سنِ اجراء ۱۹۳۸ء   فون نمبر ۳۸۴۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ سب رس حیدرآباد

سالنامہ

جلد ۴۰   جنوری ۱۹۷۷ء   شمارہ (۱)

زرِ سالانہ ——— ۱۲ روپے
ششماہی ——— ۷ روپے
فی شمارہ ——— ایک روپیہ

پرنٹر پبلشر: سید علی اکبر
مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان، حیدرآباد
مقامِ اشاعت: ادارۂ ادبیاتِ اردو، ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

ترتیب

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اِس کی مخالفت کرتا ہے۔

اپنی بات

۱۹۳۸ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان "سب رس" شائع ہوا تھا۔ صاحبزادہ محمد علی خان میکش اس کے ایڈیٹر اور بانی و معتمد ادارہ ڈاکٹر زور نگراں تھے۔ ڈاکٹر زور کی وفات (۱۹۶۲ء) کے بعد "سب رس" ان کی ادبی یادگار بن گیا۔ اب جبکہ ۱۹۷۷ء شروع ہو چکا ہے، "سب رس" اپنی باقاعدہ اشاعت کے ۴۰ ویں سال میں پہلا قدم رکھ رہا ہے۔ پچھلی کتنی ہی یادیں حافظے میں تازہ ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر زور کا جذبۂ خدمت، شاگردوں اور حیدرآبادی قلمکاروں سے مضامین لکھوانے کا طریق اور ڈھنگ، دکنیات اور حیدرآبادی ثقافت کے مختلف گوشوں پر ریسرچ میں انہماک، قدیم سے جدید تک تخلیقی و تنقیدی شعور کی کارفرمائی۔

صاحبزادہ میکش کی بے پناہ شعری و ادارتی صلاحیتوں اور ڈاکٹر زور کی جادو نظری نے ادارہ اور سب رس کو ملک کے ادبی حلقوں میں اولیت کا شرف بخشا۔ پھر یہ کاروانِ شوق بڑھتا رہا۔ محبت اور محنت کے چراغ نفز نفز اور قدم قدم روشن ہوتے رہے۔ میکش کی جواں مرگی پر آنکھیں نم دیدہ ہوئیں۔ "سب رس" کی ادارت حمید الدین شاہد کے حصے میں آئی۔ شاہد و مشہود (ڈاکٹر زور) کے رشتوں نے اس ادبی صحیفہ کو پروان چڑھانے میں قابلِ قدر حصہ لیا۔ پھر سلیمان اریب نے پس پردہ زمامِ ادارت سنبھالی، وہ کچھ مدت صدر دفتر کے کاموں میں منہمک رہے۔ ڈاکٹر زور کی حیات اور نگرانی میں وقار خلیل نے بھی اریب کے بعد سب رس کو اسم بامسمیٰ بنانے کی سعی مشکور کی۔ ازاں بعد ادارہ کے رفیق دیرینہ پروفیسر محمد اکبر الدین صدیقی نے "سب رس" کو دکنی ادب کا ترجمان بنانے میں اپنی فعال صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ میر حسن مرحوم نے سب رس دورِ ششم کو اپنی روشن صلاحیتوں کے سبب نیا روپ رنگ بخشا، یکایک وفات نے ادارہ کو ایک مخلص ادیب، قابل مترجم اور ممتاز عثمانین سے محروم کر دیا۔

میر حسن کے بعد قرعۂ فال راقم السطور (غلام جیلانی) کے نام نکالا گیا اور جولائی ۱۹۷۶ء سے "سب رس" جیسا کچھ شائع ہو رہا ہے اس کے متعلق ہم قارئین کی رائے اور مشوروں کے خواستگار رہیں گے۔ بقول کسے، ہم سب رس کے مستقبل کے بارے میں اس سالنامہ کی اشاعت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ؏ اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے۔

۱۹۳۸ء کے شمارۂ اول کا پیش لفظ ڈاکٹر زور نے لکھا تھا اور اس کی ادبی پالیسی بھی اسی شذرے میں متعین کر دی تھی ہم برابر اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ سب رس بالکل انھیں خطوط پر اشاعت پذیر ہوتا رہے۔ یہ چند سطریں ڈاکٹر زور کی صحافتی و مدون بینی کا روشن مظہر ہیں "سب رس" ادارۂ ادبیاتِ اردو کا ترجمان ہے جو ہر مہینے اردو زبان اور ادب کی خدمت کے لئے شائع ہوا کرے گا۔ اس ادارہ نے اب تک سنجیدہ علمی و ادبی کتابیں شائع کر کے اردو کی جو خدمت کی ہے وہ علم دوست اصحاب کے لئے مخفی نہیں ہے۔

ہمارے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں، جن کا اثر یا فائدہ ایک خاص حلقہ یا طبقہ تک ہی پہنچتا ہے۔ اب ایسے کاموں اور تحریکوں کی زیادہ ضرورت ہے جو "سب رس" بن سکیں اور ایسے ماہنامے اور روزنامے نکالے جائیں جن میں بھانت بھانت کی باتوں اور طرح طرح کی معلومات کا نچوڑ ہو اور جن کو ہر وہ شخص دلچسپی سے پڑھ سکے جو کسی خاص علم و فن کا ماہر نہ ہو اور اپنی فرصت کی گھڑیوں کو خوشگوار طریقے پر گزارنا چاہتا ہو۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے اردو زبان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور ہماری آواز دور دور تک پہنچ سکے گی۔

"سب رس" کا سب سے بڑا مقصد یہی ہوگا کہ وہ سب کے لئے ہو، وہ سب کے لئے اُسی وقت مفید ہو سکے گا جب اس کی زبان سلیس اور سادہ ہوگی اور جب اس میں سب طرح کے موضوعات پر دلچسپ مضامین، نظمیں اور افسانے چھپتے رہیں۔"

قارئین "سب رس" نے اس کے دورِ ہفتم میں ان سب موضوعات پر نمائندہ اور بہتر ادب ہی پڑھا ہے اور اپنی بے لاگ آرا سے ہمیں نوازا ہے۔ انشاءاللہ ہم اسے اور بہتر بنانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔ "سب رس" کے نگراں پروفیسر سید علی اکبر صاحب، ادارہ کے معتمد جناب سید ہاشم علی اختر اور حیدرآباد کے ادب شناس صحافی اور مخلص مربّی جناب عابد علی خاں صاحب ایڈیٹر "سیاست" کی بھرپور معاونت اور رفاقت کے سبب "سب رس" نے پھر ایک بار سنبھالا لیا ہے۔ ضرورت ہے عوامی اور حکومتی سطحوں پر بھی ادبی رسائل کی بقا اور ترقی کے لئے مناسب سہولتیں حاصل ہوں۔

اس بار ہم نے "حیدرآباد کے شاعر" کے زیرِ عنوان ایک نیا سلسلۂ تعارف شروع کیا ہے۔ اب سے پہلے ۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے حیدرآباد کے شعراء اور نثر نگاروں کے تذکرہ اور "رشحاتِ فکر" پر دو کتابیں دو حصوں میں مرتب اور شائع ہوئی تھیں، پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور نئے قلمکاروں میں ایک طرح کی بے چینی سی محسوس کی جانے لگی۔ ادارہ نے طے کیا ہے کہ "سب رس" کی ہر اشاعت میں ان تذکروں میں شامل شعراء کے بعد کی نسل کا مختصر تعارف اور نمونۂ کلام شامل کیا جائے۔

سالنامہ، یومِ جمہوریہ ہند کے پُرمسرت موقع پر شائع ہو رہا ہے اس میں شامل مضامین نظم و نثر میں قومی اتحاد اور یگانگت کی روشن فضا کے عکس، رنگ نمایاں نظر آئیں گے۔ یادوں کے نم دیدہ اوراق بھی ملیں گے، جن سے اُردو شعر و ادب کا رشتہ کبھی استوار رہا ہے ہماری دعوت پر جن قلمکاروں نے اپنے گراں قدر تعاون سے نوازا ہے اور بہتوں نے وعدہ بھی کیا ہے ہم سب کے تئیں ممنونیت کا دلی اظہار کرتے ہیں۔

■ جہاں ہم ان خوش آئند توقعات کے ساتھ آگے بڑھنے کی سعی کر رہے ہیں، اس میں چند عظیم سانحات سے دو چار ہونا پڑا ہے ۶/جنوری ۷۷ء کو اردو ادب کا ایک نامور صاحبِ طرز اور قادرقلم انشاء پرداز ادیب عبدالماجد دریا بادی ہم سے بچھڑ گیا۔ مولانا ماجد کو مولانا محمد علی کی رفاقت کا شرف حاصل تھا اور ان کی تحریروں میں وہی عظمت اور بے باکی نظر آتی ہے جو مولانا محمد علی کا شعار تھا۔ "صدق" کے صفحات میں حالات سے متاثر ہوئے بغیر صداقت اور جی داری کے ایسے نمونے ملتے ہیں کہ شاید اُن کا بدل آئندہ اُردو ادب کو نصیب نہ ہو سکے۔ مولانا عبدالماجد اور ایک دوسرے صاحبِ طرز ادیب نیاز فتحپوری کی تحریری جھڑپیں بھی اُردو ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں اگرچہ ان میں مذہب اور لامذہبی کی تکرار راہ پا گئی ہے لیکن زبان و بیان کی شگفتگی اور فکر و نظر کی وسعت و قادرالکلامی کے ان نمونوں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا ماجد فکر و دانش کا گنجِ گرانمایہ تھے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور ڈاکٹر زورؔ سے ان کی رفاقت دیرینہ رہی زورؔ صاحب کی وفات پر انھوں نے "صدق" میں لکھا تھا کہ "خدمتِ اُردو اور شغف و انہماک کے لحاظ سے بابائے اُردو مرحوم کی جانشینی کا مستحق اگر کوئی فردِ واحد ہو سکتا تھا تو وہ زورؔ مرحوم ہی تھے"۔ ۱۹۶۳ء میں مولانا نے ایوانِ اُردو کا معائنہ فرمایا تھا اور ادارہ کے کاموں سے دلی مسرت اور وابستگی کا اظہار کیا تھا۔ ایسے باکمال اور ہنرمند ایک ایک کرکے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ خدا مولانا ماجد کو اعلیٰ درجات سے نوازے اور اُن کی قبر کو انوار سے معمور فرمادے۔ (آمین)

■ ابھی ماجد صاحب کا غم تازہ ہی تھا کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی بھی چل بسے۔ رشید صاحب نے ۱۵/جنوری ۷۷ء کو علی گڑھ میں آخری سانسیں لیں۔ علی گڑھ جو انھیں زندگی سے عزیز تر رہا۔ رشتہ ٹوٹا، اُردو کے گنے چنے انشاء پردازوں میں رشید صاحب کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی تحریریں معطر روشن اور گہری فکر و نظر کا سرمایہ ہوتی تھیں، حضرت ابوہریرہ سے بلی ــ "خواجہ حسن نظامی سے

دلّی اور رشید صاحب سے علی گڑھ ایسی نسبتیں رہیں جن کا شہرہ نگروں نگروں عام ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے رشید صاحب نے تاریخ ساز خدمات انجام دیں۔ وہ صفِ اوّل کے نقّاد، خاکہ نویس اور منفرد انداز کے سوانح نگار تھے۔ ان کی تحریروں میں ولیم ہزلٹ اور چارلز لیمب کی طرح نادانستہ طور پر کلاسیکی ادب کے حوالے آجاتے ہیں اور لطف دے جاتے ہیں۔ غالب کی شاعری سے رشید احمد صدیقی کو کچھ اس طرح کا عشق تھا کہ ان کی نثر دانستہ طور پر غالب کے اشعار کا حصّہ نظر آتی ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور ڈاکٹر زورؔ سے ان کا رشتہ استوار رہا ہے۔ زورؔ صاحب جب بھی علی گڑھ جاتے رشید صاحب کے ہاں ہی قیام کرتے تھے۔ رشید صاحب نے "سب رس" کے زورؔ نمبر (۱۹۶۳ء) میں لکھا تھا "بڑے آدمی کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے اعلیٰ مقاصد کے انصرام کے لئے کس پائے کے کتنے کام کرنے والے چھوڑے"۔ اس اعتبار سے میں ڈاکٹر زورؔ کو بڑا آدمی سمجھتا ہوں۔ غرض ایسے "بڑے لوگ" اُٹھتے جارہے ہیں۔ اور ان کی جگہ بظاہر خالی خالی نظر آتی رہے گی۔ رشید صاحب اُردو تہذیب کے سچّے عاشقوں میں تھے۔ ان کی وفات دُنیائے ادب کے لئے ناقابلِ تلافی المیہ ہے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

غلام جیلانی

بقیہ ادبی سرگرمیاں (صفحہ ۲ سے آگے)

کی امداد کتابوں اور رسائل کی شکل میں دینے کا اعلان کیا۔ یہاں کتب خانوں میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کتب خانہ انجمن ترقی اُردو اور حیدر گشتی کتب خانہ بھی شامل ہیں۔

۲۱ دسمبر کو محفلِ خواتین کا ادبی اجلاس بیگم وحید ہاشم علی اختر (معتمد ادارۂ ادبیاتِ اردو) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے خواجہ حسن نظامی پر مضمون اور محترمہ فاطمہ عالم علی (دختر قاضی عبدالغفار مرحوم) نے ایک انشائیہ سنایا۔ خواتین شعرا نے کلام سے محفل کو مہکایا۔

● ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں علی یاور جنگ کی یاد کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ جناب اکبر علی خان سابق گورنر اڑیسہ نے صدارت کی قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

مطبوعاتِ ادارۂ ادبیاتِ اُردو

تاریخ ناندیڑ دکن	احمد علی بیگ چغتائی	2/50
ہندوستانی قومیت	ایشور الورپا	1/50
ریاض مختاریہ	دلاور علی دانش	6/-
حیدرآباد	رفیعہ سلطانہ	1/-
اشوکِ اعظم	سیدہ مہدی جعفر	1/-
تاریخ گولکنڈہ	پروفیسر مجید صدیقی	8/75
حیدرآباد کے بڑے لوگ	غلام پنجتن	2/50
میر محمد مومن	ڈاکٹر زور	3/75
یادگارِ زور	مرتبہ اکبر الدین صدیقی	7/50
ابوالکلام آزاد (ادب الطفال)	وقار خلیل	1/-
کیف و کم (طنز و مزاح)	یوسف ناظم	2/50

ملنے کا پتہ: "سب رس" کتاب گھر ایوانِ اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

قومی یک جہتی کا تصوّر اور امیر خسروؒ کی دین!

ہندوستان میں قومی یک جہتی کی تاریخ جن مردانِ خود آگاہ کے کارناموں کے باعث علم برداری کی حامل ہوگی، ان میں حضرت امیر خسروؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ امیر خسروؒ اگر ایک طرف اپنی ذات سے انجمن تھے تو ہر انجمن میں وہ روحِ انجمن بن کر رہے۔ اور پھر ان کی ذات نے مختلف انجمنوں کو باہم دگر مربوط کر دیا تھا۔ امیر خسروؒ کی شخصیت رنگا رنگ، طرفگی اور کئی جہتوں کی حامل تھی۔ وہ شاعر بھی تھے اور بڑے ملک التجار بھی۔ وہ ماہرِ موسیقی بھی تھے اور اپنے وقت کے ماہرِ لسان بھی۔ وہ صوفی بھی تھے اور ایک کامیاب درباری بھی ــــ یہ سارے اوصاف ان میں اس خوبی کے ساتھ مجتمع ہو چکے تھے کہ ان کی شخصیت کا ہر پہلو بے مثال اور اپنا جواب آپ تھا۔ انہوں نے ان سب میں ایک ایسی یک جہتی پیدا کر دی تھی کہ یہ سارے رخ ایک دوسرے کی تقویت اور تابانی کا باعث بن چکے تھے۔

خسرو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ترک پس منظر اور غیر ہندوستانی ورثہ کے باوجود، خود کو ہندوستانی تمدن و معاشرت کا جزو لاینفک بنا دیا تھا کہ ان کے بغیر ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا بیان نامکمل رہتا ہے۔ خسرو کے اجداد ترکمان خطا سے تعلق رکھتے تھے، اور قبیلۂ لاچین کے امراء میں سے تھے۔ یوں بظاہر خسرو کا فارسی سے بے حد گہرا رشتہ ہو جاتا ہے لیکن خسرو کا ننھیال ہندوستانی تھا، قطعی ہندوستانی! اُن کی ماں سلطان بلبن کے وزیر جنگ عماد الملک کی بیٹی تھیں۔ ہندی (یا ہندوی) خسرو کی زبان قرار پاتی ہے۔ اس طرح قومی یک جہتی کے تصوّر ہی کو نہیں، بین قومی یک جہتی کے تصوّر کو بھی خسرو کی دین ہے۔ فارسی شاعری کی تاریخ میں خسرو کا تذکرہ کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور خسرو کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستانی کو بھلانا ممکن نہیں۔ خسرو صد سالہ تقاریب کا ایک اثباتی پہلو یہ بھی ہے کہ اس طرح ہم ہندوستان اور ایران و ترکی کے قدیم ثقافتی رشتوں کی بازیافت کر رہے ہیں۔ خسرو نے فارسی کے علاوہ ہندوستانی زبانوں میں شاعری ہی نہیں کی بلکہ ہندوستان اور عجم کی ثقافتی قدروں کو باہم دگر مربوط بھی کیا ہے کہ موسیقی میں ہندی اور فارسی کے راگوں کے امتزاج سے نئے نئے راگ ایجاد کئے اور کئی راگوں میں ترمیمات کر کے ان کی ہیئت ہی بدل دی ــــ اس تمہید سے میرا مقصود یہ ظاہر کرنا تھا کہ یک جہتی کی کوششوں کی حد تک خسرو کا نقطۂ نظر بے حد وسیع اور کشادہ تھا۔ انہوں نے ارادی طور پر نہ بھی کیا ہو اور بات ہے لیکن غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر بھی ان کا مزاج یگانگت، مرکزیت اور یک جہتی کے جذبات کا گہوارہ تھا۔

خسرو کے دور میں قومی یک جہتی کا تصوّر وہ نہ رہا ہو جو آج ہے لیکن خسرو جس مسلک سے وابستہ تھے اس کا مقصد وہی تھا جو آج قومی یکجہتی کا ہے۔ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب، نسلوں، زبانوں اور رنگوں کے لوگ رہتے ہیں، امن کی برقراری، عوام کی خوش حالی اور نظم و نسق کی کامیابی آج ہی نہیں، ابتداء ہی سے اسی صورت میں ممکن ہے جب کہ یہاں قومی یک جہتی کے جذبات کارفرما ہوں۔ قومی یک جہتی

یہاں ہر دور میں صرف حکومت کی سیاسی حکمت عملی نہیں، عوام کی بھی ناگزیر ضرورت تھی، ہے اور رہے گی۔ خسرو نے اپنے عہد کے تقاضوں کو محسوس کیا اور کوشش کی کہ ان تقاضوں کی زیادہ سے زیادہ تکمیل کی جا سکے۔

خسرو کا سنِ پیدائش ۶۵۲ ہجری م ۱۲۵۳ عیسوی ہے۔ سنِ وفات ۱۳۲۵ء۔ اپنی اس (۷۲) برس کی عمر میں خسرو نے گیارہ سلاطین کا زمانہ دیکھا تھا اور خود پانچ سلاطین کے دربار سے وابستہ رہے۔ جن میں پہلا معز الدین کیقباد (۶۸۷ - ۶۸۹ھ) اور آخری محمد بن تغلق (۷۲۵ - ۷۵۲ھ) تھا۔ ان سلاطین کے حالات بیان کرتے ہوئے خسرو نے جہاں تہاں حقِ مصاحبت بھی ادا کیا ہے، لیکن ان کی تصانیف سے اگر ایسے حصوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ بات بآسانی محسوس کی جا سکتی ہے کہ عہدِ بلبن سے لے کر غیاث الدین تغلق تک کے عہد کے بیشتر واقعات قلمبند کرتے ہوئے خسرو نے دربار داری کے آداب اور مصاحب پیشگی کے طریقوں کو فراموش بھی کر دیا ہے اور قومی تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ کو انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ آنے والی نسلوں کے لئے پیش کر دیا ہے۔ اس طور پر ان کی تصانیف تیرھویں اور چودھویں صدیوں کے ہندوستان کی سیاست اور تہذیب کی دستاویز بن جاتی ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں ہندوستان کی رنگا رنگ تہذیب، مختلف معتقدات، سیاست کے پیچ و خم اور معاشرت و ثقافت کے شوخ و شنگ دھاروں کو پیش کر کے اپنے دواوین اور تصانیف کو قوسِ قزح کی سی کیفیت کا حامل بنا دیا ہے۔

غیر معمولی کر و فر اور جاہ و جلال کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ ان مسلم سلطنتوں کو استحکام حاصل نہیں تھا۔ خسرو کا عہد ہندوستان میں سیاسی طور پر انتشار اور خلفشار کا عہد بھی ہے۔ اندرونِ ملک سلاطین کی عیش پسندی اور درباری سازشوں کے باعث انتظامِ سلطنت متاثر اور مجہول ہوتا جا رہا تھا۔ بادشاہوں سے زیادہ بادشاہ گروں کی اہمیت تھی۔ اور بیشتر بادشاہ کٹھ پتلی! اسی کے ساتھ بیرونی حملہ آوروں سے بھی ملک کو خطرہ درپیش تھا۔ منگولوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں ایشیا میں جو قتل و غارت گری اور لوٹ مار آغاز کی تھی ہندوستان بھی اس سے محفوظ نہ تھا۔ ۱۲۸۴ء میں منگولوں نے لاہور پر حملہ کیا۔ شمس الدین التمش کا بیٹا شہزادہ سلطان محمد اس وقت ہلاک ہوتا ہے۔ خسرو، شہزادہ کے ہمراہ تھے، منگولوں نے ان کو گرفتار کر لیا۔ گویا خسرو اس بحران اور انتشار کے محض تماشائی ہی نہیں کبھی کبھی خود تماشا بھی رہے ہیں! — یہ چیز بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ہندوستان میں لگ بھگ ایک صدی گذر جانے کے باوجود ابھی مسلم تہذیب اور ہندوستانی تہذیب کا پوری طرح امتزاج نہیں ہو پایا تھا۔۔۔۔ ہندوستان کے ان مسلم بادشاہوں کے پیشِ نظر اپنی سلطنت کے استحکام و اقتدار کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ ملک میں قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا برقرار رہے۔ اس اہم مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے اپنے مذہب اور معتقدات اور تمدن و معاشرت سے بالاتر ہو کر مذہبی آزادی کی فضا بحال کی۔ وسیع النظری اور کشادہ دلی سے کام لیا کہ قومی یکجہتی کی برقراری اور استحکام میں مدد ملے اور قومی یکجہتی کے رجحانات کی ترویج ہوتی رہے۔ خسرو کا ماحول درحقیقت یہی تھا۔ اسی کے ساتھ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے اور حضرت سے غیر معمولی عقیدت کے باعث خسرو کے دل میں رواداری، انسانیت دوستی، بے تعصبی اور بلا رنگ و نسل ہمدردی کے جذبات پیدا ہو چکے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے ہند مسلم تہذیبی ہم آہنگی اور ایک صالح معاشرہ کے لئے اپنی مساعی کی شروعات کر دی تھیں۔ خسرو نے بھی اپنے روحانی پیشوا کی تقلید کی اور اس عظیم و وسیع مشن کی اشاعت کے لئے اپنی شخصیت اور اپنی تصانیف کو حتی المقدور کام میں لایا۔

قومی یکجہتی کے سلسلہ میں خسرو کی خدمات اساسی نوعیت کی حامل ہیں، خسرو ہی تھے جنہوں نے اس ملک میں سب سے پہلے۔

ہندوستان کے ایک کُلّی تصوّر کو پیش کیا۔ وہ پٹیالی، ضلع ایٹہ (اتر پردیش) میں پیدا ہوئے لیکن انہوں نے صرف اتر پردیش یا شمالی ہند ہی سے اظہارِ وابستگی نہیں کیا بلکہ علاقائیت سے ماوراء ہو کر ہندوستان سے بطور ایک وحدت کے محبت کی اور ایسی محبت کہ اسے دنیا کے سارے ممالک پر فوقیت دے دی۔ انہوں نے اپنی مشہور مثنوی "نُہ سپہر" کے ایک سو بارہ اشعار میں ہندوستان کی برتری کو کیا عرب اور کیا عجم، ہر دو پر ثابت کیا۔ اسی مثنوی میں ہندوستان کو "بہشتے بزمیں" قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

کشورِ ہند است بہشتے بزمیں مجتش اینک برخ صفحہ بیں
حجتِ ثابت چو دراں نیست شکے ہفت بگویم بہ درستی نہ یکے

انہوں نے ہندوستان کو ہر طرح سے ترجیح دی۔ اور اس کی برتری کو بیان کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان نے علم و فن میں تمام ممالک سے زیادہ ترقی کی ہے۔ یہاں دنیا کے مختلف ممالک سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے ہیں وہ سنسکرت کا ذکر غیر معمولی احترام سے ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ یہاں کے لوگوں میں اس قدر صلاحیت ہے کہ وہ دنیا کی ہر زبان میں مہارت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہاں فنِ موسیقی دیگر ممالک کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ ہندوستان نے شطرنج جیسا کھیل ایجاد کیا ہے اور یہاں وید جیسی قابلِ قدر تصنیف ملتی ہے جس میں مذہب، سیاست، موسیقی، معاشرت کی اعلیٰ اور عمدہ پیمانے پر عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں کی ایک اہم تصنیف "پنچ تنترہ" ہے جس کا ترجمہ عربی، فارسی اور ترکی کے علاوہ دنیا کی مزید کئی زبانوں میں ملتا ہے —— اس مثنوی میں خسرو نے ہندو مت کا نہ صرف اسلام بلکہ دنیا کے دیگر بڑے مذاہب سے موازنہ کیا ہے۔ وہ ہندو مت کو دیگر مذاہب پر ترجیح دیتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ "ہندو تو صرف ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں جبکہ ثنوی فرقہ دو خداؤں کو مانتا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا ہے جب کہ ہندو اس طرح کے عقیدے کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح فرقۂ مجسّمہ کا ایمان ہے کہ خدا صاحبِ جسم ہے جب کہ ہندوؤں کا اعتقاد ایسا نہیں ہے۔ ستارہ پرست سات خداؤں کے وجود کو مانتے ہیں جب کہ ہندو ایسے معتقدات نہیں رکھتے۔ ہندوؤں کا عقیدہ فرقۂ مشبہ کے جیسا بھی نہیں ہے جو خدا کو مخلوقات سے تشبیہ دیتے ہیں۔ پارسیوں کے نزدیک دو خدا ہیں نور اور ظلمت - جب کہ ہندوؤں کا مذہب بھی یہ نہیں ہے۔" غرض اسی طرح ہندوؤں کو ان سب سے ممیّز کرتے ہوئے خسرو نے بت پرستی کی مدافعت کی ہے اور کہا ہے کہ دوسروں کو اس طرزِ عبادت سے سبق سیکھنا چاہیئے کیونکہ یہ چیز ہندوؤں کے راسخ العقیدہ ہونے کا ثبوت ہے۔

خسرو کٹر مذہبی تھے لیکن تنگ دل مذہبی نہیں۔ ہندو مذہب کے بارے میں اُن کے خیالات سے یہی ظاہر ہوتا ہے اور یہ کہ انہوں نے اپنی گہری مذہبیت کو کبھی بھی قومی یک جہتی اور وطن دوستی کی راہ میں حائل ہونے نہیں دیا۔ اپنے ذاتی مسلک کو جو صلح کل اور اتحاد و یک جہتی کا معیاری نمونہ تھا خسرو نے جگہ جگہ بیان کیا ہے اور دلکش اور انوکھے انداز میں۔ یہ اشعار سُنیئے ؎

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست
خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کند آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

خسرو نے ہندوستان کے موسموں، یہاں کے میوؤں، یہاں کی آب و ہوا، یہاں کے جانوروں، پرندوں، عماروں، عمارتوں، سنگتراشوں غرض اپنے وطن کے ہر رنگ اور رُخ کو سراہا ہے۔ "نُہ سپہر" کے پانچویں سپہر میں ہندوستان کے موسموں اور خاص طور پر جاڑے کی توصیف بے پایاں ہے۔

خسرو نے ہندوستان کی تعریف محض یونہی رواجی اور سنی سنائی بنیادوں پر نہیں کی ہے بلکہ انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا ہے حالات سے واقفیت حاصل کی اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا ۔ کئی بادشاہوں کی مصاحبت میں رہنے کی وجہ سے خسرو کو سفارتی امور کے سلسلے میں یا بادشاہوں کے ہمراہ ہندوستان کے طول و عرض میں کئی مقامات کی سیر و سیاحت کا موقع ملا ۔ اپنی تجارت کے سلسلے میں بھی ان کو کئی جگہوں پر آنے جانے کا موقع ملا ۔ یہاں انہوں نے اپنی سرکاری یا تجارتی ذمہ داریاں خواہ کسی طرح نباہی ہوں لیکن انہوں نے ان علاقوں کی تاریخی حیثیتوں، تمدنی اور معاشرتی رُخوں اور فطری دلکشیوں کو محسوس کیا اور ان کی بھرپور ترجمانی بھی کی ۔ چنانچہ خسرو نے اپنی کئی مثنویوں اور دواوین کے دیباچوں میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی فراخدلی کے ساتھ توصیف کی ہے اور خارجی نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے ان علاقوں کی خوبی اور دلآویزی کے ہر رُخ کو نمایاں کیا ہے ۔

خسرو کے یہاں دِلّی کا ذکر کئی جگہوں پر اور طرح طرح سے ملتا ہے ۔ اپنے دیوان " تحفۃ الصغر " میں خسرو نے دِلّی کا ذکر غیر معمولی سرشاری سے کرتے ہوئے اس کو مصر، خراساں، بغداد، غلا، تبریز، ترمذ، بخارا اور خوارزم سے بہتر قرار دیا ہے ۔ حتیٰ کہ جب وہ شہزادہ سلطان محمد کے ہمراہ ملتان میں رہتے ہیں تو انھیں دِلّی کی یاد بے حد ستاتی ہے ---- یاد بھی کیسی ؟ یہاں کے میدان، سبزہ زار، چشمے یہاں کے پُل، پھول، پتھر، باغات، درخت، سیر، تماشے، دن، رات، سب یاد آتے ہیں ۔ " قرآن السعدین " میں خسرو نے دِلّی کی تعریف میں جذباتی لگاؤ سے کام لیا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کو باغِ ارم کی صفات کا حامل قرار دیتے ہیں ۔ دِلّی کی دلکشی کا حال بیان کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ اس (بوستاں) کا حال سُن کر مکہ معظمہ بھی ہندوستان کا طواف کرنے گئے ۔ خسرو نے دِلّی کے نواحی علاقوں بہار پور اور افغان پور کی توصیف میں اپنے قلم کی بے پناہ قوت سے کام لیا ہے ۔ وہ یہاں کے پانی کو خراساں کے پانی سے بہتر قرار دیتے ہیں اور خربوزے کو جنّت کے میووں سے بھی عمدہ و شیریں ۔ انہوں نے لکھا ہے ؎

خربزہ گوئی کہ بہ صحرا و کشت　　　گوئے ربود از ثمرات بہشت ؎

مثنوی " مفتاح الفتوح " میں خسرو نے رنتھنبور کے نزد واقع قلعہ جھائیں کا تذکرہ کیا ہے ۔ یہ وہ قلعہ ہے جس کو سلطان جلال الدین نے فتح کیا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ قلعہ آسمان کی طرح بلند اور سنگِ خارا سے مزین تھا ۔ در و دیوار پر نقش و نگار کا یہ عالم تھا کہ مانی کا فن بھی شرمندہ ہو ۔ اس قلعہ میں چہار طرف بڑی نازک و نفیس مورتیاں فن کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی تھیں ۔

خسرو کو خانِ جہاں امیر اعلیٰ حاکم اودھ کی رفاقت میں دو سال تک اجودھیا میں قیام کا موقع ملا ۔ اجودھیا کے بارے میں انہوں نے اپنے خیالات دلنوازانہ اور سرشار انداز میں بیان کئے ہیں ۔ اور تو اور وہ اس علاقہ کو دنیا کے لئے باعثِ زینت قرار دیتے ہیں ۔ خسرو کے بموجب اس سرزمین پر خوشیوں اور مسرتوں کے لوازم بے نہایت ہیں ۔ پھول اور شراب کی کثرت، انسانوں کو فرحت، توانائی اور تازگی بخشنے والے پھل، سریلی اور پرکشش آواز والے طائر وغیرہ ۔ مزید برآں خسرو نے یہاں کے باشندوں کی خوش اخلاقی اور دلداری کی بہت ستائش کی ہے ۔

ملک کافور نے جس زمانے میں تسخیرِ دکن کے لئے کوچ کیا تھا، خسرو اس کی معیت میں دکن آئے تھے اور دیوگیر میں کچھ عرصہ کے لئے قیام بھی کیا تھا ۔ انہوں نے جن شاعرانہ الفاظ اور جس شاندار اسلوب میں دیوگیر کی ستائش کی ہے وہ انہی کا حصہ ہے ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شہرِ دیوگیر اپنے حسن اور لطافت میں قصرِ شدّاد سے بھی آگے ہے ۔ مصر جیسے حسین شہر نے بھی دیوگیر کے حُسن کی شہرت سُن کر اپنا ملبوس اُتار کر دریائے نیل میں پھینک دیا ہے اور بغداد دو ٹکڑے ہو گیا ہے ۔ اس کی فضا جنت کی، میوے بے مثال، پھول خوشبو سے بھرپور،

اور ہر بازار ایسا گلشن ہے جہاں جوہری اور صراف سونے چاندی کے سکّوں کے ڈھیر لئے بیٹھے ہیں ۔ دیوگیر کے کپڑوں کی تعریف کرتے ہوئے خسرو نے تحریر کیا ہے کہ یہاں جو کپڑے تیار کئے جاتے ہیں وہ ہندوستان میں بہار سے لے کر خراسان تک کہیں نہیں ملتے ۔ بعض کپڑے ایسے ہیں کہ جن کو لپیٹو تو انگلی کے ناخن میں آجائیں اور کھولو تو بڑا تھان بن جائے ۔ یہاں کی موسیقی کا یہ حال ہے کہ اس کے باعث مُردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں ۔

خسرو کو ان کے علاوہ بھی اور کئی علاقوں کی سیر و سیاحت کا موقع ملا ۔ کئی علاقوں میں انہوں نے تھوڑے بہت عرصہ کے لئے قیام بھی کیا چنانچہ ان کے کلام میں اور کئی شہروں کی تعریف ملتی ہے ۔ جن میں ملتان، اودھ، لکھنوتی، ورنگل اور دوارسمدر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ ہندوستان کے بے شمار حصوں میں مختلف مقاصد کے تحت آمد و رفت کے باعث خسرو کو ہر طرح کے عوام سے ملنے ملانے، ان کے رسم و رواج، طور طریقوں اور عقاید وغیرہ سے آگاہی حاصل کرنے اور ان علاقوں کی زبانوں کو جاننے کے مواقع حاصل ہوئے ۔ خسرو نے محض حد تک نہ صرف یہ کہ ان زبانوں کو سیکھا بلکہ ان میں تھوڑی بہت طبع آزمائی بھی کی ۔ لائق ذکر بات یہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی زبان کے بارے میں بھید بھاؤ سے کام نہیں لیا ۔ وہ خاص خوش دلی سے ان زبانوں کے بارے میں تحریر کرتے ہوئے ایک طرح سے لسانی ہم آہنگی کی فضا تیار کرتے ہیں جو قومی یک جہتی کے سلسلے میں اساسی اہمیت رکھتی ہے ۔

اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں انہوں نے ہندوستان کی زبانوں کا جن سے ان کو واقفیت ہوئی، یوں تذکرہ کیا ہے ؎

سندی و لاہوری و کشمیر و کبر — دھور سمندری، تلنگی و گجر
معبری و گوری و بنگال و اودھ — دلی و پیرامنش اندر ہمہ حد
ایں ہمہ ہندویست زایام کہن — عامہ بکار است بہ ہر گونہ سخن

علاوہ ازیں ہندوی و کیرتی کا بھی انہوں نے بیان کیا ہے ۔

فارسی میں خسرو کا مرتبہ ایران کے صفِ اوّل کے فارسی شاعروں کے ہم پلّہ ہے ۔ انہوں نے عربی میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن خود اعتراف کرتے ہیں کہ ان کے عربی کلام میں عربی شعراء کے کلام کی طرح حلاوت و لطافت نہیں پائی جاتی ۔ جہاں تک ہندوستانی زبانوں کا تعلق ہے خسرو سے منسوب بہت سارا کلام متنازعہ فیہ ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں کم سہی، انہوں نے شعر ضرور کہے ہیں، بالخصوص ان کی فارسی اور ہندی کی ملی جلی معروف غزل، جس کا مطلع "زحالِ مسکیں مکن تغافل... الخ" ہے، کے مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور یہ خسرو کی معتدبہ ہندی دانی کا واضح ترین ثبوت ہے ۔ اسی طرح خسرو برج اور کھڑی کے بھی اولین شاعر قرار دیئے جاتے ہیں، اردو شاعری میں بھی ان کی حیثیت مسلّم ہے ۔ نیز ان کے فارسی کلام میں بھی کئی ہندوستانی زبانوں بالخصوص اردو اور ہندی کے الفاظ، تراکیب اور تشبیہات کا استعمال، ہندوستانی زبانوں سے ان کے رشتے کو اور مضبوط بنا دیتا ہے ۔

اس ساری گفتگو سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ خسرو نے صرف کسی ایک زبان سے محبت نہیں کی اور نہ دیگر زبانوں کو نظر انداز کر دیا ۔ ہو سکتا ہے کہ اگر ان کو کسی ایک ہندوستانی زبان میں مہارت حاصل ہو جاتی جتنی کہ ان کو فارسی میں حاصل تھی تو وہ فارسی کے مقابلے میں یا فارسی کے ساتھ اس ہندوستانی زبان میں بھی اظہارِ خیال کرتے ۔ تاہم انہوں نے جہاں تک کہ وہ کر سکتے تھے مختلف زبانوں میں طبع آزمائی کی، مختلف اسالیب کو اختیار کیا اور ہندوستان کی ہر زبان سے بحیثیت زبان کے مساوی محبت کی ۔

ان دنوں لسانی ہم آہنگی کے رجحانات کو خسرو کی یہ ایک بڑی دین ہے۔ انہوں نے مختلف زبانوں میں تفریق نہیں کی اور نہ کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دی۔ قومی یک جہتی کے عصری تقاضوں کی تکمیل کے لئے خسرو کے اس زاویۂ نظر سے غیر معمولی استفادہ کیا جاسکتا ہے "کرنا چاہیئے۔

نسلی، سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے خسرو کا تعلق اپنے عہد کے طبقۂ اشراف سے تھا۔ لیکن خسرو کی انسان دوستی اور وسعت قلب و نظر کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ان اونچی حیثیتوں کو اپنے اور عوام کے مابین حائل ہونے نہیں دیا۔ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ سلاطین کے ندیم خاص رہے اور رعیت کے محبوب بھی! غرض وہ بڑی جامع اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیاؒ کی عزیز ترین شخصیت بھی تھے اور ان کے مریدوں کے مرکز نگاہ بھی! انہوں نے مختلف عالی اوصاف کو اپنی پیاری شخصیت میں مرکوز کر رکھا تھا۔

حضرت امیر خسرو کے عہد کو ۶½ صدیوں سے زائد عرصہ گذر چکا ہے لیکن آج بھی کیا شہری اور کیا دیہاتی، کیا ہندو اور کیا مسلم، کیا ہندی جاننے والے اور کیا اردو جاننے والے — کھڑی، برج اور فارسی والے بھی — صوفیا اور اہل طرب، بلا تخصیص سب ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور ہر مکتب فکر اُن کے افکار میں اپنے لئے جاذبیت اور کشش محسوس کرتا ہے — یکجہتی۔ قومی یکجہتی کے لئے اس سے فزوں کردار اور کیا ہوگا؟ عصر حاضر میں قومی یک جہتی کے تصور کو امیر خسرو کی دین یہی ہے!

• •

عابد علی خاں

اُردو ادب میں ہندوستانی عناصر

ہندوستانی ادب کا اور خاص طور پر اُردو ادب کی تاریخ کا اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ہمارے ادب کا بیشتر حصہ ہندوستانی عوام کی سیدھی سادھی زندگی ان کی خوشی اور غم اُن کی معصوم خواہشات اور اُن کی امنگوں بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ میں کسی حد تک ذمہ داری کے ساتھ یہ عرض کر سکتا ہوں کہ میری زبان کے ادب میں پانچ چھ سو سال کی تاریخ ادب میں خصوصی طور پر ہندوستانی عوام کی واضح ترجمانی موجود ہے اور ان کی زندگی کی صحیح عکاسی ہوئی ہے۔ اگر ہندوستان کے اولین اردو شاعر محمد قلی نے ہندوستان کے گیت گائے، ہندوستان کی عظیم روایات کی ترجمانی کی، ہندوستان کے تیوہاروں سے متاثر ہوا، ہندوستان کے درخشاں مستقبل پر یقین کے ساتھ پیش قیاسی کی ہے تو آج ۱۹۷۷ء کے چوٹی کے اردو ادیب اور شاعروں نے بھی ہندوستان کے شاندار ورثہ پر فخر کا اظہار کیا ہے۔۔۔ اس کے شاندار ماضی، انمول ثقافتی روایات اور اس کے روشن مستقبل کے گیت گانے میں آگے آگے ہیں۔ اگر غالبؔ نے کہا تھا:

بنارس کو بجا ہے کعبۂ ہندوستان کہئے۔

تو اقبالؔ نے بھی یہ کہہ کر "خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز" اپنے ہندوستانی ہونے پر فخریہ انداز میں مسرت کا اظہار کیا ہے۔ شاعرِ مشرق نے گردشِ افلاک کے دوران ہندوستان کی روح کو ایک خوبصورت حسینہ کے روپ میں اُبھرتے ہوئے دیکھا ہے انہوں نے اس حسینہ کو پابہ زنجیر دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس میں آزاد ہونے کی تڑپ دیکھی۔ دورِ جدید کے اردو شاعروں نے انہی آدرشوں کو اپنے دل کی دھڑکنوں کی آواز بنائی اور گزشتہ ۳۰، ۳۵ سال کے اُردو ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ دورِ جدید کے اُردو لکھنے والوں نے ہندوستان کے اس لافانی جذبہ کے وفادار رہے ہیں اس موقع پر ان شاعروں کی تخلیقات کے نمونے پیش کرنا میں ضروری نہیں سمجھتا کیوں کہ اس دور کا ہر پڑھا لکھا اور ادبی ذوق رکھنے والا 'میری بات' کی توثیق کرے گا۔ میری بات کی وضاحت کے لئے میں صرف چند نام لوں گا جیسے مخدوم، جعفری، فراق، ساحر، کیفی، جاں نثار، مجروح، نیاز حیدر وغیرہ، ان کی شاعری میں ہندوستان کی اصلی روح جھلکتی ہوئی نظر آئے گی اُردو افسانوں اور ناول میں ایسے ہی خیالات اور احساسات کی ترجمانی ہوئی ہے۔ یہ صنف ادب بھی نظم کی طرح کچھ کم شاندار نہیں ہے ناول اور کہانی لکھنے والوں میں پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی جیسے نام بھلائے نہیں جا سکتے۔ قرۃ العین حیدر کا ناول آگ کا دریا میں ہندوستانی روایات اور اس کے شاندار ماضی کی ایک بے مثال عکاسی کی گئی ہے۔ جب ہم ہندوستان کے ادب میں ہندوستان کی روح کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس اہم بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہندوستانی ادب میں وہ اعلیٰ قدریں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جو ہندوستان کے کلچر کا اثاثہ ہے اور یہی ہندوستانی کلچر دنیا بھر کے ادب و کلچر کو اپنے

انداز سے متاثر کئے ہوئے ہے۔ ہندوستانی ادیب نے ہمیشہ ان قدروں کی تلاش کی ہے جو عالم انسانیت کو ایک رشتہ میں جوڑتے ہیں جو اختلاف میں اتحاد کی فکر کرتے ہیں اور جو انسانی تخلیقات کے روشن مستقبل کی ضمانت دیتے ہیں۔ یہ روایات بہت قدیم ہیں۔ صوفی شاعر بابا گنج شکر سے اس کا سلسلہ شروع ہوتا ہے گنج شکر نے کیا خوبصورت بات کہی تھی کہ "جب میں کسی کے ہاتھ میں قینچی دیکھتا ہوں تو فوراً ہی سوئی لے کر اس کے پیچھے چلا جاتا ہوں"۔ یہ بات اتحاد کی بات ہے۔ دوستی، بھائی چارگی، محبت اور پیار اور باہمی رفاقت کی بات ہے۔ اور یہی جذبہ ہندوستان کی تاریخ فلسفہ اور ثقافت کی روح ہے محض ماضی کی حسین یادوں کو کلیجے سے لگانے کا نام ہندوستانیت نہیں ہے۔ ہندوستانیت کے معنی ماضی کی روایتوں کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لئے راستہ دکھانا ہے، عوام کے جذبات اور احساسات کی صحیح ترجمانی کی بھرپور خواہش، ان کے دکھ درد کا احساس، ان کی فلاح و بہبود پر توجہ اور انسانیت کے مرتبہ کو اونچا کرنے کی جستجو کرنا، ہمارے ادیبوں کے فرائض ہونے چاہئیں۔ آج کا زمانہ ایک تاریخ ساز دور ہے اور ہندوستان کے لئے منزل تک پہنچنے کے لئے ایک انتہائی نازک دور ہے اس نزاکت کو جو سمجھ لے، وہ دیدۂ بینا کا مالک ہو جو زمانہ کی سرد و گرم کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو عوام کو سمجھ کر اُن کے مرتبہ کو اونچا کرنے کی پیہم کوشش کرتا ہو، وہی ادیب صحیح معنوں میں ہندوستانی ادیب ہے جس کے شعروں کو سننے کے بعد جس کی تحریرات کو پڑھنے کے بعد، جن کے ڈراموں کو دیکھنے کے بعد عوام جہاں داد و تحسین کے طور پر واہ کا نعرہ بلند کریں وہیں ان کے دل کی گہرائیوں سے آہ بھی نکلے ہمیں آج ایسے ادب کی ضرورت ہے۔ ہمارے ادیبوں کی ہندوستانیت کو صحیح طور پر عوام ہی جانچنے لگے ان کی پسند جتنی ہوگی ادیب اتنا ہی محبوب ہوگا۔ جن تحریرات کو عوام پسند نہ کریں۔ وہ تحریرات کہیں مددگار نہیں ہیں۔

اب ہم مختلف زبانوں کے علحدہ علحدہ بند کمرے نہیں بنا سکتے۔ باہر کی روشنی اور تازہ ہوا زندگی کے لئے ہے۔ ہندوستان ایک تراشا ہوا ہیرا ہے اس کے ہر پہلو میں چمک اور روشنی ہے اس لئے ہمیں اس ہیرے کے ہر پہلو کی حفاظت کرنی ہوگی تاکہ اس کی تابناکی میں روز افزوں اضافہ ہو۔ خدانخواستہ کوئی پہلو مدہم ہوا تو اس انمول ہیرے کی کوئی قیمت نہ ہوگی اس لئے کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ہندوستانی زبانوں کے تمام ادیبوں کو قریب کیا جائے۔ ادب کا تبادلہ ترجموں کے ذریعہ دوسری زبانوں میں کیا جانا چاہئے اس طریقے سے ہمارا ادب کمزور نہیں طاقتور ہوگا اور یہ آج کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

آخر میں میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں ہم اچھا ادب چاہتے ہیں، جہاں ہم ہندوستان کے مزاج کے مطابق تحریرات چاہتے ہیں، جہاں ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ادیب وقت کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھ کر لکھا کریں، ان کے رشحات قلم سے ہندوستانی عوام کے جذبات و احساسات کی مکمل ترجمانی ہو، جہاں ہم خواہش رکھتے ہیں وہیں ہمارا یہ فرض بھی ہو جاتا ہے کہ ہم ادیبوں کا خیال رکھیں انھیں فکر معاش سے آزاد کریں، ان کی مشکلات اور پریشانیوں کو دور کرنے کا انتظام کریں تاکہ وہ افکار و آلام زمانہ سے بے فکر ہو کر اپنے خونِ دل سے زندگی کے زیر و بم کا اظہار کرنے کے قابل ہوں ——————

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(ادبی سمینار دہلی کی تقریر سے)

●

میر یٰسین علی خاں

غزل

بے بس ہیں بے گناہ مقدر کے سامنے
کھلتی نہیں زبان ستمگر کے سامنے

مقتل بنا ہوا ہے یہ ایوان چارہ گر
پردہ پڑا ہوا ہے نگاہ دیدہ ور کے سامنے

وہ دن گئے کہ رکھتے تھے ہم گھر میں تو دو پاش
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم اب گھر کے سامنے

یہ منظر ہے عجیب کہ ہے اک حیات نو
رقصاں ہر ایک جنبشِ خنجر کے سامنے

حل ہو گئے مسائلِ رنج و غمِ حیات
دیوار اک کشیدہ ہے ہر سر کے سامنے

یٰسیں دیارِ فن میں سخنور ہیں کم سے کم
اور نکتہ چیں ہزار سخنور کے سامنے

سعادت نظیر

نقشِ قدم باقی ہے

(پروفیسر سید محمد کی یاد میں)

ایک پل کے لئے پھر آج رکا وقتِ رواں
ذرّہ ذرّہ رہِ ہستی کا ہوا گریہ کناں

ہائے اِدہ پاک نظر پاک دل و پاک ضمیر
تھا جو اخلاق کے میدان میں آپ اپنی نظیر

جس کا اخلاص مہکتا تھا دیارِ دل میں
دھوم تھی جس کے روایات کی ہر محفل میں

غیر کے غم کو غمِ ذات بنانے والا
اور ہر زخم کو سینے سے لگانے والا

یار غم خوار تھا، مخلص تھا رفیق اور شفیق
اگلی تہذیب کا آئینہ تھا وہ مردِ خلیق

صاحبِ ہوش بھی تھا صاحبِ کردار بھی تھا
جو مبصر بھی تھا، ناقد بھی تھا فن کار بھی تھا

جس کے دم سے رہِ تحقیق میں جل اٹھے چراغ
جس نے بتلایا ہمیں شوق کی منزل کا سراغ

جس کی تدریس میں تھے علم و ہنر کے پہلو
جس کے ہر لفظ میں تھی فکر و نظر کی خوشبو

جس کی تحریر میں ملتا ہے شگفتہ انداز
کھو گیا موت کی وادی میں وہ انشا پرداز

کام اُس کا مگر، اے اہلِ قلم! باقی ہے
جادۂ شوق میں ہر نقشِ قدم باقی ہے

محمد منظور احمد

معاشرے میں ادیب کی ذمہ داریاں

زندگی ہر دور میں مسائل سے الجھی اور بگڑی ہوئی رہی ہے لیکن انسان نے عزم و ہمت سے کام لیتے ہوئے جدوجہد اور تگ و دو سے ان مسائل سے نمٹنے اور انھیں حل کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ سماج کے ایک ذمہ دار فرد کی حیثیت سے ہر با شعور شخص زندگی کے مد و جزر کا سامنا کرتا ہے۔ بڑا ادیب اور شاعر، صاحبِ نظر ہونے کے علاوہ عام آدمی کی بہ نسبت زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کا گہری نظر سے جائزہ لیتا ہے۔ اور سماج میں پھیلے ہوئے انتشار یا سماج کی طاقت اور ترقی کو متاثر کرنے والے عناصر پر نظر رکھتا ہے۔ فرض شناس ادیب، ساحل سے طوفان کا نظارہ کرنے کا کبھی قائل نہیں ہوتا بلکہ وہ تو قانوں کا پامردی سے ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے۔ وہ ہواؤں کے رخ کو بدل دیتا ہے اور اپنی سعی و جہد سے کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے اور دنیا میں امن و سکون اور مسرت و خوش حالی کو عام کرتا ہے۔

ادب زندگی کا آئینہ اور ترجمان ہوتا ہے۔ وہ بقول میتھیو آرنلڈ زندگی کی تنقید بھی ہوتا ہے۔ جب اخلاق اور انسانی قدریں خطرے سے دوچار ہوں تو یہ صورت حال ایک بلند درجہ ادیب کے لیے چیلنج کی حیثیت اختیار کرتی ہے۔ وہ زمانے کے اس چیلنج کو قبول کرتا ہے اور اپنی زندگی کا نذرانہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ غالب نے کہا تھا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران جو غزل آزادی کے متوالے نوجوانوں کی نوک زبان تھی، اس کا مطلع سنیے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بہر حال صفِ اول کا ادیب اپنی حیات پرور تخلیقات کے ذریعہ لوگوں کی فکر کے انداز میں انقلابی تبدیلی لاتا ہے صحت مند تبدیلی اور تعمیری انقلاب، زندگی کو حسین سے حسین تر اور خوب سے خوب تر بنانے کے لیے ناگزیر ہیں۔ یوں بھی اقبال کے خیال کے مطابق ۔۔۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

انقلاب کا مقصد تعمیر ہو تو انسان اور انسانیت کی بقا اور اس کے تحفظ کی توقع کی جا سکتی ہے لیکن اگر انقلاب کا مقصد تخریبی ہو تو پھر انسان اور انسانیت کا وجود خطرہ میں پڑ سکتا ہے۔ زندگی ہر دم، نئی دنیا کی تعمیر و تشکیل میں لگی رہتی ہے جیسا کہ اقبال نے کہا۔

چشم بکشائے اگر چشم تو صاحب نظراست زندگی در پئے تعمیرِ جہانِ دگراست

اردو کے ادیب اور شاعر کسی زمانے میں بھی اپنے دور کے مسائل سے غافل نہیں رہے۔ ہمارے نثر نگاروں اور شاعروں نے ہمیشہ اپنے دور کے عوام کے جذبات و احساسات کی کامیابی سے ترجمانی کی ہے۔ ان کے دل کی دھڑکنوں، آہوں، آنسوؤں اور

درد و کرب کو اپنی تخلیقات میں سمویا ہے۔ عام لوگوں کی آرزوؤں، تمناؤں اور ان کے سنہرے خوابوں کو انھوں نے فنکارانہ مہارت کے ساتھ موثر پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ اعلیٰ نصب العین کے حصول کے سلسلے میں ان کی جد و جہد ہمیشہ مثالی رہی ہے۔ اصغر گونڈوی نے ان ادیبوں کے جذبہ و احساس کی صحیح ترجمانی اپنے اس شعر کے ذریعہ کی ہے۔

آلامِ روزگار کو آساں بنادیا جو غم ملا اُسے غمِ جاناں بنا دیا۔

اُردو ادب کا کم و بیش پورا سرمایہ، معاشرہ کے مختلف مسائل کا آئینہ ہے۔ اپنے دور کی زندگی کی تصویر ہے۔ ناکامی یاس، حسرت، مایوسی، نارسائی، محرومی، درد و کرب، تنہائی کا شدید احساس اور مردم بیزاری معاشرہ کی ہمہ جہتی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ بقول شمس الرحمٰن فاروقی "تنہائی کا احساس" شاعر کی شخصیت کی تعمیر میں نمایاں رول ادا کرتا ہے۔ شاعر اپنی شخصیت کو دوسروں سے بہت زیادہ مختلف پاتا ہے۔ اس لیے وہ زیادہ تنہائی محسوس کرتا ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

اعلیٰ ادب یا عالمی ادب میں ہم عصریت CONTEMPORONETY کے علاوہ ابدیت ETERNITY اور ہمہ گیری بھی وقتی مسائل پر مشتمل ہنگامی ادب زیادہ دیرپا نہیں ہوتا لیکن ایسے ادب کی بھی اپنی جگہ بے حد اہمیت ہے۔ اگرچہ وقتی مسائل، مختصر عرصے کے لیے لوگوں کی توجہ، دلچسپی اور غور و فکر کا مرکز ہوتے ہیں پھر بھی ان کی اہمیت سے کوئی باشعور شخص انکار نہیں کر سکتا۔ زندگی کے مسلسل، متواتر تلخ اور ناخوش گوار تجربات، انسان کے دل میں مردم بیزاری کا جذبہ پیدا کرتے ہیں اور ایسا انسان اپنے ساتھیوں سے نفرت کرنے لگتا ہے جس سے محبت، ملنساری، اتفاق و اتحاد کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ بقول غالبؔ ۔

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں۔

ڈاکٹر عابد حسین نے سچے ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ادب" شاعر یا ادیب کے ذہن میں سوئے ہوئے خیالات کا نام ہے جو زندگی کی چھیڑ سے جاگتے ہیں۔ زندگی کی آنچ میں تپتے ہیں اور زندگی کے سانچے میں ڈھل کر خود زندگی بن جاتے ہیں"۔

محبت، ہمدردی، ایثار اور قربانی کے جذبات، اعلیٰ انسانی جذبات ہیں۔ ادب اپنی تخلیقات کے ذریعہ ان اعلیٰ انسانی جذبات اور اخلاقی قدروں کو عام کرتا ہے۔ آج کے معاشرے میں ادیب کی ذمہ داریوں میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ ہر حساس ادیب، آج یہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی اس سے احساسِ فرض اور ادائیگی فرض کا مطالبہ اور تقاضا کر رہی ہے اُسے مسلسل آواز دے رہی ہے آج کے ادیب کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے ماحول اور ساری دنیا کے حالات پر گہری نظر رکھے اور معاشرے کے اہم مسائل کو اپنی تخلیقات کا عنوان بنائے اور اس طرح قومی اتحاد و یکجہتی اور بنی نوعِ انسان سے محبت کے جذبات کو عام کرے۔

ہمارا معاشرہ، ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہے۔ ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے معاشرے کے تمام افراد کو بیدار رہنے اور باعمل ہونے کی ضرورت ہے۔ اصحاب فکر و نظر کے لیے موضوعات کی کوئی کمی نہیں۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے اور ذہن کی کھڑکیوں کو کھلا رکھنے کی ضرورت ہے ہمارے معاشرے میں جہیز کی رسم، کم سنی کی شادی، نشہ بندی، اچھوتوں کی فلاح و بہبود کی تدبیریں، کسانوں اور مزدوروں کے دکھ درد کے علاج اور دیہات سدھار جیسے کئی امور قلم کاروں کی توجہ چاہتے ہیں۔ ہمارے قدیم

ادب میں متوسط اور غریب طبقہ اور کسانوں اور دیہات کی زندگی کے مسائل کو افسانوں، ناولوں اور نظموں میں پیش کیا جارہا ہے۔ آج قوم کی تعمیر و ترقی کے سلسلے میں بڑے بڑے منصوبوں کو تیزی سے عملی جامہ پہنایا جارہا ہے جن سے قوم کی خوشحالی میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ عام لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کے منصوبوں پر عمل شروع ہوچکا ہے۔ ان تمام موضوعات پر ہمارے ادیب اپنی اعلیٰ اور معیاری تخلیقات پیش کرسکتے ہیں تاکہ ہمارے ادب میں آج کے ہندوستان کی صحیح تصویر محفوظ ہوجائے۔

دنیا کی تاریخ میں انقلاب روس، انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب اہم واقعات ہیں۔ اہل یورپ کے ذہن کی تبدیلی میں روسو، والٹیر اور کارل مارکس نے اہم حصّہ ادا کیا ہے۔ انگریزی زبان کے کئی ادیبوں نے بھی اپنے دور کے حالات کی ترجمانی کی ہے۔ اُردو میں سرسید احمد خاں، مولانا حالیؔ، ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ، برج نرائن چکبستؔ، مولانا عبدالحلیم شررؔ، مرزا ہادی رسواؔ، نظیرؔ اکبرآبادی اور منشی پریم چند کے علاوہ کئی دوسرے مضمون نگاروں، ناول نگاروں، افسانہ نگاروں اور شاعروں نے اپنے دور کے سماجی، معاشی اور اخلاقی مسائل کو اپنی تخلیقات کا عنوان بنایا۔ اور اس طرح ان ادیبوں نے سماجی شعور کے بیدار کرنے میں اہم حصّہ لیا ہے۔

آج کے ادیب پر انسان اور انسانیت کے حال اور مستقبل کو بہتر بنانے اور زندگی کو سنوارنے نکھارنے اور خوبصورت بنانے کی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اس لیے اُردو کے ادیبوں کا فرض ہے کہ وقت کے تقاضے کو محسوس کریں۔ زمانے کی آواز پر کان دھریں اور قلم کے ذریعہ دکھی انسانیت کی بے لوث خدمت کا بیڑہ اٹھائیں۔

قلم یقیناً تلوار سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ اس لیے پُرامن ہمہ وجودیت، جیو اور جینے دو اور انسان دوستی کے خیالات کو عام کرنے اور عالمی برادری کے قیام کے لیے مسلسل کوشش کی جانی چاہیئے۔ اعلیٰ پایہ کے ادیبوں کی تصانیف نے ماضی میں دنیا کے کئی ممالک میں ذہنی انقلاب پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ آج بھی اعلیٰ معیار کی تخلیقات، ہمارے معاشرہ کی بہتر طور پر خدمت کا موثر ذریعہ بن سکتی ہیں۔ موجودہ دور میں ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور دوسرے ایٹمی ہتھیاروں سے اعلیٰ انسانی قدروں اور تہذیب و تمدن کے گراں قدر سرمایہ کے چشم زدن میں کسی بھی لمحہ تباہ و برباد ہونے کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ اس لیے ادیب ہی دوستی اور محبت کے پیام کو دنیا کے گوشے گوشے میں عام کرنے کا اہم فریضہ بحسن و خوبی انجام دے سکتے ہیں۔ جگر مرادآبادی نے کہا تھا۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے۔

اس کے علاوہ ہمارے ادیب ملک میں ہونے والی ہمہ جہتی ترقی کی رفتار سے اہل ملک بلکہ ساری دنیا کو واقف کرواسکتے ہیں جس سے قومی عزت اور وقار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ اہل ملک کے دل میں خود اعتمادی اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے میں بھی ہمارے ادیب سرگرمی اور جوش و خروش سے حصّہ لے سکتے ہیں۔

فنکار یا ادیب کا دل صحیح معنوں میں جامِ جم ہے جس کے اندر اُسے سب کچھ نظر آتا ہے۔ وقتی مسائل کو ابدیت کی صورت دے کر عظیم ادب کی تخلیق کی جاسکتی ہے جس سے پڑھنے والوں کو مسرت اور بصیرت حاصل ہوسکتی ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی اور آواز کی رفتار سے بھی زیادہ تیز چلنے والے ہوائی جہاز کنکارڈ کی ایجاد کی بدولت، دنیا کے ممالک ایک دوسرے سے بہت قریب آگئے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارے ادیب، ساری دنیا کے انسانوں کے دلوں کو بھی ایک دوسرے سے ملانے کا اہم انسانی فریضہ انجام دیں۔۔

جواد رضوی

سالار جنگ خاندان کی علمی و ادبی خدمات

دسمبر ۱۹۷۶ء میں سالار جنگ میوزیم کی سلور جوبلی کی تقاریب بڑے پیمانے پر منائی گئیں۔ اس شہرہ آفاق میوزیم کی وجہ سے سالار جنگ کا نام نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا کے کئی اہم ممالک میں بھی مشہور ہو گیا ہے۔

جو شخص بھی اس میوزیم کو دیکھتا ہے اس کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی ۵۰، ۶۰ سالہ زندگی میں آرٹ اور ادب کا اس قدر کثیر، متنوع اور نادر ذخیرہ کیسے جمع کر پایا۔ اس سوال کا جواب ہمیں اسی وقت مل سکتا ہے جب ہم سالار جنگ خاندان کی تاریخ کا ایک سرسری جائزہ لیں۔ یہاں یہ بات واضح کر دیتے چلوں کہ اس مضمون کا مقصد اس خاندان کے سیاسی پس منظر کو پیش کرنا نہیں اور اگر اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو شاید اس خاندان کے لئے باعث فخر و مباہات ثابت نہ ہو۔ اس لیے زیر نظر مضمون میں اس خاندان کی صرف علمی، ادبی اور ثقافتی خدمات کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس امر کا اظہار بیجا نہ ہوگا کہ اس خاندان کے کئی افراد سلطنت آصفیہ کے کئی برسوں تک دیوان وزیر اعظم رہے اور انھوں نے اس ریاست کی تنظیم جدید، استحکام اور ہمہ جہتی ترقی کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور یہ بھی ایک امر حقیقت ہے کہ اس خاندان کے کئی افراد اپنے علمی تبحر، اعلیٰ صلاحیتوں اور ادبی خدمات کی بناء پر کافی مشہور رہے ہیں۔ چنانچہ میوزیم اور کتب خانہ کا نایاب ذخیرہ ان کی علم دوستی اور فنون لطیفہ کے تعلق سے ان کے اعلیٰ اور ستھرے ذوق کا بہترین ثبوت ہے۔

اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ آصفجاہی دور میں اس خاندان کو ایک بلند مقام حاصل رہا۔ لیکن خاص دوران درگاہ قلی خاں سالار جنگ (سنہ وفات ۱۷۶۶ء) سے اس خاندان کی رشتہ داری کی وجہ سے سالار جنگ کا خطاب اس خاندان کا جز بن گیا اور دوسری طرف میر عالم کی دامادی نے اس خاندان کے پانچ (۵) افراد کو سلطنت آصفیہ کے وزیر اعظم بننے کے مواقع فراہم کئے۔

اس خاندان کے جد اعلیٰ اویس قرنی تھے، جو یمن کے باشندے تھے، لیکن انھوں نے مدینہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ پیغمبر اسلام کے صحابی تھے اور جنگ صفین میں درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔ اسی قرنی خاندان کے چشم و چراغ اویس ثالث مدینہ کے اوقاف کی مہتمی پر فائز تھے اور ان کی علمی صلاحیتوں کی بنا پر اُس زمانے کے مسلمان انھیں بڑی قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اویس ثالث نے اپنے لڑکے شیخ محمد علی کے ساتھ ترک وطن کیا اور سترھویں صدی عیسوی میں بحرین سے ہوتے ہوئے ہندوستان کے ساحل کوکن پہنچے۔ اس زمانے میں بیجاپور کی عادل شاہی حکومت کا دربار عالموں، ادیبوں اور فن کاروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس علمی اور ادبی ماحول سے متاثر ہو کر اویس ثالث اور شیخ محمد علی نے بیجاپور کو اپنا وطن بنانے کا فیصلہ کیا۔ شیخ صاحب کے دو لڑکے شیخ باقر اور شیخ محمد حیدر تھے جو عادل شاہی

اور مغل دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ شیخ محمد باقر جید عالم اور بلند پایہ مصنف تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "روضۃ الانوار زبدۃ الافکار" ہے۔ اس کے علاوہ سالار جنگ کے کتب خانہ میں ایک بیش ترین قرآن مجید بھی موجود ہے جس پر محمد علی اور محمد باقر کی مہریں ثبت ہیں اور جس کو انھوں نے اپنے افراد خاندان کے لیے [illegible]ء میں وقف کیا۔ اس خاندانی قرآن کو سالار جنگ کے کتب خانہ کی خشت اول تصور کیا جاسکتا ہے۔

اس خاندان کی ایک اہم کڑی محمد باقر کے پوتے شیخ شمس الدین محمد حیدر تھے جنھیں نظام الملک آصفجاہ اول اور بعد کے بادشاہوں نے منیر الملک (اول) منیر الدولہ حیدر یار خان بہادر شیر جنگ کے خطابات عطا کئے۔ آخری عمر میں انھیں اورنگ آباد کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور [illegible]ء میں وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی جمع کردہ کئی مخطوطات کتب خانہ سالار جنگ میں محفوظ ہیں۔

شیر جنگ کے دو فرزند شیخ محمد صفدر اور شیخ محمد تقی تھے۔ شیخ محمد صفدر غیور جنگ کی شادی اسی زمانے کے ایک ہفت ہزاری منصب دار درگاہ قلی خان سالار جنگ کی لڑکی سے ہوئی۔ درگاہ قلی خان آصفجاہ اول کے زمانے میں نہ صرف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے بلکہ انھوں نے ایک بلند پایہ کتاب "مرقع دہلی یا دہلی بارھویں صدی ہجری میں" تصنیف کی جس کا اردو ترجمہ سید مظفر حسن نے کیا۔ ان کی تصنیف کا قلمی اور مطبوعہ نسخہ کتب خانہ سالار جنگ میں موجود ہے۔

غیور جنگ کا انتقال ۱۷۹۱ء میں ہوا۔ انھوں نے بھی اپنے خاندانی کتب خانہ میں کافی کتابوں کا اضافہ کیا۔ ان کی اولاد میں ان کے تیسرے فرزند علی زماں خان منیر الملک (ثانی) قابل ذکر ہیں۔ (سنہ وفات [illegible]ء) وہ نظام وقت کے مقرب خاص اور میر عالم کے داماد تھے۔ منیر الملک ثانی نے اپنے پیش روؤں کے مقابلہ میں بہت زیادہ مخطوطات کا اپنے خاندانی کتب خانہ میں اضافہ کیا مثلاً تاریخ طبری، حبیب السیر، تاریخ قطب شاہی وغیرہ۔ یہاں سید ابوالقاسم میر عالم کا اجمالاً ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ سالار جنگ کے خاندان سے میر عالم کا رشتہ ننھیالی تھا۔ وہ سر سالار جنگ کے پرنانا ہوتے تھے۔ میر عالم کا سلسلۂ نسب شوستر (ایران) کے قدیم سادات سے ملتا ہے ان کے والد سید رضی [illegible]ء میں ہندوستان آئے۔ وہ ایک مسلمہ عالم اور بلند پایہ شاعر تھے ان کا ایک مجموعہ کلام "دیوان اقدس" جو میر عالم کے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ سالار جنگ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ میر عالم کی شخصیت بھی بڑی پہلو دار تھی۔ وہ ایک جری سپہ سالار، نظم و نسق کا وسیع تجربہ رکھنے والے ایک حاکم، ایک کامیاب سفیر اور مدبر، ایک اچھے شاعر اور بلند پایہ ادیب و عالم بھی سمجھے جاتے تھے۔ وہ کئی کتابوں اور رسائل کے مصنف تھے جن میں قابل ذکر یہ ہیں (۱) مصباح العارفین (۲) زیارت مختلف (۳) مثنوی میر عالم (۴) باغ و بہار یا رقعات میر عالم وغیرہ ان کے علاوہ دکن کی تاریخ پر ایک مستند کتاب حدیقۃ العالم بھی اِن سے منسوب کی جاتی ہے۔ مذکورہ بالا تمام مخطوطات اور اُن کی جمع کردہ کئی مخطوطات اور مطبوعات کتب خانہ سالار جنگ کی زینت ہیں۔

ان علمی اور ادبی خدمات کے علاوہ میر عالم نے رفاہی کاموں میں سرگرم حصہ لیا لیکن ان کاموں کا یہاں ذکر باعث طوالت ہوگا۔ [illegible]ء میں میر عالم کے انتقال کے بعد ان کے داماد منیر الملک ثانی، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم بنے اِن کے چار لڑکے تھے لیکن اِن کے چھوٹے لڑکے میر عالم علی خان سراج الملک سراج الدولہ اپنے والد کے جانشین ہوئے۔

عالم علی خاں عربی و فارسی ادب پر نہ صرف گہری نظر رکھتے تھے بلکہ وہ مشرقی علوم کے ایک مسلمہ عالم سمجھے جاتے تھے اور ایک عالم ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اپنے خاندانی کتب خانہ میں مخطوطات اور مطبوعات کی کثیر تعداد کا اضافہ کیا۔

وہ کئی برسوں تک حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر فائز نہ ہو سکے۔ آخرکار ہندوستان کے گورنر جنرل کی راست مداخلت کے بعد ہی انھیں ۱۸۵۱ء میں حیدرآباد کا وزیرِ اعظم بنایا گیا۔

سراج الملک کے جانشین میر تراب علی خاں بہادر سر سالار جنگ ہوئے (سنہ پیدائش ۱۸۲۹ء) چونکہ بچپن میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے ان کے چچا سراج الملک کی نگرانی میں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی سترہ برس کی عمر میں انھیں سالار جنگ بہادر کا خطاب دیا گیا اور ۱۸۵۳ء میں ناصرالدولہ آصفجاہ چہارم نے انھیں حیدرآباد کا وزیرِ اعظم منتخب کیا۔

وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سر سالار جنگ نے اپنی ساری صلاحیتیں ریاست حیدرآباد کے نظم و نسق کو بہتر بنانے اور ضروری اصلاحات نافذ کرنے میں صرف کر دیں۔ تیس (۳۰) سال تک وہ حیدرآباد کے وزیرِ اعظم رہے اس قلیل مدت میں انھوں نے حیدرآباد ریاست میں جو افراتفری پھیلی ہوئی تھی اس کو ختم کر کے نظم و ضبط پیدا کیا، ایک جدید اور مستحکم نظم و نسق کی بنیاد رکھی۔ ریاست میں پہلی بار آصفجاہی خاندان کے نام سے سکوں کا چلن شروع کیا۔ اسی بنا پر انھیں اُس دور کا ایک بلند پایہ اڈمنسٹریٹر اور مدبر سمجھا جاتا ہے۔

۱۸۷۶ء میں جب وہ صوبہ برار کی واپسی کے بارے میں نمائندگی کرتے انگلستان تشریف لے گئے تو برطانوی حکومت کے تعلق سے اُن کی سیاسی خدمات کے پیشِ نظر کوئین وکٹوریہ نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انگلستان میں وہ اپنے سیاسی مشن میں کامیاب تو نہ ہو سکے لیکن یورپ سے واپس ہوتے ہوئے انھوں نے روم میں قیام کیا اور وہاں "ویلڈ ربیکا" کا نایاب و نادر مجسمہ خریدا جو اب میوزیم کی زینت بنا ہوا ہے۔ اس مجسمہ کے علاوہ کئی مخطوطات اور دوسرے نوادرات اپنے ساتھ لائے۔ ان کا انتقال ۱۸۸۳ء میں ہوا۔ سر سالار جنگ نے ادبی تخلیقات کی ہر وقت سرپرستی کی، کئی مصنفین کی کتابوں کی ترتیب اور اشاعت میں مالی امداد فرمائی اسی بنا پر مختلف فنون کی کئی کتابیں ان کے نام سے معنون کی گئی ہیں۔ کتب خانہ میں کتابوں کی جو فہرستیں ہیں ان سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ان کے انتقال تک مشرقی زبانوں کی مخطوطات اور مطبوعات کی جملہ تعداد (۹۲۶۲) تھی۔ اور یہ گمان غالب ہے کہ ان میں کثیر تعداد سر سالار جنگ نے جمع کی ہوگی۔ اسی طرح انگریزی کتابوں کی فہرست کے مطابق اُس وقت انگریزی کتب کی تعداد (۴۴۳۵) تھی اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یہ تمام ذخیرہ سر سالار جنگ کی کاوشوں ہی کا نتیجہ ہے۔

سر سالار جنگ کو ریاست کی تعلیمی ترقی سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ چنانچہ ان کے دور میں مدرسہ دارالعلوم ۱۸۵۵ء میں قائم کیا جس میں ہر طبقہ کے طلباء کے لیے تعلیم کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ ابتدائی دور میں اس مدرسہ میں محسن الدولہ، رفعت یار جنگ اور عماد جنگ بہادر نے تعلیم پائی۔ دو سال بعد انگریزی ذریعہ تعلیم کا ایک علیحدہ اسکول مسمیٰ "اینگلو ورناکولر اسکول" کے نام سے شروع کیا گیا اسی طرح مدرسہ عالیہ کی بھی ابتدا کی گئی جس میں اُمراء اور اعلیٰ عہدہ داروں کے لڑکے تعلیم پاتے تھے۔ چنانچہ سر سالار جنگ کے فرزند میر لائق علی خاں اور پوتے میر یوسف علی خاں نے بھی اسی مدرسہ میں تعلیم پائی۔ سر سالار جنگ کی زندگی اور کارناموں پر کئی کتابیں لکھی گئیں جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں ـــ ۱۔ حیدرآباد دکن اور سر سالار جنگ ۲۔ ریاض مختاریہ ۳۔ مرقع عبرت۔

سر سالار جنگ کی دو لڑکیاں اور دو لڑکے میر لائق علی خاں اور میر سعادت علی خاں تھے۔ میر لائق علی خاں ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اعلیٰ

اپنے والد کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی پھر انھیں ۱۸۸۱ء میں مزید تعلیم و تربیت کے لئے یورپ بھیجا گیا۔ جہاں ان کا قیام دو سال رہا۔ سفر یورپ کے تاثرات کو انھوں نے فارسی میں قلمبند کیا جو "وقائع مسافرت" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

میر محبوب علی خاں آصفجاہ سادس نے ۱۸۸۳ء میں میر لائق علی خاں کو حیدرآباد ریاست کا وزیر اعظم مقرر کیا لیکن ان کی وزارت عظمیٰ کا دور بہت ہی مختصر رہا اور وہ اس عہدہ سے مستعفی ہو کر دوبارہ یورپ چلے گئے۔ اس مختصر دور وزارت میں اُن کا سب سے بڑا کارنامہ اُردو کو ریاست حیدرآباد کی سرکاری زبان کا رتبہ دینا اور تعلیمی اداروں سے گہری دلچسپی کا اظہار رہے۔ لائق علی خاں کے انتقال کے وقت ان کے لڑکے میر یوسف علی خاں صرف ۲۴ دن کے تھے۔ اس لیے اس کم سن اور ہونہار لڑکے کی نگہداشت، تعلیم و تربیت اور خاندانی جاگیرات اور جائیداد کی نگرانی کے لیے بادشاہ وقت نے معقول انتظامات کئے۔ انھیں مدرسہ عالیہ میں شریک کیا گیا جہاں سے انھوں نے مڈل (جس کا سرٹیفکیٹ میوزیم میں محفوظ ہے) اور "یوسف دکن" کے مصنف کے بموجب اسی اسکول سے میٹرک کا امتحان بھی ممتاز حیثیت سے پاس کیا۔

جب نواب صاحب کی عمر (۱۰) سال تھی انھیں سالار جنگ کا خطاب دیا گیا اور منصب بحال کر دی گئی۔ ۱۹۱۲ء میں میر عثمان علی خاں کے دور حکومت میں سالار جنگ بہادر کو وزارتِ عظمیٰ کے عہدہ پر مامور کیا گیا۔

۲۳ سالہ نوجوان وزیر اعظم نے ریاست کے نظم و نسق کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے جی جان کی بازی لگا دی۔ ان کے مختصر دورِ حکومت میں کئی جدید محکمے مثلاً آب رسانی، تعمیرات اور آثارِ قدیمہ قائم کئے گئے۔ حیدرآباد سیول سروس کی ابتدا ہوئی۔ حیدرآباد ایجوکیشن کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ اس عالمی فتنے نے نہیں معلوم کیوں حیدرآباد کے حکمران اور وزیر اعظم میں بھی رنجش پیدا کر دی۔ اور سالار جنگ نے ۷/ نومبر ۱۹۱۴ء کو دیوانی کے عہدہ سے علیٰحدگی اختیار کر لی۔ یہ ان کی زندگی کا ایک ایسا موڑ تھا جہاں انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اپنے آبا و اجداد کی جمع کردہ کثیر دولت اور وسیع ذرائع آمدنی کو اُس دور کے دوسرے نوابوں کی طرح عیش و عشرت اور جھوٹی شان و شوکت میں ضائع کیا جائے یا پھر اس دولت کو صحیح استعمال کر کے اپنے خاندان کے جمع کردہ نوادرات اور مخطوطات کے ذخیرہ میں اضافہ کیا جائے نواب صاحب نے دوسری متبادل صورت کو ترجیح دی اور اپنی دولت کا کثیر حصّہ اور ساری زندگی آرٹ اور ادب کے خزانہ کو مالا مال کرنے میں صرف کر دی۔

نوادرات سے اُن کی گہری دلچسپی سے سب ہی واقف تھے اس لیے دور دراز مقامات سے لوگ پینٹنگس، مخطوطات، خطاطی کے بہترین نمونے اور مخطوطات فروخت کرنے نواب صاحب کی دیوڑھی پر جمع ہوتے اور ان کی نظر انتخاب جن نوادرات پر پڑ جاتی وہ خرید لی جاتیں۔ نوادرات کی تلاش میں انھوں نے یورپ اور مشرق وسطیٰ کے اکثر ممالک کا کئی بار دورہ کیا اور اپنی پسند کی چیزیں خریدتے رہے۔ بعض بیرونی ممالک میں ان کے ایجنٹ تھے جو نوادرات کے کیٹلاگ اور تصاویر نواب صاحب کو روانہ کرتے اور وہ جن نوادرات کا انتخاب کرتے کیبل کے ذریعہ انھیں خرید لیتے۔ اس طرح وہ کئی برسوں تک نوادرات، مخطوطات اور کتابیں خریدتے رہے اور انھیں دیوان دیوڑھی اور سرور نگر کے کئی محلات میں محفوظ کرتے رہے۔ نوادرات جمع کرنے کے علاوہ نواب صاحب نے فن کاروں، ادیبوں اور شاعروں کی ممکنہ مدد کی اور سماجی اور کلچرل اداروں کی سرپرستی بھی کی۔ چنانچہ انہی کی سرپرستی اور مدد سے کئی کتابیں مثلاً — "شیر جنگ"، "میر عالم"، "ریاض مختاریہ"، اور "مرقع دہلی" وغیرہ مرتب اور شائع کی گئیں۔ کئی ادبی رسالوں کی مالی امداد بھی

فرماتے تھے۔

نواب صاحب کو دکنی ادب اور کلچر سے گہری دلچسپی تھی۔ جب دکن کے مشہور شاعر ولی کا دو صد سالہ جشن سٹی کالج میں ۱۹۴۱ء میں منایا گیا تو نواب صاحب نے اس جشن کی افتتاحی تقریب کی صدارت فرمائی اور اس جشن کے موقع پر دکنی مخطوطات اور قلمی تصاویر کی جو نمائش ترتیب دی گئی تھی اس میں اپنے کتب خانہ کی کئی مخطوطات اور قلمی تصاویر رکھنے کی اجازت دی۔ ان تقاریب کے فوراً بعد نواب صاحب کی سرپرستی میں دکنی مخطوطات کو مرتب کرنے اور شائع کرنے کا کام شروع کیا گیا۔ ایک مجلس مشاورت تشکیل دی گئی جس کے روحِ رواں جناب زورؔ صاحب تھے۔ اس مجلس مشاورت کی نگرانی میں نواب صاحب کے کتب خانہ کی چند دکنی مخطوطات کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ، کلیات سراج، قصہ بے نظیر، پھول بن، طوطی نامہ اور مثنوی سیف الملوک بدیع الجمال سلسلہ یوسفیہ کے نام سے شائع کی گئیں۔

نواب صاحب نے اپنے خاندانی کتب خانہ میں بارہ ہزار سے زائد مشرقی زبانوں کے مخطوطات اور مطبوعات اور بائیس ہزار سے زائد انگریزی رسائل کا اضافہ کیا۔ فنونِ لطیفہ کا یہ شیدائی اور علم و ادب کا سرپرست اُس وقت تک نوادرات اور مخطوطات جمع کرتا رہا جب تک ان کے جسدِ خاکی میں سانس چلتی رہی اور ۲/ مارچ ۱۹۴۹ء کو سالار جنگ میوزیم کے خالق نے آخری سانس لی۔

اس عظیم شخصیت، پرانے حیدرآباد کے ایک روشن خیال جاگیردار اور ریاست کے ایک سابق وزیراعظم کے سوگ میں ملٹری گورنر نے ایک دن کی تعطیل عام کا اعلان کیا۔

حیدرآباد آرٹ سوسائٹی نے اپنے خصوصی جلسہ میں تعزیتی قرارداد منظور کی اور اربابِ اقتدار سے یہ اپیل کی کہ ان کے جمع کردہ نوادرات کو میوزیم کی شکل دی جائے اور ان کے نام سے منسوب کیا جائے۔ اس تحریک کو عملی جامہ پہنانے نواب کے قریبی دوستوں پروفیسر حسین علی خاں اور مہدی نواز جنگ بہادر نے پوری کوشش کی۔ چنانچہ ایم۔ کے ویلوڈی جو اُس وقت حیدرآباد کے چیف سیول اڈمنسٹریٹر تھے، مسٹر وِنکٹ چلم کو میوزیم کی ترتیب کے لیے مقرر کیا۔ اور ۱۶/ ڈسمبر ۱۹۵۱ء کی مبارک و مسعود تاریخ کو ہندوستان کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے اس شہرۂ آفاق میوزیم کا افتتاح کیا۔ اس طرح نوادرات مخطوطات اور مطبوعات کا یہ لاثانی ذخیرہ جو کئی برسوں تک ایک جاگیردار خاندان کی شخصی ملکیت کی حیثیت رکھتا تھا اور عوام کے دسترس سے باہر تھا اُس کو میوزیم کی صورت میں منظم کرکے ایک قومی ادارہ میں تبدیل کردیا گیا اور اس کے دروازے عوام کے لیے کھول دیئے گئے۔

○

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ... لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ... خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

○

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

(غالبؔ)

حیدرآباد کے شاعر

(۱)

صلاح الدین نیّر

۱۹۶۰ء سے حیدرآباد کے جن نئے شاعروں نے اپنے فکر و فن سے شعری و ادبی دنیا میں روشناسائی حاصل کی ان میں صلاح الدین نیّر بھی شامل ہیں۔ نیّر ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء کو حیدرآباد کرناٹک کے پہاڑ ضلع گلبرگہ میں پیدا ہوئے۔ تجارت اور زمینداری اجداد کا پیشہ رہا۔ ان کے حصّے میں سرکاری ملازمت کے ساتھ علمی و ادبی خدمت اور حیدرآباد کی تہذیبی و مشاعراتی مصروفیات آئیں ۔۔۔ صلاح الدین نیّر، ادارۂ ادبیات اردو سے اردو عالم اور اردو فاضل، جامعہ نظامیہ سے منشی فاضل، علیگڑھ سے میٹرک اور ادیب کامل، عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے ایل کرچکے ہیں۔ ۱۹۶۵ء میں پہلا شعری مجموعہ "گلِ تازہ" شائع ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں دوسرا انتخاب "زخموں کے گلاب" ریاستی حکومت کے تعاون سے منظرِ عام پر آیا جس پر ۱۹۶۹ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی اور ۱۹۷۶ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی سے انعامات بھی ملے۔ تیسرا مجموعہ "صنم تراش" زیرِ طبع ہے۔ انکی شاعری کا سلسلہ تدریجی ملتا ہے۔ اردو مجلس حیدرآباد کے اعزازی معتمد ہیں۔ روزنامہ "سیاست" اور ادبی ٹرسٹ سے انکی مخلصانہ وابستگی بقول نیّر "ذہنی تربیت کی ضمانت" رہا۔ کئی دفاتر معتمدی کے محکمہ تعلیمات و ادارہ میں گزیٹیڈ سیکشن آفیسر کے عہدہ پر تعینات ہیں اور بزم اردو کے صدر بھی۔ مستقلاً غزل اور نظم کہتے ہیں۔ ترنم سے کلام سناتے اور متعدد مشاعروں میں شرکت کرچکے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی آچکے ہیں۔ (و۔ غ)

غزل

متاعِ ہوش یہاں سب نے بیچ ڈالی ہے　　تمہارے شہر کی تہذیب ہی نرالی ہے
ہم اہلِ درد ہیں تقسیم ہو نہیں سکتے　　ہمارا ہر دبستاں گلشن میں ڈالی ڈالی ہے
نہ جانے بزم سے کس کو اٹھا دیا تم نے　　تمام شہرِ وفا آج خالی خالی ہے
کہیں تو میرے ہی ماضی کا آئینہ تو نہیں　　تری یہ بدلی ہوئی شکل دیکھی بھالی ہے
خلوص بانٹتے میں سب کے گھر گیا لیکن　　تم آج آئے ہو جب میرا ہاتھ خالی ہے

کسی کی شمعیں سرِ شام بجھ گئیں نیّر
کسی کے شہر میں لیکن ابھی دِوالی ہے

●

کب سے خاموش ہیں ہم خالی مکانوں کی طرح　　کب تلک پھر تے رہیں خانہ بدوشوں کی طرح
ذہن کی روشنی دل میں تو اتر جانے دو　　یہ اندھیرے نظر آئیں گے اُجالوں کی طرح
کاسۂ زیست لئے ہاتھوں میں اب بھی کچھ لوگ　　ہم کو مل جاتے ہیں جلتی ہوئی لاشوں کی طرح
یاد کر کر کے بھلا دیتے ہیں اکثر احباب　　ہم کو پڑھتے ہیں سبھی درسی کتابوں کی طرح
تم نے چلتے ہوئے یہ کیسی امانت سونپی　　ایک ایک لمحہ گراں ہے کئی برسوں کی طرح
اس نئے دور میں پھولوں کا کفن پہنے ہوئے　　اب بھی کچھ لوگ ہیں بے نام رشتوں کی طرح

تم بھی اچھا سا کوئی نام دو اُن کو نیّر
حادثے ملتے ہیں ہم سے بھی عزیزوں کی طرح

●

ہم نذر کریں کس کو پھولوں کی یہ مالائیں　　پلکوں کے اُجالوں سے لکھی ہیں کویتائیں
اسبابِ بغاوت تو معلوم ہیں ہم کو بھی　　زنجیرِ وفاداری کس شخص کو پہنائیں
اے دوست ابھر آیا اِن گرم ہواؤں کا　　شائستہ نظر رہنا جب گھر سے نکل جائیں
کیا بحث کریں تم سے سمجھوتہ ہی بہتر ہے　　بات اپنے ہی گھر کی ہے بازار میں کیوں لائیں
پھر خود سے پڑھ لیں گے قسمت کی لکیروں کو　　مٹ جائیں گی جس دن بھی ہاتھوں کی ریکھائیں
اس شہر کی مٹی میں بیگانگی کی خوشبو ہے　　پابندِ وفا کب تھیں اس شہر کی سلمائیں

مے خانے کا دروازہ پھر بند ہوا ہم پر
اب تم ہی کہو نیّر کس شخص کے گھر جائیں

●

صلاح الدین نیّر

ڈاکٹر عابد پشاوری

وقت کے تقاضے اور ادب کا رول

اگر کسی باشعور شخص سے یہ سوال کیا جائے کہ انسانی حیات و صحت کو قائم رکھنے میں متوازن غذا کیا رول ادا کرسکتی ہے، تو مخاطب یا تو مسائل کی پیچ۔ الدماغی کے باب میں مشکوک ہو جائے گا یا سوال کی صحت کے باب میں سورج ہمیں گرمی بھی دیتا ہے اور روشنی بھی یہ بات ہر شخص بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے لیکن اگر کسی سے یہی سوال کر دیا جائے کہ کیا سورج ہمیں روشنی اور گرمی دیتا ہے ؟ تو مخاطب کی کیا حالت ہوگی۔ آج جب میں اس سوال کا جواب دے رہا ہوں کہ وقت کے تقاضے کیا ہیں اور اردو ادب ان تقاضوں کے تحت کیا رول ادا کرسکتا ہے، تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں ع۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟ وقت کے تقاضوں کی ترجمانی ادب سے بڑھ کر بھلا کون سا ذریعہ ہوسکتا ہے ؟ ادب اور اسی نسبت سے ادیب وہ کچھ کرسکتا ہے جو بڑی سے بڑی طاقت بھی نہیں کرسکتی۔ آپ نے یہ تو سنی ہوگی۔ "جہاں نہ پہنچے روی، وہاں پہنچے کوی" یہ جو ہم رام راج کے گن گاتے ہیں، کبھی آپ نے سوچا ہے اس کا سبب کیا ہے ؟ نہ میں نے رام راج دیکھا نہ آپ نے۔ رام راج از منہ، قبل تاریخ کی ایک تاریخی حقیقت ہے، لیکن ہر دل میں رام راج کی عقیدت کی جوت کس نے جگائی ؟ مہا کوی تلسی داس نے، ایک ادیب، ایک شاعر نے۔ آپ نے دورِ جاہلیت کے ایک نابینا شاعر اعشیٰ کا نام تو سنا ہوگا اور اگر نام نہ بھی سنا ہو تو یہ واقعہ تو ضرور سنا ہوگا کہ ایک شاعر نے تین غریب اور بدصورت لڑکیوں کے حسن کی تعریف میں ایسے شاندار قصیدے کہے کہ باوجود مفلسی اور بدصورتی کے اُن کی شادیاں بہت اچھے گھرانوں میں ہوگئیں۔ آپ آدم الشعرا رودکی کے نام سے ناواقف نہیں ہوں گے اور آپ کو اس واقعہ کا بھی بخوبی علم ہوگا کہ جب شاہِ وقت نصیر بن احمد سامانی دورانِ سفر چھے ماہ سے زیادہ ایک ہی جگہ پڑاؤ ڈالے پڑا رہا۔ درباری اور سپاہ فراقِ اہل و عیال سے پریشان تھے لیکن جلالِ شاہی دل کی بات کو زباں تک لانے میں مانع تھا تو رودکی سے درخواست کی گئی کہ وہ کسی طرح بادشاہ کو واپسی پر راضی کرے۔ اس میں یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اظہار کی جو جرأت بڑے بڑے اہلِ سیف میں بھی نہیں تھی اس کی توقع ایک اہلِ قلم سے کی گئی اور رودکی نے بوجوہ احسن اس توقع کو پورا کیا۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمی ٭ یادِ یارِ مہرباں آید ہمی

مطلع ہے اس قصیدے کا جو رودکی نے اپنے وطن کی شان میں پڑھا اور نتیجہ آپ سب جانتے ہیں بادشاہ موزے تک پہننے کے لئے نہیں رکا اور ننگے پاؤں سوار ہوگیا سپاہ و مصاحب اس کے متعاقب روانہ ہوئے۔ یہ تمہید اس لئے باندھی گئی ہے کہ میں اس مسلّم حقیقت کی تائید مزید حاصل کرسکوں جسے آپ سب جانتے، پہچانتے اور مانتے ہیں۔

بہرحال، اِدھر اُدھر کی بہت ہوچکی۔ اب کچھ "اردو" ادب کے حوالے سے کہنا ضروری ہے۔ جو اس تحریر کا اصل مقصد ہے۔ "اردو" ادب کی تاریخ سے معمولی واقفیت رکھنے والا شخص بھی بخوبی جانتا ہے کہ اردو ادب نے ہمیشہ وقت اور وقت کے تقاضوں کا ساتھ دیا ہے۔ نہ صرف ساتھ دیا ہے بلکہ ایسے موقعوں پر پیش پیش بھی رہا ہے۔ ان معنوں میں اردو کی حیثیت امام کی ہے مقتدی کی نہیں۔ اردو ادب کا دورِ قدیم نظم کا دور ہے (اور ادب کا دورِ قدیم نظم کا دور کہلاتا ہے)۔

شاہ عالم ہی کے زمانے سے انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے قدم مضبوطی سے جا لیے تھے، اور شاہ کی حالت ایک مہرۂ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔ سلطنت شاہ عالم از دلی تا پالم، اُس زمانے کا فقرہ ہے۔ بادشاہ خود ادیب و شاعر تھا۔ جہاں وہ اپنی شاعری میں اپنی سلطنت سے رفعِ فساد کی دُعائیں مانگتا ہے وہیں شکایت کے پیرایہ میں احتجاج بھی کرتا ہے۔ ؏ "جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی" انگریزی حکومت تاجروں کی حکومت تھی۔ اُس کا پہلا حملہ ہندوستان کی دولت پر ہوگا۔ اُس دور میں سیاسی بیداری اور سیاسی شعور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اِس کے باوجود اپنی قومی دولت و عظمت کو لُٹتا دیکھ کر کبھی کبھی کسی شاعر کے دل میں کھٹک تو ہوتی ہوگی۔ اُس کا اظہار مصحفی کے اِس شعر میں ہے ؎

ہندوستان کی دولت و عظمت جو کچھ کہ تھی * ظالم فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہُوا۔ دلی لُٹی، دلی والے لُٹے۔ شاعروں نے اُس دور میں جو شہر آشوب کہے وہ محض دلی کے مرثیے اور تباہی کی داستان نہیں بلکہ بین السطور میں اُس جبر و تعدّی کے خلاف احتجاج بھی دیکھا جا سکتا ہے اور غم و غصّہ کا اظہار بھی جو احساسِ غلامی سے پیدا ہُوا تھا۔ خواہشِ آزادی کا وہ پہلا غیر شعوری اظہار تھا۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو نیا شعور جنم لینے لگا۔ اب کچھ ہندوستانیوں کو محسوس ہونے لگا تھا کہ ہم لوگ تعلیم کے میدان میں بہت پیچھے ہیں اور جب تک ہم جدید علم و علوم سے محروم رہیں گے، وقت کے تقاضوں کو سمجھنے کے قابل نہ ہو سکیں گے۔ ۱۸۰۳ء میں انشاؔ نے ایک قصیدے میں انگریزی قوم کے سمندری جہاز، عود، لفافہ اور پرانی کتابوں اور علوم کے تقویم پارینہ ہو جانے کا جو تذکرہ کیا ہے، اُس کے پیچھے بھی جدید علوم کی بہتری اور برتری کا وجدانی احساس کام کر رہا تھا۔ یہی جذبہ تھا جس سے مجبور ہو کر غالبؔ نے غدر سے بہت پہلے آئینِ اکبری کی تقریظ میں سرسید کو نئے آئین و نظام کو سیکھنے کا مشورہ دیا تھا جسے سرسید نے اُس وقت قبول نہ کیا لیکن ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو جانے کے بعد سرسید نے جو پالیسی بنائی اور تعلیمی مہم کا آغاز کیا۔ وہ ایک طرح سے غالبؔ کے اندازِ فکر کا اعتراف تھا۔ خود غالبؔ جو ساری زندگی انگریزوں کا بہی خواہ اور وظیفہ خوار رہا، ۱۸۵۷ء میں دلی کو تباہی اور انگریزوں کے مظالم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

بسکہ فعالِ ما یرید ہے آج * ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار تک نکلتے ہوئے * زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا

یہ نظم نا فرمان محض منظر کشی اور واقعہ نگاری نہیں بلکہ اِس میں احتجاج کی ایک زیریں لہر دیکھی جا سکتی ہے۔ خیر بات سرسید کی تھی۔ اُنھوں نے اپنی تعلیمی پالیسی کی تبلیغ و ترویج کس طرح کی؟ لوگوں کے دل و دماغ کو بدلنے کے لئے کون سا ذریعہ، کون سا وسیلہ اپنایا؟ ادب اور ادبی صحافت، ثبوت وہ ہزارہا صفحات ہیں جو اُن کے اور اُن کے رُفقا کے قلم سے نکلے۔ اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ ادب نے اُن سے بے وفائی نہیں کی۔

شبلیؔ بھی اُس دور کے پروردہ ہیں۔ اُن کی نظموں میں آزادی کی جو تڑپ اور قومی بہبودی کی جو لگن ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مسلم لیگ وغیرہ پر اُن کی نظمیں جرات اظہار اور جذبہ حُب الوطنی کے درخشاں نمونے ہیں۔ ہندوستانی قوم کی پس ماندگی پر اُن کا دل کس قدر کُڑھتا تھا اُس کا نقشہ اُس مکالمے میں دیکھا جا سکتا ہے جو ایک جرمن اور ہندوستانی کے مابین پہلی جنگِ عظیم کے بارے میں لکھا گیا، ملاحظہ ہو:

اِک جرمنی نے مجھ سے کہا ازرہِ غرور * آساں نہیں ہے فتح تو دشوار بھی نہیں
برطانیہ کی فوج ہے دس لاکھ سے بھی کم * اور اُس پہ لطف یہ ہے کہ تیار بھی نہیں
باقی رہا فرانس تو وہ رندِ لم یزل * آئین شناسِ شیوۂ پیکار بھی نہیں
میں نے کہا غلط ہے ترا دعویٰ غرور * دیوانہ تو نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
ہم لوگ اہلِ ہند ہیں جرمن سے دس گنے * تجھ کو تمیزِ اندک و بسیار بھی نہیں

سُنتا رہا وہ غور سے میرا کلام اور ؎ پھر وہ کہا جو لائقِ اظہار بھی نہیں
"اِس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا ؎ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں"

اِس زمانے میں پنجاب میں انجمن پنجاب کی داغ بیل ڈالی گئی۔ حالی تو خیر سرسید کے قریبی رفقا میں تھے اور اِسی نسبت سے آپ کے اصلاحی مقاصد کے مُبلغ و ترجمان بھی۔ مولانا محمد حسین آزاد جیسا شاعر مزاج رومانی ادیب بھی وقت کے تقاضے کو پہچاننے میں دیر نہیں لگاتا۔ انجمن پنجاب کی نشستوں میں پڑھے گئے مضامین اس پر شاہد ہیں۔ قدیم طرز کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اُن کا یہ کہنا۔ "اب وقت اور ہے، اور ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیئے" یعنی شاعری کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دینا چاہیئے، ظاہر کرتا ہے کہ ادب اور ادیب وقتی مصالح سے غافل نہیں رہتا۔ ادب میں مقصدیت و افادیت کی یہی گونج ہمیں بعد کو ترقی پسند تحریک میں سنائی دیتی ہے۔ انجمنِ ترقی پسند مصنفین کے قیام سے بھی پہلے ادیبوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اہلِ ہند کے ذہنوں کو غلامی کی لعنتوں سے خبردار کرنا اور اُنھیں آزادی کے لئے تیار کرنا، ادیبوں کا فرض ہے۔ چنانچہ "انگارے" نام کا افسانوی مجموعہ شائع ہوتے ہی ضبط کر لیا گیا۔ اس سے بھی پہلے پریم چند نے جو گاندھی جی اور اُن کے فلسفے سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ جدو جہد آزادی میں عملاً بھی شریک تھے، گاندھی جی کے آدرشوں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ چنانچہ اُن کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوزِ وطن" صرف اِس لئے ضبط کر لیا گیا کہ برطانوی حکومت کو اُس سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں ترقی پسند مصنفین کا قیام عمل میں آیا تو اُن کا مقصد کیا پسماندہ و درماندہ طبقوں کی بہبودی اور آزادی کی لگن کو تیز تر کرنا نہیں تھا؟ خود حصولِ آزادی کے لئے ادب نے وہ کیا جو اکیلے سیاسی رہنماؤں کے بس کی بات نہیں تھی۔ بھلا گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے ادیب ہونے میں کس کو شک ہو سکتا ہے۔ کیا اُن کی ادبی و صحافتی تحریریں حصولِ آزادی کی جدوجہد میں معاون نہیں ہوئیں۔ آج ہم اِن عظیم رہنماؤں کے جن آدرشوں پر ہندوستانی قوم کو چلانا چاہتے ہیں، اُن کی تفصیل و تفسیر خود اُن کی تحریروں میں زندہ ہے۔ ادب اور ادیب اِنسان دوستی، آپسی میل جول، قومی یک جہتی و ہم آہنگی کا نقیب ہی نہیں پرستار بھی ہوتا ہے۔ ہمارے ادیبوں نے اِسی وسیلے سے ادب میں تفریق و تفرقہ پردازی کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ اِس کے باوجود اِنسانی فطرت کی ناپختگی اور غلط فہمیوں میں مُبتلا ہو جانے کی خصلت، حالات و واقعات کی غلط تفسیر و تعبیر کی بدولت تفرقے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی باتوں نے ملک کو دو ٹکڑوں میں بٹوا دیا اور حد تو یہ ہے کہ خود ایک ٹکڑے کے باسی آج اس بات کی تبلیغ بڑے طمطراق سے کرتے ہیں کہ اُنھیں بلکہ اُن کے لیڈروں کو یہ نکتہ سمجھانے والا ایک ادیب ہی تھا۔ بہرحال ملک بٹ گیا۔ آزادی مل گئی۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد بھی ادب اور ادیب اپنے فرض سے غافل نہیں رہے۔ چینی اور پاکستانی حملوں کے دوران خطرہ و دُبدھا کا دشمن نے پورے ملک کو ایک سلسلے میں منتظم و منظّم کر دیا۔ ساری قوم کا بہ یک وجود، بہ یک وقت حالات کے مقابلے کے لئے اُٹھ کھڑے ہونا اور بہ یک آواز اپنے رہنماؤں کی صدا پر لبیک کہنا، ادیبوں کی کوششوں سے ممکن ہوا۔ کیسے کیسے پُرجوش منظومات و نغمات وجود میں نہیں آئے۔ اُس زمانے کے مرتبہ و مطبوعہ مجموعے بازار میں نایاب نہیں ہیں۔ ادب ایک تناور اور چھتنار درخت ہے جس کی کئی شاخیں ہیں، اور جس کا سایہ عالم و عامی پر یکساں پڑتا ہے۔ نظم، ریڈیو، فلم ادب کی ترجمانی کے کارآمد ذرائع ہیں۔ آزادی کے بعد اُٹھنے والے فتنوں، فسادوں اور جنگوں میں ادیبوں اور شاعروں نے بھرپور عمل ادا کیا ہے۔ وہ اِس کے لئے تحسین و تعظیم کا مستحق بھی۔ ادب اور ادیب بھی ہے۔ ہر زبان کا ادیب ادیب ہوتا ہے اور ادب ادب ہے۔ ادب ملکوں اور ملکتوں کی طرح خطّوں اور خانوں میں بٹا ہوا نہیں ہوتا اور نہ اِسے بانٹا ممکن ہے۔ کوئی اسٹیشن لگا کر دیکھیے، ڈرامے، سلسلے وار فیچر، نظمیں، تقریریں الغرض ادب کی کوئی صنف اور کوئی شاخ ایسی نہیں جس میں موجودہ حالات سے آگاہی اور بیداری کا ثبوت نہ دیا جا رہا ہو۔ عہدِ عتیق میں بادشاہ شاعر اور ادیب ہوتے تھے۔ عصرِ نو میں کئی رہنمایانِ قوم ادیب پہلے ہیں اور رہبر بعد میں۔ گاندھی جی نے اپنے مقاصد کو صرف عمل ہی سے نہیں تحریر و تقریر سے بھی حاصل کیا۔ پنڈت نہرو خود ادیب تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی تحریروں

سے قومی بیداری میں نمایاں حصّہ لیا۔ میرا مقصد ناموں کی فہرست پیش کرنا نہیں بلکہ صرف اس امر کا اظہار ہے کہ ادب کے ذریعے بڑے سے بڑے مقصد یا مقاصد کا حصول ممکن ہی نہیں سہل بھی ہے۔ بیس نکاتی پروگرام بھی ایک عظیم مقصد ہے۔ عوام کی فلاح و بہبود کا، پسماندگی اور جہالت کو مٹانے کا، قومی یکجہتی و ہم آہنگی کو ہوا دینے اور نفرت اور چھوا چھوت کی آندھیوں کے منہ پھیر دینے کا۔ ادیب سماج کا سب سے زیادہ حساس اور باشعور فرد ہوتا ہے۔ اس کی ذات میں کم زوریاں اور کوتاہیاں ہو سکتی ہیں لیکن معاشرے کے لئے جس میں وہ اپنے شب و روز بسر کرتا ہے، اس کے دل میں بڑا درد ہوتا ہے۔ اس میں وہ کوئی کمی یا کوتاہی برداشت نہیں کر سکتا۔ دراصل اس کی اپنی اور فن کی کمزوریاں ہی اسے سماج کی برائیوں سے آگاہی بخشتی ہیں۔ اور وہ انھیں دور کرنے اور ایک معاشرہ بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر نشر و اشاعت کے ذمہ دار ارباب اگر ادیبوں اور شاعروں کو مناسب مواقع عطا کریں تو ادب وقت کے تقاضوں کی ناقابلِ فراموش خدمت کر سکتا ہے۔

نتائج امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو منعقدہ دسمبر ۷۶ء

مرکز حیدرآباد: اُردو فاضل درجہ دوم: ۱۔ عارف مجاہد ۲۔ عنایت الرحمٰن درجہ سوم: ۳۔ محمد عظمت اللہ غوری ۴۔ سید خواجہ معین الدین علی ۵۔ محمد انفس محی الدین ۲۲۔ محمد خاں۔ اُردو عالم: درجہ دوم ۔۔ ساجدہ بیگم سالار اُردو دانی کامیاب ۱۔ بلبیر سنگھ ملہوترہ

مرکز نندیال: اُردو فاضل درجہ دوم: ۹۔ سید عباس حسین رضوی ۲۹۔ یم قادر محی الدین ۳۳۔ یم اسد اللہ شریف درجہ سوم ۱۳۔ پٹھان اکبر خاں۔ ۳۰۔ سید قادر پاشا قادری اُردو زبان دانی: درجہ سوم ۱۹۔ شیخ فیض الرحمٰن ۲۰۔ سیدہ محبوب بی ۲۲۔ شیخ آسیہ ۲۳۔ حمیرہ بیگم۔ ۲۴۔ قادر النساء ۲۶۔ مہر نگار ۲۷۔ سیدہ نصیر بانو ۲۸۔ خدیجہ بی ۲۹۔ ممتاز بی۔

مرکز نظام آباد: اُردو فاضل: درجہ دوم ۸۔ عطیہ تسنیم ۲۲۔ محمد یعقوب ۲۴۔ حافظ عائشہ نسیم ۲۵۔ ارجمند جہاں بیگم ۲۶۔ ریحانہ بیگم ۲۷۔ مجاہدہ بیگم اُردو عالم دوم ۱۳۔ دردانہ صدیقہ درجہ سوم ۵۔ شیخ زین العابدین ۶۔ شیخ حیدر۔ اُردو زبان دانی: کامیاب بہ امتیاز ۲۳۔ خورشید بیگم ۲۶۔ شبانہ یاسمین ۲۷۔ غزالہ تبسم ۳۲۔ محمد عبد الرؤف کامیاب: ۲۰۔ فہیم بیگم ۲۱۔ نظیر سلطانہ ۲۲۔ رفیعہ سلطانہ ۲۴۔ صبیحہ سلطانہ ۲۵۔ اطہر فرحانہ ۲۸۔ ساجدہ کوثر ۳۰۔ اصغر شاہ خاں ۳۱۔ عارف الدین ۳۳۔ نیلوفر عمرانہ ۳۴۔ ماجدہ تسنیم ۳۵۔ شمیم النساء ۳۶۔ فردوس تسنیم ۳۷۔ محمد منیر الدین ۶۴۔ انیس فاطمہ ۶۵۔ خواجہ قمر الدین۔

مرکز شادنگر: اُردو فاضل: درجہ دوم ۳۱۔ محمد ندیم شریف ۳۴۔ رحیم النساء بیگم ۳۵۔ محمود النساء بیگم ۳۸۔ محمد رحیم الدین اردو عالم: درجہ دوم ۳۷۔ حافظ محمد طاہر درجہ سوم ۳۱۔ رفیع الدین ۳۲۔ محمد عبد الرب ۳۳۔ محمد عبد الصمد اُردو زباں دانی درجہ دوم: ۴۵۔ صفیہ خاتون درجہ سوم ۴۴۔ قطب النساء ۴۶۔ فخر النساء بیگم اُردو دانی: کامیاب بہ امتیاز ۵۳۔ وی انور سہا ۵۴۔ محمد سمیع اللہ ۵۵۔ ریحانہ خاتون کامیاب ۵۱۔ محمد سلیم ۵۲۔ محمد انور احمد ۷۔ سید ساجد علی ۱۷۔ سید ساجد علی

مرکز دہلی: اردو عالم درجہ دوم ۱۵۔ عبد الرؤف ضیاء ۱۹۔ محمد انیس ۲۰۔ عبد الحمید ۲۱۔ عبد الباری ۲۳۔ احمد حسن خاں ۲۴۔ بلال احمد ۲۵۔ اعجاز عظیم ۲۶۔ محمد اسمٰعیل خاں ۴۱۔ نصرت جاوید درجہ سوم ۱۶۔ عبد السلام ۱۸۔ انوار الحسن ۲۸۔ اکرام الدین ۲۹۔ نجم الحق صدیقی ۳۰۔ جاوید انور اردو زبان دانی: درجہ سوم ۱۵۔ محمد اختر اُردو دانی: کامیاب بہ امتیاز ۳۹۔ ۳۹۔ محمد صلاح الدین ۶۲۔ معراج الدین۔ کامیاب ۵۹۔ محمد رفیع ۶۰۔ محمد شاکر ۲۳۔ نوشاد احمد۔ (سلسلہ صفحہ ۳۲ پر دیکھئے)

غزلیں

فیض الحسن خیال

خوشی کا درد کا سنگم رہا ہے آنکھوں میں
ترا خیالِ مجسم رہا ہے آنکھوں میں

غمِ حبیب جو کم کم رہا ہے آنکھوں میں
اک انتشار کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

تماشہ شب کا ابھی ختم ہونے والا ہے
مگر سحر کا لہو جم رہا ہے آنکھوں میں

اسی لئے تو میں تنہا پسند ہوں شاید
خموشیوں میں وہ ہمدم رہا ہے آنکھوں میں

جہاں پہ ٹوٹ گیا سلسلہ محبت کا
وہیں سے سلسلۂ غم رہا ہے آنکھوں میں

رہیں خیال کے دامن میں اس کی خوشبوئیں
اسی لئے تو وہ پیہم رہا ہے آنکھوں میں

رئیس اختر

جب تشنہ لبی کی راہوں میں میخانے سجائے جاتے ہیں
ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑوں سے پیمانے بنائے جاتے ہیں

کل تک تو یہاں کا ہر جلوہ منسوب انھیں کے نام سے تھا
کیوں آج تمہاری محفل سے دیوانے اٹھائے جاتے ہیں

خود شمع کو بھی معلوم نہیں کس غم کی امانت ہوتی ہے
وہ آگ کہ جس کے شعلوں میں پروانے جلائے جاتے ہیں

انداز جدا ہیں سب کے مگر ہے بات وہی احساس وہی
اک لفظِ محبت سے لاکھوں افسانے بنائے جاتے ہیں

جس رات بھی روشن ہوتے ہیں فانوس کسی کی یادوں کے
اس رات رئیس اختر کتنے ویرانے سجائے جاتے ہیں

ایک شام

شفیق احمد

کبھی یہ زُلف
مرے گال پہ لہرائی تھی
یاد ہے خوب مجھے
زندگی میں مری اک ایسی بھی شام آئی تھی
جب مرے رُخ پہ کوئی ناگن سی
رقص کرتی ہوئی بل کھائی تھی
ریشمی بالوں کا وہ لمس
یاد آتا ہے مجھے
گیسوئے یار کا خم آج بھی یاد آتا ہے

مصطفیٰ علی فاطمی

نجم آفندی کی یاد میں

اکثر القاب اور خطابات حقیقت کا پردہ ہوتے ہیں یا پردہ کا جلوہ بن جاتے ہیں اور حقیقت بہر حال نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے ۔ " علامہ " کی کنیت اور ارباب علم و فن کے دیے ہوئے خطاب " شاعر اہل بیت " نے مرزا تجمل حسین نجم آفندی کے ساتھ شاعری سے کہیں زیادہ مذہبیت کا تصور وابستہ کر دیا ۔ ایک عام اور غلط تاثر یہ پیدا ہوا کہ نجم آفندی کی شاعری کا میدان مرثیے ، سلام اور نوحے تک محدود ہے اور دوسرے اصناف سخن غزل ، نظم ، نعت ، منقبت ، قصیدہ ، مثنوی ، رباعی اور قطعات پر انھوں نے طبع آزمائی نہیں کی ۔ نجم صاحب ہند و مسلم اتحاد کے علمبردار ہیں ، شیعہ سنی افتراق کو پسند نہیں کرتے وہ بنیادی طور پر انسان ہیں ۔ اور ان کی شاعری عشق اور انسانیت کی شاعری ہے اسی لئے انسانیت کی میراث ہے ۔ اور اسے محدود نہیں کیا جا سکتا ۔ جذبے اور خیال کے اظہار کے لئے نجم صاحب نے پیرایہ شعر اختیار کیا ، تفہیم اور واقعات بیان کرنے کے لئے نثر کو اپنایا ، بچوں کے ادب پر بھی قلم اٹھایا ۔ شاعری کی ہر صنف کو برتا اور اپنی قادر الکلامی سے اساتذہ میں بھی منفرد مقام پیدا کیا اور یوں درد مندِ انسانیت نجم آفندی نے اپنے سی پارۂ دل کے ۲۷ ٹکڑے نظم و نثر کے لباس سے سجا کر ایوانِ ادب میں پیش کیے جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر قبول عام حاصل کر چکے ہیں ۔

صلاحیت شعر گوئی مبداء فیاض کا عطیہ ہوتی ہے اور فن شاعری نجم کے گھرانے کی میراث ہے جو انہیں فصیح ، بلیغ ، ملیح اور بزم آفندی سے ورثہ میں ملی ۔ ان کے نانا آغا حسین آغا بھی شاعر تھے ۔ ان کے والد مرزا عاشق حسین بزم آفندی سید اسمٰعیل حسینی منیر شکوہ آبادی کے شاگرد اور نجم اپنے والد بزم کے شاگرد اور اس طرح سلسلۂ شعر و ادب میں منیر شکوہ آبادی کہلاتے ۔ ان کی سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ نجم نے اپنی اس نسبت پر بجا ناز کیا ہے ۔ اسی نسبتِ تلمذ کے اظہار نے جانشین مومن و دلستیم ، منشی امیر اللہ تسلیم کو باوجود کبر سنی اور انتہائی ضعیفی کے خود اپنی زبان سے دو شعر سنانے پر مجبور کر دیا ۔ ابو المظفر وقار کانپوری سے تعارف ہوا تو ان کی فرمائش پر نجم نے اپنی غزل سنائی جس کا مطلع تھا ؎

یہ سنتا ہوں لحد میں پیستا ہے استخواں کوئی ‏ الٰہی خیر ! کیا زیر زمین ہے آسماں کوئی

نوجوان نجم کی غزل کے تیور دیکھ کر وقار کو اچنبھا ہوا ۔ پوچھا کس کے شاگرد ہو ۔ کہا ، اپنے والد بزم کا جب دریافت کیا کہ بزم کس کے شاگرد ہیں ۔ جواب دیا ، حضرت منیر شکوہ آبادی کے ۔ وقار نے بے ساختہ کہا ہاں پھر تو اس عمر میں اس سے بہتر شعر کہہ سکتے ہو ۔ تمہارا ہمارا سلسلہ ایک ہی ہے ۔ ہم عروج کے شاگرد اور عروج ، منیر کے ۔

اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ ابتدا ہی سے نجم نے غزلیں کہیں اور بھر پور تغزل اور فنی رچاؤ کے ساتھ ۔

نہ صرف غزل بلکہ قصیدے بھی۔ موجودہ دور کے قصیدہ نگاروں میں علامہ نظم طباطبائی کے بعد دوسرا ممتاز نام نجم آفندی کا لیا جاسکتا ہے۔ ان اصناف شاعری میں انھوں نے اس دور کے اساتذہ سے داد حاصل کی۔ لیکن دنیائے ادب میں ان کے قصاید کا کم اور غزلیات کا تو بہت ہی کم تعارف ہوا جس کے چند در چند اسباب و وجوہات ہیں۔

نجم صاحب کی جسامت مختصر و مفید لیکن چہرہ بارعب اور آواز گرجدار تھی۔ ذہانت اور بصیرت سے روشن آنکھیں، آنکھوں کے حدقے بڑے بڑے اور عینک کے علاوہ ان سے بڑے مضبوط کاٹھی، پستہ قد، گول چہرہ اور انتہائی سرخ و سفید رنگ غور سے دیکھیں تو روپہلی گرد ڈاڑھی کے ہالے میں چہرہ گلاب معلوم ہوتا تھا۔ شعروادب میں افادیت اور فیض کا سرچشمہ وضعداری میں بے مثال۔ خودداری اور قناعت کا مظہر، عزم و عمل کا پیکر۔ مختصر یہ کہ لکھنو اور حیدرآباد کی تہذیب کا حسین امتزاج۔ لکھنوی کاٹ کا کرتا پاجامہ اور حیدرآبادی شروانی پہنتے۔ علماء کا احترام کرتے۔ ہم عمروں کے رفیق اور کم عمروں پر شفیق سادگی اور مجلسی آداب کا مکمل نمونہ۔

ترکی النسل، محبت کے متوالے، مرنجان مرنج صلح کل مشرب کے صاحب کردار انسان تھے۔ انسانی نفسیات کا نہ صرف مطالعہ بلکہ دیرینہ تجربہ رکھتے تھے۔ دکھتی رگوں سے خوب واقف اور محرکات عمل کے نبض شناس۔ جو کچھ کہتے بینہ شاہد بصیرت، تجربہ اور تجزیے کی روشنی میں کہتے۔ اسی لیے ان کا کلام، کلام سے زیادہ پیام ہے۔ ماحول پر ان کی تنقید چھبتی اور مزاح لطیف بلکہ ایک زیرلب مسکراہٹ جو نشتر کا کام کرجاتی۔ دل، خلوص اور درد انسانیت سے معمور اور زبان حق آشنا اور دل کی ترجمان

راقم کو شخصی طور پر نیاز حاصل تھا۔ میں نے نجم صاحب میں ہمیشہ محبت، شفقت اور خلوص پایا۔ بات کہتے تو کھری ستھری۔ لب ولہجے میں لکھنو سے زیادہ آگرہ آشکار مشورہ دیتے تو بے لاگ۔ واقعہ یہ ہے کہ گفتگو کے حسن اور اس کے پیچ و خم سے حضرت نجم پوری طرح واقف تھے مگر پرپیچ زبان اور ذو معنی بیان سے انہیں طبعی نفرت تھی وہ انصاف پسند اور بے باک تھے اسی لیے ان کی صاف گوئی بڑی پراثر ہوتی۔ جو کہتے وہ خود بھی کرتے اور بڑی خودداری کے ساتھ کرکھاتے۔ اور اصول اور انصاف کی خاطر ہر مصیبت برداشت کرلیتے۔

اردو اور فارسی پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ انگریزی اور ہندی سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے بیشتر کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں لکھا جاسکتا ہے۔ اپنا کلام تحت اللفظ میں پڑھتے۔ آواز میں رعب، لہجے میں شوکت اور دبدبہ۔ سلام ہو کہ قطعہ، رباعی ہو کہ غزل، انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ پڑھتے اور مجمع پر چھا جاتے حضرت نجم کو پسند نہ تھا کہ ترنم سے شعر کی قدروقیمت میں اضافہ کیا جائے ان کی نظر میں عمدہ شعر تو وہ ہے جو بیان پر ہلا بولنے کے اور آنکھوں کی راہ دل میں اتر جائے۔ اپنی تاثیر کے لیے صوت وساز کا محتاج نہ ہو۔

قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے کہ مرزا محمد ہادی کے بزرگوں میں کون کس زمانے میں ترک وطن کرکے وسط ایشیا سے ہندوستان آئے۔ قیاس یہ ہے کہ فتنۂ تاتار نے ان کے آباواجداد کو بھی ایسے گزرگاہ میں یہاں بودوباش اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مرزا محمد ہادی کے تین لڑکے تھے۔ مرزا جعفر علی فصیح، مرزا محمد علی بلیغ اور مرزا اشرف علی صبیح۔

فصیح کا آخر زمانہ لکھنؤ میں امجد علی شاہ کا عہد ہے جن کے ہاں فصیح کو رسائی حاصل تھی لیکن ان کی تخت نشینی یعنی ۱۲۶۷ھ سے قبل ہی وہ بہ عزم حج و زیارت لکھنؤ سے بمبئی روانہ ہو چکے تھے۔ امجد علی شاہ نے منصب وزارت کی پیشکش کے ساتھ انہیں واپس بلا بھیجا تو فصیح کا جواب کمالِ فصاحت کا آئینہ دار ہے کہلا بھیجا "دو میں ایک ایسے بادشاہ کے پاس جا رہا ہوں جس کے آگے آپ بھی سر جھکاتے ہیں۔ میری واپسی کسی صورت میں بھی ممکن نہیں البتہ میں آپ کے لئے دعا کروں گا"۔ امجد علی شاہ نے وافر رقم بھجوائی جس سے میرزا فصیح نے حرم شریف کے قریب محلہ قرارہ دکرارہ، میں ایک دو منزلہ مکان بنوا کے اس کو زائرین حج کے قیام کے لئے وقف کر دیا۔ یہ عمارت شہر مکہ کی توسیع و آرائش کے سبب باقی نہ رہی۔ مکہ معظمہ میں ان کی خدمات کے صلے میں سلطنت ترکی نے مرزا جعفر علی فصیح کو افندی کا خطاب عطا کیا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ اس خاندان میں مستعمل ہے۔

مرزا فصیح نامی گرامی شاعر تھے۔ مرثیہ و سلام ان کا خاص میدان تھا۔ مورخین ادب محمد حسین آزاد اور رام بابو سکسینہ نے ان کو ناسخ اور دلگیر دونوں کا شاگرد بتایا ہے اور نجم صاحب نے غزل میں ناسخ سے ان کے تلمذ کی تصدیق کی ہے۔ فصیح کے سلام اور مرثیے لکھنؤ اور حیدرآباد کی مجلسوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ فصیح کی ہجرت کے بعد ضمیر (دبیر کے استاد) اور اور خلیق (انیس کے والد اور استاد) کا میدان مرثیہ گوئی رہ گیا تھا۔

مرزا فصیح لاولد تھے اور اپنے چھوٹے بھائی نجف علی بلیغ کے بیٹے مرزا عباس ملیح کو بہت چاہتے تھے۔ ملیح کے بیٹے مرزا عاشق حسین بزم آفندی اپنی ننھیال آگرہ میں پیدا ہوئے۔ نجم صاحب نے قرآن اور اردو فارسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور شاعری میں اپنے والد کی شاگردی اختیار کی۔ نجم کے نانا آغا حسین آغا خود بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کے بھائی آغا حاجی حسن کے نام سے آج بھی کٹرہ حاجی حسن آگرہ میں مشہور مقام ہے۔

مفید عام اسکول میں مروجہ تعلیم پائی اور مڈل کا امتحان کامیاب کیا۔ ان کے اساتذہ میں مولوی سلامت اللہ اردو فارسی کے جید عالم شمار کئے جاتے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر راجکمار صاحب تھے جن میں آزادیٔ وطن کی لگن تھی۔ چھٹی جماعت کے دو طالب علم تجمل حسین (نجم افندی) اور امبیکا پرشاد کا جھگڑا جب راجکمار صاحب کے پاس پیش ہوا تو انھوں نے دو ٹوک فیصلہ دیا۔ "آپس میں لڑنے کی بجائے تم دونوں مل کر تیسرے کو کیوں نہیں مارتے"۔ ذہین اور نکتہ شناس تجمل حسین کے دل پر اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب کی بات نقش ہو گئی۔ چھٹی کا یہ سبق نجم افندی کی پوری زندگی میں مشعلِ راہ بن گیا۔ ہندو مسلم اتحاد وطن دوستی، حصولِ آزادی، بدیشی حکومت سے بیزاری۔ سیاسی اور سماجی مساوات اخوت پاکیزہ کردار اور انسانیت نجم افندی کا نصب العین قرار پائے۔ جب نجم صاحب کی سوانح اور شاعری پر ریسرچ ہوگا اور حیات کی تفصیل قلم بند ہوگی تو معلوم ہوگا یہ واقعہ تجمل حسین نجم افندی کی زندگی میں نقطۂ انقلاب بن گیا۔ واقعات سے ثابت کیا جاسکے گا کہ ان کے دل و دماغ کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے والا، محدوش اوصاف اور کردار کو جلا دینے والا، اخلاق کو آفاقیت عطا کرنے والا۔ مختصر یہ کہ تجمل حسین کو بیباک محب وطن اور خوددار علامہ نجم افندی بنانے والا یہی چھٹی کا سبق ہے۔

نوجوان نجم کے انقلاب پسند ذہن کا اولین اقدام یہ تھا کہ انھوں نے اپنے ہم جماعت طالب علموں کی ایک انجمن بنائی جس کے بنیادی مقاصد، سامراجی حکومت سے بیزاری، انگریز معاشرت سے کنارہ کشی اور حصول آزادی تھے۔ اراکین کی علامت

شناخت ایک خاص قسم کی انگوٹھی تھی۔ نجم صاحب کے ایک رشتے کے بھائی بھی اس کے رکن (ممبر) تھے۔ انہیں پولیس میں ملازمت ملی تو اپنی کارگزاری اور ترقی کے لئے پہلا وار اسی انجمن پر کیا اور چھوٹی سی دنیائے نجم میں عقرب ثابت ہوئے۔

۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۵ء تک نجم صاحب نے محکمہ ریلوے دہلی میں بحیثیت کلرک ملازمت کی۔ ریلوے آفیسر سٹر نیومین نے نجم کی کھدر پوشی پر اعتراض کیا۔ آزادی کے متوالے نجم کہاں چپ رہنے والے، ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ انگریز آفیسر ایک ہندوستانی کی یہ جرأت کیسے برداشت کرتا۔ آسنسول پر تبادلہ کر دیا۔ نجم صاحب نے ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

۱۹۲۶ء میں بمقام آگرہ کے ایک مسلم قبرستان کی زمین خریدی اور وقف کے سلسلے میں، شیعہ کانفرنس کے سکریٹری سید کلب عباس کے ساتھ حیدرآباد آئے۔ نجم کے لئے حیدرآباد نیا نہ تھا کیونکہ ان کے والد کی یہاں اکثر آمد و رفت تھی اور ان کے دوستوں میں حیدرآباد کے کئی امیر و رئیس تھے۔ جونیر پرنس معظم جاہ بہادر شجیع کے ہاں نجم صاحب کا تذکرہ ہوا اور شہید یار جنگ اور حکیم محمد عباس امین شہزادہ شجیع کے دربار میں لے گئے۔ نجم صاحب نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا۔ ؎

کعبہ و دیر سے پیام آئے تیری جانب جو چند گام آئے

مقطع نجم صاحب کے حسب حال ہے ؎

نجم صاحب کو راستہ و نیا مذہب عشق کے امام آئے

نجم صاحب کو اصرار سے روک لیا گیا اور فانی بدایونی کے ساتھ دربار کی حاضری شروع ہوئی۔ شہزادہ شجیع نے اپنا کلام دکھانا شروع کیا اور استادی کا شرف بخشا۔

۱۹۴۸ء کے بعد حیدرآباد) تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ یہاں کی بساط شعر و ادب بھی الٹ گئی۔ نجم صاحب بڑے شاعر ہیں۔ رباعی کے چار مصرعوں میں کائنات سیاست سمیٹ لی ؎

ہر سمت نظر میں جوئے خوں آتی ہے سرگشتہ جستجو سے خوں آتی ہے
تہذیب و زباں تجارت و قوم و وطن ان لفظوں سے آج بوئے خوں آتی ہے
جیتے رہے نجم پچیس برس ڈوبے رہے غم میں ابھرنے کے لئے

ایک آئین حیات وضع کرنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک قابل رشک موت مرنے کے لئے۔ افسوس کہ اس شہر محبت (حیدرآباد) میں نجم کا مدفن نہ بنا۔ اپنی بیٹیوں اور عزیزوں کے اصرار پر پاکستان گئے۔ وہ نہیں گئے۔ بلکہ اجل انہیں لے گئی اور ۱۷ر ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ م ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۵ء سوا نو بجے دن بمقام کراچی روحی فداک کہہ کے دم توڑ دیا۔ یاد نجم میں حضرت قدر عریضی نے دوستی اور قدر دانی کا حق ادا کر دیا۔ اور ایک رباعی لکھی ؎

تھے عاشق چہرۂ درخشان حسین تھا دل میں نہ کچھ بھی بجز ارمان حسین
دنیا میں نہ صنعیہ ہو سکا نجم سے جب فردوس بگئے ہونے کو قربان حسین

حسب اقتضائے قدامت پرستی جس کا ایک نام قدر دانی بعد موت بھی ہو سکتا ہے، ہندوستان اور پاکستان کے کئی شہروں میں علامہ نجم کے احباب، شاگردوں اور قدر دانوں نے جلسے منعقد کئے۔ تقلیں برپا کیں اور نثر اور نظم

میں خراج تحسین ادا کیا۔

علامہ نجم آفندی کی اولاد میں ایک فرزند مرزا مسعود الحسن سہیل آفندی ہیں جو خود بھی اچھے شاعر ہیں اور پچاس برس نصف صدی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی نجم صاحب نے اردو شعر و ادب کی خدمت کی اپنے گراں قدر ادبی مشوروں اور اصلاح شعر و سخن سے قریب قریب دو نسلوں کو فیض پہنچایا۔

شاگردوں کی تعداد سوؤں میں ہے۔ نامور تلامذہ میں معظم جاہ شجیع، ہاشم جاہ، سعید شہیدی، خاور نوری، سعادت نظیر، خورشید جنیدی، شاہد حیدری، عادل نجمی، قائم جعفری، علی ظفرت، عباس عابدی، ساجد رضوی، کاوش حیدرآبادی، راحت عزمی، رعنا اکبرآبادی، صادق نقوی، تبسم نظامی، فلیس صابر، ذاکر آبادی، مائم دہلوی، نظر سیوہاروی، بانو سیدپوری ہیں۔ ان کے مداحوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح علامہ نجم آفندی کو بھی یہ احساس رہا کہ زندگی میں نہ سہی لیکن ان کی موت کے بعد ان کے افکار و اشعار کی روز افزوں قدر افزائی ہوگی۔

؎ میری تلاش راہ پہ ہنستے ہیں آج قافلے شمع بنائی جائے گی کل مری گرد راہ کی (نجم)

○

نتائج امتحانات (ادارہ صفحہ ۲۸ سے آگے)

مرکز نارائن پیٹ: اُردو عالم: ۴۳۔ ڈاکٹر محمد عبدالجبار صدیقی ۴۴۔ ڈاکٹر محمد عبدالمجید صدیقی سوم: ۴۲۔ ڈاکٹر محمد عبدالرحیم صدیقی۔
۴۵۔ عثمان عبداللہ صدیقی ۴۶۔ محمد اسمٰعیل اردو زبان دانی: درجہ سوم ۴۸۔ عبدالسلام ۵۰۔ عبدالرزاق ۵۱۔ شرف الدین ۵۴۔ جاوید احمد
۵۵ محمد غوث ۵۶۔ عبدالرشید ۵۷۔ اسلم نور خاں ۶۱۔ محمد ایوب حسین اُردو دانی کامیاب بہ امتیاز ۶۷ خلیل احمد۔
کامیاب: ۶۸۔ تاج الدین ۶۹۔ عبدالرؤف۔

مرکز ادونی: اُردو زبان دانی: درجہ دوم ۱۔ خطیب محمد اسلم ہاشمی ۷۔ سیدہ ادیبہ فرحت ۱۲۔ ایس شاہین بیگم، درجہ سوم ۲۔ محمد عبدالحلیم صدیقی
۳۔ پی اسلم پاشا ۴۔ طبیب جلال نورالحق ۵۔ یم ریاض احمد ۸۔ آمنہ بی ۹۔ پی زرینہ بانو ۱۰۔ کے شاہدہ بیگم ۱۱۔ جی مہربانو ۱۲۔ خطیب خیرالنساء
اُردو دانی: کامیاب ۲۔ سی نثار احمد ۳۔ بھالتی محمد ایوب ۴۔ کے عبدالرؤف ۵۔ ٹی اصغر علی ۶۔ قاضی محمد عبدالغفور ۷۔ میستری
محمد ایوب ۸۔ فیض محمد خاں شکیل ۹۔ میر محمد فاروق ۱۰۔ کے شاکرہ بیگم ۱۱۔ کے محمودہ بیگم ۱۲۔ ایس سعیدہ بانو ۱۳۔ یم اختر بیگم ۱۴۔ ین رقیہ بانو۔
۱۵۔ آر۔ راشدہ بیگم ۱۶۔ رخسانہ بانو ۱۷۔ ایم ریحانہ بیگم ۱۸۔ رحیم النساء بیگم ۱۹۔ ین آمنہ بی۔

مرکز ابراہیم باڑی: اُردو زبان دانی درجہ دوم ۳۷۔ یم سہیل احمد درجہ سوم ۳۱۔ یم نوشاد ۳۳۔ پی آر حسین احمد ۳۴۔ کے عبداللہ پاشا
۳۵۔ سید شفیق احمد ۳۸۔ اے محمد خلیل اللہ ۳۹۔ وی شبیر احمد ۴۰۔ یس ٹی محمد شفیق ۴۱۔ کے محمد ذاکر حسین ۴۴۔ میر طاہر علی۔
۶۴۔ ایچ کمال الدین اُردو دانی: کامیاب بہ امتیاز ۴۳۔ ین شفیق احمد ۴۴۔ سی محمد اسمٰعیل [illegible]۔ امتیاز احمد سلیم۔
۴۶۔ یل ایم حفیظ الرحمٰن ۴۷۔ پی محمد عاقل ۵۶۔ کاکا ارشاد احمد ۴۷۔ ایم نصیر الدین ۷۶۔ پی محمد یونس ۷۷۔ ایس خالد احمد
۷۸۔ ولی ارشاد احمد۔ کامیاب: ۴۱۔ جی نصراللہ ۵۰۔ ایچ کلیم اللہ [illegible]۔ پی اے نصراللہ۔

(محمد اکبر الدین صدیقی، معتمد اعزازی)

غلام جیلانی

آغا حیدر حسن مرزا دہلوی ـ چند یادیں

سنہ ۱۹۳۵ء کی بات ہے جب میں نے نظام کالج میں داخلہ لیا تھا اور مجھ کو آغا حیدر کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا جب پہلے دن جماعت میں داخل ہوا تو آغا حیدر کو کرسی پر براجمان پایا۔ جامہ دار کی شیروانی جس میں جڑاؤ گنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ سر پر بارن کی عجیب سی ٹوپی' سلک کا چوڑی دار پائجامہ' زر دار سلیم شاہی جوتی۔ شیروانی کا رنگ سبز اور اس پر سُرخ پھول آستین سے قمیض کے کف جھانکتے ہوئے' قمیض کا رنگ شوخ گلابی اور یاقوتی رنگ کی ریشمی دستی آستین سے جھانکتی ہوئی۔ گو یہ سب چیزیں محوِ حیرت کرنے کے لئے کم نہ تھیں' کہ ان کی استقبالی باتیں سننی پڑیں زبان سے تو نہیں دل ہی دل میں یا مظہر العجائب کا ورد کرتے ہوئے اپنی نشست سنبھالی۔ آغا حیدر نے مسلماً کسی کا نام پوچھا' نہ کوئی پھبتی کسی اور کسی سے اپنی پہلے سے واقفیت کا اظہار کیا اور کوئی چلتا ہوا جملہ کہہ دیا۔ ہماری جماعت میں ۳۸ طلباء اور ۲ طالبات تھیں۔ طالبات بھی ان کے فقلی جملوں سے بچ نہ سکیں۔

دن گذرتے گئے تو پتہ چلا کہ یہ صورتحال روز کا معمول رہے گی اگر کوئی لڑکا دیر سے آتا تو کہہ اٹھتے "آئیے آئیے ہماری آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترستی ہیں اور تم پتہ نہیں کس گلی میں پھنس جاتے ہو۔ اسی طرح اگر کوئی لڑکی دیر سے آتی تو بڑی نرمی سے کہتے "آؤ بی بی بیٹھو' شرماؤ نہیں "پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے"

ان باتوں سے ڈر کر وقت کی پابندی ہر ایک کا شعار بن جاتی۔

رفتہ رفتہ واقفیت بڑھی' بے تکلفی کے مظاہرے ہونے لگے۔ کالج کے پروگرام کے لحاظ سے ایک گھنٹہ پڑھنے پڑھانے کے لئے ہوتا لیکن آغا حیدر کی جماعت میں پڑھنا پڑھانا کم اور باتیں زیادہ ہوا کرتیں اور بعض وقت تو پورا گھنٹہ صرف باتوں میں گزر جاتا۔ باتیں ایسی کہ اس محفل سے نکلنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ دو چار ماہ اس طور پر گزرے تھے کہ کالج میں انجمن بازی شروع ہوئی اور اسی سلسلے کی ایک کڑی بزمِ اردو تھی۔ سنہ ۱۹۲۱ء تا سنہ ۱۹۲۴ء نظام کالج سے ایک اردو میگزین نکلا کرتا تھا۔ ارباب اقتدار نے اپنی بے تعصبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے امداد بند کر دی اور نتیجتاً پرچہ بھی بند ہو گیا۔ سنہ ۱۹۳۵ء کی بزم اردو نے طے کیا کہ قدیم طلباء کے دو کمکشاں اور بلا امداد پھر سے پرچہ نکالیں۔ آغا حیدر کی سرپرستی میں مجلس ادارت بنی اور اسی سلسلے میں ان سے زیادہ قریب ہو جانے کا موقع ملا۔ کلاس کی ملاقات کے علاوہ کالج اور خود ان کے مکان پر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ ان کا مکان کیا تھا' ایک عجائب خانہ جو مغل دور کے نوادرات سے پُر بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ کسی مغلیہ شہزادے کے محل کا ایک حصہ تھا جو جوبلی ہلز پر منتقل کر دیا گیا تھا۔ ان ملاقاتوں میں اُستاد شاگرد کے مراتب باقی رہتے ہوئے بھی تکلف برخواست ہو جاتا اور پُر لطف باتیں ہوتیں۔ آج جبکہ آغا حیدر خود ان کی زبان میں "اللہ کو پیارے ہو گئے"

ان ملاقاتوں کی یاد رنج و مسرت کی ملی جلی کیفیت پیش کر رہی ہے۔

مجلس ادارت کا ابتدائی جلسہ تھا۔ پرچہ ماہواری، سہ ماہی یا ششماہی ہونا چاہیئے غور ہو رہا تھا۔ آغا حیدر بڑی بے تکلفی سے کہہ گئے "میاں شنو! ماہواری کی بات چھوڑ دو۔ اس پر لڑکیوں کا حق ہے، وہ ناراض ہو جائیں گی" بات پلّے نہ پڑی اور ہم ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ آغا صاحب ہماری کم مائیگی سے لطف اٹھاتے ہوئے کہنے لگے "چھوڑو بھی ہر ماہ کی تکلیف برداشت کرنا تم لوگوں کے بس کا روگ نہیں"۔ خاتون رکن مجلس ادارت کو شرماتے دیکھا بات سمجھ میں آئی لیکن اسی وقت آغا صاحب نے بات کا رُخ بدلا اور کہا۔ پڑھائی اور امتحانات کے ساتھ یہ کام کرنا پڑتا ہے بہتر ہے کہ ابتداء ششماہی سے کرو۔ اگر چل جائے تو آئندہ اُسے سہ ماہی بنا سکتے ہیں۔ یہ بات چیت طے پائی تو پھر مسئلہ اٹھا کہ چندہ سالانہ کیا رکھا جائے۔ بحث کے بعد طے پایا کہ چار روپیہ سالانہ چندہ رہے گا۔ اس بحث کے دوران خاتون رکن خاموش رہیں۔ آغا حیدر بخشنے والی ہستی نہ تھی کہہ اُٹھے "کہو بی بی۔ چار روپیہ پر آپ رضامند ہیں" آغا حیدر کا سوال کچھ اور تھا لیکن پوچھنے کا انداز ایسا تھا کہ ہم لوگ ہنسی پر قابو نہ پاسکے۔

آغا حیدر سے واقفیت ہونے کے بعد ہمیں ان کے مضامین کا مجموعہ "پس پردہ" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ آغا حیدر اپنی طرز تحریر کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد ہم نے آغا صاحب سے دریافت کیا کہ اس کو چھپے ہوئے عرصہ ہوا اس کے بعد کی تحریرات کہاں ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ میاں یہ اس وقت کی بات ہے جب آتش جوان تھا۔ اب لکھنا لکھانا کس سے ہوتا ہے۔ ہم لوگ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور ہم نے طے کر لیا کہ ہر شمارہ میں ان کا ایک مضمون شامل ہونا چاہیئے۔ پہلے شمارہ کے لئے جب اصرار کیا تو بہت ہی ٹال مٹول کے بعد اس پر راضی ہوئے کہ ہم میں سے کوئی ایک صبح کالج سے پہلے ان کے گھر آئیں اور وہ لکھوا دیں گے اور ہم لکھ لیں۔ خوش فہمی سے یہ فریضہ راقم الحروف کے سپرد ہوا۔ میں روزانہ چکر لگا لیتا لیکن مضمون آگے بڑھتا نظر نہ آتا۔ کسی دن آدھا صفحہ، کسی دن صرف چند سطور اور کسی دن خالی ہاتھ لوٹنا پڑتا۔ میں جس وقت یعنی ساڑھے آٹھ یا پونے نو کے قریب ان کے ہاں پہونچتا تو انھیں ناشتہ سے فارغ، حقہ یا سگریٹ سے شوق کرتے پاتا۔ میرے پہونچنے پر چائے آتی اور بات چیت ہوتی۔ موڈ آیا تو سلسلہ کے لئے اگلا لکھا ہوا حصہ پڑھوا کر سُنتے اور کچھ لکھوا دیتے لیکن اکثر بات دوسرے دن پر ٹل جاتی اور گپ شپ کے بعد کالج روانہ ہو جاتے۔ انھیں کالج وقت پر پہونچنے کی ہمیشہ دُھن رہتی۔

ایک صبح جب پہونچا تو دیکھا کہ آغا حیدر ابھی ناشتہ کی میز ہی پر ہیں۔ ناشتہ شروع نہیں ہوا تھا۔ وجہ دریافت کی تو کہا۔ میاں بیگم کی مرضی، غسل ہو رہا ہے۔ وہ آجائیں تو ناشتہ ہوگا اتنے میں بیگم صاحبہ تشریف لائیں طویل بیماری کی وجہ سے ہمیشہ نڈھال نظر آتی تھیں لیکن اس صبح کسی قدر بحال تھیں اور میرا سلام قبول کرتے ہوئے کہہ اٹھیں۔ اچھا ہوا تم موجود ہو۔ شکور کل رات سے ایک مصرعہ سنا رہا ہے۔ دوسرا مصرعہ یاد نہیں آ رہا ہے۔ میں نے کہا۔ فرمایئے، اگر مجھے یاد ہے تو سنا دونگا۔ مصرعہ یہ تھا۔

سحر ہوگئی داستاں کہتے کہتے

بہتیرا دماغ پر بار دیا نہ دوسرا مصرعہ یاد آیا نہ شاعر کا نام۔ اس دوران ناشتہ ہوتا رہا۔ میں نے عرض کیا کہ ایک مصرعہ مجھ میں آرہا ہے شاید اسی شعر کا ہو اور شعر سناتے وقت شرارت سوجھی اور میں نے آغا صاحب کی طرف اشارہ کر دیا شعر یوں تھا۔

نہ آیا سمجھ میں نہ آئے گا اُن کی　　سحر ہوگئی داستاں کہتے کہتے

بیگم صاحبہ ہنس پڑیں اور آغا صاحب نے سنترہ کی قاشیں جو ہاتھ میں تھیں میرے منہ پر دے مارا اور کہا "دوستو! ہمارا بھی کچھ تو ہم سے فرق ٹھوں"۔

ایک مرتبہ آغا صاحب کے ساتھ نواب سالار جنگ کے ہاں جانے کا موقع ہوا۔ آغا صاحب کے نواب صاحب سے خاص مراسم تھے۔ بے تکلف مذاق ہوا کرتا۔ ہمارے جانے کا مقصد میگزین کے لئے مالی امداد حاصل کرنا تھا۔ نواب صاحب حسب عادت ٹہلتے رہے۔ کبھی کسی سے بات کرتے اور کبھی کسی سے۔ ایک فرانسیسی سیاح آیا ہوا تھا۔ نوادرات کے معائنہ کا انتظام بھی ساتھ ساتھ ہوتا رہا۔ اسی دوران ہم لوگوں کی کافی سے تواضع ہوئی۔ خالص فرنچ کافی۔ خوبصورت چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں۔ کافی بے حد لذیذ تھی لیکن مقدار اس قدر کم تھی کہ ایک ہی گھونٹ میں پیالی ختم ہوگئی۔ ہمارا ساتھی توتی مرحوم جو شاعر تھا۔ آغا صاحب سے مخاطب ہوا ؎

اس قدر تھی لذیذ یہ کافی ایک پیالی نہیں ہوئی کافی

انھوں نے نواب صاحب کو مخاطب کر کے یہ شعر سنا دیا۔ نواب صاحب بے حد خوش ہوئے اور اس کی سزا ہم سب کو بھگتنی پڑی ایک بھرا پاٹ کافی آئی اور ہر ایک کو تین تین پیالیاں ڈھونی پڑیں لیکن اس لطیفے کی وجہ ہمیں اپنے مقصد میں توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔

آغا صاحب نے آخری زمانہ زیادہ تر فرانس، جرمنی میں گذارا کبھی کبھی حیدرآباد آجاتے۔ ان سے آخری ملاقات تین چار سال قبل ایک تقریب شادی میں ہوئی قریب جاکر سلام کیا تو بڑی محبت سے ملے لیکن اندازہ ہوا کہ پہچان نہ سکے جب یاد دلایا تو بات بنا گئے اور کہنے لگے "ایسے میں اور تجھ کو بھول سکتا ہوں" پھر بہت دیر تک بات چیت ہوتی رہی۔ شادی کی محفل میں کیا کچھ ہوا اس سے غافل آغا صاحب کی پُر لطف باتیں سنتا رہا۔ ■■

اب جلسے کی جان مسز سروجنی نیڈو کی بابت سنو۔ ٹھمکا ٹھمکا، بوٹا سا قد، گول گول گدرایا ہوا ڈیل۔ کھلتی ہوئی چمپئی رنگت، کتابی چہرہ، کھڑا کھڑا نقشہ، چہرے سے متانت اور سنجیدگی ہویدا ہے مگر ساتھ ہی اس کے خوش خلق اور ہنس مکھ بھی ضرور ہیں خوب گہری گہری، کالی کالی، جٹی بھویں۔ جٹ کے اوپر چھوٹا سا خوب گہرا سرخ کسوم کا ٹیکہ، بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، کچھ جھکی جھکی سی۔۔۔ پتلیاں خوب سیاہ اور بڑی بڑی جس کی چاروں طرف بڑے بڑے مڑے ہوئے سیاہ گنجان پلکوں کا جنگلہ ہے جس میں یہ وحشی ہر وقت رم کرتے رہتے ہیں۔ بھلا کہیں اس جنگلے سے یہ کالے شیرازی کبوتر رکتے ہیں۔ آنکھیں کیا بتاؤں۔ موتی کوٹ کوٹ کر بھر دیے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ان سے حجاب و شرم و حیا اور عصمت و عفت بڑی برستی ہے۔ بال بڑے گھن دار کالے بھونرا سے ہیں۔ اور انگریزی موجودہ طرز کے موافق کنپٹیوں پر جھکا کر اور کانوں پر سے لے جا کر پیچھے جوڑے کی صورت میں لپیٹ دے کر کالی کنگھیاں لگائی گئی تھیں جن میں ہیرے کی طرح چمکتے ہوئے سفید نگ جڑے ہوئے تھے جو مہین بنارسی ساڑی کے اندر سے پٹ بیجنوں کی طرح جھم جھم کر رہے تھے۔ بالوں کی وضع تھی تو انگریزی، مگر ہماری محمد شاہی بیبیوں اور ساری بیریوں سے کچھ کچھ ملتی جلتی ہے۔ بائیں رخسارے پر ذرا کچھ اوپر ہٹ کر ایک ننھا سا ہلکے سیاہ رنگ کا تل ہے کہ جب ہنستے وقت گال اوپر کی طرف بڑی خوبصورتی سے تلاطم پیدا کرتے ہوئے چڑھتے ہیں تو شامت زدہ آنکھوں میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس وقت سروجنی نیڈو بول رہی تھیں۔۔۔ سارے لوگوں پر وہ سناٹا جیسے اُلّو چھپکے اور سارے پرند چپکے ہو کر بیٹھ رہیں۔

(آغا حیدر حسن، پس پردہ سے)

بادۂ کہن

ترک علی شاہ ترکیؔ، قصبۂ نورمحل لاہور کے رہنے والے تھے۔ مہاراجہ کشمیر نے انھیں "ملک الشعراء" کا خطاب دیا تھا۔
مولف "تزکِ محبوبیہ" (غلام صمدانی گوہر) نے لکھا ہے کہ ترکیؔ (۱۳۱۹ھ م ۱۹۰۲ء) میں میر محبوب علی خاں آصف سادس کے عہد میں حیدرآباد آئے، وقار الامراء کے دربار سے متوسل ہوئے۔ تئو روپے ماہانہ منصب پاتے رہے۔ بعد کو بقول ڈاکٹر زورؔ، وہ مہاراجہ سرکشن پرشاد کے لیے گہرے رفیق اور صاحبِ شفیق تھے کہ آخر وقت تک ان کی ادبی محفلوں میں ناقد اور محتسب کے فرائض انجام دیتے رہے
ترکیؔ اردو اور فارسی کے قادر الکلام سخنور تھے۔ انہوں نے رامائن کا فارسی مثنوی میں ترجمہ کیا جو "فرخ نامہ" کے نام سے شائع ہوا۔ "گلشنِ معنی" اور "سرمایۂ پیری" دو دیوان اور ایک تذکرہ "مردم دیدہ" شائع ہو چکا ہے۔ لالہ سری رام صاحب "خمخانۂ جاوید" نے ان کے کلام کی شوخی، طرح داری اور جدت کو قابلِ قدر جوہر قرار دیا ہے۔ —— (ادارہ)

روضۂ خلد سے نکلے نہ تھے آدم ایسے ، جس طرح کوچۂ جاناں سے میں باہر نکلا
مثلِ شاہیں کے اڑا میں بھی پیچھے پیچھے ، لے کے خط گھر سے مرے جب کبوتر نکلا
ہوا کرتا ہے چرچا جابجا فصلِ بہاراں میں ، مرے کانٹوں کے بستر کا ترے پھولوں کے زیور کا
عہدِ پیری میں جو دیکھا اک جواں کا بانکپن ، نوجوانی کا ہمیں بھی بانکپن یاد آ گیا
عقبیٰ کا کروں ذکر میں کیا سامنے اس کے ، سنتا نہیں زردار جو افسانۂ دنیا
ہنگامِ مصیبت نہیں دیتا ہے کوئی ساتھ ، ہمراہ شبِ تار میں سایہ نہیں جاتا
میں گلشنِ نامنج کا ہوں ترکیؔ گلِ رنگیں ، ہر اک سے مرا رنگ اڑایا نہیں جاتا
بگڑے ہوئے طالع کو بنایا نہیں جاتا ، تقدیر کے لکھے کو مٹایا نہیں جاتا
افسوس عیادت کو مری آئے وہ اس دم ، تسلیم کو جب سر بھی جھکایا نہیں جاتا
مری وحشت کا بھی ذکر اس جگہ کچھ آ ہی جاتا ہے ، ہوا کرتا ہے جب محفل میں حسنِ یار کا چرچا
صفِ محشر میں بھی ہونے لگا اب ہائے یہی قیامت ، ہماری پائمالی اور تری رفتار کا چرچا
نہ آؤ میری محفل میں اگر ہمراہ دشمن ہو ، کہ مجھ سے آستیں میں سانپ یہ پالا نہیں جاتا
دمِ پیری بھلا دل سے ترے مد افسوس لے نکلا ، خیالِ عارضِ دوشیزۂ دنیا نہیں جاتا
نہیں مسلم کو شایاں جان کر انجان ہو جانا ، بہت ہوتا ہے پاس اسلام میں صاحب سلامت کا
لقب ہے اس کا ہرجائی نہیں ٹکتی یہ اک گھر میں ، نہ کرنا اعتبار اے اہلِ دول بانوئے دولت کا
کہہ جاتے ہیں اغیار مجھے بزم میں سب کچھ ، ہے خاطرِ دلدار کہ میں کچھ نہیں کہتا

ترکی میں بہت ڈرتا ہوں اس بندے سے دلمیں
جو وقتِ غضب خوف خدا کا نہیں کرتا

یوں ملے آشنا بہت لیکن
جس کو کہتے ہیں آشنا نہ ملا

کیا غضب ہے کہ اس زمانہ میں
کوئی بھی یارِ باوفا نہ ملا

غیر کی کرتے خوشامد جو تری محفل میں
جام کیا پھر تو ہم بادۂ گلگوں ملتا

تری یاد میرا وظیفہ ہوئی
ترا ذکر میرا سبق ہو گیا

قصہ اپنا کبھی کہتے کبھی سنتے اس کا
کسی صحرا میں جو پھرتا ہوا مجنوں ملتا

مجھ سے کہنے لگے کہ محفل میں
خیر گذری کہ شب کو تُو نہ ہوا

دولت کا چمن رنگ بدلنے نہیں دیتا
ایام جوانی کو یہ ڈھلنے نہیں دیتا

ڈھائی تری رفتار نے محشر میں قیامت
قامت نے کیا عالم بالا تہ و بالا

کیا عجب ہوں موے سر اول محاسن سے سفید
صحن سے پہلے ہی اکثر بام پر آتی ہے دھوپ

مارا ہے مجکو افعیٔ زلفِ تلنگ نے
کیا زہردار ہوتا ہے ملکِ دکن کا سانپ

دو چیز کی دے سکتا نہیں کوئی جہاں میں
بوسہ کی ترے اور مرے اشعار کی قیمت

ہم کرتے ہیں دونوں کی دعا وقتِ سحر سے
دیکھیں کہ وہ آتے ہیں کہ آتی ہے قضا آج

یہ جاں نثار شادؔ ہے ترکیؔ ہے اس کا نام
لکھنا یہ دوستو مری لوحِ مزار پر

ترکیؔ فنِ سخن میں ہمارا ہے اعتقاد
ناسخؔ پہ اور امیرؔ پہ داغؔ اور نثارؔ پر

مایۂ عمر لٹا کر ہوں میں نادم ایسا
نا سزا جیسے پسر باپ کا پیسا کھو کر

ہے تندرستیم کی خواہش نہ ہوس جینے کی
ہم سے الجھے گی بھلا قحبۂ دنیا کیوں کر

میں چبھو دوں گا ترے ہاتھ میں کانٹے ساقی
اس گل اندام کا محفل میں نہ رخسار مروڑ

پینسٹھ برس کی عمر میں آئے دکن کو ہم
حاصل ہوا نہ جب کسی شیخِ وطن سے فیض

میرے مدت سے ہیں کرم فرما
میرزا داغؔ اور جلیلؔ و لطیفؔ

ہم نے کیا ہے غالبؔ و مومنؔ کے شعر سے
اپنی غزل کا حسن سے دو چند رنگ ڈھنگ

لکھوں اعدا کی شکایت یہ مجھے تاب نہیں
حیدرآباد ہے یہ خطۂ پنجاب نہیں

تُو دیکھتا ہے غیر کو اور تیرے سامنے
ہم حور کو بھی تیری قسم دیکھتے نہیں

مصیبت کے دن بھی گذر جائیں گے
گئے ہیں گذر جیسے عشرت کے دن

پڑھ لیجئے کچھ خط مقدر تو نہیں ہے
دو حرف کا مکتوب ہے دفتر تو نہیں ہے

جو ملکِ دل آ جاتا ہے قبضہ میں جنوں کے
اس ملک میں پھر عقل کی شاہی نہیں رہتی

رقیب جھوٹ نہ بول اس قدر خدا کے لئے
گیا تھا پیشِ مسیحا میں کب دوا کے لئے

الطاف حسین حالی

قسط مکرر

مزاح

مزاح جس کو غلطی سے مذاق کہنے لگے ہیں انسان کی ایک جبلی خاصیت ہے جو کم و بیش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔

مزاح کو عربی، فارسی اور اردو میں تین مختلف القاب دیئے گئے ہیں یعنی ۱۔ مطائبہ ۲۔ خوش فعلی ۳۔ خوش طبعی۔ یہ تینوں لقب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مزاح کا موضوع لہٗ "خوشی" کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ روزانہ محنت و مشقت جو ہر انسان کا فرض ہے اس کے بعد ہر شخص ایسے مشغلے ڈھونڈتا ہے جن میں تھوڑی دیر دل بہلے اور دن بھر کی کوفت رفع ہو۔ اور ایسے اوقات میں کوئی مشغلہ مزاح سے بہتر نہیں ہے۔

ہم اپنی زبان میں مزاح کا ترجمہ ہنسی، چہل، دل لگی، ٹھٹھول وغیرہ کرسکتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب ہماری زبان میں یہ الفاظ صرف مزاح کے مترادف نہیں رہے بلکہ لچپن، شہدپن، مسخرگی، فحش، دشنام، بے حیائی اور دھول دھپا جوتی پیزار بھی شامل ہیں۔

مزاح جب تک محفل کا دل خوش کرنے کے لئے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے لئے) کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا یا ایک سہانی خوشبو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہوجاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ و حکما بلکہ اولیا و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہوجاتے ہیں۔ اس جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے جب وہ حد سے بڑھنے لگتا ہے تو دمبدم ہولناک ہوتا جاتا ہے اور آخر کو اس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے خوشی کے غم پیدا ہوتا ہے۔ وہ اخلاق کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھن۔ مزاح کرنے والا ایسا بے دید ہوجاتا ہے کہ غیروں کو ہنسانے کے لئے اپنے عزیز دوست کا خاکہ اڑانے لگتا ہے۔ وہ ایسا بے باک ہوجاتا ہے کہ خدا اور رسول پر بھی اس کی ایک آدھ پھبتی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ وہ ایسا کذاب ہوجاتا ہے کہ بری خبریں جن کو سن کر خاص یا عام لوگوں کو رنج ہو نہایت خوشی سے اڑاتا ہے۔ وہ ایسا بے غیرت ہوجاتا ہے کہ اس کو سخت سے سخت گالی بھی ناگوار نہیں گذرتی۔ وہ ایسا مفسد ہوجاتا ہے کہ باتوں باتوں میں لڑائی کرا دینی اس کے نزدیک ایک کھیل اور معمولی بات ہوتی ہے۔ غرض تمام دنیا کے عیب مزاح کی زیادتی سے انسان میں پیدا ہوجاتے ہیں۔

مزاح کے بڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں مگر ہم یہاں وہ خاص سبب بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مزاح کسی خاص قوم میں

رفتہ رفتہ تمسخر اور استہزاء بلکہ فحش و دشنام کے درجہ کو پہنچ کر انسانی خصلت سے ایک قومی خصلت بن جاتا ہے اور اس قدر عام ہو جاتا ہے کہ اس کی بُرائی اور عیب نظروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ہنسی اور چہل میں جو امتیاز ہماری قوم کو حاصل ہے وہ تمام ہندوستان میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔

جتنے ضلع جگت بولنے والے اور پھبتیاں کہنے والے پیدا ہوتے ہیں اسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں۔

جتنی گالیاں ایک مسلمان شریف زادے کو یاد ہوتی ہیں کسی کو نہیں ہوتیں۔

تمام ہندوستان میں جتنے پنچ اخبار ہیں ان کے اڈیٹر، پروپرائٹر اور کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) اسی قوم کے زندہ دل ہیں۔

ہندوستانی امیروں اور امیرزادوں کی مجلس میں جتنے مسخرے رونقِ محفل پاؤ گے اسی قوم کے پاؤ گے۔

واعظوں میں جتنے لطیفہ گو اور بذلہ سنج دیکھو گے اسی قوم کے دیکھو گے۔

فحش اور بے حیائی کی کتابوں میں ایک بھی ایسی نہ ہوگی جس کا مصنف مسلمان نہ ہوگا۔

مناظرے کی کتابیں اسی قوم کے عالموں کی ایسی نکلیں گی جن میں ستم ظریفی کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہو۔

شاعروں میں کوئی ہاجی، ہزل گو، ریختی گو اور گندہ دہن ایسا نہ ہوگا جو قوم کا مسلمان نہ ہو۔

داستان کہنے والوں میں صرف ایک شخص ایسا سُنا گیا ہے جو اصل میں قوم کا مسلمان نہ تھا لیکن آخر اس کو بھی مسلمان ہونا پڑا۔

الغرض اس قوم کی فصاحت، ذہانت، اور فضیلت جس قدر مزاح میں صرف ہوتی ہے ویسی کسی اور کام میں نہیں ہوتی۔

یہاں نہایت تعجب کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمینہ خصلت اسی قوم کے حصے میں کیوں آئی؟ شاید اس کا یہ جواب دیا جائے کہ تنزل کے زمانے میں ہر ایک قوم کے فضائل رذائل کے ساتھ بدل جاتے ہیں اور تمام کمینہ خصلتیں اور سفلہ عاد تیں خاص و عام میں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ جواب ناکافی معلوم ہوتا ہے کیونکہ ابھی یہ بات غیر منفصل ہے کہ قومی تنزل اخلاق کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے۔ پس وہی سوال اب بھی باقی رہتا ہے۔

البتہ ایک اور جواب ہمارے خیال میں آتا ہے جو قابلِ غور ہے۔ ادنیٰ توجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاح کو جس قدر تعلق زبان اور الفاظ سے ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں۔ خاص خاص صورتوں کے سوا ہمیشہ ہنسی اور چہل الفاظ ہی کے پیرایے میں کیجاتی ہے۔

اس زمانے میں جب کہ انسان کی اخلاقی تعلیم طفولیت کی حالت میں تھی اور اس کی منہ زوری اور بدلگامی کا چنداں انسداد نہ ہوا تھا، ضرور ہے کہ مزاح اور ظرافت نے ان قوموں میں زیادہ رواج پایا ہوگا جن کی زبان میں اس کی زیادہ قابلیت تھی۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب کی زبان اس وقت کی تمام زبانوں کی نسبت اس بات کی زیادہ قابلیت رکھتی تھی۔ اس میں ایسے الفاظ کثرت سے تھے جو دو معنی رکھتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے مولےٰ کہ آقا اور غلام دونوں کو کہتے ہیں۔ اس میں ایسے الفاظ بھی بکثرت تھے جو بہت سے مختلف معنوں کے لئے وضع کئے گئے ہوں جیسے کہ آنکھ، چشمہ، ذات اور سونے کو کہتے ہیں۔ اس میں مترادف الفاظ بھی بے شمار تھے یعنی ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ مستعمل ہوتے تھے جیسے اسد، لیث، غضنفر وغیرہ۔ اس وقت عرب شاعری کا زور بھی اس قدر تھا کہ دنیا کی کسی زبان میں نہ تھا اور اس سبب سے مجاز، کنایہ اور استعارہ کا وہاں سب سے زیادہ برتاؤ تھا۔

یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں ایسی ہیں جو اہلِ زبان کو مزاح کی طرف خود بخود مائل کرتی ہیں۔ کیونکہ مزاح میں زیادہ تر ایسے ہی لفظوں کا استعمال ہوتا ہے۔ مزاح میں جو خوشی متکلّم اور مخاطب کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک طبعی بات ہے پس اگر اس کی مزاحمت نہ کی جائے تو ضرور رفتہ رفتہ وہ حدِّ اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے اور تمسخر و استہزاء بلکہ فحش و دشنام تک نوبت پہونچ جاتی ہے۔

عرب کا بھی ایسا ہی حال ہوا جس وقت خدا تعالیٰ نے خاتم النبیینؐ کو مبعوث فرمایا اس وقت .. ... یہ ذمیم خصلت ان میں حد سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی۔ اُن کے ہاں سب و شتم و قذف کا کچھ عیب نہ تھا۔ ان کے مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے تمسخر و استہزاء کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بُرے ناموں اور بُرے القاب سے یاد کرتے تھے۔ اُن کے اشعار میں ہجو اور فحش کثرت سے ہوتا تھا۔

چنانچہ بہت سی آیتیں قرآن میں اور بہت سی حدیثیں صحاح میں ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مزاح، سخریت، استہزاء، سب، لعن، قذف، فحش، بذاوت، لمز اور تنابز بالالقاب اُن کے ہاں شدت سے رائج تھا۔

آنحضرتؐ کی پاک تعلیم سے جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا چند روز میں تمام بُرائیاں نیست و نابود ہوگئیں۔ اور صرف اس قدر مزاح باقی رہ گیا جو سوسائٹی کے زینت ہے۔

خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہی حال رہا، بلکہ جو لوگ صاحبِ ہیبت و وقار تھے وہ اس پسندیدہ مزاح کو بھی پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے چند صحابہ کے نام لئے گئے جو اس وقت خلافت کے لائق سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے ہر ایک کی نسبت کچھ کچھ اعتراض کئے اور حضرت علیؓ کے نام پر صرف یہ کہا کہ **ھو رجل کثیر الدعابۃ** یعنی ان کے مزاج میں مزاح بہت ہے۔

خلافتِ راشدہ کا زمانہ گذر گیا اور اسلام میں شخصی سلطنت کی بنیاد پڑی اور وہ وقت آیا جس کے متعلق مخبرِ صادقؐ نے ثم یصیر ملکا عضوضاً کہا تھا تو تمام طبقاتِ انام کو ایک خاص شخص کی مرضی اور رائے کا تابع ہونا پڑا۔ فقیہوں نے خلفاء کے جذباتِ نفسانی پورے کرنے کے لئے شرعی حیلے تراشنے شروع کئے۔ شعراء کو فاسق و فاجر بادشاہوں کی مدح میں قصائد غرّا انشا کرنے پڑے۔ مشیر اور ندیم بجائے مشورہ اور صلاحِ نیک کے لطائف و مضحکات سے اُن کے دل بہلانے لگے۔ چونکہ مزاح اور ظرافت عرب کے خمیر میں تھی گو وہ نبیؐ برحق کی تعلیم سے ایک مدت تک اس کو بھولے رہے۔ لیکن جب زمانے کی حالت خود اس کی محرک ہوئی تو پھر اپنی اصلی خاصیت پر آگئے تاہم بنی اُمیّہ کے عہد میں بہ سبب قربِ عہدِ رسالت کے مزاح اور ظرافت محدود رہی۔

بنی عباسیہ کے زمانے میں مزاح نے خوب رونق پائی۔ بذلہ سنج مصاحبوں کی جماعت بھی سامانِ عیش و نشاط کا ایک جزوِ عظیم قرار پائی۔ بغیر ان کے شبستانِ خلافت سُونا سمجھا جاتا تھا۔ سفر اور حضر میں مصاحب اور ندیم خلیفہ کے ہمراہ رہتے تھے۔ پھر جس قدر ان کی فتوحات بڑھتی گئیں یہ رنگ بھی ان کے ساتھ پھیلتا گیا۔ مگر امویہ اور عباسیہ کے اخیر زمانے تک ظاہرا فحش اور ہزل نے مسلمانوں میں چنداں رواج نہ پایا تھا۔

البتہ ایران میں جاکر بعض اسباب ایسے جمع ہو گئے کہ مزاح حدِ اعتدال سے بہت بڑھ گیا۔ چنانچہ سعدی شیرازی کے مطائبات اور انوری و شفائی کے اہاجی و ہزلیات اور سب سے زیادہ فارسی مصطلحات کی کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ وہاں ہنسی اور چہل اس درجہ کو پہنچ گئی تھی کہ اصحابِ فضیلت اس کی مشق بہم پہنچاتے تھے۔ تاکہ اس کے ذریعے سے تقربِ سلطانی حاصل کریں۔ وہاں فحش اور ہزل کا نام "مطائبہ" رکھا گیا تھا۔ چنانچہ "مطائباتِ سعدی" مشہور ہیں۔ وہاں لفظِ ظرافت جس کے معنی عربی میں زیرکی اور دانائی کے ہیں

ہنسی اور چہل کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا تھا (جیسا کہ آج کل ہندوستان میں بھی مستعمل ہے) یعنی وہی لوگ بڑے لائق و فائق سمجھے جاتے تھے جو ہنسی اور چہل میں کمال رکھتے تھے۔ یہی رنگ "چغتائیہ" کے عہد میں فارسی کے ساتھ ایران سے ہندوستان میں آیا۔

اگرچہ اسلام کی سلطنت مخفیہ میں بھی بہت سے بادشاہ جن کو مہمات سے فرصت کم ملی یا جن کے مزاج میں قدرتی ہیبت اور وقار تھا نہایت سنجیدہ گزرے ہیں۔ جن کے دربار میں کسی کو بیہودہ گوئی کی مجال نہ تھی۔ مگر اکثر ان کے برخلاف تھے۔ خصوصاً وہ جن کا ملک کئی کئی پشت سے خارجی حملوں سے محفوظ تھا اور نہایت اطمینان کے ساتھ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے تھے۔

انسانی نسلوں کی قدیم سے یہ خاصیت رہی ہے کہ جن کو دولت یا سلطنت وراثتاً بغیر سعی و کاوش کے ہاتھ لگی ہے اور بغیر کسی مزاحمت کے وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیئے گئے انہوں نے کبھی اس عطیۂ غیبی کی کچھ قدر نہ کی۔ وہ اس کی نگہداشت اور محافظت سے غافل ہو کر عیش و عشرت میں ایسے منہمک ہو گئے کہ دنیا و مافیہا کو فراموش کر دیا۔ جب وہ عیش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو اس میں کوئی نئی اختراع کرنی چاہتے ہیں اور جب اس نئی اختراع سے بھی طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو اُسے اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ اب ان کی حالت چوپاؤں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اور ان کے تمام فضائل مبدل بہ رذائل ہو جاتے ہیں۔

اُن کی جرأت بے حیائی ہو جاتی ہے ان کی سخاوت اسراف ہو جاتی ہے، ان کی شجاعت بے رحمی ہو جاتی ہے، اُن کی اولعزمی بوالہوسی ہو جاتی ہے، ان کے مذاق ایسے فاسد ہو جاتے ہیں کہ جو لذت روح کو پند و حکمت سے ہونی چاہیئے وہی لذت ان کو فحش اور ہزل سے حاصل ہوتی ہے۔ جب خود مختار بادشاہوں کی ایسی حالت ہو جاتی ہے تو ملک کے خاص و عام کو وہی روپ بھرنا پڑتا ہے جو اُن کے دل خوش کرنے کا ذریعہ ہو۔ خصوصاً وہ فرقہ جو مذہب و ملت کی رو سے بادشاہ کا ہم قوم ہوتا ہے اور جس کو بہ نسبت اور قوموں کے تقرب اور حضوری کا زیادہ موقع ملتا ہے یا زیادہ امید ہوتی ہے کہ اس کو درباری اور مصاحبت کی وہ تمام لیاقتیں پورے اور اکمل طور پر حاصل کرنی پڑتی ہیں جو بادشاہ کے نزدیک لیاقتیں سمجھی جاتی ہیں۔

اگر بادشاہ کو گانے بجانے کا شوق ہے تو ہزاروں بھلے مانس گانا بجانا سیکھتے ہیں۔ اگر اس کی طبیعت حسن پرستی اور ہوا و ہوس کی طرف مائل ہے تو ہزاروں اہل علم غزل، واسوخت اور مثنوی لکھنے میں کمال بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر وہ خود پسند اور خوشامد پسند ہے تو شعرا کو بھاٹ بننا پڑتا ہے۔ اور قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل کرتے ہیں۔ اگر اس کو ہنسی اور چہل سے رغبت ہے تو ہزاروں سنجیدہ اور متین آدمی مسخرہ پن اختیار کرتے ہیں۔

ہنسی اور ظٹھول کی چشم بد دور اور بدرجہا بنیاد جمتی چلی آتی ہے یہاں تک کہ عالمگیر جیسے روکھے اور متشرع بادشاہ کے دربار میں بھی نعمت خاں جیسا ظریف اور بذلہ سنج موجود تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں ظرافت یہاں تک بڑھی کہ منجر بہ تمسخر و استہزا ہو گئی۔ بادشاہ ملک کا انتظام اوروں پر چھوڑ کر آپ ہمہ تن عیش و عشرت میں مشغول ہو گیا۔ اور اس کو ناچ رنگ اور شراب و کباب کے سوا کوئی شغل نہ رہا۔ تمام اعیان سلطنت بادشاہ وقت کی طبیعت کا میلان دیکھ کر اسی رنگ میں رنگ گئے۔ امیروں میں باہم نوک جھونک ہونے لگی۔ مردوں میں نواب امیر خاں اور عورتوں میں نور بائی ایک ایک پر پھبتیاں کہتے تھے۔ یہاں تک کہ برہان الملک اور آصف جاہ جیسے سنجیدہ آدمیوں پر بھی اُن کے وار چلتے تھے۔ اور ان کو بھی کبھی کبھی [illegible] جواب دینا پڑتا تھا۔

یہ رنگ رفتہ رفتہ خاص و عام میں پھیل گیا اور تمام امرا کی مجلسوں میں مسخرہ پن ہونے لگا۔ اور اس طرح محمد شاہ رنگیلے کی بدولت تمسخر اور استہزا اعلیٰ سے ادنیٰ تک تمام طبقوں میں پھیل گیا۔ پھر جب نواب سعادت علی خاں کے ساتھ دہلی کی زبان لکھنؤ میں گئی تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ یہ رنگ بھی وہاں پہنچا اور لکھنؤ میں اس نے اور ترقی پائی۔ وہاں کے اکثر کار فرما ایسے ہوئے جو تعیش و کامرانی میں محمد شاہ پر بھی سبقت لے گئے۔ اُن کے ہاں بھی مسخرہ پن کا بازار خوب گرم رہا۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں ثانی جیسے مدبر اور ہوشمند کو بھی انشاء اللہ خاں کے بغیر چین نہ آتا تھا۔

چونکہ مزاح اور زبان (جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے لازم و ملزوم ہیں اور ظاہر ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کو زبانِ اردو کے لحاظ سے تمام ہندوستان پر ترجیح ہے۔ اس لئے یہ دونوں شہر ہنسی اور چہل کے لحاظ سے بھی اور شہروں سے بالاتر رہے۔ ان تمام خرابیوں پر بھی جب تک مسلمانوں میں تھوڑی بہت تعلیم و تربیت رہی تب تک تمسخر و استہزاء نے ایک حدِ معین سے تجاوز نہیں کیا اور شرفاء اور خواص کی مجالس میں زیادہ تر بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ہی پہ قناعت رہی مگر جب نکبت اور ادبار کی گھٹا چاروں طرف چھاگئی اور بے علمی اور جہالت کا بازار گرم ہوا تو شریف زادوں کو وہ صحبتیں ملنے لگیں جہاں گالی گلوج، دھول دھپا اور جوتی پیزار ہی کا نام دل لگی تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تھچپن اور بے حیائی ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام خاندانوں میں وبائے عام کی طرح پھیل گئی۔ اور اس کی بُرائی کا خیال کم ہوتے ہوتے تقریباً تمام قوم کے دل سے بالکل جاتا رہا۔ پہلے ساری مجلس میں ایک آدھ آدمی بذلہ سنج ہوتا تھا کیونکہ اس وقت بذلہ سنجی کے لئے ذہانت اور جودتِ طبع کے علاوہ کسی قدر علم و فضل بھی درکار تھا۔ چنانچہ محمد شاہ کے دربار میں صرف نواب امیر خاں ہی ایک ایسا شخص تھا جو اس خدمت سے عہدہ برآ ہوتا تھا۔

آج کل ہر مجلس میں ایک کثیر مجمع ظریفوں کا ہوتا ہے کیونکہ اب بات بات میں محل بے محل فحش اور ہزل بکنا ہی داخلِ ظرافت سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجے کی ظرافت چند باتوں پر منحصر ہے۔ مثلاً کوئی ایسا فحش بکنا جو حضارِ مجلس نے پہلے کم سنا ہو، فحش کی بھری ہوئی واہی تباہی نقلیں بیان کرنی، کوئی ایسا لفظ بولنا جس کے سُننے سے شرم آئے، کوئی ایسی حرکت کرنی جسے دیکھ کر ہنسی آئے، کسی دوست کے جھوٹے سچے عیب کو ظاہر کرنے، کوئی ایسی بات کہنی جس سے مجلس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کا دل دُکھے اور باقی سب لوگ ہنسیں۔

کسی نئے آدمی پر جس سے شناسائی نہ ہو کوئی پھبتی کہنی، کسی کی صورت دیکھ کر خواہی نخواہی قہقہہ لگانا، کسی مقدس آدمی کو جس کا نام ہمیشہ تعظیم سے لیا جاتا ہو گالی سے یاد کرنا، کوئی ایسی خبر اُڑانی جسے سُن کر سب کو رنج ہو، کوئی ایسی عجیب روایت کرنی جو عادتاً محال ہو۔ غرض ہنسنے ہنسانے، دل دُکھانے یا بے حیائی کا نام "ظرافت" رکھا گیا ہے۔ چونکہ غریب اور محنتی آدمیوں کو دو چار گھڑی ہنسنے بولنے کی مہلت بہت کم ملتی ہے اس سبب سے فحش و دشنام اور بیہودہ باتیں زیادہ تر آسودہ اور مرفہ الحال لوگوں میں سُنی اور دیکھی جاتی ہیں۔

اس ذمیم خصلت کی بدولت اُردو، زبان نے جو کہ خاص مسلمانوں کی زبان کہلائی جاتی ہے، بہت کچھ وسعت پیدا کرلی ہے۔ غالباً دنیا میں کوئی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں ہماری زبان کی برابر گالیاں اور فحش اور بے شرمی کے الفاظ اور محاورات بھرے ہوئے ہوں۔

ایک فاضل انگریز نے انہی دنوں میں اُردو زبان کی ایک ڈکشنری انگریزی میں لکھی ہے جس پر انگریز اخبار نویسوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اس ڈکشنری کو فوربس اور شیکسپیر پر اس کے سوا کوئی ترجیح نہیں ہے کہ اس میں ہزاروں گالیاں اور فحش محاورے لیے ہیں

جو ان میں نہیں ہیں۔ لیکن مصنف نے ایک مختصر جواب دے کر سب کو ساکت کر دیا۔ اس نے کہا۔

" فوربس اور شیکسپیر صرف لغاتِ انگریزی کی ڈکشنریاں ہیں اور ہماری کتاب لغاتِ اردو کے سوا ہندوستانیوں کی طبیعت کا آئینہ ہے جس میں ان کے اخلاق اور خصائل و جذبات نہایت عمدہ طور سے نظر آتے ہیں "۔

اگرچہ مصنف نے اس مقام پر " ہندوستانیوں " کا عام لفظ لکھا ہے مگر حقیقت میں اس کتاب سے زیادہ تر مسلمانوں ہی کے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں، کیونکہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اس میں فحش اور بے حیائی کے وہی الفاظ ہیں جو مسلمانوں کی بول چال سے مخصوص ہیں اور خاص انہی کی سوسائٹی میں وضع ہوئے ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ ذمیم خصلت اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ واعظ جو اپنی مجلس، وعظ کو گرم کرنا چاہے اس کو ضرور ہے کہ آیتوں اور حدیثوں کے ضمن میں کچھ تمسخر کی چاشنی بھی دیتا رہے۔

اخبار کا مالک جو اپنے پرچے کو رونق دینی چاہے اس کو اس کے سوا کچھ چارۂ کار نہیں کہ اپنے اخبار کو " پنچ " بنادے۔

مصنف جو کوئی کتاب سمجھ کر اس کے حقِ تصنیف سے فائدہ اٹھانا چاہے اس کا فرض ہے کہ اپنی کتاب کی بنیاد دہنسی اور ٹھٹھول پر رکھے۔

شاعر جو مشاعرے کو گرم کرنا چاہے اس کی تدبیر یہی ہے کہ فحش اور ہزل سے اس کی غزل کا کوئی مصرع خالی نہ ہو۔

اہلِ مناظرہ کی بڑی فتح یابی یہ ہے کہ ان کی تحریر میں اعتراض اور جواب کی جگہ فریقِ مخالف پر بڑی پھبتیاں اور آوازے لوازمے جائیں

دنیا کی تمام قوموں کی تفریق مذہب و ملت کے لحاظ سے کی گئی ہے، جیسے ہندو، مسلمان، پارسی، یہودی، اور عیسائی وغیرہ ——

پس جو اچھی یا بُری خصلت کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس قوم کی مذہبی تعلیم کا مقتضا یہی ہوگا۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ جو قوم خوش نصیبی سے کسی نیک خصلت میں ضرب المثل ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ اپنے مذہب کو بھی نیک نام کرتی ہے۔ اور جو قوم بدنصیبی سے کسی بُری خصلت میں انگشت نما ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنی قوم بلکہ اپنے مذہب کو بھی بدنام کرتی ہے۔

اسلام نے انسان کی تہذیب اور اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس نے مزاح کو صرف وہیں تک جائز رکھا ہے جب سے خوشی حاصل ہوتی ہو، اور اخلاق پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ " میں بھی مزاح کرتا ہوں مگر کوئی بات بے جا نہیں کہتا "۔ آپؐ خود بھی کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے اور اگر کوئی دوسرا شخص کوئی لطیف مزاح کرتا تھا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔ لیکن ہر وقت یا بہت مزاح کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ اور سخریت و استہزا کی سخت ممانعت کرتے تھے یعنی کسی کی حقارت یا پردہ دری کرنی جس پر لوگ ہنسیں یا کسی کی نقل اتارنی یا کوئی اور ایسی بات کرنی جس سے دوسرا شخص ذلیل ہو اور فحش اور سب و لعن کو نہایت مبغوض سمجھتے تھے یہاں تک کہ بتوں کو بھی سب کرنے سے منع فرماتے تھے۔

ایک بار چند آدمی کفار کے ان مقتولوں کو جو بدر میں مارے گئے تھے بُرائی سے یاد کر رہے تھے، آپؐ سن کر ناراض ہوئے اور ان کو سخت ممانعت کی۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ طعن کرنے والا، لعنت کرنے والا، فحش بکنے والا اور بیہودہ گو مومن نہیں ہے۔

آپؐ کی ممانعت کا طریقہ ایسا موثر تھا کہ جس کو ایک مرتبہ نصیحت کی وہ ساری عمر کے لئے اس بُرائی سے باز آ گیا۔ کتبِ احادیث میں اکثر مثالیں ایسے لوگوں کی موجود ہیں جنھوں نے صرف آپؐ کی ایک بار کی ممانعت پر تمام عمر فحش وغیرہ زبان سے نہیں نکالا۔ مثلاً ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ " اپنے ماں باپ کو گالی دینا گناہِ عظیم ہے " لوگوں نے عرض کیا کہ " حضرتؐ ایسا کون ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا؟"

فرمایا "جو شخص کسی کو ماں یا باپ کی گالی دے کر اس سے اپنے ماں باپ کو گالیاں دلواتا ہے حقیقت میں وہی ان کا گالیاں دینے والا ہے"۔

اسلام کی یہ تعلیم عرب میں اس قدر پھیلی کہ فحش اور بے شرمی کی باتیں وہاں سے گویا بالکل مفقود ہوگئیں۔ قرآن میں ایسی چیزوں کے بیان میں جن کے نام لینے سے نفرت یا شرم آتی ہے مجاز اور کنایہ برتا گیا۔ مثلاً جائے ضرور کے لئے غائط کا لفظ بولا گیا جس کے معنی گڑھے یا نشیب کی زمین کے ہیں جہاں عرب حاجتِ ضروری کے لئے جایا کرتے تھے یا مثلاً ہم بستری کے لئے ملامست، مس اور اتیان وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ جن کے معنی چھونے یا آنے وغیرہ کے ہیں۔

عرب کے لئے جو کہ لطفِ زبان اور استعارہ و کنایہ پر جان دیتے تھے، یہ ایک نہایت عمدہ تعلیم تھی۔ چنانچہ اسی بناء پر ان کے ہاں صدہا استعارے لفظوں کی جگہ استعمال ہونے لگے۔ جیسے وقاع کے لئے لمس، مسیس، مس، دخول، صحبت وغیرہ اور بول و براز کے لئے قضائے حاجت، تغوط، تبرز وغیرہ اور عورتوں کے لئے فی الحجرین، ددار الستر، ام الاولاد، وغیرہ۔ اس قسم کی تہذیب عرب میں ایسی پھیلی تھی کہ جتنا بدن کپڑوں سے اکثر ڈھکا رہتا ہے اس کا نام لینا خلافِ شرم و حیا سمجھا جاتا تھا۔

ایک بار خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی بغل میں پھوڑا نکلا۔ لوگ عیادت کو گئے اور پوچھا "من این خرج" خلیفہ نے جواب میں صاف طور پر بغل کا نام نہ لیا بلکہ یہ کہا "خرج من باطن البدن"۔

مزاح و ظرافت بھی عرب میں خلفائے امویہ کے عہد تک بہت کم رہی، لوگ اس وقت اپنی اولاد کو مزاح سے بھی ایسا ہی منع کرتے تھے جیسے اور برائیوں سے۔ بہرحال اسلام نے اس بات میں ہدایت و ارشاد کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور ایک ایسی قوم سے جن کی سرشت میں ظرافت اور مزاح پیدا کیا گیا تھا اس کو گویا بالکل نیست و نابود کر دیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے وقتاً فوقتاً ایسے اسباب جمع ہوئے کہ یہ خصلت مسلمانوں میں بڑھتے بڑھتے انتہا کے درجے کو پہنچ گئی۔ اور جس قوم کو نبیؐ برحق نے اس سے ہمیشہ کے لئے پاک کرنا چاہا تھا وہ داغ بدنامی بن کر ہمیشہ کیلئے ان کی پیشانی پر لکھی گئی اور پورا ہوا وہ جو کلام الٰہی میں ارشاد ہوا تھا کہ "اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ" (یعنی اے نبی تو اپنے پیاروں کو ہدایت نہیں کر سکتا، بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔)

یورپ کی قوموں نے جس طرح اور تمام اخلاقی برائیوں کی اصلاح کی ہے اسی طرح انہوں نے اس برائی کو بھی مٹایا ہے۔ ان کے یہاں فحش اور ہزل اس طرح مفقود ہوا ہے کہ لغت کی کتابوں میں بھی اس کا پتہ نہیں لگتا۔ انہوں نے مشرقی کتابوں کے ترجمے جو اپنی زبانوں میں کئے ہیں ان میں جہاں فحش و ہزل کا موقع آگیا ہے وہاں اس مطلب کو ایسے لطیف پیرایے میں ڈھال کر لکھا ہے جس میں فحش باقی نہ رہے اور مدعا بخوبی ادا ہو جائے۔ ان کی مجلسوں میں یا ان کی تحریروں میں اگر مزاح کی باتیں ہوتی ہیں تو اس قدر لطیف اور دقیق ہوتی ہیں کہ ہم لوگ اس کو سے مزاح کہہ سکتے ہیں۔ جنگِ روم و روس کے آغاز میں ایک نہایت لطیف مطائبہ وزیر ہند اور ان کی لیڈی کا کسی اخبار میں نقل کیا گیا تھا اس کو سن کر ہمارے ایک مسلمان دوست سخت متعجب ہوئے اور فرمانے لگے کہ اس میں کونسی بات ظرافت کی ہے۔ اُن کی ہنسی اور چُہل کا سب سے بڑا نمونہ پنچ اخبار ہے جن میں وہ حد سے زیادہ ظرافت خرچ کرتے ہیں مگر ان کی ظرافت ہمیشہ کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتی ہے۔ نری ظرافت ہی نہیں ہوتی مثلاً کسی قانون کی اصلاح ہو، گورنمنٹ کی کوئی غلط پالیسی بدل جائے کسی باب میں قوم کو غیرت دلائی جائے ۔۔۔ ایسی ظرافت ہمارے نزدیک عین حکمت ہے اور ہماری قوم کے بعض ریفارمر جو کبھی کبھی مزاح کے پیرایے میں کوئی مضمون لکھتے ہیں گو وہ بالفعل ناعاقبت اندیشوں کو ناگوار گذرتے ہیں لیکن بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ ان کی نہایت تعظیم کی جائیگی اور اُن کے دلدوز فقرے اور دل شکن طعنے شفیق استاد کی زد و کوب سے زیادہ قدر کے لائق سمجھے جائیں گے۔

(رسالہ تہذیب الاخلاق ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء))

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

عبدالماجد دریابادی

خودنوشت

۱۸۹۶ء کا ایک خوشگوار سہ پہر، اودھ کے ایک چھوٹے شہر کھیم پور کھیری میں اودھ ہی کے ایک دوسرے چھوٹے ضلع بارہ بنکی (متصل لکھنؤ) کے رہنے والے ایک ممتاز ڈپٹی کلکٹر کا مکان۔ ڈپٹی صاحب کے چھوٹے لڑکے عمر ۴ سال (زائد ۵ سال) کی رسم تسمیہ یعنی بسم اللہ خوانی کی تقریب۔ زنانہ مکان کے صحن میں پردہ ہو گیا ہے۔ تخت پر ایک مولوی صاحب، صاحب علم، مع اس بچے کے بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور دگر دعزیزوں، ملازموں وغیرہ کا مختصر مجمع۔ سب کے چہرے خوشی سے چمکتے ہوئے۔ تازہ گرماگرم مٹھائی خوان میں رکھی ہوئی، کہ ابھی بسم اللہ ہو جائے اور مٹھائی سب کے کھانے میں آ جائے —— یہی اس زمانہ کا دستور ہر شریف مسلمان کے گھر کا تھا۔

مولوی صاحب سراپا لطف و شفقت بنے ہوئے لڑکے سے کہتے ہیں، "ہاں میاں اس سطر پر ذرا انگلی رکھ کر کہہ تو دینا 'بسم اللہ۔ ہاں کہو تو بسم ...... ہاں شاباش کہہ ڈالو جلدی سے بس .. .. .." لیکن یہ کیا! منٹ دو منٹ، پانچ منٹ! مولوی صاحب بے چارے تو دم دلاسا دے، کہتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور کھڑے ہوئے عزیز بھی سہارا دیئے جا رہے ہیں۔ لیکن لڑکا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہا ہے۔ مجمع سے شرما پہلے ہی گیا تھا۔ اور اب اس بے طرفہ اصرار نے (وہ فرط شفقت ہی سے سہی) اس جیب کو اور گھبرا کر دیا۔ آخر انتظار کب تک ہوتا اور اس عجیب اور ناخوشگوار اور سرتاسر غیر متوقع صورت حال پر غصہ والد ماجد کو کب تک نہ آتا؟ پہلے انھوں نے ڈانٹ ڈپٹ کی اور جب اس سے بھی کام نہ چلا، تو مجبور ہو کر انھوں نے قمچی منگائی اور لگانا شروع کر دی۔ اس کا بھی اثر نہ ہوا۔ اور لوگوں نے ہاں، ہاں کرتے ہوئے یہ کہہ کر جان بچادی کہ "اچھا اس وقت جانے دیجئے، بھیا تھوڑی دیر میں آپ ہی بسم اللہ کہہ دیں گے" —— یہ منظر دیکھنے والی ماں کے دل پر جو کچھ گزری ہوگی، اور اس کی اداسی اور اس کی حسرت ناکی بالکل ظاہر ہے۔

گھنٹہ بھر بھی مشکل سے ہوا ہوگا کہ کھلانے والی انّا (قصباتی زبان میں "بوا") نے چمکار کر بہلا کر، بچہ سے کہا کہ "واہ، کیا ہمارے بھیا کو بسم اللہ نہیں آتی۔ جا کے پکار کر مولوی صاحب سے کہہ تو آؤ" بچہ دوڑا دوڑا گیا، اور مولوی صاحب کے حجرہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر پوری بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سنا آیا! اترے ہوئے چہرے بحال ہو گئے۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شادیانے بجنے لگے۔

یہ تھا وہ طفل ناہنجار جو آج ۷۰ سال کی عمر میں، دوستوں، قدر افزائی کی فرمائش پر اپنی رسوائیوں کی داستان، ایک ہلکی پھلکی سی

آپ کو ستانے بیٹھا ہے! ـــــ پڑھا لگا ہے خود قلم سرنوشت کر" یہ زندگی کے آغاز ہی سے ظاہر ہے۔

دریاباد انگریزی عمل داری کے شروع میں خود ضلع تھا۔ اور اس سے پہلے اودھ کی سلطنت میں بھی ایک خاص اہم مقام تھا۔ قصبہ کے شریف خاندانوں میں ایک اہم خاندان قدوائی مخدوم زادوں کا ہے۔ قدوائی اسرائیلی نسل سے ہیں سلسلہ نسب ہادی بن حضرت یعقوب تک پہنچتا ہے حضرت ہارون بن عمران کے واسطہ سے مورث اعلیٰ قاضی معزالدین معروف بہ قدوۃ العلم والدین کہا جاتا ہے کہ خواجہ اجمیریؒ کے عہد میں ہندوستان آئے۔ اور اجودھیا (کہ اس کا دوسرا تلفظ اودھ ہے) میں آکر مقیم ہوئے۔ اجودھیا اب فیض آباد کے متصل ایک قصبہ ہے اور ہندوؤں کا مشہور تیرتھ۔ قدوائیوں کو اولاد انبیاء ہونے کی بنا پر ہندوستان کے شیوخ (عثمانی و صدیقی وغیرہ) نے بلکہ خود سادات نے اپنا ہم کفو قرار دیا اور آپس میں شادی بیاہ کا کثرت سے رواج دے دیا۔ قدوائیوں کی نسل لکھنؤ کے قصبہ جگور اور بارہ بنکی کے قصبوں رسولی، بڑاگاؤں، گدیا، سولی وغیرہ میں خوب پھیلی اور بڑے بڑے نامور ان میں پیدا ہوتے رہے۔

اسی قصبہ اور اسی خاندان میں میری پیدائش وسط مارچ ۱۸۹۲ء مطابق وسط شعبان ۱۳۱۰ھ میں ہوئی۔ والد مرحوم مولوی حاجی عبدالقادر (۱۸۵۵ء تا ۱۹۱۲ء) اودھ کے مختلف ضلعوں میں ڈپٹی کلکٹر رہے۔ یہ اس عہد کا ایک اونچا اور معزز عہدہ ہندوستانیوں کے لئے تھا۔ دادا صاحب مفتی شریعت مولوی مظہر کریم ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے وقت شاہ جہاں پور میں سررشتہ دار عدالت کلکٹری تھے صحیح یا غلط ان پر بھی بغاوت کا الزام لگا، اور سزایاب ہو کر کئی سال کالے پانی (جزیرہ انڈمان میں) رہے نانا صاحب (جو پہلے سے دادا بھی تھے) مولوی حکیم نور کریم اپنے وقت کے ایک نامور طبیب اور اعلیٰ درجہ کے خوش خط تھے، کتابوں پر کتابیں (لغت، طب، فقہ، تاریخ، تفسیر وغیرہ ہر قسم کی) اپنے ہاتھ سے لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ قیام لکھنؤ میں رہا۔ دوسرے قریبی عزیز بھی اچھے عہدوں پر رہے، یا طبابت، وکالت اور دینداری میں ممتاز۔ علم کا چرچا خاندان میں خاصہ رہا۔ والد مرحوم بھی صاحب علم تھے اور ایک حد تک اہل قلم بھی۔ فقر و تصوف کا سلسلہ بھی قائم رہا۔ جد امجد بانسہ کی درگاہ قادری سلسلہ میں مشہور رہے۔ وہاں کی سجادگی اپنے قریبی عزیزوں کے حصہ میں رہی۔ لکھنؤ میں علماء فرنگی محل سے تعلقات، استادی اور شاگردی کے دہرے رشتے کئی پشتوں تک رہے۔

والدہ ماجدہ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۱ء) بڑی عبادت گزار و فیاض تھیں۔ روزہ اور نماز تہجد اخیر عمر تک قضا نہ ہوئی اور نہ موسم کی سختی یا ضعیف العمری اس میں حائل ہوئی۔ ایک بھائی اور ایک بہن تھیں۔ دونوں مجھ سے بڑے۔ بہن (وفات ۱۹۲۹ء) جلد بیوہ ہوگئی تھیں۔ عبادت و تہجد گذاری میں والدہ ہی کی پڑیں۔ بھائی صاحب (وفات دسمبر ۱۹۶۶ء) نے انگریزی پڑھی، اور باوجود دائم المرض ہونے کے سینئر ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر پہنچ کر پنشن لی۔ دونوں مجھ سے انتہائی محبت کرتے رہے۔ گو میری طرف سے کبھی بھی ان کے حقوق ادا نہ ہوئے۔

انگریزی تعلیم سیتاپور ہائی اسکول میں ہوئی۔ وہیں سے ۱۹۰۸ء میں میٹریکولیشن کیا۔ خانگی تعلیم، خصوصاً فارسی کی، گھر پر ہو چکی تھی۔ کیمیائے سعادت، سکندر نامہ، یوسف زلیخا وغیرہ پڑھ چکا تھا۔ اسکول میں ثانوی زبان عربی لی۔ استاد اچھے اور شفیق ملے، توجہ سے پڑھایا۔ کچھ شد بد آگئی۔ ایف، اے اور بی، اے کی چار سال تعلیم لکھنؤ کیننگ کالج میں پائی۔ یہ اس وقت تک الہ آباد یونیورسٹی کے ماتحت تھا۔ یہاں پہنچ کر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ دل عربی تعلیم سے اُچاٹ ہو گیا اور استاد بھی ویسے شفیق نہ ملے۔ کالج کے زمانے میں تھوڑی بہت شہرت جو حاصل رہی، وہ انگریزی اور منطق و فلسفہ میں حاصل ہوئی انگریزی سے مراد انگریزی تحریر ہے۔ ورنہ انگریزی تقریر میں تو بالکل یوں ہی سا رہا۔ استادوں میں ایک انگریز ڈاکٹر کیمرن تھے، اچھے استاد تھے۔ ان کے ساتھ محض رسمی نہیں دلی محبت رہی۔

بڑھنے، رطب و یابس، ہر قسم کی کتابیں پڑھ ڈالنے کا مرض بچپن سے تھا۔ کالج میں رہ کر قدرۃً یہ بہت ترقی کر گیا۔ شہر کی پبلک لائبریری پر روز دھاوا رہتا۔ اور کالج کی وسیع و عظیم لائبریری کا تو خیر کہنا ہی کیا۔ ڈاکٹر کیمرن نے ایک سرٹیفکیٹ میں لکھا کہ "میرے علم میں کسی بھی طالب علم نے لائبریری سے اتنا استفادہ نہیں کیا ہے جتنا انھوں نے کیا ہے" کوئی ہادی و راہبر نہ تھا، اس لیے بہت سی کتابوں اور رسالوں کے پڑھنے میں وقت ہی ضائع ہوا۔ اور اُلٹے سیدھے چت پٹ کر اندھیرے میں کر اور دھندلی روشنی میں کتب بینی سے آنکھ کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ گیا وہ الگ۔

بی۔ اے کے امتحان کا جو زمانہ قریب آیا تو عربی میں اپنی کمزوری پر نظر گئی۔ کورس نثر و نظم کا اچھا خاصا اونچا تھا استعداد اُس کی نسبت سے بہت پست۔ اپنے ایک دوست اور ساتھی مولوی عبدالباری (مولانا شاہ عبدالباری ندوی اشرفی) کو کانظام ندوہ میں پڑھ رہے تھے۔ اور امتحان میٹریکولیشن کی فکر میں تھے۔ عربی کے سبق ان سے لینے، اور انگریزی کے سبق انھیں دینے شروع کیے اور اس لین دین کے بعد خیر کسی طرح ۱۹۱۲ء میں نشتم پشتم نکل گیا۔ سکنڈ ڈویژن ملا انگریزی اور فلسفہ میں فرسٹ ڈویژن ملا ہوگا۔ اور عربی میں تھرڈ، اوسط جا کر سکنڈ ڈویژن کا پڑا۔

ایم۔ اے۔ فلسفہ میں کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں اس کا کوئی معلم نہ تھا۔ اس وقت صوبہ بھر میں اس کا انتظام دو ہی جگہ تھا کوئنس کالج بنارس اور علی گڑھ، لکھنؤ، الٰہ آباد، آگرہ تینوں اس سے محروم تھے، اکتوبر ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کا رخ کیا۔ داخلہ کے دن کا سفر آج تک یاد ہے لکھنؤ کے باہر گویا نکلا ہی نہ تھا ایک بالکل نئی دنیا آباد نظر آئی۔ یوں پڑھا لکھا اچھا خاصہ تھا مضمون نگاری میں خاصہ نام پیدا کیے ہوئے تھا۔ اُردو کے علاوہ کسی قدر انگریزی میں بھی، اس پر بھی عملی دنیا سے کورا تھا۔ سخت بھونچکا اور پریشان۔ خیر جوں توں داخلہ کالج میں ہوا، اور ایک بڑے دور افتادہ ہوسٹل میں جگہ ملی۔ اس میں بھی اپنے لیے سب سے چھوٹا کمرہ پسند آیا، جو دراصل غسل خانہ تھا۔ یہ عالم اپنی خشک مزاجی اور مردم بیزاری کا اُس وقت تھا۔ کسی کھیل ویل میں بھلا کیا شریک رہتا۔ علی گڑھ میں رہ کر اور کھیل سے کورا۔ اس مثال میں شاید میں منفرد ہی ہوں۔

اُستاد بے چارے کچھ یوں ہی سے ملے۔ ایک انگریز تھے، بعد کو خودکشی کر لی، امتحان میں بیٹھا قبل ہوا فیل ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ چار یا پانچ پرچوں میں سے ایک پرچہ کی کتاب ہی کہیں دستیاب نہ ہو سکی تھی۔

والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اب فکر معاش بھی دامن گیر ہو گئی تھی۔ راجہ (بعد کو مہاراجہ) سر علی محمد خاں تعلق دار محمود آباد سے خاندانی تعلقات آڑے آئے۔ بے چارے نے سال بھر تک مزید تعلیم کے لیے پوری امداد کر دی اب علی گڑھ چھوڑ صوبہ کے باہر، دہلی کے سینٹ کالج سینٹ اسٹیفنس میں پڑھنے گیا۔ یہاں اُستاد فلسفہ پروفیسر شارپ اچھے ملے۔ یہیں مشہور علم دوست و انسانیت دوست اُردو نواز پادری سی ایف اینڈریوز سے بھی ملاقات ہوئی اور دل نے ان کی شخصیت کا اثر قبول کیا۔ ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ میں بنک میں ہم لوگوں کی جمع پونجی جمع تھی اس کے دیوالیہ ہو جانے کی خبر اُڑی اور میں اس کو بہانہ بنا کر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ واپس آگیا اب ۱۹۰۸ء سے ہم لوگوں کی مستقل سکونت لکھنؤ ہی میں تھی۔ وہیں خاندان ہی کی لڑکی سے محبت پیدا ہو گئی (اور وہی آگے چل کر بیوی بنیں) ان سے طویل جدائی طبیعت کے لیے سخت بار تھی، اور تحت الشعور میں یہی چیز تھی جو دہلی سے تعلیم چھوڑا لکھنؤ واپس لے آئی۔

اس وقت یونیورسٹیوں کی یہ بھرمار کہاں تھی۔ لکھنؤ تک میں یونیورسٹی نہ تھی۔ جی میں شروع سے یہی ہوئی تھی کہ کسی کالج میں فلسفہ کی پروفیسری کا عہدہ حاصل کیجیے (اُردو زبان و ادب کا کوئی شعبہ اُس وقت تک کہیں قائم نہیں ہوا تھا) اس کے لیے ایم۔ اے کی شرط ضروری تھی۔ خیال یہ پیدا ہوا کہ بجائے ڈگری حاصل کرنے کے مختلف رسالوں میں فلسفیانہ مقالے لکھیے، اور انھیں کو ایم۔ اے کی ڈگری کا قائم مقام بنا لیجیے۔ اسکیم عملاً چل نہ سکی۔ مضمون حد لیک سے زیادہ نہ لکھے جا سکے۔ دوسری ملازمتوں کی طرف خیال گیا۔ ریلوے اور ڈاک خانہ دونوں میں کچھ جگہیں

دو ڈھائی سو کے مشاہرہ سے شروع ہو رہے تھے (اس وقت کے ۲۰۰ آج کے ہزار بارہ سو کے مترادف) کوششیں کیں۔ سفارشیں اٹھوائیں کامیابی نہ ہوئی۔

والد مرحوم کے زمانہ تک عادت خاصی امیرانہ زندگی کی رہی۔ گاڑی گھوڑا، نوکر چاکر وغیرہ۔ اب (یعنی شروع ۱۹۱۳ء) زمانہ نسبتاً تنگ دستی سے آیا۔ کچھ تھوڑا بہت معاوضہ اُردو رسالوں سے وصول ہوتا رہا۔ سب سے بڑھ کر دست گیری بابائے اُردو عبدالحق نے کی۔ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے کام تصنیف و تالیف و ترجمہ کا دلواتے رہے اور اس طرح وہ زمانہ تین چار سال کا بسر ہو گیا۔ وسط ۱۹۱۶ء میں شادی کے معاً بعد صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کی قدر دانی کانفرنس آفس علی گڈھ میں کھینچ کر لے گئی۔ یہاں بھی جی نہ لگا۔ استعفا دے کر واپس آگیا ۱۹۱۷ء میں سر راس مسعود اور بابائے اُردو نے تار دے کر حیدرآباد بلایا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کھلنے پر تھی اور اس کے لیے کتابیں ہر فن کی تیار ہو رہی تھیں۔ مشاہرہ کا آغاز تین سو روپے (آج کے ڈیڑھ دو ہزار) ۱۱ مہینے وہاں رہنا ہوا۔ پھر وہاں سے مستعفی ہو گیا۔ مئی ۱۹۱۹ء میں اعلیٰ حضرت نظام دکن کے ہاں سے تار پر طلبی ہوئی۔ باریابی ہوئی اور ۱۲۵ روپے ماہوار کا وظیفہ علمی مولانا شبلی کے وظیفہ کی طرح مدۃ العمر کے لیے جاری ہو گیا۔ ۱۹۱۹ء کے سوا سو روپے آج کے آٹھ سو کے برابر تھے۔ مرزا محمد اسمٰعیل وزیر اعظم حیدرآباد نے ۱۹۴۲ء میں یہ رقم بڑھا کر دو سو کر دی۔ پولیس ایکشن کے بعد ۱۹۴۸ء میں یہ پنشن حیدرآباد گورنمنٹ نے بند کر دی۔ یہاں سے وزیر تعلیمات مولانا ابوالکلام سے مسلسل لکھا پڑھی کی۔ بے اثر رہی۔ مہینوں بعد خود پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا۔ جب جا کر کھلی۔ مگر دو سو سے گھٹ کر وہی سوا سو۔ کتابوں، اخبار وغیرہ کی مد سے آمدنی پہلے برائے نام تھی، اب اچھی خاصی ہو رہی ہے اور زندگی اوسط درجہ کی خوش حالی سے بسر ہو رہی ہے۔

پڑھنا اور چیز ہے اور پڑھ ڈالنا اور۔ پڑھنے کے لیے سمجھنا بھی ضروری ہے، پڑھ ڈالنے کے لیے ضروری نہیں ــــ پڑھ ڈالنے کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ جب سے حرف شناسی ہوئی کہنا چاہیے کہ پڑھ ڈالنے کا بھی مرض پیدا ہو گیا۔ رطب و یابس، کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار جو چیز بھی چھپی ہوئی سامنے آگئی بس اس کو بے پڑھے نہ چھوڑا۔ والد کے ہاں روزنامہ اودھ اخبار (لکھنؤ) آتا تھا اور وہی وقت کا واحد اُردو روزنامہ یوپی بھر میں تھا۔ اور ریاض خیرآبادی کا نیم ادبی نیم سیاسی سہ روزہ ریاض الاخبار (گورکھپور) بھی۔ بس یہ دونوں تو گویا میری خاص غذا تھے۔ اس کے علاوہ لاہور کا پیسہ اخبار (ہفتہ وار) بھی کہیں ادھر اُدھر سے لے کر پڑھ لیتا تھا۔ عمر کے بارھویں سال میں (۱۹۰۴ء میں) تھا اور چوتھے درجہ کا طالب علم، کہ مذہبی عنوانوں پر اودھ اخبار میں مضمون نگاری شروع کر دی۔ گمنام۔ نام لکھنے میں ہمارا غ کچھ تو طبعی جھجک یا حجاب رہی اور اس سے بھی بڑھ کر والد ماجد کا ڈر۔ جب ذرا انگریزی چلا لینے لگا، تو لکھنؤ کا سہ روزہ ایڈووکیٹ پابندی سے پڑھنے لگا۔ یہ بھی والد ماجد کے پاس آتا تھا اور جب ذرا کچھ اور چل نکلا تو لکھنؤ کا روزنامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف اپنے اسکول کے ساتھیوں کی شرکت میں منگانے لگا۔ علی گڑھ منتھلی (آدھا اُردو، آدھا انگریزی) اس کے علاوہ اور پھر کچھ ہی روز بعد والد سے کہہ سن کر الندوہ بھی منگانا شروع کر دیا۔

پنجاب کے مذہبی پرچوں کے علاوہ جب کالج میں پہنچ کر ذرا آزادی ملی تو وکیل (امرتسر) میں بھی (کہ اپنے زمانہ کا بڑا ذی وقعت پرچہ تھا) دو مقالے قسط وار لکھ کر بھیجے ایک تاریخی، یعنی محمود غزنوی پر دوسرا نیم طبی، یعنی نظریہ نباتات خوری کے جواب میں جواز گوشت خوری پر 'غذائے انسانی' کے عنوان سے دونوں مقالے بہت زیادہ پسند کیے گئے۔ خوب داد ملی۔ اور وکیل والوں نے ۱۹۰۹ء میں انھیں مستقل رسالوں کی صورت میں چھاپ دیا۔ یعنی ایف اے اور بی اے میں تھا کہ مضمون اُردو کے نامور رسالوں میں چھپنے لگے۔ ۱۹۱۰ء میں

جوش جاہلیت میں آکر مولانا شبلی کی الکلام پر ایک تنقیدی نظر، ۱۰، ۱۲ نمبروں میں ماہنامہ الناظر (لکھنؤ) کے لیے ایک طالب علم کے نام سے لکھی ادیب (الہ آباد) میں بھی دو چار مضمون لکھے۔ دوسرے رسالوں سے بھی مانگ آنے لگی۔ الندوہ کے آخیر زمانے میں اُسے بھی دو مقالے ترجمہ کر کے دیئے یہ بجائے خود ایک بڑا اعزاز تھا۔ الناظر کا مستقل مضمون نگار ہوگیا اور چند سال بعد ادارت کے چند صفحے میرے لیے مخصوص ہوگئے۔ ان میں "چلپی" کے نام سے لکھا کرتا۔ کتابوں پر تبصرے اس کے علاوہ۔ مولانا شبلی نے سنہ ۱۲ء میں ایک اونچے پیمانہ پر سیرۃ النبی لکھنے کا ارادہ کیا۔ اُس کے لیے مولانا کی فرمائش پر انگریزی رسالوں، مقالوں، کتابوں سے ترجمہ کرتا رہا۔ مولانا اس کا معاوضہ بھی ماہانہ عنایت فرماتے رہے۔ چند سال بعد جب معارف (اعظم گڑھ) نکلا تو وہ گویا اپنا ہی تھا۔ جب چاہتا اُس میں لکھتا پھر ایک عرصہ (سنہ ۱۶ء تا سنہ ۲۲ء) تک ایسا بھی ہوا کہ اس کے کچھ صفحات میرے ہی لیے مخصوص رہے اور اس کا مستقل معاوضہ مجھے وصول ہوتا رہا۔

مسلمانوں کا پہلا روزنامہ یو۔پی سے "ہمدم" کے نام سے سید جالب دہلوی کی ادارت میں اکتوبر سنہ ۱۹۱۲ء سے نکلا۔ وہ بھی گویا اپنا ہی تھا۔ سنہ ۱۹ء میں ہفتہ وار "حقیقت" لکھنؤ سے نکلا وہ شروع میں تمامتر اپنا ہی تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ سنہ ۲۳ء میں جب مولانا محمد علی کا روزنامہ "ہمدرد" دوبارہ دہلی سے جاری ہوا تو عملاً اس کا انچارج "میں ہی تھا۔ پھر جب سنہ ۲۵ء میں مولانا لمبے سفر پر یورپ گئے تو ضابطۃً بھی اس کا نگران یا ڈائرکٹر قرار پاگیا۔

شروع سنہ ۲۵ء سے سچ نکلا پہلے میری شرکت میں اور پھر یکسر میرا ہوگیا۔ اس کی عارضی بندش کے بعد ظفر الملک مرحوم سے مجھ سے موافقت نہ رہ سکی سچ کے نام پر وہ قابض تھے۔ میں نے نیا پرچہ صدق کے نام سے نکالا پھر اُس میں تھوڑی سے ترمیم کر کے قانونی مصلحت سے اُسے "صدق جدید" کرنا پڑا۔

مقالہ نگاری ہی سے ملتی ہوئی گو اس سے بہت مختلف ایک چیز نشری تقریر بھی ہے۔ ہندوستان میں جب سے ریڈیو آیا اس کے کچھ ہی دن بعد ریڈیو والوں نے بلانا شروع کیا۔ شروعات لکھنو ریڈیو نے کی اور کثرت سے اس نے بلایا۔ اس کے بعد نمبر دہلی ریڈیو کا رہا۔ اور کبھی کبھی حیدر آباد دکن لاہور اور کراچی کے اسٹیشنوں سے بھی اس کا اتفاق ہوا عنوان عموماً مذہبی یا ادبی۔ ابتداً جھجک تھی رفتہ رفتہ ان نشریہ کی تکنیک سیکھ لی آواز کو قابو میں رکھنا اور اس کا اتار چڑھاؤ اچھے نشریہ کی جان ہے۔ بغیر اس کے ہر نشری تقریر بے جان، بے مزہ، سیٹھی، اکتا دینے والی۔

تصنیف و تالیف، مضمون نگاری کی ترقی یافتہ صورت ہے بعض باریک فرقوں کے ساتھ یہ علت بھی شروع سے ساتھ لگی رہی شروع شروع اس کا کام بھی مضمون نگاری ہی کی طرح ادھر ادھر کی چوری چکاری سے چلتا۔ کچھ اس کتاب سے چرایا کچھ اُس سے اپنے نام سے ایک چیز تیار کر دی۔ پھر دور مولانا شبلی کے تسلط کا آیا۔ اور سچ یہ ہے کہ لکھتا آج سید صاحب جو کچھ آیا وہ اصلاً انھیں کا طفیل ہے۔ کالج پہنچ کر جب عقاید میں فتور آیا تو طبیعت کا رخ اسلام سے الحاد کی طرف مڑ گیا انگریزی ملحدین کی کتابیں بہ کثرت پڑھنے سے۔ اُسی زمانہ میں ایک کتاب پروفیسر ہکسلے پر بڑے چاؤ اور اہتمام سے لکھنا شروع کی اور اُسے معنون بھی مولانا شبلی ہی کے نام سے کیا۔ الحمدللہ کہ اب اس کا مسودہ بھی معدوم ہے۔

سن شعور پر پہنچ کر پہلی بار باضابطہ کتاب "فلسفۂ جذبات"، قلم سے سنہ ۱۳ء میں نکلی۔ سن کا اُس وقت ۲۱ واں سال تھا۔ کتاب انجمن ترقی اردو نے لکھوائی اور اسی نے چھاپی (صحیح نام "نفسیات جذبات" ہونا چاہیے تھا مگر نفسیات کی اصطلاح اس

وقت تک ناول نویس تھی) ۔ اب اس کی کوتاہیوں پر ہنسی تو کم آتی ہے غصہ زیادہ آتا ہے۔ دوسری کتاب ہیرا اعتبار سے "فلسفہ اجتماع" لکھ ڈالی جس کا ایک ایک صفحہ الحاد سے داغدار، اس کی اشاعت و فروخت مدت ہوا بند ہو گئی۔ پھر دو کتابیں انگریزی سے ترجمہ کر کے چھاپیں ایک "تاریخ اخلاق یورپ" (پورپیا) اور دوسری "تاریخ تمدن انگلستان (جزو) ایک ڈرامہ بھی "ناظر" کے فرضی نام سے اس درمیان میں لکھ ڈالا۔ ۱۹۱۷ء میں حیدرآباد جانا ہوا، یونیورسٹی کے سر رشتۂ ترجمہ و تالیف میں وہاں ایک خاص ضخیم کتاب منطق پر کی اور جو خالی وقت بچ گیا اس میں ترجمہ "تاریخ یورپ" کا کیا۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے لیے فلسفہ میں مکالمات برکلے کا ترجمہ کیا۔

دس سال تک ملحد رہنے کے بعد خیالات میں پھر انقلاب پیدا ہوا، ہندو فلسفہ و تصوف کا درمیانی راستہ طے کرتے ہوئے اسلامی تصوف کی طرف آیا اور ۱۹۲۱ء میں از سر نو مسلمان ہو گیا۔ اس درمیانی دور میں ایک فرنچ فلسفی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ، مع اپنے اسلامی قلم سے حواشی اور دو مستقل بابوں کے اضافہ کے، "پیام امن" کے نام سے کر دیا تھا اور مصحفی کی ایک عاشقانہ مثنوی بھی ایڈٹ کر ڈالی تھی۔ تجدید اسلام کے بعد توجہ از سر نو اسلامیات کی جانب ہوئی۔ بھولی بھالی زنگ خوردہ عربی کو پھر سے تازہ اور صاف کیا۔ اور سرگرم مطالعہ پہلے تو تصوف اسلام کا رہا۔ بزرگوں کے ملفوظات، تذکرے، اور سب سے بڑھ کر مثنوی مولانا روم اور اس کے بعد مطالعہ حدیث و فقہ اور آخر میں تفسیر کی باری آئی۔ بہت کچھ اردو ترجموں سے بھی سہارا لے کر۔ تھانہ بھون کی حاضری ۱۹۲۸ء سے شروع ہو چکی تھی۔ وہیں خانقاہ میں دو ایک سال بعد ایک صاحب نے ہمت دلائی کہ قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی میں جمہور اہل سنت کے نقطۂ نظر سے کر ڈالو۔ ہمت آخرکار کسی طرح بندھ گئی اور جس کا کلام ہے اسی کی توفیق و امداد سے کئی سال کی مشقت میں کام جوں توں کر ڈالا۔ تفسیری حصہ بھی لشتم پشتم ہو گیا اور خاصا مطالعہ اتنی تفسیری حواشی کی خاطر کرنا پڑا۔ قرآن کے بے شمار معجزہ اسے بھی سمجھنا چاہیئے کہ مجھ سے کم علم بلکہ بے علم سے بھی یہ کام کرا لیا۔ چھپائی میں دیر بے اندازہ لگ گئی اور جب پریس کے شکنجہ سے باہر آیا جب بھی میری مرضی کے مطابق نہیں۔ خیر اس کے بعد ہیاؤ کھل گیا، اردو ترجمہ و تفسیر کا بھی کام شروع کر دیا۔ اور جوں توں اسے بھی ختم کر دیا۔ انگریزی کام میں چھ برس لگ گئے۔ یعنی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک اردو کے کام میں اسی کے قریب قریب وقت لگا۔ دیر اس کی چھپائی میں بہت ہوئی۔ لیکن بہر حال انگریزی تفسیر سے پھر بھی کم۔ دوسری چھوٹی چھوٹی کتابیں بھی قرآن ہی سے متعلق نکلتی رہیں، "جغرافیۂ قرآنی" "اعلام القرآن" وغیرہ۔ اور آخر میں دو کتابیں ایسی ہی جیسی تفسیر قرآنی کے بعد حاصل زندگی سمجھتا ہوں۔ ایک سیرۃ نبوی قرآنی (جو دراصل مدارس میں دیئے ہوئے میرے لکچروں کا مجموعہ ہے) اور دوسری بشریت انبیاء کہ اس موضوع پر مجھ کو نظر کو کسی زبان میں کسی کتاب کا اب تک علم نہیں۔

حج بیت اللہ کے لیے ۱۹۲۹ء میں گیا تھا کچھ روز بعد سفرنامہ "سفر حجاز" کے نام سے شائع ہوا اور لوگوں میں بہت مشہور رہا۔ دو کتابیں اپنے ذرا خصوصی محسنوں پر لکھیں، ایک حضرت تھانوی پر "حکیم الامت، نقوش و تاثرات" کے نام سے ۱۹۵۲ء میں دوسری مولانا محمد علی پر "محمد علی ذاتی ڈائری کے چند ورق" کے عنوان سے ۱۹۵۴ء میں۔ ان پر بھی دوستوں، رفیقوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ ایک کرم و محترم دوست مولانا سید سید سلیمان ندوی (متوفی ۱۹۵۳ء) تھے ان کے خطوط بہت سے شائع ہو جانے کے بعد بھی کئی سو کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ دوستوں کے اصرار سے انہیں ایڈٹ کر کے چھاپنا شروع کر دیا ہے۔ مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی اور مولانا محمد علی کے خطوط کا مجموعہ "خطوط مشاہیر" کے نام سے مدت ہوئی چھپ چکا ہے۔ "مبادیٔ فلسفہ حصہ اول و حصہ دوم" کے علاوہ نفسیات جذبات پر ایک کتاب "ہم آپ" کے نام سے بہت عرصہ ہوا چھپ چکا ہے۔ اور ادبی چیزیں بھی نکل چکی ہیں۔ مثلاً انشائے ماجد (اول و دوم) "اکبر نامہ" "تحریرات" وغیرہ تصنیفات کی یہ

مکمل فہرست نہیں چھوٹی بڑی اور بھی ہیں۔ یہاں انہیں کا ذکر ہے جو بے ساختہ یاد آگئیں۔

کتابوں کی آمدنی پہلے برائے نام ہی ہوتی تھی اب ماشاءاللہ حاشیہ وغیرہ سے اچھی خاصی ہو جاتی ہے۔ "صدق" بھی اچھا خاصا چل رہا ہے۔ اور بجائے بار ہونے کے اب مالی اعتبار سے بھی منفعت بخش ہے۔ لکھنے پڑھنے کے کام میں سب سے بڑا فیض مولانا شبلی سے پایا۔ برسوں ان کی کتابوں کا مسلسل مطالعہ کیا۔ اُن کے فقرے زبانی یاد کر لیے، کوشش کر کے ان کی نقل اور پیروی کی۔ شبلی کے بعد اُردو جو کچھ بھی آئی وہ مرزا محمد ہادی رسوا لکھنوی اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی کی کتابوں سے۔ اُن کے علاوہ اور بھی بہتوں سے فیض حاصل کیا۔ بڑوں اور برابر والوں کا ذکر نہیں، چھوٹوں سے بھی سیکھنے میں کبھی شرم نہ محسوس کی، اب بھی سیکھتا رہتا ہوں۔ اور ۸۰ سال کے سن میں اپنے کو محض "طالب علم" ہی جانتا ہوں۔ اپنے غائبانہ استادوں میں سے سب کے نام لکھنے بیٹھوں تو شاید پورا صفحہ ہی اس فہرست کی نذر ہو جائے۔ اس کا یقین رکھتا ہوں کہ لکھنا اب بھی نہ آیا، اپنی ہر تحریر پر جب کچھ عرصہ کے بعد نظر کرتا ہوں تو صرف و معنی کے علاوہ زبان و بیان میں بھی بیسیوں عیب و سُقم نظر آتے ہیں۔ اور بس نہیں چلتا کہ ان عیبوں کو کھرچ کھرچ کر چھیل کر مٹا دوں۔

یہ مادیت کا دور کوئی ۸، ۹ سال قائم رہا۔ ۱۹۱۰ء، ۱۹۱۸ء تک۔ بلکہ ابھی ۱۹۱۸ء ہی چل رہا تھا کہ ایک دوست نے ایک انگریزی کی لکھی ہوئی کتاب بدھ مذہب پر تعریف کے ساتھ دی۔ اس سے خیالات میں انقلاب کی شروعات ہوئی اور مادیت کی صلابت و جمود پر پہلی بار ضرب لگی۔ ذہن نے کہا کہ مادیت کے سوا کچھ اور آوازیں بھی سننے کے قابل ہیں۔ جیسا اسی زمانہ میں بعض اور غیر معروف مذہبوں (مثلاً دینِ تھیوسوفی، جینی) کی کتابوں کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور ان کی باتیں بھی کچھ کچھ دل کو لگنے لگیں۔ ان ہلکی ہلکی لہروں کے ساتھ ایک طوفانی رَو ہندو فلسفہ تصوف کی آئی۔ ان کے ہاں کی مشہور کتاب "بھگوت گیتا" (مسز اینی بسنٹ کی ترجمہ کی ہوئی) نظر سے گزری، اور اس نے ایک زبردست ضرب کاری فلسفہ مادیت پر لگا دی۔ بنارس کے ڈاکٹر بھگوان داس اور دوسرے ہندو فلسفیوں، مفکروں، رشیوں اور یوگیوں کی کتابوں نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔ یعنی فرنگیت کے زہر کے لیے تریاق کا۔ اربندو گھوش کی کتابیں گو سمجھ میں نہ آئیں پھر بھی انہیں پڑھ گیا۔ جیکو اور لاؤزے بھی بھی اس مرحلہ میں بڑے معین و مفید ثابت ہوئے۔ اور دیکھتے دیکھتے میں ملحد و دہری سے ایک ہندو قسم کا صوفی بن گیا۔ اس دور میں جوگ بسشٹ کی قسم کی کتابیں بھی بہت کام آئیں۔ سال سوا سال اس دور کے گزرے ہوں گے اور نظر سے اب مسلمان درویشوں کے بھی ملفوظات اور خوارق، کرامات کے تذکرے بھی دلچسپی و عقیدت کے ساتھ گزرنے لگے تھے کہ حکمت کاملہ نے عین وقت پر دستگیری کی اور ایک عزیز کے ذریعہ سے مثنوی مولانا روم کا کانپوری نسخہ خوشخط، خوشنما، محشّی ۶ جلدوں میں ہاتھ لگ گیا۔ اس نے جادو کا اثر کیا۔ بیسیوں کیا سینکڑوں شعر مطلق سمجھ میں نہ آتے۔ لیکن تاثر کا یہ عالم کہ کتاب ایک مرتبہ کھول کر بند کر دینے کو جی ہی نہ چاہے۔ بس جی یہی چاہے کہ اسے بند کمرے میں تنہائی میں پڑھتے چلے جائیے اور چیخ چیخ کر روتے جائیے! اب قدرت کے کرشمے دیکھیے کہ مثنوی ختم بھی ہوئی تھی کہ مولانا شبلی کی سیرۃ النبی جلد اوّل دیکھنے میں آگئی اور اس سے ذات رسالت کے ساتھ جو بغض و عناد سا پیدا ہو گیا تھا وہ دور بلکہ کافور ہو گیا اور رسول اللہ صلعم نبی تو نہیں، البتہ ایک بڑے اچھے مصلح نظر آنے لگے۔ اس منزل پہ تھا کہ محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن ایک عزیز کے پاس دیکھنے کو مل گئی۔ اس نے تریاق کا کام کیا۔ اور اب میں توحید و رسالت دونوں کا قائل تھا اور قرآن کا مصدّق۔ حضرت اکبر الہ آبادی کی حکیمانہ گفتگو میں اور مولانا محمد علی کی نظمیں، خطوط اور گفتگو میں سب اس راہ نمائی و ہدایت یابی میں شریک حال رہیں۔ اور شاید سب سے بڑھ کر میرے والد مرحوم کی وہ درد و دل کے ساتھ نکلی ہوئی مخلصانہ دعائیں جو انہوں نے کعبہ پر ۱۹۱۲ء (دسمبر ۱۹۱۲ء) میں غلاف کعبہ پکڑ کر میری

اصلاح و ہدایت کے لیے ربِ کعبہ سے مانگی تھیں ان ہی کے سلسلہ میں آخری کتاب اسی نوعیت کی مکتوبات مجدد سرہندیؒ [illegible]
چھپے ہوئے خوش خط و خوش نما مثنوی نسخہ کے دو حصے جو میں نے قریب قریب سے پڑھ ڈالے اور اب میں ارتداد کے جنگل سے نکل چھوٹ کر
از سرِ نو اسلام و ایمان کے دائرہ میں داخل ہوا۔

۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۸ء تک نو دس سال کی مدت سرتاسر گمراہی میں گزری۔ ۱۹۱۸ء کے اواخر سے ہلکی ہلکی روشنی ہدایت کی نصیب
ہونے لگی ۱۹۲۰ء کے آغاز میں بحمد اللہ پورا مسلمان تھا۔ نماز شروع کی پہلے پہل بالکل چھپ کر جب بیوی نے کسی وقت دیکھ لیا تو لوگوں کو دفعتہ
معلوم ہوا۔ ایک زمانہ تک بزرگوں کے مزاروں پر حاضری کا شوق رہا لکھنؤ، رودولی، دیوہ، بانسہ وغیرہ کا ذکر ہی نہیں حد یہ کہ اس کے کئی بار پھیرے
کیے اور اجمیر کے عرس میں بھی حاضر ہوا۔ خود اپنے گھر میں ایک عرس قائم کیا۔ محفلِ سماع میں کثرت سے شریک ہوتا اور اکثر گریہ طاری رہتا۔
وطن کے ایک قوال سے خاص طور پر وابستگی رہی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں مطالعہ قرآن و حدیث کا بڑھتا گیا اور علمائے دیوبند سے قربت
ہوتی گئی یہ شوق بھی کم ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۰ء میں بالکل ختم ہو گئے۔ معاصر مذہبی و روحانی شخصیتوں میں متاثر سب سے زیادہ حکیم
الامت مولانا اشرف علی تھانوی سے رہا۔ باقی کم و بیش دینی و روحانی استفادہ بہت سے دوسرے حضرات سے بھی کیا۔ مولانا حسین احمد مدنی
مولانا محمد علی، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ ہم۔ عقائد اہلِ سنت والجماعت پر قائم ہوں لیکن
دوسرے کلمہ گو فرقوں کی بھی تکفیر نہیں کرتا بلکہ حتی الامکان ان کے اقوال کی تاویل ہی کر لیتا ہوں۔ فقہ حنفی کا قائل ہوں، آنکھیں اسی میں کھلیں لیکن
محدثین اور دوسرے ائمہ فقہ کی بھی دل سے عظمت کرتا ہوں۔ اور کبھی کبھی ان کے طریقہ پر عمل بھی کر لیتا ہوں۔ عقائد کا بیان اجمالاً ہو چکا۔ اعمال
صالحہ سرے سے بیان کے قابل ہی نہیں جو ان کا ذکر درمیان لایا جائے۔ عملی کمزوریاں بے شمار ہیں اور سن جب ۸۰ سے اوپر ہو چکا تو
اب ان کی اصلاح کی بھی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اللہ کی رحمت بے پایاں اور عفو بے حساب پر بھروسا اگر نہ ہو تو اپنے اعمال و احوال کے لحاظ
سے تو شاید نجات سے بھی مایوسی ہی ہو جائے۔

صحت بہت اچھی تو لڑکپن، جوانی، اپنی یاد کے کسی دور میں بھی نہیں رہی۔ لیکن خیر کچھ ایسی بری کہنے والی بھی نہیں بے احتیاطیاں طرح
طرح کی کرتا رہا خصوصاً غذا کی، ورزش سے گویا تعلق ہی نہ رکھا اور نہ دانتوں کی صفائی پر کبھی توجہ رکھی نہ آنکھوں سے کام لینے میں روشنی
یا طرز نشست وغیرہ کا کوئی اہتمام رکھا مسلسل بد پرہیزیاں آخر کب تک رنگ نہ لاتیں۔ بال بہت قبل از وقت سفید ہو گئے۔ دانت ایک
کے بعد ایک برابر گرتے گئے ماءِ پیا (نزدیک بینی یعنی "کوتاہ بینی") کے مرض نے لڑکپن ہی سے آنکھوں کو عینک کا خوگر کر دیا تھا۔ آگے
چل کر ہوش آیا اور عمر جب ۴۵ اور ۵۰ کے درمیان ہو گئی تو لکھنؤ کے بڑے مخلص و محترم بزرگ مولوی محمد نسیم صاحب (نامور ایڈووکیٹ)
نے خاص طور پر چونکایا۔ اس وقت سے صحت پر توجہ کی اور ہلکی پھلکی ورزش کے لیے بھی وقت نکالا۔ گرتی ہوئی صحت اللہ کے فضل سے سنبھل
گئی۔ دانت تو خیر اب سب جا چکے اور آنکھ سے بھی اب کام رات کو ذرا بھی نہیں لے سکتا۔ شام کے جھٹ پٹے یا فجر کے دھندلکے یا ابر
غلیظ کے وقت دن میں بھی نہیں لے سکتا اور گراں گوشی بھی چند سال سے عارض ہو گئی ہے۔ ۸۱ سال کے سن میں خوب کھا پی لیتا ہوں اور چل پھر
بھی اچھا خاصہ لیتا ہوں۔ رات کو نیند بھر سوتا ہوں۔ البتہ تیز چلنے سے مقامِ قلب پر تکلیف سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اور زینے بہت زیادہ
نہیں چڑھ سکتا کام کے اوقات قدرتاً بہت گھٹ کر اب صرف دن کے چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔

علوم و فنون، زبان و ادب کسی شعبہ میں بھی کمال حاصل کرنا نصیب میں نہ تھا۔ وصفِ امتیازی بے کمالی میں رہا۔ اردو اپنی مادری زبان

تھی۔ خیر ٹوٹی پھوٹی کسی حد تک آگئی گو اس میں بھی جتنی خامیاں ہیں، سب مجھ پر خوب روشن ہیں۔ انگریزی لکھنے کی مشق ایک زمانہ میں کچھ تھوڑی بہت تھی۔ ہندوستان کے روزناموں اور رسالوں میں تو خاصی مضمون نگاری کر لیتا تھا، پرچوں میں بھی دو ایک بار جسارت کر بیٹھا تھا۔ اور اواخر ۱۹۱۴ء میں تو ایک چھوٹی سی کتاب بھی "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" کے عنوان سے ایک لندنی پبلشر کے ہاں چھپوا دی تھی۔ اور ۱۹۴۲ء سے ۱۹۵۲ء تک کا وقت لگ لپٹ کر انگریزی ترجمہ تفسیر قرآن میں صرف کر دیا تھا۔ لیکن اب سالہا سال سے یہ مشق بھی بالکل چھوٹ چکی ہے۔ اور جب بھی کوئی معمولی سی تحریر انگریزی میں ناگزیر ہوتی ہے تو سوچ سوچ ہی کر لکھ پاتا ہوں۔ ایک زمانہ میں خبط فرنچ زبان سیکھنے اور اس کے بہت بعد جرمن زبان سیکھنے کا رہا۔ اور جرمنی کی کئی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ پھر ان کے لیے بھی وقت نہ نکال سکا۔ اور جو کچھ دماغ میں آگیا تھا۔ سب صاف ہو گیا۔ رہی عربی تو سالجی عربی کی بساط ہی کیا۔ جسارت ہی جسارت تھی کہ ترجمہ و تفسیر قرآن کے لیے قلم ہاتھ میں اُٹھایا اور اللہ نے اپنے اس بے علم بندے کی لاج اس حد تک رکھ لی کہ نشستم پشتم کام کو انجام تک پہنچا دیا۔ حقیقتاً اسے بس قرآن مجید ہی کا ایک زندہ معجزہ سمجھنا چاہیے۔

ایک طرف اپنی علمی بے بضاعتی کو دیکھتا ہوں اور ایک طرف اپنے ان کاموں کو جو کسی نہ کسی طرح بہرحال انجام کو پہنچ ہی گئے ہیں تو بس حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہوں۔ بہ قول شخصے ؎

ہے آرزو کہ ابروئے پُرخم کو دیکھیے — اس حوصلہ کو دیکھیے اور ہم کو دیکھیے

کتابوں اور اخبار کے لیے حسنِ قبول بھی تمامتر ایک عطیہ الٰہی ہے۔ صدق کے شذرے اور سچی باتیں اس کثرت سے ہندوستان کے اندر اور باہر (یعنی پاکستان اور برما میں) نقل ہوتی ہیں کہ اتنی کسی اور پرچہ کی نہ ہوتی ہوں گی اور کتابوں کی اشاعت بھی شکر کے قابل ہے۔ مالی مستقل آمدنی تو اس وقت تک وہی ایک سو پچیس روپے ماہوار کی علمی پنشن کی ہے جو حیدرآباد سے اب اپنے صوبہ اُتر پردیش کو منتقل ہو آئی ہے۔ باقی کتابوں اور اخبار کے فروخت، نیز کتابوں کی رائلٹی وغیرہ سے کئی ہزار سالانہ کی ہو جاتی ہے۔ اور گھر کا اُجلا خرچ بہ آسانی چل جاتا ہے۔

خوش لباسی کا شوق مدت دراز ہوئی ترک ہو چکا ہے۔ موٹا مہین، اُگالدعا جیسا بھی مل جاتا ہے بہ خوشی پہن لیتا ہوں۔ پیوند لگے ہوئے لباس سے بھی احتراز نہیں۔ کھانے کا شوق البتہ اب تک ہے۔ مگر وہ بھی بڑی حد تک قابو کے اندر۔ اور یہی حال مکان کا ہے۔ مکان وسیع اور آرام دہ چاہتا ہوں۔ آسائش کا حریص رہتا ہوں۔ مگر آرائش کا نہیں۔ مزاج کا غصہ ور بچپن سے ہوں۔ جوانی بھر غصہ سے بے طرح مغلوب رہا۔ میلان و صلاحیت اب بھی وہی ہے۔ البتہ اب کچھ تو سن اور تجربہ کے اثر سے اور کچھ حضرت تھانوی کے فیض تربیت سے کبھی کبھی غصہ کو دبا لینے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ حرصِ دنیا میں بھی گرفتار رہتا ہوں۔ بندوں کے حقوق کی ادائی اب بھی نہیں کر پاتا ہوں۔ اور پچھلا حساب جو سر و پشت پر لدا ہوا ہے اس کا تو حساب ہی نہیں۔ عبادت میں بھی حد درجہ کاہل اور متساہل ہوں تو آسانی اور عافیت کوشی کو ہر چیز پر مقدم رکھتا ہوں۔ جد و جہد کیا، زیادہ سخت و پُرمشقت صعوبتوں کے قریب بھی نہیں جاتا۔

بیعت ضابطہ سے مولانا سید حسین احمد مدنی سے ۱۹۲۸ء میں کی۔ اس وقت تک بیعت کی حقیقت سے بھی واقفیت نہ تھی۔ دل میں یہ جا ہوا تھا کہ جو بھی بزرگ و صالح نظر آئے بس وہ اس قابل ہے کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا جائے۔ چنانچہ کئی سال قبل مولانا محمد علی کے اخلاص و للّٰہیت کو دیکھ انھیں سے بیعت کا ارادہ کر لیا تھا۔ پھر اس کے بعد جب حضرت تھانوی کے ہاں آمد و رفت زیادہ ہوئی اور ان کی کتابیں بھی آنکھ کھول کر پڑھیں، جب سمجھ میں آیا کہ اوّل تو مرشد اور مرید میں مناسبت ہونا ضروری ہے اور پھر مرشد کا مرتبہ بزرگی و مقبولیت عنداللہ جیسا بھی ہو، اسے اصلاح نفس کے کام کا ماہر ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت تھانوی ہی کی خدمت میں نیاز مندی بڑھتی گئی اور اپنے

ظرف و بساط کے لائق جو کچھ بھی حاصل ہو سکا، سب اسی آستانے سے حاصل ہوا ـــــ یوں اکبر الٰہ آبادی اور مولانا محمد علی سے بھی بہت کچھ سیکھا۔

کتابوں میں بعد کتاب الٰہی کے، پھر جس کتاب سے عشق کی سی کیفیت ہے وہ مثنوی مولانائے روم ہے۔ سیکڑوں شعر اب بھی سمجھ میں نہیں آئے ہیں جب بے سمجھ میں آئے ہوئے بھی وہ موثر ہیں۔ تاثر کے لحاظ سے کچھ یہی حال کلام اقبال کے بھی ایک حصہ کا ہے گو سارے کلام کا نہیں۔ محض شعر و شاعری کا جہاں تک تعلق ہے۔ دیوان غالب کا مرتبہ بھی کم نہیں۔

زندگی پر تبصرہ کرنے بیٹھتا ہوں تو احسانات الٰہی بے حد و حساب نظر آتے ہیں۔ پیدائش اچھے کھاتے پیتے لکھے پڑھے گھر میں ہوئی۔ والدین اچھے ملے۔ بھائی بہن اچھے ملے۔ صحت کی نعمت ملی۔ بہترین اعلاترین صحبتوں تک رسائی ہوئی کوئی بھی دور زندگی کا خصوصی حسرت کا نہ آیا۔ بیوی اچھی ملیں اولاد اچھی ملی وقت کے بہترین بزرگوں سے فیض کا موقع مل گیا۔ اللہ والوں اور دنیا والوں دونوں کے دلوں میں اللہ نے محبت ڈال دی۔ اتار چڑھاؤ کس کی زندگی میں نہیں ہوتے۔ میرے لیے بھی پیش آئے۔ الحمد اللہ کہ خیر کا پہلو شر پر غالب رہا۔ یہ سب کچھ اُدھر سے ہوا۔ اِدھر سے ثبوت کم ظرفی ہی ملتا رہا۔ بڑوں، چھوٹوں، رفیقوں، دوستوں، زیر دستوں، کسی کے بھی حق پورے نہ ہو سکے بلکہ بعض کی تو شدید حق تلفیوں کا بار اپنے سر پر رہا۔ اللہ زندگی کا اگر یہ موقع دیتا تو تجربہ کے بعد شاید بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہ جاتا اور خدمت قرآن ہی میں عمر تمام کر دیتا۔ اب بھی امید رحمتِ کاملہ سے یہی ہے کہ بغیر کسی استحقاق کے اپنے دامنِ عفو میں پناہ دے اور مواخذہ و باز پرس کا سوال ہی سرے سے حذف کر دے۔ (بہ شکریہ نقوش لاہور)

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیفی زندگی کا آغاز ایک فلسفی اور اُردو شعر و ادب کے ایک نقاد کی حیثیت سے ہوا، مطالعہ کے وسیع اور رسا، نظر میں وسعت اور ذہانت و فطانت خداداد، اس زمانے کے باکمال اربابِ قلم کی معیت و صحبت، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ انشا و تحریر کا ایک منفرد اسلوب، ان سب چیزوں نے مل جل کر عنفوان شباب میں ہی اُردو زبان کا ایک ممتاز ادیب اور مصنف بنا دیا، مولانا نے تذکرہ و سوانح، شعر و ادب، تاریخ و فلسفہ اور اجتماعی مسائل، ان سب پر بہت کچھ لکھا اور اچھے سے اچھا لکھا۔

مولانا نے باقاعدہ کبھی اور کہیں ملازمت نہیں کی، تعلیم سے فراغت کے بعد کچھ دنوں دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے منسلک رہے اور منطق و فلسفہ کی بعض کتابوں کو انگریزی سے اُردو میں منتقل کیا، مگر وہاں جی نہ لگا اور وطن چلے آئے یہاں آکر ایسے جمے کہ بڑے بڑے انقلابات آئے، زمین اور آسمان زیر و زبر ہو گئے، مگر مولانا اپنے قصباتی کنج عافیت سے نہ نکلے اور ساری عمر وہیں گذار دی۔ ـــــ (مولانا سعید احمد اکبرآبادی)

موت سے کس کو رستگاری ہے، مگر مولانا سپرد خاک ہوئے تو ان کے سینہ میں علم کی جو ہمہ گیری، قلم کی جو صاحب قرانی، تحریر کی جو برق وشی، علم و عرفان کی جو فرمانروائی، اور اسلام کی عزت و ناموس کی خاطر جو قلمی سرفروشی اور جانبازی تھی وہ بھی ان کے ساتھ تہِ خاک ہو گئی، علم بقا کے مسافر! تجھ پر رحمت، تیری روح پر رحمت، تیرے قلم کی اس کوہ کنی پر رحمت جس سے جوئے شیر بہتی نظر آتی، الوداع، السلام، تو جا چکا، مگر تو زبان حال سے کہتا گیا ـــــ (معارف، اعظم گڈھ)

نقد و نظر

تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے۔

ریڈیو ڈرامے کی تاریخ

مصنف ڈاکٹر اخلاق اثر - صفحات ۴۸ قیمت چار روپے
ملنے کا پتہ: مصنف، شعبۂ اردو، ریجنل کالج آف ایجوکیشن، بھوپال

اس مختصر سے کتابچے میں مصنف نے ریڈیو ڈرامے کی تاریخ اچھے انداز میں پیش کی ہے۔ اگرچہ تمہید میں انگریزی ڈراموں کا بھی ذکر ہے لیکن یہ تاریخ صرف اردو ریڈیو ڈراموں سے متعلق ہے۔ ایک خامی جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ مصنف نے زیادہ تر شمالی ہند کے ڈرامہ نگاروں اور دہلی اور لکھنو یا لاہور سے نشر ہونے والے ڈراموں کو پیش نظر رکھا۔ گو ابتداء میں اچھے اور معیاری ریڈیو ڈرامے دہلی، لاہور اور لکھنؤ کے علاوہ بمبئی اور حیدرآباد سے بھی نشر ہوتے رہے۔ ڈرامہ نگاروں میں خصوصیت سے سید بادشاہ حسین اور ناکارہ حیدرآبادی کے ذکر کا نہ پایا جانا ایک بڑی کمی ہے۔ ۴۲ء بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں کو سلسلہ وار ریڈیائی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس پیش کش کے مصنف اور ہدایت کار بادشاہ حسین تھے۔ بہرحال یہ کتابچہ آئندہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

(غلام جیلانی)

دھوئیں کے آنچل

(ڈرامے) مصنف ابراہیم یوسف۔ صفحات ۲۶۷ قیمت ۵/۰
ملنے کا پتہ: نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ، لکھنو

ابراہیم یوسف صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اچھے ڈرامے لکھے جائیں تو اسٹیج خود بخود دل جائے گا۔ اب آئیے دیکھتے ہیں کہ خود ابراہیم یوسف صاحب نے جو چھ ڈرامے لکھے ہیں وہ کس معیار کے ہیں۔ ایک ڈرامہ کو اچھا ڈرامہ بنانے میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ہمارے اپنے خیال میں ڈرامے کی خصوصیات یہ ہیں ۱۔ کردار نگاری ۲۔ چست مکالمے ۳۔ ڈرامہ پڑھنے یا اسٹیج پر دیکھنے والے کے لئے بین السطور مواد دینے۔ ابراہیم یوسف صاحب کے دو ڈرامے "وقت کے کراہتے رنگ" اور "کاغذی دھجی" میں تقریباً جملہ کردار ذہنی ہیں۔ اس طرح یہ دو ڈرامے ایک ہی ڈرامے کے دو ایکٹ نظر آتے ہیں۔ "مغلوب غالب" غالب کی زندگی اور ۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ایک تصویر ہے لیکن اس ڈرامے میں ابراہیم یوسف صاحب کردار نگاری کے وہ جوہر نہ دکھا سکے جو متذکرہ بالا دو ڈراموں میں نظر آتے ہیں۔ ڈرامہ "دھوئیں کے آنچل" میں کردار نگاری تو ہے لیکن مکالمے خیال کی پوری ترجمانی نہیں کرتے۔ "زبیدہ" "ننھی خوشیاں" کچھ ادھورے ادھورے سے نظر آتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ڈرامائی ادب کو اجاگر کرتے ہیں۔ ابراہیم یوسف صاحب کی کوشش لائق ستائش ہے۔ ——— (غلام جیلانی)

نایافت

(مجموعۂ کلام) حامدی کاشمیری صفحات ۱۳۲ قیمت ۴/۲ روپے
ملنے کا پتہ: ناشر ادارۂ ادب ۳۹۶/ جواہر نگر، سری نگر، کشمیر

گذشتہ پندرہ سولہ برسوں میں جن شاعروں کے کلام کو پڑھتے ہوئے ندرت اور تازگی سے لطف حاصل کرتا رہا ہوں، ان میں

حامدی کاشمیری قابلِ ذکر ہیں۔ حامدی کاشمیری کی شاعری کا طرز جداگانہ ہے۔ نہ تو وہ انتہا پسند طور پر علامتی شعوری رویئے کے مؤید ہیں اور نہ ہی عنوان کی ماتحت شاعری کے اسیر۔ اس مجموعۂ کلام میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں۔ نظموں میں تجربات اور احساسات کی شدت ہے تو غزلیں دقیقوں سے معمور۔ ایک اور خوبی جو غزلوں میں ملتی ہے وہ ردیف اور قافیہ کو لفظی طور پر ضابطے کی بجائے ان کو نئے انداز میں برتنے کا ذوق۔ میں کسی بھی مجموعۂ کلام کو اس کے پیش لفظ کے پس منظر میں پڑھنے کا قائل نہیں اور نہ ہی پیش لفظ پر بحث کر کے کلام میں اختلافی عنصر کی تلاش پسند کرتا ہوں کیونکہ فن ایک غیر شعوری تخلیقی تحریک کا نتیجہ ہے۔ جب کہ تنقید و تبصرہ شعوری اور منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حامدی کی شاعری کے علامتی اور تشبیہاتی نظام میں عمومی زندگی کے عناصر، خصوصاً مناظر کے اجزا ملتے ہیں، مثلاً درخت، دھواں، غبار، جگمگاتی راہیں، برگ، شاخ، سڑک، پیلی دھوپ، چٹانیں، پرچھائیاں اور سمندر وغیرہ

حامدی کی شاعری میں یا تو فاعل متکلم ہوتا ہے یا ایک پس پردہ کردار۔ نئی زندگی کے مختلف دقیقوں (phenomena) کا استعاراتی طور پر انعکاس، شہر کے درمیان لوگوں کا حال، نشاط کی صورت میں کرب کا سایہ اور کئی اسی قسم کے تجربات ان کی نظموں اور غزلوں میں زیب و زینت ہیں۔ کچھ اشعار اور نظموں کے گوشے پیش ہیں۔

کبھی تو دیکھو درختوں کا حال رات گئے　　ہیں برگ و شاخ پہ کالے سوال رات گئے

میں کس کو ساحلِ شب سے صدائیں دیتا ہوں　　مرا مذاق اڑاتا ہے موج موج کوئی

•

دھواں دھواں سی تقدس مآب آنکھوں سے
وہ مجھ کو تکتی رہی
امڈتے کالے سمندر میں اک منارۂ نور
ابھر ابھر کے تھکی روشنی کا درد لئے
تمام رات سحر کو پکارتا ہی رہا
میں لہر لہر خموشی پہ سورۂ یٰسین　　(یٰسین)

•

میں نے اپنی آنکھوں سے
پیڑوں کو
روتے دیکھا ہے　　(روتے پیڑ)

ان مثالوں سے بھی واضح ہوگا کہ حامدی نئی لفظیات اور نئے فکری نظام کی تخلیق کے لئے کوشاں اور انفرادیت کی تلاش میں ہیں۔ اس مجموعۂ کلام میں وہ بہر صورت کامیاب نظر آتے ہیں اس طرح بھی کہ شدید احساس کو نئے لب و لہجہ میں کہنے کی کوششیں نامانوس نہیں لگتیں۔ اگرچہ شاعر کی ذاتی شراکت (involvement) کم محسوس ہوتی ہے۔ حیات و ممات کے اس رنگا رنگ ماحول میں سب سے فراواں جو صورتِ حال ہے وہ کرب انگیز ہے۔

خوبصورت علاقوں کے جنگل میں چھپے ہوئے ناداری اور مایوسی کے بھوندے ایک استعجابی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ اس تضادی کیفیت کو عادی نے اپنے کلام میں نقش کیا ہے۔ خوبصورت موسموں میں انسانی زندگی گل و گلزار کے تلازمے سے آشنا ہوتی ہے۔ عادی نے ایسا محسوس ہوتا ہے کشمیر کے علاقوں اور تشبیہاتی مناظر و حالات، وہاں کی عوامی زندگی کی کشمکش سے کافی شعوری اکتساب کیا ہے اور اسے وسیع کر دیا ہے۔ مجموعہ کی کتابت و طباعت اچھی اور گٹ اپ مناسب ہے، اور یہ مجموعۂ کلام ایک اہم ادبی اضافہ ہے۔

(اسلم عمادی)

دیوانِ ناطق

(انتخاب کلام مولانا ناطق گلاوٹھوی) مرتبہ محمد عبدالعلیم، صفحات ۲۲۴ مع گرد پوش
قیمت ۱۰/- ناشر: محمد عبدالعلیم، قدوائی روڈ، مومن پورہ، ناگپور ۱۸ مہاراشٹر

مولانا ابوالحسن ناطق گلاوٹھوی (۱۸۸۴ء - ۱۹۶۹ء) کا شمار بیسویں صدی کے ان اساتذہ شعراء میں ہوتا ہے جو اردو کی کلاسیکل شاعری کے پاس دار، محافظ اور نگران تھے۔ ان کا شمار داغ، امیر کے بعد کے اکابر شعراء میں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ناطق کا کلام اردو کی کلاسیکل شاعری کی نمائندگی کرتا ہے۔ مولانا ناطق نے اپنی دینی حیثیت کو ادبی حیثیت سے متاثر ہونے نہیں دیا۔ وہ ایک عالم دین تھے۔ انہوں نے اسی وضع داری کو شاعری میں بھی نبھایا ہے۔ وصل و ہجر، جذبات حسن و عشق، عدو و رقیب، گل و بلبل جیسے موضوعات کو چھوڑ کر جو اس وقت کے لحاظ سے شاعری میں فرسودہ سمجھے جاتے تھے، ناطق صاحب نے اس کمی کو محاورہ بندیوں سے پورا کیا ہے، جن سے زبان و بیان کی سلاست میں ایک گونہ دلچسپی پیدا ہوگئی۔ یہ محاوراتی شاعری زبان و بیان پر استادانہ مہارت اور قدرت چاہتی ہے۔ اُن کے قصبے کی زبان مرزا داغ دہلوی کی نظر میں مستند تھی۔ ناطق صاحب نے اس فن کو خوب خوب سنوارا، نکھارا اور اپنا ایک رنگ اور اپنی ایک الگ وضع بنائی۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

ناطق نہ ہو جو بات تو بولے نہ آدمی　　　بولے تو اس میں بات بھی پیدا کرے کوئی

اللہ سب وہ کیا ہوئے آخر کدھر گئے　　　یارانِ رفتہ کی تو خبر بھی نہیں ملی

ناپنا تھا مجھے غم، عمر کے پیمانے سے　　　رہ گیا کام ادھورا مرے مرجانے سے

میں کہاں ہوں شبِ غم گھر میں بلا کون سی ہے　　　سانس گھٹتی ہے الٰہی یہ فضا کون سی ہے

اڑا دیں ہم تو شیشے کی پری کے ساتھ تجھ کو بھی　　　اڑانی ہو اگر منظور واعظ ہم کو بے پر کی

ہے دکن میں بیٹھ کر ناطق زباں دانی پہ ناز　　　دور رکھ یہ دل ابھی نادان دلّی دور ہے

کہاں تک ناطق کے اشعار سناتے جائیں۔ دیوانِ ناطق پڑھیے، لطف لیجئے اور اپنی پسند کے اشعار خود چن لیجئے۔ اشعار کے انتخاب میں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی بلکہ جس غزل پر نظر پڑے گی، دو ایک شعر یقیناً ایسے نظر آئیں گے جہاں نظر از خود رک جائے گی۔

(امین تابش)

آندھرا پردیش لگاتار ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے

(اشتہار)

صنعت کاروں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ یہاں صنعتوں میں سرمایہ معروف کریں۔ پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کے قیام کے لئے حسب ذیل ترغیبات اور مراعات میسر ہیں۔

۱۵ فیصد مرکزی امداد ' (۸۹) پنچایت سمیتیوں میں۔

۱۰ فیصد ریاستی مالی امداد تمام تعلقوں میں ۶ نکاتی ذرمولے کے تحت۔

۲۰ فیصد ریاستی مالی امداد تمام قبائلی اور ایجنسی علاقوں میں۔

علاوہ ازیں متذکرہ بالا تمام علاقوں میں املاک اور قائم سرمائے پر ۱۰ فیصد بلا سودی سیلس ٹیکس قرض۔

مختصر یہ کہ حیدرآباد و سکندرآباد کے دونوں شہروں اور وشاکھاپٹنم و وجئے واڑہ کے سوائے ریاست کے پورے علاقے میں یا تو ریاستی امداد یا مرکزی امداد یا پھر سیلس ٹیکس قرض کی صورت میں سہولتیں موجود ہیں۔

غرضکہ ہماری ریاست میں صنعت کاروں کو صنعتی ارتقاء کے لئے عظیم اور بافراط مواقع دستیاب ہیں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش
حیدرآباد

DIPR: 29/76-77/374/ADVT/C3

ادبی سرگرمیاں

اُردو نامہ : علمی ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

۵۔ دسمبر : نامور دانشور اور نقاد ڈاکٹر عالم خوندمیری (سابق پروفیسر فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی) کینیڈا اور یوروپی ممالک کے دورہ کے بعد حیدرآباد پہونچے۔ پروفیسر عالم نے وہاں کی جامعات میں کئی لکچر دیئے۔

۷۔ دسمبر : اُردو اکیڈمی آندھراپردیش کی مجلس انتظامی کے اجلاس میں ۱۹۷۶ء میں وفات پانے والے دانشوروں ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کی اجتماعی قرارداد تعزیت کے ذریعہ خراج عقیدت ادا کیا گیا۔ جن میں پنڈت یم نرسنگ راؤ (ایڈیٹر رعیت) نجم آفندی، اشفاق حسین، میر حسن، ڈاکٹر ولی الدین، غلام ربانی، ریحانی، آغا حیدر حسن، کامل شطاری، دامودر ذکی اور احمد مکی کی وفات پر رنج و ملال کا اظہار کیا گیا۔

۸۔ دسمبر : اردو اکیڈمی آندھراپردیش نے ۱۹۷۶ء کے لئے اردو کے ۶۴ مصنفوں کو ان کی مطبوعات پر ۳۱ ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا (سب رس نومبر ۷۶ء میں تفصیلات شائع کی جاچکی ہیں) جناب آصف پاشا، ریاستی وزیر قانون و صدر اکیڈمی نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ اکیڈمی نے حیدرآباد میں اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ موصوف نے اس امر کا اظہار کیا کہ آئندہ سال اکیڈمی کو ریاستی حکومت کی طرف سے زیادہ گرانٹ ملنے کی توقع ہے موصوف نے اکیڈمی کی طرف سے چلائے جانے والے اُردو مدرسہ اور بُک ڈپو سے بھی واقف کرایا۔ اس موقع پر جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی اُردو اکیڈمی نے بتایا کہ ریاست کے ۱۵ کتب خانوں کو اکیڈمی کی طرف سے ۱۳ ہزار روپے کی امداد منظور کی گئی ہے پریس کانفرنس میں جناب بھارت چند کھنہ سکریٹری و ڈائرکٹر اکیڈمی اور جناب اختر حسن اسسٹنٹ سکریٹری بھی موجود تھے

● پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن ترقی اُردو نے ایک صحافتی بیان کے ذریعہ آندھرا کے اضلاع گنٹور، کڑپہ اور کرنول میں اُردو ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا پُرزور مطالبہ کیا۔

۱۰۔ دسمبر : بزم کہکشاں کا ادبی اجلاس جناب پرویز یداللہ مہدی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مظہر الزماں، یوسف شکیل اور داؤد رفیق نے طنز و مزاح سے عبارت تحریریں پڑھیں، شمیم نصرتی، مصطفےٰ نیاز اور اشرف نہال کے علاوہ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۱۱۔ دسمبر : نواب علی یاور جنگ گورنر مہاراشٹرا کا بمبئی میں انتقال ہوا اور دوسرے دن حیدرآباد میں تدفین عمل میں آئی۔

● جناب حیات اللہ انصاری صدر ترقی اردو بورڈ (وزارت تعلیم حکومت ہند) نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقدہ ایک علمی محفل میں "مولانا ابوالکلام آزاد اور اُردو صحافت" کے زیر عنوان مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کے اخبارات لسان الصدق، الہلال اور البلاغ تاریخ صحافت کا عظیم ورثہ ہیں۔ مولانا کی تحریروں سے ملک آج بھی فیضان حاصل کر رہا ہے۔ پروفیسر سید علی اکبر نے اس تقریب کی صدارت کی۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ ادا کیا۔

● اُردو محاذ کا ادبی اجلاس مولانا ابویوسف (یم یل سی) کی صدارت میں منعقد ہوا، مولانا نے صدارتی تقریر میں شاعروں اور ادیبوں کو مشورہ دیا کہ وہ قومی یکجہتی کے فروغ میں اپنی صلاحیتیں صرف کریں۔ محفل شعر میں منوہر لال بہار، معین نیئر، امام [illegible] فدا اور سعادت جہاں رضوی نے کلام سنایا۔

۱۲۔ دسمبر : اقبال اکیڈمی کی ماہانہ محفل اقبال جناب خلیل اللہ حسینی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر غیاث صدیقی اور جناب محمد منظور احمد نے علی الترتیب "غالب اور اقبال"

"پیامِ اقبال کے چند پہلو" پر مقالے سنائے۔

● حلقۂ اربابِ ذوق کی طرف سے نظامس اُردو لائبریری ہال میں ڈاکٹر سید عبدالمنان کی صدارت میں "اُردو کے مسائل" پر ایک سیمنار منعقد ہوا۔ جناب حیات اللہ انصاری صدر ترقی اردو بورڈ نے عالمانہ تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "عصری علوم کے ذخائر کو اردو میں منتقل کرنا وقت کا اہم تقاضہ ہے" موصوف نے اُردو والوں پر زور دیا کہ وہ نئی نسلوں کے لئے زبان کے علمی خزانے کو مالا مال کریں۔ بیگم سلطانہ انصاری نے اردو کے تعلیمی مسائل پر بصیرت افروز تقریر کی اور یورپ میں باسانی اردو سیکھنے کے لئے مرتبہ نصاب نامہ اور طریق تعلیم سے واقف کرایا۔ ڈاکٹر بشارت بدر لوی (پرنسپل پبلیکیشنز آفیسر بورڈ) نے کہا کہ حکومت ہند کی طرف سے اُردو زبان اور ادب کی ترقی کے سلسلہ میں جو مفید اقدامات کئے جا رہے ہیں ان سے اُردو والوں کو استفادہ کرنا چاہیئے۔ جناب ابوالفیض سحر (اسسٹنٹ ڈائرکٹر ترقی اردو بورڈ) نے اردو کو زندگی اور حرکت کا جزو بنانے پر زور دیا۔ ابتدا میں جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر نظامس لائبریری نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ اس موقع پر علی یاور جنگ کی وفات پر قرارداد تعزیت بھی منظور کی گئی۔ احمد علی صاحب شریک معتمد نے شکریہ ادا کیا۔

● راجستھان گریجویٹ اسوسی ایشن کی طرف سے اُردو ہندی کا ملا جلا مشاعرہ جناب کیپٹن حسین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ نامور صحافی جناب محبوب حسین جگر (جوائنٹ ایڈیٹر "سیاست") مہمان خصوصی تھے۔ اُردو کے شعراء میں صلاح الدین نیّر، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، مظفر النسا ناز اور اسحٰق ملک نے کلام سنایا اور خوب داد بھی پائی۔

۱۳۔ ڈسمبر جناب حیات اللہ انصاری صدر ترقی اردو بورڈ پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے بورڈ کی کل ہند پیمانے پر کی جانے والی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "ترقی اُردو بورڈ رسم الخط میں مناسب تبدیلیوں پر غور کر رہا ہے اور نستعلیق کو سائنٹفک اور عصری طرز کا بنانے اور کتابت کے استعمال میں آنے والی سیاہی کو عصری ادویات سے اعلیٰ پیمانے پر تیار کرنے کی افادیت پر زور دیا اور کہا کہ اردو کی ترقی کے لئے مرکزی وزارت تعلیم کی طرف سے قائم کردہ یہ بورڈ اُردو ذریعہ تعلیم کی درسی کتابوں کی قلت کو دور کرنے کے لئے تیزی سے کوشاں ہے۔ اس دوران بورڈ کے پراجکٹ میں ۴۰ سے زائد درسی کتابیں حیدرآباد ہی میں طباعت، ترتیب اور کتابت کے مراحل سے گزر رہی ہیں اور کئی ایک چھپ کر طلبہ کے استفادہ کا باعث بن چکی ہیں۔ جناب انصاری نے بتایا کہ بورڈ نے اب تک ۸۲ کتابیں شائع کی ہیں اور گزشتہ ۶ ماہ میں تقریباً ۳۰ ہزار مطبوعات فروخت کی جا چکی ہیں۔ موصوف نے کہا کہ ریاستی اُردو اکیڈیمی کے ڈپو سے بورڈ کی تمام مطبوعات حیدرآباد میں فروخت کے لئے فراہم کی جا رہی ہیں۔ کانفرنس کے موقع پر بورڈ کے عہدیدار ڈاکٹر بشارت بدر لوی، ابوالفیض سحر کے علاوہ پروفیسر فضل الرحمٰن چیف ایڈیٹر اردو انسائیکلو پیڈیا اور ابوالکلام ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈائرکٹر خواجہ محمد احمد صاحب بھی موجود تھے۔

۱۴۔ ڈسمبر کو ایوانِ اردو میں بصدارت جناب حیات اللہ انصاری مرکز خوشنویسی ادارہ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ ادارہ اور مرکز خوشنویسی کی طرف سے انصاری صاحب کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ و یوپی نے مرکز خوشنویسی کے طلبا و طالبات کو سندیں تقسیم کیں۔ صدر نشین مرکز خوشنویسی جناب عابد علی خاں نے سالانہ رپورٹ سناتے ہوئے کہا کہ مرکز خوشنویسی کے کئی طلبہ و طالبات کتابت سیکھ کر مختلف اخبارات و رسائل اور اشاعتی اداروں میں اپنے روزگار آپ پیدا کر رہے ہیں۔ جناب اکبر علی خاں نے انصاری صاحب بیگم سلطانہ انصاری اور مرکزی حکومت کی اردو دوستی کے رجحانات کی ستائش کی اور وزیر اعظم اندرا گاندھی کی اس زبان کے تعلق سے جو ہمدردیاں پائی جاتی ہیں ان کی تعریف کی اور بورڈ کی کارگزاری پر طمانیت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر موصوف نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو، ڈاکٹر زور اور مرکز خوشنویسی کے بارے میں بھی حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا۔

محترمہ سلطانہ حیات انصاری نے اردو کی بنیادی ترقی کے لئے کتابت کو بنیاد بتلاتے ہوئے کہا کہ ایسے مراکز سے اردو کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔ جناب حیات اللہ انصاری نے ابتدا میں

اراکین بورڈ کے ہمراہ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبہ مخطوطات و مطبوعات اور اُردو میوزیم اور نمائش خوشنویسی کا دلچسپی کے ساتھ معائنہ کیا۔ اور ڈاکٹر زور کی اس اہم یادگار کو ملک کا ناقابل سرمایہ قرار دیا۔ جلسہ تقسیم اسناد میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے انصاری صاحب نے کہا کہ فن کتابت کے اس مرکز نے دیگر مراکز سے بڑھ کر خدمات انجام دی ہیں جس کے پیش نظر بورڈ کی طرف سے یہاں اعلیٰ خطاطی اور طغریٰ نویسی کی نئی اسکیم بھی جلد شروع کی جائے گی۔ اس موقع پر مرکز سے ڈپلوما پانے والے طالب علم سید محمود سلیم نے صدر ترقی اُردو بورڈ کے نام کا خوبصورت طغریٰ پیش کیا جناب انصاری نے ہونہار خوشنویس کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی طرف سے (۵۰) روپے کا انعام مرحمت فرمایا۔ اس جلسہ میں مصنفوں ادیبوں، صحافیوں، کتابت اور طباعت کے اُمور انجام دینے والے اصحاب کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ ابتداء میں علی یاور جنگ کی وفات پر جناب رمن راج سکسینہ شریک معتمد ادارہ [illegible] خاموشی کے [illegible]

● محترمہ [illegible] نے دفتر اردو اکیڈمی [illegible] وہاں اصحاب کو مخاطب اور [illegible] بھی کیا۔ آپ نے اس موقع پر مطبوعات کتابت [illegible] دسی دلائیں اردو کا ایک نسخہ بھی اکیڈمی کے اسکول کی نذر کیا۔

● ادارۂ تعمیر ادب کا ادبی اجلاس [illegible] شاعر مولانا ابو یوسف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خورشید جنیدی نے نجم آفندی مرحوم کی شخصیت اور شاعری پر مضمون سنایا آخر میں محفل شعر ہوئی جس میں مولانا سیف احمدی حضرت قدر عریضی، قادر نور کا منیر النساں منیر، اسمٰعیل ظریف اور امان قریشی نے کلام سنایا۔

● پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارہ ادبیات اردو نے علی یاور جنگ کی وفات پر تعزیتی بیان جاری کرتے ہوئے ان کی علمی قومی اور سفارتی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ مرحوم نے ۴۸ء سے ۵۲ء تک بہ حیثیت وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ گرانقدر خدمات انجام دے کر بدلے ہوئے حالات سے یونیورسٹی کو ہم آہنگ کرنے میں جن جمہوری اور ترقی پذیر تحریکات کا آغاز کیا تھا وہ ناقابل فراموش ہیں۔ تاریخ دکن سے علی یاور جنگ کی خاص دلچسپی تھی وہ اردو فارسی، انگریزی اور فرانسیسی ادب میں غیر معمولی مہارت رکھتے تھے۔

● [illegible] دسمبر پروفیسر نورالحسن مرکزی وزیر تعلیم و سماجی بھلائی نے سالار جنگ میوزیم سلور جوبلی تقاریب کے جلسہ افتتاحیہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ سالار جنگ ہندوستان کے عظیم فرزند تھے جنھوں نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے ارتقا میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس تقریب کی صدارت ریاستی گورنر شری [illegible] نے کی۔

۱۷ دسمبر۔ سالار جنگ میوزیم سلور جوبلی تقاریب کے سلسلہ میں "سالار جنگ کی یاد میں" کے زیر عنوان پروفیسر سید علی اکبر، سعید جنگ اور ڈاکٹر ہاشم امیر علی نے مخاطب کیا۔ جناب [illegible] سابق گورنر یوپی نے صدارت کی۔ اس موقع پر سالار جنگ کے زمانے پر مبنی تصویروں کی نمائش بھی آراستہ کی گئی تھی۔ جناب جواد رضوی لائبریرین نے شکریہ ادا کیا۔

● انڈین رائٹرس کا ماہانہ مشاعرہ فکری بدایونی کی صدارت میں ہوا۔ عزیزہ جمالی، شمیم نصرتی، اسمٰعیل ظریف اور سید نصرت کے علاوہ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

● انجمن اقلیم ادب کا ادبی اجلاس ڈاکٹر وحید اختر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جمیل شیدائی اور برق یوسفی نے مضامین سنائے۔ رحمٰن جامی کی شاعری پر مصلح الدین سعدی اور مضطر مجاز نے انٹرویو لیا۔ محفل شعر میں ڈاکٹر غیاث صدیقی صادق نوید، حسام الدین سلیم، رحمٰن جامی، سعدی حامد مجاز، برق اور رحمت کوثر نے کلام سنایا ڈاکٹر وحید اختر نے ادبی مسائل پر مخاطب کیا۔ اور اپنا کلام سنایا۔

۲۰۔ دسمبر: انجمن ترقی اُردو

آندھرا پردیش کا ۱۳ واں سالانہ اجتماع ہو رہا ہے ۱۳ فروری کو محبوب نگر میں منعقد ہو رہا ہے اس اجتماع کو ریاستی چیف منسٹر مخاطب کریں گے ریاستی سطح پر مختلف کمیٹیوں اور قراردادوں کے ذریعہ اُردو کے مسائل کا جائزہ لیا جائے گا۔

● اردو اکیڈمی آندھرا پردیش نے [illegible] کے لئے ریاست کے ۱۵ کتب [illegible]

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

پیداوار بڑھانے اور دوران پیداوار نقصانات گھٹانے میں محنت کشوں کی امداد

تقریباً ایک سال پہلے صنعتوں میں محنت کشوں کی شرکت کی اسکیم پر عمل شروع کیا گیا تھا۔ (20 نکاتی پروگرام کا پندرھواں آئٹم)

مرکزی سرکار کے تحت کام کرنے والے تقریباً 356 یونٹوں میں اس اسکیم کو عملی شکل دی جا چکی ہے جس سے ان یونٹوں کی پیداوار بڑھی ہے اور ان کی کارکردگی بہتر ہوئی ہے۔ دوران پیداوار نقصانات میں کمی ہوئی ہے اور کئی یونٹوں میں طے شدہ نشانوں سے بھی زیادہ پیداوار ہوئی ہے۔

ریاستوں میں 1079 یونٹوں نے اس سکیم پر عمل شروع کیا ہے ان میں سے کچھ یونٹوں میں ورکروں کی تعداد 500 سے بھی کم ہے اس طرح مستفید ہونے والوں کی گنتی بڑھ رہی ہے۔

قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

davp 76/655

سنِ اجراء ۱۹۳۸ء فون نمبر : ۳۸۳۶۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

حیدرآباد

نگران : سید علی اکبر ایم اے کنٹیب

معتمد مجلس مشاورت : غلام جیلانی

مرتب : وقار خلیل

جلد : ۴۰ شمارہ : ۲

فبروری ۱۹۷۷ء

زرِ سالانہ : ۱۲ روپے ششماہی : ۷ روپے

فی شمارہ : ایک روپیہ پچیس پیسے

پرنٹر پبلشر : سید علی اکبر ۔ مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ۔ مقامِ اشاعت : ادارۂ ادبیاتِ اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

اپنی بات

جنوری ۱۹۷۷ء کا شمارہ علمی و ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ہمارے ارادوں کو آگے قدم بڑھانے کا حوصلہ ملا اور ہم نے طے کیا کہ آئندہ شماروں کا حجم بھی یہی ہوگا، ایسا ہونا اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہمارے معاونین اپنی ادبی کاوشوں سے ہمیں نوازیں۔

حیدرآباد زمانۂ قدیم سے ہی علم و تہذیب اور ثقافت و تمدن کا ایک اہم اور عظیم الشان مرکز رہا ہے۔ یہاں کے شاعروں دانشوروں اور مذہبی قدروں کے اُردو دوستوں نے دکن کے گنگا جمنی کلچر کو ہمیشہ ہندوستانی روایات کا حامل بنائے رکھا۔ حیدرآباد کے بڑے لوگ، ملک کی ثقافتی اور تہذیبی تاریخ کا روشن حصہ رہے ہیں۔ اس موضوع پر ۱۹۵۷ء میں ڈاکٹر زورؔ نے سید غلام پنجتن شمشاد سے سولہ شخصیتوں کے سوانحاتی خاکے لکھوا کر ایک گلدستہ شائع کیا تھا۔ اب ادارۂ سب رس نے طے کیا ہے کہ اس باب کو وسعت دی جائے اور مسلسل ہر ماہ سب رس میں حیدرآباد کے عہد ساز بزرگوں پر سوانحاتی خاکے شائع ہوں البتہ اگلے گلدستہ اور آئندہ شائع ہونے والے خاکوں میں ایک بنیادی فرق ضروری تصور کیا گیا وہ یہ کہ خاکہ نویسی کے لئے ہم ایسے اصحاب کو تکلیف دینا چاہتے ہیں جو اُن شخصیتوں سے متعلق رہے ہوں اور متاثر بھی۔ توقع ہے کہ مارچ ۱۹۷۷ء سے اس سلسلے کا آغاز ہو جائے گا۔

جنوری ۱۹۷۷ء سے حیدرآباد کے شاعر کا تعارفی سلسلہ شروع کیا گیا۔ یہ سلسلہ بھی کوئی جدید نہیں۔ ابتداً اس موضوع پر بھی ڈاکٹر زورؔ کی دوررس نگاہیں پڑی تھیں پھر ساہتیہ اکیڈمی نے دو جلدوں میں حیدرآباد کے شاعروں اور ان کی تخلیقات کو منظر عام پر لایا اب سب رس اس سلسلہ میں ایسے شاعروں کا تعارف کرائے گا جو یا تو اگلی کوششوں میں جگہ نہ پا سکے یا جو ان کوششوں کے بعد اُبھرے ہیں۔ زیر نظر شمارے میں دکن کے بزرگ صوفی فکر سخنور پنڈت دامودر ذکیؔ ٹھاکر کا کلام اور حالات شائع کئے گئے ہیں۔

گذشتہ چند دنوں میں زبان اُردو کے کئی نامور ادیب ہم کو سوگوار چھوڑ گئے ابھی جان سے آنسو سوکھنے بھی نہ پائے تھے کہ ۱۱ر فروری ۱۹۷۷ء کی صبح صدر جمہوریہ ہند عالی جناب فخر الدین علی احمد رحلت فرما گئے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ جناب فخر الدین علی احمد نہ صرف مقبول عام صدر جمہوریہ ہند تھے بلکہ ہندوستانی لسانی اور ثقافتی قدروں کے نگہبان تھے۔ اُردو والوں سے ان کے تعلقات گہرے قسم کے تھے۔ کیوں نہ ہوں غالبؔ کے گھرانے سے رشتہ جو تھا۔ غالبؔ صد سالہ تقاریب کا کامیاب انعقاد تاہم احترام صدر ہند کا اُردو ادبیات سے گہرے ربط کا مظہر اتم تھا۔ دلّی میں ایوانِ غالبؔ کی تعمیر اور غالبؔ انسٹی ٹیوٹ کا قیام بھی آپ کی شخصی توجہات کے کرشمے ہیں۔ ملک میں اُردو اکیڈیمیوں کے قیام اور اُردو والوں کے مسائل کی منظوری میں جس

عمدگی سے تکمیل ہوئی یہ سب جناب فخرالدین علی احمد صاحب کی اُردو دوستی کے دائم و قائم ثبوت ہیں۔ حیدرآباد کو جناب فخرالدین علی احمد کی میزبانی کا سب سے زیادہ شرف حاصل رہا ہے ۔ آندھرا پردیش اُردو اکیڈیمی کے ایک اجلاس میں آپ کی یادگار تقریر ملک کے اردو والوں کے لئے مدتوں مشعلِ راہ بنی رہے گی۔

'سب رس' اپنی حالیہ جرأت مند اقداموں کے باعث پسندیدگی حاصل کر رہا ہے لیکن اب بھی ہمارے لئے پرچہ کو وقت پر منظرِ عام پہ لانا ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے اسباب سے اردو صحافت والے ناواقف نہیں۔ مگر ہم نا اُمید نہیں۔ اس خامی پر بھی قابو پانے کی کوشش جاری ہے اور مستقبل قریب میں یہ شکایت بھی باقی نہیں رہے گی۔

آخر میں اہلِ قلم شاعروں اور مضمون نگاروں سے گذارش ہے کہ وہ بھی ہماری ان کوششوں میں فراخدلی سے ہاتھ بٹائیں۔

کر پہلے مجھ کو زندگیٔ جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دلِ بے قرار کا

غلام جیلانی

———— جناب فخرالدین علی احمد نے ایسے دور میں صدارت کے فرائض انجام دیئے ہیں جبکہ ہمارے ملک میں سیکولرازم، جمہوریت اور سوشلزم کی قوتیں نمو پا رہی تھیں انہوں نے اپنے عہدہ کی دستوری حدود کے اندر رہ کر ملک و قوم کے مسائل پر جن خیالات کا اظہار فرمایا اور جو مشورے حکومت اور قوم کو دیئے اُسے بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ انہوں نے جہاں مسلمانوں کو قومی دھارے میں اپنے لئے مستحکم مقام بنانے کے لئے رہنمایانہ مشورے دیئے ہیں وہیں اقلیتوں کے مسائل پر بھی بے باکانہ اظہارِ خیال فرمایا ۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی میں جناب احمد نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر مدرسہ میں اُردو کا ایک طالب علم بھی موجود رہے تو حکومت کو اس کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہیئے اس صاف بیانی پر سب چونک پڑے تھے ۔ لکھنؤ میں اردو اکیڈیمیوں کی کانفرنس میں صدرِ جمہوریہ نے اتر پردیش اسمبلی میں اُردو کے استعمال پر زور دیا ۔ دہلی میں عید ملن کے موقع پر انہوں نے دہلی میں اُردو کے استعمال کے لئے دہلی کے نظم و نسق کو سختی سے ہدایت دی ۔ امیر خسرو کی قومی شخصیت کو اُبھارنے اور نئی نسل کو ہمارے مشترکہ کلچر سے واقف کرانے امیر خسرو صدی تقاریب کے لئے جناب احمد کی خدمات، ہماری جدید تاریخ میں آبِ زر سے لکھی جائیں گی ۔

جناب احمد کا دورِ صدارت، ہمارے ملک کے بین الاقوامی حالات و مسائل سے بھی گہری نسبت رکھتا ہے عرب ممالک اور افرو ایشیائی ممالک میں صدرِ جمہوریہ کے دورے، ہمارے ملک کے وقار کو بڑھانے، ہمارے سیاسی اقدار، ہمارے سیکولرازم اور سوشلزم سے دوسروں کو متعارف کرانے اور انہیں معترف کرانے کا بہت بڑا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔ (سیاست، حیدرآباد)

نعمت اللہ جاوید

نظریۂ وجودیت

وجودیت، ادب، نفسیات، فلسفہ اور مذہب کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ انسان، زندگی اور کائنات کے متعلق ہر دور میں کچھ نہ کچھ کہا گیا ہے۔ ادیب و شاعر حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے، فلسفیوں نے اپنی عمریں گزار دیں اور صوفیوں نے مراقبے آباد کئے مشرق میں شاعری اور ادب میں انسان اور انسانی احترام و عظمت کے خیالات جابجا بکھرے پڑے ہیں مگر مغرب میں ہیومنزم یعنی انسانیت کا فلسفہ اپنی مربوط شکل میں نشاۃ ثانیہ کی دین ہے۔ انسانی وجود کی تلاش سب سے پہلے دانتے کے یہاں 'طربیۂ خداوندی' میں شروع ہوتی ہے۔ مغرب میں انسانی نفس اور انسانی عقل کی خود مختاری کا علم نشاۃ ثانیہ کے علم برداروں نے بلند کیا اور انسان نے ایک نبرد آزما وجود کی صورت میں ظاہر ہو کر محدود وسائل کی پرواہ کئے بغیر اور فتح و شکست سے بے نیاز ہو کر ماحول کے خلاف لڑ کر انسانی عظمت کی تصویر پیش کی۔ علم کو ایک قوت مان کر ماضی کے مردہ علوم کے خلاف بغاوت کر کے انسانی تقدیر کو ایک نئے معنی پہنائے اور کائنات کی تسخیر اور اپنے لامحدود امکانات سے آشنائی کی۔ شیکسپیر کے طفیل انسان نئی دنیا کا متلاشی ہوا اور تقدیر کے برعکس اپنی خواہشوں کے تصادم اور ٹکراؤ کو انسانی علم کا سبب بتایا۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد تحریک اصلاح (REFORMATION) سے ازمنۂ وسطیٰ کے مجہول تصور انسان پر ایک کاری ضرب لگتی ہے اور انسان اور خدا کے رشتہ کو واضح کیا جاتا ہے۔ یہودی فلسفی سپنوزا اپنے فلسفہ میں انسانی نفس کی بقا اور استحکام کو نیکی اور شر سے تعبیر کرتا ہے اور لائبنز نے انسان میں یہ شعور پیدا کیا کہ یہ کائنات (EGOS) کا ایک ایسا سلسلہ ہے جس میں اگر انتہا پہ نفسِ خداوندی ہے تو ادنیٰ ترین سطح پہ مادّہ ہے۔ انسان ایک ایسا وجود ہے جو اصلاً نفس یا انا (EGO) ہے جس کا نفس قوت متحرکہ (DYNAMIC FORCE) کا ایک مرکز ہے۔ انسانی ارادے کی آزادی پر کانٹ نے بہت زور دیا کہ انسانی نفس کی بالآخر تقدیر یہ ہے کہ وہ اعلیٰ مقاصد کا عرفان حاصل کرے اور اپنی آرزوؤں اور امنگوں کو اعلیٰ تر مقاصد کا تابع بنائے۔ گوئٹے کا کردار 'فاوسٹ' نئے دور کا انسان ہے جس کی تمناؤں کی کوئی حد نہیں۔ وہ عالم امکان کی تسخیر کا خواب دیکھتا اور ہر قیمت اس کو مسخر کرنا چاہتا ہے۔ نطشے نے قوت (POWER) کے تصور کو مرکزی اہمیت دی اور اپنے اس خیال کو پیش کیا کہ کائنات فوق البشر کے ظہور کے لئے وجود میں آئی ہے اور اس کے لئے اس نے (نعوذ باللہ) خدا کی موت کا بھی اعلان کر دیا۔ اس نے یہ احساس دلایا کہ انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ فوق البشر کے ظہور کا واسطہ ہے یعنی نسل انسانی فوق البشر کے اظہار کا ذریعہ ہے برگساں ELAN VITAL کو کائناتی ارتقا کی قوت متحرکہ قرار دیتا ہے انسان کا یہ کمال ہے کہ وہ قوت متحرکہ کا کامل عرفان حاصل کرے جو محض عقل سے ممکن نہیں عقل کی پابند انسان کو ادنیٰ درجہ کے مذہب اور اخلاق کا پابند بناتی ہے۔ اور وجدان کی مدد سے انسان اعلیٰ تر مذہب اور اخلاق کا عرفان

حاصل کرسکتا ہے۔ ڈیکارٹ نے اپنے عقلی فلسفہ کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ بغیر ثبوت کے کسی صداقت کو نہیں ماننا چاہیئے۔ حقیقی علم میں تشکیک ڈیکارٹ ہی کی دین ہے اس طرح انسان بذاتِ خود معیارِ کائنات ٹھیرا۔ سائنس میں ڈارون نے نظریۂ ارتقا پیش کیا اور ثابت کیا کہ مادی قوت ٹھوس اور مستقل ہونے کے بجائے برقی لہروں کی طرح حرکت پذیر ہے۔ بیسویں صدی کے سائنسی اور صنعتی ترقی نے تہذیبی اور معاشرتی وابستگیوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور انسان اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا۔ سائنسی اندازِ فکر نے اسے قدیم تصورات کی قید سے باہر نکالا اور انسان اپنی ذات کی گپھاؤں میں بھٹکنے لگا۔ اور اب جدید زمانے کی وجودیت میں نفسیاتی انسان کی تحقیق پر زور دیا گیا۔

وجودیت کی تحریک دراصل فرانس سے چلی جس کا قائد سارتر مانا جاتا ہے جس طرح ڈیکارٹ نے اپنی علمی تحقیق کی بنا اس اصول موضوعہ پر رکھی تھی کہ چونکہ "میں فکر کرتا ہوں اس لئے میں ہوں" اسی طرح سارتر نے وجودیت کی بنا اس اصول موضوعہ پر رکھی کہ انسان کا وجود مقدم ہے پھر اس کے بعد اس کا جوہر ہے۔ پہلے انسان وجود رکھتا ہے اس کے بعد اس کے جوہر کی تعریف کی جاسکتی ہے۔ انسان دائمی طور پر اپنے آپ کو اپنے اعمال سے بناتا رہتا ہے۔ وہ خود اپنے مستقبل کا خالق ہے۔ سارتر اور دوسرے وجودی ادیبوں نے زندگی کی بے چارگی اور رنج و غم اور عالم کی نامعقولیت اور گھٹن اور المناکی کا ذکر کیا ہے ان کے فلسفے میں خدا سے زیادہ اہمیت انسان کو تھی۔ سارتر کے خیالات ملحدانہ ہیں۔ وہ ذاتِ باری کا منکر ہے اور نہ اس کے پاس کسی عالمگیر اخلاقی قانون کی اہمیت ہے۔ وہ خودی اور خارجی نظام کے وجود کو بھی تسلیم نہیں کرتا، عالم کی گھٹن کے احساس کے باعث اس زندگی کی ہما ہمی اس کی نظر میں فضول ہے اس عالم کی تنگ دیواروں میں بیچ اسے آزادی کا مینارہ نظر آتا ہے۔ وہ کہتا ہے انسان تنہا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کے باعث وہ بے کس اور لاچار ہے لیکن اس کی یہ ذمہ داری خود اپنے وجود کے دوبدو ہے۔ سارتر انسان کو اپنے اعمال کا مجموعہ بتاتا ہے جسے یہ اختیار ہے کہ وہ اپنی زندگی جس طرح بنانا چاہے بنائے لیکن اسی کے ساتھ وہ موت کے خیال کو بھی اپنے ذہن سے الگ نہیں کرسکتا جس کی وجہ اس کی زندگی اور بھی اور المناک ہوجاتی ہے۔ سارتر نے اپنے ناولوں کے کردار سے جدید تہذیب کی بحرانی کیفیت کا عکس اجاگر کیا اور وجودیت کے اصولوں کو بھی کردار کے ذریعہ سے پیش کیا ہے پھر انھیں اصولوں کو وجود اور عدم وجود (L'ETRE ET NEAUL) میں فلسفیانہ طور پر بیان کیا ہے۔ دراصل ان انسان دوستوں نے اپنی توجہ مذہبی مسائل کی طرف سے ہٹا کر ادب اور آرٹ کی طرف مبذول کردی اور وجودیت کی پرچھائیں ہر شعبہ پر منڈلانے لگیں۔ اردو ادب کا بھی گنبد یورپ اور مغربی علوم و افکار کی آواز سے گونجنے لگا۔ زندگی، موت، معاشرے، فرد، جماعت اور کائنات کے بارے میں جو تصورات روایت کی راہ پر گامزن تھے ایک نئی سمت کی طرف مڑ گئے۔ روایتی عقیدوں کے بت ٹوٹنے لگے اور اسی کے ساتھ ایک نئے ذہن کا خورشید طلوع ہوا اور نئے شعرا آوازِ باطن کی طرف توجہ دینے لگے وہ گھنٹوں آنکھیں بند کئے بیداری کے خواب دیکھتے ہیں اور ان خوابوں میں زندگی کے حقائق کو تلاش کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں اس بات کا احساس ہوچکا ہے کہ وہ انسان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ سقراط نے اپنی دانشمندی کی یہی توجیہہ کی تھی کہ غالباً وہ اس لئے بڑا دانشمند تھا کہ اسے دوسرے لوگوں کے برخلاف اس کا احساس تھا کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ سقراط اکثر اپنے خیالات کی دنیا میں کھو جاتا تھا اور ایک حالت میں ایک جگہ گھنٹوں کھڑا رہتا تھا اکثر اس کی اس عادت کا مذاق بھی اڑایا جاتا تھا لیکن ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ دنیا کے بڑے مصلحین مراقبہ اور گوشۂ تنہائی میں غور و فکر کی منزل سے گزرے ہیں شاید یہ لوگ بیداری میں خواب دیکھتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ نیا شاعر بھی گوشۂ تنہائی میں بیداری کے خواب میں مبتلا ہے۔ وہ بھی غور و فکر

کا منزلوں سے گزر رہا ہے۔ حقیقت کو ایک نئے روپ میں دیکھنے کے لئے وہ اپنی ذات میں ڈوبا ہوا تخلیقی عمل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔
عمیق حنفی کی "شب گشت" کی نظم نمبر ۳ ملاحظہ ہو : ــــــ

میز پر چھوڑ کے لب بستہ و خاموش قلم
چھت پہ چپکا کے یہ پتھرائی ہوئی سی آنکھیں
چھوڑ کے بید کے مونڈھے پہ بدن کی یہ لاش
انگلیوں میں دبے سگریٹ کا دھواں دیتا وجود
چھوڑ کر دور، بہت دور نکل جاتا ہوں۔

کانپتے ہانپتے پرزوں کی پکار
ریل کی چیخ، بسوں کی چنگھاڑ
اور نغمے ـــ وہ تمدن کا امراض
ریڈیو جن کو گلا پھاڑ کے پھیلاتا ہے
کوئی آواز کوئی لفظ کوئی شور نہیں

اس قدر دور جہاں کوئی بھی ہنگامہ نہیں
سانس لیتا ہوں، لرز اٹھتا ہوں، ڈر جاتا ہوں۔
دل کی آواز پہ آندھی کا گماں ہوتا ہے
بھیڑ میں رہ کے جو تنہائی کا احساس ہوا کرتا تھا
ویسا احساس اکیلے میں کہاں ہوتا ہے !
لوٹ آتا ہوں اسی شور میں ہنگامہ میں
لے کے سگریٹ کا دہکتا ہوا کش
دیکھتے دیکھتے مونڈھے پہ رکھی لاش تڑپ اٹھتی ہے
چھت پہ چپکی ہوئی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں
اک چمک آتی ہے پانی کے چھلکنے کی چمک
اور قلم کان میں کاغذ کے کیا کرتا ہے سرگوشی پھر

پھر اسی دنیا میں لوٹ آتا ہوں
اور پھر اپنے کو کچھ بدلا ہوا پاتا ہوں
ذہن پر تازہ علائم، نئی تمثالیں، نئے نقش اُبھر آتے ہیں
اپنی تنہائی کے احساس کے کچھ اور نئے ڈھنگ مجھے ملتے ہیں ۔

جیسے ہر بڑا مفکر گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بیداری کے خواب دیکھتا ہے اسی طرح بیداری میں خواب دیکھنے والا بھی بڑا مفکر ہو، یہ ضروری نہیں لیکن نئے شعراء بہرحال نقشے تیار ضرور کر رہے ہیں۔ ان کی نظریں بدلتی ہوئی حقیقتوں پر ہیں۔ نئے موضوعات پر نئے ڈھنگ سے سوچ رہے ہیں ان کے مادی نظریۂ حیات میں پھیلاؤ اور وسعت ہے۔ وہ ماحول کا تجزیاتی تجربہ کرتے ہیں۔ جدید نظریات و تصورات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھوں نے مغربی تحریکوں کی بنیادی حقیقتوں کا تجزیہ بھی کیا ہے اور اثرات بھی قبول کئے ہیں۔ ان کی نظریں ماضی سے زیادہ مستقبل کی طرف لگی ہوئی ہیں جہاں وہ انسان اور اس کی حقیقت تلاش کر سکیں۔ ان کے ہر موضوع پر انسان دوستی کا جذبہ چھایا ہوا ہے ان کی نظر میں صرف ایک چیز کے صحیح علم کا انسان کو یقین ہونا چاہیئے اور وہ ہے خود اپنی ذات یعنی انسان اپنی ذات کے خطے میں خود کو تلاش کرے۔ نئی اردو شاعری میں وجودیت ایک رجحان کی شکل اختیار کر چکا ہے جس طرف بھی دیکھئے "میں" کی آواز آرہی ہے لیکن یہ آواز اقبال کی 'خودی' سے مختلف ہے۔ اقبال نے اردو شاعری کو "خودی" سے روشناس کرایا تھا اور اس کے مدارج بھی بتائے تھے لیکن نئی شاعری میں ایسا کوئی فلسفہ نہیں ملتا۔ عرفانِ ذات پہ زور دیا جا رہا ہے اور نئے شاعر اپنی طور پہ قدیم نظریات و تصورات سے نظریں چرا کر انسان کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نئے شعراء میں وجودی شعرا کا روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جدید فلسفی ڈارون، فرائڈ وغیرہ انسان کو حیوان کی ترقی یافتہ شکل بتلاتے ہیں نئے شعرا کسی نظریئے یا فلسفہ کو اب ماننے کے لئے تیار نہیں بلکہ محسوسات کے سہارے اسرارِ کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انسان جیسا پیچیدہ حیوان بھی حسی ادراک ہی پہ قناعت کر رہا ہے۔ نئی شاعری بھی محسوسات کی شاعری ہے اس لئے نئی شاعری میں وجودیت کے مسئلہ پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ سارتر کے فلسفۂ وجودیت کو تو ہمارے جدید شعراء نے تسلیم کر لیا ہے خدا و مذہب سے بیزاری، اخلاقی قدروں سے گریز، زندگی کی بے معنویت، تنہائی کا شدید احساس، نئی شاعری میں وجودیت کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن ہم نے وجودیت کی دوسری شاخ کے نمائندے مارسل کو بھلا دیا ہے جس کا شمار اس وقت فرانس کے چوٹی کے مفکرین میں کیا جاتا ہے جو فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ ڈرامہ نگار بھی ہے۔ مارسل ذاتِ باری، روحانیت اور اخلاق کا قائل ہے اس کا خیال ہے وجودیت اور مسیحیت کی تعلیم میں مفاہمت ممکن ہے اس نے اپنے مشہور ڈرامہ "اللہ والا (UN HOME DIE)" میں جماعتی زندگی کی برکت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ انسان کی ذات کی تکمیل کے لئے انسان کا اس کے اندر اپنے اندرونی خول سے باہر نکلنا انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔ سارتر نعقل، روح، خودی اور خدا کے دائروں سے نکل کر اس معمورۂ تنگ میں آزادی کے مینارے پر نظر رکھتا ہے جبکہ مارسل انسان کی حقیقی آزادی ذاتِ باری کے لو لگانے میں محسوس کرتا ہے خدا کا اپنے لئے انتخاب کرنا اس کی نظر میں قابلِ فخر ہے جس کی عقیدت کے بغیر عمل کی دنیا افراتفری میں مبتلا رہتی ہے۔ مارسل کی وجودیت میں مذہبی باطنیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ مذہبی باطنیت چاہے وہ مسیحیت کی ہو یا اسلام کی اس میں روح کی ایسی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں جو وجودیت کے فلسفہ سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ مثلاً سالک کو اپنے وجود میں ذہنی کرب، ذمہ داری اور تحیر کا شعور اور محبوب سے قرب و اتصال کی تمنا کا احساس ہو جاتا ہے۔ مسیحیت اور اسلام کا خدا 'حیّ و قیوم' ہے اور پکارنے والے کی آواز سنتا ہے اور انسانی وجود کی دائمی تنہائی اسی کے ذریعہ دور ہوتی ہے۔ ورنہ مارسل کے خیال میں انسان کی تنہائی دور کرنے والا اور کوئی نہیں۔ نہ اہل و عیال نہ ریاست اور نہ سوسائٹی۔ ذاتِ باری کی بدولت انسان اپنے وجود سے ماورا ہو جاتا ہے جس سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعین ہوتا ہے۔

یہ پہلے ... مادہ پرست کون ہو سکتا ہے۔ تاہم یہاں اس قسم کا گروہ بھی موجود رہے جو روحانی ادراک کا قائل رہا ہے اور پیغمبرانہ یعنی روحانیت کے لقب سے مشہور رہے لیکن موجودہ فکری پیغامات عہد حاضر کو ایسے مادی اور عقلی نظام معاشرت کی طرف لے جاتے ہیں جس میں روحانیت اور وجدان کی قدروں کے لئے سرے سے کوئی مقام ہی نہیں امام غزالی نے اپنی کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" کے دیباچے میں جو تمہید لکھی ہے وہ ہمارے زمانے کے حالات سے بہت ملتی جلتی ہے اس لئے اس کو مختصراً اس موقعہ پر نقل کیا جاتا ہے۔ "ہمارے زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے۔ یہ لوگ مذہبی احکام اور قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکمائے قدیم مثلاً افلاطون، ارسطو وغیرہ مذہب کو لغو سمجھتے تھے اور چونکہ یہ حکما تمام علوم و فنون کے بانی اور موجد تھے اور عقل و ذہن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہوا اسی لئے ان کا انکار مذہب اس بات کی دلیل ہے کہ مذہب حقیقت میں لغو اور باطل ہے اور اس کے اصول و قواعد فرضی اور مصنوعی ہیں جو صرف ظاہر میں خوشنما اور دلفریب ہیں" (بحوالہ "الغزالی" مولانا شبلی)

اور یہ سب صرف اس لئے ہے کہ سائنس کی مادی حقیقتوں اور عملی معجزوں کو تسلیم کیا جا رہا ہے اور روحانی معجزوں کی حقیقت سے انکار کیا جا رہا ہے۔ چاہے ہم آج مادیت کا زبانی اور نفظی انکار کر دیں لیکن اس کے باوجود ہمارے قدم خالص مادی قدروں کی روشنی میں اٹھتے ہیں لیکن وہ زمانہ اب دور نہیں جب انسان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ مادیت کے مہیا کردہ وسائل اسے راحت دینے کے بجائے ذہنی پریشانیوں کا باعث بنتے جا رہے ہیں اور اب آدم خاکی کے دکھوں، دردوں کے لئے بہتر علاج روحانیت ہی بن سکتا ہے یہ اسی وقت ہوگا جب موجودہ انسانیت تسخیر انسانیت کو مقصد خاص نہ سمجھ کر اور عقلی انکشافات سے بیزار ہو کر ذہنی سکون اور قلبی راحت کے لئے مذہب اور خدا کی طرف متوجہ ہوگی۔ خدا کے ساتھ تعلق و ربط کے مدارج و مقامات کا انکشاف اسلام پر قرآن مجید سے ہوئے ہیں اقبال کے یہاں "قرآن حقیقی کا مقتضا یہ ہے کہ ذہن انسانی میں اس تعلق کا جو اسے کائنات اور خالق کائنات سے ہے اعلیٰ اور بہتر شعور پیدا کرے" لیکن انسان نے مذہب و اخلاق کو خیر آباد کہہ کر کائنات اور زندگی کے بارے میں میکانکی طرز فکر اور نظریۂ جبریت کو اپنا لیا ہے جو انسان کو مادہ پرستی کی طرف لے جاتا ہے اور جس کے باعث مادی اور روحانی اقدار کے اس عدم توازن کو پیدا کیا جس نے انسان کو عجیب کش مکش میں مبتلا کر دیا ہے۔

زندگی اور آرٹ کے متعلق اقبال نے رسالہ (NEW ERA) نیو ایرا میں لکھا تھا "حیات تمام انسانی اعمال کا منتہائے مقصود ہے، انسانی اعمال کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کی زندگی شاندار اور افزوں ہو جائے اس لئے ضروری ہے کہ جملہ انسانی آرٹ کو اس مقصد عظمیٰ کے تحت رکھا جائے۔ جو شئے زندگی کو جس قدر فراوانی عطا کرے اسی قدر اعلیٰ اور اشرف خیال کیا جائے گا۔ بلند ترین آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر خفیہ قوت ارادی کو بیدار کرے تاکہ ہم زندگی کی مشکلات کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں۔ وہ تمام علوم و فنون جو خواب آور ہیں جو ہمیں ان حقائق کی گردش سے غافل کریں جن کے حصول پر زندگی کا انحصار ہے وہ دراصل بربادی اور موت کا پیغام ہیں۔ آرٹ وہ ہے جو ہمارے اندر بیداری کی روح پھونکے نہ کہ وہ جو ہم پر حالت سکر طاری کر دے (نیرنگ خیال صفحہ ۲۶۷)

اگر انسانی اعمال کے مقصد کو نظر انداز کر دیا گیا تو فن کار ایک گنبد بے در کا قیدی بن کر رہ جائے گا۔ جہاں اسے اپنی بازگشت تک نہ سنائی دے گی اس کے اندر کا خلا ناپنے میں وہ بھی ناکام ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ خلا ابھی کا نہیں صدیوں کا ہے۔ وہ ظاہرا خود پہ ہاتھ پاؤں مارتا ہوا دکھائی تو دیتا ہے لیکن اس کے اندر سے جو آواز آتی ہے اسے اس کے پیچھے اور اس کی خاک کی طرف یاد دلا

متوجہ کرتا ہے اور انسان موت کے خوف سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ زندگی کی معنویت صرف حصارِ ذات میں گم ہونے اور اپنے بل میں چھپ کر چھپتے رہنے میں ہی نہیں ہے بلکہ اس کے باہر بھی ایسی باتیں ہیں جو اسے زندگی کا مقصد اور اس معنویت سے آشنا کر سکتی ہیں۔ جنونِ آگہی میں مبتلا ہونے سے سوائے ذات کے کہسار سے ٹکرانے کے علاوہ اور کیا مل سکتا ہے اس "میں" کے جنون نے اپنے بچوں کو ٹوڑ کر رکھ دیا ہے۔ آزادیٔ افکار کے لئے فکر و تدبر کا سلیقہ بھی ضروری ہے اور فکر و تدبر کے سلیقے کے لئے پوری تاریخ پر نظر ہونی چاہیئے ورنہ صرف مغرب کی پیروی اور جدّت کا شوق ہمارے اندر بیداری کی روح نہیں پھونک سکتا اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کے لئے اقبال کی زبان میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؎

نئی بجلی کہاں ان بادلوں کے جیب و داماں میں پُرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

جدید انسان بہت پیچیدہ روحانی اور ذہنی حوادث کا شکار ہے۔ آج وہ پھر ایسے سکون بخش فلسفۂ حیات کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو سخت مایوسیوں کے باوجود زندگی سے نباہ کی عادت سکھائے۔ فرانسیسی مفکر مارسل نے سنہ ۱۹۴۶ء میں پیرس میں یونسکو کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "انیسویں صدی کے آخر میں نطشے نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ خدا مرگیا لیکن آج بیسویں صدی کے وسط میں کوئی چاہے تو یہ سوال کر سکتا ہے کہیں انسان تو نہیں مرگیا۔؟ اس زمانے کے اہلِ فکر اور اہلِ دل دونوں کا فریضہ ہے کہ انسانیت کو ہلاکت سے بچائیں۔ اب ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ فکر و خیال کا یہ نیا قافلہ (جدید ادب) انسانیت کی تلاش و جستجو میں سرگرم سفر ہو کر کن راہوں کی نشاندہی کرے گا!

ـــــــ ادب زندگی سے علٰحدہ نہیں ہوتا اور اسی لئے ادب اور زندگی کے بنیادی معیار ایک ہوتے ہیں یہ معیار ہر اچھے ادیب اور عام انسانوں میں مشترک ہوتے ہیں۔ خود ادب اور زندگی دونوں کے مظاہر کو پرکھنے اور تولنے کے لئے تہذیب کا ایک مجموعی تصوّر ناگزیر ہوتا ہے اور غیر شعوری طور پر ہمارے فیصلوں میں کارفرما رہتا ہے۔

تہذیب کے بارے میں غالباً سبھی اس پر متفق ہیں کہ یہ حقیقت کی ایک مخصوص تنظیم ہوتی ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اور فطرت یعنی انسان اور خارجی دنیا میں ربط پیدا ہو جائے۔ علوم و فنون یا تو اس محبت سے پیدا ہوتے ہیں جو انسانوں کو فطرت یا خارجی دنیا سے ہوتی ہے یا اس ذہنی اور مادّی تصرّف سے پیدا ہوتے ہیں جو انسان، فطرت کی سرکش قوتوں پر اپنے عمل کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے۔

یونان میں تاریخی دور سے پہلے، فطرت کی قوتیں ان دیوتاؤں کے روپ میں نظر آتی تھیں جو معمولی آدمیوں کی طرح نیک دل، غصیلے، فیض رساں، ناانصاف، شہوت پرست اور کھلنڈرے ہوتے تھے، یہ اسی دور کی صداقت تھی جو خارجی حقیقت کی (جس میں خود انسان بھی شامل تھا) ایک مخصوص تنظیم سے پیدا ہوئی تھی اور یہی صداقت تھا جو اس دور کے رزمیہ، تھیٹر، موسیقی، بت گری اور روزمرہ اعمال میں برتی جاتی تھی لیکن یہ ہمارے دور کی صداقت نہیں ہے کیونکہ انسان اور فطرت کے عمل کا توازن بنیادی طور پر بدل چکا ہے۔ (خورشید الاسلام)

غزلیں

مے کدے سے ہر چہرہ ذات اوڑھ کر نکلا
دن کی باری جب آئی رات اوڑھ کر نکلا

شرط کیا تھی، کوچہ بھی کس کا تھا خدا جانے
جیت کا فرشتہ بھی مات اوڑھ کر نکلا

برگِ گل میں چھپتا تھا، خار بن کے چبھتا تھا
آج دل کا ہر شکوہ بات اوڑھ کر نکلا

بے کسی کے صحرا میں، میرا رینگتا سایہ
چاند کا کفن، میرے ساتھ اوڑھ کر نکلا

سوکھی بیل کے منظر میں بہار کی صورت
ایک طفلِ گل بے شک پات اوڑھ کر نکلا

ڈاکٹر غیاث صدیقی

کون کہتا ہے، فصیلِ بے خودی کی حد میں تھا
میں تو ہوش و عقل کے طوفاں بلا کی زد میں تھا

وقت کی گمنام کرنیں کس طرح پائیں سراغ
میں انا کی گونج بن کر ذہن کے گنبد میں تھا

اجنبی اک کہہ رہا تھا، گرچہ بونا ہوں مگر
کتنا لمبا سایہ پوشیدہ مرے اس قد میں تھا

تم کرید و بے جا رہے تھے تیر زخموں کو عبث
آنسوؤں کا اک خزانہ چشم کے مرقد میں تھا

کر لیا میں نے مقید جذبۂ آوارہ کو
مثلِ آہو جو بھٹکتا فکر کی سرحد میں تھا

حادثوں کی دھوپ سے زرد ہو گئے پتے مگر
پھولنے پھلنے کا جذبہ سوچ کے برگد میں تھا

سخاوت علی کرامت

رسم و راہِ وفا کیوں پڑھے شہر میں
لوگ چہرے بدل کر بیٹھے شہر میں

ناصحوں کی فہمیں تھیں ماگ بہت
لوگ تنہا تھے کتنے بھرے شہر میں

ہم نے اشکوں سے اپنے چراغاں کیا
تیرگی سے امڈتے ہوئے شہر میں

کون تھا جو ہمیں چپکے سے غم دیا
ایک تیرے سوا اس ترے شہر میں

خستگی کی ہماری کیسے فکر ہے
ذرہ ذرہ بکھرتے ہوئے شہر میں

جن پہ چل کر جدا خود سے ہم ہو گئے
ایسے کچھ راستے بھی ملے شہر میں

کوئی بھی شہر کا درد سمجھا نہیں
لوگ کہتے رہا آ کے گئے شہر میں

ان کے حصے میں آیا دھواں ہی دھواں
جو چراغوں کی صورت جلے شہر میں

مظہری گیت، نوحے بنے کس طرح
تم نے دیکھا نہیں درد کے شہر میں

شکیل مظہر

رفعت سلطانہ

نظیر اکبرآبادی کی شاعری

نظیر اکبرآبادی کی شاعری، اپنی ہندوستانیت اور مقامی عنصر کی وجہ سے خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہی مقامی عنصر اور ہندوستانیت ہے جس نے انھیں ایک انسان دوست شاعر بنا دیا۔

نظیر کا کلام پڑھ کر ہمارے ذہن میں ان کی شخصیت کا جو خاکہ آتا ہے اس میں نظیر ایک بے حد ہنسوڑ شخص، حاضر جواب اور بقول نیاز فتح پوری، چٹکلا باز نظر آتا ہے۔ جس کے آتے ہی محفل میں جان سی آجاتی ہے۔ ایسی محفل کہ جس سے اٹھنے کو کسی کا جی نہ چاہتا ہو۔ بے حد ضبی اور خشک آدمی بھی اس کی باتوں پر ہنس پڑتا ہے۔

نظیر رجائیت پسند شاعر تھا۔ وہ زندگی کے روشن پہلوؤں کی طرف ہماری نشان دہی کرتا ہے۔ ہم اس کا کلام پڑھ کر بے حد مسرور بھی ہو جاتے ہیں اور دل کو ہلکا محسوس کرتے ہیں۔ اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس ہوتا بلکہ زندگی بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے ۔۔

نظیر کے یہاں مذہبی تفاوت بالکل نہیں ہے۔ ان کے یہاں نری انسانیت ہے جسے انھوں نے ہندوستانی اور مقامی رنگ میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظمیں بلدیو جی کا میلہ، حضرت سلیم چشتی، گرونانک شاہ جی، ہولی، دیوالی، راکھی، بسنت، شب برات عید الفطر وغیرہ جن میں ہر مذہب کے تہواروں پر نظیر نے اپنی مسرتیں شامل کر دی ہیں۔

ہولی پر ان کی نظمیں جن میں ہولی کی رنگینیوں اور دھماچوکڑیوں کا ذکر ہے، یوں لگتا ہے جیسے نظیر ان دھماچوکڑیوں میں خود بھی شریک رہتے تھے، ہولی کی خوشیاں ملاحظہ ہوں ؎

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں　　رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں،
کچھ راگ اور رنگ جھکتے ہیں کچھ مئے کے جام چھلکتے ہیں　　کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں،
یہ طور یہ نقشہ عشرت کا ہر آن بنایا ہولی نے

نظیر کے یہاں ہندوستان کے موسم، یہاں کے گرد و پیش اور ماحول کی فضا کا احساس ملتا ہے۔ شاعر کے یہ احساسات قاری کے ذہن پر بھی اپنا گہرا نقش چھوڑتے ہیں۔ یہاں کے موسموں پر بھی ان کی بے شمار نظمیں ملتی ہیں۔ مثلاً برسات کی بہاریں، موسم برسات بہار، جاڑے کی بہاریں، برسات اور پھسلن وغیرہ۔

نظیر نے گو کہ عید الفطر اور شب برات وغیرہ جیسے اسلامی تہواروں پر بھی نظمیں لکھی ہیں لیکن یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کی

کھلنڈری طبیعت ان عنوانات میں اپنا جوہر نہ دکھا سکی۔ کیونکہ ان کے مزاج میں کھلنڈرا پن اور اچھل کود بھی ہے اس لئے وہ ہولی پر اپنی مسرتوں کا زیادہ سے زیادہ اظہار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح راکھی کے تیوہار میں خود بھی راکھی باندھتے اور بندھواتے نظر آتے ہیں۔ ؎

پھرے ہیں راکھیاں باندھے جو ہر دم حسن کے تارے   تو ان کی راکھیوں کو دیکھ لے جاں چاؤ کے مارے
پہن زنار اور قشقہ لگا ماتھے اوپر بارے   نظیر آیا ہے باہمن بن کے راکھی باندھنے پیارے
باندھ لو اس کے تم ہنس کر اب اس تیوہار میں راکھی

گرو نانک شاہ جی کی تعریف میں جو نظم ہے اس میں گرو نانک جی کی خوبیوں کو اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں کہ ہمیں ان سے دھیان لگا کر اپنے من میں سکھ اور شانتی کی شمع روشن رکھنی چاہیئے۔ اس نظم کا ایک بند سنیئے ؎

دن رات جنھوں نے یاں دل وچ ہے یاد گرو سے کام لیا   سب من کے مقصد بھر پائے خوش وقتی کا ہنگام لیا
دکھ درد میں اپنے دھیان لگا جس وقت گرو کا نام لیا   پل بیچ گرو نے آن انھیں خوش حال کیا اور تھام لیا
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو   سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو

اسی طرح نظیر نے ہندو صنمیات اور مذہبیات پر بھی اور کئی نظمیں لکھی ہیں ہندو صنمیات میں بھیروں کی تصویر بہت ہیبت ناک اور ڈراؤنی دکھائی جاتی ہے۔ نظیر نے اس موضوع پر بھی ایک نظم لکھی ہے (جو غیر مطبوعہ ہے اور "نگار" کے نظیر نمبر جنوری ۱۹۴۰ء صفحہ ۱۴ پر ہے) اس ہیبت ناک تصویر کو کتنے اچھے اور مناسب الفاظ میں موہنی بنا دیا ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

آنکھوں میں چھا رہا ہے تیرا سروپ کالا   تن میں بھبھوت گہرا گلے بیچ رنڈ مالا
آنکھیں دیا سی روشن ہاتھوں میں اک پیالا   ہوں دل سے داس تیرا سن لے میرے دیالا
غصہ میں جب تو آکر اپنی جٹا ہلاوے   دھرتی اکاس پربت پاتال دہل جاوے
سر کاٹ راکھشسوں کا چوٹی پکڑ جھلاوے   جھانکے کلال خانے کتنوں کو خوں پلاوے

ہندوؤں کی روایات کے لحاظ سے نظیر نے اس نظم میں بڑے مناسب الفاظ استعمال کئے ہیں۔

نظیر کا عہد بھی وہی ہے جو میر، سودا اور درد کا تھا۔ لیکن نظیر کو ہم کسی عہد سے وابستہ نہیں کر سکتے۔ اس کا کلام ہر عہد کے لئے ہے اس میں کسی عہد کی خصوصیات نہیں ہیں بلکہ وہ ساری دنیا کے لئے اور سب عہدوں کے لئے ہے۔

اس زمانے کا رنگ شاعری خارجیت زدہ تھا اور صرف غزل ہی پسندیدہ صنف سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے نظیر کا کلام اس وقت قدر کی نظروں سے نہیں دیکھا گیا لیکن اس زمانے کے عام لوگوں میں ان کا کلام کافی مقبول تھا۔ انہوں نے آسان زبان استعمال کی ہے۔ روزمرہ کے عام بول چال کے الفاظ اور زندگی کی موٹی موٹی باتیں جو ہر عالم اور جاہل آدمی تک آسانی سے سمجھ سکے، بیان کی ہیں۔ اس لئے اس زمانے میں پڑھے لکھے لوگ ان کے کلام کو گھٹیا اور بازاری سمجھتے تھے کیونکہ نظیر نے الفاظ 'محاورے' کہاوتیں 'عام بول چال کی زبان سے لی ہیں جنھیں ادب میں استعمال کرنا اس زمانے کا شاعر معیوب سمجھتا تھا۔ نظیر کا لب و لہجہ اردو کا معیاری لب و لہجہ نہیں ہے بلکہ ان کے لب و لہجہ پر اوسط درجے کے عام آدمیوں کی عام بول چال کا اثر زیادہ ہے۔ ان کی نظمیں بڑی عمومیت لئے ہوئے ہیں۔

اگر نظیر کو پہلا ترقی پسند شاعر کہا جائے تو مناسب رہے گا کیونکہ ترقی پسند ادب 'ادب برائے زندگی' کا قائل ہے اور نظیر کا کلام اس سے پر

پورا اترتا ہے۔ انہوں نے آج سے کئی برس پہلے جو باتیں کہی ہیں وہ آج بھی اتنے ترقی یافتہ زمانے میں بھی آج ہی کے لئے کہی ہوئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ نظیر کا کلام اپنے اندر قلندری کی شان رکھتا ہے۔ دوٹوک کہنے کا یہ انداز اس زمانے میں تو خیر کیا آج کے عہد میں بھی اتنی کھری کھری سنانے والا کوئی شاعر نہیں ملتا۔ وہ بھی شعر کے سب منصبوں کا لحاظ کرتے ہوئے۔ نظیر اپنے کلام میں بے حد خوش مذاق اور کھلے دل کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ بڑا ہی سیلانی چھوٹی چھوٹی پیش پا افتادہ باتیں جن کی طرف ہم توجہ بھی نہیں کر سکتے ان پر بھی نظیر کی نظر جاتی ہے۔

نظیر کے کلام میں موسیقیت اور اظہار فطرت دونوں چیزیں پائی جاتی ہیں۔ نظیر کے کلام میں عام انسان کی نفسیات کی عکاسی ملتی ہے مثال کے طور پر ان کی نظمیں طفل، جوانی، بڑھاپا اور مفلسی، ان میں انسانی نفسیات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں خوشامد، فقیروں کی صدا، ترغیب سخاوت وعشرت ایسی نظمیں ہیں جن میں انسان کی نفسیات اپنی ساری کمزوریوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

لفظیات کے باب میں بھی نظیر کافی اہمیت کے مالک ہیں روانی ایسی کہ الفاظ کا ایک سمندر ہے کہ اُبل رہا ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نظیر کو آٹھ نو زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ لفظیات کے سلسلہ میں دورِ جدید کے شاعروں میں جوش ملیح آبادی نظیر سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ مثلاً نظیر نے ایک غزل میں محبوب کا ذکر کیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

اس گورے بدن کا کوئی کیا وصف کرے آہ — ختم اس کے اُپر گل رُخی وسیم تنی ہے
منہ چاند کا ٹکڑا ہے بدن چاندی کی تختی، — دنداں ہیں گہر، ہونٹ عقیقِ یمنی ہے
ٹھوڑی پستہ کہوں یا موتی کا دانا — یا چین میں اک چینی کی مورت یہ بنی ہے
نرمی میں صفائی میں نزاکت میں تن اس کا — ریشم ہے نہ گلبرگ نہ برگِ سمنی ہے
گر پھول کی پتی کی بنا پہنے وہ پوشاک — چھل جاوے بدن اس کا یہ نازک بدنی ہے
کل میں نے کسی شخص سے نام اس کا جو پوچھا — یعنی یہ پری یا کہ غزال ختنی ہے
وہ بولا کہ اس شوخ کو کہتے ہیں ہیرا — (ق) کام اس کا سدا دلبری و دل شکنی ہے
تب میں نے وہیں ہنس کے کہا اس سے نظیر آہ — ہیرا نہ کہو اس کو یہ ہیرے کی کنی ہے

اس غزل کو پڑھ کر بے ساختہ جوش کی وہ نظم یاد آجاتی ہے ؎ کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے۔

نظیر کے یہاں مناظر پرستی اور جزئیات نگاری ملتی ہے۔ ان کی پوری شاعری صنائع بدائع سے مالا مال نظر آتی ہے۔

نظیر نے ہنسی ہنسی میں بڑی تلخ حقیقتیں بیان کی ہیں۔ مثلاً مفلسی نامہ، کوڑی نامہ، پیسا نامہ، "تلاشِ زر"، پیسا، روپیا، ان نظموں میں انسان کی انسانیت کے مقابلے میں اس کے مال وزر کی حقیقت اور اہمیت بتائی گئی ہے۔ اسی طرح نظیر کی نظمیں روٹیاں، چپاتی نامہ، پیٹ کی خاطر آٹا دال وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو بڑی تلخ حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ نظیر کا اندازِ بیان اتنا بے ساختہ اور دلکش ہے کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ موت اور فنا پر بھی ان کی کئی نظمیں ہیں۔ ان کی نظم "موت" کا یہ بند ملاحظہ ہو جس میں زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو ہلکے پھلکے انداز میں مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔

دنیا میں اپنا جی کوئی بہلا کے مرگیا　　دل تنگیوں سے اور کوئی اکتا کے مرگیا
عاقل تھا وہ تو آپ کو سمجھا کے مرگیا　　بے عقل چھاتی پیٹ کے گھبرا کے مرگیا
دکھ پا کے مرگیا کوئی سکھ پا کے مرگیا　　جیتا رہا نہ کوئی ہر اک آ کے مرگیا

ایک دن مرنا ہے یہ کوئی نہیں جانتا، لیکن اس کا اس طرح بیان کہ ایک تلخ حقیقت کو ہنستے ہنستے کہہ جانا یہ نظیر کا حصہ ہے اسی طرح ایک نظم "روٹیاں" میں بھی انداز بیان کی شگفتگی ملاحظہ فرمائیے ؎

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کس لئے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیے یہ ہے دل کا نور کیا　　اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا　　کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

کتنا دلکش انداز بیان ہے۔ ایسی مثالیں نظیر کی پوری شاعری میں ملیں گی جنھیں پڑھ کر ہم محظوظ ہوتے ہیں۔ نظیر کا کلام تنہا پڑھنے سے اتنا لطف نہیں آتا جتنا ہم مذاق لوگوں کی محفل میں آتا ہے۔

نظیر کی شخصیت اور شاعری دونوں ہی اردو ادب کے سرمایہ میں اپنی منفرد حیثیت اور اہمیت کے حامل ہیں۔ نظیر پہلا شاعر ہے جس نے غزل اور صرف غزل کے زمانے میں نظم کہی اور ہر موضوع پر نظمیں کہیں۔ نظیر خیالات کے نہیں بلکہ واقعات کے شاعر ہیں۔

●●

نظیر کی شاعری میں جو اجتماعی شعور ملتا ہے اس میں اگرچہ گہرائی موجود نہیں تاہم اس طویل بد نظمی والے قرار کے دور میں یہ ایک اجتہادی کارنامے کی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ لیکن نظیر کی شاعری کو صرف اس اجتماعی شعور کی بنا پر اہمیت حاصل نہیں۔ اس کی اہمیت کی ایک اور وجہ اس کا مزاحیہ و طنزیہ لہجہ اور مسرت و محبت کا اظہار بھی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نظیر اردو کے وہ پہلے شاعر تھے جنھوں نے نہ صرف شعر کو اپنے ملک کے جیتے جاگتے ماحول سے قریب تر لانے کی سعی کی بلکہ جنھوں کی حدود کو [illegible] سے نکل کر طنز و مزاح کے وسیع اطلاق کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ اس گزارش کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نظیر باقاعدہ طور پر ایک طنز نگار کی حیثیت سے ابھرے بلکہ صرف اس قدر ہے کہ انھوں نے زندگی کو ایسے نئے نئے زاویوں سے دیکھا کہ اُن کے بہت سے اشعار میں طنز و مزاح کے نقوش از خود ابھرتے چلے آئے۔

طنز سے قطع نظر نظیر اکبرآبادی کے مزاج کی نمایاں خصوصیت وہ ہمدردانہ انداز نظر ہے جو قریب قریب ان کی تمام شاعری میں موجود ہے اور جس کے زیر اثر وہ اپنے نشاط و تمسخر کو حقارت کی نظروں سے نہیں دیکھتے۔ اس لحاظ سے بھی وہ مزاح کے [illegible] زیادہ قریب ہیں۔

——— ڈاکٹر وزیر آغا

حیدرآباد کے شاعر

(۲)

دامودر ذکی ٹھاکور

سنہ ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ

تلنگانہ اور کرناٹک کے ذو لسانی تعلقہ کوڑنگل میں دامودر ذکی ٹھاکور ۳۰۔اپریل سنہ ۱۹۰۲ء کو پیدا ہوئے اور ۷۴ سال کی عمر میں ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء کو دنیا سے انتقال کر گئے۔ برہمن زادہ اُردو دکن کی گنگا جمنی تہذیب کا روشن عکس تھا۔ ذکی اردو فارسی کنڑ تلگو اور مرہٹی زبانوں سے واقف تھے۔ پیشہ معلمی تھا زندگی بھر سادگی شرافت اور مذہبی اقدار کو عزیز رکھا اُردو کے بزرگ اور قادرالکلام شعراء میں اپنی شعری صلاحیتوں کے سبب ذکی صاحب سرشہ صاحب نظراں کے مصداق تھے آپ کی شاعری پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے بڑی اچھی رائے لکھی تھی کہ "دکن کے ایک دیہات کے باشندے نے خدا جانے ایسی زبان کہاں سے سیکھ لی اور کلام میں ایسا سوز و گداز کہاں سے آیا!۔ ذکی صاحب کے دو مجموعے "ارغ" اور "سفینۂ ذکی" شائع ہو چکے ہیں۔ اُردو شعر و ادب کی خدمات کے اعتراف میں ادبی ٹرسٹ حیدرآباد، اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش اور بہار اُردو اکیڈمی نے ذکی کو انعامات سے نوازا۔ ذکی کے کلام میں سلاستِ فکر اور لطافتِ خیال کے روشن نقش ملتے ہیں ۔۔

(د۔غ)

ذکی

یہ زندگی اک بھیس سہی راس کیسے ہے ... جیتا ہوں مگر جینے کا احساس کیسے ہے
ساقی کی نوازش بھی ہے کچھ مست سی ورنہ ... ملتی ہے مئے ناب کسے پیاس کسے ہے
بے سود ہی بہتے گئے جب شمع کے آنسو ... اے اشک! سرِ بزم ترا پاس کسے ہے
صرف ایک نظر کے لئے ہم بزم میں اُن کی ... آنے کو تو آئے ہیں مگر آس کسے ہے
کتنے نہیں گل کھلتے تری بزم میں ہر روز ... اِن میں سے ترے پیار کی بو باس کسے ہے

مستوں کی زبانوں پہ ذکی دعوئ ہوش اور
ہم ہوش کی کہتے ہیں پہ احساس کسے ہے

●

ہوش نے دے دیا جواب عقل کا کیا سوال ہے ... بزم میں تری آگیا اتنا مجھے خیال ہے
موت کی عمر لمحہ بھر، زندگی ہے تمام عمر ... مرنے کی فکر چھوڑ دیجئے جینا بہت محال ہے
جس نے فرازِ بام سے ہوش و حواس اڑا دیئے ... کیا وہ ترا جمال ہے یا وہ ترا جلال ہے
شام و سحر کا امتیاز چشمِ خرد سے اُٹھ گیا ... یعنی زوالِ عقل کا حد سے سوا کمال ہے
دیکھتی ہے نظر تری رفعتِ آسماں مگر ... دیکھ اِدھر زمین پر، آدمی پائمال ہے

دل کی جراحتوں پہ ہے شفقتِ دردِ مہرباں
یہ بھی ہے ایک زندگی جس سے ذکی نہال ہے

●

غم حیات دلِ سرخ رو سے ملتا ہے ... ہمارے اشکوں کا رشتہ لہو سے ملتا ہے
ہزاروں داغ لئے غم سے دل جلا ایسا ... کہ سرخ رو کوئی اک سرخ رو سے ملتا ہے
ذلیل ہو کے ملیں نعمتیں تو کیا حاصل ... دِیا بہت ہے جو کچھ آبرو سے ملتا ہے
پکارتا ہے بیاباں میں اور کون مجھے ... ندا کا ڈھنگ، تری گفتگو سے ملتا ہے
دیا ہے نام محبت کا اہلِ دل نے جسے ... وہ ایک گل جو ہر رنگ و بُو سے ملتا ہے

ملی ہے مجھ کو اس انداز سے حیات ذکی
کہ جیسے خنجرِ قاتل گلو سے ملتا ہے

●

طیبہ خسرو

افسانے کے بدلتے رنگ

اچھے افسانے کی پہلی شرط ہے احساس کی شدت، فکر کی گہرائی، تخیل کی ندرت اور حسنِ بیان۔ افسانہ کی اہمیت زندگی کی ترجمانی اور فن کی رنگینی میں مضمر ہے۔ مختصر افسانہ میں اختصار کی وجہ سے سادگی اور حسنِ ترتیب و توازن پیدا ہوا جو ناول اور داستان میں نہیں تھا۔ مختصر افسانوں کا وجود میں آنا زندگی کے ایک نئے میلان کو ظاہر کرتا ہے۔ آج مختصر افسانہ ایک فن بن گیا ہے۔ چند لطیف کنایوں اور نازک اشاروں میں پوری داستانِ زندگی بیان کرنا کچھ آسان کام نہیں اور پھر آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی بنانا ایک فن کار ہی کا کمال ہے۔

کوئی ادیب یا شاعر سماجی اور معاشرتی زندگی سے بیگانہ ہو کر ادب پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ سماج سے الگ ہو کر ادب پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہی اشعار یا کہانیاں پسند کی جاتی ہیں جن میں ہماری سماجی زندگی اور تجربات کی جھلکیاں ہوں۔ بقول رالف فاکس "تخیل کی ہر پیداوار اس دنیا کا عکس ہوتی ہے جس میں صاحبِ تخیل زندگی بسر کر رہا ہے"۔ اس لئے ادب بھی اسی تعلق کا نتیجہ ہے۔ جو ادیب کو زمانے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ادب نام ہے انسان کے خیالات و جذبات کے اظہار کا اور جذبات و خیالات کی بنیاد پر اس کے تجربات پر ہوتی ہے جیسی ہماری زندگی ہوتی ہے ویسے ہی ہمارے خیالات ہوتے ہیں۔ اور آدمی وہی لکھتا ہے جو زندگی سے لیتا ہے۔ حساس فطرت ادیب زندگی کے خس و خاشاک میں کچھ دیکھ ڈھونڈ لیتا ہے، اور اس پر اپنے افسانے کی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے۔ مشہور امریکی ناول نگار ہنری جیمس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی تمام کہانیوں کا پلاٹ اور مرکزی خیال ملنے جلنے والوں کی گفتگو اور تجربات سے ہی اخذ کیا ہے۔

چونکہ آدمی کی زندگی سماج ہی میں گزرتی ہے اس لئے ہر واقعہ یا حادثہ اسے متاثر کرتا رہتا ہے۔ زندگی کی قدریں اور معیار ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔ انسانی معاشرت اور سماج جس قدر بدلتا رہتا ہے اسی قدر ادب بھی بدلتا جائے گا اور تہذیب و تمدن کا دائرہ جتنا پھیلا ہوا ہوگا اسی قدر ادب بھی مہذب اور سلجھا ہوا ہوگا۔ ہر ادیب اور شاعر کا اپنا ماحول اور اپنی معاشرت ہوتی ہے۔ اس کی اپنی تہذیب ہوتی ہے اور اس کے خیالات اس کی طرزِ معاشرت کا آئینہ ہوتے ہیں وہ زمانہ اور ماحول کی آواز ہوگا اور کچھ بھی لکھے گا یا کہے گا ایک اندرونی تحریک سے لکھے گا اور یہ تحریک دراصل ان ہی اثرات اور میلانات کا غیر شعوری نتیجہ ہوگی جس کو وہ اپنی معاشرت اور سماج سے حاصل کرتا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں اور فن کاروں کی زندگی میں ایسی کشمکش اور حادثات آئے جن سے ان کی زندگی درہم برہم ہوگئی مگر انہوں نے ایسے وقت جو ادب پیدا کیا وہ آج بھی جاوداں ہے۔ یورپ میں ورڈز ورتھ، شیلی اور گوئٹے اور روس کے ٹالسٹائی، گورکی، دوستوفسکی، چیخوف اور ہندوستان میں سورداس، کبیر، میرابائی، غالب اور میر کی زندگیاں ایسی ہی کشمکش سے گذریں اور جو کچھ انہوں نے دنیا کو ادب کی صورت میں دیا اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

اس کے ساتھ یہ بھی کہہ دوں کہ اچھا ادیب یا فن کار وہ ہے جو اپنی رگوں میں نہ صرف نئے زمانے اور نئی نسل کی زندگی کی حرکت محسوس کرے بلکہ جس کے اندر ماضی اور اسلاف کے تمام اکتسابات کی روح بھی کام کر رہی ہو۔ آج تک اس قوم کا کوئی مستقبل نہیں ہوا جس کے پاس اس کا اپنا کوئی ماضی نہ ہو۔ ہر مستقبل کا ایک ماضی اور ہر ماضی کا ایک مستقبل ہونا ضروری ہے۔ میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، ذوقؔ اور اقبالؔ نے جو کچھ ہماری شاعری کو ترکہ میں دیا اس کے مطالعہ سے نئے شاعروں کے لئے نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ کیونکہ قدما کا مطالعہ ہمارے اندر روایت کی آگہی اور بصیرت پیدا کرتا ہے۔ اگر ادب کو ترقی کرنی ہے تو چاہئیے کہ ماضی کا احترام کرتے ہوئے حال میں مشغول رہیں اور مستقبل کو پیش نظر رکھیں۔ جن ملکوں میں ادب روبہ ترقی ہے، وہاں یہی ہو رہا ہے اور جن ملکوں میں ایسا نہیں ہے وہاں ادب مفقود ہو رہا ہے۔ اعلیٰ معیار کے ادبی کارنامے حال کے ساتھ ماضی کی بھی نئی سمت میں توسیع کرتے ہیں۔ ورنہ ہومر، شیکسپیر، دانتے، فردوسی، حافظ، امیر خسرو، غالب، میرؔ، میر حسنؔ اور انہیں اپنے کارناموں کے ساتھ ہی دفن ہو چکے ہوتے اور آج ہمارے ذہن کا جزو نہ بن سکتے۔

شاعر یا ادیب کو اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہئیے کہ زندگی کس سمت جا رہی ہے اور کون کون سے میلانات اور محرکات پیدا ہو رہے ہیں۔ ان نئے رجحانات اور عصری تقاضوں کی عکاسی کرنی چاہئیے۔ ادب سے جمالیاتی حظ ملتا ہے مگر ادب سے زندگی کا ایک مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔ وہ محض تفریح نہیں ہے اگر مقاصد اونچے ہوں تو ادب بھی اونچا ہوگا۔ صحت بخش ماحول صحت بخش ادب پیدا کرے گا۔ ادب کی تخلیق کے لئے ضروری ہے کچھ اعلیٰ قدریں اور معیار مقرر ہوں ان کے بغیر ادب کھوکھلا رہ جائے گا۔

ہر زمانے کا ادب اپنے زمانے کے لحاظ سے ترقی پسند رہا ہے۔ شیکسپیر، ملٹن، ڈکنس، ہارڈی اپنے دور کے ترقی پسند قوتوں کے نمائندے تھے۔ جنہوں نے اپنی معاشرت کو مہذب اور شائستہ بنانے اور مستقبل کو خوش آئند بنانے میں حصہ لیا۔ بعد کی نسلیں شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سے سبق لیتی گئیں یہ اور بات ہے کہ ہمارے زمانے میں ترقی کا تصور زیادہ پیچیدہ اور ایک حد تک پراگندہ ہو گیا ہے اس لئے کہ ہماری زندگی بھی بڑی پیچیدہ ہے اور ہماری ضرورتیں بدل گئی ہیں۔

مختصر افسانے کی ابتداء ۱۹۰۶ء میں پریم چند نے کی تھی۔ یوں تو سرشار نے اس کا بیج بو یا مگر جس نے اس کی آبیاری کی اور اسے ایک مستقل فن بنایا وہ پریم چند ہی تھے۔ انہوں نے اس سماجی واقعیت کو مضبوط بنایا جس کو نذیر احمد اور سرشار نے اپنے اصلاحی اور مزاحیہ ناول میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ پریم چند کے افسانے ہندوستان کی عام زندگی اور معاشرت سے تعلق رکھتے تھے۔ نذیر احمد اور سرشار سے ان کا انداز بالکل مختلف اور اپنا ہے۔ مختصر افسانہ ایک صنف ادب کی صورت سے بیسویں صدی کے بالکل شروع میں پیدا ہوا اور اس وقت تک کافی ترقی کر چکا ہے۔ وہ ایک انتشاری دور تھا جس میں اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس وقت زندگی مایوسیوں کے غار میں سسک رہی تھی۔ لہٰذا اس وقت کا ادب بھی یاس و بے اطمینانی کا مظہر تھا۔ پھر اس میں اصلاح اور انقلاب کی لہریں موجزن ہوئیں اور ادب اس کا عکاس بن کر ہمارے سامنے آیا۔ اس عہد کے افسانہ نگاروں میں پریم چند کے علاوہ سلطان حیدر جوش، سجاد یلدرم، اور نیاز فتح پوری ملتے ہیں جن کے افسانے مختلف ریاستوں، تہذیبوں اور معاشرتوں کے رسم و رواج کا آئینہ ہیں۔

اس ابتدائی دور میں بھی اردو افسانوں میں زندگی اور فن کا امتزاج ملتا ہے۔ ادب اور زندگی کا رشتہ دائمی رشتہ ہے۔ لیکن زندگی میں سب کچھ ایسا نہیں ہے جسے ادب اپنا موضوع بنائے۔ زندگی میں صرف محبت کا نغمہ ہی ایسا نغمہ ہے جسے ادب ہر وقت اپنے سینے سے لگا سکتا ہے۔ ان تینوں افسانہ نگاروں نے یہ بتایا کہ افسانہ اور زندگی میں گہرا تعلق ہے۔ افسانہ صرف زندگی کے واقعات، سیاسی اور معاشرتی حالات سے پیدا کردہ

محرکات کی بنیاد پر لکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح ایک طرف جہاں زندگی کی حقیقتیں افسانہ کو دلکش بناتی ہیں اس کے ساتھ دوسری طرف افسانہ اصلاحی مقاصد کے حاصل کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے یہ بھی سکھایا کہ افسانہ کسی نہ کسی سے متعلق ہو، بالمقصد ہو جس میں خلوص اور شدت احساس ہو اور فن کی لطافتوں سے لبریز ہو۔ ادیب کا درد مند دل زندگی میں درد و غم کے مرقعے تلاش کرلیتا ہے۔ اور ان میں اپنے دل کی تڑپ اور کسک شامل کرکے دوسروں کو اپنا شریک غم بنالیتا ہے، اور فن کے حسن و سحر کاری کے دل نشیں نمونے پیدا کرتا ہے۔ افسانہ لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ مقصد پورا ہونے پر افسانہ اپنی افسانوی دلکشی نہ چھوڑے، یہی فن کا مطمح نظر ہے اور یہی زندگی اور فن کا صحیح امتزاج بھی ہے۔

۱۹۲۰ء میں ان چاروں افسانہ نگاروں نے بعد کے آنے والے افسانہ نگاروں پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے جن میں رشید الخیری، عظیم بیگ چغتائی، حجاب امتیاز علی، علی عباس حسینی، سدرشن، اختر انصاری، سہیل عظیم آبادی، اعظم کریوی، حیات اللہ انصاری وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کی دلکشی کا مرکز محبت، رومان، اور عورت ہے اور ہمارے سماج کے فرسودہ قوانین اور پابندیوں سے لڑنے اور محبت کو فاتح اور کامران بنانے کے ارادے ہیں۔ رومان اور تخیل کی اس شاعرانہ دنیا میں جو مرد عورت چلتے پھرتے نظر آتے ہیں وہ ہماری ہی دنیا کے مرد عورت ہیں جن میں زندگی کی ساری الجھنیں، غم اور خوشیاں سمٹ آئی ہیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء کا دور افسانہ نگاری کا زریں دور کہا جاسکتا ہے۔ جن میں کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، کے ساتھ احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، غلام عباس، شفیق الرحمن، اوپندر ناتھ اشک، مہندر ناتھ، ابراہیم جلیس، احمد علی وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان کی کہانیوں میں انسان کے درد و کسک اور دل کی اتھاہ گہرائیوں کا حزن و ملال ملتا ہے۔ شفیق الرحمن کا شگفتہ اور دل نشیں انداز بیان اور قدرت اللہ شہاب کی گہری طنزیہ نثر موجودہ افسانے کے دو ایسے پہلو ہیں جن پر ہر فرد کی دلبستگی کا سامان مہیا ہے۔ گذشتہ چند سالوں کے عظیم حادثوں نے شعراور ادیب میں حزن کے ساتھ بے اطمینانی بھی پیدا کردی ہے۔ اس تڑپ اور تلملاہٹ نے جو ادب پیدا کیا اس میں رستے ہوئے ناسور بھی ہیں اور پرجوش جذبات بھی۔ زندگی کے یہ تلخ تجربات نئی تہذیب اور نئے ادب کا جزو بن گئے۔ تقسیم ہند کے بعد جو افسانے لکھے گئے ان میں اس دور کے حزن و یاس کو اپنا موضوع بنایا گیا ان افسانوں نے زندگی کی رنگینیوں میں بھی خون تمنا کی سرخی دیکھی۔

ترقی پسند افسانہ نگاروں نے حقیقت پسندی کے ساتھ آج کے آدمی کی تڑپ کو محسوس کیا۔ اور ان کے دکھ دور کرنے کے راستے سوچے۔ اس دور کے افسانہ نگاروں نے اسلاف کی چھوڑی ہوئی روایت کو آگے بڑھایا اور اردو افسانہ کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کھڑا کردیا۔ صداقت اور فنی لطافت کو خیر و شکر کرکے پچاس برس کی روایت کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اپنی اپنی شخصیتوں کا رنگ و روپ دے کر اسے نکھارا۔ اور اس میں نئی خصوصیات پیدا کردیں۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں نے تیزی سے بدلتے ہوئے زمانہ اور فن کو اپنی گرفت میں لے لیا حالانکہ ان کی ابتدا رومانیت شہریت اور رنگینی سے ہوئی۔ کیونکہ وہ زمانہ ہی ان چیزوں کا تھا مگر زمانے کے بدلتے ہوئے مسائل کو اپنا کر انہوں نے حسب ضرورت اپنے افسانوں کو ان سے روشناس کیا اور بتایا کہ افسانہ نگار کے مزاج کا زندگی سے گہرا ربط ہے اس کے ساتھ فن پر ماہرانہ گرفت بھی بے حد ضروری ہے۔

آزادی کے بعد حالات نے ہمارے افسانہ کو نیا موڑ دیا۔ تقسیم ملک کے ساتھ فسادات اور ہجرت اس دور کے افسانوں کا موضوع بنے۔ اس بربریت کے دور میں اردو افسانہ نگاروں نے انسانیت و دوستی کی شمع روشن کی۔ تقسیم، ہجرت اور فسادات کے موضوع پر منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، احمد ندیم قاسمی، غلام عباس، قدرت اللہ شہاب، خواجہ احمد عباس، کشمیری لال ذاکر، رامانند ساگر نے بڑے پائے کے افسانے لکھے، ان کے ساتھ ہی قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اور اشفاق حسین نئی توانائی کے ساتھ آئے۔

پچھلے چند برسوں سے اردو افسانہ تجربہ کی منزلوں سے گزر رہا ہے اس دور میں علامتی افسانے (Symbolic) لکھے گئے۔ پرانی داستانوں اور قصوں، اساطیر mythology اور مذہبی روایات کو برتا گیا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام انتظار حسین کا ہے جن کا اثر ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی نئی نسل پر پڑا۔ بعد کے دور میں انور سجاد، خالدہ اصغر، اور پھر ہندوستان کے بعض نوجوان افسانہ نگاروں نے علامتی افسانے کو تجریدی افسانے کی طرف موڑا۔ ابھی ان تجربوں کیلئے کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ ان نئے تجربوں سے اردو افسانہ مالا مال ہو رہا ہے۔ اور بہت سے ایسے امکانات پیدا ہو رہے ہیں جو ہمارے افسانے کو زیادہ جاندار اور ترقی یافتہ بنا سکتے ہیں۔

اردو افسانے کی پوری تاریخ ہمارے سماج، سیاست اور معاشرت کی تبدیلیوں کے قدم بہ قدم چلتی رہی ہے۔ ہم نے روایت کو آگے بڑھایا، تجربے کئے اور کر رہے ہیں۔ تجربوں سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں مگر نئے لکھنے والوں سے اتنا ضرور کہوں گی کہ وہ تجربوں کو صرف فیشن سمجھ کر نہ اپنائیں بلکہ ہر تجربے کو اپنے ذاتی تجربے اور زندگی سے ہم آہنگ کر دیں۔ سچا اور اچھا فن کار کی ذاتی زندگی اور تجربوں ہی سے پروان چڑھتا ہے۔ ہمارے نئے لکھنے والے اردو کے ساتھ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں خصوصاً انگریزی، روسی، جرمن، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے پرانے اور نئے لکھنے والوں کو پڑھیں ان کے تجربات سے بصیرت حاصل کریں اور اس بصیرت کو اپنے تجربوں کی آگ سے نئے چراغوں میں روشن رکھیں۔

امید ہے ہمارے نوخیز ادیب اور شاعر بڑے فن کاروں کے نادر تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسا مستقبل تیار کریں گے جس میں روایت کے عرفان کے ساتھ موجودہ دور کے تلخ حقائق کی عکاسی ہوگی تب ہی پڑھنے والا یہ جانے گا کہ یہ اس کی اپنی کہانی ہے۔ اور لکھنے والا وہی لکھ رہا ہے جو اس کے دل میں ہے۔

——— کسی افسانہ میں سب سے پہلے جو چیز ہمارے ذہن کو اپنی طرف منتقل کرتی ہے وہ چند واقعات ہوتے ہیں جن پر اس افسانہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ انھیں واقعات کی ترتیب کو ماجرا یا پلاٹ کہتے ہیں۔ افسانہ اور کچھ ہو یا نہ ہو اس کو افسانہ تو ہونا ہی ہے۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ جو حالات و واردات اس میں بیان کئے جائیں عام اس سے کہ وہ فرضی ہوں یا واقعی ان کے اندر بجائے خود اتنی صلاحیت ہو کہ پڑھنے والے اور سننے والے کو بے ساختہ اپنی طرف متوجہ کر لیں۔ افسانہ کی کامیابی کی پہلی شرط یہ ہی ہے۔ اب یہ غور کرنا ہے کہ اس کے لیے کن باتوں کی ضرورت ہے اور کن باتوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے؟۔

سب سے پہلے افسانہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ جن واقعات کو وہ اپنے فسانہ کے لیے منتخب کرے وہ عوام کے لیے کوئی اجنبیت تو نہ رکھتے ہوں لیکن اُن کے اندر ایک ندرت و تازگی ضرور ہو اور اُن کی اہمیت مسلم ہو۔ ورنہ جو اثر افسانہ نگار پیدا کرنا چاہتا ہے وہ پیدا نہ کر سکے گا۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ افسانہ میں واقعات کا زمانہ ماحول اور معاشرت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ فسانہ نگار کو واقعات کے انتخاب اور اُن کے بیان میں بڑے تفحص اور بڑی تمیز سے کام لینا ہے۔ انسان کی زندگی میں ہر قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو واقعی غیر اہم اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں جن سے بڑی خوبی کے ساتھ تجاہل برتا جا سکتا ہے۔

——— (مجنوں گورکھپوری)

نہ کوئی بات تھی اس واردات سے پہلے
مری ہی ذات تھی اس کائنات سے پہلے

کوئی ہنسے بھی تو اُبھرے صدا سسکنے کی
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے

اگر وہ چھوٹ گیا بات یہ نئی تو نہیں
ملے تھے ہاتھ بہت اس کے ہات سے پہلے

کہاں ملوگے جو موسم وفا کا بیت گیا؟
یہی تو بات اٹھائی تھی گھات سے پہلے

ہوئے نہیں تھے کبھی اتنے آبرو والے
کسی کے ساتھ نہ تھے اس کے ساتھ سے پہلے

سلطان سبحانی

ایک چہرہ سامنے دن رات ہے
کوئی غم ہے اور نہ کوئی بات ہے
آگئے آگے دل نشیں خوابوں کی دھوپ
پیچھے پیچھے گردشِ حالات ہے
جذب کرلے میرے نقش پا زمیں
کس لئے محرومِ احساسات ہے
تشنگی ہی کرب کے صحرا کا غم
تشنگی ہی عظمتِ سادات ہے
اب اُسے تخلیق کا محور بنا
جس تفکر کو شعورِ ذات ہے
اتنا ہی تاریک منزل کا وجود
جتنی روشن راہِ امکانات ہے
سانس لیتا ہے وجود حرف حرف
جیسے دل پر عکسِ تحریرات ہے
تشنگی ہی تشنگی پرواز میں
ذہن و دل پر بارِ تخلیقات ہے

نصیر پرواز

پلکوں میں انتظار سجا کر چلا گیا
اب رتجگوں کی آگ جلا کر چلا گیا
کس کے لئے گھروندے بنائیں کنارِ آب
مٹی میں اپنے ہاتھ بھرا کر چلا گیا
بہتر تو ہے اُجاڑ دیں ساری کیاریاں
آنگن میں اب گلاب اُگا کر چلا گیا
ہے کون آئینوں کا خریدار اب یہاں
قیمت بھی اپنی آج گرا کر چلا گیا
کس کس کے آگے بند دریچوں کو کھولیے
ہر زخم کو تماشہ بنا کر چلا گیا
پیکر کہاں ہے کوئی کسی بھی لباس میں
سایوں سے رسم و راہ بڑھا کر چلا گیا
ہم خود ہی اپنی راہ کی دیوار ہیں مگر
الزام دوسروں پہ لگا کر چلا گیا

امان اختر

رحمت علی خاں

کتابخانۂ سالار جنگ میوزیم

ایک زمانہ تھا کہ سالار جنگ میوزیم اور کتابخانہ کا نام بجز چند اشخاص کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر آج اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل چکی ہے۔ کافی تحقیق و تدقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ خاندانِ سالار جنگ کی سب سے قدیم کتاب ایک قلمی قرآن الحکیم ہے۔ جس پر سالار جنگ کے جد اعلیٰ محمد باقر ابن شیخ محمود علی کی مہر اور دستخط ثبت ہے۔ اس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس کتابخانہ کی بنیاد ۱۰۶۷ھ م ۱۶۵۶ء میں رکھی گئی اور رفتہ رفتہ علم پرور، ادب نواز، اور قومی یک جہتی کے علمبرداروں نے اس گراں مایہ کتبخانہ کی جمع آوری کا آغاز کردیا، حتیٰ کہ نواب مختار الملک سالار جنگ اول کے انتقال سے قبل اس میں چھ ہزار سے زیادہ کتابیں جمع ہوگئی تھیں۔ ان کتب و مخطوطات کو کتبخانہ کی شکل دینے والے سالار جنگ اول یعنی میر تراب علی خاں (متوفی ۱۸۸۲ء) ہیں۔ سالار جنگ دوم میر لائق علی خاں (متوفی ۱۸۸۸ء) نے ان کتب و مخطوطات میں گرانقدر اضافے کئے اور ان کتب و مخطوطات کی الگ الگ فہرستیں ترتیب دیں۔ ایک تخمینہ کی رو سے میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوم (متوفی ۱۹۴۹ء) نے بارہ ہزار سے زائد مخطوطات و کتب مشرقیہ جمع کیں۔ اسی طرح انہوں نے پچاس ہزار سے زیادہ انگریزی کتب حاصل کیں۔ مذکورہ بالا حساب کتاب سے کوئی بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ سالار جنگ ثالث ہی اس کتابخانہ کے بانی مبانی ہیں۔ اس اہم ذخیرۂ کتب و مخطوطات کا بڑا حصہ خریدا ہوا ہے۔ اور چند ہی کتابیں تحفتہً ملی ہیں۔ میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوم کے انتقال کے بعد اُن کا یہ خزانہ ایک معاہدہ کے ذریعہ سالار جنگ اسٹیٹ کمیٹی قائم شدہ ۱۹۵۱ء سے ہوتا ہوا ۱۹۵۸ء میں مرکزی حکومت کی تحویل میں آکر قومی نوعیت کا روشن مینار بن گیا ہے۔ یہ بات قابلِ اطمینان ہے کہ مرکزی حکومت، ریاستی حکومت، سالار جنگ میوزیم بورڈ اور ہر ناظم نے اس کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

اس کتابخانہ میں تقریباً پچپن ہزار کتب و مخطوطات محفوظ ہیں، جن کی تفصیلات حسب ذیل ہیں؛

انگریزی مطبوعات تقریباً تیس ہزار، عربی، فارسی اور اردو، ترکی مطبوعات زائد از چودہ ہزار، اور تقریباً ۸ ہزار پانچ سو مخطوطات۔

ان کتب کی مضمون واری ترتیب دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس کی گیرائی و وسعت کا کیا عالم ہوگا۔ چند مضامین یہ ہیں؛

قرآن و حدیث اور اس کے متعلقہ علوم، مذاہب عالم، فلسفہ و کلام، تصوف و اخلاق، ادعیہ و مواعظ و خطبہ، قواعد لغت، فنون لطیفہ، ریاضی، کیمیا، فزکس، طب، علوم سیریہ، نظم نثر، تذکرہ، تاریخ، جغرافیہ، سیر و مناقب، سوانح و شہادت نامے، نسب نامے، مجامیع، کشکول، مجمع العلوم، مرقعات اور نمونہ جات خطاطی وغیرہ۔ دیگر السنہ میں ہمارے یہاں ترکی، پشتو، ہندی، تلگو وغیرہ کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔

کتابخانۂ سالار جنگ میوزیم کا سب سے بڑا حصہ انگریزی مطبوعات پر مشتمل ہے۔ جہاں سالار جنگ ثالث مرحوم کی وراثت میں ملی نازک و دیدہ زیب المایوں میں ان کتب کو مضمون وار سجایا گیا ہے۔ اس سے نہ صرف اس لائبریری کا باطنی حسن سامنے آتا ہے بلکہ ظاہری چمک دمک بھی ناظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ تقریباً ہر مذہب و ملت و ملک و مضمون کی کتب یہاں مل جاتی ہیں مگر زیادہ تعداد انگریزی ادب اور تاریخی کتب

پر مبنی ہے۔ سترہ سو سے زائد ریسرچ جرنل بھی یہاں محفوظ ہیں۔ کئی مطبوعات حالیہ اب نادر و نایاب کتب کے زمرے میں آتی ہیں۔ مثلاً جنرل ہسٹری آف ڈرگز جو ۱۳۳۱ء میں شائع ہوئی اور انگریزی مطبوعات میں قدیم ترین ہے۔ ببلیا ہیبریکا جو ۱۶۶۷ء میں چھپی اور ہسٹاریکل اینڈ کرٹیکل ڈکشنری جو چار جلدوں میں ۱۸۱۰ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ ایسی کتابیں جن پر کسی اہم شخصیت کے دستخط ہوں، قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں چنانچہ یہاں بھی ملکہ وکٹوریہ، سر سید احمد خاں، بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو اور ناولسٹ CORELLI کی آٹوگراف دیکھی جا سکتی ہیں۔ سنسکرت، عربی اور فارسی کے کئی انگریزی ترجمے اس جگہ موجود ہیں۔ گرونانک کی مشہور عالم سوانح عمری "جنم ساکھی" بھی یہاں ہے۔

اسی شعبہ سے ملحقہ شعبۂ ماخذ ہے یعنی REFERENCE SECTION جہاں اسکالرز کی آسانی کے لئے تقریباً آٹھ ہزار کتب جمع کی گئی ہیں جن کا تعلق اکثر و بیشتر فنونِ لطیفہ اور میوزیالوجی سے ہے۔ علاوہ ازیں کئی لغات السنۂ مختلفہ اور انسائیکلوپیڈیا بھی مطالعہ میں لائی جا سکتی ہیں۔ سالار جنگ ثالث مرحوم کے بعد اب تک تقریباً ساڑھے چار ہزار کتب اس شعبہ کے لئے خریدی گئی ہیں۔ ہندی اور تلگو زبانوں کے علاوہ بچوں کے لئے بھی ہر زبان میں دیدہ زیب و دلکش کتب جمع کی جا رہی ہیں۔ ان سب کے سوا کئی روزنامے، ہفتہ واری رسالے، ماہنامے وغیرہ بھی لائبریری کی زیب و زینت میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔

اس کتب خانہ کا دوسرا بڑا شعبہ "شعبۂ مشرقی مطبوعات" ہے جہاں تقریباً پندرہ ہزار عربی، فارسی، اردو اور ترکی کتب موجود ہیں۔ انگریزی کتب کی طرح یہاں بھی مضامین میں کتابیں مل جاتی ہیں۔ یہاں سب سے زیادہ کتب اردو کی ہیں، پھر ترتیب وار فارسی، عربی اور ترکی کا نمبر آتا ہے۔ اردو زبان و ادب کی کتب آٹھ ہزار سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس شعبہ کی قدیم ترین کتاب "تاریخ ابوالفدا" (عربی) ہے جو مع فرانسیسی ترجمے کے آج سے تقریباً ۲۵۳ سال قبل یعنی ۱۷۲۳ء میں چھپ کر منظرِ عام پر آئی۔ اسی طرح عربی ہی کی کتب "بائبل" اور "کتاب الالف والکتابیہ" بھی ہیں جو علی الترتیب ۱۷۲۷ء اور ۱۷۸۶ء میں طباعت سے آراستہ ہوئیں۔ شاہانِ اودھ کے شاہی کتب خانہ کی کچھ کتب بھی محفوظ رکھی گئی ہیں۔ دستخط شدہ کتب میں مندرجہ ذیل حضرات کا نام قابلِ ذکر ہے:

جمال عبدالناصر مرحوم صدرِ جمہوریہ مصر، مہاراجہ سر کشن پرشاد، عبدالرحمٰن چغتائی، مرزا فرحت اللہ بیگ، امداد امام، بابو سکسینہ وغیرہ

فارسی دینیات کی کتاب "حیات القلوب" بھی قابلِ دید ہے جو ۱۷۹۱ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔ مزید برآں نو سو سے زائد قدیم رسائل و جرائد بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔

شعبۂ مخطوطات اس کتب خانہ کا اہم ترین جزو ہے۔ ہم بآسانی اس کا تقابل دنیا کے کسی بھی ذخیرہ ہائے کتب سے کر سکتے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور ترکی کے ایسے انمول رتن شاید ہی کہیں اور دستیاب ہوں۔ اس شعبہ میں زائد از آٹھ ہزار عربی، فارسی اور اردو کی قلمی کتب محفوظ کی گئی ہیں۔ عربی کی مخطوطات ۲۶۰۰ سے زیادہ ہیں اور فارسی کی ۴۹۰۰ سے زیادہ، اردو کا درجہ آخری ہے چونکہ یہاں صرف ۵۰۰ قلمی نسخے ملتے ہیں۔ علاوہ بریں ترکی، پشتو اور ہندی کی کچھ قلمی کتابیں بھی یہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ زیادہ تر مخطوطات یا مطلا و مذہب ہیں یا پھر بہترین جلدوں میں محفوظ کی گئی ہیں۔ کئی نسخے شاہی کتب خانوں کی "باقیات" ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سے زائد علیحدہ علیحدہ عمدہ پارے خطاطی کے ہیں۔

یہاں سب سے قیمتی سرمایہ مصور نسخے ہیں جن کی تعداد قریب قریب ... ہے اور ان میں زائد از پانچ ہزار قلمی تصاویر ہیں۔ ان تمام تصاویر کا مستند کتب بنانے کے قابل ہے۔

بخارا، اصفہان، شیراز، تبریز، ہرات، قاچار، لاہور، کشمیر، پنجاب، دلی، ٹیپو، ارکاٹ، گجرات، مشرقی ہند، فیض آباد، لکھنؤ اسکول اور دکنی مکاتیب جیسے گولکنڈہ، بیجاپور، بیدر، اور حیدرآباد وغیرہ۔ شعبۂ مطبوعات کی طرح یہاں کی مخطوطات بھی تقریباً تمام مضامین پر حاوی ہیں۔

اس شعبہ کا قدیم ترین قلمی نسخہ ایک نامکمل قرآن مجید ہے جو تقریباً دوسری صدی ہجری میں بہ خطِ کوفی جھلی پر لکھا گیا۔ جدید مخطوطہ وہ ہے جس کو والا ورعلی دانش، استاذ و مہتمم کتب خانۂ سالار جنگ ثالث نے ۱۳۶۱ھ م ۱۹۴۲ء میں لکھا اور جس کا نام "دیوان رام" تھا۔ وہ شاہی کتب خانے جن کے مخطوطات یہاں آکر محفوظ ہو گئے ہیں، یہ ہیں: شاہانِ صفویہ ایران، بخارا، افغانستان، کشمیر، مغل، عادل شاہی، قطب شاہی، آصفجاہی اور شاہانِ اودھ وغیرہ۔

عربی مخطوطات میں قدیم واہم نسخے چار سو سے زائد ہیں مگر ان میں سے بھی ۱۵۰ ایسے نادر و کمیاب قلمی کتب ہیں جن کی قیمت پیش کرنی مشکل ہے۔ اس زبان کا قدیم ترین مخطوطہ "تہافۃ الفلاسفہ" ہے جو امام غزالیؒ کی تصنیف ہے۔ اور ان کے انتقال کے صرف دو سال بعد نقل کی گئی یعنی در ۵۰۰ھ م ۱۱۱۲ء بخطِ نسخ۔ خود ایک مضمون "القرآن" میں یہاں ۳۶۵ سے زیادہ قرآن حکیم ہیں۔ جو صدی صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری میں نقل کئے گئے۔ یعنی آٹھویں صدی عیسوی تا بیسویں صدی عیسوی۔ یاقوت مستعصمی وہ مشہور عالم خطاط ہے کہ اگر کسی کتب خانے میں اس کا ایک بھی نسخہ ہو تو وہ کتب خانہ گراں مایہ ہو جائے۔ سالار جنگ میوزیم کتب خانے کی خوش بختی ہے کہ یاقوت کے تین قلمی نسخے یہاں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک ایسا قرآن شریف بھی ہے جس کے متعلق کاتب نے لکھا ہے کہ اس نے یہ نقل حضرت علیؓ کے ایک خود نوشت سے حاصل کی ہے۔ ایک قرآن مجید اس طرح سے لکھا گیا ہے کہ ایک صفحہ پر ایک پارہ آگیا ہے۔ دوسرا اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ ہر سطر "الف" سے شروع ہوتی ہے۔ ایک تیسرے نسخے میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ پہلی اور آخری سطر ایک حروف یا الفاظ سے آغاز پائے۔ سی ورقی کئی ایک القرآن ہیں کئی ایک دو یا ہشت پہلو اوراق پر لکھے گئے ہیں۔ ایک ایسا نسخہ بھی ہے جس کو بیجاپور کے مشہورۂ آفاق بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی نے خود لکھا۔ دو ایسے کوٹ ہیں جن پر مکمل قرآن پاک لکھا ہوا ہے۔ ایسے کوٹ عام طور پر سلاطین یا امراء استعمال کرتے تھے۔ کئی قلمی قرآن مجید ایسے ہیں جو خاندان سالار جنگ کے استعمال میں رہے۔

فن حدیث میں "شرعۃ الاسلام" وہ کمیاب نسخہ ہے جس کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مخطوطہ بارہویں صدی عیسوی میں نقل کیا گیا اور محمود بن ابی بکر امام زادہ الواعظ سمرقندی کی تالیف ہے۔ عنقریب یہ نسخہ میوزیم کی طرف سے شائع ہوگا۔ اسی طرح امام جعفر صادقؒ کا مخطوطہ "اسرار رقی" بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ غرض کہ ہر فن میں آپ کو ایک دو نسخے ایسے ضرور مل جائیں گے جو قدیم یا نایاب ہیں۔ نسخہ "صحیفۂ کاملہ" کے یہاں ۶۱ نقول محفوظ ہیں اور یہ کتاب امام زین العابدینؒ کے نام منسوب ہے۔ ابن صادق کی "فتح کلیہ" اور جالینوس حکیم سے منسوب کتاب "الحشائش" بھی قابلِ قدر نسخے ہیں۔ جلال الدین سیوطی، ابن سینا، امام غزالی اور ابن حجر عسقلانی وغیرہ کے دسیوں نسخے دیکھے جا سکتے ہیں۔

فارسی میں زائد از ایک ہزار مخطوطات قدیم، کمیاب، مطلا و مذہب یا پھر مصور و مستقل اور بہترین جلدوں میں مجلد ہیں۔ ان میں سے تقریباً نصف کی تو مثال بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ مثلاً روضۃ المحبین، مثنویات آتش، دیوان حافظ، حدائق السلاطین، اور شہنشاہ نامہ شاہ جہانی وغیرہ وغیرہ۔ ادب عالیہ میں تذکروں کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ تقریباً تمام اہم تذکرے یہاں جمع کئے گئے ہیں۔ ان میں "تحفۂ سامی" نہایت اہم ہے کہ تصاویر سے آراستہ ہے اور خود مصنف کا نوشتہ ہے۔ "حدائق السلاطین" میں ایسے سلاطین، امراء و وزراء کا ذکر ہے جو شاعر بھی تھے۔ سراج الدین علی خان آرزو کا تذکرہ "مجمع النفائس" بھی اہم ہے راقم الحروف اسے ایڈٹ کر رہا ہے۔

تذکرۂ اولیاء میں "ثمرات القدس" اپنی نوعیت کا واحد تذکرہ ہے۔ یہ بھی مصور ہے۔ ایک مختصر مگر قدیم "تذکرۂ خوشنویساں و مصوران و ذہبیان" از قاضی احمد قمی نوشتہ در ۱۰۰۴ھ م ۱۵۹۶ء بھی کافی اہم ہے۔

شعبۂ فارسی مخطوطات میں سب سے زیادہ نسخے "ادبِ نظم" میں ہیں۔ وہ مشہور قصیدہ جو مرزا غالب نے سالار جنگ اول کو روانہ کیا تھا اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سالار جنگ کے اجداد میں اقدس کا کلام اور میر عالم کی تحریر یہاں محفوظ ہے۔ یہاں میں صرف چند شعراء کے اسمائے گرامی لکھوں گا تا کہ ان مخطوطات کی وسعت کا ادنیٰ تصور قارئین تک پہونچے۔ فردوسی، نظامی، سنائی، انوری، خاقانی، عطار، محمود شبستری، سعدی، امیر خسرو، امیر حسن، حسینی سادات، ابن یمین، بدر چاچ، سلمان ساوجی، عماد فقیہ، حافظ، جامی، شاہ داعی، قتالی، کمال خجندی، اہلی شیرازی، وحشی، عرفی، ظہوری، نظیری، طالب آملی، ابو طالب کلیم، ناصر علی سرہندی، بیدل، چندو لال شاداں اور کئی دیگر۔ نظم کے بعد تعداد اور اہمیت کے لحاظ سے "تاریخ" کا نمبر آتا ہے۔ ہندوستان کی قدیم ترین تاریخ "تاج المآثر" کا یہاں وہ نسخہ موجود ہے جو ۷۵۲ھ م ۱۳۵۱ء میں لکھا گیا۔ اسی طرح نثر میں بھی ہر قسم کا مواد یہاں مل سکتا ہے۔ عشرتی کا ترجمہ "پدماوت" "احسن الحکایات" کا ایک قدیم نسخہ اور "حدیقۃ التواریخ" جو مشہور کاتب محمد مظفر الدین خاں امیر یار جنگ نے تحریر کیا۔ یہاں کے شعبہ کے تین فرامین انمول رتن ہیں جو محمد بہادر سلطان نے شاہ رخ بہادر (۱۴۰۵ء تا ۱۴۴۷ء) کو لکھے اپنی اصلی حالت میں نسخہ "منشورات" میں محفوظ ہیں۔ فارسی تلخیص "منہاج الصادقین" از فتح اللہ کاشانی اور "دستور الکاتبین" بھی نہایت درجہ اہمیت کی مخطوطات ہیں۔ رسائل خواجہ محمد جہاں خانی شیرازی کے بھی کچھ رسائل یہاں محفوظ ہیں۔ فارسی مخطوطات کا قدیم ترین نسخہ "تفسیر البصائر" ہے جو ۶۰۳ھ م ۱۲۰۷ء میں نقل کی گئی ——— ترجمہ رامائن، مہابھارت اور انجیل متی بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ فلسفہ میں شاہ شجاع کا خود نوشتہ رسالہ نہایت اہم ہے۔

مصور مخطوطات کا ایک لاجواب انتخاب ماہرین کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور یہاں بھی فارسی مخطوطات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ "مجموعۂ مثنویات" جو "روضۃ المحبین" کے نام سے زیادہ مشہور ہے دراصل تین مختلف شعراء کے صوفیانہ مثنویات کا مجموعہ ہے جس کو شہرۂ آفاق کاتب علی الکاتب نے والیٔ بخارا عبدالعزیز خاں کے لئے نقل کیا۔ اس میں بخارا اسکول کی نہایت اعلیٰ پایہ کی بیس تصاویر ہیں۔ مخطوطہ "خمسہ نظامی" میں ۱۴ بہترین شیراز اسکول کی تصاویر ہیں۔ اسی طرح تبریز اسکول کے لئے "دیوان حافظ" اور اصفہان اسکول کے لئے "کلیاتِ نظیری" اہم ہیں۔ دکنی اسکول اور خصوصاً حیدرآباد اسکول کے تو لاتعداد نسخے موجود ہیں۔ کم از کم پانچ مخطوطات میں عامیانہ عریاں تصاویر ہیں۔ خود نواب میر یوسف علی خاں سالار جنگ سوم نے مشہور مصور وینکٹ راما سے ایک مخطوطہ "سحر البیان" مصور کروایا تھا۔

نسبتاً اردو میں یہاں کم مخطوطات ہیں ان میں بھی اکثر کی کئی کئی نقول آگئی ہیں۔ "کلیاتِ قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ" اس ذخیرہ کا ایک لاثانی ہیرا ہے جسے ڈاکٹر زور نے عرصہ ہوا ایڈٹ کرکے شائع کر دیا ہے۔ یہاں دکنی اسکول کی آٹھ اس قدر عمدہ نفیس دیدہ زیب ہیں جن پر علانیہ شیراز اسکول کا گمان ہوتا ہے۔ یہ نسخہ شاید عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ دوسرا دکنی نسخہ "بھوگ بل" ہے جس کو بقول ماہرین بریدشاہی دور میں بمقام بیدر تلمبند و مصور کیا گیا۔ یہ قریشی بیدری کا کسی فارسی کوک شاستر سے منظوم ترجمہ ہے۔ "نورس" از جگت گرو ابراہیم عادل شاہ ثانی کا قدیم ترین نسخہ یہاں کا انمول رتن ہے جسے شاہی کاتب نے نقل کیا۔ موسیقی میں واجد علی شاہ، راجا بنشیر اور خوشحال خاں کے مخطوطات قابلِ دید ہیں۔ "تلاوت الوجود" اور "شکار نامہ" از خواجہ بندہ نواز گیسو دراز یہاں کے قابلِ فخر نسخے ہیں۔ اسی طرح وجہی اور شمس العشاق کے نسخہ جات "سب رس" اور چند قابلِ ذکر مخطوطات یہ ہیں۔

دیوانِ مظہر بیجاپوری، دیوان لطف النساء بیگم امتیاز، دیوانِ عارف دہلوی، جنگ نامہ، ابراہیم نامہ، تاریخ سکھان وغیرہ۔ تذکروں میں "مجمع الانتخاب" از شاہ کمال عظیم آبادی بے حد اہم مخطوطہ ہے۔ جو بڑی تقطیع کے تقریباً چودہ سو صفحات پر حاوی ہے۔ تاریخی اہمیت کے لحاظ سے نصرتی کی "گلشن عشق" اور دیوانِ ولی قابلِ مطالعہ ہیں۔ معتدبہ تعداد ایسے مخطوطات کی ہے جن کا مطالعہ لسانی نقطۂ نظر سے نہایت مفید ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان نسخوں سے اردو کا تدریجی ارتقاء ظاہر ہوتا ہے یہ بات بڑی شدت سے واضح ہو جاتی ہے کہ اُردو ہندی السنہ ایک دوسرے سے کتنی قریب ہیں۔ بظاہر عربی، فارسی رسم الخط میں تحریر ہیں مگر دراصل ہندی بھاشا میں ہیں جیسے ملک محمد جائسی کی پوتھی چترلیکھا، پوتم پرکاش، چھند سندی بسم اسکند (مفقود) پوتھی سندر شنگار اور نظم ہندی وغیرہ۔

ان تمام مخطوطات کی تحریر میں تقریباً خطوط کے نمونے کئی مثلاً کوفی، تعلیق، نسخ، شکستہ، ثلث اور ان کے انوکھے طرز جیسے ضعت غبار، جلی، خفی، گلزار، پیچان، بہار، طغرا، نیریزی، زلفِ عروس، اور خطِ ناخن استعمال کئے گئے ہیں۔ جنہیں اپنے زمانہ کے مشہور اور چیدہ خطاطوں نے تحریر کیا۔ ابھی حال میں ڈاکٹر یوسف علی خاں صاحب نے "دیوان نکہت دہلوی" تحفتہً دیا ہے۔ اسی طرح جناب شبیر حسین تاریخی نے ایک اور قدیم مخطوطہ "مراثی دبیر" عطا کیا جو ۱۲۵۶ھ م ۱۸۳۶ء میں نقل کیا جب کہ حضرت دبیر بقید حیات تھے۔ ابھی تک میوزیم کی طرف سے فارسی مخطوطات کے چھ کیٹلاگ، عربی کے دو کیٹلاگ اور اردو کا ایک مکمل کیٹلاگ شائع ہو چکا ہے۔ عنقریب فارسی اور عربی کے اور بھی کیٹلاگ شائع کئے جائیں گے۔ ریسرچ کی بھی مکمل سہولتیں یہاں مہیا کی گئی ہیں۔

______ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو اُس کی پُرانی عمارت میں دیکھ چکا تھا۔ اب خوش قسمتی سے اس کی نئی اور اپنی عمارت میں اِسے دیکھنے کا موقع ملا۔ آنکھیں کھل گئیں، اس کی عمارت میں حُسنِ نظر اور ذوقِ سلیم کی کار فرمائی ہے۔ اس کی آرائش میں سلیقہ اور نفاست ہے۔ اس کے کتبوں، خطوط، فرامین، مخطوطات، مطبوعات اور زبان و ادب سے متعلق نوادر میں ڈاکٹر زورؔ اور اُن کے رفیقوں کے خونِ جگر کی آب و تاب جھلکتی ہے۔

یہ ادارہ، اُردو زبان و ادب کی صدیوں کی چمن بندی کا بڑا اچھا عکس پیش کرتا ہے۔ یہاں تحقیقی اور علمی کام کرنے والوں کے لیے بڑا خزانہ موجود ہے۔

اس ادارے کی ترقی اور توسیع کے لیے کوشش اُردو زبان و ادب سے محبت رکھنے والوں اور ہماری مشترک تہذیب کے علم برداروں کا فرض ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ یہ ادارہ اور بڑھے گا اور ترقی کرے گا۔

—— پروفیسر آلِ احمد سرورؔ

(۲/ جولائی ۱۹۶۱ء)

ڈاکٹر احسن رضوی

کیف کچھ شام و سحر میں آئے
کوئی چہرہ تو نظر میں آئے

ہر نظر اُٹھتی ہے اپنی جانب
کس کے ہمراہ سفر میں آئے

دل کے ارمان یہ کہتے ہوں گے
کیسے نادار کے گھر میں آئے

چڑھتے سورج کا پرستار ہوں میں
نام میرا بھی خبر میں آئے

منتظر تھیں تو کتابیں اپنی
رات جب لوٹ کے گھر میں آئے

لوگ پہچان سکے مشکل سے
اب کے جب اپنے نگر میں آئے

صاحب حیدرآبادی

جفا سے ربط ابھی کم ہے تم بھی ساتھ چلو
رہِ وفا میں نیا غم ہے تم بھی ساتھ چلو

اُٹھو کہ رسمِ وفا اُٹھ گئی زمانے سے
یہ ایک شہر کا ماتم ہے تم بھی ساتھ چلو

رہِ حیات گزرتی ہے تنگ گھاٹی سے
چراغِ مہر بھی مدھم ہے تم بھی ساتھ چلو

برہنہ پا ہے سفر زندگی کا ننگے سر
یہ پُل صراط کا عالم ہے تم بھی ساتھ چلو

بساطِ رقص بھی ہے مقتلِ نشاط بھی ہے
اس امتزاج کا سرگم ہے تم بھی ساتھ چلو

بس ایک جام میں پُر زندگی کا جام کریں
ثباتِ گل کہ یہاں کم ہے تم بھی ساتھ چلو

ہزار مرگِ مسلسل کا کرب [illegible] صاحب
حیات [illegible] کا سا عالم ہے تم بھی ساتھ چلو

صابر یادگیری

عمر بھر جس نے مرا ساتھ نبھایا ہوگا
وہ کوئی اور نہیں خود مرا سایا ہوگا

رات میخانہ کا دروازہ کھلا ہی ہوگا
کیا خبر تم کو کوئی اور بھی پیاسا ہوگا

دھڑکنیں دل کی بہت تیز ہوئی جاتی ہیں
دل کے آنگن میں کوئی لوٹ کے آیا ہوگا

زندگی تیرے لئے جان لٹا دی ہم نے
کس نے اس طرح تمہیں لُوٹ کے پایا ہوگا

آج پاگل سا پھرے ہے جو گلی کوچوں میں
سوچئے اس سے کوئی آپ کا رشتہ ہوگا

[illegible]
دیکھئے کوئی [illegible] ہوگا

سید معراج محمد

پروفیسر سید محمد صاحب

میرے والد ماجد پروفیسر سید محمد صاحب کو رحلت فرمائے پانچ مہینے ہو رہے ہیں ۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہیں ۔ "زینب منزل" کے وسیع و عریض دالان میں مخصوص مقام پر رکھی ہوئی کرسی پر بارہا ان کے بیٹھے رہنے اور حقہ کے کش لگانے میں مصروف رہنے کا گمان ہوتا ہے تو کبھی کشادہ و ہوادار دیوان خانہ سے ان کی آواز آتی ہے کہ جیسے وہ اپنے مہمانوں کی خاطر تواضع کیلئے زنان خانہ سے کسی کو طلب کر رہے ہوں یا پھر وہ کتب خانہ میں محو مطالعہ ہوجائے اور حقہ کی تیاری کے لئے کوئی ہدایت دے رہے ہوں ـــــ یا "اعجاز پرنٹنگ پریس" میں ملاقاتیوں سے کاروباری گفتگو کے بجائے نجی معاملات یا پھر علم و ادب کے موضوعات پر بات چیت میں مصروف ہیں ۔

والد بزرگوار کے انتقال سے جہاں ہم بھائی بہنیں یتیم ہو گئے ہیں وہیں بے شمار تشنگان علم اپنے معنوی باپ اور شفیق استاد سے محروم ہوگئے ۔ درس و تدریس کے لئے گھر تو گھر "اعجاز پرنٹنگ پریس" کے دروازے تک ہمیشہ کھلے ہوئے تھے ۔ شاید ہی ان کا کوئی وقت ایسا گذرتا جب کہ وہ علمی و ادبی مذاکرات میں مصروف نہ رہتے ۔ وہ جہاں بھی ہوتے علم و ادب، اخلاق و عادات، تہذیب و تمدن غرض کسی نہ کسی موضوع پر محو کلام رہتے ۔ اپنے چھوٹوں سے انتہائی شفقت و ہمدردی سے پیش آتے تو اپنے بزرگوں سے بصد تعظیم و تکریم پیش آتے اور ان سے گہری محبت و عقیدت کا اظہار کرتے ۔ اکثر و بیشتر طالبات اور استانیاں (بزمانۂ ٹریننگ یا پھر اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں) تحقیقی و تدریسی امور میں رہبری و رہنمائی حاصل کرنے کے لئے "زینب منزل" سلطان پورہ چلی آتیں جہاں والد ماجد اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے علمی و ادبی خدمات انجام دینے کے لئے تیار ہو جاتے ۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور اوصاف ستودہ کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی طالبہ درس لینے کے لئے ان کے گھر آتی تو فوراً اپنی اہلیہ محترمہ کو طلب کر لیتے اور انھیں بھی شریک درس رکھتے ۔ اس طرح وہ طالبات کو ان کی تمام تر توجہ علم و ادب پر مرکوز رکھنے کا موقعہ فراہم کرتے تو میری والدہ محترمہ کو بھی علم و ادب سے آگاہی کا موقعہ عطا فرماتے ۔ درس و تدریس کے اختتام پر اپنے شاگردوں کی طعام ماحضر سے یا پھر موقعہ و محل کی مناسبت سے چائے یا شربت سے تواضع کرتے ۔ بوقت واپسی ان کے لئے سواری (رکشا وغیرہ) کا انتظام فرماتے اگر ایسے موقعہ پر کوئی فرزند یا ملازم موجود نہ ہوتا تو خود باہر نکلتے اور ان کے لئے سواری لے آتے اور بوقت سواری ان کے والدین وغیرہ کی خیر خیریت دریافت کر کے انھیں رخصت کرتے ۔

مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنے والد ماجد کے آگے زانوئے ادب تہ کرنے کا موقع ملا ۔ وہ ایک انتہائی نیک نفس سرپرست اور بے غرض محسن کی طرح درس و تدریس کے ساتھ ساتھ سماجی و معاشی مسائل میں بھی اپنے شاگردوں کی رہنمائی کرتے تھے ۔ ان کا طریقۂ تعلیم و تدریس

کچھ اس قدر سلیس و دل نشیں ہوتا تھا کہ ہر ایک لفظ یادگار بن جاتا اور ان کی ہر بات "پتھر کی لکیر" بن جاتی۔ پھر دیتے وقت وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ خود انھیں اور ان کے شاگردوں کو اس بات کا پتہ بھی نہ چلتا تھا کہ ان کا لکچر کب شروع ہوا اور وقت کیسے کٹ گیا۔ اشعار کی تشریح و توضیح میں انھیں کبھی بھی انگریزی الفاظ کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ برسرِ موقعہ ایک ایک شعر پر یا پھر ایک ایک نکتہ کی تفصیل سے صراحت و وضاحت کے لئے ایک ہی خیال، ایک ہی معنی و مطلب کے متعدد اشعار (اردو و فارسی شعراء کے) سناتے چلے جاتے انھیں فارسی پر بھی کامل عبور حاصل تھا۔

نجی زندگی میں والدِ ماجد اپنے اہلِ خانہ، ملازمین، عزیز و اقارب، دوست احباب اور تمام جاننے پہچاننے لوگوں کے لئے فرشتہ صفت انسان اور مرشدِ کامل تھے۔ ان سے ملنے جلنے والا ہر شخص انھیں ایک بے غرض محسن اور سچا بہی خواہ تصور کرتا تھا۔ وہ اپنی اولاد کے لئے ایک شفیق باپ سے کہیں زیادہ جگری دوست تھے۔ میرے والد ماجد اور میری والدہ ماجدہ کے ازدواجی تعلقات فی زمانہ تصوراتی معلوم ہوتے ہیں۔ بیوی شوہر کی عاشق تھیں تو شوہر بیوی کے والہ و شیدا تھے۔ شاید اسی قلبی باہمی محبت و الفت کا نتیجہ تھا کہ دوشنبہ ۳۰ راگست ۱۹۷۶ء مطابق ۳ رمضان ۱۳۹۶ھ صبح ۷ ۱/۲ بجے میرے والد ماجد کی وفات حسرت آیات کے پورے ۲۴ دن بعد جمعرات ۲۳ ستمبر ۱۹۷۶ء مطابق ۲۷ رمضان ۱۳۹۶ھ ۱۲ بجے شب میری والدہ ماجدہ نے بھی اس دارِ فانی سے عالمِ بقا کی طرف کوچ فرمایا اور دونوں داخلِ خلد بریں ہو گئے۔

والد ماجد کی خوش خلقی، ملنساری اور خاطر مدارت ہر شخص کو ایک ہی ملاقات میں ان کا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ وہ بڑے تو بڑے چھوٹے بچوں کا تک دل نہیں دکھاتے تھے۔ جب کسی سائل کو بصورتِ مصلحت الٹے ہاتھوں واپس کر دیتے تو پھر اس طرح اظہارِ خیال فرماتے کہ بیچارہ سائل خالی ہاتھ دعائیں دیتا چلا جاتا۔ ہر کس و ناکس کی حاجت روائی ان کا محبوب ترین مشغلہ تھی۔ وہ اپنی پریشانیوں اور مشکلات کا خیال کئے بغیر ہی اپنوں اور غیروں سب ہی کے مصائب مول لیتے تھے۔ انھیں اس وقت تک چین و سکون نصیب نہیں ہوتا تھا جب تک کہ وہ دوسروں کے مصائب و مشکلات کا ازالہ نہ کر دیتے۔ ان کا مکان "زینب منزل" گذشتہ ۲۶، ۲۷ برسوں تک ضرورت مندوں کے لئے بلا معاوضہ "شادی خانہ" کے طور پر کام آتا رہا۔ ایسے مواقع پر دلہن کے سرپرستوں والدین وغیرہ کو درپیش تمام امور جیسے فرش، فرنیچر، کراکری اور دیگر سامان کی فراہمی والدِ ماجد کی جانب سے بلا معاوضہ عمل میں آتی تھی۔ قطع نظر اس کے کہ میرے والدِ ماجد نے کئی لڑکیوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں سرپرستی فرمائی، اور بعض لڑکیوں کی شادی کے تمام اخراجات بھی خود برداشت کئے۔

بہت ہی کم لوگ اس بات سے واقف ہوں گے کہ جامعہ عثمانیہ پر ایک ایسا بھی وقت آیا تھا جب کہ شعبۂ اردو کی بقاء ایک سوالیہ علامت بن گئی تھی یہ میرے والد ماجد ہی تھے جنھوں نے تن تنہا اس شعبہ کو باقی و برقرار رکھنے اور اسے پروان چڑھانے کے لئے ہر وہ ایثار و قربانی سے کام لیا جو سوائے ان کے کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ انہوں نے ہی طلباء کو بہ حیثیت مضمونِ اختیاری "اردو" سے گریجویشن، پوسٹ گریجویشن اور ڈاکٹریٹ کرنے کی ترغیب و تحریص دلائی۔ کیونکہ سابق گورنر مہاراشٹرا نواب علی یاور جنگ مرحوم کی مساعی جمیلہ کے باعث دنیا بھر میں اردو ذریعۂ تعلیم کی واحد یونیورسٹی "جامعہ عثمانیہ" کے عثمانیہ یونیورسٹی (انگریزی ذریعۂ تعلیم) میں تبدیل کر دیئے جانے اور اس وقت کے حالات کے باعث اردو کی سیاسی سماجی و معاشی اہمیت کے بالکلیہ طور پر ختم کر دیئے جانے کے نتیجہ میں بہ حیثیت مضمونِ اختیاری اردو کی تعلیم سے دلچسپی دن بدن مفقود ہوتی جا رہی تھی۔ ان حالات میں میرے والد ماجد نے اردو زبان کی بقاء و سلامتی اور اس کی ترویج و اشاعت کیلئے ایک "مسیحا" کا رول انجام دیا۔ انھوں نے نہ صرف کئی طلباء و طالبات کی فیس اپنی جیب سے ادا کی بلکہ انہیں درکار "نصابی" زائد از نصابی اور غیر نصابی کتب خواہ ان کی دستیابی و نہ

سے ممکن رہی ہو یا نہ ہو، کسی نہ کسی طرح فراہم ہی کر دیا کرتے ۔ اس مقصد کے لئے خود ان کا ذاتی کتب خانہ بہت کام آیا ۔ آج ان کا کتب خانہ جس میں سینکڑوں نایاب و کمیاب کتابیں تھیں، خود طالبانِ علم و ادب، محققین اور دیگر تشنگانِ علم و ادب کی پیاس بجھاتے بجھاتے خالی ہو گیا ۔ خود والد صاحب قبلہ نے اپنی زندگی میں ہی بہت سی کتابیں کئی اداروں اور تنظیموں کو بطور عطیہ دے دیں ۔

نواب علی یاور جنگ مرحوم کے ایک مستحسن اقدام کی بدولت جب حیدرآباد کے مختلف مقامات پر ایوننگ کالجوں کا قیام عمل میں آیا تو گریجویشن کی جماعتوں میں طلباء کو ترغیب دینے اور انہیں ممکنہ طور پر سہولتیں فراہم کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس طرح میرے والد بزرگوار کو جہاں بھی اردو کی خدمت کرنے کا موقع ملا، انہوں نے نہایت خاموش طریقہ پر ٹھوس خدمات انجام دیں ۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تو انہوں نے انجمن ترقی اردو حیدرآباد کے زیر اہتمام قائم کردہ "اردو کالج" میں بہ حیثیت پرنسپل، نمائش سوسائٹی کے زیر اہتمام قائم شدہ "ونیتا مہا ودیالیہ" اور پھر راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی ویمنس کالج میں بہ حیثیت پارٹ ٹائم لکچرر ایسی شاندار خدمات انجام دیں کہ آج اردو کالج باقاعدہ طور پر اردو آرٹس کالج اور اردو آرٹس ایوننگ کالج میں تبدیل ہو گیا جب کہ ونیتا مہاودیالیہ اور راجہ بہادر وینکٹ راما ریڈی ویمنس کالج میں باقاعدہ طور پر ہمہ وقتی لکچرار کی جائدادیں قائم ہو گئیں ۔

میرے والد ماجد ہمیشہ شہرت اور جاہ طلبی سے دور بھاگتے رہے اور انہوں نے کبھی بھی چڑھتے سورج کی پرستش نہیں کی ۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے دامن کو آلودہ ہونے سے بچائے رکھا تاہم جس کام کا انہوں نے بیڑہ اٹھایا اسے بہر طور انجام کو پہونچایا ۔ وہ بالطبع انتہائی منکسر المزاج، خلیق، مرنجان مرنج لیکن ایک وضع دار اور صلح کل مشرب کے حامی انسان تھے ۔ کسی بھی اہم مسئلہ یا پیچیدہ گتھی کو سلجھانے میں ہمیشہ سب کی رائے کو ملحوظ رکھتے اور جب بھی کوئی مناسب فیصلہ کر پاتے تو بلا تامل اس کو روبہ عمل لاتے ۔ لیکن تعلیمی اداروں، ادبی تنظیموں اور دیگر اداروں یا سماج اور خاندان کے اجتماعی امور و مسائل میں دشواریاں پیدا ہو جاتیں تو میرے والد ماجد ان رکاوٹوں اور اڑچنوں کو دور کرنے کے لئے ہمیشہ بے لاگ، ٹھوس اور انتہائی کارآمد مشورے دیتے اور جب اجتماعی و تنظیمی مفادات کو نقصان پہونچتا دیکھتے تو پھر اس ادارہ یا تنظیم کے کارکنوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ کر لیتے کہ کوئی بھی کارکن ادارہ ان کی اس ادارہ یا تنظیم سے بے تعلقی یا کنارہ کشی کو محسوس بھی نہیں کر پاتا تھا ۔ اس کے باوجود والد صاحب قبلہ دل و جان سے اس ادارہ یا تنظیم کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں در پردہ طور پر ہمہ تن مصروف رہتے ۔

یہاں صرف ایک "ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن" کی مثال ہی کافی ہوگی، میرے والد ماجد اس ادارہ کے تین بانیوں میں سے ایک تھے ۔ اور اسے بام عروج پر پہونچانے میں انہوں نے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ اور پروفیسر عبد القادر سروری کے دوش بدوش ایک اہم کردار ادا کیا تھا ۔ لیکن بعض اختلافات کی بنا پر انہوں نے بظاہر اس ادارہ کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ترک کر دیا لیکن اندرونی طور پر اردو کی ترقی و ترویج سے متعلق ادارہ کی سرگرمیوں میں وہ بدستور بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ——— ادارۂ ادبیات اردو کی جانب سے منعقد کئے جانے والے امتحانات اردو دانی، اردو عالم اور اردو فاضل کو اندرون و بیرون ریاست فروغ دینے کا سہرا بلاشبہ میرے والد ماجد کے سر ہے جس سے شاید ہی کوئی کارکن ادارہ انکار کر سکے ۔

□

امتیاز انجم

قدم قدم پہ وفاؤں کا احتساب ہوا
تیری نگاہ میں اتنا تو کامیاب ہوا

میرے جنوں میری وحشت کا سدّباب ہوا
جب ان کو میری محبت سے اضطراب ہوا

سکونِ دل کے لئے آج تک ترستا ہوں
وہ کہہ رہے ہیں ترا عشق کامیاب ہوا

ہر ایک زعمِ پرستش ہر اک غرورِ وفا
مرے اصولِ محبت سے لاجواب ہوا

زمانہ ساز وفائیں رہیں سرِ فہرست
تمہاری بزم میں چہروں کا انتخاب ہوا

بہک نہ جائیں قدم راہِ عشق میں انجم
نفس نفس مجھے اِس غم سے اضطراب ہوا

موہن لال جوہر

آہ و فغاں نہ اس قدر اے دلِ بے قرار کر
عشق سے ہیں وہ بے خبر، اُن کو نہ شرمسار کر

نقشِ وفا جو مٹ گیا، ما و شما کہاں رہا
اُن کی جفا بھی اے خدا، میری وفا شمار کر

ہائے یہ جور یہ ستم، ٹوٹ کے رہ گئے ہیں ہم
تجھ کو ہے ضبط کی قسم، ظلم نہ بار بار کر

ہائے یہ اس کی بے رخی، جیسے سزا ملی کوئی
اُس سے ذرا کہے کوئی اور نہ بیقرار کر

دیدۂ نیم باز سے اور خرامِ ناز سے
کھیل مرے نیاز سے، عقل و خرد شکار کر

چار ہیں دن حیات کے، حاصلِ کائنات کے
پردے تعینات کے عشق سے تار تار کر

غزلیں

رشید جلیلی

آپ کے اِلتفات کے پیچھے
ہے کوئی بات، بات کے پیچھے

کھو گئے صبح کے تصور میں
آ گئی رات، رات کے پیچھے

سلسلہ ہے طویل تر غم کا
مختصر سی حیات کے پیچھے

کارفرما غمِ محبت ہے
ہر حسیں واردات کے پیچھے

تو ہی تنہا رہا تصور میں
اِس بھری کائنات کے پیچھے

کل نظامِ حیات رقصاں ہے
ایک تیری ہی ذات کے پیچھے

بازیٔ عشق میں رشید اکثر
جیت ہوتی ہے مات کے پیچھے

راحت گوالیاری

ہے جرمِ وفا جرم ہمارا تو ہوا کیا
اس جرم کی دیکھیں گے وہ دیتے ہیں سزا کیا

ہوتا ہے محبت میں شکایت بھی روا کیا
اے دِل تری ناکام محبت کا صلہ کیا

خود مجھ کو مری ذات کا آئینہ دکھا کر
حیرت میں مجھے ڈال دیا ہے یہ کیا کیا

سانسوں میں بسی جاتی ہے اُس زلف کی خوشبو
لائی ہے اڑا کر یہ مہک بادِ صبا کیا

اُلفت میں کسی سے تجھے کیا مل گیا راحت
اِک درد نیا اور ملا تجھ کو بھلا کیا

بھارت چند کھنہ

زندہ شہید

(توفیق الحکیم کی عربی میں لکھی کہانی سے متاثر ہو کر)

ماحول:[پوپ کی راجدھانی ویٹیکن میں کرسمس کا سوانگت۔ گرجوں کی متبرک گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ اُن کی گونج سارے شہر میں پاکیزگی کی فضا پھیلا رہی ہے۔ چاروں طرف سے مقدس بائبل پڑھنے کی آوازیں۔ سردی کی کپکپا دینے والی ہواؤں میں چینڈل اور باخ کے مذہبی گیتوں کی لہریں۔ حضرت عیسیٰ کی عظمت کے اعتراف میں گائے جانے والے نغموں کی آوازیں۔ خود غرضی اور گناہ کے بوجھ تلے دبی دُنیا کو نیکی اور محبت کے پیغام]

آوازیں: متبرک موسیقی۔ گھنٹوں کے بجنے کی آوازیں۔ اور ایسی بیک گراونڈ میں سُنائی دینے والی آوازوں کے ساتھ بائبل اور دیگر متبرک کتابوں سے پڑھے جانے والے اقتباسات:

"۔۔۔۔ جانتے ہو۔ اس کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوگا اور تم اسے عیسیٰ کے نام سے پکارو گے، اس لیے کہ وہ لوگوں کو گناہ سے بچائے گا"

"۔۔۔۔ اور شیطان نے عیسیٰ سے کہا کہ اگر تم خدا کے بیٹے ہو تو اس پتھر کو روٹی بنا دو"

"۔۔۔۔ اور عیسیٰ نے جواب دیا ــــ انسان صرف روٹی کے لیے ہی زندہ نہیں رہتا ــــ وہ خداوند عالم کے کہے ہوئے ہر ایک لفظ کی حفاظت کے لیے زندہ رہتا ہے"

[ان الفاظ کے دوران قدموں کی چاپ ــــ اور الفاظ کے ختم ہو جانے پر ایک گہری سرد آہ ــــ اور پھر]:

"وائے افسوس ــــ یا تقدیر! کاش کہ میں نے اس کا کہا مانا ہوتا!"

"ٹھہرو۔ تم کون ہو۔ کہاں جا رہے ہو"

[قدموں کی چاپ رُک جائے]

"ہٹ جاؤ میرے راستے سے ورنہ ایسی راہ پر پڑ جاؤ گے کہ سیدھے جہنم پہنچ جاؤ گے"

"لیکن آپ ہیں کون؟ بلا اجازت اندر جانا منع ہے۔ آپ کے پاس کوئی پروانۂ راہ داری ــــ کوئی اجازت نامہ"

"پروانہ راہ داری! ــــ میرے لیے۔ چلو ہٹو۔ ہوش کے ناخن لو۔ ہٹ جاؤ اور تباہی کو نہ بلاؤ"

"لیکن صاحب!۔ ذرا خدا کا خوف کھائیے ــــ میرا یہ فرض ہے کہ۔۔"

"بس رہنے دو۔ خدا کا خوف ہی مجھے یہاں لایا ہے"

[قدموں کی چاپ پھر سے آنے لگے اور دھیمی ہو کر رک جائے]

[پوپ کی تیکھی آواز۔۔]

"تم؟! ــــ یہاں"

"ہاں صاحب ــــ خوب پہچانا"

پوپ۔ "مجھے اپنے دیکھے پر اعتبار نہیں آتا ــــ تم یعنی شیطان!"

شیطان۔ "جی ہاں ــــ بالکل بجا ــــ میں یعنی شیطان!"

پوپ۔ "میرے دربار میں۔ جہاں تمہیں دن رات پھٹکارتی ہے"

شیطان۔ "جانتا ہوں۔ میں یہ سب جانتا ہوں"

پوپ۔ "اور اس کے باوجود؟ ــــ آخر مطلب؟ ــــ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

شیطان۔ "کفارہ۔ اپنی [illegible] کا اعتراف۔ اپنی غلطیوں کی معافی"

پوپ۔ "تم!۔۔۔ جو ازل سے [illegible] مخلوق کو غلط راہ پر ڈالے ہوئے ہو؟"

شیطان۔ "[illegible] پر آمادہ کرنے والا [illegible] آیا ہے"

پوپ۔ "یقین نہیں آتا! یقیناً میری آنکھیں مجھے دھوکا دے رہی ہیں"

شیطان۔ "آپ کی بینائی درست۔ حواس بجا اور دماغ ٹھیک ہیں۔ میں یقین اور عقیدت کے عظیم پیڑ کا سایہ ڈھونڈنے آیا ہوں"

پوپ۔ "اے میرے خدا! نہ معلوم یہ کیا دھوکا ہے!!"

شیطان۔ "مجھ پر اعتبار کرو"

پوپ۔ "تم پر اعتبار کروں! تم۔ جس پر خدا کا قہر نازل ہو چکا ہے؟"

شیطان: "یہ میری سب سے بڑی بدقسمتی ہوگی اگر تم نے میری نیک نیتی کا مذاق اڑایا"

پوپ: "تم پر خدا کی لعنت ہے"

شیطان: "تھی اور ہوگی۔۔۔ مگر وہ سب ہو چکا! تم جانتے ہو کہ ہر چیز فانی اور ایک دن قیامت آنی ہے۔ میرے لیے یہ دن مبارک ہے کہ سچائی کو جان گیا ہوں اور نیکی کی راہ پر آ گیا ہوں"

پوپ: "یا خدا"

شیطان: "حضرت پوپ۔ میری ساری امید تم پر منحصر ہے۔ مجھے مت ٹھکراؤ۔ میں اپنی ضد سے خود ہی مجبور ہو گیا ہوں اور بدی کے راستہ پر چلتے چلتے تھک کر چور ہو گیا ہوں"

پوپ: "اے میرے خدا! یہ میں کیا سن رہا ہوں"

شیطان: "میں خدا کے قدموں میں پناہ [illegible] کے لیے تڑپ رہا ہوں"

پوپ: "یہ سب فریب ہے!"

شیطان: "تم چاہو [illegible] لو۔ مجھے سخت سے سخت سزا دے دو۔ لیکن خدا کے لیے اب مجھے ایک لمحہ کو بھی جنت کے آرام و آسائش [illegible]"

پوپ: "[illegible]"

شیطان: "[illegible] اپنا حال بیان کر رہا ہوں۔ وہ [illegible]

پیا اور جسے تم اپنے ہاتھوں میں سنبھالے بیٹھے ہو۔۔۔ جس سے تم نے مجھے محروم کر رکھا ہے۔ آج مجھے اس نیکی کا مزہ چکھا دو"

پوپ: "تمہارے ہتھکنڈوں سے کون واقف نہیں۔ میرا وقت ضائع نہ کرو"

شیطان: "مقدس پوپ، ضد نہ کرو۔ میں ہمیشہ سے ضدی اور مغرور رہا۔ میں نے ہمیشہ خود کو سب سے بہتر کہا۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ میرے اور مجھ پر ایمان رکھنے والوں کے لیے کافی ہے۔ مگر۔۔۔"

پوپ: "۔۔۔ مگر میں یہ سب ماننے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے دھوکا دینے کی کوشش نہ کرو"

شیطان: "میری بات پر اعتبار نہ کرنا تمہارے لیے خود کو دھوکا دینا ہوگا۔ مجھے پہچانو۔ میں وہ کہ جس کے ماننے والے ہر جگہ موجود ہیں۔ ایسا کوئی شخص کہیں بھی نہ ہوگا، جس نے پل بھر کے لیے ہی سہی، میرا کہنا نہ مانا ہو۔۔۔"

پوپ: "اے خدا۔۔۔ اے میرے خدا"

شیطان: "مجھے ماننے والے ہر جگہ موجود ہیں۔ تمہاری مقدس دیواروں کے اندر پادریوں کی قباؤں میں [illegible] کے کالروں میں اور صلیب کے نشانوں کے باوجود میرا وجود یہاں ہے۔۔۔"

پوپ: "خداوندا۔ نہ معلوم یہ کیا چکر ہے۔ کون سا مکر اور کیسا فریب ہے"

شیطان: "اے خدا کے ایجنٹ! تم اب اپنے فرض سے گریز کر رہے ہو۔ میں [illegible] نیکی کا مزہ چکھنے آیا ہوں اور تم مجھ کو اپنے سایہ میں رکھنے سے انکار کر رہے ہو۔ میری بہت [illegible]۔ اپنے خدا کے نام پر مجھے بچالو۔ ایک بار، صرف ایک بار مجھے نیکی کا مزہ چکھنے دو۔ اس کے بعد چاہے کسی گناہ و [illegible] میں دوزخ کی آگ میں جلنے کے لیے تیار رہوں گا!"

پوپ: "[illegible]۔۔۔ شیطان [illegible]!!"

شیطان: "[illegible] پوپ۔ ذرا [illegible]
[illegible] میری انتہا سے [illegible]

خدا پرستوں کا ایک حصہ جن جاؤں جو روزانہ گرجاؤں میں جاتے اور اپنے خدا کی پرستش کر کے آتے ہیں۔ جن کے دل میں اس کے بیٹے کی پیدائش کے دن عبادت اور عقیدت کی لاتعداد گھنٹیاں بج اٹھتی ہیں"

پوپ: "اے میرے خدا! میں کہیں ان بہکانی باتوں میں نہ آجاؤں!"

شیطان: "محترم پوپ! عیسیٰ کے اس دھرتی کے نمایندے!! مجھے اپنے مذہب کی آغوش میں لے لو!!! تم مجھے خدا کا ایک انتہائی نیک بندہ پاؤ گے اور اپنے کیے پر ہرگز نہ پچھتاؤ گے"

پوپ: "تم۔ بدی کے بادشاہ۔ نیکی کے جانی دشمن۔ تم شیطان۔ تم اور خدا کا نیک بندہ؟"

"چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

شیطان: "کیا تم سچ اور جھوٹ میں تمیز نہیں کر سکتے؟ کیا تم کو اصل اور نقل کا فرق معلوم نہیں؟ کیا حضرت عیسیٰ نے نہیں فرمایا تھا، میں تم کو بتاتا ہوں کہ توبہ کر لینے والے گناہگار بندے کو جنت کا اتنا ہی حق ملے گا جتنا کہ ان سارے ایسے لوگوں کو جنہیں توبہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

پوپ: "اے مسیح۔ مجھے ان چکنی چپڑی باتوں کے فریب سے بچائیو!"

شیطان: "چکنی چپڑی باتیں! کیوں حقائق سے منہ موڑتے ہو پوپ؟ کیا مسیح کی نظر میں سب لوگ برابر نہیں؟ کیا توبہ اور معافی ہر ایک کے لیے میسر نہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ تم میرے ہی لیے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے دروازے بند کر رہے ہو! — میں بدی کی راہ چھوڑ آیا ہوں۔ مجھے اپنے مذہب میں قبول کر لو — میری روح کی گہرائیوں سے اٹھنے والی ایمان کی لو دیکھو!"

پوپ: "ٹھہرو! مجھے سوچنے دو....."

[بیک گراونڈ میں سازوں پہ چرچ کی موسیقی دھیمی —
کانپتی ہوئی آواز میں سرگوشی]

اے خدا! کیا میرا امتحان لیا جا رہا ہے؟ شیطان جس کی خصلت میں دھوکا دینا ہے، جس کی رگ رگ میں ریاکاری رچی ہوتی ہے — نہیں نہیں — یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ہرگز ایسا نہیں کر سکتا — شیطان کو چرچ میں پناہ دینا — سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنے یا آورآستین پالنے کی بات ہوگی.... اور پھر اگر خانۂ خدا میں شیطان براجمان ہو گیا تو؟ — کیا ایک میان میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں؟ ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں — اور میرا اپنا وقار — میرا مقام — میری عزت، میری آبرو — ان کا کون ضامن ہوگا۔ چرچ کی یہ شان و شوکت، پوپ کا دبدبہ.... صرف یہی نہیں، دنیا کے تمام گرجے، ان کی کیا اہمیت باقی رہ جائے گی۔ ہمارا مستقبل اندھیرے میں کھو جائیگا!!"

[بیک گراونڈ کی موسیقی کی آواز بتدریج اونچی اور تیز ہوتی جاتی ہے]

"میں خدا کے گھر کو شیطان کے حوالے نہیں کر سکتا۔ میں ایمان جیسی امانت کو شیطان کے پاس رہن نہیں رکھ سکتا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں۔ اس کی عظمت اور نیکی کی بنیادوں میں رخنہ نہیں ڈال سکتا۔ شیطان کا مقام اور نئے اور پرانے دونوں ٹیسٹامنٹ میں تعین کر دیا گیا ہے۔ مجھے اس میں ترمیم یا تبدیلی کرنے کا کیا اختیار ہے۔ میرا وہم عبث اور شکوک بیکار پیدا ہوئے۔ اگر شیطان ہی شیطان نہ رہا تو بائبل کی تمام مثالیں۔ نیکی اور بدی کی داستانیں یکسر مٹ جائیں گی۔ اگر دنیا سے بدی کا خاتمہ ہو جائے تو قیامت کا تصور، جہنم کی آگ — اس کو روشن رکھنے کے لیے بیکار روحوں کا ایندھن کہاں سے آئے گا۔ شیطان ہی اس دوزخ کی آگ کے لیے لوازمات فراہم کرنے والا کرتا دھرتا ہے۔ شیطان کی توبہ قبول کرنے سے گنہگاروں کے گناہ دھل جائیں گے اور پادریوں کے کاروبار مٹی میں مل جائیں گے — اور پھر یہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا کتنی ویران، کتنی سنسان ہو جائے گی۔ بنا بدی کے دنیا پھیکی ہو جائے گی اور نیکی اور سچائی کی اہمیت جو ہم نے سیکھی ہے وہ کیسے سیکھ سکیں گے؟

[بیک گراؤنڈ کی آوازیں ایک اونچی تان پر پہنچ کر فیڈ ہو جاتیں]

شیطان: "کس سوچ میں پڑ گئے پوپ! — ایسا معلوم ہوتا ہے آپ اپنی بات پر اڑ گئے ہیں میں تو رحم کی بھیک مانگنے آیا ہوں"

پوپ: "نہیں۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک نہایت سنگین مسئلہ ہے۔ پوپ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ بدی کو دنیا سے یکسر مٹا دینا جس کے نہ کرنے سے جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ایک ایسا حادثہ ہو گا جس سے پوری کائنات کا حصار مسمار ہو جائے گا۔ نہیں۔ نہیں۔ نہیں"

شیطان: "اور اس کے باوجود تم اور تمہارا سارا نظام بدی کے خلاف جہاد کرنے میں مبتلا ہے! — میں ہوں کہ تمہاری عمر بھر کی تلاش کو تمہارے قدموں میں رکھ دینا چاہتا ہوں اور تم ہو کہ اس تحفہ کو شرفِ قبولیت بخشنے پر آمادہ نہیں!!"

پوپ: [غصہ میں] "میں ایسا کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں۔ لیکن تم یہ تو بتاؤ کہ آخر تم میرے ہی پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ تم عیسائی مذہب کیوں اختیار کرنا چاہتے ہو؟ کسی اور مذہب میں پناہ کیوں نہیں لیتے؟"

شیطان: "تم لوگ ہی تو بلند بانگ دعوے کرتے ہو کہ عیسائی مذہب سب سے اچھا ہے۔ لیکن میں تمہارے در پر محض اس لیے آیا ہوں تاکہ کرسمس کے تہوار نے میرے دل میں نیکی کے کواڑ کھول دیے ہیں۔ مجھے اس مذہب میں بڑی کشش معلوم ہوتی ہے۔ مجھے سوچا کر کہ اپنے مذہب کی عظمت اور شان بڑھانے کے لیے سب سے بہتر سرٹیفکیٹ حاصل کر تا ہوں گا"

پوپ: "تم پھر میرے خیالات کو ڈانواں ڈول کرنے لگے ہو۔ تم معاملہ کی سنجیدگی اور پیچیدگی پر غور کیوں نہیں کرتے؟ سنو تو آخر میں تم کو کس نام سے پکاروں۔ تمہارے نام ہی کا معاملہ کس قدر خطرناک ہے۔ شیطان چونکا میں! ہا۔ ہا۔ ہا۔ کیا مضحکہ خیز تصور ہے۔ بس۔ بس۔ اب میرا آخری فیصلہ سنو۔

چرچ تمہیں ہرگز ہرگز پناہ نہیں دے سکتا۔ تم چاہو تو کوئی اور دروازہ کھٹکھٹاؤ۔ تمہارے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں"

شیطان: [پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے اور کھسیانا سا ہو کر]

"خیر — تم نہیں اور سہی — اور نہیں اور سہی"۔ خدا کے گھر پہنچنے کے لیے ابھی اور بہت سے دروازے ہیں"

کلک

وقفہ

[اور پھر مسجدوں میں اذانیں دیے جانے کی آوازیں۔ اللہ اکبر کے نعرے بیک گراؤنڈ میں]

شیطان: "مسیح کے نمائندے سے مسیحائی نہیں ملی۔ خدا کے حضور میں رسائی نہیں ملی۔ مگر بدی کے دامن کو دھونے اور نیکی کے بستر پر سونے کی تمنا دل میں باقی ہے۔ چلو بھائی شیطان اب الازہر کے شیخ کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ مذہب اسلام غیر مسلموں کو اپنے سایہ میں لانے کے لیے ہزار جتن کرتا ہے۔ وہاں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔۔۔"

[قدموں کی چاپ — دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز]

شیطان: "دروازہ کھولیے حضور۔ آپ کے در پر ایک سائل کھڑا ہے"

[اندر سے] "تم کون ہو اور کس سے ملنا چاہتے ہو۔ یہ الازہر کے شیخ صاحب کا گھر ہے"

شیطان: "میں ٹھیک جگہ پر ہی آیا ہوں اور شیخ قبلہ سے ملنے کی آرزو دل میں لایا ہوں"

[اندر سے] "آپ کا نام — اور کام؟"

شیطان: "جناب شیخ ہمیں پہچانتے ہیں اور ہمارا نام بھی جانتے ہیں۔ ہم ان کو اپنا چارہ گر مانتے ہیں — براہ کرم دروازہ کھولیے"

[اندر سے] "ٹھہریے۔ شیخ صاحب آ رہے ہیں"

[دروازہ کھلنے کی آواز — قدموں کی چاپ — اور پھر۔۔۔]

شیخ: "کون صاحب اس وقت آئے ہیں — ذرا روشنی میں اس طرف آئیے"

[کچھ چار قدم چلنے کی آوازیں]

شیطان: "آپ تو بیں روشنی میں آگیا ہوں۔ میری صورت بھی آپ کی جانی پہچانی ہے"

شیخ: "تمہاری صورت ؟ ــــ کون ہو جی.... تم ؟ ــــ ارے تم ـ تم بذاتِ خود ؟ ــــ لاحول ــــ لاحول ــــ تم اور یہاں ؟"

شیطان: "جی ہاں ــــ میں وہی ہوں جو آپ سمجھتے ہیں۔ لیکن میں وہ نہیں رہا جو تھا۔ آپ کے گھر کی روشنی میں اپنے گناہوں کے اندھیرے کا سینہ چاک کرنے کے لیے آیا ہوں ۔ اسلام کی روشنی سے بدی کے دھبوں کو دھونے آیا ہوں۔"

شیخ: یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ شیطان مذہبی بننا چاہتا ہے ۔ لیکن ــــ مگر ــــ بات یہ ہے...."

شیطان: "ہم نہیں شیخ جی ان باتوں میں آنے والے ــــ اب اگر مگر چھوڑیئے بات صاف ہے کہ میں اپنی اصلاح خود کر چکا ہوں ۔ بدی سے منہ موڑ کر نیکی سے رشتہ جوڑ چکا ہوں ۔ مجھے اسلام میں جگہ دیجئے"

شیخ: "مگر شیطان...."

شیطان: "دیکھئے شیخ صاحب ! میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ رسولِ اکرم نے سب لوگوں کو اللہ کا راستہ اپنانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ کلام پاک میں ہدایت دی گئی ہے کہ "تم ہمیشہ اس پاک پروردگار کی عبادت کرو اور اپنے گناہوں کی معافی مانگو کیونکہ وہی تمہیں بخشنے والا ہے" میں سچے دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں ــــ نہایت سچا مسلمان جو دوسروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو"

شیخ: "بس اور کچھ نہ کہو شیطان ــــ مجھے تمہاری پیش کش کو سمجھنے دو۔ اس کے رموز پر غور کرنے دو"

[اپنے تئیں بولنے کی آواز]

"شیطان مسلمان ہونا چاہتا ہے یعنی اخوتِ اسلامی میں داخل ہو کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ چل کے گھر نسلے میں اس اور خلیل کے پاس اندر وہاں رہ سکتا ہے ــــ کیسی عجیب تجویز ہے ! سوچنے کی بات ہے کہ اگر شیطان مسلمان ہو گیا تو پھر قرآن شریف کی تلاوت کیسے ہوگی ؟ کیا پھر سچے مسلم یہ پڑھ سکیں گے کہ خدائی قہر نازل ہونے والے شیطان سے نجات دلادو .... اگر یہ سورۃ قرآن میں سے نکال بھی دی جائے تو قرآن کی اور بہت سی آیتیں بھی جو شیطان سے متعلق ہیں خلط ہو جائیں گی ، کیونکہ قرآن کا ایک بہت بڑا حصہ اسلام کے بندوں کو شیطان کی گمراہ کر دینے والی حرکات سے واقف کراتا ہے.... یہ عجیب معمہ ہے ۔ الازہر کا شیخ شیطان کو کس طرح مسلمان بنا سکتا ہے ۔ جب کہ ایسا کرنے سے اسلام کا سارا نظام ہی بدل جائے گا ! ایں خیال است و محال است و جنوں ؛ یہ سب دھوکا ہے۔ مجھے گمراہ نہیں ہونا چاہیئے"

[زور سے]

"سنو شیطان ۔ کان کھول کر سن لو ۔ تم میرے پاس ایسا مسئلہ لے کر آئے ہو جس کا میرے پاس کوئی حل نہیں ۔ تمہاری آس کا علاج میرے پاس نہیں ...."

شیطان: یہ تم کیا کہہ رہے ہو شیخ ، تم جو ہر دم تبلیغ کا دم بھرتے ہو اور غیر مسلموں کو اسلام قبول کرانے کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہو ـ تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھو ۔ دنیا کے مسلم بادشاہوں نے کتنی جنگیں اپنے مذہب کو پھیلانے کے لیے کی تھیں ــــ اور اب تم جو کہ مذہبِ اسلام کے جیتے جاگتے رکھوالے ہو مجھے دھتکار رہے ہو کہ میں اسلام قبول نہ کروں ؟"

شیخ: "جہت کی رگوں کو زیادہ نہ پھلاؤ اور بہر حال یہ مت بھول جاؤ کہ تمہاری درخواست منظور کرنے کا مجھے کوئی اختیار نہیں ۔ یہ میری طاقت سے باہر ہے ۔ کیا میں قرآنِ پاک کی آیتوں کو بھول جاؤں ؟ تم کو مسلم بنا کر آیتوں میں لکھے ہوئے تمہارے ذکر کو غلط ثابت

کروں؟ یہ کیسی قسم کا کفر تم مجھے سکھا رہے ہو — یہ کیسی پٹی مجھے
پڑھا رہے ہو؟!"

شیطان: "تو جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ کسی ایمان لانے والے انسان کے لیے
مناسب نہیں؟"

شیخ: "مگر تم یہ بھول رہے ہو کہ تم دوسرے انسانوں کی طرح نہیں ہو"

شیطان: "میں دوسرے انسانوں کی طرح نہیں ہوں؟ — کیوں نہیں ہوں؟
میں قطعی نہیں چاہتا کہ مجھے دوسرے انسانوں سے الگ سمجھا جائے۔
میری یہ مانگ بھی نہیں ہے کہ مجھے فوراً جنت لے لیا جائے اور میں فرشتوں
کی صف میں بیٹھ جاؤں۔ میں جنت کے دروازے پر ایک شہنشاہ
کی طرح، خواہ وہ دوزخ کا شہنشاہ ہی کیوں نہ ہو، کھڑا ہونا نہیں چاہتا۔
میں نے یہ بھی نہیں کہا کہ مجھے شکست خوردہ بادشاہوں جیسا رتبہ دیا
جائے — یا یہ کہ اسی وقت میری آواز سے آسمان گونج اٹھے۔
میں تو ایک ادنے حقیر کی طرح بارگاہِ الٰہی میں سر بہ سجدہ کیے اپنے
گناہوں اور اپنے کیے کی معافی کی بھیک مانگتا پھر رہا ہوں"

شیخ: "ہو سکتا ہے کہ تمہارا ارادہ نیک ہو۔ مگر ایک بات مجھے صاف کہہ
لینے دو۔ میرا کام اسلام کے نام کو بلند کرنا ہے اور اس کام میں
شیطان سے کسی طرح کے بھی تعلقات رکھنا ہرگز شامل نہیں۔ مجھے
افسوس ہے کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا"

شیطان: "شکریہ"

[کچھ آہیں۔ اذان کی آوازیں۔ قدموں کی آوازیں بتدریج دھیمی
ہو کر۔ فیڈ آوٹ اور ڈھلک]

وقفہ

[جب مائیک آن ہو تو دھیرے دھیرے جھکے ماندے قدموں کی
آواز۔ اس کے ساتھ ہی شیطان کی جانی پہچانی گھرپاس اور
لا گھیری تصویر، آواز سے ساتھ ہی ساتھ گھنٹے بجنے اور مندروں
کی گھنٹیاں بھی بجنے کی آوازیں بیک گراؤنڈ میں]

شیطان: "ذرا دور کے بھکاری کا ایک بھیک مانگنے کا تجربہ جاری رکھو۔ چپ
نے تمہیں دھتکارا اور شیخ نے پھٹکارا۔ اب اس کے سوا اور
کیا چارہ ہے کہ چند دھرم کا جس کی آغوش میں قسمت کے مارے بھی
پناہ لے سکتے ہیں، آسرا ڈھونڈوں۔ دھرتی کے اس دور والے
پر پہنچ کر قسمت آزمائی کروں۔۔۔۔ بس یہی ٹھیک ہے جگہ لیا ہے
کے استھان پر رہتا ہوتا ہوں۔ ان کے نام بڑے سنے ہیں شاید
ان کے دوار پر بھی میری آتما کو شانتی نصیب ہو۔ یہ تو آگیا شنکراچاریہ
جی کے رہنے کا مقام۔۔۔۔"

[زور سے] "دوارپال مجھے شنکراچاریہ جی کے پاس لے
چلو۔ کہنا بڑی دور سے ایک بھکاری آیا ہے"

دوارپال: "آپ بھیک مانگنے آئے ہیں تو شام کے وقت پدھاریے۔ اس
وقت مندر میں آرتی ہونے کے بعد پرشاد اور پھل پھلہار تقسیم
کیا جاتا ہے۔ آپ کو بھی مل جائے گا"

شیطان: "میں پیٹ کا بھوکا نہیں آتما کی شانتی چاہتا ہوں۔ وقت ضائع
نہ کرو۔ میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں"

[اندر سے نحیف اور کانپتی ہوئی آواز]

"دوارپال آنے والے کو اندر آنے دو"

دوارپال: "جو آگیا مہاراج — چلیے اندر — آئیے میرے ساتھ۔۔۔
بس یہاں رک جائیے اور یہیں سے بات کیجیے۔ مہاراج اجنبی
آپ کے سامنے کھڑا ہے"

شیطان: "نمسکار گرو جی"

شنکراچاریہ: "گرو جی! تم میرے کون سے چیلے ہو؟ اس سے پہلے تمہیں کبھی
دیکھا نہیں"

شیطان: "دیکھا تو نہیں مہاراج مگر میں آس پاس ہی رہتا ہوں اور آج یہ
آس لے کر حاضر ہوا ہوں کہ اپنی آتما کو پوتر بنالوں۔ ہندو دھرم
اپنالوں اور آپ کا شیشہ بن جاؤں"

شنکراچاریہ: "لیکن تم کس دھرم کو مانتے ہو؟"

شیطان: "مہاراج میں تو دھرم کہاں"

شنکراچاریہ: "رام — رام — ہے بھگوان۔ تم اچھوت ہو۔ شودر جاتی سے
سے تعلق رکھتے ہو؟ جلد بتاؤ کہ تم کون ہو؟"
شیطان: "میرا تعلق کسی ذات سے نہیں مگر ذاتِ انسانی کے ضمیر اور انسان
کے ضمیر میں رچا ہوا ہوں۔ میں انسان کو ازل سے بدی پہ مائل
کرتا رہتا ہوں۔ مگر اب یہ بزنس چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ اپنے پاپوں
کا پرائشچت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو اپنا گرو دھارنا چاہتا ہوں۔
میری آتما کی بھینٹ سویکار کیجئے مہاراج"
شنکراچاریہ: کوئی ذات نہیں؟ پاپوں کا پرائشچت! آتما کی بھینٹ! کوئی دھرم
نہیں!! — یہ کیا گورکھ دھندہ ہے؟"
شیطان: "کیا یہ گورکھ دھندہ ہے کہ میں بدی چھوڑ کر نیک بننا چاہتا ہوں؟
میں اپنے پرماتما تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ہندو دھرم اختیار کر کے آپ
کا چیلہ بن کر گیان اور دھیان سے مکتی حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ انت
میں سورگ کو سدھاروں"
شنکراچاریہ: "لیکن تم ہو کون؟ تم کونسے دیوتا کو پوجتے ہو؟"
شیطان: "آپ مجھے نہیں جانتے مگر میں آپ کو جانتا ہوں۔ جن دیوتاؤں کا میں
اب تک پجاری رہا وہ ہیں کام۔ کرودھ۔ لوبھ۔ مد اور موہ۔ مجھ میں
ایسی شکتی ہے کہ میں انسانوں کے دل و دماغ میں ان جذبوں کو مرضی
کے مطابق بھر دیتا ہوں۔ نیکی اور سچائی۔ راست بازی اور بھلائی
ان کو بھلا دیتا ہوں۔ ان سے بڑے بڑے کام کرواتا ہوں۔ قتل
و خون۔ بدی۔ برائی۔ چوری۔ دھوکا ہر قسم کے برے افعال میرے
ایماء پہ کیے جاتے ہیں۔ مگر میں اب ایسے کاموں سے تھک گیا ہوں۔
اب تو میں اپنی عاقبت بنانے آیا ہوں۔ یقین جانو کہ مجھ کو اپنے
چرنوں میں جگہ دینے سے اس دنیا کی بدی اور برائی ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے ختم ہو جائے گی"
شنکراچاریہ: "تم کوئی مہا پاپی معلوم ہوتے ہو جس کا نہ کوئی دھرم ہے نہ
دیوتا۔ نہ معلوم ایسے ملیچھ ہو کر یہاں کیوں چلے آئے؟ اس پوتر استھان
پر جہاں پوجا پاٹھ۔ وید و شاستروں، پرماتما کا دھیان، مہابھارت،
راماین اور گیتا کا دھیان ہوتا ہے؟ اچھا ٹھیک بتاؤ تم کون ہو؟ ہمارے
دھرم میں تمہارا کوئی ذکر نہیں۔ میں تمہاری باتوں پر کس طرح وشواس
کر سکتا ہوں"
شیطان: "آپ میری بات پر اس لیے یقین کر سکتے ہیں کہ میں اپنی بڑائی کی ڈینگیں
بگھار رہا ہوں بلکہ میں تو اپنے آپ کو اس دھرتی کا سب سے ذلیل اور
بدکردار تسلیم کر رہا ہوں۔ مجھے سویکار کیجئے مہاراج۔ مجھے اپنے
گناہوں سے بچنے کا موقع دیجئے اور لوگوں کو گناہ سے بچایئے"
شنکراچاریہ: "دھرم کوئی ایسی چیز نہیں جسے مول دے کر بازار سے خرید ا
جا سکے۔ تم یہ بھول رہے ہو کہ انسان کو اپنے کرموں کا پھل اوش
ملتا ہے۔ جس نے اپنے پچھلے جنموں میں اچھے کرم کیے ہوتے ہیں وہ منش
کا جنم لیتا ہے اور وہ بھی ایسے گھرانے میں جو پوتر ہو۔ جہاں گیان اور
دھیان اسے نصیب ہوں اور اس کو مکتی حاصل ہو سکے۔"
شیطان: "مگر مہاراج میں انسان نہیں ہوں"
شنکراچاریہ: "تو کیا تم بھگوان ہو"
شیطان: "میں تو بھگوان تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے پاپوں کا دیوتا سمجھیے"
شنکراچاریہ: "اگر میں کچھ دیر کے لیے یہ مان بھی لوں کہ اس دنیا میں جتنے پاپ ہوتے
ہیں ان کا کارن تم ہی ہو۔ اگر تمہارے ہندو دھرم میں آجانے سے
اس دنیا سے بدی اور برائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اٹھ جائیگی تو نرک میں
کون جائے گا؟ اور سورگ میں اتنی جگہ کہاں سے آئے گی کہ ہر جاتی
اور ہر مذہب کے لوگ وہاں سما سکیں؟ — اور پھر یہ ملک کے
مندر۔ بنارس۔ پریاگ۔ ہری دوار اور تیرتھ کے استھانوں کے
پجاری اور گنگا میا کے پوتر اشنان، ان کا کیا ہوگا؟ یگ، ہون، پوجا
پاٹھ۔ پرنامت اور پرساد۔ آرتی اور ارچنا — یہ سب بیکار
ہو جائیں گے۔ ہرے رام۔ ہرے رام۔ کتنا بھیانک خیال ہے کہ
جس سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے ہیں۔ نہیں نہیں ایسا
کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا"
شیطان: "تو کیا میں آپ کے پاس سے بھی نراش چلا جاؤں؟"

شنکراچاریہ: "تو [illegible] ایسے اچھے [illegible] کرم [illegible] جنم پاکر اور پھر [illegible] کہ تم [illegible] سکو گے کہ تمہاری آتما کو شانتی اور تم کو مکتی مل جائے"

شیطان: "لیکن مہاراج [illegible] ۔ میرا ابھی جنم ختم نہیں ہوتا اور زندگی جہنم بن گئی ہے۔ [illegible] چھٹکارا پانے کے لیے میں یہاں آیا ہوں"

شنکراچاریہ: "تم ہندو دھرم اپنانا چاہتے ہو مگر اس بات پر تمہیں بھروسہ نہیں کہ اگلا جنم بھی ہوگا! کیسے مورکھ ہو تم۔ تمہیں اپنے پاپوں کے بیوپار سے فرصت ہی نہیں ملی کہ تم کچھ گیان پاتے۔ پرماتما کے دھیان میں اپنے آپ کو کھو دیتے"

شیطان: "یہی غرض لیکر تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ پاپوں کو دھوتے اور اور پرماتما کے دھیان میں اپنے آپ کو کھو دینے کے لیے"

شنکراچاریہ: "مگر تم کو سب سے پہلے کرموں کے اصول کو سمجھنا ہوگا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے وہ تمہارے کرموں کا پھل ہے۔ یوں سمجھ لو کہ یہ ایک قرضہ ہے جس کو تمہیں ادا کرنا ہی پڑے گا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اگر تم نے پچھلے جنم میں جَو بوئے ہیں تو گندم کی فصل کس طرح کاٹ سکتے ہو؟"

شیطان: "لیکن مہاراج میں تو اس دنیا کی ابتدا سے زندہ ہوں اور قیامت [illegible] زندہ رہوں گا۔ یہی میری مصیبت ہے"

شنکراچاریہ: "اگر تم پر خود تمہارے کہنے کے مطابق کرموں کے اصول کا اطلاق نہیں ہوتا تو تم ہندو دھرم میں کس طرح جگہ پا سکتے ہو۔ نہ ویدوں میں تمہارا ذکر ہے اور نہ دوسری مقدس کتابوں میں۔ میں تمہاری بات پر اعتبار نہیں کر سکتا"

شیطان: "تو گویا آپ میری مدد نہیں کر سکیں گے"

شنکراچاریہ: "پرماتما تمہاری مدد کریں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اچھا تو اب تم جاؤ۔ میرے پوجا پاٹ کا وقت ہو گیا ہے"

شیطان: [ایک آہ بھر کر]

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

"چلو بھئی شیطان۔ ایک اور دروازہ بند ہوا۔ چلو۔ یہاں سے بھی چل دو"

(مندر کی گھنٹیاں اور ناقوس بجنے کی آوازیں اور پھر نہایت سریلی آوازیں یہ بھجن کورس میں)

جے جگدیش ہرے۔ سوامی جے جگدیش ہرے
تم ہی اور نہ دوجا۔ دوار پڑا تیرے وغیرہ وغیرہ

فیڈ آوٹ۔ گانگ

وقفہ

(جب مائیک آن ہو تو شیطان بڑبڑا رہا ہو)

شیطان: "اے بدی کے بادشاہ۔ گناہوں کے دیوتا۔ برائیوں کے سرتاج! آج دیکھ لیا اس دنیا میں اپنا حشر۔ جس دروازے پر دستک دی سوائے پھٹکار کے کچھ نہ ملا۔ . . . اس دنیا کے لوگ تو وہ تمہارے ایما پر اپنا ایمان قربان کر دیتے ہیں مگر تم کو اپنے مذہب اور اپنی برادری کے پاس پھٹکنے نہیں دیتے . . . . وہ تم سے اس طرح [illegible] ہیں جیسے تم کوئی کوڑھی ہو! لیکن میں کیا کروں — کدھر جاؤں؟ میں پرتشٹ کرنا چاہتا ہوں . . . جب معصوم بچوں کو کھیلتے دیکھتا ہوں تو دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے . . . . جب اچھے لوگوں کو نیکی کرتے دیکھتا ہوں تو میرا دل بھر آتا ہے . . . . جب خدا کے بندوں کی عقیدت ان کے دل میں جھانک جھانک کر دیکھتا ہوں تو سچائی اور دھرم کا حسن میری آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے . . . . میں ہاتھ بڑھا کر اس حسن، اس روشنی کو پکڑ لینا چاہتا ہوں . . . . اس کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لینا چاہتا ہوں . . . . مگر کیا کروں میرے ہاتھ پیر سُن ہو جاتے ہیں۔ میرا صبر [illegible] اب مزید انتظار نہیں کر سکتا! میرا وجود منتشر ہوتا معلوم ہوتا ہے — میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے . . . .

(ایک بیچ)

"اب میں اس دنیا میں چین نہیں پا سکتا — نہیں پا سکتا۔ مجھے خدا کے حضور میں جانا ہی ہوگا — چلو جنت کی طرف شیطان — چلو ہمت کرو ۔۔۔۔ اُڑو آسمان کی طرف ۔۔۔۔"

(آندھی کی آوازیں، بجلی کڑکنے کی — فضا میں پرواز کا سماں بندھ جائے اور بتدریج ختم ہو جائے)

جبرئیل: "کون؟ — شیطان؟ — جنت کے دروازے پر"

شیطان: "جی جناب جبرئیل"

جبرئیل: "کیا چاہتے ہو تم — یہاں؟"

شیطان: "معافی — توبہ — کفارہ!!!"

جبرئیل: "آپ — اس وقت؟"

شیطان: "کیا میں بہت دیر سے آیا ہوں؟"

جبرئیل: "دیر سے نہیں بلکہ وقت سے پہلے"

شیطان: "وقت سے پہلے کیوں؟ کیا یہاں بھی دنیا کی طرح ایڈوانس بکنگ کرانا ضروری ہے؟"

جبرئیل: کیونکہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ خدائی نظام کو بگاڑا جائے"

شیطان: "لیکن میں تنگ آگیا ہوں اپنی زندگی سے"

جبرئیل: "تم کو اپنی زندگی سے بیزار ہونے کا کوئی حق نہیں۔ فوراً واپس جاؤ۔ اسی زمین پر جہاں سے بھاگ آئے ہو — جہاں تمہیں ہونا چاہئے تھا اور وہاں ویسی ہی زندگی بسر کرو جیسی اب تک کرتے آئے ہو"

شیطان: "لیکن جناب میں تو ایک لمحہ بھر وہاں نہیں رہ سکتا — میں نیکی کی تلاش میں آیا ہوں۔ مجھے ایک لمحہ بھر کے لیے ہی سہی، اس کا مزہ چکھ لینے دو"

جبرئیل: "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا"

شیطان: "مگر کیوں ایسا نہیں ہو سکتا؟"

جبرئیل: "اس لیے کہ تمہارے لیے نیکی گناہ ہے — تم اس کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتے"

شیطان: "میرا خیال تھا کہ اگر تم مجھ کو بھی نیک بنا سکو تو اچھا ہے!"

جبرئیل: "مگر تمہارے لیے تو نیکی ایک شجرِ ممنوعہ ہے۔ میں اس معاملے میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا"

شیطان: "میں رحم کی بھیک مانگتا ہوں"

جبرئیل: "نہیں مل سکتی یہ بھیک۔ قدرت کا سارا نظام ایسی بھیک دینے سے درہم برہم ہو جائے گا"

شیطان: "میں دنیا میں واپس جانا نہیں چاہتا"

جبرئیل: "تم کو واپس جانا ہی ہوگا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں قدرت کے سارے نظام کو برباد کرنے میں تمہاری مدد کروں گا؟ اگر تم دنیا میں نہیں رہو گے تو اس کی ساری شکل و صورت بدل جائے گی"

شیطان: "مگر مجھے ہی کیوں تختۂ مشق بنایا جا رہا ہے — میں تو توبہ کرنے آیا ہوں"

جبرئیل: "نہیں! تم دنیا کو ختم کر دینا چاہتے ہو!! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ نیکی کا بغیر بدی کے وجود نہیں ہو سکتا۔ سچائی جھوٹ کے بغیر بے معنی ہو جاتی ہے۔ اچھائی کا تصور برائی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا! خدا کے بندے تمہاری برائیوں کے بغیر خدا کی عظمت کا اعتراف نہیں کر سکتے!! روشنی کی اہمیت بغیر تاریکی کے سمجھی نہیں جا سکتی۔ اس لیے جب تک کائنات باقی ہے، تمہارا وجود بھی نہایت ضروری ہے"

شیطان: "بڑی حیرت کی بات ہے کہ نیکی کے وجود کے لیے دنیا میں میرا وجود ضروری ہے! لیکن میری اپنی روح! — اس کا کیا ہوگا؟ کیا تم چاہتے ہو کہ میری روح ہمیشہ بدی سے سیاہ رہے تاکہ لوگ خدا کی تجلی کو محسوس کر سکیں؟"

جبرئیل: "تمہاری قسمت میں یہی لکھا ہے"

شیطان: "نوشتۂ تقدیر — ہائے ری قسمت! میں لوگوں کو بدی کرنے پر مائل کرتا رہوں تاکہ دنیا میں نیکی برقرار رہے خواہ میری روح کو قرار نہ آئے!! میں اس وعدہ کے ساتھ کہ زندگی بھر یہ ستم برداشت کروں

تاکہ خدا کا نور دنیا میں جھلکتا رہے اور نیکی باقی رہے — یہ کیسا انصاف ہے جبرئیل؟"

جبرئیل: "ایسے تم خدا کا حکم سمجھو کہ کائنات کے خاتمہ تک تم کو اسی حالت میں رہنا پڑے گا"

شیطان: "لیکن میرے نیک اور پاک ارادے؟"

جبرئیل: "قانونِ قدرت بدل نہیں سکتا۔ تم اپنے فرض سے منہ موڑ نہیں سکتے!"

شیطان: "رحم۔ یا میرے خدا رحم۔ میں اپنے دل کے درد و کرب سے دبا جا رہا ہوں۔ اے میرے معبود مجھ پر رحم کر اور مجھے اپنا سب سے اعلیٰ فرشتہ بنا لے — ایک ناچیز ہستی جسے تیرے نزدیک رہنے کا شرف حاصل ہو۔ اے مالکِ کون و مکاں، اے حاکمِ ہر دو جہاں، میں تیرے لیے بے پناہ عقیدت اپنے دل میں لیے آیا ہوں — ایسی عقیدت جسے نہ تو انسان سمجھتے ہیں اور نہ ہی فرشتے... (آہیں بھرتے ہوئے)... میں ایک بڑی قربانی کر کے تیرے در پر آیا ہوں۔ میری اس قربانی کا ایک پہلو ایسا پوشیدہ ہے جس سے لوگ واقف نہیں — مگر اے خدا تو انتریامی ہے اور تجھ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہ میری محبت کی انتہا ہے کہ میں تمہارے حکم کی خلاف ورزی کر رہا ہوں، مگر مجھے تمہاری محبت جتلانے پر حقارت نصیب ہو رہی ہے۔ میری عقیدت مندی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ اگر تجھ سے کوئی اور میرے جیسی بندگی ظاہر کرتا تو تیرے نور سے منور ہو جاتا۔ لیکن آہ! میرے لیے صرف تنگ و تاریک مقدر، بدی اور برائی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا — اے میرے خدا، میں کیا کروں۔ کدھر جاؤں؟"

(شیطان رونے لگتا ہے۔ اس کے آنسو زمین پر ٹوٹتے ستاروں اور کڑکتی بجلی کی طرح گرتے ہیں)

جبرئیل: "شیطان! اپنے کو سنبھالو۔ تمہارے آنسو خدا کے نیک بندوں پر بلا کی طرح نازل ہو رہے ہیں۔ زلزلے اور طوفانوں سے دنیا گھرنے لگی ہے۔ خاموش ہو جاؤ۔ ایسا نہ کرو۔ خدا کے لیے چپ ہو جاؤ"

شیطان: (درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں) "میرے تو آنسو بھی دنیا کے لیے تباہی لاسکتے ہیں اور میں اپنا دل بھی ہلکا نہیں کر سکتا!"

جبرئیل: "میں تمہیں خدا کا حکم سنا چکا ہوں۔ تمہیں اس کی تعمیل کرنی ہی ہوگی۔ اچھا کیا جو تم نے اپنے آنسو روک لیے"

شیطان: (آہیں بھرتے ہوئے)

"جی ہاں — اچھا کیا! یہ بھی تمہارا کیا انصاف ہے۔

جو ہنستا ہوں تو کہتے ہیں بدی کرتا ہے
اور روتا ہوں تو کہتے ہو کہ ہنستا ہوگا!"

جبرئیل: "یہ کیا؟ تم تو شاعری پر اتر آئے"

شیطان: "مگر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے"

جبرئیل: "خدا کا حکم اٹل ہے۔ اسے نہ تو توڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس سے منہ موڑا جا سکتا ہے"

شیطان: "مطلب یہ کہ میں خدا کے بندوں کے دل میں بدی، برائی، بغض، کینہ اور نفرت وغیرہ کے جذبات بھرتا رہوں اور اپنے لیے خود بھی دل میں دن رات مرتا رہوں"

جبرئیل: "یہی تمہارا فرض ہے۔ میں یہ نیک صلاح دینا چاہتا ہوں کہ بغیر شکوہ و شکایت اپنا فرض پورا کرو"

شیطان: "نیک مشورہ! یعنی بدی کرو!!"

جبرئیل: "بغاوت اچھی نہیں۔ اطاعت گزار بنو"

شیطان: "بغاوت! اور میں؟"

جبرئیل: "خدا کے حکم کی تعمیل کرو"

شیطان: "جبرئیل۔ تم نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ اگر میں واقعی بغاوت ہی کرنا چاہتا تو اب تک اپنا سارا کام چھوڑ کر جنت [illegible] کی طرف اشارہ کر دیتا اور خدا کے اصولوں کو ٹھکرا دیتا — میں اپنی حکم عدولی کا اظہار ایک لمحہ خاموش رہ کر بھی کر سکتا تھا۔ اگر میں صرف لمحہ بھر کے لیے بھی دنیا کو بدی کا سبق دینا بند کر دیتا

"تو بقول تمہارے سارا خدائی نظام درہم برہم ہو جائے گا"

جبرئیل: "ایسے الفاظ زبان پر نہ لاؤ — بس اب واپس چلے جاؤ"

شیطان: "چلا جاؤں گا۔ مگر تم کو پہلے یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے میری
عقیدت اور محبت ہی اس عظیم کائنات کے قیام کا راز ہے۔ ورنہ
میں چاہتا تو ہر طرف ہر دم تخریب اور تباہی پھیلائے رکھتا"

جبرئیل: "خدا اپنے عقیدت مندوں سے ہر دم اور ہر وقت باخبر رہتا ہے"

شیطان: "لیکن باوجود اس کے میں خدائی عتاب کے نقاب کو اُتار نہیں سکتا
کسی ڈرامہ کا کردار اپنا دغا بازی اور ریاکاری کا پارٹ ادا کر کے پھر
اپنی اصلی زندگی میں پہنچ جاتا ہے مگر میرے نصیب میں بدی ازل سے
لکھی ہے۔ میں اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتا — یہی درد اور یہی
غم مجھے کھائے جاتا ہے"

جبرئیل: "جاؤ دنیا کو لوٹ جاؤ اور اپنا درد و غم برداشت کرو۔ جو محبت
کرتا ہے اُسے غم اُٹھانا ہی پڑتا ہے"

شیطان: "میرے معبود کے لیے میری محبت اور عقیدت لامحدود ہے مگر
ابھی تک مجھے اس کا صلہ نہیں ملا۔ جو لوگ خدا کی یاد میں جان دے
دیتے ہیں انہیں مکتی حاصل ہوتی ہے۔ اُن کی روح قید حیات
سے آزاد ہو جاتی ہے۔ میرا یہی گلہ ہے کہ میں موت سے بھی زیادہ
سنگین صدمے برداشت کرتا ہوں مگر میری آتما کو شانتی نہیں
ملتی"

جبرئیل: "پھر بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ تم خوب جانتے ہو کہ تمہارا وجود
دنیا کے وجود کے ساتھ قائم و دائم رہے گا"

شیطان: "جانتا ہوں۔ اور اسی لیے میرا دکھ دائمی ہے۔ نہ معلوم مجھے کب
تک اس اذیت میں رہنا ہوگا"

جبرئیل: "جب تک تمہارے خالق کی مرضی ہوگی تمہیں اپنے فرائض انجام
دیتے ہی ہوں گے"

شیطان: "اُس کے حکم کی تعمیل میں جو مجھے سب سے پیارا ہے اپنی فریب
اور فسادوں کی زندگی سے نفرت کیے جاتا — آہ! مجھے
موت بھی تو نہیں آ سکتی۔ میں لافانی ہوں ورنہ خودکشی کر لیتا یا
اُس کے نام پر موت کا جام پی لیتا — میرے لیے معافی اور توبہ
کے سب دروازے بند ہیں۔ میری کوئی اُمید بر آتی نظر نہیں
آتی"

جبرئیل: "دیکھو شیطان۔ زیادہ جذباتی نہ بنو۔ پھر تمہاری آنکھیں نم ہو رہی
ہیں اور تم بخوبی جانتے ہو کہ تمہارے آنسو تباہی لاتے ہیں"

شیطان: "میں جانتا ہوں۔ اپنے غم کے ساتھ اپنے آنسو بھی پی جاتا ہوں"

جبرئیل: "شاباش شیطان۔ شاباش! خدا کی عظمت کی خاطر اس دنیا کا یہ
موہ مایا کا جال بچھا رہے گا"

شیطان: "میرے لیے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں"

جبرئیل: "اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اسی میں تمہاری نجات ہے"

شیطان: "اور اب تم مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو"

جبرئیل: "میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو جاؤ"

شیطان: "تو میں چلتا ہوں۔ خدا کے فیض کا امرت چکھے بغیر۔ پیاسا اور خالی
ہاتھ۔ تشنہ اور ناکام!"

جبرئیل: "تم خدا کی کائنات کا، خدا کی مرضی سے ایک نہایت اہم حصہ ہو"

شیطان: "نہیں جبرئیل۔ میں شہید ہوں۔ بلکہ زندہ شہید ہوں"

جبرئیل: "زندہ شہید! واقعی نہایت مناسب و موزوں نام ہے"

شیطان: "تو لو — چلا یہ زندہ شہید!

زندہ شہید!!

زندہ شہید!!!

(درد بھری موسیقی سازوں پر۔ بتدریج فیڈ آؤٹ)

بادۂ کہن

اُستادِ دکن حضرت میر شمس الدین محمد فیضؔ، دکن کے باکمال سخنور تھے۔ نظام علی خاں آصفجاہ ثانی کے عہدِ حکومت میں ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ چار آصفی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا، میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس کے عہد میں ۱۴ / رجب ۱۲۸۳ھ کو ۸۸ سال کی عمر میں وفات پائی۔

حضرت فیضؔ، درباری اور عوامی زندگی میں ممتاز رہے، علم و فن کی عظمت، اور سادگیٔ طبع کے باعث یاد کیے جاتے ہیں امیر کبیر شمس الامراء کے ادارۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے مشیر تھے، آپ کے کلام کا شہرہ ہندوستان گیر تھا، میر تقی میرؔ کے انتقال کے وقت آپ کی عمر ۳۰ سال تھی، آپ شاہ نصیرؔ دہلوی کے معاصر تھے، دکن میں اُستادی اور شاگردی کے سلسلے کو آپ نے وسعت دی۔ دو دیوان مطبوعہ ہیں اور تقریباً اتنے ہی مرتب ہیں۔ ڈاکٹر زورؔ نے ۱۹۳۶ء میں حضرت فیض کا ایک نمائندہ انتخاب "فیضِ سخن" فاضلانہ اور بسیط مقدمے کے ساتھ ادارۂ ادبیات اُردو سے شائع کیا تھا۔ فیض کی شخصیت، عہد اور فکر و فن پر ادارہ اور جامعہ عثمانیہ سے ریسرچ ورک ہو چکا ہے

(ادارہ)

مسیحائی سے وہ خالی، یہ لب ریز مسیحائی
لبوں سے برگِ گل کا استعارا ہو نہیں سکتا

عہدِ پیری میں نہیں داغِ جوانی کام کا
صبح کو بے نور ہے جلوہ چراغِ شام کا

صبحِ پیری واقعی سرمایۂ غفلت ہے فیضؔ
ہو گئی ہے بھور وقت آیا مرے آرام کا

ان پری زادوں کے کوچے میں تماشے کی ہے بات
جو تماشہ دیکھنے آیا تماشہ ہو گیا

غفلت میں ہو رہی ہے مری زندگی تمام
ہے رات دن خیال کسی مست خواب کا

کیا دوش ہے کسی پہ نصیبوں سے ہے گلہ
وہ کیا بدل گئے کہ زمانہ بدل گیا

ناتوانوں کا ترے ایک ٹھکانہ ہی نہیں
جس جگہ بیٹھ گئے تھک کے وطن ہے اُن کا

ناتوانی کا بیاں ہم خاکساروں سے نہ پوچھ
نقشِ پا کی طرح اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا

زیست کو مرگ سمجھتے ہیں ہم
پیرہن ہے سو کفن ہے اپنا

نہ ہوتا گر ادب مانع بہت کچھ سناتا میں
وہ اپنے گھر میں خوش رہتا خفا ہوتا تو کیا ہوتا

کیا خدا کی کر دی تلاش اے فیضؔ
مجھ کو میرا پتا نہیں ملتا

فیضؔ کب تک [illegible] لبِ بتاں
[illegible] ہو گیا [illegible]

عمر غفلت میں گنوائی ہم نے   یہ مثل سچ ہے کہ سویا جو کا
زندگی بھر رہا مکدر وہ !!   دل کا آئنہ جو صفا نہ کیا
تم سے یوسفؑ کو کچھ نہیں نسبت   دیکھی یہ وہ سنی سنائی بات
اسی کے منہ پہ گرتی ہم نے دیکھا   [illegible] خاک جس نے آسماں پر
کریں ہم کس کی پوجا اور چڑھائیں کس کو چڑھاوا   صنم ہم دیر ہم بتخانہ ہم بت ہم برہمن ہم
محبت ہے تو اپنے سے عداوت ہے تو اپنے سے   ہیں آپ ہی دوست اپنے ہم ہیں آپ ہی اپنے دشمن ہم
ہولئے فیض معلوم ایک مدت میں بھلا وہ بھی   جپا کرتے تھے جس کے نام کی دن رات سمرن ہم
شخص اور عکس کو پہچانوں کیا   صورت آئینہ حیراں ہوں میں
ڈرتا ہوں نہ لگ جائے نظر عکس کی تجھ کو   مت آئنہ میں عارض تاباں کی طرف دیکھ
گو بہت دنیا میں ہیں محنت کشیدہ آدمی   ہم سے کم ہوں گے مگر آفت رسیدہ آدمی
یاالٰہی مرض عشق جسے کہتے ہیں!   دل کو میرے وہی آزار ہوا ہے کیا ہے
دیوانہ بہت کون ہے انصاف تو کیجے   دیکھا ہے مجھے آپ نے مجنوں کہتا ہے
ہم نے سکھلائے ہیں انداز وفا و اخلاص   آگہی کب تھی انہیں رسم وفا سے پہلے
ہے یہ پہچان زر و انسان کی   کس کو اس کو اس کو بس کر دیکھیے
یہ طمطراق زندگی مستعار پہ   اے مشت خاک تجھ کو بھی کتنا غرور ہے
ہیں محیط و محاط دونوں ایک   آب گوہر میں گوہر آب میں ہے
چلے جائیں گے اٹھتے بیٹھتے ہم   بلند و پست گو راہ عدم ہے
خواہان محبت ہوں عداوت نہیں آتی   آتا ہے مجھے شکر شکایت نہیں آتی
پاس ہیں پہ نظر نہیں آتے   آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل ہے
بہت خاک چھانی کھلا جب یہ گل   نہ خاک شاہ و گدا ایک ہے
ہم نے چند اوراق وصف گل میں لکھے تھے کہیں   نام ان کا شیخ سعدیؒ نے گلستان کر دیا
کل کا وعدہ آج پھر اس نے کیا   لطف ہی امروز فردا ہو گیا
نقش پا کو ترے جہاں دیکھا   اپنی آنکھوں سے میں جدا نہ کیا
کون یاں خاطر میں لاتا ہے مجھے   تو بھی جب پیارے کشیدہ ہو گیا
جب سے کسی صنم کا فسانہ جانتے ہیں   ہر سنگ و خشت کو ہم بتخانہ جانتے ہیں
اے نسیم سحری کھول اگر تجھ سے کھلے   غنچہ ساں ہم بھی ہیں ایک عقدۂ مشکل والے
زمانہ ہو گیا آخر و لیکن نام ہے روشن   کرامت فیض کی جاری جو آگے تھی سو اب بھی ہے

حجاب امتیاز علی

قسطِ مکرر

روبہ صحت

آہ! آج بھی جب کبھی میں گذشتہ واقعات کو یاد کرتی ہوں تو قلب پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مارچ کا مہینہ ختم ہو چکا تھا ایشیائی اپریل کا آتشیں مہینہ شروع ہو رہا تھا۔ شہتوت کی ٹہنیاں نیلے نیلے شہتوتوں سے لدنے لگی تھیں شاہ بلوط کھلے ہوئے تھے، رات کے وقت دریچوں سے ہار سنگار اور چنبیلی کی لپٹیں آنی شروع ہو گئی تھیں۔ سنہری دھوپ اب سرخ لوہے کی طرح چبھنے لگی تھی۔ ہری ہری گھاس دھوپ کی تپش سے جل کر سنہری ہو رہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں مرجھا رہی تھیں۔ اور باغ میں گرم ہواؤں کے سبب دن بھر ویرانی طاری رہتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس سال ریاست کیبا آس میں سخت گرمی پڑیگی۔

اب بھیا منیر کی صحت میں نمایاں تبدیلی معلوم ہوتی تھی۔ سب کو اطمینان سا ہو چلا تھا۔ مگر جہاں اُن کی تندرستی پر سارا خاندان خوش ہو رہا تھا وہاں چند اندیشوں نے بعض لوگوں کو نہایت ہراساں کر رکھا تھا۔ میں نے زندگی کو اس متانت سے کبھی نہ دیکھا تھا جیسا اُس زمانے میں کیبا آس میں دیکھ رہی تھی۔

اُس دوپہر گرمی اور دلی اُلجھنوں کے سبب میں نڈھال ہو رہی تھی۔ پورا دن میں نے خوابگاہ میں بسر کیا۔ کوئی تین بجے ایک ہلکا پھلکا سا سفید ندیق کا بہن کر نیچے اتری۔ دل بیحد اداس ہو رہا تھا۔ رات کی باتیں ذہن میں تازہ تھیں۔ یہ سوچ کر میں نیچے جا رہی تھی کہ تھوڑی دیر بھیا منیر کے کمرے میں بیٹھ کر دل بہلاؤں گی کہ اتنے میں بالاخانے کے زینے پر موتیا کنیز ملی "خاتون روحی" اس نے کہا "آپ اس سفید لباس میں بالکل چمیلی کی کلی معلوم ہو رہی ہیں۔ مگر مرجھائی ہوئی سی" میں نے دھیمے سے کہا "کیا میں اُداس معلوم ہوتی ہوں موتیا؟" "بہت" اس نے کہا یہ شاید گرمی کی وجہ ہو۔ بیگم زبیدہ آپکو پوچھ رہی ہیں"

"سب لوگ کہاں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"حرم سرا کے ایوان میں سب موجود ہیں۔ سر جعفر دیچا لرنت کے سکریٹری ابھی آئے ہوئے ہیں۔ صاحبزادے منیر کی صحت یابی پر ایک جشن منایا جانے والا تھا نا۔ اسی سلسلے میں بات چیت اور تیاریاں ہو رہی ہیں" اتنا سن کر میں نے ایک آہ بھری "اچھا میں بھی وہاں جا رہی ہوں"!

موتیا ذرا سے کھڑی رہی پھر مسکرا کر کہا "ہاں میں تو بھول ہی گئی۔ سر لوئٹ آپ کو ڈھونڈ رہے تھے، شاید سر ہارکی کا کوئی پیغام دینا چاہتے تھے" اتنا کہہ کر میں شدتِ مسرت سے گلابی ہو گئی۔ جھک کر موتیا کو زور سے پیار کیا۔ پھر زینے پر سے دوڑتی ہوئی حرم سرا میں چلی گئی۔

جیسے میں ایوانِ نشست میں داخل ہوئی تو دادی زبیدہ سکریٹری سے کہہ رہی تھیں "جلسۂ رقص قصرِ نسرین کے بجائے خلیفہ کے نئے ایوان میں منعقد ہوگا" بڑے سر جعفر ایک چھوٹی سی تپائی کے پاس ملاقات کے بنڈل لئے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر گار اور بھیا منیر دریچے کے پاس شطرنج کھیل رہے تھے۔ کنیزیں ادھر اُدھر مصروف تھیں۔ مجھے دیکھ کر سر جعفر آگے بڑھے "ہوشت تو اب خانم روحی۔ لو اب تو آپکو ڈھونڈ رہے تھے"

"میں آگئی بھیا جیسی کہ خدمت میں حاضر ہوں سر جعفر" یہ کہتے ہوئے میں دادی زبیدہ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔

دروازوں پر خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ جن پر حبشی خانہ زاد دادی زبیدہ کے حکم کے مطابق عطر گلاب اور عطر خس پانی میں ملا کر چھڑکا کرتے تھے۔ پنکھے تیزی سے چل رہے تھے۔ صنوبر کنیز دادی جان کے بائیں ہاتھ کے قریب ان کے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔

اس دوپہر دادی زبیدہ نے اپنے بال اس انداز سے سنوارے تھے جیسے کبھی نور جہاں عہد میں سنوارے جاتے تھے۔ اپنی طرف سے وہ انہیں بہت شائستگی سے بیٹھی تھیں اور بار بار فخر سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھیں۔ "میں کن ہونٹوں کس منہ سے اپنے اللہ کا شکریہ ادا کروں سر جعفر؟" دادی زبیدہ نے اپنی زرتیں پنکھیا ہلاتے ہوئے کہا۔ "اُس نے یہ دن بھی دکھایا" "مری بچاری مادام" سر جعفر نے کہا۔

بوڑھا ڈاکٹر کار شطرنج کھیلتے کھیلتے مڑ کر بولا "اس تمام موسم میں بیگم زبیدہ نے ایک جشن بھی نہیں منایا"۔ "میں نے مادام کو اپنی عمر میں اتنا پریشان کبھی نہ دیکھا تھا" سر جعفر نے جواب دیا۔ "اور کیا" دادی زبیدہ اپنی ریشمیں دستی کو ناک کے پاس لیجاتے ہوئے گویا ہوئیں "جیسے کہ میں آتی ہوں نہ مجھے اپنے کپڑوں کا ہوش ہے نہ زیوروں کا۔ منیر کی علالت نے حواس باختہ کر رکھا تھا تم جانتے ہو ڈاکٹر، مجھے اپنے قدیم ہیروں سے کس قدر عشق ہے مگر میں نے انہیں یہاں اس موسم میں ایک بار بھی نہیں پہنا! اب انشاء اللہ منیر کے غسل صحت پر پہنوں گی"

"اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا ہے؟" سر جعفر نے اپنی خشخشی داڑھی کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ میں اکتا سی گئی۔ "نہ جانے چچا لوث مجھے کیوں بلا رہے تھے ......" دادی زبیدہ متوجہ ہوئیں "مجھے نہیں معلوم..... شاید تمہیں کوئی پیام دیتا ...... صنوبر! یہ دریچہ بند کر دو۔ گرم ہوا اندر آ رہی ہے" "آپ نے کیا فرمایا دادی جان؟" میں نے مچل کر پوچھا۔

"شاید کوئی پیام ...... جی ہاں جی ہاں سر جعفر میں نے سلطان حمید کو اور ان کے لڑکوں لڑکیوں کو بھی اس موقع پر مدعو کیا ہے۔ تم کیا پوچھ رہی تھیں بیٹی؟" میں چڑ سی گئی۔ اٹھنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا، اور چچا لوث ایک خط ہاتھ میں لئے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"روحی تم کہاں تھیں؟" انہوں نے آتے ہی کہا۔ "سر ہارکی کا خط آیا ہے۔ وہ اس ہفتہ کے اختتام پر دریائے ٹاشیاس کے کنارے پر تفریحاً آ رہے ہیں۔ انھوں نے ہم سب کو وہاں پکنک کی غرض سے مدعو کیا ہے" "کیا واقعی" دادی زبیدہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں ـــ" چچا لوث نے کہا، پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا "اور خصوصیت سے روحی کو مدعو کیا ہے اور سلام شوق لکھا ہے" "پھر تو ضرور چلئے چچا لوث" میں نے مچل کر کہا۔ چچا لوث ابتک مسکرا رہے تھے بولے۔ "کم از کم میں تو ان کی دعوت ٹال نہیں سکتا ضرور جاؤں گا"

"اور میں بھی۔ کیوں دادی جان پیاری؟ کیونکہ میں نے سر ہارکی کے کئی خطوں کا جواب نہیں دیا۔ جانا ضروری معلوم ہوتا ہے" میں نے دادی جان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "خدا جانے تم لوگ کس طرح برداشت کر لیتے ہو" دادی زبیدہ نے حسب عادت دخل در معقولات شروع کر دی "میرا تو یہ حال ہے کہ جب تک خط کا جواب نہ لکھ لوں چین نہیں آتا۔ رات کے ایک ایک دو دو بجے تک میں خطوط کے جواب لکھوانے میں مصروف رہتی ہوں"

"میرا جی بھی بہت چاہتا ہے کہ سر ہارکی کی دعوت قبول کر لوں" بھیا منیر نے کہا۔ چچا لوث بولے "انہوں نے یہی لکھا ہے کہ وہاں کی آب و ہوا کا تم پر نہایت اچھا اثر پڑے گا۔ مزید براں جگنو بھی شادی سے پہلے تفریحاً کہیں جانا چاہتی تھی۔ اور ہاں ڈاکٹر کارٹ تمہیں ساتھ لانے کی انہوں نے بہت تاکید کی ہے۔ لکھا ہے کہ کارٹ کی بذلہ سنجی کے بغیر وہاں کا لطف ادھورا رہے گا" "شکریہ" ڈاکٹر کارٹ نے کہا۔ پھر بولا "بڑا لمبا چوڑا خط معلوم ہوتا ہے جس میں اتنی ساری باتیں لکھی ہیں" میں نے کچھ سوچ کر اچانک کہا "آپ نے سر ہارکی کی دعوت کا رقعہ بھیجا یا دادی جان؟"

"لو، اور سنو! بھیجا کیوں نہیں!" دادی زبیدہ کہنے لگیں۔ "میں تو کسی کو نہیں بھولتی چہ جائیکہ سر ہارکی! میرا حافظہ تو تم لڑکیوں سے زیادہ تیز ہے۔ انہیں کیونکر مدعو نہ کرتی؟" "تو زبیدہ" چچا لوث نے فرمایا "کچھ کب تک چلتی ہو؟"

کچھ عقل و ہوش کی باتیں کیا کرو" جسونتی بولی " میں تو اپنے عقل و ہوش میں تمہیں سے نہیں ہوں، اب تم بھی اسے کھو بیٹھیں "
"کیا کہتی ہو جسونتی" میں نے بے ضبط ہو کر کہا " کسی نے تم سے کچھ کہا ہے ؟ تم نے سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کر لیتی ہو ؟ " " میں سنی سنائی باتوں پر اعتبار نہیں کرتی روتی ۔ نہ کچھ بیتی رکھتی ہوں ۔ صاف صاف کہتی ہوں کہ تمہارے چاہنے والے نے مجھ سے کہا " یہ کہہ کر جسونتی نے کتاب کھولی ۔
میں دو لمحے سوچتی رہی پھر بولی " میرے چاہنے والے نے !! یعنی ؟ اُس شخص کا نام تو جسونتی " " میرا منہ نہ کھلواؤ روتی ۔ منصور نے کہا تھا کہ عنقریب ..... " میں زیادہ نہ سن سکی غصّے سے بولی " آہ ـــــ منصور صاحب کس قدر نامعقول ہیں "
اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی مجھے آج تک یاد ہے کہ اُس شام جب میں نے ایک زرد ریشمی لباس زیب تن کیا تو بوڑھی حبشن نوتا نے حیران ہو کر کہا تھا " ایں خاتون روتی آپ کا چہرہ آپ کے لباس کی طرح زرد ہو رہا ہے ! خیر تو ہے ؟ "
" خیر کہاں کی بوڑھی لومڑی " یہ کہتے کہتے میں رو پڑی ۔ (بہ شکریہ "ساقی" دہلی فروری ۱۹۴۷ء)

ـــــــــــــــ یہ تو تحقیق سے نہیں کہا جاسکتا کہ اُردو زبان کا بیج سب سے پہلے ہندوستان کے کس حصہ میں بویا گیا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی کونپلیں پہلے پہل دکن میں پھوٹیں اور وہیں اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی مدارج طے کیے ۔

دکنی اُردو کی نمایاں خصوصیت طرزِ ادا کی سادگی اور جذبات کی صداقت ہے ۔ سادے جذبات سیدھے سادے لفظوں میں بیان کر دیے گئے ہیں ۔ خیالات کو آراستہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔ اکثر طرزِ بیان کی بے رنگی گراں معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ زبان مفہوم ادا کرنے میں قاصر رہی ہے ۔ لیکن یہ نوبت کبھی نہیں آتی کہ محض الفاظ کے الٹ پھیر پر شعر کی بنا قائم کی گئی ہو ۔ فارسی تشبیہیں اور ترکیبیں ضرور استعمال کی گئی ہیں لیکن مزاجِ زبان تبدیل نہیں ہوا ہے مقامی تہذیب اور معاشرت کا رنگ پورے طور پر جھلکتا ہے اور ہندی خد و خال صاف صاف نظر آتے ہیں ۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں پہلے دہلی اور پھر لکھنؤ نے وہ وہ باکمال پیدا کیے کہ سپہرِ اردو جگمگا اٹھا اور ان ستاروں کی روشنی کے آگے دکنی چراغ ماند پڑ گئے ۔ جس طرح پہلے شمال نے دکن سے فیض حاصل کیا تھا ۔ اسی طرح اب دکن نے شمال سے فائدہ اٹھایا ۔ لیکن جب دہلی اور لکھنؤ دونوں کی سلطنتوں کا خاتمہ ہوا تو اُردو کے اہلِ کمال کی پھر دکن ہی نے سرپرستی کی ۔ داغؔ ۔ امیرؔ ۔ سرشارؔ ۔ نظم طباطبائی ۔ شبلیؔ ۔ جلیلؔ وغیرہ نے اپنی عمر یہیں بسر کی اور حیدرآباد کی بجھی ہوئی ادبی چنگاریوں کو پھر مشتعل کر دیا ۔ خاکِ دکن نے پھر گل کھلانا شروع کیے مہاراجہ سرکشن پرشاد ۔ کیفیؔ اور امجدؔ کے سے مایہ ناز شاعر پیدا کیے اور اسی طرح حیدرآباد کی اُردو کے دورِ ثانی کی بنا ڈالی ۔

حیدرآباد کے موجودہ دور کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ اُردو کو ایک علمی زبان بنانا ہے ۔ توسیعِ زبان کی جو خدمت حیدرآباد نے کی ہے اور کسی جگہ دہلی لکھنؤ نے کی اور نہ دہلی نے ۔ یوں تو کچھ عرصہ سے حیدرآباد یہ خدمت انجام دے رہا تھا لیکن ۱۹۱۷ء سے جب سے کہ عثمانیہ یونیورسٹی کا افتتاح ہوا ہے اس کام نے ایک منظم صورت اختیار کر لی ہے اور اس دارالعلوم کے دارالترجمہ و تالیف سے جو سیکڑوں کتابیں شائع ہوئی ہیں انھوں نے زبانِ اردو کو مالا مال کر دیا ہے ۔ لیکن اس توسیعِ زبان کا ایک قابلِ غور پہلو بھی ہے ۔ ہر زبان کی ایک روح ہوتی ہے اور اگر اس روح کو مناسب قالب نہیں ملتا تو وہ مجروح ہو جاتی ہے ۔ کچھ ترجموں میں جو میری نظر سے گزرے ہیں ۔ مترجموں نے یہ نکتہ بھلا دیا ہے اور ترجمہ کرنے میں نئے نئے الفاظ و اصطلاحیں اس طرح وضع کی ہیں کہ اردو کا نازک اور لطیف جسم اُن کا بار اٹھاتا نظر نہیں آتا ۔۔
آنند نرائن ملّا (۱۹۴۷ء)

رنگ سب

اس عنوان کے تحت ہندوپاک کے معیاری ادبی رسائل سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا۔ (ادارہ)

رشید احمد صدیقی

آپ بیتی

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ میرا پسند ناپسند، رہن سہن گفتار و کردار اور فکر و نظر جسے بحیثیت مجموعی "شخصیت" کہہ سکتے ہیں، سب کی سب علی گڑھ میں ڈھلیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی سیرت کی تعمیر یا تشکیل کے لیے بہت کچھ خام مواد اپنے گھر اور اسکول سے لایا تھا لیکن اس کو تب و تاب، رنگ و آہنگ، لمس و لذت اور صورت و معنی علی گڑھ نے دیے۔

رہنے سہنے، لکھنے پڑھنے اور کھیل کود کا زمانہ اسکول میں بڑے لطف کا گزرا۔ اچھے ساتھی، ان سے اچھے استاد اور سب سے اچھے ماں باپ، بھائی بہن ــــ سب ہی تو مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان سب کی محبت نے دل میں اپنی وقعت کچھ اس طرح سے روشن کر دی تھی اور دوسروں کی عزت و خدمت کرنے کا ایسا حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ تمام عمر کسی حال میں ادنیٰ درجے کی حرکت کرنے پر طبیعت مائل نہ ہوئی البتہ ریاضی اور اس کی ذریات، الجبرا، اقلیدس اور مساحت ایسے تھے جن سے تمام عمر دوستی تو درکنار کسی شرط پر مفاہمت تک نہ ہو سکی۔ ان سب ہوں نے مجھے اور میرے دوستوں کو ایسا رسوا کیا کہ انگلیاں دور سے اٹھتی تھیں کہ [illegible] آتے ہم تین چار دوست ایک ہی بنچ پر ہر درجے میں سالہا سال بیٹھتے آئے۔ ریاضیات میں ہم سب کے حاصل کردہ نمبر جوڑ دیے جاتے جب بھی پاس مارکس تک رسائی نہ ہوتی۔ امتحانات میں ہم سب کے نمبر دوسرے مضامین میں بہت اچھے آتے تھے۔ اچھے کھلاڑی ہونے کا بھی لحاظ کیا جاتا اس لیے ترقی دے دی جاتی۔ ہم کو اس کی سخت کوفت تھی کہ دوسرے مضامین میں تو اکثر تیس چالیس فی صد تک جارحانہ [illegible] باقوں کے مقابلے میں مان لی جاتی تھیں، ریاضیات میں آخر کیا ضرر خاص کا پڑ گیا تھا کہ ایک شوشہ، ایک صفر تک کا ہیر پھیر ہماری خاطر گوارا نہیں کیا جاتا تھا۔

آخر میں نے گورنمنٹ ہائی اسکول جون پور سے پاس کیا۔ اس عہد کے بورڈنگ ہاؤس کی زندگی آج کل کی زندگی سے بہت مختلف تھی۔ [illegible] بورڈنگ ہاؤس کی، جہاں نہ خاص قسم کی کوئی نگرانی کی جاتی تھی نہ قواعد و ضوابط کیا [illegible] عموماً [illegible] لڑکے کا نگران ہوتا۔ یہ بڑی کڑی نگرانی تھی جس سے کسی کا مفر نہ تھا۔ [illegible]

جونیئر ہو یا سینیئر، کسی لڑکے کے دور یا قریب کے وہ رشتہ دار ہوتے جن میں سے اکثر کسی نہ کسی کام سے شہر آتے رہتے اور بورڈنگ ہاؤس میں مقیم ہوتے۔ یہ ناممکن تھا کہ کوئی طالب علم ان کا کہنا نہ مانتے یا ان کی موجودگی میں اس سے کسی قسم کی لاپروائی یا بے راہ روی سرزد ہو جائے۔

جون پور تاریخی شہر ہے۔ وہاں شاہانِ شرقی کے آثار اب تک موجود ہیں۔ دریائے گومتی وسط شہر سے گذرتا ہے جس پر شاہی زمانے کا بڑا مضبوط پل ہے۔ پل کے ایک سرے پر پبلک لائبریری کی دو منزلہ عمارت ہے۔ اس لائبریری میں شہر کے ثقات و اشراف اتنا کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں آتے جتنا شام کو مل بیٹھنے کے لیے جمع ہوتے، شعر و ادب کی باتیں کرتے اور بیٹھے بیٹھے شہر، قلعہ اور دریا کی سیر کرتے اور کبھی کسی دور و نزدیک بکھری ہوئی مسمار عمارتوں اور کھنڈروں کی یاد میں تھوڑی دیر کے لیے گم ہو جاتے۔

میری طالب علمی کے زمانے میں سربرآوردہ شریف شیعہ خاندانوں کی تعداد جون پور اور مضافات میں کافی تھی۔ اسکول کے ساتھی زیادہ تر ان ہی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اکثر ان کے گھروں پر جایا کرتا۔ گھر کے بزرگ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ کبھی اپنے خاندان یا باہر کے شعراء کا منتخب کلام یا خاندانی بیاض سے مرثیے اور سوز اس خوبی سے سناتے کہ جی خوش ہو جاتا۔ ان کا اندازِ شعر خوانی اور شعر کی خوبیوں کی توضیح اتنی مکمل اور دل نشین ہوتی کہ آج اچھے اچھے فن کاروں اور معلموں میں نظر نہیں آتی۔ شعر و ادب کا جتنا چرچا میں نے ان خاندانوں میں دیکھا کہیں اور نظر نہ آیا۔

طالب علمی کے زمانے میں میرا دل پسند مشغلہ بالخصوص برسات کے موسم میں جب میدان میں کوئی کھیل کھیلا نہ جا سکتا، اس کتب خانے میں جو دوسری منزل پر واقع تھا، کھڑکی سے متصل آرام کرسی پر دراز ہو کر اردو و انگریزی افسانوں اور ناولوں کا مطالعہ تھا۔ یہاں سے دریا کی طغیانی نظر آتی تھی۔ اس عمر، زمانے، ماحول و معاشرت میں اس مقام پر طرح طرح کے افسانے اور ناول پڑھنے میں جو لطف آیا وہ پھر کبھی نصیب نہ ہوا۔ کبھی ایسے معلوم ہوتا جیسے ان افسانوں اور ناولوں کا میں ہی مصنف تھا۔ میں ہی ماحول اور میں ہی ہیرو! لائبریری سے باہر نکلوں گا تو میرے احترام میں پل کے نیچے بہتا ہوا پانی، پل کے اوپر چلتی ہوئی مخلوق اور فضا کا نمناک رستخیز رک جائے گا۔

مجھے ہر طرح کی چیزیں پڑھنے میں لطف آتا تھا البتہ اس زمانے میں بھی جب مجھے اردو سے کہیں کم انگریزی آتی تھی میں زبان و ادب کے اعتبار سے انگریزی کو اردو سے اونچا درجہ دیتا تھا۔ انگریزی کتاب پڑھتا تو کچھ ایسا محسوس کرتا جیسے مصنف جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے اور میرا بہی خواہ ہے۔ اردو کتابوں کی عبارت کا اکثر یہ اثر ہوتا جیسے مصنف کا مقصد اپنا کرتب دکھانا ہے مجھے کوئی فائدہ پہنچانا نہ ہو۔ یہ باتیں اور اسی طرح کی باتیں وضاحت سے نہیں بلکہ گڈ مڈ ہو کر ذہن میں آتیں۔ انگریزوں سے میرا کچھ ایسا سروکار کبھی نہیں رہا لیکن انگریزی زبان و ادب سے اب بھی بہرہ مند ہوتا ہوں۔

جنگِ طرابلس کا زمانہ تھا۔ دسویں، پندرھویں اقبال کا ترانہ پڑھتا ہوا شہر سے جلوس گزرتا، شریفانہ اور پر وقار جلوس نہ پولیس کا انتظام، نہ ایسا کوئی اژدہام، ہزار پانسو آدمیوں کا مجمع ہوتا۔ تخمیناً ایک میل کا فاصلہ آہستہ آہستہ طے کرتا اور پھر منتشر ہو جاتا۔ اقبال سے غائبانہ شغف مجھے اس جلوس اور ترانے سے ہوا۔ اگر یہ بھی یاد آتا ہے کہ جون پور کی پبلک لائبریری کے برآمدے میں ایک شام اقبال کی نظم سے خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا

ایک صاحب نے بڑے پُر اثر لہجے و انداز سے سنائی تھی۔ محفل پر دیر تک سکوت طاری رہا۔ بعض حضرات آبدیدہ بھی ہو گئے تھے اور "رہے نام اللہ کا" کہتے ہوئے یکے بعد دیگرے اٹھ کھڑے ہوئے اور محفل خاموشی برہم ہو گئی۔

میری ایک عادت ہے کہ اردو کا چھپا ہوا کاغذ کیسا ہی کٹا پھٹا، گرا پڑا کیوں نہ ہو میں اسے اٹھا کر ایک نظر دیکھ لوں گا۔ اس میں نہ دیر لگتی ہے نہ زحمت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ میں اُردو کی چھپی ہوئی تحریر اکثر ترتیب سے فقرہ فقرہ یا جملہ جملہ نہیں پڑھتا بلکہ سطروں اکثر صفحوں میں پڑھتا ہوں جیسے کوئی تحریر نہ پڑھی جا رہی ہو بلکہ تصویر دیکھی جا رہی ہو۔ ان متفرق تحریروں میں مجھے کوئی نہ کوئی انوکھی، دلچسپ یا بے تکی بات ضرور مل جاتی ہے۔ اُردو میں لکھنے کے اتنے انداز، اتنے فقرے، ترکیبیں، لب و لہجے اور پینترے ہیں کہ کسی نہ کسی سے کہیں نہ کہیں محفوظ یا منغض ہونا لازمی ہے۔ موضوع سیاست، تہمیت، انقلاب، امراض، ادویات، عورت یا عقبیٰ جو کچھ ہو کوئی نہ کوئی فقرہ گفتنی یا ناگفتنی ضرور مل جائے گا۔

اسکول کے زمانے میں تھوڑی بہت نثر لکھ لیتا تھا۔ ایسی نثر جو اس زمانے کے معمولی اخبارات اور رسائل میں جگہ پاتی تھی۔ یہاں میں شاہ نذیر غازی پوری مرحوم کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ان کی شخصیت، قابلیت اور اسلوب تحریر کا مجھ پر اثر ہوا ہے۔ شاہ صاحب بڑے شریف، اونچے اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ نواب عبدالمجید صاحب رئیس اعظم جون پور کے داماد تھے۔ سرخ و سپید رنگت، بلند قامت، متناسب الاعضاء، خوبرو، خوش گفتار، نگاہ نیچی رکھتے تھے۔ گفتگو میں جوں جوں گرمی آتی آنکھیں مسحور کن انداز سے کھلنے بند ہونے لگتیں جیسے والہانہ کیفیت طاری ہو۔ بڑی ستھری اور شائستہ زبان میں ترشے ہوئے فقرے، جذبات کی تھوڑی سی برہمی اور لب و لہجہ کی سنجیدگی سے مل کر ادا ہونے لگتے جیسے کسی پہاڑی جھرنے سے پانی گر رہا ہو اور کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے سے آواز کے تسلسل و ترنم میں فرق آ جاتا ہو۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں اس کا تذکرہ بھی کر دوں کہ ہائی اسکول سے پہلے کی میری تعلیم کیا اور کیسی تھی۔ جیسا کہ اس زمانے کے بیشتر مسلمان گھرانوں کا دستور تھا میں نے بھی قاعدہ بغدادی، کلام پاک اور تختی لکھنے کی تعلیم اپنے گھر پر اس عہد سے بھی پرانے ایک مولوی صاحب سے پائی۔ اسی طرح کے ایک دوسرے مولوی صاحب نے کچھ دنوں بعد فارسی کی کچھ کتابیں فارسی سے بھی مشکل اور زبان و بیان کے اعتبار سے مضحکہ خیز اُردو میں پڑھائیں۔ اسی دوران میں ایک مولوی صاحب سے چند رسالے عربی کے بھی پڑھے۔ قاعدہ کچھ اس طرح سا بن گیا تھا کہ جس طرح کے مولوی ہوں اسی طرح کی پڑھائی ہو۔ یعنی مولوی صاحب قرآن پڑھا سکتے ہوں تو قرآن شریف پڑھائیں۔ فارسی جانتے ہوں تو فارسی، عربی جانتے ہوں تو عربی، صرف میلے مسائل سکھانے بتانے پر اکتفا کرتے ہوں تو وہی سہی۔ مقصد غالباً یہ تھا کہ مولوی صاحب کی پرورش ہو، گھر والوں کو ثواب ملے اور طالب علم اتنی دیر گھر اور محلے والوں کی عافیت میں خلل انداز نہ ہو۔

ان مضامین اور اس طرح کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اُردو، پہاڑے، حساب وغیرہ سیکھنے کے لیے دیہات سے پرائمری سے پرائمری اسکول میں جانا پڑتا تھا جس پر پرائمری سے زیادہ پرمشو ہونے کا اطلاق ہوتا تھا۔ اس بات پر اکثر ہنسی آتی ہے کہ جو زبان تمام عمر کے لیے وجہ معاش قرار پائی یعنی اُردو، میں نے اسکول میں کسی ایسے ماسٹر سے جو اُردو میں غالباً صرف اپنے دستخط کر سکتے تھے اور جو اتنے ہی کٹر برہمن تھے جتنے شریف النفس اور دردمند انسان۔ کوئی کلاس سامنے ہو وہ

پڑھتے تھے بڑے زور زور سے صرف رامائن۔ وہ شاید ہندی سے بھی کچھ زیادہ لطف نہ رکھتے تھے اس لیے کہ میں نے ان کو کسی طالب علم کے قلم، پنسل، کاپی، تختی کو چھوتے نہ دیکھا۔ ان پر جو کچھ لکھا یا بتا ہوتا دور سے دیکھ کر صحیح قرار دے دیتے۔ نہ خود کبھی سبق دیتے نہ سنتے۔ صرف رامائن سناتے۔ نہ کسی ہندو لڑکے کا لایا ہوا پانی پیتے، نہ کسی شخص یا شے کو ہاتھ لگاتے، دور سے ترس کھاتے، مسکراتے اور شفقت کرتے نظر آتے۔

بچپن میں میری صحت خراب رہتی تھی چنانچہ والدین کو جہاں کسی "تیر بہدف" قسم کے طبیب، وید، ڈاکٹر، سیانے، فقیر، جوگی، بوڑھیاں، ملا یا مزار کی خبر ملی مجھے وہاں پہنچایا گیا اور علاج یا جھاڑ پھونک شروع کر دی گئی۔ کم لوگوں نے طرح طرح کی اتنی دوائیں کھائی ہوں گی، لیپ لگائے ہوں گے، تعویذ باندھے ہوں گے، چڑھاوے چڑھائے ہوں گے، نقش گھول کر پیئے ہوں گے، مزارات پر حاضری دی ہوگی جتنی میں نے۔ آسیب سے نجات پانے کے لیے انار کے درختوں میں کسی کے لیے اتنے نقوشِ سلیمانی نہیں ٹھونکے گئے ہوں گے جتنے میرے لیے۔

ہائی اسکول کو الوداع کہنے کے بعد عدالت دیوانی میں عارضی کلرکی ملی۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کے دفتر میں کلرک ہونا بھی بڑی بات تھی۔ کلرکی کرتا رہا اور کبھی کبھی ڈبل روٹی بھی کھا لیتا۔ لیکن خوشی سے پھول نہ سکا۔ کس طرح سالہا سال کلرکی کی اور علی گڑھ کا طالب علم بھی رہا۔ کلرکی کے چکر میں کہاں کہاں گیا، کیا دیکھا، کیا گزری اور اس کا اثر مجھ پر اور میری تحریر پر کیا پڑا؟ بڑی طویل داستان ہے اور دلچسپ بھی لیکن اس کو چھیڑے کون؟ اس لیے کہ پھر اس کا سمیٹنا بہت مشکل ہوگا۔ تمام زندگی میں یہی ایک موقع ایسا آیا تھا جب میں نے کلرکی کے نقد کو طالب علمی کے ادھار پر ترجیح دی اور میرا عشق بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑا۔

پڑھنے کو کالج میں داخلہ ملا اور رہنے کو کچی بارک میں جگہ ملی۔ اس زمانے میں جون میں داخلہ ہو جاتا۔ تعطیل کلاں برسات میں ہوتی اور کالج وسط اکتوبر میں کھلتا۔ نئے پرانے طلبا کے ملنے پر جتنی تفریحیں ہونے والی ہوتیں وہ جون سے وسط جولائی تک ختم ہو جاتیں۔ یہ فطرت اور اربابِ کالج کی ستم ظریفی تھی یا سازش کہ داخلے اسی زمانے میں ہوتے تھے اور ہر نیا لڑکا آگ اور پانی کی آزمائش سے گزر کر ہمیشہ کے لیے موسم آزمودہ اور سرد و گرم چشیدہ ہو جاتا۔

کچی بارک (سید محمود کورٹ) کیا چیز تھی؟ کوئی عمارت، عبادت تھی، علامت یا حادثہ، یہ سب تھی۔ ان کے علاوہ کچھ اور بھی۔ ایسی زار و زبوں عمارت اس وقت کالج کے رقبہ میں کہیں اور نظر نہ آتی تھی۔ معلوم نہیں کب کی بنی ہوئی کھپریل کی چھت، مٹی کی دیوار و در، انتہائی درجہ نیچا، بوڑھا، بوسیدہ برآمدہ جس کی کڑیاں جگہ جگہ سے گل بھی گئی تھیں اور گھن کھا بھی رہی تھیں جن میں لکڑی کے آڑے ترچھے طرح طرح کے پیوند لگائے گئے تھے۔ جون کی گرمی اور آندھی میں ایسا معلوم ہوتا جیسے پوری بارک خیالی گرد و غبار دھول اور دھند میں جھول رہی ہو، کانپتی، کوستی، کراہتی، کھانستی!

میں نے کچی بارک پر "گم منزل" کے عنوان سے کئی نمبروں میں اس زمانے کے کالج میگزین (علی گڑھ منتھلی) میں مضامین لکھے تھے۔ طنز و ظرافت کے انداز میں لکھنے کی یہ میری سب سے پہلی کوشش تھی۔ اسی طرح کے چند مضامین کچھ عرصہ بعد "سیاحت پرما" کے عنوان سے لکھے جو "میگزین" میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ یہ اس سفر کے تجربات یا تاثرات تھے جو ڈیوٹی ڈیپوٹیشن کے سلسلے میں ملا، چاٹگام، ایمبو کے دورے میں پیش آئے تھے۔ اب سوچتا ہوں تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسی بات نے مجھ سے یہ

مضمون لکھوایا جس نے مجھے زندگی اور ادب کے اس ڈگر پر ڈال دیا وہی میری تقدیر تھی جو کچی بارک کی صورت و حتی میں مجھ پر منکشف ہوئی جو میری تحریر اور طور طریقوں میں جب، جہاں اور جس طرح چاہتی ہے جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ نہ وہ مجھ سے جدا ہوتی ہے نہ میں اسے جدا کر سکتا ہوں۔ دراصل تمام عمر کچی بارک ہی میں رہا اور اب بھی ہوں۔

ابتدا میں مجھے کالج کی ظاہری شکل پسند نہ آئی۔ قدم قدم پر ایسے لوگوں سے سابقہ پڑتا جو طرح طرح کی اُردو، طرح طرح کے تلفظ اور لہجے سے بولتے تھے۔ علی گڑھ میں ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے آئے ہوئے ساتھیوں کی اُردو سننے میں آئی تو کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے دیار کے اشخاص کے علاوہ دوسرے لوگ غیر متمدن سے تھے۔ یہ تاثرات کلیتہً احمقانہ تھے لیکن بہت دنوں بعد جب میں خاصا کم احمق رہ گیا تھا، سر اقبال مرحوم سے پہلے پہل نیاز حاصل کرنے لاہور گیا تو مرحوم کا اُردو لہجہ اور تلفظ سن کر ایک لمحہ کے لیے دم بخود ہو گیا۔ تلفظ کے ناہموار ہونے سے زبان کتنی غیر معتبر معلوم ہونے لگتی ہے۔

ایک دن مولانا (اقبال احمد خاں) سہیل سے جو ابتدا سے میرے "نگہبان فرشتہ" کی حیثیت اختیار کئے ہوئے تھے اپنے یہ وسوسے بیان کیے۔ مولانا کمرے میں کھڑے تھے، اتفاق سے کمرہ بھی مولانا ہی کا تھا۔ وہیں اکڑوں بیٹھ گئے۔ بولے "ارے بھائی اچھی اُردو ہمارے دیار کیا لکھنؤ تک میں نہیں بولی جاتی۔ ہم سب تو کتابی اُردو بولتے ہیں۔ رہا شعر و شاعری کا معاملہ تو یہ کچھ جوار پور ہی پر موقوف نہیں۔ ہر جگہ اس کی گرم بازاری ہے۔ ہندوستان کے دور افتادہ حلقوں میں اُردو کا شاعر ہونا پڑھے لکھے اور مہذب ہونے کی نشانی سمجھتے ہیں لیکن یہ لازم نہیں کہ جو شخص اُردو کا شاعر ہو وہ صحیح اور اچھی اُردو بھی بول سکتا ہے۔ اچھا دیکھو کسی دن تم کو ٹکسالی اُردو سنواؤں گا۔"

مولانا نیز ہم سب کو ڈاکر صاحب مغرب کے جدید علوم اور نظریوں سے آشنا رکھتے تھے۔ لٹن لائبریری، یونین اور معلوم نہیں اور کہاں کہاں سے نئی نئی باتیں اور نئے نئے اشعار یاد کر لاتے اور ہم سب کو سناتے۔ ان سب پر مولانا تبصرہ کرتے اور صلہ میں ہم سب کے لیے بہ طیب خاطر اور کبھی کبھی خوانچے والوں سے پھل، فیرنی یا کباب خرید دیتے۔ شعر و ادب کا صحیح و صالح ذوق پیدا کرنے، متقیانہ علمی انداز عام کرنے، نیز گفتگو اور روز مرہ کے مشاغل کے آداب میں شائستگی ملحوظ رکھنے کی مولانا نے ایک روایت قائم کر دی تھی۔

ایک دن مولانا نے مجھے ساتھ لیا۔ فرمایا "چلو تم کو دلی کی زبان سنواؤں" چنانچہ ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تک کچی پکی بارکوں کے خلط کمروں میں اعتماد کے ساتھ داخل ہوتے رہے جیسے وہ کمرے اور اس میں رہنے والے مدت سے جانے پہچانے ہوئے تھے۔ بلاآخر فضل الرحمٰن قدوائی (ذکی مرحوم) کے کمرے پر کچی بارک پہنچے۔ پوچھا۔ "آغا حیدر حسن نہیں آئے؟" مرحوم نے ملازم بھیج کر کہیں سے آغا صاحب کو بلوایا۔ موصوف دلی کے رہنے والے ہیں، علی گڑھ میں تعلیم پائی۔ اب حیدرآباد میں رہ بس گئے۔ دلی کی زبان بالخصوص بیگمات کی دلی کے کوچے، دلی والوں کی سیر و تفریح، شادی غمی، طور تہذیب، رسم و رواج، پہننے اوڑھنے، اٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی ہو۔

مولانا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بھئی آغا حیدر! ان کو دلی کی زبان سنوانے لایا ہوں" پھر تو آغا صاحب نے وہ گل افشانیٔ گفتار "ہی نہیں" انداز "گل افشانیٔ گفتار" وہ رنگ دکھایا کہ میں دنگ رہ گیا اور یہ سب اس طور پر نہیں جیسے کوئی رٹی ہوئی تقریر سنا رہا ہو بلکہ جیسے ہم آپ روز مرہ کے واقعے پر بے تکلف بات چیت کر رہے ہوں۔ یا جیسے ریشم پر موتی غلطاں ہوں۔

کچھ دنوں بعد سید آلِ عبا قادری مارہروی سے ملاقات ہوئی۔ یہ کالج میں مجھ سے دو سال سینئر تھے۔ طلاقتِ لسانی اور علم مجلسی میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ بڑے سے بڑوں کی کو ردیتی تھی۔ لکھنؤ کے ہر طبقے کی زبان پر اتنا عبور تھا کہ خود حضرات لکھنؤ ان کے اس کمال کے معترف تھے۔ سید صاحب کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ جن صاحبوں کو مطالعے کا اتفاق ہوا ہے وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ آغا صاحب اور سید صاحب نے اس زمانے کے دہلی اور لکھنؤ کے ماحول و معاشرت کی کیسی دل کش عکاسی کی ہے۔ آغا صاحب کے مضامین "بے پر کی" کے عنوان سے آج سے تقریباً ۳۵، ۳۶ سال قبل میں نے علی گڑھ میگزین کی طرف سے شائع کئے جو بہت پسند کئے گئے تھے۔

انٹرمیڈیٹ میں میرے مضامین قدیم روم و یونان کی تاریخ اور وہاں کے جغرافیہ تھے جن کے لکچرر قاضی جلال الدین صاحب مراد آبادی تھے۔ موصوف ایک زمانے تک علی گڑھ منتھلی کے اُردو سیکشن کے ایڈیٹر اور نگراں بھی رہے۔ بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ اشاعت میں آگیا تو مدتوں ساتھ کام کرنے کی بھی عزت و امتیاز حاصل رہا۔ بڑے ذہین، ظرف، زندہ دل اور کنبہ پرور تھے۔ مایوس و ملول نہ دیکھے گئے نہ کسی اور کو محفل میں مایوس و ملول رہنے دیتے۔ خوب سوجھتی تھی۔ اس طرح کی طباعی نے ان کی ذہانت کو ایک تفریحی یا فلسفیانہ مشغلے کی طرف پھیر دیا۔ الفاظ کی الٹ پھیر اور ان سے معنی اخذ کرنے کے ایسے ایسے نئے اصول گھڑے یا پرانوں کو زیر و زبر کیا کہ بعضوں نے ان کے ہاتھ چومے اور بقیہ نے اپنے سر پکڑ لیے۔ اس مہم میں راقم السطور ان کا دستِ راست تھا اور جہاں کہیں ایسے الفاظ کے لیے اصول وضع کرنے یا معنی پہنانے کی ضرورت ہوتی جو کسی طرح قابو میں نہ آتے تو مجھ سے مشورہ کرتے اور میں توجہ و تلبیس کے ایسے نوادر پیش کرتا کہ اپنے وقت کا بڑے سے بڑا علامہ بھی اعتراض یا مذہب کی نہیں کر سکتا تھا۔ میرے مشورے سے ایسے الفاظ کے لیے ایک نیا کھاتہ کھول دیا گیا تھا جس کا نام "گھپلا کھاتہ" تھا۔ میرا کہنا یہ تھا کہ بالآخر اس ڈکشنری کا نام رکھنے کا مرحلہ پیش آئے گا۔ اس وقت تک کوئی موزوں تر نام دستیاب نہ ہو سکا تو لغت ہی کا نام "گھپلا کوش" یا "گڑ ھپ کوش" رکھ دیا جائے گا۔ ہندی میں شاید فرہنگ یا لغت کو کوش ہی کہتے ہیں۔ فارسی میں بھی آیا ہے "در عمل کوش ہرچہ خواہی پوش"۔ چنانچہ اس کھاتے میں وہ تمام الفاظ درج کر دئے جاتے جن کی تعبیر و توجیہ پر نہ قاضی صاحب کا ضمیر مطمئن ہوتا نہ مجھے اپنی بخشائش کی امید باقی رہ جاتی۔ ایک خیال یہ ضرور تھا کہ ممکن ہے امتدادِ زمانہ سے دونوں ہموار ہو جائیں۔

مشاعرے کی علی گڑھ میں بڑی اہمیت رہی ہے۔ محض شعر و سخن کے اعتبار سے نہیں بلکہ ایک تہذیبی روایت کے اعتبار سے بھی۔ اب سے چند سال پہلے تک شعر و ادب کی سرپرستی تمام تر والیانِ ملک اور اکابر و امرا کی ذات اور ان کی ریاست سے وابستہ تھی۔ علی گڑھ شعرا کی ان معنوں میں تو کفالت نہ کر سکتا تھا لیکن ان کی قدر و منزلت میں بیش از بیش حصہ لیتا رہا اور اس اعتبار سے شعر و سخن کی ترقی میں علی گڑھ کا بڑا قیمتی حصہ رہا ہے جس کی نظیر شاید کسی دوسری درسگاہ میں مل سکے۔ کسی شاعر کے کلام کو علی گڑھ میں تحسین قبول حاصل ہو جاتا تو اس کے اچھے اور مستند شاعر ہونے کی حیثیت مسلم ہو جاتی۔

سب سے دلچسپ پوزیشن ڈائننگ ہال کی تھی۔ یہاں کے کھانے کی جو شکایت میرے زمانے میں تھی اس سے پہلے بھی وہی تھی اور آج بھی وہی ہے۔ شکایات کے اعتبار سے ایسا سدا بہار ادارہ شاید ہی کہیں اور ہو۔ طنز و ظرافت کی میری ابتدائی مشق یونین، بارک اور ڈائننگ ہال ہی سے شروع ہوئی۔

کالج کے عہد میں ڈیوٹی سوسائٹی یا انجمن الفرض کا شمار طلباء کے بڑے قابل قدر اداروں میں ہوتا تھا۔ اب بھی کچھ کم نہیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی) نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسے قائم کیا تھا۔ اس کے دو مقاصد بہت اہم تھے۔ ایک نادار لیکن ہونہار طلباء کے لیے مالی امداد فراہم کرنا، دوسرے کالج کے بارے میں قوم اور ملک میں جو غلط فہمی پھیلی ہو اس کو دور کرنا۔ اس طور پر انجمن کا کام سرسید کے مقاصد کو آگے بڑھانا تھا۔ جب سے آج تک انجمن وہ فرائض یکساں تندہی سے بجا لا رہی ہے۔ ہر سال تعطیل میں طلباء ملک کے مختلف دور و نزدیک حصوں میں وفد لے کر جاتے ہیں اور جو کچھ جمع ہوتا ہے اسے انجمن کے فنڈ میں داخل کرتے ہیں۔

سوسائٹی سے دیرینہ تعلق کے لوازم میں ایک بات یہ بھی رہی ہے کہ مجھے طرح طرح کے مواقع اور مباحث پر کثرت سے خطوط اور مضامین لکھنے پڑے ہیں۔ ایسے خطوط لکھنے میں جس تحمل و توازن، خیراندیشی، خوش مذاقی اور کبھی کبھی گلہ مندی یا آزردگی کا اظہار کرنا پڑتا وہ میرے طور طریقوں نیز میرے سلیقۂ تحریر کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ان کے علاوہ کالج کے عہد سے آج تک طرح طرح کے مباحث پر جتنے مضامین، خطبے، پمفلٹ اپنے یا دوسروں کے لیے لکھنے پڑے میرا خیال ہے طالب علمی کے عہد میں علی گڑھ میں شاید ہی کسی اور کو لکھنے پڑے ہوں۔

کالج کے عہد میں کرزن ہسپتال اور یونانی مطب میں طالب علموں کے علاج کا انتظام رہتا تھا۔ ہسپتال کی وہی عمارت تھی جو آج ہے۔ حکیم صاحب کا مطب مارسین روڈ پر اس جگہ تھا جہاں اب ایک مختصر سی دو منزلہ عمارت ہے جس میں کم و بیش پندرہ سولہ سال راقم السطور مقیم رہا۔ اس زمانے میں دوا تجویز کرنے میں جتنی توجہ صرف کی جاتی اتنی مرض تشخیص کرنے میں نہیں۔ میری یہ عادت شاید اسی زمانے کی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے تصرف کو بھی بڑا دخل ہے کہ یونانی علاج میں اس پر اصرار کروں گا کہ طبیب جو مرض چاہے تجویز کر لے، دوا میں اپنی تجویز کردہ استعمال کروں گا۔ اس کے بہت سے فوائد ہیں۔ ایک یہ کہ طبیب کو مرض تشخیص کرنے اور دوا تجویز کرنے میں جتنی زحمت اٹھانی پڑتی ہے وہ مریض اور معالج میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس طریقے سے ایسے امراض کا بھی علاج یا انکشاف ہو جاتا ہے جس کی نہ مریض کو خبر تھی نہ معالج کو۔ تیسرے یہ کہ اس حادثے کی بھی تصدیق ہو جاتی تھی کہ میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا۔

ہسپتال میں "بڑے ڈاکٹر صاحب" سے ہم لوگوں کا زیادہ سابقہ نہیں رہتا تھا۔ ہمارا کھاتہ ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر شفاعت اللہ صاحب سے کھلا ہوا تھا جن کو محض بربنائے قافیہ یا حلیہ تمام کالج ہلاکت اللہ کہتا تھا۔ پستہ قد، سن رسیدہ، کاٹھی مضبوط، آنکھیں تیز اور بھوری، داڑھی چڑھی ہوئی اور خضاب سے لیس، آواز مخدوش، ہاتھ میں رعشہ، نسخہ لکھتے تو انگشتِ شہادت اچھلتی رہتی۔ اس زمانے میں کوئی طالب علم دوا کے لیے ہسپتال جاتا تو دو چار دوست ادھر ادھر سے ساتھ ہو جاتے۔ ایک دفعہ میں بھی اسی طرح کی مہم میں ہمرکاب تھا۔ ساتھیوں میں سے ایک نے کہا۔ "قربان جایئے اس کمال پر، ڈاکٹر صاحب لکھتے بھی جا رہے ہیں اور ٹائپ بھی کرتے جاتے ہیں۔"

گزشتہ اوراق میں جن اصحاب یا اداروں کے بارے میں عرض کیا گیا ہے ان کے علاوہ کتنے اور ممتاز و منفرد کردار ذکر ہونے سے رہ گئے جو ذہن کے دھندلے افق پر بار بار اور بے اختیار ابھرتے ہیں لیکن ان صفحات میں ان سب کا ذکر میرے لیے بڑا مشکل ہے ——————

(تلخیص: نقوش لاہور ۱۹۶۳ء سے)

ایک نئے دَور کی دہلیز پر

نصف صدی کے موڑ پر نمودار ہونے والا منصوبہ بندی کا دور آندھرا پردیش کی تاریخ میں ایک روشن باب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یہ دور شاندار کارناموں اور بے مثال کامیابیوں سے معمور ہے ۔ زراعت ۔ آبپاشی ۔ برقی اور سماجی خدمات کے کلیدی شعبوں پر اس دور میں زبردست اور مفید اثرات مرتب ہوئے ہیں جن کی بدولت ہماری معیشت کی بنیادوں کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی ہے اور ریاست کی ترقیاتی سرگرمیاں نئی اور برتر بلندیوں تک پہنچ گئی ہیں ۔

آندھرا پردیش میں منصوبوں کے جو اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ کافی نمایاں اور روشن ہیں ۔ منصوبہ جاتی اخراجات کے بڑھتے ہوئے رجحان پر اگر ایک نظر ثانی ڈالی جائے تو ہم کو ان اثرات کا اندازہ ہوجائے گا ۔ یہ اخراجات جو پہلے منصوبے کی مدت میں ، ۹ کروڑ روپیے تھے بتدریج بڑھ کر چوتھے منصوبے کے دوران میں ۴۲۷ کروڑ روپے ہوگئے ۔ تمام منصوبوں میں زراعت ۔ آبپاشی اور برقی کے شعبوں کو اولین فوقیت حاصل رہی ۔

پہلے منصوبے کے پہلے سال یعنی ۵۲ ۔ ۱۹۵۱ء سے چوتھے منصوبے کے تیسرے سال یعنی ۷۲ ۔ ۱۹۷۱ء تک آندھرا پردیش میں کی جانے والی کوششوں کی یہ خصوصیت رہی کہ زراعت کو ترقی دینے اور سماجی و معاشی حالات کو بہتر بنانے کی حکمت عملی کو روبہ عمل لایا جائے اور بحیثیت مجموعی اقتصادی حالات کو سدھارنے کی خاطر آبپاشی اور برقی کے فروغ کے لئے بھاری مقدار میں سرمایہ مصروف کیا جائے ۔

آج آندھرا پردیش میں منصوبہ بندی ایک نئے اور حوصلہ افزا مرحلے میں داخل ہوگئی ہے ۔ ۷۶ ۔ ۱۹۷۵ء کے سالانہ منصوبے کے لئے مقررہ رقم ۱۵۴ کروڑ روپے کو نظر ثانی کے بعد بڑھاکر ۱۹۰ کروڑ روپے کردیا گیا ہے ۔ یہ رقم ۷۴ ۔ ۱۹۷۳ء کے اخراجات سے دوگنی اور ۷۵ ۔ ۱۹۷۴ء کے اخراجات سے ۲۸ فیصد زیادہ ہے ۔

گزشتہ دو برسوں میں منصوبہ جاتی خرچ میں جو اضافہ ہوا ہے وہ شاید ریاست کی تاریخ میں کثیر ترین ہے ۔ اضافہ شدہ اخراجات کی پابجائی ریاستی وسائل ہی سے کرنا تجویز پایا ہے ۔ ۷۷ ۔ ۱۹۷۶ء کے سالانہ منصوبے کے خرچ کو بڑھاکر ۲۰۰ کروڑ روپے کردیا گیا ہے ریاستی منصوبے کے اخراجات میں اضافہ ریاست کی آمدنی بڑھ جانے کے باعث ممکن ہوسکا اور یہ نتیجہ ہے ۔ گذشتہ چند برسوں میں بڑھی چڑھی پیداوار اور ان کوششوں کا جو حکومت نے ریاستی منصوبے کے لئے مالیے کی فراہمی کی خاطر زائد وسائل مہیا کرنے کے سلسلے میں کی ہیں ۔ جزوی طور پر اس کی ایک وجہ نظم ونسق کا سدھار بھی ہے جس کے نتیجے میں محصولات اچھی تعداد میں وصول ہوئے ۔ غیر پیداواری خرچ میں کفایت برتی گئی اور فضول خرچی سے احتراز کیا گیا ۔

بلاشبہ آج ہماری ریاست ایک نئے دَور کی دہلیز پر کھڑی ہے

ناظم محکمہ اطلاعات وتعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش ۔ حیدرآباد ۔

نقد و نظر

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

آئینہ ابوالکلام

مرتبہ عتیق صدیقی — ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ دہلی
تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، صفحات (۲۰۸) قیمت بیس روپے

مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمہ گیر شخصیت کی کامیاب عکاسی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مولانا آزاد بیک وقت عالم، دینی رہنما، مفسر قرآن، صحافی، صاحب طرز ادیب، دل و دماغ پر چھا جانے والے شعلہ بار مقرر، پُر اثر خطیب، سیاست وقت کی روح رواں اور تحریک آزادی کے میر کارواں تھے۔ زیر تنقید کتاب میں عتیق صدیقی نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں جہاں مولانا آزاد کے ہم عصروں کے ان سے متعلق تاثرات ملتے ہیں وہیں خود مولانا آزاد کی وہ تحریریں بھی ملتی ہیں جو نہ صرف ان کی زندگی اور ان کے دور کے بے شمار پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ ان کے رفقائے کار اور صفِ مخالف کے ہم عصروں کے خد و خال کو بھی ظاہر کرتی ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد عتیق صدیقی سے مخاطب ہو کر کہنا چاہتا ہوں کہ ؎

مئے خانے کی ایک روح مجھے کھینچ کے دے دی
کیا کر دیا ساقی نگہ ہوش رُبا سے

میرے اپنے خیال میں یہ کتاب نہ صرف ہر کتب خانے میں رہنا چاہیئے بلکہ ہر اردو داں کے گھر میں بھی۔ اسی خیال کے پیش نظر انجمن ترقی اردو سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اس کتاب کا ایک سستا ایڈیشن شائع کرے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

(غلام جیلانی)

متاعِ کبیر

(شعری مجموعہ) حفیظ کبیر، صفحات (۱۴۴) اشاعت: (۱۹۶۶ء) قیمت =/۳ روپے
ناشر: بزم حفیظ کبیر کوڑنگل ضلع محبوب نگر (اے پی)

حفیظ کبیر، ضلع محبوب نگر کے تعلقہ کوڑنگل کے جواں فکر شاعر ہیں، حضرت دامودر ذکی آنجہانی کے تلامذہ میں گنے جاتے ہیں۔ شریف الطبع، ذہین اور غریب گھرانے کے محنت کش فرد ہیں۔ زندگی کا بڑا حصہ صعوبتوں اور ناآسودگیوں کی نذر ہوا۔ چند دن پہلے احباب نے ان کی شعری و شخصی خدمات کے اعتراف میں "جشن کبیر" منعقد کر کے نہ صرف سہارا دیا بلکہ ذہنی طور پر کسی حد تک کبیر کو سنبھالنے کی سعی مشکور کی۔ "متاع کبیر" کے مطالعے سے اس امر کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ کبیر نے مر مر کر اپنے فن اور اسلوب کو زندہ رکھا۔ ان کی غزلیہ شاعری کی جڑیں بقول علی احمد جلیلی "ماضی سے پیوستہ ہیں"، وہ غزل کے تمام لوازمات کو سامنے رکھ کر غزل کہتے ہیں۔ کلام میں سلاست اور سادگی کے ساتھ ساتھ حسن ادا کی نیرنگی ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

رہ رہ کے دامن میں بن جاتا ہے گوہر
جو آنسو یاد میں تیری رواں ہے

کبھی تم ہم سے بے رُخ ہو گئے تھے
زمانہ آج بھی برہم ہے ہم سے

دن گزرتے ہیں خیمے سے اپنے　　　کیا شکایت ہے زندگانی سے
اب ضرورت نہیں راہبر کی　　　جذبۂ دل مرا راہبر ہے
رات کو نیند ہے نہ دن کو چین　　　یہ نتیجہ ہے دل لگانے کا

"متاعِ کبیر" میں نعتیہ شاعری کا قابلِ قدر حصہ بھی شامل ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غمِ زمانہ کی ہر تشنگی کو کبیر جامِ تصوف کی رندی سے بجھا لیتے ہیں ؎

کبیر ہے مئے حُبِ نبی سے دل سرشار　　　غرض نہیں ہے مجھے اب شرابِ فانی کی

عبارت مختصر: حفیظ کبیر کا یہ مجموعہ غزلیہ شاعری کی روایتی اقدار کا تصویر خانہ ہوتے ہوئے بھی شرافتِ فکر کا دلآویز البم بھی ہے۔ عصری حسیت اور اندازِ نو سے شاعر کو چشم پوشی نہ کرنی چاہیئے۔ زندگی کے تقاضوں، جد وجہد اور صعوبتوں اور روشن مستقبل کے امکانات کو موضوعِ سخن بنانے کی ضرورت کا احساس شاعر کو ہونا چاہیئے اور بس۔

(وقار خلیل)

دشتِ تمنّا (شعری مجموعہ)　"زبیدہ تحسین" قیمت ۳ روپے صفحات (۹۴) مجلّد
ناشر: محفل خواتین حیدرآباد۔

"دشتِ تمنّا" محترمہ زبیدہ تحسین کی شاعری کا اولین مجموعہ ہے۔ زبیدہ تحسین تقریباً دس برس زیادہ سے شعر کہہ رہی ہیں ان کی شاعری ان کی زندگی ہی کے نشیب و فراز کا آئینہ ہے بقول عظمت عبدالقیوم "زندگی کے نشیب و فراز سے انھیں گہری دلچسپی رہی ہے۔ جہاں اُنھوں نے خوشیوں کو ٹوٹ کر گلے لگایا ہے وہیں غموں سے بھی آنکھیں ملائی ہیں زیرِ نظر مجموعہ منظومات، غزلیات پر مبنی ہے جس میں تحسینہ کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔" زندگی جہدِ مسلسل ہی ہے یہاں زبیدہ کے تصوری کاوش کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سالہا سال سے کچلے ہوئے معصوم عوام
ڈال ہی دیں گے ستاروں پہ کمند
بسترِ مرگ سے اٹھ اٹھ کے لہو روتے کہاں
آج دھرتی کے ہر اک گوشے میں
پرچمِ امن و محبت کو وہ لہرا دیں گے۔

وہ مساوات کی حامی اور پستی اور بلندی کے فرق سے انحراف کرتی ہیں چنانچہ ایک جگہ کہتی ہیں ؎

پستی و بلندی کا فرق کیوں نہیں مٹتا　　　اک حدِ فاصل سی اپنے درمیاں کیوں ہے۔

اضطرابِ دل سے گھبرا کر سکونِ دل کی تلاش کرتی ہیں اور پھر گھبرا جاتی ہیں ؎

اضطرابِ دل میں بھی مجھ کو سکوں ملتا نہیں　　　اور سکونِ دل سے بھی جیسے کہ گھبراتی ہوں میں

الغرض "دشتِ تمنّا" محترمہ زبیدہ تحسین کی ایک اچھی کاوش ہے جسے خوبصورت طریقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔

(انیس قیوم فیاض)

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ: علمی ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

۲۔جنوری: اُردو سوسائٹی کا اجلاس مصلح الدین سعدی کی صدارت میں منعقد ہوا' ادب کے عصری رجحانات پر رحمٰن جامی' مضطر مجاز' تاثیر صدیقی اور حامد مجاز نے مباحثہ میں حصہ لیا' آخر میں چند شعراء نے اپنا کلام سنایا۔

● جناب آصف پاشا صدر ریاستی اُردو اکیڈمی (ریاستی وزیر قانون) نے ایلورو' آندھرا پردیش میں طالب علموں کے ایک بڑے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اردو کو جو ملک میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے' دوسری قومی زبان بنانا چاہیئے۔

۳۔جنوری: ندوۃ اُردو ٹرسٹ لائبریری میں بصدارت پروفیسر عالم خوندمیری' ڈاکٹر وحید اختر (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے "جمالیاتی تجزیہ کی زبان' شعری صداقت اور اُردو تنقید" کے موضوع پر لکچر دیا۔

۶۔جنوری: کل ہند صنعتی نمائش میں اُردو اکیڈمی کے بُک اسٹال پر صدر اکیڈمی جناب آصف پاشا (ریاستی وزیر قانون) نے مخدوم کے شعری مجموعہ "بساطِ رقص" کو خرید کر اسٹال سے کتابوں کی باضابطہ فروختگی کا آغاز کیا۔ اس موقع پر اکیڈمی کے اراکین اور صدر مجلس انتظامی جناب عابد علی خاں کے علاوہ مصنفین اور ادیبوں کی خاصی تعداد بُک ڈپو پر موجود تھی۔ نوجوان شاعر برق یوسفی کو نمائش کے بُک ڈپو کے شعبۂ فروخت کا انچارج مقرر کیا گیا ہے۔

۸۔جنوری: حکیم محمد غلام قادر سالک کا (۷۰) سال کی عمر میں انتقال ہو گیا' سالک' دبستان صفی اورنگ آبادی کے سخنور تھے' ۱۹۷۶ء میں شعری خدمات کے اعتراف میں مختلف شعری انجمنوں اور احباب کی طرف سے "جشنِ سالک" منایا گیا تھا۔ مرحوم کے کلام کا انتخاب شائع ہو چکا ہے۔

۹۔جنوری: اقبال اکیڈمی کی طرف سے محفلِ اقبال میں مسرز محمد منظور احمد' عابد صدیقی اور صدر جلسہ محمد ظہیر الدین احمد نے اقبالیات کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کیا۔ کریم رضا معتمد اکیڈمی نے شکریہ ادا کیا۔

۱۳۔جنوری: مرکزی محکمۂ اطلاعات و نشریات کے شعبہ ڈسٹرکٹ فیلڈ پبلسٹی کی طرف سے گاندھی صدی ہال میں "ملک کی ترقی میں عوام کا حصہ" کے موضوع پر مقصدی محفل شعر جناب میر اکبر علی خان سابق گورنر یوپی و اڑیسہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ میر مشاعرہ نے ابتداً تقریر میں بتایا کہ "اردو شعراء نے تحریک آزادی سے لے کر ہر ایسے وقت جبکہ ملک کو خطرات درپیش رہے ہوں' اپنے جذبات حب الوطنی اور نغمات قومی سے حوصلوں کو گرمایا اور ترقی کی نئی نئی راہوں کو روشن کرنے میں قابل قدر حصہ لیا ہے۔ اس مشاعرہ میں امیر احمد خسرو' کنول پرشاد کنول' شاذ تمکنت صلاح الدین نیر' فیض الحسن خیال' رئیس اختر' علی الدین نوید' جوہر ہاشمی' عزیز النسا صبا اور وقار خلیل نے نظمیں سنا کر داد حاصل کی۔ جناب صلاح الدین نیر معتمد مشاعرہ

۱۵۔جنوری: محفل خواتین کا ادبی اجلاس و مشاعرہ محترمہ لکشمی دیوی کارراج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انوار فاطمہ نے فانی کا تصورِ غم پر مضمون اور قمر جمالی نے کہانی سنائی۔ عظمت عبدالقیوم' بانو طاہرہ سعید' زبیدہ تحسین' نسیم نیازی اور ڈاکٹر امدو وششت نے کلام سنایا۔

● مرکز ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس و مشاعرہ مولانا سلطان محی الدین سیف حموی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عبدالکریم ماہر نے "ارمان قریشی کی شاعری" پر مضمون سنایا محفل شعر میں کئی شعراء نے کلام سنایا۔

۱۶۔جنوری: انجمن اقلیم ادب کا ادبی اجلاس ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر یوسف کمال نے "گفتگو کا فن" کے موضوع لکچر دیا۔ جناب امام ارشد کی شخصیت اور شاعری پر جناب

مصلح الدین سعدی نے انٹرویو لیا۔ مضطر مجاز کی ایک نظم پر جمیلہ شیدائی، صادق نوید اور رحمت یوسف زئی نے تجزیاتی مطالعہ کیا۔ آخر میں چند شاعروں نے نیا کلام بھی سنایا۔

ڈاکٹر عالم خوندمیری، ادب کی تعمیری محفلوں اور اخانو نقد و نظر کی ستائش کی ابتدا میں مولانا عبدالماجد دریا بادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی وفیات پر جناب رحمٰن جامی نے قرار قرارداد تعزیت پیش کی جسے دو منٹ کی خاموشی کے بعد منظور کر لیا گیا۔

● اسلامی مفکر علامہ جمال الدین افغانی کی یاد میں ایک علمی محفل ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد ہوئی جناب آصف پاشا صدر ریاستی اردو اکیڈمی نے اس تقریب کی صدارت کی اور اور کہا کہ "علامہ افغانی بڑے جمہوریت پسند اور جید عالم تھے۔ ڈاکٹر انور معظم صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز عثمانیہ یونیورسٹی نے جمال الدین افغانی کی مفکرانہ شخصیت اور اُن کے آفاقی نقطۂ نظر پر سیر حاصل لکچر دیا۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ ادا کیا اور جناب اصغر اشرف نے خیر مقدمی تقریر کی۔

● جوش ملیح آبادی کی خود نوشت "یادوں کی برات" پر جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم صابر کمال نے ایم اے کے لئے ایک مقالہ لکھا تھا۔ اب یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے اور اردو اکیڈمی کے بکڈپو واقع سیف آباد حیدرآباد سے خریدا جا سکتا ہے۔

۱۷ جنوری کو نئی کہانی کے باشعور مزاج داں جناب ابراہیم شفیق کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "لہو لہان سورج" کے نام سے اعجاز پریس، حیدرآباد۔۲ نے شائع کیا ہے۔ کرشن چندر نے شفیق کی فعال صلاحیتوں کو پیش لفظ کے ذریعہ خراج تحسین ادا کیا ہے۔ اردو اکیڈمی کے بکڈپو سے یہ کتاب خریدی جا سکتی ہے۔

● غیر اردو داں اصحاب کو ریاستی اردو اکیڈمی کے شعبۂ تدریس کی طرف سے اردو لکھنا پڑھنا سکھایا جا رہا ہے اور ایک مفید کورس اس سلسلے میں تیار کیا گیا ہے۔ اردو جماعت کے دوسرے گروپ کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز کرتے ہوئے صدر اکیڈمی جناب آصف پاشا نے اردو سیکھنے کے خواہشمند ۲۵ سے زیادہ امیدواروں کے پہلے بیاچ کو جن کی اکثریت مختلف سرکاری محکموں میں گزیٹیڈ عہدوں پر فائز ہے مبارکباد دی۔ موصوف نے اردو زبان کی تاریخ پر سرسری روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ زبان ہندوستان کی مشترکہ قومی تہذیب کا ایک قیمتی ورثہ ہے۔ اردو جماعت کے طلبا نے بتایا کہ وہ اس لئے بھی اردو سیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ زبان ہمارے پورے ملک میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس زبان کی شاعری بہت خوبصورت اور دلوں کو چھونے والی ہوتی ہے۔

● شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ صاحبہ صدر شعبہ کی صدارت میں جلسۂ تعزیت ہوا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی وفیات حسرت آیات پر تعزیتی قرارداد دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ منظور کی گئی۔ پروفیسر سلطانہ نے رشید صاحب اور ماجد صاحب ایسے صاحب طرز مصنفوں اور عالموں کی وفات کو اردو کے لئے نقصان عظیم قرار دیا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے کہا کہ "ان بزرگوں کی موت نے ہم سے بڑے فنکار چھین لئے"۔

۲۱ جنوری کو ● کل ہند صنعتی نمائش کا سالانہ اردو مشاعرہ جناب بیرسٹر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ شاذ تمکنت نے معتمد مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ قدیم و جدید مکتب فکر کے جن شاعروں نے کلام سنایا ان میں امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، نواب ہاشم جاہ، ڈاکٹر مغنی تبسم، شاذ، علی احمد جلیلی، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، خیرات ندیم، محمود خاور، ناصر کرنولی، شکیلہ بانو بھوپالی، عزیزالنساء صبا، راجہ لال راجہ، بیکس الہ آبادی، استھانہ سحر اور اسحٰق ملک شامل تھے۔

۲۶ جنوری : یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر صدر ہند جناب فخرالدین علی احمد نے ملک کے چنے چنے دانشوروں، مصنفوں، قومی

رہنماؤں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو اعزازات کا اعلان کیا۔ ان میں حیدرآباد کے ماہر تعلیم اور عظیم سیاست داں علی یاور جنگ مرحوم کو بعد از مرگ پدم وی بھوشن اور دکن کے نامور آرکیٹکٹ جناب فیاض الدین نظامی کو پدم شری کا اعزاز ملا ہے۔

● یوم جمہوریہ ہند کے موقع پر ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی عمارت ایوانِ اُردو، انجمن ترقی اردو کی عمارت اردو ہال، اور ریاستی اردو اکیڈمی کے دفتر پر قومی پرچم لہرایا گیا اکیڈمی کے دفتر پر جناب یم باگا ریڈی نائب صدر، جناب بھگت چند کھنہ سکریٹری اور جناب اختر حسن جوائنٹ سکریٹری نے تقاریر کے ذریعہ ملک کی آزادی اور جمہوریت کو خراج تحسین ادا کیا۔ جناب میر سراج الدین علی خاں معتمد دفتر نے ایوانِ اُردو پر قومی پرچم لہرایا۔

۲۹۔ جنوری: جشنِ جمہوریہ ہند کی مسرت میں انجمن احباب دکن نے یادگار محفلِ شعر آراستہ کی۔ جناب منوہر لال بہار نے صدارت کی۔ قاضی انجم عارفی نے عمدگی سے مشاعرہ کی کارروائی انجام دی۔ رمان ارشد، وقار خلیل، علی سرور، اسمٰعیل ظریف، بے ہوش محبوب نگری، انجم عارفی اور کئی بزرگ و قدیم طرز کے شعرا نے رات گئے تک کلام سنایا۔

۳۰ جنوری: مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی کی خدمات کو اُردو مجلس کے جلسۂ تعزیت میں زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور جناب اعجاز صدیقی (ایڈیٹر "شاعر" بمبئی) نے مخاطب کیا۔ صلاح الدین نیر معتمد اردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

★

دیدہ زیب خد و خال کا جادو

دور خلاؤں میں گھورتی ہوئی حسین و پُر وقار نظر۔ مست بادامی آنکھیں۔ زیور رات سے آراستہ صراحی دار گردن دلنشین چہرہ اور متناسب اعضاء۔ یہ ہیں دیدہ زیب اور بے عیب خد و خال ان شکلوں کے جو بیدری فن پاروں پر پائی جاتی ہیں اور بیدری فن دستکاری آندھرا پردیش کا ایک قدیم اور مقبول عام فن ہے۔

آج ریاستی معیشت کے خد و خال اور نقوش ہوبہو بیدری فن دستکاری کے مانند بے عیب اور کسی بھی قسم کی خامی سے پاک ہیں۔ بیس نکاتی فارمولا جو ریاست کی یکجہتی کو تقویت دینے کے لئے مدون کیا گیا تھا کامیابی کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا ہے۔ ریاست کے پسماندہ علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے لئے زائد از دو سال کے عرصہ سے ایک پُرنمو پروگرام پر عمل ہو رہا ہے۔ پانچویں منصوبے کی مدت میں خرچ کرنے کے لئے آندھرا پردیش کو ۹۰ کروڑ روپے کی جو انتہائی فراخدلانہ امداد حاصل ہوئی ہے اس کی بدولت اس پروگرام کی عمل آوری ممکن ہوگئی ہے۔

۲۰۔ نکاتی پروگرام نے اگرہم کو نئے چیلنجوں سے دوچار کیا ہے تو ساتھ ہی ساتھ ہمارے لئے نئے مواقع بھی فراہم کئے ہیں۔ آندھرا پردیش نے اس سلسلے میں مجاہدانہ جوش و خروش کا مظاہرہ کیا ہے۔ اشیائے ضروریہ کی قیمتوں کو قابو میں کر لیا گیا ہے۔ قانون تحدید اراضی کی عمل آوری زور و شور کے ساتھ جاری ہے اور اس طرح دھرتی کے لالوں نے جو خواب دیکھے تھے وہ پورے ہو رہے ہیں۔ فاضل قرار پانے والی اراضیات کی کل مقدار ۵ء۲ لاکھ ایکڑ سے زائد ہوگئی ہے۔ کمزور طبقات کے لئے رہائشی جگہوں کی گنجائش وسیع پیمانے پر فراہم کی گئی ہے۔ اپریل ۱۹۷۵ء کے بعد سے کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۵ لاکھ خاندانوں میں رہائشی اراضیات کی تقسیم کا کارنامہ اس زبردست اور شاندار پروگرام کے عین شایان شان ہے اس کے علاوہ رہائشی حقوق کا استقرار۔ جبری محنت کا خاتمہ۔ دیہی قرضوں کی ادائی پر التوا اور کھیت مزدور کی اقل ترین اُجرتوں میں اضافہ وغیرہ جیسے دوسرے اقدامات سماج استحصال کردہ طبقات کے لئے ایک "نئی بشارت" کا حکم رکھتے ہیں۔

ریاست میں صنعتی ماحول کا پیدا ہونا نئے صنعت کاروں کے لئے ایک خوش آئند امر ہے۔ ترغیبات کی نظر ثانی شدہ اسکیم کے مطابق بیس نکاتی فارمولے کے تحت پسماندہ قرار دیئے ہوئے علاقوں میں نئی صنعتی یونٹوں کے قیام کے لئے رقمی امداد کی مقدار لاگت کے سرمائے کی ۱۰ فیصد یا زیادہ سے زیادہ ۱۰ لاکھ روپے مقرر کی گئی ہے۔ قبائیلی علاقوں میں قائم کی جانے والی یونٹوں کے لئے اضافہ رقمی امداد مقرر کی گئی ہے یعنی سرمایہ لاگت کا ۲۰ فیصد اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ لاکھ روپے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR/19/76-77

قائم شدہ ۱۹۳۸ء

فون نمبر ۳۸۳۹۹۴

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

نگراں: سید علی اکبر ایم اے کنٹیب

معتمد مجلس مشاورت: غلام جیلانی

مرتب: وقار خلیل

زر سالانہ: ۱۲ روپے   ششماہی: ۷ روپے

فی شمارہ: ایک روپیہ پچیس پیسے

جلد: ۴۰   شمارہ: ۴

اپریل ۱۹۷۷ء

پرنٹر پبلشر سید علی اکبر۔ مطبوعہ [illegible] حیدرآباد، مقام اشاعت: ادارۂ ادبیاتِ اردو [illegible]

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے زیرِ اہتمام گزشتہ مہینے "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی سہ روزہ تقاریب نہایت شاندار طریقوں پر منائی گئیں۔ "اردو نامہ" کے کالموں میں تفصیلات شائع کی گئی ہیں۔ اس موقع پر مذاکرہ بھی منعقد ہوا تھا۔ جناب پدم شری فیض الدین نظامی کا مضمون جسے مذاکرہ میں پسند کیا گیا تھا اِس اشاعت میں شامل کیا گیا ہے۔ اس مذاکرہ کے دیگر مضامین مصنفوں سے بروقت حاصل نہ ہو سکے۔ متعاقب تمام مضامین شائع کئے جائیں گے۔

دکنی کے نامور شاعر نصرتی کی رزمیہ شاعری پر طیب انصاری کا مضمون اِس امر کا شاہد ہے کہ طیب صاحب علمی مسائل پر ٹھہر ٹھہر کر سوچنے کے عادی ہوتے جا رہے ہیں اور عجلت میں فیصلے صادر کرنے کے جذباتی عمل سے خود کو الگ کر رہے ہیں۔ نقد و نظر میں ایک طرح کی گہرائی اور سوجھ بوجھ کے طریقے کو مثبت قرار دیا گیا ہے۔

اس شمارے کے دیگر علمی مضامین کا افق فکر و نظر کی ذہانت و فطانت کے سبب روشن تر نظر آتا ہے۔ تمام مستقل موضوعات کا اِس بار بھی احاطہ کیا گیا ہے اور ہر موضوع پر "منتخب" نگارشات کو جگہ دی گئی ہے۔

عظیم افسانہ نگار ادیب جناب کرشن چندر مرحوم کی یاد کو جناب بھارت چند کھنہ اور جناب ایم اے شفیق صاحبان نے اپنی تحریروں کے ذریعہ بھرپور خراجِ عقیدت ادا کرنے کی سعیٔ مشکور کی ہے۔ "سب رنگ" کے اوراق میں کرشن چندر کا ایک اہم طنزیہ کہانی "جامن کا پیڑ" شامل کی گئی ہے۔

▪ ۱۰ر مارچ ۱۹۷۷ء کی شب اردو ادب کا ایک اور روشن ستارہ ڈوب گیا۔ پروفیسر اختر اورینوی کا شمار اگلی نسل کی بزرگ اور فعال شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ بہار میں اردو ادب، تعلیم اور افسانہ کی روایت کو اختر مرحوم نے زندگی عطا کی۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بڑا اور بہتر حصہ تعلیم اور تصنیف و تالیف میں گزرا۔ اردو تحقیق، تنقید کو آپ دینے میں اور مغربی ادب کا ہم پلہ بنانے میں اختر اورینوی کی صلاحیتوں کو بھلایا نہ جائے گا۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو اور اس کے بانی مجتہد ڈاکٹر زور مرحوم سے اختر اورینوی کے مخلصانہ مراسم استوار تھے۔ اختر صاحب نے ۱۹۶۹ء میں ایوانِ اردو کا معائنہ بھی کیا تھا۔ ایک معلم، ایک دانشور اور ایک ادبی رہنما کی وفات دنیائے اردو کے لئے بلاشبہ ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوتی ہے اور اختر صاحب کی موت بھی ایسا ہی المیہ ہے۔ خدا مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

غلام جیلانی

پدم شری ضیاء الدین نظامی

قطب شاہوں کے عہد میں تشکیل شہری اور فن تعمیر

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر منعقدہ سیمینار میں پڑھا گیا)

صدر محترم۔ خواتین و حضرات۔ قبل اس کے کہ میں قطب شاہی عالیشان عمارتوں کے دلکش نوک و پلک اور خوبیوں کو بیان کروں۔ اس کی شہری منصوبہ بندی کے خد و خال پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی تشکیل یا ٹاؤن پلاننگ قطب شاہوں کے پاکیزہ ذوق، سلیم طبع، موسیقی اور دور اندیشی کا ایک زرین کارنامہ ہے۔ دراصل یہ شہر قرون وسطیٰ کی زبردست یادگار ہے جو مدتوں قطب شاہوں کے نام کو زندہ رکھنے کے لیئے کافی ہے۔ آج بھی ماشاء اللہ یہ خوبصورت اور مبارک شہر آندھرا پردیش کی ناک ہے اور اس کی سماجی اور تمدنی تہذیب کا ایک عظیم گہوارہ ہے۔ اب اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس شان و شوکت کا شہر بنانے کی نہ ہمت ہے، نہ حوصلہ۔ اگر اس کی خوبصورتی کو بحال رکھا جائے تو یہی موجودہ زمانہ کی بڑی کارگذاری ہوگی۔ چنانچہ آج کل جو [illegible] کی جو شروع کی گئی ہے وہ واقعی بڑی ہمت افزا اور قابل ستائش ہے۔ اس موقع پر مجھے اہل یونان کی حلف یاد آتی ہے جو انہوں نے شہر ایتھنز کے متعلق اٹھایا تھا کہ "ہم شہریان ایتھنز اپنے بزرگوں کے عطا کئے ہوئے خوبصورت شہر کو ہرگز نہیں بگاڑیں گے۔ بلکہ اس کو بہتر سے بہتر بنائیں گے تاکہ ہمارے بعد آنے والی نسلوں کو معلوم ہو کہ ہم اپنے بڑوں کے اچھے جانشین تھے۔"

زمانہ قدیم سے گولکنڈہ کو بحیثیت دارالسلطنت جو اہمیت حاصل تھی وہ محتاج بیان نہیں البتہ شہر کی منتقلی اور توسیع کے بتدریج مراحل کے متعلق تاریخ بتلاتی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں سلطنت کی راجدھانی صرف گولکنڈہ ہی میں تھی جہاں شہر کے عوام کی آبادی بھی حصار کے اندر تھی۔ لیکن اس میں کشادہ راستوں کے ساتھ حکومت کی عمارتیں۔ رفاہ عام کی عمارتیں اور بازارات کافی تعداد میں موجود تھے اور عوام کے لیئے باغ بغیچے بھی سیر و تفریح کے لئے فراہم کئے گئے تھے۔ لیکن جوں جوں سلطنت کے سیاسی اغراض اور بڑھتی ہوئی سماجی اور بلدی ضروریات میں اضافہ ہوتا گیا۔ گولکنڈہ کی قدیم آبادی اس قدر گنجان ہو چکی تھی کہ حفظان صحت کے اعتبار سے شہر تقریباً ناقابل رہائش ہو گیا تھا۔ مزید براں پڑوسی ریاستوں کے انقلاب اور سیاسی قدر جزر نے مہاجرین کو اس امن والے شہر کی طرف متوجہ کیا۔ خصوصاً احمد نگر کی تباہی کے بعد سینکڑوں خاندانوں کا یہاں آکر بس جانا شہر کو اور بھی متاثر کرنے کا باعث ہوا۔ بر ایں وجہ اطراف و اکناف کے باغات اور کھلے میدان اس کی زد میں آگئے اور متعدد مکانات اور بازارات خود رو طریقہ پر قلعہ کے باہر بننے لگے یہاں تک کہ اس کا پھیلاؤ ٹولی چوکی اور کاروان سرائے تک پہنچ گیا اس نازک صورتحال کا اندازہ کرتے ہوئے محمد قلی قطب شاہ جو قدرتی طور پر ایک بیدار مغز، سلیقہ مند اور دور اندیش حکمران تھا۔ اپنے مدبر عقیدہ حضرت میر محمد مومن کے زرین مشورہ سے موسیٰ ندی کے قرب و جوار میں ایک ایسا پر فضا خوش منظر اور وسیع رقبہ کا انتخاب کیا جو نہ صرف صورتحال کو سنبھالے بلکہ آیندہ کئی صدیوں میں آنے والی ضروریات کو پورا کر سکے۔

فی الحقیقت تشکیل شہر کے اعتبار سے یہ انتخاب نہایت موزوں ثابت ہوا جس کا فائدہ ہم آج تک اٹھا رہے ہیں۔ موسیٰ ندی کے علاوہ تالابوں، پہاڑوں اور دلکش وادیوں اور سبزہ زاروں سے بھرپور ہونے کی وجہ یہاں ایک خوبصورت شہر کے آباد ہونے کے قدرتی امکانات

مکمل طور پر موجود تھے۔ یہ عجیب خوش قسمتی کی بات ہے کہ حضرت میر مومن جیسے بلند حوصلہ اور ذوقِ سلیم رکھنے والے پیشوا شہ سلطنت موجود تھے جن کا شمار مملکتِ ایران کے صفِ اول کے سیاست دانوں اور دانشوروں میں کیا جاتا تھا اور خصوصاً جن کا اعلیٰ ذوقِ تعمیر شاہ عباس کی حکومت میں شہر اصفہان کی تعمیر میں جو ایران کا دارالخلافہ تھا پورا اترا تھا۔ چنانچہ ان کے سبد دیرینہ تجربے اس شہر کا داغ بیل کے نکھارنے میں نہایت مفید ثابت ہوئے۔ بقول نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اوّل۔ حضرت میر مومن کی دلی آرزو تھی کہ یہ قطب شاہی شہر بھی ایران کے عظیم الشان شہروں کی شکل کا بن جائے۔ قدرت نے اس کو پورا کر دیا۔

تاریخ کے بموجب محمد قلی قطب شاہ کی تخت نشینی کے تقریباً بارہ برس بعد ۱۵۹۰ء م ۹۹۹ھ کی مبارک ساعتوں میں اس کی بنیاد ڈالی گئی اس کا مسودہ خاکہ قرونِ وسطیٰ کے شہروں کی طرح اس ڈھنگ سے تیار کیا گیا کہ شہر کے بیچوں بیچ ایک عالیشان یادگاری عمارت ہو اور اس کے چاروں سمت کشادہ راستے ترتیب دیئے جائیں اور پھر شاہی محلوں اور امراء کے مکانوں کے علاوہ عوام کے لئے منظم وار بستیاں جس میں مدارس، شفاخانے، بازارات، حمام، نمازخانے اور کارخانے نہایت کشادہ راستوں کے ساتھ مربوط کئے جائیں اور سایہ دار درختوں سے آراستہ ہوں۔ اور ہر منطقے کے لئے باغیچے اور تفریح گاہیں بھی فراہم ہوں۔ چنانچہ اس وضع اور قطع سے اس عالیشان شہر کی تعمیر و تشکیل عمل میں آئی۔ جس کی ابتدا چارمینار جیسے لاجواب عمارت سے ہوئی۔ اور خانۂ خدا کے لئے اسی کے قرب و جوار میں اونچے مقام پر جگہ فراہم کی گئی۔ جہاں مکہ مسجد جیسی شاندار مسجد تعمیر کی گئی۔ چارمینار کے جانبِ شمال و مغرب عالیشان دولت خانۂ عالی بنایا گیا۔ جس کے جلو خانہ میں چاروں سمت چار بلند کمانیں کھڑی کی گئیں اور وسطِ جلو خانہ میں ایک ہشت پہلو حوض جس کو "سوکا حوض" کہتے ہیں اور جس کو رفتارِ زمانہ نے سوکھا حوض اور بعد میں "گلزار حوض" کے نام سے شہرت دی، تعمیر کیا گیا۔ دراصل اس حوض کو "سوکا حوض" اس لئے کہا گیا کہ اس میں شہر کی داغ بیل کے صحیح سمت مقرر کرنے کے لئے Bench Mark قائم کیا گیا۔ جو آج بھی اس حوض میں چوکونی سیاہ پتھر کی شکل میں چاروں سمت کے نشانوں کے ساتھ موجود ہے دولت خانۂ عالی سے گزرنے کے بعد شمال کی جانب لشکریوں، جوالداروں اور سلحداروں کے لئے بڑے بڑے ایوان بنائے گئے تھے۔ اور ان سے گزرنے کے بعد متعدد عالیشان محلوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جن میں قابلِ ذکر چندن محل، گگن محل، سجن محل، ندی محل، حیدر محل، حنا محل، داد محل، خداداد محل اور محل کوہِ طور جو اکثر و بیشتر ندی کے کنارے اور اس کے قرب و جوار کے اونچے مقاموں پر تقریباً چھ سات مربع میل کے رقبہ پر ترتیب دیئے گئے تھے جن کے نام و نشان باقی نہیں۔ ان کی بلندی اور عالیشان ہونے کا ثبوت شہنشاہ عالمگیر کے اس جملہ سے ملتا ہے جب گولکنڈہ کے ختم ہونے کے بعد ان کی نظر "داد محل" پر پڑی تو دریافت فرمایا "این بلند چیست" جب نعمت خان عالی نے عرض کیا کہ "این داد محل است" تو طنزاً فرمایا "آں بیداد محل است"۔ اور غالباً یہ اسی کے بعد ہی ختم کر دیا گیا۔ شہر و عمارات کی اس خوش اسلوبی اور عظمت کے پیش نظر متعدد نامور مورخین، سیاح اور شعرا جن میں خود فیر (Tavernier) ولیم میتھولڈ (William Methold)، فرشتہ اور شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد کے مشہور مؤرخ خافی خان اور محمد ساقی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ شہر آب و ہوا اور گل و گلزار کی جدت کا عجیب و غریب نمونہ ہے کوئی اس کو زمین پر بہشت کا ایک ٹکڑا کہتا ہے۔ بقول سکندر علی وجد ؎

فضا جاں فضا ذرہ ذرہ حسین ہے	حقیقت میں ملک دکن گل زمین ہے
بہت خوش نما شہر دیکھے ہیں میں نے	مگر تیرا جادو کہیں بھی نہیں ہے

حضرت میر معظم بھی اپنے قصیدۂ تہنیت میں فرماتے ہیں ؎

حیدرآباد از تو شد شاہا صفاہانِ نوے چو صفاہاں نو شد از شاہی‌ہاں عباس شاہ

تشکیل شہر کی اس مختصر داستان کے بعد اب میں قطب شاہی فنِ تعمیر کی خصوصیات عرض کروں گا۔ جو اپنی جسامت، بلندی اور مضبوطی کے ساتھ ساتھ اپنی خوبصورتی اور لطافت میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان عمارتوں میں، میناروں، کمانوں اور گنبدوں کو نمایاں اور خصوصی حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ ان کو شاہی محلوں، رفاہِ عام کی عمارتوں، مسجدوں، عاشور خانوں اور شاہی مقبروں میں بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔
چارمینار کو لیجیے۔ اس کے دو اہم اجزائے عمارت۔ ایک سو نوے فیٹ بلند فلک بوس مینار اور خوبصورت بلند و بالا ۸۰ فیٹ اونچے کمانیں ہیں ان دونوں میں جو نہایت نپا تلا تناسب اور امتزاج پایا جاتا ہے وہ قطب شاہی فنِ تعمیر کا ایک حسین کرشمہ ہے اور ساتھ ہی ان کا مناسب نقش و نگار اس کے حسن کو دوبالا کرتا ہے اس کے چاروں مینار جن میں اوپر پہنچنے کی سیڑھیاں بنی ہیں جہاں سے شہر کا پورا منظر سامنے آجاتا ہے۔ مہندس معماری کمال الدین شیرازی نے ان بلند میناروں کو چار حصوں میں نہایت مناسبت سے بانٹ کر تین خوبصورت کنگنیوں کو جو ہر کونے اور شہ نشینوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی سجیلی کمانوں سے مرصع کیا ہے جو بتدریج اونچائی کی مناسبت سے کلس تک پہنچ کر مینار کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ اسی طرح سامنے کے چاروں رخ والی زبردست اسّی فٹ اونچی کمانوں پر خوبصورت بالاخانوں اور برآمدوں کی زیبائش نے چاروں رخ کی زینت کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

اوپر کی منزل پر پانی کا خزانہ، خوبصورت مسجد اور عاشور خانہ بنایا گیا ہے جس کی بدولت زبردست معرکوں میں بھی یہ عمارت محفوظ رہ سکی کیوں نہ ہو اس فلک بوس عمارت کی تاریخ بھی "یا حافظ" سے نکلتی ہے تعجب ہے کہ یہ جسیم عمارت جو صرف چونے، پتھر اور اینٹ سے تعمیر کی گئی ہے تقریباً چار سو برس سے بغیر کسی نقص کے اپنی جگہ پر تزک و احتشام سے قائم ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس عالیشان عمارت کی نگہداشت خاطر خواہ نہیں کی گئی اور نہ ہی اس کے ماحول کو جاذبِ نظر بنایا گیا۔ بلکہ گذشتہ بیس پچیس برس کے عرصہ میں گندی عمارتیں گرد و پیش بنا دی گئیں۔ علاوہ ازیں چاروں مرکزی راستوں پر دو کمانوں کا بڑھ بڑھ کر آگے ہونا نہ صرف راستوں کو تنگ بنا دیا بلکہ چار مینار اور چار کمان کے منظر کو بھی کافی متاثر کیا۔

قطب شاہی عمارتوں کا دوسرا شہکار مکہ مسجد ہے جس کا شمار اس کی وسعت اور شان کے اعتبار سے ہندوستان کی چیدہ بڑی مساجد میں ہوتا ہے لیکن اس مسجد کی بعض تعمیری خصوصیات ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا کی بڑی بڑی مسجدوں سے بھی نایاب ہیں۔ خصوصاً اس کے اونچے اونچے بلند کمانوں کی تعمیر میں بڑے بڑے پتھروں کو جو تقریباً چالیس فیٹ اونچے ہیں خمیدہ تراشے گئے ہیں تاکہ دو خمیدہ پتھروں سے مل کر کمان تعمیر ہو جائے یہ انوکھا طرزِ تعمیر ہندوستان اور بیرونِ ہند میں بھی مفقود ہے۔ مسجد کی مکمل تعمیر صرف گرانائیٹ پتھر سے کی گئی ہے۔ جو نہایت سخت مانا گیا ہے۔ اسی پتھر میں باریک جالیاں اور دیگر نقوش تراشے گئے ہیں۔ لیکن اس شاندار مسجد کی عمارتوں کو شہنشاہ عالمگیر کے حکم ہر چہ گیرید مختصر گیرد کی بنا پر پست کر دیئے گئے۔ جس سے مسجد کی شان و شوکت بے حد متاثر ہوئی۔ ورنہ عمارت کی وسعت اور بلندی کی مناسبت سے ان میناروں کی اونچائی چار مینار سے کم نہیں ہوتی۔ بہر صورت اب بھی ہر اعتبار سے نہ صرف قطب شاہی دور کی بلکہ ہندوستان کی ایک منفرد عمارت ہے یہاں بھی مجھے عرض کرنا ہے کہ مکہ مسجد کے ماحول کو کافی درست کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ یہ مقام قلب شہر میں ہونے کی اہمیت رکھتا ہے جہاں اکثر اوقات مختلف ممالک کے سیاح آتے رہتے ہیں۔ میرا ناچیز رائے ہے کہ مکہ مسجد اور چار مینار کے درمیان تمام گندی عمارتوں کو حاصل کر کے منہدم کیا جائے اور صرف چمن بندی کیا جائے تو یہ نہایت دلفریب منظر ثابت ہوگا۔ علاوہ ازیں مسجد کے اندرونی صحن میں جو شاہی مقبرے ہیں وہ مدتوں سے بغیر کسی عمارت کے تھے کچھ عرصہ قبل ان پر پتھر کی عمارت بنا کر مسجد کے رخ کو کافی متاثر کیا گیا۔ کاش کہ پھر اس کو نکال دیا جائے اور قبور زیر آسمان کر دیئے جائیں تو محمد قلی قطب شاہ کی روح خوش ہوگی۔ ..

بھارت چند کھنہ

کرشن چندر

آٹھ مارچ ۱۹۷۷ء کو اُردو والوں نے دن میں یہ خبر جانکاہ سنی کہ اُردو ادب کی دنیا کا آفتاب کرشن چندر غروب ہوگیا۔ کرشن چندر جو بیک وقت افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، انشائیہ نگار، ناول نگار، طنز و مزاح نگار، محقق، دانشور، مکالمہ نویس۔ یہ سب کچھ تھا اور اس پر طرہ یہ کہ وہ جو کچھ لکھتا وہ نہ صرف ایک تیکھے اور غیر مبہم طرزِ تحریر کے باعث منفرد بلکہ بے حد دلفریب اور انتہائی دلکش ہوتا اور پھر ان نگارشات کے پیچھے کوئی تحریک، کوئی پیغام، کوئی بات، کوئی مرکزی خیال اور کوئی دل میں اُتر جانے والا پہلو ضرور ہوتا!

ابتدا میں کرشن چندر ترقی پسند مصنفین کے ادارے کے معتمد بہت عرصہ تک رہے۔ اس صنفِ ادب کے لکھنے والوں میں ایم اسلم، کنہیا لال کپور، ملک راج آنند، سجاد ظہیر، سعادت حسن منٹو، بیدی اور اشک وغیرہ ان کے ہم عصر تھے۔ ہو سکتا ہے کہ شروع میں کرشن چندر ان میں سے بعض لکھنے والوں سے متاثر ہوئے ہوں مگر مجموعی طور پر کرشن چندر سے یہ لوگ زیادہ متاثر ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ جس تیزی سے کرشن چندر نے معیاری ادب کی تخلیق کی وہ شاید ہی کسی اور لکھنے والے کو نصیب ہوئی ہو۔ ۱۹۶۶ء میں ان کی انسان دوستی، زندگی میں رائج ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد اور عالمی امن کے پیرو و پرستار کی حیثیت بین الاقوامی سطح پر تسلیم کی گئی اور ان کو سوویٹ لینڈ ایوارڈ عطا کیا گیا۔

اُردو ادب میں ننانوے فیصد بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی لکھنے والے جو وقت اپنی ادبی کاوشوں میں صرف کرتے ہیں اس کے عوض متواتر افلاس میں مبتلا رہتے ہیں۔ کرشن چندر غالباً اس صدی کے اُردو میں لکھنے والوں میں اس لئے بھی منفرد سمجھے جانے چاہئیں کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی قدر و قیمت تھی۔ فلموں کے لئے لکھنے والوں کو چھوڑ کر، اُردو ادب میں شاید ہی کسی اور ادیب کے قلم نے اس قدر سونا اُگلا ہوگا۔ جتنا ان کی کتابوں کی بکری کے باعث ان کو ملا۔ ان کی بے پناہ مقبولیت تصویر کے اس پہلو سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔

کرشن چندر اہلِ زبان نہیں تھے۔ وہ خالص پنجابی تھے اور اس لئے ان کے اندازِ بیاں میں ایک بڑی دلفریب بے باکی تھی۔ غالباً وہ پہلے لکھنے والے تھے جنہوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں لکھنؤ، دلّی، اودھ وغیرہ کی تہذیب کو مزید نہ جھنجھوڑتے ہوئے دنیا والوں کو وادیٔ کشمیر، وہاں کے حسین مناظر اور حسیناؤں سے واقف کرایا۔ وہاں کے سربفلک پہاڑوں، عمیق گھاٹیوں، شفاف آبشاروں اور جھیلوں، تیرتی ہوئی گنگناتی، گل و گلزاروں کی تصویریں کھینچیں۔ اس خطہ ملک کے لوگوں کی معصومیت، الہڑ جوش، سادگی اور استقلال، مرمٹنے والا عشق اور ان کے اندازِ فکر سے متعارف کرایا۔ انہوں نے اس بیک گراؤنڈ میں بہت لکھا اور بہت خوب لکھا۔

مجھے کرشن چندر صاحب سے ملنے کا اعزاز ۱۹۶۶ء میں ہوا جب زندہ دلانِ حیدرآباد کے قیام کے بعد ان کی پہلی تقاریب۔ ادبی محفلیں اور کل ہند مزاحیہ مشاعرہ عمل میں آئیں۔ ہماری درخواست کو قبول فرماتے ہوئے علم و ادب کے اس جادوگر نے اس ادارے کی بقا کا سنگِ بنیاد رکھنے میں ناقابلِ فراموش کارنامہ انجام دیا ایک جشن کہ انسان جو بات بات پر قہقہے لگاتا، کسی لطیفے کو سن کر لوٹ پوٹ ہو جاتا اور اس لطیفے کی تعبیر اور تفسیر میں اس کو دعا آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا کے رکھ دیتا۔ اس کانفرنس کا افتتاح اُردو ہال کی بالائی منزل پر ہوا تھا جو

سامعین سے ہال کھچا کھچ بھر گیا تھا اور جگہ نہ ہونے کے باعث لوگ سیڑھیوں پر اور نیچے میدان میں ایک مجمع بن کر کھڑے تھے۔ یہ محض کرشن چندر کی کشش تھی کہ لوگ ان کے خطبۂ صدارت کو سننے کے لئے اپریل کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پسینے میں شرابور کھڑے تھے۔ ادبی اجلاس اور مشاعرہ ان کی موجودگی کی وجہ سے جس قدر کامیاب ہوئے اس سے غالباً حیدرآباد کے اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب خود واقف ہوں گے۔ مگر جس چیز کا ذکر میں خاص طور پر اس موقعہ پر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کرشن چندر نے ہم کو ہمارا منصب انھیں بتلایا کہ رو برو اجلاس میں یہ طے پایا کہ زندہ دلانِ حیدرآباد اس وقت تک جدوجہد کرتے رہیں گے جب تک طنز و مزاح نگاری کو اردو ادب میں وہ جائز مقام حاصل نہیں ہو جاتا جس کی یہ صنفِ ادب مستحق ہے۔ کرشن چندر نے اس موقع پر کہا تھا کہ مزاح نگار جب تک اپنا خونِ جگر نہیں جلاتا تب تک وہ بات پیدا نہیں ہوتی جس سے پڑھنے والوں کے دل کی کلیاں کھل جاتیں۔ میں نہیں جانتا کہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی کاوشیں اس کو اپنی منزلِ مقصود کس قدر قریب لے جا سکی ہیں مگر یہ کہنے کی جسارت ضرور کر سکتا ہوں کہ اس تحریک کے بانی کرشن چندر رہے تھے اور جب بھی طنز و مزاح اردو ادب میں اپنا جائز مقام پائے گا تو اس کے لئے مرحوم موصوف کی کوشش قابلِ مبارکباد ہوں گی۔ اور کرشن چندر کی عظمت کا راز اسی میں ہے کہ انھوں نے ہر مقام اور ہر گام پر ہر بات میں ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جبر اور زیادتیوں کی خدمت کی اور ان کے لئے طنز کا حربہ استعمال کیا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ان کا وار ہمیشہ بے خطا اور ضرب کاری ہوتا تھا۔

ویسے تو جو اس جہانِ فانی میں آتا ہے اسے ایک دن جانا ہی ہوتا ہے مگر ایسے سحر نگار اور اردو ادب کے بانکے، رسیلے اور اردو کے عظیم انسان ستون کا چلا جانا ایک بہت بڑا المیہ ہے جس پر اردو والے جس قدر ماتم کریں کم ہوگا۔

کرشن چندر اردو ادب کی تخلیق کرنے والوں میں وہ واحد شخص تھے جن کے ڈراموں، ناولوں، افسانوں اور مضامین کے دنیا کی تقریباً ساٹھ مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر کسی اور اردو کے مصنف کو بشمول اقبال و غالب، اتنی مقبولیت اور اہمیت حاصل نہیں ہوئی جو مرحوم کو نصیب ہوئی۔ اس منفرد حیثیت سے بھی ان کا نام کبھی بھلایا نہیں جا سکے گا۔

کرشن چندر کی زندگی کے آخری چند برس اپنے دل آشفتہ دل، فریفتہ دل، بے قرار دل" کو راہِ راست پر لانے میں صرف ہوئے پرہیز کا کھانا جس کو وہ بے حد ناپسند کرتے تھے ان کو زہر مار کرنے پڑے۔ دخترِ رز جس سے وہ کبھی کبھی دل بہلاتے تھے احتراز کرنا پڑا۔ اپنے قدموں کو بھی احتیاط سے اٹھانے اور رکھنے کی پابندیوں کو برداشت کرنا پڑا۔ انھوں نے یہ سب کچھ کیا، ہر انسان کی طرح وہ بھی خوب جانتے تھے کہ زندگی کا کوئی جواب نہیں۔ پھر جب حضرتِ دل عام علاج و معالجوں سے درست نہ ہو سکے تو بالآخر ان کے سینے میں "پیس میکر" نامی آلہ فٹ کر دیا گیا۔ جس کا کام دل کو طبعی حالت میں رکھنا تھا۔ اس نے ان کو حیاتِ نو بخشی مگر تا کجے؟ میرے خیال میں کرشن چندر کا خیالی افسانہ کچھ اس طرح کا ہوا ہوگا۔

۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو ــ

ایک تنہائی میں ڈوگ تک دل بیچارہ ہو گیا

اور اس ڈوانگ نے جنم دیا

پیس میکر ــ "میاں دل، سنبھلو"

دل ــ "میرے رفیق، اب بس کیا کرو۔ بہت ہو چکا"

پیس میکر ــ "ایسا مت کہو، میرے نام کو بٹہ نہ لگاؤ۔ تمہاری حفاظت میرا فرض ہے"

دل — "مجھ کو تمہاری خوبیوں سے کوئی شکایت نہیں۔ اگر کہو تو تمہاری افادیت کا ایک سرٹیفکیٹ لکھ کر تم کو دیدوں تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آسکے۔"

پیس میکر — "شکریہ۔ مگر ہمت نہ ہارو۔"

دل — "ہمت نہ ہارو! چہ خوب! تم شاید یہ نہیں جانتے کہ اگر ہمت ہار دیتا تو شاید تمہاری رفاقت کی ضرورت ہی نہ پڑتی خواہ مخواہ تم میرے ساتھ قید بھگت رہے ہو۔"

پیس میکر — "قید بھگت رہا ہوں؟ — یہی تو میرا کام ہے۔ مگر تم جذباتی نہ ہو — ایسا کرنے سے تمہارے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔"

دل — "مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا، مگر اب تو سہارا حاصل کرنے کی سکت بھی نہیں۔ ہی — ہائے رہی بے چینی"

پیس میکر — "ایسے خیال نکال باہر کرو — نہ بھولو کہ میں موجود ہوں۔"

دل — "رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیئے تھمے؟"

پیس میکر — "تم تو شہسوار ہو"

دل — "نہ باگ ہاتھ میں ہے نہ پا ہے رکاب میں — سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں!"

پیس میکر — "تمہارا ذہن بالکل اچھی حالت میں ہے۔ حوصلہ کرو اور بات نہ کرو"

دل — "یہ طفل تسلیاں کسی اور کو دینا، میرا وجود ڈوبے جا رہا ہے۔ وہ دیکھو ترقی پسند ادب کا بے مثل ستارہ منٹو مجھے اشارے سے خوش آمدید کہہ رہا ہے۔"

پیس میکر — "تم ابھی میری دنیا میں ہو — بس اب چپ کرو۔"

دل — "ہاں۔ چپ چاپ۔ خاموشی — سکونِ ابدی!"

اور اس طرح زندگی کی فصل کاٹنے والا دستِ اجل کرشن چندر کو لے گیا۔ جسدِ خاکی مٹ گیا مگر اس کی سحر نگاری، اس کے اچھوتے اندازِ بیان، اس کے بے پناہ طنز اور اس کے دلآویز تخیل کے نقوش کو ہرگز نہیں مٹا سکے گا — وہ سدا امر رہیں گے!

"ایوانِ اردو" رواروی میں دیکھنے کی چیز نہیں ہے۔ حیدرآبادی کلچر اور تہذیب کے اتنے نوادر یہاں جمع ہیں کہ انھیں دیکھنے کے لیے پھر سے مجھے آنا ہوگا۔ "ایوانِ اردو" میں آکر زورؔ مرحوم یاد آگئے، کتنا بڑا کام کر گئے۔ اس دل لگی سے کام کرنے والے اگر اردو کو ملتے رہیں تو یہ زبان ہمیشہ زندہ رہے گی۔

کرشن چندر
۱۸؍ مئی سنہ ۱۹۶۶ء

وقت آتا ہے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے
زندگی موت کے سانچے میں بھی پل جاتی ہے

دن نکلتا ہے نئے درد کا سورج لے کر
رات کیوں آرزوئے صبح میں ڈھل جاتی ہے

صرف لفظوں سے بنائی ہوئی ہر اک تصویر
اپنی ہی گرمیٔ گفتار سے جل جاتی ہے

کچھ نہ دیں آپ مگر دینے کا وعدہ تو کریں
آرزو آپ کے وعدوں سے بہل جاتی ہے

وقت نے درد کے انداز بدل ڈالے ہیں
آہ کرتا ہوں تو نغمات میں ڈھل جاتی ہے

وہ گھڑی کہ جو کبھی اپنا خیال آتا ہے
دل کے نزدیک کوئی شمع سی جل جاتی ہے

کچھ اور حوادث کی ہوا تیز چلی ہے
جس وقت مری فکر کی قندیل جلی ہے

سینے میں چھپے درد کا سورج ابھر آیا
یا ان کی نظر دل کے قریب آکے رکی ہے

محسوس ہوا کہ در یہ عرش کھلا ہے
جب بھی مرے احساس کی زنجیر ہلی ہے

کاغذ پہ لکیریں کوئی آڑی کوئی ترچھی
اس طرح مرے دور کی تصویر بنی ہے

کیا حسنِ تغافل ہے یہ اے گردشِ ایام
مجھ سے ہی مرے گھر کا پتہ پوچھ رہا ہے

چٹکی تھی گلستاں میں کلی بات تھی اتنی
گزرا یہ گماں دل کو صدا آپ نے دی ہے

امیر احمد خسرو

جہانِ نو

(مخدوم کے نام)

خد و خال روشن نگہ دھند، کہرا
یخ بستہ ماحول پگھلے، سورج جو چمکے
تو پھر عکس اور شخص مہکے، مسرت سمیٹے
نہ حسرت، نہ اندوہ بینا کی
غبارِ سرِ راہ بیٹھے، دھنک رنگ پھیلے
فراوانیاں فکر و فن کی، شگوفے کھلانے چلی ہیں
احتسابِ نظر ذات کے دائروں میں
.... سکوں چھن گیا ہے
تمنا کہ مجروح ہوتی رہی ہے
صبا زخم آلود کرنوں، کسیلی لگی ہے
مگر اب کچھ ایسی فضا ہو چلی ہے
تلاطم، تموج، غبارِ سرِ راہ چھٹنے لگا ہے
بادباں کھل گیا ہے کہ موسم نیا ہے
آرزو، جھیل، کشتی
نئی رہگزر سامنے ہے

وقار خلیل

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

احمد ندیم قاسمی خطوط کے آئینے میں

میرے دوست جناب احمد ندیم قاسمی کے نام کے ساتھ پچھلے ۶۶ برسوں کی بھولی ہوئی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے سینکڑوں کوس دور تھے کبھی ایک دوسرے کو دیکھا نہ تھا، نہ ہم وطن نہ ہم نشین، نہ ہم جلیس نہ ہم بتی اور نہ کوئی خونی رشتہ البتہ قلمی دوستی اور اردو زبان و ادب کی خدمت کا شوق قدرِ مشترک تھی۔ ہوا یہ کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن سے استادِ محترم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم و مغفور کی زیرِ نگرانی رسالہ "سب رس" جاری ہوا تو میں اس کی مجلسِ ادارت کا ایک رکن تھا۔ غیر منقسم ہندوستان کے ادیبوں اور شاعروں سے قلمی اعانت کے سلسلے میں مجھے اس قدر کے بے شمار ادیبوں اور شاعروں سے مراسلت کرنے کا موقع ملا جن میں سے چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ مولانا صلاح الدین، پروفیسر حامد حسین قادری، راجہ مہدی علی خاں، جگر مراد آبادی، عبدالرحمٰن چغتائی، حفیظ جالندھری، مجنوں گورکھپوری، فراق گورکھپوری، اثر صہبائی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، پروفیسر احتشام حسین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جمیل ملک، احمد ظفر، قتیل شفائی، سلام مچھلی شہری، پروفیسر شور، ہادی مچھلی شہری، میرزا ادیب، اختر ہوشیارپوری، مجروح سلطانپوری، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، اوپندر ناتھ اشک، کرشن چندر، جگن ناتھ آزاد، عرش ملسیانی، ڈاکٹر حفیظ سید، ڈاکٹر زبیر صدیقی، الطاف مشہدی، احسان دانش، ایم اسلم، ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، ل۔ احمد وغیرہ وغیرہ۔ ان ہی میں سے ایک نام احمد ندیم قاسمی کا بھی ہے جن سے میری خط و کتابت کا آغاز غالباً اپریل ۱۹۴۱ء سے ہوا۔ اولاً سب رس بابت مئی ۱۹۴۱ء میں ضلع سرگودھا تحصیل خوشاب کے ایک گاؤں "انگہ" کے اس جیالے شاعر کے قطعات شائع ہوئے تھے۔ اس کے بعد ان کی حسبِ ذیل تخلیقات سب رس کے مختلف شماروں کی زینت بنی تھیں۔ ۱۔ تلوار (نظم) جولائی ۱۹۴۱ء ۲۔ انقلاب (سانیٹ) ستمبر جولائی ۱۹۴۱ء ۳۔ محتسب اور میں (نظم) دسمبر ۱۹۴۱ء ۴۔ کیا کر رہا ہوں (نظم) جنوری ۱۹۴۲ء ۵۔ استغفرا (افسانہ) مارچ ۱۹۴۲ء ۶۔ بے وقت آمد (نظم) جولائی ۱۹۴۲ء ۷۔ شہر کی رات (نظم) جنوری ۱۹۴۳ء ۸۔ جانے کون (نظم) مئی ۱۹۴۳ء ۹۔ شاہراہِ حقیقت (نظم) اگست ۱۹۴۳ء ۱۰۔ ایک دوست کی خودکشی (نظم) مئی ۱۹۴۴ء ۱۱۔ آنکھ مچولی (ڈراما) جولائی ۱۹۴۵ء ۱۲۔ جو ہوا ہے (نظم) اکتوبر ۱۹۴۵ء ۱۳۔ کھیل (نظم) مارچ ۱۹۴۶ء ۱۴۔ غزل

سب رس بابت مئی ۱۹۴۱ء میں جو قطعات شائع ہوئے تھے ان میں سے دو کے سوائے باقی سب "رم جھم" کے پچھلے ایڈیشن میں شامل ہیں۔ ان قطعات کے عنوانات یہ ہیں۔ تنبیہ، نظامِ نو، چار راز، رہگذر، ساحل نشین۔ وہ دو قطعات جو "رم جھم" میں شریک نہیں ہیں ہو سکتا ہے کہ ان کے دوسرے مجموعے "دھڑکنیں" میں چھپے ہوں۔ مجھے یہ مجموعہ نہ مل سکا اس لیے ان قطعات کو پیش کر رہا ہوں۔

تیرے ہونے میں کیا زیاں تیرا　　ڈھونڈتا ہے مجھے جہاں تیرا
مجھ سے دعویٰ تجھے نہیں جچتی　　میں تو ہوں ایک ترجماں تیرا

کس قدر ہے بلند میرا مقام　　نقشِ پا ہے مرا یہ ماہِ تمام
عرش کے اس طرف سے میرا وطن　　میرے مذہب میں بے بسی ہے حرام

نظم بھی کیا کہہ رہا ہوں " ان کے مجموعۂ کلام " جلال و جمال " کے صفحہ (۵۵) پر " مرد آزاد " کے عنوان سے شائع ہوئی ہے لیکن آخری شعر حذف کر دیا گیا ہے جو یہ ہے :

قوسِ بتا ندیم کہ دنیا سمجھ سکے کیا کر چکا ہوں اور یہ کیا کر رہا ہوں میں

ایک دوست کی خودکشی پر " جلال و جمال " کے صفحہ (۱۰۷) پر " ایک یار دیرینہ عزیز دوست کی خودکشی پر " کے عنوان سے شائع ہوا ہے شہر کی رات ، جانے کون ، چہرہ ہے اور کہیں ، یہ نظمیں " جلال و جمال " کے صفحات ۱۰۵ ، ۱۸۶ ، ۲۱۴ ، اور ۲۴۱ پر درج ہیں ۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے بعد سے میں جناب احمد ندیم قاسمی کے رشحاتِ قلم سے محروم ہو گیا اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی بند ہو گیا ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جس کا اظہار قاسمی صاحب نے " رم جھم " (۱۹۵۲ء) کے " سرِ آغاز " میں کیا ہے ۔

" دراصل ۱۹۴۶ء کے بعد اب تک کی زندگی کچھ ایسی افراتفری میں گزری ہے کہ میں اس نہایت حسین صنفِ شعر کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکا "

اس افراتفری کے نتیجے کے طور پر ہماری خط و کتابت یک لخت رک گئی ۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد کے بعد میں بھی ذہنی الجھن میں مبتلا رہا ۔ ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء مسلسل گیارہ برس تک ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہو سکی لیکن میرے دل پر قاسمی صاحب کے خلوص و محبت کے گہرے نقوش مرتسم ہو چکے تھے جو مٹائے نہیں مٹ سکتے تھے ۔

اگست ۱۹۵۸ء میں پہلی مرتبہ میں اپنے عزیزوں سے ملنے کی غرض سے سمندر کے رستے کراچی آیا تھا ۔ جب واپسی کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ سمندری جہاز مجھے بروقت نہ مل سکے گا ۔ اس سے مجھے پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ مجھے عثمانیہ یونیورسٹی میں سرما کی چھٹیوں کے فوراً بعد اپنی ملازمت پر حاضر ہونا ضروری تھا ۔ اب مجھے ٹرین کا سفر اختیار کرنے کے سوائے کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا ۔ چنانچہ میں کراچی سے لاہور پہنچا ۔ لاہور سے امرتسر جانے والی ٹرین تین چار گھنٹے بعد روانہ ہونے والی تھی ۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لاہور کے احباب سے ملنے کے لیے پیدل کھڑا ہوا ۔ لاہور میرے لیے بالکل نیا تھا ، رستوں سے ناواقفیت کے باوجود پوچھتا پاچھتا پاکستان ٹائمز کے دفتر پہنچ گیا اور جناب احمد ندیم قاسمی صاحب سے ملاقات کرنے کا میرا دیرینہ آرزو پورا ہو گیا ۔ جناب فیض احمد فیض دفتر میں موجود نہیں تھے اس لیے ان کا دیدار نصیب نہ ہو سکا ۔ اس کے بعد اپنے عزیز دوست جناب حبیب اللہ اوج سے " امروز " کے دفتر میں ملا ۔ اس کے بعد حضرت احسان دانش کے مکتبۂ دانش پر حاضری دی ۔ وہ کسی کام سے یونیورسٹی گئے ہوئے تھے اس لئے ملاقات سے محروم رہا ۔

جناب احمد ندیم قاسمی کا علمی و ادبی دنیا میں جو مقام ہے اس سے کون واقف نہیں ؟ وہ ایک بلند پایہ شاعر ، صاحبِ طرز افسانہ نگار کامیاب ڈراما نویس اور روشن دماغ صحافی ہیں ۔ دو درجن کے قریب کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ہر کتاب کے ایک سے زائد ایڈیشن شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں ۔ ان کی زندگی اور شاعری میں گہرا ربط ہے ۔ دنیا کے نشیب و فراز اور خارجی ماحول کے اثرات نے ان کو زندگی کے حقائق سے قریب تر کر دیا ہے ۔ ان کا موضوعِ سخن زندگی ہے جو نکہت فشاں ، رقصاں ، جواں ، بے کراں بھی ہے اور بے بس ، بے چین ، افسردہ اور سرگراں بھی ۔ وہ ایک شائستہ انسان ، سنجیدہ شاعر اور شگفتہ بیان ادیب ہیں ۔ ان کے اسلوبِ بیان اور طرزِ نگارش میں ایک انفرادیت ہے جس نے ان کی تحریروں کو ممتاز بنا دیا ہے ۔ انسان دوستی ان کی شاعری کا محور ہے ۔ وہ انسانیت کے ہر دکھ کو اپنا ذاتی دکھ محسوس کرتے ہیں ۔ اور یہ احساس ان کی فکر اور شخصیت میں اس طرح رچ بس گیا ہے کہ اس کو ان کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ

انسانی اقدار، خدا ترسی، خدا پرستی اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے علم بردار ہیں۔ ان کی شخصیت میں ترقی پسندی اور قدامت پرستی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جس معاشرے کی یہ پیداوار ہیں، اس کے حسن و قبح پر ان کی گہری نظر ہے۔ کسی مسئلے پر رائے زنی کرتے وقت توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ بس وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے ادب اور معاشرے میں ان کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

موجودہ دور کے صفِ اول کے دانشوروں اور فن کاروں میں جناب احمد ندیم قاسمی کے نام کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان و ادب کے ایک معمار کی حیثیت سے ان کی خدمات کا اعتراف بہرحال ضروری تھا۔ یہ زمانے کا ستم ظریفی ہے کہ ہم کو اپنے باکمالوں کی قدر و منزلت کرنے کا اس وقت خیال آتا ہے جب ہماری تعریف و تحسین کے فلک شگاف نعرے ان کو ابدی نیند سے جگا نہیں سکتے اور وہ ہمارے خلوص سے بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ زندہ قوم کے افراد اپنے محسنوں کی خدمات کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کرتے ہیں۔ یہ شخصیت پرستی نہیں بلکہ اعترافِ حقیقت ہے۔ جناب صہبا لکھنوی مدیر افکار ساری اردو دنیا کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سب سے پہلے مردہ پرستی کی بت کو پاش پاش کر کے زندہ شخصیتوں پر «افکار» کے خاص نمبر بڑی محنت و کاوش اور خلوص و اہتمام سے شائع کیے جو اپنی افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے کسی ادبی شہ پارے سے کم نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افکار کا «احمد ندیم قاسمی نمبر» بھی اپنا جواب آپ ہوگا۔

جناب احمد ندیم قاسمی کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ملاقاتیں کرنے کے مجھے بہت کم مواقع ملے۔ پاکستان آنے کے بعد گزشتہ پندرہ سولہ برسوں میں میری ان سے صرف چار پانچ ملاقاتیں ہوئیں وہ بھی بہت ہی مختصر۔ البتہ ایک بار ان کے ساتھ چند گھنٹے گذارنے کا موقع ملا۔ ۲۰ فروری ۱۹۶۴ء کو ان کے اعزاز میں ایوانِ اردو کی طرف سے استقبالیہ دیا گیا تھا جس میں کراچی کے بیشتر ادیب و شاعر شریک تھے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ محترمہ باجی مسرور، ڈاکٹر معین الحق، سید ضمیر جعفری، ممتاز حسین، ابراہیم جلیس، خواجہ معین الدین مرحوم، مرزا ظفر الحسن، سید بادشاہ حسین، مجیب خیرآبادی، تحسین سروری، عبد الرؤف عروج، اس پر لطف صحبت کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ کیونکہ مجھے پہلی مرتبہ ان کی شخصیت کی عظمت اور کردار کی بلندی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

مجھے اس بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے کہ جناب احمد ندیم قاسمی کا اردو ادب میں کیا مقام ہے۔ میں تو صرف ان کے خطوط کے آئینے میں ان کی شخصیت اور کردار کی ہو بہو تصویر دکھانا چاہتا ہوں کیونکہ میں نے ان کے خطوط میں ان کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسان اپنے مکاتیب میں بے نقاب ہو جاتا ہے خواہ کوئی اپنے آپ کو لاکھ چھپانا چاہے۔ اس کی تحریر اس کے دلی جذبات اور کردار کی غمازی کرتی ہے۔ خط لکھتے وقت آدمی محتاط نہیں رہتا کیونکہ مکتوب الیہ اس کا دوست ہوتا ہے اور دوست سے کوئی بات چھپائی نہیں جاتی۔ اسے یہ گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے خطوط کو مکتوب الیہ محفوظ رکھے گا اور کسی نہ کسی وقت ان کی اشاعت عمل میں آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ خطوط نگاروں میں تصنع، تکلف اور ادبیت سے زیادہ شخصی اور ذاتی حسن و قبح کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ قاسمی صاحب نے میرے پہلے خط کے جواب میں یہ مکتوب روانہ فرمایا تھا۔

بیرون بوہڑ دروازہ

ملتان شہر۔ ۲۰ مارچ ۱۹۶۱ء

محترمی تسلیم۔

گرامی نامہ اور «سب رس» ملے۔ یاد فرمائی کا بے حد ممنون ہوں۔ پرچہ مجھے بے حد پسند آیا ہے اور مجھے اس میں قدیم و جدید ادب کے ایک خوشگوار امتزاج کی ایک ایسی جھلک نظر آئی ہے جو آج کل تمام نہاد ترقی پسند پرچوں کے صفحوں میں سے بہت تیزی سے غائب ہوتی

ہے۔ آپ کی یہ روش قابلِ ستائش ہے۔

میں ان شاء اللہ ہر ماہ سب رس کی قلمی امداد کرتا رہوں گا۔ فی الحال ایک نظم روانۂ خدمت ہے۔ قبول فرمائیے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کا احمد ندیم قاسمی

اس کے تین ماہ بعد جو خط مجھے لکھا تھا اس میں انھوں نے مجھے میرے نام سے مخاطب فرمایا ہے جس سے ان کے خلوص و محبت اور ربط باہمی کا اظہار ہوتا ہے اس زمانہ میں غالباً وہ محکمۂ آبکاری سے منسلک تھے۔ سرکاری مصروفیتوں کے باوجود اپنے رشحاتِ قلم سے "سب رس" کو نوازتے رہتے تھے اور ادارۂ ادبیات اُردو کی خدمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ "سب رس" ان کو کتنا عزیز تھا اور اس کے لیے انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ خط ملاحظہ فرمائیے۔

بیرون بوہڑ دروازہ

ملتان شہر ۱۱

محترم و مکرم خواجہ صاحب نیاز

میں شرمندہ ہوں کہ اس سے قبل آپ کے گرامی نامے کا جواب پیشِ خدمت نہ کر سکا۔ دراصل چند عزیزوں کی علالت اور معلمانہ مصروفیتوں نے ایک دم چین نہ لینے دیا۔ معذرت خواہ ہوں۔ آپ کے ارشاد کے مطابق میں نے برادرم سعادت حسن منٹو سے سب رس کی قلمی امداد کے متعلق خط و کتابت کی۔ لیکن انھیں دنوں ان کا ننھا صاحبزادہ عارف وفات پا گیا اور چونکہ وہ بے حد حساس اور زود رنج ہیں اس لیے ان پر اس سانحہ کا ایسا اثر پڑا کہ اب تک بسترِ علالت پر ہیں اور مجھے خط بھی لکھتے ہیں تو بہت دیر سے۔ جب وہ اچھے ہوں گے تو میں پھر گفتگو کروں گا۔

سب رس کے لیے ایک نظم ارسالِ خدمت ہے، قبول فرمائیے۔ یہ بالکل تازہ نظم ہے اور مجھے بہت عزیز ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی گراں مایہ خدمات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ افسوس کرتا ہوں کہ میں دکن سے اس قدر دور ہوں۔

آپ کا احمد ندیم قاسمی

تیسرے خط میں مجھے "برادرم" کے اعزاز سے سرفراز فرمایا۔ اس خط کو پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ واقعی ایک بھائی دوسرے بھائی کو لکھ رہا ہے۔ اپنی علالت کا ذکر ہے، عیادت کا شکریہ ہے۔ صحت کے لیے دعا طلبی ہے۔ سب سے بڑھ کر اپنے ادبی کاموں سے آگاہی بخشی گئی ہے۔

بیرون بوہڑ دروازہ

ملتان۔ ۷ ستمبر ۱۹۵۱ء

برادرم السلام علیکم

گرامی نامہ ملا، یاد فرمائی اور عیادت کا شکریہ۔ میں ہنوز اسی طرح بیمار ہوں، دعا فرمائیں ستمبر کا پرچہ مجھے مل گیا ہے۔ اکتوبر کے سب رس کا منتظر ہوں۔ ایک نظم ارسالِ خدمت ہے، قبول فرمائیے۔ میں آج کل ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں کی نگارشات کو ایک مجموعے کی شکل میں ترتیب دینے میں مصروف ہوں۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن مجھے میرے دوستوں اور مہربانوں کا اصرار خاموش نہیں ہونے دیتا۔ ایک ضمن میں آپ بھی میری امداد فرما سکتے ہیں، وہ یوں کہ آپ اپنے اثر سے کام لے کر ڈاکٹر محی الدین صاحب زور سے موجودہ

اردو ادب کے متعلق ایک مختصر سا مضمون لکھوا بھیجیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف مجھے جانتے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں میری طرف سے بصد نیاز یہ گزارش پیش کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مجھے مایوس نہیں فرمائیں گے۔ موجودہ ادب کو پوری طرح سمجھنے والوں میں ڈاکٹر صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔

لوٹتی ڈاک میں آپ کے تسلی بخش جواب کا منتظر رہوں گا۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

مخلص　احمد ندیم قاسمی

چوتھے خط میں ڈاکٹر زور صاحب کے مضمون کے لئے یاد دہانی کی گئی ہے۔ اور زیر ترتیب مجموعے کے مضمون نگاروں کے ناموں کی تفصیل لکھی ہے۔ کتاب کے مندرجات کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ یہ وہی ادیب کر سکتا ہے جس کو اپنے دوستوں پر کامل اعتماد اور خود علم و ادب کا سچا ذوق رکھتا ہو۔ اس خط کو پڑھ کر آپ بھی کچھ محسوس فرمائیں گے۔

ملتان چھاؤنی ۲۶

محترم و مکرم　سلام علیکم

بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے جناب ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور) کی خدمت میں میری معروضات پیش کر دیں۔ مجھے یقیناً ہے کہ وہ مزید میری امداد فرمائیں گے۔ یہ مجموعہ جنوری کے اوائل میں پریس میں جائے گا چونکہ یہ سلسلہ جنبانی ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔ اس لیے فی الحال جناب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب نے اپنا مضمون، جناب شاہد احمد صاحب دہلوی نے ڈرامہ، محمد حسن عسکری، منٹو اور شفیق الرحمٰن نے اپنے افسانے اور اختر شیرانی، حامد علی خاں اور مجاز نے اپنی نظمیں بھیجی ہیں۔ جناب فراق گورکھپوری صاحب نے ایک مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ نیز پروفیسر فیض احمد صاحب کے مضمون کی توقع ہے۔ مضامین کے عنوان میں نے مقرر نہیں کئے، یہ لکھنے والے کی مرضی پر موقوف ہے۔ موجودہ رجحانات کے مطابق وہ خود ہی سرخیاں انتخاب فرمائیں گے۔ شعرا اور افسانہ نگار وہی ہیں جن پر اردو کو ناز ہے اور ناز رہے گا۔ مضمون نگاروں کی فہرست میں مندرجۂ ذیل اصحاب ہیں ۱۔ ڈاکٹر زور صاحب ۲) پروفیسر فراق گورکھپوری ۳) پروفیسر حمید احمد خاں ۴) پروفیسر فیض احمد صاحب ۵) ن۔م۔ راشد ایم۔اے ۶) مولانا عبدالمجید سالک مدیر انقلاب۔

مجھے یقین ہے کہ میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب سے بھی ایک مضمون حاصل کر لوں گا۔ جناب ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں تاکیداً عرض کریں کہ ان کے مضمون کے بغیر میری کتاب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جو ہر پڑھنے والے کو کھٹکے گا۔ موجودہ اردو ادب کے متعلق ان کی رائے صائب ترین ہے اگر آپ ان کا پتہ مجھے تحریر کریں تو بڑا احسان ہوگا۔ میں دو ماہ کی رخصت پر اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔ اس لیے مجھے "سب رس" مندرجۂ ذیل پتہ پر بھیجئے۔ اور اس عریضے کا جواب بھی۔

ندیم معرفت پیرزادہ محمد بخش قاسمی بی۔اے۔ بی ٹی۔ گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرہ ضلع سرگودھا (پنجاب)

میں آپ کے تسلی بخش گرامی نامے کا شدت سے انتظار کروں گا۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں نیاز۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ والسلام

نیازکیش　احمد ندیم قاسمی

مندرجۂ ذیل خط گزشتہ خطوط کے تقریباً چار سال بعد کا ہے اس میں وطن الحبوں اور بیماری کا ذکر کیا گیا ہے۔ غالباً وہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت سے علحدہ ہو چکے تھے۔ قاسمی صاحب نے "سب رس" کے لئے ہمیشہ بلا معاوضہ لکھا۔ "سب رس" کی مالی حالت اس قابل نہ تھی کہ کوئی اعزازیہ ان کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔

انگہ۔ تحصیل خوشاب، ضلع سرگودھا (پنجاب)

۳۱ مئی ۱۹۴۵ء

برادر محترم، سلام مسنون

بے حد شرمندہ ہوں کہ اتنے عرصے سے نہ آپ کو خط لکھ سکا اور نہ "سب رس" کے لئے کوئی چیز پیش کر سکا۔ عفو خواہ ہوں اور مجھے امید ہے کہ میری مجبوریوں کے مدنظر آپ درگذر سے کام لیں گے۔ یکم ستمبر ۱۹۴۴ء سے دل و دماغ کے چند خطرناک عوارض میں مبتلا ہوں۔ لاہور میں محض اس لئے پڑا رہا کہ "ادب لطیف" کے مقدمات شکار نہ لگیں۔ ۱۲ مئی کو مجھے اور منٹو کو بری کر دیا گیا اور میں فوراً اپنے گاؤں آ گیا۔ صحت کر رہا ہوں۔ لکھنا پڑھنا مدت سے چھوٹ چکا ہے۔ محض وقتی دلچسپی کے لئے ادب لطیف کی ادارت کا کام کرتا رہا ہوں، مگر اب شاید یہ بھی وہ بھی جاری نہ رکھ سکوں۔ یہاں گاؤں میں موسم گرما گذاروں گا۔ میرا پتہ مستقل طور پر بدل دیں تاکہ "سب رس" باقاعدہ ملتا رہے۔ پتہ میں نے اوپر درج کر دیا ہے میری صحت کے لئے دعا فرمائیں۔ بہت ناکارہ ہو چکا ہوں۔

سب رس کے لئے دو چیزیں ارسال ہیں ایک تو ڈرامہ ہے جسے نقل کرانے میں اتنی تاخیر ہوئی کہ آپ کے گرامی نامہ کا وقت پر جواب نہ دے سکا۔ آج ہی میرے دو چار عزیز اسے نقل کر کے لے آئے ہیں، سو وہ حاضر ہے۔ میرا نہایت اچھا ریڈیائی ڈرامہ ہے، امید ہے آپ پسند کریں گے۔ دوسری چیز تازہ قطعات ہیں۔ میری کتاب بھی ڈیڑھ مہینے کے اندر چھپ جائے گی۔ اگر انھیں سب رس کی کسی قریبی اشاعت میں نمایاں مقام پر شائع کریں تو احسان ہوگا۔ یہاں سے میں سب رس کے لئے ان شاء اللہ باقاعدہ لکھتا رہوں گا۔ تندرست ہو لوں، فی الحال تو کسی کام کے قابل نہیں ہوں۔ تین چار سال ہوئے۔ آپ نے محترمی ڈاکٹر زور صاحب سے مجھے قطب شاہی دور کی زبان کے عنوان سے ایک مقالہ لے دیا تھا کیا وہ چھپ چکا ہے؟ اگر نہیں تو میں اسے استعمال میں لے آؤں۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کے گرامی نامہ کا سخت انتظار رہے گا۔ والسلام

آپ کا بھائی　احمد ندیم

(بقیہ:- ادبی سرگرمیاں)

کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، ڈاکٹر غیاث صدیقی، خیرات ندیم، وقار خلیل، مرزا سرفراز علی، منوہر لال بہار، علامہ صلاح الدین نیر، محمد منظور احمد، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، علی الدین نوید، رؤف خلش، غیاث متین، رؤف خیر، جوہر ہاشمی، صادق نقوی، علی سرور، عباس ماجد، اور منیر الزماں منیر کے علاوہ عظمت عبد القیوم، بانو طاہرہ سعید، ڈاکٹر اشرف رفیع، زبیدہ تحسین، احمد منظور النساء ناز نے کلام سنایا۔

● محفل خواتین کا ادبی اجلاس و مشاعرہ ڈاکٹر فرحت لطیف الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مظفر النساء ناز اور قمر جمالی نے کہانیاں سنائیں، خاتین شعراء نے کلام پیش کیا۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے شکریہ ادا کیا۔

۲۹ مارچ یوم محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں ایوان اردو کے آڈیٹوریم میں شب غزل کا اہتمام کیا گیا جناب یس آر واستو جناب خصوصی تھے جناب خواجہ بہاؤ الدین نے معتمد کے فرائض انجام دیئے۔ حیدرآباد کے مشہور موسیقاروں وٹھل، پریم لتا، جاوید رضا، غضنفر تنویر اور کئی فنکاروں نے سازوں پر حیدرآبادی شعراء کی غزلیں سنا کر داد حاصل کی۔

● اقبال اکیڈیمی کی اطلاع کے بموجب سہ ماہی "اقبال ریویو" اردو اور انگریزی میں ماہ اپریل سے شائع ہو رہا ہے جس کے مدیر جناب محمد ظہیر احمد ہوں گے۔ مجلس مشاورت میں ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، جناب جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ اور مولانا سید مبارک حسین کے نام شامل ہیں۔

طیب انصاری

نصرتی کی رزمیہ شاعری

جس طرح ہم چاسر کو انگریزی ادب کا باوا آدم قرار دیتے ہیں اسی طرح نصرتی کو بھی دکنی اردو شاعری کا باوا آدم قرار دیا جاسکتا ہے — چاسر کی طرح نصرتی نے بھی انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا ہے ۔ اور جس طرح چاسر کے بعد انگریزی ادب میں شیکسپیئر اور ڈکنس ایسے شہرۂ آفاق شاعر پیدا ہوئے اسی طرح اردو میں نصرتی کے بعد حالی اور اقبال نے جنم لیا۔ چاسر کی طرح نصرتی نے بھی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد کے خیالات و جذبات کی آئینہ داری کی ہے۔ اس کی بہترین مثال "علی نامہ" اور "تاریخ اسکندری" ہیں۔

بہرحال چاسر اور نصرتی کے درمیان ایک طرح کی مماثلت کے باوصف بنیادی اختلاف بھی ملتا ہے۔ بلاشبہ دونوں ہی نے ادب کے دورِ نشاۃ الثانیہ کے ادیبوں اور شاعروں کی طرح انسان دوست خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انسانی اقتدار کا قصیدہ پڑھا ہے اور دونوں ہی کے یہاں حب الوطنی کے جذبات ملتے ہیں۔ لیکن چاسر کی طرح نصرتی منکرِ خدا نہیں ہے۔ جہاں نصرتی نے وطن کے گیت گائے ہیں وہیں وہ خدائے بزرگ و برتر کی حمد و ثنا بڑے انہماک و عقیدت سے کرتا ہے۔ اس کے یہاں خدا کی ذات پر کامل ایقان ملتا ہے۔ کہتا ہے "خدا کی جتنی حمد و ثنا کی جائے اس کو سزاوار ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے عین حکمت ہے" یہی ایقان کی منزل ہے جو نصرتی کے مرتبہ کو بلند کرتی ہے۔

نصرتی کی شاعری کا مطالعہ اس بات کی شہادت پیش کرتا ہے کہ اردو ادب کا ابتدائی سرمایہ کہیں زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ حضرت بندہ نواز اور دوسرے صوفیائے کرام کی تحریریں اس بات کی شاہد ہیں۔ نصرتی اور اس کے ہم عصروں کے زمانہ میں یقیناً حسن و عشق کی طلسماتی داستانیں بصورت مثنوی تحریر تو ہوتی رہی تھیں تاہم ان مثنویوں کی ابتداء حمد باری تعالیٰ سے ہوا کرتی تھی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اولیائے کرام اور شعرائے عظام نے اردو کے اس ابتدائی دور میں ادب کو انسانیت نواز قدروں کی تبلیغ و ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ چونکہ نصرتی صوفی نہیں تھا بلکہ وہ ایک قومی شاعر تھا۔ اس لئے اس کی شاعری میں مذہب اور تہذیب کے ساتھ ساتھ تاریخی بصیرت ہی اثر انداز نظر آتی ہے۔ یوں تو نصرتی کا پیشہ آبا و اجداد کی طرح سپاہ گری تھا لیکن خود اس کا تعلق عادل شاہی دورِ حکومت کے عروج کے زمانہ سے رہا اور وہ علی عادل شاہ ثانی کا مقرب خاص بھی تھا اس لئے اس کی شاعری میں اپنے دور کے سیاسی مسائل کی بہترین عکاسی بھی ملتی ہے۔ اور تاریخ اسکندری اسی دور کے زوال کی المناک کہانی کو زبانِ حال سے بیان کرتی ہے۔ جس طرح ہومر نے اپنی شاعری کے ذریعہ یونانیوں کی اخلاقی سطح کو بلند کرنا چاہا تھا۔ اس نے اپنے بیشتر شعراء کی تقلید میں رزمیہ انداز بیان اختیار کیا تھا اور تیلی نگ میں تہذیبی اقدار اور ثقافت و ذوق ہم زندگی کی جھلکیاں پیش کیں۔ اسی طرح نصرتی نے بھی علی عادل شاہ کے زمانہ بیجاپور کی اخلاقی و تہذیبی اور سیاسی سطح کو بلند کرنا چاہا۔ اس نے بھی رزمیہ انداز میں اپنے دور کے شاہوں کے سیاسی اور فوجی کارناموں کو شعور کے ساتھ پیش کیا۔

ان کی فاتحانہ نظام کی جھلکیاں دکھائیں اور فتوحات پر اپنی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔ اسپنسر نے Faerie Queene میں اپنے فوق البشر کا تصور شاہزادہ آرتھر کی صورت میں پیش کیا ہے جب کہ نصرتی کا فوق البشر ایک زندہ اور طاقتور شاہزادہ علی عادل شاہ ثانی ہے جو کسی شہزادی گوہر یانہ کا عاشق زار نہیں ہے بلکہ جسے اپنے عوام سے پیار ہے اور جو ملک میں پُرامن فضا کو بحال رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور بحالت مجبوری تلوار اٹھاتا ہے۔ کیونکہ بقول نصرتی سے کیا توں لوحا نالۂ صلح کل۔ " اور پھر تلوار کی تعریف کرتا ہے اور لوہے کی خوبیاں بیان کرتا ہے اور خدا کی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " تُو نے جس کسی کو بڑائی کے لئے پیدا کیا ہے اس کے بغیر تلوار کے نہیں رکھا"۔ نصرتی سپاہی زادہ تھا، اس لئے اس نے ہتھیار اور طاقت کے بارے میں بڑی خوبی سے اظہار خیال کیا ہے۔ وہ شاعر نہیں بلکہ یہاں ایک فوجی کی نظر سے زمین و آسمان پر نظر ڈالتا ہے۔ تب ہی تو وہ سورج کو چمکتی ہوئی تلوار، سمندر کی موجوں کو بہ ہتیار، زرہ اور آگ کے شعلوں کو ہزاروں خنجر سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ گلشن عشق کے اس رومان پرور شاعر کو پھول بھی "سپر" نظر آتے ہیں اور غنچہ "بھالا" دکھائی دیتا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ نصرتی معشوق کی نظر میں تیزی اور ابرو اور ان کی آنکھوں کو تیر و کمان سے تشبیہ دیتا ہے۔ وہ اپنے فوق البشر سے بے حد خوش ہے اور اس کی تعریف میں قلم کہیں نہیں رُکتا۔ علی عادل شاہ ثانی کی شجاعت اور دلیری کے واقعات کو وہ جھوم جھوم کر بیان کرتا ہے

سکھاؤں تا مدح شاہ زماں　　کہ ثانی سکندر ہے صاحب قراں،
قلم آج مجھ جو جہانگیر ہے　　صفت شہ کے لکھنے کی تاثیر ہے،
رہے شاہ عادل سہی ولی،　　علی ابن سلطان محمد بلی،
تیرا چتر خورشید کا سایہ باں،　　منگے تجھ علم کا پناہ آسماں،
تری ذات تھے ہے شجاعت کو ناؤں　　کہ پالیا ہے کر تیغ کی جس پہ چھاؤں
صفت تجھ کھڑگ صف میں کرتیں بیاں　　پڑے موں میں چیونٹی کے آری زباں
ترے ہاتھ تے نت آبرو پائے تیغ　　کہ جوں فیض پاتا ہے دریا تھے میغ

(مطلب: اب میں شاہ زماں کی مدح بیان کرتا ہوں جو صاحب قراں اور سکندر ثانی ہے) یہ بادشاہ کی صفت لکھنے کی تاثیر ہے کہ میرا قلم آج جہاں پر چھایا ہوا ہے۔ تیرا چتر آفتاب کا سایہ بان ہے اور آسمان تک تیرے جھنڈے کی پناہ مانگتا ہے۔ شجاعت کا نام تیری ذات سے ہے کیونکہ اسے تو نے تلوار کی چھاؤں تلے پالا ہے۔ اپنی صفوں میں تلوار کی صفت کرتے کرتے چیونٹیوں کی زبان لال ہے۔ تیرے ہاتھ سے تلوار ہمیشہ اس طرح ابرو پاتی ہے جیسے بادل دریا سے فیض پاتے ہیں"۔ از مولوی عبدالحق"۔

پروان چڑھتی ہوئی تہذیب، مستحکم حکومت، بھائی چارہ اور امن و سلامتی کی فضا کو دیکھ کر، نصرتی اپنے شہر اور ملک پر بہزار جان سے وارفتہ و فریفتہ نظر آتا ہے۔ اس لئے محلوں کے حلے اور سپاہی کی ریشہ دوانیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اور جب فوجی ہنگاموں میں علی کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ پھول کی طرح کھل اٹھتا ہے۔ بیجاپور میں ایسے موقعوں پر جو روشنیاں اور خوشیاں رقصاں ہوا کرتی تھیں اور خوشی کے جو شادیانے بجائے جاتے تھے ان تمام کا عکس اور رنگ ہمیں علی نامہ میں نظر آتا ہے۔

سودا، ذوق اور غالب نے جو قصیدے لکھے ہیں اگر وہی صحیح معنوں میں قصیدے ہیں تو "علی نامہ" ان معنوں میں قصیدہ نہیں ہے۔

فردوسی کا "شاہنامہ" ہو کہ آذری کا "بہمن نامہ" اپنی طوالت اور جامعیت کے اعتبار سے قصیدے کی تعریف میں نہیں آتے یہ ایک دور کی مکمل تاریخ ہیں، منظوم تاریخ، اور ان کارناموں کو منظوم تاریخ ہی کا نام دیا جانا چاہیے۔ کیونکہ اس میں محض مدح سرائی نہیں ہوتی بلکہ واقعات بیان کئے جاتے ہیں، فتح و شکست کے واقعات۔ کم از کم میں علی نامہ اور تاریخ اسکندری کو قصیدہ نہیں منظوم تاریخ کہنے پر ہی اصرار کروں گا۔ اس کی دوسری اہم وجہ صحت واقعات بھی ہے۔ غلو کا عمل دخل نظر نہیں آتا۔ قصیدہ میں غلو اور اکثر اوقات جھوٹی تعریف بھی شامل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں "علی نامہ" کو رزمیہ شاعری کا نام بھی دیا جاتا ہے حالانکہ اس میں جہاں رزم کی ہوشناکیاں ہیں وہیں بزم کی عیش پرستیاں بھی شامل ہیں۔ رزم و بزم کی تاریکیاں اور روشنیاں بیک وقت اپنے پورے شباب کے ساتھ "علی نامہ" میں جھلکتی ہیں۔ اس لئے رزمیہ، بزمیہ یا نشاطیہ شاعری کا نام بھی نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں، علی نامہ کے بعض اقتباسات کو قصیدہ کے طور پر آپ پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ بہرحال ایک کل کا جزو ہی اور رہیں گے۔ اس لئے نصرتی، سودا اور ذوق کا پیشرو ہوتے ہوئے بھی وہ ان سے مختلف ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ نصرتی نے تاریخ نویسی کے لئے مثنوی کی صنف کو برتا ہے۔ ایسے ہی جیسے بعد کو حالی نے "مد و جزر اسلام" کے لئے اور انیس نے واقعات کربلا کو بیان کرنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔

تاریخ بیتے ہوئے زمانہ کی سچی کہانی کو کہتے ہیں۔ واقعات حقائق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں تسلسل بھی ہوتا ہے۔ تاریخ محض سیاسی ہتھکنڈوں کی داستان نہیں ہوتی۔ اس میں سماجی، اخلاقی، معاشی اور تہذیبی اقدار کو ایماندارانہ طریقہ پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے علی نامہ ایک مکمل تاریخ ہے۔ علی نامہ میں واقعات حقیقت پر مبنی ہیں، ان میں تسلسل ہے اور سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے ساتھ ساتھ سماجی اور تہذیبی اقدار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

۱۰۶۸ھ میں جب سلطان محمد عادل شاہ کا انتقال ہوا تو اس کا کمسن بیٹا علی عادل شاہ ثانی تخت نشین ہوا۔ علی عادل شاہ اپنی اولوالعزمی، بلند ہمتی، دانشمندی اور دور اندیشی سے بہت جلد ایک طاقتور بادشاہ کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے۔ بحیرۂ عرب اور خلیج بنگال کو چھونے والی سلطنت بیجاپور اپنے دور کی سب سے بڑی سلطنت تھی اور اس وسیع سلطنت کو قابو میں رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا چہ جائے کہ فتوحات کے نئے جھنڈے گاڑے جائیں۔ علی عادل شاہ کی فتوحات بے شمار ہیں۔ اور ان فتوحات کے دائرہ میں سیاسی، تہذیبی اور ادبی کارنامے شامل ہیں۔ تاہم ابتدائی زمانہ میں بہت سی پریشان کن دوانیوں اور درباری سازشوں کا سامنا تھا۔ اورنگ زیب کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے اور یہی کچھ کیفیت سیواجی کی بھی تھی۔ ادھر اندرون سلطنت امراء کی غداری طرح طرح کے مسائل کھڑا کرتی رہی۔ لیکن ابتدائی مراحل ہی میں علی عادل شاہ نے پامردی اور جواں ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں کے دانت کھٹے کردیئے۔ نصرتی نے ان تمام جنگی فتوحات کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ اور بقول مولوی عبدالحق "اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب، بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ حسن بیان اور زور کلام کے تمام اسلوب برتتے ہوئے کہیں تاریخی صحت سے تجاوز نہیں کیا۔"

"علی نامہ" کی ابتدا میں حمد باری تعالیٰ ہے جو خدا کے بارے میں یوں رطب اللسان ہے، کہتا ہے کہ "تعریف اس قوی قادر کو زیبا ہے کہ جو بے آسراؤں کا آسرا ہے جس نے سکندر کو دارا پر غلبہ دیا اور شیر کے پنجے کو ہاتھی سے زیادہ قوت بخشی، تو نے رستم کے دست و بازو میں وہ زور دیا کہ اس سے جو دیوؤں کے دلوں میں دہشت بیٹھ گئی، وہی غالب کو مغلوب کرنے والا ہے اور وہی طالب کی طلب کا مطلوب ہے۔ الٰہی تو قوی ہے اور قوت بھی تجھ کو سزاوار ہے تو اگر نہ دیتا تو کسی کے ہاتھ کچھ نہ آتا ـــ اس طرح

نصرتی کے ان خیالات کا اندازہ بھی ہوتا ہے جن سے خدا کے قوی، برتر اور مختار کل ہونے کا پتہ چلتا ہے وہ شاہ پرست ہونے کے باوجود شاہ کی اس انداز میں پرستش نہیں کرتا کہ جس کی وجہ سے شرک کا الزام عائد ہو۔ وہ بادشاہ کو خدا کا محتاج بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ خدا ایسا ہے جو چاہے اعطاء میں حد قائم کی اور دونوں میں تلوار کی دیوار کھڑی کر دی۔ اس حمد میں نصرتی نے جن اچھوتے اور نایاب خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ذہین ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھا لکھا بھی تھا اور قرآن، حدیث اور علم التاریخ پر اس کی گہری نظر تھی۔ مناجات اور منقبت میں بھی کچھ ایسے ہی بلیغ اور پاکیزہ خیالات ظاہر کئے ہیں۔ بادشاہ کی تعریف میں تو اس نے زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اور نت نئی تشبیہات اور استعاروں کو برمحل استعمال کیا ہے۔ اصل واقعات کو بیان کرتے ہوئے اس نے اپنی اسی قدرت اور کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ واقعات جنگ ہوں یا حالات سلطنت، دربار کا تذکرہ ہو کہ بازار کا ذکر اس نے ہر جگہ جنبش قلم سے زندگی پیدا کر دی ہے۔ مولوی عبدالحق نے بڑی تفصیل سے "علی نامہ" کا جائزہ لیا ہے اور کوئی نکتہ ایسا نہیں رہ گیا جس کا ذکر کرنا ضروری تھا۔ تاریخی واقعات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مولوی صاحب کی مرتبہ کتاب "نصرتی" کا مطالعہ کریں۔

علی نامہ کا مطالعہ ختم کرتے ہوئے مولوی عبدالحق نے اعتراف کیا ہے کہ "اس میں شبہ نہیں کہ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف قدیم دکنی اردو میں بلکہ تمام اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی، اس پر جو اس نے بار بار فخر کیا ہے کچھ بیجا نہیں"۔

نصرتی کا تیسرا اور آخری مثنوی کارنامہ "تاریخ اسکندری" ہے اور بقول مولوی عبدالحق اس کا سوائے ان کے یہاں، دنیا میں کہیں بھی اس کا دوسرا نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ اس میں علی نامہ کی طرح یہ "فتح نامہ" نہیں ہے، بلکہ اس میں ایک حکومت کے زوال، تہذیب کے خاتمہ اور شہر کے اجڑنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ اسکندری بادشاہ وقت سکندر عادل شاہ کے زمانہ کے واقعات کا بیان ہے۔ اس کلام کے مطالعہ کے وقت نصرتی کی ذہنی کشمکش اور قلبی واردات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایک دل تھا بجھ گیا ـــــ شہر کے اجڑنے کی داستان بڑی دل خراش اور المناک ہے، نصرتی یہاں بے چین اور بے قرار نظر آتا ہے، اسے ایک پل چین نصیب نہیں، وہ سکندر کی کم عمری اور عمائدین سلطنت کی بے حسی کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ نصرتی کا المیہ یہ ہے کہ وہ محض شاعر تھا۔ عنان سلطنت، خواص خاں، بہلول خاں، اور عبدالمجید کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ محض تماشائی تھا اور اس کی آنکھوں نے بالآخر وہ تماشہ دیکھا جس کے دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی۔ نصرتی کو اپنے عہد سے بے پناہ محبت تھی، وہ بیجاپوری سلطنت کا عاشق اور بیجاپوری تہذیب کا دیوانہ تھا اس لئے علی عادل شاہ ثانی کے دور میں بیجاپور کی ہشت پہلو ترقی کو دیکھ کر کھل اٹھتا ہے اور ایک ایک کر خوشیوں کے ترانے گاتا ہے لیکن جب ۱۶۷۲ء میں شاہ کا انتقال ہو جاتا ہے تو یہ موت کسی بادشاہ کی موت نہ تھی بلکہ نصرتی کے ذوق الجشن کی موت تھی۔ سکندر کی تخت نشینی، عبدالمجید کا وزیر سلطنت بننے سے انکار، مغلوں کے حملے، سیواجی کی ریشہ دوانیاں، اور درباری سازشیں، بیجاپور کی بستی مسکراتی سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چراغ گل کر دیا۔ چونکہ تاریخ سکندری ستوط بیجاپور سے کچھ دو دو برس پہلے تک لکھی جاتی رہی اس لئے زوال کا اور زوال کے بعد کے حالات کا اس میں ذکر نہیں، بلکہ بہلول خاں کی سیواجی کے مقابلہ میں فتح پر اپنی مسرت کا اظہار "فتح یافتن نواب بہلول خاں برلشکر سیواجی و ادرا ہزیمت دادن" کے زیر عنوان کی۔ اس فتح کے بعد کے واقعات سے تاریخ اسکندری خالی ہے۔ لیکن مثنوی کا ابتدا میں جو تمہید باندھی ہے اور حمد میں جن اور اس احساسات و خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ

نصرتی کی دور رس نگاہوں نے سلطنت کے انجام کو دیکھ لیا تھا۔ علاوہ ازیں جس شاعر نے عمر بھر حکومت کی شان و شوکت کو اپنا موضوع بنائے رکھا وہ زوال کی دل گداز داستان کو بیان کر نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے حکومت کے خاتمہ پر خاموشی اختیار کرلی، پھر قلم نہیں اٹھایا، یا شاید گوشہ نشین ہو گیا۔ گویا بیجاپوری سلطنت کے زوال نے نصرتی جیسے بلبل ہزار داستان کو بھی برباد کر دیا تھا۔ بیجاپوری حکومت کا خاتمہ ایک خاندان کی تباہی کا سبب تھا جب کہ ایک شاعر کی خاموشی دنیائے ادب کا زبردست نقصان تھی۔ ایک ایسا نقصان جس کی برسہا برس تک تلافی نہ ہو سکی۔

محمد قلی اگر صرف قطب شاہی خاندان کا ایک عام فرمانروا ہوتا تو صرف انھیں طالب علموں کو اس کے کارنامے یاد رہتے جنھوں نے کوئی امتحان کامیاب کرنے کی خاطر دکن کی تاریخ کو پڑھا ہو۔ لیکن آج وہ دکن کے ہر آدمی کو اس لیے یاد ہے، اس لیے محبوب ہے کہ وہ ہماری مشترکہ تہذیب کو سنوارنے والا، ہمارے اس پیارے شہر کو آباد کرنے والا، لوگوں کے دلوں کو جوڑنے والی روایات کو قائم کرنے والا۔ شاعر مزاج صناع اور صنعت کار شاعر تھا۔ ابھی تک اردو زبان کے متعلق جتنی کچھ تحقیق ہوئی ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ادب کی تاریخ میں دکن کو اولیت حاصل ہے اور یہ پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قرار پاتا ہے۔ اس کی شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلوب وادا میں اتنی پختہ کاری پیدا ہو چکی تھی کہ اس سے پہلے بھی اور صاحب دیوان شاعر گزرے ہوں گے لیکن ان کا مجموعہ کلام دستیاب نہیں ہوا اس لیے اولیت کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔

محمد قلی مخلوط النسل تھا۔ اس کا باپ ابراہیم قلی ترک تھا اور ماں بھاگ رتی تلنگی تھی۔ ان دونوں نسلوں کی نمایاں خصوصیات، عادات و اخلاق اسے ورثہ میں ملے تھے اس لیے وہ صحیح معنوں میں حیدرآبادی یا دکنی کہا جاتا ہے۔ ابراہیم بھی اپنی رعایا میں وسعت نظر اور رواداری کی وجہ سے بہت محبوب رہ چکا تھا اس لیے محمد قلی کو وسیع مشربی قائم رکھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ اس کا مسلک ہر ایک کو اپنانے اور ہر ایک سے محبت کرنے کا تھا۔ اسے حیدرآبادی کلچر کا بانی کہا جاتا ہے حالانکہ کسی ایک شخص کے لیے کلچر کا بانی ہونا ممکن نہیں۔ کلچر کی روایات بہت سی باتوں کے میل جول کا نتیجہ ہوتی ہیں اور ان کے بنانے میں بہت سے انجان اور گمنام لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ لیکن وہ ان روایات کا سب سے بڑا محافظ اور پروان چڑھانے والا ضرور ہے۔

محمد قلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بیک وقت تین زبانوں کا شاعر تھا۔ تلنگی، فارسی اور دکنی۔ تلنگی کلام کا اندازہ ہمیں نہیں۔ فارسی غزلوں کے جو تراجم اس کے ہاں ملتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خواجہ حافظ سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ زندگی کو عیش و نشاط میں گزارنے کا قائل ہے گویا سورۂ رحمٰن میں گنوائی ہوئی ساری نعمتوں سے لطف اندوز ہونے ہی کو عبادت سمجھتا ہے۔ اس کی دکنی شاعری فارسی اور تلنگی شاعری کی پوری خصوصیات سے فائدہ اٹھاتی ہے۔

(زینت ساجدہ)

حیدرآباد کے شاعر ـ ۴

رگھونندن راج سکسینہ الہام

سنہ ۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ

امجد کے بعد دکن میں اُردو رباعی کی تقدیس کو دوشہ بنانے والوں میں ڈاکٹر رگھونندن راج سکسینہ الہام کا نام سرِفہرست نظر آتا ہے ان کی شخصیت اور ان کی فکر دونوں میں بھرپور ہم آہنگی ملتی ہے۔ الہام کی رباعیات کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" سے چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا "الہامِ ثانی" کے نام سے دوسرا انتخاب چند سال پہلے طبع ہو کر سخن سنجوں سے دادِ سخن لے رہا ہے۔ ڈاکٹر الہام سنہ ۱۹۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ والدِ گرامی کا نام رائے کشن لال تھا آپ نے جامعہ عثمانیہ سے طب یونانی کی تکمیل اردو ذریعہ تعلیم میں کی۔ گزشتہ تقریباً ۴۰ سال سے ڈاکٹر سکسینہ حیدرآباد کے مقبول ترین وضعدار اور انسان دوست طبیبِ حاذق کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر سکسینہ کے خاندان کی اُردو دوستی، دکن اور اربابِ دکن سے والہانہ تعلق، قومی یکجہتی اور رواداری و اتحاد کی عہد ساز تاریخ کا روشن باب ہے۔ ڈاکٹر زورؔ اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے آپ کا اور آپ کے گھرانے کا روشن ربط رہا ہے۔ ڈاکٹر الہام، ڈاکٹر زورؔ کے ہم درس اور ہم خیال ہی نہیں اُردو تحریک کے فروغ میں قدم قدم ساتھ رہے ہیں اور آج بھی ادارہ کو آپ کے بھائی پروفیسر مہندر راج سکسینہ (نائب صدر) اور برادر زادہ جناب رمن راج سکسینہ (رکن ادارہ، شریک معتمد) کا تعاون حاصل ہے۔

(ش۔ ر خ)

ایک ایک نفس جو آکے پھر جاتا ہے
انسان فنا کے ہاتھ گھر جاتا ہے
غافل ہشیار رہ کہ جسمِ خاکی
چلتے پھرتے زمیں پہ گر جاتا ہے

جز خدمتِ خلق اور کچھ کام نہیں
مقصود نہیں نمود اور نام نہیں
کی قدر نہ لوگوں نے تو یہ کیا کم ہے
سچ جھوٹ کا ہم پہ کوئی الزام نہیں

ہر ایک کے درد دکھ پہ رو لیتا ہوں
دن رات اسی میں جان کھو لیتا ہوں
ملتا نہیں کچھ اگر تو پروا کیا ہے
بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیتا ہوں

یہ خمسۂ حیات، توبہ توبہ
یہ رشتۂ بے ثبات توبہ توبہ
کچھ بھی مری توبہ کا نہیں ہے قائل
پھر ڈھاک کے تین پات توبہ توبہ

تقدیر میں عاشقوں کے چاہت آئی
اور حسن کے حصّہ میں ملاحت آئی
ہم کو وہ ملا دیدۂ بینا جس سے
ہر شے میں نظر اُس کی شباہت آئی

آئین و ادب کا اک دقیقہ رکھو
ہر کام میں ایک طور اک طریقہ رکھو
اچھی نہیں زندگی میں بے ترتیبی
ہر بات میں اپنی اک سلیقہ رکھو

کیا قدر دکن میں لعل اور گوہر کی
کیا مانگ ختن میں نافۂ اذفر کی
کاوش کا مری یہاں خریدار کہاں
مرغی ہے دال کے برابر گھر کی

میں خدمتِ خاص و عام کر لیتا ہوں
آرام اپنا حرام کر لیتا ہوں
کل جینے کا مرے بھروسہ کیا ہے
زندہ ہوں آج کام کر لیتا ہوں

قسمت میں کسی کے شادمانی آئی
تقدیر کسی کے کامرانی آئی
اللہ کا یہ کرم ہے اور کیا کہیے
حصّے میں جو میرے سخت جانی آئی

حیدر آباد کے بڑے لوگ
سلسلہ (۲)

غلام جیلانی

بیرسٹر اکبر علی خاں

میر اکبر علی خاں صاحب شہر حیدر آباد میں ۱۶ رجب ۱۳۱۷ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار میر محبوب علی خاں صاحب ایک وضعدار جاگیردار تھے۔ انھیں وضعداری جو ورثہ میں ملی وہ آج بھی قائم ہے جس کی بدولت میر اکبر علی خاں صاحب کو حیدر آباد کی قدیم تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ بخت و اتفاق نے انھیں بہ زمانہ طالب علمی تحریک ترک موالات سے ملحق کر دیا اور تعلیم ترک کرنے پر اکسایا لیکن یہ صورت زیادہ دن قائم نہ رہی کیوں کہ انھوں نے کچھ عرصہ بعد یہ محسوس کیا کہ قوم و ملک کی خدمت کے لئے تعلیم ترک کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں اس کے بجائے زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر بہتر طریقے پر قوم و ملک کی خدمت انجام دی جا سکتی ہے۔

میر اکبر علی خاں صاحب کی ابتدائی تعلیم کتھری خاندان کے مشہور مدرسہ "مفید الانام ہائی اسکول" میں ہوئی، انھوں نے اسی ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد کچھ مہینے نظام کالج میں تعلیم پاتے رہے، پھر ڈگری کورس کی تکمیل کے لئے علی گڈھ روانہ ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب علی گڈھ یونیورسٹی کے اکثر طلبہ مہاتما گاندھی اور علی برادران کے زیر اثر آکر کلاسوں سے نکل کر ملکی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں میر اکبر علی خاں صاحب ان طلبہ میں سے ایک تھے ان کے اس عمل نے ان کی تعلیم میں وقفہ پیدا کر دیا، لیکن انھوں نے تھوڑی ہی مدت کے بعد پھر سے تعلیم شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اس واقعہ کا ذکر ضروری ہے کہ طلباء علی گڈھ یونیورسٹی کی عمارتوں میں جمے رہے اور انھیں چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ اس سلسلے میں حکومت وقت نے گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا کہ اس طرح انھیں عمارتوں سے نکال باہر کیا جاسکے۔ قومی رہنماؤں نے ان تین سو سے زائد طلباء کے اس طرح گرفتار ہونے کو مناسب نہ سمجھا اور انھیں ترغیب دے کر شہر علی گڈھ کے متعدد مکانات میں منتقل کر دیا۔

اس سے قبل علی گڈھ کالج ہی کی مسجد میں مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا) نے جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اس جامعہ کے قیام کی تقریب میں مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور دیگر رہنماؤں نے شرکت کی تھی اس جامعہ کے پہلے پرنسپل مولانا محمد علی تھے۔ میر اکبر علی خاں صاحب نے تقریباً دو سال اس فضا میں زندگی گزاری اور اس وقت انھیں مختلف قومی رہنماؤں سے قریب ہونے کا موقع ملا۔ اس زمانے میں طلباء کے قائد ذاکر حسین صاحب تھے۔ قیام جامعہ کے وقت سرفروشوں کی ضرورت تھی۔ مہاتما گاندھی نے ذاکر حسین صاحب کو اس کام کے لئے منتخب کیا اور ذاکر حسین صاحب نے بخوشی اپنے آپ کو حوالے کر دیا تھا۔ ذاکر حسین صاحب اور ان کے رفقاء نے اپنی زندگی وقف کرنے کا پیمان کیا تھا اور اس پیمان کو ان لوگوں نے ساری عمر نبھایا۔

دو سال جامعہ ملیہ کی فضاء میں گزارنے کے بعد اکبر علی خاں صاحب نے عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ حاصل کیا اور بی اے کلاس میں شریک ہو گئے۔ جہاں سے ۱۹۲۳ء میں انھوں نے بی اے کیا اور اس کے فوری بعد وہ انگلستان روانہ ہوئے۔ لندن یونیورسٹی سے ال ال بی

آنرس کیا۔ مڈٹمپل سے بار ایٹ لا کی تکمیل کی۔ سنہ ۱۹۲۶ء حیدرآباد واپس ہوئے اور آتے ہی وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور اسی وقت سے لفظ "بیرسٹر" ان کے نام کا جزو بن گیا۔

اکبر علی خاں صاحب کا عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو جانا خود ان کی زندگی کا ایک اہم سنگ میل تصور ہو سکتا ہے کیونکہ اسی طرح وہ انجمن طیلسانین عثمانیہ کے ایک ایگزیکٹیو رکن بنے۔ اس تعلیمی و معاشی پروگرام کی ترتیب میں حصہ لے سکے۔ اسی انجمن کے معاشی پروگرام کے تحت اس وقت جب صنعتی نمائش کا آغاز کیا گیا جو آج تک جاری ہے اور اس کا میدان عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

اکبر علی خاں صاحب نے جدوجہد آزادی میں حصہ لیا۔ ریاست حیدرآباد کے نظم و نسق اور سیاسی الجھنوں سے نمٹنے والی کمیٹیوں کے رکن بھی رہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی سینیٹ اور کونسل کے ممبر بھی رہے۔ طویل عرصہ تک راجیہ سبھا کے رکن رہتے ہوئے بیشتر وقت نائب صدر راجیہ سبھا کے فرائض بھی انجام دیئے۔ دو بڑی ریاستوں کے یکے بعد دیگرے گورنر رہ چکے ہیں۔ مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ اور آزاد انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے نگران بھی ہیں۔ اردو ٹرسٹ اور آندھرا پردیش کی دیہات سدھار کی مشترکہ تنظیم کے رہنما بھی ہیں یہ سب کچھ ہونے کے بعد کسی وقت بھی ان کی وضعداری میں فرق نہ آیا۔ ہندو مسلم اتحاد ان کا نعرہ رہا۔ طبیعت میں سادگی ایسی کہ چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے برابری کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی سے تعارف ہو جاتا تو پھر کسی محفل میں کیوں نہ ہو وہ شخص ان کی نظر سے بچ نہیں سکتا نہ صرف یہ بلکہ وہ اس کو مخاطب کئے بغیر نہ رہتے۔ رسمی گفتگو ہی نہیں بلکہ نجی بات چیت بھی کرتے ہیں، ان کا انداز مخاطبت مشفقانہ ہوتا ہے۔ ان کے لفظ لفظ سے خلوص ٹپکتا ہے۔ اونچی سطح پر رہ کر گفتگو کرنا ان کا شیوہ نہیں اس پر بھی مخاطب ان کی عظمت کو محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں اکبر علی خاں صاحب سے بات کرتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ مصرعہ ان ہی جیسے بلند کردار شخصیتوں کے لئے کہا تھا کہ

نگہ بلند سخن دلنواز جاں پرسوز

اکبر علی خاں صاحب کی وکالت کا دور بھی بہت شاندار رہا ہے انھیں مولوی احمد شریف، رائے شیشو ناتھ، سر تیج بہادر سپرو اور سرینواس آئنگار جیسے نامور ہستیوں کے ساتھ کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ وہ وکالت میں اور تعمیر نو کے مقدمات ان کے [illegible] پر رہے ہیں لیکن قانون مالگذاری اور قانون [illegible] شاہی کے مقدمات میں انھیں امتیازی مقام حاصل رہا ہے۔

اکبر علی خاں صاحب نے کم عمری ہی میں میدان سیاست میں قدم رکھا اور آج تک اس میدان کے جری سپاہی ہیں لیکن یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عہدوں یا جاہ و جلال کی انھیں تمنا نہیں رہی۔ ان کی سیاسی زندگی کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے کبھی بھی ہوا کے رخ کو دیکھ کر چلنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر علی خاں صاحب کسی وقت بھی ایک فرقہ پرست سیاستداں کے روپ میں نظر نہیں آئے۔ عملی سیاست میں راست بازی نایاب نہیں تو کم یاب شئے ضرور ہے اور اس میدان میں اکبر علی خاں صاحب کی راست بازی اپنی آپ مثال ہے۔ انھوں نے سیاسی میدان میں نہ اپنے ہم خیالوں کی غلطیوں پر پردہ ڈالنا گوارا رکھا اور نہ مخالفین کے زاویۂ نگہ کو صرف مخالفانہ نظر سے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی اکبر علی خاں کو ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھتے آئے ہیں۔

سنہ ۱۹۳۵ء سے سنہ ۱۹۴۹ء تک حیدرآباد کے سیاسی حالات اس طرح کے رہے کہ اگر بیرسٹر اکبر علی خاں اپنے خیالات و نظریات میں تھوڑی سی لچک پیدا کر لیتے تو بڑے سے بڑے عہدہ پر فائز ہو سکتے تھے انھیں ہائیکورٹ کی ججی کا پیشکش کیا گیا تھا اور پھر

اسی طرح اکبر علی خاں صاحب کی نظر مکہ مسجد کی خستہ حالی پر پڑی۔ حالات کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ قطب شاہوں کے ہاتھوں آغاز کی ہوئی اور اورنگ زیب کے ہاتھوں تکمیل پانے والی اس تاریخی مسجد کی جانب جلد توجہ نہ کی گئی تو یہ مسجد قوم اور ملک کی لاپروائی کا مرثیہ پڑھتی نظر آئے گی۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب نے قدم قلندری آگے بڑھایا اور پندرہ لاکھ روپے کی اسکیم بنا کر چندے جمع کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں اس عظیم المرتبت شخص کو محلہ محلہ، بازار بازار دامن پھیلاتے دیکھ کر سبق سیکھنا چاہیئے۔ اس اسکیم کے دو جزو ہیں ایک تو مرمیات زمانہ کے لحاظ سے ترمیم ہے اور دوسرا باقاعدہ نگہداشت کے لئے مستقل آمدنی کے ذرائع مہیا کرنا۔

مندرجہ بالا مصروفیات کے علاوہ میر اکبر علی خاں صاحب مجلس جاگیرداران کے بھی سرگرم رکن رہے ہیں اس مجلس کے دیگر اراکین میں راجہ ترمبک لعل اور نواب بہادر یار جنگ بھی تھے اس مجلس کے رکن کی حیثیت سے انہیں مہاراجہ سرکشن پرشاد، سالار جنگ اور کمال یار جنگ کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا۔

ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ میر اکبر علی خاں صاحب عثمانیہ گریجویٹس اسوسی ایشن کے سرگرم رکن تھے۔ بلدیہ حیدرآباد کے انتخابات میں گریجویٹس اسوسی ایشن نے بحیثیت ایک پارٹی حصہ لینے پر صحیح معنوں میں جمہوری اور غیر مذہبی بنیادوں پر انتخابات لڑے گئے اور کامیابی کے ساتھ لڑے گئے اور رکن منتخب ہونے کے بعد میر اکبر علی خاں صاحب کا نائب صدارت کے عہدے پر انتخاب ہوا۔ یہ عہدہ آج کل "میر بلدیہ" کہلاتا ہے۔ یہاں اس امر کا بھی ذکر ضروری ہے کہ اکبر علی خاں صاحب کم عمری سے مسز سروجنی نائیڈو سے بہت قریب رہے ہیں اور اسی قرب کی بدولت اولاً بی رام کشن راؤ صاحب، ایم نرسنگ راؤ جیسے حیدرآبادی قومی کارکنوں سے تعارف ہوا۔ اور پھر ہندوستانی سطح پر گاندھی جی، مولانا آزاد اور علی برادران تک پہنچنے میں مسز نائیڈو کی سرپرستی رہی۔

یوں تو اکبر علی خاں صاحب کی زندگی ایک بحر بے کراں ہے اور اس کے لئے سفینہ چاہیئے جس کی تکمیل اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں اس لئے ان کی اعلیٰ ظرفی اور بلند کرداری کی ایک دو مثالوں پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ مولوی اکبر علی خاں صاحب جس وقت یوپی کے گورنر تھے مسٹر جے پرکاش نارائن لکھنو گئے۔ جے پرکاش نارائن سے اکبر علی خاں صاحب کے قدیم روابط و تعلقات تھے اس زمانے میں جے پرکاش نارائن حکومت کی نظروں میں جو حیثیت تھی اس کے بیان کی ضرورت نہیں لیکن اس کے باوجود قدیم تعلقات کو فراموش کر دینا اکبر علی خاں صاحب کی طبیعت کے خلاف تھا انھوں نے بلا جھجک مہمانداری کی نہ صرف یہ بلکہ جس وقت جے پرکاش نارائن کو دہلی کے دواخانے میں برغرض آپریشن داخل کیا گیا تو اکبر علی خاں صاحب تین دن تک وہاں قیام فرما ہوئے اور آپریشن کی کامیابی کی خبر پاکر ہی وہاں سے چلے۔ اسی طرح اکبر علی خاں صاحب کا گورنری چھوڑنے کا واقعہ ہے جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اس خدمت پر مامور رہنا اپنے اصولوں کی موت ہے تو انھوں نے گورنری سے ملحقہ جاہ و جلال کو یکلخت ٹھکرا دیا۔ ان کا یہ عمل بلندیٔ کردار کی ایسی مثال ہے جس کی شاید کوئی اور نظیر نہ مل سکے ۔۔

○

بندہ ہوں گنہگار خدا میرا گنہ بخش　　تجھ لطف کبیر الفیض خدا منجھ کو سدا بخش

منجھ بخت کے تارے کو سدا رکھ تو جھلکتا　　منجھ عیش کے سورج کو سولا دن دن تو اپنا بخش

(محمد قلی قطب شاہ)

ابراہیم شفیق

کرشن چندر کی یاد میں

وہ آٹھ مارچ ۱۹۷۷ء کا منحوس دن تھا جب آل انڈیا ریڈیو نے اعلان کیا کہ اردو کے مایہ ناز ادیب جناب کرشن چندر کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ خبر سن کر ہندو پاک کے ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ میں گھر سے باہر تھا۔ جوں ہی مجھے یہ اطلاع ملی مجھ میں ضبط غم کی سکت نہیں رہی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیل رواں ہونے کے لئے بے چین تھا۔ جیسے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں فوراً واپس گھر لوٹا۔ اپنے گھر والوں کو یہ جانکاہ خبر رندھے ہوئے گلے سے سنائی اور پھر باہر نکل گیا۔ کرشن جی کی اچانک موت کے صدمے کو لاکھ برداشت کرنے کے باوجود میری آنکھیں آبدیدہ تھیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنا کوئی قریبی عزیز یا کوئی خونی رشتہ دار مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے بچھڑ گیا ہے۔

کرشن چندر نے مجھے جس خلوص اور محبت سے نوازا تھا شاید اتنا خلوص یہاں کوئی قریبی عزیز بھی مشکل سے دے سکتا۔ تبھی تو ان کی موت کی خبر سن کر دل لرز گیا۔ اور آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھا گیا۔

کرشن چندر کی موت صرف ایک عظیم ادیب، ایک عظیم دانشور اور ایک عظیم انسان کی موت نہیں ہے بلکہ ان کی موت ایک پورے عہد، ایک انجمن خیال اور خلوص و محبت سے معمور اس عرصۂ حیات کی موت ہے جو ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء سے لے کر ۸ مارچ ۱۹۷۷ء تک پھیلا ہوا ہے۔ کرشن چندر تو پریم چند کے بعد اردو ادب کی آن بان کا نام ہے۔ کرشن چندر نام ہے اردو کے ایک جاں باز سپاہی کا کرشن چندر نام ہے سچائی، خلوص اور سادگی کے پیکر کا، کرشن چندر نام ہے اردو زبان کی آبرو کا۔

ادب میں نظریاتی اختلافات تو ضمنی بات ہیں۔ بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ ادبی رجحانات کا بدلتے رہنا تو ایک تاریخی اور سماجی عمل ہے۔ لیکن زندگی کی دوامی قدریں کبھی نہیں بدلتیں انسانی جذبات اور احساسات انقلابات زمانہ سے بے نیاز رہتے ہیں اور جو ادب یا ادیب ان سب سے بلند ہوتا ہے وہ بھی دوامی بن جاتا ہے۔ کرشن چندر بلاشبہ وہ ادیب ہیں جو بدلتے ہوئے ادبی رجحانات اور حد بندیوں سے آزاد ہیں۔ ان کے ادب کو نظریاتی خانوں میں بانٹ دینا زیادتی ہے۔

کرشن چندر کی شخصیت اور فن پر لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ لیکن ایک مختصر مضمون میں صرف ان کی زندگی کی چند جھلکیاں ہی پیش کی جاسکتی ہیں۔ کرشن چندر سے میری پہلی ملاقات ۱۹۴۸ء میں ہوئی تھی جب تھیا سوفیکل سوسائٹی (ہنومان ٹیکری) میں ایک ادبی اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں کرشن چندر نے سجاد ظہیر پر ایک خاکہ "بنے بھائی" سنایا تھا۔ اس وقت میں بچوں کے ماہنامے "ستارے" کا جائنٹ ایڈیٹر تھا اور جناب مسلم ضیائی اس کے ایڈیٹر تھے۔ کرشن چندر سے میرا تعارف مسلم ضیائی صاحب نے کروایا تھا۔

اس کے بعد جب بھی کرشن چندر حیدرآباد تشریف لائے ان سے ملنے کا موقع ملا۔ لیکن ادھر پچھلے چند برسوں میں مجھے کرشن جی سے زیادہ قریب سے ملنے اور ادبی موضوعات پر بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔ یوں تو وہ ایک طویل عرصہ سے بمبئی میں مقیم تھے، لیکن گزشتہ چند برسوں سے وہ سانتا کروز ویسٹ کی حسن آباد لین میں "ودی نشی" نام کے ایک خاموش اور خوبصورت مکان میں مقیم

تھے۔ حسن آباد لین میں اکثر لوگوں کو اس بات کی خبر نہ تھی "دی نشں" نام کے سفید مکان کے ایک خاموش حصہ میں رہنے والا ایک خاموش انسان دنیا کا مشہور ناول نگار اور اردو کی صف اول کا ادیب بھی ہے۔ "دی نشں" کے پچھلے حصہ میں جاکر جب بھی میں نے نچلی منزل کے دروازے پر لگی کال بیل دبائی چند لمحوں بعد خود کرشن چندر اوپری منزل کی بالکونی میں مسکراتے ہوئے نمودار ہوگئے۔ میں نے ہر وقت انھیں بہت شگفتہ اور چاق و چوبند پایا۔ ان دنوں میں بھی جب وہ علیل تھے ان کے چھوٹے سے کمرے میں ایک طرف پلنگ تھا جس پر وہ اکثر لیٹے رہتے۔ سرہانے کتابوں اور خطوط کے انبار ہوتے۔ پلنگ کے سامنے ایک چھوٹا سا ٹیبل اور کرسیاں موجود ہوتیں۔ وہ مجھ سے جب بھی ملتے اس قدر محبت اور پیار کے ساتھ جیسے میں ان کا قدیم رفیق ہوں۔ تکلفات یا رسمی باتوں کو کبھی درمیان میں آنے نہیں دیا۔

سلمیٰ آپا سے بھی ویسے تو ہر وقت ملاقات ہوتی لیکن وہ اسی وقت ہمارے ساتھ بات چیت کرنے بیٹھ جاتیں جب انھیں گھر کا کوئی کام نہ ہوتا۔ کرشن جی اکثر مجھ سے حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کا حال دریافت کرتے۔ جیلانی بانو، اقبال متین اور مجتبیٰ حسین وغیرہ کا ذکر چھڑتا عابد علی خاں صاحب اور ادبی ٹرسٹ کا تذکرہ ہوتا تو کبھی مخدوم کے دو شعراء کے متعلق گفتگو ہوتی۔

ایک بار میں نے یوں ہی ادب میں جدیدیت کا ذکر چھیڑ دیا تو کرشن جی خاموش ہوگئے۔ چہرہ جذبات سے عاری ہوگیا۔ لیکن بہت سنبھال کر کہا کہ افسانے میں چاہے کچھ بھی تجربات کئے جائیں لیکن کہانی پن نہ ہو تو زندگی اسے جھٹک دے گی۔ میں نے جب ان سے میرے افسانوں کے مجموعے "لہولہان سورج" کا دیباچہ لکھنے کی خواہش کی تو وہ فوراً تیار ہوگئے۔ میرے افسانوں کے مسودے ان کے ہاں گم ہوگئے تھے میں نے دوبارہ انھیں مسودے دیئے انھوں نے باوجود اپنی علالت کے مجھے گھر پر بلالیا اور خواہش کی کہ میں مسودے اپنے ساتھ لیتا آؤں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک ہی نشست میں افسانے پڑھ کر دیباچہ لکھ دیں گے۔ انھوں نے مجھ سے ابتدا میں ایک کہانی کا مسودہ مانگا۔ میں نے ایک جدید کہانی انھیں پڑھنے دی۔ کرشن چندر نے کہا کہ میں جس قسم کی کہانیاں لکھتا ہوں یا آپ خود پہلے جیسی کہانیاں لکھتے تھے اس قسم کی کہانی دیجئے۔" جدید کہانی کا نام سن کر ان کا موڈ کچھ بدل گیا۔ لیکن میں نے بڑے سلیقے سے انھیں بتایا کہ میرے ہاں جدید کہانی کے تیور الگ ہیں۔ آپ ایک کہانی پڑھ کر تو دیکھیں۔ کرشن جی اس پر تیار ہوگئے۔ کہانی پڑھتے ہوئے پلنگ پر ادھر سے ادھر ہوتے رہے۔ پھر مجھ سے دوسری کہانی مانگی۔ اس کا مطالعہ بھی انھوں نے نہایت انہماک سے کیا۔ قلم اور کاغذ لے کر میرے افسانوں کے بعض جملے نوٹ کرنے لگے اور بعض مقامات پر انڈر لائن بھی کرتے گئے۔ یہ سلسلہ دیر تک چلتا رہا۔ پھر مجھ سے کہا کہ میں ایک دو روز بعد آکر ان سے مضمون حاصل کروں۔ میں جب دو دن کے بعد "دی نشں" پہنچا تو کال بل کے جواب میں اوپری منزل کی بالکونی سے مسکراہٹوں کا ایک آبشار گر رہا تھا۔ کرشن جی نے مجھے اندر بلالیا اور چائے نوشی کے بعد اپنا تحریر کردہ تعارف مجھے سنایا۔

میں نے ان سے خواہش کی تھی کہ "لہولہان سورج" کی رسم اجراء کے موقع پر وہ حیدرآباد تشریف لائیں۔ کرشن جی نے میری دعوت قبول کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ کتاب کی اجرائی کی رسم موسم سرما میں رکھئے۔ کیونکہ حیدرآباد میں سرما کا موسم بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ میں اور سلمیٰ ضرور آئیں گے۔ لیکن یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ ان کی زندگی میں کتاب تو شائع ہوگئی لیکن رسم اجراء سے پہلے وہ انتقال کر گئے۔ "لہولہان سورج" پر لکھا ہوا ان کا دیباچہ شاید ان کا تحریر کردہ آخری دیباچہ ہو، کیونکہ اس کے بعد ان کی علالت کی اطلاعیں ہی آتی رہیں۔

کرشن چندر کی طبیعت میں بچوں جیسا بھولا پن تھا۔ وہ فطرتاً ایک شریف النفس انسان تھے۔ مجھے تعجب ہوتا کہ بمبئی جیسی کمرشیل بستی میں اس بھولے بھالے شخص کی گذر کیسی ہوتی ہوگی۔ لیکن انھیں نہ صرف شریک حیات بھی اتنی ہی ملنسار اور محبت کرنے والی ملی بلکہ ان کے رفقاء بھی بہت پُر خلوص اور ان کے سچے ہمدرد تھے۔

حالت میں دیکھا ہے اور وہ تار تار کپڑے پہنے در بدر کی خاک چھانتے پھر رہی ہے تو کیا میں اُسے مان نہیں کہوں گا ؟

لیکن یہ بات افسوس ناک ہے کہ اردو کے اتنے زبردست شیدائی کی موت کا اردو دنیا نے ایک معمولی واقعہ کی طرح نوٹس لیا۔ مختلف شہروں میں صرف تعزیتی جلسے منعقد ہوئے یا رسالوں نے ایک آدھ صفحہ ان کے لئے وقف کیا لیکن کہیں بھی بڑے پیمانے پر یادگار کرشن چندر نہیں منائی گئی۔ کرشن چندر کی موت پر اردو والوں کی یہ بے حسی ناقابلِ فہم ہے۔ اگر کرشن چندر ہندوستان کی بجائے کسی مغربی ملک میں پیدا ہوتے تو ان کی زندگی ہی میں چوراہوں پر سیاست دانوں کی بجائے ان کے مجسمے نصب ہوتے۔ ان کے مکان کے سامنے سے جانے والی سڑک پر ایک بورڈ پر یہ تحریر کندہ ہوتی "خاموش کرشن چندر لکھ رہے ہیں" اور ان کی موت پر ملک کی پارلیمنٹ قرار دادِ تعزیت پاس کرتی۔ جب کہ چند برس پہلے آسٹریلیا کی حکومت نے ریس کے ایک گھوڑے "فار لیپ" کی موت پر قرار دادِ تعزیت پاس کرتے ہوئے اسے ایک قومی نقصان متصور کیا تھا۔

ہمارے ملک میں سیاست، سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے کسی کم مدت میں بڑے بڑے جلسوں اور اجتماعی سوگ یا جشن کا اہتمام تو ہو سکتا ہے، اخباروں کے صفحات تو کالے ہو سکتے ہیں لیکن ایک فنکار کی موت پر آنسو بہانے والے اپنے قیمتی آنسو گن گن کر بہاتے ہیں۔ حالانکہ ایک فنکار یا ادیب کے سامنے سیاست داں کی اہمیت عارضی اور ہنگامی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ ہندوستان کے مایہ ناز فلسفی اور سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا تھا۔

"اگر کولمبس پیدا نہ ہوتا تو امریکہ کوئی بھی دریافت کر لیتا، یا واسکوڈی گاما پیدا نہیں ہوتا تو قطب شمالی اور قطب جنوبی کوئی دوسرا دریافت کر لیتا، لیکن اگر کالی داس پیدا نہیں ہوتا تو شکنتلا کوئی دوسرا نہیں لکھتا یا شیکسپیئر پیدا نہ ہوتا تو کوئی دوسرا جولیس سیزر اور ہیملٹ نہیں لکھتا۔"

میں اس جملے کو یوں آگے بڑھا دوں تو شاید غلطی نہیں کر رہا ہوں۔

"اگر تن سنگ ماؤنٹ ایورسٹ سر نہ کرتا تو کوئی اور کر لیتا لیکن اگر کرشن چندر پیدا نہیں ہوتا تو شکست، دلیتا اور کسان، پولکیشن کی ڈالی، میری یادوں کے چنار" اور "ٹ پاتھ کے فرشتے" کوئی دوسرا نہیں لکھتا۔

● ●

(صفحہ ۲۰ سے آگے) گولکنڈہ فیسٹول ماہ فروری میں منایا گیا اس لئے یہ تقاریب ایک ساتھ منائی نہ جا سکیں۔ توقع ہے کہ آئندہ سال ادارہ کی اس ثقافتی تقریب یعنی یوم محمد قلی قطب شاہ کے منانے میں بھی نہ صرف گولکنڈہ سوسائٹی، محکمۂ بلدیہ حیدرآباد، محکمۂ سیاحت آندھرا پردیش اور اردو اکاڈمی کا بھرپور تعاون حاصل ہوگا بلکہ حیدرآباد کے تمام ثقافتی ادارے اپنے مکمل اشتراک سے اس تہوار کو اور زیادہ دلچسپ بنائیں گے۔ امید ہے کہ آپ تمام حضرات کے اشتراک سے یہ تقاریب زیادہ سے زیادہ شاندار پیمانے پر منائی جا سکیں گی "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"۔

آخر میں اس امر کا اظہار نامناسب نہ ہوگا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی ان تقاریب کے انعقاد اور مختلف انتظامات کے سلسلے میں جناب میر سراج الدین علی خاں، ڈاکٹر مغنی تبسم، جناب صلاح الدین نیر، جناب خواجہ بہاء الدین صاحب اور جناب ایم۔ ایل۔ نرسمہا راؤ یوم قلی قطب شاہ کے سلسلے میں مختلف شعبہ جات کے معتمدوں کی حیثیت سے کافی تعاون کر رہے ہیں۔

غزلیں

تیرہ شبی تھی اوج پہ درد چمک چمک اٹھا
شعلۂ خوں نفس نفس اور دہک دہک اٹھا

روپ جو بدلے بار بار غم ہائے روزگار نے
کم حوصلہ تھا طفلِ دل ڈر سے بلک بلک اٹھا

پلکوں سے آنسوؤں نے گو کر ڈالے اپنے سب جتن
ذکر ترا ہے اشک اشک پھر بھی ڈھلک ڈھلک اٹھا

دوشیزگیٔ وقت کی، عشوہ طرازیاں نہ پوچھ
آنچل غمِ حیات کا، رُخ سے سرک سرک اٹھا

حسنِ جفا شعار کی انگڑائیاں تھیں کیا اثر
پائے خرد پہ وصفِ ضبط، اور بہک بہک اٹھا

تم نے غزل پڑھی مگر رونق کا کچھ اس طرح
بلبلِ خوش نوا کوئی، بن میں چہک چہک اٹھا

رونق دکنی سیمابی

یاد کی طرح کسی سینے میں اترتے جانا
تم بہرحال، میرے دل میں ٹھہرتے جانا

جانے والے یہ ہے توہینِ عزائم کی ترے
کوئی سمجھوتہ نہ حالات سے کرتے جانا

کھا نہ جائے کوئی آسیب تمنا تجھ کو
گرچہ درد سے جانا بھی تو ڈرتے جانا

دشتِ احساس ہے یہ جان لو، جانے والو
اپنی یادوں کے اجالوں سے سنورتے جانا

تم اگر درد ہو بس جاؤ دلوں میں یارو
تم ہو خوشبو تو فضاؤں میں بکھرتے جانا

ایک حسرت ہے کہ تم میری مسیحائی کرو
ایک احسان دلِ زار پہ کرتے جانا

یہ امانت ہے تمناؤں کی شہزاد یہاں
زندگانی میں کوئی زہر نہ بھرتے جانا

اکرام شہزاد

کچھ تو بچئے کہ بڑا نازک مرحلہ ہے
نغمے سے بچئے کہ گلستاں میں بہار آئی ہے

یہ محبت کی امانت ہیں چھپائے رکھئے
اشک اگر آنکھ سے گر جائیں تو رسوائی ہے

اس لئے میں نے ترے راز کو دل میں رکھا
بات اگر منہ سے نکلتی ہے تو رسوائی ہے

بےخودی نے مجھے مجبور کیا ہے اکثر
جب بھی شیشوں کے کھنکنے کی صدا آئی ہے

درد صدیوں کا ہے یہ کون یہاں سمجھے گا
کتنی غمگین مری روح کی گہرائی ہے

اک زمانے سے تری راہ میں بیٹھا ہوں مگر
پوچھتا ہوں جو کسی سے تری رسوائی ہے

لوگ کیوں چاند کی دنیا کی طرف مائل ہیں
کیا زمینوں پہ محبت کی کمی پائی ہے

کون رکھے گا یہاں عشق کی وحشت کا بھرم
یہ ہے دنیا، یہاں ہر شخص تماشائی ہے

ہے یہ موسم کسی میخانے میں چلئے نظیر
پانی ٹپک ٹپک کے برستا ہے [illegible]

نظیر صفی پوری

قندِ مکرر

خطوطِ سرسید احمد خاں

سرسید کے خطوط کا مجموعہ ۱۹۲۴ء میں اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر سید راس مسعود نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ مولوی عبداللہ جان وکیل سہارنپور نے "خطوطِ سرسید" کے مقدمے میں سر راس مسعود کی سعیٔ مشکور کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے کہ "جتنے مکتوبات اس وقت جمع ہو گئے ہیں اُن سے بہت زیادہ تعداد و ضخامت میں اور مکتوبات یا تو ضائع ہو چکے ہیں یا مکتوب الیہم کی بے پروائی یا ناوابستگی میں مدوّن ہونے سے رہ گئے ہیں۔" اس مجموعے کے بعد سرسید کے اور خطوط بھی شائع ہوتے، غرض ۱۹۲۴ء میں چھپنے والے اس مجموعۂ مکاتیب کو اوّلیت کا شرف حاصل رہے گا۔ اس میں (۲۸) اکابرینِ ہند اور دانشورانِ کرام کے نام سرسید کے جملہ (۲۴۹) خطوط شامل ہیں۔ ہم چند ایک مکاتیب شائع کر رہے ہیں، تاکہ نئی نسل کے لیے استفادہ کا موجب بنیں۔ (ادارہ)

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے نام

مولوی صاحب عزیز و شفیق و مکرم من سلامت۔ بعد سلام مسنون الاسلام التماس یہ ہے کہ آپ کا عنایت نامہ پہونچا حالات مندرجہ سے اطلاع ہوئی۔ افسوس صد افسوس کہ کبھی مسلمانوں میں باہم اتفاق نہ ہوا شعر و سخن پر رد و قدح دوسری چیز ہے الا آپس کا نفاق دوسری چیز ہے میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعراء نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ آپ کی مثنوی "خوابِ امن" پہونچی بہت دل خوش ہوا درحقیقت شاعری اور زورِ سخنوری کی داد دی ہے اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اُردو زبان میں ادا کیے جاویں۔ یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو سے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں ہم بیان کیا کر سکتے ہیں۔ بعد رمضان انشاء اللہ تعالیٰ نے ایک مضمون طویل اس باب میں لکھوں گا ان دنوں میں بسبب صوم کچھ کام نہیں ہو سکتا۔ آپ کی فکر اور کوئی مثنوی علاوہ چھپی ہو تو عنایت فرمایئے۔ والسلام

پنجابی اخبار میں جو آپ کے اشعار پر رد و قدح تحریر ہوتی ہے کون صاحب اس کو لکھتے ہیں؟ اس بات کے کہنے سے مجھے معاف کیجیے کہ یہ خیال آپ کا کہ "قرآن میں کوئی مضمون عملی نہیں خاص فصاحت اس کا معجزہ ہے" درست نہیں ہے قرآن علم و نیچر اور فصاحت سب سے معمور ہے اور مجموعاً من حیث المجموع معجزہ ہے۔ فقط خاکسار۔ سید احمد از بنارس ۲۹ / [illegible]

مولوی مشتاق حسین نواب وقار الملک کے نام

عزیزی و کرمی۔ عنایت نامہ پہونچا۔ حیدرآباد میں مشہور رہا تھا کہ مشتاق حسین پیروی مقدمہ کے لیے کلکتہ گئے اگر آپ آتے تو نہایت مشکل ہوتی۔ آپ نے صاحب ریزیڈنٹ کو تار دینے چٹھی لکھنے سب میں جلدی کی غلطی پر غلطیاں ہوتیں تمہاری عقل نے اور سمجھ نے میرے دل کو نہایت رنج دیا ہے۔ مگر اب ان غلطیوں کا ذکر کرنا بجز گزری بات پر رنج کے اور کچھ نہیں ہے۔ حیدرآباد میں جو حالت تھی اُس سے بھی کبھی مطلع نہیں کیا ورنہ مناسب صلاح دی جاتی۔ نہایت مشکل ہے کہ صاحب ریزیڈنٹ کوئی مفید سارٹیفکٹ دے سکیں۔ جب کہ آپ نے اُن سے مقدمے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو الزام امیر کبیر نے لگایا ہے اُس سے صفائی نہیں ہو سکتی۔ بہر حال صاحب ریزیڈنٹ سے ملاقات ہونے کے بعد جو نتیجہ ہو اُس پر کوئی رائے قایم ہو سکتی ہے مگر جو کام کرو تامل و صبر سے سوچ کر کرو مجھے تعجب ہے کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے تار دینے پر کیوں منع نہ کیا۔ تمہاری حالت سے جو رنج ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ خاکسار۔ سید احمد، کلکتہ۔ یکم فروری [illegible]

خواجہ الطاف حسین صاحب حالی کے نام

جناب مخدوم و مکرم من۔ عنایت نامہ مع پانچ جلد مسدس پہونچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ جھوٹ تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعر و شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیوں کر ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے۔ نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اس کا شکر کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں۔ اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنہی الفاظ میں ہے۔ جن میں میری طرف اشارہ ہے بیشک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم اس سے فائدہ بخشے مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھ کو مطلع فرمایئے یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب موجود ہیں۔

آپ کے اس خیال کا کہ حق تصنیف مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرا دی جاوے۔ میں دل سے مشکور کرتا ہوں مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ اور اُس کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر رواج ہو اور لڑکے ڈھنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ سارنگی پر گاویں۔ قوال درگاہوں میں گادیں۔ حال لانے والے آسمے حال پر حال لاویں اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی میرا تو دل چاہتا ہے کہ دلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف ہوں اور رنڈیاں

پھلاؤں مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کی مسدس کو تہذیب الاخلاق میں چھاپوں گا۔ میرے اُن استفسار کا جواب جو بر نشان درج کردیا ہے۔ بہت جلد مرحمت ہو۔ والسلام۔ خاکسار آپ کا احسان مند تابعدار سید احمد۔ شملہ پارک ہوٹل۔ ۱۰ رجون ۱۸۸۹ء

سراج الدین احمد ایڈیٹر "سرمور گزٹ" ناہن کے نام

مجی و مکرمی و مخدومی آپ کا عنایت نامہ پہونچا۔ ممنون ہوا۔ آپ کے قلم نے سرمور گزٹ میں میری نسبت زیادہ جوش دکھایا ہے۔ جس کے لائق میں خود اپنے آپ کو نہیں سمجھتا۔ میں فرض کرتا ہوں کہ آپ اپنی عنایت و محبت سے مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں لیکن اور لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے۔ پس وہ لوگ آپ کی تحریر کو فضول سمجھتے ہیں۔ پس ایسی تحریرات سے جن کو لوگ فضول سمجھیں کیا فائدہ ...... آپ میری تصویر کو کیا کیجئے گا؟ آپ کو معلوم نہیں ہے کہ تصویر کھینچنی کھینچوانا رکھنا سب منع ہے۔ بایں ہمہ اگر آپ چاہتے ہیں تو لیجئے ملفوف ہے۔ اگر تصویر میں کچھ نقص ہوا تو بے چاری بے جان۔ بے جان تصویر پر الزام نہ دیجئے گا۔ بلکہ جس کی تصویر ہے اس پر اور اگر آگے بڑھیئے تو اوپر۔ مگر یہ نصیحت پیر دانا یاد رکھنی چاہیئے ؎

پیر ما گفت خطا در قلم صنع نہ رفت آفریں بر نظر پاک خطا پوشش باد

والسلام۔ خاکسار سید احمد۔ علی گڈھ۔ ۱۲ رجون ۱۸۸۹ء

قومی ترقی مجموعہ ہے

شخصی محنت۔ شخصی عزت۔ شخصی ایمانداری۔ شخصی ہمدردی کا اسی طرح قومی تنزل مجموعہ شخصی سستی۔ شخصی بے عزتی۔ شخصی بے ایمانی۔ شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ ناتہذیبی و بدچلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے اُن برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کردیں تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور و شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ دی جائے۔

(سرسید)

غالباً تمام دنیا اس بات کو تسلیم کرتی ہے کہ نیکی بلاشبہ نیک ہے اور اس لیے اس بات کا ماننا بھی لازم آتا ہے کہ ہمیشہ رہنے والی نیکی سب نیکیوں سے افضل اور اعلےٰ نیکی ہو۔ انسانوں میں نیک وہی ہوگا جس نے بہت سی نیکیاں کی ہوں گی۔ سب سے زیادہ نیک وہی ہوگا جس نے ایسی نیکیاں کی ہوں جو سب نیکیوں سے افضل اور اعلےٰ ہوں۔

(سرسید)

کیوں فریبِ امید کھاؤں میں
دیارِ عقل و ہوش سے مقامِ سوز و ساز تک
آ تو جائے لبِ خاموش پہ تھمتی ہوئی آہ
کہاں کی عقل، کیسا ہوش، یہ اجزائے ہستی کیا
بقدرِ شوق نہ تھا اہتمامِ سوز و گداز
بے طلب آکے رہے اور جو مانگو تو نہ آئے
اک جہانِ گفتگو تھا وہ سکوتِ منفعل
وہ لذتِ بے خودی عطا کر، فدا ہو پندارِ عقل جس پر
تجھے کیا بتاؤں کہ بیخودی میں نہاں ہیں کتنی فراغتیں
خرابِ شوق رہے، وقفِ انتظار رہے
رہ گئے پیچھے تو کیا غم، دو قدم کی بات ہے
کیا حال بتائیں اختر کا تم آپ ہی جاکر دیکھو نہ لو
جو ہر کامیابی سے بیگانہ کر دے
کہیں عہدِ ماضی پلٹتا ہے اختر
بتایا مجھ کو یہ رازِ نہاں عرفانِ ہستی نے
چاندنی کا رقص، موجِ گل، سرودِ جوئے آب
جدا ہے عقل کی سرحد سے بیخودی کا مقام
سرِ بزمِ ناز پیامِ دل بجز اک نگاہ ادا نہ کر
بگولی شکن ہے ماتھے پر دھیما سا تبسم ہونٹوں پر
خدا شاہد بھنور میں ڈوب جانا اس سے بہتر ہے
میں حاصلِ ہستی سمجھوں گا میں غم کی تلافی کیوں کا
گیتی کے نظارے گم ہیں حسنِ ازل کے جلوؤں میں
کاش کبھی پا سکیں رازِ مئے بے خودی
رو رہی ہے شمعِ سوزاں، ہنس رہے ہیں اہلِ بزم
رہینِ آشیاں دیکھا، اسیرِ دام بھی دیکھو
زمانہ ہے صرفِ رسوم و قیود
کون کہتا ہے گل و لالہ میں اجزائے بہار

آپ میرے نہ زندگی میری
پھری ہے تیری جستجو کہاں کہاں لئے ہوئے
وہ سنیں یا نہ سنیں بات بنے یا نہ بنے
بنائے زندگی پائندہ تر ہے عشقِ کامل سے
ضمیرِ خاک میں بھرتی ہیں بجلیاں میں نے
زندگانی پہ نہیں موت کا احساں کوئی
شکوہ کیا کرتے کہ اندازِ بیاں دیکھ لئے
بنے جو بیداریوں کا عنواں مرا وہ آئینِ خواب کر دے
تو فریب خوردۂ ہوش ہے تو اسیرِ وہم و قیاس ہے
اب اور کیا ترے وعدوں کا اعتبار رہے
گردِ راہِ کارواں یہ، وہ نشاں منزل کا ہے
دیوانہ تو پھر دیوانہ ہے، دیوانے کا عالم کیا کہئے
وہ محرومئ مدعا چاہتا ہوں
میں دیوانہ ہوں، ہائے کیا چاہتا ہوں
کہ دنیا اک فریبِ فطرتِ بیدار ہے ساقی
لے رہے ہیں دل میں کیا کیا چٹکیاں تیرے بغیر
نہ پیچ و خم ہیں نہ اس راہ میں نشیب و فراز
کہ خطا ہے جنبشِ لب یہاں یہ مقامِ راز و نیاز ہے
اس حسنِ ادا کا کیا کہنا احساس بھی ہے پندار بھی ہے
اگر ساحل ملے منت پذیرِ ناخدا ہو کر
بن جائے اگر درسِ عبرت افسانہ مری بربادی کا
ہستی اک مجموعہ ہے کچھ بھولے ہوئے افسانوں کا
عقل کی بے راہیاں، ہوش کی نادانیاں
ہر خوشی میں درد و عبرت کی جھلک پاتا ہوں میں
مآلِ آرزوئے آشیاں بھی دیکھتے جاؤ
حقیقت نگاہوں سے مستور ہے
کچھ مرے دل ہی کے ٹکڑے تھے کہ افسانہ بنے

ہیں ان کے شعور و شعورِ بصیرت و آگہی، زمانے کے تجربات اور اس کی ضروریات کو گہرا دخل حاصل ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں ؎

شغلِ بادہ و ساغر تیری انجمن میں تھا   آج رزمِ ہستی میں کھینچ گئی ہیں شمشیریں

تاج کے ہاں قدیم و جدید کے سنگم کے ساتھ فکر و جذبے کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ انھوں نے غمِ یار کے پردے میں غمِ روزگار کو بیان کیا ہے۔ ان کا غم تنہا اپنی ذات کا غم نہیں ہے بلکہ پورے معاشرے کا غم ہے تمام انسانیت کا غم ہے۔ اسی عنصر کے تحت ان کے فن میں آفاقیت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کے شعور کی آواز کو ان کے کلام میں صاف طور پر سنا جا سکتا ہے ؎

یادِ گیسو و قدِ یار لیے پھرتے ہیں   ہم کہیں موجِ رسن و دار لیے پھرتے ہیں

ہم ہیں وہ چاک گریباں جو زمانے کے لیے   شوقِ پیراہنِ زرِ تار لیے پھرتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ تاج نے غمِ دوراں کو غمِ جاناں پر ترجیح دی ہے۔ یادِ محبوب ان کا دل تڑپا تو دیتی ہے لیکن جب وہ اس کے قریب جانا چاہتے ہیں تو غمِ دوراں کا عظیم تصور دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے اور وہ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" کو سوچ کر یادِ محبوب سے کترا جاتے ہیں ؎

بہت دنوں سے نظر میں ہے یار کی صورت   غمِ زمانہ سے لیکن فرار کی صورت

اور پھر غمِ دوراں ہی تاج کے ہاں غمِ جاناں کا روپ اختیار کر لیتا ہے ؎

ہزار مرحلۂ زیست سامنے آئے   بدل بدل کے تمنائے یار کی صورت

اپنے بارے میں بھلا صرف کیا سوچیں   سوچنا ہے سب ہی کے بارے میں

اس طرح تاج کی شاعری محض ان کے جذبات کا اظہار نہیں یا وہ ان کے لیے باعثِ تسکینِ دل کا ذریعہ نہیں بنتی بلکہ وہ تو انسانیت کے دکھتے ناسور کو مندمل کرنے کے لیے ایک کارگر مرہم کا کام انجام دیتی ہے۔

وہ چاہتے تھے کہ غمِ دوراں کی راہ میں اُن کا محبوب اُن کا ساتھ دے اور اس غم کو بانٹ کر ان کے دل کے بوجھ کو ہلکا کرے لیکن ان کا محبوب ان کے غموں کو بہلانے میں کامیاب نظر نہیں آتا جس کا اظہار انھوں نے اس طرح کیا ہے ؎

وہی رہا دلِ غمگیں کسی سے کچھ نہ ہوا   ستم یہ ہے کہ تیری دوستی سے کچھ نہ ہوا

تمام نغمگی و شاعری ہے کچھ نہ ہوا   وہ رات ہے کہ مری روشنی میں کچھ نہ ہوا

اور اگر ان کے محبوب کی دل نوازیاں ان کے دردمند دل کا مداوا کر بھی سکتی تھیں لیکن ان کی خوددار طبیعت اور غیرت مند دل کو شاید دردِ منت کشِ دوا ہونا منظور نہیں اس لیے وہ کہتے ہیں ؎

میری انا کو گوارا نہ ہو سکی خیرات   تیری نگاہ میری چارہ گر تو ہو جاتی

میں اپنے غم کا مداوا تو خود ہی کر لوں گا   مبارک آپ کو اپنا غرورِ چارہ گری

جب کہ تاج دنیا کے کسی بھی فن، کسی بھی ادب کو زندگی کی ترجمانی کے بغیر نامکمل سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں نقشِ دوام اسی فن کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں خلوص و صداقت کی آنچ موجود ہو، جس میں زندگی، انسان اور اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

تاج کی نظر میں بغیر ان لوازمات کے فن میں جان پیدا ہو ہی نہیں سکتی ؎

مسائلِ حیات سے ہٹ کر ہر ایک نقش گری　　نہیں وہ نقش گری یا سوا ہے وہ سری

وہ جس میں روح مستقبل نہیں ہے　　کوئی اس شعر کا قائل نہیں ہے

یہ انسانیت کی زباں بن گئی ہے　　وہی داستاں داستاں بن گئی ہے

انسانی زندگی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بچھونا ہے۔ غم ایک فطری عمل ہے جو تقریباً ہر انسان کی میراث ہے، اور اس سے متاثر ہونا عین فطرت ہے۔ غم کی تفسیر اُردو کے تقریباً ہر شاعر نے اپنے اپنے انداز سے بیان کی ہے۔ تاج کے کلام میں بھی یہ عنصر نہایت پُر سوز و دلگیر انداز میں ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ اُردو کے عام شعراء کی طرح رونے گڑگڑانے والے، آہ و فغاں سے زمین و آسمان [illegible] کرتے نظر نہیں آتے وہ اپنے غم سے ہراساں و خوف زدہ نہیں ہیں۔ اور نہ ہی ان کے ہاں غم سے بیزاری کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ [illegible] غم ان کے خاص باشعور کی بلکہ ان سخت حالات میں بھی حوصلہ و یقین، عزم و استقلال کو برقرار رکھتے ہیں۔ وہ دل کی دھڑکن کو قائم رکھنے کے لیے غم کو لازمی قرار دیتے ہیں ؎

وہ آنکھیں کیا جنھیں آیا نہ رونا　　دل کی موت ہے غم کا نہ ہونا

غموں کی آگ حد سے بڑھ چکی ہے　　بڑی مشکل ہے میٹھی نیند سونا

زمانے بھر کا غم اپنا لیا ہے　　قیامت ہو گیا احساس ہونا

غم سے والہانہ اپنائیت کی ایک مثال اور ملاحظہ ہو ؎

غمِ زمانہ جسے آپ موت کہتے ہیں　　ہمیں یہ موت نہ ملتی تو مر گئے ہوتے

اس طرح تاج کے کلام میں غم ہائے روزگار اور ان نامساعد حالات کے پردے میں بھی امید و کامیابی کا جذبہ نظر آتا ہے۔ وہ اپنے ارادوں کی مشعل کی روشنی میں یقین کے ساتھ کہتے ہیں ؎

درد اس دور کی تقدیر ہے لیکن اے دل　　صرف اک موڑ ہے محنت و زر ہونے تک

شعر سے تاج کی سماجی بصیرت و آگہی کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو انھیں ترقی پسند مصنفین کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔ جس کے تحت انھوں نے اپنی غزل میں مزدور و غریب عوام کی مدافعت میں نعرۂ حق بلند کیا ہے۔

جو شخص اس جہانِ فانی کے رموز سے واقف ہو گیا گویا اس نے اپنی اصل منزل کا سراغ لگا لیا۔ پھر وہ اس بے ثباتِ دنیا کے تماشوں، نظر فریب و دل فریب نظاروں میں گرفتار ہونا پسند نہیں کر سکتا۔ تاج بھی ان حقائق سے بخوبی واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ محبوب کا سراپا اور اس کی جلوہ سامانیاں ان کے دلِ حزیں کو اپنی جانب متوجہ نہیں کر پاتی۔ ان کا خیال ہے کہ ؎

وہ بزمِ عارض و گیسو میں رک نہیں سکتے　　جنھیں خبر ہے یہ دنیا کہاں سے اچھی ہے؟

یہی سبب ہے کہ وہ اپنے محبوب کی خوشامد یا ناز برداری کو بھی پسند نہیں کرتے وہ تو ہر دم ایک نئے اُفق نئے مقصد کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں اور اس کی جستجو میں وہ اپنی ذات کا غم بھی بھول جاتے ہیں۔ ایک دھن ایک [illegible] انھیں اپنی منزل کی جانب کھینچے چلی جاتی ہے ؎

بس ایک لگن ہے کہ روشن ہے شمع سی دل میں　　فغانِ نیم شبی ہے نہ گریۂ سحری

انھیں منزل دشوار کے حصول میں پیش آنے والی مشکلات کا بھی مکمل احساس ہے ؎

کتنے تاریک مراحل سے گزرنا ہوگا
صبح کو شمع سرِ راہ گزر ہونے تک

نقش کہن پر چلنا اور فرسودہ روایات کو اپنانا ان کی شان کے خلاف ہے۔ ان کی خود دار طبیعت کو کسی کا احسان بھی گوارہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

ہم آج مشعلِ خورشید لے کے نکلے ہیں
ہمیں قبول نہیں جگنوؤں کی راہبری

تاج نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی، ہوش سنبھالتے ہی زندگی کے سخت حالات سے برسر پیکار ہونا پڑا۔ اس کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑا اور ناکامیوں و نامرادیوں کا منہ دیکھنا پڑا اس لیے بعض اوقات بھی تلخ حقائق و مشاہدات ان کے اشعار میں بھی ظاہر ہو گئے ہیں۔ جن کی روشنی میں ہم ان پر بیتے ہوئے کوائف و حالات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ؎

یہ مہر و ماہ تو اس انجمن کی زینت ہیں
ہم اپنے گھر کے لیے روشنی کہاں سے لائیں

مرہم تو کچھ اور رہا شیشے ہے تیرے حرف تسلی کو
یوں تو خود ہم نے بھی نہ دیکھا زخموں کی گہرائی تک

یہ تو انسانوں کے ٹوٹے ہوئے دل ہیں ساقی
ہم سے ٹوٹے ہوئے ساغر نہیں دیکھے جاتے

لیکن جب دوسروں کا غم ان کے سامنے آتا ہے تو وہ اپنا غم بھول جاتے ہیں ؎

ہزاروں ہیں جو اس صحرائے غم میں پابرہنہ ہیں
ہم اپنے واسطے کیا سایۂ سرو سمن دیکھیں

میں شہر کے کئی صورت گروں کے پاس گیا
کسی سے بن نہ سکی یادِ یار کی صورت

مدتیں ہو گئیں اس دامنِ رنگیں سے چھٹے
آنکھ تک دیدۂ خونبار لیے پھرتے ہیں

دل کو کوئی آزار تو ہوتا
اپنا کوئی غم خوار تو ہوتا

غم زمانہ کے ساتھ تاج کے ہاں عشق و عاشقی کی حسین و رنگین فضا بھی پر رونق نظر آتی ہے۔ عشق کی نیرنگیاں، حسن کی جلوہ سامانیاں، جذبے کی شدت، وجدان کی فراوانی کی ترجمانی بھی بڑے ہی خوبصورت انداز میں کرتے ہیں۔

عشق کی فراوانی کے ساتھ اس کے تقدس کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں ان کا عشق جنون انگیز نہیں ہے۔ اس میں بلا کا وقار اور ٹھہراؤ ہے۔ اپنی عزت کی طرح تاج کو محبوب کی عزت بھی اسی قدر عزیز ہے ؎

ہمارا کیا ہے دیوانے ہیں کچھ بھی کر گزریں
یقین کرو کہ تمہارا وقار ذہن میں ہے

متاعِ دل بھی تیرا ہے یہ جان و تن بھی تیرے
ہر ایک شئے تیرے صدقے ہے بانکپن کے سوا

تیری آنکھوں کی کہانی ساغروں تک آ گئی
زلف تیرے رخ سے اڑ کر میکدے پر چھا گئی

کہیں موتی، کہیں تارے، کہیں پھول
دہر تیری ہی قبا ہو جیسے

قصہ مختصر تاج نے گردشِ روزگار، فکرِ معاش اور خیالِ بتاں کو اپنی غزل میں اس حسن و خوبی کے ساتھ یکجا کیا ہے کہ اس سے غزل کے کلاسیکی ترین حسن کو اس کی ہیئت و ساخت کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔

ان کی غزل اپنی تمام تر دلچسپی، رعنائی و سحر سے قاری کے دل کو مسخر کیے بغیر نہیں رہتی اور بقول جان نثار اختر (مرحوم) "ان کے شعر پڑے بڑوں کو چونکا دینے والے ہیں" اور یہ حقیقت ہے کہ تاج کے فن میں خلوص ہی خلوص موجود نظر آتا ہے ؎

نہ زعمِ فن، نہ غرورِ ہنر، نہ فخرِ شعور
میری غزل میں نہیں کچھ خلوصِ فن کے سوا

رشید الدین

بدایوں کا ادبی پس منظر

بدایوں ہندوستان کا ایک قدیم، متمدن اور تاریخی شہر ہے۔ اس سرزمین پر بے شمار اولیاء اللہ، عالم اور فاضل اہلِ قلم پیدا ہوئے ہیں۔ اُردو کے بے شمار شعراء و ادبا کا بھی یہ مولد و منشا رہا ہے۔ یہ بڑی مردم خیز سرزمین ہے اور ہر زمانے میں اس کی اہمیت رہی ہے۔ ۱۹۵٦ میں ہندوستان کی تنظیم جدید ہوئی ہے اس میں یہ اتر پردیش کے حصہ میں آیا ہے اور ان دنوں اسی نام کے ضلع کا مستقر ہے۔ اس کے شمال میں ضلع بریلی کا کچھ حصہ، مراد آباد اور رامپور، جنوب میں فرخ آباد، ایٹہ اور علی گڑھ، مشرق میں ضلع بریلی کا کچھ حصہ اور شاہ جہاں پور اور مغرب میں ضلع بلند شہر واقع ہے۔

بدایوں دو دریاؤں گنگا اور رام گنگا کے بیچوں بیچ بسا ہوا ہے اور دریائے سوت اس کے بالکل کنارے سے گزرتا ہے جسے مار دریا بھی کہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے سوت بھی کہتے ہیں۔ اس کی آب و ہوا بے حد خوشگوار ہے اور روہیلکھنڈ کے علاقے کا یہ ایک شاداب خطہ سمجھا جاتا ہے کسی زمانے میں یعنی تقسیم ہند سے قبل تک بدایوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ لیکن اب یہ صورتِ حال باقی نہیں رہی ہے اس کے باوجود آج بھی یہ دیگر بیشتر شہروں کی طرح اس پر مسلم کلچر کی گہری چھاپ ہے اور قدم قدم پر مسجدوں کے مینار اور درگاہوں کے گنبد ابھرے ہیں۔ یہ اس کی عظمتِ رفتہ اور مسلم تہذیب کی گواہی دیتے ہیں۔ یہ شہر صرف مسلم تہذیب ہی کا مظہر نہیں ہے بلکہ یہاں ہندو سلطنت کے نشان بھی ملتے ہیں اور مسلمانوں کے اس شہر میں آنے سے پہلے یہ ہندو تہذیب ہی کا مسکن تھا۔

قدیم کتابوں میں بدایوں کا تذکرہ راجہ بھرت کے زمانے سے ملتا ہے۔ "بدایوں۔ قدیم و جدید" مصنفہ نظامی بدایونی کے مطابق اس کا قدیم نام بدھ گاؤں تھا جسے بدھ نامی راجہ نے بسایا تھا۔ بعد میں یہ بداؤں ہو گیا اور پھر بدایوں کہلایا۔ آج بھی اہلِ بدایوں عام بول چال میں اسے بداؤں ہی کہتے ہیں۔ نیز اس کا انگریزی املا BUDAUN بھی لکھا جاتا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی اپنی تاریخ میں اسے جگہ جگہ بداؤں ہی لکھا ہے۔ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے قبل تک بدایوں ہندو بادشاہوں ہی کے زیر نگیں رہا اور اس زمانے کے بنائے ہوئے بہت سے مندر آج بھی خستہ حالت میں یہاں موجود ہیں۔

جب مسلمان دلی اور پنجاب میں جم گئے تو انھوں نے وسط ہند کا رخ کیا۔ سب سے پہلے سالار مسعود غازی نے ۱۰۲۸ء میں بدایوں پر حملہ کیا۔ ان کا مزار آج بھی بدایوں میں موجود ہے ۱۱۹۶ء میں اس پر قطب الدین ایبک نے حملہ کیا اور اسے فتح کیا جو شہاب الدین غوری کا غلام اور وزیر تھا۔ شہاب الدین غوری کے بعد (جو لاولد تھا) خود قطب الدین ایبک ہندوستان کا بادشاہ بن گیا اور اس نے اپنے غلام اور داماد شمس الدین التمش کو بدایوں کا

کو دو مقرر کیا جس نے یہاں کئی عمارتیں تعمیر کیں جن میں ایک مسجد اور عیدگاہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور آج بھی اس کے نام سے مشہور ہے۔ بدایوں کی گورنری سے التمش سارے ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا اور دلی روانہ ہو گیا۔

خلجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں بھی بدایوں مسلمانوں کے زیرِ نگیں رہا۔ خاندانِ سادات، پٹھان خاندانوں اور مغل دور میں بھی بدایوں اسلامی تہذیب و فن کا ایک اہم مرکز بنا رہا۔ بعد میں یہ روہیلوں کے قبضہ میں آگیا اور اسی ریاست روہیلکھنڈ کا ایک حصہ بن گیا۔ شاہانِ اودھ نے انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا اور یہ شہر شاہانِ اودھ کی عملداری میں شامل ہو گیا لیکن یہ زیادہ دن تک ان کے پاس بھی نہیں رہ سکا اور ۱۸۰۱ء میں انھیں روہیلکھنڈ انگریزوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ تب سے لے کر ۱۹۴۷ء تک یہ انگریزوں کے زیرِ نگیں رہا اور ۱۸۳۰ء میں ضلع کا مستقر قرار پایا۔ اس سارے عرصے میں یہ علم و ہنر اور اردو زبان و ادب کے فروغ کا مرکز بنا رہا۔

آج کا بدایوں پوری طرح ایک جدید شہر ہے اور آج بھی یہ اسلامی تمدن اور اردو ہی کا شہر معلوم ہوتا ہے۔ یہاں اردو کے کئی چھاپے خانے ہیں اور مقامی طور پر کئی اخبارات اور رسائل نکلتے ہیں۔ بدایوں میں آج بھی اتنے سارے اولیاء اللہ کے مزارات ہیں کہ اسے "مدینۃ الاولیاء" کہا جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کا وطن بدایوں ہی تھا اور وہ یہیں سے دلی گئے تھے۔ ان کے والد سید احمد صاحب کا مزار بدایوں میں آج بھی "مرجعِ خلائق" ہے اور بڑے پیر کا مزار کہلاتا ہے۔ بدایوں میں شہداء، صالحین اور اولیاء کے مزارات کی اسی کثرت کی وجہ سے اردو کے مشہور شاعر مصحفی نے اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر یہ شعر کہا تھا ؎

ظالم تیری گلی بھی بدایوں سے کم نہیں جس کے ہر ایک گھر میں مزارِ شہید ہے

اردو زبان و ادب سے بدایوں کا شروع سے گہرا تعلق رہا ہے اور یہاں کے بعض شاعر اور ادیب ہندوستان گیر شہرت کے مالک رہے ہیں اور آج بھی ہیں۔ اودھ پنچ گروپ کے مشہور مزاحیہ شاعر احمق پھپھوندوی بدایوں ہی کے تھے۔ عصمت چغتائی اور عظیم بیگ چغتائی کے والد مرزا قسیم بیگ چغتائی (جو انگریزوں کے زمانے میں جج تھے) کا وطن بھی بدایوں ہی تھا۔ اردو کی مشہور افسانہ نگار بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا آبائی وطن بھی بدایوں ہی رہا ہے۔ مشہور مزاح نگار اور انشا پرداز محفوظ علی بھی بدایونی ہی تھے۔ قمر الدین احمد قمر جو اکبر الہ آبادی کے بچپن کے دوست تھے اور جن کی اکبر کے بارے میں کئی کتابیں ہیں ان کا تعلق بھی بدایوں ہی سے تھا۔

بدایوں شروع سے علماء و فضلا کی بستی رہی ہے۔ الحاج حضرت مولانا شاہ قاری محمد عبدالحامد قادری نعیمی (جو پاکستان میں مفتی کے عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں اور جن کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے) بدایوں ہی کے متوطن تھے۔ مولانا عبدالقدیر جو اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کے زمانے میں ریاست حیدرآباد میں مفتی کے عہدہ پر فائز تھے ان کا تعلق بھی بدایوں سے تھا جن کے فرزند مولانا ہادی القادری ہیں جو نظام کالج حیدرآباد میں عربی کے استاد ہیں۔ ہادی صاحب اردو کے شاعر بھی ہیں اور ان کے ایک فرزند فکری بدایونی بھی حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور بدایوں کی محبت کی وجہ سے اب تک اس نسبت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ حیدرآباد کے ایک اور نوجوان اور جدید شاعر مصحف اقبال توصیفی کا وطن بھی بدایوں ہی تھا۔

ضیاء احمد بدایونی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، آلِ احمد سرور، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور مشیر علی صدیقی جیسے نقادوں اور محققین کا وطن بھی بدایوں ہی ہے اور فانی بدایونی، شکیل بدایونی، حیرت بدایونی، ادا بدایونی، زہرہ نگاہ، جام نوائی اور دلاور فگار جیسے شاعروں نے سارے ہند و پاک میں بدایوں کا نام روشن کیا ہے۔ اس سلسلے میں دلاور فگار کا مزاحیہ قطعہ ملاحظہ ہو ؎

دو چیزیں کہیں جن کو یو۔ پی کا تحفہ بھی چار چیزیں ہیں کمیاب و نادر

(بقیہ صفحہ پر)

عندلیب شادانی

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری اخبار رسائل سے
مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا

تحقیق اور اس کا طریقِ کار

ہوا خواہانِ اُردو کے لیے یہ امر یقیناً اطمینان و مسرت کا باعث ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد سے نا سازگار حالات کے باوجود، اُردو ادب کے مختلف شعبوں میں تحقیق کا کام نہایت سرگرمی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ پچھلے سترہ سال کی قلیل مدت میں تحقیقی مقالات کی ایک معقول تعداد وجود میں آچکی ہے اور دنیائے ادب کے بہت سے تاریک گوشے تحقیق کی روشنی میں جگمگا اُٹھے ہیں۔

اگرچہ تحقیق اور مقالہ یہ دونوں لفظ ہماری زبان میں قدیم الایام سے رائج چلے آتے ہیں لیکن ہمارے زمانے میں انھوں نے ایک ادبی اصطلاح کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور اب اپنے قدیم معنی کے علاوہ ایک نئے مفہوم کے حامل ہیں۔ تحقیق دراصل ریسرچ کا اور مقالہ تھیسس کا ترجمہ ہے اور یہ دونوں لفظ اپنے اصطلاحی معنی میں قبولیت کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

تحقیق کے لغوی معنی تو سب ہی کو معلوم ہیں، رہے اصطلاحی معنی تو تحقیق یعنی ریسرچ کا یہ مطلب ہے کہ یا تو نئے حقائق دریافت کیے جائیں یا پھر معلومہ حقائق کی کوئی ایسی نئی تفسیر پیش کی جائے کہ اس سے ہمارے معلومات میں معتد بہ اضافہ ہو جائے۔ بعض لوگوں نے ریسرچ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ فکر کی پوری جد و جہد کے ساتھ حقیقت کی جستجو کا نام ریسرچ ہے اور غایت اس کی حق الیقین کا درجہ حاصل کرنا ہے۔

ہمارا دور علم و فن کے ہر شعبے میں تخصص یعنی (SPECIALIZATION) کا دور ہے اور تخصص کے حصول کا ایک خاص ذریعہ ریسرچ ہے اس محل پر یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا پرانے زمانے میں تخصص کی ضرورت نہ تھی؟ آخر اگلے وقتوں میں بھی تو لوگ اپنے اپنے فن استاد کامل ہوا کرتے تھے۔ کیا وہ تخصص نہ تھا؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ کاملانِ فن تو ہر زمانے میں گذرے ہیں لیکن ان کا کمال فن ایک عمومیت رکھتا تھا۔ مثلاً پرانے زمانے میں ہر ایک ماہر طبیب سے یہ توقع تھی کہ وہ ہر مرض کا علاج ایک حد تک کامیابی کے ساتھ کر سکتا تھا۔ آج بھی ایک اچھا ڈاکٹر ہر مرض کا علاج کامیابی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب کوئی مرض مزمن اور پیچیدہ ہو جائے تو پھر وہ عام قسم کے ڈاکٹر کے بس کا نہیں رہتا۔ اُس وقت اسپیشلسٹ (SPECIALIST) کی ضرورت پڑتی ہے۔

آج کوئی دق کے علاج میں کامل ہے، کوئی امراضِ قلب کا ماہر ہے، کسی کو جراحی میں کمال حاصل ہے، کوئی آنکھوں کا بہترین معالج کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اسپیشلسٹ کی طرف رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ بات اگلے وقتوں میں نہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں علم کا دائرہ نہایت محدود تھا، اس بنا پر ایک شخص کسی علم یا فن کے جملہ شعبوں پہ حاوی ہو سکتا تھا؛ بلکہ اُس وقت کے تمام مروجہ علوم و فنون کو اچھی طرح سیکھ سکتا تھا!

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج سے چند سو سال قبل ایک شخص بیک وقت علوم دینیہ کا ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ طب، ریاضی، ہندسہ، نجوم، فلسفہ اور ادب سب ہی کچھ جانتا تھا۔ لیکن آج اس کا امکان نہیں۔ علم کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ علم و فن کے کسی ایک شعبے میں بھی کمال دسترس حاصل کرنا دشوار ہے۔ جملہ شعبوں میں کمال حاصل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چند سو سال قبل نہ سائنس کی لیبارٹری اس درجہ ترقی یافتہ تھی، نہ ایسے مطبعے تھے جو اتنی کثیر التعداد کتابیں چھاپ کر مہیا کر دیتے۔ آج علوم و فنون کی اشاعت کثیر کا ذمہ دار وہ شخص نہیں جو تمام علوم فنون کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے بلکہ وہ شخص ہے جو خوب غور و فکر کے بعد اپنے مطالعہ کے لیے چند مخصوص مضامین کا انتخاب کر لیتا ہے اور بقدر امکان ان کے مطالعے کو درجۂ کمال تک پہنچاتا ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ انسان کسی ایک فن میں تخصص حاصل کرے اور یہی ریسرچ کی غرض و غایت ہے۔

پچھلے پچیس سال کے دوران میں ایک ممتحن کی حیثیت سے مجھے ایسے کتنے ہی تحقیقی مقالات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو ہندو پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیے گئے۔ یونیورسٹی کے آئین کے مطابق پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے والے کو کم سے کم دو سال کسی ماہر استاد کی نگرانی اور رہنمائی میں کام کرنا پڑتا ہے لیکن ان مقالات کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان مقالہ نگاروں میں سے بیشتر کو اپنے رہنما کی رہنمائی سے مستفید ہونے کا کبھی موقع نہیں ملا اور استاد کی رہنمائی رسمی سرپرستی کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بعض اپنی طبع سلیم کی مدد سے منزلِ مقصود پر پہنچ گئے اور اکثر و بیشتر گمراہ ہو کر مصیبتوں اور ملامتوں کا نشانہ بنے۔

میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ ان رہنماؤں میں رہنمائی کی صلاحیت نہ تھی۔ ہماری یونیورسٹیوں کے اساتذہ میں بحمد اللہ ایسے ایسے جوہر قابل موجود ہیں جو اپنے فن میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ علم و فضل کا سمندر ہیں لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں میں کچھ ایسے الجھے رہتے ہیں کہ انھیں تلامذہ کے تحقیقی کام پر ایک سرسری نظر ڈالنے کا موقع بھی نہیں ملتا اور بعض اوقات ان کی سہل انگاری کی بنا پر ان کے وابستگان دامن کو نامرادی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جو مقالہ ایک فاضل استاد کی نظر سے گزر چکا ہو، اس میں املا کی درجنوں غلطیاں موجود ہوں، سیکڑوں اشعار غلط اور ناموزوں نقل ہوئے ہوں، مطالب کی تکرار اور اقتباسات کی غیر ضروری بھرمار ہو، عبارت میں طرح طرح کے اقسام پائے جاتے ہوں، واقعات اور حقائق مسخ کر دیے گئے ہوں اور قدم قدم پر مقالہ نگار کی کم مایگی کا پردہ چاک ہوتا ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیے جانے والے مقالات کو جانچتے وقت مجھے بارہا اس قسم کا تجربہ ہوا ہے۔

رہنماؤں کی اس کم التفاتی کا عموماً یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ مقالہ نگار بعض اوقات دو دو برس تک کامیابی اور ناکامی کے درمیان لٹکتا رہتا ہے اور کبھی کبھی یہ حالت دائمی محرومی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس صورت نے ہمیشہ مجھے یہ سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ آخر یہ گتھی کس طرح سلجھائی جائے اور ریسرچ کرنے والوں کی یہ مشکل کس طرح حل کی جائے؟

اس میں شک نہیں کہ جس طرح دوسرے فنون کو حاصل کرنے کے لیے استاد کی مدد ضروری ہوتی ہے اسی طرح تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے بھی کسی ماہر فن کی رہنمائی ناگزیر ہے لیکن تحقیق کے میدان میں خود راہ رو جب تک اپنے لیے کچھ نہ کرے، راہ نما کی ہدایت چنداں مفید ثابت نہیں ہوتی۔ راہ نما صرف راہ دکھا سکتا ہے، سفر کرنا خود راہ رو کا کام ہے۔ پھر تحقیق کا طریق کار اس درجہ قطعیت کے ساتھ متعین بھی نہیں کہ اس سے

سرہو تجاوز نہ کیا جاسکے۔ تحقیق کے دوران میں ایک ہوشمند طالب علم پر تحقیق کی راہیں خود بخود کھلتی چلی جاتی ہیں؛ البتہ طلب صادق اور سچی لگن کی ضرورت ہے۔ بایں ہمہ تحقیق کے کچھ بنیادی اصول ہیں جنھیں خود تحقیقی کام کرنے والوں نیز تحقیق کے راہ نماؤں نے عملی تجربوں کے بعد مفید پایا ہے۔ سطور ذیل میں انھیں بنیادی اصولوں سے، اختصار کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

منطقی نظم و ترتیب قائم رکھنے اور زیادہ سے زیادہ مفید نتائج حاصل کرنے کی غرض سے ریسرچ کے کام کو پانچ شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

اول ۔ موضوع کا انتخاب اور اس کی حد بندی۔

دوم ۔ ماخذوں کا تعین اور اُن کی فہرست مرتب کرنا۔

سوم ۔ مقالے کا خاکہ تیار کرنا۔

چہارم ۔ ماخذ کا مطالعہ اور اُن سے مفید مطلب مواد کا انتخاب کرنا۔

پنجم ۔ مقالہ نگاری۔

ریسرچ میں موضوع کا انتخاب بے حد درجہ اہمیت رکھتا ہے۔ موضوع کے انتخاب میں طالب علم کو پوری پوری آزادی ہونی چاہیے تاکہ وہ اپنے فطری میلان، ذاتی رجحان اور اپنی دلچسپی اور پسند کے مطابق کوئی مناسب موضوع اپنے لیے چن سکے۔ موضوع کا انتخاب کرتے وقت اپنے راہنما سے یا اس فن کے دوسرے اساتذہ سے مشورہ کر لینے میں کوئی مضایقہ نہیں بلکہ فائدہ ہی ہے لیکن آخری فیصلہ خود طالب علم کے اپنے ذوق کے مطابق ہونا چاہیے۔

کسی کو نظم زیادہ پسند ہے، کسی کو نثر، کسی کو تاریخ ادب کا مطالعہ مرغوب ہے، کسی کو انتقادیات کا۔ اب جس کو جس شعبۂ ادب سے زیادہ دلچسپی ہو اُسی میں سے اپنے لیے ایک اچھا سا موضوع منتخب کرے لیکن موضوع کا انتخاب کرتے وقت اس امر کا لحاظ بھی نہایت ضروری ہے کہ اس پر مقالہ لکھنے کے لیے کافی مواد مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر مواد بہت کمیاب ہے تو ایسے موضوع سے صرف نظر ہی بہتر ہے۔ بنجر زمین میں ہل چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

اسی طرح اگر کسی موضوع پر مواد کثیر مقدار میں آسانی سے میسر آسکتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ یا تو آپ کا موضوع بہت وسیع ہے یا پھر دوسرے لوگ اس موضوع پر ریسرچ کر چکے ہیں۔ اگر آپ کسی گھسے پٹے یا نہایت روشن راستے پر جارہے ہیں تو پھر یہ ریسرچ نہیں اور اگر موضوع نہایت وسیع ہے تو مدت مقررہ کے اندر اس کا سمیٹنا آپ کے لیے از بس دشوار ہوگا۔

جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا، موضوع کا انتخاب کرتے وقت اپنے راہنما سے مشورہ کر لینا یقیناً مفید ہے لیکن خود اپنے ذوق، میلان اور ذاتی دلچسپی کو نظر انداز کر کے اُستاد کے بتائے ہوئے موضوع کو صرف اس لیے اختیار کرنا کہ اُستاد بہر حال ایک پختہ کار ماہر فن ہے، بڑی نادانی ہے۔ ایک امریکی پروفیسر نے اس ضمن میں بعض بڑی دلچسپ اور مفید باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ:

"تحقیق کے لیے موضوعات بے شمار ہیں۔ ہمیں اپنی پسند اور دلچسپی کے مطابق کوئی موضوع چن لینا چاہیے اب ہم اگر کوئی ایسا موضوع اختیار کریں جس سے ہمیں دلچسپی نہیں تو یہ ہمارا اپنا قصور ہے۔ جس طرح ہم تحقیق ادب میں کسی خاص ظاہری وجہ کے بغیر اپنا موضوع منتخب کر لیتے ہیں اسی طرح ریسرچ میں بھی بحیثیت مجموعی یہ اس بات کا واضح ہونا ضروری نہیں کہ ہم نے فلاں موضوع کا انتخاب کس بنا پر کیا۔ انتخاب موضوع کے لیے یہی جواز کافی ہے

کہ ہمیں اس سے غیر معمولی دلچسپی ہے۔ آپ کسی نوجوان سے کہہ سکتے ہیں کہ میاں تم فلاں لڑکی سے محبت کرو اور اپنی اس تجویز کے بہت سے فائدے بھی آپ اُسے بتا سکتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ آپ کے اس مشورے سے مطمئن ہو کر اس خاص لڑکی کو چاہنا شروع کر دے کیونکہ انتخاب تو اپنے فطری میلان اور ذاتی تجربے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ بہر حال اگر وہ آپ کے مشورے پر کاربند ہو کر اپنی ذاتی رغبت کے بغیر محض آپ کے بتائے ہوئے فائدوں کی خاطر اُس لڑکی سے شادی کرے، یعنی اُستاد کے مشورے سے ایسا موضوع چن لے جس سے اُسے قطعی دلچسپی نہیں یا بہت کم دلچسپی ہے تو پھر دوران تحقیق میں اُسے جتنی زحمتیں اور تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں وہ ان سب کا مستحق اور سزاوار ہے۔"

اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صرف مقالہ نگاری کے لیے موضوع کا دلچسپ ہونا کافی نہیں بلکہ قارئین کے لیے بھی اس میں کچھ ندرت، کچھ تازگی ہونا چاہیئے تاکہ وہ بھی مقالے کے مطالعہ سے کچھ نئی باتیں سیکھ سکیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تحقیق کے لیے موضوعات بے شمار ہیں۔ کسی ایک ادیب یا شاعر پر مقالہ لکھا جاسکتا ہے، کسی صنف ادب کا جائزہ لیا جاسکتا ہے، اس کی ایجاد اور تاریخی ارتقاء سے بحث کی جاسکتی ہے، کسی دور کی ادبی تاریخ لکھی جاسکتی ہے، کسی خاص دور کے شعرا یا نثر نگار زیر بحث آسکتے ہیں۔ زبان و ادب کا سیاسی، سماجی یا تاریخی پس منظر بیان کیا جاسکتا ہے۔ سوانحی اور مذہبی لٹریچر پر بہت لکھا جاسکتا ہے۔ اُردو لغت اور اُردو قواعد بھی تحقیق کا موضوع بن سکتے ہیں۔

اُردو ادب میں ہندو کلچر، ہندی کلچر، یورپین کلچر اور اسلامی کلچر کے اثرات، اُردو کے یورپین شعراء، ہندو شعراء، اُردو شاعرات اور ادیب خواتین، ترقی پسند ادب، نیا ادب، اُردو ثقافت، تصوف، مرثیہ، اخلاق، طنز و مزاح، داستان، افسانہ، ناول، ڈراما، تنقید، مناظر قدرت، قومی و ملی شاعری، بنگال میں اُردو، غرض یہ اور ایسے بے شمار دوسرے موضوعات تحقیق کے لیے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ اُن چند موضوعات کو سامنے رکھ کر تحقیق کرنے والے انھیں میں سے اور سیکڑوں نئے موضوع پیدا کر سکتے ہیں۔

شق اول کے تحت انتخاب موضوع کے ساتھ میں نے موضوع کی حد بندی کا بھی ذکر کیا ہے۔ حد بندی سے میری یہ مراد ہے کہ موضوع غیر معین طور پر وسیع، ہمہ گیر اور عام نوعیت کا نہ ہو۔ مثلاً "اُردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد" ہمارا موضوع بحث ہو تو یہ ایک ایسا موضوع ہوگا جس کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے عمر دراز چاہیے۔ اُردو ادب میں سب ہی کچھ شامل ہے۔ نظم بھی، نثر بھی، نظم و نثر کے جملہ اصناف بھی، ہیئت کے لحاظ سے بھی اور مواد کے اعتبار سے بھی، داستان، افسانہ، ناول، ڈراما، صحافت، نظم و غزل، اُردو شاعری کا نیا دبستان ترقی پسند ادب، سیاسی ادب، غرض کوئی چیز اس کے دائرے سے خارج نہیں۔

اختصار کی یہ صورت ہو سکتی ہے کہ مثلاً اگر کسی کو نظم سے دلچسپی ہے تو وہ "اُردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد" کو مختصر کر کے "اُردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد" میں محدود کر سکتا ہے۔ پھر "اُردو شاعری ۱۸۵۷ء کے بعد" کو مختصر کر کے "اُردو شاعری کا نیا دبستان" میں تبدیل کر سکتا ہے اس آخری موضوع میں بھی مزید اختصار کی خاصی گنجائش ہے۔ مثلاً "اُردو شاعری کا نیا دبستان پہلی جنگ عظیم کے آغاز تک" ہمارا موضوع تحقیق ہو سکتا ہے۔ کام اتنا ہو کہ دو برس میں یا زیادہ سے زیادہ تین برس میں اس کی تکمیل ہو سکے۔ اس تحقیقی مقالے کے لیے تین سو ساڑھے تین سو صفحات کا حجم بالکل کافی ہے۔

ادھر چند سال سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تحقیقی مقالوں کا حجم برابر بڑھتا جاتا ہے۔ فل سکیپ سائز کے چار سو، پانچ سو، بلکہ چھ سو صفحات کے مقالے میری نظر سے گزر چکے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے مقالہ نگاروں میں یہ بنیادی خیال کسی طرح پھیل گیا ہے کہ تحقیقی مقالے

کی اہمیت اس کی ضخامت پر منحصر ہے۔ پچ چہ سو صفحوں کے طویل مقالوں کے مواد کو بڑی آسانی سے تین سو ساٹھ سے تین سو صفحات میں سمیٹا جا سکتا ہے اور اس شرط کے ساتھ کہ نہ کوئی اہم بات چھوٹنے پائے نہ بحیثیت مجموعی مقالے کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ذرہ برابر نقصان پہنچے۔

موضوع کے انتخاب اور اس کی حد بندی کے بعد دوسرا مرحلہ ماخذوں کے تعین کا ہے۔ چونکہ ریسرچ کا سارا دار و مدار ماخذوں پر ہی ہوتا ہے۔ اس لیے ہر نوع کے ماخذوں کی ایک مفصل اور مکمل فہرست تیار کر لینی چاہیے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں اپنے ماخذوں کا پتا کیوں کر چلے؟ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں؛ سب سے پہلے اس فن کی کتابوں سے واقفیت بہم پہنچانا ضروری ہے جو ہمارے موضوع تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں ان تمام کتب خانوں کی فہرستوں کا مطالعہ کرنا پڑے گا جن تک ہماری رسائی ممکن ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے کتب خانے خواہ وہ یونیورسٹیوں کی ملکیت ہوں یا دوسرے علمی اداروں کی، حد درجہ نامکمل ہیں۔ بعض اوقات ان میں کسی کی بعض امہات کتب بھی دستیاب نہیں ہوتیں۔ ایسی صورت میں کسی ایک لائبریری پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ بعض کتب خانوں میں مخطوطات کے بڑے قیمتی ذخیرے محفوظ ہیں لیکن بدقسمتی سے ان کی فہرستیں ہنوز شائع نہیں ہوئیں اس لیے بیرونی لوگ ان مخطوطات سے استفادہ نہیں کر سکتے۔

کتب خانوں کے علاوہ اپنے راہ نما کی معلومات سے استفادہ کرنا بھی ضروری ہے بلکہ جہاں تک ممکن ہو اپنے استاد کے علاوہ دوسرے اساتذۂ فن سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔ جن لوگوں نے اپنی زندگیاں اسی دشت کی سیاحی میں صرف کی ہیں ان کی یاد کے کسی نہ کسی گوشے میں ہمارے کام کی چیزیں بھی پڑی ہوئی مل آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے موضوع تحقیق سے تعلق رکھنے والے فن کی کتابیں ہی ہمارے لیے ضروری مواد فراہم کر سکتی ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرے فنون سے تعلق رکھنے والی بعض معاصرانہ تصنیفات میں بھی ہمیں اپنے کام کی کچھ باتیں مل جاتی ہیں۔

مرزا غالب نے کسی موقع پر سرور کی "فسانۂ عجائب" کے متعلق یہ رائے ظاہر کی تھی کہ "لاحول ولاقوۃ۔ اس میں لطف زبان کہاں۔ ایک تک بندی ہے اور بھٹیار خانہ جمع کیا ہے۔"

قدرتی طور پر ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ غالباً مرزا غالب کی یہ رائے مولانا حالی نے "یادگار غالب" میں نقل کی ہوگی یا ممکن ہے کہ مرزا نے اپنے کسی خط میں کسی بے تکلف دوست کو یہ بات لکھی ہو اس لیے اردوئے معلیٰ، عود ہندی یا مکاتیب غالب یا خطوط غالب کے کسی دوسرے مجموعے میں یہ عبارت ملنی چاہیے لیکن نام بردہ کتابوں میں سے کسی میں بھی اس کا وجود نہیں۔ ادب کے ایک طالب علم کے لیے مرزا غالب کی یہ تنقید بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ تلاش کرنے والے کو یہ عبارت غالب کے ایک ہم عصر بزرگ حضرت غوث علی شاہ کے تذکرۂ غوثیہ میں مل جائے گی۔ اسی طرح بہت سے قیمتی نکتے اور اہم معلومات دوسرے فنون کی معاصرانہ تصنیفات سے ہمارے ہاتھ آجاتی ہیں۔

بعض اوقات کتابوں کے علاوہ ادبی ماہناموں سے بھی نہایت قیمتی مواد مل جاتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے یہاں مختلف ماہناموں میں چھپنے والے مضامین کا انڈکس (اشاریہ) شائع کرنے کا دستور نہیں۔ ادھر چند سال سے دو ایک رسالوں نے اس مفید کام کا آغاز کیا ہے۔ اس کے علاوہ رسالوں کے مکمل فائل بھی شاذ و نادر ہی کہیں میسر آتے ہیں۔ لہٰذا ریسرچ کرنے والے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ معیاری ماہناموں کے جتنے شمارے جہاں کہیں مل جائیں ان کی فہرست مضامین پر نظر ڈال لے۔ اس کی محنت رائگاں نہیں جائے گی

بلکہ مفید اور قیمتی مواد ہاتھ آنے کے امکانات قوی ہیں۔

بعض فضلا اور محققین کے مضامین پہلے ماہناموں میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے بعد کتابی صورت میں، لہٰذا ان کتابی صورت میں شائع ہونے والے مجموعوں کی فہرست مضامین پر بھی ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔ اس طرح ماہناموں کے فائل دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے جو کمی رہ جاتی ہے وہ کسی حد تک ان مجموعوں سے پوری ہو جاتی ہے۔

ماخذوں کا پتا چلانے کے لیے دو ذریعے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں؛ ایک تو اُن مخطوطات نیز مطبوعات کی مطبوعہ فہرستیں جو یورپ کے اکثر اور ایشیا کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ دوسرے ماخذوں کے وہ حوالے جو کسی انسائکلوپیڈیا یا مضمون کے آخر میں درج ہوتے ہیں۔ ان حوالوں کی مدد سے بہت سے اہم اور قیمتی ماخذوں تک ہماری رسائی ہو جاتی ہے۔

ماخذوں کے سلسلے میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ تمام ماخذ یکساں طور پر قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ بعض کا مستند اور معتبر ہونا مسلم ہے اور بعض ساقط الاعتبار ہیں۔ دونوں کے درمیان حد فاصل کھینچنے کے لیے پوری احتیاط لازم ہے۔ کسی غیر مستند ماخذ سے حاصل کی ہوئی اطلاع ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھی جاتی ہے اس لیے دوسرے معتبر ماخذوں سے اس کی تائید ضروری ہے۔ کسی ماخذ کا نسبتاً قدیم ہونا یا واقعات کا معاصر ہونا یقیناً اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ علمی دنیا میں اس کا کیا پایہ ہے اور اس کی روایات درایت کی کسوٹی پر کس حد تک پوری اترتی ہیں۔ کچھ چشم دید واقعات بھی قابل قبول نہیں ہوتے کیونکہ عقل اُنھیں تسلیم نہیں کرتی یا دوسرے حالات سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔

ماخذوں کی فہرست تیار کر لینے کے بعد ہم تیسرے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اب ہمیں اپنے مقالے کا ایک خاکہ تیار کر لینا چاہیے۔ خاکہ بنائے بغیر مقالہ لکھنا ایسے ہی ہے جیسے نقشے کے بغیر مکان تعمیر کرنا۔ خاکہ بنانے کے بعد ذہنی طور پر مقالے کی ہیئت متعین ہو جاتی ہے۔ اس نقشے پر عمارت بنانا آسان ہے۔ خاکے میں جو عنوانات قائم کیے جائیں ان میں ترتیب زمانی کا لحاظ مفید ہے بلکہ ضروری ہے۔ مطالعے کے دوران میں خاکے کے جس عنوان سے متعلق مواد ہاتھ آئے اسے اسی عنوان کے تحت درج کر لینا چاہیے۔

ماخذ کی فہرست اور مقالے کا خاکہ تیار کر لینے کے بعد ہم چوتھے مرحلے میں داخل ہوتے ہیں۔ اب ماخذوں کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ مطالعے کے دوران میں مقالہ نگار اپنے مفید مطلب مواد کا انتخاب کر کے یادداشتیں لکھتا جاتا ہے۔ اس کام میں بڑی احتیاط لازم ہے۔ یادداشتیں لکھتے وقت دو بنیادی اصول پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ ایک تو یہ کہ غیر ضروری نوٹ ہرگز نہ لیے جائیں ورنہ مقالہ لکھتے وقت سخت اُلجھن کا سامنا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ کوئی ضروری نکتہ چھوٹنے نہ پائے۔ ماخذوں کا مطالعہ بار بار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کوئی چیز چھوٹ گئی تو پھر اس کا ہاتھ آنا دشوار ہے۔

یادداشتیں لکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کتاب کا پورا خلاصہ تیار کر لیا جائے بلکہ صرف انھیں مقامات کا لب لباب اخذ کرنا چاہیے جو ہمارے موضوع سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بعض اوقات آپ کسی کتاب کے پورے پورے ابواب میں سے اس طرح گزر جائیں گے کہ ایک سطر بھی نوٹ نہ کریں گے اور بعض اوقات کسی ایک ہی صفحے سے کئی کئی نوٹ لینے ہوں گے۔

یادداشتیں کسی مقررہ اصول کے مطابق لکھی جانی چاہئیں۔ بعض لوگ دوران مطالعہ میں کسی اصول یا ترتیب کا لحاظ کیے بغیر، عجلت میں کاغذ کے متفرق پرزوں پر یا نوٹ بک میں مسلسل نوٹ لکھتے جاتے ہیں۔ ان یادداشتوں میں کسی اصول یا نظم و ترتیب کو دخل نہیں ہوتا اور لکھے جانے کے بعد ان کی طبقہ بندی بہت دشوار ہے۔ اس لیے ان کی افادیت گھٹ جاتی ہے اور مقالے میں بے ترتیبی اور تکرار پیدا ہو جاتی ہے

اس خرابی سے بچنے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ ہر یادداشت ایک جداگانہ کارڈ یا ورق پر لکھی جائے۔ پھر اُن اوراق کو مضمون کی مناسبت سے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کرلیا جائے گا۔

یادداشتیں لکھنے کا کوئی معیاری طریقہ ہنوز متعین نہیں ہوا ہے۔ ہر شخص اپنی رائے اور فہم کے مطابق ماخذوں سے نوٹ لے سکتا ہے لیکن مذکورہ بالا طریقہ مبتدیوں کے لیے ضرور مفید ثابت ہوگا۔ یادداشتیں تیار ہوگئیں تو گویا مقالے کی تعمیر کے لیے جملہ سامان فراہم ہوگیا۔ اب مقالہ نگار کو مقالہ لکھنا شروع کردینا چاہیئے۔

ہر لکھنے والے کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے۔ اُسے نہ بدلا جاسکتا ہے نہ بدلنے کی ضرورت ہے لیکن بعض امور ایسے ہیں جن کا لحاظ رکھنا ہر شخص کے لیے مناسب ہے اور وہ مجموعی طور پر مقالے کے حسن و خوبی میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ غیر ضروری طوالت سے پرہیز کیا جائے۔ مقالے کی خوبی اور اس کی اہمیت کا انحصار اُس کے حجم پر نہیں، اہلِ نظر یہ دیکھتے ہیں کہ اس مقالے سے علم کے حدود میں کتنا اضافہ ہوا، کون سی نئی بات ہمیں معلوم ہوئی، کون سا نیا نقطۂ نظر سامنے آیا؟ ایجاز و اختصارِ تحریر کی ایک بڑی خوبی ہے، بشرطیکہ اختصار کی بنا پر کوئی اہم نکتہ بیان ہونے سے رہ نہ جائے اور مفہوم میں کسی قسم کا اُلجھاؤ یا جھول پیدا نہ ہو۔

تحقیق کی دنیا میں ندرت کی بڑی قیمت ہے۔ اگر آپ نے کوئی ایسا نادر نکتہ دریافت کیا ہے جو اب تک لوگوں کی نظر سے پوشیدہ تھا تو دوسروں سے قطع نظر خود آپ کو اپنی اس دریافت سے بے حد مسرت ہوگی۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو بنیادی اصول کے طور پر یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ اُن کی تحقیق کی غرض و غایت اپنے کسی عقیدے یا نظریے کی تائید نہ ہو۔ اگر بلا قصد و ارادہ اُن کی بے لاگ تحقیق سے اُن کے کسی خیال کی تائید ہو جائے تو سبحان اللہ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو تو تحقیق کو توڑ مروڑ کر اپنے عقیدے کے سانچے میں ڈھالنا نہ صرف منصبِ تحقیق کے منافی ہے بلکہ امانت و دیانت کے بھی خلاف ہے۔ تحقیق کرنے والے کو ہمیشہ کھلے دل سے تحقیق کے نتائج کی پذیرائی کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔

مقالہ نگار کا یہ فرض ہے کہ جہاں جہاں سے اس نے استفادہ کیا ہے بلا پس و پیش اور کھلے دل سے اس کا اعتراف کرے۔ اس اعتراف سے اُس کے کام کی اہمیت اور قیمت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے۔ مقالہ نگار کے قارئین صرف طلبا ہی نہیں ہوتے، پختہ کار اہلِ نظر اور اربابِ علم و فضل بھی ہوتے ہیں۔ اگر مقالہ نگار نے دوسروں کے دریافت کیے ہوئے حقائق کو اپنے نتائج کی تحقیق کے طور پر پیش کیا تو اربابِ نظر سے اصل حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اس طرح مقالہ نگار کا بھرم کھل جاتا ہے، اُسے سرقہ کا مجرم گردانا جاتا ہے اور اس کے مقالے کی قدر و قیمت کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

ماخذ کے حوالے دیتے وقت بعض لوگ ایک اور "حکمت" سے کام لیتے ہیں جو بالآخر نادانی ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مولانا شبلی نے "شعرالعجم" میں بدایونی کی "منتخب التواریخ" سے ایک اقتباس پیش کیا۔ اب ایک مضمون نگار صاحب اپنے مضمون میں بدایونی کی وہی عبارت شعرالعجم سے نقل کرتے ہیں مگر "شعرالعجم" کا ذکر نہیں کرتے۔ صرف "منتخب التواریخ" کا حوالہ دیتے ہیں، گویا انھوں نے یہ عبارت براہ راست "منتخب التواریخ" سے لی ہے، حالانکہ "منتخب التواریخ" اُن کی نظر سے نہیں گزری۔

اس قسم کی جو بے احتیاطی ہوتی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر بدایونی کی عبارت نقل کرنے میں شعرالعجم کے کاتب سے کوئی غلطی ہوگئی ہے تو ان مضمون نگار صاحب کے یہاں بھی وہ غلطی ٹھیک اسی طرح پائی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اگر ان کا پیش کیا ہوا اقتباس اصل کتاب سے لیا گیا ہوتا تو اس میں یہ غلطی ہرگز نہ ہوتی۔

تحقیقی مقالات کی زبان کے بارے میں ایک بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ قطعیت اور اعتدال تحقیق کے لوازم ہیں۔ تحقیق میں مبالغے کی مطلق گنجائش نہیں ہوتی۔ سنسنی خیز، جذباتی، جانب دارانہ، تحقیر وغیرہ قسم کے الفاظ سے اجتناب لازم ہے۔

(صحیفہ، لاہور، [illegible])

کرشن چندر

جامن کا پیڑ

رات کو بڑے زور کا جھکڑ چلا۔ سکریٹریٹ کے لان میں جامن کا ایک درخت گر پڑا۔ صبح جب مالی نے دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ درخت کے نیچے ایک آدمی دبا پڑا ہے۔

مالی دوڑا دوڑا چپراسی کے پاس گیا۔ چپراسی دوڑا دوڑا کلرک کے پاس گیا۔ کلرک دوڑا دوڑا سپرنٹنڈنٹ کے پاس گیا۔ سپرنٹنڈنٹ دوڑا دوڑا باہر لان میں آیا۔ منٹوں میں درخت کے نیچے دبے ہوئے آدمی کے گرد مجمع اکٹھا ہوگیا۔

"بے چارا! جامن کا پیڑ! کتنا پھل دار تھا۔" ایک کلرک بولا۔

"اور اس کی جامنیں کتنی رسیلی ہوتی تھیں۔" دوسرا کلرک یاد کرتے ہوئے بولا۔

"میں پھلوں کے موسم میں جھولی بھر کے لے جاتا تھا۔ میرے بچے اس کی جامنیں کتنی خوشی سے کھاتے تھے۔" تیسرا کلرک تقریباً آبدیدہ ہوکر بولا۔

"مگر یہ آدمی؟" مالی نے دبے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں، یہ آدمی — !" سپرنٹنڈنٹ سوچ میں پڑ گیا۔

"پتہ نہیں! زندہ ہے یا مر گیا؟" ایک چپراسی نے پوچھا۔

"مر گیا ہوگا۔ اتنا بھاری تنہ جس کی پیٹھ پر گرے۔ وہ بچ کیسے سکتا ہے؟" دوسرا چپراسی بولا۔

"نہیں میں زندہ ہوں!" دبے ہوئے آدمی نے بمشکل کراہتے ہوئے کہا۔

"درخت کو ہٹا کر اسے جلدی سے نکال لینا چاہیے!" مالی نے مشورہ دیا۔

"مشکل معلوم ہوتا ہے۔" ایک کاہل اور موٹا چپراسی بولا۔ "درخت کا تنہ بہت بھاری اور وزنی ہے۔"

"کیا مشکل ہے۔" مالی بولا۔ "اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب حکم دیں تو ابھی پندرہ بیس مالی، چپراسی اور کلرک لگا کر درخت کے نیچے سے دبے ہوئے آدمی کو نکالا جاسکتا ہے!"

"مالی ٹھیک کہتا ہے!" بہت سے کلرک ایک دم بول پڑے۔ "لگاؤ زور۔ ہم تیار ہیں!"

ایک دم بہت سے لوگ درخت کو اٹھانے پر تیار ہوگئے۔

"ٹھہرو!" سپرنٹنڈنٹ بولا۔ "انڈر سیکریٹری سے مشورہ کرلوں۔"

سپرنٹنڈنٹ انڈر سیکریٹری کے پاس گیا۔ انڈر سیکریٹری ڈپٹی سیکریٹری کے پاس گیا۔ ڈپٹی سیکریٹری، جوائنٹ سیکریٹری کے پاس گیا۔ جوائنٹ سیکریٹری چیف سیکریٹری کے پاس گیا۔ چیف سیکریٹری منسٹر کے پاس گیا۔ منسٹر نے چیف سیکریٹری سے کہا۔ چیف سیکریٹری نے جوائنٹ سیکریٹری سے کچھ کہا۔ جوائنٹ سیکریٹری نے ڈپٹی سیکریٹری سے کہا۔ ڈپٹی سیکریٹری نے انڈر سیکریٹری سے کہا۔ فائل چلتی رہی۔ اسی میں آدھا دن گزر گیا۔

دوپہر کے کھانے پر دبے ہوئے آدمی کے گرد بہت بھیڑ ہو گئی تھی۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے تھے۔ کچھ منچلے کلرکوں نے معاملے کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ وہ حکومت کے فیصلے کا انتظار کیے بغیر درخت کو خود سے ہٹانے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں سپرنٹنڈنٹ فائل لیے بھاگا بھاگا آیا اور بولا۔

"ہم لوگ خود سے اس درخت کو یہاں سے نہیں ہٹا سکتے۔ ہم لوگ محکمۂ تجارت سے متعلق ہیں۔ اور درخت کا معاملہ ہے۔ جو محکمہ زراعت کی تحویل میں ہے۔ اس لیے میں اس فائل کو ارجنٹ مارک کر کے محکمہ زراعت میں بھیج رہا ہوں۔ وہاں سے جواب آتے ہی اس درخت کو ہٹوا دیا جائے گا۔"

دوسرے دن محکمۂ زراعت سے جواب آیا کہ درخت محکمۂ تجارت کے لان میں گرا ہے اس لیے اس درخت کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمہ تجارت پر عائد ہوتی ہے۔ یہ جواب پڑھ کر محکمۂ تجارت کو غصہ آ گیا۔ انہوں نے فوراً لکھا کہ پیڑوں کو ہٹوانے یا نہ ہٹوانے کی ذمہ داری محکمۂ زراعت پر عائد ہوتی ہے۔ محکمۂ تجارت کا اس معاملے میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

دوسرے دن بھی فائل چلتی رہی۔ شام کو جواب آ گیا۔ "ہم اس معاملہ کو ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کر رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایک پھل دار درخت کا معاملہ ہے اور ایگریکلچر ڈیپارٹمنٹ صرف اناج اور کھیتی باڑی کے معاملوں میں فیصلہ کرنے کا مجاز ہے۔ جامن کا پیڑ ایک پھل دار پیڑ ہے۔ اس لیے یہ پیڑ ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کو دال بھات کھلایا حالانکہ لان کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ تھا کہ کہیں لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر درخت کو خود سے ہٹوانے کی کوشش نہ کریں۔ مگر ایک پولیس کانسٹبل کو رحم آ گیا۔ اور اس نے مالی کو دبے ہوئے آدمی کو کھانا کھلانے کی اجازت دے دی۔

مالی نے دبے ہوئے آدمی سے کہا۔ "تمہاری فائل چل رہی ہے، امید ہے کہ کل تک یہ فیصلہ ہو جائے گا۔"

دبا ہوا آدمی کچھ نہیں بولا۔

مالی نے پھر کہا۔ "تمہارا کوئی وارث ہے تو اس کا اتا پتہ بتاؤ۔ میں انھیں خبر دینے کی کوشش کروں گا۔"

"میں لاوارث ہوں۔" دبے ہوئے آدمی نے بڑی مشکل سے کہا۔

مالی افسوس ظاہر کرتا ہوا وہاں سے ہٹ گیا۔

تیسرے دن ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ سے جواب آ گیا بڑا کڑا جواب تھا اور طنز آمیز۔ ہارٹی کلچر ڈیپارٹمنٹ کا سیکریٹری ادبی مزاج کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔ "حیرت ہے! اس سمے میں جب ہم "درخت اگاؤ اسکیم" بڑے پیمانے پر چلا رہے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے سرکاری افسر موجود ہیں جو درختوں کو کاٹنے کا مشورہ دیتے ہیں اور وہ بھی ایک پھل دار درخت کا۔ اور وہ بھی جامن کے درخت کو جس کے پھل عوام بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

ہمارا محکمہ کسی حالت میں اس پھل دار درخت کو کاٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

"اب کیا کیا جائے؟" ایک منچلے نے کہا۔ "اگر درخت کاٹا نہیں جا سکتا تو اس آدمی کو کاٹ کر نکال لیا جائے۔"

"یہ دیکھیے!" اس آدمی نے اشارہ سے بتایا۔ "اگر اس آدمی کو ٹھیک بیچ میں سے یعنی دھڑ کے مقام سے کاٹا جائے تو آدھا آدمی ادھر سے نکل آئے گا۔ آدھا آدمی ادھر سے باہر آ جائے گا۔ اور درخت وہیں کا وہیں رہے گا۔"

"مگر اس طرح سے تو میں مر جاؤں گا۔" دبے ہوئے آدمی نے احتجاج کیا۔

"یہ بھی ٹھیک کہتا ہے!" ایک کلرک بولا۔

آدمی کو کاٹنے والی تجویز پیش کرنے والے نے پُرزور احتجاج کیا۔

"آپ جانتے نہیں ہیں آج کل پلاسٹک سرجری کتنی ترقی کر چکی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں اگر اس آدمی کو بیچ میں سے کاٹ کر نکال لیا جائے تو پلاسٹک سرجری کے ذریعے دھڑ کے مقام پر اس آدمی کو پھر سے جوڑا جا سکتا ہے۔"

اب کے فائل کو میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں بھیج دیا گیا۔ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ نے فوراً اس پر ایکشن لیا۔ اور جس دن فائل ان کے محکمے میں پہنچی۔ اُس کے دوسرے ہی دن اپنے محکمے کا سب سے قابل پلاسٹک سرجن تحقیقات کے لیے بھیج دیا۔ سرجن نے دبے ہوئے آدمی کو اچھی طرح ٹٹول کر، اس کی صحت دیکھ کر، خون کا دباؤ، سانس کی آمد و رفت، دل اور پھیپھڑوں کی جانچ کر کے رپورٹ بھیجی کہ اس آدمی کا پلاسٹک آپریشن تو ہو سکتا ہے اور آپریشن کامیاب ہو جائے گا۔ مگر آدمی مر جائے گا۔

لہٰذا یہ تجویز بھی رد کر دی گئی۔

رات کو مالی نے دبے ہوئے آدمی کے منہ میں کھچڑی کے لقمے ڈالتے ہوئے اسے بتایا: "اب معاملہ اوپر چلا گیا ہے ...... سنا ہے کہ کل سیکریٹریٹ کے سارے سیکریٹریوں کی میٹنگ ہوگی۔ اس میں تمہارا کیس رکھا جائے گا۔ اُمید ہے سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔"

دبا ہوا آدمی ایک آہ بھر کے آہستہ سے بولا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن	خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

مالی نے اچنبھے سے منہ میں اُنگلی دبائی حیرت سے بولا۔ "کیا تم شاعر ہو؟"

دبے ہوئے آدمی نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔

دوسرے دن مالی نے چپراسی کو بتایا۔ چپراسی نے کلرک کو، کلرک نے ہیڈ کلرک کو۔ تھوڑے ہی عرصے میں سیکریٹریٹ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ دبا ہوا آدمی شاعر ہے۔ پھر کیا تھا۔ لوگ جوق در جوق شاعر کو دیکھنے کے لیے آنے لگے، اس کی خبر شہر میں پھیل گئی اور شام تک محلّے محلّے سے شاعر جمع ہونا شروع ہو گئے۔ سیکریٹریٹ کا لان بھانت بھانت کے شاعروں سے بھر گیا۔ اور دبے ہوئے آدمی کے گرد ایک مشاعرہ بپا ہو گیا۔ سیکریٹریٹ کے کئی کلرک اور انڈر سیکریٹری تک جنہیں ادب اور شعر سے لگاؤ تھا رک گئے۔ کچھ شاعر دبے ہوئے آدمی کو اپنی غزلیں اور نظمیں سُنانے لگے۔ کئی کلرک اُس سے اپنی غزلوں پر اصلاح لینے کے لیے مصر ہونے لگے۔

جب یہ پتا چلا کہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے تو سیکریٹریٹ کی سب کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ چونکہ دبا ہوا آدمی ایک شاعر ہے۔ لہٰذا اس فائل کا تعلق نہ ایگریکلچرل ڈیپارٹمنٹ سے ہے نہ ہارٹی کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے، بلکہ صرف کلچرل ڈیپارٹمنٹ سے استدعا کی گئی کہ جلد سے جلد اس معاملے کا فیصلہ کر کے بدنصیب شاعر کو اس شجر سایہ دار سے رہائی دلائی جائے۔

فائل کلچرل ڈیپارٹمنٹ کے مختلف شعبوں سے گزرتی ہوئی ادبی اکیڈمی کے سیکریٹری کے پاس پہنچی، بے چارہ سیکریٹری اسی وقت اپنی گاڑی میں سوار ہو کر سیکریٹریٹ پہنچا اور دبے ہوئے آدمی سے انٹرویو لینے لگا۔

"تم شاعر ہو؟" اُس نے پوچھا۔

"جی ہاں!" دبے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔

"کیا تخلص کرتے ہو؟"

"اوسؔ"

"اوس؟" سیکریٹری زور سے چیخا۔ "کیا تم وہی اوس ہو جس کا مجموعۂ کلام 'اوس کے پھول' حال ہی میں شائع ہوا ہے؟"

دبے ہوئے شاعر نے اس بات میں سر ہلا دیا۔

"کیا تم ہماری اکیڈمی کے ممبر ہو؟" سیکریٹری نے پوچھا۔

"نہیں!"

"حیرت ہے!"

سیکریٹری نے زور سے چیخا۔ "اتنا بڑا شاعر 'اوس کے پھول' کا مصنف اور ہماری اکیڈمی کا ممبر نہیں ہے۔ اُف! اُف! کیسی غلطی ہو گئی ہم سے، کتنا بڑا شاعر اور کیسے گوشۂ گمنامی میں دبا پڑا ہے؟"

"گمنامی میں نہیں! ایک درخت کے نیچے دبا ہوا۔ براہ کرم مجھے اس درخت کے نیچے سے نکالیے!"

"ابھی بندوبست کرتا ہوں" سیکریٹری فوراً بولا۔ اور فوراً جا کر اس نے اپنے محکمے میں رپورٹ کی۔

دوسرے دن سیکریٹری بھاگا بھاگا شاعر کے پاس آیا اور بولا۔ "مبارک ہو! مٹھائی کھلاؤ۔ ہماری سرکاری اکیڈمی نے تمہیں اپنی مرکزی کمیٹی کا ممبر چن لیا ہے۔ یہ لو پروانۂ انتخاب!"

"مگر مجھے اس درخت کے نیچے سے نکالو۔" دبے ہوئے آدمی نے کراہ کر کہا۔

اس کی سانس بڑی مشکل سے چل رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید تشنج اور کرب میں مبتلا ہے۔

"یہ ہم نہیں کر سکتے!" سیکریٹری نے کہا۔ "اور جو ہم کر سکتے تھے وہ ہم نے کر دیا ہے۔ بلکہ ہم تو یہاں تک کر سکتے ہیں کہ اگر تم مر جاؤ تو تمہاری بیوی کو وظیفہ دے سکتے ہیں۔ اگر تم درخواست دو تو ہم وہ بھی کر سکتے ہیں۔"

"میں ابھی زندہ ہوں!" شاعر رک رک کر بولا۔ "مجھے زندہ رکھو!"

"مصیبت یہ ہے" سرکاری ادبی اکیڈمی کا سیکریٹری ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "کہ ہمارا محکمہ صرف کلچر سے متعلق ہے۔ درخت کاٹنے کا معاملہ قلم دوات سے نہیں کلہاڑی سے متعلق ہے۔ اس کے لیے ہم نے فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کو لکھ دیا ہے اور ارجنٹ لکھا ہے۔"

شام کو مالی نے آ کر دبے ہوئے آدمی کو بتایا۔ "کل فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی آ کر اس درخت کو کاٹ دیں گے۔ اور تمہاری جان بچ جائے گی۔"

مالی بہت خوش تھا۔ دبے ہوئے آدمی کی صحت جواب دے رہی تھی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی کے لیے لڑے جا رہا تھا۔ کل تک۔ صبح تک ۔۔۔ کسی نہ کسی طرح اسے زندہ رہنا ہے۔

دوسرے دن جب فارسٹ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی آری، کلہاڑی لے کر پہنچے۔ تو ان کو درخت کاٹنے سے روک دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ محکمۂ خارجہ سے حکم آیا تھا کہ اس درخت کو نہ کاٹا جائے۔ وجہ یہ تھی کہ اس درخت کو دس سال پہلے حکومتِ پٹونیا کے وزیر اعظم نے سیکریٹریٹ کے لان میں لگایا تھا۔ اب اگر یہ درخت کاٹا گیا۔ تو اس امر کا شدید اندیشہ تھا کہ حکومتِ پٹونیا سے ہمارے تعلقات ہمیشہ کے لیے بگڑ جائیں گے۔

"مگر ایک آدمی کی جان کا سوال ہے" ایک کلرک غصے سے چلایا۔

"دوسری طرف دو حکومتوں کے تعلقات کا سوال ہے۔" دوسرے کلرک نے پہلے کلرک کو سمجھایا ۔۔۔ "اور یہ بھی تو سمجھو کہ حکومت پی ٹونیا ہماری حکومت کو کتنی امداد دیتی ہے۔ کیا ہم ان کی دوستی کی خاطر ایک آدمی زندگی کو قربان نہیں کر سکتے؟"

"شاعر کو مر جانا چاہیے!"

"بلاشبہ!"

انڈر سیکریٹری نے سپرنٹنڈنٹ کو بتایا۔ "آج صبح وزیراعظم دورے سے آ گئے ہیں۔ آج چار بجے محکمہ خارجہ اس درخت کی فائل ان کے سامنے پیش کرے گا۔ جو وہ فیصلہ دیں گے وہی سب کو منظور ہوگا۔"

شام کے پانچ بجے خود سپرنٹنڈنٹ شاعر کی فائل لے کر اس کے پاس آیا ۔۔۔ "سنتے ہو؟"

آتے ہی وہ خوشی سے فائل کو ہلاتے ہوئے چلایا۔ "وزیراعظم نے اس درخت کو کاٹنے کا حکم دیا ہے۔ اس واقعے کی ساری بین اقوامی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے کل یہ درخت کاٹ دیا جائے گا۔ اور تم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لوگے۔

"سنتے ہو؟ آج تمہاری فائل مکمل ہو گئی۔" سپرنٹنڈنٹ نے شاعر کے بازو کو ہلا کر کہا۔

مگر شاعر کا ہاتھ سرد تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں بے جان اور چیونٹیوں کی ایک لمبی قطار اس کے منہ میں جا رہی تھی ۔۔۔

اس کی زندگی کی فائل بھی مکمل ہو چکی تھی۔ (ماہنامہ نقوش کراچی ۱۹۶۵ء)

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء کو وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ میں صبح کے ۷ بجے پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں انگریزی میں ایم۔ اے اور ۱۹۳۷ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو میں اکزیکیٹو پروگرام کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ تین سال کے بعد دہلی سے شالیمار اسٹوڈیو، پونہ چلے گئے اور وہاں سے بمبئی کی فضا ایسی راس آئی کہ پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ۱۹۶۱ء میں سوویٹ لینڈ نہرو انعام ملا اور ۱۹۶۹ء میں پدم بھوشن کا خطاب۔ مرحوم کے افسانوں، ناولوں، ڈراموں اور رپورتاژوں کی مجموعی تعداد ستّر بتلائی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے افسانوں اور ناولوں کے ہندی اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں ترجمے شائع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ انگریزی، روسی اور چینی زبانوں میں بھی متعدد ترجمے شائع مقبول ہوئے ہیں۔ افسوس کہ اردو کا اتنا فعال اور ہر دل عزیز ادیب ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

مرحوم کا اسلوب سادگی و پرکاری کا حامل تھا۔ خود مرحوم نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ، "بالعموم نثر میں یورپ کے نثر نگاروں کے کہنے کے ڈھنگ سے متاثر ہوں اور شاعروں میں مشرقی شاعروں کی ادا کا قتیل ہوں۔" اس طرح مشرق و مغرب کی آمیزش سے ان کے اسلوب میں وہ حسن، وہ سادگی اور دل کشی پیدا ہوئی۔ جو اردو کے شاید ہی کسی افسانہ نگار کو نصیب ہو۔ اسی آمیزش کا اثر ہے کہ وہ جہاں براہ راست بات کہتے ہیں وہاں رمز و اشارے اور تشبیہ و استعارے سے بھی کام لیتے ہیں۔ موقع موقع سے طنز و مزاح بھی ہوتا ہے، مگر اس میں آورد نہیں آمد ہوتی ہے۔ مرحوم کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی سے ترقی پسند تحریک کو بڑی تقویت اور سہارا ملا اور شاید کم لوگوں کو معلوم ہو کہ جب بھی ترقی پسند مصنفین کی صف میں انتشار اور اختلاف پیدا ہوا تو اتفاق و اتحاد پیدا کرنے اور مصالحت کرانے میں مرحوم کی محبوب اور مرنجان مرنج شخصیت بڑی مددگار ثابت ہوتی تھی۔

(ماہنامہ جامعہ دہلی سے)

[illegible]

تعارفِ ادارہ

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے افتتاحی اجلاس منعقدہ مورخہ ۲۷ر مارچ ۱۹۷۸ء دبمقام گنبدان قطب شاہی کی گئی تقریر)

عالی مرتبت گورنر صاحب! عالیجناب آصف پاشاہ صاحب، خواتین و حضرات!

گذشتہ پندرہ سال سے اسی مقام پر شہر حیدرآباد کے بانی، اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر، تلگو علم و ادب کے پرستار اور سرپرست، سلطان محمد قلی قطب شاہ کی یاد منانے کیلئے ہم جمع ہو رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی یہ تقاریب ہماری ریاست کے باشندوں کے لئے ایک قومی تہوار کی نوعیت اور اہمیت رکھتی ہیں۔ ان تقاریب کے سماجی اور ثقافتی اہمیت کے پیش نظر گذشتہ کئی سالوں سے اس ریاست کے گورنر صاحبان ان تقاریب کا افتتاح فرما رہے ہیں۔ اس سے قبل شری اللادیم سین ینجر شری بی رام کشن راؤ، نواب مہدی نواز جنگ، شری کھنڈو بھائی دیسائی اور شری موہن لعل سکھاڈیا ان تقاریب کا افتتاح فرما چکے ہیں یہ امر ہمارے لئے انتہائی باعث فخر ہے کہ عالیجناب پی سے دیوان صاحب نہ صرف ایک ممتاز ماہر قانون، بلند مرتبت حاکم عدالت ہیں بلکہ آپ ہندوستانی تہذیب اور مشرقی ثقافت کے ایک بڑے پرستار بھی ہیں۔

گذشتہ تقاریب کی صدارت ڈاکٹر گوپال ریڈی اور شری سنجیوا ریڈی فرما چکے ہیں خوشی کی بات ہے کہ آج اس تقریب کی صدارت جناب آصف پاشاہ صاحب فرما رہے ہیں۔ جو نہ صرف اس ریاست کے وزیر قانون ہیں بلکہ صدر نشین اردو اکاڈمی کی حیثیت سے اردو کا کام کرنے والوں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ حضرات! اس شہر میں "یوم محمد قلی قطب شاہ" کی تقریب ایک سالانہ جشن کی اہمیت رکھتی ہے اس تقریب کی عام مقبولیت کا اندازہ ان خواتین و حضرات کی شرکت سے ہو سکتا ہے جو ہر سال اس مقام پر بڑی پابندی کے ساتھ تشریف لاتے ہیں اور اپنے علمی و ادبی ذوق کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ تقاریب پنجاب کے "پھول والوں کی سیر" اور پنجاب و ہریانہ کے بیساکھی تہوار سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ کہوں گا کہ غالباً دنیا کے تمام شہروں میں شاید یہ اعزاز صرف اہل حیدرآباد کو حاصل ہے کہ وہ اپنے شہر کے بانی کی یوں ہر سال یاد مناتے ہیں۔ اس کے علمی و ادبی کارناموں، مذہبی رواداری اور تلگو پرستی کا تذکرہ انتہائی عقیدت اور خلوص کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ان تقاریب نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اگرچہ انسان فانی ہے لیکن اگر وہ اپنی چند روزہ زندگی میں کچھ اچھے کام کر جائے تو یہ دنیا اس کو بھول نہیں سکتی۔

اس بات سے تو آپ بخوبی واقف ہیں کہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب گذشتہ پندرہ سال سے ادارہ ادبیات اردو کے زیر اہتمام منعقد کی جا رہی ہیں۔ آج اس محفل میں ادارہ ادبیات اردو کے تفصیلی کارناموں کا تذکرہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ مختصر طور پر عرض کروں گا کہ یہ ادارہ آج سے ۴۷ سال قبل ایسے زمانے میں قائم ہوا جب کہ اردو کو اس ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا شرف تو حاصل تھا لیکن شہر حیدرآباد میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا کوئی موزوں مرکز نہ تھا۔ ایسے میں مرحوم ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

نے اپنے چند مخلص رفقا کے ساتھ ۱۹۳۱ء میں اس ادارہ کی بنا رکھی۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مسلسل انتھک کوشش اور ان کے رفقا کے خلوص اور مسلسل علمی و ادبی خدمات کی بنا پر آج یہ ادارہ ہندوستان کے اہم تحقیقاتی مراکز میں شمار کیا جاتا ہے۔ ادارہ کے صدر جناب سید علی اکبر صاحب اور معتمد جناب سید ہاشم علی صاحب اختر (آئی، اے، ایس) کی توجہ خاص سے یہ ادارہ اپنی علمی ادبی خدمات کو حسب سابق انجام دے رہا ہے۔

ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں مختلف علوم و فنون پر مشتمل پانچ ہزار نادر مخطوطات اور ۲۷ ہزار مطبوعات موجود ہیں۔

شعبہ امتحانات ادارہ کا ایک اہم شعبہ ہے جو ۱۹۲۰ء سے کام کر رہا ہے اس شعبہ کی نگرانی میں "اردو دانی" "اردو زبان دانی" اردو عالم۔ اور "اردو فاضل" کے امتحانات سال میں دو بار منعقد کئے جاتے ہیں۔ ان امتحانات میں نہ صرف آندھرا پردیش، بلکہ مہاراشٹر، کرناٹک، اور یوپی سے ہزارہا امیدوار شریک ہوتے ہیں جامعہ عثمانیہ نے امتحانات "اردو عالم" "اردو فاضل" کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ امتحانات جناب محمد اکبر الدین صاحب صدیقی کی نگرانی میں منعقد کئے جاتے ہیں۔ جو بحیثیت استاد جامعہ عثمانیہ درس و تدریس میں دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں۔ جناب سراج الدین احمد صاحب مجلس امتحانات کے صدر ہیں۔ جن کی نگرانی میں یہ شعبہ کافی ترقی کر رہا ہے۔

ادارہ کا ترجمان رسالہ سب رس ۱۹۳۸ء سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ سب رس ملک کے قدیم اور معیاری رسالوں میں اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ جناب میر حسن صاحب کے انتقال کے بعد سب رس کی ادارت کے اہم فرائض جناب غلام جیلانی صاحب انجام دے رہے ہیں۔ اور انھیں ملک کے مشاہیر اہل قلم حضرات کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ جناب عابد علی خاں صاحب کی توجہ خاص سے سب رس کا مالیہ بڑی حد تک اطمینان بخش بن گیا ہے۔

اردو ترقی بورڈ کے زیر اہتمام اور وزارت تعلیم حکومت ہند کی جانب سے خوشنویسی کا ایک مرکز ادارہ ادبیات اردو کی نگرانی میں قائم ہوا ہے۔ طلبہ و طالبات دو سالہ نصاب کی تکمیل کے بعد کتابت اور آفسٹ کی مہارت پیدا کر لیں گے اور یہ فن ان کے لئے ایک باوقار ذریعہ معاش بن جائے گا۔ ملک کے مشہور صحافی جناب عابد علی خاں صاحب شعبہ خوشنویسی کے صدر ہیں۔

جہاں تک کتابوں کی اشاعت کا تعلق ہے ادارہ کی جانب سے اب تک ۲۱۷ کتابیں شایع کی گئی ہیں۔ گذشتہ چند سال سے اشاعت کا کام چند مالی دشواریوں کے باعث رکا ہوا ہے۔

ادارۂ ادبیات کی جانب سے مناسب مواقع پر علمی و ادبی محفلوں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ یوم محمد قلی قطب شاہ کی سالانہ تقاریب کے علاوہ "یوم زور" کی تقاریب، بانی ادارہ ڈاکٹر زور کے علمی ادبی کارناموں سے متعارف کرانے کے لئے منعقد کی جاتی ہیں۔

ادارہ کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلہ میں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ ہندوستان کی ممتاز شخصیتوں نے جن میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، جناب فخرالدین علی احمد قابل ذکر ہیں۔ ادارہ کے تفصیلی معائنہ کے بعد ادارہ کی کارکردگی کی ستائش کی ہے۔

گذشتہ سال یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب گولکنڈہ سوسائٹی کے اشتراک سے منائی گئی تھیں اس سال [illegible]

پیامات ـــــ یوم محمد قلی قطب شاہ ۱۹۷۷ء

کارگزار صدر جمہوریہ

صدر جمہوریہ کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ "ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کی جانب سے حیدرآباد میں ۲۷ مارچ تا ۳۰ مارچ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب منائی جارہی ہیں۔ صدر جمہوریہ محمد قلی قطب شاہ کو اپنا خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان تقاریب کی کامیابی کے متمنی ہیں۔

ایم۔ اے عبدالمجید　پریس سکریٹری صدر جمہوریہ

ڈاکٹر ایم چنا ریڈی صاحب
گورنر اتر پردیش

آپ حضرات قابل مبارک باد ہیں اس بادشاہ کی یاد منا رہے ہیں جس نے جنوبی ہند میں نئی تہذیب اور تمدن کی بنیاد ڈالی۔ شہر حیدرآباد کو آباد کرنا ہی اس کا ایک تاریخی کام تھا۔ کیونکہ یہی شہر آگے چل کر ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب اور سکولر کردار کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔

محمد قلی قطب شاہ کے دربار میں ہر زبان کے عالم موجود تھے جن کی وہ دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا اس کے افکار اور ترقی شعور کی چھاپ جنوبی ہند میں ہمیشہ قائم و دایم رہے گی۔ میری دعا ہے کہ آپ کی تمام تقاریب کامیاب ہوں۔

جناب شیخ عبداللہ
وزیر اعلیٰ جموں و کشمیر

جناب شیخ عبداللہ وزیر اعلیٰ کو یہ معلوم کرکے انتہائی مسرت ہوئی کہ ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے ۲۷ تا ۳۰ مارچ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب منائی جارہی ہیں۔ وہ ان تقاریب کی کامیابی کے خواہشمند ہیں۔

غلام احمد　سکریٹری برائے چیف منسٹر

ڈاکٹر محمد علی خاں
امپیریل کونسل جنرل ایران

مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے اس خوبصورت شہر کے بانی محمد قلی قطب شاہ کی یاد منائی جارہی ہے۔ سلطان قلی قطب شاہ کی اعلیٰ صلاحیتوں کا اندازہ نہ صرف ایک خوبصورت شہر کی بنا ڈالنے سے ہوتا ہے بلکہ اردو، فارسی اور تلگو زبانوں میں اس کی نظموں اور غزلوں سے بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بادشاہ جو ایرانی انسل تھا دکن کی تہذیب پر اپنا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ ہندوستان میں ایرانی تہذیب کا ایک بڑا نمائندہ تھا۔

جناب سید میر قاسم
سابق مرکزی منسٹر میونسپل سپلائیز

قلی قطب شاہ پہلے شخص ہیں جن کا کلام اردو مجموعی صورت میں موجود ہے انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں مثلاً عید، بقرعید، بسنت، ہولی وغیرہ پر اشعار کہے اور اسی طرح قومی یک جہتی کی داغ بیل ڈالی۔ ان کا کلام ہندی الفاظ اور ترکیبوں سے مالا مال ہے۔ وہ نہ صرف دکن کے بلکہ پورے ہندوستان کے علمی حلقوں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں

آپ کی اس تقریب کی کامیابی کے لئے نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر علی محمد خسرو
وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میری انتہائی خواہش تھی کہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب میں شریک ہوتا لیکن ماہ مارچ کے آخری ہفتہ میں اسلامک تعلیمات کے موضوع پر ایک سمینار میں شرکت کے لئے سعودی عرب جارہا ہوں اس لئے ان تقاریب میں حاضر نہ ہوسکوں گا۔

پروفیسر مسعود حسین خاں
وائس چانسلر
جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

محمد قلی قطب شاہ نہ صرف دکنی اردو کا نظیر اکبرآبادی ہے بلکہ وہ اس روایت شعر کا بانی بھی ہے جس نے انیسویں صدی کے نصف آخر میں جدید شاعری کی تحریک کی شکل اختیار کرلی تھی۔ وہ شہنشاہ بھی تھا شاعر بھی اور عاشق بھی اور دور وسطیٰ اس تری مورتی کا ایک رکن تھا جو اکبر اعظم ابراہیم عادل شاہ ثانی اور خود اس سے تشکیل تھی۔ جو نام اکبر نے تاریخی و تہذیبی سطح پر کیا۔ اور ابراہیم عادل شاہ نے موسیقی کی سطح پر محمد قلی قطب شاہ نے فن شعر اور تعمیر کی شکل میں کیا، اور اس طرح ہندوستانی تہذیب کا وہ سنگم بنایا جس کی تلاش میں آج بھی ہندوستان سرگرداں ہے۔

(بدایوں صفحہ ۴۲ سے آگے)

مصدیے کے لڈو علی گڑھ کے تارے   بریلی کا سُرمہ' بدایوں کے شاعر

اس سلسلے میں علامہ حیرت بدایونی کا ایک واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہ غالباً ۱۹۱۲ء کی بات ہے۔ وہ ابھی طالب علم تھے اور پنجاب یونیورسٹی کا منشی فاضل کا امتحان دینے دلی گئے تھے۔ امتحان سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے دلی دیکھنے اور وہاں کے اکابرین سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن فاتحہ خوانی کے لیے درگاہ حضرت نظام الدین اولیا بھی گئے۔ وہاں سے قریب ہی خواجہ حسن نظامی مرحوم کی رہائش گاہ بھی تھی۔ چنانچہ وہاں بھی سلام کے لیے پہنچ گئے۔ حسب معمول محفل جمی تھی۔ بے شمار معتقدین اور مریدین میں یہ بھی جاکر ایک طرف بیٹھ گئے۔ خواجہ صاحب کی نظر پڑی کہ انھوں نے مشغلہ نام اور وطن پوچھا۔ پھر دلی آنے کی غایت دریافت کی۔ علامہ حیرت نے بتایا کہ :

"امتحان کے لیے آیا ہوں"

خواجہ صاحب نے کہا کہ "امتحان اور شاعر تو دو متضاد چیزیں ہیں"

"یکھو اہل بدایوں مشتنیٰ ہیں"۔ علامہ حیرت نے جواب دیا۔

(زیرِ طبع کتاب "علامہ حیرت بدایونی۔ حیات اور کلام" کا ابتدائیہ)

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

مراٹھی ادب کا مطالعہ

از:- یونس اگاسکر صفحات (۱۷۵) ڈیمائی سائز قیمت:- دس روپے
ناشر:- نقش کوکن پبلی کیشنز - بمبئی نمبر ۹

دیدہ زیب سرورق، خوبصورت طباعت اور بہترین جلد سازی سے مزین کتاب "مراٹھی ادب کا مطالعہ" یونس اگاسکر کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے جس میں ان کی ذاتی محنت اور لگن کو خصوصی دخل محسوس ہوتا ہے۔ اس تحقیقی کتاب کے ذریعہ یونس اگاسکر نے اردو داں اصحاب کے لئے مراٹھی ادب کی تاریخ، اس کے اسلوب اور اصنافِ سخن کے بارے میں فرودی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جس میں کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

بین الادبیات رابطہ کو ہموار کرنے اور مراٹھی ادب کے نشیب و فراز سے اردو ادب کو روشناس کرانے میں یونس اگاسکر صفِ اول کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے رہے ہیں۔ تعارف، انتساب، پیامات، مقدمہ اور عرض ناشر کے بعد ۲۳ ویں صفحہ سے نفسِ مضمون کا آغاز ہوتا ہے کہ بیشتر عنوانات پر مشتمل تحقیقی مضامین میں عام، سلیس اور ادبی زبان استعمال کی گئی ہے تخلیق کار کے اسلوب کی سادگی، مطالعہ سے انسیت پیدا کرتی ہے۔ یونس اگاسکر کے اسلوب میں یہ خوبی پوشیدہ ہے۔ سنت گیانیشور اور ان کی منظوم گیتا "گیانیشوری" کی خصوصیات، مراٹھی کے مختلف ادیب، ڈرامہ نگار، شعراء اور ناول نگاروں کا اس کتاب میں تذکرہ اردو والوں کی معلومات میں اضافہ کا موجب ہے۔ سردار جعفری۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔ اور یوسف ناظم نے تخلیق اور تخلیق کار کے بارے میں جن الفاظ کا اظہار کیا ہے وہ حقیقت سے بعید نہیں۔

"مراٹھی ادب کا مطالعہ" تحقیق، اسلوب اور معلومات کے اعتبار سے اردو ادب کو مراٹھی ادب کے تعزّرات و تاریخ سے روشناس کرانے کا ایک ذریعہ قرار پاتا ہے لیکن مراٹھی ادب کے اصنافِ سخن کا انداز، مقاصدِ ادب اور سماجی تحریکات کی اثر پذیری کا ذکر اس کتاب میں نہیں ملتا۔ اگر کتاب میں اردو اصناف سے مراٹھی اصناف کا تقابل کیا جاتا اور ایسے اصناف جو ہر دو زبان میں کیاب ہیں اس کا ذکر بھی کیا جاتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس کتاب میں اردو تذکرہ نگاری کے دور کی جھلکیاں ملتی ہیں اسی لئے اندازِ بیان کے اعتبار سے اس کتاب کو "تذکرۂ مرہٹی زبان" کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس کتاب کو مہاراشٹر اردو اکاڈمی کی امداد حاصل ہے۔ مجموعی اعتبار سے یونس اگاسکر کی یہ کتاب اردو میں مراٹھی ادب کی تحقیق کرنے والوں کے لئے کافی سودمند ثابت ہوگی۔ (مجید بیدار)

جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ

از:- ضیاءالحسن فاروقی صفحات (۱۲۰) کراؤن سائز قیمت جلد پیپر
ناشر:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵

عالمی زبانوں کے نامور تخلیق کاروں کی سوانح اور کارنامے پیش کرنے کا رجحان اردو میں قدیم دور سے رائج ہے۔ لیکن ترکی ادب کے شاعروں اور ادیبوں سے متعلق اردو میں مواد کمیاب تھا۔ ضیاءالحسن فاروقی نے "جدید ترکی ادب کے ارکانِ ثلاثہ" تحریر کرکے اس کمی کو پورا کیا ہے۔

"جدید ترکی کے ارکانِ ثلاثہ" میں ابراہیم شناسی، نامق کمال اور ضیاء پاشا کی حیات و خدمات کو شامل کیا گیا ہے جو جدید ترکی ادب کے ممتاز شعراء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ تینوں شعراء کی ادبی خدمات، حالات اور واقعات کا ذکر اس کتاب میں ملتا ہے لیکن ان کے کلام کی خصوصیات، اسلوب اور تصنیفات و تالیفات کی تعداد کا ذکر اس کتاب میں نہیں ملتا۔

فاروقی کا اسلوب سادہ ہے۔ وہ شستہ زبان اور الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ بیان میں روانی ان کی خصوصیت ہے۔ انداز تحریر اور مواد کے اعتبار سے اس کتاب کو اردو تذکرہ اور سوانح نگاری جیسے اصناف سخن کی درمیانی کڑی کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے۔ ضیاء الحسن فاروقی کی اس نکتہ رس نگاہ کو ضرور سراہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ترکی ادب کے سرسید شبلی اور حالی جیسی شخصیت رکھنے والے فنکاروں سے اردو داں طبقے کو واقف کر دیا۔ (مجید بیدار)

یہ ہندوستان

مصنف: شیلا دھر، مترجم: رام شرن چوپڑہ صفحات (۱۹۲)، طباعت آفسیٹ دو کلر میں، باتصویر، قیمت ۱۸ روپے
ناشر: ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن۔ وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند پٹیالہ ہاؤس۔ نئی دہلی ۱

بچوں کی نفسیات کے مطابق کتب تحریر کرنے کا رجحان موجودہ دور میں کافی عروج پا رہا ہے اور بچوں کے ذہن و فکر کے مطابق کتابوں کی ترتیب پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ "یہ ہندوستان" اسی کوشش کا ثمر آور نتیجہ ہے۔ خوبصورت آساوپر۔ آرٹ اور ڈیزائن سے مزین یہ کتاب بچوں کی ذہنی الجھنوں کا جواب دینے کے لیے کافی فائدہ بخش ہے۔ پچیس عنوانات پر قوم و ملک کے متعلق کمسن بچوں کے ذہنوں پر مرتب ہونے والے سوالات کا مصنف نے بہتر انداز میں جواب دیا ہے۔ ہندوستانی طرز زندگی، معاشرت اور قبائل کے بارے میں بچوں کو اس کتاب سے مفید معلومات ملتی ہیں۔ اگرچہ کتاب ترجمہ شدہ ہے لیکن ثانوی مدارس کے طلباء کی زبان کے مطابق عام فہم اور چھوٹے چھوٹے الفاظ میں ترجمہ کیا گیا ہے جس سے طلباء کو پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ کتابت اور جلد بھی بڑی خوبصورت ہے۔ "بچوں کے ادب" کے لئے اردو زبان میں ایسی کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ اس کتاب سے بچوں کو ہندوستان کا قدیم ماحول۔ موجودہ دیہات اور طریقہ حکومت کے علاوہ تاریخ سے بھی واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ خوبصورت سرورق کے ساتھ اردو میں بچوں کے لئے "سماجی ادب" اکٹھا کرنے کی یہ کوشش مصنف کی مستقبل شناسی کی علامت ہے اور ہندوستانی شہریوں کو ہندوستانی ماحول میں زندگی بسر کرنے کی دعوت ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اس درجہ اہم ہے کہ اسے ہر کتب خانہ اطفال میں جگہ دی جانی چاہیئے۔ (مجید بیدار)

البوالوقت

(پندرہ روزہ) مدیر: محمد عبدالغفار صفحات (۸)، قیمت فی شمارہ ۵۰ پیسے سالانہ دس روپے۔
پتہ:- دفتر البوالوقت ۳۲۹ - ۴ - ۲۰ ہمت پورہ، حیدرآباد - ۲

طنز و مزاح اور چند ایک سنجیدہ و ترقی پذیر قومی و ملکی مسائل پر مضامین نظم و نثر کا دیدہ زیب، مختصر اور بڑی حد تک مکمل پندرہ روزہ "البوالوقت" گذشتہ تقریباً دو سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ غفار صاحب کی کوششوں اور محنتوں کی قدر کی جانی چاہیئے کہ ستائش و صلہ کی پروا کئے بغیر عرصہ سے طنز و مزاح کا یہ نیم ماہی پرچہ شائع کر رہے ہیں۔ "وقتے خوش گزرے" کے مصداق ایسے مختصر مگر دلچسپ پرچوں کو خرید کر پڑھنا ہر اردو دوست کے لئے فرض بنتا ہے۔ اس اخبار میں بچوں کے لئے مخصوص کالم بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ خوش نویسی کے تعلق سے وقتاً فوقتاً چھپنے والے مضامین معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ (ابن ناگی)

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ : علمی ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

یکم مارچ : ویمنس کالج (جامعہ عثمانیہ) کے شعبۂ اردو کی طرف سے جناب بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر ریاستی اردو اکیڈیمی کی صدارت میں محفلِ مزاح و شاعری" منعقد ہوئی۔ ابتداءً صدر شعبۂ اردو محترمہ صالحہ ظفر نے مہمانوں کا خیرمقدم کیا۔ طالبہ نکہت بہار نے "اردو نظم میں مزاح" پر مضمون سنایا۔ جناب کھنہ نے بھی مزاحیہ تخلیق پیش کی۔ محفلِ شعر میں مسرز امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر اشرف رفیع، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، بوگس حیدرآبادی اور اسحٰق ملک نے حصہ لیا۔

۳ مارچ : جشنِ رحمت العالمین کے موقع پر کل ہند نعتیہ مشاعرہ بمقام دارالسلام منعقد ہوا الحاج عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے نگرانی کی مسرز بیکل اُتساہی، مرزا شکور بیگ، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر عنایت الرحمٰن منشاؔ راحت دہلوی، حاذق ہیگوری، حامد بھوپالی، سعید شہیدی، ہاشم جاہ، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، خواجہ شوق، شاکر بینگ سنگھ نقیبی، صلاح الدین نیر، خیرات ندیم، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، معلم عبید اللہ ناظم، میر نازاں و دیگر شعراء نے نعتیہ کلام سنایا۔

● جناب محمود انصاری کی ادارت میں نیا روزنامہ "منصف" شائع ہونے لگا۔

● حیدرآباد ایوننگ کالج (جامعہ عثمانیہ) کی طرف سے ڈاکٹر محمد ہاشم علی (پروفیسر میسور یونیورسٹی) کے اعزاز میں ایک خیرمقدمی ادبی اجلاس پرنسپل پی۔ وی۔ راجگوپال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب محمود قادری لکچرار نے ڈاکٹر ہاشم علی کی علمی و تحقیقی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین ادا کیا دکنی ادب کی افادیت پر ڈاکٹر ہاشم علی نے لکچر دیتے ہوئے کہا کہ دکن ہی ایک ایسا علاقہ رہ گیا ہے جہاں صحیح معنوں میں گنگا جمنی تہذیب آج بھی برقرار ہے۔

● اقبال اکیڈیمی کے زیرِ اہتمام جلسۂ محفلِ اقبال منعقد ہوا۔ جناب خلیل اللہ حسینی نے صدارت کی۔ پروفیسر صلاح الدین اور محمد منظور احمد صاحبان نے اقبالیات پر مخاطب کیا۔

۸ مارچ : ادارۂ "برگِ آوارہ" کے زیرِ اہتمام نئی غزل کے معروف سخنور حضرت خورشید احمد جامی کی ساتویں برسی کے موقع پر قرآن خوانی اور فاتحہ خوانی ہوئی اور مزارِ جامی پر چادرِ گل چڑھائی گئی۔ اس موقع پر "جامی میموریل سوسائٹی" کے قیام کا مسٹر محمود خاور ایڈیٹر "برگِ آوارہ" نے اعلان کیا۔

● زندہ دلانِ حیدرآباد کے ہنگامی اجلاس میں کرشن چندر کی رحلت پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

۱۰ مارچ : مسٹر کمال الدین احمد صدر اقلیتی سیل و کنوینر اردو کمیٹی (ریاستی کانگریس) نے ایک بیان میں کرشن چندر کی وفات کو اردو کے لیے "ناقابلِ تلافی نقصان" قرار دیا۔

● شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی طرف سے جلسۂ تعزیت میں کرشن چندر کی عظیم ادبی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اردو نے جلسہ کی صدارت کی۔

۱۲ مارچ : شنکر جی میموریل سوسائٹی کی طرف سے تیسرا کل ہند مشاعرہ جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ کی صدارت میں نہایت اہتمام سے منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خاں کنوینر مشاعرہ نے آنجہانی شنکر جی کی قومی و تہذیبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی اردو دوستی کو خراجِ عقیدت ادا کیا صدر مشاعرہ نے بھی مخاطب کیا۔ مہمانِ خصوصی جناب مہتاب علی محمد علی وزیر سیاحت کرناٹک نے شنکر جی کی تصویر کی نقاب کشی کرتے ہوئے سووینیر کی رسمِ اجرا انجام دی۔ اس مشاعرے میں مہمان شعراء بیکل اُتساہی، تسنیم فاروقی، اندرجیت سنگھ تُلسی اور شاداں بارہ بنکوی کے علاوہ میزبان شعراء شامل تھے۔

امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، مغنی تبسم، علی احمد جلیل، کنول پرشاد کنول، راشد آذر، غیاث صدیقی، صلاح الدین نیر، وحید خلیل، خیرات ندیم، فیض الحسن خیال، منوہر لال بہار، رئیس اختر، ناصر کرنولی، عزیز النسا صبا، حمایت اللہ اور جگجیون استھانہ سحر نے کلام سنایا۔

● اردو سبھا حیدرآباد کے جلسۂ تعزیت میں کرشن چندر کی ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ جناب ابراہیم شفیق نے کرشن چندر کی شخصیت اور فن پر مخاطب کیا۔ راجہ لال راجہ معتمد سبھا نے قرار دادِ تعزیت پیش کی۔ روحی قادری صاحب نے اس جلسہ کی صدارت کی

● بزمِ نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب مرزا سرفراز علی سابق نائب ناظم تعلیمات کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قدیم دبستانِ شعر کے دو درجن سے زائد شعرا نے طرحی غزلیں سنائیں۔

۱۳ر مارچ : ریڈرس اسوسی ایشن کا تعزیتی اجلاس سید خاں کی صدارت میں ہوا۔ جناب احسن علی مرزا سب ایڈیٹر "سیاست" نے کرشن چندر کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ قرار دادِ تعزیت بھی منظور کی گئی۔

۱۵ر مارچ : آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی طرف سے سوویت یونین کے اردو اور فارسی کے دو اسکالرس خواجہ عبدالحمید سلیمونوف ڈائرکٹر علی شیر نوائی میوزیم آف لٹریچر ازبکستان) اور عبدالمجید اسکالر کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ جناب سجاوت چند گھنڈ ڈائرکٹر اکیڈیمی نے مہمانوں کی گلپوشی کی اور اکیڈیمی کی کارکردگی سے واقف کرایا۔ جناب اختر حسن اسسٹنٹ سکریٹری اکیڈیمی نے مہمانوں کو حیدرآبادی مصنفوں کی مطبوعات کا سیٹ نذر کیا۔ جناب سلیمونوف نے سوویت یونین میں اردو ادب اور تکشنا سے جو دلچسپی لی جارہی ہے اس پر وضاحت سے روشنی ڈالی اور ہند روس ادبی تعلقات کی استواری پر زور دیا۔ اس موقع پر مختلف اصحاب نے علمی، تہذیبی اور تحقیقی میدانوں میں سوویت یونین میں کیے گئے پراجکٹوں پر سوالات کے ذریعہ معلومات چاہیں۔ اور مہمان اسکالر نے وضاحت سے اردو میں جوابات دے کر متاثر کیا۔ اس موقع پر مسرز پروفیسر حبیب الرحمٰن، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر رضیہ اکبر، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر مغنی تبسم، غلام جیلانی (معتمد سب رس) سریندر اس لاہوتی، وقار خلیل، ناز صدیقی صلاح الدین نیر، رئیس اختر اور فیض الحسن خیال خیر مقدمی محفل میں شریک تھے۔

۱۶ر مارچ : بزرگ شاعر حکیم محمد خواجہ شفیع حسن عارف آغائی ابوالعلائی کا انتقال ہو گیا۔ عارف آغائی عہدِ عثمانی کے مشہور تاریخ گو شاعر تھے جنہیں میر عثمان علی خاں آصف سابع کی طرف سے تاحیات پچاس روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ عارف مرحوم کی کئی تاریخیں اور کتبات عہدِ عثمانی کی سرکاری عمارتوں کی زینت ہیں۔

۱۹ر مارچ : ریاستی اردو اکیڈیمی نے اپنے ایک اجلاس میں قرار دادِ تعزیت منظور کرتے ہوئے اردو کے مرحوم ادیبوں مسرز عبدالماجد دریابادی، رشید احمد صدیقی کرشن چندر، سالک اور عارف آغائی کی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔

۲۰ر مارچ : اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس جناب فصیح الدین احمد پرنسپل انوار العلوم ایوننگ کالج کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر سید سراج الدین ہیڈ شعبہ انگریزی عثمانیہ یونیورسٹی اور نقی حسن جعفری لکچرر انوار العلوم کالج مہمان مبصر کی حیثیت سے شریک محفل رہے۔ مصلح الدین سعدی صاحب نے جناب تاج مہجور کا شاعری پر انٹرویو لیا۔ حسن فرخ کی ایک نظم پر رؤف خیر، مضطر مجاز اور جمیل شیدائی نے تجزیاتی مطالعہ سنایا۔ محفل شعر میں شمس الدین تاباں، امان ارشد، حسن فرخ، تاج مہجور، رحمٰن جامی، رؤف خیر، غیاث متین علی سرور، حسام الدین سلیم، رحمت یوسف زئی نے حصہ لیا۔

● انسٹیٹیوٹ اسرکل تعمیر ملت کے زیر اہتمام علامہ شبلی نعمانی کی (۶۳ ویں) برسی کے موقع پر "یادِ شبلی" کا علمی اجلاس جناب سلیمان سکندر

کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید
جناب محمد منظور احمد لکچرر سٹی کالج اور پروفیسر
محمد انور نے خطاب کیا۔

۲۲ مارچ : ایوننگ کالج عثمانیہ
یونیورسٹی کے دو اردو اساتذہ ڈاکٹر یوسف سرمست
اور جناب ابوالفضل سید محمود قادری فیضی کو
ریڈر کے عہدہ پر ترقی ملنے کی مسرت میں جلسۂ
تہنیت پرنسپل پی۔ وی۔ راج گوپال کی صدارت
میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر
حمید شطاری، ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر صفدر
علی بیگ کے علاوہ شعبۂ اردو کے طلبہ و طالبات
نے شرکت کی۔

۲۴ مارچ : جناب مسیح انجم کے
طنز و مزاح سے عبارت دوسرے مجموعہ مضامین
کی رسم اجراء جناب نریندر لوتھر نے انجام دی۔
جناب بھارت چند کھنہ سکریٹری اردو اکیڈیمی
نے جلسہ کی صدارت کی۔ مسرز عاتق شاہ، پرویز
یداللہ مہدی اور رشید عبدالسمیع جلیل نے انجم
کی طنز و مزاح سے بھرپور صلاحیتوں اور ان
کی مرنجان مرنج شخصیت کے مختلف گوشوں
کو روشن کیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی طرف
سے حمایت اللہ نے شکریہ ادا کیا۔

۲۶ مارچ : ریاستی انجمن ترقی اردو
انجمن ترقی پسند مصنفین اور اردو مجلس کی طرف
سے اردو ہال میں کرشن چندر کی یاد میں جلسۂ
تعزیت جناب بھارت چند کھنہ کی صدارت میں
منعقد ہوا۔ جناب سری نواس لاہوٹی معتمد تنظیم
ریاستی انجمن نے قرار دادِ تعزیت پیش کی۔ ڈاکٹر
زینت ساجدہ، محترمہ جیلانی بانو اور ڈاکٹر
غیاث صدیقی نے کرشن چندر کی ادبی خدمات
کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ آخر میں
دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔

● بزمِ کہکشاں کی طرف سے مہمان
شاعر شکیل مظہری (کرناٹک) کا ادبی اجلاس
اور مشاعرہ میں خیر مقدم کیا گیا۔ وقار خلیل
نے جناب مظہری کا تعارف کروایا۔ سیم مظہر الزماں
اور پروفیسر یداللہ مہدی صاحبان نے طنز و
مزاح سے عبارت مضامین سنائے۔ محفل شعر
میں شکیل، وقار خلیل، شمیم نصرتی، طالب
خوندمیری، رؤف خلش، ناگپال عظیم دہلوی
اور کئی شاعروں نے کلام سنایا۔ شکیل مظہری
نے صدارت کی اور شمیم نصرتی نے نظامت کے
فرائض انجام دیئے۔ گوہر اسحاق نے شکریہ ادا کیا۔

۲۷ مارچ : اردو کے پہلے صاحبِ
دیوان شاعر اور شہر حیدرآباد کے بانی سلطان
محمد قلی قطب شاہ معانی کی یاد میں ادارۂ
ادبیاتِ اردو کے زیر اہتمام سہ روزہ جشنِ
محمد قلی قطب شاہ کی ۵اویں سالانہ تقاریب
کا بمقام گنبدانِ قطب شاہی واقع گولکنڈہ
ریاستی کارگزار گورنر جناب پی۔ جے۔
دیوان نے ۷ بجے شام افتتاح کیا۔ شہریانِ
حیدرآباد نے ہزاروں کی تعداد میں شرکت کی
مشہور موسیقار رگھو ملیکن ڈیسلے نے محمد قلی کی
مناجات سنائی۔ جناب سید ہاشم علی اختر
معتمد ادارہ نے گورنر صاحب اور حاضرین کا استقبال
کرتے ہوئے ادارہ کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ جناب
رمن راج سکسینہ رکن ادارہ و معتمد تقاریب یومِ قلی
نے ادارہ کا تعارف کرایا اور پروفیسر سید علی اکبر
صاحب صدر ادارہ نے گورنر صاحب سے تقاریب
کے افتتاح کی استدعا کی۔ اس موقع پر موصول ہونے
والے چند پیامات جناب عابد علی خاں رکن ادارہ
و ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے پڑھے۔ ریاستی گورنر
نے محمد قلی کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ
محمد قلی قطب شاہ ایک عظیم المرتبت بادشاہ تھے
جنہوں نے عوام کے قلوب پر حکمرانی کی۔ جن اصولوں
کی بنیاد رکھی وہ ہماری تاریخ کا ایک عظیم ورثہ اور
دکنی عوام کی تہذیب و تمدن کا ایک جزو بن گئے
محمد قلی نے انسانی بھائی چارگی، خدمت خلق اور
گنگا جمنی تہذیب کی جن اعلیٰ روایات کو فروغ
دیا اس کو نئی نسل سے واقف کرانے کے لئے ادارۂ
ادبیاتِ اردو کی جانب سے مفید کام کئے جا رہے ہیں
اور ادبی لٹریچر بھی شائع ہوتا رہا ہے۔ مسٹر
دیوان نے کہا کہ موجودہ دور میں سیکولرازم کا لفظ
فیشن کے طور پر استعمال ہونے لگا ہے لیکن ان
حکمرانوں نے قومی یکجہتی کو عملی جامہ پہنایا۔ گورنر
صاحب نے کہا کہ اردو ایک عام آدمی کی زبان ہے
اور اس زبان نے دکن اور لکھنؤ میں ترقی کی۔ اس
موقع پر بڑی روانی کے ساتھ ریاستی کارگزار گورنر
جناب دیوان نے ہمدم کا یہ شعر بھی سنایا ؎

آدم کو خدا مت کہو آدم خدا نہیں
لیکن خدا کے نور سے آدم جدا نہیں

قونصل جنرل ایران جناب محمد علی خانی نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

صدر نشین ریاستی ٹورسٹ ڈیولپمنٹ کارپوریشن مسٹر اجیت سنگھ نے کہا کہ محمد قلی قطب شاہ، حیدرآباد کے عظیم معمار تھے انھوں نے بتایا کہ بادشاہ یا حکمران کی عظمت یہ ہے کہ عام آدمی کے دل میں اس سے محبت پیدا ہو۔ ان معنوں میں محمد قلی کا عہدِ حکومت اتحاد، بھائی چارگی اور امن و امان کا عہد تھا۔ مسٹر اجیت سنگھ نے بتایا کہ قطب شاہوں کے تاریخی قلعہ گولکنڈہ میں ۲۰ لاکھ کے صرفہ سے مستقل بنیادوں پر "روشنی اور آواز" پراجکٹ کا آغاز کیا جائے گا اور گنبدوں کے اطراف خوبصورت چمن بندی بھی کی جائے گی تاکہ سیاحوں کو ایک اچھے ماحول میں یہاں سیاحت کے مواقع فراہم ہوں۔

ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے کہا کہ محمد قلی مشترکہ تہذیب کی روشن علامت کا نام ہے۔ دکن کی تہذیب اور یہاں والوں کے کردار میں عظمت و رنگینی کی جو روایت پروان چڑھ رہی ہے وہ قطب شاہوں کے عہد کا اثاثہ ہے۔ ڈاکٹر کمال نے کہا کہ ڈاکٹر زورؔ نے قطب شاہی ادب، تہذیب اور ثقافت کو زندگی نو عطا کر کے ملک کو قومی یکجہتی کا بیش قیمت تحفہ عطا کیا ہے اور ان کی سعی و کاوش کے سبب ہم دیکھتے ہیں کہ آج گنبدوں اور قلعہ میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں۔

صدر جلسہ جناب آصف پاشا صدر ریاستی اردو اکیڈیمی نے محمد قلی کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہماری مشترکہ تہذیب کا مینارۂ نور تھے۔

کاری پریم لتا، جاوید رضا، ذوالفقار اور غفار تنویر نے سازوں پر محمد قلی کا کلام پیش کر کے خوب خوب دادِ تحسین حاصل کی۔ کیپٹن عباس عابدی نے محمد قلی کا مرثیہ سنایا۔ بدیع شہری عزیز احمد خاں وارثی کی قوالی سے ہزارہا افراد نے لطف اٹھایا۔ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد ادارہ نے شکریہ ادا کیا۔

۲۸ مارچ، یومِ محمد قلی قطب شاہ کے سلسلے میں ۶ بجے شام ایوانِ اردو میں ایک سمپوزیم "گولکنڈہ کلچر کے اثرات حیدرآباد کی موجودہ تہذیب پر" کے زیرِ عنوان بصدارت جناب وی۔ کے باوا آئی اے ایس ڈائرکٹر اسٹیٹ آرکیوز منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے اس سمپوزیم کا معتمدی کے فرائض انجام دیئے۔ جناب رائے محبوب نارائن نے سمپوزیم کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ دکن کے چپہ چپہ پر قطب شاہوں کی سماجی اور ثقافتی اقدار کی نشانیاں آج بھی نئی تہذیب کا جزو بن گئی ہیں۔

جناب ضیاء الدین شکیب نے کہا کہ شہر حیدرآباد کی انفرادیت قطب شاہی آب و رنگ سے عبارت ہے "ایوانِ اردو" ڈاکٹر زورؔ اور دکنی کلچر کا مینارِ ادب ہے، جناب شکیب نے بتایا کہ لفظ گولکنڈہ کے معنی دولت و خوشحالی کے ہیں گولکنڈہ کا شمار اب سے پہلے دنیا کی بڑی تجارتی منڈیوں میں ہوتا تھا اور ساری دنیا سے اس کے تجارتی و ثقافتی رشتے استوار تھے ترکستان، ایران، عربستان، حبش، یورپ اور پرتگال سے کئی تاجر اور اپنے عہد کے نامور افراد یہاں آئے اور بس گئے آج بھی حیدرآباد کے کئی محلے ان کے نام سے آباد ہیں۔ جناب شکیب نے بتایا کہ گولکنڈہ تہذیب کے اثرات آج بھی یہاں کی زبان، رہن سہن اور تعمیرات میں جھلکتے ہیں اردو میں دکنی محاورے اور روزمرہ قطب شاہوں کا عطیہ اور یہاں کا لہجہ تلگو، اردو آمیزش کا بہتر نمونہ ہے۔

جناب بدیع شہری فیاض الدین نظامی (آرکیٹکٹ) نے کہا کہ حیدرآباد قرونِ وسطیٰ کی یادگار اور قطب شاہوں کا تحفہ ہے۔ بیدار مغز سلطان محمد قلی نے وزیر با تدبیر میر محمد مومن کی نگرانی میں اس خوش منظر شہر کی بنیاد رکھی جس کا فائدہ ہم آج تک اٹھا رہے ہیں۔

ڈاکٹر زینب، راہ دھا کرشنن شرما اور ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے بھی سمپوزیم میں حصہ لیا۔ صدر جلسہ جناب وی۔ کے باوا نے ڈاکٹر زورؔ کی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ حیدرآباد کا ماضی ایسا رہا ہے جسے حال سے جوڑا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے شکریہ ادا کیا۔

● اسی شب ۹ بجے ایوانِ اردو میں یادگار اور مستحسن مشاعرہ جناب نریندر لوتھر اسپیشل افسر مجلس بلدیہ حیدرآباد کی صدارت میں منعقد ہوا جناب صلاح الدین نیر نے معتمدِ مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ مدعو مہمان شعراء ڈاکٹر کرشن دھوری اور جناب شکیل مظہری کے علاوہ حیدرآباد کے معروف شعراء مسرز سعید شہیدی، امیر احمد خسرو

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

سن اجرا ۱۹۳۸ء — نمبر: ۳۸/۲۹۰۲۳
بیادگار: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

نگراں: سید علی اکبر ایم اے کینٹب
معتمد مجلسِ مشاورت: غلام جیلانی
مرتب: وقار خلیل

○

جلد: ۴۰ شمارہ: ۳
مارچ ۱۹۷۷ء
زرِ سالانہ: ۱۲ روپے ششماہی: ۷ روپے

○ ○ ○

پرنٹر پبلشر: سید علی اکبر
مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چار کمان حیدرآباد
مقامِ اشاعت: ادارۂ ادبیاتِ اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

ترتیب

نہرو جی نے کہا تھا
"میرے لئے یہ ایک مقدس تقریب ہے"

دنیا کا سب سے بڑا میسنری ڈیم آندھرا پردیش میں ہے اور یہ ڈیم ہے عظیم ناگرجنا ساگر جس پر بدھا کے گزشتہ پر واقع ہے جس کے ہندوستانی روایات اور تاریخ میں زبردست گن گائے گئے ہیں۔ ڈسمبر ۱۹۵۵ء میں اس بندھ کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے آزاد ہندوستان کے معمار جواہر لال نہرو نے کہا تھا " یہاں اس ناگرجنا ساگر کا سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے لئے یہ مقدس تقریب ہے " یہ سنگِ بنیاد سرزمین ہند کی پوری انسانیت کے ایک مندر کا ہے۔ یہ ان تمام جدید مندروں کا مظہر اور نشان ہے جو ہم ہندوستان بھر میں تعمیر کر رہے ہیں "!
ہندوستان کے عظیم فرزند کے یہ بلیغ و گراں مایہ ارشادات کا ایک جز بن چکے ہیں۔

ناگرجنا ساگر بہتات و فراوانی کے دور کا نقطۂ آغاز ہے چوتھے منصوبے کے اختتام تک ہماری ریاست میں بڑی اور اوسط آبپاشی اسکیموں پر ۹۰٫۰۸ کروڑ روپے خرچ کئے گئے اور اس طرح مزید ۳۳٫۴۴ لاکھ ہیکٹر اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا کرلی گئی۔ پانچویں منصوبے میں بڑی اور اوسط آبپاشی اسکیموں پر جن میں ناگرجنا ساگر۔ پوچم پاڈ اور گوداوری بیریج شامل نہیں ہیں ۱۱۲ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

عالمی بنک کی امداد سے تعمیر کیا جانے والا پوچم پاڈ پراجکٹ ریاست کا ایک اہم اور بڑا پراجکٹ ہے اس کے پہلے مرحلے کی تکمیل پر توقع ہے کہ علاقۂ تلنگانہ میں تقریباً ۲٫۵ لاکھ ایکڑ رقبے کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ جون ۱۹۷۵ء تک اس پراجکٹ کے ذریعہ ۱٫۴۵ لاکھ ایکڑ اراضی کو سیراب کرنے کی گنجائش مہیا ہو چکی ہے۔

دمسادھرا پراجکٹ بھی ایک حوصلہ مند اور عظیم تعمیری کام ہے جو ضلع سریکاکلم کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لئے روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ اس پراجکٹ کے تحت ایک بیریج اور ایک بڑی کنال تعمیر کی جائیگی اور اس سے ۱٫۴۸ لاکھ رقبے کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا ہوگی۔ پراجکٹ کے پہلے مرحلے کی تعمیر کا کام مارچ ۱۹۷۲ء سے آغاز ہو چکا ہے اور پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔ پانچویں منصوبے میں اس پراجکٹ کے لئے ۱۵۰ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR: 28/76-77

اپنی بات

جنوری ۱۹۵۸ء میں پہلی بار ڈاکٹر زورؔ نے "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کے زیرِ اہتمام اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان جلیل القدر سخنور سلطان محمد قلی قطب شاہ معانیؔ کی یاد کے چراغ کو روشن کیا تھا اور یہ تقریب جب سے ہر سال ادارہ کی طرف سے شعر و ادب اور دکنی تہذیب و ثقافت کے سالانہ جشن کی صورت میں منائی جاتی رہی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ نے پہلے "یوم محمد قلی قطب شاہ" تقاریب پر مبنی دستاویزی "تذکرہ" "نذرِ محمد قلی" کی تقریب میں لکھا تھا۔

"نومبر ۱۹۵۶ء میں جب قدیم ریاستِ حیدرآباد ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہندوستان کے نقشے سے غائب ہو گئی اور شہر حیدرآباد آندھرا پردیش کا پایۂ تخت قرار پایا اور آندھرا پردیش کے نقشے چھپ کر سامنے آئے تو سب کو معلوم ہوا کہ یہ تو وہی ملک ہے جو محمد قلی قطب شاہ کے زیرِ نگیں تھا اور جس کے لئے شہر حیدرآباد بطور پایۂ تخت بسایا تھا اور جس ملک کے تلگو شاعروں کی سرپرستی اور عام رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے اس فیاض بادشاہ نے بڑے بڑے کام انجام دیئے تھے۔" شہر حیدرآباد کا بانی اور قطب شاہی خاندان کا پانچواں فرماں روا حسنِ اتفاق سے ایک دولت مند سلطنت کا فیاض بادشاہ بھی تھا۔ اسکے خاندان نے دکن میں تقریباً دو سو سال حکومت کی اور علم و فضل اور شعر و سخن کی ایسی سرپرستی کی کہ اس خاندان کی لکھی اور لکھائی ہوئی کتابیں ہندوستان کے مختلف کتب خانوں کے علاوہ ایران اور ترکی تک پہونچ گئیں۔ ڈاکٹر زورؔ ایسے دکنیات کے قدآور محقق نے محمد قلی کے ضخیم کلیات کو مرتب کرکے شائع کیا جس کے سبب اُردو زبان اور ادب میں قامت میں اضافہ ہوا۔

۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء سے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے زیرِ اہتمام ۱۵ دیں "جشن محمد قلی قطب شاہ" کی چار روزہ رنگا رنگ علمی، تہذیبی اور ادبی تقاریب منعقد کی جا رہی ہیں ریاست کے گورنر جناب بی جے دیوان نے اس تقریب کا افتتاح کرنا منظور کرلیا ہے۔ ریاستی وزیرِ قانون جناب آصف پاشا ابتدائی اجلاس کی صدارت فرمائیں گے۔ ریاستی ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے صدرنشین جناب اجیت سنگھ اور حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے ڈائرکٹر جناب نریندر لوتھر کے بھرپور تعاون کے باعث امید ہے یوم محمد قلی قطب شاہ کی یہ تقاریب شایانِ شان طور پر منائی جائیں گی۔ اس موقع پر ایک سمپوزیم بھی ہو رہا ہے جس میں "گولکنڈہ کلچر کے اثرات" حیدرآباد کی موجودہ تہذیب پر" کے زیرِ عنوان دکن کے نامور دانشور اور اسکالر صاحبان اپنے خیالات کا اظہار کریں گے "محفلِ مشاعرہ" اور "شبِ غزل" کے علاوہ تلگو اجلاس بھی ہوگا۔ محمد قلی کے گنگا جمنی دکنی کلچر، روا دارانہ خدمات اور تلگو شعر و ادب نیز دکنیات پر ان تقاریب میں فکر انگیز خیالات کا اظہار کیا جائے گا۔ ادارہ کی مجلس انتظامی کے رکن اور ان تقاریب کے معتمد جناب رمن راج سکسینہ (ایڈوکیٹ) نے اِن تقاریب کو اپنی مخلصانہ مساعی جمیلہ سے ادبی اور تہذیبی "حیدرآبادی تہوار" کے درجے تک پہنچایا ہے۔

اس سالانہ جشن کی مناسبت سے زیرِ نظر شمارہ قطب شاہی دور کی کچھ جھلکیاں پیش کر رہا ہے اس کے بعد کے شمارہ میں اس جشن کی تفصیلات پر مبنی رپورٹ بھی شامل کی جائے گی۔ اس شمارہ میں حسبِ سابق تمام مستقل عنوانات پر منتخب نگارشات کے علاوہ موعودہ سلسلہ "حیدرآباد کے بڑے لوگ" کا آغاز بھی ہورہا ہے۔ ہمیں یہ اعلان کرتے ہوئے احساسِ فخر ہورہا ہے کہ اس سلسلہ کی ابتداء مولوی غلام حیدر صاحب سابق صدرنشین آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن کے بڑے سوانحی خاکے سے ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ ہر ماہ اس عنوان کے تحت حیدرآباد کے ان عہد ساز شخصیتوں کی خدمات اور ان کی بے لوث "حیدرآبادیت" پر خصوصی مضامین شائع ہوتے رہیں گے۔ جن کی فکری و فنی بصیرت و بصارت کے سبب آج بھی حیدرآباد "شہر آرزو" بنا ہوا ہے۔

■ ۸ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہماری زبان کا عالمی شہرت یافتہ ادیب اور عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کا بمبئی میں انتقال ہوگیا۔ پریم چند نے اردو میں جس ہندوستانی روایت کو اپنی افسانہ نگاری سے روشن کیا تھا اسے روشن تر کرنے والا ایک اور چراغ بھی بجھ گیا۔ ابھی مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر رشید احمد صدیقی ایسے دانشور اور صفِ اول کے بزرگوں کی المناک وفات کا صدمہ دلوں کو محزون کئے ہوئے تھے کہ اچانک کرشن بھی جدا ہوگئے، کرشن نے بے شمار تخلیقات اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کی کہانیوں میں ہندوستان کے محنت کش افراد کا دل دھڑکتا ہے جبر، ظلم اور ناانصافی کے خلاف کرشن نے طنز و مزاح کا سہارا لیکر سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر زنی کی ہے اور معاشرہ کو صالح، ستھرا اور روشن بنانے کے جتن کئے ہیں۔ کرشن کی کہانیاں زندہ رہیں گی اور ادب کا قابلِ قدر سرمایہ بن کر ان کی عوامی حسیت اور دردمندی کو خراجِ عقیدت دیں گی۔ قومی اتحاد اور محبت اور محنت کے جذبات کی جس خوبی سے کرشن چندر نے اپنی کہانیوں میں ترجمانی کی ہے اس کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی ترقی پسند تحریکوں سے جو وابستگی رہی ہے اُسی عالمی طور پر سراہا جائے گا۔ اردو زبان اس کے کلچر اور اس کی ادبیات سے کرشن چندر کو بے پناہ اور اٹوٹ پیار تھا اور اس زبان کے پڑھنے، لکھنے اور بولنے والوں نے بھی ان سے اسی طرح کا رشتہ استوار رکھا تھا۔ کرشن کی موت ایک دور، ایک تہذیب، ایک طرزِ فکر کی موت ہے مگر وہ تو مر کر بھی زندہ رہیں گے۔ ع

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ہم اگلے شمارہ میں کرشن چندر کی یاد میں خراجِ عقیدت ادا کر رہے ہیں۔

غلام جیلانی

قندِ مکرّر

(مجلۂ عثمانیہ دکنی ادب نمبر [illegible])

پروفیسر عبدالقادر سروری

دکن میں اُردو نثر کا ارتقاء

عام طور پر زبانوں میں نظم، بہ لحاظ زمانہ، نثر سے پہلے تشکیل پاتی ہے۔ اُردو میں بھی امیر خسرو اور ابتدائی تشکیلی دور کے ایک دو صوفی شعراء کے کلام کے کچھ نمونے ملتے ہیں۔ لیکن ہر زبان کے ابتدائی آثار کی طرح ان کے مستند ہونے کے بارے میں بھی پورا یقین نہیں ہے۔ دکن میں صوفیہ کی تبلیغی مساعی کے سبب سے نثر کی پہلے نشو و نما ہونے لگی تھی۔ گو یہ صحیح ہے کہ نظم کی نشو و نما میں بھی بہت زیادہ دیر نہیں لگی۔

دکن میں اُردو نثر کے آغاز کے بارے میں اگر بعض روایتوں پر اعتماد کیا جائے تو حضرت شیخ عین الدین گنج العلم کے مختصر مذہبی رسالوں کا نام دکن میں اُردو نثر کے اوّلین آثار کے طور پر لیا جا سکتا ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے اپنی تصنیف "اُردوئے قدیم" میں لکھا ہے کہ حضرت عین الدین گنج العلمؒ نے "کئی چھوٹے چھوٹے رسالے دکنی زبان میں تصنیف کیے تھے"۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسے تین رسالے تھے جو تقریباً چالیس اوراق پر مشتمل تھے۔ یہ رسالے قلعہ سینٹ فورٹ جارج مدراس کے کتب خانے میں محفوظ تھے، لیکن اب ان رسالوں کا پتہ نہیں ہے۔

دکن میں اُردو نثر کے آغاز پر جتنے علماء نے لکھا ہے، وہ حکیم شمس اللہ قادری ہی کی روایت کو دہراتے رہے ہیں۔ پہلے تو یہ رسالے ہمارے پیشِ نظر نہیں ہیں، اس لیے ان کے بارے میں کوئی بات تیقن کے ساتھ کہنی مشکل ہے۔ پھر ان رسالوں کی زبان کے بارے میں حکیم شمس اللہ قادری کا یہ کہنا کہ یہ دکنی زبان میں تھے۔ اسی طرح درخورِ تنقیح ہے، جس طرح حضرت گیسو درازؒ کے رسالوں کی زبان جس کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

اگر صوفیائے کرام کے کچھ اُردو ملفوظات کو ہم نثر کا آغاز کہہ سکیں تو محمد تغلق کے عہد میں دولت آباد اور خلد آباد آنے والے کچھ صوفیوں جیسے حضرت زین الدین خلد آبادی ([illegible] تا [illegible]) کے اقوال بھی دکن کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن ان پر نثر کا اطلاق بہت ہی ابتدائی مفہوم میں ہو سکتا ہے۔ ان اقوال اور روایتی رسالوں سے قطع نظر دکن میں اُردو نثر کا باضابطہ آغاز حضرت گیسو درازؒ سے اب تقریباً ایک مسلّمات ہو گئی ہے۔

اس موضوع پر اتفاق سے میرے دو عزیز شاگردوں نے سیر حاصل لکھا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے، اپنے مقالے "اُردو نثر کا آغاز اور ارتقاء" میں اس موضوع کے تقریباً سارے ہی جہات کا احاطہ کر لیا ہے، اور حضرت گیسو درازؒ کے رسالوں کی تفصیل اور تحقیق میں انھوں نے بہت بنیادی کام انجام دیا تھا۔ اس کے بعد جو گوشے باقی رہ گئے تھے، ان پر ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے "شکار نامہ اور رسائل عثمانیہ" کے دیباچے میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ مجھے اس سلسلے میں اب کوئی نئی بات نہیں کہنی ہے۔

جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے جو حکیم شمس اللہ قادری ہی کی طرح اس موضوع پر اوّلین لکھنے والوں میں سے ہیں، اپنی کتاب "دکن [illegible]

کے حالیہ ایڈیشن میں حضرت گیسودرازؒ کے رسالوں کے بارے میں لکھا ہے کہ آپ کی چند تصانیف کا پتہ چلتا ہے اور ان رسالوں کے نام لکھے ہیں۔
معراج العاشقین، ہدایت نامہ، تلاوت الوجود، شکار نامہ اور رسالہ سہ بارہ۔

ہاشمی صاحب کو اس کا افسوس ہے کہ ان رسالوں کی تصنیف کے زمانے کا صحیح علم نہیں ہوتا۔ بعض حضرات نے ان رسالوں کو آپ کے دکن آنے کے بعد کی تصنیف مانا ہے، کیونکہ ان میں "چ" حرف تاکید کا استعمال ہوا ہے۔ بعض حضرات کے خیال میں "چ" حرف دکن کا اضافہ ہے۔ اور یہ رسالے آپ کے دہلی میں قیام کے زمانے ہی میں تصنیف ہوئے۔ کچھ حضرات سرے سے ان رسالوں یا بعض رسالوں کو حضرت گیسودرازؒ کے نام سے منسوب کرنے سے پس و پیش کرتے ہیں، کیونکہ ان کے یہاں ان رسالوں کے آپ کی تصنیف ہونے کے کافی ثبوت مہیا نہیں ہیں۔

آخرالذکر حضرات کے شبہ کے بھی میری نظر میں موجہ ثبوت موجود نہیں ہیں، اگر کچھ غیر مستند لکھنے والوں کی شہادتوں کو ہم زیادہ اہمیت نہ دیں تو بھی حکیم شمس اللہ قادری اور مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر زورؔ مرحوم جیسے محتاط محققین اور اس موضوع پر گہری نظر رکھنے اور ذاتی تحقیق پر بھروسہ کرنے والوں کی شہادتیں ہمارے لیے یقین آفرین ہونی چاہئیں۔ ہم سے قریب تر زمانے کے مصنفین میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اپنی محققانہ تصنیف "اردو کا آغاز اور ارتقاء" میں بھی معروضی چھان بین اور اس کے بعد خاص کر حضرت گیسودرازؒ کی تصانیف کے بارے میں ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا "شکار نامہ اور مماثل مثالیے" کے دیباچے میں حضرت گیسودرازؒ کے رسالوں کی پوری چھان بین اور شبہات کے ازالہ کی عالمانہ کوششیں، ہمارے شبہات کو دور کرنے میں بڑی حد تک معاون ہیں۔ اگر ہم پہلے سے CLOSED MIND کے ساتھ اس بارے میں سوچ نہ رہے ہوں۔ اسی طرح میرے اور شاید میری طرح بہت سے حضرات کے ایقان میں ان میں سے بعض رسالوں کے حضرت گیسودرازؒ کی تصنیف ہونے کے بارے میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوگا۔

حضرت گیسودرازؒ کے اُردو رسالوں کے بارے میں علمی (ACADEMIC) بحثیں ہوتی رہیں گی۔ جس طرح شکسپیئر کے ڈراموں کے بارے میں بیکن کے تعلق سے بحثیں سالہا سال سے ہوتی رہی ہیں، پھر بھی دنیا کے ایقانات میں ان ناٹکوں کے شکسپیئر کے مصنف ہونے کے بارے میں کسی طرح کا تزلزل پیدا نہیں ہو سکا۔

ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ نئی دریافتیں، روز بروز اس بات کو پایۂ ثبوت کو پہنچانے میں مدد و معاون ہوتی جا رہی ہیں۔ حضرت گیسودرازؒ کی معاصر تصانیف سے ہم کو پتہ چل رہا ہے کہ آپ ہندی میں ارشاد و ہدایت فرمایا کرتے تھے، اور کم سے کم معراج العاشقین کی طرف اشارے ملتے ہیں کہ آپ کے معتقدین خاص موقعوں پر اس رسالہ کی تلاوت نہایت خشوع و خضوع سے فاتحہ خوانی کے بعد کیا کرتے تھے۔ اور "شکار نامہ" کے بارے میں حضرت سید میر محمد کالپوی کی شہادت کے بعد، جس کی تفصیل ڈاکٹر ثمینہ نے "شکار نامہ اور مماثل مثالیے" کے دیباچے میں لکھی ہے، اس رسالے کے آپ کی تصنیف ہونے کے بارے میں ہمارا یقین مستحکم ہو جاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ بات بھی شاید احتیاط سے سوچنے کی ہے۔ آپ کے نام سے سارے منسوب اور مشتبہ رسالوں میں سے کن رسالوں کے بارے میں ہم کسی شبہ کے بغیر یہ ماننے پر آمادہ ہوں کہ یہ آپ کے قلم کی نہیں تو یقیناً آپ کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ اس سلسلہ میں شاید ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا محتاط اور معروضی طرزِ عمل ہمارے لیے رہنمائی کا باعث ہو سکتا ہے۔

حضرت گیسودرازؒ سے منسوب رسالوں کی تفصیل ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے حسب ذیل گنائی ہے:

"معراج العاشقین" "شکار نامہ" "سہ بارہ" "ہدایت نامہ" "درِ اسرار" "تلاوت الوجود" "خلاصۃ التوحید" "ہشت مسائل"
"تشریح کلمۂ طیبہ" "وجود نامہ" "مجموعہ رسائل تصوف" "وجود العاشقین" "مثنوی تمثیل نامہ" "رسالہ تحقیق" "پندار شاد نامہ" —
"رسالہ حدیث قدسی" "مثنوی دکنی" "مثنوی مسائل تصوف" "مشاہدۃ الاکبر" "ہفت اسرار" "تمثیل نامہ"

ان کے علاوہ محترمہ نے لکھا ہے کہ نظم و نثر کے کچھ اجزا بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے مشاہدۃ الاکبر کے بارے میں ان کا قیاس یہ ہے کہ یہ حضرت کے فرزند محمدؐ اکبر کی تصنیف ہے۔ لیکن اپنے قیاس کی بنیاد کیا ہے، اس طرف انھوں نے اشارہ نہیں کیا۔ غالباً یہ قیاس اس بنا پر کیا گیا ہے کہ حضرت کے فرزند اکبر کا نام محمدؐ اکبر تھا۔ میرے خیال میں یہ موجہ بنیاد اس بات کی نہیں ہو سکتی کہ یہ آپ کی تصنیف نہیں ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت گیسو درازؒ نے رسالے کو اپنے فرزند کے نام موسوم کیا ہو۔ اس طرح کی مثالیں ملتی ہیں کہ کتاب بیٹے یا کسی عزیز شاگرد جن کے استفادہ کے لیے لکھی گئی ہے، انہیں کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔

معراج العاشقین کا ایک متبادل نام غالباً رسالہ تصوف بھی تھا، جس کی طرف میں نے اپنے مضمون مطبوعۂ علی گڑھ تاریخ ادب میں اشارہ کیا ہے۔ معراج العاشقین کو مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنے محققانہ مقدمے کے ساتھ شائع کر دیا تھا۔ آپ کا دوسرا رسالہ "شکار نامہ" بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان رسالوں سے ان کے مطالب، اسلوب اور زبان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ اس زمانے تک دکنی کا ادبی رُوپ معین نہیں ہوا تھا۔ یہ بول چال کی عام زبان تھی، اور شمالی دکنی کا وہ امتیاز جو دکنی کے ادبی دور میں نمایاں ہوا، اس وقت تک موجود نہیں تھا۔

دکن میں اُردو کی اشاعت اور اس کی لسانی صورت، اور حضرت گیسو درازؒ کے اس زبان سے تعلق کے مسائل پر، اب تک جتنا لکھا جا چکا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ مفصل بحث شاید "شکار نامہ" اور "معائل مثالیۂ" کے دیباچے میں ملتی ہے۔ آپ کے رسالوں میں مخطوطات کا سب سے زیادہ تعداد اسی رسالے میں ملتی ہے۔ محترمہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے ان سب مخطوطات کی تفصیل بڑی وضاحت سے لکھی ہے۔ اس کے بعد بھی، ایک مخطوطہ مجلس تحقیقات اُردو حیدرآباد کے کتب خانے میں مزید دستیاب ہوا ہے، اس پر تاریخ کتابت تو درج نہیں ہے، لیکن یہ رسالہ آپ کے سلسلے کے دوسرے بزرگوں کے رسالوں کے ساتھ منسلک ہے اور اس پر وضاحت سے آپ کی تصنیف ہونے کی تفصیلات درج ہیں۔

حضرت گیسو درازؒ کے اُردو رسالوں کی تصنیف کا جب کبھی ہم ذکر کرتے ہیں تو یہ بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیئے کہ آپ اپنے قلم سے بہت کم لکھتے تھے، اور اکثر رسالے اور آپ کے ارشادات اور آپ کے منشی یا کاتب کے لکھے ہوئے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ بھی ہوا ہے کہ آپ کے معتقد بھی آپ کے ارشادات کو لکھ لیا کرتے تھے۔ اس لیے مختلف مخطوطات میں بعض وقت بڑی اور کبھی کبھی اظہار کے وسیع اختلافات بھی ملتے ہیں۔ ایسے اختلافات سے محقق کو گھبرانا نہیں چاہیے۔ اتنے قدیم اور مقبول رسالوں میں ایسے اختلافات کا ہونا ایک عام اور فطری بات ہے۔ یہ رسالے ان عام لوگوں کے ذہنی تقاضوں کا نتیجہ تھے جنھوں نے اُردو کو اپنی زبان کے طور پر اختیار کر لیا تھا۔ یہ سارے رسالے اعلیٰ اخلاقی اور مذہبی اور متصوفانہ قدروں کے حامل ہیں۔ اُردو کے نشو و نما کی تاریخ کا یہ بہت بڑا اور عہد آفریں واقعہ تھا کہ حضرت گیسو درازؒ اور آپ کے سلسلے کے رُوحانی پیشواؤں نے ارشاد و ہدایت کے لیے اس زبان سے کام لیا - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - چنانچہ حضرت گیسو دراز کی زندگی ہی میں آپ کے فرزند اکبر، محمد اکبر حسینی نے بھی ایک رسالہ طالبانِ حق کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے لکھا تھا۔ آپ کے نواسے اور پوتے یہ اختلاف روایات، آپ کے نواسے داماد حضرت عبداللہ حسینی (۸۳۸-۸۵۲ھ) نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی

کی تصنیف "نشاط العشق" کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا۔ شاہ داول کا رسالہ "کشف الوجود" اور شاہ قلندر کا رسالہ "رسالہ قلندر" محترمہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی تحقیق کے مطابق اس کے قریبی زمانے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک اور بزرگ حضرت شاہ کمال الدین تھے، جن کا رسالہ "ارشاد نامہ" اسی زمانے میں لکھا گیا تھا۔ "ارشاد نامہ" کے نام سے اکثر پیرانِ طریقت نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کے لیے رسالے لکھے تھے، جن میں شاہ برہان الدین جانم کا منظوم رسالہ سب سے زیادہ مشہور ہے۔ شاہ کمال الدین، شاہ جمال الدین کے والد اور پیرِ طریقت حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے مرشد تھے۔

حضرت گیسو دراز کے بعد، حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کا نام قدیم اُردو کے مصنفین میں سب سے زیادہ روشن ہے۔ آپ کا تعلق سلاطینِ بہمنیہ کے آخری دور اور بیجاپور کے عادل شاہیوں کے ابتدائی عہد سے تھا۔ بانیِ سلسلہ عادل شاہیہ، یوسف کے زمانے میں آپ بیجاپور آئے اور ارشاد و ہدایت کا مرکز رہے اور اپنے مریدوں اور معتقدوں کے لیے اُردو میں چھوٹے چھوٹے رسالے نظم و نثر کے لکھے۔ حکیم شمس اللہ قادری مرحوم نے ان کے پانچ نثری رسالوں کا تذکرہ کیا ہے، جن کی تفصیل یہ ہے:

(۱) مجالس (۲) [illegible] (۳) سب رس (۴) شرح مرغوب القلوب (۵) رسالہ تصوف۔

پہلے دو رسالے اب غالباً دستیاب نہیں ہوتے۔ آپ کا دوسرا رسالہ جو دستیاب ہوتا ہے "شرح مرغوب القلوب" ہے۔ یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، جو حمد سے شروع ہوتا ہے، اور نعت کے بعد اس میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کے ترجمے اور ان کی شرح درج ہے۔ حکیم شمس اللہ قادری کا یہ خیال تھا کہ یہ میراں جی خدا نما کی تصنیف ہے۔ لیکن انجمن ترقی اُردو کے دو نسخوں اور کتب خانہ آصفیہ کے نسخے میں یہ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کی تصنیف بتائی گئی ہے۔ اس کے دس باب ہیں، پہلا باب توبہ، دوسرا باب نفس کی پہچانت، تیسرا وضو، چوتھا ترکِ دنیا، پانچواں تجرید اور تفرید، چھٹا عرفانِ ذات، ساتواں عشق، آٹھواں معشوقِ حقیقی، نواں فنا اور بقا اور دسواں خاتمے کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس رسالے کا جو نسخہ عثمانیہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں محفوظ ہے، اس پر مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ اور آپ کے فرزند شاہ برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلیٰ کے رسالوں کے ساتھ منسلک ہے۔ مجموعہ کا نام "رسائل شاہ امین الدین اعلیٰ" ہے اسی بنا پر اسے آپ ہی کے رسالوں میں شامل سمجھا گیا تھا۔

ایک اور رسالہ "سب رس" بھی آپ کے نام سے منسوب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر زور مرحوم نے اسے آپ ہی کی تصانیف میں شامل کیا تھا لیکن ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے اس کے مطالعہ کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ رسالہ نہ تو "سب رس" کے نام سے موسوم ہے اور نہ یہ حضرت شاہ میراں جی کی تصنیف ہے بلکہ یہ شاہ وجیہ الدین علوی کی تصنیف ہے، جو گجرات کے رہنے والے تھے اور میاں جی کے لقب سے ملقب تھے۔ اُردو سے محبت کے اس دور میں جب کہ ہر ایک والا شیدا مصنفین کو اپنے وطن اور وطن میں بھی اپنے مخصوص شہر کا ثابت کرنے کے درپے ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ کی یہ سعی قابلِ قدر تھی، لیکن "دکن میں اُردو" کے آخری ایڈیشن (۱۹۶۳ء) میں پھر ہم "سب رس" کو شاہ میراں جی سے منسوب پاتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اس "سب رس" اور "تاج الحقائق" کے بارے میں مفصل چھان بین کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہیں کہ یہ نہ تو "سب رس" ہے اور نہ وجہی کی تصنیف۔ اسی طرح سے اسے شاہ میراں جی سے بھی کوئی واسطہ نہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ یہ "تاج الحقائق" ہے اور شاہ وجیہ الدین (۹۱۰ - ۹۹۸ھ) اس کے مصنف ہیں۔

شاہ میراں جی کے فرزند اور جانشین حضرت برہان الدین جانم نے اپنے والد کی روایات کی پوری پابندی کی اور اپنے معتقدین کے لیے

اردو نظم و نثر میں رسالے لکھ کر، ان تک علم دین پہنچاتے رہے۔ آپ کے تین نثری رسالے "کلمۃ الحقایق"، "ہشت مسائل" اور "معرفت القلوب"، تصوف، شریعت اور معرفت کے مسائل پر مشتمل ہیں۔ اب تک صرف ایک رسالہ "کلمۃ الحقایق" چھپا ہے اور ایک ساتھ دو وقتوں نے حیدرآباد سے چھاپا ہے۔ ایک ایڈیشن مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد کی جانب سے شائع ہوا ہے۔ "کلمۃ الحقایق" کی زبان ان کے دوسرے دو رسالوں کی زبان کے مقابلے میں، موضوع کی نزاکت کی وجہ سے گنجلک ہوگئی ہے۔

شاہ برہان کے فرزند اور شاہ میراں جی کے پوتے شاہ امین نے بھی کئی نثری رسالے لکھے تھے، جن میں سے دو رسائل شاہ امین الدین اعلیٰ، موسومہ مخطوطے میں محفوظ ہیں۔ کچھ رسالے نظم اور نثر دونوں میں ہیں۔ دو نثری رسالے "گفتار شاہ امین" اور "گنج مخفی" ہیں، جن کے مخطوطات کتب خانہ انجمن ترقی اردو میں محفوظ ہیں۔ شاہ امین کے رسالے بھی تصوف اور عقائد پر مشتمل ہیں، لیکن ان کے زمانے تک زبان زیادہ منجھ گئی تھی۔ اس لیے عبارتیں صاف ستھری ہیں، الفاظ اور محاورے کی قدامت کے قطع نظر، مطالب کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔

شاہ امین کے گولکنڈے کے معاصرین میں میراں جی خدا نما، مولانا عبداللہ اور وجہی کے کارنامے دکنی میں اردو نثر کے ارتقائی دور کو پیش کرتے ہیں۔ میراں جی خدا نما کی "شرح تمہید ہمدانی" تصوف کے مسائل پر شیخ احمد، برادر امام غزالی کی تصنیف کا ترجمہ یا شرح ترجمہ ہے۔

مولانا عبداللہ نے نماز کے مسائل کو ایک کتاب کی صورت میں لکھا تھا جو "احکام الصلوٰۃ" کے نام سے موسوم ہے۔ میراں یعقوب کا ترجمہ "شمائل الاتقیا" بھی ایک عظیم مذہبی کارنامہ ہے، لیکن اس کی ادبی اہمیت نہیں ہے۔

وجہی کی "سب رس" شاید قدیم اردو کا سب سے زیادہ درخشاں کارنامہ ہے، جو اردو نثر کے ارتقا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہنے کو تو یہ ایک داستان ہے۔ لیکن اس کے مثالیہ کے مکمل انداز، واردات کی متصوفانہ معنویت اور اس کے حسین اسلوب نے اسے ایک معرکۃ الآرا کارنامہ بنا دیا ہے۔ وجہی نہایت قادر الکلام شاعر تھا، اور اس سے زیادہ ایک صاحب اسلوب نثر نگار، جدید عہد میں اچھے ناول نگار۔ جیسے شاعری اور موسیقی سے لگاؤ اور ان میں مہارت، اس کے کارنامے کی کامیابی کا وسیلہ مانا گیا ہے۔ "سب رس" کی کامیابی کا بھی بلاشبہ یہ ایک ذریعہ ہے۔ اس کارنامے میں مفہوم اور آہنگ دونوں میں بڑی یک آہنگی ملتی ہے۔ وجہی بڑی باتوں کو آسان اور مانوس انداز میں کہنے میں بڑا چابک دست ماہر ہے۔ "سب رس" میں بہت سے (digressions) بھی ہیں، مولوی عبدالحق مرحوم نے انہیں محض بیان بھی تھا، لیکن سچ یہ ہے کہ "سب رس" کے بیانیہ میں ان سے ایسے گنج پیدا ہوگئے ہیں جو بجائے خود حسین اور تسکین دہ ہیں، یہ ایک وسیع گلستان کی منفرد روشیں ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی نزہت، رنگ برنگی کی وجہ سے نظر کش ہیں۔ انہیں میں ہم کو اردو انشائیہ کا [illegible]

وجہی کے اسلوب کا ایک مخصوص آہنگ ہے۔ اس کا بیانیہ ایک ایسی آب جو ہے، جو اپنی رفتار سفر میں ایک ہموار روانی رکھتی ہے اور ایک ترنم پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس میں بعض وقت اونچے آبشار بھی آجاتے ہیں۔ جب یہ نغمہ تند مدی خوانی میں تبدیل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اس وقت محسوس ہوتا ہے کہ وجہی کے نغمے میں حاتم اور زمزم دونوں تحریریں ہیں۔

وجہی مقفیٰ اور مسجع کا بھی اہتمام کرتا ہے۔ لیکن ان تکلفات کے استعمال کا انداز اس کا اپنا ہے۔ لمبے اور چھوٹے جملوں میں توازن پیدا کرنے میں اس کا اپنا آرٹ ہے۔ اسی لیے اردو کے مرصع کارناموں میں اس کی تصنیف "سب رس" کا ایک اونچا مقام رہے گا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس کی مرصع نگاری سے اس کی عبارتوں میں ابہام یا بدمزگی پیدا نہیں ہوتی۔

یہ ایک نہایت سرسری خاکہ ہے۔ دکن کے عہد قدیم کے اہم اور بعض اعتبارات سے عہد آفرین نثری کارناموں کا اس سے بہتر، مختصر زمانے میں مذہبی موضوعات، مسائل، تصوف پر لکھے ہوئے کارنامے اتنے ملتے ہیں کہ ان سب پر تحقیق سے لکھنے کے لیے بہت وقت درکار ہے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

حیدرآباد

میرے ارمانوں کے رنگیں گلستاں تجھ کو سلام!
تجھ پہ قرباں ہوں زمین و آسماں تجھ کو سلام!
اے او' ارضِ پاک! اے جنت نشاں تجھ کو سلام!
تیری ہر اک راہ مثلِ کہکشاں تجھ کو سلام!

حیدرآباد دکن! تیرے نظاروں کو سلام!
گل رخوں کو' دل بروں کو ماہ پاروں کو سلام!

دل پہ دستک دے رہا ہے آرزوؤں کا ہجوم
ساقیا! تجھ کو قسم ہے اور لہرا' اور جھوم
یہ ہوائیں' یہ نظارے اور یہ ماہ و نجوم
لے رہا ہے آج کوئی آپ خود اپنے کو چوم

میری نظروں میں فروزاں' ہر روش' ہر بام ہے
یہ ہے ساگر کا کنارا اور یہ باغ عام ہے

اے قطب شاہوں کی بستی' باباؒ صاحب[1] کی زمیں
اے عروس ہندستاں' اے ایشیاء کی نازنیں
آج بھی ہے روشن و تابندہ تر تیری جبیں
میں ہوں غربت میں تو تُو ہے اور بھی مجھ سے قریں

یاں تو سب کچھ ہے میسّر' وہ سکونِ دل کہاں؟
محفلیں سجتی ہیں لیکن رونقِ محفل کہاں؟

تیری ارضِ محتشم میں داغؔ[2] و فانیؔ[3] کے مزار
حضرتِ امجدؔ[4] کے غم میں چشمِ اردو اشکبار
کون جانے تجھ میں کھوئے کتنے دُرِّ شاہوار
جامیؔ[5] و مخدومؔ[6] کے غم میں ہیں سارے سوگوار

خاک میں خوابیدہ تیری والدِ مغفور ہیں
درگہہِ نوابؒ[7] کے دیوار و در رنجور ہیں

چھوڑ کر میں تیرا دامن پھر رہا ہوں کُو بکُو
جس طرح زلفِ پریشاں' جس طرح پھولوں کی بُو
اس دلِ بے تاب میں ہے ایک تیری آرزو
اور ترا دیدار ہی سجدہ مرا' میرا وضو

تیری خاکِ پاک ہی کحلِ جواہر ہے مجھے
تیرا ہر گوشہ کہ جنّت کے برابر ہے مجھے

کون جانے ٹھوکریں کھایا ہوں کتنی ہمنشیں!
ہر قدم پہ زندگی لیکن دکھائی دی حسیں
گیت تیرے دلربا ہیں' ساز تیرے دلنشیں
اب بھی تیرا آستاں ہے نازشِ و فخرِ جبیں

تیری ہر ٹھوکر میں پوشیدہ مری تقدیر ہے
تو ہی میرا خواب ہے اور خواب کی تعبیر ہے!

---

[1] حضرت بابا شرف الدین صاحب قبلہؒ [2] داغؔ دہلوی [3] فانیؔ بدایونی [4] امجدؔ حیدرآبادی [5] خورشید احمد جامیؔ [6] مخدوم محی الدین
[7] درگاہ حضرت میاں میر نواب صاحب قبلہؒ (واقع مستعد پورہ) جہاں میرے والد کا مزار ہے۔

مجید بیدار

کلامِ معانی کا لسانی مطالعہ

زبان کا آغاز و ارتقاء و لسانیات کا موضوع ہے جس پر نظر رکھے بغیر ادب کا مطالعہ نہیں ہوسکتا۔ اردو کے قدیم شاعر اور بوقلموں نشاط پسند نظم نگار کی حیثیت سے محمد قلی قطب شاہ معانی کا مقام اردو اصناف شاعری میں کافی بلند ہے۔ معانی کا قلم اصناف شعر کے ہر شعبہ کو احاطہ کئے ہوئے ہے۔ وہ غزل، مرثیہ، نظم، رباعی، قطعہ، منقبت اور قصیدہ جیسے تمام اصناف شعری کو اپنی زبان کا موضوع بناتا ہے اسی لئے اردو کلاسیکی ادب میں اس کو بلند مرتبہ دیا گیا ہے۔

معانی کے کلام کا لسانی مطالعہ اس کی زبان اور مروجہ الفاظ کی تحقیق اور تدقیق سے کیا جاسکتا ہے۔ کلام معانی تجزیاتی اور تقابلی دونوں قسم کے طریقۂ لسانیات کا علمبردار ہے۔ تجزیاتی لسانیات سے مراد زبان کا ایک مخصوص منزل میں مطالعہ ہوتا ہے۔ چونکہ کلام معانی سے اس دور کی زبان، زبان کے مختلف اجزائے ترکیبی اور ساخت کا پتہ چلتا ہے اس لئے اس کے کلام میں تجزیاتی لسانیات کی کھوج ناگزیر ہے۔ قطب شاہ کے کلام سے نہ صرف اس دور کی زبان کا پتہ چلتا ہے بلکہ افراد کے سماجی تعلقات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ تہواروں، عیدوں اور موسموں پر تحریر کردہ نظمیں محمد قلی قطب شاہ کے کلام کی تجزیاتی لسانیات کا جائزہ لینے پر ادب کے طالب علموں کو ابھارتی ہیں لیکن اردو داں طبقہ میں لسانیات کا شعور ابھی شاخِ بے ثمر کی طرح ہے۔

کلام معانی کا دوسرا رُخ، لسانی اعتبار سے تقابلی جائزہ ہے جو لسانیات کے شعبۂ تقابلی لسانیات کی جانب نمائندگی کرتا ہے۔ چونکہ قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں دو مختلف زبانوں کے الفاظ کو استعمال کیا ہے اسی لئے اس کے کلام کی تقابلی لسانیات بھی ممکن ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے عہد، اس کے دور اور زبان کی تحقیق ہو جانے کے بعد تاریخی لسانیات پر بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی — پروفیسر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم نے تاریخی شواہد اور تحقیق سے "کلیاتِ قلی" میں ثابت کردیا ہے کہ معانی کی زبان اس کے دور کی ہے اور یہ نسخہ جعلی نہیں ہوسکتا اور مخطوطات کے مطالعہ کے تفحص سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ "کلیاتِ محمد قلی" کے اصل نسخہ کو ملنے میں اہل زبان کو عار نہیں ہے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے قلی قطب شاہ کے کلام کا لسانی مطالعہ کرنا لایعنی سی بات ہے البتہ تقابلی اور تجزیاتی اعتبار سے معانی کی شاعری کا لسانی جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اور اس کے مقام، مرتبہ اور شاعری میں درجہ کا تعین کیا جاسکتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس کے کلام میں سہ لسانی الفاظ کا اجتماع نظر آتا ہے۔ وہ مقامیت پر خصوصی توجہ دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کے کلام میں بکثرت سنسکرت اور ہندی الفاظ کی چھاپ نظر آتی ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ شدہ شدہ ہی استعمال کرتا ہے جس سے اس بات کو تقویت پہنچتی ہے کہ اردو ایک ہندوستانی زبان ہے۔ اور اس کا تعلق عربی اور فارسی زبانوں سے اتنا قریبی نہیں جتنا کہ ہندوستانی

زبانوں سے ہے۔ محمد قلی کے کلام سے اردو لسانیات کا ایک عظیم مسئلہ حل ہو جاتا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کلیات قلی اردو لسانیات میں حرفِ اول کا درجہ رکھتا ہے۔ اردو زبان والوں کو لسانی مطالعہ کے لئے راہ ہموار کرنے والا واحد ثبوت "کلیات محمد قلی" ہے اور یہ سچ ہے کہ تحقیق کے دوران یہ نسخہ دریافت نہ ہوتا اور محمد یوسف الدین سر سالار جنگ مرحوم کی توجہ اس جانب مبذول نہ ہوتی تو اردو لسانیات ابھی تک تاریکی میں رہتی۔ کلیات محمد قلی کی کھوج میں ڈاکٹر زور کی کوششوں نے اردو لسانیات کو صحیح نتیجہ پر پہنچایا۔ اس حقیقت سے آگاہی کے بعد کلام قلی کا لسانی جائزہ اہمیت کا حامل بن گیا ہے۔

زبان، بیان اور قواعد کی رو سے قلی قطب شاہ نے جس انداز کو اپنے کلام میں روا رکھا ہے اس کا مطالعہ تجزیاتی لسانیات کہلائے گا۔ قلی قطب شاہ نے اپنے کلام میں تمام بے جان اسماء کو مذکر باندھا ہے جس سے اردو کا جدید مذکر و مونث مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یعنی اس قدیم دور میں قواعد کے اصول میں اتنا ربط اور باقاعدگی کا رواج تھا کہ تمام بے جان اسماء کو مذکر اور جاندار اسماء کو مونث باندھا جاتا تھا جس کی وجہ سے غیر زبان داں کیلئے قواعد کی غلطی کا امکان ممکن نہ تھا۔ بے جان اسماء کو مذکر کے طور پر استعمال کرنے کی مثال ذیل کے مصرعوں سے ملتی ہے ؎

مناجات میرا تو سن یا سمیع

اس مصرع میں مناجات کو میرا سے جوڑ کر بے جان اسم کو مذکر بنا دیا گیا ہے تاکہ جاندار اور بے جان میں امتیاز باقی رہے اسی طرح سے ایک اور مصرعہ میں کیا گیا ہے ؎

مبارک کا خبر تبرات لے کر آئیا سر تھے

اس مصرعہ میں بھی شب برات کو بے جان ہونے کی حیثیت سے مذکر کے طور پر رکھا گیا ہے۔ اس سے قدیم اردو کی ایک اہم خصوصیت ظاہر ہوتی ہے اور مذکر و مونث کی پہچان کافی آسان ہو جاتی ہے۔

کلام معانی کی یہ بھی ایک لسانی خصوصیت ہے کہ جب اسم مذکر باندھا جاتا ہے تو فعل بھی مذکر ہی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اس مصرعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

نوا نو روز نورنگ جوں کلیاں کھلایا ہے

موجودہ دور میں "نورنگ کلیاں کھلائی ہے" استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اسم بے جان ہونے کی وجہ سے فعل بھی مذکر باندھا گیا ہے۔ کیونکہ قدیم اردو یا دکنی میں بے جان اسماء مذکر ہوتے ہیں اسی لئے فعل بھی مذکر باندھے گئے ہیں۔ معانی کے کلام میں ایسے بے شمار اشعار ملتے ہیں جن میں بے جان اسماء کو مذکر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ؎

ساقی ہو یا عید آیا۔ دیکھ خیال موہنیاں کے

یہاں پر عید کو مذکر اور فعل کو بھی مذکر کے طور پر استعمال کیا گیا ہے موجودہ دور میں عید آئی بکثرت استعمال ہوتا ہے اسی طرح ایک اور مصرعہ ہے ؎

خوشی خبراں سنایا عید بکرید

اس مصرعہ کے اسم کا تعلق بھی بے جان ہونے کی وجہ سے اسے مذکر تصور کیا گیا ہے اور فعل کو مذکر رکھا گیا ہے۔ ان مصرعوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تجزیاتی طور پر قدیم دور میں بے جان اسماء مذکر تصور کئے جاتے اور ان کی مناسبت سے فعل بھی مذکر استعمال ہوتے تھے جس سے یہ بڑی سہولت تھی کہ زبان کو سیکھنے اور سمجھنے میں کافی آسانی رہتی اور کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی۔ قواعد کا یہ طریقہ تلگو اور سنسکرت قواعد کی

نمائندگی کرتا ہے جس میں تمام بے جان اسماء مذکر تصور کیے جاتے ہیں جو ایک اصولی قواعد کے مخالف ہیں۔

سہا آیا، کوئل گیت سنایا، سال گرہ آیا، اور رُت آیا جیسے جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ بے جان اسم مذکر اور اس کے ساتھ فعل بھی مذکر استعمال کرنا دکنی (قدیم اردو) کا رواج تھا۔ کلام معانی میں قواعد کے موجودہ طریقوں سے جداگانہ طریقہ اپنانے کا اظہار تجزیاتی لسانیات کی نمائندگی کرتا ہے۔

ماہرینِ لسانیات، قلی قطب شاہ کے کلام کے مطالعے سے یہ بات بآسانی کہہ سکتے ہیں کہ جس دَور جو ادب پیش کیا ہے اس کے بیان کی زبان لازمی طور پر عام بول چال کی زبان رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ لسانیات کا تجزیہ اور زبان کے الفاظ کی نشست خود بتاتی ہے کہ قلی قطب شاہ کے کلام کی زبان عوامی ہے اور دکن میں کثرت سے بولی جانے والی ہے۔ اسی دور کی دیگر تخلیقات جیسے "سب رس" "گلشن عشق" "علی نامہ" اور دیگر کتابوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ لسانی اعتبار سے ان تخلیقات کی زبان عوامی رہی ہے۔ ورنہ تخلیق کے لئے عربی، فارسی اور دیگر زبانوں کی مدد تھی۔ ایک زبان میں کسی تخلیق کا ظہور پذیر ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے سمجھنے اور جاننے والے موجود ہیں، ورنہ نہ سمجھنے والی زبان میں تخلیق کوئی امر معنی نہیں رکھتی۔ اس بحث سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کلام معانی جس زبان میں جس دور میں لکھا گیا ہے اس وقت اس زبان کے جاننے، سمجھنے اور بولنے والے موجود تھے۔

کلام معانی میں مستعملہ زبان اور قواعد کا تجزیاتی جائزہ لینے کے بعد اس کے کلام میں بیان کی چاشنی اور فکر کی سنجیدگی بھی دیکھنا ضروری ہے۔ قلی قطب شاہ کی نعتیں، منقبت، مولودِ علیؓ اور دیگر مذہبی عنوانات پر تحریر کردہ نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بیان میں شائستگی اور احترام کو ملحوظ رکھتا ہے۔ طرزِ بیان نہایت سادہ ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے اجتناب برتا گیا ہے۔ شعری صنعتیں اور تصوف کو کلام میں جگہ نہیں دی گئی اگرچہ کہ فارسی شاعر حافظ کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن تصوف کے مسائل اور شعری صنعتوں کو بطور شعر کی خوبی پیش نہیں کیا گیا جس سے کلام معانی کا اندازِ بیان سادہ ہونے کی دلیل ملتی ہے۔ بقول زورؔ صاحب وہ حافظ کا پہلا مترجم ہے۔ پھر بھی بیان میں اس نے فارسی تراکیب سے اجتناب برتا ہے اور خالص ہندوستانی ماحول میں پلنے والی زبانوں کے اندازِ بیان کو اپنایا ہے۔ حافظ کے کلام سے معانی کا تقابل یہ بتاتا ہے کہ اندازِ بیان کی سادگی اس کے کلام کی اعلیٰ ترین صفت ہے۔

گل بے رخِ یار خوش نہ باشد (حافظؔ)
پھول بن رخِ یار خوش نہ دسے (معانیؔ)
یوسف گم گشتہ باز آید بہ کنعاں غم مخور (حافظؔ)
یوسف گم سو پھر آتا ہے بہ کنعاں غم نہ کھا (معانیؔ)

ان مصرعوں کے مطالعے سے معانیؔ کے بیان کی سادگی ظاہر ہوتی ہے اور عام بول چال کے بیان کو ذریعۂ شاعری بنانے کا پتہ چلتا ہے۔ البتہ اس کے کلام میں قدیم الفاظ کا استعمال بکثرت دکھائی دیتا ہے جیسے "سے" کے لئے "تے" کا استعمال۔ "تجھے" کے لئے "تج"، "سے" دسے اور ایسے ہی متعدد الفاظ اس کے کلام میں شامل ہیں جس کا مطالعہ قدیم اردو کے بیان کے ہنج کا پتہ دیتا ہے اور اردو کا قدیم دور بیانیہ طور پر ہندوستانی زبانوں سے استفادہ کرنے کی دلیل ملتی ہے۔

غزلیات اور دیگر نظموں میں قلی قطب شاہ نے عشقیہ انداز یا رومانیت کو اپنایا ہے اور تخیل اور بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ عیش پرست اور عاشق مزاج ہے۔ بارہ پیاریاں اور دیگر نظمیں اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ رسم جلوہ، سال گرہ اور دیگر معاملات

اور استعمال میں آنے والے سماجی تیوہار پر پیش کردہ نظموں میں بھی اس کا بیان ایک عاشق مزاج شاعر جیسا ہے لیکن اس میں بھی احترام کو ملحوظ رکھنا، شاعری کی خصوصیت تصور کرتے ہوئے معانی حضرت علی اور نبی کے صدقے سے پیاریاں ملنے کا ذکر کرتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے بیان پر مذہبیت کی چھاپ ہے۔ اور عشق کے دوران بھی وہ نبی و علی کو مہربان ٹھہراتا ہے۔

معانی کا انداز بیان سادہ اور عام فہم ہونے کے علاوہ قدیم ہے اس کے بیان سے احترام عشق و حسن اور پیار و محبت کی تقدیس کا جذبہ ابھرتا ہے اگرچیکہ وہ اپنے بیان میں بعض جگہوں پر عامیانہ انداز کو اپناتا ہے لیکن آج کل کی جدیدیت پسندی کے دور میں اس کو بھی گوارا کیا جاسکتا ہے۔ "چولی مست، انگی مست" کہنا بھونڈے انداز بیان کی دلیل ہے اس کے علاوہ متعدد نظموں اور غزلوں میں ایسا ہی عامیانہ پن نظر آتا ہے لیکن اس میں لذتیت کا جذبہ کارفرما ہے۔

کلام معانی کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی شاعری کا مقصد "حظ نفس" تھا، ایک ایسے دور میں جب کہ عیش و نشاط کے سارے دروازے بادشاہ پر وا ہوں، اس کی شاعری کا مقصد سوائے لذتیت کے کچھ اور نہیں ہوسکتا۔ بارہ پیاریاں، کسبن، اور ایسی ہی متعدد نظمیں اور عشقیہ غزلوں کا انداز تحریر بتاتا ہے کہ قلی قطب شاہ کے نزدیک شاعری کا مقصد لذت حاصل کرنا تھا۔ اسی لئے تو وہ اپنے انداز بیان میں عشق، ملاپ، اور محبت کو بکثرت استعمال کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں فراق و ہجر کی کیفیت کہیں بھی نہیں ملتی بلکہ وہ ہر ایک سے اپنی دلی محبت کا ذکر کرتا ہے چاہے وہ سانولی ہو، گوری ہو یا پیاری ہو۔ بہرحال ایک سے زائد عشق کرنا اور متعدد عورتوں کو حرم میں رکھنا عیش پرست سلاطین کی خصوصیت رہی ہے۔ اسی لحاظ سے کوئی عیش و عشرت کا دلدادہ بادشاہ شاعری کرے گا تو یہی عنصر اس کی شاعری کا جزو بن جائے گا، چنانچہ معانی کی شاعری میں بھی لذت، حظ اور عشق کا جذبہ کارفرما ہے۔

معانی کا انداز بیان سادہ اور عام ہونے کے باوجود چونکہ اس میں مقصدیت کا اظہار نہیں ہے اس لئے اس کی شاعری کو "ادب برائے لذت" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کا تذکرہ اس کے کلام کا خاصہ نہیں۔

تقابلی لسانی جائزہ، "تقابلی لسانیات" کا وہ طریقہ ہے جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ اور انداز سے استفادہ سے بحث کی جاتی ہے۔ چونکہ قلی قطب شاہ نے کلام میں جو زبان استعمال کی ہے۔ وہ دکنی ہے اور اس میں کئی زبانوں کا سنگم ہے اسی لئے اس کے کلام میں تقابلی جائزہ بھی اس کی مشترکہ زبان کی نمائندگی کرتا ہے۔ قلی قطب کی شاعری میں بہ کثرت سنسکرت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ فارسی اور عربی الفاظ کو ثانوی حیثیت کا درجہ دیتا ہے چنانچہ اس کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی بنیاد ہندوستانی نہج پر ہوئی ہے۔

"ہوا دو جگت تب سوال و جواب" اس مصرعہ میں لفظ جگت کا استعمال عالم یا دنیا کے لئے ہوا ہے، جگت، سنسکرت زبان کا لفظ ہے جو شہادت دیتا ہے کہ معانی ہندوستانی الفاظ کو بیرونی زبان کے الفاظ پر ترجیح دیتا ہے، چنانچہ مزید ایک مصرعہ ہے۔

"جب تے ہوا جگ میں تمارا نور پرکٹ چوطرفت" لفظ پرکٹ سنسکرت زبان کا ہے جس کے معنی ظاہر کے ہیں۔ اس مصرعہ میں بھی سنسکرت لفظ کو استعمال کر کے مقامی زبان کی نمائندگی کی گئی ہے۔ بعض اوقات شاعر ایک ہی مصرعہ میں متعدد سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتا ہے بہ

آدھار سا تو کس کا جیون توں تہ بہوں کا

اس مصرعہ میں لفظ آدھار کے معنی سہارا کے ہیں جو سنسکرت زبان سے حاصل کیا گیا ہے۔ اسی طرح جیون زندگی کے معنی دیتا ہے جس کی اصل بھی سنسکرت ہے۔ ایک ہی مصرعہ میں دو سنسکرت الفاظ کا استعمال مقامی زبان کو کلام میں ترجیح دینے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح کلام معانی میں لاج، سروج، نیر، نرمل جیسے الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوئے ہیں جس سے ہندی زبان کا اردو میں اثر و نفوذ ظاہر ہوتا ہے۔ سنسکرت اور ہندی الفاظ کے مقابل میں فارسی اور عربی الفاظ کا استعمال بہت کم کیا گیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ لسانی اعتبار سے اردو کا رشتہ سنسکرت اور ہندی سے قریب کا ہے۔ فارسی اور عربی زبانیں اردو کے مولود کے وقت اس میں شامل نہ تھیں بلکہ اردو پر ان کا اثر بعد میں ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ کا اپنی شاعری میں سنسکرت اور ہندی الفاظ کو استعمال کرنا اس کی "ہندوستان پسندی" کی دلیل ہے۔ اور وہ مقامی عناصر کو پیش کرنا اپنی شاعری کا لازمہ تصور کرتا ہے جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ لسانی اعتبار سے قلی قطب شاہ کا کلیات اردو کے مولد اور اس کی قبیلہ کی زبانوں کی نشاندہی کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ کلیات قلی قطب شاہ کی وجہ سے لسانی اعتبار سے یہ ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ اردو کا مولد ہندوستان ہے اور اس کا رشتہ سنسکرت اور ہندی زبان سے قریب کا ہے اور یہی زبانیں اردو کو اس کا انداز اور فکر دینے کی ذمہ دار ہیں۔ اس ثبوت کی وجہ سے اردو کی پیدائش ہندوستان میں ہونے کا فلسفہ مسلم ہو جاتا ہے اور لسانیات کا ایک پیچیدہ مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کو مذہبی حیثیت میں نہ دیکھئے بلکہ ان کو محبت و خلوص کی ان مٹ یادگاروں میں دیکھئے جو آج بھی اس سرزمین سے رواداری اور بین طبقاتی بھائی چارگی کا سبق دے رہی ہیں۔ میں اس انسان کو بادشاہ کے مقابلے میں زیادہ یاد کرتا ہوں جو قلی قطب شاہ کے اندر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کو ہم محدود شکل میں یا صرف بادشاہ کے روپ میں نہیں پیش کر سکتے۔ بلکہ انھیں ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں جو تلنگانہ کے ذرہ ذرہ سے بن کر پیدا ہوئی۔ وہ ایک عظیم اور سچے عاشق تھے اور ان کا دل انسان کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ سب ہی فرقے ان کی نہ صرف یاد منائیں بلکہ ان کی یاد کی قدر کرنا اپنا فرض اور سعادت سمجھیں۔

سلطان قلی قطب شاہ قوم کے سچے معمار رہے ہیں۔ انھیں غریبوں کے دکھ درد کا بڑا خیال تھا۔ جب کبھی عوام مصیبت میں مبتلا ہو جاتے تو وہ اپنا آرام چھوڑ کر ان کی دستگیری اور مدد کو پہنچتے۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی عوام کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔ ان کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ محبت کے علمبردار تھے اور انھوں نے اس سرزمین پر خلوص و محبت کے چراغ جلائے اور دلوں کو روشن کیا جس کی وجہ سے حیدرآباد بذات خود روشنی کا مینار ہے۔ اگر آج کوئی اس روشنی کو نہیں دیکھ پاتا تو اس کی آنکھوں کو خدا نے بینائی سے محروم کر دیا ہے۔

قلی قطب شاہ کی ذات میں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں بھی نظر آتے ہیں۔ وہ ان سب کا مرقع تھے۔ اکبر کی رواداری، فراخدلی اور رعیت نوازی کی وجہ سے اکبر کا نام لیتے ہوتے ہر ہندوستانی کا سر بلند ہوتا ہے۔ یہ اوصاف قلی قطب شاہ میں بھی ملتے ہیں۔ شاہ جہاں کو فن تعمیر سے جو لگاؤ تھا وہ محمد قلی قطب شاہ میں بھی ملتا ہے جس کا ثبوت حیدرآباد ہے جس کی آج بھی تعریف ہو رہی ہے۔ عدل و انصاف اور مل جل کر زندگی گذارنے کا شوق جو جہانگیر کی طرح ان میں بھی ملتا ہے سچ تو یہ ہے کہ عوام کی زندگی محمد قلی قطب شاہ کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی اور انھوں نے اپنی زندگی کو لوگوں کی زندگی کا حصہ بنا دیا تھا۔ وہ خوبیوں کا مجسمہ اور انسان کی شکل میں ایک فرشتہ تھے (بھیم سین سچر گورنر آندھرا پردیش ۱۹۵۸ء)

سماجی ترقی

گذشتہ 18 مہینوں میں ملک میں ایک پُر امن معاشی و سماجی انقلاب رونما ہوا ہے

★ نومبر 1976 کے آخر تک، تقریباً 71 لاکھ کنبوں کو مکان بنانے کی جگہیں مہیا کی گئیں (اس کے لئے کل مستحق کنبوں کی تعداد 13.6 لاکھ ہے)

★ تمام ریاستوں میں زمین کی ملکیت کی حد کے تقرر کو عمل میں لانے کے لئے قوانین منظور کئے گئے ہیں۔

★ گیارہ ریاستوں اور چار مرکزی علاقوں میں دیہی قرضوں کو ختم کرنے کی قانونی کارروائی کی گئی (اس میں قرضوں کی وصولیابی پر روک لگانے کی کارروائی بھی شامل ہے۔)

★ 89,198 بندھوا مزدوروں کا پتہ لگا کر انھیں آزاد کرا دیا گیا ہے۔

davp 76/885

لئیق صلاح

ارباب نظم و نثر بیجاپور

اس سرزمین بیجاپور کی زرخیزی و شادابی، اور موزوں آب و ہوا جہاں مختلف قسم کی غذائی پیداوار کے لئے مناسب سمجھی جاتی ہے، وہیں اس خطے نے ذہنی پیداوار میں بھی کمی کا احساس ہونے نہیں دیا۔ اس خاک میں ایسے دفینے پائے جاتے ہیں جن پر زمانہ ہر دور میں نازاں رہیگا۔

شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ صوفیوں اور بزرگوں نے بھی یہاں کی معاشرت، تہذیب و تمدن کو سنوارنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ تہذیب و شائستگی کی سب سے اہم کڑی زبان ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے جس قدر زبان کی خدمت کا حق ادا کیا، اسے تاریخ کبھی فراموش نہ کرسکے گی۔ دکنیات کا کوئی محقق یا مطالعہ کرنے والا ان کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ ان مخلص خدمت گذاروں کے سوا ایک اور طبقہ تھا جس کی دلچسپیوں اور سرپرستیوں نے ان سچے خدمت گذاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ وہ جماعت امراء و سلاطین کی تھی۔

بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں جو دو مشہور سلطنتیں اس کی حقیقی جانشین ثابت ہوئیں ان میں سے ایک سلطنت بیجاپور تھی۔ جس طرح شمال میں دلی اسکول اور لکھنؤ اسکول دو دبستانوں کی نشاندہی کرتے ہیں اسی طرح دکن میں دو دبستان تھے۔ ایک گولکنڈہ، دوسرے بیجاپور۔ شعری، ادبی اور علمی اعتبار سے دونوں اپنی اپنی جگہ اہمیت کے حامل تھے۔ بس یوں سمجھئے کہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ جو صرفی، نحوی اور لسانی اعتبار سے بالکل ایک جیسی ہیں۔ قدیم دکنی کی جو روایات ہمیں گولکنڈہ کے شعر و ادب میں ملتی ہیں انھیں رہنما اصولوں پر بیجاپور کی زبان میں بھی بتدریج تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان دونوں ریاستوں کے شعر و ادب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو زیادہ فرق محسوس نہ ہوگا۔

بیجاپور کی سلطنت کا بانی یوسف عادل شاہ تھا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ خود یوسف عادل شاہ علم و ادب کا دلدادہ اور فارسی کا اچھا شاعر تھا۔ علماء، فضلاء اور اہل فن کا قدرداں تھا۔ اس لئے ہند و بیرون ہند سے تمام علماء و فضلاء کو بیجاپور آنے کی دعوت دی۔ اور گراں بہا تحائف عطا کئے۔ وہ ہمیشہ ونشاط کی محفلوں میں کسی نہ کسی جذبے سے متاثر ہو کر فی البدیہہ شعر کہتا تھا۔ اس نے شیعیت کو حکومت کا مذہب قرار دیا تھا اس لئے بڑے بڑے عہدوں پر باہر سے آئے ہوئے عراقی اور ایرانی فائز تھے۔ چونکہ ان کی مادری زبان فارسی تھی اسی سبب اردو کی ترقی ناممکن تھی۔ یوسف عادل شاہ کا کلام "کلام الملوک" میں شائع ہو چکا ہے۔

اس کے لڑکے اسماعیل عادل شاہ کی ماں مرہٹہ خاتون تھیں۔ بادشاہ کو ڈر تھا کہ کہیں وہ فارسی عربی، ترکی زبانوں سے بے بہرہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ اسی خدشے سے اس نے اس کی تربیت میں اس بات کو خاص طور سے ملحوظ رکھا کہ فارسی سے دلچسپی زیادہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہ مرہٹی اور اردو کا واقف تھا اور فارسی میں خوب مہارت حاصل کی۔ وہ بھی اپنے باپ کی طرح فارسی میں شاعری کرتا تھا۔ وفائی اس کا تخلص تھا ــــ

مورخین بیجاپور فرشتہ، نوراللہ زبیری وغیرہ نے اس کے علم و فضل اور قدردانی کمال کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کے فارسی کلام کے نمونے موجود ہیں۔

اسماعیل عادل شاہ کا فرزند ابراہیم عادل شاہ اول (۱۵۳۴ء - ۱۵۵۷ء) حکمراں ہوا۔ اہل علم و کمال کی قدردانی اسے وراثت میں ملی تھی۔ یہ بھی اپنے پیش روؤں کی طرح علماء و فضلاء کا قدرداں تھا۔ اس کی قدردانی کا ایک واقعہ مشہور ہے۔ جب رشید قمی گجرات سے بیجاپور آئے تو اس نے ان سے کہا جتنا زر نقد اٹھا سکتے ہیں اٹھا لو۔ چنانچہ انہوں نے دو وقت میں پچاس ہزار ہن اٹھائے۔ وہ خود شاعر نہ تھا۔ لیکن شعراء کی سرپرستی اس طرح کرتا تھا۔ شیعیت کو ترک کر کے سنی مذہب اختیار کیا تھا۔ اس لئے ایرانیوں کا اثر کم ہوا۔ اور دکنیوں نے غلبہ حاصل کیا۔ نتیجتاً اردو کو ترقی ہوئی۔ اس کے جانشین علی کی کوششوں کے باوجود فارسی کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جو پہلے تھا۔ سوائے شاہ برہان الدین جانم کے کسی اور اردو شاعر کا پتہ نہیں چلتا۔

ابراہیم کے بعد علی عادل شاہ جانشین ہوا۔ وہ قدردانی اور فیاضی میں اپنے آباو اجداد سے بڑھا ہوا تھا۔ لیکن اپنے پیش رو کی طرح اردو کا مربی نہیں تھا۔ فارسی کی طرف اس کی توجہ منعطف تھی۔ اس کے مطالعہ کا افسانہ لگانے کے لئے یہی ثبوت کافی ہے کہ سفر میں چار سو کتابوں کا صندوق ساتھ رہا کرتا تھا۔ بادشاہ اور اس کا وزیر افضل خاں شیرازی، دونوں میر فتح اللہ شیرازی جو اس وقت کے جید عالم تھے، ان کی شاگردی کا شرف انہیں حاصل تھا۔ وزیر بھی عالم فاضل تھا۔ اس کی فیاضیوں اور قدردانیوں کے سبب بیجاپور عالموں اور فاضلوں کا مرکز بن گیا۔ بادشاہ وزیر اور فتح اللہ شیرازی کے مکان پر علمی و ادبی مباحثے ہوا کرتے تھے۔ بایں ہمہ اور خانقاہوں میں اردو کا رواج تھا۔ بعض دور کے آخری شعرائے اردو شاہ میراں جی اور شہباز حسینی اس وقت بیجاپور میں مقیم تھے۔ ان کا قیام گاہیں صوفیوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ عوام کی تعلیم اور رشد و ہدایت کے لئے انہوں نے اسی زبان کو منتخب کیا۔ اس لئے ان کی تصانیف اسی زبان میں ہیں۔

علی عادل شاہ کا جانشین (۱۵۸۰ - ۱۶۲۶) اس کا بھتیجا ابراہیم عادل شاہ ثانی ہوا۔ جو محمد قلی قطب شاہ کا ہم عصر تھا۔ اور صحیح معنی میں ہم ذوق و ہم مشرب تھا۔ خود بھی عالم تھا اور اہل علم و کمال کا قدرداں بھی۔ جب مغلوں نے احمد نگر اور گجرات پر حملے شروع کئے تب اس نے بڑی بڑی رقمیں دے کر اپنے آدمیوں کو وہاں روانہ کیا تاکہ وہاں کے علماء و فضلاء بیجاپور آ جائیں۔ بادشاہ کی یہ فیاضی ایک زندۂ جاوید کارنامہ ہے۔ ان علماء و فضلاء کی آمد سے ایک صدی تک بیجاپور علوم و فنون کا مرکز بنا رہا۔

بادشاہ کے دربار کے علماء میں علامہ نورالدین ظہوری، مولانا ملک قمی، شیخ علم اللہ محدث، مرزا رفیع الدین شیرازی، حکیم محمد ابوالقاسم فرشتہ اور شاہ صبغت اللہ، عبدالرشید البلخی قابل ذکر ہیں۔ بادشاہ کی ہندی کتاب "نورس" کا دیباچہ ظہوری نے لکھا جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ فارسی نثر کی بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ ۱۶۰۸ء میں رفیع الدین شیرازی نے "تذکرۃ الملوک" لکھی۔ محمد قاسم فرشتہ نے ۱۶۰۰ء میں بادشاہ کی ایماء سے ملک ہند کی لاثانی تاریخ لکھی۔ جو تاریخ فرشتہ کے نام سے مشہور ہے۔ ملک قمی نے "مخزن اسرار" نظامی کے جواب میں ایک مثنوی لکھی اور بطور انعام ایک مشتری سونا حاصل کیا۔ اکبر اور محمد قلی کی طرح ابراہیم عادل شاہ بھی موسیقی کا دلدادہ تھا۔ "نورس" اس نے موسیقی کے موضوع پر لکھی۔ یہ پوری کتاب دکنی میں نہیں لیکن بعض راگ اور راگنیاں دکنی میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کلاسیکل موسیقی میں بھی دکنی بولی استعمال کی جاتی تھی۔ اس کی زبان عام دکنی زبان کی بحروں سے الگ ہے۔ اس میں خواجہ سید محمد حسینی بندہ نواز کی مدح کے چند شعر یہ ہیں

سید محمد جی میرا　　　جیو جگت میں اتم ہیرا

کدم کستوری جو چندن لائے بادل کھلنے ہور نگ برسائے

ابراہیم کے انتقال کے بعد محمد جانشین ہوا۔ اس نے علماء و فضلاء کی سرپرستی و قدردانی کی۔ ہر مضمون اور زبان کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم کئے۔ اور طلباء کو وظیفے مقرر کئے۔ علماء اور شعراء کی مجلسیں بھی منعقد ہوا کرتی تھیں۔

"تحفۃ النصائح" کا جواب آتشی نے اسی کے عہد میں لکھا تھا۔ ظہوری کے فرزند ملا ظہور نے "محمد نامہ" تصنیف کیا۔ اور بہت ساری کتابیں بھی اسی کے عہد میں لکھی گئیں۔ اس کی ملکہ خدیجہ سلطان تھی۔ جو گولکنڈہ کی شہزادی تھی۔ اس کے ساتھ ملک خوشنود بھی گولکنڈہ سے بیجاپور آیا۔ ملکہ کی سرپرستی کے سبب رستمی اور ملک خوشنود کے کارنامے منظر عام پر آئے۔ اس زمانے میں بھی اردو کی خاصی ترقی ہوئی۔ مقیمی، دولت شاہ امین، صنعتی، رستمی، ملک خوشنود، شوقی وغیرہ اسی عہد کے باکمال شعراء ہیں۔

محمد کے بعد علی عادل شاہ ثانی جانشین ہوا۔ سلاطین کی قدردانی سے ہر طرف علم و ادب کا چرچا تھا۔ شعر و سخن کے تذکرے ہوتے اور مشاعرے کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ سلطان بھی شاعر تھا اسے بھی اردو شاعری کا ذوق تھا۔ اسی لئے ہر طرف اردو شاعری کا بول بالا تھا۔ سلطان کا تخلص شاہی تھا۔ شعراء کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں عموماً وہی شعراء ہیں جو محمد عادل شاہ کے زمانے میں مشہور ہوگئے۔ لیکن ان میں چند ایسے ہیں جو اسی عہد میں مشہور ہوئے جن میں قابل ذکر نصرتی ہے اس نے ملک الشعراء کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ ملک، ہاشمی، ایاغی، مرزا قادر وغیرہ نے اس عہد میں شہرت پائی۔

سکندر کے عہد میں سیاسی ابتری پھیل ہوئی تھی۔ مغلوں کے متواتر حملوں کے بعد بیجاپور کی سلطنت قائم نہ رہ سکی۔ اور سلطنت مغلیہ میں اس کا الحاق ہوگیا۔ لیکن ایسے پرآشوب دور میں بھی بیجاپور شعراء و ادیبوں کا مرکز تھا۔ سیوا، موہن اور معظم کی تصانیف ملتی ہیں۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی خود بھی شاعر تھا، ابراہیم تخلص کرتا تھا۔ تاریخوں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس نے مثنوی، غزل اور قصیدوں میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ لیکن کوئی نمونۂ کلام دستیاب نہیں ہوا، سوائے "نورس" کے۔ یہ کتاب جو راگ راگنیوں سے متعلق ہے ۹۹۵ھ کے بعد ۱۰۱۵ھ سے پہلے، ممکن ہے ۱۰۰۵ھ میں مرتب ہوئی۔ یہ بہت مدت تک ناپید تھی اب اس کے چار نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو ؎

نورس سور جگ جوتی ان سو دکنی پوست سرستی ماتا ابراہیم پرسادسنی دونی

ابراہیم سندری دیکھ یو کچھن ہے کہاں جات چاند سلطان نا نوبی ملکے جب ماں

علی عادل شاہ ثانی کا تخلص شاہی تھا۔ نصرتی جو اس عہد کا مشہور شاعر اور ملک الشعراء تھا وہ بادشاہ کا شاگرد تھا ۱۲۳۱ء... کے کلیات کا ایک نسخہ دستیاب ہوا ہے۔ اس نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے قصیدوں میں ادق اور مشکل بحروں کے ساتھ آسان اور سہل بحریں بھی ہیں۔ قصیدوں سے شاہانہ طمطراق کا اظہار ہوتا ہے تو مثنویاں، مرقع نگاری اور واقع نویسی کی اچھی یادگار ہیں۔ غزلوں میں تخیل کی بلند پروازی، رنگین خیالی، اور عاشقانہ مضمون آفرینی پائی جاتی ہے۔ صفائی اور سادگی اس کے کلام کی خصوصیت ہے۔ شاہ ابوالحسن جو اس کا مصاحب تھا اسی نے اس کے کلام کو مرتب کیا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ فرمائیے ؎

عشق کا مکتب ہوا تھا کہ پڑھنے بدل عقل علم اپنی فقر سکھا یا کہن

۲

عقل خبردار ہے عقل سمجھ کار ہے — عشق کا جاسوس ہے دکھ پہ اچھا لوکرن

شاہی عاشق آتا بول مناجات کرنج — تاکہ کرم تج پہ ہوئے بر حسین و حسن

سارے جہاں کے یار کبھی پر کھو دل رتن کیوں کرکھو — یا قوت جواہر جان میں کوئی رتن بہتر کہو
بولے جہاں کے یار کبھی ہنہانہ آئے بولنا — تمنا سہا تا بولنا اے شاہ مجھ یو نہ کہو

ابروں کمانان کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں — زخمی ہوا دل کا ہرن لاگیا نشان تج بات کا
تج مکھ پہ رنگ کا نشان دستا ہے تج اس بات کا — روشن شفق میں جھلکے جیوں چاند بیلا رات کا

بح بین کے نگر میں لائن دلن کے تجب — تب انجن کے لوگاں خلوت اسے کہتے ہیں۔

شاہ برہان الدین جانم (۱۵۴۳ء۔ ۱۵۹۱ء) شاہ میراں جی کے خلیفہ اور فرزند تھے۔ اپنے وقت کے بڑے صوفی اور شاعر گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنے باپ کی تصانیف کی تالیف بھی کی ہے۔ کئی ایک تصنیفات ان کی یادگار ہیں۔ ان کا کلام بہت مقبول ہوا — بیرون ملک بھی ان کی کتابیں ملتی ہیں۔ یہ تصنیفات عموماً دکنی زبان میں ہیں۔ اور زیادہ تر منظوم ہیں۔ ان کا موضوع تصوف و سلوک ہے جن میں سے قابل ذکر درج ذیل ہیں:

وصیت الہادی: ایک مثنوی ہے جس کا موضوع تصوف ہے۔
رمز الواصلین، بشارت الذکر: ان دونوں میں تصوف کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے (بحوالہ مختصر تاریخ ادب اردو ڈاکٹر اعجاز حسین صفحہ ۴۳)
ارشاد نامہ: اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ صوفیانہ اعتقادات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ نظم کا زیادہ حصہ مکالمہ کی صورت میں ہے۔
سکھ سہیلا: ایک ترکیب بند ہے جس کا ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہے جن میں آخری مصرع مشترک ہے۔ اس نظم میں مرشد سے استفادہ اور معرفت و سلوک کے صحیح طریقوں کی تلقین کی ہے۔

ان کا موضوع زیادہ تر تصوف ہے لیکن کبھی کبھی انہوں نے غزلیں اور دوہرے بھی کہے ہیں۔ اس لئے اپنے باپ سے زیادہ باذوق شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ اسلوب بھی میراں جی سے زیادہ سادہ ہے۔ فارسی اور عربی کے بہت کم الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ڈاکٹر زور ان کی زبان پر برج بھاشا کا اثر محسوس کرتے ہیں۔

نصرتی: محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا۔ اس نے بیجاپور کے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ ریاض حسینی میں لکھا ہے کہ جب اورنگ زیب نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں نصرتی بھی تھے۔ شہنشاہ نے اس کو سب سے اعلیٰ بلند پایہ شاعر قرار دیا۔ اور ملک الشعراء الہند کا خطاب سرفراز فرمایا۔ علی عادل شاہ نے بھی اسے

ملک الشعراء کا خطاب عطا کیا تھا۔ نصرتی کا باپ شاہی سلحدار تھا۔ جب شعر و سخن اس کا ایک خاص مشغلہ تھا۔ اور دکنی پشتوں سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے سلسلے کا مرید بھی تھا۔ نصرتی کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں ولیعہد سلطنت کے ساتھ ہوئی تھی۔ نصرتی کو بیجاپور میں وہ عزت اور توقیر حاصل تھی جو کسی اور دکنی شاعر کو نصیب نہ تھی۔ وہ علی عادل شاہ ثانی کا بچپن کا ساتھی تھا اور مقرب تھا۔ اس زمانہ کے رواج کے مطابق اپنے آپ کو بادشاہ کا شاگرد کہا کرتا تھا۔ رزم اور بزم دونوں میں بادشاہ کا ہم رکاب رہا۔ اس نے علی عادل شاہ کے صرف دو سال بعد ۱۶۷۵ء میں وفات پائی۔

نصرتی کی تین تصنیفوں کا پتہ چلا ہے۔ پہلی "گلشن عشق" ہے۔ یہ ایک رزمیہ مثنوی ہے جو ۱۶۵۷ء میں تصنیف ہوئی۔ اس میں کنور منوہر اور مدھ مالتی کے عشق کی داستان ہے۔ (ڈاکٹر عبدالحق اسے عشقیہ کہتے ہیں اور ڈاکٹر زور رزمیہ) یہ مثنوی دکنی اردو میں خاص امتیاز رکھتی ہے علاوہ حسن شاعری اور زور کلام اس میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جو اس سے قبل کی مثنویوں میں کم پائی جاتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں "اکثر باب میں مختلف قدرتی مناظر کا جلوہ دکھاتا ہے اور قصے کے ضمن میں جو بعض حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ان کی تصویر خوب کھینچتا ہے۔ مثلاً جہاز کے سفر میں کشتی کا حال، باغ اور پرندوں کی کیفیت، شادی بیاہ کا حال، برف باری کی کیفیت، کھانوں کی تفصیل وغیرہ۔ اسی طرح طلوع و غروب آفتاب، چاندنی کا سماں موقع موقع سے خوب بیان کیا ہے۔ انسانی جذبات کی کیفیت بھی ہر موقع پر بڑی خوبی سے دکھائی ہے۔ کلام میں طول ضرور ہے وہ ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے جس کا روکنا مشکل ہے۔

مولوی نصیرالدین ہاشمی اس مثنوی کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں: "گلشن عشق میں انسانی جذبات اور خیالات کی جس عمدگی سے ترجمانی کی گئی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اس کے کلام کی رنگینی، تشبیہ و استعارات کی ندرت واقعی قابل داد ہے۔

۱۶۶۵ء میں ایک رزمیہ مثنوی "علی نامہ" لکھی، اس میں علی عادل شاہ کی داستان رزم، بزم قلمبند کی ہے۔ بقول ڈاکٹر زور "دراصل اسی کتاب سے اس کی استادی اور صاحب کمالی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کی تیسری کتاب "تاریخ اسکندری" ہے۔ چونکہ یہ علی عادل شاہ کی وفات کے بعد ۱۰۸۳ھ میں مرتب ہوئی اسی لئے علی کے جانشین سکندر عادل شاہ سے منسوب کی گئی۔ مثنوی "گلشن عشق" اور "علی نامہ" کے مقابلے میں بہت مختصر ہے۔ اس میں صرف ۱۱۴۵ شعر ہیں۔ کلام میں وہ زور اور شگفتگی بھی نہیں جو اس کی دوسری مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔ یہ نصرتی کا آخری کلام ہے۔ مولوی عبدالحق اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں "چونکہ یہ بیجاپور کے انحطاط کا دور تھا۔ اگلی سی شان و شوکت تھی اور نہ پہلے بادشاہوں کا سا جاہ و جلال، نہ ان کے پرعظمت کارنامے، اس لئے شاعر کی طبیعت کو ابھارنے والی کوئی بات نہ تھی"۔

ڈاکٹر زور نے اپنی تصنیف "دکنی ادب کی تاریخ" میں اس کی غزلوں کے مجموعہ "گلدستۂ عشق" کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق بھی اس بات کے معترف ہیں کہ نصرتی نے غزلیں کہی ہیں۔ اس کی غزلیں مختصر ہیں۔ غزلوں اور رباعیات میں ہندی کلام کا اثر پایا جاتا ہے۔ نصرتی خود اپنے کلام کی قدر سمجھتا ہے اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس نے دکنی زبان کو سنوارا ہے۔ اس میں نیا رنگ پیدا کیا ہے اور وہ چیزیں لکھی ہیں جو اس سے پہلے ناپید تھیں۔

اس کا کہنا ہے کہ فارسی کی سی فصاحت اور حسن ہندی میں نہ تھا لیکن ہندی میں بعض خوبیاں ایسی ہیں جو فارسی میں نہیں۔ اس نے دونوں خوبیوں کو دکھانے میں رکھا اور ہندی شعر کو فارسی کا ہمسر بنا دیا۔ اس کے کلام میں جس قدر فارسی الفاظ ہیں اسی قدر ہندی بھی ہیں۔ اور دونوں کے امتزاج

سے کلام میں ایک نئی شان پیدا کی۔ ملناڈ کی فتح کے بارے میں نصرتی نے ایک قصیدہ لکھا جو ۲۲۰ ابیات پر مشتمل ہے۔ ناقدین کی رائے ہے کہ اس قسم کا قصیدہ ہماری زبان میں مشکل سے ملے گا۔ یہ ایک جنگ نامہ ہے جس میں بادشاہ کی مدح سے زیادہ جنگ کے تفصیلی حالات ہیں۔ مثلاً راجا کی سرکشی، شرزے خاں کا سرکوبی کے لئے روانہ ہونا، بادشاہ کا کوچ کرنا، برسات، جنگل کی بہار، مناظر قدرت کی منظر کشی، فوج کا دھاوا اور لڑائی کے طور طریقے وغیرہ۔

اس قصیدے کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کے یہ الفاظ کافی ہیں: "یہ ایسا بے مثل قصیدہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ پورا نقل کر دوں لیکن ڈرتا ہوں کہ پرانی زبان ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کو لطف نہ آئے گا۔ شروع کرتا ہوں تو وہ لطف بیان اور زور کلام کہاں سے آئے"۔

قدیم دکنی قصیدے کی ایک قسم "چرخیات" کے نام سے موسوم کی گئی تھی۔ اس قسم کے قصائد محمد قلی اور علی عادل شاہ ثانی اور دیگر شعراء کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ نصرتی نے بھی ایک قصیدہ اسی طرح لکھا ہے۔ معراج کی مناسبت سے سورج کے طلوع اور غروب ہونے کی کیفیات کو مختلف تشبیہوں اور استعاروں سے ظاہر کیا ہے۔ یہ اس کی ابتدائی کوشش ہے۔ علی نامہ میں جو قصائد ہیں وہ اس سے زیادہ شاندار ہیں۔ قصائد میں خیال اور مضمون کے علاوہ الفاظ کا انتخاب اور برمحل استعمال بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نصرتی کو اس میں خاص ملکہ تھا۔ اس لئے اس کے قصائد کی زبان دوسرے شعراء کے مقابلے میں زیادہ مشکل محسوس ہوتی ہے۔

رزمیہ واقعات کے بیان میں بھی اس کو خاص کمال حاصل تھا۔ فوجوں کی آمد، جنگ کا زور و شور اور ہنگامہ خیزی ان سب کو اس خوبی سے بیان کرتا کہ پڑھنے والے کے سامنے جنگ کی پوری تصویر کھنچ جاتی۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ اگر مولوی شبلی کی نظر ان رزمیہ قصائد پر پڑتی تو وہ اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے کہ میر انیس سے قبل بھی ایک ایسا باکمال گزرا ہے۔ جس نے مسلسل رزمیہ نظمیں لکھی ہیں۔ اور جو معرکہ آرائی نیز دیگر واقعات کے بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

نصرتی کے قصیدے، مثنوی اور غزل کا مختصر سا نمونہ یہ ہے۔ علی عادل شاہ کی مدح میں لکھتا ہے۔ ؎

جب تے جھلک دیکھیا اوک سورج تری تروار کا ، تب تے گیا تھرا کانپنے ہو پر عرق یک بار کا

علی نامہ میں دکھنیوں اور مغلوں کی جنگ کا حال اس طرح لکھا ہے ؎

دسی رات ارسطو لے دوراں کے یاں — دکھن کے سب عیال تھے جہاں،
سنوارے تھے کئی انجمن دل نشین — نشین میں ہر روح راحت گزین

تلک یوں کہے آ کے جاسوس بھید — جو دیتا ہے یوں دشمن بد امید،
بد اندیش کے دل کا جب بھید پائے — سبھی شیر مردان غصہ میں آئے

کتا ہوں آتا فوج دہلی کی بات — چلی تھی دکھن ملک پر کس دھات سات

جس میں حضرت علی کی لڑائیاں کی گئی ہیں۔ اس میں چوبیس ہزار ابیات ہیں اردو کی طویل ترین مثنویوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ ڈیڑھ سال کے قلیل عرصہ میں اس نے یہ مثنوی مکمل کی۔ ابتدائی حصہ میں اپنے فن کی استادی کا منظر ہو گیا ہے۔ گو یہ ایک ترجمہ ہے لیکن اس کی چند خصوصیات کی بنا پر دوسری مثنویوں سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔

نصیر الدین ہاشمی " دکن میں اردو " میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ " یہ مثنوی نہ صرف رزمیہ ہونے کے لحاظ سے قابل تعریف ہے بلکہ اس کی اور بھی متعدد خوبیاں ہیں اس مثنوی کا تسلسل بیان اچھا ہے۔ زبان کے لحاظ سے نہایت صاف اور سادہ ہے۔ اکثر اشعار ایسے ہیں جن کی نثر نہیں ہو سکتی۔ رزم کا نقشہ بہت قابلیت سے کھینچا ہے۔ اسی طرح بزم کے حالات بھی نہایت خوبی سے بیان کئے ہیں"۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ بادشاہ اور ملکہ کی مدح سرائی نہیں کی گئی جو عموماً اس دور کی مثنویوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ یہ خصوصیت شاعر کی جدت اور اپج کو ظاہر کرتی ہے۔ چند شعر درج کئے جاتے ہیں ؎

فلک کوں وفاداری اندیشہ نیں — بغیر از جفا اسکوں کچھ پیشہ نیں
اتی خوب یو زندگی ہور ہوس — اگر مرگ کا ڈر نہ ہوتا نپس

⁂

مقیمی : ابراہیم عادل شاہ کی شہرت سن کر ایران سے بیجاپور آیا تھا۔ فارسی کا شاعر تھا۔ دکھنی میں بھی شعر کہے ہیں۔ ۱۶۳۸ء میں ایک مثنوی " چندر بدن و مہیار " لکھی ہے جس میں ان کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے۔ گولکنڈہ کے فواصی کا بھی ذکر اسی طرح اپنی تصنیف میں کیا ہو

شاہ امین الدین علی اعلیٰ : بیجاپور کے شعر و ادب کا جائزہ نامکمل رہے گا، اگر ہم شاہ امین الدین علی اعلیٰ کا ذکر نہ کریں۔ شاہ امین کا خاندان تین پشتوں سے شعر و ادب کی خدمت کرتا آرہا تھا۔ میراں جی شمس العشاق، شاہ امین کے دادا تھے۔ اور برہان الدین جانم ان کے والد۔ دکھنی زبان کے جو قدیم نمونے ملتے ہیں ان میں میراں جی کی تصنیفات بھی شامل ہیں۔ جانم کی شخصیت بھی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ بھی صاحب تصنیف و تالیف تھے۔ قدیم نظم و نثر میں ان کی تصنیفات ملتی ہیں۔

شاہ امین الدین علی اعلیٰ کو اپنے والد کی صحبت و تربیت کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ شاہ امین کی ولادت سے قبل ہی جانم کا انتقال ہو گیا تھا۔ لیکن تصنیف و تالیف کی صلاحیتیں انہیں ورثے میں ملی تھیں۔ اپنے بزرگوں کی طرح وہ بھی کئی ایک تصنیفات کے مالک ہوئے — جن میں قابل ذکر نظم و نثر کی تصانیف یہ ہیں۔ " جواہر الاسرار، رموز السالکین، قربیہ، نارینہ، وجودیہ، محب نامہ، خیال ریختہ در مدح شاہ برہان الدین، غزلیں، اور سہیلا، اور نثر میں " گنج مخفی، وجودیہ، گفتار شاہ امین، شرح کلمۂ طیب، عشق نامہ اور حکمۃ الاسرار وغیرہ۔

متذکرہ بالا تصانیف میں صرف چند سے اردو دنیا آشنا تھی، باقی تصانیف کو منظر عام پر لانے میں ڈاکٹر حسینی شاہد کی سعی و جستجو کو بڑا دخل ہے۔ ان تصانیف کا موضوع بحث زیادہ تر تصوف ہے۔ مصنف " شاہ امین الدین علی اعلیٰ " نے اپنی تصنیف میں اس خانوادہ کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیجاپور میں طریق قادریہ کا رواج تھا۔ لیکن چشتیہ طریقہ کو مقبول بنانے والے میراں جی، جانم، اور شاہ امین الدین علی اعلیٰ تھے۔ جانم نے تصوف اور سلوک کی تفہیم کے لئے ویدانت کی اصطلاحیں، دیومالا کی بعض تلمیحیں اور علامتیں بھی استعمال کی تھیں۔ حضرت امین کے تعلق سے ڈاکٹر حسینی شاہد لکھتے ہیں :

"حضرت امینؔ نے اس جانب ایک اور قدم اٹھایا اور اپنے تصوف کو اس قدر وسعت بخشی کہ افیاد بھی ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔
اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ "سکینت محل" کی تانوں اور "برہان صوفیہ" کی "تلاوت الوجود" نے بیجاپور کی ذہنی تربیت میں برابر کا حصہ لیا" ۔ (ص ۳۱)

حضرت امینؔ کا تصوف "پانچ عناصر اور پچیس گن" کے نام سے مشہور ہے۔ ورنہ عموماً صوفیاء چار عناصر' آب' آتش' خاک' بادی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ "خالی یا ہوا" کے عنصر کا اضافہ شاہ امینؔ نے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ جانمؔ کے یہاں اس کا سرسری ذکر پایا جاتا ہے۔ جسے جانمؔ "ہوا" سمجھتے ہیں وہی امینؔ کے یہاں "خالی" ہے۔ شاہ امینؔ کی اس اصطلاح سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ ہندو فلسفے سے متاثر تھے۔ لکھتے ہیں کہ اس عنصر کو ہندو مفکرین نے "آکاش" کا نام دیا ہے۔ آگے ڈاکٹر صاحب تحریر کرتے ہیں کہ حضرت امینؔ نے اپنے رسائل نظم و نثر میں ان اصطلاحوں کے علاوہ جو ان کے والد جانمؔ نے رائج کی تھیں' بعض ایسی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں جو خود ان کی وضع کی ہوئی ہیں۔

شاہ امینؔ اپنی غزلوں میں تصوف کے اسرار و رموز سے واقف کراتے ہیں۔ چند غزلوں سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے فنی نقطۂ نظر سے بے پروائی کا اظہار کیا ہے۔ اس کا سبب بس یہی ہے کہ ان کے یہاں موضوع کی اہمیت زیادہ تھی۔ اس لئے زبان اور طرزِ ادا کو ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔ ان کی ایک غزل جس میں "مسائل تصوف" بیان کئے گئے ہیں۔ نیچے درج کی جاتی ہے۔

دیکھا کہ میں تو ایک ہوں اور سب بھکت سے مج منے ۔۔۔ اظہار ہوئے معشوق سوں تو آکے اس لٹ پٹ ہوا
جب ایک تھیں دوجا ہوا پوجا ہوا اس حسن کا ۔۔۔ تو بل احد احد ہوا بندا اپنا تو گھٹ ہوا
جن کوئی پایا بھید یو پورا ہوا وہ جگ منے! ۔۔۔ عالم کہتے ہیں سب اے امیںؔ اس مرد کو اوچٹ ہوا

[illegible] جیلانی

قطب شاہی دور کے چند تعمیری کارنامے

قطب شاہی دور اپنے تعمیری کاموں کے باعث ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس دور میں تعمیری کاموں کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ سب سے زیادہ کام ابراہیم قلی قطب شاہ اور اس کے فرزند اکبر محمد قلی قطب شاہ کے دور حکومت میں ہوا۔ اس مختصر سے مضمون میں ہم اپنی توجہ صرف چند ایسے مخصوص تعمیری کارناموں کی حد تک محدود رکھیں گے جن کی افادیت یا شہرت آج بھی باقی ہے۔

تاریخ دکن کے طلبا جانتے ہیں کہ ابراہیم قلی قطب شاہ کا دور آپسی خانہ جنگیوں کا دور تھا۔ نئی نئی سازشوں، بغاوتوں اور دکنی ریاستوں کی آپسی رقابتوں کے باعث رفاہ عام کے کاموں کی جانب متوجہ ہونا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا مگر ابراہیم قلی قطب شاہ نے اپنی فراست اور دور اندیشی سے کام لے کر اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کو نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ اس کے ساتھ ہی ابراہیم قلی قطب شاہ کو اپنے کسی کارنامے کو اپنے ہی نام سے موسوم کرنے کی بھی خواہش تھی۔ ابتدا میں اس نے اس خواہش کو اور دل پر ظاہر نہ ہونے دیا۔ اس کا پہلا کارنامہ خود اس کے نام سے موسوم ہونے کی بجائے کسی اور کے نام سے موسوم ہو گیا۔ وہ کارنامہ تالاب حسین ساگر کی تعمیر ہے۔ اس تعمیر کا نگراں حسین خان نامی شخص تھا۔ تعمیر مکمل ہونے سے پہلے اور بادشاہ کے اس تالاب کو کوئی نام دینے سے پہلے ہی نگراں کے نام سے یہ تالاب مشہور ہو گیا۔ اس ذخیرۂ آب کو پُر کرنے والا نالہ درگاہ حسین شاہ ولیؒ کے قریب سے لایا گیا تھا۔ اگرچہ حسین ساگر ابتداءً ایک افادی تعمیر تھی لیکن اب صرف شہر کی خوشنمائی کا ضامن ہو کر رہ گئی ہے۔

چونکہ ابراہیم قلی قطب شاہ کے نزدیک اپنے نام سے زیادہ اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کی اہمیت تھی اس نے نام تبدیل کرنا روا نہ رکھا مگر خواہش کی تکمیل کے خیال سے اس تالاب سے پندرہ میل دور ایک اور تالاب کا کام شروع کیا گیا اور وہ بھی اس سے وسیع پیمانے پر۔ ستم ظریفی دیکھئے یہاں بھی وہی صورت پیش آئی یہاں کا نگرانِ تعمیر شاہ میر خان یا شاہ میر بیگ تھا۔ تعمیر کے لئے اکٹھا کئے ہوئے کاریگر اور مزدوروں کے پڑاؤ کا نام شاہ میر پیٹ پڑ گیا۔ اور تالاب بھی اسی نام سے مشہور ہونے لگا۔ حال حال تک اس تالاب کے تحت (۹) مواضعات کے اراضیات سیراب ہوا کرتے تھے لیکن بھلا ہو آج کل کے انجینئروں کا کہ تعمیر کی قدامت کے پیش نظر اور تالاب کے تحفظ کی خاطر اس کی چادر نیچے کر دی گئی جس سے ذخیرۂ آب کی گنجائش میں کمی واقع ہوئی۔ یہ تو ہوا ہی تھا کہ سنہ ۱۹۶۲ء میں کثرت باراں کی وجہ سے پہلے طوم کے قریب شگاف آ گیا اور تالاب کی بقا خود خطرے میں پڑ گئی۔ اس شگاف کو بند کرتے ہوئے اس کی گنجائش اور بھی کم کر دی گئی۔ اس طرح ابراہیم قلی قطب شاہ کے دور میں دو افادیت سے پُر تعمیراتی کارنامے تو انجام پا گئے لیکن بادشاہ کی دلی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ اس خواہش کی تکمیل کی خاطر اب ابراہیم قلی قطب شاہ ایک منظم فکر تیار کیا اور گولکنڈہ سے تقریباً ۲۵ میل دور پہلے ایک آبادی کی بنیاد رکھی اور اس کا نام ابراہیم پٹن رکھا۔ اور پھر وہاں اوپر بیان کئے ہوئے دونوں تالابوں سے بڑا تالاب تعمیر کروایا۔ ابراہیم پٹن کے تالاب کی وسعت کے لحاظ سے

وہاں پانی سربراہ کرنے والا ذریعہ نہیں تھا۔ یعنی (CATCH MENT AREA) کی کمی تھی اس کمی کی تکمیل کے لئے جیلی نکلے سے ایک سنگ بستہ نالہ تعمیر کیا گیا جو اس تالاب کو پُر کرتا تھا۔ اب یہ نالہ ٹوٹ گیا ہے لیکن اس کے آثار اب بھی شمس آباد اور چیلی ملڑی وغیرہ مواضعات کے قریب ملتے ہیں۔ اس تالاب کے تحت ۱۳ مواضعات کی اراضیات سیراب ہوا کرتی تھیں یوں تو اب بھی اس تالاب کے تحت وسیع رقبہ سیراب ہوتا ہے لیکن یہ تالاب بھی دو تین مرتبہ شکست ہوا اور نتیجہ کے طور پر اس کی وسعت بھی کم ہو کر رہ گئی ہے۔

اب ہم ابراہیم قلی قطب شاہ کے ایک اور تعمیری کارنامے کا ذکر کریں گے وہ ہے "پرانا پل" یا "پلِ قدیم" اس پل کا تاریخی نام "صراط المستقیم" تھا۔ اس نام سے آغازِ تعمیر کی تاریخ بھی نکلتی ہے یعنی سنہ ۹۸۱ھ اور اس تعمیر کی تکمیل سنہ ۹۸۶ھ میں ہوئی اور "گزرگہ ما" سے اس کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔ اس پل کی تعمیر کی اصل وجہ یہ تھی کہ شہر گولکنڈہ کی آبادی بڑھتی جا رہی تھی اور مقامی طور پر توسیع شہر کی گنجائش کم تھی اس کے ماسوا پینے کے پانی کی قلت بھی محسوس کی جا رہی تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ موسیٰ ندی کے اس پار ریشوں اور خود بادشاہ کے محل و باغ تعمیر ہوئے تھے ان میں قابل ذکر "محل طرب" تھا۔ یہ محل تقریباً وہی مقام پر تھا جہاں اب شہرۂ آفاق قصر فلک نما موجود ہے۔ بارش کے زمانے میں ندی پار کرنا دشوار ہوتا تھا اور خصوصاً اس وقت جبکہ ندی بھرپور ہو۔ ان ہی چیزوں کے پیش نظر یہ تعمیری کارنامہ انجام پایا اور آج بھی قائم ہے۔ یہاں اس روایت کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا جو آج بھی زبان زد عام ہے وہ یہ کہ نوجوان شہزادہ محمد قلی قطب شاہ شکار کے شوق میں گھومتے ہوئے چیچلم کی رقاصہ بھاگ متی کے آتش افروز حسن کا شکار ہوا اور اس سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا ایک مرتبہ کثرت بارش کی وجہ ندی بھرپور چل رہی تھی شہزادے کو خیال ہوا کہ اس کی محبوبہ کا مسکن غرقاب ہو جائے گا وہ بلا خطر گھوڑے پر سوار ندی پار کر گیا بادشاہ نے اس خبر سے متاثر ہو کر اس پل کی تعمیر کا حکم دیا۔ مورخین اس روایت کو اس لئے غلط ٹھیراتے ہیں کہ اس پل کی تکمیل کے دو سال بعد یعنی ۹۸۸ھ میں ابراہیم قلی قطب شاہ کا انتقال ہوا اور محمد قلی قطب شاہ کی اس وقت عمر ۱۴، ۱۵ سال کی تھی گویا تعمیر کے آغاز کے وقت شہزادہ کی عمر ۸ سال سے زائد نہ تھی لیکن روایتوں کے پیچھے بھی کچھ ہوتا ہے ممکن ہے کہ شہزادے کی عمر کا صحیح تعین نہ ہوا ہو۔

شہر حیدرآباد کے تاریخی اور معاشرتی جغرافیہ میں "چارمینار" کو جو ممتاز مقام حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آصفی سکوں اور آصفی دور کے ٹکٹ ٹپہ پر چارمینار کا نشان ہونے سے اس عمارت سے دنیا کا ہر گوشہ آشنا ہو گیا۔ چارمینار کی تعمیر سے متعلق مختلف روایات زبان زد عام ہیں ایک روایت تو یہ ہے کہ عمارت اس مقام پر تعمیر کرائی گئی جہاں محمد قلی قطب شاہ نے پہلی مرتبہ اپنی محبوبہ چیچلم کی رقاصہ بھاگ متی کو دیکھا تھا اور گرفتار محبت ہوا تھا اور اس عمارت کی تعمیر کا مقصد علیحدہ اور لیلیٰ کی مستقل یادگار قائم کرنی تھی دوسری روایت یہ ہے کہ شہر کی بنیاد رکھنے کے چند ہی دن بعد سخت وبا پھیلی اور کسی شخص نے اس مقام پر حضرت امام حسینؓ کے نام کا تعزیہ ایستادہ کیا تھا۔ وباء کا غلبہ ختم ہوا تو اس مقام پر یادگار قائم کرنے پر بادشاہ کو آمادہ کیا گیا۔ یہ روایت مستند معلوم نہیں ہوتی کیونکہ وباء کا سنہ غرہ محرم سنہ ۱۰۰۰ھ سے پہلے کا ہے اور خود شہر کی بنیاد سنہ ۱۰۰۰ھ میں رکھی گئی۔ یہی وجہ اگلی روایت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کہ اس میں چیچلم کی رقاصہ جو تھی جیسا کہ

حیدر محل بنی بادشاہ کی محبوبہ تھی اور نگاہ اولین کی یادگار قائم کرنا مزاج شاہی کے مطابق ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ روایت ہی درست ہو لیکن قیاس کچھ اور بھی کہتا ہے۔ شہر کی تعمیر کے منصوبے میں چارمینار کے اطراف چار بازار قائم کرنا بھی شامل تھا اور فن تعمیر کے لحاظ سے بازاروں کے رُخ سے ایک ہی منظر کا نظر آنا اس دور کے ذوقِ تعمیر کی جھلک دکھلاتا ہے۔ عین وسطِ شہر میں چارمینار کا سنگِ بنیاد رکھوایا جانا قرین قیاس ہے۔

اس عمارت کی بلندی ۱۸۹ فٹ ہے۔ اس کی تعمیر پہ دو لاکھ باون ہزار ہن یا تین لاکھ ہن صرف ہونا بیان کیا جاتا ہے روپیوں کی شکل میں دس تا بارہ لاکھ کا صرفہ ثابت ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ بجلی گرنے سے اس کا جنوب مغربی جانب کا مینار منہدم ہوگیا تھا اور جس زمانے میں مغل سلطنت کا نمائندہ بہادر خاں مقرر ہوا تو اس نے ساٹھ ہزار روپے کے صرفہ سے اس مینار کی از سرِ نو تعمیر کروائی۔ آصف جاہ ثالث کے زمانے میں پوری عمارت کی استرکاری ایک لاکھ روپے کے صرفہ سے ہوئی اور سنہ ۱۸۸۴ء میں لارڈ کرزن کی آمد کے موقع پر اس کے اطراف آہنی کٹہرا تعمیر ہوا اور سنہ ۱۸۸۹ء میں اس کے چاروں رُخ پر گھڑیاں نصب ہوئیں۔

قطب شاہی دور کے تعمیری کارناموں میں مکہ مسجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ شہر حیدرآباد کی سب سے بڑی اور شاندار مسجد ہے اس کا طول ۲۲۵ فٹ عرض ۱۸۰ فٹ اور بلندی ۷۵ فٹ ہے بلکہ مسجد کی تعمیر سے متعلق ایک روایت بیان کی جاتی ہے: چارمینار کی تعمیر جب شروع ہوئی تو حکام سلطنت کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔ انھوں نے دبی زبان میں خانگی محفلوں میں یہ خیال ظاہر کیا کہ سرکاری خزانے کی دولت ایک غیر افادی عمارت کی تعمیر پہ صرف کرنا کوئی دانشمندی نہیں۔ اُڑتے اُڑتے یہ بات بادشاہ تک پہونچی اور بادشاہ نے بھی اس بات پر غور کیا اور اس کی حقیقت آشنا طبیعت نے اس بات کی صحت کو تسلیم کر لیا اور فوراً اس نے اس عمارت پہ خرچ کی جانے والی رقم سے کئی گنا زیادہ رقم کے موازنہ سے ایک مسجد تعمیر کرنے کا حکم دیدیا اور اس مسجد کو "بیت العتیق" کا نام سنہ ۱۰۲۲ھ میں دیا گیا اور سنگِ بنیاد خود محمد قلی قطب شاہ کے ہاتھوں رکھا گیا۔ یہ مسجد قطب شاہی دور میں پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکی اگرچہ محمد قلی قطب شاہ اور اس کے بعد کے دو بادشاہوں کے دور میں بھی تعمیری کام جاری رہا۔ مسجد کی تکمیل اورنگ زیب کے ہاتھوں ہوئی اور اسی نے "بیت العتیق" کی جگہ اس کا نام "مکہ مسجد" تجویز کیا اور یہ آج بھی اسی نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد سے متعلق معروف فرانسیسی سیاح موسیو ٹیورنیر نے لکھا تھا کہ:—

"پچاس برس ہوئے جب سے یہاں ایک عظیم الشان مسجد بن رہی ہے اگر پوری ہوگئی تو یقیناً تمام ہندوستان کی مسجدوں سے بڑی اور تمام ایشیاء کی عمارتوں سے بہتر ہوگی۔"

○

دکن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ انگوٹھی کوں حرمت نگینہ سوں لگ

دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں (وجہی)

انیس قیوم فیاض

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری

محمد قلی قطب شاہ نے اپنی شاعری کو قطب مینار دکن کے خوبصورت لفظوں سے تعمیر کیا تھا اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ایک ایک شعر آج بھی ارباب نظر کی آنکھوں کا کاجل ہے۔ اس کے دل کا ایک گوشہ دکن اور دکن والوں کی محبت سے ہمیشہ معمور رہتا تھا۔ وہ ایک سچا وطن پرست اور ہر دلعزیز بادشاہ تھا۔ دکن کی موجودہ تہذیب کا وہ بانی سمجھا جاتا ہے۔ شہر حیدرآباد اسی کا بسایا ہوا ہے۔ اگرچہ کہ نہایت کم عمری میں وہ گولکنڈہ کی سلطنت کا بادشاہ بنا لیکن اس نے وہ تمام کارہائے نمایاں انجام دیئے جو ایک مدبر بادشاہ کو کرنا چاہیئے تھے۔ شعر و شاعری سے جس قدر دلچسپی رکھتا تھا، موسیقی کا بھی اتنا ہی دلدادہ تھا۔ حافظ شیرازی سے متاثر تھا۔ دیوان حافظ کا وہ حافظ بھی تھا اور مترجم بھی۔

عشق محمد قلی کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت ہے اور تصوف کی چاشنی حافظ کے مطالعہ ہی سے پیدا ہوگئی تھی۔ خاقانی کو وہ [illegible] شاید اسی لیے اپنے شعر کو خاقانی کا شعر قرار دیتا ہے ؎

نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا ہے تجکوں　　　معانی شعر تیرا ہے کہ یا ہے شعر خاقانی

محمد قلی قطب شاہ کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ قدرت نے اس کو شاعری کا ایسا عجیب و غریب ملکہ عطا کیا تھا جو شاید چند ہی شاعروں کے حصہ میں آیا ہوگا۔ اس نے دکنی کے علاوہ فارسی اور تلنگی میں بھی شعر کہے ہیں۔ اس کا ضخیم کلیات پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ کوئی صنف سخن ایسا نہیں کوئی موضوع ایسا نہیں جس پر اس نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔

مستقل موضوعات پر اس نے سیکڑوں دلچسپ اور بلند پایہ نظمیں کہیں۔ اس کے ضخیم کلیات میں کئی تخلص ملتے ہیں جن میں قطب، معانی، قطب شاہ کی اکثریت ہے۔ وہ بچپن ہی سے آزاد اور عاشق مزاج تھا۔ ایک جگہ کہتا ہے ؎

عالم مجھے تعلیم کریں علم و ہنر کا　　　لکھے ہیں ازل تے ہمنا عشق قرارا

وہ کہتا ہے شعر گوئی میں جو کچھ اس نے ترقی کی محض اپنے محبوب کی وجہ سے ؎

تمہارے وصف کہنے تے ہوا ہوں شعر فرزانہ　　　او شعراں کو عاجز ہیں سب شاعراں ہم عہد ہم درد

وہ زندگی کو عشق و نشاط، راگ رنگ میں گزارنے کا قائل تھا۔ زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے ہی کو وہ عبادت سمجھتا تھا۔ شاعری اس کی پیشہ نہیں، شاعری اس سے ہوگئی۔ چاہت ہو کہ شاعری دونوں ہی اس کی پرکشش شخصیت کے بے ساختہ مظہر ہیں۔ عشقیہ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی سادگی و شیرینی ہے۔ اور یہ دونوں ہی خصوصیتیں محمد قلی کے کلام میں افزوں ملتی ہیں۔

معانی کے باتاں تھے جھڑتا نمک جسے چاکھے کہے ہے نمک سوں شکر

وہ خدا کی سرفرازی کی ہوئی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا جاتا ہے۔ اور طرح طرح سے شکرانہ بھی بجالاتا ہے ؎

یک جیب سوں کرتا ہوں تجھے شکر ہزاراں بھی شکر کرن منج کوں تو توفیق نوا بخش

وہ نبیؐ کا شیدائی بھی ہے اور علیؓ کا عقیدت مند بھی۔ چنانچہ ایک نعت میں کہتا ہے ؎

چندر خواص ہو آیا گگن سمدر بھیتر دھایا نبیؐ پر وار نے لیایا ڈھلک موتیاں شفق سیتی

اور حضرت علیؓ کی شان میں کہتا ہے ؎

راکھو تمہاری چھاؤں تل دائم خوشیاں سوں قطب کوں قطب ہور فرزند قطب کے بندہ سے تمہارے ہیں علیؓ

قلی قطب شاہ نے چار سو سال قبل جو باتیں کہی ہیں اس میں اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں جھلکتی ہیں اس نے اپنی نظموں میں اپنے عہد کے تہذیب و تمدن کے مختلف نمونے پیش کیے ہیں اس طرح وہ اپنے عہد کا مورخ قرار پاتا ہے۔ اپنے ایک محل کی تفصیلات میں یوں کہتا ہے ؎

خداداد محل کوں محمدؐ سنوارے تو اس میں جنت کے نگاراں نگارے

بلندی محل کا ہے آسمان جیسا سورج چاند تارے سو اس تھے نگارے

ڈاکٹر زینت ساجدہ کے بیان کے بموجب: وہ ایک پیدائشی فن کار ہے اور اس کی طبیعت کی یہ فنکاری کئی کئی ڈھنگ سے اپنا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس کا ذوق اس قدر شائستہ اور آراستہ تھا کہ اس کے اظہار کے لیے اس نے شاعری اور تعمیر کاری دونوں کو چنا۔

بلاشبہ اس کی نظموں کے حسن، تناسب، الفاظ کے چناؤ اور ترکیبوں کی مناسبت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک تربیت یافتہ تخلیق کار ہے۔ موضوع کے ساتھ وہ اسی محنت اور توجہ سے انصاف کرتا ہے جس طرح کوئی معمار عمارت بناتے وقت طاق و محراب کی موزونیت کا خیال رکھے۔

عام طور پر شعراء فراق کی شاعری کرتے ہیں لیکن اس نے وصال کی شاعری کی، اس نے جذبات کی تسکین کے لیے شعر کہے۔ سرمستی اور سرشاری اس کی ہر بات سے ٹپکتی ہے۔ وہ سبزہ و گل، روشنی اور پانی کا رسیا تھا اور عیدوں، تہواروں کو خاص اہتمام سے منانے کا عادی۔ اس طرح اس نے اپنی مملکتِ تلنگ میں بارہ تقریبات مقرر کر دی تھیں۔ بسنت اور بارش کی آمد کو اس نے بڑی اہمیت دی ہے۔ یہ دراصل عوام کی عیدیں کہلاتی تھیں۔ ان تمام عیدوں پر اس کی سیکڑوں نظمیں ملتی ہیں ؎

بسنت کھیلیں عشق کی آ پیارا تمہیں ہے چاند میں ہوں جوں ستارا

بسنت کھیلیں ہمن ہور ساجنا یوں کہ آسمان رنگ شفق پایا ہے سارا

نبیؐ صدقے بسنت کھیلیا قطب شاہ رنگیلا اور ہیا تر ؤک سارا

سراپا نگاری میں اسے حد درجہ کمال حاصل تھا۔ اپنی شاعری میں وہ نئی نئی تشبیہیں استعمال کر کے اپنی قوتِ مشاہدہ کا حیرت انگیز طور پر مظاہرہ کرتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نین نیناں سہیلیاں کے سوپر اسیام بادام ٹھڈی کا ہے سیب داستاں جو رنگ کہ جا دو نیاں جا بیاں کی

محبوب کی آنکھوں کو بادام سے اور ٹھڈی کو جا ولی کے مغز سے تشبیہ شاید ہی کسی شاعر نے دی ہوگی اور ایک جگہ کہتا ہے ؎

بنڈ جھنبلک کے پاتاں منے گل لال جوں پتاں منے　　موتی جوں باتاں منے، جن سے سمد بکتا اہیں

اکثر باکمالوں کی طرح وہ بھی اپنے کلام کی قدر و منزلت کا آرزو مند ہے چونکہ وہ خود ایک مطلق العنان بادشاہ تھا اس لیے اپنی قدر و منزلت یعنی زر و جواہر کی جگہ کچھ تعریف و تنقید مانگتا ہے، ایسے خریداروں کی تمنا کرتا ہے اور کہتا ہے۔ دو ٹکڑے موتیوں کے عوض میرا ایک دردانہ زیادہ قیمتی ہے —

معانی کے پرکھنے میں ہنسا اسکیا کام کرتے ہیں　　گویا دو ٹکڑوں موتی مو یک دُردانہ بات

الغرض کلیاتِ معانی میں گہرائی، گیرائی جلال و جمال، فصاحت و بلاغت، شیرینی و ترنم سب کچھ ملتا ہے۔ وہ دکنی اُردو کا پہلا شاعر تھا جس نے اپنی شاعری میں ہندوستانیت یا ہندوستانی ماحول کی کیفیت کو مکمل پیش کیا ہے۔

بشیر النساء بیگم بشیر

یادِ صنادید

دکن کی سرزمیں پر جب قطب شاہی حکومت تھی
ہماری یہ ریاست صفحۂ گیتی پہ جنت تھی
اُمورِ سلطنت میں کارفرما نیک نیت تھی
رعایا کے دلوں پر حکمراں شخصی حکومت تھی
نہ ہندو تھا، نہ مسلم تھا وفاداروں کی بستی تھی
دلوں میں تھی رواداری، رگوں میں شہ پرستی تھی
وہ شاہِ گولکنڈہ یعنی پہلا حیدرآباد کا
کیا تازہ یہاں جس نے فن مانی و بہزاد کا
چمک اُٹھی تھی قسمت شاعروں کی باکمالوں کی
زمیں پر بس گئی تھی ایک بستی خوش مقالوں کی
سنہری دور تھا، رنگیں فضا تھی، عام خوش حالی
اسی ماحول نے دکنی تمدن کی بنا ڈالی
رہا ہر دور میں ضرب المثل جاہ و جلال اس کا
مسلّم ساری دنیا میں ہے تعمیری کمال اس کا

[illegible]

غلام حیدر

حیدرآباد کے بڑے لوگ سلسلہ نمبر ۱

مرزا محمد بیگ

گزشتہ اشاعت میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اس اشاعت سے "حیدرآباد کے بڑے لوگ" کے عنوان سے سوانحی خاکے شائع ہوا کریں گے۔ یوں تو یہ عنوان کچھ عجیب سا لگتا ہے کیونکہ بڑے پن کا یقین کس طرح ہونا چاہیے، ایک متفقہ چیز نہیں ہے۔ کہیں دولت لوگوں کو بڑا بنا دیتی ہے کہیں عہدہ اور کہیں پدرم سلطان بود کے باعث اس منصب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

ہم اس سلسلے میں ایسی ہستیوں کو منتخب کر رہے ہیں جنھوں نے نام سے زیادہ کام چھوڑا ہے۔

مرزا محمد بیگ صاحب بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ ہمیں مسرت ہے کہ مرزا صاحب کی شخصیت پر مولوی غلام حیدر صاحب سابق صدر نشین آندھرا پردیش پبلک سروس کمیشن نے ہماری استدعا کو شرف قبولیت بخشا ہے۔ موصوف کی تحریر سے متعلق ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ع مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا (و۔ ق)

ہندوستان کے برطانوی تسلط سے آزاد ہونے سے پہلے کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر کے جو فرائض اور ذمہ داریاں تھیں وہ اب بھی برقرار ہیں لیکن ان کے ساتھ کئی اور فرائض آج اس عہدہ سے متعلق ہیں۔ ملک کے نظم و نسق کے شیرازہ میں جو کلیدی اہمیت اس عہدہ سے متعلق تھی وہ اب بھی بدستور باقی ہے مگر فرق یہ ہے کہ پہلے کلکٹر ضلع کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اب خدمت گذار اعلیٰ ہے۔ دیہی افلاس کے خاتمہ کی تدابیر اس کے ذمہ ہیں اور حکومت کی طرف سے مالیہ کی فراہمی کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً ہدایات دی جاتی ہے اور اس کی رہبری کی جاتی ہے۔ ریاست حیدرآباد کے نظم و نسق کا ڈھانچہ بھی بڑی حد تک برطانوی خطوط پر قائم تھا۔ یہاں پر ضلع کا حاکم اول تعلقدار کہلاتا تھا غالباً آج بہت کم لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ اب سے چالیس پینتالیس سال قبل حیدرآباد کے ایک تعلقدار نے اپنے طور پر دیہی خوش حالی اور معاشی ترقی کے لئے وہ سب کام شروع کئے تھے جو آزادی کے بعد کمیونٹی پراجیکٹس بلاک ڈیولپمنٹ اور پنچایت راج سے متعلق رہے یا ہیں۔ اس تعلقدار کا نام مرزا محمد بیگ تھا جن کا کراچی میں چند سال قبل انتقال ہوا۔

مرزا صاحب حیدرآباد کے ایک خوشحال متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے ہم بزرگوار خسر مرزا عبدالرحیم بیگ صاحب مرحوم محکمہ جمارک کے معتمد تھے۔ ابتدائی گھریلو تعلیم و تربیت کے بعد علوم مشرقیہ کے مدرسہ دارالعلوم سے منشی فاضل کی تکمیل کے بعد تقریباً بیس سال کی عمر میں محکمہ مال میں تحصیلداری کی خدمت پر مامور ہوئے اور ضلع عادل آباد کے ایک چھوٹے صحرائی تعلقہ پر انکی تعیناتی عمل میں آئی۔ آصف آباد جو اُس

تعلقہ کا مستقر ہے اور کچھ عرصہ تک ضلع کا مستقر بھی رہا ہے اس زمانے میں ایک بالکل چھوٹا موضع تھا جسے جیگاؤں کہتے تھے ۔ یہ تحصیل کا مستقر قرار دیا گیا تھا ۔ مستقر ہے اور اس کے اطراف ساری چھوٹی بستیاں صحرائی اقوام کی تھیں ۔ ایک خوشحال گھرانے کے نوجوان کے لئے جس کی زندگی اس وقت تک بلدہ حیدرآباد میں گذری ہو یہ دیہات بالکل نئی تھی ۔ ہو سکتا تھا کہ اس وقت کے دوسرے نوجوانوں کی طرح وہ بھی یہاں سے بھاگ نکلنے کی سوچتے ۔ لیکن انھوں نے اپنے تبادلہ کے لئے اپنے اعزہ کے رسوخ کو کام میں لانا گوارا نہیں کیا ۔ نہایت تندہی سے اپنے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اور ساتھ ہی ساتھ دیہی زندگی کے مختلف مسائل کا مطالعہ شروع کر دیا اور وہاں کی پسماندہ حالات کو دور کرنے کی تدبیریں سوچتے رہے ۔ کچھ عرصہ کے بعد بعض لوگوں کی خواہش کے انہیں حیدرآباد بلا لیا گیا ۔ پہلے تالاب حمایت ساگر کی تعمیر کی وجہ جو مواضعات غرقاب ہوئے تھے وہاں کے مکانات اور اراضیات کے معاوضہ کی تشخیص و تقسیم کا کام ان سے متعلق رہا ۔ یہ کام انھوں نے اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ تالاب پالیر دوبیرا اور پوچارم اور پھر نظام ساگر سے متعلق معاوضہ اور بازآبادکاری کے کام اُن کے سپرد ہوئے اسی کام کی انجام دہی میں دیہات کے رہنے والوں اور خصوصاً مزدور پیشہ افراد کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بالکل قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور بازآبادکاری کے سلسلہ میں دیہات سدھار کے وہ تمام کام شروع کر دیئے جن کا آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے احیاء کیا تمام ریاستوں میں آغاز ہوا مرزا صاحب کے پاس نہ وہ مالی وسائل تھے جو آج مرکزی یا صوبائی حکومتوں کی طرف سے دی جاتی ہیں اور نہ بیرونی FOUNDATIONS کی امداد ۔ ان کے پاس صرف بے لوث خدمت کا جذبہ تھا ۔ ان کے جوہر اور بھی کھلے جب انہیں نظام آباد کا اول تعلقدار مقرر کیا گیا جب وہ تعلقدار ہے نظام ساگر کی تعمیر ختم ہو چکی تھی اور ڈیولپمنٹ کے مسائل در پیش تھے ۔ نظام ساگر کے ڈیولپمنٹ کے مسائل پیچیدہ اُلجھے ہوئے اور دشوار تھے ۔ آبپاشی کے تحت آنے والی اراضیات غیر ہموار ہونے کے علاوہ اپنی اختیار سے بھی تری کاشت کے لئے کچھ موزوں نہیں سمجھے جاتے تھے اس چھوٹے ذرائع آبپاشی کے تحت جو تری کاشت ہوتی بھی تھی تو بالکل قدیم طریقوں پر ۔ مقامی کاشتکار رعیت کے کاشتکار تھے وہ نہ تو وسیع پیمانے پر تری کاشت کرنے کی سکت رکھتے تھے اور نہ صلاحیت اس کے ماسوا خود اس علاقے کی آبادی بھی کم تھی ۔ ڈیڑھ دو لاکھ ایکڑ اراضی کو خشکی سے تری میں منتقل کرنے کے لئے حکومت وقت نے متعدد سہولتیں عطا کی تھیں اس کے باوجود ڈیولپمنٹ ہوتا نظر نہ آرہا تھا ۔ ایسے وقت میں مرزا صاحب کی دور رس نگاہیں گنٹور ، کرشنا اور گوداوری کے کاشتکاروں پر پڑیں جو پالیر پراجکٹ پر کام کرتے وقت مرزا صاحب نے ان لوگوں کے طریق کاشت اور محنت کو دیکھا تھا ۔ انھوں نے طے کیا کہ ان علاقوں کے لوگ یہاں بسائے جائیں تو نہ صرف ڈیولپمنٹ کی رفتار میں تیزی آجائے گی بلکہ مقامی کاشتکاروں کو بھی ترغیب ہو گی ۔ چنانچہ اس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اضلاع گنٹور و کرشنا کے کاشتکاروں کو یہاں لاکر بسانے کا کام آغاز کیا گیا ۔ ان نو آبادکاروں کو سب سے پہلے مستقر نظام آباد سے ۲ میل فاصلہ پر نہر کے کنارے بسایا گیا ۔ اور اس نو آبادی کا نام مرید پور رکھا گیا ۔ آج یہ موضع ایک شہر کی صورت اختیار کر گیا ہے اور مرید پور کا نام بگڑ کر مردی پور ہو گیا ہے ۔ تاڑ کے پتوں اور پیال کے گھاس سے بنائی ہوئی کرسیوں کی جگہ آج بڑے بڑے جدید وضع کے بنگلے کھڑے ہیں ۔ ہائی اسکول ، بنک ، چرچ اور مندر تعمیر ہو گئے ہیں ۔ ابتدائی کوشش کی کامیابی کے بعد ایسی کئی نو آبادیات وجود میں آئیں ۔ مثال کے طور پر محمد نگر ، اکبر نگر وغیرہ ایسی بستیاں ہیں جو مرزا صاحب کے ہاتھوں آباد ہوئیں اور ان آبادیوں کی اکثریت آج کل کہ یہاں میں آندھرائی ہے ۔ آج اگر نظام آباد کے تعلقات ۔ بودھن ، بانسواڑہ اور نظام آباد کی آبادی کا تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ تقریباً ۱۵ فی صد آبادی آندھرائی علاقے سے آئی ہوئی ہے اور یہ تبادلہ آبادی اس وقت ہوا تھا جب کہ آندھرا پردیش کے وجود میں آنے کا کسی نے خواب بھی نہ دیکھا تھا ۔

اس زمانے میں انھوں نے جس طرح تعلقداری کے فرائض انجام دیئے اس کی تقلید آج جو کلکٹر کریگا وہ نمونہ ہوگا WELFARE STATE

سے ماڈل کلکٹر تھا۔ مرزا صاحب نے جس زمانے میں دیہات سدھار کے پروگرام بنانے اور ان کو روبہ عمل لانا شروع کیا تو ان کے پاس نہ وہ مخصوص عملہ تھا جو آج کل مامور کیا جاتا ہے نہ وافر رقوم۔ ان کا بجٹ محدود تھا۔ ان کے پاس نہ P.R.O تھا کہ آج کل کی طرح ہر چھوٹے کام کی تشہیر کرے، نہ معلومات عامہ کا ماہانہ رسالہ تھا اور نہ ریڈیو یا دور درشن تھیں۔ اشتہار بازی پسند نہ تھی۔ جس زمانے میں مرزا صاحب ضلع کے تقریباً نصف مواضعات میں دیہات سدھار کے کام کرنے میں مصروف تھے اس سے کچھ عرصہ قبل پنجاب میں مسٹر برنیا کے موضع گرگاؤں کی اصلاح کے چرچے تھے ایسے ایک دو چیدہ چیدہ کام ہندوستان میں ضرور ہوتا ہے لیکن خاصے بڑے پیمانہ پر منظم طور پر زراعت کی ترقی اور دیہی زراعت پیشہ افراد کی زندگی کے ہر پہلو کی اصلاح کا کام جس کلکٹر نے کیا وہ مرزا محمد بیگ تھے۔ وہ پہلے کلکٹر تھے جو ضلع کی حکمرانی کے ساتھ ضلع کی خدمت گذاری کو کلکٹر کے فرائض کا جزو لازم سمجھتے تھے۔ تعلقدار کے گھر پر اس زمانے کے دستور کی طرح شان و شوکت کے سامان نہ تھے لیکن سادگی اور صفائی میں خوش سلیقگی کی جھلک تھی خوش پوشاک تھے۔ عموماً ترکی ٹوپی اور شیروانی پہنتے تھے۔ دورہ اور مخصوص موقعہ پر انگریزی لباس۔ ان کی تعلیم اگرچہ مشرقی طریقہ پر ہوئی تھی لیکن ملازمت کے آخری حصہ میں اپنے طور پر انگریزی کا میں بھی خاص مہارت حاصل کرلی تھی۔ رک رک کے گفتگو کرتے تھے لیکن بات مطلب کی کہتے تھے۔ اخلاق نہایت وسیع۔ چھوٹے اور بڑے دونوں سے اٹھ کر ملتے۔ علاقائی یا مذہبی تعصب ان سے کوسوں دور تھا۔ کم سخن تھے اور منکسر المزاج۔ کثیر العیال تھے۔ بچوں کی تعلیم کا خیال تھا۔ ان کے دو لڑکے حیدرآباد سیول سروس میں منتخب ہو کر حیدرآباد کے سقوط سے پہلے تعلقدار ہو چکے تھے۔ مرزا صاحب سرکاری خدمت سے وظیفہ کے بعد مہاراجہ سرکشن پرشاد کی وفات کے بعد ان کے اسٹیٹ کا کام ان کے سپرد ہوا اور بڑی خوش اسلوبی سے جاگیروں کے برخاست ہونے تک وہاں کا کام کرتے رہے۔ جب ان کے بچے پولیس ایکشن کے بعد کراچی چلے گئے تو وہ بھی وہاں منتقل ہو گئے۔

چار مینار

میر سراج الدین علی خاں

عظمتِ خوابیدہ کے اے پاسباں — گم شدہ منزل کے میر کارواں
تیرے ہر ذرّہ سے عظمت آشکار — تیرے چہرہ سے عیاں عزّ و وقار
تو نے دیکھے کتنے چہروں پر نکھار — لٹتے دیکھی کتنے باغوں کی بہار
اک سراپا گردشِ لیل و نہار — کوئی ہو گویا کہ خوابِ انتظار
جیسے اک تارا اندھیری رات میں — جیسے جگنو موسمِ برسات میں
داستانِ عشق کا اک نقشِ پا — اک مجسّم درد، اک بوئے وفا

تو شکستہ ساز کی آواز ہے
تجھ میں مضمر زندگی کا راز ہے

بادۂ کہن

استادِ کُل حضرت میر شمس الدین محمد فیض کے ارشد تلامذہ میں سدانند جوگی بہاری لال رمزؔ (۱۲۴۰ھ تا ۱۳۲۵ھ) کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے آباد و اجداد دہلوی تھے۔ رمزؔ، قادر الکلام اور صوفی منش شاعر تھے، شہاب جنگ نے زندگی بھر ان کی خبرگیری کی۔ چھیالیس سال کی عمر میں ان کے عیال و اطفال یکایک انتقال کر گئے، اس صدمہ نے رمزؔ کو شہاب جنگ کی ملازمت کے ساتھ دنیا سے بھی قطع تعلق کر گئے استاد و مرشد حضرتِ فیض کا گرویدہ و عقیدت مند بنا دیا۔ فیض کی وفات کے بعد تو وہ اور بھی کھنچ سے گئے اور حالتِ جذب یہاں تک پہنچ گئی کہ برہنگی اور ترکِ دنیا سے رشتہ استوار کر لیا۔ استاد کی یاد میں منعقد ہونے والے سالانہ مشاعرہ میں شرکت کو ہر سال معمول بنا لیا تھا۔ آخر ۱۴ رجب ۱۳۲۵ھ کو عرس حضرت فیض کے سالانہ مشاعرہ میں مزارِ فیض کے پائین طرحی غزل سناتے ہوئے رمزؔ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ مہاراجہ کشن پرشاد کی دیوڑھی کے احاطہ میں دفن کیے گئے۔ کلیاتِ رمزؔ میں ڈاکٹر زورؔ کی تحریر کے مطابق ۷ ہزار سے زیادہ شعر ملتے ہیں۔ رمزؔ کے کلام کا نمائندہ انتخاب ڈاکٹر زورؔ نے ۱۹۴۵ء میں "رمز سخن" کے نام سے شائع کیا ہے۔ رمزؔ کی شاعری اور زبان دانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور کے مقبول سخنور اور فارسی، ہندی زبانوں کے رمز شناس ہی نہیں، دکنی کلچر کی روشن تر علامت بھی تھے۔ (ادارہ)

بے یادِ حق کے ٹل گئے سب میں ہی دن تمام — بس رنج معصیت ہی کے ہوئے تمام رات

انتظاری میں مری عمر گذشتہ سے کٹی — تیرے آنے میں ہوئی دیر تھا کیا باعث

شادی خود نمائی کر ہوئے بد وضع دنیا میں — نمائش دیکھتے ہیں دہر کی خود بدنما ہو کر

حکم حاکم کے سوا آئے نہیں ہم اس جگہ — سمجھ کے لے جاتے ہیں کچھ احوالِ زنداں دیکھ کر

کہیں ہیں جلنیں عشق کی، کہیں پنکھے بھی چلتے ہیں — کہیں دیکھو فردوس میں پیدل نکلتے ہیں

تکرار کیا ہے وجود و شہود میں — بے فائدہ ہے بحث جو علم الیقیں نہیں

ہوس دنیا کے دولت کی کچھ کو مزید آدمی کیسا — نکال اے رمزؔ گھر سے اس بڑی بدذات قحبہ کو

اس جہاں میں ہر جگہ زردار کا اعزاز ہے — پوچھتا ہی کون ہے اس مفلس و نادار کو

ہوئے جو یار و مطلب کے آشنا نکلے — ملے بہت ہے پہ کوئی نہ خیر خواہ ملے

قدم عشق کی رہ میں رکھو مگر — خبردار دیکھو سنبھلتے ہوئے

نہیں رہتا یکساں زمانہ کا رنگ — نہیں دیر اس کو بدلتے ہوئے

مخالف ہوا سے چلے ایک دم — دیئے بجھ گئے سارے جلتے ہوئے

جب بگڑ جائے زمانہ تو بن آئی کیا ہے — ہاں مگر کام فقیروں کی دعا آتی ہے

کرتا ہے جان بوجھ کے انسان دوڑ دھوپ — ہوتا وہی ہے رمزؔ جو مرضی خدا کی ہے

زر دل دے کے کیا مانگو پھر ان سے
بہت شرم آتی ہے تھوڑی رقم ہے

موت کے دن قریب آ پہنچے
شب غفلت کی پر سحر نہ ہوئی

میرے احوال سے واقف ہی زمانہ سارا
کوبکو ہوتے ہیں چرچے مرے افسانے کے

عمر غفلت میں کٹی رمز کدھر ہو سوچو
آ کے مدت ہوئی سامان کرو جانے کے

دنیا کے یہ پنگھٹ پہ تماشے کو نہ جا رمز
کھائے گا کہیں گالیاں دو چار کسی کی

باتیں کچھ اور کرو، اور سنو، اور سناؤ
تذکرے یہ تو ہیں آنے کے کچھ نہ جانے کے

یہ یادگار کلام اپنا چھوڑ جاتے ہیں رمز
نشانی کچھ تو ہو دنیا میں بے نشانوں کی

وہی جا کے پھل پائیں گے آخرت میں
جو تخم عمل بوئیں گے بونے والے

غم عقبیٰ کدھر، دنیا کدھر کی
کدھر فکر اب ادھر کی اور ادھر کی

رضا پر تیری ہوں راضی جو خواہش ہو سو حاضر ہے
یہ دل حاضر ہے میں حاضر ہوں اور حاضر مری جاں ہے

دل اب پچھتائے ہوتا کیا ہوئی اپنے سے نادانی
چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

رہے کب دین و ایماں جب صنم نے گھر کیا دل میں
چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

سوائے حسرت و افسوس اب تو کچھ نہیں باقی
شباب اپنے لیے مثل خواب باقی ہے

لوگ دیوانہ کہیں لاکھ پر آپ ہی کہیے
لے کے پتھر مرے پیچھے کہیں دوڑا کوئی

کعبہ و دیر کو نہ جائے شیخ
جو کرامات ہے بشر میں ہے

رمز کا قصہ نہ کر آغاز تو
خوف ہے اس کے مجھے انجام سے

وہ دن گئے، گئے وہ جوانی کے شوق و ذوق
اب وہ زمانہ دھیان میں خواب و خیال ہے

گذر جائے گی سکھ سے راحت سے اے رمز
جو تھوڑی سی ہے زندگانی ہماری

عمر بھر کوچہ نوردی میں رہا میں اے رمز
پاؤں اب تھک گئے بس گور کنارے میرے

اری دنیا جو تو ڈوبی سو ڈوبی ہم کو لے ڈوبی
جب اونچا سر سے پانی ہے تو کب امید ساحل ہے

مئے وحدت کا پینا اور پچانا مشکل ہے
نہیں شربت کا ساغر شیخ یہ زہر ہلاہل ہے

تھے بھلے چنگے عدم کے ایک کونے میں
وحشت ہستی میں آ کر کیوں یہ تہمت لے چلے

بستر اچھا پایا تھا یہ مانا کہاں تم نے
اب سر کو لگا ہاتھ تو پچھتائے تو کیا ہے

آشنا ملتے تھے بیگانے زر و مال تھا جب
کون اس وقت میں کرتا ہے رفاقت میری

ہوں گے اعمال جو ساتھ برے ہوں کہ بھلے
حشر میں کوئی کرے گا نہ رفاقت میری

تن کے مکاں سے نہ ہو بے فکر یوں ولا
ہر آن میں اسے خطر انہدام ہے

گذرتا ہوں دنیا سے میں آجکل میں
غنیمت ہے دو دن کی صحبت تمہاری

دکن کا سفر

جا رہا ہوں ریل میں بیٹھا دکن کی سیر کو
گردشِ پرکار بخشی ہے خدا نے پیر کو

میں اکیلا اپنے ڈبے میں ہوں دل ہے بے قرار
دیکھتا ہوں ہر طرف چھائی ہوئی رنگین بہار

سامنے میرے کھلی ہے ایک فطرت کی کتاب
چومتی پھرتی ہیں نظریں جس کو میری بے حساب

کس قدر قدرت نے کی ہیں اس طرف فیاضیاں
اس زمیں کو بخش دیں خالق نے سب رعنائیاں

ابر ہے چھایا ہوا اور کوندتی ہیں بجلیاں
سرد جھونکے کر رہے ہیں کس قدر اٹھکیلیاں

ہر طرف سرسبز کھیتوں کے چمن بکھرے ہوئے
دھان کے رنگین خوشے سامنے بکھرے ہوئے

دامنِ باغات میں ہیں دھان کی ہریالیاں
ناریل کے کان میں لٹکی ہوئی جیسے بالیاں

ہر قدم پہ ہیں شوالے اور پتھر کے صنم
جس جگہ جا کر جفاکش بھول جاتے ہیں الم

جس کو کہتے ہیں لنگوٹی اس جگہ آئی نظر
چار انگل ایک کپڑا آدمی کے جسم پر

کیوں ہوا گر شہر میں فیشن پرستی آ گئی
گاؤں والوں کو جہالت اور غریبی کھا گئی

اس طرف طرزِ کہن کا دور دورہ ہے ابھی
ان غریبوں کو نظر آتی نہیں دنیا نئی

شہر والو گاؤں کا بھی کچھ تماشا دیکھ لو
اپنی دنیا سے نکل کر یہ بھی دنیا دیکھ لو

حسن یکتا ہے یہاں بے عقل و دانش بھی یہاں
وصف ان کے پردۂ غربت میں ہیں سارے نہاں

بخش دو ان کو بھی طرزِ نو کی کچھ گل کاریاں
کچھ کھلا دو گاؤں میں بھی علم کی پھلواریاں

یہ بھی مخلوق ہیں انہیں یہ بھی ہیں اہلِ وطن
تم ذرا ان کو سنبھالو یہ بھی ہیں حسنِ چمن

ان خیالوں میں تھا میں دنیا سے ایسا بے خبر
آگیا مدراس قریب اور اٹھا میں چونک کر

ہرلین قمر بانو

تڑپ

یہی ہے
یہی ہے
یہی ہے وہ دریا!
وہ دریا یہی ہے
کہ صدیوں سے جس نے
کئی خشک کھیتوں کو پانی پلایا
وہ دریا یہی ہے
کہ اطراف جس کے
کئی میل زرخیز مٹی پڑی تھی
وہ دریا یہی ہے
کہ سینے پہ جس کے
کئی کشتیاں رقص کرتی رہی تھیں
وہ دریا یہی ہے
کہ اب اس کا سینہ
جھلستا جھلستا جھلس سا گیا ہے!
وہ شبنم کے اک ایک قطرے کو یکسر
ترستا گیا ہے!!

منظر محی الدین

خواجہ حمید الدین شاہد

تحسین سروری کی یاد میں

رات کے اندھیرے میں کتنے دل اجڑتے ہیں صبح کے ستاروں کو کچھ خبر نہیں ہوتی

۶ دسمبر ۱۹۷۶ء کی رات ایسی منحوس اور اندوہناک رات تھی جب میرے پرانے ساتھی میری ہر بات سے خوش ہونے اور میرے کاموں کی قدر کرنے والی ہستی یعنی تحسین سروری کی اچانک موت کی خبر نے بجلی بن کر میرے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا۔ تحسین سروری کی موت ایک ایسا دردناک المیہ ہے جسے آسانی سے نہیں بھلایا جاسکتا۔ ہمارے معاشرے، بالخصوص سرمایہ دار معاشرے اور اردو زبان و ادب کی خانقاہوں اور اس کے مجاوروں کی غفلت اور لاپروائی کو بڑی حد تک ان کی موت کا ذمہ دار قرار دیا جائے گا۔ گذشتہ دس بارہ سال سے ان کی صحت خرابی کی طرف مائل تھی اور پچھلے دو تین سال سے تو وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔ گویا وہ ایک چلتی پھرتی لاش تھے۔ اپنا اور اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنے کے لئے ناظم آباد سے بابائے اردو روڈ تک چار میل کا فاصلہ اٹھتے بیٹھتے طے کرتے اور پھر انجمن ترقی اردو کے دفتر میں پہنچ کر دم لیتے تھے۔ جہاں وہ تقریباً چودہ سال سے ملازم تھے ان کی تنخواہ اتنی قلیل تھی جس سے گھر کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے تھے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے وہ ترقی اردو بورڈ کے چکر کاٹتے تھے۔ وہاں سے کتابیں حاصل کر کے ان کو بغور پڑھتے اور لغت کے لئے الفاظ اخذ کرتے اور پھر ان لفظوں کو سندوں کے ساتھ کارڈوں پر تحریر کرتے۔ معاوضہ میں ان کو حقیر سی رقم ملتی تھی یعنی ۵۰۰ صفحات کی کتاب کے مطالعے کا معاوضہ زیادہ سے زیادہ ایک سو روپے اور ایک سو کارڈ تحریر کرنے کی اجرت صرف پانچ روپے۔ ریڈیو اور ٹی وی میں بھی انہیں کوئی پروگرام نہیں ملتا تھا۔ افسوس کہ ایک جوہر قابل ناقدری اور کسمپرسی کا شکار ہو گیا۔

مرحوم کی قابلیت اور علمی و ادبی کارناموں سے پاکستان اور ہندوستان کے بیشتر اہل دل واقف ہیں لیکن جو مشکل اور ناساعد حالات میں انہوں نے علم و ادب کی قابل قدر اور بے غرض خدمات انجام دیں ان کو وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے قریب سے ان کی خانگی زندگی کے حالات کو بچشم خود دیکھا ہے۔ بے سروسامانی، فکر و پریشانی، صحت کی خرابی اور معاشی تنگ دستی کے باوجود یہ مرد قلندر جراتمندانہ اور ہمت مردانہ سے اردو زبان و ادب کی خدمت میں مشغول رہا۔

تحسین سروری میرے ایسے مرحوم دوستوں میں سے تھے جن کی یاد تا دم مرگ مجھے تڑپاتی رہے گی۔ ان سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۴۰ء میں حیدرآباد دکن کے ایک ضلع محبوب نگر میں ہوئی تھی جہاں ایک اردو کانفرنس میں شہر حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس کا ایک اجلاس نواب بہادر یار جنگ اور دوسرا اجلاس ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی صدارت میں ہوا تھا۔ ان دنوں سے [illegible]

جامعہ عثمانیہ کا طالب علم تھا اور رسالہ "سب رس" میں بھی کام کرتا تھا۔ ہم دونوں کی عمروں میں شاید ایک آدھ سال کا فرق تھا۔ وہ مجھ سے چھوٹے تھے۔ تحسین اس زمانے میں شعر کہنے لگے تھے اور یہ ان کی شاعری کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ اپنی شاعری کی ابتدا کے بارے میں خود تحسین سروری نے اپنے ایک مضمون "میرا بھانجا میرا دوست نظم حیدرآبادی" میں اس بات کا اس طرح انکشاف کیا ہے:

"۳۳ء کی بات ہوگی میں نے اچانک شاعری شروع کردی۔ میری اس حرکت کا چرچا سب سے پہلے خاندان کے ہم سن لڑکوں میں ہوا۔ ایک روز افسر (نظر کی عرفیت) سے ایک عزیز کے گھر کسی تقریب کے موقع پر ملاقات ہوئی۔ اس نے مجھ سے کہا "سنا ہے تم نے شاعری شروع کردی ہے" میں نے بڑے فخر سے جواب دیا "ہاں"۔ افسر نے میرا مذاق اڑایا پھر نصیحت کے انداز میں کہا "تم سخت غلطی کررہے ہو، یہ بڑا منحوس شوق ہے اور پھر تعلیم مکمل کئے بغیر یہ شغل اختیار کرنا نادانی ہے"۔"

لیکن افسر کی اس بات کو میں سنی ان سنی کرگیا اور اپنا شغل جاری رکھا۔ تحسین سروری نے بہت جلد یعنی ۳،۴ سال کی مشق سخن کے بعد حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی حیثیت سے اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی غزلیں اور غالباً ۱۹۴۱ء سے نظمیں حیدرآباد اور ہندوستان کے مشہور رسالوں اور ہفتہ وار جرائد میں شائع ہونے لگی تھیں۔ وہ ناموافق حالات کی وجہ سے اپنے ہم عمر شعراء مخدوم محی الدین، صمد رضوی، ممتاز، محمد علی نیئر، شعیب حزیں، صاحبزادہ میکش، شاہد صدیقی (مرحومین) اور سکندر علی وجد، ظہیر الدین بابر وغیرہ کی جیسی اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور نہ ہو سکے۔ چونکہ ان کو علم و ادب اور شاعری کا شوق تھا اس لئے انہوں نے ذاتی مطالعہ اور عالموں کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی استعداد علمی میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ حیدرآباد کے شاعرانہ ماحول اور بالخصوص جامعہ عثمانیہ کی ادبی محفلوں میں شریک رہ کر تحسین سروری بھی اچھے شاعر بن گئے۔ ان کی شاعری کی ابتدا غزل سے شروع ہوئی تھی لیکن اپنے ہم چشموں کے فیض صحبت سے وہ نظم گوئی کی طرف مائل ہو گئے اور بہت جلد اس میں مہارت پیدا کرلی۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بہت ہی قلیل مدت میں اردو ادب کے نئے تقاضوں، جدید اسالیب اور مسائل و موضوعات کو اچھی طرح سمجھنے لگے تھے۔

تحسین سروری کی زندگی کا بیشتر حصہ تلاش معاش کی فکر و پریشانی میں گزر گیا۔ مایوسی، ناکامی اور نامرادی نے ان کے جواں حوصلوں کو پست کردیا تھا۔ ناسازگار حالات زندگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۸ء تک تحسین کی ترقی پسند شاعری اور انقلابی رجحانات میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ پاکستان ہجرت کرنے کے بعد شاعری کی طرف انہوں نے بہت کم توجہ کی۔ انجمن ترقی اردو میں ملازمت مل جانے کی وجہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق، قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی، ڈاکٹر ممتاز حسن، سید ہاشمی فریدآبادی، حفیظ ہوشیارپوری (مرحومین) اور پیر حسام الدین راشدی جیسے علماء کی علمی مجالس سے فیض یاب ہونے کے مواقع ملے۔ اس علمی و ادبی ماحول کا تحسین سروری پر یہ اثر ہوا کہ حیدرآباد دکن سے کلاسیکی ادب کے مطالعہ کا جو شوق وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ یہاں ان کا باضابطہ اور محبوب مشغلہ بن گیا۔ اور بہت جلد انہوں نے تحقیقی مضامین لکھنے شروع کردیئے۔ اب وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر بلکہ صاحب طرز انشا پرداز بھی ہوگئے تھے۔ اس وقت تک ۱۰۰ سے زائد مقالے اور مضامین مختلف معیاری رسالوں میں شائع ہو کر مقبول عام حاصل کرچکے تھے۔ میں ان کو کتابی صورت میں مدون کررہا ہوں اور انجمن ترقی اردو ان کو شائع کرے گی۔

اس مضمون میں تحسین سروری کی شاعری پر سرسری نظر ڈالی جائے گی۔ کیونکہ ۱۹۶۸ء میں خود تحسین نے اپنے بارے میں لکھا تھا:

"تحسین میں جو شاعر تھا اس کے انتقال کو تقریباً ۲۰ سال ہوچکے ہیں۔ اب جو کبھی کبھی مشاعروں یا نشستوں میں کلام سناتا دکھائی دیتا ہے یا چند خاص رسالوں میں جس کا کلام چھپ جاتا ہے وہ کوئی محقق یعنی محمد رکن تحسین سروری ہے۔"

تحسین سروری ایک نظم ہی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں رعنائی، بانکپن اور ایک نکھار تھا۔ وہ انسانی اقدار کی عظمت سے بخوبی

واقف تھے ان کی ذہانتِ طبع اور جودتِ فکر نے نہ صرف ان کی شاعری کو تازگی بخشی بلکہ ان کے ذوقِ تحقیق کی روشنی اور اسلوبِ نگارش کو دلآویزی سے مالامال کیا۔ وہ بڑے حساس اور دردمند شاعر تھے۔ ان کے کلام میں قدیم و جدید رنگ کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ آخری دور کے کلام میں پختگی اور مہارت کے علاوہ سوز و گداز اور مایوسی و دردمندی کے گہرے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کلام سے چند اشعار بطورِ نمونہ پیش کیے جاتے ہیں ؎

چاکِ دامن نہ مری شورشِ وحشت دیکھو ۔۔۔ مجھ کو دیکھو مرا انجامِ محبت دیکھو
کوئی آثار نظر تو نہیں آتے پھر بھی ۔۔۔ کیا نکالیں گے ہم اب جینے کی صورت دیکھو
دشت میں آئے تو ہیں شہر سے اکتائے ہوئے ۔۔۔ پھر کہاں ہم کو لئے جاتی ہے وحشت دیکھو

عشق میں دیوار نہ در چاہیئے ۔۔۔ دور تک اک راہ گزر جاتی ہے
کب سے نہ جانے ہے ہماری تلاش ۔۔۔ کچھ تو ہماری بھی خبر چاہیئے
راہ میں تاریکیٔ شب ہو تو ہو ۔۔۔ روشنیٔ طبع مگر چاہیئے

مسائل کچھ عجب پیدا ہوئے ہیں ۔۔۔ ہم اپنے شہر میں رسوا ہوئے ہیں

مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ پھر چارہ کریں ۔۔۔ چاک دامن نہ کریں عشق کو رسوا نہ کریں
کچھ تو معلوم ہو ہم کو بھی یہاں کا دستور ۔۔۔ کیا کریں ہم ترے اس شہر میں اور کیا نہ کریں

ہمارے گھر میں یوں تو کیا نہیں ہے ۔۔۔ بس اتنا ہے کوئی رہتا نہیں ہے
مجھے اس سے نہیں ہے یہ شکایت ۔۔۔ کہ میری بات کو سمجھا نہیں ہے
زمانہ ہو گیا ہے شب کو گزرے ۔۔۔ مگر سورج ابھی نکلا نہیں ہے

نہ کوئی گل نہ ہے گلشن ہمارا ۔۔۔ تہی جب سے ہوا دامن ہمارا
کہیں کیا اور ہم اپنی زباں سے ۔۔۔ کہ تم پر حال ہے روشن ہمارا
جو نغمہ تھا وہ نالہ بن گیا ہے ۔۔۔ یہاں تک آ گیا ہے فن ہمارا

سو بار ابھر کے پھر مٹا ہوں ۔۔۔ میں ایسا حرفِ مدعا ہوں
نفرت کی نظر سے جو نہ دیکھے ۔۔۔ حیرت سے اسے میں دیکھتا ہوں
ہر شام پیالہ و سبو میں ۔۔۔ سورج کی طرح میں ڈوبتا ہوں

ہوں سہل پسند آدمی میں　　　سمجھا وہ نہیں جو سوچتا ہوں
بے حال میں ہو گیا ہوں جب سے　　　ہر ایک کا حال پوچھتا ہوں
میں چشم حیات کی مژہ پر　　　آنسو کی طرح رکا ہوا ہوں
باہر سے ہوں اک تودۂ برف　　　اندر سے مگر سلگ رہا ہوں
میرے نہ قریب سے گذرنا　　　میں شاخ شجر ہوں ٹوٹتا ہوں
واقف ہی نہیں ہے کوئی مجھ سے　　　اور میں ہوں کہ سب کو جانتا ہوں
تحسین کہاں گئے ہیں سب لوگ　　　میں راہ میں کیوں کھڑا ہوا ہوں

تحسین سروری نے حسب ذیل پانچ کتابیں مرتب کیں جو شائع ہو چکی ہیں۔

۱۔ مسدس رنگین (مرزا سعادت یار خاں رنگین) ۲۔ قادر نامہ (مرزا غالب کی نایاب تصنیف) ۳۔ پری خانہ (واجد علی شاہ اختر کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ) ۴۔ معراج العاشقین (حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی تصنیف معانی اور حواشی کے ساتھ) ۵۔ چند ہم عصر (ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب حاشیوں کے ساتھ)

تحسین سروری کی صحت وفات سے ایک ماہ قبل بہت بگڑ گئی تھی۔ انتقال سے ایک دن قبل میں ان کے گھر جا کر ملا تھا۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کہہ نہ سکے صرف "ہماری خیال رکھنا" مجھے بمشکل سمجھ میں آیا۔ چند روز قبل ڈاکٹر نے مرض دق کی تشخیص کی تھی۔ کل دوسرے دن انہیں اوجھا سینی ٹوریم میں داخل کرنا چاہتا تھا افسوس کہ صبح ہونے سے پہلے ہی ۷ دسمبر کی رات ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور تحسین کی: عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا۔

اب تحسین سروری دنیا کے ہنگاموں سے دور معائب زندگی سے چھٹکارا پا کر "سخی حسن" کے قبرستان کراچی میں ابدی نیند سو رہا ہے۔

ڈاکٹر خالد بلگرامی نے ایک قطعہ میں تحسین مرحوم کو یوں خراج عقیدت ادا کیا ہے ؎

بخشی ادب نے اس کو زمانے میں برتری　　　سینچا لہو سے جس نے ریاض سخن وری
محو خرام ناز ہے باغ بہشت میں　　　وہ سرو جس کا نام ہے تحسین سروری

اعلان: بحکم پریس رجسٹرار حکومت ہند' فارم ۴ رول نمبر ۸

ایڈیٹر کا نام: سید علی اکبر　　　پتہ: ادارۂ ادبیات اردو' حیدرآباد (۴۔۔۔۵۰۰)
قومیت: ہندوستانی　　　پبلشر کا نام: سید علی اکبر
پتہ: ادارۂ ادبیات اردو' حیدرآباد ۴　　　قومیت: ہندوستانی
پرنٹر کا نام: سید علی اکبر　　　پتہ: ادارۂ ادبیات اردو' حیدرآباد ۴
قومیت: ہندوستانی　　　نام و پتہ مالک: ادارۂ ادبیات اردو' حیدرآباد ۴

میں' سید علی اکبر' تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں' وہ میرے علم میں صحیح ہیں۔　　　دستخط

(سید علی اکبر)

غزل

تسنیم فاروقی

امید کی مدھم سی کرن بھی ہو تو پیاری ہے
یہ ایک کرن تنہا ظلمات پہ بھاری ہے

ہستی کے حسیں لمحے یوں کاٹ دیئے ہم نے
جیسے کسی صحرا میں اک رات گزاری ہے

پھولوں کو محبت سے دیکھیں بھی تو مجرم ہیں
کہنے کو گلستاں میں ہر شاخ ہماری ہے

تاریخ سے ہوتا ہے حالات کا اندازہ
حالات نے قوموں کی تقدیر سنواری ہے

تصویر تری ہم نے فردوسِ تصوّر میں
سو آئینے توڑے ہیں تب جا کے اتاری ہے

میں تم کو جفاؤں کا الزام نہیں دوں گا
تم نے مری آنکھوں میں اک عمر گذاری ہے

تسنیم یہ بیداری، یہ جشنِ سحر کا ہی
چڑھتا ہوا سورج ہے اور نیند سی طاری ہے

(شکر جی میں ایک مشاعرہ میں پڑھی گئی)

ہمسفرِ منزلِ جنوں

شبنم رومانی

(غالب لائبریری کراچی میں تحسین سروری کے جلسۂ تعزیت میں
جس کی صدارت نواب سعید جنگ نے کی، یہ نظم پڑھی گئی)

کیسی چلی ہوائے ستم، کچھ نہ پوچھئے!؟
طغیانیٔ جراحتِ غم، کچھ نہ پوچھئے!؟
برہم ہے کیوں، مزاجِ قلم کچھ نہ پوچھئے!؟

پیوست ایک تیر ہوا پھر جگر کے پاس
تحسینؔ بھی جا چکا ہے ادیب و ظفر کے پاس

تحسینؔ، وہ میرا ہمسفرِ منزلِ جنوں
پیتا رہا جو شام و سحر حسرتوں کا خون
ویران کر گیا ہے مجھے اور ــــ کیا کہوں

وہ بھی غریبِ شہر تھا میری طرح ــــ مگر
غم یہ ہے اپنے سود و زیاں پہ نہ کی نظر

ارضِ دکن میں تھا کہ "دیارِ سحر" میں تھا
بے چین و مضطرب سا مسلسل سفر میں تھا
محوِ خرامِ وادیٔ فکر و نظر میں تھا

یوں تو شریکِ قافلۂ اہلِ درد تھا!
وہ کم سخن سا شخص عجب کوچہ گرد تھا!

تحقیقِ علم و فن میں مگن تھا لگن کے ساتھ
سچائیوں کے زہر پیئے بانکپن کے ساتھ
کیا کیا نہ غم تھے ایک غریب الوطن کے ساتھ

لاتا، لبوں سے اس کے ہنسی چھین لی گئی!
لیکن ضمیر و دل کی تجارت نہ کی گئی!

کس دن وہ شاملِ صفِ دیدہ وراں نہ تھا
لیکن شریکِ حلقۂ دانشوراں نہ تھا
ہاں لے منکرِ امامتِ پیرِ مغاں نہ تھا

تحسینؔ جسے غرض ہی نہ تھی ننگ و نام سے
زندہ اگر رہے گا تو بس اپنے کام سے

تمام عمر کے غم نیند سے جگائے گئے
تمہارے واسطے رستے نئے بنائے گئے

رہِ حیات کے ہر موڑ پر دھواں سا ہے
ہماری طرح کئی دل یہاں جلائے گئے

وہ ہم نہیں تھے مگر اس جہاں میں ہم جیسے
ہزار بار مٹے، بار بار آئے گئے

ہزار بار یہاں جرمِ بے گناہی پر
ستمگروں کی عدالت میں ہم بلائے گئے

دلوں کے زخم وہی، درد و غم وہی اقبال
یہ کیوں ہمارے فسانے نہیں سنائے گئے!

افتخار احمد اقبال

سچ کا زہراب مری بات میں ہے
کیا خدا دل کی کائنات میں ہے

اے جنوں شکریہ! معلوم نہ تھا
زندگی اصل حادثات میں ہے

لذتِ میکشی سے بڑھ کر ہے
جو نشہ ان کے التفات میں ہے

دیکھ اے رند کہیں ایسا نہ ہو
عشق کی خیر ترے ہات میں ہے

جل اٹھا دل تو یہ محسوس ہوا
اک اجالا سا مری رات میں ہے

موت سے آنکھ جو ملا آئے
حلقۂ زیست ان کی گھات میں ہے

جانے کیوں آج کا انسان افضل
صرف محبوس اپنی ذات میں ہے

فضل افضل

ساتھ جب چھوڑ دیا تم نے بہاروں کی طرح
زندگی پھوٹ کے روتی رہی چھالوں کی طرح

اپنی ہی آگ سے روشن رکھا سینہ اپنا
بھیک مانگی نہ کبھی ہم نے ہلالوں کی طرح

لاکھ دشواریاں حائل تھیں سفر میں لیکن
ہم نے کاٹے ہیں کڑے کوس ہواؤں کی طرح

پھول تو پھول ہیں کانٹوں کو بھی چن کر ہم نے
اپنے سینے سے لگایا ہے گلابوں کی طرح

خوفِ ظلمت سے جنھیں وہ مرے ہمراہ چلیں
جلتے بجھتے ہیں کئی زخم چراغوں کی طرح

دو گھڑی بیٹھ کے پھر سایۂ مژگاں میں سہیل
خوبصورت سی غزل کہیئے ان آنکھوں کی طرح

سہیل احمد سہیل

سید یعقوب شمیم

زبان اور ادب کے تعلق کے پیشِ نظر ادب کی ماہیت

زبان کے ادبی و غیر ادبی استعمال کے فرق کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ادب اور غیر ادب کے فرق کو سمجھا جائے تب ہی ہم زبان اور ادب کے تعلق کو بآسانی سمجھ کر ادب کی ماہیت کو متعین کر سکتے ہیں۔

ادب کا لغوی مفہوم ابتداً دعوت تھا جو انسان کے بلند شریفانہ خصائل کو ظاہر کرتا ہے جس کے لئے ایک مترادف لفظ تہذیب بھی موجود ہے لیکن ادب کو اشارتاً ان تمام علوم کے لئے استعمال کیا جانے لگا جو ذہنی شائستگی اور تمدنی تعلقات کی پاکیزگی سے متعلق ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس خاص مفہوم کے لئے لفظ ادب کا استعمال عربی میں دوسری اور تیسری صدی ہجری سے ہوا جبکہ عرب عجمی تہذیب اور لٹریچر سے متاثر ہوئے جس کے نتیجے میں انھوں نے بعض مشاغل تفریح اور لہو و لعب کو بھی ادبیات میں شامل کر دیا تھا۔ اسی طرح مغرب میں بھی ادب کے تعلق سے متضاد اور متنوع نظریات پائے جاتے تھے بعضوں نے اس کے مفہوم کو اس قدر وسیع کر دیا تھا کہ اس میں وہ تمام تحریریں شامل ہو گئیں جو مختلف اقوام نے مختلف ادوار میں اپنے بعد چھوڑیں تو بعضوں نے اس مفہوم کو نہایت ہی محدود کر دیا مگر یہ ہر دو آراء افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ اس کی ایک حد تک معتدل صورت ایک مغربی نقاد HUDSON کے نظریئے کے مطابق ہے جس کے نزدیک ادب سے مراد صرف وہ کتابیں ہیں جو اپنے موضوع اور طرزِ بیان کے لحاظ سے عام انسانی دلچسپی کی حامل ہوسکتی ہے جس میں ایک مخصوص طرزِ بیان میں پڑھنے والوں کے لطف کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے ایک ادبی کتاب نجوم، ہیئت، طب، فلسفہ اور تاریخ کی کتابوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے کیونکہ وہ کسی خاص طبقہ کے لئے نہیں ہوتی بلکہ ہر شخص کی دلچسپی کا باعث ہوتی ہے اور قاری کے جمالیاتی ذوق کی تسکین کرتی ہے برخلاف اس کے دوسرے فنون کی کتابوں کا مقصد صرف معلومات فراہم کرنا ہوتا ہے اور اس میں قاری کی دلچسپی کا لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ دلچسپی سے میری مراد جمالیاتی ذوق کی تسکین ہے۔

ادب دراصل فن کی ایک قسم ہے اور فنون دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو کارآمد فنون اور دوسرے فنونِ لطیفہ جہاں تک کارآمد فنون کا تعلق ہے اس میں نہ صرف علوم جیسے فلسفہ، سائنس اور تاریخ وغیرہ شامل ہیں بلکہ عام صنعتیں بھی جنھیں انگریزی میں انڈسٹری کہا جاتا ہے شامل ہوتی ہیں جبکہ فنونِ لطیفہ میں بھی اگرچہ صنعت و فن ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں "لطافت" کا بھی اضافہ ہوتا ہے۔ جو صنعت و فن کو "فنِ لطیف" بنا دیتا ہے۔ چونکہ ادب بھی فنونِ لطیفہ کی شاخ ہے اسی لئے اس میں صنعت کے ساتھ ساتھ لطافت بھی ہوتی ہے یعنی اس میں فنکار کی تخلیقی یا تخیلی صلاحتیں اکتسابی صلاحیتوں کے ساتھ

شامل ہوتی ہیں اور اپنی ان صلاحیتوں کے اظہار کے لئے وہ زبان کو اپنا وسیلہ یا واسطہ یعنی میڈیم بناتا ہے مگر ادب کا یہ میڈیم فنون لطیفہ کے دیگر شعبوں کے برخلاف پتھر کا تخلیق شدہ نہیں ہوتا بلکہ فنکار خود اس کی تخلیق کرتا ہے اور اس میڈیم میں اس کے بولنے والوں کی تہذیبی روایات کا ذخیرہ موجود ہوتا ہے اور چونکہ یہ صرف فنکار کی تخلیقی اور تخیلی صلاحیتوں کا نتیجہ ہوتا ہے اس لئے اس میں سرد، ناول، افسانہ، شاعری یا اسی نوع کی تحریریں شامل ہوتی ہیں اور اس طرح ادب کی اساس FIKTIONALITY یعنی من گھڑت پن طے پاتا ہے۔

چونکہ ادب کا میڈیم زبان ہے اس لئے جب ہم زبان کے استعمال کی بابت غور کریں تو معلوم ہوگا کہ زبان کا استعمال تین طرح کا ہوتا ہے۔ ایک 'بول چال کے لئے زبان کا عام استعمال' دوسرے 'علوم کے اظہار کے لئے زبان کا استعمال' تیسرے 'ادب کے اظہار کے لئے زبان کا استعمال' زندگی کے عام کاموں یعنی بول چال کے لئے زبان کے استعمال کا مقصد صرف ترسیل ہوتا ہے اس لئے اس میں الفاظ کی صوتی تنظیم کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی بلکہ اس میں فعل VERB کو اہمیت حاصل ہوتی ہے جبکہ علوم کے اظہار کے لئے جو زبان استعمال ہوتی ہے اس میں الفاظ کے ذریعہ کسی مفہوم کو قطعی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ایسی زبان اظہاری دلالتی یا DENOTATION زبان کہلاتی ہے جس کا بہت ہی معیاری نمونہ ہمیں علم ریاضی میں ملتا ہے جیسے "مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو قائموں کے برابر ہوتا ہے" مگر اس عبارت میں جذباتی کیفیات یا لہجہ بالکل نہیں پایا جاتا۔ لیکن ایسے علوم جو معاشرتی امور سے متعلق ہوتے ہیں ان میں زبان کا استعمال غیر قطعی ہوتا ہے اور اس میں کئی ایک مفاہیم کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً فلسفہ اور تصوف کی اصطلاحات میں ایک سے زیادہ مفاہیم پنہاں ہوتے ہیں گویا معاشرتی علوم کی زبان طبعی علوم کی زبان کے مقابلے میں زیادہ غیر قطعی ہوتی ہے مگر زبان کا سب سے زیادہ غیر قطعی استعمال ادب میں ہوتا ہے۔ ادیب و شاعر زبان میں محاورہ، استعارہ، تشبیہات، تلمیحات اور ذو معنی الفاظ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان میں ایک سے زائد مفاہیم کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے اور زبان کا یہ استعمال CONNOTATION تعبیری یا متضمن استعمال کہلاتا ہے ادب اور شاعری میں دراصل زبان ہی ہمارا مطمح نظر ہوتی ہے کیونکہ ادبی زبان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ محض "اشارے" کے کام نہیں آتی بلکہ بذات خود اظہار ہوتی ہے۔ اگرچہ یہاں بھی اس کے استعمال میں تھوڑا بہت فرق ہوتا ہے جیسے نثر اور نظم کا فرق یا پھر مختلف اصناف سخن کا فرق وغیرہ۔ شاعری میں چونکہ داخلی جذبات کا اظہار زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس میں زبان کا تعبیری وصف زیادہ نمایاں ہوتا ہے جبکہ FICTION میں یہ وصف اتنا نمایاں یا واضح نہیں ہو پاتا۔ اس کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادب میں بھی اثر انگیزی کا فرق پایا جاتا ہے لیکن یہ فرق دراصل کلچر کا فرق ہوتا ہے ہم کسی انگریزی نظم سے اس درجہ لطف اندوز اور متاثر نہیں ہو سکتے جتنا کہ ایک انگریز ہو سکتا ہے کیونکہ ادب میں جو زبان استعمال ہوتی ہے وہ اپنا ایک تاریخی ارتقا رکھتی ہے جس تک صرف ایک اہل زبان ہی کی رسائی ہو سکتی ہے مثلاً اردو شاعری میں گل کبھی محبوبہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی لیلائے وطن کے معنوں میں تو کبھی صرف پھول ہی کے معنوں میں اس لئے ایک غیر زبان داں اگر علمی اعتبار سے زبان سیکھ بھی لے تو وہ زبان کے اس تہذیبی ارتقاء سے نابلد ہونے کی بناء پر گل کا مفہوم صرف پھول ہی سمجھتا ہے جو اس نے لغت کی مدد سے سیکھا ہے اور ادبی زبان کا یہی وصف امکانات کی پہچان

یا زبان کا استعمال کہلاتا ہے۔

ادب کی زبان کو ہم روزمرّہ کی زبان سے بآسانی ممیّز نہیں کرسکتے کیوں کہ ہمارا روزمرّہ کی زبان بہت ہی متنوع ہوتی ہے جس میں خانگی گھریلو گفتگو، مذہبی گفتگو، دفتری گفتگو، مکتوب نگاری یہ سبھی کچھ شامل ہوتے ہیں اس لئے ترسیل کے نقطۂ نظر سے روزمرّہ کی زبان اور ادب کی زبان میں فرق محسوس کرنا بہت مشکل ہے مگر ادبی زبان کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کا 'SOURCE' تو اگرچہ روزمرّہ ہی کا ہوتا ہے لیکن ادیب اس کو اس سلیقے سے برتتا ہے کہ وہ غیر ادبی نظر نہیں آتا۔ گو ادبی زبان کی بنیادی خصوصیت اس کی تنظیم ہے لیکن مختلف اصناف ادب میں یہ تنظیم مختلف ہوسکتی ہے۔ عام طور پر شاعری کی زبان بہت ہی منظم ہوتی ہے کیونکہ شاعری کی لفظیات DICTION کے انتخاب کے وقت شاعر کو صوتی آہنگ کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے جبکہ نثر کی تنظیم بہت ہی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف صوتی آہنگ کے لئے ہی شاعری کی زبان منظم ہونی چاہیئے کیونکہ شاعری میں آہنگ کا مفہوم فن موسیقی سے مختلف ہوتا ہے اور جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے خالصتاً داخلی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعض شعراء کا DICTION بہت ہی سہل ہونے کے باوجود ان کے یہاں ہمیں اصوات کا بے سرا پن نظر نہیں آتا اور یہی ادبی زبان کی خصوصیت ہے۔ ادبی زبان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عملی مقصد کا فقدان ہوتا ہے اور ادیب اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے زبان کا ایک ایسا FRAME WORK تیار کرتا ہے جس کی بنا پر زبان حقیقی دنیا سے علٰحدہ ہوجاتی ہے کیونکہ فکشن کا زمان و مکان حقیقی زمان و مکان نہیں ہوتا۔ مثلاً رسوا کی امراؤ جان ادا میں پیش کیا گیا فیض آباد اور غدر کے واقعات، باوجود حقیقی زندگی سے متعلق ہونے کے بھی اس کے FICTION ہیں کہ ان مخصوص واقعات کی تاریخ سے کوئی توثیق نہیں ہوتی جو اس ناول میں پیش کئے گئے ہیں اس لئے یہ فن کار کی جانب کا تخلیقی استعمال یا اختراع ہے۔ اسی طرح شاعری میں صرف شاعر کی ذات ہی ضمیر متکلم نہیں ہوتی بلکہ قاری بھی اپنے آپ کو ضمیر متکلم سمجھنے لگتا ہے یعنی شاعری میں خارجیت یا زمریت ہوتی ہے مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی ۔۔۔ مرے دکھ کی دوا کرے کوئی

اور ادبی زبان کے اسی وصف کو FICTIONALITY کہا جاتا ہے۔ اس لئے ہم زبان کے ادبی اور غیر ادبی استعمال کو ایک خاص نوع کے اعتبار سے متعین کرنے کے لئے FICTIONALITY کو ادب کی اساس بناتے ہیں اور اس طرح ہی ہم مختلف لکھنے والوں کو علٰحدہ علٰحدہ تمیز کرسکتے ہیں۔ وجہی، تحسین، سرشار اور نذیر احمد وغیرہ اپنے اپنے منفرد مقامات پہ اسی طرح نظر آتے ہیں کہ ان کا لکھا ہوا فکشن موجود ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ سرسید احمد خاں، مولانا آزاد اور حضرت خواجہ بندہ نواز کی تحریریں ہمارے لئے قابل قدر نہیں کیونکہ ان کے پاس فکشن نہیں ہے۔ ادبی اور غیر ادبی کا فرق صرف ایک خاص نوع کو متعین کرنے کے لئے کیا گیا ہے اور یہ فرق معیار کے لحاظ سے بالکل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے مولانا آزاد کی تصنیف "غبار خاطر" ان کی بیشتر قابل قدر تحریروں کے مقابلے میں صرف اس لئے ادب میں شامل ہے کہ اس میں FICTIONALITY کا وصف نمایاں ہے اور اس تصنیف کا مقصد ترسیل نہیں ہے۔ ادبی زبان کے متعلق ایک اور تصور یہ ہے کہ یہ پیکر کی زبان ہوتی ہے یعنی امیجری کی زبان ہے۔ ادب میں امیجری کا تصور ۱۹ ویں صدی کے مشہور مغربی جمال پرستوں EDWARD VON HARTMANN اور VISCHIER وغیرہ کی وجہ سے آیا ہے جن کے مطابق فنکاروں کی جستی تابندگی ہے یعنی خیال فن میں تنقید

کے بعد قابلِ مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ ایک اور دبستانِ تنقید نے جس میں HILDE BRON ، FIEL DBER ، وغیرہ شامل ہیں اس نظریہ کو اہمیت دی کہ فن خاص شئے ہے اس کے علاوہ فنِ مصوری میں EZRA POUND کی تحریکِ امیجزم کا بھی ادب پر اثر ہوا جس کی وجہ سے ادب میں امیجری کو اہمیت دی جانے لگی اور خیال کو حواس کی مدد سے محسوس کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ اردو شاعری میں بھی امیجری کی بیشتر مثالیں ملتی ہیں جیسے میر تقی میر کا یہ شعر

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اس شعر کے مطالعہ سے قاری کے ذہن پہ جو امیج بنتا ہے اس کا تعلق ہماری بصری حس سے ہے۔ ادبی زبان میں غیر ادبی نا ترسیلی زبان کے بر خلاف فعل کو نہیں بلکہ صفت اور متعلقاتِ فعل کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے اور انہیں کی مدد سے امیجری کی جاتی ہے۔ غالب کا یہ شعر اس کی بہترین مثال ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ادبی زبان کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا پیچیدہ استعمال ہے کیونکہ ادب کی تخلیق میں زبان ایک پیچیدہ نامیاتی وجود بھی ہے نامیاتی وجود سے مراد یہ ہے کہ اس کے کئی اجزا ہوتے ہیں جن کو علیحدہ علیحدہ کر کے پھر ایک بار اسی طرح یکجا نہیں کیا جا سکتا اس کا یہ مطلب ہوا کہ ادب میں زبان کی صوتی تنظیم کافی اہمیت رکھتی ہے اگرچہ ایک مفہوم کو ادا کرنے کے لئے زبان میں کئی مترادف الفاظ ہو سکتے ہیں لیکن ادبی اور غیر ادبی کا فرق یہی ہے کہ ادبی تخلیق ہی میں لفظ استعمال کیا جاتا ہے جس کا صوتی آہنگ اس تخلیق میں استعمال کئے گئے دیگر الفاظ کے ساتھ میل کھا سکتا ہے اور الفاظ کا یہی برجستہ یا بے جا استعمال زبان کو ادبی یا غیر ادبی بناتا ہے۔ ادبی زبان کی اس پیچیدگی کو مشہور مغربی نقادوں نے کچھ اس طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے

"کسی ادبی تخلیق میں الفاظ کی ترتیب سادہ نہیں ہوتی بلکہ بہت ہی پیچیدہ ہوتی ہے اس کی کئی تہیں ہوتی ہیں اور جو ایک سے زائد مفاہیم اور رشتے رکھتی ہیں"

ادبی زبان کی اس پیچیدگی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہیئت اور موضوع دو الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں بلکہ کسی فنی تخلیق کے مطالعے کے لئے ہمیں اس تخلیق کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل
سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا　　(ادارہ)

پروفیسر مجیب صدیقی

آندھرا پردیش کا کلچر

جن محرکات سے تمدن کی تعمیر ہوتی ہے ان میں سب سے پہلے جغرافیائی اور طبعی ماحول سامنے آتا ہے۔ ملک کا موقعہ محل، زمین کے نشیب و فراز، گرم و سرد ہوائیں قوموں کی زندگی ڈھالتے ہیں۔ اسی طبعی ماحول میں قوموں کی ذہنیت اور بود و باش بنتی ہے۔ دوسرا محرک وہ تصور حیات ہے جو ملک کے معلم اخلاق اور رہنمائے سیاست اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان سے زندگی کے سانچے بنتے ہیں اور زندگیاں سنورتی ہیں۔ تصور حیات کو ایک مسلسل ہدایت سمجھنا چاہیے۔ انھیں کے زور سے سیاسی اور معاشرتی آندھیاں اٹھتی ہیں، دور انقلابات ہوتے ہیں اور سماج کے نقشے بدلتے ہیں۔ اس تلاطم میں کبھی باہر کے اثرات بھی کام کرتے ہیں۔ یہ بیرونی اثرات کبھی حملہ آوروں کے ساتھ آتے کبھی تاجروں اور سیاحوں کے ہمراہ ملک میں داخل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک قوم سے دوسری قوم کو اپنے خیالات اور تصورات کے بدلنے کا بڑا موقعہ ملا اور دیئے سے دیا روشن ہوا۔ آندھرا پردیش کا تمدن بھی کچھ ایسے ہی محرکات کا نتیجہ ہے۔

آندھرا پردیش دکن کا مشرقی خطہ ہے جو چانکیہ سے چتوڑ تک خلیج بنگال کے متوازی چلا گیا ہے۔ اس کے حدود مغرب میں بیدر اور کولار سے ملتے ہیں تو شمال میں اڑیسہ سے جڑتے ہیں اور مغرب میں چتوڑ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرقی گھاٹ کے سلسلے جو سمندر کے متوازی چلے گئے ہیں آندھرا کو دو حصوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ مشرق میں سمندر کے متوازی وہ زرخیز اضلاع ہیں جن کو شمالی سرکار کہا جاتا ہے اور مغرب میں اضلاع تلنگانہ واقع ہیں۔ اس خطہ میں کاکتیہ خاندان نے راج کیا اور پھر یہاں قطب شاہی سلطنت قائم ہوئی اور آج آندھرا پردیش ہے۔ اس خطے کی ریتیلی زمین جس میں پانی کے بڑے ذخیرے جمع ہو سکتے ہیں اور سنگ خارا کی چٹانیں اس کو دکن کے دوسرے خطوں سے الگ کر دیتی ہیں۔ آندھرا کے پہاڑ اور اس کی چٹانیں جو ایک دوسرے پر ٹکی ہوئی نظر آتی ہیں اس ملک کا امتیازی نشان ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے ان چٹانوں کو ایک دوسرے پر بڑے احتیاط و تدبیر سے جما دیا ہے۔ ان کو دیکھ کر لوگ اس خطے کو دور سے پہچان لیتے ہیں کہ یہ آندھرا ہے۔ اس ملک کی دولت اس کی دریاؤں میں چھپی ہوئی ہے جو مغرب سے مشرق کی طرف بہتے ہیں۔ یہ ندیاں قدیم زمانے سے اس ملک کو سیراب کرتی اور ملک کی زرخیزی بڑھاتی رہی ہیں۔ گوداوری، کرشنا، تنگبھدرا اور پنار کا سفید و شفاف پانی جو چٹانوں پر سے بہتا ہوا درختوں کے جھرمٹ سے گزرتا ہے بڑی دلکشی پیدا کرتا ہے۔ ان دریاؤں کی شاداب وادیاں اور دھان کے لہلہاتے کھیت باہر کے سیاحوں اور فاتحوں کو یہاں کھینچتے رہے۔ مارکو پولو اور ٹیورنیر نے اس ملک کی شادابی کا ایسا دلکش مرقع کھینچا تھا کہ اب بھی وہ سننے والوں کو موہ لیتا ہے۔ مغل شہنشاہ بھی آندھرا دیش کے گرویدہ تھے۔ شہنشاہ اورنگ زیب یہاں سے گذرے تو وہاں کے سرسبز لہلہاتے کھیتوں کو دیکھ کر ششدر رہ گئے اور کہا کہ "ایک قطعہ زمین بے مزروع نیست" ــــ اس میں سردی بہت کم اور گرمی مختلف مدارج میں پڑتی ہے۔ یوں تو مشرقی اضلاع میں جو لب ساحل پر واقع ہیں

گرمی زیادہ ہوتی ہے لیکن اس خطے سا سب سے زیادہ دلکش اور استوار موسم برسات ہے جو بڑا پر رہ شگفتگی اور کھانے پینے میں لطافت پیدا کرتا ہے جب ساون گھٹائیں جھوم جھوم کر برستی ہیں تو جنگل کے جنگل ہرے ہو جاتے ہیں۔ دریاؤں کی وادیوں میں اپنے طرح کے پھول کھلتے اور خوشبوئیں اٹھتی ہیں کہ دیکھنے والے دنوں تک سیر نہیں ہوتے۔ ٹھنڈی ہوائیں کے جھونکے امراء نے سالمیں ... اور باغوں میں ... پینگ ... اس موسم کی رنگینیاں اس قدر دل ... کرتی تھیں کہ خوش حال لوگ گھروں میں نہیں بیٹھتے تھے بلکہ میدانوں میں نکل جاتے تھے۔ شاعر اس موسم کے گیت گاتے تھے کہ ان کے نغموں سے فضا بسیط گونج جاتی تھی اور موسم کی رنگینیاں اور دلکشیاں کوئل کی کوک دلوں میں چٹکیاں لیتیں نچلے دلوں کو ابھارتی تھیں

ان ہی معتدل اور خوشگوار ہواؤں میں آندھرا قوم بنی اور اس کا تمدن ... ہوا۔ اس ملک کے طبعی حالات اور معتدل ہواؤں کو دیکھ کر فوراً یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ملک کا تمدن بھی کس قدر متوازن اور خوشگوار ہو سکتا ہے آندھرا ایک خاموش اور پرسکون خطہ ہے جس کی ٹھنڈی ہواؤں نے اہل آندھرا کو ایک متوازن زندگی سکھا دی ہے۔ اس میں کئی شاعر اور فلسفی اور معلم اخلاق پیدا ہوئے انہوں نے ہمیشہ ذہنی توازن کا سبق دیا۔ ان کے نغمے تلاطم پیدا کرنے کی بجائے دلوں میں ٹھنڈک پیدا کرتے اور زندگی کو پرسکون اور معتدل بناتے۔ یہی وجہ ہے آندھرا کے باشندے جنگ و جدل سے اپنا دامن چھڑاتے رہے آج صدیاں گذر گئیں کہ یہاں تلواروں کی جھنکار نہیں بلکہ امن و شانتی کا سبق پڑھایا گیا بلکہ یہی نہیں بیرونی حملہ آوروں نے تو یہاں یورشیں کیں اور اس کی خاموش فضا کو متلاطم کیا لیکن اہل آندھرا نے اپنے خطے سے باہر نکل کر کسی دوسری آبادی پر چڑھائی نہیں کی کیونکہ وہ ہمیشہ امن و شانتی کا سبق دیتے رہے ہے۔ آندھرا کی پرسکون تاریخ ہے جس میں سیاسی و معاشرتی الٹ پھیر نہیں ہوئے۔ اس میں آندھیاں نہیں لیکن ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہیں۔ زندگی کے ہر پہلو میں سکون اور ہر شعبہ حیات میں ایک کیف آور توازن پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے اور خطوں کی بہ نسبت یہاں مذہبی رواداری اور بھائی چارہ زیادہ ملتا ہے۔ ظاہر ہے جس ملک کی فضا اس قدر پرسکون اور خاموش ہو وہ تمدن کی ترقی کا پورا سامان جمع کر سکتا ہے۔ پرآشوب زندگی میں تمدنی ترقی کہاں ہو سکتی ہے۔ اہل آندھرا نے اپنی خاموش فضا میں تمدن و ثقافت کے جس قدر راستے کھول دیئے وہ دوسرے خطوں کو نصیب نہیں ہوئے۔ یہاں بلند پایہ کردار پیدا ہوئے تو ادب و فنون لطیفہ کی خاطر خواہ آبیاری بھی ہوئی۔ ادب و شاعری کے جواہر پارے جمع ہوئے تو سنگ تراشی کے نظر افروز نمونے سامنے آئے۔

آندھرا پردیش میں صدیوں کی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ قدیم زمانے سے لوگ اس خطے سے واقف تھے ایتاریا برہمنا میں آندھرا کا ذکر پایا جاتا ہے جو کہ تین ہزار سال پہلے ... [illegible] ... اشارہ کیا تھا وہ یہاں سے واقف تھا۔ وہ اپنے سفرنامے میں آندھرا کے شہر و قصبات کا بڑا دلچسپ مرقع کھینچا ہے ... دوسری صدی قبل مسیح سے روشنی میں آتی ہے جب کہ دکن میں ستواہنوں سلطنت قائم کیا۔ اس خاندان کی اصلیت کے متعلق کافی بحث و اختلاف ہے کہ یہ لوگ کہاں کے رہنے والے تھے لیکن یہ کہنا غلط نہیں کہ ستواہنوں کا آندھرا سرزمین سے کہیں نہ کہیں رشتہ جڑ جاتا ہے۔ اس خاندان کو آندھرا بھرتیہ کہتے ہیں۔ ان لوگوں نے چار سو سال راج کیا اور دکن کے دوسرے خطوں کے ساتھ آندھرا دیش کی بھی خاطر خواہ خدمت کی۔ میگستھنیز کہتا ہے کہ آندھرا میں کئی قلعے اور قصبات میں جو جیں آراستہ ہیں اور شاہی محل بارونق دیکھنے والوں کو مرعوب کر دیتی ہے۔ چنانچہ ان کا پایہ تخت بناجو دریائے گوداوری کی وادی میں واقع ہے۔ اس کے کھنڈروں میں آج بھی ستواہنوں کے تمدنی جواہر جگہ جگہ ہیں وہ جگہ بھی بتائی جاتی ہے جہاں اس خاندان کے جلیل القدر راجہ شالیواہن کا تخت بچھتا تھا اور دکن کے چاروں طرف اس کے احکام جاری ہوتے تھے۔ اسی کے نام سے شالیواہن تقویم بنی۔

جب ستواہنوں کو زوال ہو گیا تو پھر دکن میں ہڑبونگ مچ گئی اور ملک چند چھوٹے خاندانوں میں بٹ گیا۔ جن کی بہت بڑی تاریخ نہیں ہے۔ البتہ چھٹی صدی سے اس کی تاریخ میں روشنی پڑنے لگی جب کہ چالوکیہ خاندان کی عملداری شروع ہوئی۔

چالوکیہ راجگان کرناٹکی تھے اور ان کو اندھرا سے کوئی گہرا رشتہ نہ تھا تاہم یہ عجیب اتفاق ہے کہ پلکیشن ثانی نے جو اس خاندان کا جلیل القدر راجہ تھا وہ آندھرا کو اپنی سیاست میں ایک ممتاز جگہ دے۔ اس نے اپنے بھائی کبجا وشنو وردھن کو آندھرا کا گورنر بنا دیا تاکہ اس صوبے کی خاطر خواہ خدمت ہو سکے۔ اس انتظام سے آندھرا کو دکن سے علیحدگی کا موقعہ ملا۔ گو وشنو وردھن بھی کرناٹکی تھا اور کنڑی بولتا تھا اس لیے پہلے پہل اس نے الاکرناٹک کا مرپرستی کی اور غالباً اسی وجہ سے آندھرا اور ملک تامل کے بعض علاقے آج بھی کرناٹک کہلاتے ہیں۔ تاہم چند سال کے بعد تلنگی روایتیں ہر طرف چھانے لگیں اور تلنگی زبان و ادب غالب آنے لگا۔ وشنو وردھن کے جانشین آہستہ آہستہ آندھرائی ہو گئے اور مقامی روایات اور زبان کو ترقی دینا شروع کیا۔ پھر یہ سلسلہ یہیں نہیں ٹوٹا بلکہ آندھرا کی رفتار ترقی برابر جاری رہی۔ اگرچہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں۔ واشٹراکت بر سر اقتدار ہو گئے اور چالوکیوں کا دوسرا دور شروع ہوا مگر آندھرا دیش کی انفرادیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ لیکن جب بارھویں صدی میں چالوکیان کلیانی کا خاتمہ ہو گیا تو آندھرا دیش کے اچھے دن لوٹ کر آئے اور اس کو ایک نئی زندگی حاصل ہو گئی۔ کیونکہ یہاں پہلی مرتبہ کاکتیا خاندان کی سرپرستی میں ایک قومی حکومت قائم ہوئی جو تلنگی ادب اور رعایا کی پرستار تھی۔

بارھویں صدی سے آندھرا پردیش کا روشن زمانہ شروع ہوتا ہے' جب کہ کاکتیا خاندان یہاں راج کرنے لگا۔ کاکیتا راجگان چالوکیہ سلطنت کے صوبہ دار تھے۔ جب کلیانی کی چالوکیہ سلطنت دم توڑنے لگی تو یہ صوبہ دار آندھرا میں خود مختار بن بیٹھے۔ یہ آندھرا دیش کا ایسا زمانہ ہے جس میں یہ خطہ اپنی تلنگی زبان اور تمدن کے ساتھ نمایاں ہوا۔ کاکیتا راجگان جو راجہ' بھیم کے اولاد میں ہیں خصوصیت طلقانہ کے رہنے والے اور تلنگی زبان اور تمدن کے پرستار تھے۔ یہ دو سو سال کی زرخیز تاریخ ہے جس میں آندھرا قومیت' زبان اور تمدن کے خدوخال نمایاں ہوئے اور یہ خطہ دکن کے دوسرے خطوں سے الگ ہو گیا۔ کاکیتا خاندان کے تین راجگان پرتاپ رودر' دیو' راجہ گنپتی' رودرما دیوی بڑے راجہ گذرے ہیں جنھوں نے تلنگی ادب و روایات کی دل سے آبیاری کی۔ تلنگی زبان اور ادب کو اس قدر سینچا کہ یہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی اور ملک کے تمام شعبہ حیات میں زندگی کی ہر دوڑ گئی ہنمکنڈہ جو اس خاندان کا پایۂ تخت تھا تلنگی تمدن سے جگمگا اٹھا یہاں عمارتیں بنیں' بازار سجائے گئے جن کی خرید و فروخت اس زمانے کی تمام تمدنی ضروریات پوری کرتی تھیں۔ اس زمانے کے مورخ ہنمکنڈہ کی تمدنی زندگی کا بہت اچھا نقشہ کھینچتے ہیں۔ بازاروں میں رونق تھی شہر میں مسافروں کی پوری نگہداشت ہوتی تھی اور شہر میں مسافروں کے کھانے پینے کے لیے جگہ جگہ ہوٹل کھلے ہوئے تھے جس میں اچھے کھانے مل جاتے تھے۔ شہری زندگی صاف ستھری تھی اور علمی و سماجی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ یہ اچھے خاصے تمدن کا نقشہ ہے۔ اس کی تصدیق اس دور کے آثار باقیہ اور ادبی ذخیرے سے ہوتی ہے۔ ہنمکنڈہ میں ہزار ستون والا مندر اور پاکھال میں رامپا کا دیول کاکیتا خاندان کی بڑی نشانیاں ہیں۔ ورنگل قلعے میں سنگ تراشی کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ پتھر کی ایسی لطیف تراش جس میں باریک نقش و نگار اور پھول اور پھول کی پنکھڑیاں دکھائی گئی ہوں حیرت سے خالی نہیں ہے۔ ادب و زبان کے معماروں میں کئی نام آتے ہیں جنھوں نے تلنگی زبان کو پروان چڑھایا اور ذہنی کدوکاوش سے مالا مال کیا۔ تلنگی زبان کی ترقی زیادہ تر اسی کاکیتا دور کی رہین منت ہے تکنّا شاعر کا نام سب جانتے ہیں جس نے مہابھارت کو تلنگی زبان میں منتقل کیا تھا۔ چنانچہ تلنگی زبان پڑھنے والے اسی شاعر کی بدولت قدیم تاریخ اپنی زبان میں پڑھنے کے قابل ہوئے تھے۔ مہکارا اور میرتا جو تکنّا سوامی کے چیلے تھے دو بڑے شاعر ہیں۔ جنھوں نے نظم میں اس دیش کی تاریخ اور بزرگوں کی سوانح قلم بند کی اور اس طرح تلنگی زبان اور ادب کو سنوارا تھا سوا اکا سینپا اور گرستی چاری اس دور کے فلسفی اور معلم اخلاق گذرے ہیں جنھوں نے اپنی مذہبی نظموں سے عقائد میں جلا پیدا کی اور ملک کی دینی اور اخلاقی فضا کو شگفتہ بنایا آندھرا کے رہنے والے ان معماران تہذیب و تمدن کو نہیں بھول سکتے۔

تیرھویں صدی کے آخری برسوں میں آندھرا تاریخ کا جدید دور شروع ہوتا ہے کیونکہ اس زمانے میں یہاں ترکوں کی آمد شروع ہوئی اور ترکوں کے کاروان ، گوداوری اور کرشنا کی وادیوں میں اپنا پڑاؤ ڈالنے لگے۔ ترکوں کے جو قبیلے دکن میں وارد ہوئے وہ خلجی اور تغلق کہلاتے ہیں۔ خلجی حملہ آوروں کو آندھرا سے صرف دُور کا ہی واسطہ رہا۔ ان کی یورشیں آندھرا میں ایسی اثرانداز نہیں ہوئیں کہ ان کو مقومات کا درجہ دیا جائے۔ ملک کافور ایک آندھی کی طرح آیا اور چلا گیا۔ لیکن ان کے پیچھے تغلق حملہ آور فاتحانہ شان سے آئے اور اپنی سیاست کا جال بچھا دیا۔ ۱۳۲۳ء میں ورنگل کی بساط الٹ دی اور آندھرا میں اپنی عملداری قائم کر دی اور سیاست کے نئے ڈھنگ ڈالے۔ اب آندھرا میں دہلی کی نئی روشنی پڑھ رہی تھی۔ امیرانِ صدہ جو ترک نظم و نسق کے ذمہ دار قرار دیئے گئے ہیں وہ آندھرا کے مختلف گوشوں میں نظر آنے لگے۔ ان لوگوں نے نئی رعایا کے ساتھ ایسا بھائی چارہ کیا کہ لوگ پرانی حکومت کو بھولنے لگے۔ تلنگانے کے عام نمایاں اور ادارات جوں کے توں رکھے گئے۔

ان امیرانِ صدہ کی دھندلی نشانیاں شائد آج بھی آندھرا کے بعض گوشوں میں نظر آتی ہیں۔ چونکہ یہ سب ترک تھے۔ اسی وجہ سے آندھرا میں عام مسلمانوں کو ترکولو کہا جاتا ہے اور ان کی زبان کو ترکا ماٹا کہتے ہیں۔ لیکن دہلی کا راست نظم و نسق پچاس سال سے زیادہ نہیں رہا۔ ۱۳۴۷ء میں دکن کے امیرانِ صدہ دہلی سے سرتابی کر بیٹھے اور دکن کی ایک خود مختار سلطنت بنالی۔ جس میں مرہٹواڑہ اور کرناٹک کے ساتھ آندھرا بھی شامل تھا۔ علاءالدین بہمن شاہ کی بدولت جو اس سلطنت کا بانی ہے یہ سلطنت بہمنی کہلاتی ہے۔ بہمنی سلطنت کوئی ڈیڑھ سو سال تک دکن پہ چھائی رہی۔ پندرھویں صدی میں یہ سلطنت اس قدر پھیل گئی کہ گوداوری سے مسولی پٹنم تک اس کے ڈانڈے مل گئے۔ آندھرا بہمنیوں کا مشرقی صوبہ بنا۔ جہاں اقوام الدین کبیر اور قوام الدین صغیر، اعظم ہمایوں ، ملک حسن بحری ، جیسے جلیل القدر صوبہ داروں نے اس کا نظم و نسق سنبھالا۔ محمود گاواں نے جو اس سلطنت کا بڑا وزیر تھا آندھرا کے دو حصے کر دیئے اور دو صوبہ داریاں بنالیں۔ لیکن یہ تقسیم بہت دنوں تک نہیں چلی۔ خواہ آندھرا کی تقسیم ہو یا نہ ہو بہمنی بادشاہوں نے دل سے اس خطے کی آبیاری کی۔ بہمنی ایک بلند پایہ تمدن کے علمبردار تھے جن کی نظر سیاست اور تمدن کے دور دراز گوشوں تک پہنچتی تھی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ بہمنی بادشاہوں نے اپنی سلطنت کی لسانی بنیاد پر تقسیم کی تھی اور زبان اور تمدن کا لحاظ کرتے ہوئے صوبہ داریاں بنائی تھیں۔ کرناٹک اور مرہٹواڑہ کے ساتھ جو جداگانہ صوبے تھے آندھرا بھی اپنے جغرافیائی حدود کے اندر ایک علٰحدہ صوبہ ہو گیا اور اس کی بدولت اہل آندھرا کو اپنی زبان ، اور روایات کو فروغ دینے کا موقع ملا۔ گو حکومت بہمنی تھی لیکن معاشرتی اور تمدنی ماحول وہی تھا جو کاکتیا زمانے میں پایا جاتا تھا۔ نئی سیاست اور میل ملاپ اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہا۔ آندھرا کی بود و باش وضع قطع میں یہ اثرات پائے جاتے ہیں۔ ہنمکنڈہ ، بالکنڈہ ، مرتضیٰ نگر گنٹور ، مصطفیٰ نگر کونڈاپلی ، سکول ، مسولی پٹنم بہمنی تمدن کے بڑے مرکز تھے۔ ان کا اثر دور دور تک پڑتا تھا۔ ان گھرانوں میں امیرانِ صدہ کے نام لیوا ابھی تک اپنے قدیم روایات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

پندرھویں صدی کے شروع میں پھر سیاسی بساط الٹ گئی۔ بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور دکن کے ٹکڑے ہو گئے۔ اس سلطنت کے جتنے صوبے تھے اتنی ہی خود مختار سلطنتیں بن گئیں۔ اس فہرست میں گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت بھی ہے۔ قطب شاہیوں کی دو سو سال کی تاریخ ایک عہد آفریں زمانہ ہے۔ جس میں پورے آندھرا دیش کی قسمت جاگ اٹھی۔ قطب شاہوں نے اس دیش کی اس قدر آبیاری کی جیسے تولو بادشاہ کرتے ہیں۔ حالانکہ قطب شاہ باہر سے آئے تھے۔ ان کو بعضوں نے نو آموز اور نو دولتی سمجھا تھا۔

لیکن چند دنوں میں معلوم ہوا کہ یہ بڑے کامیاب حکمراں ہیں۔ ان کے ساتھ بادشاہی کا بہت بڑا سرمایہ آیا تھا۔ یہ چند سال کے اندر اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ ایسے گھل مل گئے کہ کاکتیا خاندان کی طرح قومی بادشاہ ہو گئے۔ شائستگی، و لطافت، رعایا پروری اور مذہبی اور سماجی رواداری اس خاندان کا خاصہ تھا۔ اپنی تلنگی رعایا کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ وہ ان کے بھائی بند ہیں۔ ان کی روایات کا پاس کیا۔ ان کے مذہبی جذبات کی برداشت کی اور ان کے دینی اور اخلاقی ترقی کی راہیں کھول دیں۔

سلطان قلی قطب شاہ جو ہمدان سے آیا تھا اپنی رعایا میں اس قدر ہر دل عزیز تھا اس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ سب لوگ اس کو ملک کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس کے جانشینوں نے قوم پرستی کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ابراہیم قطب شاہ اپنی ملک پرستی کی وجہ سے اتنا مشہور تھا کہ وہ تمام آندھرا میں ملک ابراہیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملک کی ترقی کے لیے اس نے نہ صرف تمام مادّی ذرائع اختیار کئے۔ بلکہ ذہنی و اخلاقی ترقی کا سامان جمع کیا۔ اس نے ایک بہت شائستہ نظام حکومت بنایا۔ راستے تیار کرائے تاکہ تاجر اور مسافر بے کھٹکے آمد و رفت کر سکیں حسین ساگر، پرویل اور ابراہیم پٹن کے بڑے ذخیرۂ آب تو اس کی مادی یادگاریں ہیں لیکن تلنگی کے شاہکار سنجھوردن پاکھیا لم اور یپاتی چرتر اس کی علمی یادگاریں ہیں۔ جنھیں تلنگی کے مشہور شاعر گنگادہر اور تلنگنا آریہ نے اس بادشاہ کی سرپرستی میں لکھی۔

محمد قلی قطب شاہ جو شہر حیدرآباد کا بانی ہے وہ آندھرا دیش کا بڑا معمار ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ اس نے اپنے بزرگوں سے زیادہ تلنگانے کی سیاسی اور سماجی خدمت کی۔ شہر بسائے، عمارتیں بنائیں، دینی اور اخلاقی ترقی کا انتظام کیا۔ خود تلنگی سیکھی اور اس میں اشعار کہے۔ محمد قلی نے اپنی دکنی نظموں میں تلنگانے کی تمام معاشرت اور روایات کا ایسا اچھا مرقع کھینچا ہے کہ گویا وہ اس کی اپنی روایتیں ہیں۔ اس نے ترکی اور ایرانی پوشاک اُتار دی تلنگانے کا لباس پہنتا تھا کہ گویا وہ آندھرا کا سچا سپوت ہے۔ گولکنڈہ کا آخری تاجدار ابوالحسن تانا شاہ اپنی قوم پرستی اور رواداری کی بدولت آج آندھرا دیش کے ہر بچے کی زبان پر ہے۔ بھدرا سوامی کا مندر جو دریائے کرشنا پر واقع ہے اور بھدرا چلم جو گوداوری کی وادی میں ہے، اس کی رواداری کی زندہ مثالیں ہیں۔ اس کے بلند کردار جس میں رواداری اور رعایا پروری بھری ہوئی تھیں۔

تاریخ گولکنڈہ کا قیمتی سرمایہ ہے تانا شاہ نے ہر موقع پر اپنے بلند کردار کا مظاہرہ کیا۔ جب ۱۶۸۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو بادشاہ اور اس کے جنرلوں نے آٹھ مہینوں تک محاصرین کے چھکے چھڑا دیئے لیکن ایک جنرل کی بیوفائی سے ۲۱ ستمبر کی رات کو قلعہ کا دروازہ کھل گیا تو اس وقت قطب شاہی تمدن کے اخلاقی جواہر آنکھوں کے سامنے آئے۔ ایک طرف بادشاہ نے پورے تمکنت اور وقار کے ساتھ حملہ آوروں کا خیر مقدم کیا تو دوسری طرف اس کے وفادار جنرل عبدالرزاق لاری نے قلعہ کی مدافعت میں اپنی وفاداری کی آخری بازی لگادی۔ جس کو دیکھ کر سب دوست دشمن حیران ہو گئے۔ جب مغل جنرل روح اللہ خاں اور اعتبار خاں تانا شاہ کو گرفتار کرنے کے لیے آئے تو ان کے ساتھ اس نے پیٹ بھر ناشتہ کیا اور مزے مزے کی باتیں کیں اور ان کے ساتھ اسی شان کے ساتھ چلا کہ تیوری پر بل تک نہیں تھے۔ راستے کے دونوں طرف لوگ دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ مگر اس مسند سے یہ کہتے ہوئے اُٹھا کہ "سرارادت ماد آستان حضرت دوست کہ ہر چہ بر سرمائی رود ارادت اوست" ـــــ جب عبدالرزاق لاری کو خبر لگی کہ دروازہ کھل گیا تو اس نے مغل حملہ آوروں پر دلیوانہ وار تلواریں چلانا شروع کیں کہ اس کے ہاتھ سے آخری خدمت ہو جائے ـــــ "ماجان دارم نثار راہ ابوالحسن خواہیم نمود" کی دل ہلا دینے والی آواز دور دور تک سنائی دیتی تھی اور وفادارانہ آغاز آج بھی

گولکنڈے کی بوسیدہ دیواروں میں سنائی دیتی ہے۔ یہ بلند کردار گولکنڈے کے انمول جواہر ہیں جن کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی اور اس کی عظمت کے گیت گائے جاتے ہیں۔ جس بلند کردار سے یہ سلطنت شروع ہوئی تھی اس کا انجام بھی اسی شان سے ہوا۔ اسی وجہ سے تاناشاہ کو آج ہر ہندو گھر میں رشی سمجھا جاتا ہے۔

قطب شاہوں کے تمام تمدنی کارناموں کا جائزہ لینا مشکل ہے۔ اس پر ضخیم جلد لکھی جا سکتی ہے۔ قطب شاہوں نے آندھرا دیش کی اس قدر تمدنی خدمت کی کہ وہ ان کی وطن کی خدمت ہے۔ بہترین نظم و نسق قائم کیا نہایت دیانت داری کے ساتھ اہل ملک کی قسمتوں کے فیصلے کیے۔ علماء کی سرپرستی کی جس میں عربی، فارسی اور تلنگی ہر چیز شامل ہے۔ عربی اور فارسی میں کتابیں لکھائی گئیں تو تلنگی میں نظم و نثر کا ذخیرہ جمع ہوا۔ مدرسے اور مسجدیں بنائیں۔ زراعت اور صنعت و حرفت کو اس قدر ترقی دی کہ گولکنڈہ ایک عمری مملکت معلوم ہوتی تھی۔ لکڑی اور لوہے کی صنعتیں ترقی پا گئیں۔ لوہے کے ہتیار بیرون ہندوستان بھی جاتے تھے۔ کپڑوں میں تن زیب، جھینٹ اور قلم کار تمام ہندوستان میں مشہور تھے۔ مسولی پٹنم کے قلم کار جو آج بڑے خاندانوں میں دستیاب ہیں وہ قطب شاہی زمانے کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ لیکن قطب شاہوں کا سب سے بڑا کارنامہ شہر حیدرآباد کی تعمیر ہے۔ موسیٰ ندی کی وادی میں جہاں اس شہر کی تعمیر کی گئی چند جھونپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں کبھی بنجاروں کے ٹانڈے گذر جاتے تھے۔ سنہ ۱۵۹۱ء میں جب کہ تقویم ہجری کا دوسرا الف شروع ہوتا ہے۔
محمد قطب شاہ نے چار مینار کا سنگ بنیاد رکھا تھا، وہ دن لوگوں کو برسوں یاد تھے کہ تلنگانے کے مزدور تلنگی گیتوں کے کورس پتھر پر پتھر چینے رہے۔ شہر حیدرآباد کو اس شان اور پاکیزہ منصوبے کے ساتھ آباد کیا گیا کہ وہ قرون وسطیٰ کا عجوبہ تھا۔ شہر کے بیچ میں چارمینار کی شاندار عمارت تیار کی گئی اور اس کے چاروں طرف چار سیدھی سڑکیں بنائی گئیں اور سڑکوں کے دونوں طرف ہم وضع عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ شہر تمام شہری ضرورتوں سے آراستہ تھا۔ چاروں طرف نہریں دوڑتی تھیں کہ ہر گھر میں پانی پہنچ جائے۔ بیماروں کے لئے دارالشفاء جیسا ہسپتال بنایا گیا۔ جہاں ہر قسم کے علاج کا انتظام تھا۔ سیاحوں، تاجروں اور صناعوں کے رہنے سہنے کی تمام سہولتیں مہیا کی گئیں۔ عمارتوں کو دیکھو تو ایک سے ایک بلند تھی۔ خداداد محل کی بلندی اور نقش و نگار دیکھنے والوں کو ششدر کر دیتی تھیں۔ داد محل اور امان محل میں مظلوموں کی فریادیں سنی جاتی تھیں اور انصاف کیا جاتا تھا۔ چار محل اور چندن محل کی مینا کاریاں آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی تھیں۔ گگن محل کی بلند منزلوں سے تالاب حسین ساگر کی تموج کا نظارہ ہوتا تھا۔ یہ ہے شہر حیدرآباد جس کے متعلق فرانسیسی سیاح ٹیورنر نے کہا تھا کہ پاکیزہ شہر ہے۔ ولیم میتھولڈ نے لکھا تھا کہ ہندوستان کا بہترین شہر ہے۔ مورخ فرشتہ جو ہندوستان کے تمام شاہی شہروں یعنی فتح پور سیکری، اکبرآباد وغیرہ سے واقف تھا لکھتا ہے کہ "شہرے در تمامی ہندوستان، شرقاً، غرباً، شمالاً، جنوباً مثل آں لطافت و صفا ہرگز یافت نمی شود"۔ محمد صادق شہنشاہ اورنگ زیب کا خاص مورخ ہے حیدرآباد کے متعلق لکھتا ہے کہ "آرام گاہ بے است بر قطعہ زمین و بہشت راحت جسم و آرام جاں آبادی و وسعت تراز احاطہ خیال عمارات وسیع تراز پایۂ اندیشہ عذوبت و اطافت چشمہا شادابی سبزہ بہ رتبہ کہ بنداری کہ گل و سبزہ ہائیں زمین مآب رنگ زمرد و لعل است"۔ حالانکہ یہ مورخ شہنشاہی شہر شاہ جہاں آباد کا رہنے والا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے حیدرآباد کے مقابلے میں شاہ جہاں آباد کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ جس طرح حیدرآباد قطب شاہوں کے زمانے میں حکومت کا شاندار مرکز تھا اب گہوارۂ تمدن ہے جس کی شعاعیں دور، دور تک پہنچتی ہیں۔ آج تمام آندھرا کا حیدرآباد ایک ہی شہر ہے اور یہ قطب شاہوں کا عطیہ ہے۔
۱۶۸۷ء میں گولکنڈے کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت مغل شہنشاہیت میں ضم ہوگئی۔ جس میں آندھرا پردیش بھی تھا۔ لیکن ابھی

سلطنت جنوب میں مضبوط ہونے نہیں پائی تھی کہ شہنشاہ اورنگ زیب کا ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوگیا اور شہنشاہیت کے جلد جلد تار و پود بکھرنے لگے۔ ان مایوس کن حالات میں نظام الملک آصف جاہ نے ۱۷۲۴ء میں شکر کھیڑے کی جنگ کے بعد دکن میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کرلی۔ یہ بہت وسیع سلطنت تھی جو دریائے تاپتی سے لے کر جنوب میں مدراس تک پھیلی ہوئی تھی جس میں آندھرا بھی ایک صوبہ تھا نظام الملک اور ان کے جانشینوں نے دکن اور آندھرا کی تمام روایتیں باقی رکھیں۔ گولکنڈہ سرکار سے مندروں کو امداد ملتی تھی۔ وہ برابر جاری رہی۔ ابھی تک بعد راجلم کی نذر گنگ کو تھوڑا سا روپیہ ملتا ہے۔ لیکن نظام الملک کے جانشین صلابت جنگ کی کمزوری سے ایک تاریخی حادثہ ہوگیا۔ پہلے مشرقی آندھرا حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا اور ان پر انگریز قابض ہوگئے۔ یہ سات [illegible] کا زرخیز علاقہ ہے جس میں سکاکول، راجمنڈری، ایلور، گنٹور اور کنڈہ پلی شامل ہیں۔ اور ان کو شمالی سرکار کہتے ہیں۔

آصف جاہی سلطنت کو ان سے ہاتھ دھونا پڑا۔ حیدرآباد کے ہاتھ میں صرف تلنگانہ کے (۹) اضلاع رہ گئے اور مشرقی گھاٹ حد فاصل قرار پائی۔ شمالی سرکار پر پہلے فرانسیسی قابض ہوئے تو بعد میں انگریزوں نے ان سے چھین کر اپنا راج قائم کردیا۔ اس سے آندھرا دیش میں خلیج حائل ہوگئی۔ مشرق میں انگریزی راج تو تلنگانے میں مغلائی عملداری میں جہاں نظم و نسق میں تفریق ہو جاتی ہے تو معاشرت، ذہنیت اور روایات میں بھی بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ اس پر آج دو سو سال گذر گئے۔ ۱۷۶۶ء میں شمالی سرکار حیدرآباد سے الگ ہوئے تھے اور آج ۱۹۵۶ء تک یہ تفریق باقی رہی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ جدید سیاست میں دونوں خطے آندھرا اور تلنگانہ جوڑ دیئے گئے ہیں اور ہم اس کو آندھرا پردیش کہہ رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس دیش میں ہماری قدیم پاکیزہ روایتیں باقی رہ جائیں گی۔ (نذر محمد قلی قطب شاہ ۱۹۵۸ء سے)

چارمینار حیدرآباد کی یہ مشہور عمارت ہر دیکھنے والے کو اپنی جانب متوجہ کئے بنا نہیں رہتی۔ چارمینار کی تعمیر سے ہندو مسلم اتحاد کی ناقابل تردید مثال اہل ہند کے سامنے قرار پاتی ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد قلی نے چارمینار کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد پر ہی رکھی۔ اس کا ثبوت چارمینار کے بالائی حصہ پر جانے پر مل جاتا ہے۔ چنانچہ اگر اعتبار چوک کی جانب سے چارمینار پر نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ وہ مندر کا حصہ ہے۔ البتہ مندر کے کلس اس وقت موجود نہیں ہیں۔ اور اس کا پتہ نہیں چلتا کہ یہ کب اور کس نے نکل وادیئے۔ ہم بلا خوف تردید یہ تحریر کر سکتے ہیں کہ سلطان محمد قلی اپنی رعایا کے مذہبی احساسات کو مجروح کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی اس کی مذہبی رواداری کا ثبوت ہے۔ وہ خود اپنے مذہب کا پابند تھا اور دوسروں کو بھی یہی تلقین کرتا تھا اس دور کی مذہبی پابندیوں کا ثبوت اس امر سے بھی مل جاتا ہے کہ اس کے داماد نے مکہ مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ مکہ مسجد ہندوستان کے مساجد میں عظیم الشان مسجد کہی جاتی ہے اور یہ سلطان محمد قطب شاہ کی یادگار ہے۔ سلطان نے ۱۶۱۷ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھتے وقت حاضرین کو مخاطب کرکے کہا کہ جس شخص کی نماز تہجد کبھی قضاء نہ ہوئی ہو وہ اس خانۂ خدا کا سنگ بنیاد رکھ سکتا ہے، مگر حاضرین میں سے کسی نے بھی جرأت نہیں کی۔ جب کوئی شخص جرأت نہ کرسکا تو اس نے یہ کہتے ہوئے کہ میں ایک ایسا بندہ خدا ہوں۔ جس کی نماز تہجد آج تک قضا نہیں ہوئی۔ ہمارا خیال ہے عبادت الٰہی کے تعلق سے اس قدر زبردست دعوے کرنا کوئی آسان بات نہیں۔ ایسا ہی شخص یہ کہہ سکتا ہے۔ جس کا ضمیر پاک اور جس کے دل میں خوف خدا ہے اور جس نے عبادت الٰہی کو اپنی روزانہ زندگی کا ایک جزو بنالیا ہو اور اس پر باعمل ہو۔ (کرشنا سوامی مدیراج ۱۹۵۵ء)

نقد و نظر

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

مجموعہ کلام :- مخدوم محی الدین ناشر :- ادبی ٹرسٹ حیدرآباد

بساطِ رقص ملنے کا پتہ :- اردو اکیڈیمی بکڈپو، سیف آباد، حیدرآباد۔ (۲۶۳) صفحات (مجلد) قیمت ۱۲/- روپے

بساطِ رقص کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ اور اب دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی اشاعت پر تبصرہ کرنا کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن "سب رس" کی فائل سے ظاہر ہے کہ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد بھی اس پر تبصرہ نہ چھپا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مخدوم اور مخدوم کی شاعری کا نہ تعارف کی محتاج ہے اور نہ تبصرہ کی۔ لیکن یہ حسین مجموعہ کچھ سوچنے اور کچھ لکھنے پر اکساتا ہے۔ اس مجموعہ میں مخدوم کے ہر روپ کا عکس موجود ہے۔ وہ کہیں "بیٹھکی ہوئی نکی" ہے تو کہیں "پیامبر انقلاب"، کہیں سسکتی ہوئی جوانی ہے تو کہیں گنگناتا ہوا شباب۔ کہیں اندھیروں میں گم تو کہیں شعلہ، کہیں قصرِ سرمایہ داری میں ہلچل مچانے والا نعرہ تو کہیں دلوں کو گرمانے والا سُریلا راگ۔

اردو کتابیں اور خصوصاً منظوم تخلیقات کی چند جلدوں کا بک جانا تو ممکن ہے لیکن ایک ایڈیشن کا مختصر عرصے میں بک جانا اور کتاب کا نایاب بن جانا "بساطِ رقص" کی مقبولیت کا بہترین ثبوت ہے۔ اس مجموعے کے ہر صفحہ پر ذہنی انبساط کے ساتھ ساتھ دعوتِ فکر بھی ملتی ہے۔ بہت جلد تیسرے ایڈیشن کی اشاعت کی بھی ضرورت پیش آئے گی۔ (غلام جیلانی)

مسیح انجم کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

"دریں دہ" مطبوعہ "زندہ دلان" حیدرآباد مجلد (۱۳۲) صفحات قیمت چھ روپیہ

مسیح انجم کے مضامین کا یہ مجموعہ بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے۔ اور دیدہ زیب ڈسٹ کور سے آراستہ ہے۔ مزاح کی ان خصوصیات میں دوسروں کا مذاق اڑانا تو ہوتا ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو بھی نشانہ بنالینا بھی شامل ہے۔ ایسا کرنا نہ صرف ہنسی بلکہ اعلیٰ ظرفی کی علامت ہوتی ہے۔ کرشن چندر مرحوم کا مسیح انجم سے متعلق یہ کہنا کافی حد تک درست ہے کہ "ان کے مزاح کی ایک خصوصیت مجھے بے حد پسند آئی وہ یہ کہ دوسروں پر ہنسنے کی بجائے وہ اپنے آپ پر ہنستے ہیں"۔ ہمارے خیال میں مسیح انجم دوسروں پر بھی ہنستے ہیں اور دل کھول کر ہنستے ہیں۔ اور ہنستے ہنستے ہنسی کی پھلجھڑیوں کے ساتھ ساتھ سماجی برائیوں کے زہر میں بجھے ہوئے طنز کے خنجر چبھتے جاتے ہیں۔ جو قاری کو داد و تحسین سے آشنا کرتے والے چرکے دے جاتے ہیں۔ اس مجموعے سے متعلق ہمیں صرف ایک شکایت ہے ایسا معلوم ہوتا ہے مسیح انجم بعض مضامین بڑی جلدی میں لکھ گئے ہیں ہوسکتا ہے کہ کسی محفل میں پڑھنے یا کسی رسالہ کے مدیر سے وعدہ نباہنے کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ اگر حقیقت یہی ہے تو ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں کہ وہ کم از کم ان اہلِ قلم حضرات میں سے نہیں جو چند سطور لکھنے کے لئے بار بار یاد دہانی کے خواہاں ہوتے ہیں اور کچھ حجاب کر بیٹھے ہیں تو پھر یہ ہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ (غلام جیلانی)

مولانا محمد علی: شخصیت اور خدمات (مرتبہ خضر یمنی) صفحات (۲۲۴)

ناشر: ادبی سنگم جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ قیمت ۲۰/۰ روپے

مولانا محمد علی جوہر نہ صرف ایک شعلہ مقال مقرر، ولولہ پرور شاعر، بیباک صحافی، جنگ آزادی کے صف اول کے مجاہد ہی تھے بلکہ ایک مخلص اور پاکباز انسان بھی تھے۔ انھوں نے کامریڈ اور ہمدرد نکالا اور انگریزوں سے اپنی صحافت اور انگریزی اسلوب کی داد حاصل کی۔ انھوں نے تحریک خلافت کی بنیاد ڈالی اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ اپنوں سے بھی بیر مول لے لیا۔ مولانا ہوش سے زیادہ جوش کے قائل تھے۔ جب تک زندہ رہے ہندوستان اور یورپ میں ان کا طوطی بولتا رہا۔ تنظیم ریفا قابل مبارکباد ہیں کہ جنھوں نے ایک ایسی شخصیت کی سوانح یکجا کر ڈالی جس کو ہم ہندوستانیوں نے تقریباً فراموش کر دیا تھا۔ اس کتاب میں اہم دانشوروں کے مقالے شامل ہیں جن میں رشید احمد صدیقی، عبدالماجد دریا آبادی، یوسف حسین خاں، سید عابد حسین، امتیاز علی خاں عرشی، خضر برنی، صوفی نذیر احمد، ضیاالدین احمد برنی اور ہاشم قدوائی کے نام لائق ذکر ہیں۔ ان لوگوں میں سے بیشتر ایسے ہیں جنھوں نے مولانا محمد علی کو دیکھا سمجھا اور پرکھا ہے۔

(مہ لقا ملک)

"گل و سنگ" (مجموعۂ کلام) خضر برنی

ناشر: ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ صفحات (۱۱۲) قیمت ۱۰/- روپے

خضر برنی حرکت اور جد و جہد کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تمام جوانی جنگ آزادی کے لئے وقف کر دی تھی اور اپنے ترانوں اور قومی نغموں سے ہندوستان کے عوام میں عزم اور ولولہ کی لہر دوڑا دی تھی۔ موصوف کی فکر میں ہمواری بھی ہے اور شعری تجربات میں دھیما دھیما سا ٹھہراؤ بھی۔ وہ براہ راست داغ اسکول سے متعلق ہیں۔ ان کے ہاں بے خودی، سرمستی اور بے ساختگی کے عناصر داغ اسکول کی وابستگی کا پتہ دیتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کا یہ قول درست ہے کہ خضر صاحب کے کلام میں سادگی، واقعات اور ان کی اپنی کیفیات کا عالم پایا جاتا ہے۔ مجموعہ کلام میں شاعر نے "تعارف" کے عنوان سے اپنے وطن بلند شہر کی تاریخی اور ادبی اہمیت پر سیر حاصل مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ اس سے موصوف کی علمی لیاقت اور نثری جوہر کا ثبوت ملتا ہے۔

(مہ لقا ملک)

"یہ ہے میرا ہندوستان" (از خضر برنی)

ناشر: ادبی سنگم، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵ صفحات (۱۷۲) قیمت ۱۰/- روپے

جناب خضر برنی، بقول گوپی چند نارنگ، کلاسیکی روایت اور رچا ہوا شعور ذہن و مزاج رکھتے ہیں، پختہ اور بامزہ شعر کہتے ہیں۔ وہ گزشتہ پچاس سال سے گلشن غزل کی آبیاری میں مصروف ہیں اور انھوں نے طوفانوں اور آندھیوں میں بھی اس کی تنزئین و آرائش کی ہے۔ خضر برنی کی شاعری محض جذبات کا اظہار نہیں ہے بلکہ اس میں غم و آلام کی حدیث، مستقبل کی تابناکی کی بشارت اور انسانی فطرت کی گتھیوں کا ذکر بھی مل جاتا ہے۔ وہ روایتی لفظیات کا استعمال ضرور کرتے ہیں لیکن نئی معنویت کے ساتھ۔ ان کی زبان اور اسلوب قاری کو زندگی اور توانائی کا پیغام سناتا ہے جو خضر جیسے قدامت پسند شاعر کے یہاں اس کی مثال نہیں تو پھر کیا ہے؟ اس مجموعے کی نظمیں، غزلیں خضر صاحب کے شعور فکر کی روشن علامتیں ہیں، جنھیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر عنوان چشتی کا خیال ہے کہ خضر برنی ان چند شاعروں میں سے ہیں جنھیں جملہ اصناف سخن پر دسترس حاصل ہے۔ ان کی غزلوں میں تغزل کا حسن ہے۔ یہ حسن ایک طرف بحروں کی نغمگی، قوافی کے آہنگ، ردیف کی پختگی اور الفاظ و تراکیب کے دروبست سے اور دوسری طرف حسن و عشق کی کیفیات، مسائل حیات، جذبات اور شکست جذبات سے عبارت ہے۔"

(مہ لقا ملک)

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ : علمی، ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم فروری : ریاستی نائب ناظم اعلیٰ تعلیم مسٹر آنی ودی چلیپتی راؤ نے "ادب اور تہذیب" کے موضوع پر سٹی کالج میں توسیعی لکچر دیتے ہوئے کہا کہ مکتب بینی کی عادت عقل و دانش کو جلا بخشتی اور زندگی کی لڑائی سے مقابلہ کرنے کی اہلیت پیدا کرتی ہے۔ مسٹر راؤ نے بتایا کہ سستا ادب جیسے فحش لٹریچر سے جسمانی قوت برداشت، دماغی چستی اور جذباتی دروں کا توازن متاثر ہوتے ہیں۔

۲ فروری : اردو اسوسی ایشن سکریٹریٹ کی طرف سے نمائش کلب میں رنگا رنگ کلچرل پروگرام ترتیب دیا گیا۔ جناب بھارت چند کھنہ ڈیپٹی کریاسی اردو اکیڈیمی نے صدارت کی، جناب صلاح الدین نیر سکریٹری اسوسی ایشن نے تعارفی و خیرمقدمی تقریر کی۔ جناب قادر جاوید نے خوش اسلوبی سے کارروائی انجام دی۔ مسرز وشل راؤ، اقبال قریشی پریم لتا، غفار تنویر، رکن الدین اور ششا سکینہ نے غزلیں سازوں پر سنائیں، مصباح اور عابد نے مزاحیہ خاکے پیش کئے۔

۳ فروری : کل ہند صنعتی نمائش کی طرف سے مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا، حمایت اللہ مصطفےٰ علی بیگ، گرگٹ حیدرآبادی، اسمٰعیل ظریف طالب خوندمیری، بوگس حیدرآبادی، اشرف خوندمیری، صبغتہ اللہ بھباٹ، سرپٹ، سپاٹ اور رشید عبدالسمیع جلیل نے کلام سنایا۔

۵ فروری : مشہور نقاد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی (دہلی یونیورسٹی) نے آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں "اردو یونیورسٹی کا قیام اور اس کا جواز" کے موضوع پر فاضلانہ لکچر دیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے صدارت کی۔

● یل ین لیتا میموریل چیاریٹیبل ٹرسٹ کے اعزازی معتمد نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ ادیبوں کو قومی سطح پر ایوارڈ دینے کی غرض سے ٹرسٹ مالیہ کی فراہمی کے سلسلے میں کلچرل پروگراموں کا انعقاد کرے گا۔

۶ فروری : مخدوم سوسائٹی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے شہرۂ آفاق ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کی (۶۹) ویں یوم پیدائش کے موقع پر اردو ہال میں طرحی محفل شعر جناب بھارت چند کھنہ کی صدارت میں منعقد ہوئی ڈاکٹر زینت ساجدہ نے معتمد مشاعرہ کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ جناب کھنہ نے مخدوم کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ اس محفل شعر میں مسرز شاذ تمکنت، کنول پرشاد کنول ڈاکٹر غیاث صدیقی، ارشد آذر، ناصر کرنولی، شمس الدین تاباں، امان ارشد، منوہر لال بہار، رحمٰن جامی مضطر مجاز، غیاث متین، رؤف خلش، علی الدین نوید، احسن فرخ، مسعود عابد، برق یوسفی، مرزا سرفراز علی، خورشید نذیر، بانو طاہرہ سعید، نقی علی خاں ثاقب، ڈاکٹر احسن رضوی، عظمت عبدالقیوم راجہ لال راجہ، علی سرور، اسمٰعیل ظریف، عزیز النساء صبا اور عبدالحکیم نے حصہ لیا۔ اردو ہال باذوق حضرات سے کھچا کھچ پر تھا اور یہ محفل بڑی رات تک چلتی رہی۔

۷ فروری : کل ہند صنعتی نمائش کے زیر اہتمام خواتین کی محفل شعر محترمہ بانو طاہرہ سعید کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف رفیع، ڈاکٹر اندرو شسٹ، سلطانہ شرف الدین، جمیلہ نشاط، سعادت جہاں رضوی سحر، مظفر النساء ناز، نسیم نیازی، نسیم آرا مہر اور نورالف و تسکین نے غزلیں سنائیں، خواتین کی بڑی تعداد نے مشاعرہ سنا۔

۸ فروری : بزرگ اور مقبول شاعر جناب علمی آفندی کا انتقال ہوگیا۔ علمی مختلف پریسوں میں کتابت کا کام انجام دیتے رہے اور زندگی بڑی ناآسودہ حالی میں گزری، پرگو اور عوامی سخنور تھے۔

۱۳ فروری : ماہر اقبالیات ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ (حال مقیم پاکستان) نے ادارۂ ادبیات اردو کے مختلف شعبوں کا معائنہ کیا۔ جناب اکبر الدین صدیقی معتمد کتب خانہ ادارہ نے شعبۂ مطبوعات و مخطوطات کی سیر کرائی۔ میر سراج الدین علی خاں نے "اردو میوزیم" سے متعارف کرایا۔

جناب عابد علی خاں رکن ادارہ اور جناب غلام جیلانی معتمد شعبۂ "سب رس" نے ڈاکٹر صدیقی کا ایوانِ اردو میں خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے کتب ارائے میں تحریر کیا کہ "مجھے انتہائی مسرت ہے کہ اپنے دیرینہ رفیقِ کار اور شفیق دوست عزیز ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کے بنائے ہوئے ادارۂ ادبیاتِ اردو کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ مرحوم سے زمانۂ طالب علمی اور زمانۂ پروفیسری جامعہ عثمانیہ بڑے عرصے تک ملتے رہنے کا شرف حاصل تھا۔ اور ان کے کام کی بڑی قدر کی جاتی تھی، افسوس ہے کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ جلد ہی داغِ مفارقت دے گئے۔ لیکن جس شاندار اور مفید کام ادارہ کی تخلیق اور تاسیس ان کے ہاتھوں سے ہوئی تھی بحمد اللہ وہ اب تک جاری ہے اور ان کے مخلص رفقائے کار کی محنت اور مساعی کی بدولت امید ہے کہ یہ کام مسلسل جاری رہے گا۔ جناب سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارہ نے ڈاکٹر صدیقی کو ادارہ کی مطبوعات کا سیٹ نذر کیا۔

● صدر جمہوریۂ ہند جناب فخر الدین علی احمد (متوفی ۱۱ر فروری ۱۹۷۷ء) کو حیدرآباد کے علمی و ادبی اداروں کی طرف سے منعقدہ جلسۂ تعزیت میں زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیاتِ اردو، ریاستی اردو اکیڈیمی، اردو مجلس اور اردو آرٹس کالج کی طرف سے بلائے گئے اس جلسہ کی صدارت پروفیسر حبیب الرحمٰن نے کی۔ مسٹر سریندر سس لاہوتی نے قرارداد تعزیت پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ "جناب احمد سیکولرازم اور جمہوریت کے استحکام کے لئے آخری سانسوں تک کام کرتے رہے۔ ہم ایک ایسے رہنما سے محروم ہو گئے ہیں جو اقلیتوں، اردو کی بقا، جمہوریت کے تحفظ، سوشلزم کے فروغ اور ملک کی سالمیت کی جدوجہد میں نیا عزم اور حوصلہ عطا کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے۔" جناب عابد علی خاں صدر نشین ریاستی اردو اکیڈیمی نے کہا کہ "جناب احمد مولانا آزاد کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات و احساسات کے نقیب تھے۔" جناب ہاشم علی اختر معتمد "ادارۂ ادبیاتِ اردو" نے بتایا کہ "جناب احمد ماہر نظم و نسق تھے اور نہایت جرأت و استقلال کے ساتھ مسائل کا حل تلاش کرتے تھے۔" ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر کل ہند انجمن ترقی اردو نے جناب احمد کو ایک وضعدار شخصیت قرار دیتے ہوئے کہا کہ "اردو اور اس کے مسائل سے انہیں مخلصانہ دلچسپی تھی۔" جناب شمس الدین تاباں نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر رحمٰن نے کہا کہ "اردو کے تعلق سے ملک میں جو اچھی فضا روشن ہوئی اس میں جناب احمد کا بڑا دخل رہا ہے۔"

۱۵ر فروری، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے ریاستی اردو اکیڈیمی کا معائنہ کیا۔ اور اکیڈیمی کی علمی و ادبی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی۔ جناب آصف پاشا صدر اکیڈیمی و ریاستی وزیر نے ڈاکٹر صدیقی کا خیر مقدم کیا۔ جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی اکیڈیمی، جناب سجارت چند گھنہ ڈائرکٹر اور جناب اختر حسن اسسٹنٹ سکریٹری اکیڈیمی کے علاوہ علم دوستوں نے بھی خیر مقدمی محفل میں شرکت کی۔ اکیڈیمی کا لٹریچر معزز مہمان کی نذر کیا گیا۔

● جناب حیات اللہ انصاری صدر نشین مرکزی ترقی اردو بورڈ نے ابوالکلام آزاد اورنٹیل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں "مادری زبان میں تعلیم کے موضوع پر لکچر دیتے ہوئے اردو والوں کو اس امر کا مشورہ دیا کہ "وہ اردو تعلیم کے ماڈل اسکول قائم کریں جو عصری ضروریات سے آراستہ ہوں، جناب اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ نے اس جلسہ کی صدارت کی اور جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ نے شکریہ ادا کیا۔

۱۸ر فروری، معروف غزل گو شاعر حضرت شاہد صدیقی کی ۱۵ ویں برسی کے موقع پر عقیدتمندوں کی طرف سے ان کی قبر پر چادرِ گل چڑھائی گئی اور فاتحہ خوانی بھی ہوئی۔

● بزم اردو سٹی کالج کے طلباء کو جناب حیات اللہ انصاری نے مخاطب کیا اور کہا کہ "اردو کسی ایک ریاست کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ زبان سارے ملک میں بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ اور اس کی ترقی کے لئے نوجوانوں کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ صدر نشین مرکزی ترقی اردو بورڈ دہلی نے بتایا کہ "بورڈ کی طرف سے معیاری نصابی کتب اور طلباء کے لئے رہنمایانہ لغت اور ڈکشنریوں کی ترتیب و اشاعت کا کام تیزی

سے تکمیل کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ابتدا میں
کالج کے پرنسپل نے جناب انصاری کا خیرمقدم کیا۔
۲۰ر فروری ۔ عالمی شہرت کے حامل ماہر
اقبالیات ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اقبال اکیڈیمی
کی طرف سے بلائے گئے ایک علمی جلسہ کو مخاطب کرتے
ہوئے کہا کہ مذہب اور سائنس میں زیادہ تضاد
نہیں ہے۔ انسان مابعد الطبیعیات کی منزل سے
گزرتے ہوئے شعور ذات کی جستجو اور طلب میں
مذہب کی حقیقت، حکمت اور ضرورت کو تسلیم
کرتا جا رہا ہے۔ پروفیسر صلاح الدین سابق صدر
شعبہ فلسفہ عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جناب
ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے ڈاکٹر
صدیقی کا پرتپاک خیرمقدم کیا۔ کریم رضا صاحب
معتمد اکیڈیمی نے شکریہ ادا کیا۔

● اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس
ڈاکٹر حسینی شاہد کی صدارت میں ہوا۔ ڈاکٹر زینت
ساجدہ بہ حیثیت نقاد و مبصر شریک بزم رہیں۔
ڈاکٹر غیاث صدیقی کی شخصیت اور شاعری پر
جناب مصلح الدین سعدی نے دلچسپ انٹرویو لیا۔
جناب احسن علی مرزا نے شمس الدین تاباں کی شعری
دینیات" کے موضوع پر خاکہ نما مضمون سنایا۔
مد ایک نظم "تین تاثر" کے تحت حامد مجازی کی نظم پر
ڈاکٹر یوسف کمال، جمیل شیدائی اور احمد قادری
نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ آخر میں شاعر نے بھی
وضاحت کی۔ محفل شعر میں تاباں، غیاث صدیقی
امان ارشد، وقار خلیل، رحمن جامی، رؤف خیر،
ڈاکٹر محمد رشید خضر، برق یوسفی، رحمت یوسف زئی
علی سرور اور حسام الدین سلیم نے کلام سنایا۔
ثمینہ عاصم نے شکریہ ادا کیا۔

۲۱ر فروری ۔ سردار پٹیل کالج کے شعبہ
اُردو کی جانب سے توسیعی تقاریر پروگرام کے تحت
ڈاکٹر زینت ساجدہ ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ
نے "جدوجہد آزادی میں اُردو کا حصہ" کے موضوع
پر مخاطب کیا۔ قبل ازیں جناب حبیب قادر شعبہ
بیک اڈمنسٹریشن نے ڈاکٹر ساجدہ کا خیرمقدم
کیا۔ جناب عاتق شاہ لکچرار شعبہ اُردو نے
شکریہ ادا کیا۔

۲۶ر فروری ۔ محفل خواتین کے تعزیتی
جلسے میں خواتین اور مہمان شعرا جنہوں نے جناب فخرالدین
علی احمد مرحوم کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا
مسز روڈا مستری سابق ریاستی وزیر نے صدارت کی
منیزہ کاوس جی، بلقیس علاء الدین اور عظمت
عبدالقیوم نے مضامین سنائے۔ بانو طاہرہ سعید
اور مظفر النساء ناز نے منظوم خراج عقیدت
ادا کیا۔ محترمہ سلطانہ شرف الدین نے جلسہ
کی کارروائی چلائی۔

● ادارۂ قدر ادب کے زیر اہتمام محفل
دو بیتی (رباعی) جناب مرزا سرفراز علی کی صدارت
میں منعقد ہوئی۔ ابتدا میں ظہیر حموی نے حضرت
شمس الدین فیض کی شاعری پر مضمون سنایا۔
(۳۰) شعراء نے رباعیات سنائیں۔

۲۳ر فروری ۔ آزاد میموریل سوسائٹی
کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد کی (۱۹) ویں
برسی کے موقع پر مسز حافظ ابو یوسف (ایم ایل سی)
احسن علی مرزا، محمود پاشاہ قادری اور کنول پرشاد کنول
نے زبردست خراج عقیدت ادا کیا اور مرحوم آزاد
کی قومی، ملی، ادبی اور صحافتی خدمات کی ستائش کی۔
جناب سرخواص لاہوتی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

۲۴ر فروری ۔ خانقاہ عنایت اللہ میں
حضرت شاہ ابوالبرکات غلام محمد زعم رضائی
القادری مشکل آسان ثانی کے عرس کے موقع پر حضرت
زعم کے صاحبزادے، ڈاکٹر سید محی الدین قادری
زور مرحوم کی سالانہ فاتحہ کے مراسم بھی انجام پائے۔

۲۵ر فروری ۔ گولکنڈہ فیسٹول کا افتتاح
کرتے ہوئے جناب ظہیر احمد سابق سفیر سعودی عرب
نے قطب شاہی دور کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور
یگانگت کے درثے کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ
کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس موقع پر یادگار
مشاعرہ "بالا والا بلیس" میں جناب اکبر علی خان
سابق گورنر اڑیسہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صد
شاعروں نے حیدرآباد کی علمی و ادبی تہذیب کے جشن
کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا۔ اس مشاعرہ میں
کنول پرشاد کنول، امیر احمد خسرو، سعید شہید علی،
ڈاکٹر غیاث صدیقی، منوہر لال بہار، شنکر لال
صلاح الدین نیر، نقی علی خان ثاقب، وقار خلیل، ...
خیال نے کلام سنایا۔ گولکنڈہ فیسٹول کمیٹی کی طرف سے
ایک سمپوزیم ڈاکٹر ڈی۔ راجا نج راؤ معتمد ریاستی تلگو
اکیڈیمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر گوپال کرشنا
ریڈر تلگو جامعہ عثمانیہ نے قطب شاہی دور کے
ادب پر مقالہ سنایا۔ جناب سراج الدین ریڈر تاریخ
جامعہ عثمانیہ نے قطب شاہی تہذیب پر مخاطب کیا۔

پہاڑی بچّے
ایک تابناک مستقبل کے منتظر ہیں

"جہاں دنیا چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور محدود گھریلو چار دیواریوں میں بٹی ہوئی نہ ہو میرے خدا آزادی کی ایسی جنّت میں میرے ملک کو بیدار کرنا" یہ تھا آزاد ہندستان کا اعلیٰ وارفع خاکہ جو ایک شاعر کے تخیل میں اُبھرا تھا لیکن ایک طویل عرصے تک ہندوستان میں گھریلو چار دیواریوں نے آدمی کو آدمی سے جُدا رکھا۔ اس لئے صبح آزادی کے طلوع کے بعد کمزور طبقات اور قبائیلی باشندوں کے ساتھ نئے انداز سے پیش آنے پر زور دیا جانے لگا۔

گذشتہ ۲۰ برسوں کے عرصے میں پہاڑی بچوں یعنی قبائیلیوں کی فلاح و بہبود پر پانچسالہ منصوبوں میں غیر منقسم توجہ دی گئی ہے پہلے پانچسالہ منصوبہ میں ۱۸۸٫۷ لاکھ روپیوں کے اخراجات کی گنجائش فراہم کرکے آندھرا پردیش میں قبائیلی علاقوں اور قبائیلی باشندوں کی فلاح وبہبود کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا گیا۔ دوسرا منصوبہ اس سلسلے میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ اس منصوبے کی مدت میں قبائیلی بہبود سے متعلق گوناگوں سرگرمیوں پر مشتمل اٹنور، اراکو، نرسم پیٹھ اور پاڑیرو میں چار کثیرالمقصدی پراجکٹس قائم کئے گئے۔

تیسرے منصوبے کے دوران میں ۲۴ قبائیلی ترقیاتی بلاکس کے قیام کی بدولت قبائیلی بہبود کے پروگراموں کو مزید بڑھاوا ملا۔ چوتھے منصوبے میں اخراجات کی سطح ۷۳۴٫۰۴ لاکھ روپے تک بڑھا دینے سے ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا کردی گئی اور اب پانچویں منصوبے کے پیش نظر رفتار تیز تر کردیا ہے۔

گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن جو اپنی قسم کا پہلا ادارہ ہے ان تمام برسوں کے دوران قبائیلیوں کو قرض اور مارکٹنگ کی سہولتیں فراہم کرنے میں نمایاں اور فائدہ مند کردار ادا کرتا رہا ہے اس کارپوریشن کی سرگرمیاں ۱۷ اضلاع پر محیط ہیں اور یہ اس سے ملحقہ ۲۸ ابتدائی انجمنوں اور ۴۰۲ گھریلو ضروریات کے ڈپوز کے ایک جال کے توسط سے اپنے کاروبار انجام دیتا ہے۔

منتخبہ قبائیلی علاقوں کی تیز رفتار ترقی کیلئے ۱۵۰ لاکھ روپیوں کے مصارف سے زراعت پر مبنی ایک ہمہ مقصدی پراجکٹ بنایا گیا ہے جو گریجن ڈیولپمنٹ ایجنسی کے نام سے معروف ہے۔ اس پراجکٹ میں مرکزی حکومت کا سرمایہ لگا ہے اور یہ ضلع سریکاکلم کے تعلقہ جات بالاکنڈہ۔ پاروتی پورم۔ سالور۔ ٹیکالی۔ سوم پیٹھ اور پاتھاپٹنم کے شیڈولڈ اور نان شیڈولڈ دونوں علاقوں پر محیط ہے۔ اس پائیلٹ پراجکٹ کی عمل آوری کے تخمیناً ۱۱۷۰ مربع میل علاقہ جس میں ۴۳۳۰۰ قبائیلی گھرانے ہیں منتخب کیا گیا ہے

پہاڑی بچے۔ قبائیلی۔ ایک ایسے تابناک مستقبل کی چمک دمک دیکھ رہے ہیں جو ان کی توقعات اور امیدوں کے عین مطابق ہے

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

DIPR 27/76-77

بھارتی معیشت میں وسیع پیمانے پر مزید ترقی کے روشن امکانات

بھارتی معیشت میں بڑی تیزی سے توسیع ہوئی ہے۔ بھارت نے نہ صرف سکے کے پھیلاؤ پر قابو پالیا ہے بلکہ اس کا رخ ہی موڑ دیا ہے اور قیمتوں میں ٹھہراؤ آگیا ہے۔

- اناج کی 11 کروڑ 80 لاکھ ٹن کی پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے اور اس وقت ملک میں ایک کروڑ 80 لاکھ ٹن سے زیادہ اناج کا اسٹاک ہے۔
- مالی سال کے پہلے چھ مہینوں میں صنعتی شعبے میں بارہ فی صد کی شرح سے ترقی ہوئی جب کہ پچھلے سال کی اسی مدت میں یہ صرف تین فی صد تھی۔ 77 - 1976ء میں پچھلے سال کے مقابلے میں دس فی صد زیادہ صنعتی پیداوار متوقع ہے۔
- اپریل سے ستمبر 1976ء تک کے عرصے میں 1975ء کی اسی مدت کے مقابلے میں بجلی کی پیداوار 16.4 فی صد بڑھی ہے۔
- اپریل سے اکتوبر 1976ء تک کے عرصے میں بھارتی برآمدات میں 33.9 فیصد کا قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور اسی مدت میں درآمدات میں 9 فیصد تک کمی ہوئی ہے۔
- بیرونی ادائیگیوں کی پوزیشن میں نمایاں بہتری ہوئی ہے غیر ملکی سکے کا ریزرو حصول آزادی کے بعد پہلی بار 2,500 کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔
- پبلک سیکٹر میں ترقی کی شرح تقریباً بارہ فیصد ہے۔
- روپے کی قوت خرید میں 17 سے 21 فیصد تک کا اضافہ ہوا۔

یہ کامیابیاں اس بات کی مظہر ہیں کہ بھارت کی حکومت اور جنتا نے ترقی کیلئے اس وسیع اور سرگرم عمل ملک کے تمام تر وسائل کو بروئے کار لانے کا پختہ عزم کر رکھا ہے۔

DAVP. 76/913

سن اجراء ۱۹۳۸ء   فون نمبر: ۳۸۴۶۹
بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

نگران: سید علی اکبر
معتمد مجلس مشاورت: غلام جیلانی
مرتب: وقار خلیل

زر سالانہ ... ... ۱۲ روپے
ششماہی ... ... ۷ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچیس پیسے
جلد: ۴۰   شمارہ: ۵
مئی ۱۹۷۷ء

ترتیب

پرنٹر پبلشر: سید علی اکبر
مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ٭ مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴۔

نسلِ انسانی پر اُن کا احسان عظیم ہے

فاضل غذائی اجناس پیدا کرنے والی ریاست آندھرا پردیش کو " جنوب کا غلہ گودام " کہا جاتا ہے ۔ اس ریاست میں گنّا ۔ تمباکو ۔ تیل کے بیج اور مرچ وغیرہ کی پیداوار بھی فاضل ہوتی ہے ۔ ہماری ریاست ہندوستان میں سب سے زیادہ چاول پیدا کرنے والی ریاستوں میں سے ایک ہے ۔ ریاست آندھرا پردیش برسہا برس سے اپنی غذائی پیداوار میں اضافہ کے لئے غیر منقسم توجہ دے رہی ہے ۔

ایک عرصہ پہلے یعنی ۱۹۶۵ء میں آندھرا پردیش نے زیادہ پیداوار دینے والے تخموں کا استعمال اختیار کیا اور اس سلسلے میں اس کو اولیت حاصل ہے ۔ تخموں کی ان اقسام کے استعمال کو عام کرنے کے لئے مسلسل اور لگاتار کوششیں کی جاتی رہیں ۔ کچھ مدت سے " وجیا " ۔ " سونا " ۔ " رتنا " ۔ " جگن ناتھ " اور " آر بی ۱۹۳ " وغیرہ جیسی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کو بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوگئی ہے ۔

۱۹۵۰ء ۔ ۵۱ میں چاول کی پیداوار ۲۲ء ۲۷ لاکھ ٹن تھی جو بڑھ کر ۱۹۷۴ء ۔ ۷۵ میں ۵۷ لاکھ ٹن ہوگئی ۔ غذائی اجناس کی پیداوار جو ۱۹۵۱ء ۔ ۵۲ میں ۴۰ء ۳۰ لاکھ ٹن تھی بڑھ کر ۱۹۶۴ء ۔ ۶۵ میں ۷۷ء ۴۰ لاکھ اور ۱۹۷۴ء ۔ ۷۵ میں ۰۶ء ۹۰ لاکھ ٹن ہوگئی ۔ ۱۹۷۶ء ۔ ۷۷ میں توقع ہے کہ مقداً پیداوار ایک کروڑ ٹن کے نشانے تک پہونچ جائے گی جو ایک تاریخ ساز کارنامہ ہوگا ۔ ۱۹۵۰ء ۔ ۵۱ اور ۱۹۷۴ء ۔ ۷۵ کے درمیانی عرصہ میں جملہ زیر کاشت رقبے میں ۱۲ء۴ فیصد سے زائد اضافہ ہوا ہے ۔

غذائی محاذ کے ان بہادروں کو ہم خراج تحسین پیش کرتے ہیں جنھوں نے ایک کی جگہ دو بالیاں پیدا کیں ۔ بے شک نسلِ انسانی پر ان کا احسان عظیم ہے ۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش ، حیدرآباد

DIPR : 21/76-77/465/Cg/77

برگزیدہ شخصیتیں زمانے اور علاقائی حدود سے ماورا ہوتی ہیں، مفکر، سخنور اور صاحب طرز دانشور علاقائی اور لسانی حدود کو پار کر جاتے ہیں، اقبال ایسے ہی مفکر تھے جنھیں ہم شاعر مشرق بھی کہتے ہیں۔ "اقبال صد سالہ تقاریب" کا اہتمام ہند و پاک اور مشرق و مغرب میں یکساں تزک و احتشام کے ساتھ ہو رہا ہے۔ بھارت میں ان تقاریب کا آغاز اُردو بنیاد شہر حیدرآباد میں ہوا تھا۔ حیدرآباد کے اقبال سمینار کے مقالات کا دستاویزی مجموعہ "فکر اقبال" کے نام سے ابھی ابھی شائع ہو کر ارباب نظر سے خراج حاصل کر رہا ہے ——— گذشتہ دنوں غیر منقسم ہندستان کی ایک اہم شخصیت حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری کا حیدرآباد میں آمد پر ہند و پاک اور دلی خیر مقدم کیا گیا۔ اس سے اس بات کو تقویت پہونچتی ہے کہ عہد ساز افراد ہر عہد میں سرمۂ چشم دلبراں ہوتے ہیں۔ حضرت حفیظ تقریباً چالیس برس بعد دکن آئے تھے۔ ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے بانی و معتمد جناب عابد علی خاں کی دعوت پر کل ہند مشاعرہ میں شرکت کی غرض سے چند روزہ قیام میں حضرت حفیظ نے دکن کی علمی و ادبی فضا میں وہ جہاں جہاں تشریف لے گئے حیدرآباد کی ادبی اقدار، یہاں کے علمی و ادبی ماحول اور یہاں کے اُردو نژاد رہنماؤں کی مسلسل مثال دیتے جارہے ہیں کہ دکن میں ان چند اصحاب فکر و نظر کے سبب پورے ہند و پاک کے لئے ایک مثالی اُردو تہذیب، ایک کلچر اور ایک جادہ آج بھی روشنی اور حرکت کا سرچشمہ بنا ہے۔

حضرت حفیظ نے حیدرآباد کو اپنا وطن ثانی بھی کہا، جہاں سے انھیں عظیم شعری تخلیق "شاہنامۂ اسلام" کو مکمل کرنے کی غرض سے بھرپور معاونت ملتی رہی۔ انھوں نے نئے حیدرآباد کے ایک ایک علمی ادارہ کا معائنہ کیا اور قدیم سے جدید کے رشتۂ استوار کو خراج تحسین ادا کیا۔ حیدرآباد کے اہل قلم حضرات، صحافت اور ادبی انجمنوں نے جی کھول کر حفیظ کی قدر و منزلت کی۔ آپ نے ادارۂ ادبیات اُردو کا تفصیلی معائنہ کیا۔ بانیٔ ادارہ ڈاکٹر زورؔ اور دکن کے آخری فرمانروا حضور نظام میر عثمان علی خاں مرحوم کو زبردست خراج عقیدت بھی ادا کیا۔ اپنے تاثرات اور کلام سے بھی نوازا۔ حضرت حفیظ کا عطیۂ سخن ہم اسی اشاعت میں شامل کر رہے ہیں۔ اُردو میں گیت اور غزل کے لہجے کو معتبر کہنے والے اپنے عہد کے اس باکمال سخنور کو ہم "ہند و پاک" ادبی رشتوں کی استواری میں سنگ میل کا درجہ دیتے ہیں اور اس امر کی توقع رکھتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی دوستی اور دونوں کے علمی و ادبی رشتے اور استوار تر ہوں گے۔

اس شمارہ میں ادب، شعر اور تحقیق کے گوشوں پر اہم نگارشات کو شامل کیا گیا ہے جن کے لکھنے والے اُردو کے نئے اور ہنرمند قلمکار ہیں جنھیں اپنی فکر اور اپنے فن پر بھرپور اعتماد رہا ہے ——— طنز و مزاح کے باب میں نامور ادیب مجتبیٰ حسین کا لکھا ہوا پڑھنے کی چیز ہے۔ ان کا وہلب عندلیب کا خاکہ "مجتبیٰ شناسی" کی روشن سعی ہے۔ مشکور، مستقل عنوانات "قند مکرر" "بادۂ کہن" اور "سب رنگ" کی منقولات اپنے رنگ، رس اور آب و تاب کے باعث یقین ہے مزہ دیں گی۔ نثری نظم پر ابو الفیض سحر کی متوازن تحریر نئے شعور کے مثبت امکانات کو روشن کرتا ہے۔

ادبی ٹرسٹ کے کل ہند مشاعرہ کی چند منتخب غزلیں بھی ہم اس شمارہ میں شامل کر رہے ہیں اور یہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں۔ ایک انشائیہ نما تحریر جناب سید ہاشم علی اختر کی ہے جو خود ایک شخصیت سرچشمۂ علم و فضل رہی ہے۔ "تاریخی، علمی اور قومی معلومات" کا اندازہ وہی کرسکتے ہیں جنھیں جناب اختر سے شرف تلمذ حاصل رہا ہے۔ زیر نظر "نگارش" اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ "خاصے کی ہے"

غلام جیلانی

خوشحال زیدی

تحقیق میں لائبریری کا استعمال

موضوع کے انتخاب کے بعد محقق کے سامنے جہاں یہ سوال آتا ہے کہ اپنی تحقیق میں محقق کس قسم کے وسائل اپنائے، وہاں یہ اہم سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ متعلقہ مواد اور اس سے متعلق سہولیات کہاں اور کس طرح فراہم ہو سکیں گی حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی محقق اپنے کام میں تب تک کامیابی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ اسے لائبریری کے استعمال کی اچھی معلومات نہ ہو۔ تحقیق میں لائبریری لازمی حیثیت رکھتی ہے ۔۔۔ خواہ کسی بھی وسیلے کو اپنایا گیا ہو۔ لائبریری کے استعمال کے بغیر کوئی تحقیقی کام مکمل نہیں ہو سکتا۔ بیسٹ کا کہنا ہے کہ تمام انسانی علوم کتابوں اور کتب خانوں میں دستیاب ہوتے ہیں[1]

لائبریری کا صحیح اور مناسب استعمال کرنا بھی ایک فن ہے۔ اگر کسی محقق کو لائبریری کا صحیح اور مناسب استعمال کرنا نہیں آتا تو وہ اپنا وقت، محنت اور پیسہ بے کار قسم کی دوڑ دھوپ اور جد و جہد میں برباد کر سکتا ہے۔ اس کا کوئی حل نہیں نکلتا اس لئے محقق کو لائبریری کے صحیح استعمال کے بارے میں مکمل معلومات ہونا از بس ضروری ہے اس معلومات سے محقق کو درج ذیل فوائد ہیں۔

۱۔ وقت، پیسہ اور محنت ۔۔۔ تینوں کا صحیح استعمال ہوتا ہے۔
۲۔ اہم مواد ضرورت کے اعتبار سے مناسب وقت پر مل جاتا ہے۔
۳۔ محقق نئی نئی معلومات سے آشنا ہوتا رہتا ہے۔
۴۔ نہ تو کوئی اہم ادبی موضوع چھوٹتا ہے اور نہ ہی بے کار قسم کے موضوعات کے الٹ پلٹ میں پریشانی ہوتی ہے۔
۵۔ خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔
۶۔ محقق کا کام مستقل اور ترتیب وار چلتا رہتا ہے اور وقت پر ختم ہوتا ہے۔

۱۔ لائبریری کے طریقے

کسی بھی لائبریری کا استعمال کرنے سے قبل محقق کو یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ اس کے موضوع سے متعلق کتنا ضروری مواد وہاں مل سکتا ہے۔ اس کو کتنی سہولیتیں مل سکتی ہیں۔ لائبریری

اس کے قوانین کے بارے میں معلومات کا نظم و نسق کیا ہے؟ اصول کیا ہیں؟ اس قسم کی معلومات محقق اس لائبریری کے دفتر سے بآسانی حاصل کر سکتا ہے۔ عموماً ہر لائبریری کے اصول اور قوانین چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مطالعہ کرتے وقت درج ذیل باتوں کو دھیان میں رکھیئے۔

---

[1] "PRACTICALLY, ALL HUMAN KNOWLEDGE CAN BE FOUND IN BOOKS AND LIBRARIES." Best, J.W., "Research in Education" Prentice Hall, Inc. Englewood Cliff, N.J., 1959. P. 31-

(الف) لائبریری فہرست سے یہ پتہ لگانا چاہیئے کہ اس کا نظام ڈیوی (Dewey) طریقے پر ہے یا کسی دوسرے طریقے پر ہے۔

(ب) اپنی دلچسپی اور موضوع کے اعتبار سے جن نمبروں پر وہ کتابیں ہیں ۔۔ وہ لائبریری میں کس جگہ رکھی ہیں ۔۔۔۔ اس کا پتہ لگا کر موضوع سے متعلق کتابوں کے بارے میں، ان کی تعداد کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔

(ج) یہ پتہ لگانا بھی ضروری ہے کہ مخصوص، محفوظ کتب (جو کہ وہیں پڑھ سکتے ہیں لائبریری سے باہر نہیں لے جا سکتے) حوالہ جات کتب رسائل اور اخبارات، مختلف خاص نمبر، انسائیکلوپیڈیاز، گورنمنٹ مطبوعات وغیرہ کس نمبر سے اور کس جگہ رکھے ہیں اور موضوع سے متعلق کون سے ہیں۔

(د) آسانی کے لئے لائبریری کے اوقات چھٹیوں کی فہرست اور ضروری قوانین کی تفصیل اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کونسی کتب کتنے دنوں کے لئے مل سکتی ہیں۔

۲۔ موضوعاتی گائڈ بنانا :۔ یہ گائڈ ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر یہ تیار ہو جائے تو محقق کو بہت آسانی ہوتی ہے۔ بنا تاخیر ادبی مواد حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل گائڈز تیار کرنا ہوں گی۔

۱؎ ڈیوی درجہ بندی میں علم (Knowledge) کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ہی قسم کے نشانات (Notations) کا استعمال ہے یعنی ۱ تا ۹ عربک نمبر جو کہ بہت آسان طریقہ ہے دنیا کی زیادہ تر لائبریریوں میں یہی درجہ بندی رائج ہے جیسے لائبریری آف کانگریس امریکہ، نیشنل لائبریری آف کلکتہ۔

دوسرا طریقہ کولن (Colon) کلاسیفکیشن (درجہ بندی) کا ہے جس کی ایجاد ہندوستان کے مشہور لائبریرین ایس آر رنگا ناتھن نے کی۔ اس میں علم کو چھبیس ۲۶ حصوں میں (A تا Z) تقسیم کیا گیا ہے۔ مگر اس میں ملے جلے (Mix) اشارے اور نشانات ہیں یعنی اس میں عربک نمبر بھی ہیں اور انگریزی حروف A تا Z بھی اور رومن نمبر بھی ہیں۔ جس سے یہ اسکیم مشکل ہوتی ہے اور کم استعمال کی جاتی ہے۔ ویسے ہندوستان کی بڑی بڑی تحقیقی اور ٹکنیکل لائبریریوں میں اس درجہ بندی کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے کیونکہ اس کے جو قوانین ہیں اگر ان پر باقاعدگی سے عمل کیا جائے تو بہت ہی مفید ہیں۔ ہندوستانی ادب کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس درجہ بندی کی تنظیم ہوئی ہے۔ اس کی مدد سے ہندوستانی زبانوں اور ادب کی صحیح حد بندی ہو سکتی ہے جب کہ ڈیوی درجہ بندی میں ہندوستانی زبان و ادب پر مفصل تبصرہ نہیں کیا بلکہ انگریزی ادب کے اعتبار سے گوشوارہ (Schedule) بنایا گیا ہے۔

تیسرا طریقہ یونیورسل ڈیسیمل کلاسیفکیشن کا ہے (U.D.C) یہ درجہ بندی ڈیوی کی اسکیم سے بہت ملتی جلتی ہے مگر پہلے سے قدرے مشکل ہے۔ ہندوستان کی بہت سی ٹکنیکل اور ریسرچ لائبریریوں میں اس کا استعمال ہو رہا ہے اس میں کتابوں کی درجہ بندی کے علاوہ جرنل اور مخطوطات (Manuscripts) یعنی غیر کتابی مواد (Non-Book-Material) شامل ہے۔

مضامین میں متعلق درجہ بندی (Subject Classification) ۔ یہ ہندوستانی لائبریریوں میں بہت کم مستعمل ہے۔

(الف) **مصنفین کے اعتبار سے :۔** یہ گائڈ اس قسم کا تیار ہوگا جس میں موضوع سے متعلق مختلف ادیبوں، مصنفین اور شعراء کے نام ان کی شخصیت، حیثیت مطبوعات اور ادب میں ان کے مقام کے اعتبار سے اپنے موضوع کا نشاندہی کرنا ہوگی۔

(ب) **تحقیقی اداروں سے متعلق گائڈ :۔** اس کے تحت تحقیقی کاموں میں لگے ہوئے ادارے، ان کے تحقیقی مقالوں۔ ان کے طریقہ کار، وسائل، شائع شدہ مقالوں کی فہرست اور ان کی طباعت کا سال لکھنا ہوگا۔

(ج) **فہرست کتب سے متعلق گائڈ :۔** ایک گائڈ اس قسم کی بھی تیار کرنا ہوگی جس میں اپنے موضوع سے متعلق کتب کی فہرست ہو ایسے ناشرین کی فہرست بھی بنانا ہوگی جو کہ اس قسم کے موضوعات پر کتب یا مضامین شائع کرتے رہتے ہیں۔

(د) **تاریخی دستاویزات سے متعلق گائڈ :۔** اس میں حوالہ جات کتب (Reference Books) مخطوطات، تاریخی مواد اور قانونی نیز عدالتی دستاویزات لکھی ہوتی ہیں۔ پورے تجزیئے کے بعد بہت اہم اور مفید کتب، رسائل اور اخبارات کو کسی خاص لائبریری کے لئے حاصل کرنا ہوگا اگر ضروری ہو تو پچھلی مطبوعات کو بھی منگوانا پڑے گا۔

۳۔ **عنوانات کو تلاش کرنے میں احتیاط :۔** محقق کے سامنے اکثر ایک بڑا مسئلہ یہ آتا ہے کہ جن عنوانات کے تحت وہ اپنے موضوع کو کسی کتاب یا رسالے میں تلاش کرتا ہے وہ اس کتاب یا رسالے کے عنواناتی فہرست میں نہیں دیئے ہوتے اور اس کو پوری کتاب دیکھنا پڑتی ہے جس کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی کتاب یا رسالے میں جو عنوانات دیئے گئے ہیں ان سے محقق پوری طرح واقف نہ ہو۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کارڈ کیٹلاگ، انسائیکلو پیڈیاز، حوالہ جات کتب اور کچھ وضاحتی تلخیص (Abstract Services) کے ذریعہ مخصوص قسم کی فہرست سے واقف ہو۔ دوسری وجہ اس پریشانی کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جن عنوانات کو وہ تلاش کر رہا ہے وہ کسی وسیع عنوان کا ذیلی عنوان ہو یا اس کا ایک حصہ ہو یا کسی دوسرے نام سے دیا گیا ہو۔ اس کے لئے محقق کو اس فہرست کو نوٹ کرنا ہوگا اور اس بات کا دھیان رکھنا ہوگا تیسری وجہ یہ ہے کہ سرکاری مطبوعات پر زیادہ تر کسی مصنف یا مؤلف کا نام نہ ہو کر اس ادارے کا نام یا جہاں سے شائع ہوتی ہیں۔ اس کا نام ہوتا ہے۔

کچھ مخصوص ناشرین کچھ مخصوص تحقیقی مقالوں کے عنوانات محققین کے نام اور پتے بھی شائع کرتے ہیں۔ کس موضوع پر کتنا کام ہو چکا ہے یا ہو رہا ہے اس بارے میں ان سے اچھی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

عنوانات بھی بدلتے رہتے ہیں مثلاً جدید غزل کا دوسرا عنوان "غزل آزادی کے بعد" ہو سکتا ہے۔ محقق کی اس قسم کی تبدیلیوں سے واقفیت ضروری ہے۔

۴۔ **لائبریری کے کام کا باقاعدہ منصوبہ :۔** عام طور پر محقق ادھر ادھر کی موضوع سے ہٹ کر، کتب دیکھنے اور اس میں اپنے موضوع سے متعلق مواد ڈھونڈھنے میں اپنا وقت برباد کرتا ہے وہ پہلے سے اپنے ذہن میں کسی قسم کا کوئی منصوبہ لائبریری سے متعلق نہیں رکھتا اس پریشانی اور وقت بربادی سے جب ہی بچا جا سکتا ہے جب کہ لائبریری میں جانے سے قبل اپنے ذہن میں ایک پلان ہو۔ اس سلسلے میں درج ذیل باتوں کو ذہن میں رکھیں۔

لائبریری میں جانے سے قبل مقصد کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ ہم کس سلسلے میں لائبریری جا رہے ہیں۔ کس قسم کی معلومات حاصل کرنا ہیں۔ مقصد جتنا واضح

ہوگا۔ کام میں اتنی ہی آسانی ہوگی۔ مثلاً ہم کو کسی رسالے کی فائل دیکھنا ہے تو ہم کو سیدھے اسی سیکشن کی جانب جانا چاہیئے ادھر ادھر کی کتب یا ورق گردانی سے محض وقت کی بربادی ہوگی۔ جیسے "اردو میں بچوں کا ادب" اس موضوع سے متعلق کچھ رسائل دیکھنے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ بچوں سے متعلق کون کون سے رسائل اور کب سے کب تک کے موجود ہیں؟ وغیرہ وغیرہ

۱۔ لائبریری میں عجلت میں نہیں جانا چاہیئے۔ کافی وقت اپنے پاس ہونا چاہیئے اگر جلدی ہو تو اس کام کو کریں جو آسانی سے اور جلد ہو جائے۔

۲۔ سب سے پہلے کام محفوظ کتب کا ختم کرنا چاہیئے کیونکہ وہ آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ اسکے بعد ان کتابوں کو لیں جو آسانی سے مل جائیں۔

۳۔ لائبریری کے ایک سیکشن کا کام ایک ساتھ ختم کرنا چاہیئے۔ ایک سیکشن کا کام ختم کرنے کے بعد دوسرے سیکشن کو دیکھنا چاہیئے۔

۴۔ کسی خاص بات کو (موضوع سے متعلق) اور اس کی ضروری چیزوں کو فوراً نوٹ کر لینا چاہیئے۔ کتاب واپس کرنے سے قبل اس کو دوبارہ دیکھ لینا چاہیئے نیز جو نوٹس لئے ہیں ان کو دوبارہ پڑھ لینا چاہیئے۔ مضمون، مصنف، صفحہ، باب، سن اشاعت وغیرہ کو ٹھیک طرح لکھنا چاہیئے۔

موضوع کو تلاش کرنے، اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے، اس سے متعلق مواد کو جاننے اور اپنے تحقیقی مقالے کا خاکہ بنانے کے لئے بہت گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے اس کو آسان بنانے کے لئے درج ذیل باتوں پر دھیان دینا چاہیئے۔

۱۔ مطالعہ کیلئے مواد کا انتخاب کسی کتاب رسالے یا جرنل کے لئے کال سلپ لکھنے سے قبل اچھی طرح یہ سوچ لینا چاہیئے کہ یہ ہمارے مقصد میں کہاں تک معاون ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی عنوان یا مضمون محقق کے موضوع کے تاریخی پہلو کو پیش کرتا ہے جب کہ اس کو موضوع کے نظریاتی یا تحقیقی پہلو کو دیکھنا ہے تو اس کتاب یا رسالے کو لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، اس لئے سوچ سمجھ کر سلپ بنائیں۔

کتاب یا رسالہ لینے کے بعد سرسری طور پر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنا بہتر ہوگا جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ہمارا کام کن صفحات کو پڑھنے سے آسانی سے ہوتا ہے ان ہی صفحات کو پڑھنا مناسب ہوگا۔

۲۔ حوالہ جات کے مطالعہ میں مہارت ۔ حوالہ جات کتب دیکھنے سے قبل یہ دیکھنا چاہیئے کہ حوالہ ترتیب وار تاریخ کے اعتبار سے یا عنوان کے اعتبار سے دیا ہے؟ کیا آخر میں کوئی خلاصہ دیا گیا ہے؟ کیا فہرست مضامین ہے؟ کیا کوئی شرح، اصول یا صفحات سے متعلق اشارے، یا کوئی طریقہ دیا گیا ہے جس سے مخففات (Abbreviations) نشانات وغیرہ کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ کیا یہ اشارے شروع میں ٹائیٹل کے اندر، مضامین کے آخر میں یا حوالہ جات کے ساتھ دیئے گئے ہیں۔

حوالہ جات کے استعمال یا تحریر کرنے سے قبل یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کوئی مخصوص عنوان کس مضمون سے متعلق ہے؟ اسکی کیا حیثیت ہے؟

مواد کی فراہمی کے لئے جو مطالعہ کیا جاتا ہے اس کے سلسلے میں وھٹنی (Whitney) نے مندرجہ ذیل مفید اور عملی ہدایتیں دی ہیں۔

• محقق کو ہمیشہ یہ جاننا چاہیئے کہ اسے کس قسم کی تحریروں کو توجہ سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔ یہ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑی ہے وہ ہر تحریر کو جو اسے دستیاب ہوتی ہے یکساں توجہ یا رفتار سے نہیں پڑھ سکتا وقت اس کی اجازت نہیں دیتا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ بعض اوقات محقق ٹائیٹل یا ابواب کی سرخیوں اور دیباچہ پر نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا۔ بعض کتابوں کا اشاریہ دیکھ لینے سے مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بعض ابواب کو تیزی سے سرسری طور پر پڑھنا چاہیئے۔ بعض کتابوں کو آہستہ اور توجہ سے پڑھنا ہوگا اور پڑھنے کے ساتھ نوٹ بھی لینا ہوگا بعض کتابوں اور مضمونوں کو دوبارہ پڑھنے کے لئے الگ رکھ دینا ہوگا۔

۳۔ ایک وقت میں ایک ہی پہلو مدنظر رکھنا چاہیئے ۔ مطالعہ سے قبل کسی خاموش اور پرسکون جگہ کا انتخاب لازمی ہے یہ بھی

ضروری ہے کہ کسی موضوع کے کسی ایک ہی پہلو پر دھیان رہے ۔ اس نظریہ کے پیش نظر مطالعہ کرنا چاہیئے۔ مثلاً اگر کسی کتاب کے متعلق عام معلومات حاصل کرنا ہیں تو ہر بات کو پڑھنے کی ضرورت نہیں پہلی بار پڑھتے ہوئے مصنف کے خیالات سے واقف ہونے کی کوشش کریں ۔ بعد میں نوٹس لینا ایک وقت میں ایک ہی کام کرنا زیادہ سودمند رہتا ہے ۔

پڑھتے وقت کسی بات یا حوالے کو اسی شکل میں قبول کرنا خطرناک ہے ہمیشہ اس کو تنقیدی نکتۂ نظر سے دیکھیں اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ مضمون محقق کے موضوع ۔ ضرورت سے کہاں تک مناسبت رکھتا ہے ؟ یہ بات یا نظریہ صحیح ہے ؟ مصنف دوسرے لوگوں کی باتوں سے متفق ہے یا نہیں ؟ اس نے یہ نظریہ کہاں سے اخذ کیا ہے ؟ ہم نے ابتک جو مطالعہ کیا اور نتیجہ اخذ کیا ہے اس مصنف کا نظریہ اس کے برخلاف تو نہیں جارہا وہ کون سے ذرائع ہیں جن سے مصنف نے یہ نظریہ اخذ کیا ہے ؟ ۔۔۔ ان تمام باتوں پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اپنے الفاظ اور اسلوب میں اس سے نوٹ لیں ۔

پڑھنے کے ساتھ ساتھ نوٹ لینا تحقیق میں بہت مفید اور کارآمد ہوتا ہے مگر محض نقل کرنا ہی کافی نہیں بلکہ اپنے "ذہن اور قلم" دونوں سے کام لے کر خود اپنی زبان میں نوٹ لکھنا چاہیئے۔ اگر نوٹ نہایت ہوشمندی اور اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ تیار کئے جائیں تو وہ تحقیقی مقالے کا جزو بن سکتے ہیں ، ذہنی طور پر محقق کو چاق و چوبند رکھتے ہوئے مزید مطالعہ کے لئے اس میں دلچسپی بڑھاتے رہتے ہیں ۔ دوسرے مضامین سے تقابل کرسکتے ہیں نئے ذرائع پیدا کرسکتے ہیں ۔

نوٹ لینے کے سلسلے میں ریسرچ مینول (Research Manual) کے مرتبین نے لکھا ہے کہ نوٹ لیتے وقت دو باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ، ایک تو یہ کہ بیکار قسم کے نوٹ نہ لیے جائیں اور دوسرے یہ کہ کوئی ضروری بات چھوٹنے نہ پائے ۔ غیر ضروری نوٹ مقالہ لکھتے وقت دردِ سر کا باعث ہوں گے ۔ ضروری نوٹ چھوٹ جانے سے یہ نقصان ہوگا کہ یا تو مقالہ کی قدر و قیمت میں کمی محسوس ہوگی یا محقق کو دوبارہ تلاش پر مائل ہونا پڑے گا ۔ [1]

نوٹ لینے اور اس کو مائندہ ، مند بنانے کے درج ذیل باتوں پر خصوصیت سے دھیان دینا چاہیئے ۔

(الف) کتابیات سے متعلق تفصیل یا نوٹ لینے کے درج ذیل مقاصد ہیں ۔

۱۔ تحقیق میں معاون ہر کتاب ، رسالے ، مقالے ، اخبار یا کسی اور ذریعہ کے بارے میں مکمل تفصیل رکھنا ۔

۲۔ لائبریری سے اس حوالے کو فوراً حاصل کرنا ۔

۳۔ اس حوالے کی اہمیت و افادیت کے بارے میں نوٹ لینا ۔

۴۔ کتابیات تیار کرنے کے لئے نوٹ لینا

(ب) اس کتاب کے تحت مصنف ، قاری یا لائبریرین کے پاس کسی بھی حوالے کو معلوم کرنے کے لیے ضروری تفصیل ہوتی ہے ایک کتابی فہرست ، کارڈ کے لئے درج ذیل باتیں ضروری ہیں ۔

۱۔ مصنف کا نام ۲۔ موضوع کا پورا عنوان ۳۔ مقام ناشر اور مطبوعہ کی تاریخ ۴۔ صفحات ۵۔ ابواب (اگر ہیں)

---

[1] ولیمسن ، سی ، بی ، اینڈ اسٹونیسن ، اے ، ایچ ، اے ریسرچ مینول ترمیم شدہ ایڈیشن نیویارک ، ہارپر اینڈ الاؤرس 1961 باب ۲ صفحہ ۲۶

(نمونہ ملاحظہ ہو)

قریشی — عبدالرزاق
"مبادیاتِ تحقیق"
بمبئی — ادبی پبلشرز
۱۹۶۸　　　　صفحات ۱۶۹
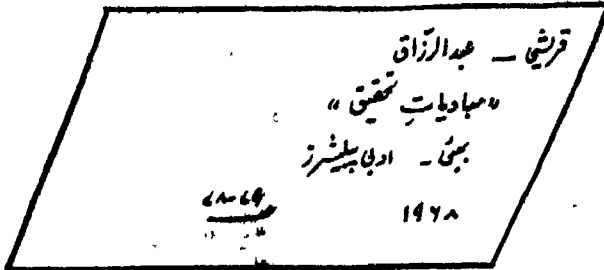
رسائل، اخبارات اور جرائد سے متعلق تفصیل:- ۱۔ مصنف کا نام ۲۔ مضمون کا پورا عنوان ۳۔ مقامِ طبع ۴۔ شمارہ نمبر ۵۔ تاریخ ۶۔ صفحہ یا صفحات کا نمبر　　(نمونہ)

نیاز فتحپوری
"جوشؔ صاحب کے معاشقے"
کانپور ماہنامہ "گنگ و جمن" جنوری ۱۹۶۱ء
ص ۲۹ تا ۳۷
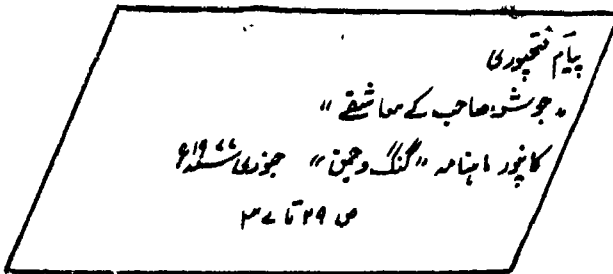
نوٹ لینے کا عموماً یہ طریقہ رہا ہے کہ محقق ایک کاپی میں مسلسل نوٹ یا حوالے لکھتا رہتا ہے۔ ادبی تحقیق میں زیادہ تر لوگ تقریباً اسی انداز سے نوٹ لیتے ہیں۔ کسی بھی نوٹ یا حوالے کی کئی بار ضرورت پڑسکتی ہے اس کی آسانی کے لئے کاپی یا بیاض کے بجائے تراشے یا کارڈ کا استعمال کرنا چاہیئے۔ ساتھ ہی درج ذیل باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیئے۔ ۱۔ لائبریری میں کتاب کا کال نمبر۔ ۲۔ لائبریری کا نام۔ ۳۔ ریکشن یا کس حصہ میں وہ کتاب ہے۔

مختلف حوالجات حاصل کرنے کے بعد ایک محقق اس غلط فہمی کا شکار ہوسکتا ہے کہ کون سی تفصیل کس حصہ میں تھی۔ اس الجھن سے بچنے کے لئے کارڈ یا تراشے کے پیچھے کی طرف موضوع کی شکل و حیثیت، اس کی خصوصیت اور ضروری نوٹ لے لینا چاہیئے۔ نوٹ لینے کی اچھی عادت کے ذریعہ وقت اور محنت دونوں کی بچت ہوتی ہے اس لئے ضروری یہ ہے کہ دہرانے سے قبل یہ دیکھ لیں کہ یہ نوٹ یا بات پہلے تو نہیں آگئی۔ عجلت میں نوٹ نہیں لینا چاہیئے جہاں تک ممکن ہو کسی حوالے کا نوٹ مکمل طور پر ایک ہی بار ایک مخصوص سائز کے کاغذ یا کارڈ پر ہی لینا چاہیئے اس کے لئے ہمیشہ کارڈ اپنے پاس رکھیں ایک کاغذ پر نوٹ لے کر پھر دوسرے کاغذ پر نوٹ اتارنے کی عادت خراب ہے۔

ایک کارڈ یا تراشے پر صرف ایک پہلو سے متعلق نوٹ لینا چاہیئے اگر نوٹ لمبا ہے تو دو یا دو سے زائد کارڈ استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ ہر کارڈ کے دائیں سرے پر سرخی یا ذیلی سرخی ضرور لکھ لی جائے تاکہ انھیں ترتیب دیتے وقت سہولت ہو۔ یہ تراشے یا کارڈ 3×5 سائز میں بہتر رہتے ہیں۔ ریسرچ مینول کے مرتبین کے خیال میں 4×6 یا 5×8 اور 8½×11 کے سائز کے ہوسکتے ہیں۔ وہ یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ یہ کارڈ یا تراشے مختلف رنگوں کے ہوں تو بہتر ہے۔ رنگوں کی تفریق عنوانات یا ابواب کے لحاظ سے کی جاسکتی ہے ہر نوٹ کے آخر میں مصنف کا نام، ایڈیشن نمبر، کتاب کا نام، باب، صفحہ، یا صفحات ضرور لکھ لینا چاہیئے تاکہ اگر دوبارہ پڑھنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ بآسانی مل جائے۔

مختلف مصنفین اور ناشرین حوالہ جات مختلف ڈھنگ سے دیتے ہیں۔ اس کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اس موضوع سے متعلق سوالی تحقیق کے کارڈ یا تراشے نوٹ کرتے سامنے رکھیں۔ نوٹ ہمیشہ اصل کتاب سے لینا چاہیئے نہ کسی حوالے سے حوالہ لکھنا۔ یا کسی کتاب سے آپ دوسرا حوالہ مقتبس کریں۔ نوٹ لینے کے بعد اس کو چیک کرلیں اور جب مطمئن ہوں تو کارڈ میں کونے پر "O.K." (ٹھیک ہے) لکھ دیں۔ شروع میں وقت زیادہ دینے سے بعد کی الجھنوں سے بچا جا سکتا ہے۔

نوٹ لینے کے سلسلے میں بیسٹ نے چند اچھے مشورے دیئے گئے ہیں:-

۱۔ نوٹ کو دوبارہ نقل کرنے یا ٹائپ کرنے کا خیال ذہن میں نہ لاؤ۔ اس سے وقت کا نقصان ہونے کے علاوہ غلطیوں کے راہ پانے کا بھی امکان ہے۔

۲۔ ہمیشہ اپنے ساتھ تھوڑے سے تراشے یا کارڈ رکھو تاکہ جب کوئی نیا خیال ذہن میں آئے تو اسے فوراً لکھ لو۔

۳۔ نوٹ کو احتیاط سے رکھو تاکہ وہ کھو نہ جائیں اگر انھیں کہیں لے جانے کی ضرورت پڑے تو فائل فولڈر میں رکھ کر جاؤ۔

۴۔ مقالہ لکھنے کے بعد بھی نوٹ کو محفوظ رکھو ممکن ہے کہ بعض نوٹ کسی اور موضوع پر لکھنے کے سلسلہ میں کام آسکیں۔

بیسٹ نے نوٹ کو محفوظ رکھنے پر زور دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوٹ لینے کے بعد کارڈوں کو سلسلہ وار مرتب کرنا چاہیئے مصنفین کے قلمی نام یا Sub headings کے حوالے کے ساتھ نوٹ ترتیب دینا زیادہ اچھا ہے۔ کچھ لوگ پہلے موضوع کو عنوان کے تحت اور پھر مصنفین کے تحت ترتیب دیتے ہیں۔

کتابیات اور موضوع، دونوں قسم کے نوٹس ایک ساتھ لینے میں عملی طور پر کئی پریشانیاں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اسلئے دونوں کو الگ ہی رکھنا مناسب ہے موضوع سے متعلق نوٹ لینا موضوع اور محقق دونوں پر منحصر ہے۔ محقق درج ذیل نوٹ لے سکتا ہے۔

۱۔ مخصوص حوالے:۔ جیسے تاریخیں، مقامات، نام (اعداد و شمار کی رو سے) اور مختلف تعریفیں (Definitions)

۲۔ مصنفین کے نظریات، سوالات، تنقید، خیالات، مباحث اور بیانات کو ضرورتاً نوٹ کر سکتا ہے۔

۳۔ حوالہ جات کے سلسلہ میں اپنی رائے لکھ سکتا ہے۔

نوٹ لینے کے سلسلے میں ان باتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔

۱۔ مشکوک سطروں یا عبارات کو لکھنے میں وقت برباد نہ کرکے احتیاط سے پڑھ کر بہت ضروری اور اہم باتوں کو نوٹ کرلیں اور اگر وہ کتاب اپنے پاس ہے تو الفاظ کے نیچے سطر کھینچ دیں۔ ورنہ کارڈ پر ضروری نوٹ لے لیں۔

۲۔ ہر نوٹ کے اوپر بائیں جانب یا دائیں جانب عنوان دینا ضروری ہے۔

ہر کارڈ پر نیچے یا اوپر کونے میں اس کا ذریعہ (جہاں سے لیا گیا ہے) صاف اور مکمل طور پر لکھنا چاہیئے۔ اس سے مقالہ لکھتے اس کی حوالجات تیار کرنے اور فوٹ نوٹ لینے میں آسانی ہوگی۔

حوالے صحیح طور پر دینے چاہیئے:۔ کسی مصنف کے خیالات، رائے یا نظریات کو مقتبس کرنے کے سلسلہ میں ریسرچ میتھڈ کے مرتبین کی رائے ہے کہ اس کا استعمال ایسی صورت میں کرنا چاہیئے کہ:۔ ۱۔ مصنف نے بات کے کہنے کے لئے جن الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ ہی بہتر ہوں۔ ۲۔ دوسرا استعمال یہ ہے کہ مصنف کی عبارت حسن انشاء کا عمدہ نمونہ ہے اور محقق اپنی مسرت میں اپنے قارئین کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔

(بقیہ صفحہ (۳۶) پر)

اقبال — بہ نگاہِ اولو الامر

حفیظ جالندھری

لحد میں سو رہی ہے آج بے شک مشتِ خاک اس کی
مگر گرمِ عمل ہے ۔ جاگتی ہے جانِ پاک اس کی
وہ اِک فانی بشر تھا، میں یہ باور کر نہیں سکتا
بشر اقبال ہو جائے تو ہرگز مر نہیں سکتا
بہ زیرِ سایۂ دیوار مسجد ہے جو آسودہ
یہ خاکی جسم ہے ستّر برس کا راہ پیمودہ
یہ خاکی جسم بھی اس کا بہت ہی بیش قیمت تھا
جسے ہم جلوہ سمجھے تھے وہ پردہ بھی غنیمت تھا
اُسے ہم ناپتے تھے لے کے آنکھوں ہی کا پیمانا
غزل خواں اس کو جانا، ہم نے شاعر اس کو گردانا
فقط صورت ہی دیکھی۔ اس کے معنی ہم نہیں سمجھے
نہ دیکھا رنگِ تصویر۔ آئینے کو دل نشیں سمجھے
ہمیں ضعفِ بصارت سے کہاں تھی تابِ نظارہ
سکھائے اس کے پردے نے ہمیں آدابِ نظارہ
یہ نغمہ کیا ہے؟ زیرِ پردہائے ساز کم سمجھے
رہے سب گوش بر آواز۔ لیکن راز کم سمجھے

●

شکستِ پیکرِ محسوس نے توڑا حجاب آخر
طلوعِ صبحِ صادق بن کے چمکا آفتاب آخر
"مقید" اب نہیں اقبال اپنے جسمِ فانی میں
نہیں وہ بند حائل آج دریا کی روانی میں
وجودِ مرگ کی قائل نہیں تھی زندگی اس کی
تعالی اللہ اب دیکھے کوئی پائندگی اس کی
جسے ہم مردہ سمجھے۔ زندہ تر۔ پائندہ تر نکلا
مہ و خورشید سے ذرّے کا دل۔ تابندہ تر نکلا
ابھی اندازہ ہو سکتا نہیں اس کی بلندی کا
ابھی دنیا کی آنکھوں پر ہے پردہ فرقہ بندی کا
مگر میرے تصوّر میں ہیں چہرے اُن جوانوں کے
جنہیں اقبال نے بخشے ہیں بازو قہرمانوں کے

ڈا غیاث متین

نثری نظم۔ روایت اور تجربے کے درمیان

ادھر چند برسوں سے اردو میں بھی نثری نظم کا بڑا چرچا ہو رہا ہے۔ ہمارے کئی اہم شعراء اور اساتذۂ علم و فن نے بھی اس طرف دھیان دیا ہے توجہ کی ہے۔ خاصے معتبر اور مستند ناقدین اور ماہرین زبان و ادب نے بھی اس موضوع پر غور کیا ہے، بحثیں کی ہیں۔ قارئین کی خاصی بڑی تعداد کے تجربے اور محسوسات بھی ان سب کے ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے رہے ہیں جیسے کسی شہر کی مصروف سڑک کے کنارے دو رویہ پیڑ، اور ان کے ساتھ ساتھ بجلی کے کھمبے اور جلتے بجھتے برقی قمقمے۔ لیکن کچھ ذہن ابھی تک اس طرح کی شاعری کو روا اور جائز سمجھنا تو کجا، خود اس اصطلاح کی ترکیب کو درست ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ صرف اس منطقی استدلال کے سہارے کہ نثر، نثر ہے اور نظم، نظم ہے۔ حد یہ ہے کہ شاعری کے زمرے میں کلاسیکی شاعری، قدیم شاعری، روایتی شاعری، طربیہ شاعری، غنائیہ شاعری، رومانی شاعری، عشقیہ شاعری، المیہ شاعری، حزنیہ شاعری، مزاحیہ شاعری، ہجویہ شاعری اور اس طرح کئی نام اور تراکیب مروج اور مستند۔ تنقید کے باب میں جمالیاتی تنقید، جدلیاتی تنقید، سماجیاتی تنقید، عمرانیاتی تنقید، تاثراتی تنقید، متنی تنقید، نئی تنقید، جدید تنقید، مجلسی تنقید اور اس طرح کی طرح طرح کی تنقیدیں درست اور بجا۔ مگر طے نہ پائے تو بیچاری نثری نظم۔ یہ مانا کہ اس کا مقدمہ بنیادی طور پر کچھ جداگانہ نوعیت کا حامل ہے۔ مگر پھر بھی پچھلے دس بیس برسوں میں جو ادبی اصطلاحات وضع ہوئی ہیں ان میں بیشتر اس سے ملتی جلتی ہیں۔

دراصل اس سلسلے میں دو باتیں ہیں جو بنیادی طور پر ایک مسئلہ کے دو پہلو یا ایک تصویر کے دو رخ ہونے کا حکم رکھتی ہیں۔ پہلی چیز، بہ لحاظ زبان نثری نظم کے درست اصطلاح ہونے کی بات ہے۔ دوسری چیز فکری اور فنی سطح پر اس اصطلاح سے وضع ہونے والا خیال، تصور اور فن پارے کے خد و خال سے متعلق ہے۔ جہاں تک اصطلاح کا تعلق ہے اس میں کوئی لسانی سقم نہیں۔ داغ داغ اُجالا، شب گزیدہ سحر، کالا سورج، سرخ سلام، پیلی چاندنی، ٹوٹا ہوا اسلحہ، آواز کا ... آواز کا رنگ اور اس طرح کی بے شمار فنی اصطلاحیں اور شعری تراکیب درست اور قابل قبول ہیں تو پھر نثری نظم میں کیا قباحت ہے۔ دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس طرح کی شاعری اور اس طرح کی اصطلاحیں موجود ہیں۔ جاپانی، روسی اور فرانسیسی کو نہ سہی خود انگریزی اور ہندی کو لیجئے۔ فری ورس، بلینک ورس، پروز پوئٹری اور گدیا پد، اکوتیا وغیرہ تو اب ان میں شاعری کی ایک عام پسندیدہ صنف بن چکی ہیں۔ کچھ لوگ نثری نظم کے تصور کو اور نثری شاعری کی روایت کو جدید ذہن کی اختراع یا حالیہ دور کی پیداوار سمجھتے ہیں اور یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ یہ مغربی ادب کی دین ہے۔ حالانکہ یہ بات پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نثری نظموں کے حالیہ شہرے کے نتیجے کے طور پر، دنیا کی مختلف زبانوں کے تقابلی مطالعے کے دوران اس کی از سر نو بازیافت ہوئی ہے۔ اور یہ ادب کے نئے رجحانات اور نئے میلانات کے دھاروں میں بہتے جزیروں کی طرح ہمارے شعرا ادب میں پھر در آئی ہے مگر ہم پچھلی نسلوں اور ادب پچھلے عہد در عہد کے ادیبوں اور قصیدوں پر جو پڑھ کر ذرا پیچھے کی طرف دیکھیں تو اردو، فارسی میں بھی نظم منثور کی روایتیں ملتی ہیں۔ عربی میں

تو قرآن جیسی مثال موجود ہے۔ اسے اب آپ فراموش کردہ ایک روایت کہیئے یا کوئی نیا تجربہ۔ لیکن ادب کے ارتقاء کے لیے دونوں ضروری ہیں۔ ہر روایت ابتداً ایک تجربہ ہوتی ہے۔ اور ہر تجربہ بعد ازاں ایک روایت بن جاتا ہے روایت اور تجربے کا یہ تواتر ہی دراصل زبان و ادب کا تخلیقی ارتقاء ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہیئت، موضوع اور مواد کی تخلیق و ترتیب میں نئی راہیں کھولتی ہیں، نئی منزلیں ملتی ہیں یہاں یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہیئت اور اسلوب کے تجربے اردو ادب کے لیے نئے نہیں بلکہ تجربوں کی یہ روایتیں ہمارے لیے پرانی ہیں جیسا کہ ادب کے طالب علم جانتے ہیں فرانس کی ورس لبر انگریزی میں فری ورس کہلائی اردو میں ایسی شاعری کو آزاد شاعری کہا جانے لگا۔ دراصل یہ ساری کوششیں عروضی شاعری کی سخت گیریوں کے رد عمل اور ایک فطری ضرورت کے طور پر پروان چڑھتی گئیں۔ سب سے پہلے شررؔ نے ۱۹۰۱ء میں آزاد نظم کو غیر مقفیٰ نظم کا نام دیا۔ پھر مولوی عبدالحق کے مشورے پر نظم معرّا کہا۔ تاجور نجیب آبادی نے سر عبدالقادر کی صدارت میں انجمن ارباب علم پنجاب تشکیل دے کر اسے فروغ دیا۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ حامد اللہ افسر، عظمت اللہ، عبدالحلیم شررؔ، نظم طباطبائی جیسے باکمال کلاسیکی شعراء اور عہد جدید کے میراں جی، ن۔م راشد، یوسف ظفر، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، قیوم نظر، مخدوم، سردار جعفری، اختر الایمان، مختار صدیقی، مجید امجد، منیب الرحمٰن جیسے ذہین فنکاروں نے اس روایت کو مزید تقویت پہنچائی۔ یہ شاعرانہ عجز نہیں بلکہ شاعری کو اسلوب اور آہنگ کے نئے افقوں سے روشناس کرانے کی جستجو ہے۔ بہر حال ترقی پسندوں کے شانہ بہ شانہ جدید شاعروں نے بھی نثری نظم کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا ہے۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سجاد ظہیر نے اس طرح کی شاعری کی پھر ابتدا کی تھی اور پھر ۶۰ کے بعد جن نئے شعراء نے اس طرف توجہ کی ہے ان نئے ناموں میں احمد ہمیش، حمید سہروردی وغیرہ کے نام بھی لیئے جا سکتے ہیں۔ ادھر اساتذۂ زبان و ادب میں پروفیسر محمد حسن اور پروفیسر خورشید الاسلام نے بھی اچھی نثری نظمیں کہی ہیں۔

اب ہم مسئلے کے دوسرے پہلو یعنی نثری نظم کے تصور اور اس کی ہیئت کی بحث کی طرف آتے ہیں۔ ادب اور ادب کے تصور کی توضیح و تشریح میں جمالیاتی حس اور جمالیاتی اظہار کی قدر بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ زمانہ قدیم سے چلے آنے والے نظریہ شعر کی روشنی میں شعری اظہار کے لیے فنکارانہ جذبے کے ساتھ ساتھ شعری پیکر اور اوزان و عروض کا التزام ناگزیر ہے۔ لیکن اب جدید سائنٹفک اندازِ فکر کے تحت ادب اور ادب کی مختلف اصناف سخن پر بھی ذہن انسانی نے نظر ثانی کرنی شروع کی ہے۔ بہت سے کلیئے کل تک صحیح تھے مگر آج صحیح نہیں ہیں۔ بہت سے اصول کل تک درست تھے مگر آج درست نہیں ہیں۔ بہت سی توضیحات کل تک مکمل تھیں جامع تھیں مگر آج وہ ادھوری ہیں تشنہ ہیں۔ اس طرح شاعری کے لیئے بحر، ردیف اور قافیہ کی پابندی گو کہ ایک زمانے میں لازمی قرار دی گئی تھی لیکن ضروری نہیں کہ یہ پابندی قرآنی احکام کی طرح قیامت تک درست سمجھی جاتی رہے اس سے ہٹ کر بھی جمالیاتی اقدار، نفسیات، اخلاقیات اور معاشیات کی دیگر اقدار کی طرح محض اعتباری نوعیت کی ہوتی ہیں اور فرد تا فرد، سماج تا سماج، عہد تا عہد، علاقہ تا علاقہ بدلتی رہتی ہیں۔ آفریقہ کے سماج کی جمالیاتی قدریں مختلف ہیں۔ جاپان کی جمالیاتی قدروں سے ہندوستانی سماج کا جمالیاتی حس ضروری نہیں کہ امریکی سماج کی جمالیاتی حس کے معیار و مذاق پر پوری اترے۔ اس لئے سینکڑوں برس پہلے وضع کیے گئے عرباء، فارس کا قواعد عروض ہمارے آج کے سماجی اور ادبی تقاضوں کی تکمیل و تشفی کس طرح کر پائیں گے۔ معاشرے بدلے ہیں۔ تہذیبیں بدلی ہیں، مزاج بدلے ہیں لباس بدلے ہیں، خود زبانیں بدلی ہیں۔ الفاظ بدلے ہیں الفاظ کے معنیٰ و مفہوم بدلے ہیں اس طرح ذہن انسانی کا فکری سفر عبارت ہے۔ اسی تغیر اور اسی ارتقاء سے۔ تو کیا وجہ ہے کہ ہم ہمارے دقیانوسی نظریۂ شعر پر نظر ثانی نہ کریں۔ یہ ضروری ہے کہ نظم اور نثر میں کچھ نہ کچھ امتیاز ہونا چاہیئے۔ مگر عین ممکن ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی آئے جب کہ ان دونوں کا فرق ہی مٹ جائے۔ بہر حال بنیادی طور پر نظم کے لئے

شاعرانہ اندازِ فکر اور شاعرانہ اندازِ بیان کی شرط پر اصرار کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن کلام موزوں اور بحر، ردیف اور قافیہ پر حد سے زیادہ اصرار کرنا بھی ایک طرح کی توہم پرستی ہے ۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پابند شاعری نہ ہو۔ بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صرف پابند شاعری ہی کیونکر ہمارے نت بدلتے ہوئے موضوعات اور بدلتے ہوئے تہذیبی اور فنی تقاضوں کے ساتھ انصاف کر پائے گی ۔ پابند شاعری کے علاوہ ادب کے ارتقاء کے بعد غیر پابند شاعری میں بدلے ہوئے حالات اور رجحانات کے زیر اثر ایک ادبی فنی ضرورت بن کر ہمارے سامنے آ چکی ہے ۔ دنیا کی مختلف ترقی یافتہ ۔ زبانوں میں غیر پابند شاعری خاصہ رواج پا چکی ہے تو پھر اردو ادب اس سے کیوں محروم رہے اور نثری نظم شجر ممنوعہ کیوں بنی رہے ۔ عام طور پر شاعری کی امتیازی خصوصیات کے باب میں موسیقیت اور ترنم کی بات بھی اٹھائی جاتی ہے ۔ یہ سچ ہے کہ غیر پابند شاعری خاص کر نثری شاعری میں کوئی بندھا ٹکا آہنگ اور مانوس ترنم نہ ہوگا ۔ مگر محض اس لیے یہ خیال کرنا کہ وہ شاعری ہی کیا جس میں آہنگ اور لے نہ ہو، اب ایک طرح سے غیر دانشورانہ اندازِ فکر محسوس ہوتا ہے ۔ موسیقی بلاشبہ ایک عظیم فن ہے لیکن شاعری بھی کوئی کمتر صنف نہیں بلکہ اسے جزو پیغمبری بھی قرار دیا جاتا رہا ہے ۔ اس لیے کیا ضروری ہے کہ شاعری کی عظمت کے لیے آہنگ و لے کی شرط لگا کر شاعری جیسے عظیم فن اور برگزیدہ خلاقانہ صنف کو موسیقی کے تابع بنا دیا جائے ۔ ٹھیک ہے کہ انسان نے جہاں ہزاروں تجربے کیے وہاں ایک تجربہ یہ بھی کیا تھا کہ شعر کو سروں اور اوزان کے ڈھانچے میں ڈھالا ۔ بلکہ سچ پوچھیے تو مجھے ایک لحاظ سے یہ ایک غیر فطری اظہار معلوم ہوتا ہے ۔ بہرحال اب اس ضمن میں تو بات کو ختم ہو جانا چاہیے ۔ تازہ فکر اور نئے ذہن سے نئے تجربے کیے جانے چاہئیں ۔ نئے قرینے مرتب ہونے چاہییں ۔ اگر شعر کو موسیقی کے تابع کیا جا سکتا ہے تو موسیقی کو بھی شعر کے تابع بنایا جا سکتا ہے یا ان دونوں کے التزام کا سلسلہ ختم بھی کیا جا سکتا ہے ۔ یا دونوں طرح کی شاعری جائز قرار دی جا سکتی ہے ۔

یہاں ایک اور بات بھی کہنی ہے وہ یہ کہ صرف کلام موزوں ہی شاعری نہیں، شاعری بہت کچھ اور بھی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو

سہ ریل آتی ہے ریل جاتی ہے :: ریل جاتی ہے ریل آتی ہے یا سہ ایک دو تین :: آ جا موسم ہے رنگین

جیسے کلام موزوں کو بھی شاعری کا درجہ عطا کرنا ہوگا ۔ نہ صرف یہ بلکہ جتنی منظوم لغات ہیں پہیلیاں، ڈھکوسلے اور چیستانیں ہیں ان سب کو بھی شاعری کے زمرے میں شامل کرنا ہوگا ۔

شعر کی جو شرط اولین ہے وہ شاعرانہ احساس اور فنکارانہ اظہار ہے اس کے لیے بلاشبہ اسلوب و آہنگ اور ہیئت کا بھی متوازن ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے مگر بہ نظر غائر حقائق کا تجزیہ کیا جائے تو یہ لازمی نہیں ۔ مثلاً تاج محل پابند شاعری کی طرح فنِ تعمیر کا نہایت مرصع اور متناسب و متوازن نمونہ ہے ۔ جمالیاتی ذوق کی تسکین کا ایک حسین پیکرِ دلنشین ۔ تراشیدہ مینار، تراشیدہ گنبد، تراشیدہ محراب ۔ لیکن کیا وادیٔ کشمیر کے خودرو مگر خوبصورت پیڑ پودے، آزاد منش مگر دلکش پہاڑیاں، آزاد مگر گنگناتے ہوئے جھرنے اور آبشار، لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں کے ناہموار نشیب و فراز کشمیر کے جنت نظیر ہونے کے ضامن نہیں ہیں ۔ دنیا کے موجودہ معاشروں کا کون ایسا جمالیاتی ذوق ہے جو نثری نظم کی طرح آزاد اور اس وادیٔ کشمیر کے قدرتی حسن و جمال اور کیفِ بہاراں سے مسحور نہیں ہوگا اس طرح نثری نظم کی روایت اور اس کے تجربے کو بھی شعر و ادب کے اس نئے سیاق و سباق میں شعری جمالیات کی اس نئی قدر بندی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ان نئے گل بوٹوں سے اردو شاعری کے آنچل کی جاذبیت کی دل آویزی میں اضافہ ہی ہو رہا ہے ۔ اس کی ہمہ گیریت نئی جہتوں اور نئے ابعادوں کا احاطہ کر رہی ہے ۔ ہمارے شعری اثاثے میں یقیناً ایک قابلِ قدر اضافہ ہے ۔

● ●

غزلیں

میرا غم ہو غمِ دوراں یہ ضروری تو نہیں
ان کی زلفیں ہوں پریشاں یہ ضروری تو نہیں

سب پہ یکساں نہیں ہوتا اثرِ فصلِ بہار
چاک ہوں سب کے گریباں یہ ضروری تو نہیں

جس فسانے کا ہوا نام سے تیرے آغاز
اُس فسانے کا ہو عنواں یہ ضروری تو نہیں

آنکھ فرصت نہ سہی موت تو آسکتی ہے
وہی آئیں شبِ ہجراں یہ ضروری تو نہیں

رفتہ رفتہ انھیں ہو جائیگا خود اندازہ
غم ہو چہرہ سے نمایاں یہ ضروری تو نہیں

سعید شہیدی

رات کے بڑھتے اندھیروں کو سزا دی جائے
لَو ذرا دل کے چراغوں کی بڑھا دی جائے

کیا اسی واسطے سینچا تھا لہو سے اپنے
جب سنور جائے چمن آگ لگا دی جائے

شمعِ دل ہم بھی جلانے کو ہیں تیار مگر
شرط یہ ہے کہ جَلا کر نہ بجھا دی جائے

عقل کا حکم کہ ساحل سے لگا دو کشتی
دل کا اصرار کہ طوفاں سے لڑا دی جائے

تبصرہ بعد میں بھی قتل پہ ہو سکتا ہے
پہلے یہ لاش تو رستے سے ہٹا دی جائے

جوہری کوئی تو بازار میں آنکلے گا
آج قیمت تو علیؔ اپنی بڑھا دی جائے

علی احمد جلیلی

شعر کہیں ہیں مری تنہائیاں
گنگناتی ہیں تری پرچھائیاں

دیکھتے رہیئے جہاں تک بس چلے
ان کی آنکھوں کی حسیں گہرائیاں

ان کے عارض کی گلابی چاندنی
ارغوانی جام کی رعنائیاں

رات میرے پاس تجھ کو دیکھ کر
دیر تک روتی رہیں تنہائیاں

بخش دے مجھ کو یہ انجانی تھکن
تجھ کو بوجھل ہیں تری انگڑائیاں

آپ اور ہم دونوں پیچھے رہ گئے
فاصلے طے کر گئیں رسوائیاں

ہم سے اے تسنیم چند الفاظ میں
لے گئے وہ زیست کی زیبائیاں

تسنیم فاروقی

غلام جیلانی

اُردو ادب میں ناول کا مقام

اردو ادب میں ناول کے مقام کے تعین سے پہلے ضروری ہے کہ ادب کی متعلقہ شکلوں سے بھی تعارف کرا دیا جائے جو کسی نہ کسی وجہ سے ناول سے مشابہت رکھتی ہیں۔ ان شکلوں کے نام گنوانا کافی نہیں بلکہ ان کی ماہیئت پر بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہمارے سامنے داستان آتی ہے۔ داستانیں ' بالعموم " یک گونہ بیخودی " پیدا کرنے والی صنف ادب ہیں۔ جس میں ایسا ماحول ' ایسی فضا اور ایسے واقعات سامنے آتے ہیں جن کا زندگی کی تلخ حقیقتوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ داستان گوئی چونکہ درباری داری کا ایک لوازمہ تھی اور جو بادشاہوں اور کاہل رئیسوں کے لئے خواب آور گولیوں کی طرح کام کرتی تھی ' اس لئے ان میں مافوق الفطرت عناصر ' غیر ضروری عبارت آرائی ' قصہ سے قصہ پیدا کرنے کی مہارت کے کمال دکھائے جاتے تھے۔

داستانوں کے بعد قصوں کا مقام آتا ہے۔ داستان اور قصہ کو اکثر اصحاب ایک ہی چیز سمجھتے ہیں لیکن حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ داستان کو حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا ' اس کے برخلاف قصہ گذرے ہوئے واقعات ہوتے ہیں۔ مشہور اور ممتاز شخصیتیں ان کے مرکزی کردار ہوتے ہیں اور قصہ گو ان سے متعلق یا ان کے دور کے واقعات کو زور قلم سے رنگین اور دلچسپ بنا دیتے ہیں لیکن قصوں کو سوانحاتی ادب نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان دونوں میں ایک نمایاں فرق ہوتا ہے۔ سوانح نگار ایماندارانہ طور پر تاریخی صحت کے ساتھ واقعات بیان کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن قصہ گو واقعات کو خیالی تانے بانوں میں الجھانے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔

جس طرح داستان اور قصوں سے متعلق غلط فہمی عام ہے ' اسی طرح کچھ لوگ افسانہ یا ناول کو بھی ایک ہی چیز سمجھتے ہیں۔ اور صرف طوالت کو ان دو اصناف کی تقسیم کی صفت سمجھتے ہیں یعنی یہ کہ طویل افسانہ ناول کہلایا جا سکتا ہے اور مختصر ناول افسانہ ' حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ فرق واضح ہو جائے گا کہ افسانہ ایک نقطے یا ایک حادثے کے پھیلاؤ کا نام ہے۔ اور ناول میں مرکزی کرداروں پر ایک طویل عرصہ میں کیا کچھ گزرتا ہے اور وہ ماحول اور فضا سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں یا وقت اور زمانے کی قدروں سے ان کی شخصیتوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔

سب سے آخر میں ڈرامہ سامنے آتا ہے ' بعض اصحاب ڈرامے اور ناول میں یکسانیت پاتے ہیں اور یہ تک کہہ گذرتے ہیں کہ مکالموں کی کثرت ناول کو ڈرامہ بنا دیتی ہے اور بیانیہ عبارت کی کثرت ہی ناول کی خاص خصوصیت ہے۔

ناول کی ابتدا عشقیہ کہانیوں سے ہوئی۔ اور حال حال تک ناول کے پلاٹ کے تانے بانے خانگی و جنسی جذبات کی سازشوں سے بُنے جاتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ناول کے پلاٹ زندگی اور موت کے اطراف گھومتے ہیں۔ زندگی کا لازمی نتیجہ موت ہے لیکن ناول میں آغاز کسی اچانک یا حادثاتی موت سے ہوتا ہے یا ایسی موت جو نتیجہ رہتی ہے کشمکش کا۔ کبھی موت ایسے موقع پر واقع ہوتی ہے کہ اس کے باعث ناول کے پلاٹ

الجھ جاتے ہیں۔ اور اس کی وجہ سے ناول میں ایسا مقام آجاتا ہے کہ آئندہ وقوع پذیر ہونے والے واقعات پر غلط قیاس آرائیوں کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے ۔ اور کبھی ناول کا اختتام موت پر ہوتا ہے، مرکزی کردار کی موت کے بعد وہ کچھ باقی نہیں رہتا ۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ آغاز اور اختتام خواہ کیسا ہی ہو، ناول کے پلاٹ کو مستحکم بنانے والی چیز صرف محبت ہے ـــــ فرانسیسی ناقد تو یہاں تک لکھنے سے باز نہیں آتے کہ ناجائز محبت اور رومانوں کے بغیر کوئی ناول مکمل نہیں ہوتا اس طرح محبت و رومان ناولوں کے پلاٹ کے اہم جزو ہوتے ہیں ۔ اگرچہ ان میں حقیقت پسندی سے زیادہ ذہنی عیاشی نمایاں ہوتی ہے ۔ زندگی کی گوناگوں مصروفیات کو ثانوی حیثیت ملتی ہے لیکن ناول میں محبت کا رنگ حاوی نہ ہو تو وہ دلچسپی سے محروم ہو جاتی ہے ۔ انسانی زندگی میں امراض اور دیگر اقسام کی تکالیف، کی بہتات رہتی ہے ۔ لیکن ان کی تفصیلات اگر کتابی صفحات پر ملیں تو قاری اکتا جاتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی میں دولت کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن ناول میں دولت کو اہمیت صرف اس لئے ملتی ہے کہ اس کے وجود سے ناول کے مرکزی کردار جنسی و دیگر خواہشات کی تکمیل کر پاتے ہیں ۔ ادب لطیف کی اس صنف کی یہ خاص خصوصیت ہے کہ اصلی زندگی میں دولت مند مشہور شخصیتوں کے اطراف زندگی گھومتی ہے لیکن ناول میں ایسا نہیں ہوتا ۔

جوں جوں حقیقی زندگی میں مادہ پرستی پھیلتی گئی اور انسانی قدریں دولت کے پیمانوں سے ناپی جانے لگیں تو ناول نگاروں نے جذبات کی ترجمانی کو زیادہ اہمیت دے کر ذہن کو تھکا دینے والی فضا کا بدل ڈھونڈ لیا ۔ ناول نگار کی توجہ محدود فضا ، اور ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات و حادثات پر ہوتی ہے جن کا حقیقی زندگی میں وقوع پذیر ہونا قرین قیاس ہوتا ہے ۔ اس کا مقصد انفرادی زندگی کی جذباتی الجھنوں کو کچھ اس طرح بیان کرنا ہوتا ہے کہ قاری ان میں نہ صرف دلچسپی محسوس کرتا ہے بلکہ ان الجھنوں کو سلجھانے کے لئے مختلف امکانات پر غور کرتے ہوئے ناول نگار کے زاویہ نگاہ کی قدر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ۔

بعض ناقدین ادب کا خیال ہے کہ ناول ایک قریب المرگ صنف ادب ہے ، یہ خیال درست نہیں ، اگر ناول نگار اصول پرستی اور روایات سے چپکے رہ کر اپنا دائرہ عمل محدود نہ کر لے تو ناول کی اہمیت برقرار رہ سکتی ہے ۔ آج ناول نگار رائج ہوئے رجحانات سے بغاوت کرتے ہوئے نئے نئے راستے تلاش کرتے جا رہے ہیں ۔ اور یہ حقیقت ہے کہ نئے راستوں کی کمی نہیں ۔ آج کل کی ہموار زندگی میں سماج ناولوں کے لا تعداد پلاٹ مہیا کرتا ہے ۔ کامیاب ناول نگاری کے لئے صرف صحیح انتخاب کی ضرورت ہے ۔ ناول نگار اگر یہ بات پیش نظر رکھے کہ ادب اور زندگی میں جو فرق ہے وہ صرف اتنا ہے کہ حیرت انگیزی اور ندرت ۔ کا تناسب ادب میں حقیقی زندگی سے بڑھ چڑھ کر آتا ہے ۔ غالباً یہ بات معلوم کر کے تعجب ضرور ہوگا کہ نامور ناول نگار وہی ہوتے ہیں جو اپنی ناولوں کو وقت کے تقاضوں کی ترجمانی صحیفہ نگاری کے انداز میں کرتے ہیں ۔ سماج کی کمزوریوں کو نمایاں کرنا ، دکھتی رگوں کو چھیڑنا ، اور پھر جذبات کی صحیح ترجمانی ایسی چیزیں ہیں جو ناول نگار کو ناموری بخشتی ہیں ۔

آج کل کی اردو ناولوں کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناول نگار آج کی سوسائٹی کی ہمہ جہتی سے پوری طرح آشنا نہیں ، اور ہو سکتا ہے کہ اس خامی کے باعث وہ راہ فرار تلاش کر رہے ہیں ۔ فرار کے لئے بھی راستوں کا تعین ضروری ہے ، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ایسے راستے یا تو ناقابل وجود تصوراتی ہوتے ہیں یا نفسیاتی ہوتے ہیں یا پھر شخصی زندگی کے گناہ آلود اعترافات ہوتے ہیں ۔ آج کل کی سماج کی نمائندگی کی ناولیں پیش کرنا مشکل ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں ۔

ادب لطیف کی بہترین شکل وہ ہوگی جس میں فرضی کہانیوں اور واقعاتی اطلاعات یا مورخوں کے مضمونوں میں ایسی یکسانیت آجاتی ہے کہ ان میں بہت کم فرق محسوس ہو۔ جانے پہچانے کردار، دیکھے بھالے مقامات، اور اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر ایسا ہو جائے تو وہ کہہ اٹھیں گے کہ۔

ان نہ گونے اور بھی بے خواب کر دیا ظالم سنا رہا ہے مری داستاں مجھے

ناول کو ادب میں اہم مقام اس لئے حاصل ہے کہ اس میں نہ صرف کسی نہ کسی طریقہ پر تاریخی واقعات اور تاریخی شخصیتوں کی پرچھائیاں موجود رہتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان میں تہذیبی اور تمدنی لہروں کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

اردو ادب کی ابتدائی ناولوں سے لے کر آج تک لکھی جانے والی ناولوں میں زمانے اور مقام سے تعلق رکھنے والی فضاء اور سماجی قدروں کی عکاسی تو ہوتی ہے لیکن مرکزی کردار جیتے جاگتے بہت ہی کم ملتے ہیں۔ "گل رعنا" اور "امراؤ جان ادا" گو اولین کوششیں ہیں لیکن ان میں جو بات ملتی ہے وہ آج کل بکثرت چھپنے والے ناولوں میں نہیں۔ اسی طرح شررؔ کے تاریخی ناول یا ڈپٹی نذیر احمد اور راشد الخیری کے نصیحت آموز ناول یا منشی پریم چند کے دیہی فضا کے ناول جس معیار کو پہونچتے ہیں، اس تک آج کل کے ناول پہونچنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ آج کل کے ناول سیکرٹری کہلائے جا سکتے ہیں، کہیں صرف گندگی اور عریانی ہے تو کہیں صرف رسم و رواج کی پابندیاں، کہیں صرف مکالمے ہیں تو کہیں شہزادے ہیرو ہیرو ٹائپ کی خاطر کہانی کو اس قدر طول دیا جاتا ہے کہ قاری اکتاہٹ اور بیزاری سے دوچار ہوتا ہے۔ کہیں ناول نگار ایک مخصوص گروہ بلکہ خاندان کے مرکزی و غیر مرکزی کرداروں میں اپنی ساری صلاحیت کو گم کر دیتا ہے، کہیں مزاح کی ناکام کوشش پھکڑ بازی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور کہیں طنز کی ناکامی خود طنز نگار کو شکار کر گذرتی ہے۔

یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ادب میں ناول کے مقام کی اہمیت کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ناول نگار ایک ناول کے چند صفحات میں بے شمار مسائل کے حل تلاش کرنا چھوڑ دیں اور ناولوں کو اصلیت اور حقیقت کے قریب تر لائیں، یہ ہو جائے تو ادب میں ناول کو وہ اہم مقام جس کی وہ مستحق ہے، مل جائے گا۔

حیدرآباد کے شاعر (۵۰)

محمد منظور احمد

سنہ ۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ

اردو کے تعلیمی اور علمی اُفق پر جن مخلص اور شہرت گریز افراد نے گذشتہ ربع صدی میں اپنی صلاحیتوں کے سبب اپنا مقام بنایا اُن میں محمد منظور احمد شامل ہیں۔ پیشہ تدریس کی طہارت کو روشن کرنے میں ان کی قابلیت، انہماک اور صلاحیتوں کے کیا کہنے، منظور احمد، استادِ اُردو، نثر نگار اور صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد کے علمی حلقوں میں شہرت خاص رکھتے ہیں۔ ۱۰ر مارچ سنہ ۱۹۲۳ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد عبدالمغنی ہے۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے مضمون اُردو میں ایم اے کیا۔ ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء سے اسسٹنٹ لکچرر اُردو کی حیثیت سے کریم نگر، نرمل اور ملگنڈہ کے ڈگری کالجوں میں تعینات رہے۔ آجکل گورنمنٹ سٹی کالج حیدرآباد میں کارگذار ہیں۔ اُردو مجلس کے ۱۹۵۸ء سے کئی سال تک معتمد رہے۔ علمی و ادبی تقاریب کو اس اہتمام اور انصرام سے ترتیب دیا کہ شہر کے تہذیبی حلقے آج بھی مثال دیتے ہیں۔ صحافت پر سمینار، یوم مولوی عبدالحق، یوم مومن، یوم فراق کیسے یاد نہیں۔ سہ ماہی مجلہ "مجلس" کے مدیر کی حیثیت سے ان کی صحافتی خدمات بھلائی نہ جائیں گی۔ محمد منظور احمد، ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے شعبہ امتحانات اور مجلس مشاورت "سب رس" اور ماہنامہ شگوفہ کی مجلس ادارت کے رکن ہیں۔ اقبال اکیڈمی حیدرآباد کے سہ ماہی ترجمان "اقبال ریویو" (حصہ اُردو) کے مدیر بھی مقرر کئے گئے ہیں۔ آپ کا پہلا شعری مجموعہ "حرفِ شوق" ۱۹۷۴ء میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔ منظور صاحب کلاسیکی غزل کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ (و۔ رغ)

غزلیں

اُس کی محفل میں تو آکر دیکھو　　زیست سے آنکھ ملا کر دیکھو
در و دیوار سے آئے گا جواب　　کبھی آواز لگا کر دیکھو
اور بڑھ جائے گی یہ حیرانی　　دل کو آئینہ بنا کر دیکھو
وہ تو ہر رنگ میں ہے جلوہ نما　　تم ذرا ہوش میں آکر دیکھو

○

نہ پوچھو کون ہوں میں اور کیا ہوں　　کسی سنسان جنگل کی صدا ہوں
وہ لمحے جو تمہارے ساتھ گزرے　　انہی کی یاد میں کھویا ہوا ہوں
کوئی کیا جانے لذتِ تشنگی کی　　سمندر میں بھی میں پیاسا رہا ہوں
ترے جلوے کی تابانی مسلّم　　میں خود ہی اصل میں پردہ رہا ہوں
کہانی میری بس اتنی ہے منظورؔ!　　میں حرفِ شوق کا مارا ہوا ہوں

○

اب کسی میں کہاں وفا ہے میاں　　عجب اس دور کی ہوا ہے میاں
کچے دھاگے کا ربط و رشتہ ہے　　کون کس کا یہاں ہوا ہے میاں
یوں تو جینے کو لوگ جیتے ہیں　　کون یاں واقعی جیا ہے میاں
کم ہیں انساں، خدا کی بستی میں　　آج ہر شخص اک خدا ہے میاں

○

گھور اندھیرے میں مجھ کو ڈھونڈتی تھی　　رات سناٹے میں صدا کس کی
کارواں جا چکا سوئے منزل　　دیر تک گرد پھر بھی اٹھتی رہی
سوچ میں گم ہیں اس کیوں بیٹھیں　　تھی مگر اتنی آس بھی تو نہ تھی
کچھ مداوا نہ ہو سکا اب تک　　کب ان آنکھوں کی قدر ہوگی نمی
کھولے بیٹھا ہے منہ ہر ایک صدف　　جانے حصے میں کس کے ہے موتی

○

ایک آہٹ سی ہے سنسان سے شہر دل میں　　کیا مسافر کوئی چلتا ہے بہت رات گئے
اُف یہ یادیں، اُنہی یادوں کے جھروکے سے کبھی　　ایک سایہ سا اُبھرتا ہے بہت رات گئے
اپنے ہی حسنِ طلب کا ہے انوکھا انداز　　پیرِ میخانہ سمجھتا ہے بہت رات گئے

○

وقت کی کتنی کڑی دھوپ میں جلتے ہیں　　آرزو یادوں کے ہم گلستاں جاتے ہیں

کچھ شعر اور اُن سے وابستہ یادیں

ہاشم علی اختر

کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

سرسری اس جہان سے گزرے ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

یہی بات ذرا غیر شاعرانہ انداز میں شرلاک ہومز اپنے دوست ڈاکٹر واٹسن سے کہتا رہتا ہے کہ "WATSON, YOU SEE BUT YOU DON'T OBSERVE" جس کا ترجمہ شاید یہ ہو کہ "تم نظر ڈالتے ہو مگر دیکھتے نہیں۔" ایسے لوگوں کی بڑی اکثریت ہوتی ہے اور بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں جو کسی کے چہرے کی خفیف سی ناراضگی دیکھ سکیں یا کسی منظر کی دلکشی کا تاثر دیر تک باقی رکھ سکیں۔ ویسے زندگی میں کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس کے ختم پر اس کے پُرغم ہونے کا ثبوت نہ ملتا ہو چاہے وہ خمِ اَبرو ہو یا خمِ گردن اور کوئی نہ کوئی ایسی دلچسپ بات نہ ہوتی ہے جو برسوں یاد نہ رہے اپنے شہر یا وطن کی محبت میں انہیں یادوں کا بڑا دخل ہوتا ہے اور ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ذہن میں آجاتی ہے جو خود کو ماضی سے وابستہ کرتی ہے اور وطن کی محبت میں اضافہ کرتی ہے۔ ایسی دلچسپ باتوں میں اشعار کا خاص مقام ہوتا ہے اور پسندیدہ شعر اکثر اپنی ہی کسی وارداتِ قلبی کا عکس ہونے کی وجہ سے پسندیدگی کا درجہ حاصل کرتا ہے۔ میرے ماضی کے ایسے ہی چند اشعار کا ذکر اب میں آپ سے کروں گا۔ شہزادہ شجیع کا ایک شعر ہے

کیا کہیں شامِ غم کا حال شجیعؔ وقت گزرا نہیں گزارا ہے

کوئی پینتیس چھتیس سال قبل جامعہ عثمانیہ کے اڈریس ہال میں ایک شاندار مشاعرہ منعقد ہوا تھا جس کی صدارت شہزادہ معظم شاہ بہادر شجیعؔ نے کی تھی اور اس میں باہر کے شعراء بھی مدعو تھے۔ مشاعرہ نہایت کامیاب رہا اور جناب صدر کے چلے جانے کے بعد شاید کسی اخباری نمائندے نے برار کے ایک شاعر شرف الدین شرفؔ سے مشاعرہ کے بارے میں اُن کی رائے دریافت کی۔ شرفؔ صاحب مشاعرے سے بہت متاثر ہوئے لیکن جواب میں انھوں نے کہا کہ "صاحب میں نے ایسا مشاعرہ آج تک نہیں دیکھا۔ "وقت گزرا نہیں گزارا ہے" مشاعرہ کے شرکا جو شاہی آداب کی وجہ سے مشاعرہ کے دوران مؤدب رہنے پر مجبور تھے۔ اس بات پر اسقدر زور سے ہنسنے لگے کہ یوں معلوم ہونے لگا کہ اڈریس ہال بادلوں کی گرج کی راست زد میں آگیا ہے اور مہینوں بعد تک ہر دلچسپ محفل کے کوئی نہ کوئی منچلا کہہ بیٹھتا کہ

واہ صاحب وہ کیسی محفل تھی وقت گزرا نہیں گزارا ہے

نوجوان گلوکار امیر محمد خاں انڈین کانفرنس آف سوشیل ورک کے کالج آف سوشیل ورک کے کسی جلسے میں ایک غزل گا رہے تھے جس کا ایک شعر ہے ؎ موت کیا ہے زمانے کو سمجھائیں کیا راستے میں مسافر کو نیند آ گئی

اسٹیج پر ایک سابق ناظم طبابت ڈاکٹر کھتری بھی تشریف فرما تھے اس شعر پر وہ بے اختیار داد دینے لگے اور اپنے

دوستوں کو جو محفل میں موجود تھے نام بہ نام پکار کے کہتے کہ واہ کیا شعر ہوا اور یہ شعر مفتی کو کئی دفعہ دوہرانا پڑا۔ جلسے کے بعد میں اُن سے ملا تو وہ مجھ سے بول کہنے لگے کہ صاحب خوب شعر تھا۔ چند منٹ بعد وہ اپنی کار میں سوار ہوئے اور گیٹ سے باہر نکلنے سے قبل بے ہوش ہوگئے اور پھر ہوش میں نہیں آئے۔ اس کے بعد سے جب کبھی کھتری صاحب کا ذکر آتا ہے یا امیر محمد خاں سے ملاقات ہوتی ہے تو مجھے یہ مصرع یاد آجاتا ہے کہ ؎ راستے میں مسافر کو نیند آگئی۔

فارسی کا ایک شعر ہے ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق　　او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

شاید ۱۹۴۳ء کی بات ہے جناب قاضی محمد حسین جامعہ عثمانیہ کے پرو وائس چانسلر تھے۔ امتحانوں کے زمانے میں ممتاز بیرونی پروفیسر امتحانوں کے سلسلے میں حیدرآباد آتے۔ ان میں ہمارے ایم ایس سی کے امتحان کے سلسلہ میں حیوانیات کے مشہور پروفیسر جارج متھائی آئے ہوئے تھے اور قاضی صاحب انہیں ہاسٹل کے کسی ایٹ ہوم میں لے آئے۔ دونوں برسوں پہلے کیمبرج میں ساتھ تھے اور برسوں سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے جارج متھائی صاحب سے تقریر کرنے کو کہا اور وہ قاضی کی باتوں کو یاد کر کے قاضی صاحب کی جوانی کی بعض باتیں بیان کرنے لگے۔ قاضی صاحب غائب دماغ مشہور تھے لیکن بار بار متھائی صاحب کو ٹوک کر اُن کی بیان کی ہوئی بعض تفصیلات کو صحیح کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ غرض متھائی صاحب کی تقریر کے دوران دونوں کی خوب نوک جھونک ہوتی رہی۔ جب قاضی صاحب کی تقریر کا وقت آیا تو انھوں نے کہا کہ مجھے یہ ساری تفصیلات یاد نہیں رہی تھیں لیکن چونکہ متھائی صاحب نے کہا ہے لہذا شاید صحیح ہوں مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق　　او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

وحید کا ایک شعر ہے ؎

اصلاحِ انتظامِ جہاں تیری بھول ہے　　یاں ہر گدھے کی پیٹھ پہ اطلس کی جھول ہے

اس شعر پر بھی ایک مشاعرہ کی یاد آتی ہے جو جامعہ عثمانیہ کے طعام خانہ میں ہوا تھا۔ وحید نے اپنی نظم شروع کی نظم کے اپنی نظم شروع کی۔ نظم کے چند شعروں کے بعد پروفیسر وحید الرحمٰن جو عثمانیہ میں "صاحب" کے نام سے مشہور تھے اٹھ کر باہر چلنے لگے ان کے بارے میں لڑکوں نے بہت سے لطیفے اپنی طرف سے بھی الٹے سیدھے منسوب کر رکھے تھے اور اُس دور کے ہر عثمانین کو ان کی کہانیاں سنانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ سو نئے اتفاق سے جیسے ہی وہ اُٹھے اور باہر کی طرف جانے لگے وحید اپنی نظم کے اس شعر پر پہونچے کہ ؎

اصلاحِ انتظامِ جہاں تیری بھول ہے　　یاں ہر گدھے کی پیٹھ پہ اطلس کی جھول ہے

وحید صاحب نے یہ شعر کئی محفلوں میں سنایا ہوگا لیکن جو ہنسی اس وقت ہوئی تھی اس کا جواب نہیں۔

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے برسوں پہلے ایک مشاعرہ ہوا تھا جس میں فانی اور جگر دونوں شریک تھے۔ جب فانی کی باری آئی تو کسی نے جگر سے فانی کی غزل پڑھنے کے لئے کہا اور جگر نے اپنے مخصوص اندازِ ترنم سے غزل شروع کی۔ مطلع تھا ؎ مجھ ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور　　اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

اس غزل کے ہر شعر پر جو داد ملی وہ شاید فاؔنی اگر خود پڑھتے تو نہیں مل سکتی۔ دو مختلف الطبع شاعروں کا یہ امتزاج ایک نایاب چیز تھی۔ اس شعر کے ساتھ مجھے جگرؔ کا ترنم آج بھی سنائی دیتا ہے

کسی کا شعر ہے ؎

رہے گی حاجت شرح جفا نہ محشر میں　　اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے

یہ شعر ہاسٹل کے اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب نئے داخل ہونے والے طلباء کی RAGGING نسبتاً مہذب انداز میں ہوا کرتی تھی اور آج کل کی طرح مار پیٹ اور بدتمیزی نہیں بن جاتی تھی جس کی وجہ سے حکومت کو اب RAGGING کو جرم قرار دینا پڑا ہے۔

ایک نئے صاحبزادے ہاسٹل کے وارانڈے میں رات دیر گئے بار بار غسل خانے کی طرف جاتے اور چونکہ بڑے موٹے سلیپر پہنے رہتے تھے تو رات کی خاموشی میں بڑی آواز سے کمروں پر سے گزرتے اور دوسروں کی نیند خراب کرتے۔ چند دنوں بعد جب کبھی ان سلیپروں کی آواز آتی۔ ایک سینیئر اپنی گہری باٹ دار آواز میں بڑے اونچے ترنم میں یہ شعر پڑھنے لگتا ؎

رہے گی حاجت شرح جفا نہ محشر میں　　اس ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے

آدمی سمجھدار تھے۔ دو تین راتوں میں اس شعر کو سننے کے بعد انھوں نے سلیپر چھوڑ کر بے آواز چپل خرید لئے۔

اقبالؔ کا ایک شعر ہے ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا　　ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اس شعر پر مجھے اس دوست کا خط یاد آتا ہے جو خود امتحان میں ناکام رہا لیکن اپنے دوست کو کامیابی کی مبارکباد کا خط لکھا اس کی ذہانت اور محنت کی تعریف کی اور اپنی بیکار مصروفیتوں اور وقت ضائع کرنے کی عادت پر تبصرہ کرتے ہوئے خط اس شعر پر ختم کیا کہ ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا　　ہم محوِ نالۂ جرس کارواں رہے

ڈاکٹر حفیظ قتیل ریڈر اُردو جامعہ عثمانیہ کسی زمانے میں جامعہ عثمانیہ کے مقبول شاعر تھے ان کے ایک دوست اپنے حمام میں قتیل صاحب کے یہ دو شعر ترنم سے باآواز بلند گا رہے تھے۔

روز اک شوخ دلآرام کہاں سے لاؤں　　منزلِ تازہ بہ ہر گام کہاں سے لاؤں

قسمت حافظ و خیام کہاں سے لاؤں　　پھر بہ بادہ نیا جام کہاں سے لاؤں

جب وہ ان اشعار کو کئی مرتبہ دہرا چکے تو اُن کی کم عمر لڑکی نے سمجھا کہ یہ واقعی ان چیزوں کی تلاش میں ہیں اور حمام کے دروازے پر دستک دے کر بولی۔

" بابا امریکہ سے "

کتاب

مرزا سرفراز علی

صراطِ نور ہے، تو بزمِ دل ستاں ہے
نشاطِ ماضی و امروز ہے، خیاباں ہے

نسیمِ زیست جواہر حصار، رقصِ ہزار
تو نسترن، تو مدانِ مست، تو گل و گل زار

بنی رفیقِ سفر، مونسِ حیات بنی
تو اندمالِ غم و رمز، کائنات بنی

عروسِ دہر کی آغوش میں پلی ہے، تو
ہے، زندگی کا مرقع، مہابلی ہے تو

مصنفین نے ارض و سماں کو، یہ چھان لیا
مسافتوں سے مہ و خور سے مان، پان لیا

ملے ہیں، تیکھے، سنبھالے جوانِ غزالوں سے
بصیر ہو گئے اندھے، ان آنکھ والوں سے

تو فلسفے کا ہے معدن تو، علم، دین کا دل
مجھی نے، کھولے ہیں، عقلِ رسا کے سو سو تل

پیمبرانِ سخن، داعیانِ دار و رسن
ہے ان کا نطق، کتابوں میں حرف کا توسن

تو جانِ غالب و حافظ تو قلبِ افلاطوں
تجلیات، ملیں، ہم کو مجھ سے گوناگوں

وہ شیکسپیر کی تماثیل گوئٹے کا کمال
جہانِ آدمِ خاکی ہے ان سے مالا مال

ہے آسماں سے اُتری تو معجزہ بن کر
حریمِ قدس کا آئینۂ صفا بن کر

کتاب خلعتِ ذہنی، کتاب، بامِ فلک
ہے سرفراز، کتابوں میں فکر و فن کی دہک

غزل

صلاح الدین نیر

شاید پرانے زخم کا یہ انتقام ہے
قاتل کے لب پہ اب بھی مسیحا کا نام ہے

کروٹ بدلنے ایک ہی شب درمیان تھی
ماتم ہے اب کہیں تو کہیں جشنِ عام ہے

پھولوں کے جسم سے بھی اترنے لگا لباس
شاید یہ جشنِ گل کا نیا اہتمام ہے

ان کی گلاس میں بھی ہے انسان کا لہو
کل تک جو کہہ رہے تھے کہ پینا حرام ہے

پربت کئی شبوں کے ہیں سر پہ کھڑے ہوئے
سورج ابھی ڈھلا ہے ابھی پہلی شام ہے

قدموں پہ سر جھکانے کی عادت نہیں گئی
لگتا ہے اپنا ذہن ابھی تک غلام ہے

نیر! ہم ایسی بزم سے سمجھوتہ کیا کریں
اپنے اصول کا ہی جہاں قتلِ عام ہے

وہاب عندلیب

ارضِ دکن کا شہزادہ ــــ مجتبیٰ حسین

میں مجتبیٰ کو ان دنوں سے جانتا ہوں جب کہ وہ گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کر رہے تھے۔ گریجویشن کے لیے حیدرآباد آئے تو ان کا قیام بھی ہمارے ساتھ گلبرگہ کے طلباء کی ہاسٹل "گلبرگہ اسٹوڈنٹس ہاسٹل" ہی رہا۔ ہاسٹل کے "ڈائننگ ہال" میں مجتبیٰ کی وجہ سے بڑی ہماہمی رہی دسترخوان پر اکثر احباب ان سے منتظر رہتے تو بعض ان کا سامنا کرنے سے احتراز کرتے کیونکہ مجتبیٰ کے تیز و تند فقروں کی تاب لانا ان کے بس کے بات نہیں تھی۔ جامعہ عثمانیہ میں وہ مجھ سے دو سال جونیر تھے۔ ان دنوں ان کا خصوصی مشغلہ گپ ہانکنا تھا۔ ہر دم غیر نصابی سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ پڑھتے کم گھومتے زیادہ تھے۔ زیادہ تر وقت سگریٹ پھونکنے کی نذر ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائی مدارس سے لے کر کالج تک اسپورٹس میں دلچسپی لی۔ گلی ڈنڈا، فٹ بال اور پتنگ بازی کھیلتے رہے۔ اسپورٹس سے کم دلچسپی کم ہوتی تو سیناجینی اور ہوٹلنگ پر توجہ مرکوز کی۔ خود ان کا بیان صادق ہے کہ انھیں کلاس روم میں پٹاخے چھوڑنے، بندروں اور بلیوں کی آوازیں نکالنے میں مہارت تھی۔ زندہ دلی اور خوش ذوقی کے باعث ہاسٹل اور کالج کے احباب میں ممتاز رہے۔ گویا ہنسنا اور ہنسانا ان کی بابی تھی۔ اکثر فقرے کستے، لطیفے اور چٹکلے کہتے، مذاق اڑاتے یا بھری بزم میں راز کی بات کہہ دیتے تو کوئز ذوق ان سے منہ چھپاتے اور زندہ دل ان کی پرلطف باتوں سے اپنی تکان دور کرتے۔ ابتداء ہی سے بڑے لطیفہ گو اور لطیفہ ساز تھے۔ اکثر کسی کے حوالے سے لطیفہ یا واقعہ سناتے مگر بہت سارے لطائف ان کی دماغی پیداوار ہوتے۔ جتنی دیر بھی ہم ان کے ساتھ ہوتے وقت گزارنے کا احساس نہ ہوتا۔ اسی فطری میلان نے انھیں مزاحیہ ادب کی جانب راغب کر دیا۔ ابتداء میں انھیں نیٹشے کے فلسفہ سے دلچسپی تھی مگر ووڈ ہاؤس اور پی۔ جی۔ وڈ ہاؤس کو پڑھنے کے بعد ان کی زندگی کا رخ بھی بدل گیا۔ غالب، پطرس، اسٹیفن لیکاک، کرشن چندر، بیدی، شفیق الرحمٰن، رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور، ابن انشاء، فکر تونسوی اور ابراہیم جلیس، ان کے پسندیدہ ادیب ہیں۔ نیٹشے کا فلسفہ، غالب کا دیوان اور پطرس کے مضامین انھیں زبانی یاد ہیں۔ نئے مزاح نگاروں میں مشتاق احمد یوسفی کو پسند کرتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا آغاز [illegible] سے ہوتا ہے۔ جب کہ انھوں نے روزنامہ "سیاست" میں کالم "شیشہ و تیشہ" لکھنا شروع کیا ایک عرصہ تک فرضی نام سے ماہنامہ "پونم" میں بھی مستقل مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ انھوں نے اس دوران شاہد صدیقی کے کالموں کا انتخاب "شیشہ و تیشہ" ترتیب دے کر ساہتیہ اکیڈمی حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۶ء میں حیدرآباد میں پہلی بار ملک بھر کے مزاح نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تب سے یہ روایت چل پڑی ہے کہ حیدرآباد میں "زندہ دلان" مزاح نگاروں کا سالانہ اجتماع باقاعدگی سے منعقد ہوتا رہتا ہے۔ مجتبیٰ کے دہلی پہنچنے کے بعد اس طرح کے اجتماعات دہلی، لکھنؤ، پٹنہ اور شمال کے دیگر شہروں میں بھی منعقد ہو رہے ہیں۔ مجتبیٰ کا پہلا مزاحیہ مضمون ہم طرفدار ہیں غالب کے "سخن فہم نہیں" [illegible] میں "صبا" میں چھپ کر مقبولِ عام ہوا۔ ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ "تکلف برطرف" ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا جب کہ ان کی عمر ۳۲ سال تھی۔ اس مجموعہ کی ادبی حلقوں نے بڑی گرم جوشی سے پذیرائی کی۔ چنانچہ ممتاز مزاح نگار فرقت کاکوروی نے ان کے اس پہلے مجموعہ پر اس طرح

تبصرہ کیا "۳۲ سال کی عمر میں ایسے انداز میں اچھے سے فقرے نکالنا اسداللہ قیامت ہے۔"

مجتبیٰ نے برق رفتاری سے مضامین لکھے اور اپنے مجموعے شائع کئے۔ ہر دوسرے سال ان کا ایک نیا مجموعہ منظر عام پر آتا رہا ہے۔ چنانچہ [illegible] میں دوسرا مجموعہ "قطعِ کلام" [illegible] میں تیسرا مجموعہ "قصۂ مختصر" اور [illegible] میں چوتھا مجموعہ "بہرحال" شائع ہوا۔ ان مجموعہ ہائے مضامین کے باعث مضمون نگار کی شہرت دکن سے شمال تک پہنچ گئی۔ اس طرح ایک عرصہ کے بعد ولی دکنی کی طرح مجتبیٰ حسین بھی شمال میں ادبی محفلوں کے روحِ رواں بن گئے ہیں۔ جس کا اعتراف اہلِ شمال نے بھی کیا ہے۔ جنوری [illegible] کے اوائل میں "بہرحال" کی رسمِ اجراء دہلی میں مشہور شاعر و نقاد عمیق حنفی نے انجام دی۔ ممتاز محقق و نقاد ڈاکٹر گوپی نارنگ نے اس تقریب کی صدارت کرتے ہوئے یوں اظہارِ خیال فرمایا۔

"ڈھائی سو سال پہلے ارضِ دکن سے غزل کا شہزادہ ولی دکنی دہلی آیا تھا اور اب ڈھائی سو سال بعد ارضِ دکن سے مزاح کا شہزادہ دہلی آیا ہے اور اس کے آتے ہی دہلی کی مزاحیہ ادبی محفلوں میں ایک جان سی پیدا ہوگئی ہے۔"

حیدرآباد اور گلبرگہ جیسے شہر تو دکن میں کسی تعارف کے محتاج نہیں مگر نارنگ کے اس خراجِ تحسین کے بعد چنچولی، تانڈور اور راجوری جیسے مقامات بھی دکن کے نقشے میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ مجتبیٰ اپنے ننھیال چنچولی ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں ۱۵ جولائی [illegible] کو پیدا ہوئے، راجوری ضلع عثمان آباد (مہاراشٹرا) ان کا آبائی وطن ہے۔ انھوں نے تانڈور (آندھرا) سے میٹرک، گلبرگہ سے انٹرمیڈیٹ اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ڈپلوما اِن پبلک اڈمنسٹریشن کا امتحان کامیاب کیا اس طرح مجتبیٰ بیک وقت کرناٹکی، آندھرائی اور مہاراشٹری کہلانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔

مجتبیٰ مزاح کے شہزادہ نہیں بلکہ نوابوں کے شہزادہ بھی معلوم ہوتے ہیں۔ گندمی رنگ، اونچی ناک، شرارت و فراست سے پُر آنکھیں، سلیقہ سے جمے ہوتے بال —— ہمیشہ اِن شرٹ کئے ان کی دل آویز شخصیت جادو جگاتی نظر آتی ہے۔ ان کے بے ضرر چہرہ پر پھیلی ہوئی معصومیت پر نہ جائیے ان کی معصومیت میں کئی شرارتیں پوشیدہ ہیں۔ گو عمر ۴۰ سال کے لگ بھگ ہے مگر ان کی سدا بہار شخصیت سے حقیقی عمر کا پتہ لگانا مشکل ہے۔ وہ ابھی کنوارے ہی نظر آتے ہیں۔ حال میں کملا نہرو کالج دہلی میں اپنی صاحبزادی کے داخلہ کے سلسلہ میں گئے تو وہاں اچانک ایک محترمہ کا سامنا ہوا جو اُن ہی کے آفس میں کام کرتی ہیں۔ مجتبیٰ کو لڑکیوں کے کالج میں دیکھ کر انھیں اچنبھا ہی نہیں بلکہ تشویش ہوئی۔ محترمہ کو یقین نہیں آیا کہ مجتبیٰ کی صاحبزادی ڈگری کالج میں ہوسکتی ہیں۔ وہ تو مجتبیٰ کو اس عمر کا سمجھتی ہیں جس سے کالج کا طواف کسی اور مقصد سے کیا جاتا ہے۔ مجتبیٰ کی زعفران زار شخصیت کا کرشمہ ہے کہ غیر اردو داں طبقہ میں بہتوں کو اردو سیکھنے کی ترغیب ہورہی ہے۔ چنانچہ مجتبیٰ سے ملنے اور دیوناگری رسم الخط میں شائع شدہ ان کے بعض مضامین پڑھنے کے بعد دہلی میں ان کے کئی احباب باقاعدہ پڑھ رہے ہیں۔ جن میں مسز خورشید ورما اور مس شکتی قابلِ ذکر ہیں۔

آج [illegible] اور غیر محفوظیت کے احساس نے فرد کو نیم جاں اور شکستہ بنا دیا ہے۔ جاں نثار اختر نے اسی احساس کو زباں دی ہے ۔

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود ہر ایک فرد کوئی سانحہ لگے ہے مجھے

کرب [illegible] اور بے یقینی کے اس ماحول میں فرد کے لئے ہنسنا یقیناً ایک بڑا کام ہے ان حوصلہ شکن حالات میں ہنسنا ہنسانا جوئے شیر لانا

جاتا کام ہے۔ ہم اسے فن کار کی عظمت سے تعبیر کریں گے کہ اس کی تحریریں دل برداشتہ و دل شکستہ افراد کی دل جوئی کا موجب بنیں اور کچھ دیر کے لیے ہی سہی ہماری بے کیف زندگیوں کو مسرت سے ہمکنار کریں۔ بلاشبہ مزاح نگار اپنی تحریروں کے ذریعہ زندہ رہنے اور زندگی سے محبت کا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے مرزا غالب سے دورِ حاضر تک مزاح نگاروں کی ایک فوج ظفر موج اپنا یہ فرض منصبی پورا کرتی رہی ہے۔ ان مزاح نگاروں میں مجتبیٰ حسین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ [illegible] "ہنسی ایک مقدس فرض اور قہقہہ لگانا دنیا کا سب کا بڑا اڈونچر ہے"۔ مجتبیٰ نے نہایت کم عمری میں لکھنا شروع کیا اور [illegible] عرصہ ہی میں اپنی چونکا دینے والی تحریروں کے ذریعہ ایوان ادب میں تہلکہ مچادیا۔ ان کے ہاں قہقہے بھی ہیں اور زیرِ لب تبسم بھی۔ جب وہ پھلجھڑیوں اور لطائف سے پُر مضامین پڑھتے ہیں تو جلسہ گاہ کی چھت اڑ جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔ مجتبیٰ ہلکے پھلکے مزاح کے حق میں ہیں۔ انھیں بوجھل مزاح پسند نہیں۔ وہ مزاح کا مقصد قوم کی اصلاح قرار نہیں دیتے اس خصوص میں مشتاق احمد یوسفی کے ہم خیال ہیں کہ "اگر طنز کے تیر و نشتر سے قوم کی اصلاح ہو سکتی تو عربوں کو بارود ایجاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی" ان کی تحریریں لفظوں کی کرتب بازی، استہزا، لعب، پھکڑپن سے مبرّا ہیں۔ "تکیہ کلام" "ریلوے منتری مسافر بن گئے" "مرزا کی یاد میں" "قصہ داڑھ کے درد کا" "چیخوف اینڈ سنز کی یاد میں" اور "ڈاکٹر کرشن ساگر" جیسے مضامین کے مطالعہ کے بعد بھی اگر کوئی یہ رائے قائم کرتا ہے کہ طنز و مزاح دوسرے درجے کا ادب ہے تو پھر مجھے بھی یہاں ممتاز مزاح نگار یوسف ناظم کا یہ قول دہرانا ہوگا کہ "ہمارا مزاحیہ ادب اگر دوسرے درجے کا ادب ہے تو اردو میں اب تک پہلے درجے کا ادب پیدا نہیں ہوا"۔

مجتبیٰ حسین ایک اہم مزاح نگار ہی نہیں بلکہ منفرد خاکہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے خاکہ نگاروں کو راہ دکھائی ہے اور ایک [illegible] دیا ہے۔ مظفر حنفی نے مجتبیٰ کی خاکہ نگاری کا اس طرح تجزیہ کیا ہے۔

"بحیثیت مجموعی مجتبیٰ حسین ایک ایسے خاکہ نگار ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ہم پر خاکے لکھیں اور ڈر لگتا ہے کہیں وہ واقعی ہم پر خاکہ نہ لکھ دیں۔ اس چاہت اور گریز سے ان کی خاکہ نگاری عبارت ہے۔ سلیمان ادیب، عزیز قیسی، عتیق حنفی، فکر تونسوی اور حسن الدین احمد پر لکھے گئے ان کے خاکے مرقع نگاری کا لازوال سرمایہ ہیں۔

مجتبیٰ دوستوں کے رسیا اور متوالے ہیں۔ دفتری مصروفیت کے بعد اس کا زیادہ تر وقت دوستوں کی نذر ہوتا ہے۔ حیدرآباد کا اورینٹ ہوٹل ہو کہ دہلی کا کافی ہاؤس، احباب ہمیشہ ان کے منتظر رہتے۔ جہاں گفتگوں ادب، سیاست، مذہب اور ہر مسائل پر بڑھ چڑھ کر گفتگو ہوتی۔ وہ دوستوں پر اس طرح جان چھڑکتے ہیں کہ بسا اوقات اپنا گھر بھول جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ رات دیر گئے گھر پہنچتے ہیں اور علی الصبح گھر چھوڑ دیتے ہیں۔ سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں۔ اس لیے بعض احباب انھیں صرف "سوشیل ورکر" سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ مجتبیٰ ایک دردمند انسان اور انسان دوست ادیب ہیں۔ وہ جدوجہد پر ایقان رکھتے ہیں۔ زندگی کے شدائد سے گھبراتے نہیں۔ مایوسی ان کے مسلک میں حرام ہے [illegible] کے پُر آشوب دور میں جب کہ وہ ہائی اسکول میں تھے۔ معصوموں کو لٹتے اور بے گناہوں کو کٹتے دیکھا۔ یہاں تک کہ ان کے حقیقی ماموں ان کی نظروں کے سامنے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اس کے باوصف وہ عصبیت کا شکار نہیں ہوئے۔ انھوں نے فرقہ پرستی سے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ اپنی تحریروں میں اگرچہ وہ کسی بزم کے ڈھنڈورچی نظر نہیں آتے مگر ہر مرحلہ پر ترقی پسند طاقتوں کا پورا ساتھ اور

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

مجتبیٰ حسین

جشن منانا

ہمیں نہیں معلوم کہ تاریخ کے کس موڑ پر جشن منانے کا آغاز ہوا۔ اور کیونکر ہوا۔ مورخین نے اس معاملہ میں ایک گمبھیر چپ سادھ رکھی ہے یوں بھی مورخین ایسے نازک معاملات میں چپ سادھ لیتے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے اپنے اطراف کسی نہ کسی کا "جشن" منتے ہوئے دیکھا ہے۔ آج اس کا جشن ہے تو کل اس کا جشن۔ معاملہ وہی ہے کہ

ع جشن سے کس کو رُست کاری ہے ؎ آج وہ کل ہماری باری ہے۔

ادب ہو یا سیاست، آرٹ ہو یا سماجی کام غرض زندگی کے ہر شعبہ میں جشن منانے کی گنجائش نکل آسکتی ہے۔ بس اس کے لیے "دیدۂ بینا" کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے جشن عموماً اس شخص کا منایا جاتا تھا جس نے زندگی کے کسی نہ کسی شعبہ میں کوئی خدمات انجام دیا ہو۔ اب ہر شخص کا جشن منایا جاتا ہے۔ جو "جشن" منانے کے بھاری اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔

ایک بات کی صراحت اور بھی کر دیں کہ جشن منانے کے لئے "صاحب جشن" کا ضعیف اور ناکارہ ہونا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ جشن منانے کا مقصد کسی کے خدمات کا اعتراف کرنا ہوتا ہے۔ اور خدمات کا اعتراف اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ آدمی بوڑھا ہو جائے اور عوام الناس کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ شخص مزید خدمات انجام نہیں دے سکتا۔ گویا جشن کسی کے خدمات میں آخری کیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ بعض لوگ اپنے "جشن" کے منائے جانے کے باوجود "اپنی خدمات" سے باز نہیں آتے۔ یہ سراسر ہٹ دھرمی ہے۔ مثال کے طور پر ایک شاعر کے کلام سے لوگ عاجز آ گئے اور انھیں دیکھتے ہی گلیوں میں بھاگنے لگے تو بستی کے چند عقلمندوں نے مل کر فیصلہ کیا کہ اب ان کا "جشن" منایا جائے۔ جیسے تیسے ان کا جشن منایا گیا۔ لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ کیونکہ "جشن" کے بعد وہ اور بھی مہلک شاعری کرنے لگے۔ اور اسے منانے کے لئے اور بھی مہلک طریقے اختیار کرنے لگے۔ "جشن" منانے والے ایک دوسرے کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ "جشن" اور "ضعیفی" ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کمسنی اور جشن دو تلواریں ہیں جنہیں ایک ہی نیام میں رکھا نہیں جا سکتا۔

جشن کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ "صاحب جشن" کی زندگی ہی میں منایا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جو چیز منائی جاتی ہے اسے عرف عام میں "یوم" منانا کہتے ہیں۔ "جشن" میں "صاحب جشن" کو چار لوگوں کے سامنے بٹھایا جاتا ہے اور اس کی جی کھول کر تعریف کی جاتی ہے۔ یوں بھی ہمارے یہاں منہ پر تعریف کرنے کا رواج عام ہے۔ اس سے بڑے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ جشن منانے کا طریقہ غالباً شروع ہی اس لئے ہوا کہ لوگ بلا خوف و خطر کسی کے منہ پر بے دھڑک تعریف کریں اور وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہے۔ اپنے بارے میں تعریفی کلمہ اچھی باتیں سننا کون پسند نہیں کرتا؟ اس لئے "جشن منانے" کے طریقہ کو حالیہ عرصہ میں اس قدر فروغ حاصل ہوا ہے کہ

اگر کسی کا جشن نہیں منایا جاتا تو لگتا ہے کہ آج کا دن یوں ہی ضائع ہوگیا۔ بلکہ اب تو یہ ایک اچھا خاصہ آرٹ اور ایک اچھا خاصہ پیشہ بن گیا ہے۔

جشن کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ آج تک جشن کی کوئی تیسری قسم دریافت ہی نہ ہوسکی۔ ایک جشن "زبانی جمع خرچ" کا جشن ہوتا ہے اور دوسرا جشن "رقمی جمع خرچ" کا ہوتا ہے۔ اول الذکر جشن میں صاحبِ جشن کو تعریف کے سوائے کچھ بھی نہیں دیا جاتا۔ اس جشن پر بڑی کم لاگت آتی ہے کیونکہ اس قسم کے جشن کو منانے کے لئے چند سامعین۔ چند مقررین۔ ایک جلسہ گاہ۔ ایک لاوڈ اسپیکر اور پھول کے چند ہاروں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ایسے جشن کے لئے صاحبِ جشن کے سوائے کسی اور کو بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑتی۔ یہ بڑا بے ضرر قسم کا جشن ہوتا ہے۔ صاحبِ جشن "جشن سے کچھ دن پہلے سے اپنے جشن کے دعوت نامے بانٹنے میں مصروف رہتا ہے اور اگر اس نے جشن کے پوسٹر چھپوا رکھے ہوں تو انھیں راتوں میں چوری سے شہر کی دیواروں پر چسپاں بھی کرتا ہے جشن کے دن جلسہ گاہ میں خود ہی دریاں بھی بچھاتا ہے اور بعد میں ڈائس پر چڑھ کر یوں بیٹھ جاتا ہے جیسے اس جشن سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ ایک کے بعد ایک مقرر آتا ہے۔ اور اس کی تعریف کرکے چلا جاتا ہے اور یہ گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ ڈائس پر پہونچنے کے بعد وہ جشن کے سارے انتظامات سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور صرف اپنی تعریف سننے میں مگن رہتا ہے۔ ہمیں ایک بار ایک صاحب کے جشن میں شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ مقررین نے ان صاحب کی بے پناہ تعریفیں کیں۔ یوں بھی جشن کے مقررین کسی کی ذات میں خوبیاں یوں تلاش کرتے ہیں جیسے ہم عام زندگی میں کسی کی ذات میں عیوب تلاش کرتے ہیں۔ لہٰذا اس دن ان کی اُن ساری خوبیوں کا ذکر کیا گیا جو ان میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ جشن کے بعد ہم ان صاحب کو مبارکباد دینے کے لئے آگے بڑھے تو ہمیں یوں لگا جیسے وہ اس جشن سے خوش نہیں ہیں۔ وہ ہمیں کچھ اُداس اُداس سے نظر آئے۔ ہم نے کہا "قبلہ! آپ کا جشن اس قدر شان و شوکت سے منایا گیا ہے کہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیئے مگر یہ کیا کہ آپ کے چہرے پر تو اداسی کے آثار ہیں"

ہمیں ایک کونہ میں لیجا کر بولے "تم اپنے آدمی ہو۔ تم سے کیا چھپانا ہے۔ یہ جو اسٹیج سکریٹری تھا نا اس نے مجھے بڑا زبردست دھوکہ دیا ہے۔ میں اُسے کبھی معاف نہیں کروں گا"

ہم نے پوچھا "آخر بات کیا ہوئی۔ یہ تو بتائیے ؟"

بولے "میاں! میں نے اُسے (۲۵) ہاروں کے پیسے دیئے تھے اور اس دھوکہ باز نے مجھے صرف دس ہار پہنائے ہیں۔ یقین نہ آئے تو تم خود گن کر دیکھ لو" اور پھر میں نے پیشگی کے ہاروں کی اجرت دی تھی اور تم دیکھ رہے ہو کہ میری گردن میں گیندے کے پھولوں کے ہار پڑے ہیں۔ یہی ایک کام ایسا تھا جو میں نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے ہاروں کی ذمہ داری میں نے اس کے سپرد کردی تھی۔

ہم نے کہا "اب ضبط کیجیئے جو ہونا تھا وہ ہوچکا۔ مشیت ایزدی کو یہی منظور تھا۔ اگلی بار اگر کبھی آپ کا جشن منایا جائے تو اس وقت ہاروں کا معاملہ بھی خود ہی نبٹا لیجئے"

بولے "میاں! اگلے جشن کے لئے ہماری بیوی کبھی راضی نہیں ہونگیں"

ہم نے پوچھا "وہ کیوں ؟"

بولے "بڑی منت سماجت کرکے اسے اپنے ایرنگ بیچنے کے لئے آمادہ کیا تھا تاکہ جشن کی سبیل نکل آئے۔ اب بھلا وہ میرے دھرے

جشن کے لئے مزید زیور کیوں بیچے گی؟ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ اس قسم کے جشن "زبانی جمع خرچ" کے جشن کی تعریف میں آتے ہیں۔ کچھ جشن ایسے ہوتے ہیں جن میں زبانی جمع خرچ کے علاوہ "صاحب جشن" کو کیسۂ زر پیش کرنے کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔ اس طرح کا "جشن" منانے کا آغاز بڑے خوشگوار ماحول میں ہوتا ہے۔ لیکن اس کا انجام بڑا ناخوشگوار ہوتا ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ "صاحب جشن" کو جو کیسۂ زر پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں "کیسہ" زیادہ اور "زر" کم ہوتا ہے۔ ایسے جشن کے لئے ایک "تیاری کمیٹی" بھی بنائی جاتی ہے۔ اس کمیٹی میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے لوگوں کو رکھا جاتا ہے جن کا صاحب جشن سے کوئی ذہنی رشتہ نہیں ہوتا۔ اس میں وہی لوگ ہوتے ہیں جن کی سماج اور بنک دونوں میں کوئی حیثیت ہو۔ ہمیں اس وقت اپنے ایک صحافی دوست کی یاد آرہی ہے جن کا "کیسۂ زروالا جشن" منایا گیا تھا۔ اُن سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس جشن کے موقع پر جو سوؤنیر چھاپا جائے گا۔ اس کے اشتہارات کی ساری رقم انہیں دی جائے گی۔"

یہ بیچارے اپنا "جشن" منوانے کے لئے راضی ہوگئے۔ بیچارے مزدور تھے ہی تھے اور قرض خواہوں نے الگ تنگ کر رکھا تھا۔ جیسے ہی جشن کا اعلان ہوا انھوں نے اپنے قرض خواہوں کو "جشن" پر ٹال دیا کہ میاں جشن ہو لینے دو۔ پھر سارا قرض وصول کر لینا۔ خیر صاحب! جشن منایا گیا اور ہم نے دیکھا کہ ہال ان کے قرض خواہوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب جشن میں کیسہ زر پیش کرنے کا مرحلہ آیا تو استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری نے ان کے ہاتھ میں ایک بڑا سا کیسہ پیش کیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کیسے میں ایک لاکھ سے کم روپیئے نہیں ہوں گے۔ ہمارے دوست بھی اس بھاری کیسہ کو سنبھال کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔ لیکن جشن کے بعد جب انھوں نے اپنے قرض خواہوں کی موجودگی میں اس کیسہ کو کھولا تو اس میں سے اُن کے جشن کے سوونیر کی ایک کاپی اور مختلف کمپنیوں کے نام اشتہارات کے بل نکل آئے پھر استقبالیہ کمیٹی کے سکریٹری کی ایک تحریر بھی برآمد ہوئی جس میں لکھا تھا۔ "آپ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ سوؤنیر کے اشتہارات کی رقم آپ کو بطور کیسۂ زر پیش کی جائے گی۔ لہٰذا سوونیر کی ایک کاپی اور اشتہارات کے سارے بل آپ کے حوالہ کئے جارہے ہیں۔ ان بلوں کو پیش کر کے مشتہرین سے رقم وصول کیجئے اور ہمارا پیچھا چھوڑیئے۔ ہمیں اور بھی لوگوں کے جشن منانے ہیں۔"

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے یہ صحافی دوست کئی مہینوں تک مشتہرین کے چکر لگاتے رہے۔ کہیں سے کچھ ملا اور کہیں سے کچھ بھی نہ ملا۔ اگرچہ جشن منائے ہوئے پورے چھ سال بیت گئے مگر پرسوں جب وہ ہم سے راستہ میں مل گئے اور ہم نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو تو معصوم سی صورت بنا کر بولے "یار! کچھ نہیں۔ بس وہی جشن والے مشتہرین کے پاس جا رہا ہوں۔ یار لوگوں نے اب تک پیسے نہیں دیئے۔" ایسا طویل جشن شائد ہی کسی کا منایا گیا ہو۔ کیونکہ چھ سال سے یہ جشن لگاتار اور متواتر جاری ہے۔ بعض لوگ جشن منانے کے انتظامات کے ماہر ہوتے ہیں اور یہ لوگ عام طور پر ادیبوں۔ شاعروں اور فنکاروں کے ہی جشن مناتے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں آسانی سے بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ادیب ہر دم ادب کو ایک نیا موڑ دینے کی چکر میں گرفتار رہتے ہیں۔ لیکن جب بھی ذرا سا موقع ملتا ہے وہ ادب کو موڑ دیدیتے ہیں۔ جبھی تو ہمارا ادب جگہ جگہ سے اس قدر مڑا ہوا ہے جب بھی کوئی ادیب ادب کو مندرجہ بالا قسم کا موڑ دیدیتا ہے۔ تو جشن منانے کے ماہرین اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "ارے صاحب آپ نے ادب کو اس طرح موڑا ہے کہ اب آپ کا جشن منانا ضروری ہوگیا ہے۔ آپ صرف ہاں کہہ دیں۔ باقی کی ساری ذمہ داریاں جیسے چندے جمع کرنا وغیرہ ہم سنبھال لیں گے۔" ادیب بھی بالآخر انسان ہی ہوتا ہے۔ پھر کون اپنی تعریف سننا نہیں چاہتا لہٰذا ادیب ہاں کہہ دیتا ہے اور جشن منانے والے اپنے شوق میں مبتلا ہو جاتے ہیں جشن میں ادیبوں کی جی کھول کر تعریف کی جاتی ہے انھیں اس خوش فہمی میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ ادب میں آج جو کچھ ہے وہ انہیں کے دم قدم

ہے۔ اگر وہ ادب میں نہ رہیں تو ادب کے میدان میں اُلّو بولنے لگیں۔ ادیب کو تعریف مل جاتی ہے اور جشن کے منتظمین کو عطیے مل جاتے ہیں۔

کیا خوب سودا نقد ہے ؎ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے

مگر بعض حالات ایسے بھی پیدا ہوتے ہیں جب ادیب اور شاعر اپنا جشن منوانے کے لئے تیار نہیں ہوتے یہ بات ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں کسی زمانے میں ہم ایک شہر میں رہتے تھے وہاں چند نوجوان ایسے اکٹھا ہوگئے تھے جن کا ذریعۂ معاش ہی یہ تھا کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کا جشن منائیں۔ ہر سال یہ نوجوان اس شہر کے کسی بڑے شاعر کا جشن منا دیتے تھے مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ یہ نوجوان اس شہر کے جس کسی شاعر کا جشن مناتے وہ اگلے سال تک اللہ کو پیارا ہو جاتا تھا۔

تین شاعروں کے جشن ہماری آنکھوں کے سامنے منائے گئے اور یہ تینوں کے تینوں شاعر دیکھتے ہی دیکھتے ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ رفتہ رفتہ ماباقی شاعروں کو بھی اس کا احساس ہونے لگا۔ جب یہ نوجوان چوتھے سال چوتھے شاعر کے پاس اس کا جشن منانے کے ارادے سے پہونچے تو اس نے اپنے کان پکڑ لئے اور کہا "صاحبو میری بعض خانگی مجبوریاں ایسی ہیں کہ مجھے مزید چار پانچ سال تک اسی دنیا میں زندہ رہنا ازحد ضروری ہے۔ ابھی تو ایک لڑکا کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنا ہے اور اپنے زیر طبع مجموعۂ کلام کی برات نکالنی ہے، ان سارے فرائض سے نپٹنے میں چار پانچ سال تو لگ ہی جائیں گے۔ اس بار آپ کسی اور کو مرنے کا موقع عطا کیجئے۔ دور کیوں جائیے حضرت نمک مرچوی کا ہی جشن منا ڈالئے۔ اب تو لوگ انھیں مشاعروں میں بھی نہیں سنتے عرصہ سے "ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے" والی کیفیت سے گذر رہے ہیں۔ اس سال اگر وہ آپ کے جشن کے وسیلہ سے اپنے خالق حقیقی سے جاملیں تو کیا کہنے"

نوجوانوں نے بعد میں حضرت نمک مرچوی کو بھی پھانسنے کی کوشش کی مگر انھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ طبی مشورے کے مطابق ان کا فی الحال مرنا خود ڈاکٹروں کے لئے مناسب نہیں ہے"

ادھر پانچ چھ برس بیت گئے مگر اس شہر میں پھر کسی شاعر کا جشن نہیں منایا گیا اور نہ ہی کسی شاعر کی موت واقع ہوئی۔ اگر جشن کے ساتھ یہ کیفیت دوسرے شہروں میں بھی رائج ہو جائے تو ذرا سوچئے کہ ملک میں کس قدر امن و امان قائم ہو جائے گا اور لوگ کس طرح چین کی نیند سو سکیں گے۔

بقیہ:- تحقیق میں لائبریری کا استعمال — (صفحہ ۱۰ سے آگے)

کسی بات، رائے یا خیال کو مقتبس کرنے کے دو مخصوص طریقے ہیں۔

۱۔ اس بات یا رائے کو اپنے الفاظ میں لکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ فلاں مصنف نے فلاں کتاب یا مضمون میں اس طرح لکھا ہے۔

۲۔ مصنف کے الفاظ کو بعینہٖ لکھ دینا — اس میں یہ احتیاط رکھنا ہوگی کہ اس کی کہی ہوئی بات کو معہ پنکچوئیشن کے جوں کا توں لکھنا ہوگا۔ مصنف کی بات کو ہمیشہ دوہرے الٹے کاماز (INVERTED COMMAS) میں دینا ہوگا۔

نوٹ لیتے وقت ہمیشہ تنقیدی فکر کو مدنظر رکھنا چاہیئے اور ضروری چیزوں کو اپنے تنقیدی پیرایہ میں لکھنا چاہئے۔ مطالعہ کے ساتھ ساتھ جب "فکر" اپنا کام کرتی ہے تو کام میں آسانی ہوتی ہے۔

بادۂ کہن

ڈاکٹر احمد حسین مائلؔ (م ۱۲۷۰ھ - ۲۲ رمضان ۱۳۳۲ھ) دکن کے استادِ سخن شاعر تھے، اُن کی غزلیہ شاعری شوخی، رندی و مستی اور معرفت کی جھلکیوں سے روشن رہی ہے۔ اُن کی شخصیت اور فن میں گہرا وابستہ استوار رہا۔ وہ طبیب حاذق اور اُستادِ کامل تھے، دکن کے سخنور اُن کے اطراف یوں مجتمع تھے کہ ایک دبستان سا کھل گیا تھا۔ عہد غفران مکان (میر محبوب علی خاں) اور مہاراجہ کشن پرشاد کے زمانے کے شاعروں اور شعری روایات کا گویا مائلؔ "عطرِ مجموعہ" تھے۔ ان کے شگفتہ و شاداب کلیات "تحفۂ دکن" مطبوعہ ۱۸۹۷ء کے مطالعے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ بسیار گو اور قادر الکلام سخنور تھے، ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ مائلؔ نے ۱۵ ہزار سے زیادہ شعر کہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں ڈاکٹر زورؔ نے مرقع سخن جلد اوّل میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ضرورت ہے کہ مائلؔ کی شاعری کا بہتر انتخاب "مقدمہ" کے ساتھ مرتب کیا جائے۔ (ادارہ)

تجھ کو تحفہ تیرے ہی قابل ملا — موتیوں میں تولنے کا دل ملا

کچھ تو سمجھا مجھ کو جو تعظیم دی — مجھ سے وہ اٹھ کر سرِ محفل ملا

کیا ملا مجھ کو تمہاری یاد میں — سوزِ دل کے ساتھ، دردِ دل ملا

آنکھیں کھلی بھی ہوں تو وہی سامنے رہے — آنکھوں کو بند کرکے نظارے ہوئے تو کیا

مجھ میں یہ رنگ ہے کس شوخ کی یکتائی کا — لامکاں نام ہوا ہے مری تنہائی کا

گھس گیا سنگِ درِ یار مرے سجدوں سے — جم گیا نقش مری ناصیہ فرسائی کا

ناز کر ناز ترے ناز یہ ہے ناز مجھے — میری تنہائی ہے پرتو تری یکتائی کا

ہم دل کی بات کہہ نہ سکے رعبِ حسن سے — مطلب رہا کتاب کے اندر کتاب کا

ہوا جینا بہت مشکل کسی کا — کسی سے پھر گیا ہے دل کسی کا

اگر مر جائیں ہم اُس کی بلا سے — وہ بے پروا نہیں مائلؔ کسی کا

یہ کیا غضب ہے وہ کہہ رہے ہیں جو ہو اذیت گلا نہ کرنا — تڑپتے رہنا پھڑکتے رہنا دوا نہ کرنا دعا نہ کرنا

میں اُن کی اس خامشی کے صدقے، ہیں اس میں پہلو مزے مزے کے — ادا ہے کانوں پہ ہاتھ دھرنا حیلہ ہے سن کر سنا نہ کرنا

مجھ سے جو وہ مل کے جدا ہو گیا — شوق فزوں ذوق سوا ہو گیا

خود کو جو کھویا تو ہوئی بندگی — خود کو جو پایا تو خدا ہو گیا

کس کی نظر لگ گئی کیوں ست ہے
اے دلِ مضطر تجھے کیا ہوگیا

دیکھ کے منہ اپنا وہ بیخود ہوئے
آئینہ بھی ہوش ربا ہوگیا

حضرتِ دل کیوں ہیں یہ بے چینیاں
قبلۂ عالم تمھیں کیا ہوگیا

شام سے گریہ و زاری، ہنرِ شیشہ سے
صبح تک خندہ دہانی ہنرِ جامِ شراب

مشکل کے وقت دل ہی سے کچھ مشورہ کریں
کیوں دیں کسی کو غیر سے ہم پوچھ کر جواب

ہے لن ترانی و ارنی رازِ حسن و عشق
کچھ مختصر سوال تو کچھ مختصر جواب

ڈھونڈھتا ہوں اُس کو دل میں اُٹھ کے آدھی رات کو
روز جس کی راہ میں چلتا ہے سر سے آفتاب

جب کبھی دھوپ میں سلطانِ نبوت نکلا
سایۂ ابر رہا سر پہ ہما کی صورت

بطنِ مادر سے رہی قبلۂ عالم کی تلاش
دل تڑپتا ہے مرا قبلہ نما کی صورت

گر مروں تجھ پہ تو ہاتھ آئے حیاتِ جاوید
جلوہ گر نقشِ فنا میں ہو بقا کی صورت

نعمتِ غیب سے بھر دے مرے دل کی جھولی
مائلؔ آیا ہے تیرے در پہ گدا کی صورت

مضطرب ہوں ادھر میں وہ تڑپتے ہیں ادھر آج
منہ دیکھ کے روتا ہے دعاؤں کا اثر آج

کس سلیقے سے ہے روشن محفلِ ارض و سما
آسماں پر چاند ہے، گھر گھر دھواں، بتی، چراغ

کس کو ہم حشر میں دیکھیں گے تمنا کیا ہے
وہ تو ہر ہر میں ہے پھر اُس کا سراپا کیا ہے

بے ساختہ لوگ جھومتے ہیں
مائلؔ ترے شعر یاد کر کے

جانتا ہے جو تجھے کرتا نہیں تیرا بیاں
جو یگانہ ہے تری محفل میں وہ بیگانہ ہے

دل کی تم کو قدر کیا پوچھو کسی صوفی سے تم
جس میں پوشیدہ خزانے ہیں یہ وہ ویرانہ ہے

یہ کس کی نگاہ کا اثر ہے
دل دونوں جہاں سے بے خبر ہے

دل میں ارماں بڑے بڑے ہیں
افسوس کہ عمر مختصر ہے

شیشہ یہ نہیں سمجھ کے توڑو
میرا دل ہے خدا کا گھر ہے

پھرا جستجو میں تری عمر بھر
مری عمر یوں ہی بسر ہوگئی

جو کی میں نے مائلؔ تلاشِ خدا
مری بیخودی راہبر ہوگئی

یہ تھی کس کو خبر احباب یوں بدنام کر دیں گے
نہ ہو جب تک بھروسہ آدمی کہتا نہیں دل کی

وہ لحظہ لحظہ اُن کا بگڑنا بناؤ میں
وہ بار بار چھیڑ دلِ بے قرار کی

جانِ مائلؔ کیوں ہو مائلؔ سے خفا
کیا دیا تھا دل اسی دن کے لئے

زباں کا بڑا حسن کو عشوہ ہے مائلؔ
انھیں بھی تو آئی زبان آتے آتے

میں نہیں ہوں، میں نہیں ہوں، تو ہی تو ہے تو ہی تو
خود کو بھولا تجھ سے جب مجھ کو شناسائی ہوئی

(انتخاب محمد منظور احمد)

قندِ مکرر

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصولِ زندگی سمجھتا ہوں۔ اور ہمیشہ سے اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔

چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں۔ اتنے ہی روشن آرا کو بُرے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے۔ انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعثِ ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں۔ کہ خدانخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں۔ جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جاسکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں۔ لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے۔ اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں گو محکمۂ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں۔ لیکن شکل و صورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امامِ مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا وہ نہیں کھیلتے۔ گلی ڈنڈے کا ان کو شوق نہیں۔ جیب کترتے ہوئے کبھی نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انہی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے۔ تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی ہے۔ ہمارے گھر میں "موئے کبوتر باز" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کسی چیل، کوے۔ گدھ۔ شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز کبھی لمبی بحر میں کبھی چھوٹی بحر میں

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا۔ آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے۔ اندر آجاؤ۔ ہم نے کہا۔ نہیں آتے۔ تم باہر آؤ۔ خیر آخر اندر گیا۔ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کہا بیٹھیں گے نہیں۔ آخر بیٹھ گئے۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے

تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے کیوں بھئی خیر باشد! میں کہا کچھ ہی۔ کہئے ہیں۔ اس وقت کیسے آنا ہوا؟

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا۔ اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو۔ لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:-

'مرزا بھئی! کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں'؟

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکہ تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل افشانی کرتے رہے۔ اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یونہی چلے آئے۔ لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ شام کو گھر میں صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا۔ چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کار آمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات قبیحہ کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتہ زبردستی صبح کے سات بجے کرا دیا جاتا ہے۔ اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اٹھنے میں کوتاہی کریں۔ تو فوراً کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔ ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا۔ کہ اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پُر اسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا۔ اور پھر گانے لگے کہ "توری چھل بل ہے نیاری ...." اس کو ہماری انتہائی بد مذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا۔

لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھا لی ہے۔

تین چار دن کا ذکر ہے کہ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے۔ روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے۔ اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے چلی جاؤں۔ میں کہا اور کیا؟

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی۔ اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات نے چکر لگانے شروع کئے۔ یعنی اب بیشک دوست آئیں۔ بیشک اودھم مچائیں۔ میں بیشک کھاؤں۔ بیشک جب چاہوں اٹھوں۔ بیشک تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:-

"روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی"

ساتھ اسٹیشن پر گیا۔ جب گاڑی میں سوار کر چکا تو کہنے لگی۔ "خط ضرور لکھتے رہئے" میں نے کہا۔ "ہر روز اور تم بھی" "کھانا وقت پر کھا لیا کیجئے۔ اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔"

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے میرا دل

بھی بیتاب ہونے لگا۔ اور جب گاڑی روانہ ہوئی۔ تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا۔ اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا۔ اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا۔

پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں۔ چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا۔ قلا بازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقہ کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ رکھا جاتا ہے تو گویا وہ وہاں کی شان و شوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں۔ تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر تانگے میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگا لیا۔ ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں۔ اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آیا۔ تانگہ موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی نوکر کو آواز دی۔

"امجد!"

"حضور!"

"دیکھو حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔"

"بہت اچھا۔"

"گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح چھ بجے وارد نہ ہو جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔"

"اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔"

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان۔ آدمی کا نام نشان تک نہیں سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیرڈ کا کمرہ خالی۔ شطرنج کا کمرہ خالی۔ تاش کا کمرہ خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا۔ "کیوں بے آج کوئی نہیں آیا۔"

کہنے لگا۔ "حضور آپ جانتے ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟"

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا۔ ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا کہنے لگے:-

"تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام ہے۔"

میں نے کہا۔ "تھیٹر!"

کہنے لگے۔ "بس بہت ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی ۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا ۔ اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا ۔ اور ابھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا ۔ پھر پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے ۔ اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا ۔

آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا ۔ جمائی پہ جمائی ۔ حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا ۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں ۔ لیکن اس سے بھی تھک گیا ۔

پھر میز پہ طبلے کی گتیں بجاتا رہا ۔

بہت تنگ آگیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا۔ " ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا سارا دن میرا ضائع کر دیا ۔"

وہاں سے اُٹھ کر مرزا کے گھر گئے ۔ شام بڑے لطف میں کٹی ۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے ۔ تکیے پہ سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا ۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی ۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے ۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگرٹ اٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا ۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا ۔ کہنے لگا۔ "حضور حجام آیا ہے ۔"

ہم نے کہا ۔ "یہیں بلا لاؤ ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں ۔ اطمینان سے اٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے ۔ لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی امید لگائے بیٹھے تھے ۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال میں آیا ۔ وہیں کرسی پہ بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا ۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سُرمئی رنگ کا ایک ریشمی دوپٹہ نظر پڑا ۔ باہر نکالا ۔ ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آرہی تھی ۔ بہت دیر تک اس پہ ہاتھ پھیرتا رہا ۔ دل بھر آیا ۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا ۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا ۔ لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے ۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہوگیا ۔ اور سچ مچ رونے لگا ۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے ۔ لیکن نا معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوگیا ۔

آخر رہا نہ گیا ۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا ۔ وہاں سے تار دیا کہ میں بہت اُداس ہوں تُم فوراً آجاؤ !

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا ۔ یقین تھا کہ روشن آرا اب جس قدر جلد ہوسکے گا آجائے گی ۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا ۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پہ تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا ۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں ۔ اس لیے تجویز ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو ۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی ۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے ۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں ۔ اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے ۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں ۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا ۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا ۔ بہت معقول طریقے سے قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ ۔ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد

کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیئے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اڑا نہیں۔ اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اُڑنے لگے۔ تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے۔ کوئی فرش پہ بازو ٹیکے سیٹی بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مذاقیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے۔ لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہوا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا۔ جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال، اور جو سب سے ہار جاتا ہے وہ چور۔ سب نے کہا۔ "واہ واہ کیا بات کہی ہے"۔ ایک بولا۔ "پھر آج جو چور بنا۔ اس کی شامت آجائے گی"۔ دوسرے نے کہا۔ "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے سلطنتوں کے معاملے ہیں سلطنتوں کے"۔

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے۔ "ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے"۔ کوئی کہے۔ "نہیں حضور سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے"۔ دوسرے نے کہا۔ "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے"۔ آخر میں بادشاہ سلامت بولے۔ "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پہ سیاہی مل دی جائے۔ اور یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقّے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا۔ "کیا دماغ پایا ہے حضور نے۔ کیا چیز تجویز کی ہے۔ واہ واہ!"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا۔ "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں۔ کل کسی اور کی باری آجائے گی۔" نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بے ہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شانِ استغنا کے ساتھ چلم اٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیئے اور ہمارے پیچھے کمرہ قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اُلٹا۔ تو روشن آرا!

دم خشک ہو گیا۔ بدن پہ ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا۔ کہ تم فوراً آجاؤ۔ میں بہت اداس ہوں۔ اور اپنی یہ حالت کہ منہ پہ سیاہی ملی ہے۔ سر پہ وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اٹھائے کھڑے ہیں۔ اور مردانے سے قہقہوں کا شور برابر آرہا ہے۔

روح منجمد ہو گئی۔ اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔ روشن آرا کچھ دیر تو چپکی کھڑی دیکھتی رہی۔ اور پھر کہنے لگی۔۔۔۔ لیکن میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی! اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذاتِ خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں یہاں تک میں میں ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا کبھی پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے اس لیے میں نے مصمّم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ نہ کسی سے ملوں گا نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا۔ سوائے ڈاکئے یا حجام کے۔ اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کیا کروں گا۔

"خط ہے؟"
"جی ہاں۔"
"دے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"
"ناخن تراش دو۔"
"بھاگ جاؤ!"

بس اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا آپ دیکھئے تو سہی!

(نقوش لاہور، پطرس نمبر [illegible])

سب رنگ

اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل
سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا (ادارہ)

ڈاکٹر سید عبداللہ

حفیظ کی شاعری۔ نالہ پابندِ نَے

ہمیں حفیظ کا یہ دعویٰ تسلیم نہیں کہ ان کی شاعری محض نالۂ دل ہے نغمہ و رباب نہیں۔ وہ شاعری کیا جس کی شاعری میں نالۂ دل اور نغمہ و رباب مل جل کر سامنے نہ آئیں۔ شاعری تو ایک لحاظ سے ہے ہی موسیقی بھی اسی نوع کی کہ اس کو کان کے علاوہ دل بھی سن سکتا ہے۔ شعر کی ایک داخلی موسیقی بھی ہوتی ہے جس کو گائے بغیر بھی گایا جاسکتا ہے اور سنا جاسکتا ہے اور اگر شاعری کبھی اپنی اندرونی موسیقی کے علاوہ نغمہ و رباب کی بھی ہم قدم بن جائے تو اسے عیب نہ کہئے کیونکہ یہ تو وہ مرتبہ ہے جو شعر کو دو آتشہ بنا دیتا ہے! مدعا یہ ہے کہ حفیظ کی شاعری نالۂ دل بھی ہے اور نغمہ و رباب بھی۔ اور ان دونوں چیزوں کے علاوہ اس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اس میں غبارے اور کھلونے بھی ہیں جو فضا میں اڑتے نظر آتے ہیں۔ اس کی شاعری کے یہ ٹھاٹھ بھی ہیں کہ فلک شامیانہ ہے اور پربت قناتیں اور اسی ٹھاٹھ کے ہمراہ اس کے یہاں "تہی دستی و بیتی و خستہ حالی بھی ہے" یعنی وہ خارزاروں کی دنیا جو بگولوں سے معمور اور پھولوں سے خالی ہے لہذا معلوم نہیں کتنی اور دنیائیں ہیں جو شاعر کے تخیل میں ہیں جن سے وہ اپنی شاعری کی کائنات آباد کرنا چاہتا ہے۔ یکجا ان تمام دنیاؤں کی ایک جھلک حفیظ نے اپنی نظم "میری شاعری" میں دکھا بھی دی ہے!

مرا شعر شیشہ بھی نشہ بھی ہے میرے شعر میں غازیوں کی رسالے
مرے شعر آنسو مرے شعر آہیں مرا شعر اخلاص کا ترجماں ہے

اور ایک سبب اس رنگا رنگی کا یہ ہے کہ حفیظ کی زندگی کے تجربات و حوادث بھی رنگا رنگ ہیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شاعر اپنی زندگی کے حوادث سے بلند تر اور ان سے یکسو بھی ہو جاتا ہے مگر حفیظ کی شاعری میں زندگی نے ہر حادثے سے ایک اثر قبول کیا ہے چنانچہ ابتدائی دورِ مفلوک الحالی اور محنت کشی سے لے کر اور جنگ عظیم ثانی تک اور اس کے بعد قیام پاکستان کی تحریک سے لے کر پاکستانی سلطنت کے نظام کے فروغ تک کونسی وہ جدوجہد ہے جس میں حفیظ شریک نظر نہیں آتا۔ حفیظ کی تخیلی زندگی اس کی عملی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ وہ ایک باعمل شاعر ہے جو جہادِ زندگی سے معذور کبھی نہیں ہوا۔ مختلف شاعروں کا باہمی موازنہ کرنے کی عادت کوئی اچھی عادت نہیں مگر یہ تو تسلیم ہے کہ حفیظ زندگی کا اور عمل کا شاعر ہے کسی اور شاعر سے زیادہ نہ سہی۔ کسی اور

سے کم بھی تو نہیں بلکہ بہت کم شاعر ایسے ہوں گے جو زندگی کے معاملہ میں اتنے باوفا ہوں گے۔ میں حفیظ کی شاعری کی اس حیثیت پر اس لئے زیادہ زور دے رہا ہوں کہ عام طور سے ان کی شاعری کی اس حیثیت پر زور کم دیا جاتا ہے۔ حفیظ کو یار لوگوں نے گیت لکھنے والا دل بہلانے والا اور گیت گانے والا شاعر مشہور کر رکھا ہے۔ بے شک وہ گیت گانے والا ہے مگر وہ دردمند بھی تو ہے وہ غریبوں کا غم گسار بھی تو ہے۔ وہ دل فگاروں کا ساتھی بھی تو ہے وہ اپنے من کی دنیا کی جراحتوں کا فریادی بھی تو ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے یہ نالے پابندنے یا پابند نغمہ ہیں ع — کیا پابند نے نالے کو میں نے!

اور اس سے ماسوا خود حفیظ کے، کسی کو کچھ نقصان بھی تو نہیں ہوا نہ سننے والے کو، نہ فن کو رہا اس کی شاعری جیسی کچھ ہے نقادوں کی نظر میں اس کی حیثیت اتنی ہی جتنی کہ وہ مستحق ہے۔ تنقید کرنے والا مشاعرے کی محفل سے الگ اپنے کتاب کمرے کے دریچے کے سامنے بیٹھ کر شاعری پر نظر ڈالتا ہے اس لئے حفیظ کے نالۂ پابند نغمہ سے نقاد کے دین و ایمان میں کچھ فرق نہیں آیا۔ ادریچے کی ایک نظر یہ کہتی ہے کہ حفیظ کی شاعری میں بہت سی باتیں ایسی بھی ہیں جن کی کامیاب ترجمانی اس کے معاصروں میں، اس کے سوا بہت کم لوگ کر سکے ہیں اور جو پیغام اس کا ہے اس کو جس خوبی سے مقبول عام سطح پر وہ پہونچا سکا ہے اس کے ہم عصروں میں دوسرا کوئی نہیں پہونچا سکا یہ صحیح ہے کہ دوسروں نے بھی اپنے اپنے مزاج کا رنگ اپنے اپنے انداز میں ہنرمندی اور اخلاص سے ظاہر کیا ہوگا مگر عام لوگوں تک یعنی بچے، بچے تک، جوان سے بوڑھے تک اپنی بات پہنچانے میں جو کامیابی حفیظ کو نصیب ہوئی ہے۔ وہ بہت کم لوگوں کو ہوئی۔ ہاں یہ قبول عام بعض اوقات خود اس کے لئے ضرور وجہ بدنامی بن جاتا رہا ہے۔ مگر مجھ سے پوچھئے تو میں کہوں گا۔ ع مجھ کو منظور نکونامیٔ فرہاد نہیں

حفیظ کی شاعری میں ایک مستقبل نقطہ نظر ہے جو بدلی ہوئی شکلوں میں بار بار سامنے آتا ہے اور وہ ہے قومی وطنی اور ملّی احساس حفیظ نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو ہندستان ایک عظیم اضطراب سے دوچار تھا۔ رولٹ ایکٹ جلیانوالہ باغ تحریک خلافت، ہندو مسلم اتحاد، ترک موالات وغیرہ۔ اس عالم اضطراب میں حفیظ دو عظیم شخصیتوں سے متاثر ہوا۔ اقبال اور محمد علی سے۔ یہ دونوں رہنمایان فکر اپنے اپنے رنگ میں حفیظ کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے۔ ملک کی آزادی کا مسئلہ کوئی اختلافی مسئلہ نہ تھا مگر محمد علی اس میدان کے عملی مجاہد تھے۔ اور اس زمانے کے بہت کم لوگ ہوں گے جو ان کی طوفانی زندگی سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ اقبال مسلمانان ہند کے علمی اور ذہنی رہنما تھے۔ شاعر بھی تھے فلسفی بھی تھے۔ حکمت آموز اور حکمت شناس بھی تھے۔ حفیظ پر ان کا اثر مستقل اور دیرپا ہوا۔ غرض حفیظ نے اپنے ماحول میں ان دو بزرگوں کے زیر اثر ایک نقطۂ نظر قائم کیا جس کو میں نے بغرض سہولت قومی اور ملّی نقطۂ نظر کہا ہے۔

حفیظ کی مجموعی ترجمانی کے پیش نظر ان کو اگر ملّی شاعر کہہ دیا جائے تو مناسب نہ ہوگا۔ میں نے ملّی اور قومی میں امتیاز اس لئے کیا ہے کہ حفیظ وطن دوست اور قوم پرور ہونے کے باوجود، قومیت کی مذہبی اساس کا معتقد رہا اور یہ اقبال و محمد علی کے اثر کے علاوہ اس سبب سے بھی ہے کہ حفیظ کی فطرت ہی عقیدتوں سے سیراب و شاداب ہے۔ عقیدت نفس انسانی کی ایک ایسی تمنّا کا نام ہے جو عقلی تجزیے سے بے نیاز ہو کر جذبات کی دنیا سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ عقیدت کے پھول تخیل کی ان رفعتوں پر اگتے ہیں۔ جہاں محبت ہی محبت ہوتی ہے اور تجزیہ و قیل و قال کے کانٹوں کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ حفیظ بھگتی داسوں کے

مانندِ قلب انسانی کی انہی سرشاریوں کو پیش کرتا ہے ع ۔ ہر اشعر شیشہ بھی نشہ بھی ہے بھی

مگر عقیدتوں کی بحث تھوڑی دیر بعد آئے گی۔ ابھی میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ حفیظ ایک مذہبی مزاج کا آدمی ہے۔ اس میں بغاوت کم اور تسلیم کی خو زیادہ ہے۔ اسی عادت کی وجہ سے اسے ملیّت اور قومیت کے اس تصور سے کبھی وحشت نہیں ہوئی جس کی اساس مذہب پر ہے اور اسی وجہ سے وہ پاکستان کے قیام سے پہلے بھی قوم سے زیادہ ملت کے زاویہ نظر سے دیکھتا اور سوچتا رہا اور اسی وجہ سے وطن دوست ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی الگ ہستی اور انفرادیت کا بھی معتقد اور طلب گار رہا پاکستانی ذہن و شعور پیدا کرنے والوں میں حفیظ کا بھی بڑا حصہ ہے۔ یہ شعور (جیسا کہ معلوم ہے) وطنی اور مذہبی تقاضوں کا امتزاج کی پیداوار تھا چنانچہ اس کی شاعری میں وطن کی آزادی کے جذبے کے ہمراہ ملت کی آزادی کا احساس بھی نمایاں ہے۔ انگلستان میں اس نے جو نظمیں لکھیں (مثلاً نیرنگِ فرنگ اور اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے) ان میں وطن کی محبت کار فرما ہے، مگر عید شہیدوں کی عید، ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا اور درۂ خیبر وغیرہ میں اس کی آواز ایک دوسری لے اختیار کرتی ہے۔ پھر بھی وہ وقت کے دوسرے اہم افکار سے اثر لیتا رہا۔ خوب ہنسے گا دیوانہ یہ نظم اقتصادی ناہمواریوں کا انکشاف کرتی ہے اور وہ اس طبقاتی شعور کی بھی نمائندگی کرتا ہے جو سنہ ۱۹۳۰ء کے درمیان کے ہندوستان کے ذہن و فکر پر خاصا مسلط تھا۔ اس زمانے میں حفیظ نے بھی ایک خواب دیکھا۔ اس نے اس عالم خواب میں سرمایہ داری کے قصر گرتے دیکھے اور اس نے یہ دیکھا کہ غریبوں کے غلبے کے آتے ہی امرا کے ایوانِ زر نگار بھائیں بھائیں کرنے لگیں گے اور دنیا اس جبر و تعدی سے نجات پالے گی جو سرمایہ پرستوں کے راج کا لازمی نتیجہ ہے سنہ ۱۹۴۷ء کے اعلان آزادی کے بعد ملک کی جو حالت ہوئی حفیظ کو اس سے بھی دکھ ہوا۔ اس نے فریب آزادی میں اپنے اس ردعمل کا بھی اظہار کیا ہے جو آزادی سے وابستہ توقعات کی شکست کے باعث پیدا ہوا۔

سماجی تصورات کے اعتبار سے حفیظ ان رسموں، روایتوں اور طریقوں کا بڑا مداح رہا ہے جو تاریخ نے مسلمان قوم کے کو دیے۔ اس کی نظم "رقاصہ" اس کی بے حد مقبول نظم ہے جو مقبول اس لئے بھی ہے کہ وہ جمہور کے سماجی خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

حفیظ کی شاعری کا یہ حصہ اپنے زمانے میں جتنی توجہ سے پڑھا اور سنا گیا ضروری نہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں بھی اس کی اتنی ہی قدر کی جائے۔ اس سے زیادہ دیرپا اور مستقل اہمیت ان کی عقیدت مندانہ شاعری کی ہے جس کی سب سے محکم صورت ان کی نعتوں اور سلاموں میں نظر آتی ہے۔ بعض لوگ نعتوں کو شاعری کہہ کر اس کی تنقیص کرتے ہیں۔ مگر نعتیہ شاعری محض ایک کنایہ سے مذہبی شاعری ہوتی ہے۔ مذہب کی شاعری وہ ہوتی ہے جس میں مذہب کے مسائل بیان ہوں یا مذہب کی تمہید و تقدس کے لئے موعظتی طرز بیان اختیار کیا جائے۔ لیکن مذہبی شخصیتوں کی عقیدت کی شاعری جس میں جذبہ محبت بھی ذاتی۔ انفرادی اور شدید شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خشک نظم گوئی نہیں ہوتی۔ اس کی نوعیت ایک خاص حد تک عشقیہ شاعری کی ہو جاتی ہے جس میں جذبہ عشق تجریدی صورت میں پاک ا ہو کر نمایاں ہوتا ہے اور اس کے اظہار کے لئے جو علامتیں اور اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں وہ بھی عاشقی کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔

"میرا سلام لے جا" عقیدتی شاعری کا شاہکار ہے۔ محسن کاکوروی کا قصیدہ نعتیہ بھی بڑا مقبول و معروف نظمیہ شاہکار ہے مگر اس کی ہندوانہ فضا کو دیکھ کر کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے عقیدت کے جوش میں آنحضرت ؐ کو ملکی دیو مالا کی

فضاؤں میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ اور اگرچہ محبت کے معاملہ میں زبان سے زیادہ جذبہ قابل لحاظ ہے مگر ادب کا فتویٰ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کے تعلق میں "با محمد ہوشیار" کی احتیاط ملحوظ رہے تو بہتر ہے۔ حفیظ عقیدت کے طوفان میں بھی پاس ادب کی کشتی کو سنبھالنے میں کامیاب رہا ہے۔ ضبط اور وقار اس سلام کا سب سے بڑا خاصا ہے اور نظمیہ تعبیر کے اعتبار سے تو یہ حسن ترکیب کا بہترین موقع ہے۔ اردو شاعری کی تاریخ میں حفیظ کو زندہ رکھنے کے لئے اس کا یہی ایک سلام کافی ہے۔ نظم "مدینہ کے مسافر" بھی کامیاب ہے۔ مگر میرا سلام لیجا۔ میں جس قسم کی "الوہیت" پائی جاتی ہے وہ شاہنامۂ اسلام کے سلاموں میں بھی نہیں۔ "سلام اے آمنہ کے لال اے محبوب سبحانی" " احترام کی تصویر ہے۔ عاشقی کی ترجمان نہیں۔ شاہنامۂ اسلام بھی بہت بڑی نظم ہے۔ جس کی بناء پر شاعر خود کو فردوسی اسلام کہہ کر اپنے کارنامے پر خود کو مبارک باد پیش کرتا ہے۔ اور ہم بھی اس مبارکباد میں اس کے ہم نوا ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ شاعری کو جب تاریخ نگاری کے بوجھ تلے چلنے پر مجبور کر دیا جائے تو وہ بے چاری ذرا تکلیف سے ہی چلتی ہے۔ رزمیہ نگاری اور بزم نگاری اور تاریخ نگاری تینوں کے دائرے مختلف ہیں۔ اور ان میں شاعری کو سب سے زیادہ تکلیف اس آخری چیز سے ہوتی ہے کیونکہ تاریخ میں امر واقعہ کی سچائی لازمی ہے جس کے دائرے میں تخیل کے فرشتے کے پر جلتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سائنسی سچائی سے سرمو تجاوز ممکن ہی نہیں جب صورت یہ ہو تو شاعری کے لئے اس میں کونسا میدان باقی رہ جاتا ہے ..... ایپک کی بات اور ہے اس میں تخیل کو کھلا سانس لینے کی اجازت ہوتی ہے۔

پھر بھی شاہنامہ اسلام خوب صورت مرقع نگاری سے خالی نہیں اور ملّی ادبیات میں تو اس کا مقام محفوظ ہی ہے شاعری میں حفیظ کا اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے گیت کو مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ گیت لکھنے والے اور بھی ہیں مگر حفیظ نے گیت کی کلا کو سچ مچ گانے کی چیز بنا دیا۔ اور اس میں گیت کی معنوی روح بھی بھر دی۔ گیت کا آہنگ سنگیت کے تابع ہے اس کی داخلی روح نیم افسردگی اور نیم نشاط کے امتزاج سے ترکیب پاتی ہے۔ گیت میں غم ہو سکتا ہے جیسے درد اشتیاق کہئے مگر اس غم کی لہر نشاطِ زندگی کے چشمے سے ابھرتی ہے۔ گیت اپنی اونچی سطح پر نامعلوم فضاؤں میں پرواز کرنے والی چیز ہے مگر اس کی ایک زمینی سطح بھی ہے جو اس کے تاروں کو مقام و محل اور دوسرے زمینی رشتوں سے وابستہ کئے رکھتی ہے۔ گیت حد سے زیادہ غم انگیز اور الم خیز مضمون کا متحمل نہیں ہو سکتا اسی طرح گیت ضرورت سے زیادہ جوش انگیز مضمون اور تیز گردش لے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ گیت کو دوہے کی طرح درسِ حکمت بھی نہیں بن جانا چاہیئے اور نہ بھجن کی طرح اسے نغمہ الوہیت بن جانے کی اجازت۔ ہے گیت تو فقط بھولپن، معصومیت، قبل از عنفوانِ شباب کے سے سادہ جذبات یا درد اشتیاق کی ان صورتوں کے لئے موزوں ہیں جن میں غم شوق کی دل تنگستگی شوقِ زیست کی خوشی سے شیر و شکر ہو جاتی ہے اور اپنے آخری تاثر میں ایک شیریں خواب کی یاد مسرت آلود شکل میں محفوظ رہ کر ایک مبہم سی خوشی پیدا کر کے فضاؤں میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ گیت کے الوہی نغمے، ان روحانی کیفیتوں کو بھی خوب ادا کرتے ہیں۔ جو بھگتی یا عقیدت کے جذبے کی پیداوار ہیں۔

حفیظ اردو کے واحد گیت نگار نہیں مگر منفرد گیت نگار ضرور ہیں۔ انھوں نے گیت کی تکنیک کی پابندی کی بھی ہے۔ اور نہیں بھی کی۔ حفیظ کے گیت کرشن بھگتوں کے گیتوں سے یہ مماثلت ضرور رکھتے ہیں کہ ان میں معصوم شرارتوں کی لہریں کبھی کبھی سطح پر بھی اتر آتی ہیں مگر عام طور سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کے گیتوں میں ولولہ اور جوش زیادہ ہے اور وہ نیم دل شکستگی یا ہلکا ہلکا

درد نہیں پایا جاتا جو گیتوں کی جان ہے۔ ان کے گیتوں کی بحر اور مصرعوں کی ساری اندرونی ترتیب وترکیب اکثر رجزیہ ہوتی ہے۔

جاگ سوزِ عشق جاگ!

پھر اسی اُٹھان سے   تیر اُٹھے، کمان اٹھے

صبر کس زبان سے   فغورا لامان اٹھے

جاگ اٹھیں دلوں کے بھاگ

جاگ سوزِ عشق جاگ!

رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ   رنگ دے قدیم رنگ، بے دریغ بے درنگ

جس کی ضو سے مات ہو، رنگ بازیٔ فرنگ   عشق کے لباس کو رنگ دے قدیم رنگ

رنگ دے، رنگ دے، قدیم رنگ   (پرانی بسنت)

"اندھی جوانی" میں مصرعوں کی ترتیب اور قطع و برید ایسی ہے جس سے رجزیہ جوش اور مستی پیدا ہوتی ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں ٹیپ یا استھائی کی تکرار بھی اسی کیفیت کی آئینہ دار ہے۔ کرشن بنسری میں ٹیپ در ٹیپ کا غیر معمولی اہتمام کیا ہے۔ ان کے بعض گیتوں میں مختلف بحروں کے امتزاج کے تجربے بھی ملتے ہیں۔ "بسنتی ترانے" میں اس کی نمایاں مثال ملتی ہے اور تلخابۂ شیریں کی ایک نظم (جس کو گیت کہا جا سکتا ہے) تیری منزل دور مسافر بھی اس کی تائید میں ہے۔ بسنتی ترانے کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

لو پھر بسنت آئی   پھولوں پہ رنگ لائی

چلو بے درنگ

لب آب گنگ

بجے جل ترنگ

من پر اُمنگ چھائی   پھولوں پہ رنگ لائی

لو پھر بسنت آئی

کھیتوں کا ہر چرندہ   باغوں کا ہر پرندہ

کوئی گرم خیز

کوئی نغمہ ریز

سبک اور تیز

پھر ہو گیا ہے زندہ   باغوں کا ہر پرندہ

کھیتوں کا ہر چرندہ

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ حفیظ نے میرا بائی اور بہاری کی طرح کے گیت کیوں نہیں لکھے یعنی ان کے گیتوں میں ہندی الفاظ اور استعارے کیوں زیادہ نہیں مگر یہ اعتراض بڑے مزے کا اعتراض ہے کیونکہ زندگی بہاری اور میرا بائی کے زمانے سے آگے

تو نہیں گئی نہ جدت اور تجربے پر قدغن لگ گئی ہے حفیظؔ اپنے مزاج اور اپنے زمانے کا پابند ہے اس لئے یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ ان کے گیت ہندی کے بجائے فارسی ترکیبوں سے کیوں معمور ہیں البتہ ایک بات ضرور کہنے کی ہے کہ گیت کی صنف کے لئے دل شکستگی اور نشاط کی جس آمیزش کی تلاش ہمیں ہے وہ حفیظؔ کے گیت میں نہیں ہے اس کو کوئی عیب کہیے تو کہہ سکتا ہے مگر میں تو اس کو بھی جدت ہی کہوں گا جس طرح اقبال کی آخری دور کی غزل کو میں غزل کے نئے تجربہ سے تعبیر کرتا رہتا ہوں اگر یہ غزل مجھے میر ہی کی اچھی لگتی ہے اور گیت میرا بائی کے دل پسند ہیں' اور مجھے تو عظمت اللہ خاں مقبول احمد پوری اور اختر شیرانی کے گیت بھی اس معنی میں گیت نہیں لگتے کہ ان میں سے ہر ایک کے یہاں گیت کے کسی نہ کسی ضروری عنصر کی کمی نظر آتی ہے اور حفیظؔ کے معاملہ میں ایک ضد اور بھی تو ہے' وہ یہ کہ ان کا زمانہ روحانی انفرادیت کے ولولہ خیز عناصر کا ترجمان ہے اور حفیظؔ کے قریبی اسی گیت میں ہیں۔

حفیظؔ نے بچوں کے لئے جو شاعری کی ہے اس میں بھی تخیل کی عجائب خیزی سے زیادہ بچوں کی طبعی ہنگامہ پسندی کے رجحان کو برانگیختہ کیا گیا ہے یوں یہ ضرور مد نظر رہنا چاہئے کہ حفیظؔ نے مناظر و مظاہر فطرت کے بیان میں اس معصومانہ استعجاب و حیرت کا ثبوت دیا ہے جو نیچر کی شاعری کا ایک جزو خاص ہے۔ بچوں کی شاعری میں حفیظ بچوں کے روپ میں سامنے آتا ہے مگر وہاں بھی وہ بوڑھا بچہ نہیں' سچ مچ بچہ ہے .... اور بھی ایک تیز طرار اور شوخ شریر بچہ! حفیظؔ کا بچپن ہر عمر میں اس کا رفیق و ندیم ہے۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ حفیظ کا مزاج خاص' جو مستانہ لے اور آہنگ کا شاعر ہے اور یہ لے اس کی خمریہ شاعری تک محدود نہیں بلکہ ہر قسم کی شاعری میں پائی جاتی ہے "بجے جل ترنگ' لب آب گنگ جوش سے لے کر ستوں پر انگلیاں نہ اٹھاؤ بہاریں" تک اور ابھی تو میں جوان ہوں' سے" میرا سلام لے جا" تک ہر صنف شاعری میں حفیظؔ کی لے جوانی کی لے اور آہنگ جوش زندگی کا آہنگ ہے۔

غزل گو حفیظؔ (جہاں تک میں سمجھا ہوں) گیت لکھنے والے حفیظؔ کے مقابلے میں پچھلی صف کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خیر یہ تو چھوٹی حفیظؔ کی حفیظ سے لڑائی کی بات مگر باہر سے کسی دیکھنے والے کو یہ ضرور محسوس ہوگا کہ حفیظؔ کی غزل کے خمریہ حصے میں سرشاری کی ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے اور کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کو جی چاہتا ہے بے تکلف گیت کی صف میں کھڑا کر دوں۔ ایسا سرمایہ بھی ہے جو غزل کی سچی چاشنی رکھتا ہے۔ یعنی ہنگامہ نہیں مچاتا ہلکی ہلکی المیہ دردمندی کو لطافت کے انداز میں (جسے تغزل کہتے ہیں) پیش کرتا ہے مگر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ حفیظؔ ہنستا ہوا ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ اداسی کے موڈ کو تادیر برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسا موڈ اگر مستقل ہو جائے تو اس لہجے میں تلخی اور چہرے پر جھنجھلاہٹ کے آثار ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ اور حفیظؔ کے خشک لبوں پر مجروح تبسم جب بھی نمودار ہوا ہے وہ مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔

حفیظؔ ہمارے رومانی شاعروں میں سب سے الگ اس لئے ہے کہ رومانیت کا رنگ جدا ہے۔ وہ اختر شیرانی سے اس لئے الگ ہے کہ وہ ایک ایسی محبوبہ پر فریفتہ رہا ہے جسے حفیظؔ نے رقاصہ کا خطاب دیا ہے۔ حفیظ کی رومانیت بعد کے رومانی شاعر مجازؔ سے اس لئے الگ ہے کہ حفیظؔ آداب زندگی کے لحاظ سے اس "آوارگی" کا کبھی معتقد نہیں ہو سکتا جو مجازؔ کا خاص اسلوب حیات ہے۔ وہ میرا جی اور ن۔م راشد اور جوشؔ سے بھی مختلف ہے اور ہونا چاہئے۔ اس کی رومانیت تو اس کی اپنی ہی ہے جو ایک طرف اس کی سرشاری اور جوشِ زندگی میں اور دوسری طرف اس کے ملی اور وطنی احساسات میں منعکس ہوئی ہے۔ وہ نغمۂ ٹیگور کی خواب آلود موسیقی سے بھی مسحور ہے اور اسے اقبالؔ کے لہو سے بھی خاص وابستگی ہے مگر اقبالؔ کی شاعری کے انداز اور اس کی فکری گہرائی اور وسعت سے حفیظؔ کو کچھ زیادہ حصہ نہیں ملا۔ اور یہ بہت اچھا ہوا کہ حفیظؔ نے اقبالؔ سے اشارہ پا کر پوری بات اپنے ہی انداز میں کی۔ ورنہ آج حفیظؔ پر مضمون لکھنے کی کسی کو ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ محض وغیرہ کی صف میں شمار ہو کر قلم انداز ہو جاتے۔ —— (نگار کراچی' حفیظ نمبر ۱۹۶۳ء)

ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی

اقبال صدی سیمنار دلی کے اقتباسات

اقبال صدی کے سلسلے میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دلی کے زیر اہتمام ایک کل ہند اقبال سیمنار ۲۶، ۲۷ مارچ ۱۹۷۷ء کو منعقد ہوا۔ سیمنار کا افتتاح جناب اندر کمار گجرال سفیر کبیر ہند برائے روس نے فرمایا۔ اور اقبال کی شاعری کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اقبال ہماری ادبی میراث کا ایک ایسا حصہ ہیں جس پر ہمیں فخر ہے۔ ہندوستان و پاکستان سے باہر کئی مغربی ملکوں میں بھی اقبال صدی منانے کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہیں۔ خصوصاً روس میں ماسکو، تاشقند اور دوشنبہ میں بین الاقوامی سیمنار ہوں گے اور اقبال کی کتابوں کے تراجم شائع کئے جائیں گے۔ افتتاحی اجلاس کی کارروائی کا آغاز اقبال کی نظم "لا الٰہ الا اللہ" سے ہوا۔ اس کے بعد پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ یہ سیمنار شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ کی تنظیمی و علمی صلاحیت اور ان کی اور ان کے ساتھیوں کی محنت، خوش ذوقی اور خوش سلیقگی کا ثمرہ ہے۔ اقبال ہمارے عظیم شاعر ہیں اور ہمیں خوشی ہے کہ اس سیمنار میں ان کے فن کے مختلف گوشوں پر بحث ہوگی اور نئے نئے نکات پیش کئے جائیں گے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے سیمنار کے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ کرنا خاصا دشوار تھا کہ موجودہ سیمنار میں اقبال کے کس پہلو کو موضوع بنایا جائے، چونکہ عام طور پر اقبال کے نظریات، تصورات اور افکار سے بحث کی جاتی ہے اور اکثر و بیشتر ان کی شاعرانہ عظمت کے فنی عناصر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ جامعہ کے سیمنار کو اقبال کے فن کے لئے وقف کر دینا چاہیئے کیونکہ اقبال مفکر، مصلح، اور نظریہ ساز سب کچھ اسی لئے ہیں کہ وہ شاعر ہیں۔ اس سیمنار کے سامنے سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ اقبال کی شعری شخصیت کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے نہ دیکھا جائے بلکہ شاعر اقبال اور ان کی فنکارانہ عظمت کے جمالیاتی، تکنیکی اور فنی پہلوؤں پر غور کیا جائے اور ان کے شکوہ و ترکمانی، ذہنِ ہندی، اور نطقِ اعرابی کے تخلیقی اسرار و رموز تک رسائی حاصل کی جائے۔
اس موقع پر مرکزی اقبال صدی کمیٹی کے سکریٹری سردار جعفری نے بھی تقریر کی اور اقبال صدی کے سلسلے میں مرکزی کمیٹی کے پروگرام کی تفصیل پیش کی۔ انہوں نے بتایا کہ اقبال پر ایک رنگین دستاویزی فلم زیر تکمیل ہے۔ اقبال پر بعض کتابیں بھی شائع ہوں گی اور اکتوبر میں بڑے پیمانے پر ایک بین الاقوامی سیمنار کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے۔ افتتاحی اجلاس میں پاکستان کے معروف و ممتاز شاعر حضرت حفیظ جالندھری نے بطور مہمانِ خصوصی کے شرکت کی۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اقبال سیمنار میں شمولیت کو اپنی خوش نصیبی بتایا۔ جامعہ ملیہ کو بہترین اسلامی درسگاہ قرار دیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی دو نظمیں سنا کر سامعین سے خراجِ تحسین وصول کیا۔

آخر میں پروفیسر مسعود حسین وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے خطبۂ صدارت پیش فرمایا۔ ان کے خطبہ کا عنوان تھا "ساقی نامہ، تخلیق بلند آفرینی" انہوں نے کہا کہ ساقی نامہ اسرارِ خودی کی صدائے بازگشت ہے۔ دونوں میں فن کے بین اختلافات کے باوجود

فکر کا اشتراک ملتا ہے۔ اسرارِ خودی کا کینوس وسیع ہے جب کہ ساقی نامہ جاوداں پر مثل ھواللہ کہنے سے عبارت ہے۔ مسعود صاحب نے اس نظم پر اردو کی شعری روایات کے اثرات کی بھی نشاندہی کی اور اس نظم کی فکری بنیادوں کا بھی تجزیہ کیا۔ علاوہ ازیں اقبالؔ کے تصورِ عشق کی وضاحت اسرارِ خودی کے حوالے سے کی۔ انہوں نے کہا کہ جو پیغام اقبالؔ نے اسرارِ خودی کے ہزاروں اشعار میں دیا تھا وہی پیغام ساقی نامہ کے ۵۷ اشعار میں مربوط ہے۔ وہ اردو میں ایک بڑے خاکہ پر مثنوی لکھنا چاہتے تھے۔ مصروفیتیں مانع ہوئیں لہٰذا اس خاکہ کو اس نظم میں مختصر کرکے پیش کیا۔ مسعود صاحب نے مزید کہا کہ فکرِ اقبال کے سلسلہ میں ان کے خطبات کی بڑی اہمیت ہے۔ ساقی نامہ میں مجردات کو مشکر بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور محسوسات و مدرکات کا اظہار بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ عظیم فن کار کو اظہارِ بیان کے ان تمام وسائل پر قدرت ہوتی ہے جو شاعری سے پیغمبری تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اختتامی اجلاس کا اختتام اقبالؔ کی غزل "جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی" پر ہوا جسے استاد ہلال احمد خاں نے اپنی سحر آفریں آواز میں پیش کیا۔ اقبالؔ صدی سیمینار کے موقع پر اقبال نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ جناب جگن ناتھ آزادؔ نے سامعین کو بتایا کہ اس نمائش کے پیچھے کتنی بڑی کوشش کا ہاتھ ہے اور کتنے برسوں کی محنت کے بعد اس کی تدوین ہوسکی ہے۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر آلِ احمد سرور نے فرمائی۔ ان کے مقالے کا عنوان تھا "خضرِ راہ۔ ایک مطالعہ" سرور صاحب نے خضرِ راہ کی فنی ساخت سے بحث کرتے ہوئے اس میں ان عناصر کی کارفرمائی پر توجہ دلائی جسے ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری کی تین آوازوں سے موسوم کیا ہے۔ (غنائی، خطابی اور ڈرامائی)۔ سرور صاحب نے بتایا کہ اقبالؔ کی شاعری میں مذکورہ دو آوازیں تو پہلے بھی موجود تھیں لیکن "خضرِ راہ" میں شاعری کی تیسری آواز کا حسن بھی موجود ہے۔ انہوں نے کہا کہ "خضرِ راہ" جس قسم کے ذہنی و روحانی دباؤ کے عالم میں خلق ہوئی اس کا کچھ اندازہ جنگِ عظیم اول، انقلابِ روس، ترکوں کی شکست، وسطِ ایشیا میں انور پاشا کی ناکامی وغیرہ کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ مگر شاعر کی نظر ہنگامی واقعات کے دوررس نتائج، خصوصی واردات میں عمومیت اور آفاقیت یعنی وقتی پہلو میں عصریت دیکھ لیتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ خضرِ راہ کا کوئی حصہ اپنی الگ دنیا نہیں بناتا، ایک کُل کا جزو ہے اور سارے اجزاء بھرپور تاثر دیتے ہیں۔ شخصیت میں وہ استناد جو کھری شاعری کی پہچان ہے ذوقِ یقیں سے آتا ہے۔ اقبالؔ کے یہاں یہ ذوقِ یقیں اس خونِ جگر کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے جو سِل کو دل بناتا ہے اور صدا کو سوز و سرور بخشتا ہے۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے "اقبالؔ کا لفظیاتی نظام" کے موضوع پر فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ انہوں نے اس مفروضے پر کہ "اقبالؔ کا شاعرانہ حسن ان کے افکار پر مقدم ہے اور شاعرانہ حسن کا مطالعہ دراصل شاعرانہ زبان کا مطالعہ ہے"۔ اقبالؔ کی شاعرانہ زبان کے خواص اور ان کے عناصر کی نشاندہی کی جن سے ان کا لفظیاتی نظام مرکب ہے۔ انہوں نے جدید شعری لسانیات کے اصولوں کی روشنی میں اقبالؔ کے بعض کلیدی الفاظ کو موضوعِ گفتگو بنایا۔ جو ان کے تخلیقی سفر میں بار بار لیکن ایک نئی معنویت کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے "لالہ" کا ذکر خاص طور سے کیا جو ذوق و شوق تک آتے آتے معنوی ربط و بے ربطی کی کئی منزلوں سے گزرتا ہے۔ بعد ازاں فاروقی صاحب نے اپنے مطالعہ کا دائرہ "ذوق و شوق" کے تجزیہ تک محدود کرکے اس کے فنی، لسانی اور ہیئتی سرمایہ کا بھرپور جائزہ لیا۔ اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ باوجود طویل ہونے کے نظم کا ہر مصرع لفظی اور معنوی ارتباط کے ایک داخلی نظام میں جکڑا ہوا ہے۔

جناب وارث علوی نے "شاعری" فلسفیانہ شاعری اور اقبال" کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ اقبال سارتر کی مانند فلسفیانہ فکر کا استعمال زندگی کو نئی معنویت عطا کرنے کے لئے کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری سماجی و سیاسی طنز کی بھی دلچسپ مثالیں پیش کرتی ہے۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کا پورا لطف طنز ہی میں ہے۔ سولینی کا پیغام بھی سیاسی طنز کی دلچسپ مثال ہے۔ انہوں نے کہا کہ اقبال کے تمام خیالات کو فلسفیانہ وقار کا حامل نہیں کہا جاسکتا۔ ان کا عام رویّہ شاعرانہ ہے، فلسفیانہ نہیں۔ اقبال شاعری میں مضمون نہیں سکھتے۔ اقبال کے آخری دَور کا کلام اس جذباتی نور اور رنگارنگی سے عاری ہے جو "بانگ درا" اور "بالِ جبریل" کو سوز و گداز عطا کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ شاعری میں ORIGINAL فلسفی ہونا ضروری نہیں ہے لیکن شاعر کی شاعری اگر ORIGINAL نہ ہو تو اس کی قیمت دو کوڑی کی ہوجاتی ہے۔ اقبال مذہب سے اتنی شدید وابستگی کے باوجود بھی مذہبی شاعر نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کی شاعری آدمی کے تخلیقی شعور کی کلیّت کو نہیں پیش کرتی۔ اقبال کے یہاں کوئی شاعرانہ اجتہاد نہیں تھا" تاہم ان کے یہاں اردو شاعری کا کلاسیکی اسلوب اپنی شدید ترین شکل میں نقطۂ عروج پر پہونچا نظر آتا ہے۔ اقبال، ہیملٹ کے اضطراب اور مسیح کی بصیرت دونوں کا امتزاج تھے، گو آگے چل کر مسیح، ہیملٹ پر غالب آگیا۔ یہ شاعر کا المیہ ہے۔

جناب جگن ناتھ آزاد نے "اقبال کی ترمیموں کا تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے مقالہ پڑھا انہوں نے اس امر پر روشنی ڈالی کہ اقبال نے اکثر و بیشتر کس طرح اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے پیش نظر اشعار میں ترمیمیں کی ہیں۔ آزاد صاحب نے بتایا کہ اقبال کی ہاں ترمیمات کی کئی شکلیں ملتی ہیں۔ انہوں نے نظموں کو بندوں، بندوں کے مصرعوں میں بھی حذف و اضافہ کیا ہے۔ الفاظ، تراکیب، مصرعوں کے ٹکڑے اور مصرعے بھی تبدیل کئے ہیں۔ بعض ترمیموں میں سخن شناسوں کے مشورہ پر زبان اور اندازِ بیان میں تبدیلیاں بھی کی ہیں۔

ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے "اقبال کی شعری تمثیلیں" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ انہوں نے جدید انگریزی تنقید کی روشنی میں مرئی اور غیر مرئی تمثالوں کی معنوی تعریف اور بصیرت کی حامل شاعری میں علامتی تمثالوں کے عمل دخل پر روشنی ڈالی۔ اور بتایا کہ اقبال کی شاعری واہمہ (FANCY) کی پیدا کردہ مرئی تمثالوں سے بتدریج ہٹتی ہوئی تخییل اور بعد ازاں بصیرت کی سطح تک پہونچتا ہے جس کے باعث شاعر کے لئے ایک آفاقی نوع کی ارفع سطح کی حامل شاعری خلق کرنا ممکن ہوتا ہے۔

مقالوں پر بحث میں ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر شمیم حنفی، جناب حنیف کیفی، ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر محمد ذاکر، ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، اور عبداللطیف اعظمی نے حصہ لیا۔

اقبال سیمینار کا تیسرا اجلاس ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے "اقبال کے یہاں تصوّرات کی شاعری" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ایسی شاعری کے علاوہ جس میں استعاروں اور محاکات سے ابلاغ اور ترسیل کا کام عام طور سے لیا جاتا ہے، شاعری کی ایسی شکلیں بھی ملتی ہیں جن میں بیش از بیش تصورات کی کارفرمائی ملتی ہے یا جہاں تصورات اور شعری پیکر بیک وقت ملتے ہیں یا جہاں شعری پیکر سے کم سے کم کام لیا جاتا ہے۔ شاعری محض حواس سے اپیل نہیں کرتی بلکہ تصورات کی تخلیق بھی کرتی ہے۔ ایسی شاعری میں پیکر نگاری کو کام میں لائے بغیر تخلیق کا جادو جگایا جاتا ہے۔ اس قسم کی شاعری میں ذہانت اور تفکّر کی توانائی، روشنی اور گرمی ملتی ہے۔ اقبال کے یہاں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ یہ "بانگ درا"

بالِ جبریل، ضربِ کلیم، جاوید نامہ، ارمغانِ حجاز سبھی مجموعوں میں تلاش کی جاسکتی ہیں ۔ اس میں اس قسم کی شاعری کی نشاندہی کی جاسکتی ہے جسے مابعد الطبیعاتی شاعری کہا گیا ہے ۔ اور جس میں مجرد فکر سے زیادہ فکری عمل اور تفکر کی جیش از بیش کارفرمائی ملتی ہے اور ایسی شاعری یقیناً حسیاتی شاعری سے کم درجے کی شاعری نہیں ہے بلکہ بعض اعتبار سے اس سے زیادہ تشفی بخشتی ہے ۔

پروفیسر شکیل الرحمٰن نے اپنے مقالے "اقبال ۔ روشنی کی جمالیات" میں یہ خیال ظاہر کیا کہ اقبال کی جمالیات میں روشنی کو نقطۂ ارتکاز سمجھ کر اقبالیات کا مطالعہ کیا جائے تو تجربوں کی بازآفرینی کا احساس شدید تر ہو جائے گا ۔ اقبال نگاہ و نظر کی تیزی، شوخی، روشنی اور اس کی لطیف چبھن کو حرکت اور بیداریٔ قلب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔ اقبال کی جمالیات میں عشق، روشنی، وجدان، گرمی، تپش اور رفتار کا رہنما ہے ۔ حیرت کو بصیرت میں تبدیل کرنے والے جذبے کے پیچھے روشنی کا حسیاتی پیکر اس قدر متحرک ہے کہ اقبال اسے دانشِ نورانی کہتے ہیں جو دانشِ برہانی یعنی عقل سے بلند تر ہے ۔ اقبال نے عقل کو سراپا تاریکی کہا ہے اور عشق کو سراپا نور ۔ اقبال کے یہاں نگاہ، جلال اور جمال دونوں کا گہوارہ ہے ۔ گو اقبال کی جمالیات میں رنگ کی کارفرمائی ہے اور دوسرے بہت سے مغربی اور مشرقی شاعروں کی طرح ان کا محبوب رنگ بھی سرخ ہے جس کی علامت لالہ ہے لیکن ان کے پورے کلام میں رنگ کی اہمیت زیادہ نہیں ہے ۔ ان کے یہاں روشنی نے اپنے نور میں تمام رنگوں کو جذب کر لیا ہے ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "اقبال کی اردو شاعری کے صوتی نظام" پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ صوتی آہنگ کا گہرا تعلق شاعر کی افتادِ طبع اور شعری مزاج سے ہوتا ہے ۔ اقبال کا فردیت پر اصرار، عمل کی گرم جوشی، جرات مندی، آفاق کی وسعتوں میں پرواز کا حوصلہ اور بے پایاں تحریک ایک ایسے صوتی نظام کا تقاضہ کرتا ہے جو اس کے معنیاتی نظام سے پوری طرح ہم آہنگ ہو ۔ اقبال کے لہجے کے شکوہ، برش، تندی و توانائی، چستی و روانی اور گونج کی کیفیت کا گہرا تعلق مسلسل آوازوں کے استعمال سے ہے ۔ اگرچہ اردو کی صفیری آوازیں تعداد میں ہکار اور معکوسی آوازوں سے بہت کم ہیں لیکن اقبال کے یہاں ان کا استعمال کئی گنا زیادہ ملتا ہے ۔ غالب کے یہاں ان آوازوں کا استعمال میر سے کم اور اقبال کے یہاں بہت ہی کم ہے ۔ صفیری آوازوں کا استعمال غالب کے یہاں بھی ملتا ہے لیکن وہ مسموع آوازوں اور منہ کے پچھلے حصوں سے ادا ہونے والی آوازوں کو ترجیح دیتے ہیں جو ان کے حزنیہ تفکر اور الم ناکی کی کیفیت کا ساتھ دے سکتی ہے ۔ اقبال کے یہاں نسبتاً زیادہ تنگی کی وجہ طویل اور غنائی مصوتوں کا استعمال بھی ہے ۔ اقبال کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں طویل اور غنائی مصوتوں کی ذہنی کیفیات زناٹے دار صفیری و سلسلہ وار مسلسل آوازوں کی آسمانی کیفیات کے ساتھ مربوط و مدوج ہو گئی ہیں ۔ اور اصوات کی اس خوش امتزاجی نے اقبال کے صوتی آہنگ کو ایک ایسی دلآویزی، توانائی اور گونج عطا کی ہے جو اپنے تحرک و تموّج کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے ۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اپنے مقالے "شعرِ اقبال کا علامتی پہلو" میں علامت کی متنازعہ فیہ اصطلاح کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ علامت ایک ایسا طرزِ اظہار ہے جس میں تلازموں کے سہارے کسی شئے کی نمود اس شئے سے زیادہ یا اس سے مختلف ہو سکتی ہے ۔ علامت موضوع کی دنیا کی توسیع بھی کر دیتی ہے اور اسے سرے سے بدل بھی ڈالتی ہے ۔ اس لحاظ سے علامتی طرزِ اظہار میں کوئی بات کہنے کی ایک روش ہوتی ہے اور اس کے مفہوم تک پہنچنے کی تعلیٰ دوسری ۔ علامت کے اس تصور کے پس منظر میں ڈاکٹر وہاب اشرفی نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اقبال کی کوئی نظم کلّی طور پر علامتی نہیں ہے ۔ کیونکہ اقبال کی نظموں میں عضویاتی تکمیل

خوبصورت استعاراتی نظام اور غیر معمولی قوتِ حاسہ کے حامل پیکروں کے باوجود سرّیت اور ابہام نہیں جو علامتی نظموں کو ایک سیلابِ معنی کی شکل دیتا ہے ۔ علامت پسندی اور علامت نگاری میں فرق کرتے ہوئے مقالہ نگار نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اقبالؔ علامت پسند ہیں لیکن وہ بودلیئر، ملارمے یا درلین کی طرح علامت نگار نہیں ہیں ۔ اقبالؔ کے یہاں استعارے یا علامتی استعارے اتنی کثرت سے ملتے ہیں کہ ہم ایسے علامتی استعاروں پر مبنی نظموں کو علامتی کہہ دیتے ہیں لیکن ان علامتی استعاروں یا علامتوں کے استعمال کے باوجود اقبالؔ کی نظمیں کلیتاً علامتی نہیں ہیں ۔ اقبالؔ کی شاعری کی ساری بحث علامتی استعاروں کی بحث ہے' علامتی شاعری کی نہیں ۔ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے مقالہ نگار نے اقبالؔ کی نظموں سے مثالیں پیش کیں ۔ اور اقبالؔ کے بنیادی علائم کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کی ان علامتوں کا ذکر بھی کیا جنھیں اقبالؔ نے ایک نئی معنویت عطا کی ۔

اس اجلاس کی صدارت ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے فرمائی ۔ انہوں نے اپنا مقالہ " کلامِ اقبالؔ میں جلال و جمال کی آمیزش " کے موضوع پر لکھا تھا ۔ لیکن دوسرے مقالوں پر مفصل اظہارِ خیال کی وجہ سے اور وقت کی تنگی کے باعث انہوں نے تقریر پر اکتفا کیا ۔ اقبالؔ کو ایک بڑی شخصیت بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ سب کو اپنا بنالیتا ہے حتیٰ کہ نطشے و فشتے کو بھی مشرف بہ اسلام کر لیتا ہے رومیؔ و اقبالؔ کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کہا کہ اقبالؔ نے جتنا رومیؔ سے لیا ہے اس سے زیادہ انھیں دیا ہے ۔ یعنی کسی نے رومیؔ کی ایسی تعبیر و تشریح نہیں کی جیسی اقبالؔ نے کی ۔

اس اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں پر پروفیسر مسعود حسین، سردار جعفری، ضیاء الحسن فاروقی، ڈاکٹر وحید اختر، وارث علوی، تنویر احمد علوی، محمود ہاشمی، ابوالفیض سحر، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، انور صدیقی، ڈاکٹر شمیم حنفی، اور ڈاکٹر عنوان چشتی نے بحث میں حصہ لیا ۔

اقبالؔ صدی سمینار کا چوتھا اور آخری اجلاس ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر انجمن ترقی اردو (ہند) کی صدارت میں شروع ہوا، جس میں ڈاکٹر وحید اختر، سید حامد، محمود ہاشمی، اور ڈاکٹر شمیم حنفی نے مقالے پڑھے ۔ ڈاکٹر وحید اختر نے " اقبالؔ کا تصورِ فن " پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہر بڑا شاعر اپنے ساتھ ایک نئی شعریات لاتا ہے ۔ اقبالؔ نے بھی فن کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ایک نئی شعریات کی تدوین کا متقاضی ہے ۔ انھیں شعریات کی عمومی اصطلاحوں کی مدد سے سمجھنے میں تناقضات کا شکار رہنے کا اندیشہ رہتا ہے ۔ اقبالؔ نے اپنی نثری تحریروں اور خطوط میں مختلف فنونِ لطیفہ سے متعلق جو آرا پیش کی ہیں ان کے مطالعہ سے یہ نکات واضح ہوتے ہیں کہ قدر نہ معروضی ہے نہ موضوعی' یہ دونوں کے جدلیاتی رشتے سے بنتی اور بدلتی ہے ۔ فن اور حُسن کی قدریں مطلق نہیں' فن کا مرکز انسان ہے ۔ فن انسانی خودی' تخلیقیت اور آزادی کا اظہار ہے اور جلال اور قوتِ آزاد کی حرکی فن میں حُسن سے آمیز ہو کر توازن اور فعالیت پیدا کرتے ہیں ۔ اقبالؔ نے زبان کو شعری اظہار کا وسیلہ مان کر اس پر استادانہ قدرت کو لازمی قرار دیا ہے ۔ انہوں نے حتی الامکان محاورۂ اہلِ زبان کی پابندی کی ہے لیکن جہاں ان کے منفرد تجربات و تصورات کے لئے اردو کی مروّجہ شعری زبان ناکافی ثابت ہوئی انہوں نے نئی زبان تراشی ۔ اقبالؔ زبان کی فطری نشو و نما کو ایک تخلیقی عمل کے تابع بتاتے ہیں جو قوم کے عروج و زوال کے ساتھ بدلتی ہے ۔ اقبالؔ کے نزدیک شاعری محض محاورہ و تراکیب کی جستجو نہیں بلکہ حیات افروزی اور قدرت آفرینی ہے ۔

جناب سید حامد نے " اقبال کے کلام میں تضمین' ترکیب اور تلمیح " کے موضوع پر مقالہ پڑھتے ہوئے بتایا کہ اقبالؔ کی

خادرہ مشاف نظر نے کثرت کی نقاب کے پیچھے وحدت کا روئے زیبا دیکھ لیا تھا۔ تضمین، ترکیب اور تلمیح کو جس طرح اقبال نے استعمال کیا ہے اس میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اول تو یہ کہ ساتذہ کے اشعار کی تضمین روایتی تلمیح اور دیرینہ ترکیب تینوں کو اقبال اس انداز سے زیر نگین لایا ہے کہ اس نے ان کے رخ اور سمت کو بالکل بدل ڈالا ہے۔ ہر عہد آفریں اور کائنات ساز شاعر کی طرح اقبال اپنے پیشروؤں سے خواہ ان کا میدان شاعری رہا ہو یا مذہب یا فلسفہ یا تاریخ یا فنونِ لطیفہ خراج وصول کرتا ہے۔

پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ اقبال کی شاعری ایک مخصوص شعری حکمت عملی سے معمور ہے وہ اپنی شاعری کے ذریعہ ایک ایسے طاقت ور انسان یا ایسی ہمہ گیر شخصیت کو پروان چڑھانا چاہتے ہیں جو مظاہرِ کائنات اور اشیاء پر حاوی ہو۔ اس مقصد کے لئے اقبال نے ایک ایسے شعری PERSONA کو اپنی شاعری کا محور بنایا ہے جو اقبال کی شاعری میں ابتدا سے انتہا تک اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی کائنات اور اپنے زماں و مکاں سے معرکہ آرا نظر آتا ہے۔ اور اس کا سیاق و سباق، ایک خاموش صف آرائی کا منظر پیش کرتا ہے۔ شکوہ سے تصادم کا آغاز ہوتا ہے۔ خضرِ راہ میں یہ PERSONA منزلِ فتح کے عرفان سے آگاہ نظر آتا ہے اور بالِ جبریل میں اس PERSONA کی تکمیل اس طرح نمایاں ہوتی ہے کہ وہ اپنی کائنات پر حاوی ہو چکا ہے اور اب اس کائنات سے آگے خود اپنی ایک تازہ کائنات کی تخلیق کے لئے جستجو کرتا ہے۔ یہی اس PERSONA کی تکمیلی منزل ہے۔

ڈاکٹر شمیم حنفی نے اپنے مضمون کو اقبال کی غزل سے متعلق چند مباحث تک محدود رکھا۔ اقبال کی غزلیہ شاعری کے فنی محاسن یا ان کے افکار کا تجزیہ کرنے کے بجائے انہوں نے صرف ان سوالات پر روشنی ڈالی جو براہِ راست اقبال کی غزل کے میڈیم سے متعلق ہیں۔ اقبال کی غزل پر اردو اور فارسی کی کلاسیکی غزل کے بعض اثرات اتنے گہرے تھے کہ ان کی نظم گوئی بھی اس سے خود کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ اسی کے ساتھ ساتھ چونکہ اقبال ایک باضابطہ نظامِ اقدار اور اسلوبِ زیست کے شاعر تھے اس لئے ان کی فکر بھی مربوط، مسلسل اور تربیت یافتہ تھی جس کا اثر ان کی غزل کی ترکیب پر پڑا۔ اقبال کی غزل اور نظم دونوں ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ بالِ جبریل تک پہنچتے پہنچتے اقبال کی غزل نے ایک نئے لسانی تجربے کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

آخر میں اقبال صدی سیمینار کے ناظمِ اعلیٰ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے تمام شرکاء، سامعین اور منتظمین سیمینار کا شکریہ ادا کیا۔

● ●

(بقیہ سلسلہ صفحہ [illegible])

خلوص سے ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے قریبی احباب میں ہر مکتبِ فکر کے نمائندے شامل ہیں۔ مجتبیٰ ان دنوں دہلی میں صاحبِ مسلک بھی ہیں اعتمادِ مغل بھی جدیدیت کے ہوا خواہوں کو، ترقی پسندی کے علمبردار سبھی حلقوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ ویسے ایک ذمہ دار ادیب کا منصب بھی یہی ہے کہ وہ انتہا پسندی کا شکار ہوئے بغیر حقیقت کی ترجمانی کرے۔

★ ★ ★

نقد و نظر

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

اعراض۔ مجموعہ غزلیات

انیس مالیگانوی۔ (۱۱۲ صفحات) اشاعت جنوری ۱۹۷۷ء

قیمت -/۱۰ روپے۔ ملنے کا پتہ:- بزم جمال مومن پورہ مالیگاؤں (ناسک)

غزل کو اردو ادب کی بدنام ترین صنف کہئے یا عروس ادب لیکن کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر شاعر اس صنف کو تختۂ مشق بناتے ہوئے ہی آگے بڑھا ہے جس غزل کے خلاف حالی نے مقدمہ "شعر و شاعری" لکھ کر اعلان بغاوت کیا تھا۔ وہ غزل حالی کے بعد تو اپنی اصلی شکل میں جلوہ فرما رہی۔

جدیدیت کے حامیوں نے جب غزل کو معاشرہ کی عکاسی کا ذریعہ بنانا چاہا تو عورت یا معشوق سے بات کرنے والی پس پردہ رہ گئی اور غزل نے ایسا روکھا پھیکا روپ اختیار کیا کہ اس کے مانع بے مائگی کے علمبردار نظر آنے لگے لیکن رفتہ رفتہ اس بے مائگی کے درمیان اسی کا وشیں بھی سامنے آنے لگیں جو قاری کو چونکا دیا کرتی ہیں۔ انیس مالیگانوی کی غزلیات جدیدیت کی نمایاں مثالیں ان میں جدید غزل کی دونوں شکلیں ملتی ہیں اور یہ شعر اس بات کی صحیح ترجمانی کرتا ہے ؎

دشت میں تیر امیدوں کے چلاتے جاؤ   کیا ضروری ہے کہ ہر وار ہی خالی جائے

یہ مجموعہ اچھی طباعت اور خوبصورت ڈسٹ کور سے آراستہ ضرور ہے لیکن کاغذ کہیں بہت اچھا اور کہیں گھٹیا قسم کا استعمال کیا گیا ہے ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا

(غلام جیلانی)

فرمودات (شعری مجموعہ)

شاعر: شری بسویشور۔ مترجم: حمید الماس

پبلشر: کرناٹک اشاعت گھر بنگلور

فرمودات موضوع اور مواد کے اعتبار سے اردو شاعری میں نئی چیز ہے عام طور پر تلگو، مراٹھی، ہندی، پنجابی اور بنگالی ادب و شعر کی طرف ہمارے اردو ادیب توجہ دیتے رہتے ہیں لیکن کنڑا لٹریچر کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے خصوصاً شاعری کے ترجمے تو عنقا ہیں۔ ایسی صورت میں حمید الماس صاحب نے بوجیشاعری کے ممتاز شاعروں کی اس جانب توجہ دے کر مستحسن اقدام کیا ہے۔ "فرمودات" ان کی اپنی کوششوں کی پہلی قسط ہے یعنی یہ کہ انھوں نے دو سو نظموں کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو شاید آئندہ اشاعت پذیر ہوں فی الحال انھوں نے مشہور مصلح اور لنگایت دھرم کے رہنما شری بسویشور کے وچنوں کو پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں اصلاحی تحریکیں مختلف ادوار میں انسانیت نوازی کا فریضہ انجام دیتی رہی ہیں۔ رام کرشن، گوتم بدھ اور بسویشور اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں ان تمام کا بنیادی مقصد خیال کی پاکیزگی اور عمل کا ستھرا پن تھا وہ روح کے سکون کے متلاشی رہے اور اسی طرح انھوں نے ایک بہتر سماج کی تشکیل میں اپنا حصہ ادا کیا ہے فرمودات کے مطالعہ سے بسویشور کی ان ہی کوششوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ جاتی پاتی کی

[illegible] اور مساوات جیسی بنیادی قدروں کو بسولشر نے کتنے آسان اور خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ان سطروں میں آپ بھی محظوظ ہوں ؎

نظر جو آئے کہیں ایک دانۂ گندم	تو	پکارتا نہیں کیا اپنی قوم کو کوّا
جو دیکھ لے کہیں مرغی بھی ایک دانہ کو	تو	کیا صدائیں نہیں دیتی اپنے کنبے کو
اسی طرح سے جو تم خوش قسمت ہو کوئی اگر	تو	اس کا فرض ہے جو بھی اسے ملے
وہ کھائے بانٹ کر آپس میں ٹھیک سے ورنہ	تو	حقیر ہوگا وہ کتے سے اور مرغے سے

درحقیقت کہ اس عام فہم انداز نے انہیں عوام میں مقبول بنایا اور کمال یہ کہ حمید الماس نے کنڑا نظموں کی اس سلاست اور روانی کو ترجمہ میں باقی رکھا ہے میں سمجھتا ہوں جو لوگ مذہبی عصبیت اور تنگ نظری کا شکار نہیں ہیں اور جن کا مقصد اچھی باتوں کو اپنے دامن میں سمیٹنا ہے وہ یقیناً ترجمات کا مطالعہ کریں گے اور حسب استطاعت مستفید بھی ہوں گے

سرورق ایسا کہ اس کے دیکھنے سے نگاہوں کا کلچر آنکھوں کے سامنے گھوم سا جاتا ہے اس خوبصورت سرورق کے ساتھ ترجمات کی قیمت دس روپیہ کچھ زیادہ نہیں ہے اس مجموعہ کو کرناٹک اشاعت گھر بنگلور نے شائع کیا ہے (طیب انصاری)

غزلوں کی رات

حیدرآباد فرخندہ بنیاد جہاں کی منفرد خصوصیات کے باعث ملک بھر میں امتیاز رکھتا ہے وہاں اسے یہ بھی افتخار حاصل ہے کہ خاتون شعراء و ادبا کی ایک انجمن "محفل خواتین" یہاں گذشتہ ۵ سالوں سے خواتین کے ذوقی ادب کی آبیاری کر رہی ہے شعری، ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کو فروغ دینا اور خاتون شعراء و ادبا کی تخلیقات شائع کرنا محفل خواتین کے مقاصد میں شامل ہے "غزلوں کی رات" اسی انجمن کا سالانہ مجلہ ہے جو انجمن کے زیر اہتمام سالانہ تہذیبی پروگرام "غزلوں کی رات" کے انعقاد کے موقع پر شائع کیا جاتا ہے زیر نظر شمارہ تیسرا سالانہ میگزین ہے جو محترمہ عظمت عبد القیوم کی ادارت اور اہتمام سے شائع ہوا ہے ڈاکٹر سیدہ جعفر ڈاکٹر ثمینہ شوکت، ڈاکٹر حمیرہ جلیلی، ڈاکٹر صابرہ سعید، رفیع رؤف کے مضامین جیلانی بانو، مطیبہ خسرو، انیس قیوم فیاض، فاطمہ عوض سعیدہ کے افسانے سلیم النساء اور فاطمہ عالم علی کے انشائیے متاثر کرتے ہیں شعراء میں باقی طاہرہ سعید، نایاب سلطانہ ڈاکٹر اشرف رفیع زبیدہ تحسین اور جمیلہ نشاط قابل ذکر ہیں۔

صوری و معنوی حیثیت سے مزین ۱۰۰ صفحات پر محیط شمارہ ہذا کی قیمت ۲ روپے نہایت ہی کم ہے محفل خواتین کا یہ اقدام کہ کم قیمت میں رسالہ زیادہ ہاتھوں تک پہنچے نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ قابل تقلید بھی (وہاب عندلیب)

ادبی سرگرمیاں —

اردو نامہ، علمی ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

۴/ اپریل : "یوم محمد قلی قطب شاہ" تقاریب کے سلسلہ میں بمقام کرشنا دیوارایا لائبریری تلگو ادبی اجلاس ڈاکٹر ڈی راما نج راؤ سکریٹری ساہتیہ اکیڈمی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر آئی کرشنا مورتی ریڈر شعبہ تلگو عثمانیہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر کے گوپال راؤ کے علاوہ تلگو کے معروف ادیبوں نے محمد قلی کی تلگو، دکنی خدمات اور قطب شاہی عہد کی قومی یکجہتی پر روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ راما نج راؤ صاحب نے ڈاکٹر زورؔ اور ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ عقیدت ادا کرتے ہوئے اردو اور تلگو کے محسن، سلطان سخنور محمد قلی کی سالانہ یاد کے شایانِ شان انعقاد کی ستائش کی اور کہا کہ اس طرح تلگو اُردو ادب اور ثقافت کو بہتر فروغ ہوگا۔ تلگو ادبی اجلاس میں تلگو، اردو کے باذوق افراد نے شرکت کی۔

۶/ اپریل : مشہور افسانہ نگار اور ناول نویس ادیب جناب اکرام جاوید کے نئے ناول "شیشے کی دیوار" کی رسم اجرا، ریاستی اُردو اکیڈیمی کے صدر جناب آصف پاشا وزیر قانون نے انجام دی۔ مسٹر یم باگا ریڈی نائب صدر اُردو اکیڈمی نے تقریب کی صدارت کی۔ اکرام جاوید کے فن اور ان کی شخصیت کو مضامین اور تقاریر کے ذریعہ مسز اختر حسن (نائب معتمد اردو اکیڈمی)، عاتق شاہ، ابراہیم شفیق، علاء الدین جیب، چندر سری واستو نے خراجِ تحسین ادا کیا۔ جناب آصف پاشا نے کہا کہ ادیبوں پر قوم کی رہنمائی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اکرام جاوید کی تحریروں کا اُفق انسانیت کی سربلندی اور قومی وحدت سے عبارت ہے۔ موصوف نے اس بات پر اظہارِ تاسف کیا کہ ملک میں اُردو زبان کو ابھی تک اُس کا مستحقہ مقام حاصل نہ ہو سکا۔ ولی تنویر صاحب کنوینر نے شکریہ ادا کیا

۷/ اپریل : نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری میں "حلقۂ اربابِ ذوق" کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کی صدارت میں منعقد ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تصنیف "مسلمانوں کا عروج و زوال" پر تنقیدی تبصرہ سنایا۔ جناب یم یم بیگ سکریٹری نظامس چیارٹیبل ٹرسٹ نے لائبریری کی طرف سے شائع شدہ کتاب "مبصّر" کی رسم اجرا انجام دی۔

۹/ اپریل : ریاستی انجمن ترقی اُردو کی سالانہ کانفرنس کے سلسلہ میں اردو اساتذہ آندھرا پردیش کا مشاورتی اجتماع "ٹاؤن ہال" (محبوب نگر) میں پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر رحمٰن نے عزم و حوصلہ کے ساتھ اردو کے مسئلہ کے حل کی جانب متحدہ جدوجہد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ "اُردو ذریعۂ تعلیم کے ماڈل طرز کے مدارس کا کثیر تعداد میں قیام از حد ضروری ہے اس طرح اُردو کی ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا معیار عصری اور مفید طور پر آگے بڑھے گا۔ اساتذہ کے اجتماع کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، جناب عابد علی خاں اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی مخاطب کیا۔

● اسی شام انجمن کے مندوبین کا ایک اجلاس جناب عابد علی خاں شریک معتمد ریاستی انجمن ترقی اُردو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسٹر سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیم نے رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ ریاست میں انجمن کی (۴۸) شاخیں اُردو تعلیم اور اُردو مسائل کے سلسلہ میں کارکرد ہیں۔ اضلاع تلنگانہ، آندھرا اور رائل سیما کے مندوبین نے اپنے اپنے مسائل رکھے اور مختلف قرار دادیں اجلاسِ عام کے لئے تیار کی گئیں۔

۱۰/ اپریل : انجمن ترقی اُردو کے ۱۴ ویں دو روزہ سالانہ اجلاس کا ریاستی چیف منسٹر مسٹر جے وینگل راؤ نے ٹاؤن ہال (محبوب نگر) میں افتتاح کیا اور اُردو کے تمام مسائل کا جائزہ لینے اور ان کی جلد یکسوئی کی غرض سے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان کرتے ہوئے اُردو والوں کے مفادات

کے تحفظ کے لئے مناسب قانون سازی کا تیقن دیا اور انجمن کی سالانہ گرانٹ پچاس ہزار روپے کرنے کا تالیوں کی گونج میں اعلان کیا۔ انجمن کے افتتاحی اجلاس کی صدارت انجمن کے صدر نواب میر احمد علی خاں نے کی۔ جناب ابراہیم علی انصاری (ریاستی وزیر جنگلات) صدر مجلس استقبالیہ نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ جناب عابد علیخاں شریک معتمد انجمن نے ریاست میں اُردو کے تعلیمی مسائل پر تقریر کی اور چیف منسٹر کو ضروری اُمور میں مداخات کی طرف توجہ دلائی۔ جناب عابد علی خاں کی موثر اور اہم تقریر سے کانفرنس کا رُخ ہی بدل گیا پھر ریاستی چیف منسٹر نے مخاطب کیا اور کہا کہ "میری حکومت اُردو کے ساتھ کسی قسم کی ناانصافی کو روا نہیں رکھے گی اور اردو کے تمام مسائل حل کرنے کے سلسلہ میں ٹال مٹول کی پالیسی اختیار نہیں کرے گی۔

چیف منسٹر نے کہا کہ اُردو اکیڈمی کی امداد میں بھی اضافہ کیا جائے گا۔ اس امر پہ مسٹر راؤ نے زور دیا کہ اُردو کی بقا اور ترقی کے لئے ریاست آندھرا پردیش ملک کی کسی بھی دوسری ریاست سے پیچھے نہیں رہے گی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر مرکزی کل ہند انجمن ترقی اُردو، پروفیسر حبیب الرحمٰن، مسٹر کے یل مہندرا (ایم یل سی) اور نائب صدر ریاستی انجمن ڈاکٹر بیس الدین منان نے بھی اُردو کے مسائل پر مخاطب کیا۔ سرندیاس لاہوٹی نے پیامات سنائے۔ اس موقع پر انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام مرکزی ترقی اُردو بیورو دلی کی شائع کردہ چند نصابی کتابوں کی ریاستی وزیر مارکٹنگ مسٹر پی مہندر ناتھ نے رسم اجرا انجام دی۔ معتمد استقبالیہ مسٹر نصرت فاروقی نے شکریہ ادا کیا۔

● اسی شب ٹاؤن ہال میں بزرگ شاعر جناب عبدالمجیب عیاں کی صدارت میں محفل شعر منعقد ہوئی۔ نواب میر احمد علیخاں صدر انجمن مہمان خصوصی تھے۔ جناب علی احمد جلیلی نے جہاندار افسر کی معاونت سے نظارت کے فرائض انجام دیئے۔ اس مشاعرہ میں علی احمد جلیلی، ڈاکٹر غیاث صدیقی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیرؔ، منوہر لال بہار، وقار خلیل، شمس الدین تاباں، جہاندار افسر، تجمل اظہر، راجہ لال راحبہ، قطب سرشار، عبدالرزاق صولت، سلطان محوی، نصرت فاروقی اور آمنہ ضیاء کے علاوہ اضلاع کے شاعروں نے کلام سنایا۔

● اسٹڈی سرکل تعمیر ملت کے زیر اہتمام مولانا الطاف حسین حالیؔ کی یاد میں ادبی اجلاس جناب خلیل اللہ حسینی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر صفدر علی بیگ یوسف اعظمی، یوسف رحمت اللہ اور کریم رضا صاحبان نے حالیؔ کی شعری و ادبی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔

۱۱/اپریل: کتب خانہ سالار جنگ میوزیم میں جناب رحمت علی خاں ریسرچ اسکالر میوزیم "مخطوطہ شناسی" پر لکچر دیتے ہوئے کاغذ اور روشنائی کے ذریعہ کتاب کی قدامت کے بارے میں مفید فنی معلومات کا اظہار کیا۔

۱۶/اپریل: مرکز ادب کا ماہانہ اجلاس رضی الرحمٰن صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولوی عبدالکریم ماہرؔ نے "برق موسوی کی رباعیات" پر سیر حاصل مضمون سنایا۔ آخر میں مختصر محفل شعر ہوئی جس کی معتمدی کے فرائض عزیز بھارتی نے انجام دیئے۔

۱۷/اپریل: اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس رائے جانکی پرشاد ہال (انوار العلوم کالج) میں بصدارت ڈاکٹر انور معظم منعقد ہوا۔ جناب اوجؔ یعقوبی کی شخصیت اور فن پر ان سے جناب مصلح الدین سعدی نے ادبی انٹرویو لیا۔ "ایک نظم ۲ تاثر" کے تحت برق یوسفی کی نظم پر امان ارشد اور جمیل شیدائی صاحبان نے تبصرہ کیا۔ محفل شعر میں ڈاکٹر معظم، اوج یعقوبی، شمس الدین تاباں، امان ارشد، قطب سرشار، رحمٰن جامی، رضا وصفی، حامد مجاز، مصلح الدین سعدی، غیاث متین، جمیل شیدائی، غنی نعیم اور چند ایک شعراء نے کلام سنایا۔

۲۱/اپریل: جناب میر حسن (معتمد مجلس مشاورت سب رس) کی پہلی برسی کے موقع پر بمقام عبادت خانہ دارالشفاء مجلس منعقد ہوئی اور قبر پر اعزہ و احباب کی طرف سے چادر گل چڑھائی گئی۔

● انڈین رائٹرس اینڈ آرٹسٹس

اسوسی ایشن سکندرآباد کا مشاعرہ عزیزہ بھارتی صاحبہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب خیرات ندیم اور دو خواتین شعراء صبا و اندو ششٹ نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر ایک مخلص اور اردو کارکن جناب ناگپال غلیم دہلوی کی شعری صلاحیتوں کے بارے میں کلمات تہنیت کہے گئے۔ مشاعرہ میں شمیم نصرتی، علی سرور، محسن جلگانوی، ناگپال، خیرات ندیم، عزیزۃ النساء صبا، ڈاکٹر اندو وششٹ اور غیاث آصف نے کلام سنایا۔

۲۱ راپریل: زندہ دلان حیدرآباد کی دسویں سالانہ محفل طنز و مزاح کا ادبی اجلاس جناب بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر ریاستی اردو اکیڈمی کی صدارت میں منعقد ہوا مسرز مجتبیٰ حسین، خواجہ عبدالغفور (بمبئی) یوسف ناظم (بمبئی) شفیقہ فرحت (بھوپال) رشید قریشی، نریندر لوتھر، مسیح انجم، پرویز یداللہ مہدی، برہان حسین اور ایم اے حنان نے طنز و مزاح سے عبارت مضامین اور خاکے سنا کر محفل کو زعفران زار بنایا جناب رشید قریشی نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اس موقع پر ملک کے صف اول کے طنز و مزاح نویس جناب مجتبیٰ حسین نے ایم اے حنان کی پہلی کتاب "گستاخی معاف" کی رسم اجراء انجام دی۔ مسٹر مصطفیٰ علی بیگ نے شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر ماہنامہ "شگوفہ" کا خاص نمبر بھی شائع ہوا۔

● ملک پیٹ یوتھ فیڈریشن کی جانب سے قائم کردہ "مطالعہ گھر" کا جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی ریاستی اردو اکیڈمی نے افتتاح کیا اور کتب خانوں کی سماجی، علمی اور قومی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ مسعود احمد خانصاحب نے اس تقریب کی صدارت کی۔

۲۴ راپریل: زندہ دلان حیدرآباد کی کانفرنس کے موقع پر کل ہند مشاعرہ جناب آصف پاشا صدر ریاستی اردو اکیڈمی کی صدارت میں ہوا۔ صدر زندہ دلان جناب بھارت چند کھنہ نے صدر مشاعرہ اور مہمان شعراء کا خیر مقدم کرتے ہوئے گلدستے پیش کئے۔ اس مشاعرہ میں ہلال سیوہاروی، سجنی بھوپالی، مقرب حسین محمل مدراسی، اگلی تلگنڈوی، ڈھکن رائچوری، نرگس حیدرآبادی، سرپٹ حیدرآبادی، بگڑ رائچوری، عظمت بھلاواں، پاگل عادل آبادی، اشرف خوندمیری، گلیم میدکی۔ حمایت اللہ اور گرگٹ حیدرآبادی نے اپنا کلام سنایا اور رنگ جمایا

۲۶ راپریل: ریاستی اردو اکیڈمی کے خبرنامہ کے بموجب اکیڈمی کی طرف سے غیر اردو داں اصحاب کو اردو سکھانے کے لئے ستمبر ۷۶ء میں جن اردو کلاسوں کا آغاز کیا گیا تھا، ششماہی نصاب کی تکمیل کے بعد ان طلبہ کا تحریری اور زبانی امتحان لیا گیا اور کامیاب قرار دیا گیا یاد رہے کہ ان کلاسوں میں اردو تدریس کا باقاعدہ طور پر جناب فخرالدین علی احمد مرحوم صدر جمہوریہ ہند نے افتتاح فرمایا تھا۔

۲۷ راپریل: آندھراپردیش کی حکومت کی طرف سے اردو اسکولوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کی غرض سے چیف منسٹر نے ایک سہ رکنی سرکاری کمیٹی کے قیام کا اعلان کیا ہے جس میں جب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نائب صدر مرکزی انجمن ترقی اردو اور جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر۔ یہ کمیٹی ریاست میں اردو ذریعہ تعلیم کے مدارس کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ درسی کتب، تربیت یافتہ اساتذہ اردو کی کمی و علام دستیابی کتب اور دیگر متعلقہ مسائل پر بھی توجہ دے گی اور اردو ذریعہ تعلیم کے طلبہ کے حالات اور ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے اندرون چار ماہ اپنی رپورٹ حکومت کو پیش کرے گی۔

یاد رہے کہ ایسی کمیٹی کے قیام کے سلسلہ میں جناب عابد علی خاں نے ریاستی چیف منسٹر کو انجمن کے سالانہ کنونشن منعقدہ محبوب نگر میں توجہ دلائی تھی۔

۲۹ راپریل: حیدرآباد کے جواں فکر اور ذہین شاعر جناب رؤف خیر کا پہلا شعری مجموعہ "اقرا" کے نام سے ریاستی اردو اکیڈمی کی اعانت سے طباعت کے مراحل طے کر رہا ہے۔ رؤف کی شعری حیثیت کو ڈاکٹر وحید اختر نے اپنے پیش لفظ میں سراہا ہے۔

ہمارے جری کسانوں کی واحد امید

کسی شک اور شبہ کے بغیر امداد باہمی اداروں کو ہمارے جری اور مایہ ناز کسانوں کی دعاؤں کا پھل کہا جاسکتا ہے۔ تحریک امداد باہمی کے فروغ کے معاملے میں آندھرا پردیش کا ریکارڈ بہت شاندار ہے اور گزشتہ دو دہوں کے دوران میں اس بات کی متواتر کوششیں جاری رہیں کہ دیہی کسان وسیع اور مختلف ذرائع سے قرض کی سہولتیں حاصل کرنے کے قابل بن جائیں۔

ان پورے برسوں کے دوران میں قلیل مدتی اور اوسط مدتی قرضوں کی اجرائی میں اضافہ ہوتا رہا ہے ۵۶-۱۹۵۵ء سے ۶۵-۱۹۶۴ء تک کے دہے میں بعد قرض اجراء ہونے والی رقم کی مقدار ۱۸۹.۹۰ کروڑ روپے تھی جو ۶۶-۱۹۶۵ء اور ۷۵-۱۹۷۴ء کے درمیانی دہے میں بڑھ کر ۴۱۲.۴۰ کروڑ روپے ہوگئی۔

پرائمری ایگریکلچرل ڈیولپمنٹ بنکوں کی جانب سے اب قرضوں کی اجرائی کے سلسلے میں فراخدلانہ پالیسی پر عمل کیا جارہا ہے جس کے نتیجے میں ان بنکوں کے توسط سے اجرا ہونے والے قرضوں کی مقدار میں پہلے دوسرے اور تیسرے پانچسالہ منصوبوں کے دوران برابر اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ ان منصوبوں کے دوران دیئے جانے والے قرضوں کی مقدار علی الترتیب ۲.۲۵۶ کروڑ روپے ۵.۷۷۸۵ کروڑ روپے اور ۱۸.۲۷۴۶ کروڑ روپے رہی۔ پانچویں منصوبے کے دوسرے سال میں قرضوں کی رقم ۶.۲۷۲۳ کروڑ روپے تھی بلکہ ۷۵-۱۹۷۴ء میں اجرا شدہ قرضوں کی رقم ۱۶.۱۸۸۶ کروڑ روپے ہوگئی۔

ریاست کی زرعی معیشت میں مارکٹنگ سوسائٹیز اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جون ۱۹۵۶ء میں ہماری ریاست میں ۱۴۸ پرائمری مارکٹنگ سوسائٹیز تھیں جن کا سرمایہ حصص ۲۶.۶۱ لاکھ روپے تھا لیکن جون ۱۹۷۶ء میں ان سوسائٹیوں کی تعداد ۲۶۵ اور ان کے سرمایۂ حصص کی مقدار ۲۶۹.۲۲ لاکھ روپے ہوگئی۔ ان اعداد سے گذشتہ ۲۰ برسوں کے دوران جاری پُر زور سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد۔

DIPR : 465/C3/77 - 24/76-77

فون نمبر: ۳۸۳۴۹ یادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور آغاز اجراء ۱۹۳۸ء

ماہنامہ
سب رس
حیدرآباد

نگراں: سید علی اکبر
معتمد مجلس مشاورت: غلام جیلانی
مرتب: وقار خلیل

مجلسِ مشاورت
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رمن راج سکسینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ پچیس پیسے
زرسالانہ ... ۱۲ روپے
ششماہی ... ۷ روپے

جلد: ۴۰ —— شمارہ: ۶
جون ۱۹۷۷ء

پرنٹر پبلشر: سید علی اکبر

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد ☆ مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ حیدرآباد

کیا آپ رائے دہندہ ہیں ؟

[...] ۱۹۷۷ء سے سارے آندھرا پردیش میں فہرست رائے دہندگان پر سرگرمی سے [...] جاری ہے۔ اگر آپ کی عمر جنوری ۱۹۷۷ء کو ۲۱ سال ہو اور کوئی خامی نہ ہو تو آپ کو [...] فہرست رائے دہندگان میں شریک کرائیں۔ شمار کنندہ بہت جلد آپ کے مکان پر پہنچے گا۔ براہِ کرم اس سے تعاون عمل کیجئے اور فہرست میں نام کی شمولیت کے لئے اپنے گھر کے تمام اہل افراد کے بارے میں صحیح تفصیلات فراہم کیجئے۔

اگر ۲۵ر جون ۱۹۷۷ء تک شمار کنندہ آپ کے گھر نہ پہونچے یا پھر شمار کنندہ کے فارم کی مثنی کاپی بھی نہ دے تو ایسی صورت میں آپ فی الفور حسب ذیل عہدہ داروں سے ربط قائم کرسکتے ہیں۔

قریبی ریونیو ڈویژنل آفیسر یا تحصیلدار } مضافات میں

دونوں شہروں حیدرآباد و سکندرآباد میں

علاقہ حیدرآباد {
متعلقہ ڈپٹی کمشنرس سرکل آفس میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد ۔ حیدرآباد
یا
اڈیشنل کمشنر (ریونیو) میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد۔ حیدرآباد

علاقہ سکندرآباد {
ڈپٹی کمشنر میونسپل کارپوریشن آف حیدرآباد سکندرآباد فون (72012)

کے بی لال
چیف الکٹورل آفیسر

DPR/AWT/574/cs/77

اپنی بات

نئے حالات، اُردو زبان، تدریس اور تہذیب کے لئے کٹھن نہیں تو صبر آزما ضرور ہیں ویسے بھی آزادی کے بعد سے اُردو تہذیب و ثقافت کو قدم قدم وفاداریوں کے دم دلاسوں کے سہارے آگے بڑھنا پڑا، حالانکہ ہماری زبان، اس کا ادب اور اس کی تہذیبی قدریں کسی طرح کی چارہ گری کی محتاج کبھی نہیں رہیں ـــــ ہندوستان میں پیدا ہونے اور پھلنے پھولنے والی زبان اُردو، لسانی اعتبارات سے خالص ہندوستانی نژاد اور ہندی الاصل زبان ہے ـــــ لسانی تعصبات کا وار زبانوں اور تہذیبوں پر جب بھی ہوتا ہے تاریخ شاہد ہے کہ وہ قائم اور مستحکم ہوتی گئیں، اُردو زبان کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے کٹر سے کٹر مخالفین نے بھی اس کا سہارا لیا ہے، چاہے کوئی میدان ہو، اُردو نے وصل کا منصب ادا کیا ہے اور بہتر طور پر ادا کیا ہے ـــــ جمہوریت کے نئے تقاضے اور نئی طرزِ فکر سوچنے والے ذہنوں کے لئے "سرمایہ" عزیز ہیں نامطلق اور نامساز گار ہرگز نہیں ـــــ ادبی و ثقافتی اداروں اور علمی اور ادبی رسائل وجرائد کی اشاعت کا کاروبار کرنے والے ہر شعبہ میں زیاں کا سودا ہی گوارا کرتے رہے ہیں۔ ہم بھی تو اُن ہی کے حالات سے دوچار ہیں مگر ایک پُرسکون اطمینان اس جنوں کو سہارے ہے کہ ادب و تہذیب کی راہ تیرہ نہ ہو اور نئی نسلوں کے تازہ کار قافلے رواں رہیں۔ زبان و ادب کی رہگذر روشن رہے۔

اس بار "سب رس" کی سبھی مشمولات میں فکر و فن کی ندرت، تازگی، سچائی اور عصریت کی مہک پیدا ہوتی ملے گی، زبان تہذیب اور ادب کے مسائل ہوں کہ جدیدیت کا ذکر، تذکروں کی تنقیدی اہمیت کا بیان ہو کہ دکنیات کی چھان پھٹک، سبھی گوشے اہلِ قلم اصحاب کی دروں بینی کے باعث جلوۂ صد رنگ نظر آتے ہیں۔

■ لسانیات کا ایک عالم، بنگالی ادب کا ایک دانشور، کلکتہ ۲۹ رمئی کی سہ پہر کلکتہ کی نرسنگ ہوم میں جاں بحق ہو گیا پروفیسر سنیتی کمار چیٹرجی، اردو والوں کے لئے بھی اتنے ہی سُرمۂ چشم و نظر تھے جتنے کہ بنگالی ادب کے لئے، بہ حیثیت نیشنل پروفیسر ڈاکٹر چیٹرجی نے ملکوں ملکوں ہندوستانی ادبیات کے پیام جانفزا کو عام کیا۔ مرحوم، کئی کتابوں کے مصنف، لسانیات کے ماہر اور بزرگ دانشور تھے۔ اُردو لسانیات، اُردو تہذیب اور اُردو والوں سے ان کا ربط گہرا اور دلکش تھا۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور اس کے بانی مغفور مرحوم ڈاکٹر زور سے تو انھیں بے حد علمی و ذہنی ہی نہیں شخصی ربط استوار تھا۔ ادارہ کے علمی و تحقیقی اُمور کو وہ جی جان سے چاہتے تھے اور اس کی ترقی کے آرزومند تھے۔ ڈاکٹر چیٹرجی نے ۳؍جنوری ۱۹۶۱ء کو ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ دورہ کیا تھا۔ پروفیسر زور اور پروفیسر چیٹرجی دونوں کے چہروں پر کھیلنے والی بے پناہ مسرت جن اصحاب نے دیکھی ہے وہ اس اَمر کی گواہی دیں گے کہ روشن خیال دانشور علمی مرکزوں میں کس طرح کا سکون محسوس کرتے ہیں۔ اسی رشتۂ خلوص کا مظاہرہ پروفیسر چیٹرجی نے اپنی کتاب "بکھرے موتی" کا انتساب ڈاکٹر زور کے نام کر کے واضح کر دیا کہ علم و ادب کی توقیر کسی تعصب، لسانی تنگ نظری کی حامل نہیں ہوتی۔ بقول میر

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ   افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر چیٹرجی ۲۶ رنومبر ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوئے، فارسی، بنگالی اور اردو ماحول میں پروان چڑھے، بین الاقوامی شہرت پائی، پڑھے

بڑے درجات سے سرفراز ہوئے۔ عمر کے آخری زمانے میں وہ مرکزی ساہتیہ اکیڈمی اور بنگال اردو اکیڈمی کے صدر نشین بھی رہے
ان کا اٹھ جانا قومی نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں "سب رس" کے صفحات میں ہم پروفیسر چیٹرجی کا ایک مضمون احترام اور
عقیدت کے طور پر شامل کر رہے ہیں۔

■ ۱۳ر مئی کو افسانوی ادب کا ایک روشن ترستارہ سرِشام غروب ہوگیا — ابراہیم شفیق، اُردو کے ذہین، باصلاحیت
اور صاحبِ طرز افسانہ نگار مصنف تھے دو کتابوں "ایک ہوا اور چلے" اور "ابھرتا سورج" کے علاوہ ان کی کئی زندگی شناس
کہانیاں افسانوی ادب میں زندۂ جاوید رہیں گی۔ شفیق کی جواں مرگی ارباب دکن ہی کو نہیں، اچھی اور مقصدی کہانی پڑھنے والے ہر
قاری کو رُلائے گی۔ ابراہیم شفیق مخلص دوست، ستودۂ انسانی صفات کا مجسمہ اور زمینی رشتوں کی گل سرسبد تھے، ان کی
ناوقت وفات صدمۂ جانکاہ ہے : خدا مغفرت کرے۔

غیروں سے شکایت نہیں، اپنوں سے گلہ ہے ' ہماری نظر میں ایسے اصحاب کی کمی نہیں جنھیں زور مرحوم سے
وابستگی بھی تھی اور ادارہ "سب رس" سے اُنس بھی تھا بلکہ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ یہ اُنس اب بھی برقرار ہے لیکن اس کے باوجود
ہم اس کا ہے کہ خدا مرحوم کی اس یادگار کو صحیح معنوں میں یادگار بنائے رکھنے کے لئے تعاون کی درخواست صدا بصحرا ہوتی رہی ہے۔

ہے پستی کی کہ پستی کو بلندی جانا　　اب بھی احساس ہو اس کا تو اُبھرنا ہے یہی

ہم ادارہ کے اُن مخلصوں سے "عرض" کریں گے کہ وہ "سب رس" کی توسیع اشاعت میں اپنے فرض کو محسوس کریں۔

غلام جیلانی

بقیہ : آل احمد سرور اور جدیدیت صلا سے آگے

شاعری میں جو انتشار ہے سرور اسے ایک نئی تنظیم کا آغاز بتاتے ہیں۔ جو فن کار کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہا ہے اور اسی باطنی سرچشمے
میں انسانی تجربے کی وسعت، زندگی کی گہرائی اور جامعیت خود بخود سماتی گی۔

آل احمد سرور کے ان نظریات و خیالات سے یہ بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ سرور آج نہایت لگن اور خلوص سے شعر و ادب میں بعض جدید تر
رجحانات کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ ماضی کو ایک لخت نظر انداز نہیں کر دیتے۔ تنقید کے لیے وہ روایت کا علم ہی نہیں عرفان
بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس کے بعد تجربے سے ہمدردی اور تجربے کے نئے اپنی آغوش وا رکھنا بھی۔ کلیوں پر قناعت کرنا نادانوں کا کام
ہوتا ہے۔ سرور اپنے تنگیٔ داماں کا علاج گلشن میں خود کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ آل احمد سرور ان ناقدین میں سے ہیں جو جو خرد مندانہ
بجت سکتہ سے ناخوش نہیں ہوتے بلکہ تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ جدیدیت کی حمایت میں ان کا یہ شعر پیش کرنا۔

غمگین نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی　　نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہر کبود　　(اقبال)

اس بات کا ثبوت ہے وہ نئی شاعری کے مستقبل سے مایوس نہیں۔

ڈاکٹر سید رشید الحسن

زبان اور ادیب

انسانی زندگی میں زبان کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات محض اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے خالق نے اپنی تمام مخلوقات کے مقابلہ میں صرف انسان ہی کو قوتِ گویائی عطا کی، حالانکہ حیوان اور انسان کی تخلیق میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں کی حیات، موت، کھانے پینے، رہنے سہنے وغیرہ میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انسان کو صرف نطق کا امتیاز حاصل ہے۔ اسی لیے اس کو حیوانِ ناطق بھی کہا گیا ہے۔

زبان میں اللہ تعالیٰ نے بڑی قوت اور تاثیر عطا کی ہے۔ زبانی باتوں ہی پر جنگیں ہوتی ہیں اور زبانی معاہدات ہی پر دنیا کے بڑے بڑے فیصلے ہو جاتے ہیں۔ زبان میٹھی بھی ہوتی ہے اور کڑوی بھی۔ کڑوی باتوں پر جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے اور میٹھی باتوں سے دوستی اور محبت قائم ہو جاتی ہے۔ کسی کی زبان سے پھول جھڑتے ہیں اور موتی رُلتے ہیں اور کسی کی زبان زہر افشانی کرتی ہے۔ کوئی ہنستوں کو رُلاتا ہے اور کوئی روتوں کو ہنسا دیتا ہے۔ غرض دنیا میں سب کرشمے زبان ہی کی بدولت ہیں

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

تلخ کر دی ہے زندگی جس نے — کتنی میٹھی زبان ہے پیارے

زبان دل کی ترجمان ہوتی ہے۔ اگر کسی کی زبان نہ کھلے تو اس کے دل کا بھید بھی نہ کھلے، کیونکہ ع
بات نکلی منہ سے اور بیگانی ہوئی۔ انسان یا تو منہ سے بولے یا سر سے کھیلے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انسان کھانے پینے کا اتنا بھوکا نہیں ہوتا جتنا کہ بات کا بھوکا ہوتا ہے۔ بقول غالب ؎

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

باتوں کا سلسلہ دراز ہے۔ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ قیامت تک چلتا رہے گا۔ ہر آن بات میں سے بات نکلتی ہی چلی جاتی ہے ؎

تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی — بات پر بات یاد آتی ہے

کسی کو بات کرنے کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا۔ خود ہی بولتا چلا جاتا ہے ؎

بات پہ واں زبان کٹتی ہے وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بعض کا حال یہ ہے کہ ۔ ع کوئی سُنے نہ سُنے ہم سنائے جاتے ہیں ۔

کوئی خود کلام ہوتے ہیں۔ وہ اپنی باتوں کا مزہ آپ ہی آپ لیا کرتے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا کہ میری نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

یہ خصوصیت عاشقوں اور مجنونوں کی ہے ۔ وہ کو بہ کو، صحرا بہ صحرا بولتے پھرتے ہیں ۔ یہی طلبا کی زندگی ہے ۔
غرض ادیب کو زبان کے ان کرشموں اور گھاتوں سے واقف ہونا پڑتا ہے ۔ ورنہ بات بنائے نہ بن سکے گی ۔ آغازِ آفرینش سے انسان نے اپنی نطق میں کمال پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جس کے نتیجے میں مختلف زبانیں ظہور پذیر ہوئیں ۔ جوں جوں انسانی آبادیاں بڑھتی گئیں اور بے شمار علاقے بنتے گئے، مختلف زبانیں اپنی اپنی آبادیوں اور علاقوں میں پیدا ہوتی گئیں، جو ان علاقوں کی معاشرتی ضروریات کو پورا کرتی تھیں ۔

زبان میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے قواعد بنائے گئے، کیونکہ اگر ہر شخص اپنی اپنی بولتا رہے تو سب کے درمیان ایک مشترک زبان نہیں رہ سکتی ۔ ہر کس و ناکس بے بس ہو جائے گا اور پھر وہی حشر ہوگا کہ ؎ زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم ۔

غرض ایک معین و مشترک زبان کے لیے آہستہ آہستہ زبان کی قواعد معرضِ وجود میں آئی بغیر کسی قواعد کے کسی زبان کا وجود بھی ناممکن ہے ۔

قواعد کے تین بڑے حصے قرار دیئے گئے یعنی جملہ انسانی آوازوں کی تین قسمیں نمایاں ہیں ۔ ایک اسماء، دوسرے افعال اور تیسرے حروف ۔ جب تک یہ تین قسمیں معین نہ ہوں، کوئی زبان متعین نہیں ہو سکتی ۔ قواعدِ زبان کا دوسرا مرحلہ ان تینوں قسم کے الفاظ کا ربطِ باہمی ہے ۔ اسماء، افعال اور حروف اپنا اپنا علاحدہ مقام رکھتے ہیں ۔ انہیں سب کے درمیان ربط قائم کرنے کے لیے قواعد منضبط ہوئے ۔ اسماء، افعال اور حروف کی تفصیلات کا علم، قواعد میں علمِ صرف کہلاتا ہے اور پھر ان سب کو مربوط کر کے خیال کی صورت پیدا کرنے کے قواعد کو علمِ نحو کہا جاتا ہے ۔

الفاظ کا تعلق صرف لغت سے ہوتا ہے جس میں الفاظ کے معنی اور ان کی تشریح درج ہوتی ہے ۔ الفاظ ہی میں روزمرہ اور محاورہ بھی داخل ہے ۔ اس کے معنی صرف اہلِ زبان متعین کرتے ہیں ۔ ورنہ الفاظ تو مختلف جگہ مختلف معنوں اور مفہوم کے تحت استعمال کیے جاتے ہیں ۔

صرف و نحو کے بعد علمِ فصاحت و بلاغت کا درجہ آتا ہے، جس میں بیان کے طریقے، تشبیہ، استعارے، رمز، اشارہ، کنایہ اور اسی قسم کے بیسیوں اصول وضع کیے گئے کہ جس کے اتباع سے انسان اپنے خیال کو سنوارتا ہے اور اپنے بیان کو حسین سے حسین تر کر سکتا ہے ۔

کسی زبان کی مکمل تحصیل کے لیے پڑھنا، لکھنا اور بولنا ضروری ہے ۔ تینوں کے علاحدہ علاحدہ طریقے اور اصول ہیں ۔ پڑھنے اور مسلسل مطالعہ کی عادت بھی ضروری ہے ۔ بغیر پڑھے ہم فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ کثیر مطالعہ انسان کو خود بخود لکھنے کی طرف مائل کر دیتا ہے ۔ کثرتِ مطالعہ خیالات کی کثرت کا باعث ہو جاتا ہے جو اپنے اظہار کے لیے تڑپ اٹھتا ہے ۔

پڑھنے، لکھنے اور بولنے میں ایک طریقہ اور فن کی ضرورت ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عیب کرنے کے لیے بھی ہنر کی ضرورت ہوتی ہے تو بے عیب ہنر کے اظہار کے لیے تو بہت بڑی ہنرمندی کی ضرورت درکار ہوتی ہے۔ غرض ادیب کو سب سے پہلے پڑھنے لکھنے اور بولنے کے طریقوں اور فن کو سیکھنا پڑتا ہے اور پھر ایک اعلیٰ مرتبے کے حصول کے لیے قواعد زبان، فصاحت و بلاغت کے اصولوں کا جاننا بھی بے حد ضروری ہے۔ بغیر ان تمام فنون کی تحصیل کے کوئی شخص ادیب بننے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ علم کی اس وسیع دنیا میں اس کو بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ ادیب بننا کھیل نہیں ہے۔ بقول داغ ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو   کہ آتی ہے اُردو زبان آتے آتے

کسی شخص کو حسن یونہی نہیں مل جاتا۔ بڑے چاؤ اور رکھ رکھاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ تب کہیں حسن حسن بن کر اپنی جلوہ نمائی کرتا ہے اور بقول کسے ؎

خدا جب حسن دیتا ہے   نزاکت آ ہی جاتی ہے

کسی چیز کا کمال ہی اس کا حسن ہے، جس میں اس کے بے شمار جلوے اپنے کرشمے دکھاتے ہیں۔ اظہارِ حسن کا خیال ایک ادیب کو گرماتا اور تڑپاتا ہے اور وہ لوح و قلم کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک جہدِ مسلسل اور سعیٔ پیہم ہی ادیب کو تخلیق کی راہ دکھاتی ہے۔

ادیب کی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے اور یہ شخصیت اس کے قول و فعل سے نمایاں ہوتی ہے۔ قول و فعل میں یکسانیت کا ہونا ضروری ہے۔ قول و فعل کا فرق اس کی شخصیت کے نقص کو نمایاں کرتا ہے۔ اگر کوئی شرابی، شراب کی برائیوں کے اظہار کے لیے اپنی ساری فصاحت و بلاغت صرف کر دے تب بھی اس کا جادو بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا کلام تاثیر سے خالی ہو جاتا ہے۔

ادیب کی شخصیت اس کے اظہارِ خیال کے طریقے، اس کے موضوعات اور اس کے عقائد کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ بعض ادیب محض افسانہ میں نمایاں ہوتے ہیں، بعض ناول نگاری میں اور بعض مضمون نگاری میں اپنی شخصیت بنا لیتے ہیں۔ اس طرح ان کا اندازِ بیان اور تصورات و عقائد متعین ہو جاتے ہیں۔ جو ادیب ہر وقت ایک نیا راگ الاپتے ہیں اور ہر آن پہلو بدلتے ہیں ان کی شخصیت متعین نہیں ہوتی۔ یہ گویا ان کے قول و فعل کا تضاد ہے۔ ادیب کے لیے خلوص کار کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچا ادیب زندگی کی خدمت کے لیے ہوتا ہے، جس کے لیے اپنے آپ کو مٹا دینا پڑتا ہے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر   نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری   وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

ادیب اپنے زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ زندگی اور ماحول کی اچھائیاں اور برائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ وہ خیر و شر کی کشمکش سے بے خبر نہیں ہوتا۔ اس کی بصیرت اُسے علم کی گہرائی تک لے جاتی ہے۔ ادیب درحقیقت نہ صرف زبان کو بناتا، سنوارتا اور اس کا درجہ بلند کرتا ہے بلکہ اپنے پڑھنے والے کی بصیرت کو بھی تیز تر کر دیتا ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن   جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا   (اقبال)

بنا کے آئینہ دیکھے ہے پہلے آئینہ گر ہنرور اپنے ہی عیب ہنر کو دیکھتے ہیں (ذوقؔ)

ادب کو دو بڑے حصّوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، نظم و نثر، پھر نظم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ مثلاً غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مخمس، مسدس وغیرہ۔ اسی طرح نثر کی بھی قسمیں ہوتی ہیں، جیسے مضمون، افسانہ، ناول وغیرہ۔ بعض ادیب ناثر ہوتے ہیں یعنی نثر میں ادب پیدا کرتے ہیں اور بعض ناظم ہوتے ہیں یعنی نظم کی قسموں میں سے کسی ایک قسم یا کئی پر قلم اٹھاتے ہیں، انہیں شاعر کہا جاتا ہے۔ شاعر ہو کہ نثر نگار، ہر قسم کے ادیبوں کی جانچ ادب کی اس قسم کے اصولوں پر ہوتی ہے، جس پر وہ لکھتا ہے۔

نثر میں لکھنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم، تدریس اور تفہیم کے لیے نظم کے مقابلے میں نثر لکھنا آسان ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان نثر ہی میں بول چال کرتا ہے۔ نظم میں شاعروں کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ عروض، بحر، ردیف، قافیہ کے علاوہ انداز بیان کی خصوصیت بھی اہم ہے۔ بقول غالب ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

بعض شعرا تشبیہ و استعارے کے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ وسیع سے وسیع خیال کو ایک یا چند مصرعوں میں ادا کرتے ہیں، گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ رمز و کنایہ بھی شعر کے حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ بعض شعرا اس فن میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض شعرا جدت طراز ہوتے ہیں۔ پرانے سے پرانے خیال کو جدید سانچوں میں ڈھال کر سننے والوں کا دل موہ لیتے ہیں۔ نئی نئی ترکیبوں اور چست بندشوں سے سو سو رنگ دکھاتے ہیں۔ بقول انیسؔ ؎

ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو ڈھنگ سے باندھوں

بعض شعرا اپنے موضوعات کے لحاظ سے بھی اپنا مقام بلند کر لیتے ہیں۔ جیسے اقبالؔ ہیں کہ انھوں نے خودی، بے خودی، مومن، تقدیر، خدا، انسان، اسلام اور اپنے دور کی سیاست کے تمام موضوعات پر قلم اٹھایا اور اپنے دور کے بڑے شاعر کہلائے۔

شعر کا سب سے اہم موضوع عشق ہے۔ فارسی اور اُردو میں عشق و محبت کی باتیں شاعری سے مخصوص کر دی گئیں۔ اگر کوئی شخص عشق و عاشقی کی باتیں نثر میں لکھنا چاہے تو یہ اس سے ممکن نہیں۔ شعر کے پیمانے میں وہ عشق کے [illegible] پر آزادی سے قلم اٹھا سکتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

تلخ سے تلخ بات بھی شعر کی صورت میں گوارا کی جاتی ہے۔ کیونکہ ؎

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

شعر کہنے کے لیے علم عروض اور علم فصاحت و بلاغت کی مکمل تحصیل ضروری ہے۔ اس غرض کے لیے ایک مدت تک محنت شاقہ اٹھانی پڑتی ہے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ شعر گوئی کے لیے ایک خاص مزاج، طبیعت اور ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ شعر کہنے کے لیے خونِ جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ ذہن رات دن خیال کی وادیوں میں گھومتا رہتا ہے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتا ہے۔ شعر میں رنگ و صوت کو بھرنا پڑتا ہے۔ شاعر

کا کام ایک مصور کی طرح نقاشی کا کام ہے ، جس کے لیے وقت ، محنت اور محویت کی ضرورت ہوتی ہے ۔

نثر کا میدان سنگلاخ نہیں ہے ۔ ہر پڑھا لکھا شخص اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ اظہار خیال کرسکتا ہے ، کیونکہ یہ کام ایسا ہی ہے جیسا کوئی کسی سے گفتگو کرے ۔ مضمون نگاری ، افسانے ، ناول اور دیگر علمی اور سائنسی تحریروں کی دنیا الگ الگ ہے ۔ ہر ایک کی تکنیک مخصوص ہے اور ہر ایک کا دائرۂ فکر جدا جدا ہے ۔

مضمون ، افسانے ، ناول اور دیگر نثری تحریروں کے لیے دل و دماغ کو ایک خاص تربیت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ ہر نثری تخلیق کے لیے پہلے ہی سے ذہن میں ایک خاص ترتیب دینی پڑتی ہے اس ذہنی تربیت کے لیے حسب ذیل طریقے اختیار کرنا ضروری ہے ۔

۱۔ کسی تحریر یا مضمون کے لکھنے سے پہلے موضوع کا مقرر کرلینا ضروری ہوتا ہے ۔ مقررہ موضوع لکھنے والے کے لیے ایک دائرہ غور و فکر معین کردیتا ہے ۔

۲۔ موضوع کے ہر پہلو پر غور کرنے کے بعد ، اُس مخصوص موضوع پر خیالات معین ہوجاتے ہیں ۔ اب لکھنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان خیالات کو نشان وار ایک کاغذ پر قلم بند کرلے ۔

۳۔ خیالات کے معین اور یکجا ایک جگہ جمع ہونے کے بعد اب یہ غور کرنا ہے کہ مضمون کس طرح شروع کیا جائے ۔ جیسا کہ کوئی اس پریشانی میں کہہ اٹھتا ہے کہ ؎

وہ سننے بیٹھے ہیں افسانۂ دل کروں میں ابتدا لیکن کہاں سے

بات کا آغاز بڑا غور طلب ہوتا ہے ۔ صرف مطلب زبان پر آنے سے پہلے کچھ پیش بندی کی جاتی ہے ۔ آغاز اچھا ہو تو انجام بھی اچھا نکلتا ہے ۔ کسی کا خیال ہے کہ ؎

مری انتہائے نگارش یہی ہے تیرے نام سے ابتدا کررہا ہوں

آغاز دلچسپ ہو تو پڑھنے والا اختتام تک پہنچنے کی جرأت کرسکتا ہے ۔ آغاز کا ایک کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر تک آسانی سے پہنچا دیتا ہے ۔ غرض اسی آغاز سے بات آگے بڑھتی چلی جاتی ہے ۔ ورنہ ؎

بڑی مشکل سے اپنا حال ان کو سنایا کچھ یہاں سے ، کچھ وہاں سے

۴۔ بات کو بڑھا کر لامتناہی کو نہیں پہنچایا جاتا ہے ۔ موضوع اور اپنے دائرۂ عمل کے لحاظ سے اپنی بات کا ایک حد اور ایک عروج معین ہوتا ہے ۔ اس کا اندازہ مضمون نگار ہی کرسکتا ہے ۔ ایک افسانے ، ناول یا ڈرامے میں یہ عروج (CLIMAX) تو آسانی سے سمجھ میں آتا ہے ۔ مضمون نگاری میں عروج خیال کے لیے بڑی ژرف نگاہی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مگر اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی بات بھی صرف بڑھا کر چھوڑی نہیں جاتی ، بہر صورت خاتمۂ کلام ضروری ہے ۔ غرض خیال کے گلدستہ عروج کے بعد زوال یعنی خاتمہ کی طرف رجوع ہوتا ، ہر بات کے پیش کرنے کے لیے ضروری ہے ۔

۵۔ مضمون کے آخر میں اس کا خاتمہ ہوتا ہے ۔ خاتمہ کے معنی موت یا سکوت نہیں ہیں ۔ بلکہ خاتمہ یعنی بات مکمل ہوتی ۔ مضمون ختم ہونے کے بعد پڑھنے والا اپنے خیال کو پھر موضوع کی طرف لے جاتا ہے ۔ آغاز اور موضوع کی طرف رجوع

ہونے کے بعد ہی پڑھنے والا کسی مضمون کے متعلق اپنی رائے قائم کرتا ہے اور اس کے اچھے یا بُرے ہونے کی تصدیق بھی کر سکتا ہے۔ ورنہ انجام یہ ہوگا کہ ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا　　جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا

۹۔ ہر تخلیق کے لیے ارادہ، قوتِ فکر، بصیرت افروزی، صداقت شعاری اور زورِ قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔ خیال جب فکر کی وادیوں سے گزر کر بصیرت کی روشنی میں پہنچتا ہے تو ارادہ بیدار ہوتا ہے اور خیال کی صورت گری کے لیے پہلے چند نقوش ابھرتے ہیں اور پھر ان میں رنگ آمیزی کی جاتی ہے۔ یہی ایک کمال کا حصول ہے کہ جو کسی مضمون نگار یا صاحبِ تصنیف کو تحصیلِ علم و علم اور اس کے اظہار کے سینکڑوں طریقوں کی طرف کشاں کشاں لے جاتی ہے۔ وہ اپنی محنتِ شاقہ اور سعیِ پیہم کے ذریعہ اس کو حاصل کرتا ہے۔ غرض ادیب اس وقت تک اپنے منتہائے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ زبان کی تحصیل کے لیے اپنا تن، من، دھن نہ لٹا دے۔ ادب کی سچی خدمت یہی ہے کہ زبان کے معیارِ اظہار کو بلند کرے۔ ادیب کے خیالات اور طرزِ بیان میں یکسانیت نہیں ہونا چاہیے، ایسے فرسودہ نگارش سے بچنا چاہیے۔ ایک ادیب تو زبان کا سودائی ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت اس کو بنانے اور سنوارنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ وہ پروانۂ زبان و علم ہوتا ہے۔ نوجوان ادیبوں سے آخری گزارش یہی ہے کہ ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے　　شمع یہ سودائی دل سوزیِ پروانہ ہے　　●●

بقیہ اردو نامہ صفحہ ۵۴ سے آگے

کی تکمیل کے لئے دیئے گئے۔ اس بار اشاعتی پروگرام کے تحت دکن کے قادر الکلام بزرگ شاعر حضرت کاظم علی باغ مرحوم کے کلام کی اشاعت کا کام شروع کر دیا گیا ہے۔

جناب خیرات ندیم اور ایک بزرگ شاعر احسان علی عرشی کے کلام کی اشاعت بھی ادبی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام عمل میں لائی جا رہی ہے۔

۳۱ رمئی کو ۲ ۱/۲ بجے سہ پہر عثمانیہ ہاسپٹل میں جوان فکر اور مقبول افسانہ نگار جناب ابراہیم شفیق کا ۴۲ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ وہ ایک ماہ سے بلڈ یوریا کے مرض میں مبتلا تھے۔ ابراہیم شفیق کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سنگلاخ میں" ایک ہوا اور چلے" کے نام سے مکتبہ شعر و حکمت کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ چند روز قبل دوسرا مجموعہ "لہولہان سورج" منظرِ عام پر آیا جس کا پیش لفظ کرشن چندر نے تحریر کیا ہے۔ مرحوم شفیق کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹے کا لڑکا ہے۔ وہ محکمہ ڈاک و تار میں ملازم تھے۔

★

غزل

فضل افضل

سوزشِ درد و الم اور بڑھاؤ لوگو
اور کچھ سنگِ گراں مجھ پہ گراؤ لوگو

جنبشِ لب کو بھی تم باعثِ الزام کہو
بات اتنی سہی! افسانہ بناؤ لوگو

دل جگر رہا مرتکبِ جستجو دعا
ہے بڑا اتنا تو اس سے نہ نبھاؤ لوگو

ایک مدت سے ہوں خود اپنے ہی زنداں کا اسیر
خوب ہوں اپنی جگہ پاس نہ آؤ لوگو

خود مرا اپنا جنوں ہے مجھے اک دستِ سوال
خندہ زن اب نہ بنو اب نہ ستاؤ لوگو

اب بھی وابستہ ہے خوابوں کے جہاں سے افضل
ہے اگر جرم تو سولی پہ چڑھاؤ لوگو

جگن ناتھ آزاد

اقبال کی وطن کو واپسی

اقبال کیمبرج سے بی۔اے کی ڈگری اور سرٹیفکیٹ آف میرٹ میونخ سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری اور لنکنز ان سے بیرسٹر ایٹ لا کی ڈگری لے کر انگلستان سے روانہ ہوئے اور ۲۷ر جولائی ۱۹۰۸ء کی شام کو لاہور پہنچے۔ اسٹیشن پر احباب اور عقیدتمندوں کے ایک جم غفیر نے آپ کا استقبال کیا۔ یہاں سے احباب انہیں بھاٹی دروازے لے گئے جہاں اُن کے اعزاز میں ایک پُرتکلف چائے کا انتظام کیا گیا۔ چائے کی اس دعوت میں اللہ یار جوگی اور غلام علی خاں غلامی خوش نویس پیسہ اخبار نے استقبالیہ نظمیں پڑھیں۔

اقبال کی لاہور کو واپسی پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے علمی اور ادبی حلقوں کے لئے ایک مژدۂ جانفزا تھی۔ اخبارات نے استقبالیہ نوٹ اور ایڈیٹوریل نوٹ لکھے اور ہر ادبی محفل اقبال کی واپسی کے ذکر سے معمور ہو گئی۔

وطن کو واپس آنے کی خوشی کسے نہیں ہوتی۔ اقبال بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھے چنانچہ خود انھوں نے اسی زمانے میں اپنی ایک غزل کے مقطعے میں کہا ہے

پھر آیا دیس میں اقبال بعد مدت کے　　پس از سہ سال ہوا گم شدہ نگیں پیدا

اقبال اُسی رات اپنے شہر سیالکوٹ روانہ ہو گئے تاکہ والدین اور گھر کے دوسرے لوگوں کے دیدار سے آنکھیں روشن کر سکیں۔ سیالکوٹ اسٹیشن پر دوسرے اعزہ کے ساتھ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد بھی موجود تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ پلیٹ فارم استقبال کرنے والوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پھولوں کے ہار اتنی کثیر تعداد میں پہنائے گئے تھے کہ علامہ کا چہرہ پھولوں میں چھپ گیا۔ علامہ کو ٹاؤن ہال میں شہریوں کی طرف سے ایک استقبالیہ بھی دیا گیا۔

اِس استقبالیہ میں اقبال کے اعزاز میں تقریریں بھی ہوئیں اور نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ یہاں اس سنجیدہ تحریر میں کسی ہنسی مذاق یا ادبی معیار سے گری ہوئی کسی بات، کی گنجائش تو نہیں لیکن یہ ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس جلسہ میں ایک صاحب نے جن کا نام تھا منشی میراں بخش اور تخلص تھا، جلوہؔ اقبال کو خوش آمدید کہتے ہوئے ایک نظم پڑھی جس کا ایک شعر یہ تھا۔

مبارک ڈاکٹر اقبال انگلستان سے آیا　　وہ پی ایچ ڈی اور ایل ایل ڈی کی ڈگری ساتھ ہے لایا

شعر جیسا ہے سو ہے لیکن اس کا ذکر کرتے ہوئے نقیر سید وحید الدین نے ایک نہایت ہی شگفتہ بات لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں "علامہ پی ایچ ڈی تو ضرور لائے تھے لیکن ایل ایل ڈی کی ڈگری جلوہ صاحب نے انھیں ضرورتِ شعری کے تحت اپنے پاس سے عطا کر دی"

اسی سلسلے میں "مخزن" میں شائع شدہ ایک نظم کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ چند مرحوم نے اقبال کو خوش آمدید کہتے

جو انہوں نے "سلام و پیام" کے نام سے کہی۔ اس نظم کے آخر میں مخروم لکھتے ہیں ؎

اک بار پھر سنا دے ہندوستاں ہمارا　اپنی زباں میں کہہ دے رازِ نہاں ہمارا
تجھے تیری جستجو میں بن بن کی خاک اُڑاتے　بادِ بہار اپنی آب رواں ہمارا
کیا حال ہے وہاں کا آتا ہے تو جہاں سے　کچھ تذکرہ سنا بھی تو نے وہاں ہمارا
ہم چل پڑے ہیں لیکن منزل ابھی ہے کوسوں　اور سخت مشکلوں میں ہے کارواں ہمارا
اقبال! دیکھ اتنا کوئی نہیں سمجھتا　مٹنے کو ہے جہاں سے نام و نشاں ہمارا
آپس کی دشمنی کے یہ دن نہیں ہیں ہرگز　پہلے ہی جب کہ دشمن ہے آسماں ہمارا
یہ وقت ہے کہ مل کر دیں سب ہو کے ہم زباں ہم　"ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا"

اقبال نے یہ نظم پڑھی تو اظہار تشکر کے طور پر مخروم کو لکھا :

" آپ کا "سلام و پیام" رسالہ مخزن میں میری نظر سے گذرا جس حسن ظن کا اظہار آپ نے ان اشعار میں کیا ہے اس کے لئے میں آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ میں آپ کی نظمیں "مخزن" میں پڑھتا رہتا ہوں ماشاءاللہ خوب طبیعت پائی ہے مجھے یقین ہے کہ بہت تھوڑے عرصے میں تمام شعر کہنے والوں میں آپ کا نمبر اول ہوگا۔

افسوس کہ میں بوجہ مصروفیت فی الحال شعر گوئی سے محروم ہوں۔ خدا آپ کی جولانئ طبع کو زیادہ کرے

والسلام ، محمد اقبال بیرسٹرایٹ لا ، لاہور　(۱۳ر جنوری ۱۹۰۹ء)

بیرسٹری اور پروفیسری

انگلستان سے واپس آکر اقبال نے بیرسٹر کے طور پر چیف کورٹ لاہور میں پریکٹس شروع کر دی۔ اس پریکٹس کی ابتداء ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے گورنمنٹ کالج میں پروفیسری حیثیت سے طلبہ کو فلسفہ پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ یہ دونوں کام انہیں اس لئے کرنے پڑے کہ جب گورنمنٹ کالج کے صدر شعبۂ فلسفہ پروفیسر جیمس کا انتقال ہوگیا تو پرنسپل رابسن نے یہ عہدہ اقبال کو پیش کیا۔ اقبال نے یہ کہکر کہ میں چیف کورٹ میں پریکٹس جاری رکھنا چاہتا ہوں، پروفیسری کی پیش کش شکریہ کے ساتھ لوٹا دی۔ اب نقشہ یہ بنا کہ پرنسپل رابسن تو یہ چاہتے تھے کہ اقبال اُن کے کالج میں صدر شعبہ فلسفہ کا عہدہ قبول کریں اور چیف کورٹ کے حکام یہ چاہتے تھے کہ اقبال چیف کورٹ ہی میں پریکٹس جاری رکھیں۔ دونوں محکموں کے درمیان اس بحث نے طول کھینچا اور نتیجتاً یہ طے پایا کہ اقبال صبح کے وقت کالج میں پروفیسری کریں اور اس کے بعد چیف کورٹ میں پریکٹس کریں۔ یہ ایک عجیب و غریب فیصلہ تھا جس کے لئے حکومت سے باقاعدہ طور پر دونوں محکموں نے اجازت لے لی چنانچہ اقبال کوئی اٹھارہ ماہ تک دونوں کام کرتے رہے۔

گورنمنٹ کالج سے استعفیٰ

لیکن وہ پروفیسری پر بیرسٹری کو ترجیح دیتے تھے کیونکہ پروفیسری ملازمت تھی اور بیرسٹری ایک آزاد پیشہ چنانچہ ایک دن انہوں نے اچھی طرح سوچ بچار کے بعد پروفیسری سے استعفیٰ دے دیا۔ استعفیٰ کے بعد جب آپ گھر واپس آئے تو گھر کے لوگوں بالخصوص علی بخش نے ... بغیر کسی سے مشورہ کئے فوراً استعفیٰ

دینے کی وجہ پوچھی۔ اقبال نے کہا کہ حکومت کی ملازمت میں رہ کے میں وہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا جو کہنا چاہتا ہوں۔ اب میں آزاد ہوگیا ہوں۔ اور جو کچھ میرے دل میں ہوگا بے دھڑک زبان پہ لے آؤں گا۔

دوسری اور تیسری شادی

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ اقبال کی پہلی شادی ناکام رہی اور اگرچہ اقبال کے بعض احباب اس کوشش میں رہے کہ پہلی بیوی کے ساتھ اقبال کے تعلقات خوشگوار ہوجائیں لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اقبال کی اس سے علیحدگی ہوگئی۔

اس کے بعد اقبال دوسری شادی کے خواہاں ہوئے۔ شیخ گلاب دین وکیل نے لاہور کے ایک کشمیری خاندان کی لڑکی تجویز کی۔ یہ لڑکی اس وقت وکٹوریہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی چنانچہ اس کے والدین کے ساتھ بات پختہ ہوگئی لیکن جب نکاح ہوچکا تو اس لڑکی کے خلاف اقبال کے پاس طرح طرح کے خطوط آنے لگے۔ اقبال بے حد پریشان ہوئے کہ ایک بیوی کے ساتھ نوبت علیحدگی تک پہنچی۔ دوسری کے خلاف طرح طرح کے خطوط آنا شروع ہوگئے چنانچہ رخصتی کا معاملہ کچھ مدت کے لئے ملتوی کردیا گیا اور اس مدت میں لڑکی کے چال چلن کے متعلق تحقیق و تفتیش شروع ہوگئی اور احباب کے مشورے پر اقبال نے تیسری شادی کی۔ یہ شادی لدھیانہ میں ہوئی جب یہ شادی ہوچکی تو لاہور والی لڑکی کے بارے میں مختلف ذرائع سے یہ اطلاعات فراہم ہوئیں کہ لڑکی کا دامن بے داغ ہے اور کسی شرارت پسند شخص نے یہ تمام الٹے سیدھے خطوط لکھوائے تھے۔

چونکہ اقبال اس لڑکی کو طلاق دینے کا ارادہ کرچکے تھے اور اگرچہ یہ شرعاً طلاق نہیں تھی لیکن اقبال کے دل میں مذہبی اعتبار سے شبہ پیدا ہوا اور اس لڑکی کے ساتھ اقبال کا دوبارہ نکاح ہوا۔ اقبال کی اس بیوی کا نام سردار بیگم تھا اور جاوید اور منیرہ اسی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

گجرات اور لدھیانہ والی بیگمات

ابھی سردار بیگم کے ساتھ اقبال کا دوبارہ نکاح نہیں ہوا تھا کہ لدھیانہ والی بیگم لاہور آگئیں اسی اثناء میں اقبال کی پہلی بیگم بھی آگئیں اور دونوں انارکلی والے مکان میں اقبال کے ساتھ رہنے لگیں۔

سردار بیگم کے ساتھ شادی نے اقبال کی زندگی کو ہر طرح اطمینان اور سکون سے لبریز کردیا شادی کے چند ہی روز بعد اقبال نے اپنے عزیز دوست مرزا جلال الدین سے کہا کہ "اب میں بالکل مطمئن ہوں اور اپنے آپ کو جنت الفردوس میں خیال کرتا ہوں"

(زیر ترتیب کتاب "حیات اقبال" کا ایک غیر مطبوعہ باب)

اختر حسن

میں نے چاہا اُسے ...

میں نے چاہا اُسے اُس کے ہر نقشِ طنّاز کو
اُس کی رعنائیِ ناز و انداز کو
اُس کی چشمِ فسوں ساز کو
اُس کی آواز کو

میں نے پوجا اُسے، اس کے اَبروئے خمدار کو
اُس کے لب ہائے گُل بیز و گلنار کو
اس کی قامت کی تلوار کو
اُس کی رفتار کو

اُس کا شاداب و سرشار پیکر لہکتا ہوا
اُس کے عارض کا کندن دمکتا ہوا
ساغرِ مئے چھلکتا ہوا
گُل مہکتا ہوا

اُس کے الطاف اس کی عنایات میرے لیے
اُس کی چشمِ مدارات میرے لیے
اُس کے دن رات میرے لیے
بات میرے لیے

زندگی روز و شب اپنے محور پہ چلتی رہی
وقت کے برف کی سِل پگھلتی رہی
پیار کی دھوپ ڈھلتی رہی
رُت بدلتی رہی

مڑ کے دیکھا تو بستی محبت کی ویران تھی
خاک کوئے تمنّا پریشان تھی
انجمن دل کی سنسان تھی
آنکھ حیران تھی

میں نے چاہا اُسے ...

رونق دکنی سیمابی

غزل

اے نشاطِ جلوۂ رنگ و بُو، میری کائناتِ نظر میں آ
نہ جنون بے خبری رہے کبھی تو حدودِ خبر میں آ
تو امینِ خیر و عمل سہی، تو بُرائیوں کا بدل سہی
تیرے حُسنِ ذات کی جانچ ہے کبھی تو بھی پیکرِ شر میں آ
یہ جبینِ شام و سحر بجی، ہے تیرے تبسم کی دھنک
تو نہ آسکے سرِ شام اگر کبھی شب کی پچھلی پہر میں آ
یہ تجلیاں ابدیہ طلعتیں، سبھی تیرے تابعِ اذن ہیں
تو سوادِ شام کا ہے امیں، تو ہی نور بن کے سحر میں آ
تو نگارشِ در و بامِ دل، تو ہے انتساب بہ نامِ دل
تو ہی بن کے قطرۂ اشکِ خوں کبھی میرے دیدۂ تر میں آ
یہ جو شہر شہر، نگر نگر، تیری رفعتوں کی ہے دھوم کیا
ہو سرِ نیاز بھی خم تیرا، کبھی سر بسجدہ تو گھر میں آ
تو ہنر ہے کھوٹے درم نہیں، تیری جیب میں کبھی عیب کے
تو متاعِ جہد طلب سہی کبھی بن کے عیب ہنر میں آ
ہیں تیرے کرم کی یہ بارشیں، جو روش روش ہیں شجر شجر
کبھی بن کے آبِ حیات بھی، رگِ برگ و رُوحِ ثمر میں آ
تیری یاد کے یہی سلسلے ہیں متاعِ رونقِ خستہ جاں
کبھی اشک بن کے سرِ مژہ، کبھی درد بن کے جگر میں آ

زینت اللہ جاوید

آل احمد سرور اور جدیدیت

آل احمد سرور اُن ناقدین میں سے ہیں جنھوں نے ادب یورپ کا مطالعہ کیا اور مغربی ادب کے مطالعات سے اُردو ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی اور جب اردو تنقید اشتراکی تنقید سے اُلجھ کر رہ گئی تو آل احمد سرور بھی زندگی بھر ادب میں سماجی و اشتراکی واقفیت کے قائل رہے۔ لیکن ان کے یہاں اشتراکی یا مارکسی نظریات سے مکمل وابستگی نہیں ملتی۔ وہ ترقی پسند اور سائنٹفک نظریات کے قائل ضرور رہے ہیں اور انھوں نے اس زمانے میں نظریے کی اہمیت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ لیکن عہد حاضر میں وہ اس نقطۂ نظر کے منکر ہو گئے اور جدیدیت کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس نظریاتی تبدیلی کو دستاویزی شکل عطا کرنے کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی میں جدیدیت پر ایک سمینار بھی منعقد کیا تھا۔ جس میں انھوں نے اپنا مضمون "جدیدیت پرستی کے مضرات" پیش کیا تھا جو جدیدیت سمجھانے کی ایک کوشش تھی۔ ویسے انھیں خود اس بات کا احساس ہے کہ ترقی پسند ادب نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک اُردو ادب کی سب سے اہم تحریکوں میں سے رہی ہے۔ جس نے جوش کے کئی ادیب اور بڑی تعداد میں اعلیٰ ادب کو جنم دیا ہے۔ ایک طرف معاشی اور سماجی نابرابری کے خلاف آواز اٹھائی ہے تو دوسری طرف تحریک آزادی میں بھی بھرپور حصہ لیا ہے لیکن " یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آج کے شعر و ادب پر مارکسزم سے زیادہ وجودیت کا اثر ہے۔ وہ [illegible] کہ مارکسزم بحیثیت آئیڈیالوجی کے اب اتنا پُراثر نہیں رہا ہے' یوں بھی انیسویں صدی کو آئیڈیالوجی کا دور کہا گیا ہے اور بیسویں صدی کو آئیڈیالوجی کی شکست کا دور" (تنقید کے بنیادی مسائل' از تنقید کے بنیادی اِشکالات [illegible]) سرور مارکسزم کو آج بحیثیت فلسفے کے اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں بیسویں صدی کو سمجھنے کے لئے حقیقت کے کھردرے اور ناہموار خطوط کا احساس ضروری ہے۔

تنقید میں سرورؔ حالیؔ سے اس قدر متاثر ہیں کہ حالیؔ کا وجود ان میں سرایت کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اردو تنقید کے دونوں جمالیاتی و سماجی اہم رجحانات حالی کی طرح سرور کے یہاں بھی ملتے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ حالی کا عہد اور ان کا فن سماجی، سیاسی، نفسیاتی اور فلسفیانہ شکست و ریخت سے مبرّا ہے اس لئے آل احمد سرور یوں بیان دیتے ہیں " مارکسزم نے ہمیں اتنا بڑا ادب نہیں دیا۔ ہاں وجودیت کے علم برداروں میں سارتر اور کامیو کی عظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ــــــ جدیدیت کا نمایاں روپ آج کی آئیڈیالوجی سے بیزاری ہے۔ "بہت سے پڑھنے والے نئی شاعری میں اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کی فضا یا مشہور اساتذہ کے اسلوب سے مناسبت ڈھونڈتے ہیں۔ اور جب یہ نہیں پاتے تو جدیدیت ہی کو کوئی مرض سمجھنے لگتے ہیں آل احمد سرور تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ اور اپنے قلب کو کشادہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں مغرب کی ترقی کا راز بھی یہی تبدیلی ہے۔ سرور مشرق سے بیزار ہیں نہ مغرب سے حذر کرتے ہیں بلکہ مغرب اور مشرق' قدیم اور جدید' روایت اور بغاوت' مواد اور ہیئت کے بارے میں اور ان کے مطالعے کے سلسلے میں وہ ہمیشہ ایک درمیانی صورت نکال لیتے ہیں۔ ان کی تنقید کم از کم

دو ادوار میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ ایک ترقی پسندانہ تحریک کے عروج کا زمانہ اور دوسرا تقریباً بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے لے کر آج تک کا زمانہ ــــــ لیکن اس مضمون میں سرور کی تنقید کے دوسرے دور پر روشنی ڈالنا مقصود ہے۔

آل احمد سرور نے اعتدال اور توازن سے کام لے کر قدیم و جدید کے درمیان ایک نئی راہ نکالی اور بہت صحیح سمجھ کر اس پر گامزن ہوتے ہیں۔ وہ ماضی سے بیزار ہیں نہ مستقبل سے غافل بلکہ ان کے نزدیک ماضی کے بغیر مستقبل کی تعمیر ممکن نہیں ہے۔ وہ اس بات کے حامی ہیں کہ اردو شاعری کو ماضی کے تمام تجربوں کو سمو کر اور سمیٹ کر حال کے رجحانات کی عکاسی کے کام میں لایا جائے۔ سرور کے یہاں اعتدال اور توازن ہے لیکن رد و قبول کے عمل کی تیزی سے ان کے اعتدال پر حرف آنے لگتا ہے۔ ان کی ترقی پسند تحریک کے زمانہ عروج کی تحریریں ادب اور سرمایہ داری تک پہنچتی ہے اور دوسرے دور کے مضامین افادیت اور مقصدیت کے بجائے کھوتے ہوتے فرد کو تلاش کرتے ہیں۔ کبھی وہ سائنٹفک اصولوں اور نظریات اور تصورات پر زور دیا کرتے تھے اور آج وہ شعر و ادب میں بعض جدید تر رجحانات کی حمایت کرنے لگے ہیں۔ کسی زمانے میں وہ سائنس اور ادب کے سمجھوتہ کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور اسی سمجھوتہ کو ادب میں نظریئے کی تلاش کا نام دیتے تھے۔ (ادب اور نظریہ ص۲۸۲) لیکن اب وہ ادب میں نظریئے اور افادیت کے مخالف ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کسی ادیب کے یہاں نظریئے کی تلاش ہرن پر گھانس لادنے کے برابر ہے۔ سرور کے دوسرے دور کے نظریات پہلے دور کے تصورات کی نفی کرتے ہیں۔ آج سرور کسی میلان کو اپنا مسلک نہیں بناتے۔ وہ جدیدیت کے قائل ہیں اور اس کی ضرورت کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ جدت پرستی انھیں پسند نہیں اُن کے خیال میں جدت پرستی ابدیت کو سمتا کرتی ہے اور نئی چیز یا لہر کی پرستش بن جاتی ہے اس لیے وہ کہتے ہیں۔ "ہمیں جدت پرستی سے پرہیز کرنا چاہیئے مگر جدیدیت کو عام کرنا چاہیئے۔ اس کے بغیر ہم مرد کو وقار، سماج کو توازن، علم کو انکسار، فکر کو نئی جرأت، فن کو نئی بصیرت نہیں دے سکتے۔ بیسویں صدی میں صدیوں کی منزلیں دہوں میں طے ہوتی ہیں اس لیے آج ہمارا کام ذہنی ابتری اور پس ماندگی کو دور کرنے کے علاوہ یورپ اور امریکہ کی جدیدیت کو اپنانا اور وہاں کی جدت پرستی سے بچنا بھی ہے" (تنقید کے بنیادی مسائل، اردو تنقید کے بنیادی افکار ص۱۵۱) سرور جدیدیت کے حامی ہیں لیکن اس کی اندھی پرستش انھیں منظور نہیں۔ وہ اس کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس کی خصوصیات متعین کرتے ہیں اور ان خصوصیات کی روشنی میں اس کی قدر و قیمت اور ضرورت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں طرفداری یا غیر جانب داری کے بجائے سخن فہمی اور سنجیدہ شعور کا پتہ ملتا ہے۔

اس دور میں ہمارے تنقیدی سرمائے پر گہرے مغربی اثرات ہوئے ہیں۔ جن میں فرانسیسی اور انگریزی نقادوں کے اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ان میں مثبت اور منفی دونوں ہیں۔ تنقید لکھتے ہوئے کسی نے بھی انگریزی ادب سے اپنا دامن نہیں بچایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے اہم تنقید نگار بنیادی طور پر انگریزی ادب کے اسکالر رہے ہیں اس لیے ان کی تنقیدوں میں بھی انگریزی تاثر حاوی ہے۔ سرور کی تنقید میں بھی اکثر انگریزی ادیبوں کے مقولے اور اشارے ملتے ہیں۔ اور اسے وہ برا بھی نہیں سمجھتے۔ غیروں کے میخانوں میں جانے سے وہ پرہیز نہیں کرتے اور نہ ہی تازہ علوم کی سرمستیوں کو گناہ سمجھتے ہیں۔ "تنقیدی اشارے" میں اپنے تعارفی مضمون میں سرور نے اس امر کا اعتراف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انگریزی جیسی زندہ شاندار اور عالمگیر میراث و روایات کی مالک زبان سے جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بے نیاز رہنا اچھا نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس کے اصول کو بھی اٹل سمجھنا یا

صرف اس کے معیار سے اپنی ہر چیز کو پسند کرنا یا ناپسند کرنا صحیح نہیں ہے۔ آج ٹی۔ ایس ایلیٹ کے حوالے تنقیدی تحریروں میں اُبھرتے ہوتے دکھائی دیتے ہیں اس کا سبب سے گہرا اثر آل احمد سرور کے یہاں بھی ملتا ہے۔ وہ اپنی بات کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے ایلیٹ کے نظریات و خیالات کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ اور یورپ کے اہل قلم کی مدد سے بات کہتے جاتے ہیں۔ مغرب سے استفادہ کرتے وقت انھوں نے مشرق سے اپنی نگاہیں نہیں چرائیں۔ نہ وہ مشرق سے دور بھاگتے ہیں نہ مغرب کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔ انھوں نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اردو ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود وہ اردو تنقید کو انگریزی کی نقالی نہیں سمجھتے۔ ان کے یہاں اقبال کی مشرقیت بھی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرور اپنی تحریر میں اقبال کے وہ اشعار پیش کرتے جاتے ہیں جن کی مدد سے انھیں اپنے مافی الضمیر کو سمجھانے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

آل احمد سرور کے ہمہ جہتی Multi Dimensional رویہ ملتا ہے۔ وہ بعض رنگوں کے مداح نظر آتے ہیں اور بعض کے مخالف بھی ۔۔۔ یوں تو وہ تجربات کے متعلق فیصلہ بھی کر دیتے ہیں مگر وہ محض یک طرفہ نہیں ہوتا۔ موجودہ زندگی سادہ نہیں پیچیدہ ہے، قدیم و جدید بالکل علٰحدہ جدا اور بے تعلق چیزیں نہیں ہیں، جدید و قدیم رجحانات ہر دور میں کش مکش اور پیکار میں مصروف نظر آتے ہیں ہم عصر زندگی کے متعلق فیصلہ تو اور بھی مشکل ہے اس کو سمجھنے کی کوشش ہی کی جاسکتی ہے اس لیے سرور لہریں گننے کی بجائے دریا کے بہاؤ پر نظر رکھتے ہیں۔ وہ تنقید کو تہذیب کی تاریخ کا ایک جز مانتے ہیں، ادب کے مخصوص دائرے اور اس کے بنیادی تقاضوں کو تسلیم کرتے ہوتے ایک ایسے جمالیات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جس میں سماجی اور اخلاقی قدروں کا احساس ہو۔ اس لئے سرور فن کی نزاکتوں پر نظر رکھتے ہیں۔ مگر ان میں اسیر ہو کر نہیں رہ جاتے۔ ان کی تنقید میں تخلیق کو اور باشعور اور تحسین کو اور باذوق بنانے کی کوشش ملتی ہے۔ وہ قدیم ادب کے قیمتی عنصر سے بھی رشتہ جوڑے رکھتے ہیں، ترسیل و ابلاغ کے مسائل پر توجہ دینا، ہنگامی واقعات کے بجائے عصری میلانات پر غور کرنا ان کا شیوا رہا ہے۔ وہ اپنے فرائض کو موجودہ میلانات کا مطالعہ کر کے تنقید کے ذریعے پورا کرتے ہیں۔ سرور ہمیں شعری سرمائے پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور اس کے رنگارنگ حسن، اس کی گہرائی اور اس کے بدلتے رہنے کے باوجود اپنے منصب سے وفادار رہنے کا احساس دلاتے ہیں۔ جو ہمیشہ مسرت بھی رہے گی اور بصیرت بھی۔ رابرٹ فراسٹ کے اس قول کو "شاعری مسرت سے شروع ہوتی ہے اور بصیرت پر ختم ہوتی ہے" سرور نے اپنایا ہے۔ اور ان کے نزدیک یہ بات شاعری کے اثر کو زیادہ خوبی سے واضح کرتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی کتاب کا نام 'مسرت سے بصیرت تک' مذکورہ قول سے اخذ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر شاعری کی مخصوص بصیرت کو تقسیم کر لیا جائے تو شاعری کو کسی پیرائے میں دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوگی۔ سرور شاعری کی بصیرت کو مانتے ہیں۔ مگر فراسٹ کی طرح اس شاعری کے قائل ہیں جو پہلے مسرت اور پھر بصیرت عطا کرتی ہے۔ محض بصیرت کی دعوت میں کشش نہیں ہوتی۔ ہاں مسرت کی تلاش عام ہے۔ جو مسرت کو بصیرت بھی عطا کر دے وہی سچا شاعر ہے۔

سرور جدیدیت کو ایک ایسے فارم کی تخلیق مانتے ہیں جو انسانی تقاضات کی نقالی نہیں کرتا بلکہ ان کی علامت ہوتا ہے اس لیے شعر و ادب میں انسان کی تنہائی، مایوسی، اس کی اعصاب زدگی، انسان کی عظمت،[5] فرد اور سماج کے رشتے، انسان دوستی کا جذبہ، امید کو لانے بیزاری کا فروغ، ہر جو اس کے نفسیات کی تحقیق، ذات کا عرفان اور اس کی موت کے تصورات جیسے مضامین کے لیے پرانی روایت کو ترک کر زبان کے رائج تصورات سے ہٹنا اور اسے نیا رنگ و آہنگ دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس کے اظہار کے لیے سرور

کے نزدیک علامتوں کا سہارا لینا بھی جائز ہے۔ وہ جدیدیت کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں اور طالب علموں کو بھی جدیدیت کے ہر پہلو کا معروضی طور پر مطالعہ کرنے کا یوں مشورہ دیتے ہیں۔ ”فیشن اور فارمولے کے چکر سے نکل کر اپنے ذہن کو جدیدیت کی روح سے آشنا کرانا چاہیئے۔ وہ از منہ وسطیٰ کے ذہن کو لے کر جدید دور کی بھول بھلیاں میں اپنا راستہ تلاش نہیں کر سکتے۔“ (نظر اور نظریئے ’ادب میں جدیدیت کا مفہوم ص۱۹۱) ـــــ ہمارے دور کے بعض پیچیدہ حقائق عوامی زبان میں ادا نہیں کئے جاسکتے اس لئے سرور کی نظر میں ان کو نظر انداز کر کے رہ جانا بھی ٹھیک نہیں۔ کسی زبان کی ترقی کا ایک راستہ نہیں ہوتا بلکہ کئی راستے ہوتے ہیں۔ سرور کے اس خیال کا عکس آپ ان کے اس شعر میں دیکھ سکتے ہیں۔

ـــہ رہ حیات بڑے پیچ و خم سے گزری ہے مگر کسی طرف کوئی سیدھا سا راستہ نہ گیا

ترقی پسند تحریک کے زمانے میں فن اور فارم کے جو تجربے ہوتے ہیں وہ بھی سرور کی نظر میں قابل قدر ہیں ـــــ ان کا خیال ہے ان تجربوں کی وجہ سے اردو شاعری کو فائدہ ہی پہنچا ہے نقصان نہیں۔ لیکن سرور یہ تجربے صرف نئے فارم ہی میں نہیں بلکہ نئے موضوعات، نئے تصورات اور نئے عنوانات میں بھی چاہتے تھے۔ دراصل یہ ان کی وسیع النظری ہے کہ ادب میں نئی قابل قدر چیز کا وہ استقبال کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب کی بعض مختلف حلقوں نے مخالفت کی تھی انھیں سرور نے برا نے خیال کا بتایا تھا جنھیں ہر نئی چیز زہر نظر آتی ہے

آل احمد سرور نے اپنی کتاب ”مسرت سے بصیرت تک“ میں ایک مضمون بعنوان ’نئی اردو شاعری‘ میں جدید شاعری کے مخالفین کی تصویر مغربی ڈرامے کے ایک سین کو نقل کر کے یوں کھینچی ہے۔ ”ایک شخص اسٹیج کے وسط میں آتا ہے اور میز سے ایک کتاب اٹھا کر بڑے غور سے اس کی جلد دیکھتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے اوراق پلٹتا ہے۔ یہ دیکھتے دیکھتے وہ سخت غصے کے عالم میں کتاب سے ورق فوراً نوچنا شروع کر دیتا ہے۔ اور پھر ان اوراق کو بار بار اپنے جوتے سے مسل دیتا ہے۔ حیران ہو کر دوسرا شخص ایک تیسرے آدمی سے پوچھتا ہے: اسے کیا ہوا؟ ـــــ تیسرا آدمی جواب دیتا ہے:

”کچھ نہیں غریب کو پڑھنا نہیں آتا اس لئے کتاب پر غصہ اتار رہا ہے ـــــ“ سرور کا مغربی ڈرامے کا یہ سین پیش کرنا خود ان کی اپنی نفسیات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں مخالفین کے یہاں جدیدیت سے جھنجلاہٹ پائی جاتی ہے وہیں سرور بھی ان سے خفا ہو جاتے ہیں تبدیلی زندگی کا قانون ہے اس لئے سرور کے نزدیک جدیدیت ایک مستقل چیز ہے۔ نئی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں آل احمد سرور نے جو رول ادا کیا ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اپنے ایک مضمون ’نئی اردو شاعری‘ کے ذریعہ انھوں نے نئی شاعری کیوں ہے؟ اور نئی شاعری کیسے۔ ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظر میں تنقید خواہ نئی شاعری کی ہو یا پرانی شاعری کی انھیں تین سوالوں کے جواب کی کوشش ہوتی ہے۔ اس مضمون کے دوران اور کئی ذیلی سوالات جو نئی شاعری کے معترضین کی طرف سے اٹھائے جاتے رہے ہیں ان کے بھی جوابات دینے کی کوشش کی ہے۔ جدید شاعری کے بارے میں ان کا یہ نظریہ ہے کہ یہ فوری اپیل کی شاعری نہیں ہے یہ غور و فکر کا تقاضہ کرتی ہے۔ یہ صرف سنانے کی چیز نہیں پڑھنے کی چیز ہے۔ نئی شاعری اپنے پڑھنے والوں سے ایک ذہنی مطالبہ کرتی ہے۔ یہ اپنے طور پر تہذیبی تنقید ہے۔ یہ عرفانِ حیات و کائنات تک پہنچاتی ہے۔

اب یہاں سرور کی تحریروں سے چند اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ تاکہ نئی شاعری کے متعلق ان کے نظریات و تصورات واضح ہو جائیں جدید ادب میں جو تنہائی ’خواہش مرگ‘ علاحدگی کے عناصر پائے جاتے ہیں اس کے بارے میں سرور کہتے ہیں۔ ”ان کے پیچھے اصل غلطی انسانی

کے ان سرپستہ رازوں کا علم ہے جس پر مذہب، سیاست، اخلاق، تہذیب کے محدود تصور نے پردے ڈال دیئے تھے۔ جدید ادب اس لحاظ سے بہلاتا، یا سُلاتا یا مست نہیں کرتا وہ آدمی کو مرد بناتا ہے اور جیسا وہ ہے اسے سمجھنے کی اس میں صلاحیت پیدا کرتا ہے" (تنقید کے بنیادی مسائل، اردو تنقید کے بنیادی افکار ص[illegible]) "ترسیل کے المیہ کے متعلق کہتے ہیں: "جدید شاعری میں تمام آدمی کے لئے جو شعر سے دل بہلانے یا مقررہ و مروجہ آداب پر چلنے کا مطالبہ کرتا ہے الجھن کا سامان ہوگا۔ ترسیل کا المیہ یہی ہے۔ شاعر اس مقام سے ہٹ گیا ہے۔ جہاں اس کا حلقہ ابھی تک ڈٹا ہوا ہے ــــ" (مسرت سے بصیرت تک، نئی اردو شاعری ص[illegible])

جدید شاعری میں یاسیت اور تنہائی کے موضوعات پر سرور کا کہنا ہے: ــــ "اس کی یاسیت ایک نئی امید کی تلاش ہے۔ اس کی تنہائی اوّل تو اپنی انفرادیت پر اصرار ہے دوسرے اپنے بندھنوں سے آزادی کا اعلان یہ پابندی Dependance کے ختم ہونے آزادی independance یعنی اپنے جذبے اپنے دل اپنے حواس اپنی نظر کے ساتھ دینے کا عہد ہے ــــ جب مشین کی گھڑگھڑاہٹ دل و دماغ کچل دے، پرانے عقیدے ساتھ نہ دیتے ہوں، جب ہر طرف رایوں، خیالوں، مذہبوں، دلوں کا نیلام ہو رہا ہو تو ایک حساس، ذہن جسے اپنی انفرادیت عزیز ہے۔ جو اپنی نظر کے ساتھ وفادار رہنا چاہتا ہے۔ تنہا محسوس نہ کرے تو کیا کرے۔" (ایضاً ص[illegible])

بعض اعتراضات کے جوابات ملاحظہ ہوں: ــــ "اس (نئی اردو شاعری) کو جب سماجی Anti Socail کہا جاتا ہے تو دراصل شکایت یہ ہوتی ہے کہ اس نے مخصوص سیاسی پارٹیوں کو کیوں نظرانداز کر دیا ہے۔ جب اسے سائنس دشمن کہا جاتا ہے تو یہ گلہ ہوتا ہے کہ یہ سائنس سے حکومتوں کا کام لینے والوں سے بیزاریت کا اظہار کیوں کرتی ہے۔ جب اسے مشکل مبہم کہا جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پیغمبری یا مقصدی لَے سے بیزار کیوں ہے۔ یا یہ رومانیت کے سحر سے آزاد کیوں ہو گئی۔" (ایضاً ص[illegible])

نئی شاعری میں جنس کے متعلق سرور یوں رقمطراز ہیں: ــــ "ہماری قدیم شاعری خاص جنس زدہ تھی۔ (اس کے ثبوت میں سرور اقبال کا یہ شعر پیش کرتے ہیں: ــــ
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس ✿ آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار
ــــ یہ ظاہر ہے یہ شعر نئی شاعری پر نہیں تھا) ہاں وہ جنسی جذبات کو ذرا خوبصورت غلاف میں پیش کرتی تھی ــــ نئی شاعری جنس زدہ نہیں ہے ہاں وہ روح کے علاوہ بدن کو مناسب اہمیت دیتی ہے اور بدن کے تقاضوں کو بیان کرنے میں زیادہ شرماتی نہیں" (ایضاً ص[illegible])

ادب میں ابلاغ کے مسئلے پر یوں روشنی ڈالتے ہیں: ــــ "ادب میں ابلاغ کا مسئلہ بالعموم اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعری اور ادب کوئی نئی کروٹ لیتا ہے۔ جب کچھ نئے تجربے اور نئے میلانات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جب ہم نئے فنی معیار اسالیب اور تکنیکوں سے روشناس ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ لوگ جو حسن کا مانوس اور محدود تصور رکھتے ہیں وہ ابتدا میں ان تجربوں، میلانات اور اسالیب کی معنویت کو سمجھ نہیں پاتے۔" (نظر اور نظریے، ادب میں ابلاغ کا مسئلہ ص۸۷)

ترقی پسند شاعری کا فرق سرور کے نزدیک صرف نیا احساس اور نیا لب و لہجہ ہی نہیں ہے۔ اور نہ ترقی پسندی اور نئی شاعری میں ازلی بیر ہے۔ خلاصہ ترقی پسند اور نئی شاعری کے ٹکرانے کا نہیں ہے بلکہ سرور کی نظر میں اقبال کے اس شعر کا ہے۔

اپنے فن میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی ✿ تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

سرور کی نظر میں حقیقی شاعری مذہبی، فلسفیانہ، متصوفانہ، سماجی، سیاسی بھی کچھ ہو سکتی ہے۔ مگر فلسفے یا نظریے یا علم کی وجہ سے نہیں نہ کسی ازم کی وجہ سے بلکہ اپنے فن میں ڈوبنے اور اپنی نظر سے وفادار رہنے اور زندگی کی پیچیدگی کو اپنی شاعری میں سمونا فن کی خصوصیت ہے۔ جدید

(بقیہ ص[illegible] پر دیکھئے)

اسلم عمادی

پہلا حرف

ابھی تو
میں نے اپنے نام کا
— پہلا حرف ہی لکھا ہے
ابھی تو —
میرا رنگ سنگِ شہرِ خواب
میں چھپا ہے
ابھی تو —
نرم نرم ہونٹ پپڑیوں کی وحشتوں سے
زخمِ نالہ ہائے دل خراش
سے ملے نہیں
ابھی تو —
چھوئی سی کٹوریوں میں شبنمی خبر ہے
صبح کی اداسیوں کی زردیاں نہیں
ابھی تو —
خواب دیکھ لیں
اپنے نام کے ہر ایک حرف کو
خوشنمائی سے لکھیں ••

رؤف خیر

سن اسٹروک
(سانیٹ)

کڑی ہے دھوپ بہت آؤ سایہ سایہ چلیں
چٹ نہ جائیں یہ جلتی ہوئی ردائیں کہیں
بدن تو یوں بھی ہیں مومی پگھل نہ جائیں کہیں
سکون محال، سفر ناگزیر کیا — نہ چلیں

یہ قہر دوپہری اور یہ ادھ کھلی آنکھیں
یہ سُرخ سُرخ بھبھوکا زرد زرد راہوں میں
جو لو چلے بھی تو اڑتی ہے گرد راہوں میں
بجھے بجھے سے یہ چہرے، ڈھلی ڈھلی آنکھیں

کرن ہے یا کوئی سورج کے ہاتھ کی تلوار
شجر حجر ہیں سبھی یوں تو سر جھکائے ہوئے
گزر ہی جائیں چلو گرد نیں بچائے ہوئے
ہر ایک سمت سے ہونے لگا مسلسل وار

خدانخواستہ زہریلی کوئی چوٹ آئے
وجود اپنا بخارات بن کے اُڑ جائے

حمید سہروردی

ایک نظم

شعلہ زن آرزو
تپاں تپاں
گرم گرم
یخ بستہ ہواؤ، تم
لاؤ اپنے دوش پر
بھینی بھینی
دھیمی دھیمی
خوشبوؤں کے راز کو
فاصلے
گشت و انجماد کے
طے کرو
ایک ہی جست میں

مجید بیدار

وجد کی شاعری میں تمدنیات

عہدِ گذشتہ کے واقعات اور حالات کا جائزہ "تاریخ" کہلاتا ہے ۔ اور جس تخلیق میں تاریخ و تمدن کے آثار و قرائن کی تصویر کشی کی جائے وہ تاریخی تخلیق کہلانے کی مستحق ہے ۔ اردو شاعری میں قدیم مثنویاں اور قصائد کسی حد تک تاریخیت کو پیش کرنے میں کامیاب رہے لیکن ان میں تمدنیات کا عنصر کمیاب ہے اور تاریخی منظر و تہذیبی ادراک کی نشانیاں ان میں مفقود ہیں ــــ سکندر علی وجد اردو کے پہلے ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے اردو شاعری میں تاریخی شان و شوکت، تہذیبی برتری اور تمدنی جھلکیوں کو پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ۔ چنانچہ ان کی نظمیں "اجنتا" "جامعہ عثمانیہ کے مزدوروں سے خطاب" "ایلورہ" "حیدرآباد" "نذرِ وطن" اور "اورنگ آباد" وغیرہ اردو شاعری میں تمدنیات کی بنیاد رکھتے ہیں ۔

بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے اردو شاعری میں جدید تجربے ہونے لگے ۔ حالی نے "نیچرل شاعری" کی بنا رکھی ۔ اقبال نے "فلسفیانہ شاعری" کے ذریعہ غزل و نظم کے فرق کو مٹانے کی کوشش کی ۔ فیض نے قوم و ملک کے مسائل پر اشارتی انداز میں "علامتی شاعری" کے لئے راہ ہموار کی ۔ جوش نے شاعری میں "شبابیات" کو فروغ دیا ۔ مجاز کی نظموں سے اردو شاعری میں "رومانیات" کا دور دورہ ہوا ۔ اور فانی نے یاسیت کا پرچار کر کے اردو شاعری میں حزن و یاس کو جگہ دی ۔ لیکن ان تمام سے منفرد خصوصیات کو وجد نے اپنایا اور اردو شاعری کو تمدنیات کا اہل بنا کر اس میں ہندوستانی تمدن کا پرچار کیا ۔

تمدنیات ایسا طریقۂ ادب جس میں کسی تخلیق کو پیش کرتے ہوئے انسانی تہذیب و تمدن اور ثقافت کا جائزہ، تاریخ اور عہد کے جھروکوں سے لیا جاتا ہے ۔ اور مرحوم قوموں کے باقی آثار کو شاعری کا موضوع بنایا جاتا ہے ۔ یعنی کسی ادب میں آثارِ قدیمہ کی جھلکیاں، تاریخی شواہد، تمدنی عناصر اور ثقافتی ادراک شامل ہو جائیں اور اس میں تاریخ کے کسی گوشہ کی نمائندگی ہو جائے تو یہ شعری اصناف میں "تمدنیات" کا علمبردار ادب کہلائے گا ۔

اردو شاعری میں تمدنیات کی ابتدائی جھلکیاں مولانا حالی کی "مسدسِ حالی" میں ملتی ہیں ۔ انہوں نے اس کتاب میں مسلمانوں کی تہذیب کے الٹ پھیر کا جائزہ لیا ہے اسی لئے اس کتاب کو "مد و جزرِ اسلام" بھی کہا جاتا ہے ۔ لیکن حالی کی شاعری میں تمدن کی یادگاروں کا ذکر نہیں ہے یعنی وہ "مسدسِ حالی" میں صرف مسلمانوں کی تہذیب کے تابناک اور تاریک دور کا جائزہ لیتے ہیں جو تاریخیت کی جانب اشارہ کرتا ہے لیکن وہ مسلم تمدن اور مسلمانوں کی یادگاروں کے ذکر سے گریز کرتے ہیں چنانچہ ان کی شاعری میں کہیں بھی آثارِ قوم پر نظمیں نہیں ملتیں ۔ علامہ اقبال نے مسجد قرطبہ پر نظم "مسجد قرطبہ" تحریر کی ۔ لیکن اقبال بھی تمدنیات کو پیش کرنے میں ثابت قدم نظر نہیں آتے اگرچہ انہوں نے اس نظم کو "مسلم کلچر" کا نمونہ بنانے کی کوشش کی ہے ۔ لیکن تہذیب و تمدن کے فرق کو پہچانے

ہیں ان کا احساس جاتا رہا ہے۔ ان کے بالمقابل سکندر علی وجد اپنی شاعری میں تمدن کی نمائندگی پر زور دیتے ہیں۔ جو تہذیب پر ہر لحاظ سے اولیت و افضلیت رکھتا ہے۔ وجد اردو کے منفرد شاعر ہیں، جنھوں نے "آثارِ قوم" اور "تمدنِ گذشتہ" کی پیشکش کے لئے شاعری کو آلۂ کار بنا دیا جس سے شاعری "مقصدی" اصولوں پر کاربند ہو گئی۔ تمدنِ گذشتہ کی اردو شاعری میں بہترین عکاسی کرنے کا فرق وجد ہی کو حاصل ہے۔

تمدنیات کے لوازمات: ادب میں تمدنیات کو فروغ دینے کے لئے چار اصولوں کی پابندی ضروری ہے، یعنی ایسا ادب جو تمدنیات کی عکاسی کرتا ہو اس پر لازم ہے کہ وہ ان ضرورتوں کی نمائندگی کرے۔ تاریخی یادگاریں، تمدنی اشارے، ثقافتی جھلکیاں، فکری ادراک۔

وجد اردو کے پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں تاریخی یادگاروں پر تحریر کردہ نظموں میں ان چار ضرورتوں کی نمائندگی ملتی ہے۔
تاریخی یادگاروں کا مفہوم تمدنیات میں اس طرح لیا جاتا ہے کہ کسی تاریخ کی یادگاروں کو اشعار کا لب لباب دیا جائے، لیکن خصوصیت یہ رہے کہ ادب دستاویز کی شکل نہ بن جائے۔ تاریخی یادگاروں اور قوموں کے آثار پر ایسی نظمیں لکھنا جو ان کی یاد کو تازہ کرتی ہوں ان کا شمار اس زمرہ میں ہوتا ہے یعنی تاریخی یادگاروں میں ادب کو تاریخ پارہ کی خصوصیت بخشی جاتی ہے۔

تمدنی اشاروں سے مراد عہدِ گذشتہ کی اقوام اور ان کے تمدن کا ادب میں ذکر کرنا اس زمرہ کی تعریف کے مماثل ہے۔ اسی طرح گذری ہوئی قوم کی یادگاروں کے ساتھ ان کی ثقافت اور ان کی فکر کو بھی شامل کر دیا جائے تو وہ ادب تمدنیات کا عکاس کہلائے گا۔

تمدنیات کے مفہوم کو سمجھنے کے لئے تہذیب و تمدن کے درمیان روا رہنے والے امتیاز کے بارے میں بھی جاننا ضروری ہے۔ تہذیب سے مراد انسان کی طبعی ترقی ہے، یعنی کوئی قوم رہن سہن، رکھ رکھاؤ اور برتاؤ کے معاملہ میں ترقی کرے تو اسے مہذب قوم کے لقب سے نوازا جاتا ہے۔ اور اگر کسی قوم میں فکری و ذہنی ارتقا رہا ہو تعلیم و تربیت، اخلاق و شعور کو بلند کرنے کی جانب راغب ہو تو اسے متمدن قوم کہا جاتا ہے۔ تہذیب اور تمدن کے اس باریک بین تصور کی وضاحت سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ تمدنیات کا شعبہ ادب میں کن معاملات کی نمائندگی کرتا ہے، اس لحاظ سے فنونِ لطیفہ کا ربط بھی تمدنیات سے ہوتا ہے۔

وجد نے اردو شاعری کو تہذیب کی گہرائیوں سے نکال کر تمدن کے وسیع میدان میں لا کھڑا کیا۔ اور ان لوازمات کی پوری طرح پابجائی کی جو تمدنیات کے لئے ضروری تصور کئے جاتے ہیں، چنانچہ وہ اپنی نظم "نذرِ وطن" میں تاریخی یادوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

کہیں جواب نہیں تیرے کوہساروں کا ۔۔۔ سماں عجیب ہے گنگ و جمن کے دھاروں کا
مثالِ قوسِ قزح رنگ کشت زاروں کا ۔۔۔ فضا میں عطر ہے تہذیب کی بہاروں کا
زمانہ تیرے فسانے بھلا نہیں سکتا
نقوشِ تاج و اجنتا مٹا نہیں سکتا

اسی طرح وجد تمدنیات کے ابتدائی عنصر تاریخی یادگاروں کی پابجائی اپنی نظم "اورنگ آباد" میں کچھ اس انداز سے کرتے ہیں ؎

ترے دامن میں عالمگیر سا مٹی نیند سوتا ہے ۔۔۔ جلالِ قطب شاہی اپنی بربادی پہ روتا ہے
حصاروں میں ترے نکلا تبسم سی بہمنی کا ۔۔۔ ترے ہی مشرق سے پہلا آفتاب آصفی چمکا

ولی کے نغمۂ جانسوز گونجے تیری محفل میں سراجِ بزمِ عرفاں سے اجالا ہے ترے دل میں

ترے ہی ساز پر میں نے سنے نغمے جوانی کے

ترے ماحول میں سیکھے ہیں گُر جادو بیانی کے

ان دو نظموں کے اشعار میں وجد نے ہندوستانی تاریخ اور اس کی یادگاروں کی طرف کشادہ دلی سے اشارے کئے ہیں اور ہر ایک کی تاریخی اہمیت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ ان کی فنائیت ناممکن ہے۔ تاریخی آثار کی اس شہادت کے بعد وجد اپنی نظم "حیدرآباد" میں تمدنی اشاروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ حیدرآباد کے اچھوتے تمدن کے بارے میں رقم طراز ہیں ؎

نفاست برستی ہے دیوار و در سے تری خاک میں نکہتِ یاسمیں ہے

بہت خوشنما شہر دیکھے ہیں میں نے مگر تیرا جادو کہیں بھی نہیں ہے

اجنتا کے شاہکاروں کو دیکھ کر وجد بے خود سے ہو جاتے ہیں اور زبانِ قلم کو تمدن کی عکاسی کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ مدیہ کلام کے شعر کے روپ میں ڈھلنے والے تخیلات پر بھی تمدن کی چھاپ نظر آتی ہے، جیسے وہ لکھتے ہیں:

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے تراشہ دل میں ہو جائے یہ وہ کافر نظر دی ہے

اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے

یہ تصویریں بظاہر ساکت و خاموش رہتی ہیں

مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کی بات کہتی ہیں

تمدن اور ثقافت کو وجد نے فکری ادراک سے اس طرح ملوث کیا ہے کہ بے ساختہ طبیعت محوِ مطالعہ ہو جانے پر اکسانے لگتی ہے۔ وہ ہزاروں پیامات عہدِ گذشتہ کے تمدن و ثقافت کے بارے میں اجنتا کے تراشیدہ بتوں کی خاموشی سے اخذ کر لیتے ہیں اور اور ان کے مہر بہ لب ہونے کو ایک راز تصور کرتے ہوئے ہنرمندوں کے کام کی داد دیتے ہیں، جن سے تمدنی اشاروں کی جانب نمائندگی ہوتی ہے۔ اسی طرح قدیم ثقافت کی جھلک کو وجد نے نظم "ایلورہ" میں اس طرح پیش کیا ہے۔

نگار خانۂ عالم کا عکس یہ وادی ہزار حشر بداماں خموش یہ وادی

ہنروروں کو تھی حرفِ ہنر کی آزادی یہاں نہیں ہے کوئی نقش "نقشِ فریادی"

غلام مرضی، حالاتِ حسن کار نہیں

کمالِ فکر کے شہکار اشتہار نہیں

اسی نظم کے ایک شعر میں وہ ہندوستانی ثقافت اور قدیم دور سے ہی ہندوستان میں آزاد ماحول ہونے کا ذکر کرتے ہیں ؎

کمندِ گردشِ ایام کے اسیر نہیں نقوشِ دستِ عقیدت فنا پذیر نہیں

اس شعر میں ہندوستان کی قدیم ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ جو وجد کی شاعری کی نمایاں خصوصیت ہے اور یہی خصوصیت وجد کے تمدنیات پسند شاعر ہونے کی دلیل ہے۔ اسی طرح متعدد نظموں کے اشعار میں وجد نے تمدنیات کے عوامل کو شاملِ شاعری کیا ہے۔ اور خود کو ایک تمدنیات کا علمبردار شاعر ثابت کیا ہے۔

تہذیب پسندی سے انسان میں اپنے وطن، ثقافتی ورثہ اور تمدنی جواہر سے عشق و محبت کے لئے راہ ہموار ہوتی ہے، اور انسان اپنے ملک، قوم، وطن اور وطن کی ہر ہر چیز سے بے ساختہ عشق کرنے کا اہل قرار پاتا ہے، جس کی وجہ سے ترقی ملک عین ممکن ہے۔ کیونکہ کسی چیز سے محبت ہی ترقی کے مدارج طے کرانے کی ضامن ہوتی ہے۔

وجد نے اپنی شاعری کو تمدنیات سے وابستہ کرکے ملک و قوم کی ایک عظیم خدمت کی ہے اور اہلِ دنیا کے لئے ایک ایسا سرمایہ فراہم کیا ہے کہ جس کی بدولت ملک و قوم سے غداری کا قلع قمع ممکن ہے، تمدنیات کی علمبرداری کرنے والا ادب لازمی طور پر دوامی ادب کے صیغہ میں آتا ہے۔ یعنی ایسی قومی یادگاریں جو آثار کی شکل میں سابقہ قوم نے ہمیں امانت دی ہے، ان کی حفاظت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہ آثار مٹائے نہیں جا سکتے۔ اسی کے لئے یہ بھی لازمی امر ہے کہ ان یادگاروں پر تخلیق کردہ ادب بھی نہ مٹایا جا سکے۔ کیونکہ تمدن کی یادگاروں کو صدیوں بعد بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ اس لحاظ سے وجد کی شاعری اور نظمیں اس وقت تک اپنی بازگشت سناتی رہیں گی، جب تک کہ انسانی تمدن قائم رہے گا۔ اسی تمدن کے ساتھ وجد انسان کو فکر و جستجو کی دعوت بھی دیتے ہیں، جو ان کی نظموں کا فکری ادراک کہلاتا ہے۔ ان کی ہر نظم ایک عظیم فکر کی نمائندگی کرتی ہے اور ہر قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہے۔ "اجنتا" اور "ایلورہ" نظموں میں وہ فکری ادراک کو اس طرح برقرار رکھتے ہیں ؎

زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

نگاہ ڈھونڈ رہی ہے نشاں نہیں ملتا غبار سامنے ہے، کارواں نہیں ملتا

جھکایا سر نہ اپنا شہرت و انعام کی خاطر جیئے بھی کام کی خاطر، مرے بھی کام کی خاطر

ایسے ہی متعدد اشعار ہیں جن میں ان کی فکری ادراک پوشیدہ ہے۔ جو بار بار انسانی ذہن کو جگاتا رہتا ہے، کہ وہ اسلاف کے آثار و کارناموں سے درس حاصل کریں، اور ملک و قوم کے مستقبل کو تابناک بنانے میں بے تکان محنت کریں۔ ان چند خصوصیات کے ساتھ وجد اپنی شاعری میں تمدنیات کی بنیاد رکھتے ہیں لیکن ان کی تمدنیات کسی عہد و قوم کی دستاویز نہیں کیونکہ یہ خالص آثار و یادگاروں کی نمائندہ صنفِ ادب ہے۔ اسی لئے اسے دستاویز نہیں کہا جا سکتا بلکہ تمدنیات کو ادب کا ایک ایسا مقصدی اظہار کہا جا سکتا ہے جو اسلاف کے آثار کا تذکرہ کرکے قوم میں سچی لگن سے کام و جستجو کا جذبہ اور ولولہ پیدا کرتا ہے اور وجد اسی مقصد کی نمائندگی کرتے ہیں جو اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے اور اسی کی بدولت وہ دورِ جدید کے شعراء کی صف میں اوّل اوّل نظر آتے ہیں۔

"کچھ دکنی کلام" صفحہ ۱۴ سے آگے

حل کر رہا تھا، وقت ختم ہوگیا گھنٹی بجی اور نگران کار نے پرچہ چھین لیا۔

مجھ نے مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ مل سکا، یہ کتب خانہ مختاریہ (سالار جنگ) میں ہے۔ کوئی اور نسخہ نہ ہونے کی وجہ سے دو تین الفاظ کی تصحیح نہیں ہو سکی۔ ایسے الفاظ کے محاذی مرتب کی دانست میں جو الفاظ نامانوس معلوم ہوتے صرف انہیں کے معنی کی وضاحت کی گئی ہے ۵۵

نوائے ادب بمبئی

جس طرف آنکھ اٹھے درد کا پہرا دیکھوں
غم کے بادل کو بہر کیف گھنیرا دیکھوں

کیسی بستی ہے کہ ہر اک بشر دوہرا ہے
ہو بڑی بات جو اک فرد اکہرا دیکھوں

باوجود اسکے کہ ہر خواب بکھر جاتا ہے
میں تو ہر روز ہی اک خواب سنہرا دیکھوں

تم جو یاد آؤ تو ایسے بھی مناظر ابھریں
میں جہاں وقت بھی کچھ دیر کو ٹھہرا دیکھوں

شاہراہوں کو کشادہ تو کیا ہے پھر بھی
حادثوں کا میں ہر اک موڑ پہ خطرہ دیکھوں

ڈاکٹر احسن رضوی

شمار اس کا تو احباب معتبر میں نہ تھا
وہ ڈوبتا سا جزیرہ تھا بحر و بر میں نہ تھا

وہ آرزوؤں کے ملبے میں دب گیا ہو کہیں
سراغ اس کا تو سیلاب چشم تر میں نہ تھا

یہ اور بات کہ مقصود امتحاں تھا مرا
وگرنہ دانۂ گندم تو ہر شجر میں نہ تھا

دھواں دھواں ہی سہی میں بھی اک حقیقت تھی
بتا کہ کب میں ترے درد کے نگر میں نہ تھا

میں اپنے آپ سے خائف تھا یہ تو سچ ہے مگر
یہ جھوٹ ہے کہ میں حالات پر خطر میں نہ تھا

ہر ایک سمت ہے تو ہی نگراں تو ہی بصیر
مرا ہی حال ترے حیطۂ نظر میں نہ تھا

مری وفا کو خطاؤں کا آئینہ نہ دکھا
غلط کہ میرا چلن فطرت بشر میں نہ تھا

ہمارے نام پہ سرشار حشر کیوں ہے بپا
ہمارا نام تو احباب فتنہ گر میں نہ تھا

قطب سرشار

جن کو ہونا بھی نہیں آتا انہیں ہم کیا کریں
ڈوبتی نبضوں کو آخر کب تلک دیکھا کریں

ہے انا اک سمت میں جبر مشیت اک طرف
اے غم دل یہ بتا ہم کس سے سمجھوتا کریں

اک اجالا سا نظر آتا ہے بام دار پر
صبح کی آمد ہے شاید آؤ سر اونچا کریں

ہر گلی میں شہر کی پتھراؤ ہی پتھراؤ ہے
وہ ابھی تک آئینے کے سامنے ہیں کیا کریں

لغزش پائے سفر سے راستے ہی گم ہوئے
روشنی کا غم بھلا اس تیرگی میں کیا کریں

کون قاتل ہے جمالی اور مسیحا کون ہے
کس کو درد دل سنائیں اور کسے رسوا کریں

عبدالحکیم جمالی

آر۔ عبدالحمید

تذکروں کی تنقیدی اہمیت

ادبی سرمایہ میں تذکروں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ تذکرہ نگاری سے پہلے بیاض نویسی کا رواج تھا۔ لوگ شعراء کے بارے میں کچھ یادداشت نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ انہیں بیاضوں پر تذکرہ نگاری کی بنیاد پڑی۔ یہ تذکرے پہلے فارسی میں لکھے جاتے تھے۔ فارسی کا پہلا تذکرہ "لباب الالباب" ہے جسے ۶۱۸ھ (۱۲۲۱ء) میں محمد عوفی نے ترتیب دیا۔ بعد میں فارسی اور اردو کے شعراء کے تذکرے عام طور پر اسی نہج پر لکھے گئے۔

"تذکروں میں تنقید" کے مسئلے پر غور کرتے وقت سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ تذکرہ ہے کیا؟ اور یہ لکھے کیوں گئے؟ فارسی کے مشہور مقولہ کے پیش نظر کہ "تصنیف را مصنف نکو گوید" اس سوال کا جواب اگر تذکروں کے اوراق میں ڈھونڈا جائے تو شاید بے محل نہ ہوگا

میر تقی میر کو ہماری اردو تذکرہ نگاری کا کاروان سالار کہا جاتا ہے، ان کا تذکرہ "نکات الشعراء" اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ جو ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ء) میں لکھا گیا۔ اس سے قبل "تذکرۂ امام الدین" تذکرۂ خان آرزو، اور تذکرۂ سودا لکھے جانے کا ذکر ملتا ہے چونکہ یہ تذکرے دستیاب نہیں ہوئے اس لئے اوّلیت کا شرف "نکات الشعراء" کو ہی حاصل ہے۔ "نکات الشعراء" کے ساتھ ہی اس زمانے میں دو اور تذکرے "گلشن گفتار" ۱۱۶۵ھ حمید اورنگ آبادی اور "تحفۃ الشعراء" ۱۱۶۵ھ افضل بیگ قاقشال لکھے گئے۔ لیکن یہ تذکرے دکن سے متعلق تھے۔ "نکات الشعراء" کے بعد بہت سے تذکرے لکھے گئے جن میں بیشتر کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

میر تقی میر نے اپنے تذکرے "نکات الشعراء" کے دیباچہ میں وجہ تالیف صرف یہ بتلائی ہے کہ ان کے پیش نظر "احوال شعرائے ریختہ مرتب کرنا تھا۔ تاکہ ریختی گو شعراء کے نام صفحۂ روزگار پر باقی رہ سکیں۔ میر نے لفظ "احوال" کی کوئی تشریح بھی نہیں کی ہے جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ ان کے ذہن میں احوال کی وسعت و گیرائی کا کیا تصور تھا۔ ان کے اس مجمل بیان سے ہم کو اس کا بھی سراغ نہیں ملتا کہ شاعر کی زندگی یا اس کے حالات کے علاوہ اس کے ماحول کا ذکر اور اس کے کلام کی تنقید کو بھی وہ احوال کا جز سمجھتے تھے یا نہیں؟

"نکات الشعراء" کے بعد اہم تذکرہ فتح علی گردیزی کا "تذکرۂ ریختہ گویاں" ۱۱۶۶ھ ہے۔ گردیزی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے میر کے نکات الشعراء کے جواب میں اپنا تذکرہ مرتب کیا تھا۔ اس نے اپنی تالیفات کے تین محرکات گنائے ہیں؟

۱۔ سابقہ تذکرہ نگاروں نے "خوردہ گیری ہمسراں وستم ظریفی با معاصراں" کا ارتکاب کیا ہے۔
۲۔ نازک خیالاتِ رنگیں نگار کو قلم انداز کیا ہے۔
۳۔ سابقہ تذکرہ نگاروں نے "اخبار و احوال" شعراء میں صریح غلطیاں کی ہیں۔ اور اس باب میں ان سے خطاہائے نمایاں سرزد ہوئی ہیں۔

گردیزی کے بیان کے مطابق تذکرہ نگاروں کی مندرجہ بالا ارادی غلطیوں کو دیکھ کر اس کے جی میں آئی کہ "بے دریدگی ازروے انصاف" ایک ایسا تذکرہ مرتب کیا جائے جس میں نہ تو منہ دیکھا پن ہو اور نہ انصاف کا دامن ہاتھ سے جانے دیا جائے۔

گردیزی کے اس دعوی نیز اس کے پہلے اعتراض "خوردہ گیری ہمسراں" سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں نے کسی نہ کسی شکل میں یا کسی نہ کسی حد تک تنقید کو بھی احوال کا جزو ضرور سمجھا تھا۔[1]

قائم چاندپوری نے ۱۱۶۸ھ میں "مخزنِ نکات" لکھا۔ انہوں نے شاعروں کے پہلی بار تین دور قائم کئے۔ متقدمین، متوسطین، اور متاخرین۔

غنایت اللہ فتوت نے "تذکرہ ریاض حسنی" لکھا۔

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے ۱۱۷۵ھ میں "چمنستان الشعراء" لکھا۔

قدرت اللہ صدیقی شوق سنبھلی نے ۱۱۸۸ھ میں "طبقات الشعرائے اردو" قلم بند کیا۔

میر حسن نے اہم تذکرہ ۱۱۹۲ھ میں "تذکرہ شعرائے اردو" ترتیب دیا۔

مردان علی خاں مبتلا لکھنوی نے "گلشنِ سخن" تذکرہ ۱۱۹۴ھ میں لکھا۔

۱۱۹۸ھ میں علی ابراہیم خاں خلیل نے "گلزارِ ابراہیم" کے نام سے مرتب کیا۔

اس کے بعد مصحفی نے تین نہایت اہم تذکرے لکھے۔

۱۔ عقد ثریا ۱۱۹۹ھ، ۲۔ تذکرۂ ہندی ۱۲۰۹ھ، ۳۔ ریاض الفصحا ۱۲۳۶ھ

یہ تمام تذکرے فارسی میں تھے مگر مرزا علی لطف نے ۱۲۱۵ھ میں ایک تذکرہ اردو میں لکھا جس کا نام "گلشنِ ہند" رکھا۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا تذکرہ "گلشنِ بے خار" ۱۲۵۰ھ ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کا ذکر بھی ضروری ہے کہ اس نے تاریخ ادب ہندی مرتب کی۔ اور دوسرے تذکرے، "گلدستۂ نازنیناں" مولف سراج الدین، ۱۲۶۲ھ، "خوش معرکۂ زیبا" مولف سعادت خاں ناصر ۱۲۶۲ھ (ضخیم تذکرہ)۔ "سراپا سخن" مولف سید محسن علی محسن ۱۲۶۹ھ، "خم خانۂ جاوید" اہم تذکرہ ہے جسے لالہ سری رام نے ترتیب دیا ہے اور یہ چار جلدوں میں شائع ہوا۔ "تذکرۂ محبوب الزمن" (۱۹۱۲ء) میں محمد عبدالجبار خاں نے شعرائے دکن کا ذکر کیا۔ "تذکرۃ الخواتین" خواتین شعراء کا تذکرہ، عبدالباری آسی نے ۱۹۴۶ء میں ترتیب دیا۔

میر گردیزی سے لے کر شیفتہ و باطن بلکہ لالہ سری رام تک سب ہی اپنی اپنی زبان میں تذکرہ نگاری کے بارے میں وہی باتیں دہراتے ہیں۔ جو میر گردیزی نے کہی تھیں۔ ان میں سے کسی نے بھی نہ تو تذکرے کی واضح تعریف یا غیر واضح تعریف ہی

---

[1] "جدید اردو تنقید" اصول و نظریات، ڈاکٹر شارب ردولوی

کی ہے اور نہ تذکرہ نگار کے منصب یا اس کے فرائض کے حدود ہی کا تعین ضروری سمجھا ہے۔ اس باب میں تذکروں کا بھی یہی حال ہے جن کو اردو تذکرہ نگاری کا پیش رو کہا جاتا ہے۔

مشرق سے مایوس ہو کر جب ہم مغرب کا رُخ کرتے ہیں جہاں علم و ادب کی دیگر اصناف کی طرح تذکرہ نگاری نے بھی غیر معمولی ترقی کی ہے تو ہمیں اور زیادہ مایوسی ہوتی ہے۔ BIOGRAPHICAL DICTIONARY جو تذکرہ نگاری کا دوسرا نام ہے، مغرب میں اس کا تعلق علم کتب LIBRARY SCIENCE سے ہے۔

شعرائے اردو کا پہلا تذکرہ کس نے لکھا اور کب لکھا؛ ہماری ادبی تاریخیں اب تک اس کا کوئی قطعی جواب نہیں دے سکی ہیں۔

موجودہ معلومات کے مطابق ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱ - ۵۲ء) کا سال ہماری ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اسی سال شعرائے اردو کے ایک دو نہیں بلکہ تین تذکرے "نکات الشعراء" (میر تقی میر) "گلشن گفتار" (خواجہ حمید اورنگ آبادی)، "تحفۃ الشعراء" (افضل بیگ قاقشال) لکھے گئے۔ یہ تمام تذکرے ایک ہی طرح کے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں معمولی اختلاف تو ضرور نظر آتا ہے، لیکن وہ اختلاف اصولی نہیں ہے۔ بعض تذکروں میں تنقیدی شعور بھی نظر آتا ہے۔ لیکن عام طور پر تذکرے عملی تنقید کی بلندی کو نہیں پہونچتے۔ ذوق اور وجدان ہی ان کا رہنما ہوتا ہے۔ اچھے اور بُرے کے امتیاز کے لئے ان کے انداز کو تنقیدی شعور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ گردیزی اور میر حسن کے تذکروں میں یہ شعور نمایاں طور پر ملتا ہے۔ مصحفی اور قائم کے یہاں بھی روایتی انداز میں بعض تنقیدی اشارے مل جاتے ہیں۔ ان تذکروں کا مطالعہ اس لئے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ ان کے ذریعہ اردو تنقید کے ارتقا کی رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا خیال ہے کہ " ان کے اندر سختی سے کسی ایسی چیز کی تلاش کرنا جو ادبی فنی یا تنقیدی نقطۂ نظر سے مکمل ہو، مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ انفرادی اور شخصی حیثیت کے حامل ہونے کے باوجود کس حد تک ان میں غیر شعوری طور پر وہ عناصر پیدا ہو گئے ہیں، جن کو ادبی، فنی یا تنقیدی اہمیت حاصل ہے "۔

اس میں شک نہیں کہ کسی بھی تذکرہ کو تنقید کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس عہد کی تنقید کا ہلکا سا خاکہ اس میں نظر آجاتا ہے۔ بعض تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ تذکرے بیکار ہیں۔ لیکن نہ تو وہ فضول اور سوختنی ہیں اور نہ ہی تنقید کا بہت بڑا کارنامہ۔ ہمارے لئے ان کی ایک خاص تاریخی، ادبی اور تنقیدی اہمیت ہے۔ جس کی بنا پر ان کا نظر انداز کر دینا ممکن نہیں۔

میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" اپنی رایوں اور نکتہ چینیوں کی وجہ سے اپنے عہد میں اور اس کے بعد بھی سب سے زیادہ زیر بحث رہا ہے، کسی کو میر کی بد دماغی پر اعتراض ہے، کسی کو ان کے لہجے کے اختصار اور انداز بیان پر۔ سید محمد عبداللہ نے ان اعتراضات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ "میر صاحب کا تذکرہ (۱) اصلاح سخن (۲) تنقید کلام (۳) تصور سیرت کے لئے ممتاز ہے۔ مگر میر معترضین ان کی بے لاگ تنقید کو تنقیص قرار دیتے ہیں۔ اور اصلاح سخن کو خردہ گیری اور عیب چینی سمجھتے ہیں"۔

میر کے پہلے معترضین میں فتح حسینی گردیزی کا نام آتا ہے، جنھوں نے تذکرۂ میر کی مخالفت میں یا جواب میں ایک تذکرہ "تذکرۂ ریختہ گویاں" کے نام سے لکھا، اس کی تمہید میں انہوں نے میر کے انداز بیان اور طرز تنقید پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور

اس کے لکھے جانے کا سبب "خردہ گیری ہمسراں وستم ظریفی با معاصراں است" لکھا ہے۔

عام تذکروں میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک تو شاعر کے مختصر حالات، دوسرے اس کے کلام پر مختصر سا تبصرہ، اور تیسرے اس کا انتخاب۔ اردو تذکروں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کسی خاص نکتۂ نظر سے کسی خاص حلقے کی ترجمانی اور کسی خاص مصلحت کے پیش نظر لکھے گئے ہیں۔ ایسے تذکروں کی صداقت اور خلوص پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے اندر جانبداری اور نفرت کے عناصر ملتے ہیں۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقالے "شعرائے اردو کے تذکرے" میں ان تذکروں کی تقسیم پیش کی ہے، وہ نہایت ہی مناسب ہے۔ وہ تذکروں کو بہ اعتبارِ خصوصیات سات قسموں میں تقسیم کرتے ہیں، جو حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات اور ان کے عمدہ کلام کا انتخاب ہے۔
۲۔ وہ تذکرے جن میں تمام قابلِ ذکر شعراء کو جمع کیا گیا ہے اور مصنف کا مقصد جامعیت اور استیعاب ہے۔
۳۔ وہ تذکرے جن کا مقصد تمام شعراء کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب پیش کرنا ہے اور حالات جمع کرنے کا زیادہ اہتمام نہیں۔
۴۔ وہ تذکرے جن میں اردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد اس ارتقائی تاریخ کو قلمبند کرنا ہے۔
۵۔ وہ تذکرے جو ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔
۶۔ وہ تذکرے جو کسی وطنی یا ادبی گروہ کے نمائندہ ہیں۔
۷۔ وہ تذکرے جن کا مقصد تنقیدِ سخن اور اصلاحِ سخن ہے۔

ان تذکروں کے تین پہلوؤں میں جن پر یہ مشتمل ہوتے ہیں تنقیدی جھلکیاں ملتی ہیں اور تنقیدی رائے قائم کرنے کے لئے مواد دستیاب ہوتا ہے۔ باوجود تاریخی ہونے کے یہ تذکرے اپنے اندر تنقیدی خصوصیات بھی رکھتے ہیں۔ تذکروں میں صرف تنقیدی روایات اور تنقیدی شعور کو تلاش کرنا چاہئے۔ تنقید کے مکمل اور بہترین نمونوں کو ڈھونڈنا بے سود ہے۔ اس لئے کہ تذکرہ نگاروں کے سامنے تنقید اتنی پھلی پھولی نہیں تھی جتنی کہ آج ہے۔

تذکروں کے لئے تنقید کے لفظ کو استعمال کرتے وقت اس کی حدود کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ آج جن وسیع معنوں میں تنقید کا لفظ استعمال ہوتا ہے ان معنوں میں اسے تذکروں پر منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ تذکروں کے سلسلے میں اس لفظ کو اس عہد کے تنقیدی شعور اور تنقیدی بصیرت تک محدود کرنا پڑے گا۔

اب اگر ہم میر کی تنقیدی بصیرت اور نکات الشعراء کے تنقیدی شعور کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ نکات الشعراء میں پایا جانے والا تنقیدی شعور اپنے زمانے کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ میر نے اپنی بے لاگ تنقیدوں سے لوگوں میں تنقیدی شعور کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کیا۔ اور انہیں عمل کے راستے پر لگا دیا۔ ان کی تنقید خواہ سخت یا تلخ ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہی عملی تنقید کی رہنما اور پیش رو ہیں۔

تذکروں میں ان تنقیدی اشاروں کو بڑی اہمیت ہے۔ دراصل ہماری جدید تنقید کی بنیاد یہی اشارے ہیں۔ تذکروں کے مطالعہ

سے اندازہ ہوتا ہے کہ تذکرہ نگار جس شاعر کا ذکر کرتا ہے اس کے کلام پر خود بھی رائے دیتا ہے۔ یہ رائیں عام طور پر ذوق اور وجدان پر مبنی ہیں۔ اس لئے ایسی رایوں میں میانہ روی کم نظر آتی ہے۔ لیکن بہت سی رائیں محاسن اور معائب کو نگاہ میں رکھ کر دی گئی ہیں۔ اس لئے اس قدیم طرز تنقید میں یہ رائیں بھی کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ دوسری چیز جو ان تذکروں کے مطالعہ سے سامنے آتی ہے یہ ہے کہ بعض تذکروں میں اردو شعراء کا مقابلہ فارسی شعراء سے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کن شعراء سے زیادہ متاثر تھے۔ یہ مقابلے مختصر ہونے کے باوجود اہم ہیں۔

تنقیدی شعور کا کارواں دراصل شعراء کے کلام سے تذکروں تک پہونچا ہے، سب سے پہلے یہ تنقیدی رجحانات اعلیٰ شاعری کے بارے میں خود شعراء کے کلام میں ملتے ہیں۔ جسے تنقیدی شعور کی ابتداء کا زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

تذکرے کے فوراً بعد تذکروں کی شکل "آب حیات" اور "گل رعنا" کی ہو جاتی ہے، تو اس میں تنقیدی پہلو اور زیادہ نمایاں ہونے لگتا ہے۔ لیکن دراصل وہ تذکروں کے حدود پار کرکے اردو شاعری کی تاریخوں کے میدان میں آتے ہیں — ان کی تنقیدی اہمیت کا ذکر اس میدان میں کرنا ہی مناسب ہے۔

اب ہمارے زمانے میں جن لوگوں نے تذکروں کے جائزے اور ان کی تنقید کو اپنا موضوع بنایا ہے، ان میں ڈاکٹر عبداللہ اور کلیم الدین احمد کے نام قابل ذکر ہیں۔

کلیم الدین احمد کا خیال ہے کہ تذکرہ نگاری کے تین اہم عناصر ہیں ۱: شاعر کی زندگی، ۲: شاعر کی شخصیت، ۳: شاعر کے کلام کی تنقید۔ ہمارے اردو تذکروں کا جائزہ لینے کے بعد کلیم صاحب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ان میں (۱) شاعر کی زندگی بہت مختصر ہوتی ہے، پرانے تذکروں میں اس قدر اختصار ہوتا ہے کہ یہ حصہ بیشتر ناکام رہتا ہے۔

۲۔ شاعر کی شخصیت کی تعمیر بھی ناکافی ہوتی ہے، بسا اوقات اس طرف توجہ بھی نہیں ہوتی۔

۳۔ تنقیدی حصہ بھی ناکافی ہوتا ہے، بہت سے شعراء ایسے ہوتے ہیں جن کی کلام پر رائے زنی بھی نہیں ہوتی۔

کلیم الدین احمد کے مطالبات اور ان کے اعتراضات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تذکروں میں تنقید ہوتی ضرور ہے۔ خواہ وہ کتنی ہی ناکافی کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر شارب ردولوی کا بھی یہی کہنا ہے کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اعتراضات میں مبالغہ زیادہ ہوتا ہے، یہی حال ان کے مطالبات کا بھی ہے جن کو مشکل ہی سے جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہ کرنی چاہیئے کہ ہمارے تذکرہ نگاروں کے پیش نظر یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیش رو اور معاصرین شعرا کی زیادہ سے زیادہ مکمل فہرست مرتب کردیں۔ جن کو قابل ذکر سمجھتے تھے ان کا تفصیلی ذکر بھی کرتے تھے لیکن اس تفصیل میں بھی وہ پوری شدت کے ساتھ اختصار سے کام لیتے تھے۔ جو شاعر جس پیمانے کا ہوتا تھا اسی پیمانے کے الفاظ بھی اس کیلئے استعمال کئے جاتے تھے۔ بعض شعراء ایسے بھی ہوتے تھے جن کا صرف نام لینا ہی کافی سمجھا جاتا تھا، جس کے معنیٰ یہ ہوتے تھے کہ یہ شعر تو ضرور موزوں کر لیتا ہے لیکن زبان قابل ذکر نہیں ہے۔ غرض جو کچھ بھی تنقیدی شعور تذکروں میں ملتا ہے اپنی اہمیت آپ رکھتا ہے۔ آج بھی تنقید طفولیت ہی کے دور سے گذر رہی ہے۔ تنقید نگاری کے واضح اصول بھی اب تک متعین ہونے میں ہی ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر اٹھارویں صدی عیسوی کے تذکروں کو بیسویں صدی عیسوی کے مغربی تنقیدی کسوٹی پر کسنا کم و بیش ایسا ہی ہے جیسے وید یا قرآن میں ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے نسخے تلاش کئے جائیں۔ ■■

ابوالنصر محمد خالدی

قند مکرر

کچھ دکھنی کلام : ایک محدود مطالعہ

کمیت اور طرماح دونوں شاعر ہیں۔ ان کو شخصاً جاننے والوں کی تعداد نہایت ہی محدود لیکن اسماً جاننے والوں کی تعداد لامحدود ہے۔ کمیت (۱۲۶ھ) متعصب عدنانی، شیعی اور محب اہل کوفہ۔ طرماح (م ۱۲۵ھ) متعصب قحطانی، شاری (= خارجی) اور محب اہل بصرہ۔ اس نمایاں اور گہرے اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے جانی وجگری دوست ہیں۔ لوگوں کو ان کی باہمی الفت پر تعجب ہوتا ہے، سبب دریافت کرتے ہیں، جواب ملتا ہے: ہم دونوں خود فریبو ں سے بیزار ہیں۔

عبداللہ بن یزید شاری اور ہشام بن حکم شیعی بھی ایک دوسرے کی شادی وغمی میں برابر کے شریک تھے۔ جب تو قع اس اتحاد پر بھی لوگ حیرت کا اظہار کرتے تو دونوں کہتے: اشعار کی دل پذیری اور اخبار کی دلچسپی ہم دونوں میں مشترک ہے۔

"قند مکرر" کا یہ اجتماع تو تقریباً تیرہ صدیوں پہلے کی بات ہے جب کہ دین ہی سب کچھ تھا اوّل بھی آخر بھی، ظاہر بھی باطن بھی ہر وقت ہر جگہ، جب کیفی وکمی، صوری ومعنوی یا داخلی وخارجی اسباب کی بنا پر نقطۂ نظر بدلا تو باوجود اختلاف مذہب اتفاق کی بے شمار صورتیں نکلیں اور صرف افراد ہی نہیں بلکہ مختلف مذہب رکھنے والے فرقوں اور متباین مسلک کے گروہوں میں بھی اتحاد واتفاق ہونے لگا۔ صرف منفی اتحاد ہی نہیں مثبت بھی۔ بقائے باہم کے لیے اصول کی برقراری کے ساتھ ساتھ فروع میں زیادہ سے زیادہ اتفاق کی مثالوں سے مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور بھی خالی نہیں رہا۔ دکن کی اسلامی تاریخ بھی اس قسم کے بین المذاہب اتفاق کی ایک نمایاں مثال ہے۔

دکن میں مسلمانوں کی باقاعدہ ومستقل قیام کی ابتداء محمد تغلق نے کی (م ۲۱ - ۱۰۵۲ء) یہاں ان کے قدم اسی نے جما دیے اور اس کی وفات سے قریباً چار سال قبل ہی بہمنیوں کی حکومت قائم ہو گئی (۲۲-۴-۸۰۲ء) ہندوستان خاص کو دکن پر مکمل اقتدار عموماً ایک نسل یعنی قریباً تیس سال سے زیادہ مدت تک باقی نہیں رہتا۔ بہمنی سلطنت کا آزاد ومستقل قیام تاریخ ہند کے اس کلیہ کی ایک نمایاں مثال ہے۔ بہمنیوں کی طبعاً یہ کوشش رہی کہ شمالی ہند سے سیاسی تعلقات کے ساتھ ساتھ معاشرتی، معاشی وتہذیبی تعلقات بھی منقطع ہو جائیں مگر ہندوستان کے فی الجملہ ایک جغرافیائی اور کسی قدر تہذیبی وحدت ہونے کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم ان رشتوں کی کیفیت کو ضعیف اور کمیت کو کم کیا جائے اور اس منصوبہ کی کو مغربی ایشیاء ... ایران

عراق اور عرب سے تعلقات بڑھا کر پورا کیا جائے۔ چنانچہ بہمنی سلطنت کے دوسرے ہی حکمران کے زمانے سے ان ملکوں سے معاشی و تہذیبی تعلقات بڑھنے لگے۔ ہر سال حج کا خصوصی اہتمام ہونے لگا۔ اور عراق و فارس سے بحری تجارت کی غیر معمولی ہمت افزائی شروع ہوئی، فارسی ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی اور حکومت کی اعلیٰ سطح پر فارسی کا چلن بھی ایرانیوں کو یہاں وارد ہونے کی ترغیب دینے لگا۔ دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں ایران، خراسان و فارس میں سیاسی اور نتیجتاً معاشی پریشانی پھیلی تو وہاں کے باشندوں کی ایک قابل لحاظ تعداد کو دکھن میں پناہ ملی۔ اور کبھی شاہی اقتدار برقرار رکھنے کے لیے ایسے نوجوانوں کی ضرورت پڑی جو فوجی زندگی کی صعوبت برداشت کرنے کے سوا ہر حال میں اس کے وفادار رہیں تو ایرانی آفاقی اس لیے حاضر ہوگئے، یہاں یہ کہنے کی شاید ہی ضرورت ہے کہ ان کی اکثریت شیعہ مذہب کی پیرو تھی۔ گو بہمنی حکومت کا مذہب ابتدا سے سُنی، حنفی رہا اور مسلمان آبادی کی اکثریت بھی اسی مذہب کی متبع تھی مگر ایرانی شیعیت بھی فیروز کے (م ۱۵ - ۱۰ - ۸۲۵ھ) زمانے سے دھیرے دھیرے ترقی کرتے ہوئے محمد شاہ لشکری (م ۳۰ - ۱ - ۸۸۷ھ) کے بعد بہت نمایاں ہوگئی تھی کہ آخری بہمنی سلطان کے "یا علی مدد یا علی مدد" پکارتے ہوئے وفات پانے سے (۴ - ۱۲ - ۹۲۴ھ) بہت پہلے ہی (ذی الحجہ نوسو آٹھ ہجری) بیجاپور کی جامع مسجد کے منبر سے "علیؑ ولی اللہ" کا آواز بلند ہوگیا۔

ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بیجاپور پہلا مقام ہے جہاں سے شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان ہوا۔ اس کے دس سال بعد (نوسو اٹھارہ ہجری)۔ گولکنڈہ نے بھی بیجاپور کی پیروی کی۔ احمد نگر قریباً پچیس سال تک پس و پیش کرتا رہا بالآخر وہ بھی اس صف میں شامل ہوگیا (نوسو چوالیس ہجری) حسب توقع تینوں مقاموں پر مسلمان آبادی کی اکثریت نے شور و غل مچایا لیکن کشت و خون کی نوبت نہیں آئی اور رفتہ رفتہ "سُنیوں اور شیعوں کا تعصب دور ہوا، جعفریوں، حنفیوں اور شافعیوں نے مثل شیر و شکر آپس میں مل جل کر بحث و تنازع کی بساط لپیٹ دی۔" اگرچہ عادل شاہی سلطنت کے بانی نے سب سے پہلے شیعیت کے سرکاری مذہب ہونے کا اعلان کیا تھا مگر اس کے مرنے کے بعد ہی کمال خاں متولی سلطنت نے شیعیت کے طریق و آئین یک قلم موقوف کر دیئے کمالؔ خاں کے مارے جانے پر اسماعیل نے پھر اپنے باپ کے مذہب کو رائج کیا مگر اس کا لڑکا ابراہیم سریر آرا ہوا تو اس نے پھر سُنیت کو سلطنت کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ مگر ابراہیم اول کے بیٹے علی نے اپنے باپ کا مذہب ترک کر کے شیعیت اختیار کی اور بارہ اماموں کے نام کا خطبہ پڑھا۔ علی کے بعد ابراہیم ثانی اپنے باپ کے مذہب پر قائم رہا مگر وہ شیعی رسوم و آئین کی پابندی اتنی کم کرتا تھا کہ کوئی اس کو شیعہ اور کوئی سنی سمجھتا تھا۔ اس کے جانشین محمد کے زمانے میں شیعہ رسوم و آئین بھی یہاں تک ختم ہوگئے تھے کہ علی ثانی کو اپنے باپ کے مذہب سے سوائے ایام اعزا کی رسموں اور مرثیوں کے کوئی اور قابل لحاظ شیعی خصوصیت نہیں ملی۔ آخری حکمران تو "بجز نام سلطانی و لقب عادل شاہی حظے دیگر نداشت۔" شاہی مذہب کے متواتر تبدیلی کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا تھا کہ دونوں گروہوں کی مذہبی زندگی میں بھی عملاً کوئی نمایاں فرق باقی نہ رہے۔

عادل شاہی حکومت قریباً دوسو سال (۸۹۶ھ تا ۱۰۹۷ھ) اور قطب شاہی حکومت پونے دوسو سال رہی۔ (۸۹۴ھ تا ۱۰۹۸ھ) عادل شاہیوں کی طرح قطب شاہی حکمرانوں کی تعداد بھی آٹھ سے زیادہ نہیں ہوئی۔ قطب شاہی حکمران شیعہ سنی چکر میں نہیں پڑے بلکہ شروع سے آخر تک فی الجملہ شیعہ ہی رہے لیکن اپنے مذہبی رنگ کو کبھی بھی اتنا گہرا نہیں ہونے دیا کہ سنیوں

کے رنگ سے جہت زیادہ ممتاز ہو کر رشک و رقابت کا باعث بنیں اور شورش و بدامنی کی نوبت آجائے۔ احمد نگر کے جملہ حکمرانوں کی تعداد تیرہ ہے مگر ان کی مدت حکومت ایک سو تریپن یا ایک سو چھپن سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ (۸۹۱ھ یا ۸۹۵ھ تا ۱۰۴۶ھ) اور وہاں بھی قریب قریب وہی صورت حال رہی جو گولکنڈہ میں تھی۔

عادل شاہیوں، قطب شاہیوں یا نظام شاہیوں کے برخلاف بیدر کے چاروں عمادی حکمرانوں (۸۹۰ھ تا ۹۸۲ھ یا ۸۹۵ھ تا ۹۸۰ھ) اور بیدر کے آٹھوں بریدی امیروں نے (۹۳۴ھ تا ۱۰۲۸ھ) اپنا مذہب نہیں بدلا بلکہ سب کے سب شروع سے آخر تک سنی ہی رہے اور مذہب کو اپنے شیعی ہم سایہ حکومتوں سے مخالفت و منازعت کا سبب نہیں بنایا اور رواداری ہی پر عمل پیرا رہے۔ اسی طرح پورے خطۂ دکن میں مسلمانوں کے یہ دونوں فرقے بحیثیت مجموعی زندگی کی ہر سطح پر اور ہر شعبہ میں ایک دوسرے سے اتنے گھلے ملے رہے کہ ان میں مذہبی فرق و امتیاز صرف برائے نام رہ گیا۔

دکنی سلطانوں کی سیاسی اور خاص طور پر تمدنی و سماجی یا تہذیبی تاریخ کا بامعان نظر مطالعہ کرنے والے پر یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ اس معاشرہ کے نمایاں عوامل وہی تھے جن کو علم الاجتماع کی اصطلاحوں میں مصالحت و مخالفت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مصالحت کا مطلب ہے: زیادہ تر بقائے حیات مادی کے لیے کسی مختلف الادیان معاشرہ کے افراد کا ایک دوسرے کے دینی اقدار ملحوظاً رکھنا اختیار کرنا جو ایک دوسرے سے متباین ہوں۔ مصالحت کے لیے بعض علماء عمرانیات رواداری کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ (مخالفت کی وضاحت آگے آئے گی)۔

دکنی معاشرہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاط بھی ہر حیثیت سے اتنا بڑھا کہ مسلمانوں نے اکثریتی گروہ کی تہذیب کے ایسے اقدار بھی اختیار کر لیے جن کا اسلامی اقدار سے ہم آہنگ ہونا قریباً ناممکن تھا کیوں کہ یہ سب کے سب یا بیشتر غیر اسلامی تھے اور اسلامی معاشرتی ڈھانچہ میں ان کی حیثیت اجنبی جسموں کی سی تھی۔ دکنی اسلامی معاشرہ میں مصالحت کا اصول کیوں پیدا ہوا؟ اس پر کس طرح عمل ہوا؟ اور اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ یہ اور اسی طرح کے دوسرے مسئلوں کا ادب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے یہاں اس کی توضیح و تشریح بھی ضروری نہیں۔ پیش نظر ادب پاروں کو کما حقہ سمجھنے کے لیے اتنا جاننا کافی ہے کہ دکنی ادب میں مادی و تمدنی حقیقتوں کی بجائے یا ان کے ساتھ ساتھ وہمی خیال آرائی بلکہ تخیل زدگی اسی مصالحت پسندی کی وجہ سے داخل ہوئی جو سراسر ہندی اثرات کا نتیجہ ہے۔ فقہی مثنویوں کے سوا دوسری دکنی مثنویوں میں آپ کو شاید ہی کوئی ایسی مثنوی ملے جس میں فطری و طبعی قوانین کے بجائے جگہ جگہ خرق عادت امور کا اظہار نہ ہوا ہو۔ شاعر کے تخیل پر وا ہمہ اتنا غالب رہتا ہے کہ اس کے بیان کردہ قصہ میں صرف عجوبگی یا غرابت ہی نہیں رہتی بلکہ وہ ایک معجزہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور پھر یہ معجزہ محض معجزہ ہی نہیں رہتا بلکہ اسطورہ و خرافہ کی شکل میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ ان مثنویوں کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی پر خود اس کے ارادہ و عمل سے کہیں زیادہ پریوں، جنوں اور فرشتوں کی حکمرانی ہے یا وہ خود ہی ایسے حیرت ناک کام انجام دیتا ہے جو صرف جنوں، بھوتوں اور پریوں ہی سے سرانجام ہو سکتے ہیں۔ یا پھر وہ اتنا قادر توانا ہے کہ ساری فوق الطبعی مخلوق اس کے زیر فرمان ہے! جو کردار کسی دینی، مذہبی یا عام اخلاقی اقدار کو اچھا (خیر) مفید و جمیل ثابت یا ظاہر کرنے کے لیے واجد کو عشق و عرفان [illegible] و وزیر بھی گریز جانتا اور مانتا ہو، اس کی اعتقادی قوت تیس سو سال

پہلے جتنی شدید ہوگئی اس کا اندازہ کرنے کے لیے ذہن پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ تاممکن تھا کہ گروہ قلیل اس سے متاثر نہ ہو، یہ صرف متاثر ہی نہیں ہوا بلکہ کمی (عددی) قلت کے ساتھ ساتھ اپنی کیفی کمزوری (ضعف عقیدہ) کی وجہ سے بقائے حیات کے لیے اس کو مصالحت کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ مصالحت ہوئی اور زندگی کے ہر شعبہ میں ہوئی۔ دکھنی ادب اسی زندگی کا آفریدہ تھا، اس لیے اس ادب میں مقبول عام ہندوانہ واہمہ پسندی یا تخیل زدگی کا اثر بہت نمایاں ہے۔ اس اثر سے شاعر کی خصوصیت سے زیادہ اس کے معاشرہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر کی خصوصیت وہاں نمایاں ہوتی ہے جہاں اسے انسانی احساسات وجذبات کی ترجمانی کا موقع ملا ہے۔

اس بحث میں اجتماعی نفسیات کا یہ کلیہ بھی نگاہ میں رہنا چاہیئے کہ کثیر العناصر معاشرہ میں ہر فرقہ کی اکثریت اصول مصالحت پر سوچ سمجھ کر نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ البتہ اسی معاشرہ میں ایسے افراد اور گروہ بھی ہوتے ہیں جو بقائے باہم کے لیے تہذیبی ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے اصول مصالحت پر ان کا عمل شعوری طور پر ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو اصول مصالحت کے قائل نہیں ہوتے بلکہ اپنے ماحول کو اپنے موافق بنانے یا کم از کم اپنی اجنبیت دور کرنے اور اپنے کو مانوس کرانے کے لیے اپنے مقابل گروہ کے ایسے تہذیبی عناصر بالارادہ اختیار کرتے ہیں جن کی خود ان کی تہذیب میں پہلے ہی سے کچھ نہ کچھ جگہ موجود ہوتی ہے۔ آئندہ صفحوں میں پیش ہونے والی یا اسی طرح کی دوسری مثنویوں کو اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض مثنویوں کی تالیف وتنظیم میں زرعی معاشرہ کے ناخواندہ ونیم شائستہ افراد کو اسلام سے قریب کرتے یا اس سے مانوس کرنے کا خیال بھی رکھا گیا ہوگا۔

ہندؤں کے پاستانی اسطوروں کی طرح دکھنی اسطورہ بھی مقصدی۔ ۔ ۔ ۔ دینی مذہبی یا اخلاقی ہوتا ہے اور اس کی غرض کسی عقیدہ کا پرچار اور اس ذریعہ سے عوام میں اچھے، مفید وجمیل اخلاق کی پرورش ہوتی ہے۔ اس میں ایسے اشخاص کا سہارا لیا جاتا ہے جن کی حیثیت فوق، روایتی یا نیم تاریخی ہوتی ہے، ان کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ اشخاص کے اوصاف واعمال سب کے سب یا اکثر وبیشتر محض تخیلی ہیں یا مادرارالطبعی باایں ہمہ ان کے احساسات وجذبات بالکل ہم جیسے عام انسانوں ہی کے سے ہیں چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ دکھنی شاعر کو جہاں جہاں احساسات وجذبات کی ترجمانی کا موقع ملا ہے وہاں یہ سب اشخاص واقعی وحقیقی انسان معلوم ہوتے ہیں۔ انسانی آرزوؤں ارمانوں وامیدوں یا ناکامیوں، نامرادیوں و مایوسیوں کی جو فنکارانہ ترجمانی دکھنی مثنوی نگاروں نے سیکڑوں سال پہلے کی تھی اس کی مثال زبان کی ترقی کے باوجود بعد کے بڑے بڑے شاعروں کے یہاں بھی بمشکل ہی مل سکے گی۔

بیجاپور وگولکنڈہ میں شیعیت کے سرکاری مذہب قرار پانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ بیجاپور میں سرکاری کی متواتر تبدیلی اور گولکنڈہ واحمدنگر کی فرقہ وارانہ رواداری کی وجہ سے صرف حکومتی سطح پر ہی نہیں بلکہ معاشری وتہذیبی سطح پر بھی مسلمانوں کے دونوں فرقوں۔ ۔ ۔ سنیوں اور شیعیوں کے تعلقات ممکنہ حد تک خوشگوار رہے اور دونوں طرف سے زیادہ سے زیادہ رواداری کا اظہار ہوا کیونکہ برخلاف دوسرے اسلامی فرقوں کے ان دونوں میں سوائے مسئلہ خلافت یا امامت کے کسی

دونوں کے عقائد میں کوئی ٹکراؤ یا گہرا اختلاف نہیں تھا۔ اس لیے دونوں نے آسانی سے اتفاق و اتحاد پر راضی ہو گئے۔ اس اتحاد و اتفاق میں مندرجہ بالا تاریخی عوامل کے علاوہ سنیوں اور شیعوں میں اصولی مخالفت بھی کا دخل رہا۔ مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ تر بقائے معنوی (عقیدہ یا اصول زندگی) کے لیے ایک ہی دنیا کے کثیر المذہب معاشرہ کے افراد کا ایک دوسرے کے مشترک اقدار کو اختیار کرنا، اسی کو بعض وقت داخلی رواداری کہا جاتا ہے۔ دکنی مسلمانوں کی تاریخ پر گہری و وسیع نظر رکھنے والے محققین واقف ہیں کہ ان دونوں فرقوں کی مجموعی تعداد بھی غیر مسلموں کے مقابلہ میں بہت ہی قلیل تھی۔ مسلموں اور غیر مسلموں کا تناسب ایک اور دو کا نہیں بلکہ تقریباً ایک اور دس کا تھا۔ غیر معمولی عددی برتری رکھنے والے گروہ کے مقابلہ میں اقلیتی گروہ اپنی انفرادیت صرف کیفی (معنوی) قوت ہی کی بناء پر قائم و برقرار رکھ سکتا تھا اس لیے سنیوں اور شیعوں کے اہل فکر زیادہ سے زیادہ اور ممکنہ حد تک گہری مخالفت کی تبلیغ کرتے اور مسلمانوں کی اخوت و جامعیت پر زور دیتے رہے۔ زندگی کے دوسرے انفرادی و اجتماعی شعبوں سے قطع نظر ادبی زندگی میں مخالفت اس طرح رونما ہوئی کہ مذہبی حکایتوں، قصوں اور داستانوں میں ایسے اشخاص و اقدار کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کیا گیا جن سے دونوں گروہ یکساں وابستہ تھے۔ چوتھے خلیفہ سیدنا علیؓ دونوں فرقوں کے امام مانے جاتے ہیں۔ آپ کی بیوی سیدہ فاطمہؓ کا ایک مقدس ہستی اور خاص طور پر مسلمان عورتوں کے لیے قابل تقلید اسوہ و نمونہ ہونا کوئی اختلافی مسئلہ نہیں ہے اس لیے اکثر دکنی مثنویوں میں آپ کو مدح صحابہ رسول اللہ کے ساتھ ساتھ منقبت علیؓ و توصیف آل علیؓ وغیرہ جیسے مستقل عنوان بھی ملیں گے اور جہاں جہاں کسی قصہ یا حکایت کے مرکزی کردار سیدنا علیؓ یا سیدہ فاطمہؓ ہیں وہاں بھی ابتداء میں خلفاء کی مدح عموماً نظر انداز نہیں کی جاتی اس لیے ایسے قصے مسلمانوں کے اکثریتی فرقہ کے مذہبی احساس پر کوئی ناگوار اثر نہیں ڈالتے۔

یہاں چند ایسی مثنویاں پیش کی جا رہی ہیں جو مذکورہ صدر خصوصیت مصالحت و مخالفت کی پوری پوری ترجمانی کرتی ہیں۔ علاوہ بریں ان سے دکن کی تمدنی، تہذیبی و معاشرتی حالت بھی واضح ہو گئی جو سیاسی تاریخوں سے بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ باعتبار زمانہ اس سلسلہ کی پہلی مثنوی محمی کی اور دوسری فاروقی کی ہے ان کے بعد باعتبار موضوع و بہ ترتیب تاریخی امین کا قصیدہ، مکین کی مثنوی اور سلیمان کا قصہ آئے گا۔ پھر ان مثنویوں کے موضوع سے قریبی تعلق رکھنے والی اسماعیل کی مثنوی پر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

ان مثنویوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس واقعہ کو نہ بھولیے کہ ——— یہ انفرادی طور پر پڑھنے یا تنہا مطالعہ کرنے کے لیے تصنیف نہیں ہوئی ہیں بلکہ محفلوں میں سنانے اور مجلسوں میں پڑھنے کے لیے لکھی گئی ہیں۔ یہ ایسے معاشرے کی پیداوار نہیں ہیں جس کے پاس شاید سب سے بڑی قلت وقت ہی کی ہوتی ہے۔ یہ اس معاشرے کی پیداوار ہیں جس کے یہاں تفریح کے لیے میدانی کھیل ہیں نہ متحرک تصویریں۔ یہاں بجلی روشنی نہیں ہے کہ رات میں بھی کارخانے چلتے رہیں اور برسات میں بھی تیز رو گاڑیاں رواں دواں رہیں۔ ہندو دکن میں مشاعروں کے رواج عام سے پہلے تقریباً تین سو سال تک مثنوی کی سماعت مہذب و شائستہ لوگوں کی تفریح و تربیت کا مرغوب ذریعہ رہی ہے۔ ان مثنویوں پر مذہبی رنگ بھی اتنا زیادہ غالب نہیں ہوتا کہ ان کو سننے کے لیے ہر شخص کو باطہارت حاضر ہونا اور ادب سے بیٹھنا ناگزیر ہو۔ شرکت سماعت کے لیے عمر، مذہب اور بعض اوقات تو جنس کی بھی کوئی قید نہیں ہوتی۔ محرم اور ایام عزا کے سوا دوسرے دنوں میں یہ محفلیں عموماً عاشور خانوں میں منعقد ہوتی تھیں جو تقریباً ہر اس قصبہ میں موجود تھا

یہاں کی خانہ شماری ہزار ڈیڑھ ہزار رہے گی یا کچھ بھی ہو۔ صاحب ثروت لوگوں کے یہاں تو سال کے چند دن اسی غرض کے لیے مخصوص ہوتے تھے جن میں مثنوی خوانی ہوتی اور اس میں شرکت عام تھی۔ بعض ایسی محفلیں بھی منعقد ہوتی تھیں جن میں ایک ہی مثنوی نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی کئی مثنویاں سنائی جاتی تھیں۔ ان محفلوں کی حیثیت مثنوی نگاروں یا مثنوی خوانوں کے درمیان مساجلہ و مقابلہ کی سی ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اسی لیے بعد میں ایسی محفلوں کو دنگل بھی کہا جانے لگا، دکنی میں اس لفظ کے یہ معنی آج بھی معلوم و معروف ہیں۔ البتہ اس کا اطلاق زیادہ تر حقیت بازی کی محفل پر کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی بعض مشہور محفلوں میں شرکت کے لیے شوقین سامعین دور دور سے آیا کرتے تھے۔ دکن کے بعض بعض علاقوں میں آج سے تقریباً بیس بائیس سال پہلے تک بھی، زیادہ تر بزرگوں کے عرسوں کے موقع پر، ایسی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں، مثنوی سنانے والے عموماً پیشہ ور خاندانی گداگر یا کسی "سید صاحب" کی درگاہ کے مجاور ہوتے تھے۔ دکنیوں کی ادبی تاریخ کا یہ واقعہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان محفلوں میں اکثر وہی مثنویاں سنائی جاتی تھیں جو اب ڈھونڈ ڈھونڈ کر پرانی بیاضوں سے نقل کی جارہی ہیں البتہ تحریری اور زبانی سنائی جانے والی مثنویوں کی زبان، بیان، تالیف و ترتیب میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو گیا ہے۔ مثنوی سنانے والے کے ضعفِ حافظہ و موزونیِ طبع نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہونا ناگزیر تھا۔

مجھی نے مثنوی "معجزۂ فاطمہ" میں جس ترتیب سے جو کچھ بیان کیا ہے اسی ترتیب سے اس کا خاکہ کچھ اس طرح ہوگا :—

الٰہی تو صاحب سکت کا دھنی — تجھے ساجتی کبریا و منی
ترے علم توحید کا ابتدا — نہ کوئی پائے نا پائیں گے انتہا
بھلا ہے کروں عجز سے افتخار — مناجات یاں سے کروں آشکار
الٰہی نکو کر مرا گھر سقر — ترحم سوں کر مجھ پر گ میں مقر
جو مرحوم میرے ہیں مادر پدر — گناہ بخش ان کو دے جنت میں گھر
انو پرورش مجھ کیے لئی وفا — خدایا تو دے ان کو اس کا اجزا
جو ہے بھائی اُستاد میرے کبیر — ہوئے لئی وفا سوں مجھے دستگیر
خدایا تو کر عمر ان کا دراز — ہور اپنے کرم سات کر سرفراز

مناجات کر یاں تے کر اختتام
کر آغاز نعتِ علیہ السلام

ترا نعت ہے تیوں کتا ہے محال — کیا نعت تیرا مری قدر حال
کروں یاں تے معراج کا میں بیاں — جو کچھ تجھ تے جو پوچھا ہے میاں
نبی مصطفیٰ سوں مل حق سے در لامکاں — پھر آئے مکاں اپنے لے نعمتاں
علی ولی شاہ دلدل سوار — کیا کفر کو قتل لے ذوالفقار

منقبت سے پہلے یا بعد مدح صحابہ کے نہ ہونے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ محمی مذہب امامیہ کا متبع تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو بندہ نواز کی طرح نہ ہوتی جو یقیناً سنی حنفی تھے۔ محمی کے مرشد کا سنی ہونا بھی کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے اس لیے ہم زیادہ سے زیادہ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمی شاید تفضیلی سنی تھے۔

خلف جو ترا شاہ اکبر اچھے — سو وہ ہادیٔ دین و رہبر اچھے
جو ملک عدم تے وہ اہل صفا — منگیا نقل کرنے یہ ملک بقا
سو اس حال میں خانہ در حال کیا — کیا جانشین شاہ راجو کے تئیں

شاہ راجو متوفی دس سو بیانوے یا دس سو چورانوے ہجری سے مراد وہی ہیں جن کا سلسلۂ نسب یہ ہے: شاہ راجو حسینی ثانی (م ۱۰۹۲ یا ۱۰۹۴ھ) بن صفی اللہ بن شاہ راجو حسینی بن اسد اللہ حسینی بن عسکر اللہ بن سیف اللہ (م ۲۸ - ۱۱ - ۸۲۵ھ) بن محمد اکبر حسینی (م ۱۶ - ۴ - ۸۱۲ھ) بن بندہ نواز (م ۱۶ - ۱۱ - ۸۲۵ھ)

"کیا جانشین شاہ راجو کے تئیں" کا مطلب غالباً یہ ہے کہ بندہ نواز نے اپنے لڑکے محمد اکبر حسینی کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے (اور اپنے پوتے) سیف اللہ کو اپنا جانشین و خلیفہ بنایا نہ کہ اپنے دوسرے لڑکے محمد اصغر حسینی کو۔ (م ۲۱ - ۸۲۸ھ) محمی نے درمیانی سلسلے حذف کر دیے ہیں اس کو صرف یہ بتانا تھا کہ راجو ثانی بندہ نواز کے بڑے بیٹے کی اولاد سے ہیں محمی کو غالباً انھیں سے بیعت تھی۔ پھر کہتا ہے، شاہ راجو کی درگاہ سے روزانہ جو لنگر تقسیم ہوتا ہے اس سے مجھے بھی کچھ ملتا ہے۔

جو اس کا ہے روضہ بہشت بریں — مری ہے وہاں روز روزی تعیں
وہ روزی سوں پایا ہوں میں یوں اثر — خزاں جا کو جو باغ پایا بہار
کہاں شاہ کا مدح محمی سرے — صفت شاہ زادوں کی بولوں برے

بڑے صاحب اس شاہ کے جانشین جو — کیے یوں کرم سب پو وہ کر ندھاں، کہ
گئی مفلسی سب کی یکبار نپاس — دے پنج مفلس ہوں اس شہ کے پاس
عجب کیا جو وہ کیمیا سی نظر — کرے میرے اس تن کے تکلیفے کو زر
جو ہیں بھائی شہ کے حمیدہ خصال — اچھو دولت ان کا ہمیشہ بحال
شجاعت منے شہ سواراں ہے — سخاوت منے نام داراں ہیں وہ

یعنی شاہ راجو کے دو بیٹے تھے، بڑے صاحب زادے تو ہندوستانی رواج کے مطابق اپنے باپ کے خلیفہ ہوئے انھوں نے ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا اور غالباً اپنی اوقات اوقاف و فتوحات کی آمدنی پر بسر کی۔ چھوٹے بیٹے عسب تو فوج میں بھرتی ہو گئے اور شاید اونچا عہدہ پایا، مزاج بھی غالباً سپاہیانہ ہی پایا تھا اس لیے جو ملتا بے تکلف خرچ فرماتے اور جوش سے کر بجل تصور فرماتے تھے۔ اور وہ "دونوں کی مادر ہے علیا جناب" "دونوں حضرت فاطمہ کے کرم" سے "دھریا سب چیکے

دھات نہیں بیش دکم " جس کی وجہ سے دسیوں مفلس اور بیسیوں مفلوک " ہوئے ہیں سرا فراز انھوں سے سدا " انہیں سے یہ دعا کرتا ہوں میں التماس " کہ

" مجھے قرض ماروں کے بند سے چھڑاؤ　　یہ احسان کا اجر دو جگ میں پاؤ "

معلوم نہیں بڑے صاحب نے بے چارے محبیؔ کی کچھ مدد کی یا نہیں۔ بڑے صاحب زادے نے دعائیں تو ضرور دی ہوں گی ممکن ہے چھوٹے صاحب نے وعدہ بھی کیا ہو لیکن " علیا جناب " کے متعلق اگر ہم یہ گمان کریں کہ انھوں نے اس کا بار قرض اتار نے میں ہاتھ بٹایا ہو تو ہماری یہ خوش گمانی غالباً بے جا نہ ہوگی۔ کیا ہم فرض کریں کہ محبیؔ نے یہ مثنوی " علیا جناب " کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لکھی؟ محبیؔ نے بتایا ہے کہ یہ مثنوی رمضان کے عشرۂ آخر میں ختم ہوئی ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ اس نے اپنی مثنوی عید سے کچھ ہی پہلے یا عید کے موقع پر بمصداق ہم خرما وہم ثواب " علیا جناب " کو سنائی ہو اگر غالب تو یہی ہے کہ شیر خرما کے ساتھ اس کو زکات یا فطرہ یا دونوں ملے ہوں۔ بہرحال " خرما " ملا ہو یا نہ ملا ہو " ثواب " تو یقیناً مل گیا ہوگا۔ اللھم اغفرہ وجعل اللہ الجنۃ مثوہ۔

محبیؔ نے اپنے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ صرف اتنا ہی ہے۔ ان معلومات کے سوا مطبوعہ مصادر میں اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی حتیٰ کہ اس زمانے یعنے گیارھویں صدی کے آخر اور بارھویں صدی کے اوائل میں گولکنڈہ کے کسی ایسے شاعر کی نشان دہی نہ ہو سکی جس کے نام کا جز محب یا تخلص محب یا محبیؔ ہو۔

کہ اے نام ور قطب شہ ابوالحسن　　عطا تجھ کیے پیر تخت دکھن
محمد حسینی دیئے تجھ کو راج　　مبارک رہے تجھ کو یہ تخت و تاج

یہ محمد حسینی وہی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا۔ ان کی دعاؤں کی برکت سے ابوالحسن بے توقع بلکہ خلاف توقع گولکنڈہ کا بادشاہ ہوا، اس واقعہ کی تفصیل گولکنڈہ کی ہر تاریخ میں موجود ہے۔

عبداللہ قطب شاہ کے کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ تین لڑکیاں تھیں۔ ایک عالمگیر کے لڑکے محمد سے منسوب تھی، دوسری لڑکی نظام الدین احمد سے بیاہی گئی تھی، تیسری لڑکی کا نکاح سید محمد سلطان سے ہونے والا تھا۔ تیاری مکمل ہو چکی تھی ایسے میں نظام احمد نے اس رشتہ کی مخالفت کی عبداللہ قطب شاہ کے مشیروں نے بھی نظام الدین کی رائے سے اتفاق کیا۔ چنانچہ بادشاہ نے بعد مشورہ یہ ارادہ کر لیا کہ اپنی بیٹی کا نکاح ابوالحسن سے کر دے گا۔ شادی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی فوراً ابوالحسن طلب کیا گیا۔ یہ اس زمانے میں اپنے مرشد شاہ راجو حسینی کی خانقاہ میں درویشانہ زندگی گزار رہا تھا۔ جس وقت شاہی گوہندے خانقاہ پہنچے ہیں اس وقت شاہ راجو اپنے مرید ابوالحسن کے ہاتھ پر رنگ مہندی دگل عباس ملتے ہوئے فرما رہے تھے : آج بادشاہ کی لڑکی کی حنا بندی ہے، آؤ ہم تمہاری بھی حنا بندی کریں۔ جب ابوالحسن کی طلبی ہوئی تو آپ نے فرمایا : جاؤ ہم نے تمہاری شادی بادشاہ کی لڑکی سے کر دی۔ چنانچہ سید محمد سلطان کی بجائے بادشاہ نے اپنی لڑکی کا نکاح ابوالحسن سے کر دیا۔

کہتے ہیں کہ شاہ راجو حسینی نے ایک روز ابوالحسن کو اتار کی ایک پھانک دی اور فرمایا اس میں کتنے دانے ہیں گنو ابوالحسن نے گن کر کہا چودہ۔ آپ نے فرمایا : تمہاری بادشاہی چودہ سال رہے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ابوالحسن تاناشاہ ۱۰۸۳ھ م ۱۶۷۲ء میں تخت نشین اور ۱۰۹۸ھ م ۱۶۸۷ء میں سلطنت سے دستبردار ہوا، ۱۱۱۱ھ م ۱۶۹۹ء میں وفات پائی۔

سخن سے سخن ور ہوویں سرفراز   سخن سے ہوویں فاش ہر ایک راز
سخن مجھ خدا سے ہوا ہے عطا   تو کیوں نا کروں مدح خیر النسا
کہوں مدح میں قصۂ فاطمہ   جو ہے مدح حضرت وہاں خاتمہ
(کہوں پھر سو میں فاطمہ کا بیاں   جو گزرا انوں پر کروں میں بیاں)

(مکہ میں) ابوجہل کی بیوی اور اس کی سہیلیوں نے ایک روز یہ تجویز کی کہ (فاطمہ کہتی ہیں کہ ان کے باپ پیغمبر ہیں حالانکہ مفلس ہیں) ان کو شرمندہ کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہم جھوٹ موٹ ایک شادی رچائیں اور اس میں فاطمہ کو مدعو کریں، ہم تو اہل ثروت ہیں، یہاں کسی چیز کی کمی ہے فاطمہ بغیر زیور پھٹے پرانے کپڑے پہن کر آئیں گی تو ہم ان کو اپنی شان دکھائیں گے اور انھیں شرمندہ کریں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت نامہ لکھا، آپ کو دھوکہ دینے کے لیے ظاہراً آپ کی مدح کرتے ہوئے درخواست کی گئی کہ آپ اپنی صاحب زادی کو شادی کی محفل میں روانہ کریں۔ آپ نے یہ رقعہ فاطمہ کو دکھایا تو فاطمہ نے کہا: میری ماں کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے ان کافروں نے مجھے شرمندہ کرنے کے لیے اپنے یہاں مدعو کیا ہے، میں تنہا اور وہ بغیر تحفے کے کس طرح جاؤں؟ آپ (صلعم) یہ سن کر متفکر تھے کہ اتنے میں جبرئیل نازل ہوئے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ (صلعم) فاطمہ کو اس شادی میں ضرور بھیجیں، بالآخر وہ کافر ہی نادم ہوں گے۔ آپ (صلعم) نے فرمان خداوندی فاطمہ کو سنایا اور وہ جانے پر راضی ہو گئیں۔ اور جبرئیل واپس ہوئے۔ ادھر کافروں نے بہت ہی شان وشوکت سے شادی کا اہتمام کیا، شامیانہ تانا، اس کو خوب سنوارا، محفل آراستہ کی اور راگ و رنگ کا بھی بندوبست کیا، قسم قسم کے کھانے پکائے۔

جب فاطمہ کے جانے کا وقت آیا تو جبرئیل جنت سے سارا ساز و سامان لے آئے جو شادی میں شرکت کے لیے ایک شہزادی کے شایان شان ہو۔ چنانچہ فاطمہ بہشتی کپڑے و زیور پہنے دعوت میں تشریف لے گئیں۔ کافروں کی عورتوں نے آپ کو اس طرح دیکھا تو خود ہی شرمندہ ہو گئیں۔ مگر با دل ناخواستہ آپ کو دسترخوان پر بٹھایا، فاطمہ نے کہا میں اپنے درجہ کے لوگوں ایماندار وں کے ساتھ ہی بیٹھ سکتی ہوں، اگر تم مسلمان ہو جاؤ تو میں کھانا کھا لوں گی۔

سن اس بات کو دین کر اختیار   ہوئے ان میں چالیس تن دیندار
چلے واں سوں بی بی پھر اپنے مقام   نبی سوں کہے واں کا قصہ تمام
جو یہ قصہ تھا فارسی سوں اول   کیا اس کو دکھنی زبان سوں اول
اتھے یک ہزار و اسی آٹھ سال   دیا بار اس مثنوی کا نہال
شب قدر تھا تھا وہ ماہ صیام   کیا ختم ترتیب سوں وہ کلام
رہے بار یہ بہرہ ور جگ میں عام   بحق محمد علیہ السلام۔

عجیبؔ نے یہ نہیں بتایا کہ فارسی میں یہ قصہ منظوم تھا یا منثور، مگر کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اصل قصہ شاید نثر میں تھا۔ عجیبؔ نے اصل قصہ میں غالباً کسی قسم کا تصرف بھی نہیں کیا، اور یہ تو بالکل واضح ہے کہ مصنف گیارھویں صدی ہجری کی دکنی ـــ ایرانی تہذیب کا پروردہ ہے، شادی کا انتظام و اہتمام اس طرح ہوا ہے گویا یہ کسی آفاقی سطح وار کی دیوڑی پر رچائی گئی ہے: زرنگار منڈپ کے ستون چاندی کے، ان کے کلس سونے کے اور زرتار طنابیں سونے کی میخوں سے (کذا فی الاصل) بندھی ہوئی ہیں، روشنی کے بلوریں جھاڑ اور عود دان ہیں، باغ میں دائیں بائیں سرو کی قطاریں ہیں اور چمن میں سیب و انار کے درخت جھوم رہے ہیں۔ ریحان، یاسمین و سیوتی وغیرہ کے پھولوں کی خوشبو سے فضا مہک رہی ہے، حوض ہیں، حوض میں فوارے ہیں، بربط، دف، چنگ و نائے (جیسے خالص ایرانی باجے) بجا رہے ہیں۔

دسترخوان تو بالکل ایرانی ہے، چنانچہ اس پر پلاؤ، بھونا ہوا دست کا گوشت، شیرینی و نان کے ساتھ پیاز، پودینہ، پنیر، مولی اور قلیہ چنا ہوا ہے۔ سیدہ فاطمہ برقعہ اوڑھے پیدل روانہ ہوتی ہیں، ڈولی ہے نہ میانہ، البتہ ہندی رواج کے مطابق آپ کا استقبال آپ کے دونوں جانب پردے پکڑ کر کیا جاتا ہے اور جب مسند پر بیٹھتی ہیں تو جوہروں کے طبق نثار کیے جاتے ہیں اور کافروں کی عورتیں آپ کے قدموں پر اپنے سر رکھتی ہیں۔

اظہار خوردی و کمتری کے لیے قدموں پہ سر رکھنے کے خالص ہندوانہ طریقہ کی تو شاید کچھ تاویل کی جا سکتی ہے لیکن ان کی دینی روایتوں کے اس دیو مالائی خرافی تصور کے متعلق کیا رائے ہے جو اس مثنوی میں شاید سب سے زیادہ نمایاں ہے؟ عالی مرفدالحال کے میدان میں کافر عورتوں کی دعوت مسابقت میں سیدہ فاطمہ قوت و مضبوطیٔ کردار کے بل بوتے پر نہیں بلکہ ماورائے انسانی امداد کے سہارے شرکت کرتی ہیں۔ وحی لانے کے علاوہ جبرئیل کو رسول اللہ صلعم کی لڑکی کے لیے آسمانی کپڑے اور زیور فراہم کرنے کی خدمت بھی سونپی جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جب فرشتوں کی دو رویہ صفوں کے درمیان سیدہ فاطمہ حوروں کی جلو میں روانہ ہوتی ہے تو:

انگے جا کے جبرئیل جوں چوبدار　　کرے غیر لوگوں کُوں منڈ سے بہار!

اللہ اپنے نبی کی بیٹی کو کافروں کی نظروں میں سرخرو کرنے کے لیے اپنی سنت بدل دیتا اور ردِ عمل ہی میں دارِ مکافات کا برائے العین مشاہدہ کرا دیتا ہے!!

مختصر یہ کہ اس مثنوی میں اگر آپ صرف دو تین اسمائے معرفہ کسی مناسب ہندوانہ ناموں سے بدل دیں تو پوری نظم ہندی دیو مالائی کہانی ہو جائے گی۔ یہ نتیجہ یا اظہار ہے اس مصالحت پسندی کا جو سترھویں صدی عیسوی کے دکنی اسلامی معاشرہ کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ ہمیں عجیبؔ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے معاشرہ کی ـــ کم از کم ایک رخ کی مطابق واقعہ عکاسی کر دی ہے۔ اس طرح اس کی مثنوی ہماری معاشرتی و تہذیبی تاریخ کی ایک تحریری دستاویز سے کم نہیں۔ البتہ فنی حیثیت سے اتنی شکایت ضرور ہے کہ اس نے بعض جدید شاعروں کی طرح جو تعارف، دیباچہ اور مقدمہ وغیرہ کا سہارا لیے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتے۔ تین سو بیالیس ابیات کی مثنوی میں ایک سو ابیات صرف رسمی عنوانوں کے نذر کر دیے ہیں اور پھر اصل قصہ یکایک اس طرح ختم کر دیا ہے گویا زمانہ حال کی کسی امتحان گاہ میں ایک محقق امیدوار پرچہ

(بقیہ ص۲۲ پر)

حیدرآباد کے شاعر

۶

اسد انصاری

۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ

حکیم و ڈاکٹر محمد اسد حسن، اسد انصاری، بزرگ اور قادرالکلام سخنور، ۱۹۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ دادا افضل حسن کو میر محبوب علی خاں غفران مکان کے دربار سے افضل العلماء کا خطاب ملا تھا، جاگیر و منصب سے بھی سرفراز تھے، والد احمد حسن کے انتقال کے بعد اسد انصاری ۱۹۶۰ء تک جاگیر و منصب سے استفادہ کرتے رہے، ان کا ددھیال لکھنؤ اور ننھیال حیدرآباد سے عبارت ہے۔ ابتدائی تعلیم مفید الانام، مدرسہ منصبداران اور مدرسہ نظامیہ میں ہوئی۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۵۶ء تک لکھنؤ میں قیام رہا۔ اسد انصاری نے وہاں کی مشرقی درسگاہوں سے مولوی، مولانا، فاضلِ حدیث، مولوی عالم اور دبیر کامل کی سندیں حاصل کیں۔ آپ طبِ یونانی اور ہومیوپیتھک طریقِ علاج پر فنی دستگاہ رکھتے ہیں اور اسی کو ذریعہ معاش بھی بنایا ہے۔

۱۹۳۰ء سے شعر کہتے ہیں۔ آرزو لکھنوی اور اثر لکھنوی سے تلمذ کا شرف حاصل رہا۔ حیدرآباد کے بزرگ اور پُرگو شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ طرحی مشاعروں میں بکثرت شرکت اور پُرطنز و مزاح کی شاعری کے باعث پسند کئے جاتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری میں ترپٹ تخلص کرتے ہیں ان کی غزلوں میں صحتِ زبان اور کلاسیک کے خوشگوار اثرات نمایاں ہیں۔ [illegible] مرتب ہیں۔ اسد انصاری بہمہ مخلص وضعدار۔ دکن اور لکھنؤ کی شرافتِ سخن کا عطر مجموعہ ہیں۔ (د۔ رخ)

تجھ سے وابستہ ہوا اپنے سے بیگانہ بنا — بعد ازاں [illegible]
یوں مٹا مجھ کو کہ ہر لب پہ مرا ذکر رہے — ورنہ دنیا مجھے دہرائے وہ [illegible]
بعد ازاں جو بھی ہوئے دوست وہ منظور مجھے — صرف تو مجھ کو سمجھ بوجھ کے [illegible]
اور در پہ ترے متوالے نہ جائیں ساقی — ان کو اپنا ہی تو قبرِ در میخانہ بنا
کبھی یارب کوئی سمجھے نہ حقیقت میری — جس کا عنواں نہ معین ہو وہ افسانہ بنا
جس کی تنویر ہو ضو بخش چراغِ ہستی — شمع خود جس پہ تصدق ہو وہ پروانہ بنا
جو ہے کم ظرف وہ محفل میں تری نہ آسکے — ایسا قانون کوئی ساقیٔ میخانہ بنا
لذتِ سجدہ سے واقف نہ ہوا قلبِ اسد — زینتِ لوحِ جبیں، نقشِ کفِ پا نہ بنا

٥

مانوسِ رنج و غم ہوں خصت ہوئی خوشی بھی — ہے ناگوار مجھ کو اب حد میں کمی بھی
وہ رنج ہو کہ راحت، دائم نہیں کوئی بھی — انجامِ گل جو دیکھا گھبرا گئی کلی بھی
آزاد زندگی ہی دراصل زندگی ہے — جینے کو جی رہے ہیں، مجبور زندگی بھی
وہ شیخ ہو کہ زاہد یا محتسب کہ واعظ — ان کو نظر نہ آیا منزل نما کوئی بھی
ناکامیاں ہوئی ہیں تمہیدِ کامرانی — تاریکیوں میں ہم نے دیکھی ہے روشنی بھی

٥

زمانہ بے خبر ہے احترامِ جوشِ وحشت سے — مجھے معلوم ہے جو عظمتِ چاکِ گریباں ہے
مجھے تو اضطرابِ دل میں ہے لطفِ سکوں حاصل — خدا معلوم کیوں چارہ گروں کو فکرِ درماں ہے
مری ناکامیاں ہی کامیابی کا سبب ٹھہریں — چراغِ منزلِ راہِ وفا ہر داغِ حرماں ہے
تری کوتاہ بینی ہے اسد خود وجہِ محرومی — سمجھتا ہے جسے تو دور نزدیکِ رگِ جاں ہے

٥

اس در سے اٹھ کے کھائی ہیں دردر کی ٹھوکریں — اُن کی نظر سے گر کے گرے ہر نظر سے ہم
اُن کو پکارتے ہوئے منزل تک آگئے — دامن بچائے کشمکشِ خیر و شر سے ہم
پھر بھی نہ اس کو پا سکے جس کی تلاش تھی — آگے بڑھے چلے گئے حدِ نظر سے ہم
تاروں کے ٹوٹنے میں بھی ہے اک نویدِ صبح
مایوس کیوں اسد ہوں طلوعِ سحر سے ہم

٥

حکیم الطاف احمد آزاد انصاری، قادر الکلام اور پرگو شاعر تھے۔ ۲۷/ رجب ۱۲۸۸ھ م ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوئے، دہرہ دون، انبالہ اور علی گڈھ میں رہے، طبابت پیشہ تھا، ۱۴/ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد آتے اور تادمِ واپسیں یہیں رہے، یہاں عینک فروشی ذریعہ معاش رہا۔ ۱۹۳۸ء میں تراب علی خان باز نے آزاد انصاری کا شعری کلیات "معارف جمیل" شائع کیا، اس کا ایک نسخہ جو شاعر کا تحفہ ہے، ادارۂ ادبیاتِ اردو کے کتب خانے میں ہے اپنے حالاتِ زندگی اور اپنے شعری رویّہ کے بارے میں سیر حاصل اور معلوماتی مقالہ آزاد انصاری نے سپرد قلم کیا ہے۔ وہ حالی کے تلامذہ سے تھے، مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے عقیدت مند اور فانی بدایونی، ناظم علی باغ، ضامن کنتوری اور نجم آفندی ایسے اساتذۂ سخن کے حبیب لبیب تھے۔

آزاد انصاری نے اپنا کلام مشاعروں کی تفصیلات کے ساتھ شائع کیا ہے، اور جگہ جگہ طرحی غزلوں پر نوٹ لکھتے ہوئے معاصر سخن وروں کے بارے میں مفید معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ ان کے کلام میں سلاست، صفائی، ندرت اور تکرارِ لفظی کا حسن ملتا ہے۔ حیدرآباد میں زندگی کا بیشتر اور اچھا زمانہ آزاد انصاری نے بتایا اور یہاں کے سخنوروں سے داد حاصل کی۔

(ادارہ)

رحم نہ کھانا ٹھیک نہیں ہے
دیکھ! ستا کر کچھ نہ ملے گا

دیکھ۔ ظالم! ہمیں تشریح پہ مجبور نہ کر
جاننے والے نے جو کچھ تجھے جانا۔ جانا

صرف اک نظر اٹھا کر قصّہ تمام کر دے
ان چشم پوشیوں سے کچھ فیصلہ نہ ہوگا

رحم کر اور در گذر فرما کہ لاگ اچھی نہیں
وہ تعلق مٹ چکا۔ وہ واسطا جاتا رہا

تم جبر کیے جاؤ، ہم صبر کیے جاتے ہیں
اللہ تو منصف ہے، اللہ جزا دیگا

پھر تلخیٔ غم دو جہاں حد سے بڑھ چلی
ساقی! پھر ایک جام مئے خوشگوار کا

اگر جانا ہی تھا، جاتے مگر اتنا بتا جاتے
یہ آنا ہے تو کیا آنا، اِدھر آنا، اُدھر جانا

وہ اک حیرت فزا ساعت، وہ اک بالکل نئی حالت
وہ اک جلوہ نظر آنا، وہ اک عالم گزر جانا

تمہارا ماننا طاقت سے باہر تھا، مگر مانا
تمہارا جاننا اِمکان سے خارج تھا، مگر جانا

ہم یوں گنوا کے بیٹھے ہیں سرمایۂ شکیب
جیسے کوئی غریب مسافر لُٹا ہوا

جب تک اہلِ دل و نظر نہ بنے
آدمی کام کا نہیں ہوتا

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی
ذرا آہستہ آہستہ اُدھر رجحان پیدا کر

اگر آزاد سادہ دیش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا، اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

کس کی لگاوٹ، کس کی لاگ
بھاگ، بلائے عشق سے بھاگ

دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر!
دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ

کمالِ عالمِ بے چارگی ہے
ستم ہائے تمنا دیکھتا ہوں

وفا کر، وعدۂ فردا وفا کر
نظر ہے، کب سے رستا دیکھتا ہوں

کبھی دن رات رنگین صحبتیں تھیں
اب آنکھیں ہیں، لہو ہے اور میں ہوں

اِدھر فکرِ دنیا، اُدھر خوفِ عقبیٰ
پریشانیوں پر پریشانیاں ہیں

اب آنکھیں نہیں جاگتی تو نہ جاگیں
کہ اب روح ہے اور بیداریاں ہیں

زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صرف یہ جانا۔ یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں

عقل والو! عقل پر غرہ تو اک حد تک درست
لیکن اُس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں

سُن، بہ بنلسے تجربہ میرا خیال سُن
آفت کا سامنا ہو۔ ترا سامنا نہ ہو

وہ آنکھیں، جو کبھی پروانہ رخسار تاباں تھیں
اَب اُن کو گریۂ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ

حادثاتِ دہر کے شکوے فضول
کڑوی میٹھی سب گوارا چاہیئے

حضرتِ آزاد! یوں بیدل نہ ہوں
اُس کی رحمت پر بھروسا چاہیئے

بس اب تم کو تغافل ہی مبارک
ہمیں تھوڑا بہت صبر آچلا ہے

خوشا وہ دِن! کہ جب تو مہرباں تھا
وہ سین آنکھوں میں اَب تک پھر رہا ہے

وہ دوستوں کے جلسے۔ وہ دِل لگی کے سَاماں
گزرا ہوا زمانہ آنکھوں میں پھر رہا ہے

نہ دیوار کا نام باقی نہ در کا
ہمارا مکاں ہر طرح لامکاں ہے

ہو سکے تو کبھی الفت کی نظر سے دیکھو
اِس نگاہِ غلط انداز میں کیا رکھا ہے

اب تمنائے وفا ہو تو خدا راس نہ لائے
کونسا ظلم ہے جو تم نے اُٹھا رکھا ہے

جب ہمیں بزم میں آنے کی اجازت نہ رہی
پھر یہ کیوں پرسشِ حالات ہے، یہ بھی نہ سہی

اب میں ہوں اور کوششِ ترکِ تعلقات
شاید یہی علاج کوئی فائدا کرے

درویش کی پرکھ ہے تو درویش کی سُنو
درویش کی صدا ہے کہ "داتا بھلا کرے"

اب نہ پرواز کی طاقت، نہ رہائی کی ہوس
رحم کر، رحم، پر و بال کترنے والے

التماسِ شوق سے کیا فائدہ
جانتا ہوں بات خالی جائے گی

مشکلاتِ عشق سے گھبرا نہ جانا چاہیئے
مشکلاتِ عشق کا مشکل کشا بھی عشق ہے

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیوں کر کیجیے
زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے

آؤ اب آزاد! آس مار بیٹھیں اور جپیں
آتما بھی عشق ہے، پرماتما بھی عشق ہے

فیض اُٹھانا ہے تو چل خدمتِ آزاد میں چل
کہ فقیروں کی توجہ میں اثر ہوتا ہے

خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ
کہ یاس چارۂ تکلیفِ انتظار کرے

بہر رنگ

اس عنوان کے تحت ہندو پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا (ادارہ)

ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی

قاہرہ اور عرب تمدن

لڑکپن سے ایک کتاب نے مجھے اپنی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کر رکھا ہے یعنی "الف لیلیٰ"۔ آج سے آدھی صدی قبل جب میں اسکول میں پڑھتا تھا اسی زمانے سے پتا جی نے انگریزی کہانیوں کی کتابیں لا لاکر پڑھنے کی عادت ڈال دی تھی۔ اور اسی طرح نصاب سے باہر کی کتابیں پڑھنے کا مجھے چسکا لگا۔ پتا جی خود یہ کتابیں ہریسن روڈ Harison Road کے موڑ کی پرانی کتابوں کی دو دکانوں سے لے آتے تھے۔ ان دنوں عام طور پر کسی اسکول میں بچوں کی لائبریری نہیں تھی اور ہمارے گھر میں بھی زیادہ کتابیں نہیں تھیں دادا جان کی ملکیت میں چند سنسکرت کتابیں، رسالے اور دو چار انگریزی کتابیں تھیں۔ ۱۸۸۰ء میں چھوٹے چھوٹے ٹائپ میں چھپی ہوئی ایک موٹی ولایتی کتاب The Arabian nights Entertainments (الف لیلیٰ) جس کے ہر صفحے کے اوپر ایک تصویر تھی اور جہاں تک حافظہ کام کرتا ہے وہ تصاویر مسٹر ہوتی ٹانی ایک مصور کی بنائی ہوئی تھیں جو لکڑی سے بلاک بنا کر چھاپی گئی تھیں۔ لیکن دادا جان کے خزانۂ کتب میں میرے سب سے زیادہ دلچسپ اور مانوس سے پڑھی ایک کتاب "الف لیلیٰ" تھی۔ لغت سے مشکل انگریزی الفاظ کے معنی دیکھ کر پڑھنے کی عادت ان دنوں مجھ میں نہیں تھی۔ جہاں تک سمجھ سکتا تھا۔ بس یوں ہی پڑھتا رہتا تھا اور جب تک کہانی ختم نہ کر لیتا مجھے چین نہ آتا۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ لغت کی مدد لیتے ہوئے بھی پڑھتے رہنا زبان کے سیکھنے میں مفید ہوتا ہے۔ بہرحال "الف لیلیٰ" کی کہانیاں پڑھ کر، لڑکپن ہی سے مسلمان عرب دنیا کے متعلق میرے ذہن میں ایک ہلکا سا عکس یا نقش قائم ہو چکا تھا اور اس سے بہت اچھی طرح واقف ہونے کی تمنا میرے دل میں گھر کر چکی تھی۔ بڑے ہو کر "الف لیلیٰ" کے سلسلے میں اور کئی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ سر رچرڈ برٹن کا مکمل ترجمہ اس کے علاوہ قدیم مسلم عرب کے تمدن کے سلسلے میں بھی چند مضامین کا بڑے شوق سے مطالعہ کیا۔ بین اقوامی ادب میں "الف لیلیٰ" کا مقام کیا ہے اس پر بنگلہ اور انگریزی میں خود بھی کئی مضمون لکھے ہیں۔ دور وسطیٰ کے عرب تہذیب و تمدن کے مراکز، عراق، شام، مصر اور ان کے دارالسلطنت بغداد، دمشق اور القاہرہ یا قاہرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش ایک عرصے سے میرے دل میں تھی۔ لیکن ان مقامات کو دیکھنے کا موقع ملتے ملتے عمر بڑھاپے کی سرحد میں داخل ہو گئی۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں یورپ سے لوٹتے وقت قاہرہ میں ایک ہفتہ قیام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۵ء میں بھی دو رات کے لئے قاہرہ میں ٹھہرا اور پھر جولائی ۱۹۴۹ء میں چھٹے دن کے لئے گیا تھا۔ اس طرح خوش قسمتی سے اسلامی ثقافت کا مرکزی عرب دیکھنا نصیب ہوا۔ پھر ۱۹۵۱ء میں دس دن (لبنان کے دارالسلطنت) بیروت میں اور ایک دن دمشق میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ ان کے علاوہ کسی دوسرے عرب شہر کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ صرف آتے جاتے عراق کے شہر بصرہ اور سعودی عرب کے دہران کے ہوائی اڈے پر گھنٹہ بھر اترکر ٹہل قدمی کی ہے۔ عرب کے ان شہروں یعنی قاہرہ، بیروت اور دمشق کے علاوہ دوسری آزاد اسلامی ریاستوں کے چند مقامات میں بھی دو چار دن رہا ہوں۔ ۱۹۴۹ء میں ترکستان کے شہر استنبول میں سات

دن اور [illegible] میں ایران کے دارالسلطنت تہران میں چھ دن گزارے ہیں۔ ترکی تمدن اور ایرانی تمدن کے مرکزوں کی حیثیت سے ان شہروں اور عرب کے شہروں میں فرق پایا جاتا ہے۔ یعنی ان شہروں کا ایک مخصوص انداز ہے۔ انفرادیت ہے حالانکہ ان سب شہروں میں اسلامی ماحول کی وجہ سے مسجدوں کے گنبد، مینار، پرانی سرائیں اور محلات بکثرت ہیں اس کے باوجود بہت سی باتوں میں یکسانیت نہیں پائی جاتی ہے۔

قاہرہ، مصر کا صدر مقام ہے، مصر دریائی ملک ہے، مصر دریائے نیل کا تحفہ ہے۔ دور دور تک پھیلے ہوئے ریگستانی ملک میں یہ دریائے نیل جس کے دونوں کناروں پر ہرے بھرے کھیت اور کھجور کے جنگل۔ جیسے چوڑے اور سبز رنگ کا ایک فیتہ، بل کھاتا ہوا دور تک ریگستان کے سینے پر بہتا چلا گیا ہے۔ اب قاہرہ کا اثر پورے عرب کے تمدن پر غالب آچکا ہے اور ایران کے علاوہ تمام اسلامی دنیا کی تہذیب کا یہ ایک اہم مرکز ہے۔ اب عرب کے دونوں قدیم شہر مکہ اور مدینہ، نیز قدیم بغداد، دمشق، پوستات یا قدیم قاہرہ، "فج" قائم دیاں، "گرانادا" قرطبہ، [illegible] وغیرہ میں کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ مکے میں خانہ کعبہ اور مدینے میں پیغمبر اسلام کا مزار مقدس ہونے کی وجہ سے ہر سال لاکھوں مسلمان حج کے لئے آتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ دونوں شہر نہایت بارونق ہیں۔ دمشق، قاہرہ سے پرانا شہر ہے۔ لیکن اب قاہرہ کی چمک دمک کے سامنے وہ ماند پڑ چکا ہے۔ بغداد بھی دمشق کی طرح تین سالوں سے تین ہزار سال کا قدیم شہر نہ ہونے پر بھی عباسی خلفاء کے عہد میں (۷۴۸ء تا ۱۲۵۸ء) اسلامی ثقافت ہی نہیں بلکہ اس کا دور کا بین الاقوامی تہذیبی مرکز رہا ہے۔

عرب کی تہذیب اور فنونِ لطیفہ نیز وہاں کی معاشرتی زندگی اور "الف لیلیٰ" کی اس عجیب و غریب دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھ آنے کی تمنا لے کر میں قاہرہ گیا۔ قاہرہ کی روز افزوں اہمیت اور سب کی توجہ کا مرکز بن جانے کے میرے نزدیک چار سبب ہیں۔

۱۔ مصر کے قدیم باشندے Firaun (فراعنہ، مصر) تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح میں اس سرزمین پر آباد ہو کر حکمران کی حیثیت سے تیسری صدی عیسوی تک وہ لوگ اس خطے پر قابض رہے۔ اس طویل مدت کی نشانیاں اب بھی مصر کے چپے چپے پر پھیلی ہوئی ہیں مختلف مجسمے، مورتیاں، تصویریں، قلمی کتابیں، زیور، اوزار، ہتھیار اور گھریلو استعمال کی چیزوں کا ایک قیمتی ذخیرہ اکٹھا کر کے قاہرہ کے میوزیم میں رکھ دیا گیا ہے۔ فرانسیسی عالموں کی کوشش سے یہ عجیب و غریب میوزیم وجود میں آیا۔ خصوصیت کے ساتھ اس میوزیم کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ قاہرہ آتے ہیں۔

لندن کا برٹش میوزیم، پیرس کا عجائب گھر Louvre میوزیم، برلن کا Anthropological Museum یعنی علم الانسان یا تشکیل سیرت کے علوم سے متعلق عجائب خانہ، اٹلی کے شہر تورن کے میوزیم کی طرح قدیم مصر کی تہذیب سے متعلق بہت سی بیش قیمت چیزیں یہاں محفوظ ہیں۔ قدیم مصر کی چیزیں میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ کے سفر میں قاہرہ کے میوزیم کی سیر میرے پروگرام میں نہ تھی۔

۲۔ مصر میں تیسری اور چوتھی صدی عیسوی سے عیسائی مذہب پھیلا اور اس کو قبول کرنے کی وجہ سے مصر والوں میں نئی طرز فن تعمیر ابھرا۔ اس فن کو "Coptic" (کوپٹک) کہتے ہیں۔ اس فن تعمیر کی گرجائیں طرح طرح کی فنکارانہ تصاویر، تصانیف اور برتن وغیرہ اس میوزیم میں محفوظ ہیں ان "کوپٹک" فن پاروں کو بھی دیکھنے کے لئے ماہرین اور عالم قاہرہ آتے ہیں۔

۳۔ قاہرہ کے پرکشش ہونے کا تیسرا سبب اس کی تاریخ کا وہ دور ہے جو ۶۴۰ء سے شروع ہو کر زمانہ حال تک آ جاتا ہے ساتویں صدی سے لے کر اب تک مصریوں اور عربوں (مسلمانوں) کی تہذیب و تمدن، علم و فن اور ان کی مذہبی اور سماجی زندگی میں تبدیلیوں اور ان کی رفتار کا اندازہ بھی اس شہر کی سیاحت میں ہو جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے مسلمانوں کے فن اور معاشرت کا بڑا حصہ آج بھی قاہرہ کی روزمرہ زندگی میں رطوبت [illegible] "الف لیلیٰ" کی حقیقی تصویریں دیکھنی ہوں تو مسجدوں اور محلات کے اس شہر کو دیکھنا ضروری ہے۔

ورنہ ہم اس تصوراتی دنیا کی کوئی مکمل تصویر نہیں بنا پائیں گے۔ جس طرح عہد وسطیٰ کی ہندو تہذیب کو جاننے کے لئے سانچی، جے پور، کھنڈالہ، پلاری، پونا، ناسک، کانجی، مدورا وغیرہ دیکھنا ضروری ہے یا یورپ کی تہذیب سمجھنے کے لئے بڑے بڑے قدیم گرجاؤں سے سجے سجائے شہروں کو دیکھنا چاہئے یا پھر ہندوستانی مسلمانوں کے فن تعمیر کو سمجھنے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کے اہم مراکز مثلاً دہلی، لکھنؤ، جون پور، حیدرآباد وغیرہ کو دیکھنا پڑے گا۔ (جو میں نے دیکھے ہیں) قاہرہ کے حالیہ سفر کا مقصد یہ تھا کہ وہاں مختلف عہد کی مسجدیں، محلات اور دوسری قابل دید عمارتیں دیکھوں گا، عرب کی کاریگری سے آگاہی حاصل کروں گا اس طرح مذہب اسلام نیز عرب قوم کے متعلق اپنی معلومات کو اور زیادہ وسیع کرنے کی غرض و غایت اور شوق لے کر میں قاہرہ گیا۔

اب رہا قاہرہ کی سیاحت کا چوتھا سبب وہ یہ ہے کہ جدید تبدیلیوں کی روشنی میں مسلم تہذیب اور عرب کے مسلمانوں کا سماجی ماحول، ان کا جدید عربی ادب، فلسفہ اور سائنس اس کے علاوہ مصر عوام کی سیاسی اور معاشرتی ترقی اور دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ عرب کے مردوں اور کے لوگوں کے تعلقات اور ان کے موجودہ رجحانات اور سیاسی جدوجہد میں ان کی روش و رفتار اور طریقہ کار، غرض ان تمام چیزوں کا نہایت غور کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ کرنا چاہتا تھا اور جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا میں نے ان تمام امور اور معاملات کو دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی کوشش کی اور بہت سی باتوں کا علم حاصل کیا۔

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس شہر کا عربی نام القاہرہ ہے۔ اٹلی، انگریزی اور فرانسیسی میں لفظ "کایرو" Cairo کایری Cairo ہوگیا ہے۔ غرض (۱) قدیم عیسائی مصری تہذیب (۲) کوپٹک فن کے نمونے (۳) الف لیلوی دنیا اور (۴) جدید عرب معاشرت انھیں چار چیزوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے میں قاہرہ گیا تھا۔

"الف لیلیٰ" بین الاقوامی طور پر ایک ہر دل عزیز کتاب ہے۔ ہماری "مہابھارت" کی طرح اس کا بھی کوئی ایک مصنف نہیں ہے۔ یہ چند بے نام و نشان فنکاروں کی تخلیقی کاوش کا نتیجہ ہے۔ مقام تالیف بھی کوئی ایک شہر یا ملک نہیں ہے۔ عراق، شام، مصر، ان تینوں ملکوں کا تذکرہ اس میں موجود ہے۔ اس کتاب کی تالیف یا تخلیق کی ابتداء اندازاً سنہ ۸۰۰ء میں ہوئی اور سنہ ۱۶۰۰ء میں یہ تکمیل کو پہنچا یعنی آٹھ سو سال کے عرصے میں بتدریج اس نے ارتقائی مرحلوں کو طے کیا۔ عرب تہذیب کے عہد وسطیٰ کی مکمل تصویریں اور بھرپور ادب اس کتاب میں دیکھ لیجئے۔ سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۶۰۰ء تک کا پر رونق اور باوقار عرب تمدن اور اس کی ترقیاں اس میں نظر آجاتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک بلند پایہ فن پارہ بھی ہے۔ اس کا مرکزی ملک تو مصر ہے (خاص کر شہر قاہرہ) لیکن سیریا، عراق، نیز شمالی مغربی افریقہ اور اسپین کی مختلف مضبوط و دلکش عمارتوں کا ذکر عربی بولنے والوں کی صنعت و حرفت کا حال، اور ان کی مرصع کاری، حسین مناظر، رنگین زندگیاں اور طرح طرح کے دل فریب مرقعے اس کتاب کے ورق ورق میں موجود ہیں۔

قاہرہ کی مسجدیں، محل اور پرشکوہ عمارتیں ان کے علاوہ فن تعمیر کے بعض شاہکار مثلاً عمرو ابن العاص (سنہ ۶۴۰ء) احمد بن طولون (۸۷۹ء) فاطمہ، ایوبی اور دوسرے عہد کے سلطانوں کی طرح طرح کی مسجدیں، عمارتیں، چھوٹی بڑی درس گاہیں، سبیل، مقبرے، مزارات، قلعے، پل، دواخانے، سرائیں، تعلیم گاہیں، درگاہیں اور امیروں کے محلات وغیرہ کا ایک طویل و حسین سلسلہ ہے جو ایک لافانی خزانے کی صورت میں محفوظ ہوگیا ہے۔ علم و حسن کے پرستاروں کے لئے اس عظیم تصنیف میں دل بستگی، واقف کاری، لطف و لذت اور پند و عبرت کا بڑا عبرت افزا سامان موجود ہے۔ فن تعمیر میں عربوں کی مہارت اور کمالات کے ساتھ ساتھ فن مصوری میں بھی یہ لوگ (اسلامی عرب) ممتاز تھے۔ چنانچہ جزیرۂ سسلی، سیریا اور عراق کی شاہی عمارتوں کے نقش و نگار قلمی تصانیف میں ان لوگوں کی بنائی ہوئی تصویروں میں فن کی کوئی خوبی اور بلندی ایسی نہیں جو نہ پائی جاتی ہو۔

[illegible] کے ابتدائی دور میں عراق اور سیریا میں جو مصور کتابیں تیار کی گئی ہیں۔ اُن میں عرب کی شہری زندگی کے جن پہلوؤں کو رنگا رنگ تصاویر کے ذریعے اُجاگر کیا گیا ہے۔ وہ عکسی اور جربے ہیں اُنھی رنگین زندگی کے جن کے تذکرے الف لیلہ میں ملتے ہیں۔ عراقیوں کی تیار کی ہوئی مصور کتابیں کچھ اور عربی تصانیف "مقامات الحریری" کے چند قلمی نسخے آج بھی پیرس، لینن گراڈ اور لندن کے عجائب خانوں میں محفوظ ہیں اُن کے مطالعے سے میرے خیال کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ ہمارے یہاں جس طرح مصوروں نے اجنتا کی جیتی جاگتی تصویروں میں قدیم ہندوستان کی رواں دواں زندگی کو زندۂ جاوید بنایا ہے بالکل اُسی طرح یحییٰ بن محمود جیسے باکمال مصوروں نے عہد وسطیٰ میں عرب قوم کی روز مرہ کی زندگی کو پُرکشش، حقیقی اور دوامی حیثیت عطا کر دی ہے۔

جنوبی اٹلی کا شہر "پومپئی" Pompei کے کھنڈرات کے در و دیوار پر اجنتا کی طرح کے جو نقش و نگار پائے گئے ہیں۔ اُن میں ہم کو قبل مسیح کے رومن باشندوں کی زندگی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح عرب نقاش کی ان تصویروں میں بھی اُن کی سماجی زندگی کا عکس پایا جاتا ہے۔ مسلم عرب دنیا کے اس زریں دور کے یہ نقوش بڑی احتیاط کے ساتھ سنہرے روپہلے اور مختلف قسم کے رنگوں سے بنائے گئے ہیں جو اتنے جاذب نظر ہیں کہ ہماری نگاہیں کچھ دیر کے لئے اُن پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ عرب کے ہر طرح کے مردوں، عورتوں کے چہرے، لباس، بناؤ سنگھار، سر کے بال، داڑھی مونچھ، عادات اطوار اور چال چلن غرض ان تمام چیزوں کو بڑی خوبصورتی اور بڑی مشاقی اور مہارت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اور جن دوسرے ملکوں سے اُن کے تعلقات تھے مثلاً عباسی عہد میں عراق والوں سے یا ہندوستانی جہازیوں، غلاموں، سادھو اور سنیاسیوں وغیرہ کی متعدد تصویریں۔ عرب کے ریگستانی علاقوں میں اونٹ یا بکرے کی کھال سے تیار کئے ہوئے خیمے قریب ہی ریت میں گڑے ہوئے لمبے لمبے برچھے، عرب شیخ یا سردار کے انصاف کا منظر جس میں پردہ نشین عورتیں بھی نظر آتی ہیں، شہری عمارتیں، شاہی محل، مسجدیں، علالات، سرائے، باورچی خانے، دکانیں، کتب خانے اور بازار وغیرہ۔ گھوڑ سوار دوسرے فوجی سپاہی، ہندوستانی مصوری میں ہاتھی کی جو اہمیت ہے وہی اہمیت عرب مصوری میں اونٹ کی ہے۔ کارواں، خیمے اور خیموں کے سامنے امیر تاجر یا درمیانی طبقے کے لوگ آرام کر رہے ہیں۔ مال لے جانے والے اونٹ، اور اُن کا نگراں، باورچی جو پکانے میں مشغول ہے۔ عالم فاضل، شاعر، استاد اور اُن کے شاگرد اور پیر و کار بیٹھے ہوئے گفتگو میں مگن ہیں۔ سندباد کے سفر نامے میں بیان کئے گئے درخت، پھل پھول، پرندے اور بندروں سے آباد حسین دکھن یورپی ایشیا کے جزیرے ـــــ امام، مذہبی درس دے رہے ہیں۔ سامنے بیٹھے ہوئے یا گھوڑوں پر سوار سامعین، اونچی جگہ پر سلطان یا حاکم تخت نشین ہے۔ اور محل میں شاہی محل کی بیگمات ہیں۔ یہ [illegible] کی مذہبی درسگاہ کا منظر ہے زچہ خانے کے مناظر، روتے ہوئے عزیزوں کے درمیان جنازہ، دعوت۔ دسترخوان پر رکابیاں اور چاروں طرف دائرے میں بیٹھے کھانا کھاتے ہوئے لوگ۔ حجامت خانہ۔ دکان اور گاہک، ریگستان میں اونٹ پر سوار عرب کی عورتیں اور گھوڑے پر سوار مرد۔ گھوڑے کی رفتار کے ساتھ ساتھ سوار کا ہلتا ہوا جسم ـــــ اس طرح کی اَن گنت تصویریں ہیں جن میں آج سے ۷، ۸ سو سال قبل کی عرب دنیا کو منقوش اور محفوظ کر دیا ہے۔ اس دور سے قبل یا اس کے بعد عرب کی زندگی کو اس طرح سے فنکاروں نے تصویروں کے ذریعہ کبھی اُجاگر نہیں کیا ہے۔ لیکن ان تصویروں میں پومپئی Pompei کی رومانی مصوری یا ہندوستان کے اجنتا کی مصوری کی طرح مرد و زن کے جسمانی اتصال، حسن و عشق یا پیار و محبت کے رومانی مناظر نہیں ہیں۔ حالانکہ اس دور کے عربی ادب میں مجازی اور حقیقی عشق و محبت کے بیانوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات قابل غور یہ ہے کہ ابتدائی عرب سامرا، خلیفہ یا سلطان کے عہد کی رنگین عریاں تصویریں، سیریا کی مشرقی سرحد میں امیروں کے شاہی محلات کے [illegible]

چاہت سے نظر آتی ہیں۔ یہ گلیاں، محسن دمشق کے معاصر مسلم عرب کے قدیم ترین باشندوں کی معاشرت کے نمونے ہیں۔ یہ ۱۸۰۰ء کے عیسائی عہد کے سلاطین وشہزادوں کا دور ہے۔ اب یہ محض دورِ قدیم کی ایک یادگار بن کر رہ گئی ہیں۔ رفتارِ زمانہ نے جدید قاہرہ کو سر سے بدل ڈالا ہے اور تمدن کے تیز بہتے ہوتے دھارے میں وہ دورِ قدیم کہیں گم ہو کے رہ گیا۔

میں عرب یا مسلم فنِ مصوری یا صنعت پارچہ بافی کا ماہر نہیں ہوں پھر بھی کئی چیزیں مجھے بے حد پسند آئی تھیں اور ان چیزوں کو میں بے شک چاہنے لگا ہوں کہ تسکینِ دل کی خاطر ان تصویروں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہتا ہوں، اُن کے سلسلے میں کتابیں پڑھتا ہوں اور ان کے مطالعے کے ساتھ اپنا وقت گزار لیتا ہوں۔

عرب کے معاشرے میں زندگی کے جواہر، مستقل مزاجی اور مردانہ پن کی خو، اور جیسی طاقت و قوت ہے وہ دوسرے اسلامی ملکوں میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ بے شک آگرے کا تاج محل نہایت حسین ہے، دلکش ہے، سفید پتھروں پر نازک کام واقعی جاذبِ نظر اور فرحت بخش ہے۔ لیکن قاہرہ کی احمد ابن طولون، ابن قلاوون، سلطان بیبرس، سلطان حسین اور سلطان قاعت بائی کی مسجدیں اور دوسری عمارتیں (جو خاص کر مدرسوں سے متصل مسجدیں) اور مدرسے ۔۔۔ اسی طرح کی بے شمار عمارتوں کا حسن بھی لاجواب اور بے مثال ہے۔ خالص عربی طرز (صحن، چاروں طرف "LIWAN" یا بیرونی صحن) قبلہ اور مینار سے آراستہ اور مزین مسجدیں کس طرح رفتہ رفتہ گنبد والی ترکی مسجدوں کے طرز پر تعمیر ہونے لگیں۔ اور اسلامی تہذیب یعنی دین کی ارتقاء میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے یہ بھی قابلِ غور ہے۔ لیکن میں اُس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں اور تصویریں موجود ہیں۔ جن حضرات کو (اس تہذیب یعنی دین) سے دلچسپی ہے ان کی تسکین اور معلومات کے لئے مغربی زبانوں میں بہت بڑا خزانہ موجود ہے۔

(ترجمہ: شانتی رنجن بھٹاچاریہ) (بکھرے ورق مطبوعہ ۱۹۶۸ء سے)

غزل

احمد ندیم قاسمی

اہلِ ثروت پہ خدا نے مجھے سبقت دے دی
اُس کی رحمت نے قلم کی مجھے دولت دے دی

خیمہ زن عشق کو دیکھا اُفقِ فردا پر
میں نے فن میں، اِسی اک خواب کو وسعت دیدی

وہ کبھی مہر، کبھی ماہ، کبھی دن، کبھی رات
اتنی کثرت کو مرے ذوق نے وحدت دے دی

اپنے اشکوں سے شکوے کا محل ہو تو کروں
غم دیئے ساتھ ہی غم سہنے کی راحت دیدی

اس کا احساں کہ جو نفرت کا ہدف ہیں کب سے
مجھ کو ان خاک نشینوں کی محبت دے دی

مجھ سے کافر پہ فرشتے کا اُترنا ہی غضب
پھر ستم یہ، اُسے اِنسان کی سیرت دے دی

آئینہ دیکھتے ہی میں نے پلٹ کر دیکھا
عشق نے جیسے مجھے تیری بھی صورت دیدی

علم نے آخری نکتہ مجھے یوں سمجھایا
لے کے تکمیل کی نخوت مجھے حیرت دے دی

(نقوش، لاہور، سالنامہ جنوری ۱۹۸۰ء)

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

■ پرانوں کی کہانیوں : مصنف، گوپی چند نارنگ

قیمت : ۸ روپیہ ۲۵ پیسے، تقسیم کار : مکتبۂ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی

ڈاکٹر ذاکر حسین کی یاد میں نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی جانب سے شائع ہونے والی یہ کتاب ۲۲ کہانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دیدہ زیب ٹائٹل خوبصورت کتابت اور طباعت سے آراستہ ۱۵۱ صفحات کی ضخامت رکھتی ہے۔ یہ کہانیاں نئی نہیں ہیں لیکن بالکل نئے انداز میں پیش کی گئی ہیں۔ اسلوب بیان کی سادگی کے باعث ابتدائی جماعتوں کے طلبا کو بھارت کے تہذیبی اور ثقافتی ورثے سے روشناس کرانے کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گی۔ کہانیوں کے اس مجموعہ کو ان کے پس منظر کے ساتھ دیکھنا ہوگا کہ کہانیاں ممکن الوقوع ہیں یا نہیں کہانیاں قیاس اور حقیقت کی کسوٹی پر جانچی جاسکتی ہیں یا نہیں ؟ اور کہانیاں خوردبینی نظر تنقید کی متحمل ہوسکتی ہیں یا نہیں ؟ ان میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے ان سے کیا سبق ملتا ہے اور اس سبق سے نونہالوں کی نشو و نما پر کیا اثر پڑتا ہے ؟ اس کو پیش نظر رکھ لیا جائے تو اس کتاب کی افادیت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس کتاب سے متعلق ہمیں ایک ہی شکایت ہے، وہ یہ کہ اردو کتاب کی صفحات شماری انگریزی میں کی گئی ہے، اسی طرح قیمت بھی انگریزی میں درج ہے، ایسا کیوں کیا گیا ہمارے پلے نہیں پڑا۔

غلام جیلانی

■ لفظوں کا پیرہن (شعری مجموعہ) بدیع الزماں خاورؔ

قیمت ۷/= روپے، صفحات (۱۱۲) کرادن مجلد، ناشر : پی۔ کے۔ پبلیکیشنز، دریا گنج دہلی ۲

ڈاکٹر مظفر حنفی نے اس کتاب کے پیش لفظ میں یہ تسلیم کیا ہے کہ بدیع الزماں خاورؔ بسیار گو شاعر ہیں، ہر چند کہ وہ بسیار گوئی کو برا نہیں سمجھتے۔ مگر شہرت صرف انہی شاعروں کو ملتی ہے جو سنتم نتم کر کہتے ہیں اور سوچ سمجھ کر کہتے ہیں، فراقؔ کی طرح جلد ممکنہ قوافی کے امکانات کو چمکانے میں اپنی صلاحیتیں صرف نہیں کرتے بلکہ وہ بات کہنا چاہتے ہیں جو "کوئی بات" تو ہو۔

"لفظوں کا پیرہن" اسی بسیار گوئی کا شکار نظر آتا ہے۔ اور لطف یہ کہ ان کے قلم سے جو نکلا اسے خاورؔ صاحب نے مجموعے میں شامل کر لیا ہے اور مجموعہ چھپوا لینے کی سہولتیں انھیں ان کی تہذیب و ترتیب سے دور رکھتی ہیں۔ بہتر ہوتا اگر وہ اپنی جملہ تخلیقات کا ایک انتخاب شائع کرتے۔ "لفظوں کے پیرہن" کی شاعری سیدھی سادھی خط مستقیم کی شاعری ہے۔ جس میں بقول (رشید احمد صدیقی) خوبی یہ ہے کہ کوئی خرابی نہیں، اور خرابی یہ ہے کہ کوئی خوبی نہیں"۔ مزے کی بات تو یہ کہ خود خاورؔ صاحب کو بھی اس کا احساس ہے۔ ان کا مقطع ہے ہے

عمر تقلید میں کاٹو گے کہاں تک خاورؔ اپنا انداز کرو شعر میں پیدا، اب تو

رؤف خیر

■ گوپال متل : ایک مطالعہ   از محمد عبدالحلیم (ایم اے عثمانیہ)
قیمت ۱۵/ روپے، صفحات (۱۱۲) ڈیمائی سائز ، ناشر: نازش بک ڈپو، ترکمان گیٹ۔ دہلی ۶

"گوپال متل" جیسی پہلو دار شخصیت پر سکھنے کے لئے ذہین آدمی کی ضرورت تھی، جو گوپال متل کی شخصیت کو اچھی طرح ہضم کر کے مکمل ہو ۔ اس کے نظریات پر بات کر سکے، اس کی شخصیت کے پیچھے چھپے ہوئے گوشوں تک رسائی حاصل کر سکے ۔ عبدالحلیم کی یہ کتاب صرف اس لئے قابل معافی قرار نہیں دی جاسکتی کہ یہ ان کا وہ مقالہ ہے جسے انہوں نے ایم۔ اے سال آخر کے لئے لکھا۔ اس قسم کے مقالے صرف ذاتی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ممتحن کے لئے چیلنج، مگر جب یہ مقالے کتابی صورت اختیار کر جاتے ہیں تو صرف طالب علم اور ممتحن کا معاملہ نہیں رہ جاتا ۔

ہند و پاک میں گوپال متل کی ادبی، سیاسی، صحافتی حیثیتیں مسلم ہیں مگر اس سے فاضل مولف نے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا ۔ یہ کتاب بجائے خود ایک مقالہ ہی ہے جو ممتحن کے نقطۂ نظر سے بھلے ہی زیادہ نشانات دیئے جانے کے قابل ہو، مگر اس سے نہ گوپال متل کا مکمل تعارف حاصل ہوتا ہے اور نہ ادب ہی کا بھلا ہوتا ہے ۔ ہرچند کہ اس مقالے کو کتابی صورت دینے میں محمود سعیدی کا طویل پیش لفظ اور کتابیات، حوالہ جات اور بیشتر جملوں کی ناگوار تکرار نے اہم رول ادا کیا ہے ۔
کتاب تجارتی نقطۂ نظر سے چھاپی گئی ہے اس لئے اگر قیمت زیادہ ہو بھی تو اداروں کے لئے لمحۂ فکر ہوگی، عوام کے لئے تو اس کی قیمت بہرحال زیادہ ہے ۔

رؤف خیر

■ پورن کمبھ : مصنف رانی چند، ترجمہ: شانتی رنجن بھٹاچاریہ
صفحات ۳۳۶، قیمت ۱۶/۷۵ روپے، طباعت ۱۹۷۶ء
ناشر: نیشنل بک ٹرسٹ، تقسیم کار: مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ ۔ دہلی

مشہور بنگالی ادیب رانی چند کی کتاب کا بنگالی زبان سے اردو میں بڑی قابلیت، خوبصورتی اور کامیابی سے ترجمہ کیا گیا ہے یہ کتاب یوں تو سفرنامہ ہے لیکن قاری اس کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ٹیلی ویژن سیٹ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور پورن کمبھ کے وقت گنگا ماتا کے کنارے جو واقعات و حادثات ہوتے ہیں انھیں دیکھ رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان واقعات و حادثات پر رواں تبصرہ بھی سُنے جا رہا ہے ۔ انداز بیان مصورانہ، نگہ ناقدانہ، اور جذبات نگاری ماہرانہ ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ نے اس ترجمہ کی اشاعت سے اردو زبان کے سرمایۂ ادب میں بیش قیمت اضافہ کیا ہے ۔ اردو کے بنگالی ادیب اور مصنف شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے، ترجمہ سلاست، روانی اور دلچسپی سے کیا ہے اس کے لئے وہ اہل نظر افراد کی طرف سے مبارکباد کے مستحق قرار پاتے ہیں ۔
ہم قارئین "سب رس" سے اس بات کی پرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب کو خریدیں اور پڑھیں اور ہمیں یقین ہے کہ وہ ہماری سفارش پر عمل کرنے کے بعد کسی قسم کے پچھتاوے سے دوچار نہیں ہوں گے ۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا سے ہم ایک بار پھر یہ شکایت کریں گے کہ صفحات، شماری اور قیمت کا "انگریزی" اندراج کچھ مناسب نظر نہیں آتا ۔

غلام جیلانی

... ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ : علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

یکم مئی : مسٹر آر گنپت راؤ بیدر نرسی کی ادارت میں ایک اردو ہفتہ وار "بھارت آزادی کے بعد" کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا

۱۷ مئی : جنوبی ہند کے مشہور فلاحی ادارہ "ادبی ٹرسٹ" حیدرآباد کا گیارہواں سالانہ کل ہند مشاعرہ ریاستی وزیر اوقاف و حج جناب ایم ایم علی انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کرناٹک کے وزیر سیاحت جناب محمد علی نے ساغر کی رسم اجراء انجام دی۔ قونصل جنرل ایران آقائی محمد علی خانی مہمان خصوصی تھے مشہور شاعر بیکل اتساہی کے قومی گیت سے مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ زبیر رضوی نے معتمد مشاعرہ کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے اس مشاعرہ میں پاکستان کے مہمان شاعر ابوالاثر حفیظ جالندھری کے علاوہ خمار بارہ بنکوی، تسنیم فاروقی، گنیش بہاری طرز، افتخار امام، مسعودہ حیات نے شرکت کی۔ مختار بیگم، زبیر، تسنیم، افتخار اور طرز کو بار بار سنا گیا۔ حضرت حفیظ حاصل مشاعرہ رہے میزبان شعراء سعید شہیدی، رشید اختر، خواجہ شوق، صلاح الدین نیر، علی احمد جلیلی، فیض الحسن خیال، افتخار خلیل، ناصر کرنولی، رحمن جامی، شاذ تمکنت، اوج یعقوبی، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، عزیزہ فاطمہ صبا، خیر تبسم اور مظفر الدین صاحب نے اپنا کلام سنایا۔

ابتداء میں بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے ادبی ٹرسٹ کی سالانہ رپورٹ سنائی اور بتایا کہ ٹرسٹ کے منعقدہ مشاعروں سے اردو آرٹس کالج کی مدد کی جاتی رہی ہے۔ ٹرسٹ کے مشاعرے حیدرآباد کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی ایک مستقل اور فعال روایت بن گئے ہیں حضرت حفیظ جالندھری نے عرصہ کے بعد حیدرآباد میں اپنی آمد پر روشنی ڈالتے ہوئے یہاں کے ادب دوستوں اور قدر دانوں کو بھرپور خراج عقیدت ادا کیا اور بتایا کہ شاہنامہ اسلام کی تکمیل میں ریاست حیدرآباد کے آخری حکمران اور ارباب دکن کے احسانات ناقابل فراموش ہیں۔ آپ نے اردو والوں سے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی دردمندانہ اپیل کی اور فرمائشوں پر بار بار داد و تحسین حاصل کی۔ ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج نے شکریہ ادا کیا۔

۱۸ مئی : حضرت حفیظ جالندھری اور ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ میں آئے ہوئے دیگر مہمان شعراء صاحبان کا انجمن ترقی اردو کی طرف سے اردو ہال میں خیر مقدم کیا گیا۔ اس خوشگوار تقریب کی صدارت جناب محمد علی وزیر سیاحت کرناٹک و صدر ریاستی انجمن ترقی اردو نے کی۔ جناب حبیب الرحمن معتمد انجمن ترقی اردو نے خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے انجمن کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ سرینواس لاہوٹی نے معتمد محفل کے فرائض انجام دیئے۔ حفیظ جالندھری نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لئے دکن نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ اس موقع پر حضرت حفیظ کے علاوہ تسنیم فاروقی، افتخار امام اور گنیش بہاری طرز نے اپنا کلام سنایا۔

• اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام ایوان اقبال کے ادبی اجلاس میں حضرت حفیظ نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور نمائش اقبالیات کا بھی معائنہ کیا۔ جناب حفیظ نے کہا "حیدرآباد اور لاہور کے ادیبوں میں ایک طرح کی فکری ہم خیالی کا رشتہ استوار ملتا ہے اور یہی ہم خیالی فاصلوں کو دور کرتی ہے۔" اقبال کو اپنا پیر و مرشد قرار دیتے ہوئے حفیظ جالندھری نے نذر اقبال کے عنوان سے اپنی کئی نظمیں سنا کر داد حاصل کی۔ جناب خلیل اللہ حسینی صدر اکیڈمی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ اس موقع پر مسز اختر حسن صدر معتمد اردو اکیڈمی، ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور ہند کے ادیب تیج ناراین جیسوال نے اقبال کی شخصیت اور فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ جناب کریم رضا معتمد جلسہ و اکیڈمی نے شکریہ ادا کیا۔

۹ر مئی : پاکستان کے نامور بہار شاعر ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری نے اُردو اکیڈمی آندھرا پردیش کا معائنہ کیا۔ اکیڈمی کی طرف سے حیدرآبادی ادیبوں کی مطبوعات تحفتاً پیش کی گئیں۔ جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی امور مسٹر بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر اکیڈمی نے حضرت حفیظ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اکیڈمی کی سرگرمیوں سے واقف کرایا۔

۱۰ر مئی : حضرت حفیظ جالندھری نے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے دفاتر "ایوانِ اُردو" کا معائنہ کیا۔ معتمدِ ادارہ جناب سید ہاشم علی اختر اور معتمدِ مجلس مشاورت "سب رس" جناب غلام جیلانی کے علاوہ معتمد دفتر میر سراج الدین علی خاں اور مرتب وقار خلیل نے حضرت حفیظ کا خیر مقدم کیا۔ آپ نے ادارہ کے تمام شعبوں کو دیر تک گھوم پھر کے انہماک سے ملاحظہ فرمایا اور کتابِ الآراء میں اپنے تاثرات کا ان الفاظ میں ذکر کیا۔ "حیدرآباد سے میرا تعلق دوسرے شاعروں سے (جو میرے ہم عصر تھے) بہت زیادہ ہے "شاہنامہ اسلام" کے سلسلہ میں تقاضا رہا پیہم اور چار دو سال تک مجھے حیدرآباد ہی سے ملتا رہا ورنہ میں فرانس اور انگلستان جا کر وہ کتب جو فرانسیسی اور انگریزی میں چھپا کر لے گئے تھے نہ دیکھ سکتا نہ مطالعہ کرسکتا۔ آج تک میرا تعلق حیدرآباد سے یہ ہے کہ اردو ہم سب کو حیدرآباد ہی سے محمد قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے ملی۔ میں ممنون ہوں کہ یہ نامور ادارہ جو میرے محسن دوست ڈاکٹر زورؔ کا قائم کردہ ہے مسلسل ترقی کررہا ہے خداوند کریم اور رسولِ رحیم سے دعا و التجا ہے کہ آپ اس شوکتِ حیدرآباد کو ترقی دیں اور اس اقبال تک پہنچیں جو ساری دنیا کے لئے روشنی کا مینار تھا۔ حضرت حفیظ نے ادارہ میں مرکزِ خوشنویسی کی کلاسوں کا بھی معائنہ کیا اور طلبہ و طالبات کے کام پر اظہارِ اطمینان کرتے ہوئے مفید مشورے بھی دیئے۔

۱۱ر مئی : ریلوے سگنل انجینئرنگ انسٹی ٹیوٹ سکندرآباد کے زیرِ اہتمام ایک مشاعرہ انڈین رائٹرس اینڈ آرٹسٹس اسوسی ایشن کے تعاون سے جناب خیرات ندیم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ حاذق طیفوری (بمبئی) محسن جلگانوی، عزیز النساء صبا، ناگپال الظیم اور کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۱۲ر مئی : حضرت حفیظ جالندھری نے ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا معائنہ کیا۔ پروفیسر فضل الرحمٰن ایڈیٹر انسائیکلوپیڈیا پراجکٹ نے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی ترتیب کے مراحل سے واقف کرایا۔ ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ جناب خواجہ محمد احمد نے حفیظ صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ کی اشاعتی اور تحقیقاتی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

★ انجمن قادریہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ یادگار "شب شاہنامہ اسلام" کے کثیر اجتماع میں حضرت حفیظ نے مسلسل دو گھنٹے تک اپنی طویل تخلیق کے اقتباسات سنائے۔

۱۳ر مئی : بزم اُردو بھارت ہیوی الکٹریکلس کے سالانہ مشاعرہ اور دس سالہ جشن کا جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" نے افتتاح کیا اور بزم کی اُردو سرگرمیوں کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ بزم اُردو کی طرف سے اردو اسکول کے قیام کے سلسلہ میں اُردو اکیڈمی کی طرف سے بھرپور تعاون اور مالی امداد کا پیش کش کیا۔ جناب امیر احمد خسروؔ نے مشاعرہ کی صدارت کی، صلاح الدین نیرؔ معتمد مشاعرہ تھے۔ مسز سعید شہیدی، خسروؔ، کنول پرشاد کنول، خیرات ندیم، ڈاکٹر راحت رضوی، وقار خلیل، فیض الحسن خیالؔ، امان ارشد، عزیز النساء صباؔ، سہیل احمد سہیل، صبا ساحری، یوسف قادری اور بی ایچ ای ایل کے شعراء نے کلام سنایا، ضمیر حسین معتمد بزم نے شکریہ ادا کیا۔

۱۴ر مئی : ایک شعری محفل میں بزم حسرت موہانی کی اڈہاک کمیٹی تشکیل دی گئی جس میں جناب اختر حسن، ڈاکٹر مغنی تبسم محترمہ رابعہ برنی، محمد منظور احمد، وقار خلیل منوہر لال بہار، نسیم الحسن اور فلک بدایونی کے نام شامل تھے۔ مسٹر عبدالواسع کو کنوینر منتخب کیا گیا۔ جناب اختر حسن صدر ادارہ معتمد ریاستی اُردو اکیڈمی نے محفل شعری کی صدارت کی اور

حضرت حسرت موہانی کی یاد میں ایسے اداروں کی تشکیل پر زور دیا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ نے حسرت کی غزل پر گفتگو کی۔ محفلِ شعر میں یوسف قادری، داؤد نصیب، راجہ لال راجہ، روحی قادری، ڈاکٹر احسن رضوی، رضا وصفی، منوہر لال بہار، وقار خلیل ڈاکٹر تبسم اور اختر حسن نے کلام سنایا، وقار خلیل نے نظارت کے فرائض انجام دیئے۔

۱۵ر مئی: اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس لائبریری ہال انوار العلوم کالج میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر حسینی شاہد اور ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مہمانانِ خصوصی و مبصرین کی حیثیت سے شرکت کی۔ غنی نعیم نے جلسہ کی کارروائی انجام دی جناب مصلح الدین سعدی نے نذیر علی عدیل سے ان کی شاعری پر انٹرویو لیا۔ رؤف خلش کی ایک نظم پر یوسف اعظمی، جمیل شیدائی اور غیاث متین نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ جناب اختر حسن نے اقلیم ادب کی سرگرمیوں کو خود تنقیدی کا مثبت مرکز قرار دیتے ہوئے مفید ادبی ضرورت قرار دیا۔ ڈاکٹر ساجدہ نے تخلیق کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ صدر بزم رحمٰن جامی نے شکریہ ادا کیا۔

● بزم سعدی کا ادبی اجلاس و مشاعرہ دکتور طاہر علی خان سلکم کی صدارت میں منعقد ہوا۔ آقائی محمد علی خانی قونصل جنرل ایران نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی۔ محترمہ بشیر النساء بیگم ریڈر شعبہ فارسی ویمنس کالج نے "اقبال اور ایران" پر مقالہ سنایا۔ محفلِ شعر میں فارسی گو شعراء ڈاکٹر مسلم، بانو طاہرہ سعید، عبدالکریم ماہر، قدر عریضی، برق موسوی، ڈاکٹر بہمن سورتی، شفیق سنجر، مرزا سرفراز علی، راشد نقوی اور حسن طبسی نے کلام سنایا۔

۱۶ر مئی: بزم نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ ڈاکٹر ناظم مرزائی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر رضی الدین صدر شعبۂ اُردو ترویتی یونیورسٹی اور مولانا حاذق طیفوری (دبئی) مہمانانِ خصوصی تھے۔ قدیم و جدید مکتبِ خیال کے دو درجن شاعروں نے کلام سنایا۔ طالب اسدی نے شکریہ ادا کیا

۱۷ر مئی: ریاستی گورنر مسز شاردا مکرجی نے راج بھون میں مدیرانِ جرائد اور صحافیوں سے ملاقات کی اور آندھرا پردیش سے شائع ہونے والے اخبارات و رسائل سے واقفیت حاصل کی۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست نے گورنر صاحب کو حیدرآباد کے اُردو اخبارات و رسائل کے بارے میں تفصیل سے واقف کرایا اور بتایا کہ اُردو اخبارات کی اشاعت اگرچیکہ انگریزی اور دوسری زبانوں کے اخبارات کی بہ نسبت کم ہے لیکن معیار کے اعتبار سے اُردو اخبارات و رسائل ملک بھر میں کافی شہرت رکھتے ہیں اور ان کا عوام سے راست اور قریبی تعلق بھی استوار ہے۔

۲۱ر مئی: مرکز ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس و مشاعرہ جناب اوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عبدالکریم ماہر نے برق موسوی کی شخصیت اور شاعری پر مضمون سنایا محفلِ شعر میں کئی شاعروں نے حصّہ لیا۔

● نہرو میموریل یوتھ لیگ کے زیرِ اہتمام گولکنڈہ میں ساتویں سالانہ شعری محفل جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جناب عابد علی خاں اور اور جناب نریندر لوتھر نے مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے مشاعرہ کی صدارت فرمائی۔ مرزا امیر احمد خسرو، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر ڈاکٹر احسن رضوی، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، سراج منیر اور کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۲۶ر مئی: جدید سخنور داقف جناب حمید سہروردی صدر شعبہ اُردو نوگان کالج بیڑ (مہاراشٹرا) کی آمد پر ایک ادبی محفل جناب اقبال متین کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ یم مظہر الزماں بیگ احساس، انور رشید اور حمید سہروردی نے جدید کہانیاں سنائیں۔ مسیح انجم نے فکاہیہ پیش کیا۔ محفلِ شعر میں رؤف خلش، غیاث متین، یوسف اعظمی، مسعود عابد انور رشید، ضیاء ساحری، طالب خوندمیری

اور صفدر حسین، اقبال متین نے حصہ لیا۔

● اسٹوڈنٹس ایکشن کمیٹی کی طرف سے ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے جانے کے مطالبہ کی تائید میں سلسلہ وار بھوک ہڑتال کا آغاز ہوا۔ مسٹر یدھ ویر ایڈیٹر روزنامہ "ملاپ" نے بھوک ہڑتال کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے اردو والوں کے اس جائز اور دیرینہ مطالبہ کی تکمیل کے لئے ریاستی حکومت کو توجہ دلائی۔ پنڈت فصیح الرحمٰن نے ۸ روزہ بھوک ہڑتال کا آغاز کیا اور کئی طلبہ نے زنجیری ۲۴ گھنٹوں کی مسلسل بھوک ہڑتال میں عملی طور پر حصہ لیا اور مطالبہ کی تکمیل تک اس سلسلے کو جاری رکھنے کا عہد کیا۔

۲۷۔ مئی ریاستی وزیر لیبر مسٹر ٹی انجیا نے بھوک ہڑتال کیمپ پہونچ کر طلباء کی مزاج پرسی کی اور بتایا کہ وہ ریاستی وزراء اور چیف منسٹر تک اُن کے مطالبات پہونچائیں گے اور کوئی قابلِ قبول حل تلاش کرنے کی سعی مشکور کریں گے۔

● ایک اردو بک اسٹال کا افتتاح کرتے ہوئے ممتاز طنز و مزاح نگار ادیب نریندر لوتھر (اسپشل آفیسر مجلس بلدیہ) نے مطالعہ کی افادیت پر زور دیا۔ جناب عابد علی خاں بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کی، مسٹر یس یس حسین نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔

۲۸ مئی: ادارۂ ادبیاتِ اردو کے سہ روزہ امتحانات "اردو" فاضل "اردو عالم" اردو دانی اور اردو زبان دانی ملک کے تیرہ مراکز پر منعقد ہوئے جن کے نام اور ان کے محاذی نگراں کار صاحبان کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ مرکز ادونی ضلع کرنول (ذریعہ ڈاک)
۲۔ امرآباد (محبوب نگر) (ذریعہ ڈاک)
۳۔ اننت پور (آندھرا) نگراں: احمد حسین صاحب لکچرر ٹریننگ کالج اورنگ آباد
۴۔ پنکنور (ضلع چتور) نگراں: جناب احمد علی درویش
۵۔ جونیئر سرٹیفائڈ اسکول چپا پیٹ نگراں: عبدالقدیر صاحب
۶۔ حیدرآباد: نگراں: عبدالستار صاحب وائس پرنسپل جونیئر کالج انوارالعلوم
۷۔ دہلی: جناب سید حفیظ الدین حسین (ایم آے)
۸۔ رایادرگ (چتور) سید ابو یحییٰ صاحب
۹۔ شادنگر: جناب سید صدیق حسین
۱۰۔ شمس آباد۔ جناب عبدالقادر ایم اے
۱۱۔ کاغذ نگر: جناب عارف احمد (ایم او ایل)
۱۲۔ نارائن پیٹ: جناب محب الدین (ایم اے)
۱۳۔ نظام آباد: عنایت الرحمٰن (بی ایس سی)

ادارہ کے ان امتحانات اردو دانی میں (۱۱۱) اردو زبان دانی میں (۱۱۵) اردو عالم میں (۷۹) اور اردو فاضل میں (۴۵) امیدواروں نے شرکت کی۔

۲۹ مئی: اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر حسینی شاہد پرنسپل اردو آرٹس کالج (ایوننگ) کی صدارت میں بمقام اُردو ہال مخدوم محی الدین مارگ منعقد ہوا۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے انیس کی انفرادیت اور جناب سری نواس لاہوٹی نے "ادب میں سلوبیت اور حقیقت" کے زیر عنوان مقالے پیش کئے۔ محفلِ شعر میں خیرات ندیم، ڈاکٹر احسن رضوی، امان ارشد، صلاح الدین نیر، صادق نقوی، یوسف اعظمی، عزیز بھارتی، علی سرور، ناگیال، عظیم دہلوی، زبیدہ تحسین اور محسن الہ آبادی نے حصہ لیا۔ معتمد اردو مجلس جناب نیر نے شکریہ ادا کیا۔

۳۰ مئی: ادبی ٹرسٹ کی مجلس انتظامی کا اجلاس جناب صدر ٹرسٹ محمد علی عباسی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ بانی و معتمد ادبی ٹرسٹ جناب عابد علی خاں نے رپورٹ پیش کی اور بتایا کہ ادبی ٹرسٹ اپنے اغراض و مقاصد کے اعتبار سے اُردو تعلیم کے فروغ کے سلسلہ میں امداد دیتا رہتا ہے۔ ادیبوں اور شاعروں کی معاونت کا کام بھی انجام دیتا رہا ہے اہلِ قلم اصحاب کی طبی امداد اور ان کے بچوں کی تعلیمی ضروریات میں بھی ٹرسٹ معاون رہا ہے۔ جناب عابد علی خاں نے بتایا کہ ادبی ٹرسٹ کا کارپس ایک لاکھ اکتیس ہزار روپے ہے۔ ٹرسٹ کے سالانہ مشاعروں کی آمدنی سے اب تک چار برسوں میں ایک لاکھ روپے اُردو آرٹس کالج کے لئے عطیہ دیئے گئے۔ انوارالعلوم ویمنس کالج کو ۱۰ ہزار روپے تعلیمی ضروریات

(بقیہ صفحہ ___ پر دیکھئے)

قبائیلی بہبود کے لئے نئی طرز سے جدوجہد

جنوبی ہندوستان میں آندھرا پردیش قبائیلیوں کی کثیر ترین آبادی رکھتا ہے یعنی ۶۶۵۷ لاکھ۔ اس لئے ہمارے پانچسالہ منصوبوں میں قبائیلی بہبود کی جانب ترجیحی توجہ دی گئی ہے۔ اس ضمن میں پہلے منصوبے میں ۱۸۸ر۷۷ لاکھ روپے کے خرچ کی گنجائش فراہم کی گئی تھی۔ دوسرے منصوبہ کے دوران اٹنور۔ اراکا۔ نرسم پیٹ اور بادیرہ میں ۴ کثیر مقصدی پراجکٹس قائم کئے گئے۔

تیسرے منصوبے کے دوران ۲۴ قبائیلی ترقیاتی بلاکس عالم وجود میں آئے۔ چوتھے منصوبے میں خرچ کی گنجائش بڑھ کر ۳۴۷ر۰۳ لاکھ روپے ہوگئی۔ پانچویں منصوبے میں ترقی کی رفتار میں تیزی پیدا ہوئی۔

آشرم اسکول قبائیلیوں کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ہیں۔ فی الوقت ۲۶۷ آشرم اسکول قائم ہیں جن میں ۱۶۶۵۰ قبائیلی طلباء کے لئے گنجائش موجود ہے۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء میں اس مد پر ۱۱۶ر۷۵ لاکھ روپے کا صرفہ آیا۔

قبائیلیوں کے لئے قرض کی سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں گریجن کوآپریٹیو کارپوریشن کی سرگرمیاں ریاست کے ۲۱ اضلاع میں سے ۱۷ اضلاع پر محیط ہیں۔ یہ کارپوریشن ۴۰۲ گھریلو ضروریات کے ڈپوز اور ۲۸ ابتدائی سوسائٹیوں کے ایک جال کے ذریعہ اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

2.77 78/574/ADVT/C3

دستی کپڑے کی صنعت کے ساتھ نیا برتاؤ

دستی کپڑے کی صنعت آندھرا پردیش میں تقریباً ۳۰ لاکھ عوام کو روزگار فراہم کرتی ہے زراعت کے۔ دستی کپڑے کے شعبہ میں عوام کی سب سے زیادہ تعداد روزی کماتی ہے۔

تحریک امداد باہمی اس شعبہ کے لئے ایک عظیم نعمت ثابت ہوئی ہے۔ ۵۴-۵۳ 619 میں بافندوں کی امداد باہمی انجمنوں کی تعداد ۶۴۹ تھی لیکن فی الوقت ریاست میں ۹۷۷ انجمنیں قائم ہیں۔

آندھرا پردیش اسٹیٹ ٹکسٹائل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام عمل میں لے آیا گیا ہے۔ اس کارپوریشن نے مختلف اضلاع میں ۹ پیداواری مراکز قائم کئے ہیں جو تقریباً ۳۰۰۰ بافندوں پر محیط ہیں۔

کنٹرولڈ اقسام کی ساڑیوں اور دھوتیوں کی تیاری دستی کپڑے کے شعبے کو تفویض کی گئی ہے اس وقت ۱۰۰۰ سوسائٹیوں میں ۳۰۰۰ کرگھے کنٹرولڈ اقسام کی ساڑیوں اور دھوتیوں کی تیاری میں مصروف ہیں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

1.. 1..77 73 /574/A..77/ 03

سن اجرا ۱۹۳۸ء — بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — فون نمبر: ۳۸۴۹۱

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۴۰ شمارہ: ۷ جولائی ۱۹۷۷ء

نگران: سید علی اکبر — معتمد مجلس مشاورت: غلام جیلانی — مرتب: وقار خلیل

مجلس مشاورت: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر غلام عمر خاں، رحمن راج سکسینہ، عابد علیخاں، محمد منظور احمد

قیمت فی شمارہ: ایک روپیہ ۲۵ پیسے — زرِ سالانہ: ۱۲ روپے — ششماہی ۷ روپے

ترتیب:

پرنٹر پبلشر: سید علی اکبر
مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد — مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو، پنجہ گٹہ، حیدرآباد ۴

ہماری کامیابی لائقِ ستائش ہے

آندھرا پردیش کے مویشی ہندوستان کے مویشیوں کی جملہ تعداد کا (۷) فی صد ہیں۔ ریاست میں مویشیوں کے فروغ کے کام کو ترجیحی توجہ حاصل ہے۔ کلیدی مواضعاتی مراکز مویشیوں سے متعلق بہ زور ترقیاتی پراجکٹس کے قیام کے سلسلے میں پیش رو ادارہ جات کی خدمات ادا کر رہے ہیں۔

فی الوقت ۱۸ کلیدی مواضعاتی مراکز موجود ہیں جو تقریباً ۱۳ء۴۱ لاکھ گائیوں اور بھینسوں پر محیط ہیں۔ اس اسکیم کا مقصد فروغِ مویشیاں کے سلسلے میں کثیر رخی حکمتِ عملی کو بروئے کار لانا ہے۔

علاوہ ازیں ریاست میں (۱۰) افزائش مویشیاں کے مراکز قائم ہیں، نیز کریم نگر اور ادلاولسا میں مویشیوں کی غذا ملانے والے دو پلانٹس بھی کام کر رہے ہیں۔

مادۂ تولید اکٹھا کرنے والے ۱۵ مراکز ہیں جو فروغِ مویشیاں کے مختلف پروگراموں کے تحت سرگرم عمل مصنوعی طریقے سے مادۂ تولید رحمِ مادہ میں داخل کرنے والی ۲۰۰۰ یونٹوں کی ضروریات کی پابجائی کرتے ہیں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

No 6-77-78/574/ADVT/C3

سب رس کا مرتبہ پالیسی تہذیب و ثقافتِ دکن کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اُردو زبان کی ترقی اور اشاعت میں حیدرآباد میں کیا کچھ ہوا اور کیا کچھ ہو رہا ہے، اسے منظرِ عام پر لانا ہے۔ ہم نے ان دونوں چیزوں کو پیشِ نظر رکھ کر کچھ نئے عنوانات اپنائے اور کچھ نئے .... نئے اقدامات بھی کیے۔ ایک ادبی پرچے کی ہر اقدام کامیابی یا ناکامی کا انحصار اس کے معاونین کے عملی تعاون پر مبنی ہوتا ہے۔ ہمیں مسرّت ہے کہ ہمارے اپنائے ہوئے عنوانات پسند کیے گئے اور ہمارے اقدامات کو سراہا گیا۔ صرف پسندیدگی سے کام آگے نہیں بڑھ سکتا، عملی تعاون کی بھی ضرورت ہے۔ قارئین "سب رس" کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ دورانِ سال خریداروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

اس بار "سب رس" کی مشمولات میں قطب شاہی تہذیب پر وہ تاثرات شامل کیے گئے ہیں، جنھیں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب میں سنا گیا ہے۔ وحید الدین سلیم، چند یادیں، دلچسپ تحریر ہونے کے باعث توجہ سے پڑھی جائے گی۔

محترمہ شاکرہ نے مرحوم نصیر الدین ہاشمی کی تحریروں اور ان کے جذبۂ حیدرآبادیت کے پس منظر میں ایک شہرِ آرزو کی سیر نہایت رواں اور سلیس اندازِ تحریر میں کی ہے۔ اس انشائیہ نما خاکے سے کتنی ہی صورتیں کتنی ہی تحریکیں اور کتنے ہی طریق آئینہ ہو جاتے ہیں۔

"تذکرہ" اور "سب رنگ" کے صفحات کو اس بار خصوصی بنایا گیا ہے۔ حیدرآباد کے گنگا جمنی ماحول کی روشن جھلکیوں نے ان اوراق کو گلِ صد رنگ بنا دیا ہے۔ انہی صفحات میں ایک اہم سیمینار کی مبسوط رپورٹ بھی شامل ہے، جسے ملک کے نامور صحافی اور اُردو تہذیب کے رمز شناس نے سپردِ قلم کیا ہے۔

اُردو نامہ کا افق حیدرآباد میں اُردو زبان اور اس کے سرکاری موقف کا [illegible] سے عبارت ہے۔

■ دکن کے ایک باکمال مصنف، محقق اور عثمانین جناب مسلم ضیائی نے کراچی میں ۴ جون ۱۹۷۷ء کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ ضیائی صاحب نے حیدرآباد کے ادبی ماحول کو اپنی فکر و نظر کی بصیرت و بصارت سے ایک حرکت اور حوصلہ دینے میں بہتر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کو ادب اور زندگی کی ترقی پسند ڈگر پر گامزن ہونے کی طرف رہنمائی کی تھی۔ ضیائی صاحب نے کراچی میں بھی ادب، تحقیق اور ترجمے کے کاموں کو آگے بڑھانے میں مقدور بھر حصہ لیا اور دکن کے نام کو روشن ہی رکھا۔ ان کی وفات بیسویں اُردو کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ خدا مغفرت کرے۔

(غلام جیلانی)

ڈاکٹر وی کے باوا

قطب شاہی تہذیب اور ہم

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر منعقدہ سمینار کی صدارتی تقریر)

آج کے موضوع یعنی "قطب شاہی تہذیب کے اثرات موجودہ حیدرآباد کی زندگی پر" سے بحث کرنے سے پیشتر یہ غور کرنا چاہیئے کہ ہم ماضی یا تاریخ کا مطالعہ کیوں کریں۔ کیا ماضی ناقابل توجہ ہے؟ کیا ہنری فورڈ کا یہ خیال درست ہے کہ تاریخ محض بکواس ہے؟ لیکن اکثر مفکرین کا یہ خیال ہے کہ انسان کو اپنے ماضی اور اپنی تاریخ میں متعدد وجوہ کی بناء پر دلچسپی لینا چاہیئے۔ ابھی ابھی ڈاکٹر رادھا کرشن شرما نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ تاریخ کسی قوم کے معتقدات اور تمناؤں کی آئینہ داری کرتی ہے۔

سائنس کا سائنٹفک مطالعہ ہمیں اس بات میں مدد دیتا ہے کہ ہم تہذیب کے بدلتے ہوئے اسالیب پر غور کریں اور ان سے نتائج کا استخراج کریں۔

تاریخ کے تغیرات میں کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ خود دکن کی تاریخ کو لیجئے کہ چودھویں صدی عیسوی میں علاؤ الدین حسن گنگو بہمن شاہ دکن کا باختیار صوبہ دار بننے سے پہلے مالوہ کا صوبہ دار تھا۔ بہمنی سلطنت کئی لسانی علاقوں پر پھیلی ہوئی ریاست تھی لیکن سلطنت کے ٹوٹنے کے بعد گولکنڈہ اور بیجاپور اور احمد نگر کی سلطنتیں بڑی حد تک دکن کے لسانی علاقوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اس طرح اٹھارویں صدی میں دکن کے خود مختار صوبہ دار بننے سے پہلے آصف جاہ اوّل بھی مالوہ کے صوبہ دار تھے۔

آصف جاہی سلطنت بالآخر لسانی ریاستوں میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے لیکن تاریخ کے واقعات میں بسا اوقات تکرار و اعادہ کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخ میں زندگی کے غیر معمولی تغیرات کا احساس ہوتا ہے۔ جغرافیائی تغیرات جس طرح قوموں کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے لئے بڑا طویل عرصہ لگتا ہے لیکن قوموں کی زندگی میں ٹکنالوجی کا تغیر حمل و نقل اور پیداوار کے موثر طریقے ہمیشہ انقلاب آفریں رہے ہیں۔ بہرحال یہ جو کچھ بھی ہو تاریخ کو اگر بحیثیت ادب بھی پڑھا جائے تو اس سے ہم ماضی کے طرز زندگی سے واقفیت اور ایک طرح کی مفاہمت پیدا کر سکتے ہیں۔ کسی ملک یا شہر کے ماضی کے حسن سے متاثر ہونا اس سے محبت کرنا ایسی کیفیات ہیں جن سے خود تاریخ متاثر ہوئی ہے۔ بھاگ متی کی داستان محبت حقیقی ہو یا محض روایت ہو اس سے انکار نہیں

کی جاسکتا کہ یہ داستان ہماری معاشرت میں محبت میل جول اور رواداری کے رجحانات کی غمازی کرتی ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے ہم اپنے آپ کو سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ گولکنڈہ کی تہذیب اور حیدرآباد کی تہذیب کے آئینوں میں جب ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں تو محض تغیر ہی کا احساس نہیں ہوتا بلکہ بہت سی باتوں میں تسلسل کا بھی احساس ہوتا ہے۔ شہر کے محلوں کے ناموں ہی کو لیجئے یا تالابوں کے ناموں کو یا دیوڑھیوں کے، آج کے شہر میں بھی قطب شاہی نام باقی ہیں جیسے سعید آباد، حسین ساگر، گوشہ محل وغیرہ۔ عمارتوں کے تعمیری مسالہ میں بھی کئی چیزیں ایسی ہیں جو قطب شاہی دور سے اب تک چلی آرہی ہیں مگر تراشے ہوئے پتھروں کا استعمال یا عمارت کی ساخت میں پتھروں کا جزوی استعمال خاص طور پر چونے کے پلاسٹر کے اندر پتھروں کا استعمال قطب شاہی تعمیری سالوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔

عمارتوں سے ہٹ کر تعمیر کے اسالیب ویرانے شہر پناہ، قبرستان، بادشاہوں اور صوفیوں کے مقبرے کا کاروان سرائے اور پھر ان کی طرز تعمیر میں پورے اسالیب کی موجودگی یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ شہر کے قدیم آثار گویا ایک کھلا ہوا (OPEN AIR) میوزیم پیش کرتے ہیں۔

اس شہر کے بعض ایسے انفرادی اوصاف ہیں جن کی نظیر سارے ہندوستان میں نہیں ملتی اور ان میں سے کئی اوصاف قطب شاہی تہذیب کا تحفہ ہیں۔ (ترجمہ :- ضیاء الدین احمد شکیب)

بقیہ :- اُردو نامہ صفحہ ۵۵ سے آگے

ایک قرار دادِ تعزیت کے ذریعہ اُردو کے دو ادیبوں جناب مسلم ضیائی اور جناب ابراہیم شفیق کی وفات پر رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔

۲۷ جون :- ریاستی وزیر تعلیم مسٹر یم کوی ملکرشنا راؤ نے اُردو کے تعلق سے اسمبلی میں بتایا کہ
• اُردو میں سرکاری اعلان اُن علاقوں میں جاری کئے جائیں گے جہاں اُردو بولنے والوں کی آبادی پندرہ فیصد پر مشتمل ہو اور ایسے مقامات پر جہاں اُردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہو وہاں اُردو میں سائن بورڈ بھی آویزاں کئے جائیں گے

ایسے ایلیمنٹری اور پرائمری مدرسوں میں جہاں کم از کم ایک جماعت میں دس طلباء ہوں یا کسی ایسے اسکول میں جہاں ۳۰ طلباء ہوں، سکنڈری اسکولوں میں جہاں چھٹی تا آٹھویں اور ساتویں درجوں میں طلباء کی جملہ تعداد (۴۵) ہو اُردو میں تعلیم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

۲۸ جون :- پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن ترقی اُردو نے ایک پریس نوٹ میں وزیر تعلیم کے اسمبلی میں دیئے گئے بیان کو غیر اطمینان بخش قرار دیتے ہوئے اُسے سابقہ دو احکامات کا اعادہ اور انجمن حکومت کے دیئے ہوئے طے شدہ سابقہ فیصلوں کے مغائر قرار دیا اور اس امر پر زور دیا کہ ریاستی انجمن ترقی اُردو وزیر تعلیم کے اس بیان پر مایوسی کا اظہار کرتی ہے ---

ضیاءالدین احمد شکیب

قطب شاہی تہذیب کے اثرات حیدرآباد کی موجودہ زندگی پر

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر　　رکھیا جیوں تو دریا میں من یا سمیع

تین سو چھیاسی (۳۸۶) سال پہلے محمد قلی نے شہر حیدرآباد کو بسانے کے بعد یہ شعر کہا تھا۔ اگرچہ یہ شعر کہے ہوئے ابھی سو برس بھی نہیں گذرے تھے کہ قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا لیکن قطب شاہی تہذیب کی حکمرانی حیدرآبادیوں کے دلوں پر تا دیر باقی رہی اور شاید اب بھی ہے۔

آج سے سو برس پہلے میکنزی نے جب ضلع چتوڑ کا گزیٹیر مرتب کیا تو اس نے اس بات پر بڑی حیرت کا اظہار کیا اور ہے بھی یہ بڑی حیرت کی بات کہ اس زمانے تک نہ صرف شہر حیدرآباد بلکہ آندھرا، تلنگانہ اور رائل سیما کے دور دراز اضلاع میں بھی لوگوں کے دل تا نا شاہ کی محبت سے لبریز تھے۔ جن لوگوں نے کم از کم ربع صدی پہلے کا حیدرآباد دیکھا ہے وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس شہر میں قطب شاہی تہذیب سے لوگوں کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ قطب شاہی دور کی کہانیاں بوڑھوں اور بچوں میں یکساں طور پر مقبول تھیں۔ شہر حیدرآباد کی انفرادیت قطب شاہی تہذیب کے آب و رنگ سے نکھرتی ہے۔ یہ ایوان (ایوان اردو) جس میں آپ ہم اکٹھا ہوئے ہیں قطب شاہی تہذیب کے ایک عظیم دلدادہ ڈاکٹر زور کا تعمیر کیا ہوا ہے۔ یہ ایوان ڈاکٹر زور کی شخصی تمنا کا اظہار نہیں ہے بلکہ حیدرآباد اور حیدرآبادی تہذیب کے ان پرستاروں کی تمناؤں کی نمائندگی بھی کرتا ہے جو علم و ہنر اور دانشوری کے روشن میناروں کی حیثیت رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔

قطب شاہی تہذیب سولہویں اور سترھویں صدی کے دوران مخصوص حالات میں پروان چڑھی ہے اس کا گھر گولکنڈہ تھا۔ یہ سلطنت کم و بیش موجودہ آندھرا پردیش کے تمام علاقے پر پھیلی ہوئی ایک دیسی ریاست کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس کی دولت و خوشحالی کا یہ عالم تھا کہ ساری دنیا میں اس کے چرچے تھے آج بھی انگریزی زبان میں لفظ گولکنڈہ (GC' CONDA) کے معنی دولت و خوشحالی کے ہیں۔ گولکنڈہ میں چلنے والا چاندی کا سکہ جو کبھی کاسو کہلاتا تھا اب انگریزی میں لفظ کیش بن گیا ہے جو بے تکلف انگریزی اور دوسری زبانوں میں برتا جاتا ہے۔ گولکنڈہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا جہاں کی ایک اہم تجارتی منڈی کا مقام رکھتا تھا۔ مغرب میں ڈنمارک، ہالینڈ اور انگلستان سے لے کر مشرق میں چین و جاپان سے اس کے تجارتی تعلقات نے اس کی تہذیبی اہمیت کو بہت بڑھا دیا تھا۔ قطب شاہی دور میں دنیا کے مختلف ممالک کے باشندے یہاں کثیر تعداد میں آئے۔ ان میں خاص طور پر ایرانی، ترک، تاجیک، افغان، عرب، آرمینی جیسے ایشیائی

باشندوں کے علاوہ کثیر تعداد میں حبشی، ولندیزی اور انگریز یہاں آباد تھے۔ حبشیوں، آرمینیوں، عربوں، ایرانیوں اور یورپی اقوام کی اچھی خاصی بستیاں آباد تھیں جن کا اندازہ ان کے نام پر موسوم محلوں اور ان کے قبرستانوں سے ہوتا ہے۔ قطب شاہی دور میں شہر حیدرآباد کو کاسمو پولیٹن شہر کی حیثیت حاصل تھی۔ اس تہذیب کا سب سے اہم ورثہ جو آج بھی ہم کو حاصل ہے وہ اس شہر کی تہذیب میں قبولیت اور پذیرائی کی صلاحیت ہے۔ دنیا کی کسی قوم یا فرد یا کسی علاقے کا باشندہ ہو جب حیدرآباد میں قدم رکھے تو اپنی اجنبیت کے باوجود وہ قدم قدم پر ایسی یگانگت بھی محسوس کرے گا جس سے اس کی اجنبیت کا احساس جلد سے جلد دور ہو جاتا ہے۔ یہ کیفیت جیسا کہ میں نے عرض کیا قطب شاہی تہذیب کا ورثہ ہے کیونکہ قطب شاہی دور میں تہذیب اور نسلوں کا جس قدر اختلاط گولکنڈہ میں ہوا ہے وہ اس سے پہلے یا اس کے بعد اس علاقے میں اس قدر بڑے پیمانے پر شاید ہی ہوا ہو۔ گولکنڈے میں جس دکنی محاورے کی نشو نما ہوئی ہے اس میں دنیا کی متعدد زبانوں کے اثرات شامل ہیں یہی وجہ ہے کہ اردو یا دکنی گولکنڈے میں ایک ایسے محاورے کے طور پر پھیلی اور پھولی جو نہ صرف ہندوستان کے مختلف علاقوں بلکہ یوروپی علاقوں سے آنے والوں کا ایک مشترک وسیلۂ اظہار بن گئی۔ عبداللہ قطب شاہ کے دور میں گولکنڈہ آیا ہوا برطانوی سیاح پادری ایک واقعہ لکھتا ہے کہ جب ایک مسلمان افسر کی زیادتی کی شکایت اس سے بڑے افسر کے پاس کی گئی تو عہدہ دار ماتحت نے اپنی غلطی کا انکار کر دیا جس پر افسر اعلیٰ نے کہا "کیا مسلمان جھوٹ بولتا ہے؟" پادری کہتا ہے کہ یہ فقرہ کہ کیا مسلمان جھوٹ بولتا ہے زبان زد خاص و عام تھا۔ اس جملے میں زبان کی صفائی اور بول چال کی روانی خود یہ بتلاتی ہے کہ حیدرآباد میں خاص و عام اُردو بولا کرتے تھے۔ یوروپی سیاحوں کے یہاں گولکنڈہ کی اُردو بول چال اور محاوروں کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی۔

گولکنڈہ کی تہذیب کے جو اثرات آج بھی حیدرآباد کی تہذیب میں باقی ہیں ان کو تین بڑے زمروں میں واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے، ایک تو حیدرآباد کی زبان دوسرے اس شہر کی ساخت و پرداخت اور تیسرے یہاں کے باشندوں کے رہن سہن اور ان کے بعض محاورات اطوار، جہاں تک زبان کا معاملہ ہے صرف اُردو ہی نہیں بلکہ تلنگی بھی قطب شاہی تہذیب سے متاثر ہے۔ یہاں کے اُردو محاورے میں جہاں دنیا کی مختلف زبانوں کے اثرات موجود ہیں وہیں اس کا لہجہ تلنگی زبان کی روانی کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہے۔ اُردو میں تلنگی کی روانی قطب شاہی دور کی شاعری میں بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ محمد قلی کی شاعری کے بیسیوں پہلوؤں میں اس کے لہجے اور آہنگ کی تیز روی ایک اہم وصف ہے۔ گفتگو کی روانی لفظوں کے مکمل تلفظ کی متحمل نہیں ہو سکتی عربی الفاظ جن کا املا صوتیات سے متعین نہیں ہوا بلکہ املے سے تلفظ متعین ہوا ہے جب حیدرآبادی صوتیات کی زد میں آتے ہیں تو اُن کے تلفظ کے عربی پیچ و خم ٹوٹ کے رہ جاتے ہیں اور لفظ کا تلفظ سپاٹ اور رواں ہو جاتا ہے جیسے "مصحف" کی بجائے "مصف"، "مسجد" کے بجائے "مہجد" حیدرآباد کی روزمرہ بول چال میں روانی حیران کن ہے اس کے علاوہ موجودہ بول چال کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں اب قطب شاہی دور کا محاورہ بہت کچھ باقی ہے۔ آزادیٔ ہندوستان کے بعد سے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا تہذیبی میل جول بہت بڑھ گیا ہے جس کے زیر اثر علاقائی تہذیبوں کی انفرادیت گھٹتی گئی ہے۔ جن لوگوں نے سابق ریاست حیدرآباد میں شہر حیدرآباد کی بول چال

شن ہے وہ اس کی تصدیق کریں گے کہ گولکنڈہ کا محاورہ حال حال تک زندہ تھا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب یہ بالکل ختم ہوگیا ہے۔ اُردو زبان و ادب کے کسی طالب علم کو اس پر کام کرنا چاہئے کہ حیدرآباد میں مختلف محاوروں اور لسانی تبدیلیوں کے کون کون سے دَور رہے ہیں اور موجودہ دَور میں اس کے قطب شاہی عناصر کس حد تک باقی ہیں

حیدرآباد کی تہذیب میں جو دوسرا اہم قطب شاہی اثر کارفرما ہے وہ شہری منصوبہ بندی کا ہے شہر حیدرآباد کی جب بنیاد رکھی گئی تو وہ ایک باقاعدہ منصوبہ کے تحت رکھی گئی تھی اس کے لئے مقامی ہندوستانی معماروں کے علاوہ ایران اور عراق کے ممتاز معمار بلائے گئے۔ ساحروں اور زمین پیماؤں نے ان کی مدد کی۔ ایک باقاعدہ شہری منصوبہ بندی کے بعد یہ شہر بسایا گیا۔ پہلا قدیم شہر تو گولکنڈہ میں شاہی مقبروں کے شمال میں بسایا گیا تھا جو بڑھتے بڑھتے پرانے پل تک چلا گیا تھا نیا شہر چارمینار کے ساتھ بسایا گیا جو پھیلتا ہوا سعیدآباد تک نکل گیا۔ گولکنڈہ سے سعیدآباد تک شہر کا پھیلاؤ اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ پھیلاؤ کا رجحان ہمیشہ افقی رہا ہے یہ آج بھی باقی ہے۔ موجودہ شہر حیدرآباد جو ۶۶ مربع میل پر پھیلا ہوا ہوا ہے اب میٹرو پولیٹن شہر کی حیثیت سے (۶۰۰) مربع میل پر پھیلنے والا ہے۔ وسیع اور کشادہ مکانوں، بڑے بڑے صحن اور خانہ باغوں کا شوق حیدرآباد میں قطب شاہی دور کا تحفہ ہے۔ نئے جمہوری دور میں اب خانہ باغوں کی جگہ عوامی باغ لے رہے ہیں اور لیتے جائیں گے۔ حیدرآباد کی جتنی بڑی سڑکیں اس وقت موجود ہیں وہ سب کی سب قطب شاہی دور کا تحفہ ہیں۔ قطب شاہی دَور کا طرز تعمیر ہندوستانی، ایرانی، عراقی اور یوروپی طرز تعمیر کے مختلف عناصر پر مشتمل تھا جس کے نتیجے میں یہاں طرز تعمیر کا ذوق ہمیشہ ایک رنگا رنگ کیفیت پیش کرتا رہا ہے۔ آج بھی حیدرآباد کے ذوق تعمیر میں دنیا کے مختلف علاقوں کی طرز تعمیر کے طریق جھلکے پڑتے ہیں۔ معاشی و مادّی تفاوت نے قطب شاہی دور میں بھی طرز تعمیر کو "بلندش بغایت بلند و پستش بغایت پست" کی حالت میں رکھا۔ یہ کیفیت آج بھی ہے کہ آج جہاں نئی وضع کے نہایت خوبصورت مکان تعمیر کئے جا رہے ہیں وہیں ردّے کی دیواریں بھی اُٹھائی جا رہی ہیں۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ ردے کا طریقۂ تعمیر اس شہر میں قطب شاہی دور سے چلا آرہا ہے۔

قطب شاہی تہذیب کے اثرات اس شہر کے رہن سہن اور اخلاق و عادات پر بھی نمایاں ہیں۔ میری رائے میں بعض اثرات پسندیدہ ہیں اور بعض ناپسندیدہ۔ قطب شاہی تہذیب میں مفاہمت انکساری اور دوست داری کے اوصاف بہت نمایاں ہیں۔ اس کا تذکرہ ایشیا اور یورپ کے مختلف سیاحوں کی تحریروں میں ملتا ہے۔ یہ اعلیٰ صفت حیدرآبادیوں میں ہر دَور میں رہی ہے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی بہ نسبت آج بھی زیادہ ہے۔ ان اوصاف نے صحیح معنوں میں اس شہر کو مروّت کا شہر بنادیا ہے۔ اسی انسان دوستی کے زیر اثر حیدرآباد میں مذہبی تشدّد پسندی غلو اور علیحدگی پسندی کو کبھی فروغ حاصل نہیں ہوا۔

قطب شاہی دور میں ان خوبیوں کے ساتھ چند کمزوریاں بھی پیدا ہوچکی تھیں جن میں سب سے نمایاں سہل انگاری اور لذت کوشی تھی۔ یہ کیفیت ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی نسبت آج بھی یہاں زیادہ ہے۔ لوگوں کے دل خلوص و محبت سے بھرے ہیں، طبیعتیں اونچے مذاق کی حامل ہیں دوستی اور صلح جوئی کی کیفیت عام ہے لیکن

کام کرنے کے انداز، راستہ چلنے کے ڈھنگ، نشست و برخاست تک ہر عمل میں سُستی کی سی کیفیت ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے لوگوں کو وقت کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہیں۔ جب میں حدیقۃ السلاطین کی دلکش عبارت میں گولکنڈے کی تہذیب کو جیتا جاگتا دیکھتا ہوں تو اس میں بھی یہی کیفیت پاتا ہوں۔ تاہم قطب شاہی دور سے اس شہر کی یہ روایت ہے کہ یہاں جو لوگ کام کرنے والے نکلے وہ بلا کے کام کرنے والے نکلے۔

کتب خانہ آصفیہ، سالارجنگ میوزیم، اسٹیٹ آرکیوز، اور خود ادارۂ ادبیاتِ اُردو میں قطب شاہی دَور کی جو قلمی کتابیں محفوظ ہیں وہ اس بات کی شہادت دیتی ہیں کہ قطب شاہی تہذیب نے اس شہر کو نہ صرف اُردو زبان کا ایک اسلوب اور فن تعمیر چند پیرائے یا رہن سہن کے چند اطوار دیئے ہیں بلکہ قطب شاہی عہد نے چند ایسی اہم چیزیں بھی حیدرآباد کو دی ہیں جو ایک عالمگیر تمدن کے فروغ کی ضامن ہیں یہ عناصر اعلیٰ قدروں پر مشتمل ہیں ان میں زرتشتی یونانی اور اسلامی اثرات زیادہ اہمیت کے حامل ہیں زرتشتی فلسفہ قطب شاہوں سے پہلے گولکنڈہ کی ویدآشنا برہمن سوسائٹی کے لئے غیرمانوس نہیں تھا لیکن قطب شاہی دور میں زندگی کے چھوٹے اور بڑے معاملات میں خیر و شر معیار و فکر بھی بن گئے اور طریقۂ استدلال بھی۔ حیدرآباد کے مسلمان ہوں یا ہندو اس زرتشتی طرز فکر نے ان کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے، اسی طرح گولکنڈہ میں یونانیت کو بھی بڑا فروغ حاصل ہوا ہے۔ بقراط، سقراط، افلاطون، ارشمیدس، اقلیدس، بطلیموس، زینو اور دوسرے متعدد یونانی فلسفیوں کے افکار و کارنامے گولکنڈے کے نظام تعلیم میں داخل تھے اور یہاں کے دانشوروں کے زیر بحث رہتے تھے۔ یہی وہ دانشور ہیں جنکی تعلیمات آج بھی مختلف علوم کے وسیلے سے ہماری یونیورسٹیوں میں شامل درس ہیں۔ اسلام کا یہ تصوّر کہ بنی نوع انسان نفس واحد سے پیدا ہوئی ہے اور خدائے واحد کا تصوّر گولکنڈے میں بھی مقبول ہوا تھا اور آج بھی تمام تلنگی علاقہ میں نہایت مقبول ہے۔

ان چند اشارات سے یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ قطب شاہی دَور نے آندھرا پردیش کو ایسے کئی تحفے عطا کئے ہیں جو انسانیت دوستی اور محبّت ہی کے ضامن نہیں ہیں بلکہ یہاں کے فرد کو کسی بھی عالمی تہذیب میں فکر و عمل کی مطابقت کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ قطب شاہی تہذیب کے جو اثرات آج باقی ہیں ان میں زیادہ تر وہ عناصر ہیں جو تہذیبی رنگارنگی کے گلدستے کے لئے رشتۂ شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

(یوم محمد قلی قطب شاہ کے موقع پر منعقدہ سیمینار کی تقریر)

دکن ملک بہوتیچ خاصا اہے
تلنگانہ اس کا خلاصہ اہے
(ملّا وجہی)

شمیم سروش

جو تم آؤ

نہ خوشبو ہے گلابوں میں، نہ جلوہ ہے بہاروں کا
گلستانِ زمانہ ایک دھوکا ہے نظاروں کا
کوئی غم آشنا سایہ نہیں ہے شاخساروں میں
کوئی نقشِ کفِ پا بھی نہیں ہے رہگزاروں میں
کوئی شہرِ طرب تسکیں کا ساماں بن نہیں پاتا
کوئی چہرہ چراغِ روئے تاباں بن نہیں پاتا
نہ آشاؤں کی شمعیں راستہ دل کو دکھاتی ہیں
نہ خوابوں کی حسیں شہزادیاں نغمے سناتی ہیں
تخیل کی حسیں وادی پہ چھایا ہے اندھیرا سا
ہے اک آئینہ وہ شاید مرے سازِ شکستہ کا
نظر مایوس ہو کر ہر طرف سے لوٹ آتی ہے
وفورِ درد سے نبضِ تمنا ڈوب جاتی ہے
سسکتی آہ بھرتی زندگی کی شاہراہوں میں
لئے پھرتا ہوں تنہائی کا افسانہ نگاہوں میں
حوادث کے کڑے کوسوں میں تم کو یاد کرتا ہوں
مثالِ بادِ صحرا اپنی ویرانی پہ مرتا ہوں
جو تم آؤ نظر پھر سے جمال افروز ہو جائے
ہر اک موجِ غمِ دل پھر نشاط آموز ہو جائے

٥

غزلیں

دل کو دریا بنا لیا ہم نے
سوچتے ہیں یہ کیا کیا ہم نے
خاک کا بھی سراغ مل نہ سکے
خود کو ایسے مٹا دیا ہم نے
چاؤ سے جس کی اینٹ اینٹ چنی
وہ نگر دل کا ڈھا دیا ہم نے
ہر تمنا کو کانپتے ہاتھوں
بزمِ دل سے اٹھا دیا ہم نے
بے حیائی جو وقت کی دیکھی
اپنا چہرہ چھپا لیا ہم نے
جانے زخمی نگاہ میں کیا تھا
دشمنوں کو رُلا دیا ہم نے
مرثیہ تھا جسے بنامِ غزل
دوستوں کو سنا دیا ہم نے
رخ جو دیکھا ہوا کا، دل کا کنولؔ
خود ہی اٹھ کر بجھا دیا ہم نے

کنول پرشاد کنولؔ

پھول کی طرح سے چہرے کو کھلائے رکھئے
لوگ پہچان نہ لیں غم کو چھپائے رکھئے
ہم بھی اس چشمۂ مہتاب میں آنکھیں دھولیں
آپ زلفیں یونہی چہرے سے ہٹائے رکھئے
بے گناہوں کا لہو رنگ نہیں شعلہ ہے
ہاتھ جل جائیں گے ہاتھوں کو بچائے رکھئے
اُس نے جاتے ہوئے یہ مجھ سے کہا ہو جیسے
حسرتِ دید ہوں آنکھوں میں چھپائے رکھئے
دل کے شیشہ میں محبت کا حسیں تاج محل
فرصتِ شوق اگر ہو تو سجائے رکھئے
آپ کے شہر میں پتھر کی طرح ہوں لیکن
فن کا شاہکار ہوں ٹھوکر سے بچائے رکھئے
جانے لے جائے کہاں عمر کا بے سمت سفر
جب تلک ساتھ رہیں بات بنائے رکھئے
ہم نے اس دور کو اک راہ نئی دی ہے بشیرؔ
ایک لغزش کو علامت نہ بنائے رکھئے

بشیر فاروقی

سید امین الدین حسینی

وحید الدین سلیم

چند یادیں

"سید امین الدین حسینی صاحب جامعہ عثمانیہ کے اولین دور کے طلبا میں سے ہیں۔ آپ کے والد حیدرآباد کے مشہور عالم سید درویش اللہ حسینی مرحوم علاقہ میں منتظم تھے۔ سید امین الدین نے ابتدائی تعلیم مدرسہ دارالعلوم حیدرآباد میں پائی۔ اور پھر ۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے اُردو، عربی اور معاشیات میں بی اے کا امتحان کامیاب کیا۔ آپ نے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہے ان میں سید غلام نبی صاحب، سید ابراہیم صاحب، پروفیسر وحید الدین سلیم، پروفیسر سید سجاد، پروفیسر حبیب الرحمٰن، پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر مناظر احسن گیلانی، مولانا اشرف شمسی، مولوی عبدالحی سہارنپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔
پروفیسر سید محمد مرحوم، مولوی ذکی الدین صدیقی اور مولوی عبداللطیف (پالونجہ) آپ کے ہم درس رہے ہیں —
امین الدین صاحب نے اپنی ساری ملازمت اسٹیٹ آرکیوز کے شعبۂ ریسرچ میں گذاری اور تیس برس سے زیادہ عرصہ تک مغل اسناد پر کام کرتے رہے۔ آپ نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں (جو اسٹیٹ آرکائیوز میں شعبۂ ریسرچ کے انچارج تھے) کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے کم و بیش دس بارہ سال کام کیا۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی مرتب کردہ کتابوں مثلاً منتخب کاغذاتِ عہدِ شاہ جہاں، منتخب کاغذات عہدِ عالمگیر، منتخب وقائعِ دکن، فرامین و اسنادِ سلاطینِ دکن کی تالیف و ترتیب میں امین الدین صاحب نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کے مضامین معارف، سب رس اور دیگر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی دو تصانیف "قدسیانِ دکن" اور "اعجازِ موسیقی" موجود ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ موخرالذکر تصنیف نہ صرف یہ کہ فنِ موسیقی کی ایک دلچسپ تاریخ ہے بلکہ اس فن سے موصوف کی دلچسپی اور واقفیت کا پتہ دیتی ہے۔ موصوف گاہے ماہے اُردو، فارسی اور عربی میں شعر بھی کہتے ہیں۔ موصوف نے میری خواہش پر پروفیسر وحید الدین سلیم کے بارے میں اپنی یادداشتیں جستہ جستہ لکھ دیں، جنھیں مرتب کر کے یہاں پیش کیا جا رہا ہے"

(ضیاء الدین احمد شکیب)

حضرت سلیم پانی پت کے باشندے تھے اور بانیِ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سر سید احمد خاں کے حاشیہ نشینوں میں سے تھے۔ بڑا سر، آنکھیں تیز تر، آواز بھی ماشاء اللہ سے بلند تر، پیشانی کشادہ تر، جسم گداز، رنگ سانولا، قد میانہ، ریش و بروت مولویانہ، باوجود کبرسنی آخر دم تک زندہ دلی، جولانی و خوش طبعی قائم رہی۔ لباس سیدھا سادا، تکلف سے عاری تھا۔ گھریلو زندگی

کا کچھ پتہ نہیں کہ مولانا کی محترمہ اولاد و اعضاء کہاں سکونت پذیر تھے؟ اور تعداد کیا تھی؟ حیدرآباد میں کسی رشتہ دار کے موجود ہونے کا ثبوت نہیں ملتا ۔ بہرحال پروفیسر صاحب یہاں تنہا بہ تقدیر زندگی گذارتے تھے ۔ البتہ ایک ملازم لڑکا ساتھ رہتا تھا۔ کمرے میں ایک گدی اور تکیہ جس پر تشریف فرما ہوتے اور آس پاس کتابیں اور طلبار کی حاضری کا رجسٹر ہوتا۔ چونکہ حضرت پان کثرت سے نوش فرماتے تھے اس لئے آس پاس کی چیزیں گل افشاں رہتیں ۔ خاص وقت پر ملازم لڑکا ایک خاص بڑی سی پیالی میں چاء پیش کرتا اور اس کے ساتھ ایک سفید ٹکڑا جو غالباً نمک کا ہوتا وہ بھی رکھ دیتا ۔ اور آپ اس ٹکڑے کو پیالی میں ایک دو ڈبو دیتے اور نوش جان فرماتے ۔

اُردو تو گھٹی ہی میں پڑی ہوئی تھی لیکن فارسی و عربی میں کافی دستگاہ رکھتے تھے ۔ انگریزی سے بھی نابلد نہیں تھے ۔ جس طرح دبیر، بھدرو شیکسپیئر کے ماہر تھے اسی طرح حضرت سلیم کلام غالب کے مفسرین میں سے تھے ۔ کئی ایک شرحیں اور مختلف علوم و فنون کی کتابیں و رسائل زیر مطالعہ رہتیں ۔ پروفیسر صاحب نے دارالترجمہ میں اپنے رفیقوں کے ساتھ ایسی ایسی مصطلحات وضع کیں جن سے زبانِ اردو میں ایک حیرت انگیز اضافہ ہوا ۔ اس سلسلے میں میں نے " یادِ ماضی " والی نظم میں اشارہ کیا ہے ۔

نظم و عمادی اور سلیم، اردو بھی طور اور یہ کلیم — ان سے تھا دارالترجمہ اردو ہوئی جس سے عظیم
سانچے نئے بنتے گئے، الفاظ نو ڈھلتے گئے — اردو کا دامن دم بدم دولت سے یہ بھرتے گئے

آپ شاعر بھی تھے اور نثار بھی ۔ یوں تو کئی ایک رسائل میں مختلف عنوانات کے تحت نظم و نثر کے شاہکار نظر آتے ہیں لیکن مجلہ "طیلسانین" میں پروفیسر صاحب نے جاہلیت کے زمانے کے عرب شعراء کے کلام کو نہایت ہی صاف و سلیس اور دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے ۔

انٹر اور بی اے میں حالی ' ذوق ' غالب اور موازنۂ انیس و دبیر پر لکچر دیتے اور اس انداز سے مطالب و معانی کی شرح و توضیح فرماتے کہ طلبار اکتا جانے کی بجائے ہمہ تن گوش بن جاتے ۔

حالی کی نظموں میں حسب ذیل نظمیں پروفیسر صاحب کی پسندیدہ ہیں ، " شعر کی طرف خطاب " شاعر کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر " پولیٹیکل اسپیچ " " سید احمد خاں کی تکفیر و مخالفت " " آزادی کی قدر " انگلستان کی آزادی' نیشن کی تعریف' دلی کی شاعری کا تنزل ' لائق ' دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں' وغیرہ وغیرہ ۔

غالب کے بعض پسندیدہ اشعار حسب ذیل ہیں ؎

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر ، — میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم — گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
دلگی میں مرگیا جو نہ بابِ نبرد تھا — عشقِ نبرد پیشہ طلب گارِ مرد تھا ،
کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ، — ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا ،

غالب کے حسب ذیل اشعار کے بارے میں فرماتے تھے کہ اردو میں ایسے نامانوس اور ثقیل الفاظ کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتے تھے ۔ " یاس و اُمید نے اک عربدہ میداں مانگا " (عربدہ میداں کو بار بار دہراتے) اسی طرح " کلہ کوبِ حوادث کا تحمل کیا "

(ملاکوب کو بار بار دہراتے) اور حسبِ ذیل اشعار کے بارے میں فرماتے ان میں فارسیت زیادہ غالب ہے۔ صرف ایک لفظ کی تبدیلی سے پورا شعر فارسی بن جاتا ہے۔

نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
دلِ خون شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار — آئینہ بدستِ بتِ بدمست حنا ہے
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا
جراحت تحفۂ الماس ارمغان داغِ جگر ہدیہ — مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں کی بڑی داد دیتے اور فرماتے کہ ان کی تشبیہات، استعارات، برجستگی، روانی اور فصاحت و بلاغت انھیں کا حق ہے۔ پروفیسر سلیم ذوقؔ کا دیوان پڑھاتے تھے، خصوصاً ذیل کی نظم بڑے مزے لے لے کر سمجھایا کرتے تھے۔

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خوابِ راحت — نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

یہ وہ طویل نظم ہے جس میں حضرتِ ذوقؔ کبھی اپنے نشۂ علم میں سرمست ہو جاتے ہیں اور کبھی منطق و فلسفہ میں غرق اور کبھی معانی و بیان و بلاغت میں محو اور کسی وقت مسئلہ مشائخ کی طرف متوجہ ہو جاتے، اور کبھی علمِ نجوم و رمل و جفر کی تشریح فرماتے اور کبھی احکامِ شریعت کے تحت نفسیات کا جھگڑا مول لیتے۔ اور کبھی حفظِ قرآن و قرأت و تفسیر و فقہ کا مطالعہ فرماتے اور کبھی علمِ طب و قانون و قاموس سے بحث کرتے اور کبھی نباتات و جمادات کی کیفیت و خواص کا اظہار کرتے اور کبھی معتزلہ و مشائیین و اشراقیین کا مقابلہ کرتے نظر آتے اور کبھی جبر و قدر و اختیار کا جائزہ لیتے اور کسی وقت ریاضی کے ماہرین میں شامل ہو جاتے اور کبھی قیافہ شناسی و افسوں و طلسم و تعویذ کا تصوّر ذہن میں لاتے اور کبھی کیمیا و سیمیا کے ذریعہ زرکشی کی جانب مائل ہو جاتے اور بعض اوقات صوفی منش ہو جاتے۔ گہے اوقات موسیقی کے سُر الاپتے اور کبھی شاعرِ غرّا کے روپ میں نظر آتے۔ اور جب مذہبیات کی طرف توجہ کرتے تو انجیل و زبور و توریت اور مصحفِ ژند و پاژند کے مسائل چھیڑتے اور کبھی تواریخ کی ورق گردانی کرتے۔ بہرحال اس طویل نظم کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کتنا ہی صاحبِ فن و ماہرِ علوم کیوں نہ ہو، نیک بخت ہونا چاہیئے۔ لیجئے بر وقت ذوقؔ کا یہ شعر بھی یاد آگیا ؎

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابرِ سیاہ — کہ جیسے جائے کوئی مست پیل بے زنجیر

اس شعر کو پروفیسر صاحب بار بار پڑھ کر بے تاب ہو جاتے اور کہتے ذوقؔ نے ابرِ سیاہ کی تشبیہ پیلِ مست بے زنجیر سے دی ہے۔

ایک دفعہ عید الفطر کے موقع پر میر عالم کے تالاب کی عیدگاہ میں عید کی نماز کے وقت میں نے خود دیکھا کہ حضرت نقش و نگار والی شیروانی زیبِ تن کئے ہوئے عید کی ملاقات فرما رہے ہیں اور مسکراتے ہوئے کچھ تمسخر بھی فرما رہے ہیں۔

حقیقی پروفیسر غائب دماغ ہوتے ہیں اتفاقاً ایک روز مولانا نے خود اپنی غائب دماغی کا ذکر کیا کہ وہ چپل قدمی کے خیال سے نکلے۔ لیکن دماغ کسی علمی مسئلہ میں الجھا ہوا تھا، بہرحال جانا کہیں اور تھا نکل پڑے کہیں اور۔

---- آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مجھے ایک روز جانا تھا عابد روڈ اور نکل گئے بشیر باغ کی طرف
ایک شاگرد کی خانہ آبادی میں جو ہمارے بھی مخلص دوست تھے اور ہم جماعت بھی، حضرت سلیم کو مدعو کیا گیا۔ بعد طعام حیدرآباد کے مشہور و معروف فن کار سردار بخش کا گانا تھا۔ یہ گلوکار نہایت سنجیدہ قسم کے انسان تھے اور ساتھ ساتھ مجلس کے رنگ کو دیکھ کر گایا کرتے تھے اور تلفظ بھی نہایت اچھا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر سردار بخش نے غالب کی غزلیں شروع کیں اور ایسے ایسے دلکش انداز میں گائیں کہ علامہ تا اختتام جھومتے رہے۔ غالب کی مشہور غزل ع "دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے" تھی، بعض نوجوان سامعین بھی کھماج یا مالکوس گانے کی فرمائش کرتے تو من مانے کچھ نہ کچھ فرمائشیں ضرور پوری کردیتے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ راگوں کی حقیقت سے بالکل نا آشنا ہیں۔
ایک وقت مطلب شعر در بطن شاعر کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ فرمایا کہ میں نے ایک شعر موزوں کیا تھا، اور میرا مطلب کچھ اور تھا، لیکن ایک سائنس داں نے مجھ سے کہا کہ آپ نے کیا ہی بہتر شعر کہا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے اس کی تشریح بھی کردی۔ مولانا نے کہا میرا مطلب تو اس شعر سے وہ نہیں تھا جو آپ بیان کر رہے ہیں۔
حسن اتفاق سے حضرت سلیم کے متعلق ایک اور بات یاد آگئی لیکن افسوس ہے کہ وہ شعر یاد نہیں رہا جس کی تشریح کرتے ہوئے یہ فرمایا کرتے تھے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ" (جس نے اپنی ہستی کی حقیقت کو پہچان لیا اس نے پروردگار کی معرفت حاصل کرلی) اور بار بار اس کو دہراتے۔ ہاں یہ بھی یاد آیا کہ ان مولویوں کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے جو تنگ دل اور حرص دہوا کے دلدادہ ہوتے۔
درس کے ختم پر پروفیسر صاحب طلبہ کی حاضری کا گل افشاں رجسٹر نکال کر حاضری لیا کرتے۔ اسی دوران ایک دن یہ بھی فرمایا کہ جو شخص پہلی نظر میں جب آنکھیں چار ہو فوراً نظریں نیچی کرلے تو یقین مانو کہ یہ علامتیں ایام طفلی کی خوش فعلیوں کے نتائج ہیں۔
یہ بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے ساتھی نواب علی محمد خاں صاحب مددگار صنعت و حرفت داماد نواب فخر الملک بہادر، جو نہایت شریف الطبع خلیق اور قابل تھے۔ بعض وقت پروفیسر سلیم صاحب سے شائستہ الفاظ ہی میں بے تکلفی سے کچھ کہہ دیتے لیکن پروفیسر صاحب مسکرا کر خاموش ہو جاتے۔
ایک دفعہ ایک معصوم طالب علم نے ذوق کے قصیدے میں ایک لفظ کے معنی دریافت کئے۔ سُن تو لیا لیکن تدریس کی مصروفیت اور شاگرد کی بار بار توجہ دہانی پر مسکرا کر دوسرے شاگرد سے کہا کہ بھئی دیکھنا گھنٹہ ختم ہونے کے بعد انھیں باتھ روم میں لے جاکر اس لفظ کی تشریح کردو۔ ان الفاظ کے سنتے ہی کلاس میں تھوڑی دیر کیلئے کھلبلی مچ گئی۔
کلاس میں جب درس شروع ہوتا تو طلبہ نہایت ہنسی خوشی سے توجہ کے ساتھ سنتے، اشارتاً کبھی مذاق بھی فرماتے اور کسی کو کسی نام سے موسوم بھی کرتے۔ مثلاً ایک طالب علم کا نام "طوطا" رکھ دیا تھا۔
ایک روز اول وقت کلاس میں تشریف لائے۔ طلباء آہستہ آہستہ جمع ہو رہے تھے دیکھا ایک صاحب سوٹڈ بوٹڈ، دوسرے صاحب شیروانی زیب تن کئے ہوئے، تیسرے صاحب برہنہ سر دھوتی میں، چوتھے صاحب تشنۂ علم چوٹی دار پاجامہ

اور زرق برق پوشاک میں ملبوس چلے آرہے ہیں۔ اس منظر کو دیکھ کر فرمایا کہ کالج کا ایک خاص لباس ہونا چاہیئے تاکہ امتیاز کرسکیں۔ یہ بوقلموں لباس اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

روئیداد کی تفصیل تو یاد نہیں البتہ ضرور یاد ہے کہ ایک گداز جسم والے قلندر منش صاحب جو کتب خانۂ آصفیہ کے کیرٹیکر کے نام سے موسوم تھے اور شناکشہ بازی کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے نوازش علی لمعہ کے کلام پر کچھ اعتراض کیا۔ بعد برخاست جلسہ صدر مجلس پروفیسر سلیم نے ان حضرات کو بلوایا' مخاطب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ "میاں تنقید تو یقیناً اچھی چیز ہے اور آسان بھی لیکن تنقید بلا دلیل بالکل بے معنی ہے"۔

ایک عرصہ قبل پروفیسر صاحب نے مجلۂ طیلسانین میں ایک طویل مضمون شائع کیا تھا اور ایام جاہلیت کے عرب شعراء کے کلام کا اس طرح ترجمہ کیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلسلہ وار مختلف عنوانات پر ایک خاص مضمون ہے۔

پروفیسر صاحب کا خیال تھا کہ انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ علامیہ ہونا چاہیئے (راقم الحروف کا خیال ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ "قاموس اللغات" یا قاموس العلوم بہتر ہے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ پروفیسر سلیم نے مزاحیہ انداز میں طلبہ کو "خوش غلاف" کے نام سے مخاطب کیا "معنی سمجھتے ہو؟"
خوش غلاف ایسا شخص جو بلا غور و خوض ہر چیز کو تسلیم کرلے اور نرم دل ہو۔ متلون مزاج ہو۔ مثال کے طور پر ایک صاحب کا واقعہ بیان کیا کہ وہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بلا مطالبہ مالک بلا جبر و تشدد' خیال سے کرایہ ادا کردیتے تھے"۔ اصل میں خوش غلاف کے معنی ایسی تلوار کے ہیں جو معمولی حرکت سے از خود نیام سے باہر نکل آئے۔

ایک اور موقعہ پر انہوں نے ایک لفظ اختراع کرکے مجلس میں پیش کردیا۔ ایک اہل ذوق اور علمی نقاد نے یہ اعتراض کیا کہ یہ لفظ تو قدماء نے بھی کبھی استعمال نہیں کیا۔ حضرت سلیم نے فوراً ایک شاعر سے اس کو منسوب بھی کردیا۔ ماشاء اللہ سے محفل میں علماء کی کچھ کمی نہ تھی فوراً ایک رکن نے تردید کردی کہ شاعر کے دیوان میں قطعاً یہ لفظ نہیں ہے' اور یہ تھے علامہ علی حیدر نظم طباطبائی۔

معلوم نہیں وہ کیا سلسلہ تھا اور کونسا موقعہ و محل تھا مولانا نے حالی کے متعلق فرمایا تھا کہ آخر زمانے میں مولانا حالی بالکل خاموش رہتے تھے اور خاموشی ہی سے ہر ایک کو غور سے دیکھا کرتے خدا معلوم کیا دھن تھی؟

اکثر لوگ دیہاتی زبان اور شہر کی زبان پر اعتراض کرتے ہیں لیکن معترضین کا خیال غلط ہے۔ ہر مقام پر اس کی آب و ہوا اور ماحول' تہذیب و تمدن کے لحاظ سے لب و لہجہ بھی قدرتاً جدا جدا ہوتا ہے۔ مثلاً اردو کو لیجئے دیہات 'گاؤں' قریہ کی زبان شہری زبان سے کس قدر مختلف ہوتی ہے۔ ان کا لب و لہجہ' ان کی کہاوتیں' پہیلیاں' گانے بہ نسبت شہر کے کچھ اور ہی ہوتے ہیں اور شہر کی زبان کچھ اور ہی ہوتی ہے لہذا اس کا تمسخر اڑانا بالکل بیجا ہے۔ زبان تعلیم و تربیت اور سوسائٹی سے بنتی ہے۔

ایک روز انداز مزاح مولانا نے فرمایا کہ سلطان حساب سے بالکل ناواقف تھے۔ لہذا ابتداء میں اہل حساب دلی کیلئے غیر مسلم امراء کو ملازم رکھ لیے اور ان سے کام لیا۔ تاریخی حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ غلط ہے کہ جو سلطان حساب داں کیا

بالکل گورے ہیں ان کے اب و جد یقیناً غیر مسلم ہوں گے ۔

پروفیسر سلیم ایک مرتبہ نماز کے سلسلہ میں اپنے خیال کا اظہار کر رہے تھے کہ جب انسان بار بار ایک ہی چیز کو ہر روز دہراتا رہتا ہے تو از خود اس کے سب ارکان پورے ہو جاتے ہیں حالانکہ اس کا خیال دوسری جانب رہتا ہے ۔ مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے اور وہ نماز کا عادی ہے تو از خود تکبیر و ثنا ، قرات رکوع و سجود قاعدہ و التحیات و درود و سلام سب پورے ہو جاتے ہیں اور مصلی کسی اور خیالات میں غرق رہتا ہے ۔ (لیکن مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے ۔ اس لئے کسی مصلی کو حقیقی معنوں میں نماز سے دلچسپی و محبت ہو تو ہرگز دوسرے خیال کی طرف اس کا ذہن نہیں جائے گا ۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر جناب پروفیسر صاحب کا خیال یہ درست ہو سکتا ہے اور بقول سعدی " چہ خوردہ بامداد فرزندم " بحالت نماز وہی گھومتا رہے گا)

بی ۔ اے کا امتحان بالکل قریب تھا ۔ نصاب ختم ہو چکا تھا ۔ کلاس میں اکا دکا طالب علم رفع شکوک کے لئے آتے لیکن پروفیسر صاحب اپنے وقت پر تشریف لاتے ۔ ایک روز میں نے اپنے چند شکوک رفع کر لئے ۔ اسی اثنا میں پروفیسر صاحب نے مجھ سے سوال کیا " کیوں جی شعر کہتے ہو نا ؟ " میں نے فوراً یہ جواب دیا کہ " جی نہیں " جواب کے سنتے ہی یہ فرمایا کہ " افسوس تم نے میرے ساٹھ سال کے تجربے کو خاک میں ملا دیا " ۔ اس وقت مجھے بھی بڑی ندامت ہوئی ۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میں ایک مصرع کہنے پر بھی قادر نہیں تھا ۔ خدا کی قدرت سے عرصۂ دراز کے بعد چند شعر کہہ دیئے بہرحال یہ عجیب سی پیشن گوئی تھی ۔

لکچر سے قبل کلاس میں چند طلبا نے ملکی و غیر ملکی کی بحث چھیڑ دی ۔ مولانا نے سن کر فرمایا " ارے بھئی ہم آپ کو پڑھانے اور سکھانے کے لئے آئے ہیں ۔ آئندہ تو آپ ہی لوگ ان کرسیوں پر بیٹھیں گے " ۔

اس دنیائے ناپائدار کے کچھ عجیب سے کرشمے اور تقاضے ہیں کہ ایک دور میں زورؔ و سروریؔ دونوں حضرات یک جان دو قالب تھے لیکن جامعہ عثمانیہ میں اردو کی صدارت نے ان دونوں کی دوستی و محبت میں ایک خلیج حائل کر دی ۔ آخر کار بعد وظیفہ زورؔ نے علمی نبرد آزمائی سے اپنے آپ کو کشمیر جنت نظیر پہونچا دیا اور شعبۂ اردو کے صدر ہوئے ۔ اسی طرح بعد میں سروری صاحب نے اپنے دوست کا جائزہ لیا ۔ جائزہ ہی کیا تھا ۔ افسوس کی بات ہے کہ ظالم اجل نے ان دونوں حضرات کو جنت نظیر ہی میں پیوند خاک کر دیا ۔ چنانچہ ایک صاحب نے ان دونوں حضرات کی قبل از وقت مرگ مفاجات پر ایک شعر کہہ دیا ؎

ہر پختہ کار علم بکشمیر می رود　　امید واپسی وطن قطع می کند

قصہ مختصر یہ کہ جامعہ کے ان دو سپوتوں نے دوران طالب علمی میں حضرات سلیم سے بہت قرب حاصل کیا اور اسی نسبت کی بدولت علمی ذوق و شوق پیدا کیا اور صاحب تصنیف و تالیف ہوئے ۔

اردو کلاس کے طلبا نے بی اے کے امتحان کے قبل پروفیسر سلیم کی وداعی تقریب کے طور پر ایٹ ہوم ترتیب دیا اور صدر کالج عبدالرحمن صاحب کو مدعو کیا ۔ پروفیسر سلیم نے اپنی تقریر کی گرجوں ہی طلبا کی محبت اور رفاقت کا منظر سامنے آیا تھوڑی دیر کیلئے غشی طاری ہو گئی ، سب لوگ پریشان ہو گئے ۔ لیکن معمولی کا غشی ہوا ، مولانا کو فوراً رہائش گاہ پہونچا دیا گیا ۔ اس وقت صدر کالج نے لڑکوں سے دریافت کیا کہ کیا کلاس میں بھی ایسی غشی طاری ہوتی تھی ، طلبا نے جواب دیا کہ نہیں یہ پہلا موقع ہے ۔

غزلیں

وہ حدِ ادراک پر یوں چھا گئے
آئینے کی چادریں پھیلا گئے

تھے بظاہر جو رفیقِ زندگی
ہم اُنہیں سے آج دھوکا کھا گئے

خیر ہو یارب مآلِ ضبط کی
وہ تو صحرا کا پتا بتلا گئے

جن کے لب پر تھی کبھی مُہرِ سکوت
آج شرحِ آرزو فرما گئے

فصلِ گُل سے کوئی اتنا پوچھتا
گُلستاں کے پھول کیوں مرجھا گئے

عالمانِ آیتِ شک و یقیں
نور و ظلمت میں ہمیں اُلجھا گئے

ابرِ رحمت کا کریں وہ تذکرہ
آسماں سے آگ جو برسا گئے

عظمتِ انساں سے قربت تھی جنہیں
فاصلوں کی زد میں وہ بھی آ گئے

کیا کسی کے کام آئیں گے وفاؔ
سُن کے جو لفظِ وفا شرما گئے

وفاؔ براہی (دھاپ)

لڑکھڑائے کبھی اُلجھے کبھی دو گام چلے
اس طرح آپ کے رندانِ مئے آشام چلے

بات وہ کر کہ اُتر جائے دلوں کے اندر
کام وہ کر کہ زمانے میں ترا نام چلے

دل جلاؤ تو اُجالوں سے شناسائی ہو
اس اندھیرے میں بھلا شمع سے کیا کام چلے

میکدے کا ہے چلن تیرے ہی دم سے ساقی
تو جو آ جائے تو مئے خانے میں پھر جام چلے

زُلف کو ڈال کے چہرے پہ پلا اے ساقی
دَورِ ساغر کا ترے صبح سے تا شام چلے

کوئی تو جادۂ پُر شوق کا ساتھی ہو عزیزؔ
کہہ دو ہمراہ مرے گردشِ ایّام چلے

عزیزؔ احمد جلیلی

تری قدرت سے ہو جائے نئی دُنیا اگر پیدا
تو بے شک ہم بھی کر لیں گے نئے شام و سحر پیدا

کمالِ دید پیدا ہو، ہو ذوقِ دیدگر پیدا
وہ آیا طور پر کوئی!! کرو تابِ نظر پیدا

چمن ہی جب اُجڑ جائے، کہاں ہو آشیاں میرا
نیا ہو اک چمن جس میں، کروں آہِ سحر پیدا

الٰہی! پھر دکھا دے آگ کا گلزار ہو جانا
ہو ابراہیم پھر پیدا، ہو عشقِ بے خطر پیدا

محیطِ بیکراں بھی ہے، صدف بھی، موجِ مضطر بھی
وہ اک قطرہ بھی کیا شئے ہے کہ جس سے ہو گہر پیدا

اسیرِ دوش و فردا بے عمل بیٹھے رہیں کب تک
سُنا دو دردؔ کے نالے، کہ شاید ہو اثر پیدا

محمد یعقوب دردؔ

شاکرہ

ایک ادیب - ایک شہر

سارا دن اِدھر، ساری رات اُدھر، جاگے پاک پروردگار، جاگے شہر حیدرآباد بھی، جاگوں میں بھی لیکن تھکن سے چور، بس کے انتظار میں مجبور۔ ساتھ ہی ذہن میں ایک مضمون کا خاکہ بنتا اور بگڑتا ہے، بگڑتا ہے اور بنتا ہے —— مجھے ایک ادیب کے بارے میں نئے ڈھنگ سے لکھنا ہے ..... پر بات کچھ بن نہیں رہی ہے —— اتنے میں ایک بس آگئی، کوئی تیزی سے دوڑتا آتا ہے اور پوچھتا ہے، ماہ نامہ یٹھہ کی بس ہے کیا؟ ہنسی اور طنز سے بھرپور جواب ملتا ہے، نہیں، مہدی پٹنم چلنا ہے تو چلو —— یہ دو نام مجھے چونکا دیتے ہیں، ذہن میں ایک روشنی سی آتی ہے اور میرے ادھورے مضمون کا خاکہ مکمل ہوجاتا ہے۔

میں سوچتی ہوں یہ دو محلے ماہ نامہ یٹھہ اور مہدی پٹنم دکن دیس کے اسی شہر نگاراں کے دو اہم شخصیتوں کے نام پر سے ہیں۔ اور وہ ادیب جس کے بارے میں مجھے لکھنا ہے، مورخ دکن تھا، بقول مصورِ فطرت حسن نظامی کے اس کے اہم موضوع تھے 'صنفِ نازک'۔ دکن کی تاریخ اور اردو زبان و ادب کے وہ بھی دکھنی کلچر، ثقافت تہذیب اور شائستگی کا ایک ورثہ ہے۔ اس سارے ورثہ کو اس ادیب نے ماضی کے اندھیروں سے نکال کر حال کے اجالوں میں پیش کیا تاکہ آنے والی نسل اس کو پہچانے اور اس کی قدر کرے۔ تو میں سوچا کہ اس ایک محلہ سے دوسرے محلے تک ہم ہاشمی صاحب کو رہنما بناکر چلتے چلیں۔ کتنے ہی نام و مقام ایسے آئینگے جن کے بارے میں انہوں نے لکھا یا جن سے ان کا ربط رہا تھا۔ اس طرح ایک شہر کی تاریخ اور خود ادیب کی زندگی بھی ہمارے سامنے آجائے گی تو چلئے ان کی ہمراہی میں یہ پدیاترا شروع کریں اور مضمون مکمل کردیں۔

یہ ہاشمی صاحب ہیں، دراز قد، دُبلے پتلے، سرخ و سفید، نہ جانے کیوں عبداللطیف اعظمی کو وہ بے ڈول سے لگے۔ حیدرآبادی فیشن کی خوب لمبی سی شیروانی پہنے، ریشمی ازار بند شیروانی سے بھی نکلتا ہوا، چوڑی دار پاجامہ، پاؤں میں بھاری چڑاوے، وقت کے بڑے پابند، اسی لئے بہت تیز چلتے ہیں کہ کہیں گھڑی کی سوئیاں آگے نہ بڑھ جائیں۔ اگر ہم نے دیر کی تو وہ یہ جا وہ جا، نظروں سے غائب ہوجائیں گے۔

باتوں ہی باتوں میں ہم بہت آگے کیشوگیری تک نکل آئے —— قطب شاہی دور کا یہ قصبہ بڑی تیزی سے جدید بنتا جارہا ہے۔ ڈیفنس لیاب کی وجہ یہاں چہل پہل بہت بڑھ گئی ہے۔ مندر کی رونق میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ ہاشمی صاحب دیول کے بارے میں کچھ کہتے ہیں "ایک بلند پہاڑ پر کیشوگیری یا چندراین گٹہ کے سامنے کیشوگیری ہے۔

دیول تعمیر ہوئی ہے۔ اس دیول کا بانی اکنا دیوان قطب شاہ تھا۔ اکنا اور مادنا بھائی بھائی تھے۔ حیدرآباد کے مضافات میں بیسیوں دیولیں تھیں جن کو آصف جاہی حکومت کی جانب سے معاش مقرر تھی"۔ سامنے شہر خموشاں ہے۔

سوادِ شہرِ خموشاں میں دیکھ لے جاکر ۔۔۔ شنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے (یگانہ)

یہ درگاہ برہنہ شاہ ہے۔ ہاشمی صاحب بتاتے ہیں" برہنہ شاہ ایک مجذوب تھے، ان کی درگاہ مشہور ہے۔ پائیگاہی امیروں اور ان کے خاندان کا یہ مدفن ہے" اب ہم مادنا پیٹھ پہونچ گئے ہیں۔ ہاشمی صاحب کے مطابق "ہنمکنڈہ، ورنگل کے بھانو جی پنڈت کے چار لائق بیٹے تھے جن میں سے دو اکنا اور مادنا شاہی دربار تک پہنچے۔ میر جملہ سید محمد مظفر ان کے مربی تھے۔ ان بھائیوں نے تلنگی اور فارسی کی اعلیٰ قابلیت حاصل کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ابوالحسن کے عہد میں شاہی فرمان (اورنگ زیب کا) آیا جو سفید روشنائی میں لکھا ہوا تھا۔ ایک ہی شخص اس کو پڑھ سکا اور وہ مادنا تھا۔ اسی روشنائی میں اس نے خط کا جواب بھی لکھا۔ ان بھائیوں نے آڑے وقت میں اپنے آقا کی مدد کی تھی"۔ ہاشمی صاحب کے دوست پروفیسر عبدالمجید صدیقی نے یہ واقعہ اپنی کتاب "تاریخ گولکنڈہ" میں غالباً سب سے پہلے لکھا ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ" بادشاہ کو اس پر پورا اعتماد تھا اور یہ اعتماد آخر وقت تک رہا۔ ملک کے تمام لوگ اس کے دشمن ہو گئے تھے لیکن ابوالحسن اس سے کبھی بدگمان نہیں ہوا ۔۔۔ صدیقی صاحب مآثر عالمگیری کے بیان کردہ واقعات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ " اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بیانات بہت کچھ مبالغے پر مبنی ہیں۔ چونکہ مادنا اور اس کی حکومت کا مسلک مغل شہنشاہیت کے لئے سنگ راہ تھا اس لئے یہ قدرتی بات تھی کہ مغل مورخوں نے ابوالحسن اور اس کے وزیر مادنا کے خلاف اپنے دل کا بخار نکالتے"۔ نہ صرف یہ دونوں بھائی بلکہ ان کا خاندان اور تلنگانہ کے کئی خاندان فارسی سے بخوبی واقف تھے۔

شہر حیدرآباد میں قطب شاہی آثار کی کوئی کمی نہیں ہے اور یہ انہیں کے زمانے میں بنائی ہوئی پرانی عیدگاہ ہے۔ اس طرف سعید آباد کی سرائے ہے اور یہ قطب شاہی مسجد ہے۔ قطب شاہیوں نے فن تعمیر میں جو تجربے کئے تھے وہ ملی جلی تہذیب کے نمونے ہیں۔

آگے بڑھیئے، پوسٹ آفس کے سامنے ملا عبدالقیوم کے نام لیوا عبدالقیوم سیوطیتی (موجودہ نظام کے سکریٹری) کا بنگلہ ہے اس خاندان کی بھی اپنی روایات اور خصوصیات ہیں۔ ملا عبدالقیوم کے بارے میں ہاشمی صاحب سے سنیئے " ملا عبدالقیوم کا تعلق مدراس سے تھا، میرے والد مولوی عبدالقادر بھی مدراس سے آئے تھے، دونوں کو بھی ملکی اور قومی کاموں سے دلچسپی تھی اس طرح حجاز ریلوے، دائرۃ المعارف کتب خانہ آصفیہ کے جلسوں میں دونوں شریک ہوتے تھے۔ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کا انتقال ایک ہی سال ہوا۔ ملا صاحب نے سیاسیات ہندوستان میں ابتدائی زمانے میں کانگریس سے اتفاق رائے کر لیا تھا بڑے پر جوش کانگریسی تھے، آپ پہلے مسلمان تھے جنھوں نے کانگریس میں نہ صرف شرکت کی بلکہ بڑا عملی حصہ لیا۔

یہ سعید آباد ہے۔ دور آصفی کے کئی عمائد اور امرا یہاں قیام پذیر تھے۔ صنعتی تہذیب میں بڑے بڑے کنبوں، بڑے پیمانہ پر خاندانی تقریبوں کی گنجائش کہاں ہے۔ سعید آباد کے کئی بڑے بڑے بنگلوں میں بھی اب دوسرے محلوں کی طرح کارخانے پروان چڑھ رہے ہیں۔ کالونی جانے والے راستہ پر نواب امین جنگ کے بنگلہ اور کتب خانہ کی بلند و بالا

عمارت اب بھی راہروؤں کی توجہ کھینچتی ہے . مگر کتب خانہ اب کہاں ؟ ہاشمی صاحب کی کتاب پر امین جنگ نے
پیش لفظ لکھا تھا . ہاشمی صاحب ان کے الفاظ دہراتے ہیں — " میرے نوجوان دوست نصیر الدین ہاشمی نے مجھ سے خواہش
کی ہے کہ میں ان کی اس تالیف کا پیش لفظ لکھوں . ہاشمی صاحب کے آباد اجداد میں اور میرے آباد اجداد میں دیرینہ علمی و
علمی ارتباط و اتحاد رہا " ہاشمی صاحب نے لکھا " میرے حسب استدعا میرے شفیق محترم واجب التعظیم علمی دوست اور بزرگ
عالی جناب ڈاکٹر امین جنگ بہادر (دام اللہ فیوضہ) نے ازراہ عنایت پیش لفظ لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی جو میرے اس
رسالے کے لئے باعث زینت ہوئی " امین جنگ کے پاس کی مخصوص محفلوں میں ہاشمی صاحب شریک ہوتے تھے . ایسی ہی
ایک محفل میں مہاراجہ کشن پرشاد نے ہاشمی صاحب کو اپنے ہاتھ سے پان بنا کر عنایت کیا تھا . ہاشمی صاحب نے بزرگوں کے
سامنے ایسا کرنا تہذیب کے خلاف سمجھا - ایک حالیہ سروے کے مطابق جاپانی بزرگوں کی عزت میں ساری دنیا میں آگے
ہیں، شاید اسی سے آج جاپانی ترقی کی دوڑ میں مغرب سے آگے بڑھے جا رہے ہیں، شاید بزرگوں ہی کی توقیر ہے جس نے
ہندوستانی تمدن کو ہزاروں سال سے باقی رکھا ہے جبکہ ع یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
چلئے، آگے چلیں، سیدآباد پولیس اسٹیشن کے سامنے والی سڑک پر سیدھے چلے جائیں تو موجودہ گورنمنٹ پریس اور
سابقہ دارالطبع کا موڑ آجاتا ہے - یہ بڑا بلند مقام ہے - یہاں سے آس پاس دور دور تک دیکھا جاسکتا ہے . یہاں ذرا سا
رُک جائیں تو ہاشمی صاحب سے بہت سارے تاریخی واقعات کی تفصیل سُنی جاسکتی ہے . آسمان گڑھ کو دور کہیں دیکھ کر
پائیگاہ کی تاریخ مدِنظر ہوجاتی ہے . وہ آصف جاہ اوّل کا کارواں دہلی سے نکل کر دکن کی راہوں پر رواں دواں ہے -
بے حد قریبی رفیقوں میں ہم رکاب ہیں ابوالخیر خاں، ان ہی کے اخلاف امرائے پائیگاہ کہلائے . ان میں سب سے نامور ہوئے
فخرالدین خاں تیغ جنگ ثالث شمس الامراء ثانی امیرکبیر اول، مدرسہ فخریہ کے بانی . مدرسہ شمسیہ کے مربی . ہاشمی صاحب سے
ان کی تعریف سنیے۔ " انہوں نے مغربی علوم و فنون یعنی طبعیات، ریاضی اور ہیئت کی کتابوں کو انگریزی اور فرانسیسی زبانوں
سے اردو میں ترجمہ کرانے کا سلسلہ قائم کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور نہ کہیں
اس قسم کے کام کی ابتدا ہوئی تھی . ارباب کمپنی نے کلکتہ میں اردو نثر کی ترویج میں قصہ کہانیاں یا تاریخ کی کتابیں ترجمہ کرائیں
یہ کارنامہ اس زمانہ میں تاریخِ ادب اردو کا ایک ممتاز باب سمجھا جاتا تھا . لیکن شمس الامراء نے جو کتابیں ترجمہ کرائیں اور
اس کی بدولت زبانِ اردو میں جو اضافہ ہوا وہ ان قصہ کہانیوں سے کہیں زیادہ بلند ہے "۔
امرائے پائیگاہ سے ہاشمی صاحب کا گھرانہ بہت قریب رہا۔ حسین عطاء اللہ، ہاشمی صاحب کے نانا، بشیرالدولہ آسمان جاہ
کے آدمی سمجھے جاتے تھے . آسمان جاہ کو آپ پر آخر تک اعتماد رہا . راجہ ریج رائے مصنف صحیفۂ آسمان جاہی کے حوالے سے
ہاشمی صاحب لکھتے ہیں —— " شام کے تقریباً پانچ بجے ہوں گے نواب صاحب نے ڈاکٹر اعتماد الحق صاحب اسٹاف سرجن سے
فرمایا " اس وقت کوئی فارسی لکھنے والا ہو تو اس کو بلوایا جائے " ڈاکٹر صاحب موصوف نے راقم الحروف ریج رائے اور عالیجناب
مولوی حسین عطاء اللہ میر مجلس کا نام عرض کیا کہ یہ موجود ہیں . فرمایا مولوی صاحب بلوائے جائیں " راقم الحروف اور دیگر حاضرین
وغیرہ حاضر ہوئے . آپ نے نہایت استقلال سے مولوی صاحب موصوف کی جانب مخاطب ہو کر فرمایا کہ خدائے عزوجل کے احکام کی

تعمیل سب پر فرض ہے .... نواب صاحب نے سب کو جتا کر حسب ذیل وصیت فرمائی اور مولوی صاحب موصوف کو ارشاد ہوا کہ اس کو قلمبند کیا جائے ۔ وصیت نامہ کے ساتھ خزانہ جس میں علاوہ نقد رقم کے جواہرات وغیرہ بھی تھے جن کا کوئی حساب نہیں تھا مولوی صاحب کے حوالے کر دیا "۔

ہاشمی صاحب نواب فخر الدین خاں شمس الامراء امیر کبیر کے بارے میں مزید تفصیل بتاتے ہیں " ان کے مدرسہ میں جس طرح درس تدریس اور وظائف میں مذہب کی تخصیص نہیں تھی اسی طرح طلباء میں بھی کوئی فرق مذہب و ملت کا نہیں تھا۔ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کی تعداد زیادہ تھی ۔ شمس الامراء کے مترجمین میں مسلمان، ہندو، عیسائی تینوں کے نام ملتے ہیں ۔ منو لال صاحب عمدۃ التواریخ " رتن لال ست، بچولال تمکین، رام پرشاد، راجہ تیج رائے صحیفۂ آصف جاہی کے مرتب کے نام لئے جاسکتے ہیں ۔ اسی طرح جوزف عیسائی کے سنگی چھاپہ خانہ جسے دار الطبع کا پیش رو کہنا بجا ہوگا ، ان کے علاوہ انکسداؤ وٹھل راؤ گلبرگہ کے باشندے تھے ۔ یہ لوگ خورشید جاہ کے متوسل تھے ۔ تاریخ خورشید جاہی کے مرتب اس تاریخ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں بجائے سلاطین اور حکمرانوں کے صوبوں اور اولیاء اللہ نیز شاہان ایران کے حالات شامل کئے گئے ہیں "۔ پائیگاہی امراء کے حالات کا ایک اور رُخ بھی ہے ، وہ صرف انگریز پرست اور عیش پسند امراء میں نہیں تھے ۔ کئی فرزندان پائیگاہ نے جنگ آزادی کی لڑائی میں خون بہایا ۔ ہاشمی صاحب نے اپنے ایک مضمون " جنگ آزادی میں اقتدار الملک امیر پائیگاہ کا حصہ " میں اس کی تھوڑی سے تفصیل دی ہے ۔

مقابل میں مدرسۂ آصفیہ کی بلند و بالا مسجد کے مینار نمایاں ہیں جس کے زیر سایہ خرابات نہیں بلکہ دانش گاہ ممتاز کالج قائم ہے ۔ حمیر نواب ممتاز یار الدولہ کی یادگار ، ہاشمی صاحب بتاتے ہیں کہ " ممتاز یار الدولہ مولوی محب حسین کی تحریک آزادی کے علمبردار تھے ۔ صدر النساء بیگم (دختر ممتاز الدولہ) اور افضل النساء بیگم (بیگم ممتاز یار الدولہ) بھی اس تحریک میں شامل تھیں ۔ میرے والد مولوی عبدالقادر اس تحریک کے مخالف تھے وہ اس وقت کے حالات اور اسلامی روایات اور ضروریات زمانہ کے مدنظر پردہ ضروری تصور کرتے تھے "۔

جدید دار الطبع سے متعلق بھی چند بھولے ہوئے نام ہاشمی صاحب یاد دلاتے ہیں ۔ راجہ وینو گوپال اس کے ڈائرکٹر تھے ، مسز جیلا پٹے مصور ، موسیقار اور سماجی خدمت گذار تھیں بلکہ اندرا پٹے ماں کے قدم بقدم تھیں ۔ مسز پٹے کو انفلوئنزا کے موقع پر بے لوث خدمات انجام دینے پر سرعلی امام نے ایک طلائی تمغہ عنایت کیا تھا ۔

سامنے عشرت محل یا محبس ہے مخدوم کی آواز گونجتی ہے ۔

مجھے غم ہے کہ مرا گنج گرانمایۂ عمر ٭ نذر زنداں ہوا نذر آزادیٔ زنداں وطن کیوں نہ ہوا

ساتھ ہی اشفاق ان کے بارے میں لکھتے سنائی دیتے ہیں ۔

" اس شہر نے اس کی رنگا رنگ شخصیت کے سارے ہی پہلو بے نقاب دیکھے اس کی کوچہ گردی اور بے راہ روی بھی دیکھی اور اس کی فتوحات بھی ۔ اسے تہی دامن بھی دیکھا ہے اور گل بداماں بھی ، اس کی آشفتہ سری بھی دیکھی اور محبوبیت بھی "

میں سوچتی ہوں یہ سب ہاشمی صاحب کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے ۔ مجھے یہ بھی یاد آتا ہے کہ ہاشمی صاحب زندگی میں بے تکلف محفلوں میں اپنے ہم عصروں کی درون و بیرون خانہ زندگی کے بارے میں بے جھجک اظہار خیال کرتے تھے ۔ مخدوم کی سوانح یا

تنقید نگار ہو ان کی ساری تحریروں میں شاید ہی کہیں اپنے ہم عصروں کے بارے میں گراوٹ یا تضحیک کے الفاظ تو کیا اشارہ کنایہ میں بھی ذکر نہیں ملتا ۔ یہ ان کی وسیع مشربی اور سیرت کی بڑائی تھی ۔

سامنے سے نکل جائیں تو چنچل گوڑہ سے گذر ہوگا ۔ مہدوی پٹھانوں کا ٹھکانہ ' آزادی کی لڑائی میں مہدوی جونپوری اور ان کے پیروؤں کا بڑا حصہ رہا ہے ۔ حیدرآباد میں جدوجہد آزادی کی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے ہاشمی صاحب نے جو خدمات انجام دی تھیں انہیں ریاست کے پہلے چیف منسٹر بی رام کشن راؤ نے پسندیدہ قرار دیا تھا ۔ اصل تاریخ تو انگریزی میں لکھی جاری تھی مگر ہاشمی صاحب دلچسپ معلومات اردو اخباروں اور رسالوں میں شائع کراتے رہے ۔ اس محلے سے متعلق ایک جانباز کی یاد میں لکھے گئے ایک مضمون کی یاد آتی ہے ۔ ہاشمی صاحب اس مضمون میں بتاتے ہیں کہ شہید آزادی طرہ باز خاں' رستم خاں روہیلے کے بیٹے تھے ' سپاہی بھی تھے اور لیڈر بھی ۔

سیدھے چلے چلیں تو بالغ بہروں کے اسکول پر کے سامنے سے گزریں گے ۔ پہلے یہاں اندھوں اور بہروں کا اسکول ہوا کرتا تھا ۔ مشہور پارسی کاوس جی گھرانے کے ایک رکن شہریار کاؤس جی اس کے پرنسپل تھے ۔ ہاشمی صاحب کے اس گھرانہ سے قریبی تعلقات تھے ۔

ریلوے برج کے نیچے سے گذر کر آگے بڑھیں تو صحیفہ پوسٹ آفس سے گزرتے ہوئے افضل پورہ چوراہے تک پہونچ جائیں گے ۔ اُلٹے ہاتھ پر افضل پورہ کی سڑک پر مسجد صحیفہ کے مینار اب بھی سر بلند ہیں ۔ مگر صحیفہ اخبار اور اس کے پریس کی داستان اب فراموش ہو رہی ہے ۔ ہاشمی صاحب ہمیں اس کی تاریخ سناتے ہیں " رضی الدین حسن کیفی مرحوم نے اس رسالہ کو شائع کیا مگر یہ چند ماہ بعد بند ہوگیا ۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے تمام تر مضامین عموماً اہل دکن کے لکھے ہوئے ہوتے تھے ۱۳۳۹ھ میں روزانہ اخبار کی شکل میں شائع ہونے لگا ۔ مولوی اکبر علی اس کے مدیر ایک خاص پالیسی کے تحت کام کرتے تھے ۔

ہمیں ان بہت ساری خواتین کے نام بھی یاد آجاتے ہیں جن کو ہاشمی صاحب نے اپنی تحریروں کے ذریعہ روشناس کرایا جو آس پاس ہی رہتی تھیں ـــــ جن میں قابل ذکر تھیں ۔ بشیر النساء بشیر' امۃ الکریم خورشید نذیر' زینب یوسف زئی' قطب النساء بیگم وغیرہ وغیرہ ' خواتین کی ہمت افزائی اور ان کے کارناموں کی اشاعت چاہے وہ کتنے ہی ابتدائی نوعیت کے ہوں' ہاشمی صاحب کا خاص موضوع تھا ۔ بقول قطب النساء بیگم " کوئی تحقیقی کام سر پر آن پڑا اور محترم کو ایک پوسٹ کارڈ سے اس کی اطلاع کریں' پھر کیا ہے' لیجئے کتاب حاضر' حوالے حاضر' اسی لئے خواتین ان کی دل سے مشکور ہیں " ۔

اب ہم چادر گھاٹ پل پر سے گذر رہے ہیں اور ہاشمی صاحب سے سُن رہے ہیں " انگریزی چھاؤنی میں رزیڈنسی والوں کی سہولت کے لئے ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم کے زمانے میں یہ پل تیار ہوا ۔ رزیڈنٹ جنرل اسٹوارٹ نے اس پل کو تعمیر کرنے کی تحریک کی تھی ۔ ۱۸۳۱ء میں اولی ننٹ انجنیر کی نگرانی میں ایک سو گز لمبا' ۴۲ فیٹ چوڑا اور ۵۴ فیٹ اونچا پل بنایا گیا ۔ چادر گھاٹ اس لئے کہتے ہیں کہ ندی کا پانی ایک چٹان کی وجہ سے چادر کی طرح گرتا تھا ۔ طغیانی میں یہ تباہ ہوگیا ۔ ۱۹۰۸ء کے بعد اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا ۔

رود موسیٰ کی طغیانی کے ساتھ سر بر دکن حضرت امجد کی یاد آنی ضروری ہے جن کا سب کچھ اس طغیانی کی نذر ہوا اور جن

کے بیارے ہے

شب بھر رہے فوارے میں فوارے کی مانند ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کی مانند

اور حضرت امجد یہ کہنے کے لئے جیتے بچ گئے ہے

غم سے بھر آئی آنکھ بہنے لگے اشک ضبطِ الم نے آنکھ کو ساغر بنا دیا

ہاشمی صاحب کو سرمدوکن سے نسبتِ خصوصی تھی، مکتوباتِ امجد اور "حضرت امجد کی شاعری" کے مرتب کی حیثیت سے ان کا نام بھی امجد کے نام کے ساتھ باقی رہے گا۔

پل کی دوسری طرف پہنچتے ہیں، ہاشمی صاحب کا سلسلۂ گفتگو جاری ہے۔ یہ مولوی علاء الدین روڈ ہے کبھی یہ رنگ محل روڈ کہلاتی تھی۔ انگریز ریذیڈنٹ کرک پیٹرک، حشمت جنگ اور خیر النساء کی رہائش گاہ، رنگ محل کو جانے والا راستہ ہے، جنگِ آزادی میں ہندوستان کے ہر مذہب وملت کے لوگ شامل ہوئے تھے، اس کی ایک مثال مولوی علاء الدین کی بھی ہے۔"

سیدھے نکل چلیں تو عیسٰی میاں بازار آجائے گا، ہاشمی صاحب کے الفاظ میں "حیدرآباد کے ایک امیر عیسٰی میاں المخاطب میراں یار جنگ تھے۔ یہ اس وقت انگریزی فوج کے ساتھ تھے جو ٹیپو سلطان سے جنگ کرنے حیدرآباد سے گئی تھی عیسٰی میاں کے تعلقات انگریزوں کے ساتھ بہت زیادہ ہوگئے تھے اس لئے انہوں نے اپنا مکان رزیڈنسی کے قریب بنایا، زمانہ مابعد ان کا محل تو باقی نہیں رہا البتہ بازار آج تک موجود ہے۔

آگے سلطان بازار ہے، سابقہ رزیڈنسی بازار، ہاشمی صاحب کہتے ہیں، بیرونِ شہر کے محلوں میں یہی آباد تھا یا سلطان بازار سب سے پہلے تعمیر ہوا۔ ۱۹۳۳ء کے پہلے سلطان بازار کا نام رزیڈنسی بازار تھا۔ اور اس کے پہلے اس کو چھاؤنی رزیڈنسی کہتے تھے۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کی جانب سے ایک سفارت حیدرآباد آئی، جانسن اور اس کے ساتھ قمر الدین خاں انگریزوں کے سفیر بن کر آئے تھے، اولاً انہوں نے جان اللہ شاہ کے تکیہ کے قریب (موجودہ کتب خانۂ آصفیہ کے قریب) قیام کیا کیونکہ بلا اجازت شہر کے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ آصف جاہ ثانی نظام علی خاں اس وقت حکمران تھے اور ارسطو جاہ وزیر اعظم۔ اطلاع کے بعد انگریزی سفیر کو شاہی مہمان بنایا گیا۔ اور انوار الدین خاں صاحب صوبہ دار ارکاٹ کے ایوان میں جواب بھی بلدیہ کے دفتر کی صورت میں موجود ہے، مہمان کو مقیم کیا گیا "۔ ہاشمی صاحب کی والدہ کے اجداد میں سالار الملک صفی الدین خاں بھی اسی مکان میں مقیم رہے تھے، بحیثیتِ وکیل نواب ارکاٹ کے۔ تب یہ مبارک محل کہلاتا تھا) ہاشمی صاحب کا سلسلۂ کلام جاری ہے۔ "اس سفارت سے بات چیت کے نتیجہ میں آصف جاہ ثانی نظام علی خاں سے انگریزوں کا ایک معاہدہ ہوگیا ایک انگریزی فوج معہ توپ خانہ کے نظام کی مدد کے لئے حیدرآباد میں مقیم کرنے کا تصفیہ کیا گیا اس کے معاوضہ میں جاگیر دی گئی اس فوج کے قیام کے لئے وہ جگہ پسند کی گئی جہاں اب سلطان بازار ہے۔ رزیڈنٹ کرک پیٹرک کا خطاب حشمت جنگ اسی زمانہ کی یادگار ہے جب انگریز سفیر آصف جاہ ثانی کو نذر پیش کرتے تھے اور ان کے عطا کردہ خطابات معز الدولہ حشمت جنگ وغیرہ کو باعثِ افتخار سمجھتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں جب یہ علاقہ نظام کو واپس کر دیا گیا تو اس کا نام سلطان بازار اور راستہ کا نام شاہراہ عثمانی رکھا گیا۔

اس سڑک کو اب ٹینک اسٹریٹ کہا جاتا ہے۔ ہاشمی صاحب ایک اور بتلاتے ہیں "رزیڈنسی کی جو عمارت آج کل زنانہ کالج کی صورت میں موجود ہے وہ اولاً شمشیر جنگ اعتماد الدولہ کوتوال شہر کا باغ تھا۔ جب انگریزوں کی فوجی چھاؤنی بن گئی تو انگریز سفیر اس باغ میں رہنے لگا۔ ۱۸۰۶ء میں رزیڈنٹ کرک پیٹرک کی خواہش پر عمارت تعمیر کرنے کی اجازت دی گئی۔ مدراس کے ایک انجینیر رسل کی نگرانی میں جس کے ساتھ راجہ کندہ سوامی کے باپ بھی شریک تھے یہ عمارت بنی۔ زمانہ مابعد میں جب انگریزی فوج میں مزید اضافہ ہو گیا تو اس کو اس مقام سے سکندرآباد اور الوال میں منتقل کر دیا گیا۔ اور یہاں صرف سیول آبادی رہنے لگی۔ انگریزوں کے چرچ کی جانب یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے مدرسے بھی بنے تھے جو آج بھی سینٹ جارجز گرامر اسکول کے نام سے عابد روڈ پر موجود ہیں۔ انگریزی دواخانہ (موجودہ دواخانہ سلطان بازار) بھی پہلے اسی مقام پر تعمیر ہوا تھا"۔ ادیب باپ کے ڈاکٹر بیٹے زیڈ این ہاشمی آج اسی راستہ پر ہومیوپیتھی میں نام کما رہے ہیں۔

زنانہ کالج پر ان بے شمار اساتذہ اور طالبات کی یاد آتی ہے جن کی ہاشمی صاحب نے ہمت افزائی کی تھی۔ خواتینِ عہدِ عثمانی، خواتینِ دکن کی اردو خدمات، دکن میں اردو، اور بے شمار مضامین میں ایسے کتنے سارے نام بکھرے پڑے ہیں۔ ——— احمد النساء ثریا، تسنیم یزدانی، رشیدہ ریورٹر، رضیہ بیگم، رفیعہ سلطانہ، زینت ساجدہ، سعادت جہاں رضوی، سلطانہ شرف الدین، شریف النساء، لطیف النساء وغیرہ وغیرہ۔

شاہراہ عثمانی پر چلے چلیں تو ہاشمی صاحب، رگھوپتی راجہ پرتاب گیرجی کی کوٹھی کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ حیدرآباد کا پہلا شادی خانہ تھا، اب یہاں ای این ٹی ہاسپٹل ہے۔

ناکہ کے سامنے کی گلی میں چلے جائیں تو ترپ بازار پہنچ جائیں گے" ہاشمی صاحب کہہ رہے ہیں ——— "سلطان بازار کے مغرب کی طرف ترپ بازار ہے۔ آصف جاہ ثانی اور ثالث کے زمانے میں یہاں موسیو ریمو کے تحت فرانسیسی فوج رہا کرتی تھی۔ اور ٹروپ کی مناسبت سے ترپ بازار ہو گیا۔ ہماری یاد تک ترپ بازار میں فوجی بارکس کے مکان موجود تھے جو خاص وضع کے کمان دار کمرے ہوا کرتے تھے۔ فوجی ہیڈ کوارٹر کا جو مکان تھا وہ آج بھی موجود ہے (اب اس مقام پر راما کرشنا تھیٹرز کھڑے ہیں) اور اس میں گوشہ محل کا زنانہ اسکول ہے۔ یہ عمارت حیدرآباد کے کسی قدیم اور جدید وضع کی عمارت سے نہیں ملتی بلکہ فرانس اور پیرس کے عمارت کے نمونہ پر ہے۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل ترپ بازار شرفاء اور معززین کی قیام گاہ تھا۔ اکثر سرکاری عہدیدار اور معززین یہاں قیام کرتے تھے۔ مولوی عزیز مرزا (سجاد مرزا، ابو سعید مرزا نواب سعید جنگ، احمد مرزا نواب اعظم جنگ، محمد مرزا، بابر مرزا کے والد) حضرت داغ کا مدتوں یہاں قیام رہا۔ ڈاکٹر سید احمد جو حیدرآباد کے مشہور ڈاکٹر تھے اسی جگہ رہا کرتے تھے۔ مقرب جنگ کا باغ اور مکان اسی محلہ میں تھا۔ آصف یار الملک سید عبدالرزاق جو مالگزاری اور پھر صرف خاص کے معتمد تھے اسی محلہ میں رہا کرتے تھے۔ سکندر نواز جنگ کا خاندان بھی اسی محلہ میں مقیم تھا۔ راجہ فتح نواز ونت مرلی دھر کا خاندان بھی اسی محلہ میں قیام کرتا تھا بہر حال یہ محلہ اپنی خاص شہرت رکھتا تھا۔ نواب رحیم جنگ بھی یہیں رہتے تھے، نواب انتخاب جنگ صرف خاص کے اعلیٰ عہدیدار اور بلحاظ قوم نوائط ہم قوم تھے۔ آپ کے مراسم بھی دوستانہ اور مخلصانہ تھے انہیں کے نواسے عابد علی خاں صاحب ہیں جامعہ کے قابل سپوت، گریجویٹ، اور "سیاست" کے ایڈیٹر۔ جو سیاسی، معاشی، اصلاحی اور ادبی نقطۂ نظر سے کامیاب اخبار ہے"

سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ہاشمی صاحب اور تفصیل بتاتے ہیں،

" ترپ بازار کی بڑی وسعت تھی آج کئی ناموں سے اس کے حصے آباد ہیں ایک حصہ جام باغ کہلاتا ہے۔ یہاں آج سے ساٹھ ستّر سال پہلے تک جام کے درخت موجود تھے۔ اسی محلہ میں سب سے پہلے میرے نانا مولوی حسین عطاء اللہ نے اپنا مکان تیار کیا، پیر راجہ صاحب ونیرتی اور دوسرے لوگوں کے مکان بنے، آج میوہ کی منڈی ہے۔ میرے والد مولوی عبدالقادر، غلام محمد شرف الدولہ غالب جنگ کے فرزند، سالار جنگ کے حسب الطلب حیدرآباد آئے۔ ۱۲۹۲ف میں آسمان جاہ کے عہد وزارت میں جالنہ کے منصف مقرر ہوئے فرانس اور پیرس کی عمارتوں کے نمونوں پر فرانسیسی ہیڈکوارٹر کا مکان انھوں نے خرید کیا۔ ساتھ میں ایک اور بڑا بنگلہ بھی تعمیر کیا۔ یہاں اب رام کرشنا تھیٹر ہے۔ پرانی عمارتیں سب گرادی گئیں۔

" میری پیدائش ۱۷ رمضان ۱۳۱۲ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۸۹۵ء کی ہے۔ ہمارا مکان نہایت کشادہ تھا۔ سہ پہر میں اور تعطیل میں نیچے کھیلا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھ کھیلنے کے لئے محلے کے دوسرے لڑکے نہیں آتے تھے بلکہ پھوپی زاد بھائی آیا کرتے تھے۔ بارہ سال کی عمر تک ہماری زندگی ایسے ماحول میں گذری جو خوش سلیقگی اور خوش مزاجی کا آئینہ دار تھا۔ ایک باغ جو ہر موسم میں سرسبز و شاداب رہتا تھا جہاں درخت سلیقہ سے لگائے گئے تھے۔ زیر زمین نالوں سے حوض میں فوارے چلتے رہتے تھے۔ ہر کمرہ صفائی اور پاکیزگی کا نمونہ، دیواروں پر خوش خط قطعے، کیونکہ فوٹو یا تصویر لگانا ناجائز تصور کیا جاتا تھا۔ تعلیم کے لئے استاد مقرر تھے۔ والد کے انتقال کے وقت میری عمر بارہ سال تھی۔ مجھے والد مرحوم کی کئی باتیں ورثہ میں ملی ہیں۔ یعنی علمی خدمت، تصنیف و تالیف، سماجی خدمات کا شوق، سلیقہ شعاری وغیرہ۔ چالیس سال تک مسلسل لکھتا رہا، ۲۹ کتابیں اور ۹۷، مضامین تا ختم دسمبر شائع ہوئے۔ مگر والد مرحوم کے کارناموں کو پیش کرنے کا موقع نہیں ملا۔ والد کے انتقال کے پورے ۵۸ سال بعد رجب ۱۳۸۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۲ء میں ان کے حالات قلم بند کئے۔ مولوی عبدالقادر میری تیسویں کتاب ہے۔"

چلئے، واپس اپنے راستہ پر چلیں، ہاشمی صاحب بتاتے چلیں گے۔ ترپ بازار کے ختم پر ایرانیوں کا ایک ہوٹل "گرانڈ ہوٹل" ہے یہاں قیام کا انتظام ہے۔

آگے ڈاکٹر کروسکر کا دواخانہ ہے۔ مس کروسکر پہلی دیسی لیڈی ڈاکٹر ہیں جن کو سکندرآباد کے دواخانہ میں لیڈی ڈاکٹری کی خدمت ملی ہے۔

یہ ساگر ٹاکیز ہے۔ ہاشمی صاحب کہتے ہیں اس کو پہلے اکسیلسیئر ٹاکیز کہتے تھے۔ یہی حیدرآباد کا پہلا سنیما گھر تھا۔ سب سے پہلے انگریزی فلم بتلائے جاتے تھے، جب ہندوستانی فلم بننے لگے تو وہ بتائے جانے لگے، مگر پولیس ایکشن کے بعد یہاں اب تلنگی فلم بتائے جارہے ہیں۔ پہلے تلنگی فلم کبھی کبھار آتے تھے مگر اب آندھرا پردیش کے صدہا اشخاص ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد آجانے کے باعث اب تلنگی فلم کی خاص مانگ ہوگئی ہے۔ یہاں بھی زنانہ کا علیحدہ انتظام ہنوز باقی رکھا گیا ہے۔

اب ہاشمی صاحب کی دو اور کتابیں جلوہ زار اور قلم نما کی یاد آتی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ حیدرآبادی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہوگا جس کے بارے میں انہوں نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ خود حیدرآبادی عورتوں کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں انہوں نے ہر درجہ کی عورت کی زندگی دکھائی ہے۔ زندگی کے ان گمنام اور اچھوتے گوشوں کو تحریر میں لانے کی ہمت و جرأت رندانہ ہاشمی صاحب

بھی لاحق تھا۔

اب ہم عابد سرکل پر ہیں۔ ہاشمی صاحب سے سنیے۔ "موجودہ عابد روڈ محلہ ترپ بازار کا ایک جز ہے۔ عابد نامی ایک یہودی انگریز اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان آصف جاہ ششم کا ملازم تھا۔ اس نے ایک عرصہ بعد اپنی دکان کھولی جو عابد کی شاپ کہلاتی تھی۔ یہ شاپ اسی عمارت میں تھی جس میں آج کل پیالس ٹاکیز ہے۔ عابد کے یہاں علاوہ مغربی سامان کے سوڈا، لیمونیڈ برف بھی تیار ہوتا تھا۔ ایک عرصۂ دراز تک حیدرآباد کے تمام امیر جاگیردار اور اعلیٰ عہدیدار عابد کے گاہک اور کھاتہ دار رہتے۔ لاکھوں روپے کی دولت اس نے پیدا کی۔ ہماری یاد میں حال حال تک یہ ورکشاپ موجود تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد برخاست ہوگئی اور کچھ عرصہ بعد عمارت کو کچھ ترمیم کے بعد سینما گھر بنا دیا گیا۔ آج عابد روڈ حیدرآباد کا مشہور بازار ہے۔ اگرچہ عابد کی شاپ کا وجود نہیں ہے مگر نام باقی رہ گیا ہے۔ اس سرکل سے معظم جاہی مارکٹ کی طرف چلے جائیں تو رگھوناتھ چتو پادھیا کا مکان موجودہ بلدیہ آفس ہے۔ ہاشمی صاحب کے مطابق حیدرآباد میں مدرسۂ نسواں قائم کرنے کے وہ بانی تھے۔ پچاس سال پہلے کی ہر علمی تحریک میں ڈاکٹر صاحب کا عملی حصہ ہوتا تھا۔

اسٹیشن روڈ کی طرف بڑھتے چلیے۔ یہ یونیورسٹی آف حیدرآباد ہے، ہاشمی صاحب کی زندگی تک یہاں میسور ہوٹل قائم تھا۔ یہ دراصل "سنہری چوکھٹ" ہے، بلبلِ ہند یا طائرِ پرشکستہ کا آشیانہ، سروجنی نائیڈو، کرنل نائیڈو، پدمجا، لیلامنی اور سب سے سودیا کا کاشانہ، اپنے دور کا تہذیبی آستانہ، شاعر کے لفظوں میں علم و فن کا میکدہ، محبتوں کا لنگر، اسی بزم کے کسی زمانہ کے حاضر باش لوگ تھے۔ ہاشمی صاحب بتاتے ہیں " بابو گیا پرشاد، پنڈت کیشوراؤ، وامن نائک، نارائن جی دلکر، رائے بال مکند رام چندر نائک اور کتنے ہی ہندو اور مسلمان یہاں جمع ہوتے تھے۔ جنھوں نے اس ریاست کی تعلیمی ترقی کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا اور آگے چل کر سیاسی بیداری کی جانب متوجہ ہوئے۔ ایجوکیشنل کانفرنس حیدرآباد کا پہلا پلاٹ فارم تھا۔ اس کانفرنس کے ایک اجلاس میں سروجنی کی آواز فارسی زبان میں بلند ہوئی تھی۔

صبر کن حافظ بہ سختی روز و شب آخرش روزے بہ یابی کام را

اسی سنہری چوکھٹ کے پیچھے کی تنگ سی گلی میں ہاشمی صاحب کی زندگی کے کئی سال بے حد گرانباری سے گزرے یہیں پر انہوں نے انجمن تحقیقات نسواں قائم کی۔ خواتین کی کئی تخلیقات کو شائع، خود اپنی بھی کئی کتابیں مرتب کیں۔ یہیں پر بہت پہلے ملک و قوم کے کچھ اور دیوانے بھی رہتے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ، اور ان کے بھائی بہن، جواں مرگ عبدالسلام، حکیم عبداللہ، اور ان کے بیٹے بیٹیاں، فضل الرحمٰن، عطاء الرحمٰن، اور خلیل الرحمٰن اور ان کی بہنیں بیگم حبیب الرحمٰن و سلطانہ ــــ اور ذرا آگے، ریونیو بورڈ دفتر بندوبست و مال گزاری۔ ہاشمی صاحب اس سے متعلق کئی ناموں کو یاد کرتے ہیں جنھوں نے علم و ادب کی بڑی خدمات انجام دی ہیں یا کسی اور حیثیت سے مشہور ہیں۔ مال گزاری کے وزیر رنگا ریڈی ایک انصاف پسند وزیر تھے۔ بی رام کشن راؤ، جمال الدین نوری اور داعیٔ اسلام آقا سید محمد علی کے شاگرد تھے۔ فارسی ان کا اختیاری مضمون تھا، انہیں مال گزاری اور عطیات کے مقدمات میں خصوصیت حاصل تھی۔ رباعیات عمر خیام کا تلنگی میں ترجمہ کیا تھا۔ غیر منقسم حیدرآباد کے پہلے چیف منسٹر تھے۔ وشال آندھرا کے خواب کی تعبیر میں ڈاکٹر بی رام کشن راؤ کی خدمات کسی طرح کم اہم نہیں "۔

نواب عزیز جنگ تاریخ النوائط کے مرتب، علمیات اور مالگزاری کے بارے میں کئی کتابوں کے مولف، ہاشمی صاحب کے والد کے قریبی دوست اور معترف ۔ ان کے بیٹے رکن الدین ہاشمی صاحب کے یارِ غار، پوتے حسن الدین مالگزاری سے متعلق عہدیدار، اردو الفاظ شماری کے مرتب، کئی اور کتابوں کے مصنف اور ان کی رفیق حیات انیس فاطمہ رکن الدین کی بیٹی، دونوں میاں بیوی ہاشمی صاحب کے معتقد اور معترف، مالگزاری کے ایک اور عہدہ دار ممتاز اسکالر سیتو مادھو راؤ پگڑی بھی ہاشمی صاحب کے قدر داں تھے۔

اب ہم ہندی پرچار سبھا کے دفتر کے سامنے ہیں۔ ہاشمی صاحب یاد دلا رہے ہیں " سرینواس لاہوٹی اردو کے خدمت گذار، ماروا‌ڑی جنہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم پائی، انھوں نے فانی بدایونی سے استفادہ کیا ہے ۔ ایل این گپتا ہندی پرچار سبھا کے صدر، دوستی کو یاد رکھنے اور دشمنی کو فراموش کرنے والے، ان کی رفیق حیات پریم لتا گپتا کے ذکر کے بغیر حیدرآباد کی تہذیبی، سیاسی تاریخ نامکمل رہتی ہے۔

اسٹیشن روڈ ختم ہوگئی ۔ داہنے ہاتھ پر ذرا آگے بڑھ جائیں تو سامنے نامپلی اسٹیشن ہے ۔ اس کی تاریخ ہاشمی صاحب سے سنیے،

" نامپلی جہاں اب براڈ گیج (بڑی پٹری) کا ریلوے اسٹیشن ہے ۔ قطب شاہی دور میں ایک قصبہ تھا ۔ اور اس کے حدود دور دور تک تھے ۔ یعنی موجودہ حمایت نگر تک اس کی سرحد تھی ۔ نامپلی زنانہ اسکول ماہ لقا چندا کی متبنیٰ حسن لقا بائی کا باغ تھا ۔ ریلوے اسٹیشن بننے کے بعد نامپلی کی آبادی بڑھنے لگی ۔ سڑک اسٹیشن کے نام سے دو راستے موسوم ہیں جو اسی اسٹیشن کے نام سے ہے ۔ اسٹیشن کے قریب حکومت کے اہتمام میں ضلع سرائے قائم ہے ۔ یہ سر علی امام کے زمانہ وزارت میں پہلی جنگ عظیم کی فتح کی یادگار میں تعمیر ہوئی ۔ اس کے قریب ایک اور سرائے یا دھرم سالہ ہندو اصحاب کے لئے مختص ہے ۔"

اب ہاشمی صاحب کے ساتھ پبلک گارڈن یا باغ عام کی سیر کیجئے ۔

" یہ باغ عام پبلک گارڈن ہے اس میں میوزیم عجائب خانہ بھی ہے اور حیوانات کو بھی رکھا گیا ہے ۔ مختار الملک کے زمانے میں یہ باغ پبلک کی تفریح کے لئے بنایا گیا تھا ۔ اس باغ میں مرحوم اعلیٰ حضرت کے چہل سالانہ جوبلی کی یادگار میں ٹاؤن ہال بنایا گیا اب یہ مجلس مقننہ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے ۔ اس باغ میں جوبلی ہال کے نام سے ایک عمارت ہے جس میں اعلیٰ حضرت یا راجہ پرشاد اپنے سالگرہ کے زمانے ڈنر دیتے اور نذریں پیش ہوتی تھیں ۔ یہاں اب سوشیل سرویس کے لئے یورپین ڈانس وغیرہ ہوتے ہیں ۔

سامنے گلی میں کاؤس جی کا گھرانہ رہتا ہے ملک و مالک کا وفادار، اردو کا پرستار، ہرمز کاؤس جی ہاشمی صاحب کے قدر داں ہیں منیزہ کاؤس جی بھی کتب خانہ خواتین دکن کی ایک مخلص ممبر۔

آگے فتح میدان ہے ، ہاشمی صاحب بتا رہے ہیں " یہ حکومت سرکارِ عالی کے زمانے میں فوجی علاقہ میں شامل تھا ۔ فوجی اسپورٹس پولو وغیرہ کے مقابلے ہوتے تھے ۔ عالمگیر کی فوج فتح کے بعد یہاں مقیم ہوئی تھی ۔ جو عمارت یہاں موجود ہے وہ راجہ رام گوپال صاحب سیٹھ نے بنائی تھی ۔ اور مرحوم اعلیٰ حضرت نے اس کا افتتاح کیا تھا ۔ فتح میدان کا گھنٹہ گھر مرحوم اعلیٰ حضرت کے چہل سالہ جوبلی میں تیار ہوا جہاں زمانہ مابعد فوج کے تیرنے کے لئے حوض بھی تعمیر ہوا ۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ میدان مدارس کے طلبہ کے لئے دے دیا گیا ۔

سامنے نوبت پہاڑ ہے ۔ ہاشمی صاحب کہتے ہیں " جس وقت دہلی سے کوئی قاصد یا پیام آتا تو اس کے استقبال یا پیشوائی

سے طور پر اس پہاڑ پر نوبت بجائی جاتی تھی ۔ سر مرزا اسمٰعیل نے اپنے زمانۂ وزارت عظمیٰ میں اس پہاڑ پر دو خوبصورت برج تعمیر کروائے تھے جو ان کے زمانہ میں رات کے وقت بجلی کی سفید روشنی سے جگمگاتے تھے ۔ اور ایک اچھا منظر پیش کرتے تھے ۔ اس زمانہ میں ٹاؤن ہال اور چار مینار بھی سرخ سبز اور سفید روشنی کا اچھا منظر پیش کرتے تھے ۔ سر مرزا کے جانے کے بعد یہ روشنی موقوف کر دی گئی ۔

رویندر بھارتی کے بازو سے مڑ کر ساہتیہ اکیڈیمی اور للت کلا اکیڈیمی کے سامنے ٹھیر کر کچھ اور شخصیتوں کو ہاشمی صاحب یاد کرتے ہیں، ڈاکٹر ریڈی (بی گوپال ریڈی صدر ساہتیہ اکیڈیمی) کی ذات میں سیاست، انسانیت، ادب، اور شعریت کا نادر امتزاج ہے حیدرآباد کا دل اپنی ترستی ہوئی آرزوؤں کے ساتھ ڈاکٹر ریڈی کے خیر مقدم کے لئے دھڑک رہا تھا ۔ ان کی شخصیت ایک سحر ہے۔ بی راما نج راؤ سکریٹری ساہتیہ اکیڈیمی تلنگی اور اردو کے ادیب ہیں ۔ تلنگی ادب میں بڑی ناموری حاصل کی ہے ۔ جامعہ عثمانیہ کے قابل سپوتوں میں شمار ہوتا ہے ۔ حیدرآباد کے بہت سے علمی، ادبی، سماجی اداروں سے وابستہ ہیں ۔

اب ہم لکڑی کا پل پر پہونچ گئے ہیں ۔ ہاشمی صاحب جہاں بانو نقوی اور ان کے شریک حیات مجتبیٰ حسین نقوی کے مکان کی نشاندہی کرتے ہوئے کہتے ہیں " جہاں بانو نثر میں شاعری کرتی ہیں، جابجا ایسے شعر لکھتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اسی مقام کے لئے موزوں کیا تھا ۔ وہ سماج کی دکھتی رگوں پر نشتر لگاتی ہیں اور سماج کے تصنع کا پول کھول دیتی ہیں" ریلوے برج سے لگا سعید جہاں بیگم کا سعید المدارس ہے ۔ سعید جہاں بیگم کے والد اور بھائی بھی ہاشمی صاحب کے معترف ہیں ہاشمی صاحب کا ایک مضمون سعید جہاں بیگم کے بارے میں بھی ہے ۔

سامنے کا راستہ خیریت آباد کو جاتا ہے ، یہ محلہ قطب شاہی دور کی یادگار ہے ۔ کہتے ہیں ابراہیم قطب شاہ کی دختر خیر النساء بیگم مرض دق سے بیمار تھی ۔ حکیموں نے قلعہ گولکنڈہ کی آب وہوا کو ناپسند کیا اور اس مقام کو پسند کیا گیا ۔ یہاں ایک مسجد بھی تیار ہو گئی اور آبادی ہو گئی ۔ جو خیر النساء کے نام پر خیریت آباد سے موسوم ہوئی ۔ شہزادی اس مرض سے جانبر نہ ہوئی ۔ اس کے مرنے پر اس مقبرہ میں لاش سونپی گئی جو مسجد خیریت آباد کے متصل ہے ۔ زمانہ مابعد میں لاش کو غالباً کہیں منتقل کر دیا گیا، بہر مقبرہ خالی ہے، کوئی قبر اس میں نہیں ہے ۔

خیریت آباد میں خود ہاشمی صاحب ایک عرصہ تک مقیم رہے ۔ کہتے ہیں " راقم الحروف نے اپنے ذاتی کتب خانہ کو حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے عام کر دیا ہے بلا کسی فیس کے اس کتب خانہ سے استفادہ کیا جا سکتا ہے ۔ زیادہ تر ریسرچ کرنے والی خواتین کتابیں حاصل کرتی ہیں اردو کتابیں زیادہ ہیں ۔ یہ کتاب خانہ میرے مکان ممتاز منشن روڈ لکڑی کے پل پر ہے ۔

سدی رسالہ پر ہاشمی صاحب بیان کرتے ہیں ۔ " اسے اے ۔ سی گارڈ بھی کہتے ہیں، یہاں ایک سنیما پکچر ہاؤس کے نام سے ہے، یہاں اولاً انگریزی فلم بتائے جاتے تھے مگر پبلک کی عدم توجہ کے باعث اردو فلم کا انتظام کر دیا گیا ہے اور اب یہاں اردو فلم ہی بتائے جاتے ہیں ۔ یہ تالاب ماں صاحب ہے " ہاشمی صاحب کہہ رہے ہیں " اس کو عبداللہ قطب شاہ کی ماں حیات بخشی بیگم نے ملا پلی، خیریت آباد کی آبادی اور زمینات کی سربراہی کے لئے بنایا تھا اس تالاب کے علاوہ دکن میں ماں صاحبہ کی اور کتنی ہی یادگاریں ہیں، میں نے حیات بخشی بیگم کے حالات میں ایک چھوٹی سی کتاب بھی لکھی ہے " ۔ اس تالاب

کے علاقے میں ہاشمی صاحب نے زندگی کے آخری دنوں میں اچھا سا ذاتی مکان خرید لیا تھا اور سوچ رہے تھے کہ اس وسیع اور کشادہ مکان میں سازگار ماحول میں کتب خانۂ خواتین دکن اور مجلس تحقیقات نسواں کو خوب سے خوب تر بنایا جائے گا لیکن ان کی یہ آرزو، آرزو ہی رہ گئی اور پیام اجل آ گیا۔ اب بھی ہاشمی گھرانہ اس جگہ رہ رہا ہے اور بجید فیاض دریا دل بیگم ہاشمی جو حافظ سرمۂ دکن ہیں، اس یادگار کتب خانہ کو سنبھالے یہیں مقیم ہیں ـــ سامنے والی سڑک بنجارہ ہلز یا جوبلی ہلز کو جاتی ہے۔ اسے مہدی نواز جنگ نے بسایا جن کے نام پر مہدی پٹنم بسایا گیا ہے وہیں چل کر مہدی صاحب کے بارے میں ہاشمی صاحب سے معلومات حاصل کریں گے۔

اب ہم ہمایوں نگر سے گذر رہے ہیں۔ یہ دیکھئے یہ صغرا منزل ہے۔ صغرا بیگم اور ان کے شوہر ہمایوں مرزا سے ہاشمی صاحب کے دوستانہ تعلقات تھے۔ خواتین کی ترقی اور بھلائی ان سب کا مقصد تھا۔ صغرا بیگم کا تعارف ہاشمی صاحب یوں کراتے ہیں "آپ مصنفہ شاعرہ، مقررہ، مباحر، سلیقہ شعار، قومی اور ملکی خدمت گذار ہیں۔ آپ کا نام حیدرآباد کی عورتوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی علمی اور قومی خدمت دوسروں کے لئے نمونہ اور نظیر کی حیثیت رکھتے ہیں" ـــ صغرا بیگم جواباً کہتی ہیں "جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب کا نام محتاج تعارف نہیں، آپ کے مضامین میں سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ عورتوں کی ترقی اور بھلائی کے لئے آپ کا قلم روانی سے چلتا ہے" ـــ

لیجئے مہدی پٹنم آ گیا (اردو اور تلگو لفظوں سے مرکب۔ خود مہدی نواز جنگ بھی تو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کے بہترین نمائندہ تھے۔ ہاشمی صاحب اپنی بات چھیڑ دیتے ہیں" سید محمد مہدی یا مہدی نواز کے والد مولوی سید عباس علی مہاراجہ کشن پرشاد کے مصاحب تھے۔ میرے والد مولوی عبدالقادر اور مولوی سید عباس علی میں برادرانہ تعلقات تھے۔ قدیم خاندانی تعلقات کے لحاظ سے دونوں کی دوستی خلوص اور یگانگت کی قرینہ دار رہی۔ سید محمد مہدی حیدرآباد میں اپنی گوناگوں خوبیوں اور اہم سرکاری خدمات کے باعث ممتاز حیثیت رکھتے ہیں"۔ ہاشمی صاحب اس یگانہ ہستی کی شریک زندگی سے بھی بہت متاثر ہیں۔ "طاہرہ بیگم سید حسن بلگرامی المخاطب موتمن الدولہ عماد الدولہ عماد الملک مرحوم کی پوتی، نواب عقیل جنگ کی صاحبزادی، فنی تیمارداری میں ذاتی دلچسپی رکھتی تھیں دوسری جنگ عظیم میں نرسنگ کی خدمات انجام دیں۔ ایک منتظم، سلیقہ شعار، مجسّم عمل خاتون، ایک بہترین بی بی، پُرشفقت و پُرمحبت ماں، باوفا سہیلی اور دوست صادق تھیں ـــ ہمارا سفر ختم ہو گیا۔ بنجارہ ہلز کی روشنیاں اور ستارے اور جگنو سب مل کر چمک رہے ہیں۔ ہاشمی صاحب آپ بھی قریب ہی درگاہ سید احمد بادپاؒ میں آسودۂ خاک ہیں مگر آپ کی فراہم کی ہوئی معلومات حال اور مستقبل کے اس شہر نگاراں پر لکھنے والوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی۔ اقبال کے چند شعر پڑھتے ہوئے ہم آپ سے جدا ہوتے ہیں۔

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور ● مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں، ● خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ ● موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ
مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا ● نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آدھی رات اِدھر، آدھی رات اُدھر، سوئے سنسار جاگے پاک مادرِ دگار، شاکرہ سدا رہے نام اللہ کا ۔"

بادۂ کہن

چندولال شاداںؔ (۱۱۷۵ھ – ۱۶ ربیع الثانی ۱۲۶۱ھ) اردو کے بسیار گو اور ادب نواز سخنور ہی نہیں، دکن میں شعر و سخن کا ستھرا اور روشن ماحول بنانے والے رہنما بھی تھے، ان کے خاندان نے مغلیہ حکومت کے سایۂ عاطفت میں ناموری اور عزت حاصل کی۔ اکبر کے مشہور وزیر ٹوڈرمل شاداں کے مورثِ اعلیٰ تھے۔

عہد آصفی میں سکندر جاہ نے انھیں مہاراجہ کا خطاب دیا تھا۔ ناصر الدولہ نے "راجہ راجایان" سے سرفراز کیا۔ مہاراجہ چندولال حکومت آصفیہ کے ہر دل عزیز مدارالمہام رہے۔ غیر معمولی اخلاق و عادات، علم و خاکساری اور بے نظیر فیاضی نے انکی شہرت اور عزت کو چار چاند لگائے ان کی کوٹھی شعر و ادب، تہذیب و تمدن اور گنگا جمنی اقدار کا بڑا مرکز تھی، ہندوستان کے نامور علماء، شعراء اور فقراء موجود رہتے، علمی و شعری محفلیں سجتیں۔ شاداںؔ فطری شاعر تھے کلام میں سادگی اور حسنِ بیاں کی شگفتگی ملتی ہے۔ شاداں کے کلام کے دو حصے مہاراجہ سرکشن پرشاد شادؔ کی نگرانی میں شائع ہو چکے ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے مطبوعہ تذکرہ "مرقعِ سخن" جلد اول میں بھی شاداں کی شخصیت اور شاعری پہ مقالہ شامل ہے۔ (ادارہ)

نہ بھٹکے گا نہ بھولے گا وہ رستہ — براہِ راست جو کوئی سے چلے گا
پاؤں پہ میرے قناعت کی لگی ہے مہندی — تو جو کہتا ہے مجھے دوڑ تو میں جاؤں کہاں
موتی کی لڑیاں میں کھول یا پھول سے جھڑتے — جب بات کو اس نے لبِ خنداں سے نکالا
کیا پیچ پڑا تھا دلِ عاشق پہ کہوں کیا — شانے کو جو شب کاکلِ پیچاں سے نکالا
اب تجھے نفرت ہے مجھ سے وہ زمانہ یاد ہے — ہاتھ میرا کاکلِ پیچاں کا تیری شانہ تھا
دام دو دام ہزار نثار اُس پر کیجئے — ہووے جو رہنا کوئی سکار ثواب کا
یہ جانتے ہیں وہی جو کہ عشق رکھتے ہیں — مزہ تھا، لطف تھا اور وصلِ یار میں کیا تھا
سیر کو جاوے ہے جب سروِ خراماں میرا — غنچے بھی پیار سے لیتے ہیں بلائیں چٹ چٹ
ہر بات میں جاہل کی طرح کب ہیں اُلجھتے — دانا تو ہم کرتے ہیں تدبیر سے تدبیر
جب تلک شمس و قمر ہیں یہ جہاں میں روشن — حیدرآباد رہے اسقدر آباد کہ بس
چاہتے ہیں کہ رکھیں خانۂ دل میں تجھ کو — کب قرار آسے جو جلئے سرا ہے گا بہے
یار ہے دل میں مگر ہم کو خبر اسکی نہیں — جس طرح شہد سے کچھ چیز دھری رہتی ہے
چھپے ابر میں چاند ہر چند لیکن — ہمارا پیارا سدا روبرو ہے
اگر چشمِ بصیرت کھول دیجئے — تو ہے کثرت میں وحدت کا تماشا
موحد نے جو کی تحقیقِ وحدت — دوئی کے حرف کو دل سے نکالا

دل دیا، ایماں دیا اور جان بھی کر دی نثار
ہم نے سر آنکھوں سے مانا جو ترا ارشاد تھا

نہ مکاں کوئی رہے گا نہ مکیں دنیا میں
انکی غفلت ہے جو کہتے ہیں تمہارا میرا

دل جب آتا ہے تو در کے سے کہیں رکتا ہے
موج کے زور سے دریا کا کنارا ٹوٹا

جو دیر دیکھ چھوڑ گیا کوئے یار کو
گمراہ مت کہو کہ براہِ صواب تھا

ہم اعتبار اُس کا اب کیا کریں بتاؤ
اس شوخ نے تو ہم کو سب لے اعتبار مانا

ابر میں جیسے آفتاب چھپے
حسن اس کا نقاب نے کھینچا

یاں مصور کا نہیں کام مگر الفت سے
میں نے کھینچی ہے تری صورت دل پر صورت

گرچہ فرصت کار دنیا سے نہیں شاداں تجھے
ذکر کرنا چاہیئے اللہ کا تھوڑا بہت

جس میں تیری حکائتیں ہیں مستم
دیکھتا ہوں وہ روز و شب کاغذ

سزاوار تجھ کو تیری صاحبی
مرے حال پر بھی خداوارا نظر

کس نے تجھے کہا تھا کہ جا طور پر برس
اے ابر، آ ادھر کسی مخمور پر برس

سایہ ترا ہے رحمتِ باری جہان کو
ہے یہ دعا ہماری کہ جمہور پر برس

کہیں دیکھی نہ سنی تیز زبانی ایسی
ہے زباں شوخ تیری بلا ہے ذہن میں مقراض

وہ شاگردی کے قابل بھی نہیں ہیں
جو کہتے پھرتے ہیں استاد ہیں ہم

غزالِ دشت میں کیا ہے فقط آنکھیں ہی آنکھیں ہیں
میاں تیری کمر جیسی کمر ہو دے تو میں جانوں

اگر شہرت کی خواہش ہے ہنر کیجے تو حاصل ہو
ثمر کے واسطے پیدا شجر کیجے تو حاصل ہو

جو ٹھنڈک آنکھ کی منظور ہے اہلِ نظر تم کو
کسی کے چاند سے رخ پر نظر کیجے تو حاصل ہو

محبت ظاہری باتوں سے گر کیجے نہیں ہوتی
اگر دل میں کسی کے آپ گھر کیجے تو حاصل ہو

پڑے ہیں آنکھ پر پردے جنوں کے
کہاں پاتے ہیں غافل تیرے در کو

رجھانا اس کا ہے ہر چند مشکل
اگر اچھے ہو تو پھر دھن میں چاؤ

بھرا ہے کون دمکاں میں ہوا کی صورت سے
اُسی کا دیکھئے جلوہ جو چشم بینا ہو

ہر ایک راہ میں چلتے نہیں ہیں تیزی سے
قدم سنبھال کے رکھو جا جو پست و بالا ہو

ہمارا یار آتا ہے نہ کر اب دیر تو اتنی
ارے ساقی ہمیں دے ساغر صہبائے انگوری

تھکے لکھ لکھ کے سارے لکھنے والے
حقیقت کب تیری لغزش میں آئی

بلاشک جن کا تکیہ ہے خدا پہ
خدا نے کام سب انکے سنوارے

ارے شاداں تجھے جو پالتا ہے
نہیں وہ بے خبر تیری خبر سے

کھیا الفت کی ہے سب سے نرالی
اجی دو ہاتھ سے بجتی ہے تالی

اے دل تجھے چاہیئے ہوشیار رہنا ہر گھڑی
چور چوری کر گیا اور پاسباں سوتے رہے

حامد مجاز

ابراہیم شفیق کی یادیں

ابھی کچھ عرصہ پہلے میرے دوست رحمٰن جامی نے مجھ سے دریافت کیا تھا کہ ابراہیم شفیق کی افسانہ نگاری کے تعلق سے میری کیا رائے ہے ....؟

میں نے کہا تھا ... "میں ابراہیم کو ہندوستان کا صفِ اوّل کا افسانہ نگار سمجھتا ہوں"۔ میں نے اور بھی بہت سے نام لیے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ ابراہیم شفیق میرے چند گنے چنے پسندیدہ افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔

میری ملاقات افسانوی ابراہیم شفیق سے پہلے ہوئی اور گوشت پوست کے ابراہیم شفیق سے بعد میں۔ اور میں دونوں سے بے حد متاثر ہوا۔ اس وقت میں سائنس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں بی ۔ ایس ۔ سی کا طالب علم تھا۔ ابراہیم شفیق مجھ سے ایک یا دو برس سینئر تھے۔ لیکن کالج کیمپس میں ان سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن میں کالج کے اُردو ترجمان "سائنس میگزین" میں ان کے افسانے پڑھ چکا تھا۔ اسی زمانے میں ماہنامہ "بیسویں صدی" میں بھی ان کی کچھ کہانیاں شائع ہوئی تھیں۔ یہ ان کی افسانہ نگاری کے زریں دَور کا آغاز تھا۔

یہ [illegible] کی بات ہے جب میں بی ۔ ایس ۔ سی کے فائنل امتحان کی تیاری کر رہا تھا اور اس سلسلے میں ملاکنٹل منڈی کے ایک خانگی تعلیمی ادارے کو جایا کرتا تھا ... اس ادارہ کے سرپرست سٹی کالج کے مشہور استاد مسعود ہاشمی صاحب تھے جو اس ادارے میں ریاضی پڑھایا کرتے تھے۔ وہیں ابراہیم شفیق سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ جہاں وہ بھی ریاضی پڑھنے آیا کرتے تھے۔ دورانِ گفتگو جب میں نے ان کی کہانیوں کی ستائش کی تو وہ مجسّم انکسار بن گئے۔ پھر ادارے میں روزانہ ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا۔ پھر ایک ساتھ ہم نے بی ۔ ایس ۔ سی کا امتحان دیا۔ ان ملاقاتوں کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ شرافت، اخلاق اور سادگی کا دوسرا نام ابراہیم شفیق ہے۔ ایک انسان کی حیثیت سے ابراہیم شفیق کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

اس کے بعد ابراہیم شفیق سے ان کے مکان پر اور اِدھر اُدھر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایک بار میں نے پوچھا۔ "آپ اتنا اچھا لکھتے ہیں ... لیکن اس قدر کم کیوں لکھتے ہیں ...؟" انھوں نے جواب دیا ... "میں ڈوب کر لکھتا ہوں۔ اور اس وقت لکھتا ہوں جب کوئی گہری URGE مجھے لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اسی لیے کم لکھتا ہوں۔" پھر ایک طویل عرصے تک ابراہیم شفیق سے کوئی ملاقات نہ ہو سکی لیکن وہ اپنی کہانیوں کے روپ میں مجھ سے ہمیشہ قریب رہے۔

ابراہیم شفیق کو مصوّری سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اس ذوق کو باقاعدہ طور پر پروان نہیں چڑھایا۔ لیکن

مصوری کا ان کی افسانہ نگاری پر گہرا اثر پڑا۔ وہ مختلف رنگوں کی جگہ الفاظ کے Media سے کام لیتے ہوئے اپنے کرداروں کی شخصیت کے خطوط ابھارنے میں ایک سحر کار کا رول ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لہجہ کا دھیماپن، بانکپن، نزاہت، شگفتگی اور بہاؤ ابراہیم شفیق کی کہانیوں کی ایسی خصوصیات ہیں جو بہت کم افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں محسوس ہوتی ہیں۔ ابراہیم شفیق کے ہاں کہانی کے پلاٹ کو ثانوی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے افسانے کی ٹیکنیک سٹیگ اور دلفریب Treatment میں پوشیدہ ہے اور ان کی کہانی کا مجموعی تاثر ایک جگمگاتے ہوئے ہیرے کی طرح ان کے اسی سٹیگ اور دلفریب Treatment سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس سے ہٹ کر ابراہیم شفیق سچائی کا ادراک رکھتے ہیں کہ وہ کیوں لکھ رہے ہیں۔ کیا لکھ رہے ہیں اور کس کے لیے لکھ رہے ہیں۔ اور یہی حقیقت انھیں اپنے عصر کے افسانہ نگاروں میں منفرد اور نمایاں اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے ... ؎

ہے ازل سے رواں دواں اب تک　　　تھک گئی ہوگی زندگی کتنی!

میں سوچتا ہوں کہ کیا ابراہیم شفیق نے داعی اجل کو لبیک کہہ کر زندگی کی تھکن کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ موت سے ہم آغوش ہو کر انھوں نے اس حقیقت کا یقین دلایا ہے کہ ؎

دریا ہوں چلتے چلتے سمندر میں گر پڑا...!

اور ہم جانتے ہیں کہ سمندر اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ بجائے خود ایک حرکی قوت کا دوسرا نام ہے۔ بڑے فن کار مرتے نہیں۔ وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ موت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ ان کے چھوڑے ہوئے فن کے نقوش ہمیشہ تابناک رہتے ہیں۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ایک تخلیق کار کی موت بھی سرچشمۂ وجدان بن جاتی ہے ؎

کرتا ہوں پس از مرگ بھی حل مشکل عالم　　　بے حس ہوں پہ ناخن کی طرح عقدہ کشا ہوں

رحمت یوسف زئی

ابراہیم شفیق ـ بحیثیت افسانہ نگار

سرزمین دکن سے ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں ابراہیم شفیق اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ افسانے کی زبان اور ٹیکنیک پر انھوں نے کئی کامیاب تجربے کیے اور افسانے کے فن کو پروان چڑھایا۔ افسانہ نگاری ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی دین ہے۔ لیکن نئی نسل کے کچھ افسانہ نگاروں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور رام لال جیسے ادیبوں کی موجودگی میں اپنے وجود کا احساس دلایا... افسانے کے امکانات اور اس کے ارتقاء کی سمتوں کا تعین کرنے والے معدودے چند افسانہ نگاروں میں ابراہیم شفیق کا شمار کیا جا سکتا ہے۔

ابراہیم شفیق ایک ماہر مصور کی طرح زندگی کے مختلف رنگوں کو علامتی طور پر اپنی شگفتہ تحریروں میں استعمال کرنے پر قادر تھے۔ ان کے افسانے زندگی کی مختلف اکائیوں پر الگ الگ انداز میں وحدت کا احساس دلاتے ہیں۔ فطرت کے خام مواد کو ان کی ماہرانہ نظر انسانی سماج میں پائی جانے والی شخصیتوں کے تناظر میں یوں پیوست کر دیتی تھی کہ فکر و فن، ہیئت و مواد کے بہت سے مسائل حل ہو جاتے تھے۔ ان کی تخلیق تو ان کی شخصیت کا پرتو معلوم ہوتی تھی۔ ایک حسین اور مخلص شخصیت... سچے انسانی جذبات سے معمور...!!

وہ اپنی کہانیوں کے پلاٹ میں حیرت افزا واقعات یا ایسے افسانوی کردار جو نفسیاتی امراض کے شکار ہوں' تلاش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ان کے افسانے مشاہداتی بصیرت اور تجرباتی گہرائی کی اچھی مثال ہیں۔ جیتے جاگتے سچے کردار جو بادی النظر میں بڑے غیر اہم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ابدی مقام پاتے ہیں۔ انھیں اپنے سماج اور ماحول کی عکاسی کرنے میں کمال حاصل تھا۔ ان کی تحریک کے پس پردہ ایک وجدانی لہر کار فرما تھی۔ وہ اختلاطِ لفظ و معنی میں ارتباطِ جان و تن کے قائل تھے۔

ابراہیم شفیق کی موت ایک ایسا سانحہ ہے جس پر تمام انسان دوست اور ادب نواز اشک بار ہیں۔ پُرکشش اور منکسرالمزاج ابراہیم شفیق آج ہم میں نہیں لیکن ان کے ادبی کارناموں سے اُردو کا گلستان ہمیشہ لہلہاتا رہے گا ■■

غنی نعیم

"تسکینِ انا"

زندگی کے اُجالے کو
موت کے اندھیروں میں
گم ہوتا دیکھ کر
یہ احساس ہوتا ہے
کہ
ایک غیر مرئی قوت
اپنے وجود پر اصرار کرتی ہے
اپنی تسکینِ انا کے لیے شائد
اپنے ہاتھوں خود
اپنے شہکار تباہ کرتی ہے
ایک ہوا ایسی ہی چلی
ایک جیالا
فکر و فن کا کوندا بن کر
نگاہوں سے گزر کر
دلوں میں اُتر کر
کسی وجودِ نادیدہ کی
تسکینِ انا کے لیے
"لہولہان سورج" کو تیرہ کر گیا

ابراہیم شفیق ' قدیم اور جدید کے درمیان ایک پل ہیں' یا یوں کہیئے کہ ایک سنگم ہیں۔ وہ خلقِ خدا کی مجبوریوں کا احترام کرتے ہیں۔ اُن کی مایوسیوں پر کُڑھتے ہیں۔ اپنے دل کا غبار نکالنے کے لیے بہتر سے بہتر علامتیں تراشتے ہیں اور اُن کے گرد الفاظ کے حسین جال بنتے ہیں ' گو یاسیت کا رنگ غالب ہے مگر روشن ضمیری اور احساسِ جمال کی پاکیزگی کے ساتھ اُن کا ذہن کسی بیمار وجود کا ذہن نہیں ہے۔ علامتوں میں معنویت ہے اور معنویت کا یہ دائرہ فنی اختراعات کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتا جاتا ہے قاری پر مجموعی تاثر مصنف کی انسان دوستی کا ہوتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

مصنف کا ذہن اِثباتیت کی وقتی شکست سے مایوس تو ہوتا ہے لیکن مرعوب نہیں ہوتا۔ اسی لیے احتجاج باقی ہے اور جب تک احتجاج باقی ہے، اُمید باقی ہے۔ 'کالا سورج' کے بعد 'لہولہان سورج' شیئے کا دوسرا چہرہ ہے۔

(کرشن چندر)

حیدرآباد کے شاعر (۷)

منوہر لال بہار

سنہ ۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈیمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ

منوہر لال بہار ۱۳ رمئی ۱۹۱۴ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے، ان کے دادا دوارکا پرشاد نازاں اور والد شاہد لال شاہد نہ صرف شاعر اور اردو ہندی کے عالم بلکہ دکن کی گنگا جمنی تہذیب کے رمز شناس بھی تھے، منوہر لال بہار، دبستانِ جلیل کے کلاسیکی شاعر اور غزل کے مزاج داں ہیں، مزاج میں سادگی خلوص میں گرمی اور گفتار میں نرمی وہ وصف ہے جو انھیں محفلِ احباب میں مہکاتا ہے اور اسم بامسمیٰ بناتا ہے۔ ربع صدی اقصر سے زیادہ زمانہ گزرا ان کی شاعری حیدرآباد کے علمی و شعری حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا رہا ہے محکمہ تعلیمات زراعت میں ملازم تھے وظیفہ حسنِ خدمت پاتے ہیں، ریاستی اردو اکیڈیمی کی اعانت سے فروری ۱۹۷۵ء میں پہلا مجموعہ کلام "بہارستان" شائع ہوا ہے پروفیسر عالم خوندمیری، ڈاکٹر حسینی شاہد، سکینہ اور ڈاکٹر اشرف رفیع نے ان کی شعری صلاحیتوں کو اپنے تاثرات سے روشناس کیا ہے (ع۔ح)

تمہارا پیار، تمہاری دعا ہے میرے ساتھ
تمام دولت ارض و سما ہے میرے ساتھ

زمانہ لاکھ مخالف رہا مرا لیکن
مجھے نہیں کوئی پروا خدا ہے میرے ساتھ

بھٹک ہی جاتا اندھیروں میں روشنی کے لئے
چراغ دل کا مسلسل جلا ہے میرے ساتھ

مشتاق رہتی ہیں ہر لمحہ دھڑکنیں دل کی
نفس نفس میں کوئی چل رہا ہے میرے ساتھ

مقابلہ ہے برابر کا یہ سمجھ لینا
جفا پہ ناز ہے تم کو وفا ہے میرے ساتھ

گزر گئی ہے شبِ انتظار آنکھوں میں
بڑا فریب کسی نے کیا ہے میرے ساتھ

شراب کی ہے ضرورت نہ جام و مینا کی
جو تم ہو ساتھ مرے میکدہ ہے میرے ساتھ

چہک رہے ہیں عنادل بھی گل بھی ہیں خنداں
بہار آج چمن کی فضا ہے میرے ساتھ

○

اس طرف ہونٹ ترے لعل بدخشاں جیسے
دل کا ہر داغ اِدھر مہرِ درخشاں جیسے

تیرے ہنستے ہوئے لب پر یہ گماں ہوتا ہے
شاخ گل پر ہوں چٹکتی ہوئی کلیاں جیسے

برقیوں آج نشیمن کی ہوئی ہے مہماں
ہو رہا ہے مرے گلشن میں چراغاں جیسے

مجھ کو ڈر ہے کہیں ساحل سے نہ ٹکرا جائے
قطرہ قطرہ مرے اشک کا طوفاں جیسے

امتیازِ حرم و دیر الٰہی کیوں ہے
کیا ابھی آج کا انساں نہیں انساں جیسے

نہ کہیں رنگِ مسرت نہ کہیں نورِ حیات
گھر غریبوں کے نظر آتے ہیں زنداں جیسے

ایک اک پھول کو دامن میں لئے بیٹھے ہیں
ہے بہار اپنی ہی میراث گلستاں جیسے

○

غمِ حیات، غمِ دل سے مشورہ تو کرو
حدیثِ شامِ غریباں کبھی سنا تو کرو

نیاز مندوں سے للہ تم وفا تو کرو
سمجھ کے قرضِ محبت کبھی ادا تو کرو

کرم نواز لبوں تک اب آ گئی فریاد
خطائے دل کا مرے حق میں فیصلہ تو کرو

تڑپ کے جل کے اگر خاک ہوں تو کیا حاصل
کبھی تو شمع کی مانند تم جلا تو کرو

جنھوں نے درد کی لذت سے سرفراز کیا
تم ان کا دل سے کبھی شکریہ ادا تو کرو

سرِ در جام تو توبہ میکشی ہے بہار
صبوح کو ثر و تسنیم تم پیا تو کرو

○

رباعی

نفرت کو محبت کی جلا دیتا ہوں
تکلیف کوئی دے تو دعا دیتا ہوں

میں فرضِ محبت کی اذاں دے کے بہار
انساں کو غفلت سے جگا دیتا ہوں

پنچائیت راج کا کلیدی کردار

آندھرا پردیش ہندوستان کی ان اولین ریاستوں میں سے ہے جنھوں نے ضلع کی سطح پر اور اس سے نیچے منصوبہ بند ترقی میں زور پیدا کرنے کی نیت سے پنچائیت راج کو رائج کیا۔ ریاست میں بلاک کی سطح پر ترقیاتی پروگراموں کی عمل آوری کے لئے پنچائیت سمیتی کو مکمل طور پر ذمہ داری سونپی گئی ہے جبکہ ضلع پریشدوں کی حیثیت مشاورتی اور نگرانکار اداروں کی ہے۔

ریاستی حکومت نے پنچائیت راج اداروں کو متعدد محکموں کے ذریعہ خصوصی مالی امداد فراہم کی ہے۔ ۶۲ - ۱۹۶۱ء میں دی گئی امداد ۱۲ کروڑ روپیوں کو بڑھا کر ۶۶ - ۱۹۶۵ء میں ۴۱ کروڑ روپیے اور ۶۹ - ۱۹۶۸ء میں ۵۰ کروڑ روپیے کر دیا گیا۔ ۷۷ - ۱۹۷۶ء کے دوران میں امدادی رقم کی جملہ مقدار بڑھ کر ۹۳.۵۰ کروڑ روپئے تک پہنچ گئی۔

یقیناً پنچائیت راج ادارے ہمارے مستقبل کی تشکیل جدید میں کلیدی کردار ادا کر رہے ہیں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش - حیدرآباد

No 4-77-78/574/ADVT/C3

وزیر حسن دہلوی

قند مکرر

پریم نگر کی رومانی کرنیں

اللہ اللہ حیدرآباد کی شان تو دیکھو۔ اس دیار کی بنا ہی پیت کی ریت ہے۔ اگلے زمانے میں ایک بادشاہزادہ تھا۔ جس نے ایک دن مجرا سنا۔ بزم میں نئی گائن آئی تھی۔ اس پہ نظر پڑی تو دل میں بجلی کوندی ؎

آنکھوں میں جگمگا اٹھے یہی زمین و آسماں!

یہ دیکھ کر دماغ نے ٹوکا۔ شہزادے! یہ سمجھ داری کی بات نہیں۔ بھلا گانے والی؟ شاہانہ پیار کہاں؟ مگر دل نے کہا: نہیں! یہ پیت کی ریت ہے۔ یہاں میں اور تو کا مذکور ہی نہیں۔ آؤ شہزادے۔ قدم بڑھاؤ۔ من کا کہنا پچتاپن کر کیا لوگے۔ بادشاہزادہ دل کے کہنے میں آ گیا۔ اب وہی گانا جو کچھ دیر ہوتا۔ آٹھ گھڑی بھر رات گئے شروع ہوا تو سحر ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ راگ دل کی زبان ہے، جو دل کے ہی کانوں سننے کی چیز ہے۔ اور ہند میں تو سنگیت آسمان سے اتری ہے۔ کہنے کو یہ تال سُر کی نزاکتوں کا تانا بانا ہو۔ مگر یہ نرا جادو ہے۔ اسی لیے من موہن ہے۔ دور کیوں جاؤ یہی جو دیکھو کہ اس میں سات سُر سات چاند تارے ہیں۔ اور ساتوں آسمان طے کر گئے ہیں۔ مثلاً سرگم کا "سا" چاند کا پیارا ہے۔ پہلے آسمان سے اترا ہے۔ تو "نی" زحل دلارا ہے۔ ساتویں آسمان کی خبر لاتا ہے۔ صوتی انداز کا بھی یہ عالم ہے کہ ان میں کہیں باوری کویل کی کوک سمائی ہے تو کہیں متوارے پپیہے کی پی کہاں! ایک بزرگ کا قصہ سنا ہے کہ وہ راگ کی تانوں سے من کا مندر جگمگا دیا کرتے تھے۔ یہی مضمون کسی اچھے مصور نے بھی اتارا ہے۔ بہت دن ہوئے۔ ایک تصویر دیکھی تھی کہ سنسان جنگل ہے۔ جس کی اونچی اونچی پہاڑیوں کو جھکتے بادلوں نے گھیر لیا ہے۔ دور دریا بھی بہتا ہے جیسے کسی نے دھانی مخمل پر روپہلی لہریا بنایا ہو! ایک پہاڑی پر خضر صورت بزرگ ترک دنیا کئے شیر کی کھال بچھائے بیٹھے ہیں سامنے میاں سدا رنگ دو زانو بیٹھے راگ الاپ رہے ہیں۔ صبح ہونے کو ہے۔ بھارا تارا ابھر آیا ہے۔ پچھلی رات کا چاند ڈوبتا ہے۔ کچھ تارے نظر سے اوجھل ہوئے۔ کچھ اب ہوا چاہتے ہیں۔ اس سمے ان بزرگ کے سیدھے ہاتھ میں تسبیح ہے۔ اُلٹے ہاتھ میں برچھا جس سے خواہش نفس کے ناگ کو زیر کیا ہے۔ جبیں پر نور عرفاں۔ لبوں پر ذکر یزداں۔ اور آنکھوں سے توبہ و استغفار کے آنسو و من کی گنگا جمنا بہہ رہی ہے! تو ہاں بزم شاہی میں بھی من کی بنسی بجی۔ لیکن لے دوسری تھی۔ یعنی گانے والی نے راگنی کیا چھیڑی۔ گویا دل سے آہ نکلی جو بادشاہزادے کے دل میں ہمراز و ہو گئی۔ یوں دل سے دل کو راہ پیدا ہوئی! بات فسانۂ عشق بن گئی!! مگر پچھلی رات سے تو بزم کا سماں ہی اور ہو گیا۔ جوں جوں رات گزری، راگ دیپک بھی کھل کھیلی۔ پریم کی آنچ بھی بھڑکی۔ لیکن ادھر سحر کا کھٹکا ہوا۔ اُدھر آرزوئیں مچلنے لگیں۔ کبھی نیند سے مندی تھیں۔ صبح شعور بھی۔ کبھی راگ کا جادو چلتا۔ من کا جوا لاکھ پٹتا تھا۔ ایسے وقت میں شانت راگوں کی آس ارحمت باری بن کر بہتی

ہے۔ کبھی کومل سُروں کی گنگا بہہ جاتی۔ یہی سُر کبھی گہرے ہوتے، کبھی جذبیلے ہوکر ادھر کی اودھر کر دیتے۔ کبھی بہار رُت کا سماں کھنچ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کرشن کنہیا جی جھولا بھی جھول رہے۔ بنسی بھی بجاتے جاتے ہیں۔ سُندر گوپیاں انھیں جھولا جھلا رہی ہیں جس کی پینگ آسمان سے باتیں کرتی ہے! غیر تو رات کا گانا کیا تھا ایک گلزار تھا۔ جس میں گانے والی تیتری کی طرح کیاری کیاری چہکتی پھرتی۔ کسی راگنی سے خوشبو لی۔ کسی کی کلیاں چوم آئی۔ پیاری صورت پر پیارا گلا قیامت ہوتا ہے۔ ان معنوں میں بھی یہ گائن قیامت تھی۔ مگر اس کا گانا۔ گانے میں بتانا۔ بتا کر ناچنا، قیامت پر قیامت بن گیا۔ دم میں رُلاتی۔ دم میں ہنساتی نہ گانے سے تھکتی۔ نہ آواز میں پتی آتی۔ جہاں ذرا کی ذرا رُکی۔ جی چاہا کہ پھر گائے۔ غرض یونہی بہروں راگ کا آستانہ آگیا۔ جہاں بہروپیں کے ٹھاٹھ تھے۔ جس کو ظلمن نے اس طرح دیکھا سے چھیڑا جیسے فجر کی رنگین روشنی پھیل رہی ہے اور ایک خوش ادا ابھی ابھی اشنان کر کے پوجا کو آئی ہے۔ گیلے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ گلابی نفیس پوشاک ہے۔

ماتھے پہ بندی ہاتھوں میں مہندی
ہونٹوں پہ مسّی آنکھوں میں کاجل

پجارن مندر گئی۔ ہاتھ جوڑے۔ ڈنڈوت کی۔ پھر چمپا کے پھولوں کا ہار مورتی کے گلے میں ڈال دیا! لیکن کب تک؟ مثل ہے کہ رات گئی بات گئی، آخر صبح ہوئی۔ بزم شاہانہ ختم ہوئی۔ گانے والی جانے لگی تو بادشاہ زادے نے بلایا۔ پوچھا! تمہارا کیا نام ہے؟ عرض کی: بھاگ متی پوچھا: کہاں رہتی ہو؟ عرض کی: حضور ہی کی امان میں ہوں۔ ندی کنارے جس گاؤں کی طرف حضور شکار کھیلا کرتے ہیں۔ وہاں بسرام ہے وہیں دور سے اکثر حضور کے قدم دیکھے ہیں۔ دیکھنا! اتنا کہا نہیں۔ جتنا خیال کو چھیڑ دیا۔ یہ سن کر بادشاہ زادے کو کہنا پڑا: اچھا کل پھر آئیں گے۔

دوسرے روز کسی سے کہا نہ سنا خاصے گھوڑے پر نکل کھڑا ہوا۔ ندی کے کنارے آیا تو دیکھا بھرپور جا رہی ہے۔ گزر مشکل ہے یہاں لگا تھا کہ خیال کھل کھیلا۔ یعنی جھٹ دل سے پیار۔ جس میں حسن کی زیبائی، عشق کی گرمائی سموئی۔ پھر فلک سے مستی ملی۔ شفق کی مہندی رچائی اور بھاگ متی کی تصویر اُتار دی! اب بادشاہ زادہ کیا دیکھتا ہے کہ ندی کے اُس پار جیسے بھاگ متی مسکراتی کھڑی ہے اور کہتی ہے۔

اچھے بادشاہ زادے! ہو میں شاہانہ عزم کے ہوتے ندی کیا سمندر بھی کچھ چیز نہیں۔ ہو نہ ہو یہ میرے بھاگ کی خوبی ہے جو آپ نہیں آتے۔ اس خیال سے بادشاہ زادہ چونک پڑا۔ ایک دفعہ ہی گھوڑے کو ایڑ دی۔ اور بھری ندی میں اُتر گیا۔ بلکہ یہ کہو کہ پار اُترا۔ بعد میں ندی پر پل بنا۔ وہیں اک شہر چراغاں ہوا۔ جو بھاگ متی کے نام پر پہلے بھاگ نگر، پھر حیدرآباد کہلایا۔ آپ محبت کا نام لے کر اسے پریم نگر کہیں!

سچ یہ ہے دکن کے سے دیس میں ایسا نگر ہونا ہی تھا جیسے پھول میں خوشبو، آنکھ میں پتلی! کیونکہ خود یہ دیس رومانی کرنوں سے جگمگاتا ہے۔ اس کی ہزاروں باتیں ایسی ہیں کہ واہ وا! مگر اس وقت کہیں سے کچھ کچھ افسانہ چن لینا ہے۔ جس میں پہلی ہی بسم اللہ ہماری سیتا جی کی رام کہانی ہے۔ دیکھنا! غرض بھی کیا بُری بلا ہے کہ اس میں انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ سری رام چندر جی کی سوتیلی ماں اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے مہاراجہ دسرت جی کو الٹا سیدھا سمجھاتی ہیں وہ بہکاوے میں آجاتے ہیں۔ اک اچھے حکمراں کو یہ شایاں نہ تھا۔ اس کے نزدیک اپنا تو اپنا پرایا بھی اپنا ہوتا ہے۔ مگر وہ چوکے، اس سے سری رام چندر جی کو بن باس لینا پڑا۔ یہ ان کی بھلمنسائی تھی کہ انھوں نے باپ کا کہنا نہ ٹالا۔ خیر گھر سے بے گھر ہوئے تو انھیں دکن دیس ہی بھایا لچھمن اور سیتا ساتھ ہیں۔ ایک چاہنے والا بھائی گویا قوت بازو کہ بھائی کی خاطر اپنا سکھ چین تج دیتا ہے۔ دوسری چاہنے والی بیوی۔ دکھ سکھ کی ساجھی! لیکن مصیبت تنہا نہیں آتی۔ یہ گھر سے نکلے تو جنگل میں بھی

چھین لیا گیا۔ پنچ وٹی آتے ہی ایک جھگڑے سے پالا پڑا۔ سروپ نکھا نام تھا، تریا ہاتھ پہاڑ پر دیتی تھی۔ یہ بد ذات رام چندر جی کے درپے ہو گئی مگر لچھمن جی عین وقت پر آڑے آئے۔ یہ دیکھ کر جھگڑنی کے دو بھائی کار اور دوشن حملہ کرتے ہیں۔ مگر مارے جاتے ہیں۔ تیسرے بھائی راون کو خبر ہوتی ہے وہ بڑا لاؤ لشکر لے کر لنکا سے نکلتا ہے اور ہزار جتن کر کے سیتا جی کو لے جاتا ہے۔ بعد میں لنکا پر چڑھائی ہوتی ہے۔ راجہ سگروا بھی مدد دیتا ہے۔ اسی راجہ کا شاہی بانا بندر کی شکل کا تھا۔ جس سے یہ سمجھا گیا کہ لڑائی میں رام چندر جی کی مدد بندروں نے کی تھی! غرض یہ وہ لڑائی تھی جس میں آریوں نے تورانیوں پر فتح پائی۔ سری رام چندر جی کا کردار بتا اور سیتا جی نے بتا دیا کہ شوہر پرستی ان کا ایمان۔ خدا ترسی ان کا دھرم۔ اور عصمت کے مقابلے جان سی عزیز شئے بھی کچھ نہیں! ویسے بھی دکن وہ دیس ہے کہ دور دور کے لوگ اس کے دلدادہ رہے۔ کسی نے اس کی طرز تعمیر اڑالی۔ کسی نے اس سے آداب سیکھے۔ یہاں قطبیہ، بریدیہ اور بہمنیہ سلاطین کا ڈنکا بجا۔ جن میں تانا شاہ کا دماغ تو ایک مثل بن گیا ہے۔ یہیں ٹیپو سلطان اور چاند بی بی نے راج رچایا۔ جن کے حوصلے اور ناموری کے قصے اب تک بچہ بوڑھے کی زبان پر ہیں۔ اور تو اور ایک زمانے نے اس دیس سے الف۔ ب۔ ت پڑھی ہے کہ تورانیوں نے یہیں ابجد کی ایجاد کی تھی! علمی انداز کا بھی یہ عالم ہے کہ نویں صدی میں شنکراچاریہ اور بارھویں صدی میں رامانج کا آوازہ بلند ہوا۔ جو آج تک سنائی دیتا ہے۔ یہیں ولی، ظہوری اور ملک قمی پرورش پائے۔ یہیں کئی سو فوا بہ کی پالکی اتری۔ اسی سرزمین میں خان عالی موت کی میٹھی نیند سوتا ہے اسی خاک پاک سے تاریخ میں انسان کیا؟ "فرشتہ" پیدا ہوا! بس تو یہی رنگ مدتوں اس دیس کے ذرّے ذرّے پر رچتا رہا۔ آخر نیچر کے سگھڑ ہاتھوں یہ ذرّے سمٹ کر اس طرح بہ حالات بنے کہ سرکار عالیہ آصفیہ کی طرح پڑی۔ یہ طرحدار سرکار حق یہ ہے کہ بڑی سرکار ہے۔ جس کی کوہساری سرزمین میں زمانے کے نشیب و فراز ہیں۔ یعنی بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جھیل، تالاب۔ بڑے بڑے جنگل جہاں کی صبح و شام کے آگے صبح بنارس اور شام اودھ بھی مات ہے۔ موسم بھی بڑے خوشگوار ہیں۔ کیونکہ گرمی میں نہ زیادہ گرمی ہوتی ہے اور نہ سردی میں زیادہ سردی۔ یہ بات دنیا کے اور ملکوں میں بہت کم ہے گرمی سردی تو خیر جیسی ہے ویسی ہے۔ یہاں کی بہار کو کوئی خوش کلام برقؔ کی نظروں آتا دیکھے تو دل کی کلی کھل جائے:۔

اٹھلاتی لجاتی مسکراتی — کس ناز سے ہے بہار آتی
بوٹا سا وہ قد بہار کے دن — اٹھتی کونپل ابھار کے دن
اتری گلشن میں جب سواری — سورج نے آرتی اتاری
شبنم بھر لائی کورے کورے — شربت سے گلاب کے سکورے
نہریں بھر بھر کے لائیں پانی — سبزے نے بچھایا فرش دھانی
غنچوں نے چٹک کے لیں بلائیں — بلبل نے چہک کے دیں دعائیں
بدلی پھولوں نے اپنی وردی — اودی، زنگاری، لاجوردی
بھونروں نے یہ گونج کر صدا دی — کوئل نے یہ پھیر دی منادی
معشوقۂ گلعذار آئی — آئی آئی بہار آئی!!

بہار تو پھر بہار ہے۔ یہاں ہر دھان کا کھیت خود اک بہار ہے۔ کیونکہ اسے جب دیکھو آنکھوں میں ٹھنڈک۔ دل میں تراوٹ آتی ہے۔ جب کبھی چاندنی راتیں ہوں۔ وہاں کی بوٹا سی فصل کھڑی ہو۔ اس وقت کھیت میں ٹہلتے چاند کا منظر دیکھنے کا ہوتا ہے کہ چاند

کا روشن گہوارہ فضل ہے۔ اور ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے سبز پری رُخ پر گھونگھٹ کھینچے چلی آتی ہے! کوہسار بھی ہے تو یہ مملکت فطرت کا سنگار دان بھی ہے! بھلا کونسا جوہر ہے جو یہاں نہیں۔ ایک دن یہیں تو کوہِ طور، تو یہ! کوہ نور نکلا تھا۔ جسے دیکھ کر آج تک دنیا حیرت میں ہے!! ویسے بھی یہاں "نل دمینتی" کے رومانی پیام سلام ہوئے۔ راج ہنس خوبصورت پیامی بنا۔ یہیں ادب کا ایک "پھول بن" کھلا "پھول بن" ابن نشاطی کی ایک سجل نظم ہے جسے کہہ کر دو ڈھائی سو برس سے اونچے ہوئے۔ نظم کیا ہے دمکتا ہیرا چمکتا تارا ہے۔ جس میں سادگی بھی ہے۔ پُرکاری بھی ہے اور جس کا سارا قصہ ایسا گجرا معلوم ہوتا ہے۔ جس میں شاعر نے بڑی رومانی پھول پتیاں گوندھی ہوں۔ مثلاً کہیں زاہد کی بیٹی جلوہ گر ہے جو باپ کی بددعا سے پھول بن گئی تو کہیں سمن بر بادشاہ زادی ہے جس کے بطن سے پرگل شباب کھلا ہوا ہے!! اس گجی حسین شہزادی پر مصر کا شہزادہ ہمایوں فال فریفتہ ہوجاتا ہے اور شہزادی کے فراق میں عجم آکر بادشاہ سے شطرنج کھیلتا ہے جس پر جان کی بازی لگتی ہے۔ قصے میں یہ مقام بڑا رومانی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ زندگی کی سچائی بھی لیے ہوئے ہے جسے مشرق کی قدیم رومانی بزم ادب میں اسی شاہانہ اور اتھاہ کھیل سے اُجاگر کیا جاتا ہے۔ کنایہ ہوتا ہے کہ دنیا بھی ایک بساطِ شطرنج ہے جہاں جان کی بازی ہو رہی ہے۔ مگر غالب! بازی کا اس جگت اُستاد سے جس کی چالوں کو آج تک کوئی نہیں پہنچا۔ جسے دیکھو یہی کہتا ہے ؎

جو چال ہم چلے سو نہایت بُری چلے

مگر جوابی ہر چال بھی تلی، اٹل اور بڑے پردے کی ہے اسی لیے نوع انسان کے دل کی آواز ہمیں ان انمول بولوں میں بھی سُنادی گئی ہے کہ ؎

مہرۂ شطرنج را انداز با فرزانگی   تو بداں غافل کہ آساں نیست بازی با فلک

ورنہ یاد رہے انسان چوکا کہ مارا گیا! تو بس ایسی ہی رومانی روشنی میں قصہ پڑھتا اور اخیر میں دونو کے سنجوگ پر تمام ہوجاتا ہے۔ اچھا یہ قلم کا "پھول بن" ہوا۔ یہاں ایک موقلم کا "پھول بن" بھی ہے۔ یہ اجنٹے میں کھلا ہے۔ جہاں نقش و رنگ کی پریاں رہتی ہیں۔ کوئی دو ہزار برس ہوئے چند ہندی حسن کاروں نے انھیں اُتارا تھا۔ وہ دن اور آج کا دن کہ سرکارِ عالیہ آصفیہ کے شمال مغرب میں یہ دعوتِ ذوق بھی ہوئی ہے۔ یہ پرستان غاروں میں ہے۔ وہ دیکھو ایک غار میں بڑا سا ایوان ہے جہاں راجہ مسند پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے۔ سر پر چڑاؤ مکٹ، گلے میں بے جنی مالا۔ رانی بڑے انداز سے راجہ کے زانو پر سہارا دیئے بیٹھی ہے۔ داسیاں کھڑی مورچھل ہلا رہی ہیں۔ پاس ایک اور خاتون چتاپٹی کی سوزنی پر بیٹھی ہے۔ ایوان کے بیچوں بیچ سجا سجایا منڈپ ہے۔ جس کے فرش پر ارغوانی پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک کا فرادا ناچ رہی ہے یہ بجلی بسنت پورے آستینوں کی نفیس سیاہ جاکٹ پہنے ہوئے ہے۔ جس پر روپہلی گجالی کے پھول بوٹے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل ہونٹوں پہ لاکھا۔ عجب دلفریبی کا عالم ہے۔ سیاہ جاکٹ میں سے کندن سا جسم ایسا جھلک رہا ہے جیسے کسوٹی پر سونا! اسی ایوان میں پرے گوشہ پر ایک اور کامنی ناچ رہی ہے۔ جس نے نازک انگلیوں پر ٹھوڑی کو اس سبھاؤ سے رکھا ہے کہ میاں رفائل بھی دیکھا کریں! حُسن کاری کے اس پرستان میں یہ اور ایسی بہت سی تصویریں ہیں جنھیں نو دان کے رسیاؤں نے بدھ مت کی رینیا میں رنگ دیا ہے۔ سوچ کے نور میں آج بھی ان کی رنگارنگی سے اک گیانی کی الہی شان پڑی ٹپکتی ہے۔ اور یہ سندریاں بھگتوں کا وہ رنگین گیت معلوم ہوتی ہیں۔ جن میں شکتی بھی ہے۔ شانتی بھی ہے۔ اور یہ پیام بھی کہ ؎

دھرتی کے باسیوں کی مٹی پریت میں ہے

اعجاز

ان پریوں کو اُترے صدیاں ہی گزر گئیں۔ صدیوں کے بعد بھی ان میں جادو کا سا اثر ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ یہ فتوحات فن ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں کہ یہ اُس سور ماگوتم کے دم قدم کا ظہور ہیں جس نے بادشاہت کو لات مار کر عرفان کی بھیک مانگی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ شام کا وقت تھا۔ آسمان پر شفق کا ایک رنگ آتا۔ ایک جاتا تھا۔ زمین کی سیج پر رات کی دلہن انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ اجنتے کی پُرسکون چٹانوں پر اسرار سے منڈلا رہے تھے کہ ہم چند زائرین اجنتے سے موٹروں میں سوار ہوئے۔ اس وقت ایسا معلوم ہوا جیسے یہاں کی لال سبز پریاں خیرباد کہتی ہیں۔ خموشی ان کی زبان ہے۔ حسن کاری اُن کا پیام! جو آج تک چھپتے سے نہیں اترا۔ کیونکہ اب تک ان کی رنگینیاں ذہن میں اس طرح اُبھر آتی ہیں جیسے سطح آب پر کنول کھلا ہو! بس یہی اجنتے کا جادو ہے اور یہی فن کی سچائی پرکھنے کا گُر بھی ہے کہ اس فن نے کیا اثر کیا۔ اگر اس نے روح کو گرمایا۔ خیال کو اکسایا۔ دل کو اُبھارا یعنی آنکھ کان میں اُلجھ کر نہ رہ گیا تو سمجھو وہ فن سچا ہے۔ ورنہ بڑا دھوکا ہے کیونکہ فن وہی سانچا اور بلند و بالا ہوتا ہے جس سے سوچ کی پینگ بڑھے۔ جس کی قوت اتھاہ ہو۔ جو سدا دور کی خبر لائے۔ اور بچے بوڑھے مرد عورت سب کو رجھا کر دلوں پر ایسا نقش چھوڑے کہ مٹائے نہ مٹے! اس کارن زیادہ نہیں شاعری کا ایک بند۔ مصوری کی ایک لکیر موسیقی کی ایک تان بھی دل میں گھر کر جائے تو بس ہے۔ مگر اجنتے میں اس کی بہتات ہے۔ پھر یہاں کی پریاں آپ کو رفعت خیال کی طرف لے اُڑیں تو اُن کی مرتبت کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔ کیونکہ حسن کاری میں جہاں ایسا موقع آیا تو کہتے ہیں حسن کی دیبی مصور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تصویر اُتروا تی ہے۔ پر جبرئیل کا قلم ہوتا ہے۔ دھنک کے رنگ۔ کوثر کا پانی۔ پاؤں فرش زمین پر اور منہ عرش بریں کے روبرو کہ نور خدا سے دمکتا ہو! یہاں شام ہوتے دیکھی تو اُس صبح کا بھی خیال آیا کہ اگلا زمانہ ہے اور رفیر کی روشنی میں اجنتے کے اللہ والے لوگ اُٹھ بیٹھے ہیں۔ پہلے ندی گئے۔ اشنان کیا۔ پھر بار سنگھار کے پھول توڑے۔ پوجا پاٹ کی۔ اور اب اپنے کام پر جاتے ہیں۔ دیکھنا! سب کے بیچوں بیچ ایک بڑے میاں ہیں۔ یہ دھیان گیان کے سچن اور سب کے اُستاد ہیں۔ سوسی کا انگرکھا۔ گزی کی دھوتی۔ سفید گاڑھے کا پگڑ۔ بشرے پہ شانتی آنکھوں میں ذکاوت، انھیں سب نے گھیر لیا ہے ایک شاگرد کے ہاتھ میں موقلم ہے، ایک رنگ کی پیالی لیے ہے ایک برابر آکر کچھ پوچھ رہا ہے۔ بڑے میاں محبت سے بتا رہے ہیں دوسرا اس سے لگا چلا آتا ہے کہ یہ ہٹے تو میں پوچھوں۔ سب مندر پہنچے دن بھر اپنا اپنا کام کیا جب اس شوق و خلوص کی بستی سے پلٹے تو ایک جگہ آ جمع ہوئے۔ اب کوئی اپنی مشکلات سُنا رہا ہے کوئی اپنی کامیابی پر باغ باغ ہے۔ بڑے میاں سب کی سن رہے ہیں۔ صلاحیں دے رہے ہیں کبھی کسی کو سراہتے ہیں کبھی کسی پر جھنجلا اُٹھتے ہیں۔ اتنے میں شام ہو جاتی ہے تو شفق کی رنگینی میں یہ اپنے ٹھکانے چلے جاتے ہیں۔

"وہ بن" آپ نے دیکھ لیے۔ کچھ تالاب بھی دیکھیے۔ اب تک تال میں تال بھوپال تال مشہور تھا۔ مگر اب نظام ساگر آپ اپنی مثال ہو گیا ہے۔ یہ تالاب کیا ہے؟ اچھا خاصہ سمندر ہے۔ ایک وقت عثمانیین کا جتھا نظام ساگر پہنچا جس میں اکثر رومانی دنیا کے رہنے بسنے والے تھے کئی دن سیر و شکار میں گزرے۔ آتی گرمی تھی۔ صبح و شام مزہ دے رہی تھی۔ باقی صاحب اور میں روز سویرے اُٹھ کر ساگر کنارے جا بیٹھتے تھے۔ ایک دن دوشیزۂ سحر انگڑائیاں لیتی تھی۔ دور آنسوؤں جیسے تارے جھلملا رہے تھے کہ رنگین نیچر نے شبنم کی ردا اوڑھی! کبھی کبھی مرغابیاں بھی بول اُٹھتیں جس سے تالاب میں جان سی پڑ جاتی تھی۔ ایسے سہانے وقت باقی صاحب دل سے باتیں کرنے لگے۔ یہ تو میں نہ سُن سکا کہ دل نے ان سے کیا پوچھا؟ ان کا جواب البتہ سُنا ہے آپ بھی سن لیں سے

تا حشر بدلتی نہیں اُلفت کی نگاہیں
وہ چاہیں محبت کو نباہیں نہ نباہیں

باقی صاحب کہتے ہیں۔ یہ باتیں ہورہی تھیں کہ ؎

اتنے میں کوئی زہرہ جبیں یاسمن اندام ۔۔۔ پانی کی پری، عشق کی جان، حسن کا پیغام
اک موج کی آغوش سے آئی مرے آگے ۔۔۔ اک شمع دل افروز جلائی مرے آگے
کہنے لگی اے تشنۂ آوازِ محبت ۔۔۔ سن حسن کے ہونٹوں سے بھی اک رازِ محبت
اس آبِ سحر خیز پہ آنکھوں کو بچھا دے ۔۔۔ اس عالمِ خاموش کے ارمان جگا دے
کہسار کے دامن میں ہے ٹھیرا ہوا پانی ۔۔۔ دل اور محبت کے سکوں کی ہے نشانی
جاں عشق کے پہلو میں ہے بہتا ہوا دریا ۔۔۔ بے تاب ہے ماہی کی طرح اس کی تمنا
محبوب ترا میری طرح نور کی تصویر ۔۔۔ ہے گویا نگاہوں میں کوئی حور کی تصویر
ہاتھوں میں اسی طرح لیے شمعِ محبت ۔۔۔ اور زیرِ قدم ایسی چمکتی ہوئی وسعت
چاہے تو تری عمر کو دامن میں چھپا لے ۔۔۔ اس شمع کو طوفان کی ہواؤں سے بچا لے
یا عشق کو اُمید کے پہلو میں سُلا کر ۔۔۔ پرواز کرے میری طرح اُس کو بُجھا کر

لیکن ایک ہی ساگر نہیں، علی ساگر ہے۔ عثمان ساگر ہے۔ حمایت ساگر ہے، حسین ساگر ہے جو دیس کو ہریالا بنا رہے ہیں۔ حسین ساگر کی چاندنی راتیں بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔ بڑی رومانی ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ بسنت رُت تھی چاندنی راتیں، اکبر صاحب فانی (عثمانیہ) سرشام حسین ساگر گئے۔ کچھ دیر میں سوتے تارے جاگ گئے۔ آنکھیں مل مل کے دنیا کو دیکھنے لگے۔ ادھر چاند نے بھی کھیت اور اگنی جل سے نورانی مکھڑا دھو کر ؎

اُٹھتا ہے افق کے بستر سے بادل پہ چلا آتا ہے ۔۔۔ تالاب پہ سایہ ڈالتا ہے جل تھل پہ چلا آتا ہے
اندھیر تو دیکھو رات کو بھی بادل میں دھوپ اور چھاؤں بھی ۔۔۔ اک ماہ لقا کی زلفوں کے ہر بل میں دھوپ اور چھاؤں بھی
ہے نور کا دھندلا عالم میں نورانی مستی چھائی ہے ۔۔۔ پتوں سے چاندنی چھن چھن کر چاندی سے جل پر کائی ہے
ہے جنبش ماتھے پہ جل کے لہریں لڑ لڑ کر ملتی ہیں ۔۔۔ اور عکسِ قمر سے بہہ بہہ کر کیا دودھ کی نہریں چلتی ہیں
یہ رم جھم رم جھم لہریں ہیں، پائل کی چھم چھم لہریں ہیں ۔۔۔ عاشق کے دل کی موسیقی، اشکوں کا تلاطم لہریں ہیں
وہ دور پہ کالے کالے بن اور سامنے اُجلا اُجلا جل ۔۔۔ یہ نور کے پیچھے ظلمت ہے یا روشن آنکھوں میں کاجل

غرض ایک طرف سرسبزی کے یہ آثار ہیں دوسری طرف خود شہر دلہن بن رہا ہے۔ آرائش کے ہاتھوں اس کا وہ وہ سجاؤ ہوتا جا رہا ہے کہ نظر لگتی ہے۔ ایک مشفق نے حال ہی میں ہوائی جہاز سے بلدہ کو دیکھا کہتے تھے چو طرف نئے نئے مکانات کا ہجوم ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بنگلوں کی اُجلی اُجلی ٹکڑیاں اکڑی ہوں۔ میں کہتا ہوں۔ ان مکانوں میں دیکھنے والا ایک نور بھی چمکتا دیکھتا ہے جو دراصل نورِ علم ہے اور جامعہ عثمانیہ کے مبارک ہاتھوں گھر گھر پھیل رہا ہے۔ یہ لکھ رہا ہوں مگر خود بخود ذہن میں وہ رومانی تاریخ اُبھر آتی ہے جب پورپ اور ایشیا سمدھیانے بنے ہیں۔ بارہ نومبر [illegible] کو حضور شہزادگان والاشان میں سے ایک شہزادے کا بیاہ حضرت عبدالمجید خان ثانی سلطان ترکی کی اکلوتی دختر نیک اختر حضور دُرِّ شہوار دانہ بیگم اور دوسرے شہزادے کا بیاہ حضرت سلطان ممدوح کی بھانجی حضور نیلوفر فرحت بیگم سے ہوا ہے

ہوا۔ نیس جنوبی فرانس میں بڑا پُر فضا شہر ہے۔ کہتے ہیں یہ دریائے بیلان کے دہانے پر ایسے موقع سے آباد ہے کہ کوہ آلپس کی پہاڑیاں اس پر چھتر کئے ہوئے ہیں اور یہاں گلابی جاڑوں میں لوگ تفریح کے لیے آیا کرتے ہیں۔ وہ لیجئے! دونوں شہزادگان والا شان کی برات روانہ ہوئی۔ دیکھتا کیا شاہانہ سج دھج سے جارہی ہے۔ انگریز امرا کی بھوری بھوری ٹوپیاں، سرخ سرخ ترکی ٹوپیوں اور رنگین دستاروں کے ساتھ مل کر کیا بہار دے رہی ہیں! پہلو بہلو تماشائیوں کا ہجوم ہے جو دُلہاؤں کو دیکھنے کے لیے مشتاق ہیں۔ نرم نرم دھوپ کھلی ہوئی ہے۔ نوشاہ ایک شاندار موٹر کار میں تشریف لے جا رہے ہیں۔ جو سفید سفید پھولوں کے خوبصورت گجروں اور مہین سفید ریشمین پردوں سے سجا ہوا ہے۔ موٹر کے چار گوشوں پر زرد گلاب کے چار گلدستے بھی لگے ہوئے ہیں۔ نوشاہ ارغوانی رنگ کی شیروانیاں اور زرد رنگ دستار پہنے ہیں۔ جن پر نارنجی پھولوں اور زرد گلابوں کے سرپیچوں کی پھبن ہے۔ آخر دُلہن والوں کے ہاں یہ شاہانہ برات جا اُتری۔ حضرت سلطان ممدوح نے بہ نفس نفیس نکاح پڑھایا۔ آپ پست قد۔ مضبوط جسم ہیں عمر تقریباً ساٹھ سال ہوگی۔ سرگالا۔ منہ بالا۔ جیسے اللہ کے نور! نکاح کے بعد عام طور پر اُسی دن جلوہ (آرسی مصحف) ہو جاتا ہے اور دلہا دولہن کو وداع کرلاتا ہے۔ لیکن ترکوں میں یہ دستور ہے کہ نکاح کے ایک ہفتہ بعد جلوہ درشام ہفتہ ہوتا ہے۔ یہ وقفہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ہاں نکاح سے پہلے ملنجھے (مائیوں) بیٹھا کر دولہا دولہن کے لیے ایک خاص ماحول پیدا کر دیا جاتا ہے تاکہ اس طرح تنہا وہ اپنی آنے والی ذمہ داریوں پر غور کرسکیں۔ بارے اکیس نومبر کی شام کو قصر کاربا ٹل میں یہ رسم بھی ادا ہو جاتی ہے۔ قصر کے دروازوں پر یورپین خواتین کا جمگٹ ہے جو مشتاق تماشہ ہیں۔ دلہنوں کی شاہانہ پوشاک نہایت خوبصورت ہے۔ دونوں دُلہنیں عاجی رنگ کے ریشمی لہریئے اوڑھے ہوئی ہیں۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے گلدستے گیسو میں نارنجی پھول شہزادگان والا شان ہندوستانی ملبوس زیب تن فرمائے ہیں۔ جڑاؤ تلواریں لگائے ہیں۔ پیش خدمت زرق برق وردیاں زرین پگڑیاں پہنے پھر رہے ہیں۔ غرض آرسی مصحف (جلوہ) ہوا۔ برات گشت کو نکلی۔ اور سات سمندر پار کرتی وطن آئی۔ دولہا دلہن "پلستا" نامی مرکب آبی میں ہیں۔ جو بدر صاحب (عثمانیہ) کی شاعرانہ نظروں میں رعنائی خیال کی زہرا بنا ہوا ہے ؎

خوشا آمد تری اے مایۂ شوقِ جبیں سائی	فضائے نیلگوں میں ایک بیک زہرا کل آئی
ترے ماتھے پہ روشن ہند کا ہے نقشِ آزادی	ترے باطن میں پنہاں ہے دکن کی خانہ آبادی
ترے سر پر ہوائیں رحمتوں کی اُڑتی آتی ہیں	ترے زیرِ قدم موجیں بھی دھن میں گنگناتی ہیں
"کرا پیشِ نظر داری؟ چرا مستانہ می آئی؟	فدایت باد دل و جانم عجب ترکانہ می آئی!!"

رومان میں رومان یہ بھی ایک رومان ہے مگر بڑا شاہانہ ہے۔ مثل ہے کہ راجہ کی خوشی پرجا کی خوشی ہوتی ہے۔ اس طرح دیس کا بچہ بچہ مگن ہوا۔ ہر ایک پر گہرا رومانی رنگ آیا۔ جس سے دل و دماغ مدتوں خالی نہ ہوئے۔ آپ جانتے ہیں۔ طبیعت پر یہ سہانا رنگ رچ جائے تو انسان جنت نگاہ، فردوس گوش بن جاتا ہے انہیں دنوں ایک مرتبہ میں قصر شاہی کی سمت سے گزرا صبح کا وقت تھا۔ برکھا رُت تھی۔ آسمان پر روم جھوم گھٹائیں آرہی تھیں۔ کبھی بوندیاں پڑنے لگتیں کبھی تھم جاتیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے رحمتیں منڈلا رہی ہیں۔ برکتیں برستی ہیں۔ کوئل بھی کوکتی تھی۔ پپیہا بھی بولتا تھا۔ نذری باغ۔ عدن باغ کی نکہت گل ہوا میں بس رہی تھی۔ اس وقت ارباب والی روشن چوکی نے بھی شادیانہ چھیڑا۔ دھن میگھ راگ کی تھی جس کے میٹھے سُر دل کھینچے لیتے تھے۔ ایسے سے حسن کار نچلے نہیں رہتے۔ جب ان کا سنجوگ ہوا تو معلوم ہوا دل مل گئے (مجلہ عثمانیہ [illegible])

[illegible]

اس عنوان کے تحت ہندوستان و پاکستان کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوتا ہے (ادارہ)

خوشبو

انور عنایت اللہ

کل رات کھانے کے بعد ایک بار پھر تقاضا شروع ہو گیا کہ کوئی دلچسپ واقعہ سناؤں۔ سارا قصور سعیدہ کا تھا جس نے میری شخصیت کے گرد ان گنت کہانیوں کا جال بُن رکھا تھا۔ میری زندگی کا بڑا حصہ سیاحت میں گزرا تھا اور میری آپ بیتی فرضی کہانیوں سے کچھ زیادہ ہی دلچسپ تھی۔ کہ سیلی سی سرد ہوائیں چلنے لگی تھیں اس لئے ڈرائنگ روم کی کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے گئے اور دبیز پردے پھیلا دیئے گئے۔ سعیدہ نے کمرے کی روشنیاں گل کر دیں۔ صرف ایک فلور لیمپ روشن رکھا۔ جس کی وجہ سے ماحول پُراسرار ہو گیا۔

"اب شروع کیجئے نا، بہت سوچ چکے آپ!" مجھے خاموش دیکھ کر فوزی نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا "آج کون سی کہانی ہوگی، شکار کی؟" زاہد خاں نے پوچھا شکار کے وہ دیوانے ہیں۔۔۔ "نہیں بھئی آج شکار کی نہیں، کوئی دوسرا واقعہ سنائیے ذرا انوکھا۔۔۔ لیکن ہو سچا۔" نرگس نے فرمائش کی۔۔۔ "اور چونکا دینے والا بھی۔" صفدر نے فوراً لقمہ دیا۔۔۔ "ہاں آج چونکا دینے والا واقعہ ہی سنا رہا ہوں، عالم ارواح سے متعلق۔" میں نے کہا۔۔۔ "ہائے اللہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے تو روحوں و وحوں سے ڈر لگتا ہے۔" ناظمہ نے ڈر کر کان چھوئے۔ کئی خواتین نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

"عجیب بات ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں۔۔۔ "انسان سے تو اس کی زندگی میں ڈرنا چاہیئے۔ خدا جانے مرنے کے بعد لوگ اس سے اس قدر کیوں ڈرتے ہیں۔۔۔" میرا خیال تھا اس پر کوئی ضرور بولے گا لیکن خلاف توقع سب خاموش رہے لیکن میں نے دیکھا سب مجھ سے قریب آگئے۔ جیسے ہمہ تن گوش ہوں۔

"بعض ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا کوئی جواز نہیں ہوتا ان کا سائنسی تجزیہ بھی ممکن نہیں اس کے باوجود ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔" میں نے پائپ سلگا کر کہانی شروع کی: بتیس سال پہلے کی بات ہے۔ مجھے دن تاریخ اور سن اچھی طرح یاد ہے۔ جمعرات تھی اور فروری کی سات تاریخ اور سن ۱۹۴۴ء! ان دنوں میرا قیام حیدرآباد سے پندرہ میل دور حمایت ساگر میں تھا۔ جہاں حکومت نظام کا زرعی فارم تھا۔ یہ جگہ بے حد حسین ہے ایک طرف حسین پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور دوسری طرف میلوں پھیلے ہوئے سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت ان کے درمیان ایک خوبصورت ڈاک بنگلہ ہے اور افسروں کے چھوٹے چھوٹے جدید طرز کے بنگلے۔ اس زمانے میں روٹ پر بسیں نہیں چلتی تھیں اور میں موٹر کار کی نعمت سے محروم تھا۔ فارم سے تقریباً پانچ میل دور ایک شاہراہ تھی جس پر حیدرآباد اور محبوب نگر کی بسیں آتی جاتی تھیں۔ شہر جانے کے لئے اس بڑی سڑک تک پیدل جا کر بس پکڑنی پڑتی تھی۔

اس جمعرات کو شہر میں چھٹی گزارنے کے بعد میں حمایت ساگر واپس آرہا تھا اتفاق سے راستے میں بس خراب ہو گئی اور دو گھنٹے کی تاخیر سے جب میں منزل سے قریب شاہراہ پر بس سے اُترا تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ سنسان سڑک پر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے وحشت سی ہوئی۔ دور دور تک زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ سات بجے تھے۔ دائیں طرف بہت دور افق سے قریب ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں۔ یہ حمایت ساگر تھا۔ ہوا میں

خاصی خنکی تھی اور آسمان پر ابتدائی دنوں کا چاند بیمار سی روشنی دے رہا تھا۔ شاید چاند کی ساتویں تاریخ تھی۔ میں نے گرم کوٹ کا کالر اوپر اٹھایا اور فلیٹ ہیٹ کو ذرا ترچھا کر کے سر پہ رکھا اور اللہ کا نام لے کر پگڈنڈی پر ہولیا جو کھیتوں میں گزرتی ہوئی حمایت ساگر تک جاتی تھی۔ اس خاموش راستے پر سے میں کئی بار گزرا تھا لیکن مغرب کے بعد یہاں آنے کا پہلا موقع تھا۔ یہ پگڈنڈی تقریباً ڈیڑھ میل تک یوں ہی کھیتوں میں سے گزرتی تھی۔ اس کے بعد گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا جس میں گھرا ہوا ایک پرانا مقبرہ تھا۔ چاندنی راتوں میں عموماً درختوں کے سائے عجیب ڈراونی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اور خدا جانے کیوں مجھے یوں لگتا جیسے ہر درخت کی اوٹ میں کوئی بدروح چھپی بیٹھی ہے۔ رات کے وقت اس علاقے کے جنگل سے گزرنے کا میرے لئے یہ پہلا موقع تھا۔

چلتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس علاقے میں اتنے مقبرے کیوں ہیں، آخر سب کی حالت اس قدر خستہ کیوں ہے؟ جس مقبرے کے قریب سے مجھے گزرنا تھا وہ اسلامی طرز کا تھا۔ مغلوں کی دکن میں آمد سے پہلے کا تھا اور سنا تھا کہ کسی مشہور درباری مغنیہ کا تھا۔ نام کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میں نے ایک بار لوح قبر پر تلاش کرنے کی کوشش کی تو مایوسی ہوئی تھی۔ خوش رنگ قیمتی پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور اب چاروں طرف اونچی اونچی گھاس اگ آئی تھی۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ یہ تقریباً ڈھائی سو سال پرانا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد میں درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ گیا۔ چاند کی دھیمی سی روشنی میں مقبرے کا مٹیالا گنبد صاف نظر آرہا تھا۔ جوں ہی میں پگڈنڈی پر سے ہو کر کچی سڑک پر آیا یکایک قریب ہی سے مجھے چیخ سنائی دی اور میں چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھا تو مجھے مقبرے کی پشت پہ دو سائے نظر آئے۔ پھر ایک مرد کی آواز سنائی دی ـــــ "آواز نکالی تو گلا گھونٹ ڈالوں گا۔" اس کے بعد سسکیاں سنائی دیں۔ یہ سنتے ہی نہ جانے میرا ڈر کہاں غائب ہو گیا اور میری حالت بالکل ویسی ہو گئی جیسے شکار میں جانور کو دیکھ کر تجربہ کار شکاری کی ہوتی ہے۔ مجھ میں ایک عجیب پھرتی آگئی اور میں دبے پاؤں آگے بڑھا میں نے احتیاط سے جھاڑیاں ہٹائیں تو وہ مجھے نظر آگئے۔ شکلیں صاف نظر نہیں آرہی تھیں لیکن یہ واضح تھا کہ ایک لمبا تڑنگا مرد ہاتھ میں بڑا خنجر لئے ایک دبلی پتلی عورت کو دھمکا رہا تھا ـــــ "بول، میرے ساتھ چلے گی یا میں کام تمام کر دوں؟" مرد نے غصے میں کہا ـــــ "پاگل نہ بنو، تم بھی زندہ نہ بچ سکو گے" عورت نے آہستہ سے جواب دیا لیکن اس کی آواز ڈر سے کانپ رہی تھی ـــــ "بکواس بند کرو، سیدھی طرح میرے ساتھ چلو۔" یہ کہتے ہوئے مرد نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے ساتھ ہی عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ چیخ سنتے ہی جھنجلا کر مرد نے اس کی گردن پکڑلی اور اس کا گلا بے دردی سے گھونٹنے لگا۔ عین اس وقت خدا جانے مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی کہ میں تیزی سے جھاڑیوں سے نکلا اور میں نے مرد کی گردن پہ زور سے وار کیا۔ اس کے ہاتھ سے چھرا چھین لیا۔ پہلے تو وہ اس غیر متوقع حملے سے بوکھلا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر جھپٹا۔ وہ ایک دیو قامت انسان تھا۔ اس نے پلک جھپکتے مجھے دبوچ لیا اور دفعاً مجھے یوں لگا جیسے میری ہڈیاں پسلیاں چور چور ہو جائیں گی، اس سے پہلے کہ میرا دم گھٹ جاتا۔ خدا جانے کیا ہوا کہ یکایک اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ میں نے سنبھل کر اسے دیکھا تو وہ خنجر صاف نظر آگیا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے ہاتھ میں تھا۔ اب یہ خنجر اس کی پیٹھ میں دھنسا ہوا تھا اور میرے ہاتھوں میں اس کا تازہ گرم خون تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہوں آخر میں اس ویرانے میں رات گئے تک کر کیا رہا تھا؟ مجھے تو اس وقت حمایت ساگر میں ہونا چاہئے تھا ـــــ یہ لاش ـــــ یہ جوان لڑکی ـــــ یہ سب کیا ہے؟ اس پراسرار ماحول کا فسوں؟ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ لڑکی میرے قریب ہی آگئی اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس کے ہاتھ بھی خون سے تر تھے ـــــ "چلو بھاگ چلیں، یہ جگہ محفوظ

نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے کہا اور وہ مجھے تقریباً گھسیٹتی ہوئی چلنے لگی۔ "کہاں جانا ہے تمہیں؟" اس نے پوچھا۔ "حمایت ساگر۔" میں نے حواس پر قابو پاکر جواب دیا۔ "یہ کس طرف ہے۔؟ قلعے سے آگے۔؟" اس نے یوں پوچھا جیسے پہلی بار نام سنا ہو۔

"خدارا آہستہ چلو۔" میری سانس پھول رہی تھی۔ "نہیں! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کے ساتھی کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "ان کے آنے سے پہلے میں قلعے پہنچنا چاہتی ہوں۔" "کون سا قلعہ؟" اب کے میں نے پوچھا عجیب احمقانہ سوال ہے، یہاں اور کتنے قلعے ہیں۔؟" اس نے جواب دیا۔ "شاید پردیسی ہو۔؟" "نہیں، لیکن بہت دنوں کے بعد دکن آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اسی لیے عجیب حلیہ بنا رکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ رک گئی اور اس نے مڑکر مجھے غور سے دیکھا۔

پھر اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ "پرتگالی؟؟؟" اس نے سہم کر کہا۔ کیا کررہی ہو؟ یہاں پرتگالی کہاں؟" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "پھر تمہارا یہ لباس۔؟ یہ حلیہ۔؟ یہ ٹوپی؟" اس نے گھبرا کر کہا۔ "خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ اب تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ہم آبادی سے قریب ہیں۔ بجلی کی روشنیاں دیکھ رہی ہو؟ وہ ہے حمایت ساگر کا زرعی فارم — وہاں ٹیلیفون بھی ہے اور جیپ بھی جہاں کہوگی پہنچا دوں گا۔

میں نے اسے تسلی دی جب تک میں بولتا رہا۔ وہ آنکھیں پھاڑے مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے سخت پریشان ہو۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا "بجلی؟ فارم؟ — جیپ؟ کونسی تاریخ ہے آج؟" اس نے آہستہ سے پوچھا یہ سنتے ہی میں بری طرح سے جھنجلا گیا۔ خدا کے لیے مذاق چھوڑو۔ اب پوچھوگی کونسی صدی ہے یہ؟ "جی ہاں — کون سی صدی ہے یہ؟" اس نے واقعی مجھ سے یہی سوال کیا۔ "بیسویں صدی ہے یہ محترمہ — یعنی اسلامی چودھویں مہینہ فروری کا یعنی اسلامی رجب کا۔" میں نے جل کر جواب دیا "اور تاریخ سات" اب کے اس نے فوراً لقمہ دیا۔ میں نے اس بات میں سر ہلا دیا تو وہ بولی تو — "یا اللہ تیرا شکر۔" مجھے بھی خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے آپ کو آخر زمان و مکان کا احساس ہو ہی گیا۔" میں نے جل کر کہا۔ "ہاں ہاں ہاں!" اس نے تیزی سے جواب دیا اور فوراً قبلہ رو ہوگئی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بڑے ڈرامائی انداز میں بولی — "تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے یا اللہ کہ کھیل آج آخری بار کھیلا گیا اور میری سزا کے دن پورے ہوگئے۔"

اب کے میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور میں نے جھنجلا کر کہا۔ "خدا کے لئے یہ ڈرامہ بند کیجئے محترمہ آپ نے یا تو مجھے احمق سمجھ رکھا ہے یا آپ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ آپ بہترین اداکارہ ہیں۔ سیدھی طرح میرے ساتھ چلئے، ورنہ میں تو چلا۔ خدا حافظ!" یہ کہتے ہوئے میں مڑا اور تیزی سے چلنے لگا۔ "خدا کے لئے رک جاؤ — میری بات سنو؟" وہ تیزی سے آئی اور اس نے میرا بازو تھام لیا۔ اور میرے شانے سے سر ٹکا دیا عین اسی وقت ایک عجیب مست کر دینے والی خوشبو کا سیلاب آیا اور بے اختیار میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب وہ مجھ سے بے حد قریب تھی اور چاندنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ خوب گورا رنگ گول چہرہ، ننھی سی ٹھوڑی، ستواں ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، گھنے سیاہ بال، سڈول سانچے میں ڈھلا حسین جسم — کیا میں خواب دیکھ رہا تھا۔ ایسی پیاری شکلیں، جوان خوابوں ہی میں نظر آتی ہیں۔ جی چاہا وقت ٹھہر جائے، وہ اسی طرح مجھ سے قریب کھڑی رہے اور یہ حسین لمحے صدیوں کا روپ دھار لیں۔ اس نے یکایک ٹھنڈی سانس لی تو فسوں ٹوٹ گیا اور میں فوراً ہوش میں آگیا۔ "کہاں پہنچاؤں تمہیں؟" میں نے آہستہ سے پوچھا — "کہیں بھی نہیں۔ فی الحال تم جہاں چاہو مجھے لے چلو۔ آج بڑی مبارک جمعرات ہے۔ تم جب تک چاہو میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں —!" "اس کے بعد؟" میں نے پوچھا۔ "اس کے بعد میں مہینے بھر کے لئے چلی جاؤں گی

اس نے جواب دیا — "لیکن کہاں؟" میں نے فوراً پوچھا — "اگر بتاؤ تو تم یقین نہیں کرو گے!" اس نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک بار پھر میرے چہرے پر ناگواری کے آثار آگئے اس نے یہ دیکھا اور بولی — "خدا کے لیے میرا یقین کرو۔ میں واقعی بے حد سنجیدہ ہوں۔ تم نے رقاصہ گلبدن بیگم کا نام سنا ہے؟ — نہیں۔؟ وہ مقبرہ دیکھا ہے؟" اس نے مڑ کر ہاتھ کا اشارہ کیا۔

"وہ ہے گلبدن کا مقبرہ! نام اس کا روحی تھا، پر گلبدن بیگم کے نام سے مشہور ہوئی۔ قلعہ گولکنڈہ کی مشہور مغنیہ جو ہزاروں دلوں پر حکومت کرتی تھی وہ جتنی حسین تھی اتنی سنگدل بھی تھی۔ امیر نوجوانوں کو اپنے عشق میں تڑپا کر مارنے میں اسے بڑا مزہ آتا تھا اس خطرناک کھیل سے اسے دیوانگی کی حد تک عشق تھا جس کی بھینٹ نہ جانے کتنے معصوم نوجوان چڑھ گئے۔" یہ کہتے ہوئے وہ رک گئی۔ ہوا سے بالوں کا ایک باغی لٹ اس کے گال پر آگئی تھی جسے اس نے ہاتھ اٹھا کر ہٹایا — "یہ کہانی مجھے کیوں سنا رہی ہو؟ کیا میں اتنا احمق نظر آتا ہوں؟" میں نے پوچھا — "نہیں نہیں، نہیں — خدا کے لئے — خدا کی قسم بالکل نہیں! میری طرف دیکھو۔ کیا تم نے ایسا لباس دیکھا ہے؟ ان زیورات کو دیکھو جو میرے جسم پر ہیں کیا تمہارے زمانے کی عورتیں ایسے ہی زیور پہنتی ہیں؟ میں نے خوشبو استعمال کی ہے کیا تمہارے زمانے میں استعمال ہوتی ہے —؟ کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں کہ میں روحی گلبدن بیگم ہوں — قلعہ گولکنڈہ کی مشہور مغنیہ! جس کا جسم اس ڈھائی سو سال پرانے مقبرے میں دفن ہے۔ لیکن جس کی روح سالہا سال سے اس ویرانے میں اپنے محسن کے انتظار میں بھٹک رہی ہے۔ ہر نوچندی جمعرات کو نہایت بھیانک کھیل یہاں کھیلا جاتا ہے۔ ہر مہینے مجھے اسی طرح بے دردی سے قتل کیا جاتا ہے جس طرح ڈھائی سو سال پہلے ایک رات کو کیا گیا تھا۔ لیکن خدا کی قسم اب یہ کھیل یہاں کبھی نہیں ہوگا۔ جس بزرگ نے اپنے جوان بیٹے کے قتل پر مجھے بددعا دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ صدیوں بعد کسی نوچندی جمعرات کو ایک اجنبی آئے گا۔ وہ تمہیں اس عذاب سے نجات دلوائے گا۔ اس دن مہینے کی ساتویں تاریخ ہوگی۔ وہ ایسی باتیں کرے گا جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی وہ ایسے کپڑوں میں ہوگا جو تمہیں بے حد عجیب لگیں گے۔ آج وہ پیش گوئی پوری ہوگئی۔ اب مجھے سکون مل گیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے یوں بھٹی بھٹی نگاہوں سے نہ دیکھو۔ آج بڑی مبارک رات ہے، آج جب تک تم چاہو میں تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں —"

یہ کہتے ہوئے اس نے بڑے پیار سے مجھے مسکرا کر دیکھا اور معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سر چکرا رہا ہے، جیسے یہ زمین، یہ آسمان، اس کا حسین چہرہ، سب کچھ گردش میں آگیا ہے۔ میں رک گیا کیوں کہ میرا پائپ بجھ گیا تھا۔ میں نے جیب میں سے لائٹر نکال کر پائپ جلانے کی کوشش شروع کر دی۔ سب خاموش دم بخود مبہوت مجھے دیکھ رہے تھے، چند لمحے بڑی پراسرار خاموشی چھائی رہی۔ پھر سعیدہ نے آہستہ سے پوچھا — "پھر کیا ہوا؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "پھر شاید میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو میں حمایت ساگر کے ڈاک بنگلہ میں تھا۔ اس رات جب میں واپس نہ پہنچا تو دوستوں نے گھبرا کر شہر ٹیلیفون کیا۔ وہاں سے اطلاع ملی کہ میں تو حمایت ساگر چلا گیا تھا۔ لوگ میری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر وقار الدین کا کہنا ہے کہ انھوں نے مجھے سب سے پہلے دیکھا۔ میں مقبرے کے قریب پڑا تھا۔ انھوں نے سفید کپڑوں میں ملبوس کسی عورت کو بھی دیکھا تھا لیکن جب وہ قریب پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں کسی عمدہ عطر کی مست کر دینے والی خوشبو مجھ میں بسی ہوئی تھی۔

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ اب سارے مہمان مجھ سے اور قریب آگئے — "آپ بار بار چپ کیوں ہو جاتے ہیں؟ پھر کیا ہوا؟" نازو نے بے چینی سے پوچھا — "پھر میں پاکستان آگیا۔ لیکن وہ اپنے وعدہ پر قائم ہے۔ شاید قیامت تک قائم رہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ہوتا کیا ہے؟ کیا اب بھی وہ تمہیں نظر آتی ہے؟" زاہد خان نے پوچھا۔ ان کے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ میری کہانی

کو من گھڑت سمجھ رہے تھے۔" یہ راز کی بات ہے ایسی باتیں بھری محفل میں نہیں کی جاتیں۔ ہاں بھئی سعیدہ ——! ہو جائے پھر ایک بار کافی کا دَور، بارہ بجے سے پہلے میں سونا چاہوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے تھکی تھکی سی جماہی لی۔ اس سے پہلے کہ سعیدہ کافی کا انتظام کر کے آتی۔ ناظمہ کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی وہ منہ پر ہاتھ رکھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے بڑی کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سب کی نگاہیں بے اختیار اس طرف گئیں۔ اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔

"شاید جلدی میں کھلا رہ گیا۔" یہ کہتے ہوئے زاہد خاں اٹھے۔ "نہیں! میں نے اپنے ہاتھ سے اچھی طرح بند کیا تھا۔" سعیدہ بولی اور تیزی سے اٹھ کر دریچے تک گئی۔ دوسرے لمحے اس کی ہلکی سی چیخ سنائی دی تو سب اس کی طرف لپکے۔ وہاں کچھ نہ تھا لیکن باہر سے کسی انجانے مست کر دینے والی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے کمرہ میں پھیل گئی۔

"میں نے وہاں اس درخت کے نیچے اسے دیکھا —— سفید کپڑوں میں تھی؟" سعیدہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ سب خاصے پریشان لگ رہے تھے۔ لیکن اس ہنگامے میں کسی نے غور نہیں کیا کہ واقعی آج نوچندی جمعرات تھی اور اتفاق سے تاریخ بھی سات ہی تھی۔؟؟؟

(ماہنامہ 'دوشیزہ' کراچی، جون ۱۹۸۵ء)

عابد علی خاں

اُردو طباعت و اشاعت آئندہ دہے میں

نیشنل بک ٹرسٹ نے آئندہ دہے میں اُردو طباعت و اشاعت کے مسائل پر غور اور جائزے کے لئے سری نگر میں ایک سیمنار کا اہتمام کیا تھا یہ سیمنار ۱۸ ر تا ۲۰ ر جون ویمنس کالج سری نگر کے آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ سیمنار کی صدارت ڈاکٹر مسعود حسین خاں وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی۔ سیمنار کے ماڈریٹر نگرانکار جناب ابوالحسن صاحب اسپیشل آفیسر بک پروموشن وزارت تعلیم و سماجی بھلائی حکومت ہند تھے۔ اس سیمنار میں ۳۳ ادیب، شاعر، پروفیسر، ناقدین، صحیفہ نگار، پبلشرز اور لائبریرین شریک تھے۔ سیمنار میں اُردو طباعت اشاعت، کتابت، مذہبی اور بچوں کا ادب، فنی، موضوعاتی، سائنسی ادب، اخبارات و رسائل ترجمۂ اصطلاحات غرض اُردو زبان کے تمام مسائل پر حاوی ۱۳ مقالے پڑھے گئے، جس پر بحث و مباحثہ ہوا اور مفید نتائج بھی نکلے

ہندوستان میں ۳ کروڑ سے زائد افراد اُردو بولتے ہیں۔ ملک کے ہر علاقے میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جموں و کشمیر میں اُردو ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ ہماچل پردیش میں ہندی کے بعد اُردو ہی کو سرکاری کا مرتبہ دیا گیا ہے۔ لیکن ملک کی دوسری ریاستوں میں خصوصیت سے ان ریاستوں میں جہاں اُردو بولنے والوں کی خاصی تعداد ہے اور جو اُردو کے مراکز سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں اُردو کو وہ مقام نہیں دیا گیا ہے جس کی وہ مستحق ہے۔ اُردو سارے ملک میں بولی جاتی ہے مگر آزادی کے بعد سے شمالی ہند میں اُردو کو ایک زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتا تھا اور یہ کہا جاتا تھا کہ تین چار نسلوں کے بعد ایسا زمانہ آئے گا کہ اُردو کا خط پڑھنے والا بھی نہیں ملے گا اس مایوس کن فضا میں اُردو والے جی رہے تھے۔ نوجوان نسل جو آزادی کے بعد

پیدا ہوتی تھی، وہ اُردو کی تاریخ اور روایات اور اردو کے قیمتی سرمایہ سے بڑی حد تک ناواقف ہے۔ ہمارے نامور ادیب اپنی تخلیقات اُردو کی بجائے ہندی میں پیش کرنے لگے تھے۔ یہ صورت حال بڑی جان لیوا تھی۔ ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ اندھیرے کے بعد اُجالا یقینی ہے۔ امید کی شعاعیں چمکنے لگی ہیں۔

اس امید افزا فضاء کا آغاز ۱۹۶۹ء سے ہوتا ہے جب کہ برسرِ اقتدار کانگریس پارٹی میں نظریاتی اختلافات کے باعث انڈین نیشنل کانگریس ایک مثبت حیثیت سے نمودار ہوئی۔ نئے منصوبے بنائے گئے۔ اُردو دشمنوں کی آنکھ پر لسانی عصبیت کی جو عینک چڑھی ہوئی تھی اس کے شیشے ٹوٹنے لگے۔ اور یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اُردو بھی اس ملک کی ایک زبان ہے اور اُردو والوں کا یہ جمہوری حق مانا جانے لگا کہ انھیں بھی اپنی زبان کی حفاظت نشر و اشاعت اور ترقی دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے اس احساس کے باعث اترپردیش میں جہاں اس زبان کو سب سے زیادہ ناانصافیوں کا شکار ہونا پڑا نسبتاً خلوص کے ساتھ سابق میں کی گئی۔ ناانصافیوں کا مداوا شروع ہوا۔ کثیر تعداد میں اردو اساتذہ کا تقرر اور اُردو اکیڈمی کا قیام اس تبدیلی کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس نئی تبدیلی کا اظہار جاری پارلیمان کے دونوں ایوانوں میں ہونے لگا۔ چنانچہ مرکزی وزارت تعلیم نے ملک بھر میں اُردو کے مقام و موقف پر تحقیق کرنے اور مناسب سفارشات کرنے کے لئے گجرال کمیٹی کی تشکیل کا اعلان کیا۔ اس کمیٹی کی رپورٹ اور سفارشات اگرچہ کہ آہنی الماریوں میں بند پڑی ہیں لیکن اس کے باوجود کمیٹی کی چند اہم سفارشات ملک کے مختلف علاقوں میں عملی تشکیل اختیار کرتی ہوئی نظر آرہی ہیں۔

اترپردیش کے بعد بہار، مہاراشٹرا، آندھرا پردیش میں اُردو اکیڈیمیوں کا قیام اور کرناٹک، مغربی بنگال وغیرہ میں ان کے قیام سے اصولی اتفاق کا اعلان ان سفارشات کی عملی صورت گری کا بین ثبوت ہے۔ اُردو طباعت اور اشاعت کی خاطر خواہ ترقی میں سب سے بنیادی ضرورت اُردو تعلیم کا انتظام ہے۔ ملک بھر میں اُردو تعلیم کا انتظام معقول نہیں ہے۔ اساتذہ کی کمی اُردو مدارس کی بُری حالت، نصابی کتابوں کی عدم دستیابی، اُردو پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی یہ ایسے سوالات ہیں۔ جو اُردو کتابوں کی اشاعت آئندہ دے سے راست تعلق رکھتے ہیں۔

سری نگر کے سیمنار میں مختلف مکتب خیال سے تعلق رکھنے والوں نے جو اظہارِ خیال کیا وہ انھی بنیادی خیالات و احساسات کا ترجمان تھا چنانچہ اُردو طباعت و اشاعت پر منعقدہ یہ پہلا سیمنار مستقبل میں اُردو کے مقام کو متعین کرنے اور اُردو زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کو مضبوط اور مستحکم بنانے میں بہت بڑی مدد دے گا۔ سیمنار میں شرکت کرنے والوں جناب حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر وارث علوی، کمال احمد صدیقی، خلیق الرحمن اعظمی، شکیل الرحمن، شہباز حسین، احمد سعید ملیح آبادی، [illegible]، عابد رضا بیدار، شفیق انصاری، عبدالحق، مولانا عبدالسلام قدوائی، پروفیسر قمر رئیس اور امر ناتھ قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اُردو کے ادیبوں پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان ملک بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے لکھنے والے ہر جگہ موجود ہیں اور صحیح معنوں میں یہی وہ زبان ہے جو رابطہ کی زبان کہلائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کا کوئی علاقہ یا ریاست نہیں ہے اس زبان کو قانونی مراعات حاصل نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے اس زبان کی ترقی میں وسعت پیدا نہیں ہوسکی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں گو اس پر توجہ کی جانے لگی ہے۔ مختلف ریاستوں میں اُردو اکیڈیمیاں قائم ہوئی ہیں لیکن جن خطوط اور تعمیری محور پر ان اکیڈیمیوں کو کام کرنا چاہیئے وہ نہیں ہورہا ہے۔ اُردو کے نام پر چند ادیبوں اور شاعروں کی تصنیفات پر انعام دینا یا ان کے مسودات کی اشاعت کے لئے امداد دینا ہی اُردو کی ترقی میں مدد نہیں دے گا۔ اکیڈیمیوں کو اُردو کا مستقبل بنانے اور

تحقیق و تنقید کے کاموں پر توجہ کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ خیال ہے کہ اُردو کتب کی فروخت اور نکاسی کے لئے ایک مثبت منصوبہ بنانا چاہیئے۔ آج کل جس طریقہ پر اُردو کتابیں شائع ہو رہی ہیں وہ غیر منظم ہے کیوں کہ ان مطبوعات سے اُردو کے مستقبل پر کوئی فشاندہی نہیں ہو سکتی۔ جناب حیات اللہ انصاری صاحب نے جو ترقی اُردو بورڈ کے صدر بھی ہیں، اُردو تعلیم پر اراکین کو متوجہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ اُردو کا بنیادی مسئلہ تعلیم کا مسئلہ ہے۔ اس لئے اُردو والوں کو سنجیدہ طور پر تعلیم کے بہتر انتظام، اساتذہ کی فراہمی اور ان کی ٹریننگ اور اچھے تعلیمی ماحول کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن (کشمیر یونیورسٹی) نے کہا کہ انھیں اُردو کے نامور اور مستند ادیبوں سے شکایت ہے کہ وہ نئے اور ابھرتے ہوئے ادیبوں کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ جب تک نئے لکھنے والے پیدا نہیں ہوں گے اور ان کی ہمت افزائی نہ ہوگی اس وقت تک اُردو ادب میں نیا اضافہ نہ ہو سکے گا اور اس طرح اُردو کی ترقی میں ٹھیراؤ پیدا ہو جائے گا۔

اُردو کتب خانوں کی اہمیت پر بھی اس سیمینار میں بحث کی گئی۔ شہاب الدین انصاری اور عابد رضا بیدار نے جو جامعہ ملیہ اور خدابخش لائبریری پٹنہ سے متعلق ہیں۔ ریاستی اور اہم کتب خانوں میں اُردو کتابوں کی بُری حالت پر اظہارِ خیال کیا اور نئے انداز سے سائنٹفک اصولوں پر اُردو کتابوں پر فہرستیں تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ امر ناتھ صاحب ہندوستان کے بہت بڑے پبلیشر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے اُردو مطبوعات کی طباعت اور نکاسی کے بارے میں مفید تجاویز پیش کیں اور اس ضرورت کا اظہار کیا کہ پاکستان، سنگاپور اور ایسے ممالک میں جہاں بڑی حد تک اُردو مطبوعات کی کھپت کے امکانات ہیں انکو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ سیمینار میں شریک صحافیوں نے اس امر سے اتفاق کیا کہ اُردو اخبارات اور رسائل میں تبصروں کا باضابطہ انتظام اور اخبارات میں ہر ہفتہ ادبی ایڈیشن اور نئی مطبوعات کی تشہیر کی ذمّہ داری انجام دیں۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے سیمینار میں اپنی اختتامی تقریر میں کہا کہ اُردو مطبوعات کا یہ پہلا سیمینار بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ سیمینار میں ظاہر کئے گئے خیالات اور تجاویز کو عملی صورت دینے کے لئے ایک ذمّہ دار تنظیم کی ضرورت ہے۔ جس کی صورت سرکاری حکومتی اداروں کے ساتھ ساتھ اُردو کے ادارے بھی مشترکہ طور پر کر سکتے ہیں۔ اُمید ہے کہ اس سیمینار میں منظور شدہ تجاویز حکومت کے لئے لائق غور ہوں گی اور خود اُردو والے ایک نئے جوش اور احساس سے اس پر توجہ دیں گے۔

سیمینار کے اختتامی اجلاس میں (۲۰) سفارشات پر مشتمل ایک جامع قرارداد بھی متفقہ طور پر منظور ہوئی ہے۔ ان سفارشات پر عمل آوری کی ذمّہ داری صرف حکومت ہی پر عائد نہیں ہوتی بلکہ نیشنل بک ٹرسٹ، این سی ای آر ٹی پبلیکیشن ڈویژن، ترقی اُردو بورڈ جیسے سرکاری اور نیم سرکاری خود مختار اداروں کے علاوہ ریاستی اُردو اکیڈیمیوں اور انجمن ترقی اُردو پر بھی مساوی طور پر عائد ہوتی ہے۔ قرارداد کے پیش نامہ میں اس حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے کہ اُردو ہندوستان کی قومی زبان ہے جو ملک کے طول و عرض میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ملک کی آزادی کی جد و جہد میں اردو زبان نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ لیکن اس زبان کی بد قسمتی ہے کہ آزادی کے حصول کے بعد سے اس کے جائز حقوق کو نظر انداز کر دیا گیا اور قانونی و دستوری حیثیت سے اس کو وہ مقام نہیں دیا گیا جس کی وہ مستحق تھی۔

پیش نامہ میں یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ اس زبان کو دستوری اعتبار سے اب وہ حق دیا جانا چاہیئے جس کو بھی ابھی تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اس زبان کی نشر و اشاعت اور اُردو ادب کے پھیلاؤ و نکاسی کے لئے منجملہ دیگر سفارشات کے قرارداد میں یہ سفارشات کی گئی ہیں۔

۱۔ مرکزی حکومت کی امداد سے اُردو کے ناشرین کی کل ہند اساس پر ایک اسوسی ایشن بنائی جائے۔

۲۔ اُردو کتابوں کی فروخت اور ان کی بہتر نکاسی کے لئے سرکاری طور پر ایک مارکیٹنگ تنظیم کا قیام عمل میں لایا جائے اور اس کی شاخیں

ان تمام ریاستوں میں قائم ہوں جہاں اُردو کا چلن ہے۔

۴۔ سرکاری اور نیم سرکاری اُردو اداروں کی ایک مجلس قائمہ بنائی جائے جو اُردو کے تمام مسائل کا جائزہ لے اور ضروری سفارشات کرے کہ اُردو کتابوں کی قیمت کو گھٹانے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔

۵۔ بک کلب اور کتابوں کے میلہ کا انتظام کیا جائے۔

۶۔ اُردو ٹائپ اور نستعلیق کے تعلق سے ماہرین کی ایک کمیٹی بنائی جائے۔

۷۔ جہاں اُردو عام ہے ان ریاستوں کی مدد سے اُردو کتب خانے قائم کئے جائیں جہاں ہندوستان بھر کی کتابیں فروخت کے لئے دستیاب ہوں

۸۔ نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے۔

۹۔ اُردو قارئین کا سروے کیا جائے

۱۰۔ ریڈیو ٹیلی ویژن اور دوسرے سرکاری تشہیری ادارے اُردو کتابوں پر تبصروں اور اُردو کی ترویج و اشاعت کے لئے زیادہ تعاون کریں

۱۱۔ سرکاری لائبریریز میں اُردو کتابوں کے لئے زیادہ گنجائش رکھی جائے اور اُردو کے شعبہ کو بہتر بنایا جائے۔

اُردو کی بقاء تحفظ اور ترقی کے لئے یہ پہلا اہم قدم آئندہ دہے ہی کے لئے نہیں بلکہ مستقبل کے لئے بھی ضروری ہے۔

(سیاست، حیدرآباد، ۳ر جولائی [illegible])

باقی صدیقی

غزل

نگارِ دشت کی جانب کوئی قدم اب تو ہجومِ شہر میں گھٹنے لگا ہے دم اب تو

کھڑا ہوں دل کے دوراہے پہ ہاتھ پھیلائے چھپائے چھپتے نہیں زندگی کے غم اب تو

نئے خیال نئے فاصلوں کے ساتھ آئے نہ مل سکیں گے کسی راستے میں ہم اب تو

مسافرانِ محبت کا انتظار نہ کر کہ دل میں آ گئے راہوں کے پیچ و خم اب تو

ہنسو کہ دل کے غموں کا کوئی علاج نہیں ہے داغ اپنے ہی چہرے کا چشمِ نم اب تو

نکل گیا ہے سفینہ ترا کدھر باقی
صدائیں آتی ہیں ساحل سے دمبدم اب تو

(فنون لاہور)

ادبی سرگرمیاں

اُردو نامہ: علمی، ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم جون:۔ مسٹر خورشید لال مہیدرا (ایم ایل سی، سی پی آئی) نے صحافتی بیان کے ذریعہ قانون سرکاری زبان کی دفعہ (۷) پر عاجلانہ عمل آوری کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے نظم و نسق کی سطح پر اُردو کے ریاست میں دائرۂ استعمال کی وضاحت کو ضروری قرار دیا۔ اور نظم و نسق کی سطح پر اُردو کے چلن میں حائل دشواری کی وضاحت کرتے ہوئے حکومت کو توجہ دلائی۔

۲ جون:۔ ہفت روزہ "اودرنیشنل گرا نجویٹ" کے زیر اہتمام ایک مباحثہ بعنوان "اُردو دوسری سرکاری زبان" بصدارت جناب یم، باگاریڈی (ایم ایل اے) منعقد ہوا۔ مولانا ابو یوسف (ایم ایل سی) بیرسٹر سردار سلیمان، محترمہ سلطانہ جبیں شرف الدین، جناب مصطفیٰ کمال اور مسٹر چندر سری واستوا جرنلسٹ نے مخاطب کیا۔ مسٹر یدھ ویر مدیر روزنامہ "ملاپ" کا ایک پیام بھی اس موقع پر سنایا گیا جس میں کہا گیا ہے کہ "اُردو جو ملک کی ایک قومی زبان ہے اس کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں، اس کا سدباب کیا جانا چاہیئے" صدر جلسہ نے کہا کہ "اُردو کو قانونی موقف دیا جانا ضروری ہے۔ گزشتہ دس سال سے اس مسئلہ کو سیاست و تعطل میں ڈالا گیا ہے جناب نذیر احمد ایڈیٹر او دنیشنل گرا نجویٹ نے ابتدا میں سمپوزیم کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور ایک قرارداد پیش کی جس میں طلبا اور نوجوانوں کی ایکشن کمیٹی کی جانب سے شروع کردہ زنجیری بھوک ہڑتال کی تائید کی گئی تھی۔ ایک اور قرارداد کے ذریعہ جواں مرگ افسانہ نگار ابراہیم شفیق کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔

● بزمِ سالک کے زیرِ اہتمام مرحوم مخدوم غلام قادر سالک تلمیذ تمنی اورنگ آبادی کو خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ جلسۂ یادِ سالک کی صدارت ڈاکٹر زینت ساجدہ نے کی اور ادب میں ہیئت و مواد کے مثبت تجربوں پر روشنی ڈالتے ہوئے داغ دہلوی سے لیکر تمنی اورنگ آبادی تک سلسلۂ شعر و ادب کو تیراغوں کی سلک مروارید قرار دیا۔ دکن کے معروف تہذیبی سفیر جناب تجمل حسین نے افتتاحی خطاب کیا۔ مہمانانِ خصوصی جناب اختر حسن اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے بھی مخاطب کیا۔ جناب نذیر الدین طالب کنوینر جلسہ نظیر علی عدیل نے مرحوم سالک کی شعری صلاحیتوں کو آئینہ دکھایا۔ موسیقاروں نے دبستانِ تمنی کے شعراء کا کلام سازوں پر سُنا کر سماں باندھا۔

مختصر وقفہ کے بعد ڈاکٹر سید عبد المنان کی صدارت میں شعرائے کلام سنایا۔ رحمن جامی معتمد مشاعرہ تھے۔ سرور شاذ تمکنت، سید شہیدی، رؤف خیر، رحمت یوسف زئی، علی سرور، مظفر مجاز، مصلح الدین سعدی، اثر غوری، داود نصیب، سرا ستعانہ، تجلی اطہر، کاجہ تال ماجد، ضیاء ساحل اور محترم سرو حسب نے کلام سُنایا۔

۳ جون:۔ حلقہ خواتین کا ادبی اجلاس محترمہ سلمیٰ کمال الدین کی صدارت میں منعقد ہوا۔ محترمہ شفیق صلاح نے انشائیہ اور محترمہ بانو طاہرہ سعید نے افسانہ سُنایا۔ محترمہ مریم بلگرامی مہمانِ خصوصی تھیں۔ سلطانہ شرف الدین اور امجدی شیرین نے کلام سے محظوظ کیا۔

۳ جون:۔ کراچی (پاکستان) سے پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد ڈائرکٹر "ایوانِ اُردو" نے ممتاز عثمانین ادیب جناب مسلم ضیائی کے سانحۂ ارتحال کی اطلاع دی۔ ضیائی مرحوم اشاعتی ادارہ "کتاب محل" کے ڈائرکٹر اور بچوں کے پندرہ روزہ رسالہ "تارے" کے مدیر اور کئی کتابوں کے باکمال اور قابل دانشور مصنف تھے۔ چند سال سے بعارضہ فالج علیل اور صاحبِ فراش تھے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

انڈین لٹریچر آف آرٹس کاونسل کے زیر اہتمام کل ہند مشاعرہ جناب محمد علی عباسی کی نائب صدر ادارۂ ادبیاتِ اُردو منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خان صدر نشین مجلس انتظامی اُردو اکیڈیمی اور جناب اصغر اشرف سکریٹری نظامس چیاریٹبل ٹرسٹ نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔

تین سو اور دو سو روپیوں کا "سیاست ادبی ایوارڈ" چیک کی صورت میں دیا گیا اور محبوب نگر کے نئے سخنور مقبول فاروقی کو ادارۂ سیاست کی طرف سے اس مشاعرے کا میاب شاعر کا لقب از ایک سو روپیہ انعام کی شکل میں دیا گیا۔ اضلاع تلنگانہ، کرناٹک اور مہاراشٹرا کے شعرائے نے مشاعرہ میں کلام سنایا۔ جن میں تاج کرینگس، مقبول فاروقی، مسعود عابد، عبدالحکیم جعلی، حفیظ کیمر، عابد انصاری، عبدالمجیب قیس، سلیم عابدی، عبد العلیم پرواز، سلطان محمود کے علاوہ ڈاکٹر امیر عارفی (دہلی) ڈاکٹر مشتاق درزی (بمبئی) اور حیدرآباد کے شعرا حکیم یوسف حسین خاں، تجلی الہمسر، فکر بدایونی، انور رشید اور محسن جلگانوی قابل ذکر ہیں۔ جناب جہاندار افسر نے نظامت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔

● پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے ایک طویل صحافتی بیان جاری کرتے ہوئے بتایا ہے کہ "آندھرا پردیش کے قیام کے بعد اس کے چیف منسٹرس ریاست میں اُردو کے مقام اور موقف کے بارے میں بلند آہنگ اور خوش آئند اعلانات کرتے رہے ہیں لیکن ان اعلانات اور تیقنات کو کبھی بھی قانونی موقف عطا نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اُردو کا موقف ریاست میں برابر متاثر ہوتا رہا اور آج بھی اُردو اپنے جائز جمہوری حقوق سے محروم ہے۔ پروفیسر رحمٰن نے اپنے بیان میں اُردو کے قانونی تحفظ کے لئے طے شدہ معاہدہ کو روبہ عمل لانے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اُردو والوں کو اصلاحوں کے چکر سے بچنے کا مشورہ دیا اور متحدہ کوشش کی اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ قانون سرکاری زبان کی دفعہ (۷) کو بعض تبدیلیوں کے ساتھ جلد روبہ عمل لایا جائے۔

۱۲ر جون :- اقبال اکیڈیمی کی طرف سے ماہانہ محفلِ اقبال میں مسرز مصلح الدین سعدی، ظہیر الدین احمد، حمید الدین محمود اور غضنفر علیخاں نے علی الترتیب اقبال اور مشرقِ وسطیٰ، علم و عرفان اقبال اور نہرو اور اقبال کی سماجی فکر کے موضوعات پر مقالے سنائے۔ صدر اکیڈیمی جناب خلیل اللہ حسینی نے صدارت کی۔

۱۳ر جون :- ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے زیر اہتمام قائم کردہ اُردو انسائیکلو پیڈیا کی ادارتی کمیٹی سے علالت کے سبب ڈاکٹر عابد حسین (دہلی) کی سبکدوشی کے سبب جناب علی محمد خسرو، وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا اس عہدہ پر انتخاب عمل میں آیا۔

● جناب حیات اللہ انصاری صدر نشین ترقی اُردو بورڈ نے ڈان اسکول کا معائنہ کیا اور اُردو تدریس کے انتظامات پر اظہارِ خوشنودی فرمایا۔

۱۴ر جون :- حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کا ادبی و شعری اجلاس دفتر شگوفہ بہ صدارت ڈاکٹر مغنی تبسم منعقد ہوا۔ ڈاکٹر یوسف کمال، جناب یوسف اعظمی اور ڈاکٹر تبسم نے علی الترتیب جدیدیت، جمہوریت، ادب اور صحافت اور معنی میں جدیدیت کی تحریک پر فاضلانہ اظہار خیال کیا۔ جناب قدیر الزماں نے "افسانے" کے باب میں گفتگو کی۔ بیگ احساس نے نئی کہانی سنائی۔ مختصر محفل شعر میں ڈاکٹر تبسم، ڈاکٹر کمال، غیاث متین، رحمٰن جامی، رؤف خلش، حسن فرخ، علی الدین نوید، مسعود عابد، مصلح الدین سعدی، مقبول فاروقی اور ضیاء ساحری نے کلام سنایا۔ ابراہیم شفیق کی یاد میں قرار داد تعزیت بھی منظور کی گئی۔

● جناب آصف پاشاہ ریاستی وزیر فائنانس و صدر اُردو اکیڈیمی نے طلباء و نوجوانوں کی کمیٹی برائے اُردو کے ایک وفد سے دفتر اکیڈیمی میں ملاقات کی اور بتایا کہ ریاستی چیف منسٹر اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کے حق میں نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ اپنے کابینی رفقاء کی مدد سے موزوں متبادل راستے کی تلاش میں ہیں۔ اس موقع پر قائد وفد جناب نصرت محی الدین نے کمیٹی کا ایک دس نکاتی منشورِ مطالبات وزیر موصوف کے حوالے کیا۔

۱۵ر جون :- اُردو کے ادیبوں اور شاعروں نے جن میں مسرز ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر انور معظم، جیلانی بانو، اقبال متین، راشد آذر، شاذ تمکنت، عوض سعید اور وقار خلیل شامل ہیں ایک مشترکہ بیان میں اُردو سے انصاف کے لئے ریاستی قانون سرکاری زبان کی دفعہ (۷) میں فوری اور مناسب ترمیم پر زور دیتے ہوئے تشویش کا اظہار کیا ہے کہ ریاست میں اُردو کو اس کا قانونی حق دینے کے سلسلے میں اب تک کوئی ٹھوس عملی اقدام نہیں کیا گیا جس کے باعث اُردو کے مسائل اُلجھتے جا رہے ہیں اور اس کا موقف کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

۱۶ر جون :- جناب حیات اللہ انصاری صدر نشین مرکزی ترقی اُردو بورڈ نے ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی کی طرف سے ایک ادبی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "مولانا کو آزادی سے قبل

بھی ضرورت تھی، آج بھی ہے اور آنے والے دو سو سال تک بھی رہے گی۔ اتحاد اور حب الوطنی کے جذبات کو پروان چڑھانے میں مولانا صاحب کی تعلیمات سے استفادہ کیا جانا چاہئیے۔ اس جلسہ کی صدارت جناب احسن علی مرزا صاحب ایڈیٹر سیاست نے کی۔ مولانا حافظ ابو یوسف (ایم ایل سی) نے بھی اس جلسہ کو مخاطب کیا۔

۱۷ر جون:۔ ریاستی چیف منسٹر مسٹر چنے ۔ ڈنگل راؤ سے ایک نمائندہ سیاسی قائدین اور وزراء کے وفد نے ملاقات کی اور اردو زبان کے مطالبات کے سلسلے میں طلباء کی زنجیری بھوک ہڑتال کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اردو کو ریاستی نظم و نسق میں جائز اور مستحقہ مقام دینے میں عاجلانہ توجہ کریں۔ مسٹر ابراہیم علی انصاری وزیر جنگلات، آصف پاشاہ وزیر قانون، کے وی، کیشولو وزیر گھریلو صنعت، سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر، یم، باگاریڈی، مسعود احمد خورشید سیدیا اور سیف اللہ بیگ اراکین اسمبلی پر مشتمل وفد کو چیف منسٹر نے یقین دلایا کہ اُن کی حکومت اردو کو قانون سرکاری زبان کی دفعہ (۷) کے تحت دیئے گئے مراعات پر بلا تامل عمل آوری کرے گی۔

۱۸ر جون:۔ طلباء و نوجوانوں کی کمیٹی برائے اُردو کے ایک وفد نے ریاستی چیف منسٹر سے ملاقات کرتے ہوئے دس نکاتی منشور مطالبات اُن کے حوالے کیا جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ اُردو کے سرکاری استعمال کے لئے استعمال کے جامع قانون کا جلد اعلان کیا جائے۔ چیف منسٹر نے وفد کو یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اس سلسلے میں سرکاری اعلان کریں گے

۱۹ر جون:۔ اردو ہفت روزہ "القریشی" کی دس سالہ صحافتی خدمات کے اعتراف میں بزم محبانِ المجید" کی طرف سے ایک خوشگوار جلسہ میں اس کے مدیر محمد ابراہیم مدنی کی گلپوشی کی گئی۔ مولانا ابو یوسف اور خالد کھتری نے تقریریں کیں سلطان محی الدین سیف صاحب کی صدارت میں ایک محفل شعر بھی منعقد ہوئی۔ جناب عارف میاں بانی معاون مدیر القریشی نے شکریہ ادا کیا

● ریاستی وزیر قانون و صدر اردو اکیڈیمی جناب آصف پاشا نے بزم اردو نظام آباد کے سالانہ جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے اردو کے تعلق سے وزیر اعظم مسٹر مرارجی دیسائی کے بیان کو مایوس کن قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس بیان سے اردو والوں میں سخت مایوسی پھیل گئی ہے۔ اردو کو اس کا جائز اور مستحقہ مقام دیئے جانے سے کسی بھی دوسری زبان کا موقف متاثر نہیں ہوتا۔

● اقلیم ادب کا ماہانہ ادبی و شعری اجلاس ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب خیرات ندیم کی شعری شخصیت پر جناب مصلح الدین سعدی نے اظہار خیال کیا۔ یوسف اعظمی کی نظم پر ڈاکٹر یوسف کمال، جمیل شیدائی اور مہیپال سنگھ ورما نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ محفل شعر میں خیرات ندیم مصلح الدین سعدی، رحمٰن جامی، ڈاکٹر کمال، حامد مجاز رؤف خلش، علی الدین نوید، اعظمی، غیاث متین برق یوسفی، رؤف خیر، حسام الدین سلیم، سلیم مقصود نے کلام سنایا۔ پروفیسر خوندمیری نے صدارتی تقریر فرمائی۔ اور مغنی تبسم صاحب معتمد بزم نے جلسہ کی کارروائی انجام دی۔

۲۱ر جون:۔ ریاستی قانون ساز کونسل میں جناب کے ایل مہندرا (ایم ایل سی سی پی آئی) نے تقریر کرتے ہوئے اردو کو سرکاری زبان کا موقف عطا کرنے کی ضرورت پر مدلل بحث کی۔

۲۵ر جون:۔ حلقۂ ارباب ذوق کا ماہانہ اجلاس بصدارت ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نظامس اردو ٹرسٹ لائبریری میں منعقد ہوا۔ پروفیسر رفیع الدین صدر شعبۂ اردو لیں ٹوی یونیورسٹی تردیتی نے جناب سردار جعفری کی کتاب "اقبال شناسی" پر تبصرہ کیا۔

۲۶ر جون:۔ اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی کی صدارت میں بمقام "اردو ہال" منعقد ہوا۔ جناب نرنیدر لوتھر (آئی اے ایس) نے نکاہیہ "سوچیے اُٹھئے" سنایا۔ جناب طیب انصاری، صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ہاسن (میسور) نے "سعادت علی خاں، خطوط کے آئینے میں" کے زیر عنوان خاکہ نما مضمون پڑھا۔ اس جلسہ میں ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے شائع شدہ کتاب "یارانِ شہر" کی جناب کھنہ نے رسم اجراء انجام دی حیدرآباد کے جواں فکر ادیب طیب انصاری نے دکن کی ممتاز اور معروف شخصیتوں کے سوانحی خاکے یارانِ شہر کے نام سے شائع کئے ہیں۔ صدر جلسہ نے طیب صاحب کی علمی و فکری صلاحیتوں کو ایک دلچسپ مضمون میں خراج عقیدت ادا کیا۔ ادارہ کی طرف سے جناب ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارہ اور اردو مجلس کی جانب سے اس کے معتمد صلاح الدین نیر نے مصنف کی گلپوشی کی۔ [illegible] منظوم تہنیتی نظم کے ذریعہ جناب طیب کی ادبی خدمات کا [illegible]

(باقی صفحہ ۵ پر)

ماہی گیری کی ترقی میں ایک سنگِ میل

آندھرا پردیش فشریز ڈیولپمنٹ کارپوریشن ریاست آندھرا پردیش میں ماہی گیری کی ترقی میں ایک سنگِ میل اور نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کارپوریشن اکتوبر ۱۹۷۴ء میں ۴ کروڑ روپیے کے منظورہ سرمائے سے عالمِ وجود میں آیا۔

اس کارپوریشن کی گوناگوں سرگرمیاں مارکٹنگ، برف خانوں کی دیکھ بھال، کاکیناڈا کی گیریونٹ، بوٹ بلڈنگ یارڈ، اور ماہی گیری کی فلاح و بہبود کے کاموں پر مرکوز ہیں۔

برسوں سے ماہی گیروں کو امداد باہمی کے حلقے میں لانے کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس وقت ماہی گیروں کی ۸۵۴ امداد باہمی انجمنیں اور ۱۳ مارکٹنگ سوسائٹیاں قائم ہیں جن کے اراکین کی تعداد ۱۲۶۰۲۵ ہے اور جن کا اداشدہ سرمایۂ حصص ۱۸۶۰۷ لاکھ روپیے ہے۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ
حکومت آندھرا پردیش۔ حیدرآباد

No. 5-77-78/574/ADVT/C3.

سن اجراء: ۱۹۳۸ء فون نمبر: ۳۸۳۴۹۹

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

نگران: سید علی اکبر
معتمد مجلس اشاعت: غلام جیلانی
مرتب: وقار [illegible]

جلد: ۴۰ شمارہ: ۸
اگست

قیمت فی شمارہ: [illegible] پیسے
زرِ سالانہ: بارہ روپے
ششماہی: سات روپے

پرنٹر پبلشر: سید علی اکبر
مطبعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲
مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد ۴

ترتیب

روشنی میں اضافہ

ریاست کی تیز رفتار ترقی کے لئے برقی قوت کی حیثیت کلیدی ہوتی ہے۔ ہماری محنت و مشقت کے نتیجے میں برقی قوت کی تنصیبی صلاحیت میں گزشتہ برسوں کے دوران اضافہ ہوتا آرہا ہے۔

سال	تنصیبی صلاحیت
۱۹۵۱ کے ختم پر	۵۹ میگاواٹ
۱۹۵۶ کے ختم پر	۱۳۲ میگاواٹ
مارچ ۱۹۶۱ کے ختم پر	۲۷۰ میگاواٹ
مارچ ۱۹۶۶ کے ختم پر	۲۹۹ میگاواٹ
مارچ ۱۹۷۴ کے ختم پر (چوتھے منصوبے کا اختتام)	۶۵۷ میگاواٹ
پانچویں منصوبے کے ختم پر	۲۰۰۸ میگاواٹ

پانچویں منصوبے کے دوران میں برقی قوت کے لئے اخراجات کی گنجائش تمام شعبوں سے زیادہ یعنی ۵۰۶ ر ۹۰ کروڑ روپے رکھی گئی ہے۔ نتیجتاً تنصیبی صلاحیت میں ایک دم ۲۰۰ فیصد کا اضافہ ہوگا یعنی چوتھے منصوبے کے اختتام پر موجود ۶۸۸ میگاواٹ تنصیبی صلاحیت پانچ سال بعد بڑھ کر ۲۰۰۸ میگاواٹ ہو جائے گی۔

برقی قوت کی تیاری کے لئے جو بڑی اسکیمیں تیار کی گئی ہیں ان کے نتیجے میں تھرمل قوت اور ہائیڈرو قوت کے درمیان ایک اچھا توازن پیدا ہوگا بلکہ حقیقت میں ان دونوں قوتوں کی مقدار تقریباً مساوی ہوجائے گی۔

وہ زمین جہاں کرشنا بہتی ہے، زیادہ سے زیادہ روشن ہونی چاہیئے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش

[illegible]. 9/77-78/ 506/ ADVT/C3/77

جنتا حکومت کے قیام کے بعد سے اُردو کے مسئلہ پر مختلف گوشوں سے اور مختلف سطح پر توجہ دہانی شروع ہو چکی ہے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے اتر پردیش کی انتخابی مہم کے وقت اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار نہ دینے کا اعلان کیا تھا لیکن بعد میں وزیر اعظم نے اپنے بیان کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی ریاست اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے آمادہ ہے تو وہ مانع نہیں ہوں گے اس کے بعد یہ مسئلہ اس مہینہ کے اوائل میں پھر زیر بحث آیا جبکہ انجمن ترقی اُردو ہند کے ایک وفد نے وزیر اعظم سے ملاقات کرتے ہوئے اپنی یادداشت میں دستور کی دفعہ ۳۴۵ کے تحت اُردو کو سرکاری موقف دینے کا مطالبہ کیا۔
اس موقعہ پر وفد کو بتلایا گیا کہ گجرال کمیٹی کی رپورٹ پر حکومت ہند جلد ہی غور کرنے والی ہے یقین ہے کہ انجمن کی نمائندگی موثر اور کامیاب ثابت ہو گی کیونکہ اُردو کا مسئلہ جمہوری قدروں کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ جنتا پارٹی کی مجلس عاملہ کے حالیہ خصوصی اجلاس میں بعض ارکان نے اُردو کے مسئلہ کے حل کے لئے اپنی آواز بلند کی اگرچیکہ وزیر داخلہ اور وزیر صحت کے بیانات حوصلہ شکن ہیں لیکن یہ بات امید افزا بھی ہے کہ جنتا پارٹی میں جمہوریت پسند گروپ اقلیتوں کے تمام مسائل کے حل کے لئے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا اور اپنے فرائض کو پہچانتا ہے۔

جنتا پارٹی کی مجلس عاملہ نے اگرچیکہ اُردو کے تعلق سے ہنوز کوئی واضح رویہ اختیار نہیں کیا ہے لیکن اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لئے اس نے جو کمیٹی مقرر کی ہے اور اقلیتی کمیشن کے قیام کے لئے پارٹی نے حکومت کو جو مشورہ دیا ہے اس سے یہ امید پیدا ہوتی ہے کہ حکومت کو اُردو کے جائز حقوق اور منصفانہ مطالبات کے تحفظ کے لئے جلد یا بدیر کوئی مثبت قدم اٹھانا ہی پڑے گا اور ان منفی طاقتوں کو راستہ سے نکالنا پڑے گا۔ جو کانگریسی حکومت کے دور میں بھی اُردو یا اقلیتوں کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں روڑے اٹکاتے رہے۔

جنتا پارٹی اپنے مختلف النوع اجزائے ترکیبی کے باوجود عوامی مسائل کے حل کے لئے جمہوری تقاضوں کی تکمیل کے لئے اس لئے بھی مجبور ہے کہ انتخابات میں عوام نے اسے کامیاب بنایا تھا اور اب عوام مسائل کا حل چاہتے ہیں۔

آج ہمارے ملک میں اُردو تحریک اُجالے اور اندھیرے کی ملگجی روشنی میں ہے۔ اُمید کی جانی چاہئے کہ اب حق بحقدار رسید کے دن قریب آ گئے ہیں جہاں اُردو تحریک اپنی منزل مقصود کی سمت آگے بڑھ رہی ہے وہیں اُردو والوں کی اپنی ذمہ داریاں بھی اب ایک اہم سوال بن رہی ہیں۔ یہ سوال اردو مدارس میں طلبہ کی تعداد اور اُردو کتابوں اور رسالوں کی نکاسی سے متعلق ہے اُردو مسائل کا جائزہ لینے کے لئے ہمیں اُردو کی تصویر کے دونوں رُخ کو دیکھنا ضروری ہے۔

اس بار "سب رس" کی مشمولات میں بیشتر تخلیقی تحریریں قدیم اور کلاسیکی ادب سے عبارت ہیں۔ "قند مکرر" "بادۂ کہن" "سب رنگ" اور "اُردو نامہ" کے اوراق قدیم سے جدید تک صحت مند ترقی پذیر اور صالح ادبی و تہذیبی اقدار کے صفحاتِ زرنگار محسوس ہوتے ہیں
ادارہ کی درخواست پر خریداروں کی طرف سے جس خلوص کا مظاہرہ درکار تھا معلوم ہوتا ہے اس میں سرگرمی کے عناصر کم شامل ہو رہے ہیں۔ "سب رس" جنوبی ہند کا واحد ادبی، تحقیقی اور اپنی نوعیت کا اُردو جریدہ ہے، اس لحاظ سے اسے اور پھیلنا چاہیئے۔ جامعات میں اُردو ادبیات سے دلچسپی رکھنے والے معلمین اور ان کے طلباء سے ہم ایک بار پھر درخواست کریں گے کہ وہ اپنے ادبی معیار اور ذوق کی کماحقہٗ تکمیل کے لئے "سب رس" کو وسیلۂ اظہار بنائیں اور اسے خرید کر زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے اغراض و مقاصد کو آگے بڑھانے میں بھرپور تعاون عمل کا ثبوت دیں۔
جناب غلام جیلانی معتمد مجلسِ مشاورت "سب رس" ان دنوں مختصر عرصہ کے لئے جنیوا گئے ہوئے ہیں، موصوف کی خواہش پر یہ چند سطریں سپردِ قلم کی گئیں، امید ہے ان پر سنجیدگی سے غور کیا جا کر زبان و ادب کی بقا کی جانب مثبت رویّہ اپنایا جائے گا۔

(عابد علی خاں)

"ادب اور ثقافت کے رشتے اس قدر گہرے ہیں کہ ان پر جبریت کی تعریف صادق آتی ہے غالباً اگر یہ کہا جائے کہ انسانی زندگی کا "کل" ثقافت ہے اور ادب اس "کل" کا ایک جزو تو زیادہ غلط نہ ہوگا۔
ہمارا دور ترقی پسندانہ نظریات کا دور ہے۔ اس نظریہ کے حامی چند حضرات اپنے غیر ترقی پسندانہ نظریات اور ان نظریات کے غلط اطلاقات و توجیہات سے بعض اوقات ترقی پسندانہ نظریات کو نقصان پہنچاتے ہیں۔
معاشی آزادی کی جد و جہد کے دور میں سخت گیری کا مظاہرہ نقصان دہ ہی رہتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سائنٹفک ترقی پسند اپنے اس دعوے سے دست کش ہو سکتے ہیں کہ بورژوا معاشرہ کا بیشتر ادب بھی بورژوا ہوتا ہے سوائے اس ادب کے جو بہت شعوری طور پر اپنے قارئین میں سائنٹفک جستجو اور عمل کے لئے اکسائے لیکن اس موڑ پر پہنچ کر ادب اور پروپیگنڈے کے درمیان واضح فرق ملحوظ خاطر نہ رکھنا ایک ایسی بھول ہے جس کے نتیجہ میں بعض اوقات یاسیت پسند ادیبوں کے حزنیہ اور طلسمی ادب کے شہ پاروں کو رجائی ادب کے پروپیگنڈہ ادب کے مقابلے میں پسند کر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ ادب نام ہے اظہار و بیان کی بلندیاں فتح کرنے کا نہ کہ پروپیگنڈہ کا۔ ادب نام ہے انسان اور فطرت اور خود انسان اور انسان کے درمیان مغائرت ختم کرنے کے لئے خوبصورت مساواتوں کی تخلیق کا۔ ادب نام ہے "نصف جانور اور نصف فرشتہ" صفت آدمی کی منزل ہے "مکمل" آدمی کی منزل تک ارتقائی سفر اختیار کرنے کا، تاکہ جب ثقافت اپنی ترقی اور تبدل کا منحنی گراف پڑھنا چاہے تو ادب سماجی مورخ کا ہاتھ بٹائے جس طرح وہ کل کامش کے عہد سے آج تک غیر شعوری یا شعوری طور پر اس فریضہ کو انجام دیتا چلا آیا ہے۔"

(مجید علی صدیقی)

عبدالغنی فاروقی

میر کا شعری اسلوب اور اس کا ماخذ

معنی و لفظ اور شخصیت اور اسلوب کے درمیان پائدار اور ناقابلِ انقطاع رشتہ ہوتا ہے یا نہیں، یہ نقد و ادب کا ایسا مسئلہ ہے جو عام طور پر سماجی اور تقابلی تنقید میں زیرِ بحث آتا رہا ہے۔ ہمارے ادب کے اہم تاریخی دور "احیاءِ فنون" کے آغاز میں تصوف و معنویت کے زیرِ اثر موضوع و صورت یا مادہ و ہیئت کے مابین نفسیاتی کشمکش و رقابت خلق کرنے کی بنیاد رسماً رکھی گئی۔ اس طرح شعر کا پہلا کام حظ و ابتہاج ہے، لیکن اس کی افادی یا اخلاقی و تعلیمی حیثیت کو اجاگر کرنے کی باقاعدہ جد و کوشش اسی عہد کی ایک غیر ادبی دین ہے جو ترقی پسند افراد کے ہاتھوں میں منظم تحریک کی شکل میں آشکارہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ کسی خاص عہد کی تخلیقاتِ شعری کو اٹھا کر دیکھئے ان میں عصری حیثیت اور شعری صداقت، فن کار کی ذاتی معنویت اور منفردانہ خصوصیت کے ساتھ اس طرح گھتی ہوئی ملتی ہے کہ اظہارِ ذات کا معاملہ عقل و ہوشمندی کے بغیر جذباتی پسندیدگی کا انداز اختیار کرنے لگتا ہے۔ یہی صورتِ حال میرؔ اور سوزؔ کے تقابلی مطالعہ میں آزاد کو پیش آئی ہے۔

میر تقی میرؔ، میر سوزؔ کے ہم عصر ہیں، دونوں نے دلی کی گلیوں میں انسانوں اور انسانیت کا خون بہتے، پُرشکوہ سلطنتِ مغلیہ کی پسپائی اور اس کے دردناک انجام کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دونوں تلاشِ معاش اور بخت کی آزمائش کے لیے اودھ کے دربار میں پہنچے ہیں۔ ایک کے ہاں اپنی تہذیبی محرومیوں کا سخت احساس ہے، دردمند دل کی پکار ہے، دوسرے کے ہاں قلبی المیوں کی آوازِ بازگشت، مگر دونوں کے غنائی لہجہ میں مقداراً و اعتباراً سوز و اثر ہے۔ ان دونوں کے آہنگ و اسلوب میں کبھی اور کہیں محسوس شباہت ملتی ہے اور دونوں کے اشعار کی جمالیاتی سطح سے جو مشترکہ تصوراتِ فن ابھرتے ہیں ان کی روشنی میں آزاد نے یہ مفروضہ گڑھ لیا ہے کہ میرؔ نے دراصل یہ انداز میر سوزؔ سے لیا ہے، وہ لکھتے ہیں: "ان کا (میر تقی) صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے ..... حقیقت میں یہ انداز میر سوزؔ سے لیا مگر ان کے ہاں نری باتیں ہی باتیں تھیں۔ انہوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا۔" (آبِ حیات [illegible])
"وہ (میر سوزؔ) اپنی محبت کی باتوں کو اس طرح باندھتے تھے کہ شعر کی موزونیت کے لیے لفظوں کا آگے پیچھے کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، میر تقی میرؔ کہیں کہیں ان کے قریب آجاتے ہیں" (ایضاً صفحہ [illegible])۔

یہ نتیجہ متذکرہ بالا اقتباس سے جو کہ اردو کے ایک جید ناقد، انشاپرداز نے اخذ کیا ہے اور صالحاتِ غزل کا ہے اس لیے جب تک میرؔ کے خاص الخاص فکری عمل اور آرٹ سے ان کی نفسیاتی وابستگی کا تحلیلی تجزیہ نہ کیا جائے اور جب تک شخصیت اور اس کی تہہ داریوں سے نقاب اٹھایا نہ جائے یہ بتانا دشوار نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے کہ سوزؔ نے میرؔ کے اسلوب کو متاثر کیا ہے یا

صورت حال اس کے برعکس تھی یا ہر ایک نے تخلیقِ اسلوب کی روشنی کیلیے اپنے دستِ خاص سے بنائی تھی ۔

حقیقت یہ ہے کہ آزاد کا تنقیدی نظام شعر کے تمام تر جمالیاتی تصور سے ماخوذ ہوتا ہے جو لفظ کو معنی سے جدا کرکے دیکھتا ہے ۔ اور شخصیت و اسلوب کے باطنی ارتباط کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے ۔ لفظ و معنی میں جو فکر انگیز رشتہ ہوتا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں : " کامیاب ادب میں لفظ و معنی میں کوئی دوئی نہیں رہتی" لفظ ہی معنی اور معنی ہی لفظ رہتا ہے ۔ شاعر کا کام نہ صرف یہ ہے کہ معنی کے لئے لفظ تلاش کرے بلکہ اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ لفظ کی معنوی کیفیت کو بڑھا دے ۔"

آزاد کا محض یہ قیاس ہے۔ ظن و تخمین ہے کہ میر سوز سے میر نے استفادہ کیا تھا ۔ اس تنقید اور اس کی نفسیات کے پیچھے دراصل جو ذہنیت کام کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ میر اپنے معاصر حریف سوز کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کے شاعر تھے ۔ اس کو بخت و اتفاق کہیئے کہ ان کی شاعری نے عوام کے دربار سے سندِ قبول حاصل کر لیا ۔ عظیم فن کے لیے جس جمالیاتی احساس کی ضرورت ہے اور ابلاغ و ترسیل کے وسائل کی تخلیق کے لئے جس طرح کا شعور درکار ہوتا ہے وہ میر سوز کے ہاں ملتا ہے مگر سوز کے اس اندازِ بیان میں میر نے مضامینِ بلند داخل کئے اور بڑی چابکدستی اور صفائی سے اس کو اظہارِ ذات کا ذریعہ بنا لیا ہے ۔

آزاد کی ژولیدہ بیانی اور ان کے گنجلک طریقۂ کار کے شکار ولی، دبیر، آتش، مصحفی، مومن اور غالب تو عموماً ہو چکے ہیں لیکن جب میر کی سیرت و فن کا ذکر آجاتا ہے ان کی ناقدانہ سحر کاری شدت و حدت اختیار کرنے لگتی ہے ۔ یہ کیوں اور کس لئے ؟ آزاد کے نظریۂ فن کی وضاحت ہو جائے تو اس کا صحیح ترین جواب ممکن ہے آپ کو مل جائے گا ۔

آزاد کی دلنواز شخصیت اور ان کے دلفریب و محیّر العقول طرزِ بیان سے انکار کیسے ہو سکتا ہے ۔ وہ جانسن کی طرح شعر سے زبان کی نزاکتوں کا عرق نچوڑ لیتے ہیں ۔ اور کالرج بن کر ان تمام جمالیاتی پہلوؤں کو احاطۂ تحریر میں لاتے ہیں جو شاعری کے ظاہری خواص، آہنگ، تشبیہ، استعارہ اور الفاظ کی صنعت گری سے تعلق رکھتے ہیں ۔ دوسرے لفظوں میں آزاد کے جس کسی تخلیقی کارنامہ کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ وہ ایک اسلوبی تنقید کا نادر نگارخانہ ہے ۔ ایک ایسا طلسمی آئینہ جس میں زبان و بیان کے صد رنگ اور ادا و طرز کے ہزاروں روپ آپ کو ملیں گے ۔ لیکن جو چیز آزاد کے ہاں نہیں ملتی اور حالی کی دکان پر وافر مقدار میں دستیاب ہوتی ہے وہ عالمانہ فکر اور مجتہدانہ نظر ہے جو موضوع و ہیئت کے غیر منفک رشتہ کو ذہن میں رکھتی ہے ۔ اور شاعرانہ قدروں کا تعین کرتی ہے ۔ یہی وہ ناقدانہ بصیرت ہے جو فن پارے میں اجزاء کی کل سے علیحدگی پر نہیں بلکہ کل سے ارتباط پر نظر رکھتی ہے اور عصری مسائل کے تناظر میں نظریہ سازی کیلئے ایک غم گسار ساتھی کی طرح مددگار ثابت ہوتی ہے ۔

آزاد کی قوتِ تخیلہ اسلوب کی شاداب وادیوں، لفاظی کے شوریدہ جھرنوں اور روزمرہ حسنِ بندش کی چھوٹی چھوٹی سرحدوں سے آگے نہیں پرواز کرتی اور جب اشیاء کی ماہیئت، خیالات کے الجھے جنگلوں بالخصوص تاریخی واقعیت کی سنگلاخ سرزمین میں قدم رکھتی ہے تو اس کی بلند آہنگی دم توڑنے لگتی ہے ۔ غالباً آزاد کسی واقعہ کے متعلق تاریخی تفاصیل و جزئیات کی صحت و استناد کو نقد و نظر کے لئے کوئی ناگزیر ضرورت نہیں سمجھتے ہیں ۔ وہ تاریخی تنقید و نفسیات سے زیادہ اس حقیقت میں ایمان رکھتے ہیں کہ جمہور کے ذہن و تخیل نے واقعہ کو کس طرح جنم دیا تھا ۔ جس کا منطقی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فن کار کی شخصیت کا مکمل پن شدید طور پر مجروح ہونے لگتا ہے ۔ شبلی جو آزاد کے

رومانی طرزِ فکر سے بہ خوبی آگاہ تھے ۔ ان کی تاریخی تنقید کے متعلق لکھتے ہیں" وہ (آزاد) تحقیق کا مردِ میدان نہیں" مگر آزاد کے ہاں اسلوب و بیان کی جو پُر اسرار دلکشی پائی جاتی ہے اس کے اعتراف سے باز نہ رہ سکے۔ اپنے خاص مشرقی اصطلاح میں سراہتے ہوئے لکھتے ہیں" آزاد جو کچھ لکھتا ہے وحی معلوم ہوتی ہے"۔

یہاں ایک اہم نکتہ کی جانب توجہ دلانا ضروری ہو جاتا ہے جس سے میر کے شاعرانہ الیونیزم کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ اور اس سے آزاد کی بے تینہ رواداری کا ثبوت بہم ہو جاتا ہے۔ آزاد کی تنقیدی دنیا اپنی تمام تر قوت کے ساتھ اس دھارے سے باقی ہے جو ذاتی پسند کی کوکھ سے بہتا ہے۔ یہ ذاتی پسند رنگا رنگ عناصر ترکیبی کا مجموعہ ہے۔ اردو کے عام تذکرے سینہ بسینہ روایت، استاد کا ذوقِ انتخاب اور صحافت کا سا سطحی طرزِ فکر، شعری آہنگوں میں دینی و سماجی تحریکوں کی مسلسل جستجو اور فن کار کے باطنی وجود کی مضمر خواہشات میں تانک جھانک، آزاد کے ہاں ایسی کشمکش کا یکسر فقدان ہے۔

اخذ و استفادہ کا سماجی عمل بالخصوص انفرادی اور بالعموم اجتماعی نشاۃ و ارتقاء کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اگر فن کار نے اس کا اعتراف قلب کی گہرائیوں سے کیا ہے تو اس کی معنویت و خصوصیت اور بڑھ جاتی ہے۔ غالب نے کئی موقعوں پر میر سے اکتسابِ فیض اور اظہارِ عقیدت کا جو اعلان کیا ہے اسے یہ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا کہ یہ صرف شاعرانہ سلیقہ پسندی اور تہذیبی ہوش مندی ہے۔ جہاں عصا ساتھ نہ دے وہاں سینہ کے بل چلنے والے غالب یعنی غالبِ خود سر و خود بیں کا یہ کہنا کہ "میر کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں" "کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا" اور ناسخ کے مصرع پر تضمین "آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں" اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ میر نے غالب کے شعری آہنگ و اسلوب کو عمر کی ہر منزل میں نہ سہی کسی ایک حصہ میں بہر حال متاثر کیا تھا۔ مگر کسی کے محرمِ راز ہونے کا اعتراف تو کجا ہلکا سا اشارہ بھی نہ ہو تو اور اردو کے سر برآوردہ انشا پرداز کا اصرار ہو کہ میر کے اظہار و ابلاغ کا سارا نظام مستعار ہے۔ تو ایک گھناؤنا سوال دل و دماغ کی چار دیواری میں آوازِ بازگشت بن کر گونجنے لگتا ہے کہ کیا یہ ممکن بات ہے؟ جب تاریخی تفصیلات بطورِ سند پیش نہ کی گئی ہوں تو کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ واقعہ کی قلبِ ماہیت ہو گئی ہے؟ مگر درست اور مثبت جواب کے لئے میر کی فنی تخلیقات اور ان کی خلقی صلاحیتوں کا عرفان ناگزیر ہو جاتا ہے۔

مثلاً میر کے "نکات الشعراء" کو لیجئے، جہاں تک محسوس جسم و ضخامت کا سوال ہے، میر کا یہ ادبی کارنامہ دُبلا پتلا سا ہے۔ قامت میں کہتر اور صرف ایک سو دو شعراء کے مختصر ترجموں اور ان کے نمونۂ کلام پر محیط ہے۔ لیکن جو چیز اس کے قد و قامت کو بلند و بالا کرتی ہے اور عصری تذکروں میں اس کو خاص الخاص مقام عطا کرتی ہے وہ اس کی بے لاگ حقیقت نگاری ہے۔ اس کی متین و سرکش روح ہے۔ اس کی وہ تنقیدی حیثیت ہے جو جذبۂ رواداری کو آنکس لگاتی ہے اور اس کی تفکرانہ جراءت ہے جو وقت کی مسلّم الثبوت شخصیتوں کے طلسم کو توڑ دیتی ہے جنہوں نے بعض غیر صحت مند ادبی روایتوں کی ترویج و اشاعت کو اپنا مطمحِ زندگی بنا لیا تھا۔ "نکات" میں میر کسی باطنی کشمکش میں مبتلا دکھائی نہیں دیتے بلکہ تلخ تنقیدی محاکموں کے ساتھ منظرِ عام پر آتے ہیں۔ اس کی معنوی ضخامت اس تصور سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ میر نے اشارۃً یا مقدارؔ ان سمتوں کی نشاندہی کی ہے جن کے رشتے ہیئتی تنقید کے رومانی ادراک سے ملائے جا سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، میر کی بلند کوشی اور ناقدانہ جراءت کا اصلی تجزیہ

کرتے ہوئے لکھا ہے: "نکات" میں توقع کے خلاف تنقیدی مواد کافی سے زیادہ موجود ہے اور تنقید سخن کے علاوہ مختلف اشخاص کی سیرت کے متعلق اس قدر برہنہ اور دلشگاف رائیں پائی جاتی ہیں کہ پڑھ کر واقعی حیرت ہوتی ہے۔ ایک تو یوں بھی یہ بات زمانے کی فضا کے خلاف تھی پھر یہ بات اور بھی استزاد ہوئی کہ معاصرین پر رائے زنی کرتے ہوئے ان کی دل شکنی کی مطلق پروا نہیں کی ہے۔ (شعرائے اردو کے تذکرے، رسالہ اردو، ج: ۲۲، نمبر ۸۶)

ظاہر ہے کہ ایک دیدہ ور نقاد جس نے اپنی فکر کی تابانی سے فن تنقید میں نئی روایتوں کی ایسی شاندار عمارت تعمیر کی ہو وہ کیوں کر دوسروں کی پٹی پٹائی لکیروں کا پابند بنے گا۔ غالب جب رنگ بیدل ایجادی بیدل میں اچھے شعر نہ نکال سکے (تنقید نگاروں نے غالب کے اس دور کی شاعری کو مہمل گوئی میں شمار کیا ہے) سوال یہ ہے کہ میر کی شاعری دوسروں کی بیساکھی کے سہارے عظیم تجربوں اور اسراری قدروں کی شاعری کیسے بن گئی۔ بات یہ ہے کہ آزاد کی اس عملی تنقید کے پس پردہ ان کے استاد شیخ ابراہیم ذوق کا نظریۂ شعر کام کر رہا ہے جو آخری عمر میں بہ قول غالب "میری سے سودائی بن گئے تھے"۔

مگر بات یہیں تک ختم نہیں ہوگی، شاید عجلت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میر کے لب و لہجہ میں دراصل خود اعتمادی اور ان کے شعری اسلوب میں قطعی تبدیلی میر سوز سے ملنے کے بعد آئی ہوگی۔ اور ایسی مثالیں تاریخ شعر و ادب میں مل جاتی ہیں۔ مثلاً ولی کی شاعری ہی کو لیجئے، ولی کی شاعری آہنگ و شعور کی رونق سے بالکل آشنا نہ تھی، دروں بینی اور دور بینی جیسی اہم صفات سے یکسر محروم تھی۔ لیکن شاہ گلشن نے نقش سلیمانی کی تعویذ انہیں دی اور ولی نے بہ صد احترام اس کو اپنے بازو پر باندھ لیا تو ان کے شعر و سخن کو سرخاب کے پر لگ گئے۔ روایتی ناقد یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ولی کا آرٹ اور فن کی داخلی تحریک کے نتیجے میں ہوئے اظہار نہیں آیا ہے بلکہ ولی نے اپنے ادبی مرشد شاہ گلشن کی ایماء پر فارسی شعراء کے اظہار ذات کی کشاکش کو فارسی غزل کی طلسماتی فضا اور استعارہ کی پیچیدگی کو اردو زبان کے چوکھٹے میں فٹ کر دیا ہے یہ بھی غنیمت سمجھئے، اگر وہ یہ کہتے کہ ساری پونجی اور تمام کا تمام مال شاہ گلشن کا تھا مگر ولی نے کمال ہوشمندی سے اس پر اپنے نام کا لیبل لگا دیا ہے تو آپ ان کا کیا بگاڑ لیتے۔

جب تمدن پر زوال کی تاریک پرچھائیاں پڑنے لگتی ہیں، جب ایمان کی تیز روشنی دلوں سے رخصت ہونے لگتی ہے، جب نیکی اپنا نورانی چہرہ چھپا لیتی ہے اور جب زبان دل سے اپنا رشتہ توڑ لیتی ہے تب تنقیدی ادب میں ایسے معجزے رونما ہوتے ہیں۔ ایسے ادبی کرشمے ذاتی پسند اور سیاسی عوامل سے پیدا شدہ واقعات کے نتیجے میں بروئے عمل آتے ہیں جو سوانحی حالات اور تاریخی تفاصیل کی استعانت کے ایک جھونکے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمارے خیال میں میر کی شخصیت، ان کے وجدان و تفکر اور ان کے فن کے خارجی پیکر کا مطالعہ اگر میر کے صحیفۂ حیات اور ان کی نسلی عبقریت کی روشنی میں کیا جائے تو زیادہ نکھر آور ثابت ہوگا۔ اور اس طرح کی تحلیل سے ہمارے رشتۂ خیال کی گرہ بھی کھل جائے گی۔

میر کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے دو میر ملیں گے۔ ایک میر وہ جو تذکروں کے پراسرار دھندلکوں میں اور نیم روشن تنقیدی جھرمٹوں میں ماتمی لباس پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ میر بد دماغ ہیں، مسکین و قلاش ہیں جن کے پاس کھنؤ جانے کا کرایہ تک نہ تھا، وغیرہ وغیرہ۔ ان تذکروں میں سے چند مثلاً قائم کا "مخزن نکات" اور قدرت اللہ قاسم کا مجموعہ نغز "نکات کے جواب اور ردیں

تصنیف کئے گئے ہیں" اور یہ سامنے کی بات ہے جو فن پارہ مسلسل فکری اُبھار (UROE) سے بیگانہ ہوجاتا ہے اور شکستہ ذہنیت اور اعصابی تصادم کا شکار ہوگیا ہو، وہ بصیرت افروز نہیں ہوتا بلکہ اس کی تاریخی و تنقیدی صحت بھی مخدوش ہوجاتی ہے ۔ میر کی منفردانہ خصوصیات، ان کی سماجی حیثیت اور نسبی شرافت کے متعلق ان تذکرہ نویسوں نے جو تصور قائم کیا ہے اس سے میر کا شخصی امیج سخت مجروح ہوجاتا ہے ۔ ان کے خیال میں میر " فروغ محفل سخن پردازان " تھا مگر مجہول النسب تھا۔ اس کے مزاج کا اشتعال اور اس کی فنکارانہ نخوت و ادعائیت ہم عصروں کے دل میں آتشِ حسد و انتقام بھڑکانے کا موجب بن گئی تھی ۔ وہ تھا تو " اشعر شعراء " لیکن اس نے اپنی زبان کی نشتر سے ہر کسی کا دل چھلنی کر دیا تھا ۔ اور تو اور اس نے اپنے قدر دانوں اور سرپرستوں کو تک نہیں بخشا ۔ چنانچہ منتقمانہ جذبہ کی تسکین کے لئے ان بزرگوں نے میر کے مقابلہ میں میر سوز کو لا کھڑا کیا۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ فن کے ہر محاذ پر میر کو شکست دینے کا رجحان ان کے ہاں مسلط رہتا ہے ۔ اپنی تحریر کو اور پُرشکوہ بنانے کے لئے انہوں نے میر کے سوانحی حالات، سفر و حضر کے واقعات اور شعر و محفل کی روایات کو جو مخصوص آہنگ و لحن دیا ہے اس میں وہ بجھا ہوا زہر مضمر موجود ہے کہ دشمن کی صاف گوئی بھی اس کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے ۔

چند اقتباس ملاحظہ کے لئے درج ذیل ہیں ۔

۱ ۔ ایک دن نواب نے (آصف الدولہ) میر سودا کے بارے میں کہا کہ کیا مسلم الثبوت شاعر تھا ۔ میر نے کہا بجا، ع ہر عیبے کہ سلطان بپسندد ہنر است " نواب نے کہا ہم عیب پسند ہوئے ۔ یک نہ شد دو شد ۔ اتنے میں میر سوز کہ استاد حضرت عالی کے تھے، واسطے مجرے کے حاضر ہوئے ۔ نواب کے حکم سے میر سوز نے دو تین غزلیں پڑھیں ۔ نواب فلک جناب نے تعریف میں ان کے مبالغہ کیا ۔ دلیری میر سوز صاحب کی اور تعریف نواب کی ۔ میر کو بہت ناگوار گذرا ۔ میر سوز سے کہا تمہیں اس دلیری پر شرم نہیں آتی ، میر سوز نے کہا صاحب بندہ کیا ہے، میں شاہ جہاں آباد میں بھاڑ جھونکتا تھا ۔ کہا بزرگی اور شرافت میں تمہارے کیا تامل ہے، مگر شعر میر سے تمہاری کیا ہمسری ...... یہ کہہ کر میر اللہ کھڑے ہوئے اور گھر چلے آئے ۔

۲ ۔ جب نواب آصف الدولہ مر گئے تو میر نے دربار جانا چھوڑ دیا ۔ ایک دن نواب سعادت علی خاں کی سواری جاتی تھی کہ میر تحسین کی مسجد پر سرِ راہ بیٹھے تھے، سب اللہ کھڑے ہوئے میر اسی طرح بیٹھے رہے ۔ نواب نے انشا سے پوچھا، کون گدائے متکبر ہے جس کی تمکنت نے اسے اٹھنے نہ دیا ۔ انشا نے جواب دیا، جناب عالی یہ وہی گدائے شکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آتا ہے، گذارہ کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم، آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا ۔ (تذکرہ سرگزشت خوش زیبا)

۳ ۔ میر قمرالدین منت اصلاح کے لئے میر کے پاس اپنی غزل لے گئے ۔ میر نے وطن پوچھا، انہوں نے سونی پت بتایا، میر نے جواب دیا، سید صاحب! اردوئے معلیٰ خاص دلی کی زبان ہے، آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے ۔ اپنی فارسی وارسی کیا کیجئے (آبِ حیات)

دوسرے میر وہ ہیں جو ذکرِ میر کی واضح سطور میں اپنی شاندار خاندانی روایات اور درخشندہ نسلی امتیازات کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں ۔ میر کے دل پر ان کے بزرگوں کی روحانی فرزانگی اور خلقی برگزیدگی کے نقوش اس قدر گہرے ہیں کہ ان کی تابناکی کو زمانہ کی بدسلوکی، تاریخ کی فطری رفتار اور وقت کے جابرانہ تقاضے دھندلا نہ کر سکے ۔ میر نے اپنی یادداشت سے اپنے خاندان

سے روشن دماغ افراد کی جو قلمی تصویریں بنائی ہیں اور ان میں جو دلکش رنگ بھرے ہیں ان میں شخصی، قرمزی، طرح دوست رنگ ہیں جن سے جاذب نظر دھنک بنتی ہے۔ اس گلدستے میں میر نے جو پھول سجائے ہیں ان سے علم و شفقت، دانش و حکمت اخلاقی بلندی اور پاکیزہ نفسی کی بھینی بھینی خوشبو نکلتی ہے جو سرعت کے ساتھ فضا میں پھیلتی گئی ہے۔ اور اپنا فسوں سازی سے دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ ذکر میر میں ملکی و سیاسی حالات کی مصورانہ اور عرانی و تہذیبی معاملات کی عکاسی بھی بخوبی کی گئی ہے۔ اس کے تناظر میں میر کے ذہنی و جذباتی میلانات کا انکشاف بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ اور اس بات کا اظہار ہو جاتا ہے کہ میر کی سیرت و کلام میں بعد و اختلاف کا جو نئی کرتب دکھایا گیا ہے یہ سب میر کے انتہاپسند حریفوں کا افشغلہ تھا۔

مختصر یہ کہ میر کی ذات و صفات میں جو اخلاقی و روحانی آثار بہ صورت توارث در آئے ہیں ان میں سے وہ میر کی فنی و جمالی تخلیق و ارتقاء کے لئے اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ میر نے باپ سے اور اپنے مربی سالک میر امان اللہ سے سنا تھا کہ بیٹا زندگی اور فن میں آہنگ و لحن اور حلاوت و رفعت خلق کرنے کے لئے دو داخلی قوتوں کی شناخت و دریافت ناگزیر ہے، ایک عشق دوسری صفت غیور ہے۔ زندگی کی آخری منزل میں داخل ہوتے ہوئے باپ نے میر سے کہا کہ "بیٹا دنیا سے میری بے نیازی نے تمہیں نان شبینہ کا محتاج کر دیا ہے لیکن ورثہ میں تمہارے لئے ایک ایسی لازوال دولت چھوڑے جا رہا ہوں جو فن کے لئے مرکز ثقل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بیٹا غیور بنو، اس لئے کہ تمہارے خالق کی صفات میں سے ایک عظیم وصف اس کا غیرت مند ہونا ہے۔ جان من، میں یہ کیا دیکھ رہا ہوں، یہ کیسی آگ ہے جو تمہارے سینہ میں سلگ رہی ہے۔

اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ میر نے جتنی خلقی و صوری قدریں بطور میراث پائی تھیں ان میں سے دو پر یعنی عشق اور غیور پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ میر ان دونوں کو نئی امکانات کے ظہور کے لئے دوسروں کے مقابلہ میں بہت اہم سمجھتے ہیں ؎

میرے سلیقے سے میری نبھی زمانہ میں ، تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا ،
جاتا ہے یار تیغ بہ کف غیر کی طرف ، اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا
بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل ، اے چشم جوش اشک ندامت کو کیا ہوا
سرکسی سے فرو نہیں ہوتا حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

غور فرمائیے اور آپ ہی بتائیے کہ جس شاعر کو اپنی عزت نفس کا اس قدر جامع شعور ہو اور شان استغنائی ابتدائے عمر سے ہی اس کی زندگی کا مقدر بن گئی ہو، وہ دوسروں کے تعمیر کردہ کوچے سے گذرنا کیسے برداشت کر سکتا ہے جب کہ خود عمارت سازی کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو۔ اس طرح کی زلہ ربائی کیا اس کے ذہنی دیوالیہ پن اور فنی موت کے مترادف نہیں ہے؟ جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ کائنات کے مسائل الجھے جنگلوں کی طرح پیش منظر میں آتے رہتے ہیں اور زندگی کی نمود مختلف پیچیدہ شکلوں میں ہوتی رہتی ہے اور شاعر یا ادیب ان کی تعبیر، تشریح، تجزیہ اور عکاسی میں محو رہتا ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دوسروں کی عطا کردہ فنی بصیرت ایک فن کار کے لئے کب تک رہنما بن سکے گی اور اس کے ذریعہ کیا وہ اپنے فن پاروں میں ابدیت و آفاقیت کا رنگ پیدا کر سکتا ہے؟

آخر میں یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ میر کے اندازِ بیان کی تالیف کن عناصر ترکیبی سے ہوئی ہے ؟ یہ سوال جتنا آسان ہے اس کا جواب اسی قدر لاینحل بھی نہیں کہا جاسکتا ۔ چند قدروں اور تجربوں میں جن کی شاعری منفرد رہتی ہے، بعض عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہو اور گرد و پیش کے اثرات سے آزاد نہ ہو ایسی شاعری کے نہاں خانہ کا انشاد مشکل نہیں ہے لیکن چونکہ میر کی شاعری مکمل زندگی سے نمو پاتی ہے اور اس میں شاعرانہ طلسمی فضاؤں کے ساتھ انسانی کرب و اضطراب اور کشمکش و صلابت کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے ۔ لہٰذا کسی نے ماہِ چہار دہم کا عشق اس کا منبع بتایا ، کسی نے جنون، کسی نے ان کا لاہوتی خاندان اور افادیت پسندوں نے اس عہد کے معاشی و سیاسی بحران اور اجتماعی ناآسودگی میں میر کی انسانی کبریائی کے رازِ سربستہ کا سراغ لگانے کی کوشش کی ۔ لیکن ہر کوشش کی جامعیت و واقفیت کا اندازہ اس بات سے ہوجاتا ہے کہ اس کا رشتہ کسی نہ کسی دبستانِ فکر سے وابستہ ہے ۔

ہمارے خیال میں میر کے اسلوبِ شعر کا دھارا وجدان کے ان چشموں سے بہتا ہے جن کے سوتے انسانی شعور سے جا ملتے ہیں اور یہ وجدان و شعورِ انسانی مختلف ابعاد سے عبارت ہے ۔ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میر کی بلند جبینی و تہذیبی ہوشمندی، خیال و جذبہ کی صداقت، لہجہ کا خلوص اور باطنی احساسات جن کی حیثیت آفاقی ہوتی ہے انہی کے امتزاج سے میر کے شعار کا تہذیبی قوام تیار ہوتا ہے ۔ معنی کی موضوعیت وجود میں آتی ہے اور فن کی دوسری صورتیں ضمناً اور انسلاکاً از خود تشکیل پاتی ہیں ۔

لیکن میر کے نکتہ چینوں کی نگاہ اس ہمہ گیر شعور کی تہہ داری تک پہونچ نہ سکی ۔ اور میر کی سیرت و کلام سے ایسے معنے اظہار لائے گئے جن سے میر کی شخصیت کا حسن داغدار ہوجاتا ہو ۔ ان لوگوں نے میر کی تنہا پسندی اور کم گوئی سے خوب فائدہ اٹھایا ۔ کوئی کہنے لگا کہ میر ایک ریشمی خول کا باشندہ ہے ۔ اور کسی نے یہ فردِ جرم عائد کر کے ستم ظریفی کی کہ وہ ایک فوق البشر مخلوق ہے جسے اپنے چہرہ کے علاوہ دوسروں کے چہرے بالکل نظر نہیں آتے ۔ وغیرہ وغیرہ، شاید ایسے ہی کسی تجربہ نے غالب سے یہ شعر کہلوایا، ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے کہ ذاتی واقعہ غالب کے ہاں کائنات کی فریاد بن کر کس طرح گونجتا ہے ؂

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ ○ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

بقیہ صفحہ ۳ سے آگے

ان عیوب سے قطعی پاک ہے جو عام طور پر ان کی نظموں میں پائے جاتے ہیں ۔ اس کے لہجے میں خلوص اور درد مندی ہے ۔ اسلوبِ بیان دلکش ہے ۔ پوری نظم اثر میں ڈوبی ہوئی ہے ۔ انگریزوں کے پچھلے مظالم کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے ۔ اور آخر میں انہیں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وقت کا فرمان بدل چکا ہے اور اب ؂

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

ہماری آزادی کی جدوجہد کا کوئی موڑ ایسا نہیں جہاں اردو ادب نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو ۔ بقول سردار جعفری "اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تنگ محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین قومیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جاندار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا ۔" (مقدمہ کتاب "نوائے آزادی" مطبوعہ ۱۹۵۷ء)

جب بھی ساقی نے مجھے محروم ساغر کر دیا
تشنگی کو میں نے پھیلا کر سمندر کر دیا
لوگ اسے سمجھیں گے میری بے گناہی کا ثبوت
تم نے ہر الزام آخر کیوں مرے سر کر دیا
میں تمہاری آرزو میں سر سے پا تک دل بنا
تم نے مجھ کو سر سے پا تک دیدۂ تر کر دیا
یہ نہ سوچا زحمتِ پرسش سے غم بڑھ جائے گا
تم سمجھ بیٹھے بڑا احسان مجھ پر کر دیا
شکوہ کیسا جنبشِ لب کی بھی گنجائش نہیں
ضبط نے خود ایسا پیمانہ مقرر کر دیا
مانگتے ہیں عود و عنبر جس کی زلفوں سے مہک
اوجؔ اسی نے خلوتِ دل کو معطر کر دیا

اوجؔ یعقوبی

میرے فن کا، مرے افکار کا لہجہ بن جاؤ
خانۂ دل میں مچلتا ہوا نغمہ بن جاؤ
پھیلو ایسے کہ غمِ ذات کی تفسیر بنو
سمٹو اس طرح کہ ہستی کا خلاصہ بن جاؤ
دل کی چوکھٹ پہ رکو حرفِ تمنا بن کر
دل میں در آؤ تو جینے کا سلیقہ بن جاؤ
اپنے جلتے ہوئے ماحول کا شکوہ نہ کرو
بڑھ کے خود آپ سلگتا ہوا لمحہ بن جاؤ
تم کو معلوم ہو پہچان کی قیمت کیا ہے
تم مرے درد، مرے غم کا جو حصہ بن جاؤ
اپنی ناکامیٔ تدبیر کو الزام نہ دو
اپنی تقدیر کا خود آپ ہی شکوہ بن جاؤ
کس کے ہاتھوں میں ہیں اخلاص کے پتھر خسروؔ
دیکھنا ہو تو زمانے میں تماشہ بن جاؤ

امیر احمد خسروؔ

دردمندوں کی نگاہوں سے نہاں تھا کتنا
ہمہ تبسم سے میرا دردعیاں تھا کتنا
آئینے لے کے چلا آیا تھا زخموں کا ہجوم
مجھ سے انصاف طلب میرا جہاں تھا کتنا
کچھ نہ تھی بات عبث بات بڑھائی تم نے
مسئلہ جو بھی ہمارا تھا میاں تھا کتنا
اہلِ دنیا نے خریدا نہ مجھے خیر ہوئی
میں بھی بک جاتا مگر اُن کا زیاں تھا کتنا
رہ گیا پیچھے میرے عرصۂ ہستی میں
بے بھروسہ یہ جہانِ گذراں تھا کتنا
ہر تجلی کی ہوئی ہم پہ توجہ اکثر
اعتبارِ نظرِ دیدۂ وراں تھا کتنا

امانت ارشد

زینت اللہ جاوید

علامت نگاری

شاعری میں علامت نگاری کا آغاز ۱۸۸۵ء میں بطور تحریک سب سے پہلے فرانس میں ہوا تھا جس کے علمبرداروں میں بودلیئر، ملارمے، ورلین، ویلری، رمبو وغیرہ کے نام زیادہ اہم ہیں۔ لیکن شاعری کو موسیقی سے قریب لانے کی تحریک کا قائد ملارمے تھا جس کے نزدیک خالص شاعری انسانی اعصاب کو لطیف انداز میں اس طرح متاثر کرتی ہے جس طرح موسیقی کے سُر اور لَے۔ ملارمے شاعری میں اس قسم کے اشارے اور کنایے چاہتا تھا جس طرح موسیقی کے بولوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ لفظوں کو ان کے معمولی مضمون کے لئے استعمال کیا گیا تو یہ ایک بیش یا افتادہ بات ہوگی۔ شاعر کو یہ عامیانہ انداز نظر کبھی بھی قبول نہیں کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے "جب تم کچھ کہنا شروع کرو تو حقیقت کو بے قدری سے الگ کرلو۔ اگر معنی میں تعین پیدا ہو تو ادب ہی مرٹ جائے گا"۔ ایک جگہ اور اس نے کہا ہے "نظم ایک معمہ ہے جس کا حل پڑھنے والوں کو نکالنا چاہیئے"۔ گویا ملارمے کے نزدیک لفظوں کا صحیح اور موزوں استعمال لفظوں کو بذات خود معنی بنا دیتا ہے۔ لفظ چیزوں کی علامت بھی ہیں اور صفات بھی اسی لئے علامتی شاعری میں اشیاء سے زیادہ ان کی صفات کو پیش کیا جاتا ہے اور ایسے لفظوں کا انتخاب ہوتا ہے جو اشارتی انداز میں اوصاف کو اجاگر کر سکیں۔ رمز نگار شاعر معنی سے قطع نظر لفظوں کا شعور کرتا ہے جس کے معنی و مفہوم تک عام قاری کے ذہن کی رسائی نہیں ہو سکتی اور اس طرح شعر کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے لیکن اس وقت کے بعض علامتی شاعر شاعری کو اعلیٰ ترین تہذیب و تمدن کے پروردہ لوگوں کے لئے سمجھتے تھے۔ گویا شاعری میں وہ لوگ ترسیل کو ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ کلام پڑھتے وقت قاری کو یہ نہیں پوچھنا چاہیئے کہ منطقی لحاظ سے اس کا مطلب کیا ہے؟ بلکہ یہ دریافت کرنا چاہیئے کہ اس سے کیا اشارہ ملتا ہے۔ (بحوالہ فرانسیسی ادب، یوسف حسین خاں)۔ بہرحال علامت پسندی کی تحریک لفظوں سے وہ کام لینا چاہتی تھی جو موسیقی کے سُروں سے لیا جاتا ہے۔ چنانچہ علامت پسند شعراء نے نہ صرف لفظ کو اس کے اصل مفہوم سے منقطع کر کے علامت کا روپ دے دیا بلکہ زبان کو موسیقی سے قریب تر بھی کر دیا۔ علامت نگاری کے علمبرداروں میں بودلیئر، ملارمے اور ویلری وغیرہ تھے۔ لیکن علامتیت کی باضابطہ تحریک کو اشارہ دینے میں خود کلا کا زیادہ دخل ہے جس نے فرانس [illegible] سے لیکر دیوما لا تک علامتی زبان کا سراغ لگایا اور علامتوں کی نئی تشریح کر کے علامت کو داخلی مفہوم کا نمائندہ قرار دیا۔

جس طرح مغربی تحریکیں دنیا کی تقریباً تمام ترقی یافتہ زبانوں کی شاعری پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں اسی طرح بیسویں صدی کے اردو ادب پر بھی فرانس کی تحریکات کے زیر اثر ۱۹۴۰ء کے بعد اردو شاعری میں دردن بینی، موسیقی کی [illegible]

رمزی بیان کا عشق نظر آنے لگا ۔ اسی طرح پراسرار عناصر اور خوابوں سے دلچسپی بڑھنے لگی جن کے اظہار کے لئے وضاحت کے بجائے اشارہ وعلامت کا رجحان فروغ پانے لگا ۔ اشاریت پسند اردو شعراء نے ملارمے اور بودلیئر کی تقلید میں اشاریت کو شاعرانہ طرز اظہار قرار دیا ۔ انہوں نے شعر کو موسیقی کے قریب لے جانا چاہا اور اپنی تخلیقات میں ایک پُراسرار ماحول اور دھندلکا پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ وہ فرانسیسی اشاریت پسندوں کی طرح شاعری کو ابھی فنِ موسیقی سے ہم آہنگ تو نہ کر سکے البتہ انہوں نے ہر لفظ، ہر امیج اور ہر اشارے سے کئی مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجہ میں ابہام کا پیدا ہونا یقینی تھا ۔ جس طرح بودلیئر لفظوں سے یادوں کو برانگیختہ کرنے کا کام لیتا تھا اسی طرح جدید شعراء بھی ایسی علامتیں پیش کرنے لگے جن سے ہمارے ذہن میں صدیوں پرانی جو کہانیاں محفوظ ہیں ابھرنے لگتی ہیں اور ان کہانیوں کے کردار نئی حقیقتوں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں ۔ اس طرح فرائڈ کے نظریۂ تحلیل نفسی سے متاثر شعراء نے شعور کے ساتھ تحت الشعور اور لاشعور کو بھی تجزیے کا موضوع بنایا ۔ اور فن کے اسالیب کو دبی ہوئی جنسیت کے اظہار کا ذریعہ قرار دیا ۔ فرائڈ کے اس خیال سے متفق ہو کر " لاشعور کی تخلیقی جبت شعور کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتی ہے اس لئے علامتوں کی تخلیق لاشعور کے بطن سے ہوتی ہے " ان شعراء نے پہلی مرتبہ لاشعور کی پُراسرار اور دھندلی دھندلی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی اور ان کی پُراسرار امنگوں کو موضوعِ سخن بنایا ۔ لاشعوری جذبات کو بالترتیب اور تفصیل سے بیان کرنے کے لئے ردیف و قافیہ اور وزن کی پابندیوں کے ساتھ ضبطِ تحریر میں لانا مشکل تھا اس لئے اظہار و بیان کے لئے نئی تکنیک اور ہیئت کا استعمال کیا جانے لگا ۔ ذہن کی پیچیدہ رَو اور خیال کے موڑ کو بیان کرنے کے لئے موجودہ الفاظ جب ان کا ساتھ نہ دے سکے تو انہوں نے اپنے طور پر زبان میں بھی تبدیلیاں کیں ۔ اور داخلی جذبات و پیچیدہ خیالات کے اظہار کے لئے روایتی اصنافِ سخن، بحور و قافیے کی قید سے آزادی حاصل کر لی ۔ احساس، تجربہ اور شعور کو سادہ بیانیہ انداز کے بجائے مبہم اور ایمائی زبان میں پیش کیا جانے لگا اور اس طرح جو کلام سامنے آیا وہ اپنی ہیئت میں براہِ راست اظہار یا گفتگو کے بجائے تصویروں، استعاروں اور اشاروں کا ایک سلسلہ نظر آیا اور بعض شعراء نے جدید حد تک ذاتی علامتوں کا استعمال کیا جس کا عام ذہن متحمل نہ ہو سکا اور بعید از فہم علامتوں نے اردو شاعری میں اغلاق پیدا کر دیا ۔

اس طرح جدید ادب کے موضوعات اور ہیئت کو فرائڈ کے نظریات نے ایک نئی سمت بخشی اور فرائڈ کے نفسیاتی میلانات کی اشاعت اور مقبولیت نے اردو اشاریتی شاعری کا تحت الشعور اور لاشعور سے قریبی ربط پیدا کر دیا ۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ ہندوستانی معاشرے کے انتشار اور اندر کی سیاحت کے رجحان نے ان محرکات کو اور تقویت بخشی چنانچہ حلقۂ اربابِ ذوق سے تعلق رکھنے والے نوجوان ادیبوں کے ذہنوں میں مغربی ادب کے مطالعہ سے نہ صرف وسعت پیدا ہوئی بلکہ ان کی تقلید کا خیال بھی پیدا ہوا اور جدیدیت کا خاص اظہار آزاد نظم کا فروغ اور اس میں علامتی اظہار قرار پایا ، اور میراجی اردو نظم کے ایک اہم علامت پسند شاعر کی حیثیت سے سامنے آئے ۔ میراجی کی ذہنی تشکیل میں فرانس، انگلستان اور امریکہ کے جنس نگاروں، علامت نگاروں، اظہاریت پسندوں نے اہم حصہ لیا تھا ۔ جس لئے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ آزاد نظم کی صورت میں سامنے آیا ۔ انھوں نے پہلی بار اردو نظم کو داخلی کیفیات کے اظہار کے لئے منتقل کیا اور علائم کو اظہار کا وسیلہ بنایا ۔ اور نظموں میں جلوس، لیٹے ہوئے کھمبے، اٹھتے ہوئے ستون، سرسراہٹ، سلوٹیں وغیرہ جیسی جنسی علامتوں کو زیادہ اہمیت دی ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے نزدیک میراجی کی علامتیں جن تصورات کے گرد گھومتی ہیں وہ یہ

ہیں : ۱۔ دشنو مت کے بنیادی عقائد کا رمزی بیان ۲۔ جنسی تقاضوں کے اردگرد بننے والی علامتیں ۳۔ قدیم دراوڑی تہذیب کی یادوں سے ابھرتے ہوئے احساسات چنانچہ غار، جنگل، سمندر اور تاریکی انہی احساسات کے مظہر ہیں۔ میراجی تھے جنہوں نے پہلی بار ایسی علامتیں پیش کیں جن کا ملکی کلچر سے گہرا تعلق تھا اس کے علاوہ انہوں نے علامتوں کو بہت سی ذہنی، قلبی اور جنسی الجھنوں کی نقاب کشائی کرنے کے لئے بھی استعمال کیا اور اس طرح اردو نظم میں علامت پسندی کی ایک نئی روایت کو قائم کیا۔ جدید اردو شاعری میں علامت پسندی کا رجحان اور اندر کی دنیا کی سیاحت کا میلان میراجی ہی کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

اردو میں میراجی، ن۔م۔ راشد اور تصدق حسین کی پیروی میں جو آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں ان میں شاعر کے شعور اور لاشعور کی جھلکیاں زیادہ نظر آتی ہیں اسی لئے بیشتر آزاد نظموں میں اظہار اشاروں اور علامتوں کے تابع ہوتا ہے۔ اسی طرح فرائڈ سے متاثر بعض شعراء نے آزاد و معریٰ نظم میں تلازمات ASSOCIATION OF IDEAS کو بڑی اہمیت دی۔ آزاد تسلسل کو لاشعور یا تحت الشعور کی تصاویر کا آئینہ ٹھیرایا اور پڑھنے والوں سے بے نیاز ہو کر ذاتی توہمات کو دور از کار علامتوں سے ظاہر کیا جس کی وجہ سے قاری کے لئے شاعر کے ذہن تک رسائی ناممکن ہو گئی۔ اور بہت سی نظموں میں انھیں بے ربطی اور پراگندگی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ انفرادی نفسیات کا اظہار جس قسم کی علامتوں کے ذریعہ کیا گیا ان سے قاری کے ذہن کو کسی قسم کی تحریک نہ ملی اور ایسی تخلیقات ان کے لئے مبہم ہو کر رہ گئیں۔ جب کہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا " علامت تو قاری کو ایسے تصور کی طرف لے جاتی ہے جو تمام انسانوں کا مشترکہ تجربہ ہے اور یہی چیز علامت کی بقا کی ضامن بھی ہے۔ جیسے ہی علامت اپنے تصور سے جدا ہو کر کسی فرد کے آزاد تلازمۂ خیال کا حصہ بن جاتی ہے اس میں فریق ثانی کی شرکت کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اور جب علامت یا تجربے میں دوسرے کی شرکت ناممکن ہو تو اسے علامت کہنے کے بجائے مجذوب کی بڑ کہنا مناسب ہے "۔ (اردو شاعری کا مزاج، ص ۹۹ - ۲۸۹)

جدید اردو شاعری پر میراجی نے بڑے گہرے اثرات مرتسم کئے ہیں لیکن میراجی سے قبل بھی علامتیں اردو نظم میں موجود تھیں جس کی مثال اقبال کی شاعری ہے جس میں علامتوں کا استعمال بالقصد نظر آتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں ایسے علامتی الفاظ استعمال کئے تھے جن کے ساتھ شعری تصورات صدیوں سے وابستہ تھے۔ لیکن اقبال نے ان میں نیا مفہوم اور نئے معنی پیدا کئے۔ ان کے یہاں رائج علامتیں تو ملتی ہیں لیکن ان کا مزاج بدلا ہوا ملتا ہے۔ علامتی الفاظ ویسے بھی وقت کے ساتھ ساتھ اپنے مفہوم اور معنی بدلتے رہتے ہیں اور ہر عہد کا شاعر ادبی تقاضوں اور وقت کی ضرورتوں کی وجہ سے مخصوص الفاظ اپنے مقصد کو ادا کرنے کے لئے علامتوں کے تناظر میں رکھ کر استعمال کرتا ہے۔ اقبال کے اثر سے جدید شاعروں نے وقت کی ضروریات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اردو شعراء میں فیض نے بھی پرانی علامتوں سے اپنے اشارتی مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں نئی علامتیں بہت ہی کم ہیں جن میں نئی اشتراکی علامتیں سویرا، صبح، تاریکی، اجالا، سحر، وغیرہ بھی ان کے کلام میں ہیں۔ اقبال اور فیض نے نئی علامتوں سے اس لئے گریز کیا تھا کہ ان کے پیش نظر خاص مقاصد تھے۔ ان لوگوں نے پرانے علائم میں تغزلی موضوعات کو پیش کیا جن میں معنی ہر جگہ ایک ہی ملتے ہیں اور جو فوراً سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ آج بھی قارئین انھیں علامتوں کو پسند کرتے ہیں جن میں مشرقی مزاج اور اردو کی روایتوں کی پائیداری کا احساس ملتا ہے۔ اور جو سماج اور تہذیبی زندگی سے قریب ہیں۔

آج اردو شاعری میں اچھی اور نمائندہ تخلیقات کی کمی اس وجہ سے محسوس کی جاتی ہے کہ اب وہ ماحول نہیں رہا جس میں ہمارے ذوقِ ادب کی نشوونما ہوئی تھی۔ شاعری میں کبھی جو علامتیں مستعمل تھیں وہ نئے ماحول میں اپنی دلکشی کھو چکی ہیں اور نئی زندگی کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں اس لئے نئی شاعری میں پرانی علامتوں کی تکرار اور گھسے پٹے تلازموں کے بجائے تازہ تر علامتیں اور الفاظ کے تلازمے ملتے ہیں۔ علامتی اظہار اس دور میں اس لئے بھی قبول ہوا کہ یہ دور کوئی سبق یا پیام دینے کا نہیں ہے۔ خیال کی پہنائیوں کو اسیر کرنے اور ذات اور کائنات کے حدود کا تعین کرنے کے لئے شعر میں ماحول، فطرت اور اس کے مظاہر علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔ جدید طرز کی ایسی نظمیں جو بالواسطہ پیچیدہ اور علامتی طریقِ کار سے وجود میں آتی ہیں ان کے معنی و مفہوم تک رسائی اس وقت نہیں ہو سکتی جب تک کہ قاری شاعر کی داخلی کیفیتوں کی نمائندہ علامتوں کے تاثراتی پھیلاؤ اور نظم کی مجموعی فضا کو سمجھ لے اور خارجیت کے بجائے داخلیت پر توجہ نہ کرے۔

زبان اور اندازِ بیان میں تبدیلی بھی وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔ علامت پسند شاعر خارجی دنیا کے بجائے اندرون کا سیّاح ہوتا ہے اس لئے وہ اس دنیائے اندرون کو اپنی زبان میں پیش کرتا ہے اور وہ زبان جو جدید احساسات کے اظہار میں ناکافی ہوتی ہے اسے اس قابل بنانا چاہتا ہے جو جدید انسانوں کے تقاضوں کو پورا کر سکے اس طرح وہ عصری مسائل اور شخصی تجربات کے اظہار کے لئے علامتوں سے لدی ہوئی زبان استعمال کرتا ہے۔ بعض شعراء نظم کو متعدد امیجز کا ایک ڈھیر بنا دیتے ہیں جس کو سمجھنے میں نہایت دشواری ہوتی ہے۔ لیکن بعض محض ایک مرکزی امیج پر مبنی ہوتی ہے۔ شاعر امیج کو لفظوں میں منتقل کر کے ایک ایسی تخلیق وجود میں لاتا ہے جو ایک مکمل امیج پیش کر دیتی ہے۔ لیکن یہ امیج تصویر کی مانند صاف واضح نہیں ہوتا بلکہ وزیر آغا کے الفاظ میں اس میں ایک عجیب قسم کی برقی رَو ہوتی ہے جو قاری کے ذہن میں لاتعداد امیجز کو بیدار کرنے کا سبب بنتی ہے۔ نظم میں الفاظ پر زور اس لئے بھی دیا گیا ہے کہ لفظ میں ظاہری معنوں کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے اندر معنویت رکھتا ہے۔ اور یہ لفظ جب بطور علامت کے استعمال ہوتا ہے تو وہ اس سے بھی زیادہ معنی دے جاتا ہے جو شاعر کا مقصد ہوتا ہے۔ اس طرح شاعر علامت کی مدد سے بہت سی باتیں بے کہے بھی کہہ دیتا ہے۔ اب اس لفظ کی گہرائی تک جانے کیلئے غالب کی یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ ؎

بہرِ بشناس کہ ہر نکتہ ادائے دارد　　محرمِ آنست کہ رہ جز بہ اشارت نزود

غالب نے اپنے شعری لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہا تھا۔ وہ لفظ کی قوت سے پوری طرح آگاہ تھے لیکن بعض اوقات لفظ بھی معنی و مفہوم کا ساتھ نہ دے پاتے اور تندیٔ صہبا سے آبگینہ پگھلنے لگتا تھا اور کبھی تو یہ عالم ہوتا ہے کہ ؎

عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا۔

غالب نے اپنے احساسات و جذبات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے جس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں انھیں عام ذہن نہ سمجھ پائے اور ان کی زبان پر اعتراضات کئے گئے۔ اتنا ہی نہیں غالب نے بعض اشعار اس قدر سیدھے سادے انداز میں کہے ہیں کہ ان میں بھی ابہام پایا جاتا ہے۔ اس لئے انھیں کہنا پڑا تھا گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل۔ لیکن اس کے برعکس ان کے کلام میں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا　　میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کی بھی کیفیت پائی جاتی ہے۔ غالب اپنے افتادِ طبع کی کیفیت سے مبہم تھے۔ لیکن جدید شاعر ارادی ابہام کا قائل ہے۔ وہ ابہام اور غیر قطعیت سے

شعر کے معنوی حسن میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کا ابہام معنی خیز ہوتا ہے ۔ اس کے نزدیک خیال مکمل ابلاغ کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ وہ محض سطح پر حسیاتی تجربات کی پیکر تراشی کرتا ہے ۔ اور اس طرح لفظوں کی نشست سے ایک ایسا "بے بدنی وجود" وجود میں آتا ہے جو شعری فضا میں سائے کی طرح پھرتا رہتا ہے جس کو پکڑنے کی کوشش نئی شاعری کو سمجھنے کی کوشش ہے ۔ اگر معنی و مفہوم اپنے پورے خد و خال کے ساتھ نمایاں ہو جائیں تو شعر کے حسن میں فرق آسکتا ہے یہی وہ چیز ہے جسے ابہام کہتے ہیں ۔ اور جو شعر کا حسن قرار دیا گیا ہے۔ اقبال کے نزدیک بھی " بر ہنہ حرف نگفتن کمال گویائی " ہے ۔ لیکن بعض اوقات جدید شعراء نظم کی فضا میں نامانوسیت کی دھند اس قدر پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے تجربات کو ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے ۔ استعارات اور علامات بذات خود اپنے اندر وسیع امکانات رکھتے ہیں اور ان کا استعمال خوش آئند علامت ہے لیکن بعض نئے شعراء اپنی تخلیقی کاوشوں کا مقصد اپنی حسیاتی تسکین اور آسودگی سمجھتے ہیں اور اپنے احساسات و خیالات کو ذاتی علائم کے ذریعہ صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتے ہیں جو عام قاری کے لئے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں ۔ اب یہ قاری کا فرض ہوتا ہے کہ وہ فن کار اور اپنے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے ۔

جدید شاعروں کے کلام سے علامت پسندی کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں جن کی روشنی میں بات کچھ آگے بڑھائی جا سکتی ہے ۔ ملاحظہ کیجئے ۔

(۱)

وزیر آغا

ڈھلوان

ایک سنگی ہیبت آواز
پھر چابک کا شور
کھڑکھڑاتے زنگ آلودہ سے پہیوں کی صدا
اور میں آواز کے آگے جُتا !
میری آنکھوں پہ نقاب
میرے منہ میں خاردار آہن کی جیب
میرے بازو
سخت چمڑے کے سیہ رستوں کے
برہم جال میں جکڑے ہوئے
اور میرے جسم
میرے چاروں رفیق
گھٹنوں کے پتھروں سے بے خطر
خندقوں سے بے نیاز

(۲)

یوسف اختر

برف کی قاشیں

برف کی قاشیں
گلاب کی پنکھڑیوں پہ رکھی ہیں
استخوانی زنجیریں
دودھ سے بھی گورے
پھولوں کی نس نس میں
پیوست ہو رہی ہیں
سورج کی اک تیز شعاع
ہولے ہولے
چاند کے اندر پگھل رہی ہے
سورج کی اک تیز شعاع
چاند کے اندر . . . . . چاند کے باہر .

(۳)

شمس الرحمٰن فاروقی

کہ پیش آدم بہ پلنگے سوار

سبز ستو ہڑ کی جھاڑی کے نیچے
میں نگین کانٹوں کے بستر پہ لیٹا ہوا
سیکڑوں سال تک
سرخ سورج کے چہرے پہ نظریں گڑوئے
اپنے ناخن سے ارض و سما کا جگر چیرنے
اور جلاتی ادنیاپئوں کو پڑھنے کا کہنہ پُراسرار فن
سیکھتا اور سکھاتا رہا۔

(۴)

ندا فاضلی

بے خواب نیند

نہ جانے کون وہ بہروپیا ہے
جو ہر شب —
مری تھکی ہوئی پلکوں کی سبز چھاؤں میں
طرح طرح کے کرشمے دکھایا کرتا ہے!
پشتی سرخ لپیٹ —
جھومتی ہوئی ڈالی —
چمکتے تال کے پانی میں ڈوبتا پتھر!
ابھرتے پھیلتے گھیروں میں تیرتے خنجر!
اچھلتی گیند ربڑ کی
سہمے سہمے دو ہاتھ
سلگتے کھیت کی مٹی پہ ٹوٹتی برسات
عجیب خواب ہیں یہ!!
بنا وضو کئے سوئی نہیں کبھی میں تو
کسی روز اپنی بھابی کے چمکتے پازیب توڑ کر رکھ دوں
بڑی ہی شریر ہے ہر وقت شور کرتی ہے
کسی طرح سہی، بے خواب نیند تو آئے
گھڑی گھڑی کی مصیبت سے جان چھوٹ جائے۔

(۵)

قاضی سلیم

کھلونے

چھن چھنا چھن ناچتی گڑیا
ٹھمکتی تالیوں پر تالیاں دیتی بندریا
گولیاں بڑھ کر تڑاتڑ داغتا انگریز
وحشی ریچھ اچھلتے
بت ہاتھی سر ہلاتے جھومتے
اک نمائش گاہ میں سب موہتے
روز و شب کے ہیرپھیر اپنے گھر میں کھلتے رہے
اور رو میں
کل کے گھوڑوں پر سوار، آباد ویرانوں سے اڑ کر
اک طلسمی شہر میں پہنچیں
لیکایک یوں لگا
جیسے وطن میں ٹوٹ کر سب آگئیں
روز و شب کے ہیرپھیر اپنے گھر میں کھلتے رہے۔

نو دمیدہ اور ننھے پھول
اپنی تختیاں لیتے اٹھلاتے
— بے نیازانہ بڑھے
دل لبادہ و سال کے
سر ایک روزن سے نکل کر
یک بیک اگلی صفوں میں آگئے
روز و شب کے ہیرپھیر اپنے گھر میں کھلتے رہے،

(۶)

افتخار جالب

لامرکزیت اظہار

قدامت پسند کابوس شیشہ در شیشہ
شیفتہ مدور سیاہ سورج کے درمیاں
گرد باد تکذیب میں اڑتا ہے

کا ہے چوراہے میں چکاچوند، مندمل زخم
خوفناک گھمبیر چشم بدور تیرہ مجبس
حرام مغز استخوان میں ہے
شدید شعور رکیس درد، ہر جزو متصل، ٹوٹنے کے لگ بھگ
تڑاخ اٹھتی ہے
کیا تنگ ظرف شدہ الرجک جمیع تعظیم دل پھپھولے، سفید
خاکستری پپوٹوں میں دم بخود دائمی شراروں کی آنکھ مچولی
میں تنہا مرحلی غنودگی کا شکار
تھا مرا کلا عدد و غفلت مآب ٹھیری ہے۔ ■■

(۷)

شہریار

یہ تمنا عبث

اسے دیکھنے کی تمنا عبث
وہ کیسا لگے گا؟
ابھی دھندلی دھندلی

لکیروں نے چہرہ بنایا نہیں
ابھی اس کی آواز بھی ریشہ ریشہ ہے
اس نے گزرتی ہوئی ساعتوں کو بتایا نہیں
ابھی برف کی تہہ کے نیچے ہیں آنکھوں کی جھیلیں

ابھی جھیل کی مچھلیاں
زرد سورج کی کرنوں سے محروم ہیں۔
■■

★

زندگی میں تغیرات ہوتے رہتے ہیں جن کے اظہار کے لئے پرانے الفاظ ساتھ نہیں دے سکتے۔ ماضی کے فلسفے نئے نظریات کی روشنی میں سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ ماحول کی تبدیلی ایک حساس ذہن کو بیدار کر دیتی ہے اور نیا انداز نظر پیدا ہو جاتا ہے۔ سچائی کی تلاش میں جدید شاعر نہ اب تہذیب و اخلاق پر بھروسہ رکھتا ہے نہ مذہبی عقائد پر، بلکہ وہ لاعلمی سے ایک نیا علم تلاش کرنا چاہتا ہے حقائق کا برملا اظہار اور سچائی کی تلخی انسان کو برداشت نہیں ہوتی۔ تہذیب و اخلاق کے دائرے میں گھیرے ہوئے لوگ یقیناً اس عہد کی عریانیت جس کا تعلق حقیقت سے بھی ہے بالکل برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ اپنے ظاہری چہروں سے وہ نہیں ہوتے جو اندر ہوتے ہیں اور دنیا کا ہر انسان اس طرح ایک دوسرے کو دھوکہ دیتا رہتا ہے۔ لیکن جب کوئی تمام رنگین نقابوں کو پھینک کر سر بازار ننگا ہو جاتا ہے تو ہدف ملامت اور طنز کے تیر و نشتر کا نشانہ بن جاتا ہے۔ نئی اردو شاعری کا بھی یہی حال ہے اس میں اب وہ موضوعات نہیں ملتے جو کبھی ادب کے لئے لازمی قرار دیئے گئے تھے۔ نئی تہذیب نے جن رجحانات کو راہ دی ہے ان کا اظہار برملا ملتا ہے۔ جس کے باعث قدامت پرستوں نے اس کی پرچھائیوں کو نظر انداز کر کے صرف عیوب و نقائص پر ہی نظر رکھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ برائیاں جو نئی شاعری کے موضوعات میں داخل ہو چکی ہیں خود ان لوگوں میں موجود ہوتی ہیں جنہیں وہ یوں بے نقاب نہیں دیکھ سکتے۔ جنس مخالف کے لاشعور کی گہرائیوں میں خوفناک خوابیدہ آرزوؤں اور خواہشات کو بیدار کرنا بھی مستحسن فعل

قرار نہیں دیا جائے گا بلکہ آج اردو شاعری صرف ظاہری خط و خال ہی کو واضح الفاظ میں تصویر کا روپ نہیں دے رہی ہے بلکہ لاشعوری کیفیات کو بھی علامتی زبان میں پیش کر رہی ہے۔

نظم "بے خواب نیند" میں شاعر نے کس خوبصورتی سے ایک ایسی لڑکی کی لاشعوری کیفیات کا اظہار علامتوں کے ذریعہ کیا ہے جو اپنی عمر کے ایک پنچ پر نہ چاہتے ہوئے بھی خوابوں کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے کبھی کبھی ایک اشارہ بھی جان لیوا ثابت ہوتا ہے جو اس کے جذبات میں ہلچل مچا دیتا ہے۔ یہ وہ خواب ہے جسے اس کے اپنوں ہی میں سے ایک مثالی حقیقت کے روپ میں دیکھ چکا ہے اور جب اسکی پازیب شور کرنے لگتی ہے تو ہزاروں کوششوں کے باوجود وہ لڑکی اپنا دامن ان خوابوں سے نہیں چھڑا سکتی جو اس کے لاشعور میں جاگ اٹھتے ہیں اور خوابوں میں کسی بہروپئے کا ظہور ہو جاتا ہے۔ شاعر نے اپنی نظم میں جو علامتیں لاشعوری کیفیات کی ترجمانی کیلئے استعمال کی ہیں ان کو پوری طرح واضح کرنے کے لئے نظم میں 'بھابی' اور 'پازیب' کے الفاظ زیادہ مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ علامتوں کو استعمال کرکے ان کو سمجھنے کے لئے اس طرح اگر واضح اشارے ہوں تو ایک حد تک قاری کے ذہن کی رسائی فن کار کے ذہن تک ہو جاتی ہے لیکن افتخار جالب کی نظم "نفس لامرکزیت اظہار" بعید از فہم ہے جس میں لفظوں کو موسیقی سے قریب لانے اور اشاروں کنایوں سے اظہار مطلب کی کوشش کی گئی ہے جنھیں سمجھنے کے لئے نہ صرف یہ کہ لفظوں کے معنی و مفہوم تک رسائی ہونی چاہیئے بلکہ علم حیاتیات سے متعلق اصطلاحوں کا جاننا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ صاف گو الفاظ اچھی شاعری کی پہچان نہ سہی لیکن مہر بہ لب الفاظ بھی تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ لفظ اگر معنی کے غماز ہوں تو کچھ بات پیدا ہو بھی سکتی ہے۔ ایک مخصوص طبقہ اس انداز کو ممکن ہے سراہے لیکن یہ چیز سب کے لئے نہیں ہے۔ یہ ایک تجرباتی نظم ہے اور بس جو نئی شاعری میں گاہے گاہے اپنا جلوہ دکھاتی رہتی ہے۔

علامتی نظموں کو سمجھنے کے لئے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ نئی شاعری میں براہِ راست اندازِ بیان اختیار نہیں کیا جاتا۔ نظم "کھلونے" میں قاضی سلیم جو بات کہنا چاہتے تھے وہ انھوں نے براہِ راست نہیں کہا ہے بلکہ اسے ایک فکری پردے میں رکھ کر اس کے متبادل تمثیلی صورت میں کھلونے کا سہارا لے کر اور اس کو ظاہری بنیاد قرار دے کر مفہوم ادا کر دیا ہے۔ اس طرح شاعر نے ہمیں بھی نمائش گاہ میں محو کرکے ہمارے سامنے ماضی اور حال کو بے نقاب کر دیا ہے۔

جس طرح ہم اکثر فلموں میں دیکھتے ہیں کہ کٹھ پتلی کے ناچ کے وقت ہیرو اور ہیروئن ناچ دیکھ کر تصوراتی دنیا میں کھو جاتے ہیں اور انھیں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ بذاتِ خود اس ناچ میں شریک ہیں یا خود ہی ناچ رہے ہیں۔ لیکن عام تماشائیوں کے ساتھ یہ بات نہیں ہوتی۔ وہ صرف ناچ دیکھ کر ہی محظوظ ہو جاتے ہیں۔ ہیرو اور ہیروئن تصوراتی دنیا میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ کٹھ پتلی کے ناچ سے ان کے جذبات برانگیختہ ہو جاتے ہیں اور ان کے احساسات و جذبات کٹھ پتلیوں کے ان جذبات سے جن کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کی ہر ایکشن سے کوئی معنی اخذ کر جاتے ہیں۔ شاعری میں علامتوں کا بھی یہی رول ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی قاری اس کے سرسری مفہوم سے گذر جائے لیکن وہ شخص جو ان محرکات کو سمجھ لیتا ہے جو اس شاعری کا موجب بنے ہیں تو وہ الفاظ اور علامتوں کی گہرائی میں پہنچ کر جو ہماری زندگی اور تڑپ کے لئے استعمال کئے گئے ہیں شاعری کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ کٹھ پتلیوں کے جذبات کو پیش کرنے کے لئے جس طرح سے زبان و بیان کے اظہار کا کام لیا جاتا ہے یقیناً وہ ہماری سمجھ سے

بالاتر ہوتا ہے لیکن وہ اشارے جو کٹھ پتلیاں کرتی ہیں ہم ان کی مدد سے ان کی زبان بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر وہ بے تکی حرکتیں کرنے لگ جائیں تو ظاہر ہے ہم انھیں سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ ہمارے نئے شعرا بھی بعد شوق ہماری زندگی کی سچائی اور تڑپ کو پیش کرنے کے لئے بندھی ٹکی زبان اور رسمی تراکیب سے گریز کریں لیکن وہ نئے الفاظ اور علائم کے ساتھ ایسے اشارے بھی ضرور دیں جن کو ہم سمجھ بھی سکتے ہوں۔ یہاں ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہمارا شاعر اسٹیج پر آ کر اشاروں کی زبان میں شاعری کرے۔ بلکہ یہاں لفظی اشارے کی طرف اشارہ ہے جسے ہم انگریزی میں [illegible] کہتے ہیں۔ اس کی مثال ندا فاضلی کی نظم 'بے خواب' میں ہے جس میں 'بھالی' اور 'پازیب' کا شور ہماری دستگیری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

لاشعوری کیفیات کی ترجمانی اور زندگی کے دیگر مسائل کو جدید شعرا نے جس انداز سے نظم آزاد و معریٰ میں پیش کیا ہے ان میں کچھ ایسی ہیں جو اجالے میں لکھی گئی ہیں، اور جن کا سمجھنا اتنا دشوار نہیں ہوتا۔ کچھ نظمیں ایسی ہیں جنھیں تاریکی میں لکھا گیا ہے اور جن کا سمجھنا محال ہے۔ لیکن وہ نظمیں جو "کچھ دھندلکے" میں تحریر کی گئیں یقیناً قابلِ تحسین ہیں جہاں معمولی فکر و نظر کی قندیل جلانے سے معنی و مفہوم کا چہرہ اجالے میں نظر آنے لگتا ہے اور نظم پوری طرح روشنی میں آ جاتی ہے۔ ہمارے علامت پسند شعرا نے نئی اور اچھوتی علامتوں کے استعمال سے اپنے تجربات پر گہرا غلاف چڑھا دیا ہے۔ جب کہ علامت کا پیرہن تو وہ چست و تنگ ہونا چاہیے جس سے انگ انگ چھلک پڑے اور جسے دیکھ کر فراق کی زبان میں یہ کہا جا سکے ؎

تجا تصورِ بیسوں مجسمہ سے کوندے دی زفرق تا بقدم اک دبی سی آگ ہے تو

اس مضمون میں زیادہ تر علامتی نظموں ہی کا ذکر کیا گیا ہے۔ جہاں تک غزل کی زبان و بیان کا تعلق ہے بعض غزل گو شعرا نے زبان و بیان کے سلسلے میں ابھی تک روایت کا دامن نہیں چھوڑا ہے لیکن عصری آگہی کے لئے نئے الفاظ کو علامتی پیرائے میں استعمال کر کے استعاراتی مفاہیم پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ نئی غزلوں سے علامت پسند اشعار کی مثالیں درج ذیل ہیں:

دن کے کاندھے پہ دہکتے سورج کی صلیب — رات کی گود میں ٹھٹھرا ہوا ماہتاب ملا — (سلطان اختر)

حالانکہ ابر ٹوٹ کے برسا تھا پیاس پر — لیکن نگاہ ابھی تک جمی ہے گلاس پر — "

کوئی پتھر ہی کسی سمت سے آیا ہوتا — پیڑ پھل دار میں اک راہ گزر کا ہوتا — راج نرائن راز

لذتیں قرب کی اے کاش ہمیشہ رہتیں — شاخِ صندل سے کوئی سانپ ہی لپٹا رہتا — "

ہوا میں عکس ہے ٹوٹے ہوئے ستاروں کا — کوئی نشان تو باقی رہا سہاروں کا — زیب غوری

اب خاک بھی نہیں ہے سمندر کی گود میں — کاغذ کی کشتیاں تھیں بہا لے گئی ہوا — بشر نواز

دھوپ نے ناخن ڈبوئے ہیں گلوں کے خون میں — زخم خوردہ خوشبوئیں پھرتی ہیں سر پٹکے ہوئے — عمیق حنفی

ہری ڈالوں والے پیڑ کے پتے کیسے پیلے ہیں — کس نے دیکھا کون روگ ہے چھپا ہوا جڑوں میں — "

فصیلِ شہر تو اب راستہ نہ روک میرا — بلا رہا ہے یہ جنگل ہرا بھرا مجھ کو — کمار پاشی

رات چنگھاڑتی تھی چاروں طرف — سارے [illegible] میری پناہ میں تھے — "

ہے تا حدِ نظر نیلا سمندر — بدن میں پھڑپھڑاتا ہے کبوتر — "

مر گیا سانپ ندی خشک ہوئی　　ریت کا ڈھیر اٹھایا جائے　　ندا فاضلی
دیکھتے ہی دیکھتے لاشہ زمیں پر آ پڑا　　تیز اور نوکیلی منقاریں بدن میں گڑ گئیں　　عتیق اللہ

چونکہ علم نفسیات میں رنگوں کی خاص اہمیت ہے جو انسان کے مختلف COMPLEXES کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نئے شعراء نے رنگوں کو بھی علامتی مفہوم دے کر انھیں نہایت کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجئے۔

سرخ بادل سے سفیدی برسی　　آگ پانی کا حلق آ پہونچا　　باقر مہدی
سبز کی سمت تھا سفر جاری　　سرخ ہوتے ٹھہر گیا ہوں میں　　عادل منصوری
جا بجا سرخ بلب روشن ہیں　　اور سرگوشیوں کا لشکر ہے　　شہریار
کالی برفیلی ہوا سے پیڑ پتے جم گئے　　کن پرندوں کے تعاقب میں حسین موسم گئے　　حامدی کاشمیری
زرد بھی، ابیض بھی، نیلا بھی، سیاہ و سرخ بھی　　ایک ہی چہرے پہ منظر نت نیا پانی کا تھا　　نشتر خانقاہی
اب کے بسنت آئی تو آنکھیں اجڑ گئیں　　سرسوں کے کھیت میں کوئی پتہ ہرا نہ تھا　　بل کرشن اشک
حقیقت سرخ مچھلی جانتی ہے　　سمندر کیسا بوڑھا دیوتا ہے　　بشیر بدر
پکے گیہوں کی خوشبو چیختی ہے　　بدن اپنا سنہرا ہو چکا ہے　　”
مجھے ان نیلی آنکھوں نے بتایا　　تمہارا نام پانی پر لکھا ہے　　”

ان کے علاوہ اردو غزل میں کانٹے، دشت، سناٹا، آندھی، جزیرہ، برف، بارش، دھوپ، سورج، دریچہ، پردہ، شلف، شوکیس، سمندر، رہگذر، سراب، بادل، بستر، چادر، بدن اور اس قبیل کے بہت سارے الفاظ ملتے ہیں جن کے اندر اشارتی مفاہیم جاگتے نظر آتے ہیں اور جن میں ابہام کا حسن بھی ہوتا ہے۔ یہ وہ علامتیں ہیں جو نئے شعراء نے ذہنی کیفیات کے اظہار کے لئے حواسِ خمسہ کی رعنائی میں وضع کی ہیں جن کا تعلق خود ہمارے ماحول اور قریبی زندگی سے ہے۔

نئی شاعری میں اب وہ الفاظ جو شجرِ ممنوع کی حیثیت رکھتے تھے بلا تکلف استعمال کئے جارہے ہیں۔ نئے شعراء نہ صرف ٹھٹھرے ہوئے لفظوں کو کاندھے پر اٹھائے دھوپ کی کھوج میں نکلے ہوئے ہیں بلکہ ہر وہ لفظ جو کسی جذبے یا احساس کو پیش کرنے میں مدد ثابت ہوتا ہے اسے بھی قبول کر لیتے ہیں۔ اس طرح اردو شاعری میں ذخیرۂ الفاظ بھی وسیع ہوتا جارہا ہے۔ ایک نقش میں سو عکس دیکھنے کیلئے نئے شاعر لفظوں کو سلیقے سے برتنا بھی جانتے ہیں ورنہ الفاظ کا غیر معقول استعمال کسی کیفیت کی صحیح عکاسی نہیں کرسکتا۔ غالب نے غم کی کیفیت کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ غور کیجئے ؎

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا　　جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غالب نے کیفیتِ غم میں جو شرار دیکھا تھا نیا شاعر اپنے ساتھ اوروں کو بھی دکھانا چاہتا ہے اور رگِ سنگ سے لہو ٹپکانے کے لئے وہ لفظوں کی تلاش میں ہے وہ لفظ جو اپنے اندر معنی کی بھرپور قوت رکھتے ہیں۔ وہ معنی جو خدا کے مشابہ ہوتا ہے جو بذاتِ خود سامنے نہیں آتا بلکہ مختلف طریقوں سے اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے۔ کچھ لوگوں کا صرف اتنا عقیدہ ہے کہ الفاظ کے اندر معنی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ لیکن کچھ لوگ عارف و صوفی ہوتے ہیں جو معنی و مفہوم کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن حقیقی فنکار وہی ثابت ہوں گے جو الفاظ و علائم کے پردوں سے معنی کے حقیقی معبود کو باہر لے آئیں۔

حیدرآباد کے شاعر

(۸)

احسان علی عرشی

سنہ ۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے جلوۂ تذکرہ کا سال

سید احسان علی عرشی، سنہ ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ اتر پردیش کا ضلع لکھنؤ اُن کے آباء و اجداد کا وطن رہا۔ ابتدائی اور ثانوی درجہ کی تکمیل لکھنؤ کے درس گاہوں میں ہوئی۔ اُردو کلاسیک کے شوق کو والد اور نانا (سید نجف علی شاہ تلمیذ وزیر علی صبا لکھنوی) نے پروان چڑھایا۔ لکھنؤ کے شعری ماحول نے عرشی کی فکرِ سخن کو مہمیز کیا، عزیز لکھنوی اور آرزو لکھنوی سے مراسم استوار ہوئے مشاعروں میں شرکت نے شعر و شاعری کے آداب سکھائے۔ جگر بسوانی تلمیذ امیر مینائی سے عرشی نے رموزِ شعر کا علم حاصل کیا۔ فطری میلان کے سبب جلد ہی شہرت حاصل کرلی۔ علی گڑھ میں بی اے تک تعلیم پائی پھر حکیم سید علی سشن جج ورنگل کی طلبی پر حیدرآباد آئے، حکیم صاحب کے داماد بنے اور محکمہ رجسٹریشن میں سب رجسٹراری پر تقرر ہوا۔ ان دنوں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ فانی بدایونی، علی اختر، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، تراب یار جنگ سعید، اور اصغر یار جنگ سے عرشی کے معاصرانہ روابط رہے، حیدرآباد کی شعری اور علمی محفلوں میں تقریباً نصف صدی سے قدر و منزلت کے ساتھ مدعو کئے جاتے رہے۔ کلام کا انتخاب "ادبی ٹرسٹ" کے زیرِ اہتمام عنقریب شائع ہو رہا ہے۔ عرشی، دبستانِ لکھنؤ کے شعر و ادب کا کلاسیکی شعور رکھنے والے وضعدار، خدا ترس خوش نہاد بزرگ ہیں۔ شاعری کی جملہ اصناف پر استادانہ دیرک رکھتے ہیں۔ مزاج میں شرافت، سادگی اور انکساری کے ساتھ لکھنوی اور حیدرآبادی روایات کا دلنشین عکس پرتو فگن نظر آتا ہے۔ (و، غ)

○

وہ مصروفِ گلگشت ہیں یوں چمن میں　　کہ جیسے رواں روح رہتی ہے تن میں
کہاں وہ لطافت گلُ و یاسمین میں　　جو پوشیدہ ہے مرے داغِ کہن میں
مرے دل کے زخموں کے ٹانکے نہ ٹوٹیں　　سمجھ کر کوئی مسکرائے چمن میں
مسرت کی اک سانس بھی ہے غنیمت　　میسر ہو گر اس جہانِ محن میں
بہاریں بھی اُن کے قدم چومتی ہیں　　لطافت ہے کس درجہ اُس گلبدن میں
مبارک کہ عرشی تیری شاعری کا　　بہت ذکر ہوتا ہے اہلِ سخن میں

○

اُمیدیں جنھیں زندگی مسکرادی　　یہ کس کی نگاہوں نے بجلی گرادی
غم اپنا دیا لذتِ غم بڑھادی　　کس عنوان سے اس نے دادِ وفا دی
یہ جلوؤں کی رعنائیاں اللہ اللہ　　نہ جانے مجھے آپ نے کیوں سزادی
ترے اک تبسم پہ ادناوک افگن　　مرے دل کے زخموں نے کیا کیا دعا دی
وہ عالم ہیں رقصاں مری مستیوں پر　　مجھے آج ساقی نے وہ مئے پلادی
ہیں اس وحشتِ دل پہ قربان عرشی　　رہِ منزلِ شوق جس نے دکھا دی

○

کثرتِ جلوۂ یکتا سے پریشاں ہوکر　　آپ کا راز نہ کہدے کوئی حیراں ہوکر
آپ اور اہلِ محبت پہ جفائیں توبہ　　مجھ کو کیجے نہ پشیمان پشیماں ہوکر
اے صبا جاکے یہ اُس جانِ چمن سے کہنا　　گلشنِ دل کو زمانہ ہوا ویراں ہوکر
اُف رے احساسِ غمِ عشق کہ دین و دل و ہوش　　رہ گئے ایک ہی کروٹ میں پریشاں ہوکر
ہائے وہ حرفِ تمنا کہ ادا ہو نہ سکا　　لب پہ آیا تو حدیثِ غمِ پنہاں ہوکر
بندۂ عشق ہوں ممکن ہی نہیں اے عرشی　　میں رہوں دہر کا شرمندۂ احساں ہوکر

○

میری نگاہِ شوق نے عالمِ اعتبار میں　　دھوکے دیئے ہیں کس قدر آپ کے انتظار میں
ذرۂ بقدرِ ظرف خود مہرِ مبیں سے کم نہیں　　عالمِ عجز ہے ابھی عشق کے اختیار میں
رقصِ تجلیات ہے ذوقِ نظر کی اک ادا　　عشق کی ہے یہ سب نمود حسن کے رہگذار میں
ولولۂ حیات کا کس نے کیا ہے اہتمام　　آپ نہیں تو کون ہے پھر دلِ بیقرار میں
میری مجال ہے کیا مجال آپ کے بندگانِ خاص　　دخل نہ دے سکے کبھی آپ کے اختیار میں
شکوۂ جبرِ روزگار عرشی زار کیا کرے　　گردشِ چشمِ دوست ہے گردشِ روزگار میں

○

مرزا ظفر الحسن (پاکستان)

عمرِ گذشتہ کی کتاب

(فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کی زندگی اور تخلیقات کا تذکرہ)

فیض اور مخدوم دونوں میرے محبوب ہیں مگر میری دوستی میں غلو نہیں ہے۔ میں ان سے پیار کرتا ہوں ان کی پرستش نہیں کرتا۔ یہ کتاب لکھ کر میں نے ایک فرض پورا کیا ہے اور ایک قرض ادا کیا ہے۔ اسے اپنی متاعِ عزیز سمجھتا ہوں اور اس حد تک کہ غرور سے نہیں فخر سے کہتا ہوں۔

دیکھیں کہدے کوئی اس سہرے سے بہتر سہرا

کتاب کی شانِ نزول تفصیل سے لکھنے کے علاوہ چند اور ضروری باتیں بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ میرا یہ گمان اب یقین کے قریب پہنچتا جا رہا ہے کہ آئندہ کچھ لکھنے کا موقع کم ملے گا اس لئے ضروری ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کو سمیٹ لوں۔ وجہ امورِ صحت کے سوا کچھ نہیں۔

فیض سے میری شناسائی کی مدت دس گیارہ سال اور قرب' قریباً پانچ چھ سال سے ہوگا۔ ادارۂ یادگارِ غالب اور غالب لائبریری کے کاروبار کے سلسلہ میں ملنا جلنا زیادہ ہوا تو مجھے خیال ہوا کہ فیض کی زندگی کے واقعات جمع کروں اور ان پر کچھ لکھوں اس میں دو مشکلیں تھیں ایک یہ کہ فیض از خود مجھے طلب نہیں کرتے اور جب بھی ان کے گھر جاتا پانچ دس منٹ میں ملاقات ختم ہو جاتی۔ دوسری دقّت یہ تھی کہ ایلس فیض سے بھی مراسم نہیں تھے کہ ان سے دریافت کرتے رہنے کی کوئی سہولت نصیب ہوتی۔

دسمبر ۱۹۷۰ء کا کوئی اتوار تھا "ادارے کے کسی کام سے فیض کے گھر گیا۔ فیض اپنے کمرے میں تھے اور ایلس دیوان خانے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ فیض کے جلد بر آمد ہونے کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو کتاب بند کی اور مجھ سے باتیں کرنے لگیں یہ پہلا موقع تھا جب ایلس نے مجھ سے گفتگو کی ورنہ اس سے پہلے تو بات" ہلو ہلو" سے آگے نہ بڑھتی تھی۔ میں نے ایلس کو بتایا کہ میں فیض پر کچھ مواد جمع کر رہا ہوں اور انہیں بھی چاہیئے کہ وہ بھی فیض پہ لکھے ہوئے مضامین وغیرہ محفوظ کرتی رہیں غالباً اسی گفتگو کے بعد ایلس کو بھی خیال ہوا کہ فیض کو اپنے متعلق کچھ لکھنا چاہیئے۔ فیض سے اس کا ذکر کیا جس پر ایلس کی روایت کے مطابق فیض نے جواب دیا کہ یہ کام کسی سکریٹری کی مدد کے بغیر نہیں کر سکیں گے۔ ایلس نے کہا کہ میں تمہارے لئے سکریٹری کا انتظام کس طرح کر سکتی ہوں البتہ میرے ذہن میں ایک نام ہے اگر تم اتفاق کرو تو پھر کوئی تدبیر سوچتے ہیں۔ ایلس نے میرا نام لیا اور پوچھا کیا ظفر تمہارے

معیار پر پورے اتریں گے ؟ فیض نے کہا ضرور بشرطیکہ وہ راضی ہو جائیں اور کچھ وقت دے سکیں۔ ۱۲ فروری ۱۹۷۱ء کو ایلس نے مجھے یہ خط لکھا۔

مائی ڈیر ظفر ___ فیض کی خود نوشت سوانح عمری سے متعلق ایک ایسی الجھن ہے جو میرے بس کی نہیں آج میں نے فیض سے بات کی تو کھلا کہ انھیں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ یہی کچھ نوٹ وغیرہ لینے ہوں گے اور کوئی خاکہ اور طریقہ کار معیّن کرنا ہوگا اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔ اگر تیار ہو تو پھر اتوار کے بعد فیض کو ٹیلی فون کر کے طے کر لو کہ کیا کرنا چاہیئے ___ فیض ساٹھ برس کے ہو چکے ہیں یہ کام اب انھیں کرنا ہی ہوگا ___ ایلس

۱۳۔ فروری ۱۹۷۱ء کو فیض کی ساٹھویں سالگرہ تھی جس کی تفصیل میں ایک مضمون میں لکھ چکا ہوں۔ یہ خط اسی سالگرہ سے چوبیس گھنٹے پہلے ملا اور میں نے فوراً ٹیلیفون پر ایلس کو بتایا کہ اپنی تمام مصروفیات ملتوی کر کے فیض کی ہر ممکن مدد کے لئے تیار ہوں۔ سالگرہ کے ڈنر میں ایلس نے ایک ایک کو بتایا کہ فیض کی سوانح عمری کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ حاضرینِ محفل میں کئی احباب ایسے تھے جنھوں نے مجھ سے اشتراک کا وعدہ کیا اور کہا ہم فیض کے بہت سے حالات جو وہ خود بھول گئے ہوں گے تمہیں بتائیں گے۔

۱۴۔ فروری کو اتوار تھا، میں فیض کے گھر پہونچا اور پوچھا کب سے ارادہ ہے کام کرنے کا ؟ جواب میں فیض نے اپنی اسیری کے ۱۳۵ خطوط کا پلندہ دیا جو انھوں نے ایلس کو حیدرآباد، کراچی اور منٹگمری (اب ساہیوال) جیل سے لکھے تھے اور کہا پہلے انھیں پڑھ لو پھر اس کے بعد سوانح عمری کی بات کریں گے۔ بات اس وقت ٹل گئی مگر ان خطوط کی وجہ سے فیض کی کتاب "صلیبیں مرے دریچے میں" تیار ہو گئی جس کی تفصیل میں اس کے دیباچہ "کتاب اور صاحبِ کتاب کی کہانی" میں لکھ چکا ہوں۔ اس کتاب کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے فیض اور ایلس دونوں کو بہت قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل گیا۔ یہیں مجھے احساس ہوا کہ فیض کو راضی کرنے کے لئے کسی خاص ریاض کی ضرورت نہیں ہوگی یہیں میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ایلس یا تو میری کارکردگی کا امتحان لے رہی ہیں یا تجربہ کر رہی ہیں کہ فیض خود نوشتِ سوانح عمری مرتب کر سکتے ہیں یا نہیں۔ خطوط کے اسی مجموعے کی تیاری کے زمانے میں فیض کو خیال ہوا کہ ان کے کلام کا پانچواں مجموعہ مرتب ہو جائے۔ چنانچہ "سرِ وادیٔ سینا" پر بھی کام ہونے لگا اور یہ دونوں کتابیں تیار اور شائع ہو گئیں۔ اگست ۱۹۷۱ء میں ان کی رونمائی کی تقریب کے بعد میں نے سوانح عمری کا ذکر چھیڑا تو فیض نے کہا ابھی ابھی تو فراغت نصیب ہوئی ہے کچھ تو آرام کرنے دو، تھوڑی تو چھٹی دو۔

سابق مشرقی پاکستان کی افراتفری، سیاسی ہنگامے اور پھر ۷۱ء کی جنگ۔ ظاہر ہے ان حالات میں کوئی ایسا کام نہیں ہو سکتا تھا جس کے لئے سکون ضروری ہے۔ ۱۲۔ جنوری ۱۹۷۲ء کو مجھے ہارٹ اٹیک ہو گیا جس نے مجھے کوئی چھ ماہ کے لئے معطل کر دیا۔ اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو سوانح کا کام شروع نہ ہوتا کیونکہ فیض نے کراچی کی سکونت ترک کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ابھی میں بستر علالت پر ہی تھا کہ فیض اسلام آباد منتقل ہو گئے۔ اسلام آباد سے ایلس نے مجھے لکھا فیض ہر ماہ ایک آدھ بار کراچی آتے رہیں گے اس لئے تم جلد صحت یاب ہو جاؤ اور سوانح عمری شروع کر دو۔ فیض کراچی آتے رہے، ملتے رہے سوانح کی بات ہوتی رہی کیونکہ کراچی میں ان کے عشاق اور مداح اتنی مہلت ہی نہیں دیتے تھے کہ کبھی جم کر بیٹھیں اور کچھ لکھیں یا مجھے لکھوائیں۔ میں نے ایک بار تجویز پیش کی

اکہ ہاکس بے یا سینڈس پٹ (کراچی کی سمندری تفریح گاہ ہیں) جاکر پورا دن سکون سے صرف کریں گے اور اس طرح سوانح کا تھوڑا تھوڑا کام فیض کے ہر سفر کراچی میں کرتے رہیں گے' یہ نہ ہو سکا کیونکہ یاروں نے کہا ہاکس بے ہم بھی چلیں گے وغیرہ۔

میرے لئے دوسری متبادل صورت یہ تھی کہ میں کراچی سے نکلوں اور فیض تک پہنچوں۔ ۱۹۷۳ء میں اسلام آباد گیا اور ۱۹۷۶ء میں لاہور دونوں دفعہ کئی کئی ہفتہ فیض کے گھر رہا "تقاضہ کیا" تنگ کیا مگر خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ نہیں کہ فیض نے تعاون نہیں کیا بلکہ وہاں بھی انھیں اتنی فراغت نہ تھی کہ کچھ کام کرتے۔

میں نے تیسری متبادل صورت یہ نکالی کہ ان کے سامنے ٹیپ ریکارڈر رکھدیتا اور کہتا فلاں موضوع پہ آپ کو جو کچھ یاد ہے ریکارڈ کر دیجئے۔ فیض نے اپنے بچپن اور طالب علمی کے اور کچھ دوسرے واقعات ریکارڈ کرائے جن سے میں نے کئی مضامین تو تیار کرلئے مگر سوانح عمری کے لئے مفید مطلب پیش رفت نہ ہوئی۔ میرا زیادہ زور خود نوشت پہ تھا اور اُسی کے لئے فیض کو فرصت نہیں ملی اور جب تھوڑی بہت ملی تو ان کا مزاج مانع ہوا جس کی بابت وہ کہتے ہیں "اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔

۱۳ فروری ۱۹۷۶ء کو فیض کی پینسٹھویں سالگرہ تھی' اس سے چند ماہ پہلے میں نے بڑے پیمانے پر "جشنِ فیض" منانے کا منصوبہ کیا تھا۔ چاہتا تھا کہ فیض پر کچھ کتابیں چھپواؤں اور ادارہ یادگارِ غالب کے رسالے غالب کا فیض نمبر شائع کروں اس نمبر کے لئے اپنے چند ایک مضامین کے علاوہ مجھے خیال ہوا کہ "فیض اور مخدوم" کے عنوان سے ایک خاص مضمون لکھنا شروع تو محسوس ہوا اس موضوع پہ پوری ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے اس لئے کچھ دنوں کے لئے یہ کام روک دیا۔ جشنِ فیض اور فیض نمبر کی مصروفیات ختم ہوئیں تو جون ۱۹۷۶ء سے متذکرہ کتاب کو اپنے ذہن پر حاوی کر دیا اس کا اصل سبب یہ تھا کہ میں فیض کی خود نوشت کی طرف سے مایوس ہونے لگا تھا۔ خود نوشت ہی کے بہانے مجھے دوسری بہت سی معلومات حاصل ہونے کی اُمید تھی جسے بُنیاد بنا کر میں فیض کی سوانح "ذکرِ فیض" لکھنا چاہتا تھا اور اب نا اُمید ہو چلا تھا اس لئے سوچا کہ فیض اور مخدوم والے مضمون کو کتاب کا روپ دے دوں کچھ نہ ہونے سے بہتر ہے کہ یہی کتاب تیار ہو جائے۔

مخدوم پر تفصیل سے لکھنے کا جواز پیش کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں مگر محض ریکارڈ محفوظ کرنے کی خاطر عرض کر رہا ہوں۔ میں نے اپنی کتاب "ذکرِ یار چلے" اس نیت سے لکھنی شروع کی تھی کہ یہ مخدوم پر ایک مستقل اور مفصّل کتاب ہوگی مگر اپنی زندگی کی دوسری بے شمار یادوں نے میرا ایسا گھیراؤ کیا کہ میں اپنی ڈگر سے ہٹ گیا اور کتاب تمام تر مخدوم پہ ہونے کی بجائے میری یادوں کا مجموعہ ہوگئی مگر اُسی وقت سے مخدوم پہ کوئی مستقل کتاب ایک قرض کی طرح بار بار مجھے بے چین کر رہی تھی۔ مجھے محبت کا یہ قرض چکانا تھا۔

ایک طرف یہ احساس کہ فیض کی سوانح لکھنے یا ان سے خود نوشت لکھوانے کا فرض پورا ہونا مشکل ہے دوسری طرف یہ خیال کہ مخدوم کا قرض ادا کرنا ہے بس یہ دو باتیں مل کر اس کتاب کی شانِ نزول کا پس منظر بنتی ہیں۔

(دیباچہ عمر گذشتہ کی کتاب)

ماہر منصور

دوسرے اوتھلو کی تلاش

یہی سنتا ہوں روز و شب
کہ یہ دُنیا جہنم ہے
یہاں تکمیلِ ارماں کی
کوئی صورت نہیں ملتی
یہاں کی زندگی سے موت بہتر ہے

سُنو یارو
میں اب بھی اس بشر کی کھوج میں ہوں
جو اوتھلو کی طرح کہہ دے کہ
اے لوگو! مری واحد تمنا آج پوری ہو چکی ہے
سُنو! میں اور جی کر کیا کروں گا !!

OTHELLO ؎

غزلیں

(نذرِ مخدوم)

زوریوں درد کا کم ہونے لگا آخرِ شب
جس طرح ٹوٹنے لگتا ہے نشہ آخرِ شب
بے سبب ہی تو مری آنکھ نہیں کھل سکتی
کس نے بھولے سے مجھے یاد کیا آخرِ شب
شاید آ پہنچے ہیں نزدیک سفیرانِ سحر
کوئی دیتا ہے درِ دل پہ صدا آخرِ شب
جانثاری میں پتنگوں نے کمی کیا کی تھی
شمع نے کس لئے دم توڑ دیا آخرِ شب
آپ کے پاؤں کی آہٹ کا گماں ہوتا ہے
گھر کے آنگن میں جب آتی ہے صبا آخرِ شب
کس کے اشکوں کا خدا جانے اثر ہے آہی
بھیگی بھیگی سی جو رہتی ہے فضا آخرِ شب

ڈاکٹر راہی

بجھنے لگا ہے خون کا پھر ذائقہ جناب
لکھوں میں اپنے نام اک اور حادثہ جناب
کامل یقیں ہے آپ پہ مجرم سدا کا میں
بخشش بنے گا حشر میں اک واسطہ جناب
شوقِ سفر ہے ٹھیک تو کیا بات ہے کہ پھر
مشکوک کس لئے ہے ہر اک راستہ جناب
اک دستِ غیب ہے کہ جگاتا ہے سدا دل
لگتا ہے منتظر ہے کوئی سانحہ جناب
ہے روشنی بھٹکتے ہوئے خوں میں کس لئے
دِل کے قریب نقش ہے کیا چاند سا جناب

خالد سعید

بھارت چند کھنہ

اُردو کی دوسری کتاب کا پہلا سبق

اِنسان کی خلقت

۱۔ یہ نیلا آسمان، نیلے آسمان کے سائے میں گول زمین، زمین پر مختلف ملک، مختلف ملکوں کے سیاہ سفید، سُرخ پیلے اور گندمی باشندے، ان باشندوں کی حکومتیں، حکومتوں میں اختلاف، چپقلش، ان کی جنگیں، جنگوں کی تباہی کون لایا؟

۲۔ زمین پر ہوا، ہوا میں جو ہری توانائی کے راکٹ، چاند پر اِنسان کے قدم، ایٹم بم، اس کی کڑک چمک اور چمکار ۔۔۔ اس کا خوف اور اس کی تباہ کاری کہاں سے آئی۔؟

۳۔ گھروں میں بلوں کے انبار، ٹیکوں کی بھرمار، قانون کے پھندے کس نے پھیلائے؟ آقا و غلام [لشموں چڑیئے کا غلام] حاکم و محکوم، ظلم و ستم [اوروں پر]، رحم و کرم [اپنوں پر] کس نے روا رکھے؟ ایک طرف عیش و مستی، دوسری طرف افلاس اور پستی، عطر کی خوشبو، بھینی بھینی بدبُو، سفید، پیلی صحافت، سبز مد، سُرخ قہر، نیلی ہری نقلی آنکھیں سنہری بال، اندھا قانون، معذور انصاف، اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا گُن کس نے گایا؟

۴۔ یہ چوڑی چکلی زمین پر پھسلنے والی موٹریں اور ان کی زد میں آنے والے راہرو، کہیں مخموری سے لڑکھڑاتے قدم کہیں فاقوں سے ڈگمگاتے، لرزتے جسم، یہ ہوا میں اڑنے والے ہوائی جہاز جو مسافروں کو لاتے لے جاتے ہیں جو ہفتوں کی منزلوں کو گھنٹوں میں طے کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو بم اور موت برساتے ہیں، یہ ٹھاٹھیں مارتا گہرا سمندر جس کی سطح پر چلنے والے جہاز اور جنگی بیڑے، جس کے اندر ہی اندر چھپے اور گھات لگائے چلتی پھرتی آبدوزیں جو تارپیڈو چلاتی ہیں، یہ اونچے اونچے پہاڑوں پر مضبوط قلعے، یہ بہتے دریا، ان کے رُخ کس نے موڑے؟

۵۔ یہ فلک بوس عمارتیں، یہ بوسیدہ دراڑوں والے گھر جن کی چھتیں برسات میں کمروں کے اندر برستی ہیں، یہ شفاف پانی سے بھرے سوئمنگ پول اور یہ دیہاتوں کے گندے جوہڑ جن کا پانی اس دھرتی والے صدیوں سے پیتے اور مرتے ہیں، یہ ہڈیوں کے ڈھانچے، یہ موٹے تازے چکنے چکنے نیتا، یہ رنگ برنگی جھنڈے، یہ آمر، یہ بادشاہ، یہ مہان اور پردھان منتری جن کی نقل و حرکت کی منٹ منٹ کی جنتری، یہ جنتر منتر، یہ دھول دھپہ، یہ قتل و خون، کس نے روا رکھے؟

۶۔ پیارے بچو! یہ سب چیزیں انسان نے پیدا کی ہیں ملک ملک اور جگہ جگہ نیتا ہیں، یہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے مثلاً جہاں چار گھر آدمیوں کے ہوں گے وہاں ایک کتا اور ایک نیتا ضرور ہوں گے۔ اس حالت کا نقشہ ہمارے ایک نامور شاعر سلیمان خطیب نے اِن الفاظ میں کھینچا ہے:

یہ فضاؤں میں اُڑتا ہوا آدمی
جسکی مٹھی میں شمس و قمر بند ہیں
ایک مٹھی جوار کا محتاج ہے

یہ بتا چارہ گر تیری زنبیل میں
کچھ علاج و مداوئے فاقہ بھی ہے؟

۷۔ ان مشکل الفاظ کے معنی درج کئے جاتے ہیں۔ ان کو حفظ کر لو۔

جوہری توانائی : یہ سونے چاندی اور جواہر سے حاصل کی جاتی ہے اس کا مار دُور دُور تک ہوتا ہے۔

ایٹم بم : ایک بہت زور دار پٹاخہ جس سے بڑے بڑے ملکوں کے نیتا اور بادشاہ کھیلتے ہیں۔

آبدوزین : آیا رام گیا رام کا دوسرا نام ہے ان کی مار اور ان کے وار ہمیشہ سطح سے نیچے ہوتے ہیں۔ یہ جڑیں کاٹتے ہیں۔

جوہڑ : برسات کے پانی کا کسی نشیبی جگہ جمع ہوجانا، چونکہ یہ پانی ساکن رہتا ہے اس لئے کچرے اور غلاظت سے اس کا ایک ایسا سیّال بن جاتا ہے جسے دیہات کے لوگ اور ان کے ڈھور ڈنگر بڑے مزے لے لے کر پیتے ہیں۔ کچھ جلد ہی مر جاتے ہیں کچھ مرنے میں دیر لگاتے ہیں۔

"کہتے ہیں کہ پرانے زمانہ میں کوئی حکیم صاحب تھے جنھوں نے پردہ نشین عورتوں کی نبض دیکھنے کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ رسّی کے ایک سرے سے پردہ نشین خاتون کی کلائی کو باندھ دیا جاتا اور دوسرا سرا پردے کے باہر حکیم صاحب تک پہنچا دیا جاتا حکیم صاحب نبّاضی میں اس قدر ذکی الحس واقع ہوئے تھے کہ رسّی پر اپنی انگلیاں رکھ کر نبض کی کیفیت معلوم کر لیتے تھے اور تشخیص مکمل کر کے نسخہ لکھ دیتے تھے۔

ایک دن یار لوگوں کو دل لگی سوجھی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے حکیم صاحب کو بلا کر لے گئے۔ گھر کے اندر رسّی کے ایک سرے سے ایک بلّی کی ٹانگ کو باندھ دیا اور دوسرا سرا حکیم صاحب کے ہاتھ میں تھما کر عرض کیا کہ حضور مریضہ کی نبض دیکھ لیجئے۔

حکیم صاحب نے رسّی پر انگلیاں رکھیں اور فرمانے لگے کہ "مریضہ کچا گوشت کھا گئی ہے اور وہ ابھی ہضم نہیں ہوا" یار لوگ بے اختیار ہنس دیئے اور حکیم صاحب کے کمالِ نبّاضی کے قائل ہوگئے۔

ایک صاحب نے دعویٰ کیا کہ "خدا مجھ سے باتیں کرتا ہے" اقبال نے ہنس کر کہا "ذرا سنبھل کر رہنا اپنے خدا کی ساری باتیں مان نہ لیا کرو۔ بعض باتیں وہ یونہی بھی کہہ دیتا ہے" اس نے اقبال کو یہ خوش خبری سنائی کہ میں ۱۹۳۸ء میں ہندوستان کا بادشاہ بن جاؤں گا اور دہلی کو اپنا پایۂ تخت بناؤں گا" اس پر اقبال نے کہا "ہم کہاں ہوں گے مگر آپ مہربانی کر کے جاوید کو نہ بھولنا آپ سے پھر دلی کا علاقہ مزید بخش دینا" مرض الموت میں وہی شخص عیادت کے لئے آیا اور کہنے لگا آپ نے مجھے پہچانا تو نہ ہوگا۔ اقبال تکلیف کے باوجود ہنسے اور کہنے لگے "واہ! یہ آپ نے کیا بات کہی ہم اور آپ کو نہ پہچانیں؟ ولی دہلی کے شاہ"

صنعتی ترقی کو زبردست بڑھاوا

بندھیاچل کے جنوب میں آندھرا پردیش معدنی وسائل کے لحاظ سے مالامال ہے اس لئے صنعتی ارتقاء اور فروغ کے لئے اس ریاست میں عظیم مواقع و امکانات موجود ہیں۔

گذشتہ دو برسوں کے دوران میں ۶۲۰ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری اور ۴۵۰۰۰ افراد کے لئے روزگار کی گنجائش رکھنے والی صنعتوں کے قیام کے لئے ۱۵۰ اجازت نامے اور صنعتی لائیسنس وصول ہوئے ہیں۔

یہاں چھوٹے پیمانے کی ۱۶۰۰۰ صنعتی یونٹیں بھی قائم ہیں جن میں ۴۸ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے اور جو دو لاکھ افراد کو روزگار پر لگائے ہوئے ہیں۔

آندھرا پردیش انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن۔ دی اسمال اسکیل انڈسٹریل ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور انڈسٹریل انفرا اسٹرکچر کارپوریشن جیسے ادارے ان تمام برسوں کے دوران انتہائی قابل تحسین انداز میں ہماری صنعتی ترقی پر غیر منقسم توجہ دیتے آرہے ہیں۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

DIPR No. 8/77-78
906/ASV7/C3/77

عبدالرزاق قریشی قندِ مکرر

جنگِ آزادی میں اردو کا حصہ

مغلیہ سلطنت کا شیرازا اورنگ زیب کی وفات کے چند ہی سال بعد بکھرنے لگا مرکز کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے مختلف باغیانہ طاقتیں اُبھر آئیں۔ نتیجا یہ ہوا کہ سارے ملک میں بدنظمی پھیل گئی ،انگریز تاجروں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ ان کی ریشہ دوانیوں اور دودھملی سے انتشار بڑھتا ہی گیا۔ سیاسی و معاشرتی زوال کے ساتھ ساتھ اقتصادی بے چینی اور بے روزگاری بھی بڑھتی گئی۔ ناصرالدین محمد شاہ کے زمانے میں نادر شاہ کا حملہ ہوا۔ رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی۔ شاہ عالم کے زمانے میں اس ابتری کی تکمیل ہو گئی۔ ملک کے ان حالات سے متاثر ہو کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے ایک تحریک شروع کی جو مذہبی بھی تھی اور سیاسی بھی۔ وہ ملک کے موجودہ اقتصادی نظام کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ اِن کی رائے میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا سبب اقتصادی بدنظمی تھی۔ ان کا قول ہے کہ جس سماج میں اقتصادی توازن نہ ہو وہ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اِن کی تحریک ناکام رہی ورنہ شاید ہندوستان کی تاریخ بہت مختلف ہوتی۔

اُردو شاعری نے اپنے زمانے کے سیاسی و اقتصادی حالات کا اثر قبول کیا مگر کم۔ زیادہ اثر قبول کرنے کی اس سے توقع بھی نہ کی جا سکتی تھی۔ اس زمانے میں شعرائ کو آج کی سی آزادیٔ فکر و خیال اور آزادیٔ بیان حاصل نہ تھی اور نہ حب وطن کا وہ تخیل پیدا ہوا تھا جو اب ہے قومیت کا موجودہ تصور حقیقتہً یورپ کی پیداوار ہے اور اٹھارہویں صدی میں وجود میں آیا۔

قدیم اُردو شعرائ نے جو کچھ کہا ہے وہ زیادہ تر اشاروں میں ہے۔ انہوں نے شہر آشوب بھی کہے ہیں۔ ان میں اپنے زمانے کی صرف تصویر ہی نہیں کھینچی گئی ہے بلکہ تنقید بھی کی گئی ہے۔ بعض شعرائ کی تنقیدیں کافی سخت ہیں۔ حاتم، سودا، میر، قائم، جعفر علی حسرت، کمال الدین کمال، وغیرہ کے شہر آشوب خصوصاً اہم ہیں۔ ان شہر آشوبوں کے علاوہ بعض شعرائ کے منفرد اشعار میں بھی اس زمانے کی اقتصادی بے چینی اور سیاسی انتشار کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ مبارک آبرو اپنے زمانے کی حالت کا نقشہ یوں کھینچے ہیں۔ ؎

اب زمانہ ہے بے طرح بگڑا کیا بنے روزگار کی صورت
زبانی ہے شجاعت ان سبھوں کی امیر اس جگ کے ہیں سب شیرِ قالین

عبدالحئی تاباں نے ملک کی ایک متاعِ عزیز کے چھن جانے پر اس طرح اپنے داغ ہائے دل کو نمایاں اور اپنی بے بسی کا اظہار کیا ہے ؎

داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس

حاتم کے شہر آشوب میں طبقاتی کشمکش کی اچھی مصوری ہے۔

ان اشاروں میں سب سے قدیم اشارا راجا رام نرائن موزوں کا یہ شعر ہے جو انہوں نے نواب سراج الدولہ کی وفات پر کہا تھا: ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

انہوں نے ارکانِ حکومت اور خود بادشاہ پر بھی کڑی تنقید کی۔ سودا کے شہر آشوب میں مغلیہ سلطنت کی زبوں حالی، امرا کی تباہی اور رعایا

کی ابتری کا ذکر ہے۔ ان کی بعض ہجویں بھی سیاسی ہیں۔ قصیدۂ تضحیکِ روزگار بہ ظاہر گھوڑے کی ہجو ہے لیکن حقیقت میں اس زمانے کے نظامِ حکومت پر تنقید ہے۔ ان نظموں کے علاوہ سودا کی ایک قطعہ بند غزل ہے جس میں انہوں نے ایک گدا کی زبان سے آئینِ حکومت بتائے ہیں۔ میر کے یہاں بھی حالات کی مصوری کے ساتھ ساتھ بادشاہِ وقت پر تنقید ہے۔

میر کے ان مفرد اشعار سے بھی اس زمانے کی اقتصادی بے چینی کا پتا چلتا ہے ؎

نہ بیٹھ اب امیروں کی صحبت میں میر — ہوئے ہیں فقیر ان کی دولت سے ہم

کیا کہیے اپنے عہد میں جتنے امیر تھے — ٹکڑوں پہ جان دیتے تھے سارے فقیر تھے

صناع ہیں سب خوار ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے

میر نے دلی کی بربادی پر بھی بڑے دل دوز اشعار کہے ہیں۔ ان سے اس زمانے کی اقتصادی حالت کا بھی اندازہ ہوتا ہے ؎

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ہند میں جو گئے برباد ہزاروں اس سال — شامتِ بخت یہ لے بار خدا کس کی ہے

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

عبدالحی تاباں کے ان اشعار سے بھی اس دور کی ابتری کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے — اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

قائم کے برعکس جعفر علی حسرت کے یہاں آہ و فغاں ہے۔ بے کسی و بے بسی کا اظہار ہے ؎

کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں — کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالتِ بستاں

نہ سیل حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں — گزر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں

فغاں! کہ ہو گیا یہ کشتِ سبز سب پامال

شاہ کمال الدین کمال کے یہاں بھی بے بسی کا اظہار ہے۔ انھوں نے اپنے شہر آشوب میں اپنے زمانے کی خستہ حالی، شاہ عالم، وزرا و امرا کی بے دست و پائی اور شہر دہلی کی تباہی کا نقشہ بڑی عمدگی سے کھینچا ہے۔ ان کے شہر آشوب میں انگریز دشمنی اور بیزاری کا اظہار بھی ہے۔ ؎

وزیر و شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہے یہ ڈھنگ — کہ اپنے بخت سے رہتا ہے ان کو ہمیشہ جنگ

وزیر تو ہیں گرفتار یاں بقیدِ فرنگ — سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہے شاہ کو تنگ

نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار

وہاں یہ شہر ہے اور ہے وہی یہ ہندوستاں — کہ جس کو رشکِ جناں جانتے ہیں سب انساں

فرنگیوں کی کثرت سے ہو کے سب ویراں — نظر پڑے ہے بس اب صورتِ فرنگستاں

نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار

جہاں کہ نوبتِ دہشت‌نمائی بجا بجا کی تھی صدا — فرنگیوں کا ہے اس جا پہ ٹم ٹم اب بجتا

اسی سے سمجھو رہا سلطنت میں کیا رتبا — ہو جبکہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا

نہ شاہ ہے، نہ وزیر، سب فرنگی ہیں مختار

اودھ کی تباہی دلّی کی بربادی سے کسی طرح کم نہ تھی اور زیادہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ شاعر کو گلۂ آشنا کرنا پڑا۔ آصف الدولہ کے بعد تخت کے حقدار وزیر علی خان تھے۔ سعادت علی خاں نے انگریزوں سے مل کر ان کے خلاف سازش کی۔ ان کی اس ذہنیت اور انگریز دوستی پر جرأت نے چل کر کہا تھا ؎

کہیں نہ اسیر ان کو اہلِ توقیر انگریزوں کے ہاتھ سے قفس میں ہیں اسیر
جو کچھ وہ پڑھائیں وہی منہ سے بولیں بنگالے کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر

مصحفی کا یہ شعر بھی عوام کے جذبات کی اچھی ترجمانی کرتا ہے ؎

ہندوستاں کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

واجد علی شاہ اختر اور بہادر شاہ ظفر کے کلام میں شکوۂ غم روزگار اور گلۂ ستم آسمان ضرور ملتا ہے مگر سیاسی جذبے کی تلاش ان کے یہاں نہ کرنی چاہیئے۔

عوام میں حریت اور وطن دوستی کا جذبہ بیدار کرنے میں اخباروں کا نمایاں حصہ ہوتا ہے۔ اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما ۱۸۲۳ء میں نکلا اور مغلیہ سلطنت کے خاتمہ تک تقریباً پینتالیس اخبار جاری ہوئے۔ تاریخ صحافت اردو کے مصنف کی رائے ہے کہ "ہندوستان کے اخبارات میں اردو کے اخبارات بھی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بدیشی انگریزی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کر سکتے تھے وہ انھوں نے پیدا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان نے انگریزی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کی زیادہ تر ذمہ داری گارساں دتاسی نے ان اخبارات پر عاید کی تھی۔"

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ دو اخباروں کے نام لیے جا سکتے ہیں: صادق الاخبار اور دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار کے مہتمم کو "اس جرم میں کہ وہ سرکار کی بدخواہی کی خبریں جھوٹی گڑھ کر لکھا کرتا تھا تین برس کی قید ہوئی۔ مقدمۂ بہادر شاہ کے ایک سرکاری گواہ چنی لال کا بیان ہے کہ "جمال الدین ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا تھا جس کے مضامین قطعی انگریزی حکومت کے خلاف ہوتے تھے اس اخبار کا نام صادق الاخبار تھا"

دہلی اردو اخبار میں "ہندوستانی ریاستوں اور دہلی کے دربار کی خبروں کے ساتھ ان کی بدانتظامیوں پر سنجیدگی اور آزادی کے ساتھ تبصرے ہوتے تھے۔ اس اخبار کا ایڈیٹر برائی کے خلاف آواز اٹھانا اپنا مذہبی فرض سمجھتا تھا۔ اس کے ذہن میں امیر اور غریب، ہندو مسلم اور سکھ کا امتیاز نہیں تھا۔

دہلی اردو اخبار کے مالک اور اڈیٹر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے۔ جب دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوا تو محمد باقر کو سولی پہ چڑھا دیا گیا۔ آزاد کے نام بھی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا لیکن وہ کسی طرح بچ کر بھاگ نکلے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ادیب اور شاعر ہندوستان کی پہلی ہی تحریک آزادی میں دارورسن کی آزمائش سے گزرے۔

غدر یا پہلی جنگ آزادی ہماری سیاسی تاریخ میں ایک نیا موڑ ہے یہ صحیح ہے کہ یہ جنگ آج کل کی طرح منظم طریقے پر نہیں لڑی گئی۔ آزادی کی اس جدوجہد کے لئے زمین ہموار کرنے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے میں علماء، ادبا اور شعراء کا نمایاں حصہ ہے۔ ان میں امام بخش صہبائی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، منیر شکوہ آبادی وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ہندوستان کی دنیا بدل گئی۔ ہنگامہ و شورش کے بعد ایک قسم کا سکون پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن یہ سکون عارضی اور ظاہری تھا۔ ساکن سمندر کی تہ کے نیچے طوفانی لہریں ہر وقت اٹھتی رہتی ہیں۔ ہندوستانیوں کے دلوں میں بھی جذبات کا ایک طوفان اٹھتا

رہتا تھا۔ مگر وہ سیاسی حیثیت سے اس طرح کچل دیئے گئے تھے کہ ان میں زندگی کے آثار بہت کم پائے جاتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے انیسویں صدی کے تقریباً آخر تک اردو ادب میں یہی نقطۂ نگاہ پایا جاتا ہے۔ مگر چند دور اندیش ہندو اور مسلمانوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ سماجی اور تہذیبی حیثیت سے ہندو مسلمانوں میں زندگی پیدا کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے خاتمہ تک متعدد سوسائٹیاں مثلاً انجمن حمایت اسلام (لاہور) انجمن پنجاب (لاہور) انجمن تہذیب (لکھنؤ) برہمو سماج، ودیا ساگر کمیٹی سوسائٹی، علی سوسائٹی وغیرہ قائم ہو گئیں۔ انہی سماجی و تہذیبی سوسائٹیوں نے آگے چل کر سیاسی پروگرام کے لئے زمین ہموار کی۔

سرسید کی تعلیمی و سماجی اصلاحی تحریک سے اُردو ادب میں ایک نیا دَور شروع ہوتا ہے۔ سید نے اپنے گرد ادیبوں کا ایک گروہ جمع کر لیا تھا اور بقول سید سلیمان ندوی " جس کا ہر فرد ایک ادبی ریاست کا مالک تھا۔ انہی ادبی رئیسوں کی کوششوں سے اُردو میں افادی ادب پیدا ہوا۔ انہوں نے ادب کو زندگی سے الگ کوئی چیز تصور نہیں کیا بلکہ ادب کے تہذیبی اور معاشرتی تعلق کا احساس کیا۔ حالیؔ سب سے پہلے شاعر ہیں جو ملک کی سیاسیات سے متاثر ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور بربادی پر سب سے زیادہ جس شاعر کا دل تڑپا تھا وہ حالیؔ ہی تھے۔ انہوں نے اس ہنگامہ کو " دریائے عتابِ ذوالجلال کی موج زنی " اور " نظمِ عالم میں خلل " سے تعبیر کیا ہے۔ جب انگریزوں کے قدم ہندوستان میں سیاسی حیثیت سے جم گئے اور مغربی تہذیب و تمدن نے مشرقی تہذیب و تمدن کو مٹانا شروع کیا تو حالیؔ نے فریاد کی۔ ؎

کہتے ہیں مغرب سے جب ہو گا برآمد آفتاب — عرصۂ آفاق میں ہو گی قیامت جلوہ گر

دوستو! شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب — آرہی ہے روشنی مغرب سے اُٹھتی اک نظر

رَو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی — اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر

دستکاری کو مٹاتی ، صنعتوں کو روندتی — علم و حکمت کی پُرانی بستیاں کرتی کھنڈر

ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی — غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

حالیؔ سب سے پہلے شاعر ہیں جن کا دل ہندوستان کی غلامی پر رُویا۔

اس دَور میں بھی عوام میں بیداری اور زندگی پیدا کرنے میں اُردو اخباروں نے نمایاں حصہ لیا۔ انگریزوں نے سیاسی غلبے کے علاوہ دماغی و اخلاقی حیثیت سے بھی اپنے آپ کو ہمیشہ ہندوستانیوں سے بہتر جانا اور ان سے قریب آنے کے بجائے اپنے اور رعایا کے درمیان ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حاکم و محکوم کے درمیان بے گانگی و منافرت کی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔

سماجی، تہذیبی، اخلاقی اور قانونی حیثیت سے انگریزوں نے اپنے لئے برتری قائم کر لی تھی اور ہمیشہ ہر ممکن طریقے سے ہندوستانیوں کو ذلیل کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے۔ اُردو اخبار ان پر سخت تنقید کرتے۔

اس دَور کے اخبارات میں سب سے نمایاں نام اودھ پنچ (لکھنؤ) کا ہے اس کے بانی اور ایڈیٹر منشی سجاد حسین کو معاشرتی لحاظ سے قدامت پرست تھے لیکن سیاسی حیثیت سے وہ جدید نسل کے علم برداروں میں تھے۔ انہوں نے بھی سرسید کی طرح اپنے گرد ادیبوں اور شاعروں کا ایک اچھا حلقہ بنا لیا تھا۔ اودھ پنچ نے زندگی کے ہر شعبہ کی طرف توجہ کی۔ اس کا نقطۂ نگاہ تعمیری نہ تھا، تخریبی تھا۔ اس رنگ کے اور کئی پرچے نکلے لیکن انہیں اودھ پنچ سے کوئی نسبت نہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا سے ہماری قوم کی جدوجہد میں ایک نیا موڑ شروع ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کا آغاز سلطنت ایشیا

کے لئے ایک نیا پیغام تھا۔ چین میں بغاوت ہوئی۔ ٹرکی میں انقلاب آیا۔ ایران نے بیداری کی کروٹ لی۔ جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپ کی برتری کے پندار کو ختم کر دیا۔ ان حالات سے ہندوستان کا اثر قبول کرنا فطری تھا اور اس نے اثر قبول کیا۔ اردو ادب بھی بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہوا حسرت موہانی، ظفر علی خاں وغیرہ نے خصوصاً اپنے مضامین اور نظموں کے ذریعہ ہندوستانی عوام میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس دور میں پریم چند کی پانچ وطنی کہانیوں کا ایک مجموعہ (سوزِ وطن) شائع ہوا جسے حکومت انگریزی نے ملک کے حق میں خطرناک سمجھا گیا اور اس کی کاپیاں "بحق سرکار" ضبط کر لی گئیں۔ یہ پریم چند کی ابتدائی کوشش تھی لیکن یہ افسانے اپنے مقصد کے لحاظ سے کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ شاعری کا نیا انداز جو حالی و آزاد نے شروع کیا تھا ملک میں مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ اب بڑے دلکش و ولولہ انگیز انداز میں وطن کے ترانے گائے جا رہے تھے۔ اقبال کی ہمالیہ، نیا شوالہ، تصویرِ درد، ترانۂ ہندی، ہندوستانی بچوں کا قومی گیت اسی دور کی یادگار ہیں۔ چکبست کی "خاکِ وطن" بہت مقبول ہوئی۔ سرور جہاں آبادی کی نظم "پھولوں کا کنج" بھی اپنے اندر بڑی دل کشی رکھتی ہے۔ اقبال نے آگے چل کر "شعاعِ امید" کے عنوان سے جو نظم لکھی وہ اپنے خلوص، سوز اور تڑپ کی وجہ سے غیر فانی بن گئی ہے۔ آنند نرائن ملا کی "زمینِ وطن" اس فہرست میں ایک نہایت خوش گوار اضافہ ہے۔ حامد اللہ افسر، ساغر وغیرہ کی بعض وطنی نظمیں بھی اچھی ہیں۔ بعض شعراء نے سلاطینِ سلف کی یادگاروں سے متعلق نظمیں کہی ہیں۔ یہ بظاہر وہ عمارتوں کی تعریف کرتے ہیں لیکن درپردہ وطنیت کا ایک جدید نقطۂ نظر بھی ان میں پایا جاتا ہے۔ اس قسم کی نظموں کے سلسلے میں اسماعیل میرٹھی، اتفی لکھنوی اور سکندر علی وجد کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔

اسی زمانے میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا۔ اگرچہ ابھی عوام نے تحریک کا کچھ زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا لیکن ہمارے شاعر اور ادیب اس سے متاثر ہوئے۔ اکبر نے اس تحریک کا یوں خیر مقدم کیا ؎

داخل میری دالنست میں یہ کام ہے پُن میں | پہنچائے گا قوت شجرِ ملک کی بُن میں
دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی | بسکٹ سے ہے ملائم، پوری ہو یا چپاتی

لیکن اکبر کو قوم کی بے بسی کا بھی احساس تھا ؎

کامیابی کا سودیشی پہ ہر ہر اک دل بستہ ہے | جوہر تو تار ام نے کھونٹی گر پر بستہ ہے

اقبال کی دوررس نگاہوں نے بھی مغرب کی تہذیب کے کھوکھلے پن کو دیکھ لیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ شاخِ نازک پہ بننے والا آشیانہ بہت جلد ٹوٹنے والا ہے۔ یہ شاعر کی عظمت کا ثبوت ہے۔ ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ انھوں نے چند مضامین بھی لکھے تھے۔ ان مضامین میں انھوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ ہماری غلامی اور افلاس کا اصل سبب یہ ہے کہ صنعتی حیثیت سے ہمارا ملک پچھڑا ہوا ہے اور جب تک ملک میں صنعتی ترقی نہ ہو گی اس وقت تک بیرونی تسلط سے نجات حاصل کرنا مشکل ہے۔

اس عہد میں جو اخبار نکلے ان میں الہلال، ہمدرد، ہمدم، مدینہ، مسلم گزٹ خصوصیت سے اہم ہیں۔ الہلال پہلا اردو اخبار ہے جس نے مسلمانوں کے جمود و تعطل کو دور کرنے کی کوشش کی اور ان میں سیاسی بیداری کی روح پھونک دی۔ الہلال کی آواز ایک اونچے پہاڑ سے گرتے ہوئے آبشار کے مانند تھی۔ آبشار بہت خوبصورت بھی ہوتا ہے اور پُر جلال بھی۔ سرور نے بہت صحیح کہا ہے کہ "ابوالکلام نے مذہبی احساس کو سیاسی شعور اور سیاسی شعور کو ادبی رنگ دیا"۔ اسی دور میں ان کے اخبار میں ظفر علی خاں نے بھی نظمیں لکھیں۔ یہ اپنی قسم کی پہلی چیز تھی۔ یہ نظمیں اپنی مقبولیت کی وجہ سے اردو ادب میں اہمیت رکھتی ہیں۔ اس انداز کی تقلید آگے چل کر ظفر علی خاں نے کی اور بہت کامیاب رہے۔ "ہمدرد"

محمد علی کا اخبار تھا۔ وہی اس کے اڈیٹر بھی تھے۔ محمد علی کا جوش، بے باک صداقت، جرأت اور سامراج دشمنی ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے محمد علی نے اپنے کچھ انشا پردازوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ یہ سب ذہین لوگ تھے۔ حفیظ علی بدایونی، محمد فاروق دیوانہ، ہمدم، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، لکھنو سے جاری کیا تھا۔ ہمدرد کی طرح یہ بھی سامراجیت کا کھلم کھلا مخالف تھا۔ 'مدینہ' اپنے توازن و سنجیدگی کے لئے ہمیشہ ممتاز رہا ہے۔ مسلم گزٹ، شبلی کی کوشش سے نکلا تھا۔ وحیدالدین سلیم اس کے اڈیٹر تھے۔ اس کے مضامین بھی تند و تیز ہوا کرتے تھے۔

اس دور میں جن ادیبوں اور شاعروں کے نام خصوصیت کے ساتھ لئے جا سکتے ہیں وہ محمد علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور اقبال ہیں۔ ابوالکلام کے یہاں نسبتاً زیادہ جوش و خروش ہے۔ لیکن ان کی آواز دماغ کی آواز ہے۔ بقول آل احمد سرور "وہ بلندیوں میں پرواز کے عادی ہیں زمین پر مشکل سے قدم رکھتے ہیں" محمد علی کی آواز دل کی آواز ہے وہ آج بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔ سرور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "ابوالکلام نے ذہن کو آزاد کیا۔ محمد علی نے دلوں کو"۔ محمد علی کی شخصیت میں جو رنگا رنگی اور خلوص تھا اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ ان کے مضامین اور غزلوں میں جو سوز و گداز اور تاثیر پائی جاتی ہے وہ اسی رنگا رنگی اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ محمد علی نے نثر میں بہت کھلم کھلا باتیں کی ہیں۔

ظفر علی خاں نے اپنی نثر میں اور نظم کے ذریعہ ملک و قوم کی بہت خدمت کی۔ ان کے متعلق سرور کی یہ رائے بہت صحیح ہے کہ "وہ تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ نعرۂ مجاہدین دلوں میں گھستا جا رہا ہے۔ لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دو دھاری تلوار ہے جو دونوں طرف پتھراؤ کرتی ہے اور نظم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کے چشمے اُبل رہے ہیں"

حسرت میں بھی محمد علی کی طرح بڑا خلوص تھا وہ انقلابی تھے۔ انھیں توپ کے دہانے پر کھڑے ہو کر بیان دینا منظور نہ تھا۔ وہ توپ کے دہانے کا رخ دشمن کی جانب موڑ دینا چاہتے تھے۔ ان کا یہ نقطۂ نظر ان کے مضامین اور خطبات میں اکثر پایا جاتا ہے۔ غزلوں میں ان کی شخصیت اتنی نمایاں نہیں ہوتی۔ پھر بھی ان کی بعض غزلیں سیاسی شاعری کا اچھا نمونہ ہیں۔ غزل میں سیاسی مضامین سب سے پہلے حسرت نے شامل کیے۔

اس دور میں ہزاروں نظمیں کہی گئیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب کو دوام نصیب نہیں ہو سکا۔ لیکن ان سے اس بات کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ شعرائے قومی تحریک میں حصہ لیا۔ ان نظموں میں قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسے حریت کا درس دیا گیا ہے۔ عمل کا پیغام سنایا گیا ہے اتحاد و یگانگت کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اکبر کا یہ قطعہ جو پنڈت مدن موہن مالویا کی فرمائش پر کہا گیا تھا اس دورِ صلح و آشتی کی یادگار ہے

محرم اور دسہرا ساتھ ہوگا نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ

خلافت کی تحریک کے دوران میں بہت سے مسلمان حکومتِ برطانیہ کے خلاف احتجاج کے طور پر ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان، ترکی وغیرہ چلے گئے۔ بہت سے مہاجرین تاشقند، سمرقند، بخارا وغیرہ بھی چلے گئے۔ جو لوگ اشتراکی خیالات روس سے لیکر آئے تھے انھیں کام کرنے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ اس طرح اشتراکی نظریہ ہندوستان میں جڑ پکڑ گیا۔ ۱۹۲۶ء میں کانپور میں پہلی آل انڈیا کمیونسٹ کانفرنس ہوئی۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر حسرت موہانی تھے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں کمیونزم اور اس کے اصول اور کمیونسٹ پارٹی کے اغراض و مقاصد وضاحت اور سنجیدگی کے ساتھ سمجھائے ہیں۔ بیگانہ مزدوروں کے درد کو جس شاعر نے سب سے پہلے محسوس کیا۔ ان کی بے بسی پر بے چین ہوا اور انھیں ان کی اہمیت جتائی وہ اقبال تھے۔ سب سے پہلے اقبال نے مزدوروں اور دہقانوں کو مخاطب کیا۔ انھیں بیداری کا پیغام

ہوگیا۔ ان میں ولولہ اور اُمنگ پیدا کی۔ اقبال نے ۱۹۱۲ء میں دہقانوں کو اس کی اہمیت جتائی۔

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا — دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

اقبال ہی نے سب سے پہلے مزدور کو یہ پیغام دیا۔

اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے — مشرق و مغرب میں تیرے دَور کا آغاز ہے

حسرت نے بھی اشتراکی تحریک سے بہت پہلے مزدوروں سے ہمدردی کا اظہار کیا اور انھیں ان کی خوش حالی کا مژدہ سُنایا تھا۔

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی — نہ حکّام کا جورِ بے جا رہے گا
زمانا وہ جلد آنے والا ہے جس میں — کسی کا نہ محنت پہ دعوا رہے گا

رفتہ رفتہ اشتراکی نظریہ روس و ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔ ادب نے بھی اثر اس کا قبول کیا۔ ۱۹۳۶ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ ہندوستان میں بھی اسی سال ترقی پسند مصنفین کی ایک انجمن قائم ہوئی۔ اس میں نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ پریم چند، مجنوں، جوش وغیرہ جیسے کہنہ مشق افسانہ نگار و ادیب و شاعر بھی شامل تھے۔ اب قومی و وطنی ترانے کے ساتھ ساتھ کسان، مزدور، بے کاری، افلاس وغیرہ بھی ہماری شاعری کے موضوع قرار پائے۔ ملوکیت و سرمایہ داری کے خلاف کھُلم کھُلا اعلانِ جنگ ہونے لگا۔

اشتراکی تحریک اور جوش کی شاعری کا اثر تقریباً تمام نوجوان شعراء پر پڑا۔ احسان دانش، سردار جعفری، مجاز، مخدوم محی الدین، مسکندر علی وجد وغیرہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ سردار جعفری کی "نئی دنیا کو سلام" اور "جمہور" اُردو ادب میں خوش گوار اضافہ ہیں۔ دونوں نظموں میں بڑی تازگی اور زندگی ہے۔ "جمہور" اقبال کے ساقی نامہ سے متاثر ہو کر کہی گئی ہے۔ اس میں شاعر نے ایک نئی صبح اور نئے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوش خبری دی ہے۔

پریم چند، اعظم کریوی، علی عباس حسینی، کرشن چندر وغیرہ نے اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعہ کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کی اچھی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے صرف ان کی بے کسی و بے بسی پر ماتم نہیں کیا ہے بلکہ ان کی حیثیت و غیرت کے جذبے کو اُبھارا ہے۔ پریم چند سب سے پہلے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے دیہات اور اس کی زندگی کو اپنے افسانوں میں داخل کیا۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ہندوستان کے دل کی دھڑکن سُنائی دیتی ہے۔ پریم چند کے افسانوں اور ان کی مقبولیت سے ملک میں بہت سے افسانہ نگار پیدا ہوئے۔ انھوں نے مزدوروں اور دہقانوں کی مکانیت و حمایت کے ساتھ ساتھ غلامی کے خلاف نفرت کا بھی جذبہ پیدا کیا۔ ان افسانہ نگاروں کے یہاں سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ انفرادی آزادی حاصل کرنے کا بھی پیغام ملتا ہے۔ انفرادی آزادی کی جدوجہد کا پیغام سب سے پہلے اقبال نے دیا۔

دوسری جنگِ عظیم نے ہندوستان کی سیاست پہ گہرا اثر ڈالا۔ اسی جنگ کے دوران میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک شروع ہوئی۔ سارا ملک بیدار ہو چکا تھا اور حریت کا جذبہ ہر دل میں موج زن تھا۔ آتشِ شوق تیز سے تیز تر ہو رہی تھی۔ اُردو ادب نے یہاں بھی وقت کا ساتھ دیا۔ عوام کو آثارِ وقت سے آگاہ کیا۔ آزادی کا گیت گایا، زمانے کا چیلنج بنایا زلفِ چلیپا کی برہمی کو مشتہر کیا۔ موسم کے اشارے بتائے، سحرِ نَو کے طلوع ہونے کا مژدہ سُنایا اور ایک نئی صبحِ وطن کی بشارت دی۔ اس دَور کی دو نظمیں خصوصاً ہماری انقلابی شاعری میں یادگار رہیں گی۔ جوش کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام"،

(بقیہ صلا پر)

بادۂ کہن

سید کاظم علی باقر (متوفی ۱۹۶۲ء حیدرآباد) عہد آصفی کے قادر الکلام سخنور تھے، ان کا شمار فصیح الملک داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے۔ علی گڑھ میں پیدا ہوئے تعلیم اور ابتدائی زندگی کا بڑا حصہ آگرہ بھوپال اور رام پور میں گزارا۔ حیدرآباد کے ادبی ماحول کو متاثر کیا۔ یہاں کی شعری محفلوں میں مقبولیت پائی۔ ان کے گھر ماہوار شعری محفلیں ہوا کرتیں۔ جہاں حیدرآباد اور بیرون دکن کے نامور شعراء شرکت کرتے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد سے باقر کے مراسم گہرے اور استوار رہے ہیں۔ مہاراجہ کی شعری محفلوں کے اہتمام میں باقر کی صلاحیتیں روشن نظر آتی ہیں، ان کی غزلوں میں بیشتر اشعار مہاراجہ شاد کی توصیف و تحسین میں ملتے ہیں، وفات کے وقت ۸۰ سال کی عمر تھی، کلام مختلف گلدستوں میں منتشر ملتا ہے۔
ایک مسلم دوست نے حضرت باقر کے کلام کا مخطوطہ بغرض اشاعت ادبی ٹرسٹ حیدرآباد دکن کو نذر کیا ہے۔ یہ مخطوطہ خود شاعر کا تحریر کردہ ہے۔
ادبی ٹرسٹ نے کلام باقر کی اشاعت کا اعلان کیا ہے۔ باقر کی شاعری میں داغ کی سلاست، زبان دانی اور غزلیہ شاعری کا رس بھی ملتا ہے۔
نامور شاعر علی اختر اور نظر حیدرآبادی، حضرت باقر کے علی الترتیب بیٹے اور پوتے ہوتے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے شکریے سے باقر کی شاعری کا انتخاب پیش ہے (د، غ)

نہ دیکھی ہو جو تم نے انقلابِ دہر کی صورت ؎ مجھے دیکھو کہ اک تصویر ہوں دنیائے فانی کی
ہمیں اب یاد آتا ہے کبھی ہم نے بھی دیکھا تھا ؎ کتابِ زندگی میں اک حکایت تھی جوانی کی

پانے والے ہی تجھے پا جائیں گے ؎ تو نہیں ہے ہر کسی کے واسطے
جو ٹپکتا ہے آنکھ سے آنسو ؎ ایک طوفاں اٹھائے جاتا ہے

آنے والی ہر مصیبت آئی اور ٹل بھی گئی ؎ مشکلیں دشوار تر تھیں، پر وہ آساں ہو گئیں
عشوہ خوں ریز، نظر قہر ستمگر، قیامت انداز ؎ آگئیں آپ کو اس بن میں ادائیں کیا کیا

دل دیا، جان دی، ایمان دیا، عزت دی ؎ عشق میں اُن کے ہوئیں ہم سے خطائیں کیا کیا
جو کہا کسی نے کہ آپ پہ کوئی بیٹ گیا کوئی مر گیا ؎ تو وہ بولے چھوڑو یہ تذکرہ جو گزر گیا وہ گزر گیا
تمہیں جس بات پہ ناز ہے یہ مریض اس کی مثال ہے ؎ کہ ہوا تھا مات کو جیسا سو وہ اٹھنے کے وقت سحر گیا
میں وہ آہ ہوں جو رسا نہ ہو، میں وہ عہد ہوں جو وفا نہ ہو ؎ میں وہ رنگ ہوں جو اتر چکا، وہ زمانہ ہوں جو گزر چکا
کہیں پاس آکے مٹا گئی تو امید آکے جلا گئی ؎ تری الفت باقر یہ بنی کہ کبھی جی اٹھا کبھی مر گیا
دنیا کی خواہشوں نے مجھے خوار کر دیا ؎ اس زندگی نے زیست سے بے زار کر دیا
ناصح ترے سبب سے ہوئی ترکِ میکشی ؎ توبہ کرا کے اور گنہگار کر دیا
شب وعدہ کسی کی یہ لگاوٹ یاد آتی ہے ؎ بناوٹ سے بگڑنا مسکرا دینا خفا ہو کر

نشانِ منزلِ مقصود مل جائے ؛ پہنچ جاؤں جو گردِ کارواں تک
کہوں کب تک فسانہ دردِ دل کا ؛ سناؤں داستانِ غم کہاں تک

الجھ رہے ہیں دامِ عرضِ مدعا کیا کیا ؛ قصور ڈھونڈھ رہے ہیں مری سزا کے لیے
جنابِ باغ یہ کیوں حال ہو گیا ؛ سنائیے تو حقیقت ذرا خدا کے لیے

تم اور وصل، غیر غلط، افترا، دروغ ؛ اس کا ہمیں بھی رنج تمھاری قسم ہوا

[illegible] میں، کرتے ہیں اپنی پاکبازی کا بیاں ؛ ضبط کرتا ہوں، ہنسی بے اختیار آنے کو ہے

بات کرتا ہے اشاروں میں ترا حسنِ سلوک ؛ خامشی فرض ادا کرتی ہے گویائی کا
دو دو دل کھینچتے ہیں ہر ایک سے کیوں حضرتِ باغ ؛ آپ کو خوف نہیں حسن کی رسوائی کا

جب آنکھ بند تھی پیشِ نظر تھا عالمِ حسن ؛ کھلی جو آنکھ وہ منظر نظر نہیں آتا

جو ٹھہرے تو ساکن ہوئیں گردشیں ؛ چلے وہ تو محشر بپا ہو گیا
گئی گزری باتوں کا افسوس کیا ؛ جو ہونا تھا وہ، ہو گیا ہو گیا

شکستِ عہد کا دھندلا سا اک خاکہ سمجھتا ہوں ؛ جو میرے سامنے ٹوٹا ہوا پیمانہ آتا ہے

تم مری زندگی سہی لیکن ؛ زندگی نے مٹا دیا ہے مجھے

دامن میں آرزو کے ہزاروں ہی پھول ہیں ؛ ایسا کوئی نہیں کہ شگفتہ کہیں جسے
پہلو میں ایک داغ ہے کہتے ہیں جس کو دل ؛ اک بوند ہے لہو کی تمنا کہیں جسے
اے باغ اس جہان میں اللہ کے سوا ؛ اپنا نہیں ہے کوئی کہ اپنا کہیں جسے

شمع باقی ہو تو پروانے بھی آجاتے ہیں ؛ تم سلامت رہو مرتے رہیں مرنے والے
باغ صاحب جنھیں کہتے ہیں یہی حضرت ہیں ؛ آپ کے سر کی قسم، آپ پہ مرنے والے

منظور کس لیے نہ ہو اُن کا کہا ہوا ؛ پتھر کے نیچے ہاتھ ہے اپنا دبا ہوا
خط تو جلا پہ عرضِ تمنا کا حرف حرف ؛ جس جا لکھا ہوا تھا وہیں تھا لکھا ہوا
گزرے ہوئے مصائبِ غم کا بیاں فضول ؛ چھوڑو بھی ذکر جانے بھی دو، جو ہوا ہوا
اللہ رے بیخودی کہ دیارِ حبیب میں ؛ خود پھر رہا ہوں اپنے کو میں ڈھونڈتا ہوا

کسی کی مست نظر کر گئی ہے کیا مخمور ؛ جو نیند سی مری آنکھوں میں آئی جاتی ہے
نہ دیکھو آئینہ، دیکھو یہ بات یاد رہے ؛ خودی کے مدِ مقابل جو بیخودی ہو گی

تم کو اس کا بھی امتیاز نہیں ؛ دل سے نکلی ہوئی دعا کیا ہے

آئینہ میں نہ دیکھو جلوۂ حسن ؛ تجھ کو تیری نظر نہ ہو جائے

میرے رونے پہ تم نہ ہنس دینا ؛ کہیں آنسو گہر نہ ہو جائے
جس طرف جاتی ہے مخلوق اُدھر تم بھی چلو ؛ رنگ دنیا کا، زمانے کی ہوا کو دیکھو ■■

غزلیں

—

ترے خیال کا سورج تو ڈوبتا ہی نہیں
مری نظر کو اندھیروں سے واسطہ ہی نہیں

زباں خموش رہے بھی تو آنکھ بول اُٹھے
دلوں کا درد چھپائیں یہ حوصلہ ہی نہیں

میں اپنے خول سے باہر نکل سکوں کیسے
حصارِ جسم کچھ ایسا ہے ٹوٹتا ہی نہیں

دلوں کی تشنگی احساس کا اَلمِ غمِ ذات
یہ راز وہ ہے کوئی جس کو کھولتا ہی نہیں

مجھے حیات کی بیداریوں کا غم کیوں ہو
خمارِ نیم شبی ہے کہ ٹوٹتا ہی نہیں

محمد علی اثرؔ

—

اب زیست مجھے معرکۂ بازار لگے ہے
ہر کوئی یہاں جیسے خریدار لگے ہے

جو شخص بھی ملتا ہے سرِ راہِ تمنا
حالات کے زنداں میں گرفتار لگے ہے

یوں بھی تو ہوا کرتا ہے اندازِ کرم بھی
اقرار لگے ہے کبھی انکار لگے ہے

احساس کی دُوری سے پرے شہرِ سخن میں
خوابیدہ ہے جو شخص بھی ہشیار لگے ہے

ابلاغ کا مفہوم یہی کچھ ہے نصیرؔ اب
لفظوں کا دروبست بھی اظہار لگے ہے

نصیر احمد نصیرؔ گلبرگوی

—

عشق میں جو بدنام نہیں ہے
اونچا اس کا نام نہیں ہے

ان کو پائیں خود کو نہ کھو کر
کیا یہ خیالِ خام نہیں ہے

اس کی نظر میں سب ہیں برابر
کوئی خاص و عام نہیں ہے

عشق پہ کیوں ہے ساری تہمت
حُسن پہ کیوں الزام نہیں ہے

ہٹ جاتے ہیں جو راہِ وفا سے
عارفؔ اس کا نام نہیں ہے

غیاث عارفؔ

اقبال کی شعر گوئی کے آغاز اور محرکات کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ان کے مداحوں اور نکتہ چینیوں نے ان کی شاعری کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس پر کچھ نہ کچھ روشنی نہ ڈالی ہو۔ ان میں دو پہلو ایسے تھے۔ جن پر بطور خاص بحث کی گئی ہے۔ ایک اقبال کا فلسفۂ خودی کا اور دوسرے اقبال کی زبان۔ یعنی ایک طرف تو اس کے فکری پہلو پر لامتناہی مباحث کا سلسلہ جاری ہے اور دوسری طرف اس کی زبان کے اسقام گنوا کر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اقبال کی شاعری کے جذباتی پہلو پر تنقید کرنے کا حق ادا کر دیا گیا۔ پھر ان دونوں میں بھی دوسری خصوصیت پر پہلی کی بہ نسبت بہت ہی کم توجہ دی گئی۔

سید عابد علی عابد نے "شعرِ اقبال" لکھ کر کلامِ اقبال پر ہر جہتی روشنی ڈالنے اور اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب لکھی گئی ہے جس میں فاضل مصنف نے کامل دیانت داری سے اقبال کے کلام کی خوبی اور خامی کو پرکھا ہے اور اقبال کی شاعری کے چند ایسے گوشے بھی اجاگر کئے ہیں۔ جو آج تک عام نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ انھیں میں ایک اقبال کی غزل گوئی بھی ہے جس کے لئے مصنف نے چند صفحات وقف کئے ہیں۔ گو ہمارے نزدیک اقبال کی غزل پر ابھی بہت کچھ لکھا جانا چاہیئے پھر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے موضوعِ کتاب کی وسعت کے پیشِ نظر کافی ہے۔

اقبال کی غزل سے نقادوں کی عدم توجہی کا سبب غالباً یہ ہے کہ اس کے کلام میں فکری عنصر کا غلبہ زیادہ ہے۔ غزلوں کا حصہ اسی تناسب سے کم ہے۔ غزلوں کی اتنی تھوڑی سی تعداد اقبال کی نظموں میں اس طرح گم ہو جاتی ہے کہ تنقید نگار انھیں سرے سے نظر انداز ہی کر دیتے ہیں۔ لیکن ہماری نظر میں اقبال کی غزل اس کے کلام کا نہایت ہی اہم جزو ہے۔ جس سے ہمیں اقبال کی شعر گوئی کے محرکات کو سمجھنے میں بڑی مدد مل جاتی ہے۔

کہتے ہیں کہ اقبال نے اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی تھی۔ چنانچہ اس کی اسی زمانے کی غزل کا ایک شعر بہت مشہور ہے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے ؎ قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہی غزل اقبال کی پہلی غزل تھی۔ لیکن ہمیں اس میں شبہ ہے ہمارے نزدیک اقبال کی غزل گوئی کی ابتدا گورنمنٹ کالج لاہور کی طالب علمی سے بھی قبل ہو چکی تھی۔ یہاں ایک بات اور بھی کہتے چلیں۔ اقبال کے استاد سید میر حسن کے متعلق سنا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں شعر کا ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ ممکن ہے اسی کے نتیجے میں اقبال کو شعر سے اتنا لگاؤ پیدا ہو گیا ہو کہ

اس نے آگے چل کر فارسی میں مستقل شعر و تخلیقات کا ذخیرہ فراہم کر دیا۔ کالج کے زمانے میں بھی اقبال خصوصیت کے ساتھ حافظ کا بہت پرستار تھا یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ اس پر فلسفے نے اتنا اثر نہیں کیا تھا جو بعد میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ عطیہ بیگم کے خطوط شاہد ہیں کہ اقبال حافظ کا حافظ تھا۔ غرض یہ ثابت ہے کہ اقبال نہ صرف غزل کا دلدادہ تھا۔ بلکہ اس نے خود اپنی شاعری کی ابتدا بھی غزل ہی سے کی جس کی اصلاح کے لیے داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔

اقبال کی طبیعت میں جو انقلاب آیا اس نے وہ فلسفۂ اخلاق کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح پر مائل ہوا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے اور ہمارے بحث سے خارج ہے۔ پھر بھی اتنا بتا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ قیام یورپ میں جب اقبال نے شاعری سے دست بردار ہونا چاہا ہے تو عطیہ بیگم اور سر عبدالقادر کے مشورے سے یہ طے پایا کہ اقبال شعر گوئی ترک نہ کرے۔ البتہ اسے صرف ملت اسلامیہ کے لئے وقف کر دے اور یوں اقبال کا آئندہ شاعری کا ایک مستقل نہج قرار پا گیا۔ اقبال نے کن وجوہ کی بناء پر ترک شعر گوئی کا فیصلہ کیا اور پھر کن مصالح کے پیش نظر شاعر ملت ہونا قبول کر لیا۔ ان سوالات کا جواب سوچنے کے لئے تخیل میں ذرا وسعت پیدا کرنا ہوگی بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ زمانہ طالب علمی سے قیام یورپ تک اقبال غزل کا شیدا رہا اور داغ کی شاگردی کا فخر حاصل کرکے اس نے وہ معرکۃ الآرا غزل لکھی جس کا سلسلۂ کلام داغ سے جا کر مل جاتا ہے۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ؛ مگر وعدہ کرتے انھیں عار کیا تھی
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا ؛ خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا ؛ تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی

اس غزل میں وہی معاملہ بندی، وہی شوخی اور زبان کا چٹخارہ موجود ہے جو داغ کا مابہ الامتیاز سمجھا جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک غزل اور ہے جس کا مطلع ہے:

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں ؛ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

یہ غزل اگرچہ پہلی غزل سے دوسرے بحر پر ہے پھر بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں اول تو اقبال کی غزلوں کی تعداد ہی بہت کم ہے اور پھر جو کچھ ہے اس میں بھی یہ تیور کہیں دیکھنے میں نہیں آتے بلکہ بیشتر غزلوں کے بیشتر اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کی غزل کو گھن لگ رہا ہے اور وہ رفتہ رفتہ جذبے سے تفکر کی جانب بڑھ کر نظم کے قالب میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ غزلوں کے قلیل سرمائے کے متعلق سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

اپنی شاعری کے آغاز سے ۱۹۰۵ء تک اقبال نے جو غزلیں کہی ہیں ان کا انتخاب بہت کڑا کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال بھی کچھ اسی قسم کے مسئلے سے دوچار تھے جس نے غالب سے یہ شعر کہلوایا ہے:

"کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ ؛ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے" (شعر اقبال صفحہ ۲۴)

اس شہادت کے بعد یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال نے غزلوں کے انتخاب میں جس امر کو معیار بنایا تھا۔ وہ جذبے کی بجائے تفکر تھا۔ چنانچہ وہی غزلیں اقبال کے مجموعۂ کلام میں شائع ہوئی ہیں جن میں فکری پہلو زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ اسی طرح جہاں اس کی غزلیں اس کی نظموں سے ہم آہنگ ہو گئیں اور اس کے مجموعۂ کلام میں ایک ہمواری اور توازن کی سی شان آ گئی وہاں ایک ایسی ارتقائی کڑی

بھی غائب ہوگئی۔ جس کی مدد سے کلامِ اقبال کا مزاج متعین کرنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔

واضح ہے کہ داغ کی شاگردی سے اقبال نے جو کچھ اخذ کیا۔ وہ وہی کچھ تھا جو داغ کی خصوصیت سمجھا جاتا ہے۔ یعنی وہ روانی اور محاورہ، شوخی، بانکپن اور معاملہ بندی وغیرہ۔ لیکن وہ مقام جہاں سے اقبال اور داغ کی راہیں الگ الگ ہوجاتی ہیں کلام کا وہ داخلی پہلو ہے جسے ہم واردات قلبی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اقبال اس باب میں داغ کی تقلید سے قطعاً آزاد اور اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے۔ چونکہ دونوں کی خاندانی معاشرت، ابتدائی تربیت اور سماجی حالات میں بہت بُعد ہے اس لئے دونوں کے تجربے بھی ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں۔ اس پس منظر میں دونوں کی راہیں الگ ہوجانا بالکل غیر فطری سی بات ہے۔ لیکن عابد علی عابد تغزلاتِ اقبال کو تمام و کمال داغ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

"اس زمانے کی جو غزلیں یا اشعار اقبال نے قلم زد کر دئیے ان کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ جہاں اقبال کشمیری مسلمانوں کی زبوں حالی دفع کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے، انجمن حمایتِ اسلام میں قومی نظمیں پڑھ رہے تھے۔ ہندو مسلم اختلاف کو رفع کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے، "ہمالیہ" اور "تصویرِ درد" جیسی نظمیں کہہ رہے تھے انہیں دنوں وہ ایسی غزلیں بھی لکھ رہے تھے جو آپ بیتی پر مشتمل تھیں۔ ان غزلوں کے مطالعے سے (جو اقبال نے بانگِ درا میں شامل نہیں کیں) یہ معلوم ہوگا کہ جہاں تک غزل سرائی کا تعلق ہے اقبال معاملہ بندی اور وقوع گوئی کی ان تمام منزلوں سے گزرے ہیں جن کا سراغ داغ کے کلام میں ملتا ہے۔" (شعرِ اقبال صفحہ ۱۴۲)

ہم فاضل نقاد سے اس باب میں تو متفق ہیں کہ اقبال نے ایسی غزلیں لکھی ہیں جو آپ بیتی پر مشتمل ہیں لیکن تغزل میں اقبال اور داغ کی مکمل مشابہت اور یگانگت سے ہمیں اختلاف ہے۔ داغ اور اقبال دونوں کے کلام کا موازنہ کرنے سے یہ بات بالکل روشن ہوجاتی ہے کہ محبت کی جو لگن اور جو تڑپ اقبال کے ہاں ملتی ہے داغ کا کلام اس سے خالی ہے۔ داغ کے یہاں تو صرف دو گھڑی ہنسی بہلا لینے والی بات ہے۔ ان کے کلام کا تاثر صرف جلد تک محسوس ہوتا ہے۔ اس کے آگے کچھ بھی نہیں۔ لیکن اقبال کے یہاں محبت کی وہ گرمی اور گہرائی نظر آتی ہے جو پتھر کو پارہ اور کسی شئے کو کندن بنا دیتی ہے اور جو ان کے کلام میں ایک مستقل سوز اور کسک بن کر رچی ہوئی ہے۔ ذرا ایک غزل کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں ؛؛ یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

علاجِ درد میں بھی درد کی لذت پہ مرتا ہوں ؛؛ جو تھے چھالوں میں کانٹے نوکِ سوزن سے نکالے ہیں

پوری کی پوری غزل ایک آہنگ میں کہی گئی ہے اور اول سے آخر تک ایک میٹھے میٹھے درد میں ڈوبی ہوئی ہے یہ ایک ایسی کسک ہے جو آنکھوں سے آنسو تو جاری کر دیتی ہے۔ لیکن آہ نہیں کرنے دیتی۔ ۱۹۰۲ء کی ایک غزل کے دو اشعار سنئے۔ یہ غزل اقبال نے اپنے انتخاب میں شامل نہیں کی۔

دل کی بستی عجیب بستی ہے ؛؛ لوٹنے والے کو ترستی ہے

تابِ اظہارِ عشق نے لے لی ؛؛ گفتگو کو زبان ترستی ہے

ان جیسے اشعار کا سلسلہ داغ سے نہیں ملایا جا سکتا۔ ہمیں توقع ہے کہ ایسے اشعار جو جذبے کی شدت اور سچائی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے اقبال نے حذف کر دیئے۔ خارجی شہادتوں کے بغیر بھی ہم ایسے اشعار سے حقیقت بیانی اور وقوع گوئی کے قائل ہو جاتے ہیں اور اقبال کے اندازِ بیان سے واردات قلب کی پُر خلوص ترجمانی پر ایمان لائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ منتخب کلام کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

میرے مٹنے کا تماشہ دیکھنے کی چیز تھی ؎ کیا بتاؤں ان کا میرا سامنا کیونکر ہوا

بُت کے لیے دل ڈھونڈ کوئی ٹوٹنے والا ؎ یہ وہ مے ہے جسے رکھتے ہیں نازک آبگینوں میں

یُوں تو لے بزمِ جہاں دلکش تھے ہنگامے ترے ؎ اک ذرا افسردگی تیرے تماشاؤں میں تھی

تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد ؎ مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت ؎ اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

خصوصیت کے ساتھ غزلوں کے مقطع اس سلسلہ میں ہماری بڑی رہنمائی کرتے ہیں اور اُن سے غزلوں کا اصلی رنگ بھی نکھرتا ہے دیکھئے ؎

خبر اقبال کی لائی ہے گلستاں سے نسیم ؎ نو گرفتار پھڑکتا ہے تہِ دام ابھی

نہ پوچھ اقبال کا ٹھکانہ ابھی وہی کیفیت ہے اس کی ؎ کہیں سرِ رہ گزار بیٹھا ستم کشِ انتظار ہوگا

مل ہی جائے گی کبھی منزل لیلیٰ اقبال ؎ کوئی دن اور ابھی بادیہ پیمائی کر

میں نے اے اقبال یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث ؎ بات جو ہندوستان کے ماہ سیماؤں میں تھی

مرے اشعار اے اقبال کیوں پیارے نہ ہوں مجھ کو ؎ مرے ٹوٹے ہوئے دل کے یہ دردِ انگیز نالے ہیں

ایک قلم زد کیا ہوا مقطع ہے :

اقبال عشق نے مرے سب بل دیے نکال ؎ مدّت سے آرزو تھی کہ سیدھا کرے کوئی

اقبال خود اس کا معترف ہے کہ اس کی علم کوشی جو ایک قسم کا فرار تھی۔ اسے تسکینِ خاطر مہیا نہ کر سکی اور اس آگ کو نہ بجھا سکی جو اس کے دل میں بھڑک رہی تھی :

پا گئی آسودگی کوئے محبت میں وہ خاک ؎ مدتوں آوارہ جو حکمت کے صحراؤں میں تھی

حسن کی تاثیر پہ غالب نہ آسکا تھا علم ؎ اتنی نادانی جہاں کے سارے داناؤں میں تھی

فرار کی بات آگئی ہے تو اتنا کہتے چلیں کہ اقبال نے فرار کے بہت سے طریقوں پر عمل کیا۔ لیکن اس درد کا مداوا نہ ہو سکا جو اسے ہندوستان سے یورپ تک لے گیا۔ اور جس نے آخر میں اس کی شاعری کا رُخ بھی موڑ دیا۔ البتہ اقبال کا احساسِ حرماں کبھی اس پر اتنا قابو نہ پا سکا کہ وہ فانی کی طرح سپر انداختہ ہو کر موت میں سکون ڈھونڈتا یا میر تقی میر کی طرح صرف اسی کا ہو رہتا۔ اس نے غمِ جاناں کو غمِ روزگار میں بھلانے کی کوشش کی۔ لیکن غم سے اسے چھٹکارا یہاں بھی نہ مل سکا۔ البتہ وہ شعلہ جو ابتداء میں بھڑک رہا تھا آخر کار راکھ میں دبی ہوئی چنگاری کی صورت اختیار کر گیا۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے :-

آہ دُنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں ؎ پہلوئے انساں میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اقبال کے محرکاتِ شعر گوئی میں عشق کو مرکزی مقام حاصل ہے جس نے اس سے ابتداء میں غزلیں کہلوائیں اور پھر بتدریج ملی شاعری کی طرف اسے ملتفت کر دیا۔ جسے ہم اپنی مذہبی عقیدت کی رو سے اس کی شعر گوئی کا ترفع کہہ لیتے ہیں۔ اس کی کچھ غزلوں میں داغ کے کلام کی شوخی، روزمرہ اور محاورہ وغیرہ جیسی خصوصیات داغ کی شاگردی کا فیضان ہیں۔ لیکن بعد میں اپنے استاد طبیعت کی مناسبت سے اس نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں سوز و گداز اور کسک کے ساتھ ساتھ لہجے کا دھیماپن بھی پایا جاتا ہے اور ان خصوصیات

یں اس کا سلسلہ میر تک جا پہنچتا ہے۔ فرار پسندی میں اقبال اور فانی دونوں شریک ہیں لیکن فانی زندگی کی تاب نہیں لاتا اور اقبال جینے کی ایک راہ نکال لیتا ہے۔ بقول ایک نقاد کے غالب کا عشق ایک بانکے شہزادے کا عشق ہے اور بقول خود وہ جس پہ مرتے ہیں اسے مار رکھتے ہیں؛

اقبال کے ہاں یہ بات نہیں ہے۔ اس کا عشق جزو ایمان ہے۔ وہ جس پر مرتا ہے اسے جینا بھی سکھاتا ہے۔ یہاں ہمیں بے ساختہ مہاتما بدھ کی یاد آتی ہے جنھوں نے چوٹ کھا کر عرفان حاصل کیا تو اپنی نجات کے ساتھ ساتھ دوسروں کی نجات کا بھی انتظام کر دیا۔ جن میں سب سے پہلے ان کی بیوی بھکشنی بن کر ان کے بنائے ہوئے عورتوں کے سنگھ میں شامل ہوئی۔ (اقبال ... ۱۹۷۰ء لاہور)

"کچھ نستعلیق کے بارے میں"

امتیاز علی عرشی

اردو زبان جس خط میں لکھی جاتی ہے وہ نستعلیق کہلاتا ہے۔ یہ لفظ دراصل "نسخ" اور "تعلیق" دو عربی لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ روزمرہ کی بول چال میں نسخ و تعلیق کو پورا ادا کرنا مشکل تھا۔ اس لیے زبان کی خراد نے "خ" اور "و" کو چھیل کر ہلکا پھلکا سا لفظ نستعلیق بنا لیا۔

یہ لفظ جن دو لفظوں سے مرکب ہے وہ بھی مستقل خطوں کے نام ہیں۔ ان میں کا پہلا نسخ آج تک زندہ اور عربی زبان کے لکھنے میں کام آتا ہے۔ تعلیق کا چلن بہت دن ہوئے کہ جاتا رہا۔

یہ دونوں خط ایک اور خط سے بنے ہیں۔ جو عام طور پر "کوفی" نام سے مشہور ہے اور مدت سے متروک ہے۔ کوفی خط اس عربی خط کی اصلاحی شکل کا نام ہے جو عرب میں اسلام سے پہلے مروج تھی۔ چونکہ اسلام کے ابتدائی عہد میں کوفہ حکومت کا مرکز اور علوم و فنون کا مخزن قرار پا چکا تھا اس لیے قدیم خط نے بھی وہاں اپنے پر پرزے درست کیے اور اسی کی نسبت سے "کوفی" کہلانے لگا۔

اس خط میں اونچائی کم اور گولائی زیادہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصر کے اہرام کی بنیادیں ابھر کر چھوڑ دی گئی ہیں۔ یا پھر بھاری بھرکم ہاتھ پاؤں جکڑے، چوڑے منہ اور سپاٹ ناک نقشے والے بونوں کی پلٹن پرا جمائے کھڑی ہے۔

دسویں صدی عیسوی تک پہنچ کر بھی بول چال سے لوگوں کے معیارِ حسن میں سادگی کے ساتھ پرکاری بھی آ گئی۔ اس کا اثر فنونِ لطیفہ کی دوسری شاخوں کی طرح خط پر بھی پڑا۔ اس صدی کے آخر یا گیارہویں صدی کے شروع میں بغداد کے ایک وزیر ابن مقلہ نے اس مسالے سے تحفۂ خط ثلث، محقق، اور توقیع نکالے اور پھر ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری لمبائی کم کرنے سے خط نسخ پیدا کیا۔

ابن مقلہ نے بس اسی پر نہ کی، بلکہ محقق میں نزاکت بڑھا کر "ریحان" اور توقیع میں سادگی اور روانی زیادہ کر کے "رقاع" بھی ایجاد کیا۔ مگر ان سب میں نسخ کے اندر رعنائی زیادہ تھی، اس لیے فنکاروں نے سب سے زیادہ اسی کی طرف توجہ کی۔ اور چودھویں صدی میں یاقوت مستعصمی کے ہاتھوں اس خط کے حسن کی تکمیل ہو گئی۔ بعد میں جس قدر خطاط گزرے ہیں وہ سب کے سب یاقوت کے متبع اور پیرو ہیں۔

یوں تو عبداللہ صیرفی، عبداللہ طباخ ہروی اور شمس کاتب شیرازی وغیرہ اس عہد کے مشاہیر میں گنے جاتے ہیں۔ مگر شمس شیرازی کا اختصاص یہ ہے کہ خط نسخ کا ایک انداز "شیرازی نسخ" کے نام سے عرصے تک زبان زد رہا۔

نستعلیق کا دوسرا جزو تعلیق عربی میں لٹکانا کا مترادف ہے۔ کتابوں کے مشکل الفاظ یا مطالب کی تشریح و توضیح کے سلسلے میں اہل علم برجستہ کچھ کچھ کتاب کے حاشیوں پر یا بین السطور میں لکھ دیا کرتے تھے اور انھیں تعلیقات کہتے تھے۔ عموماً یہ نوٹ اپنے ذاتی استعمال کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اسی بنا پر مطلقاً سادہ خط میں ہوتے تھے۔ خواجہ تاج الدین سلمانی نے اس سادہ رواں انداز تحریر کے اصول اور ضابطے بنائے۔ اور اسے "خط تعلیق" کا نام دیا۔ یہ نام بعد میں مختصر ہو کر صرف "تعلیق" رہ گیا جس طرح "زبان اردوئے معلی" نے رفتہ رفتہ صرف "اردو" کی شکل اختیار کر لی ہے۔

خواجہ میر علی تبریزی نے جو پندرھویں صدی عیسوی کے مشہور خطاط ہیں "تعلیق" میں "نسخ" کی باضابطگی نزاکت اور لوچ کی رنگ آمیزی کر کے اس کا نام "نسخ و تعلیق" رکھا۔ یہ کام کچھ ایسے مبارک وقت انجام دیا گیا تھا کہ نستعلیق سارے خطوط کا تاج نہیں تو سب پر حاوی ضرور ہو گیا۔ اور اتنا عام کہ آئندہ اسی سے "شفیعا" اور "شکست" اختراع کیے گئے۔

خط نسخ ہندوستان میں مسلمانوں کی ابتدائی آمد کے ساتھ ہی وارد ہو گیا تھا۔ مگر اس نے مشرقی ہندوستان پہنچ کر ایک مخصوص رنگ اختیار کیا۔ جو "خط بہار" کہلاتا ہے۔ اس میں ثلث اور توقیع کی آمیزش کے ساتھ کسی قدر کوفی کی شان بھی پائی جاتی ہے اور پٹھانوں کی عمارتوں کی طرح سادگی و قوت کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔

اکبر کے ابتدائی عہد سے شیرازی نسخ کا اثر بڑھتا نظر آتا ہے یہاں تک کہ نادر شاہ کے حملۂ ہندوستان کے بعد شیرازی و ہندی امتزاج کی شکل پیدا ہوتی ہے جس کے سب سے بہتر لکھنے والے قاضی عصمت اللہ خاں دہلوی تھے۔

بہار اور دہلوی انداز کے ساتھ کشمیری اسکول کا ذکر بھی ضروری ہے۔ کشمیر کی آب و ہوا اور لطافت و حسن نے اکثر ایرانیوں کو بھی اپنی طرف کھینچا ہے۔ خود کشمیریوں میں بھی جمالیاتی ذوق اور صنعت و فن کا زبردست ولولہ پایا جاتا ہے۔ انھوں نے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد کے ایرانیوں سے فن خطاطی سیکھ کر ایک نئی راہ نکالی۔ اس طرز خط میں دہلوی کی سی نزاکت نہ تھی۔ کشمیریوں نے اس کمی کو نقاشی سے پورا کرنے کی کوشش کی اور گلکاری میں ہندیوں سے بازی لے گئے۔

نستعلیق خط بابر کی آمد ہندوستان سے بہت پہلے یہاں روشناس ہو چکا تھا۔ چنانچہ امیر خسرو مرحوم کی مثنویوں اور دواوین کے چند ایسے نسخے رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ہیں جو پندرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے اندر لکھے گئے تھے۔ مگر اس کی حقیقی ترقی اور عام رواج اکبر کے عہد کے ایرانی خطاطوں کی بدولت ہوا۔ جہانگیر و شاہجہاں کے زمانے میں بھی دیسی اور بدیسی خطاط اس فن کی آبیاری کرتے رہے۔ مگر جس خطاط کا سلسلہ آئندہ ملک کے طول و عرض میں پھیلا وہ ایران کے شہرۂ آفاق استاد میر عماد حسنی کا بھانجا اور شاگرد آغا عبدالرشید دیلمی ہے۔ یہ عہد شاہجہاں میں وارد ہند ہوا۔ اور تا آخر بادشاہ کی قدردانی کے سائے میں فن کی خدمت کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی ماحول نے عماد کی شان میں بھی جدت پیدا کی اور ایک تیکھا انداز لکھنؤ کے نام سے اس بزم میں شریک ہوا۔ میر عوض علی ملیح آبادی کے ساتھ یہ رنگ رامپور پہنچا اور اتنا مقبول ہوا کہ وہاں کے عوام و خواص سب اسی خانوادے کے سلسلۂ شاگردی میں منسلک ہیں۔

اس رنگ کے مشہور استاد الٰہی بخش مرحوم رقم اور محمد علی خاں شوق رقم ہیں۔ میر احمد حسن مرحوم نے جو منشی علی محمد خاں مرحوم کے استاد تھے، الٰہی بخش مرحوم اور شوق سے ہی اصول فن سیکھے لیکن بعد میں عمادی شان میں لکھنے لگے تھے۔

خط نستعلیق اپنے نوک پلک کی انتہائی نزاکت اور دوائر و مدات کی سخت اصولی پابندیوں کے باعث روزمرہ کی ضرورت میں آسانی سے کام نہیں آ سکتا تھا اس لیے مرزا شفیع ثانی ایک خوش نویس نے عہد شاہجہاں میں ایک خط "شفیعا" کے نام سے ایجاد کیا۔ یہ نستعلیق کے دائروں کو چھوٹا کرنے اور بعض حرفوں کو دوسروں کے ساتھ خلاف اصول ملا دینے اور نوکوں کی باریکی کو کم کر دینے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہندوستانی منشیوں نے شفیعا کو اور رواں کرنا چاہا تو نتیجہ شکست یا گھسیٹ کی شکل میں نکلا۔

(سہ ماہی "کتاب"، کراچی۔ ۱۹۷۷ء)

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

■ فکرِ اقبالؔ   مرتبین: ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر مغنی تبسم   ناشر: اقبال صدی تقاریب کمیٹی۔ حیدرآباد

اس اقبالؔ صدی میں فکرِ اقبال کی نئی جہتوں کی تلاش سے جہاں نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں وہیں یہ احساس بھی ہوچلا ہے کہ اقبالؔ پر تحقیق اور تلاش کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ اقبالؔ فکر و شعر کا ایسا سمندر ہے جس کے کنارے دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتے۔ پچھلے چند سالوں سے اقبال شناسی اور اقبال فہمی کے سلسلے میں جو کوششیں ہو رہی ہیں اس ہی سلسلے کی ایک کڑی زیرِ نظر کتاب "فکرِ اقبالؔ" ہے جس میں بارہ مقالہ نگاروں کے مقالات شامل ہیں۔ یہ وہ مقالے ہیں جو کل ہند اقبال صدی تقاریب کمیٹی کی جانب سے منعقد کیے گئے، اقبال سیمینار میں پڑھے گئے۔

موضوعات کے اعتبار سے اس کتاب میں وہ مقالے بھی ہیں جو نئے موضوعات اور نئے زاویوں کو لیے ہوئے ہیں اور بعض ایسے مقالے بھی اس کتاب میں شامل کر دیے گئے ہیں جس میں تنقید اور جدت کا فقدان دکھائی دیتا ہے جنھیں ہم مطالعہ کی دین کہہ سکتے ہیں۔

اقبالؔ پر کتابیں پڑھتے ہوئے اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے لکھنے والوں نے اپنا زورِ قلم مغربی مفکرین سے اقبالؔ کا موازنہ اور تقابل کرنے میں صرف کیا ہے اور دوسرے امور کی جانب ان کی نظر کم ہی گئی ہے یا پھر انہوں نے اختلاف برتا ہے۔

فکرِ اقبالؔ کا ابہام، اقبالؔ مذہب اور سائنس، اقبالؔ کا نظریۂ اجتہاد، اقبالؔ اور فرنگی ایسے مقالے ہیں جو نئے ڈھنگ سے لکھے گئے ہیں اور جن میں موضوع اور مواد کی ندرت بھی شامل ہے۔

اقبال اور مغربی فکر، اقبالؔ کا نصب العین انسان، میں نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ انسان کی تقدیر اور وقت فکر انگیز مقالہ ہے جو اقبالؔ کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

فارسی سے نابلد نئی نسل کو اقبالؔ کے فارسی کلام سے متعارف کرنے کے سلسلے میں جگن ناتھ آزاد کی کوشش قابلِ ستائش ہے۔ حمید عشقی، اسلوب احمد انصاری اور راج بہادر گوڑ کے مضامین بھی قابلِ مطالعہ ہیں۔ ڈاکٹر مغنی تبسم نے پیش لفظ میں تمام مضامین کا خلاصہ دے دیا ہے تاکہ اقبالؔ فہمی میں مدد مل سکے۔ اس کتاب کا نام "فکرِ اقبالؔ" کی بجائے کچھ اور ہوتا تو مناسب ہوتا کیونکہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب فکرِ اقبال کے نام سے پہلے ہی موجود ہے۔ نام دہرانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ کتابت اور طباعت اچھی، سرورق دیدہ زیب ہے۔ پندرہ روپے کے عوض یہ کتاب سستی ہے اور اقبالؔ کے قارئین کے لئے ناگزیر ہے۔

(قدیر اشتیاق)

■ جامِ شعور (مجموعۂ کلام سید اطہر حسین اطہر) ۲۵۶ صفحات۔
مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ۔ قیمت ۱۶ روپے

یہ مجموعۂ کلام بہترین کتابت و طباعت، درجۂ اول کا کاغذ، دیدہ زیب ڈسٹ کور سے آراستہ جب ہاتھ میں رہتا ہے تو خیال ہوتا ہے کہ بیرونی چمک دمک کے پیچھے شاید مسندِ افکارِ پریشاں کے سوا کچھ نہ ہو۔ کیونکہ انتظامیہ کی ملازمت کے چکر میں پھنسا انسان اپنی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لانے کی فرصت سے بھی محروم ہوتا ہے۔ لیکن جناب اطہر کے کلام کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ گوہرِ نایاب خاشاک کے تلے بھی گوہرِ نایاب ہی رہتا ہے۔

ہے کائنات میں اطہر مری حقیقت کیا خلش یہ رکھتی ہے ہر وقت سوگوار مجھے

اپنی حقیقت کو پہچاننے کی خلش کا سوگ جناب اطہر نے منایا ہے۔ یہ بات خود اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ جوہر ذاتی حالات کا تابع نہیں ہوتا۔ اگرچہ بقول اطہر ؎

عمر گذری ہے تلاطم میں تمہاری اطہر تم کو گردشِ حالات نے رونے نہ دیا

جناب اطہر کے کلام میں ہم خیالات کی بلندی، زبان کے چٹخارے اور غمِ دوراں و غمِ جاناں دونوں کا اظہار بڑے پاکیزہ انداز بیان میں پاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ مجموعہ علم و ادب کی انجمنوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

(غلام جیلانی)

■ رات کا سفر (افسانے) مصنف: قدیر زماں

آج اردو افسانہ داستانوں، جن پریوں کے قصوں، رومانی المیوں اور طربیوں، زندگی کی ناہمواریوں اور تلخیوں سے گذر کر ذات کے حصاروں میں راستہ ٹٹول رہا ہے۔ حقیقت پسندی و سماجی شعور کی بجائے جدید تر افسانوں میں کردار کی ذہنی رَو کو پیش کیا جا رہا ہے نظریہ کی جگہ نظم بنے لگا ہے۔ چونکہ اشاراتی عنصر کو تمام اصنافِ ادب میں اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس لئے افسانہ بھی اس سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ چنانچہ اب نئی نسل کے افسانہ نگاروں نے تجرید اور علامت کو ایک رجحان کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

اس تناظر میں قدیر زماں کے افسانوی مجموعہ "رات کا سفر" کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ قدیر زماں نے جب افسانہ نگاری شروع کی تو ترقی پسندی کے چل چلاؤ کا زمانہ تھا۔ لیکن ابھی اس کے اثرات پوری طرح زائل نہیں ہوئے تھے اس لئے قدیر زماں کے ابتدائی افسانوں پر حقیقت پسندی کا اثر نمایاں ہے۔ اس قبیل کے افسانوں میں "دودھ کے دانت" اور "گیلا کفن" کا شمار ہوتا ہے۔ مالتی کی طرح کھٹنے دودھ کے ایک ایک گھونٹ کے لئے ترستے ہیں تو مبارک کی طرح کئی بوڑھوں کی حسرتیں دل ہی دل میں پامال ہو جاتی ہیں۔ ان کا افسانہ "امن کی بستی" سیاسی موضوع لئے ہوئے ہے، جس میں نام نہاد امن پسندوں کے فریب کو آشکار کیا گیا ہے۔ اور ان کے چہروں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جو بنام امن جبر و ظلم کو روا رکھتے ہیں۔ قدیر زماں نے یہ افسانے ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۶ء میں لکھے۔ اس کے بعد گیارہ سال تک ان کا قلم خاموش رہا۔ ایک طویل عرصہ کے بعد ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں انھوں نے پھر افسانہ نویسی کی طرف توجہ کی ہے۔ ان کی تازہ ترین کہانیوں میں "آوازیں" روایتی طرز کا رومانی افسانہ ہے، جس میں جبران اور سلمٰی کی محبت پر آوازیں اٹھتی ہیں۔

دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں کیونکہ وہ ہم مذہب اور ہم وطن نہیں تھے ۔ مگر پیار کی سچائی سے یہ بودی دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں ۔ "رات کا سفر" ایک ایسا افسانہ ہے جو ہمیں پھر سے طلسماتی فضا میں لے جاتا ہے ۔ دراصل یہ ایک خواب ہے جس کو حقیقت سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔ افسانہ کا انداز اچھوتا اور روایتی ڈگر سے ہٹا ہوا ہے ۔ "ہیرے کا زخم" "دھند" اور "دیوار کا آدمی" علامتی افسانے ہیں ۔ ان میں "دیوار کا آدمی" کو خصوصیت حاصل ہے اگرچہ افسانہ کا آغاز قصہ چہار درویش کی یاد دلاتا ہے مگر اشارتی عنصر اور نئی تکنک نے اس افسانہ کو جدید تر افسانہ بنا دیا ہے ۔ "دیوار کا آدمی" نہ صرف اس مجموعہ کا سب سے کامیاب علامتی افسانہ ہے بلکہ اس افسانہ کی شمولیت نے اس مختصر سے مجموعہ کو وزنی بنا دیا ہے ۔

قدیر زماں نے ۹ کہانیوں کے اس مجموعہ کے ذریعہ بسیار نویسوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے ۔ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس مجموعہ کی اچانک اشاعت کے ذریعہ ادب میں شب خون مارا ہے لیکن یقین ہے کہ اس کا یہ رات کا سفر منقطع نہیں ہوگا بلکہ طلوع صبح کے بعد بھی وہ اردو ادب کو اپنی چونکا دینے والی کہانیوں سے مالا مال کریں گے ۔

"رات کا سفر" جولائی ۷۷ء میں مکتبہ شعر و حکمت حیدرآباد کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے ۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت معیاری ہے ۔ خوبصورت سہ رنگی سرورق ڈاکٹر مغنی تبسم کی فن کارانہ چابکدستی کا مظہر ہے ۔ یہ مجموعہ پانچ روپے میں ناشر کے علاوہ مصنف کے پتہ فلیٹ ۹ الکم ٹیکس کالونی، رام کرشنا پورم، سرور نگر حیدرآباد سے حاصل کیا جاسکتا ہے ۔

(وہاب عندلیب)

■ نوح ناروی (حیات اور شاعری) مصنف : ڈاکٹر ظفر الاسلام ظفر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ ۔ قیمت ۱۶ روپے

نوح ناروی اردو کے ممتاز غزل گو شاعر تھے اور نیاز فتح پوری کے الفاظ میں زبان کی صفائی اور محاورات کا برمحل استعمال نوح ناروی کی وہ خصوصیت ہے جسے شاید انھیں کے ساتھ ختم ہوجانا ہے ۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان کے انتقال سے لال قلعہ کی ایک اور اینٹ گر گئی ۔ نوح ناروی کی شخصیت بھی ایسی کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک تہذیب بھی تھے اس لئے جب ان کے انتقال کی خبر ماہر القادری تک پہونچی تو بے ساختہ ان کے منہ سے نکلا "کشتی نوح بھی گرداب میں آگئی اور موت کے طوفان نے نا خدائے سخن کی زندگی کے سفینہ کو غرق کر کے چھوڑا ۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے"۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں ـــــ ظفر الاسلام ظفر نے نوح ناروی کی حیات اور شاعری کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کر نہ صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی بلکہ اردو کے سوانحی مواد میں اچھا خاصہ اضافہ بھی کیا ہے ۔ اس کتاب کو انہوں نے چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے ۔ اور اس طرح نوح ناروی کے حالات زندگی، نوح ناروی حیدرآباد میں، مقبولیت، تصانیف، تلامذہ، فن اور ضمیمہ میں ملفوظات اور ادبی سفر کا احوال بھی آگیا ہے ۔ اس کتاب کا مطالعہ اہل اردو کیلئے یوں بھی دلچسپ ہے کہ اردو کے اہم مراکز میں اردو تہذیب کی جھلکیاں بھی پیش کی گئی ہیں ۔ خصوصاً حیدرآباد کے مشاعروں کا حال دلچسپی کو دوبالا کرتا ہے ۔ ظفر الاسلام نے اپنے عام فہم اور سلیس انداز بیان سے نوح ناروی کی حیات اور شاعری کو اور بھی دلچسپ بنا دیا ہے ۔ اس طرح اردو کے سوانحی سرمایہ میں یہ ایک اچھا اضافہ کیا ہے ۔ (طیب انصاری)

★ ایک ادبی انجمن مغل اکیڈیمی کے بانی حکیم تیموری سرپرست ماہنامہ "قلمکار" کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ تیموری شگفتہ مزاج طبیب، سخنور اور مخلص بزرگ تھے۔ حیدرآباد کی کئی شعری محفلوں کے سرپرست کی حیثیت سے انھیں یاد رکھا جائے گا۔

۱۴ر جولائی: طلباء اور نوجوانوں کی کمیٹی برائے اُردو کا ایک وفد جناب لطف الدین کی قیادت میں ریاستی گورنر محترمہ شاردا مکرجی سے ملا اور دس نکاتی میمورنڈم حوالہ کیا۔ جس میں مطالبہ کیا ہے کہ "اُردو کا قانونی موقف بحال کیا جائے اور دیرینہ تعلیمی مسائل کی جلد یکسوئی کی جائے۔"

۲۴ر جولائی:- ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی مجلسِ انتظامی کا اجلاس ایوانِ اُردو میں صدر ادارہ پروفیسر سید علی اکبر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سالانہ بجٹ کی توثیق کی گئی اور محترمہ بلقیس علاؤ الدین کو رکن کی حیثیت سے نامزد کیا گیا۔ اس اجلاس میں مسز حامد علی عباس نائب صدر، ہاشم علی اختر معتمد اور اراکین محمد اکبر الدین صدیقی، رحمٰن راج سکینہ اور غلام جیلانی نے شرکت کی۔

★ جناب مجارت چند کھنہ ڈائرکٹر ریاستی اُردو اکیڈیمی نے نمائندہ "سیاست" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اکیڈیمی اُردو کتابت کے تربیتی کورس کی تجویز کو روبہ عمل لانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اکیڈیمی کی طرف سے فنِ عروض سے متعلق پروفیسر ابوظفر عبدالواحد کی مفید کتاب "آہنگِ شعر" طباعت کے مراحل طے کر رہی ہیں اور دو کتابیں بھی جلد ہی شائع ہوں گی۔ جناب کھنہ نے بتایا کہ اکیڈیمی نے سالِ رواں میں ادبی، تحقیقی اور شعری مسودات کی اشاعت کی غرض سے تقریباً تیس سے زائد اصحاب کو جملہ ۴۵ ہزار کی امداد منظور کی ہے۔

۲۶ر جولائی: مرکزِ خوشنویسی (قائم کردہ ترقی اُردو بورڈ، وزارتِ تعلیم حکومتِ ہند) ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے طلباء و طالبات کا دو روزہ سالانہ امتحان بیرونی ممتحن جناب عابد حسین (خوشنویس) کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ سالِ اول اور سالِ دوم کے طلباء و طالبات کا نتیجہ بغرض توثیق ڈائرکٹر ترقی اُردو بورڈ دہلی کو بھیجوایا گیا۔ حیدرآباد میں اُردو خطاطی اور خوشنویسی کا یہ مرکز گزشتہ چار سال سے جناب عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" کی نگرانی میں فنِ خطاطی و خوشنویسی کو روزگار کا ذریعہ بنانے میں معاونت کر رہا ہے۔ جس کی افادیت اور کارکردگی کو دانشوروں، ادیبوں اور قائدین نے وقتاً فوقتاً معائنہ کے بعد بہتر اور مثالی قرار دیا ہے۔ مرکزِ خوشنویسی میں جملہ (۲۵) امیدواروں کو تربیت دی جاتی ہے۔ تدریس کے فرائض مسز محمد عبدالغفار اور غوث محمد خاں انجام دیتے ہیں۔

۲۸ر جولائی: جناب منوہر لال بہار کے شعری مجموعہ "بہارستان" کی رسمِ اجراء مسٹر کرشن دت پرنسپل ہندی آرٹس کالج نے انجام دی۔ جناب عابد علی خان ایڈیٹر سیاست نے اس خوشگوار تقریب کی صدارت کرتے ہوئے بہار صاحب کی گنگا جمنی شخصیت اور ان کی کلاسیکی غزلیہ شاعری کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ مسٹر سریندر لاہوتی نے بھی مخاطب کیا۔ جناب علی احمد جلیلی کی صدارت میں اُردو، ہندی کا ملا جلا مشاعرہ منعقد ہوا، کئی شاعروں نے کلام سنایا۔ اُردو سبھا کی طرف سے راجہ لال راجہ نے شاعر کی گلپوشی کی۔

★ ریاستی محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ کی ڈائرکٹر مسز راحیم سبحانی نے اُردو ہفتہ وار "وقت و صداقت" کی رسمِ اجراء انجام دیتے ہوئے صحافیوں کو مشورہ دیا کہ وہ صحافت کی اعلیٰ قومی روایات کے علم بردار بنیں۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے اس جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ "آندھرا پردیش ایک تلگو اسٹیٹ ہے مگر یہاں کی حکومت اُردو اخبارات سے بھی مکمل انصاف کی پالیسی پر کاربند ہے" ڈپٹی اسپیکر جناب سید رحمت علی، جناب رحیم قریشی صدر ریاستی اُردو صحافتی جرنلسٹ اسوسی ایشن اور جناب عجاز دار افسر سب ایڈیٹر انگاڑے نے بھی مخاطب کیا۔

۲۹ر جولائی: بزمِ سعدی کا ادبی اجلاس و مشاعرہ نظام ٹرسٹ اُردو لائبریری میں بصدارت ڈاکٹر میر طاہر علی خان منعقد ہوا۔ ڈاکٹر شریف النساء انصاری نے "ایران کے شب و روز" کے عنوان پر مخاطب کیا۔ آخر میں فارسی کا مشاعرہ ہوا۔ جس میں ڈاکٹر اسلم، نور محمد نور، ہمتی موسوی، مرزا سرفراز علی، شفیق سبحری، راشد نقوی اور قدیر نعیمی نے کلام سنایا۔

(بقیہ صفحہ ۵۵ پہ دیکھئے)

(نذرِ مخدوم)

○

پیکرِ ناز سے چھلکے مئے ریحان و گلاب
جام اس کا ہے اٹھالے جو نظر سے پہلے
جوش کس وقت ہم آہنگِ جنوں ہو جائے
تلملے رقص کریں عزمِ سفر سے پہلے

اک تماشہ ہی پہ موقوف نہیں ہے دنیا
گردشیں اور بھی ہیں شام و سحر سے پہلے

جذبۂ دل نے یہ احساس دلایا ہے مجھے
کوئی منزل ہے ہر اک راہگذر سے پہلے

ہاتھ اٹھتے ہیں بصد عجز و تمنا لیکن
بے حقیقت ہے دعا سوزِ جگر سے پہلے

مجھ سے مت پوچھ تری ہستیٔ نیرنگ کا راز
کس نے دیکھا ہے تجھے میری نظر سے پہلے

کتنے افسانے سلگ جاتے ہیں یادوں کے جلیل
دل میں اٹھتی ہوئی آہوں کے شرر سے پہلے

رشید عبدالسمیع جلیل

روشنی دے کے تو جلا کوئی
خود اندھیروں میں کھو گیا کوئی

یا مجھے اذنِ گفتگو دے دو
یا کہیں سے کہو میرا کوئی

رات کل درد کی کسک بن کر
میرے پہلو میں سو گیا کوئی

پھر ادب پروری کے ہیں چرچے
پھر ادب دوستو! جلسہ کوئی

تیرگی، یاس، درد، تنہائی
دل میں کیا کیا سمو گیا کوئی

یہ ضروری نہیں ہے اے مظہر
میرے جیسا بھی ہوا برا کوئی

مظہر محی الدین

اب نہ دروازہ کھلے گا نہ دریچہ کوئی
چاند نکلے گا نہ جھانکے گا سویرا کوئی

چھاؤں پیڑوں کی نہ دیوار کا سایہ کوئی
زندگانی ہے کہ تپتا ہوا صحرا کوئی

گھر کے کانٹوں میں بھی ہنستا رہا پھولوں کی طرح
شعر کہتا رہا شاداب و شگفتہ کوئی

تیرہ و تار سہی راستہ دشوار سہی
آپ روشن تو کریں داغِ تمنا کوئی

وہ بھی دن آئے گا سب دیکھتے رہ جائیں گے
چھوڑ کر سب کو نکل جائے گا تنہا کوئی

دل کے ہاتھوں میں تھما دیجئے بہل جائے گا
آرزوؤں کا دل آویز کھلونا کوئی

زخم در زخم ہے افسانہ در افسانہ سہیل
اس کو کیا دیکھے گا کیا اس کو پڑھے گا کوئی

سہیل احمد سہیل

سن اجراء ۱۹۳۸ء   فون نمبر: ۳۸۴۹۹

ماہنامہ

بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

سب رس
حیدرآباد

جلد: ۴۰   شمارہ: ۹

ستمبر ۱۹۷۷ء

زر سالانہ: ۱۲ روپے، ششماہی: ۷ روپے، فی شمارہ: ایک روپیہ پچیس پیسے

ترتیب

پبلشر: سید علی اکبر   مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد   مقام اشاعت: ادارۂ ادبیات اردو پنجہ گٹہ

اداریہ

ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اپنے عہد کے ان خوش فکر، خوش مذاق اور خوش وضع باکمالوں میں سے تھے جنھوں نے سخت سے سخت حالات میں بھی بدسلیقگی اور بے تہی سے سمجھوتا نہیں کیا۔ ان کے انتقال کو پندرہ برس ہوگئے ہیں اور یہ زورؔ صاحب کی شخصیت اور خدمات کا تصرف ہے کہ ان کی یادوں کے چراغ بدستور روشن ہیں اور اُمید ہے کہ اُن کا اُجالا بڑھتا ہی رہے گا۔ جو کام بھی خلوص، لگن اور نیک نیتی سے کیا جائے، تاریخ کے لاشعور میں اس کی گونج کسی نہ کسی طرح محفوظ ہو ہی جاتی ہے اور پھر اِس سے برابر لہریں اُبھرتی رہتی ہیں۔ زورؔ صاحب کی شخصیت کی دلکشی اور دلآویزی کا ایک اِمتیاز یہ بھی تھا کہ وہ ایک سطح یا ایک جہت کے آدمی نہ تھے۔ اُن کے وجود میں کئی انسان بیک وقت کارفرما رہتے تھے، وہ اِنسان جس کو ادبیات سے شغف تھا وہ اِنسان جس کو دکن کی مٹی اور یہاں کے کلچر پر ناز تھا، وہ اِنسان جو ہندوستان کی روح سے ہم کلام ہونے کا ذوق و وجدان رکھتا تھا، وہ انسان جو تصوف کی اعلیٰ اقدار کا امین تھا اور وہ انسان جو اِنسان سے محبت کرتا تھا اور خدمتِ خلق اور خدمتِ علم و ادب کو شعار رکھتا تھا اور اِس شعار کے ذریعہ حلقۂ شام و سحر کا اسیر محض نہ رہ کر لمحۂ گزراں سے ماورا ہونے کی ہمت و آرزو رکھتا تھا۔ نہ جانے کیوں میں جب بھی اُن کی شخصیت کی موہنی کا سوچتا ہوں تو میرے سامنے محمد قلی قطب شاہ کا چہرہ اُبھرتا ہے، گولکنڈہ و بیجاپور کے اونچے چبوترے، بھاری دیواریں، گچ کے گنبد، کشادہ محرابیں اور کھلا نیلا آسمان اُبھرتا ہے۔ بھاگ متی کے بلکے گہرے نقوش، پھولوں کے اوس سے دُھلے رنگ، کدم راؤ پدم راؤ کی خوابناک کشش، گھوڑوں کے سُم، موسیٰ کی طغیانی، چندر بدن کی تڑپ، نظامی و وجہی و نصرتی و غواصی و مقیمی کی کیف آفریں آوازیں کنور منوہر و مدمالتی اور پھول بن اور نوزر صاحب ... زورؔ صاحب ان سب کا عطر مجموعہ تھے، قدیم سے جدید کا رشتہ جوڑنے والے وہ بیسویں صدی میں بھی تھے اور ماضی میں بھی، صرف ماضیٔ قریب میں نہیں بلکہ اُس ماضی میں بھی جس کی جڑیں

اجنتا کے غاروں کے پُراسرار ستونوں میں چھپی ہوئی ہیں۔

زورؔ صاحب سے مل کر دکن کے ماضی و حال، آج و کل، شائستگی و لطافت اور علمیت و ادبیت سب سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ سعادت برسوں حاصل رہی ہے وہ جب جب دہلی تشریف لاتے ملاقات ضرور ہوتی۔ اکثر کاموں میں مشورہ فرماتے اور میں ان کا ہاتھ بٹاتا۔ مجھے اب تک یاد ہے، مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بنانے کا خیال زورؔ صاحب ہی کا تھا۔ دہلی میں ہمایوں کبیر سے ایک ملاقات کے دوران اس کا نقشہ واضح ہوا۔ اور اس کے آئین و مقاصد کا پہلا خاکہ تیار کرنے کا کام زورؔ صاحب نے میرے سپرد فرمایا۔ ایسے بیسوں علمی و ادبی نیز ثقافتی کاموں پہ زورؔ صاحب کی نظر رہتی تھی لیکن سب سے زیادہ لگاؤ انھیں ادارۂ ادبیاتِ اُردو سے تھا، اس کے لئے انھوں نے گھر کی زمین دی، جگہ جگہ سے مخطوطات اور عطیات جمع کئے اور ہمیشہ اس کی ترقی و توسیع کے لئے کوشاں رہے۔ ان کی علمی ادبی اور شخصی روایتوں کو زندہ رکھنا اور ان کے کاموں کو فروغ دینا اُن سب پر فرض ہے جنھیں اُردو سے اور دکن سے اور مشترکہ کلچر سے محبت ہے اُمید ہے کہ ایسے لوگوں کی بدولت زورؔ صاحب کی امیدوں اور آدرشوں کا سفر جاری رہے گا۔

(پروفیسر) گوپی چند نارنگ

دبستانِ دکن کے باکمال اور آخری مُعلّم ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں ہم مرحوم کی ایک اہم اور روشن تحریر "قندِ مکرّر" کے تحت شامل کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ زورؔ صاحب کے سماجی شعور پر "جامعہ عثمانیہ" کے ایک ذہین طالب علم کے معروضی خیالات شائع کر رہے ہیں۔ "سب رنگ" کے کالموں میں ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کا خاکہ مطبوع ہو رہا ہے اس خاکہ سے ڈاکٹر زورؔ کی کئی جہتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چند شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت اس امر کا شاہد ہے کہ اربابِ سخن کو ڈاکٹر زورؔ کی علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے والہانہ عشق رہا اور اب بھی ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی پندرھویں برسی کے موقع پر ادارہ کی طرف سے ۹/ اکٹوبر کو ریاستی وزیر قانون جناب آصف پاشا کی صدارت میں ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے عزیز شاگرد جناب محمد منظور احمد لکچرر گورنمنٹ سٹی کالج نے "یادِ زورؔ" کا پروگرام بنایا ہے اور وہی اس جلسہ کی نظامت بھی کریں گے۔ ڈاکٹر زورؔ کے احباب اور اُن کے شاگردوں کے علاوہ اُن سے بے پناہ تعلق رکھنے والے اہلِ قلم و سخنور "یادِ زورؔ" میں اپنے رشحاتِ قلم کے ذریعہ خراجِ عقیدت ادا کریں گے جن میں ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر سیدہ جعفر، پروفیسر محمود حسین، جناب رمن راج سکسینہ، محترمہ لئیق صلاح اور محترمہ ناز صدیقی (ریسرچ اسکالر) کے علاوہ محترمہ بانو طاہرہ سعید، امیر احمد خسرو، رؤف خلش اور صادق نقوی قابلِ ذکر ہیں۔ ہم ان تمام کی نگارشات کو بلا سب اس میں شائع کر رہے ہیں — (و، خ)

قند مکرر

ڈاکٹر محی الدین قادری زور

یہ جو اردو زبان ہماری ہے

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اس میں ہزاروں سال سے قسم قسم کی زبانیں اور بھانت بھانت کی بولیاں رائج رہی ہیں۔ اس کے مختلف حصے اپنی آب و ہوا، رسم و رواج اور لباس و طرز معاشرت کی رنگا رنگی کے باعث ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور متضاد خیالات و کیفیات کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن ان تمام رنگینیوں کے باوجود ایک خاص مشرقی شان اور تمدنی آن اس پورے برصغیر میں شروع ہی سے جلوہ گر رہی ہے۔ اور اس تمام ملک میں طرز خیال کی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے پہلے سنسکرت زبان اس کے بعد پالی اور سب سے آخر میں اردو نے بہت بڑا حصہ لیا ہے۔

اردو زبان دراصل سنسکرت اور پالی کی جانشین ہے جس طرح سنسکرت اور پالی کا ایک خاص کلچر تھا ایک خاص رنگ تھا جو کشمیر سے کاموروپ تک اور سندھ و گجرات سے آسام تک پھیل گیا تھا اور پورے ہندوستان کے رہنے والوں کو خواہ وہ نسل کے لحاظ سے دراوڑی ہوں یا آریائی، ہند چینی ہوں یا مونڈا، اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا تھا۔ اسی طرح اردو نے بھی تمام ہندوستان کو متاثر کیا اور وسیع سرزمین کے گوشے گوشے میں پہونچ کر وہاں کی زبانوں پر اثر انداز ہوئی اور خود بھی ان کا اثر قبول کیا۔ جس طرح سنسکرت اور پالی نے ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں کو اپنے اثر و اقتدار کے زمانے میں ختم نہیں کیا اسی طرح اردو نے بھی "جیو اور جینے دو" کا عملی مظاہرہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا سے اردو زبان و ادب کے جو مرکز رہے اور جہاں اردو کے بڑے بڑے شاعر و ادیب اور سرپرست بادشاہ اور مربی امیر پیدا ہوئے وہاں کی مقامی زبانیں بھی برابر سرسبز و شاداب رہیں اور اردو کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئیں۔

گجرات میں مظفر شاہیوں کے دور میں اردو کے بڑے بڑے شاعر شاہ علی جیو، گام دھنی اور میاں خوب محمد چشتی جیسے پیدا ہوئے اور اردو کی بیسیوں مثنویاں اور کتابیں لکھیں۔ لیکن گجراتی زبان برابر قائم رہی اور وہاں کی اردو گجراتی کے لفظوں اور محاوروں سے شاداب ہوتی رہی۔ بیجاپور میں جو کنڑ زبان کا مرکز تھا اردو کے ایسے شاعر اور فنکار پیدا ہوئے جن پر اردو آج بھی ناز کرتی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی، نصرتی، علی عادل شاہ، ہاشمی اور رستمی کے اردو کارناموں میں کنڑ زبان اور کرناٹکی قوم کے الفاظ اور خیالات بھی موجزن ہیں۔ اور وہاں خود کنڑی زبان بھی پھلتی پھولتی رہی۔ گولکنڈہ اور حیدرآباد میں جو آندھرا قوم اور تلگو زبان کے وسط میں واقع ہے گزشتہ پانچ سو سال سے اردو کا رواج رہا اور یہیں محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی اور جیسے شاعر و ادیب پیدا ہوئے جن کے شاہکاروں میں تلگو الفاظ بھی موجود ہیں۔ مگر تلگو بھی ساتھ ساتھ ترقی کرتی رہی اور اس طویل عہد میں اردو دست

بادشاہوں اور امیروں نے تلگو کی بھی مساویانہ سرپرستی کی۔ احمد نگر اور اورنگ آباد علاقہ مہاراشٹرا کے دل تھے اور وہاں صدیوں اردو کا طوطی بولتا رہا۔ اور ولی اور سراج جیسے عظیم الشان شاعر پھلے پھولے۔ مگر مرہٹی بھی برابر پروان چڑھتی رہی۔ آگرہ جو برج بھاشا کی رگ جان تھا میر تقی میر، نظیر اکبرآبادی اور مرزا غالب کو جنم دیتا ہے جو اردو شعر و سخن کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اکبر اعظم کے عہد ہی سے برج بھاشا بھی وہاں شعر و ادب کا مخزن بنی رہی اور بڑے بڑے ہندو شاعروں کے علاوہ عبدالرحیم خان خاناں جیسے شاعر بھی اس زبان میں پیدا ہوئے۔

غرض جہاں بھی اردو نے اپنا ڈیرہ ڈالا خود بھی پروان چڑھی اور مقامی زبان کو بھی آگے بڑھایا۔ اس کی تازہ مثال کے طور پر کشمیر ہی کو لیجئے کہ یہاں اردو قدرے دیر سے روشناس ہوئی تھی لیکن اس نے اپنی پیشرو زبانوں سنسکرت اور فارسی کے مقابلے میں کشمیری زبان کے ساتھ نہ صرف فیاضانہ سلوک کیا بلکہ اہل کشمیر کو کشمیری کی طرف متوجہ کرنے کا باعث بھی بنی۔ سنسکرت اور فارسی کے دور میں زبان، علم و ادب اور شعر و سخن کے لئے اتنا زیادہ استعمال نہیں کی گئی جتنا اردو کے دور دورے کے بعد پروان چڑھ رہی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کشمیر میں اب اردو کا رواج کم ہو رہا ہے۔ اردو بھی پھیل رہی ہے اور ترقی کر رہی ہے اور کشمیری اور اس کے ساتھ ڈوگری بھی ریاست جموں و کشمیر میں تازہ و توانا ہو رہی ہے۔

اردو کے اس صدیوں کے طریقہ کار اور مسلسل رواداری انداز میں اس کی تاریخ کا وہ راز چھپا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ عالم وجود میں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کا آغاز ہی قومی یکجہتی کے احساس اور باہمی ہم آہنگی کی ضرورت کا نتیجہ تھا۔ اس کی بنیاد ایک ایسے زمانے میں پڑی جب کہ پورا ہندوستان مختلف ریاستوں اور علاقائی ٹولیوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور سنسکرت بولنے والے آریاؤں کی طرح ایک نئی قوم ہندوستان میں داخل ہو کر اس سرزمین کو اپنا وطن بنا رہی تھی اور اپنے ساتھ ایران و توران اور عراق و عرب کی ہوائیں اور نت نئی خصوصیتیں لا رہی تھی۔ اس قوم کے افراد پہلے پنجاب اور سندھ میں آباد ہوئے اور ۱۱۹۲ء کے بعد دلی اور دوآبہ گنگ و جمن میں داخل ہوئے۔ اور گنگا جمنا کی زرخیز وادیوں کو ایک نئی تہذیب و تمدن سے مالا مال کر دیا۔ ایک ایسی رنگا رنگ تہذیب سے جس نے آخرکار قطب مینار، تاج محل اور لال قلعہ جیسے اعلیٰ ثقافتی شاہکاروں کو جنم دیا۔

جب یہ لوگ ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ سمرقند و بخارا، اصفہان و شیراز، بغداد، بصرہ اور شام و لبنان کی قدیم ترین تہذیبوں اور شائستگیوں کا عطر لیتے آئے جس کی خوشبو اہل ہند کیلئے نئی بھی تھی اور روح پرور بھی۔ اس کے علاوہ اس ملک کی قدیم اور بنیادی خصوصیتوں کے ساتھ ہم آہنگ بھی تھی۔ مہاتما بدھ کی اہنسا کی تعلیم کے ساتھ اسلام کا تصور تسلیم و رضا بھی میل کھاتا تھا۔ اور مختلف بھی تھا۔ اہل ہند اس نئے رنگ کو تعجب و تجسس کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اور نو واردان بنا بر ہند یہاں کے فلسفہ، علوم اور سماج کی رنگا رنگی میں دلچسپی لینے لگے۔ اور دونوں طرف یہ کوشش شروع ہوئی کہ ایک دوسرے کو سمجھیں اور ایک دوسرے کے قریب آئیں۔ اس لین دین اور قرب و اتصال کے لئے ضروری تھا کہ اشاروں کنایوں سے آگے بڑھ کر ایک ایسی بولی اختیار کریں جس میں کچھ یہاں والوں کے شبد ہوں اور کچھ نوواردوں کے الفاظ۔ انہی رنگا رنگ الفاظ کی آمیزش کو بعد میں ریختہ یا ہندوی کہا گیا۔

یہ ہندوی سب سے پہلے پنجاب میں بنی اس لئے کہ وہیں دو سو سال تک قومی یکجہتی کی کوششیں ہوتی رہی تھیں۔ اور اس کے بعد دلی اور آگرہ میں۔ لیکن ابھی دلی اور آگرہ کی زبان کا اثر اس نئی بولی پر پوری طرح پڑنے نہ پایا تھا کہ اس کے بولنے والے

علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کے زمانے میں فوجوں میں دکن چلے گئے اور دکن میں یہی ناٹکی کھڑی زبان سات سو سال تک وہاں کی بھانت بھانت کی زبانوں کے درمیان پروان چڑھتی رہی ۔ جو لوگ دوآبہ گنگ وجمن میں رہتے ان کی زبان برج بھاشا ' ہریانوی اور مغربی ہندی کی دوسری شاخوں سے متاثر ہونے لگی ۔ اور آخر کار وہ زبان بن گئی جس کو کھڑی بولی کہتے ہیں ۔ اور جو اب اردو اور ہندی کے دو جداگانہ روپوں میں الگ الگ نام اور رسم الخط کے ساتھ پورے ہندوستان اور پاکستان میں جاری و ساری ہے ۔ پنجاب میں اردو نے قومی یکجہتی کے جو کامیاب تجربے کئے ان کے بارے میں اگرچہ تفصیلی معلومات امتداد زمانہ کے باعث مفقود ہو گئیں لیکن جب سلاطین تغلق کے دور میں دلی میں پھر اس قسم کی ساعی شروع ہوئی اور فیروز شاہ تغلق نے بطور خاص اس کی طرف توجہ کی تو اس دور کے سب سے بڑے شاعر اور موسیقار حضرت امیر خسرو نے اردو ہی کو قومی یکجہتی کا آلۂ کار بنایا انہوں نے ہندوستانیوں اور ان کے حکمراں ترکوں کو ادب و شاعری و موسیقی ہی کے ذریعہ سے ہم آہنگ و ہم خیال بنانے کی سعی میں کامیابی حاصل کی ۔ اور اپنی دھن غزلوں اور سہیلے گیتوں سے تہذیب و شائستگی کی نئی قدروں کو جنم دیا ان کے سوز بھرے گیت گھر گھر پہنچے ۔ اور ان سے لطف اندوز ہونے والوں کے آپس میں پھر ہندی یا ترکمانی کا امتیاز باقی نہ رہا ۔ یہ دراصل خسرو کے دل کا سوز اور روح کا نور تھا جس نے اس زبان کو بہت جلد مقبول بنا دیا ۔

ساتھ ہی امیر خسرو کی ادبی دیانت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اس قومی یکجہتی کے آغاز کا سہرا اپنے ہی سر باندھ لیں ۔ انہوں نے اپنے دیوان " غرۃ الکمال " کے دیباچہ میں صاف صاف لکھ دیا کہ میں پہلا شخص نہیں ہوں جو اس زبان میں غزل اور گیت لکھ رہا ہوں بلکہ مجھ سے پہلے لاہور میں ایک شاعر مسعود ابن سعد ابن سلمان نے بھی اس زبان میں گیت لکھے ہیں ۔

امیر خسرو کے بعد اردو کے ذریعہ سے قومی یکجہتی کی کوشش کرنے والوں کا کارواں آگے چل پڑا ۔ اور ہندوستان کے ہر خطے میں اس کے علمبردار کھڑے ہو گئے ۔ بہار میں حضرت شمس الدین یحییٰ منیری ۔ دکن میں حضرت صدر الدین ' محمد حسینی بندہ نواز ' گجرات میں حضرت شاہ علی جیو گام دھنی ایسے بزرگ نظر آتے ہیں جو ... اھ یعنی قریباً ۱۵۰۰ء سے قبل ہندوستان کی قومی یکجہتی میں اس زبان سے کام لیتے رہے تھے ۔ یہ بزرگ ہندو اور مسلمان کی اصطلاح میں سوچتے ہی نہ تھے ۔ ان کے نزدیک خلق خدا کے مسائل ایک ہی نوعیت اور یکساں اہمیت پر مبنی تھے ۔ اور وہ اپنی فارسی اور عربی زبان کی مسندوں سے نیچے اتر کر ہندوی یا اردو کے فرش پر آ بیٹھے تھے ۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے فیض پانے والوں کو رنگ و نسل یا زبان و لباس کے تفرقوں میں الجھائیں ——— صوفیوں کے ساتھ ساتھ اس دور کے بادشاہوں اور امیروں نے بھی اردو کی غیر معمولی قوت کو تسلیم کر لیا ' وہ سمجھ گئے کہ صوفی اس کے ذریعہ سے فقیری میں بادشاہی کر رہے ہیں اور عوام اور خواص جوق در جوق ان کے گرد جمع ہونے لگے ہیں اور ان کے خیالات و ارشادات فرمانوں اور احکام شاہی سے زیادہ عوام میں مقبول اور رائج ہو رہے ہیں ۔ اب انہوں نے بھی ترکی و فارسی کے دفتروں اور ایوانوں کو رفتہ رفتہ خیرباد کہنا شروع کیا اور اردو کے لئے ایسے ایوان اور شبستان تعمیر کئے جن میں اردو کے علاوہ مقامی زبانوں کے قلم کار اور ادیب بھی باریاتے اور انعام و اکرام سے سرفراز ہو کر جانے لگے ۔

ایسے ہی شگفتہ ماحول میں بیجاپور اور حیدرآباد جیسے شہروں کی تعمیر ہوئی ۔ بیجاپور کا بادشاہ ابراہیم عادل شاہ ثانی عوام میں صدیوں تک جگت گرو کے لقب سے یاد کیا جاتا رہا اور آخر کار حیدرآباد کا محمد قلی قطب شاہ آج تک حیدرآباد کے گلی کوچوں میں یاد کیا جاتا ہے اور اردو کے خطے اس کی قائم کی ہوئی روایات اس ملک کے گوشے گوشے میں اب تک زندہ و پائندہ ہیں ۔ چنانچہ انہی کی بنا پر آندھرا میں قطعی طور پر اردو کو بھی علاقائی زبان مان لیا گیا ۔ حالانکہ ہندوستان کی کسی اور صوبائی ریاست میں سوائے کشمیر کے اس کو یہ حیثیت باوجود جدوجہد کے آج تک حاصل نہ ہو سکی ۔ (باقی صفحہ ۲۲ پر)

ڈاکٹر غلام عمر خاں

اقبال کا تصورِ تعلیم

تعلیم کے جدید تصوّر میں، بالعموم نوجوانوں کی ذہنی اور کسی حد تک جسمانی تربیت کا مفہوم شامل ہے۔ قدیم قرنوں میں تعلیم مذہبی پیشواؤں کی نگرانی میں دی جاتی تھی، اور عام نہیں ہوا کرتی تھی۔ تعلیم کے نئے دور کا آغاز یونانیوں کے عہد سے ہوتا ہے۔ جنھوں نے ذہنِ انسانی کو قدیم توہمات سے آزادی دلانے میں بڑا حصہ لیا۔ اور انسانی فکر پر عمیق اثرات چھوڑے۔ یونانی تعلیم کا اثر اہلِ روما کے تعلیمی نظام پر ہوا۔ اور اس طرح عہدِ وسطیٰ اور موجودہ دنیا تک اس کے اثرات پہنچے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں یورپ میں نشاۃ الثانیہ کے ساتھ تعلیم کو زبردست ترقی ہوئی۔ اور متعدد جامعات اس زمانے میں قائم ہوئیں۔

لیکن تعلیم کے موجودہ دور کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے جب کہ مملکت یا State نے تعلیم کا ذمہ لیا۔ تعلیم کو عام بنایا گیا۔ اور مملکت کے غیر مذہبی تصور کے پیشِ نظر، تعلیم کو بھی غیر مذہبی حیثیت دی گئی۔ عورتوں کے لئے بھی وہی تعلیم تجویز ہوئی جو مردوں کے لئے۔ اور متعدد نئے مضامین، جو سائنس اور صنعتی ترقی کا نتیجہ تھے، تعلیم کے نصاب میں شامل کیے گئے۔ رفتہ رفتہ تعلیم نے یورپ میں قوموں کی رہنمائی کرنے والی قوت کی حیثیت سے، مذہب کی جگہ حاصل کرلی۔

عہدِ حاضر کے مشہور امریکی ماہرِ تعلیم، جان ڈیوی کے نزدیک، تعلیم کا مقصد، مملکت یا جماعت کے مفاد کی خاطر، جماعت کی سرگرمیوں میں دانشمندانہ حصہ لینے والے شہری پیدا کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں انسان، سماجی حیوان ہے۔ سماج کے بغیر فرد کی زندگی دشوار ہے۔ اس لئے انسان کو سماجی زندگی کے قابل بنانا، تہذیبی نقطۂ نظر سے تعلیم کا مقصد ہے۔ پھر سماج کے ایک خود مکتفی اور آزاد رکن کی حیثیت سے، فرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرے۔ اس لئے جدید تعلیم افراد کی فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم (Technical & Vocational Education) کو بھی اپنا مقصود قرار دیتی ہے۔ لیکن جدید رجحان یہ ہے کہ محض تہذیبی (Cultural) تعلیم، چونکہ افراد کی معاشی خوشحالی کی ضمانت نہیں دے سکتی اس لئے دورانِ تعلیم، تہذیبی پہلو کے مقابلہ میں، فنی اور پیشہ ورانہ پہلو پر ابتدا ہی سے زور دیا جائے۔ جدید تعلیم کا تہذیبی منتہا، اعلیٰ نصب العین تک تخلیق کرنا نہیں، بلکہ نوجوانوں کو مملکت کے دوسرے شہریوں کے ساتھ مل کر، سماجی زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے۔ اکہ وہ معاشرہ میں رہ کر معاشرہ کو نقصان پہونچائے بغیر، خوشحال زندگی گزار سکیں۔ اور اپنی صلاحیت کے مطابق، معاشرتی زندگی کے مختلف شعبوں کو آگے بڑھانے میں حصہ لے سکیں۔

تعلیم کا یہ تصور، انسانیت کے ان عظیم المرتبت معلمین (Educators) کے نزدیک عامیانہ" بلکہ مریضانہ ہے۔ جو فطانت کے ایک اعلیٰ اور برتر نمونے کی پیدائش پر مصر ہیں۔ اور اسی کو عالم انسانی کے موجودہ مصائب کا علاج" اور طبع انسانی کے انحطاط و زوال کا درماں تصور کرتے ہیں۔ اس خصوص میں عہد حاضر کے دو عظیم معلمین اقبال اور نٹشے کے خیالات میں مخفی اختلافات کے باوجود بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

ایک مخصوص تہذیب یا کلچر کا انسانی شخصیت پر مسلط کر دیا جانا، ایک مخصوص تہذیب کا انسانی خون میں سرایت کر جانا، یہی اقبال اور نٹشے، دونوں کے نزدیک تعلیم کا نصب العین ہونا چاہیے۔ اور یہ نصب العین جامعات کے اساتذہ اور کتب خانوں کی مدد سے عمل جامہ پہن سکتا ہے، اور نہ بچے کی ابتدائے عمر میں، فروبل اور مانٹی سوری کے تعلیمی طریقوں کی مدد سے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے نٹشے اور اقبال دونوں کے نزدیک، صرف عظیم شخصیتیں درکار ہیں۔ ایسے انسان، جن کی شخصیت کی کشش، ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے اور جن کی محبت میں ہر خس و خاشاک کیمیا بن جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں ہمارے ملک میں خود اقبال اور گاندھی جی کی شخصیتیں Educator کی مثالیں پیش کرتی ہیں۔ موجودہ زمانے میں جے پرکاش نارائن کی شخصیت بھی انہیں خطوط پر ابھر رہی ہے۔ ایسے عظیم المرتبت معلمین ہی قوموں کی تقدیر بناتے ہیں۔ قوم میں ایسی ایک جلیل القدر شخصیت کی موجودگی بھی اس کے نوجوانوں پر رازِ حیات افشا کر جاتی ہے۔

گزشتہ صدی میں، جرمنی کے نظام تعلیم پر تنقید کرتے ہوئے نٹشے ایسے عظیم معلمین کے فقدان کو اس نظام کی بنیادی خامی قرار دیتا ہے، اور یہی اس کے نزدیک جرمن تہذیب کے انحطاط و زوال کا سبب ہے۔ جرمنی کے نظام تعلیم کے کھوکھلے پن پر نٹشے کی یہ تنقید عہد حاضر کے مروجہ تمام نظام ہائے تعلیم پر بھی بعینہٖ صادق آتی ہے، وہ لکھتا ہے:

" ہر وہ چیز جو اہمیت رکھتی ہے جرمنی کے اعلیٰ تعلیمی نظام میں نظر انداز کر دی گئی ہے۔ لوگ فراموش کر دیتے ہیں کہ تعلیم تہذیب و تربیت کے طریق عمل کی حیثیت سے، بجائے خود ایک مقصد ہے۔ نہ کہ مملکت یا State۔ وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اس مقصد کے لئے معلم Educator درکار ہے نہ کہ پبلک اسکول کا مدرس اور یونیورسٹی کا عالم۔ ایسے معلمین درکار ہیں جو خود اعلیٰ تہذیب کے علمبردار ہوں، فائق اور رفیع الشان دماغ، جو یہ ثابت کر سکیں کہ وہ ان خوبیوں کے حامل ہیں۔ اور اپنی زندگی کے ہر لمحہ میں اپنے قول اور رجحانات میں، تہذیب کی پختہ اور رسیدہ پیداوار ہیں۔ نہ کہ تعلیم یافتہ "گنوار" یا ناتراشیدہ عالم" جو ملک کے نوجوانوں پر، اعلیٰ اتالیقوں کی طرح، پبلک اسکولوں اور جامعات کی طرف سے مسلط کر دیے جاتے ہیں۔ شاذ و نادر مستثنیات کو چھوڑ کر وہ شئے جو جرمنی میں مفقود ہے، وہ تعلیم کی شرط اولین ہے۔ یعنی معلمین۔ اور یہی بنیادی سبب ہے جرمن تہذیب کے انحطاط و زوال کا ۔۔۔ جرمنی کے اعلیٰ مدارس جو کام انجام دے رہے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کے ایک وسیع مجمع کو ممکنہ کمترین وقت میں بے حسی اور اجڈپن کے ساتھ تربیت دیتے ہیں تاکہ وہ مملکت کے لئے مفید اور قابل استعمال خادم بن سکیں۔"

نٹشے کی طرح اقبال بھی، مملکت کیلئے مفید اور خدمت گزار خادم پیدا کرنے کو تعلیم کا ایک ادنیٰ نصب العین سمجھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد ایک ایسی قومی تہذیب کا انسانی رگ و ریشے میں سرایت کر جانا ہے۔ جو خودی کی پوشیدہ صلاحیتوں کی

شیرازہ بندی کرسکے ۔ اور خودی کی پوشیدہ توانائی کے حق میں ایک اشتعال انگیز عامل EXPLOSMANT کا کام انجام دے سکے ۔ اور یہ مقصد مدرسوں اور جامعات کے موجودہ تعلیمی نظام سے پورا نہیں ہوسکتا ۔ موجودہ تعلیم ایک حریت بخش قوت کی حیثیت سے عقل کو آزاد تو ضرور کرجاتی ہے جو اقبال کے الفاظ میں "لا" یا نفی اقدار یا Negation of Values کی منزل ہے ۔ لیکن نفی اقدار کی منزل کے بعد' قدروں کے کسی طاقتور نظام کے اثبات کے ذریعہ' وہ منتشر اور پریشان افکار کی ترکیب کا کوئی سامان نہیں کرتی ۔ قدروں کے ایک طاقتور نظام کے اثبات کے بغیر' انسان کے قوئی ذہن و عمل کی شیرازہ بندی نہیں ہوسکتی ۔ اور شخصیت کی منتشر قوتیں' ایک نقطہ پر مرتکز ہو کر وہ اعلیٰ تخلیقی قوت پیدا نہیں کرسکتیں جو سوزِ یقین یا سوزِ عشق کی بدولت ممکن ہے۔

ضربِ کلیم میں اقبال "تعلیم و تربیت" کے عنوان کے تحت عصرِ حاضر کے تعلیمی نظام کی اسی خامی کی طرف اشارہ کرتے ہیں ؎

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی اس زمانے کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام
مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

علم و حکمت کی روشنی' دماغ کو منور تو ضرور کردیتی ہے لیکن اس میں وہ قوت محرکہ وہ Dynamic force مفقود ہے جو انسان کو خود اعتمادی' خود آگاہی اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ' ماحول پر اثر انداز ہونا سکھاتی ہے ۔ اور جو شخصیت کی تمام تر قوتوں کو' ایک بنیادی نصب العین پر مرکوز کر کے' جوہر خودی کو مشتعل کرنے کا باعث ہوتی ہے ۔ اس کے بغیر انسان' ذات کے حقیقی کیف و سرور سے ناآشنا رہتا ہے ۔ لیکن جوہر خودی کی کشادگی سوزِ یقین یا سوزِ عشق کے بغیر ممکن نہیں ۔ جو ایک صاحب عشق یا مردِ کامل کے فیضِ صحبت کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتا ۔ ضربِ کلیم میں تربیت کے عنوان کے تحت اقبال اسی حقیقت کی صراحت کرتے ہیں ؎

زندگی کچھ اور شے ہے علم ہے کچھ اور شے زندگی سوزِ جگر ہے علم ہے سوزِ دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہلِ دانش عام ہیں' کمیاب ہیں اہلِ نظر کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ
شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

نطشے کی طرح اقبال بھی ایک عظیم معلم' ایک عظیم الشان حرکی Dynamic شخصیت کو سارے تعلیمی نظام کی روح سمجھتے ہیں اس کے بغیر کسی قوم کا تعلیمی نظام' اپنی جامعات' اساتذہ' کتب خانوں' مدرسوں' بازی گاہوں' طفل تربیت گاہوں کے باوجود محض بے جان رہتا ہے ۔ اقبال طالب علم کی زندگی میں اسی زبردست کمی کے پورا ہونے کی تمنا کرتے ہیں ۔ کیونکہ ایک حرکی شخصیت کے فیض ہی کی بدولت' خودی کی بیداری ممکن ہے جو تمام قوت تخلیق کا سرچشمہ ہے ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

ذیل کے اشعار میں بھی اقبال نے ایک عظیم معلم کی حرکی شخصیت کا نقشہ کھینچا ہے جو ایک قومی تہذیب کی تخم ریزی کے ذریعہ

انسان ایک اعلیٰ اور برتر نمونے تخلیق کرتا ہے ؎

آگ اس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو — لاکھوں میں ایک بھی ہو اگر صاحبِ یقیں

پرورش دل کی اگر مدِ نظر ہے تجھ کو — مردِ مومن کی نگاہِ غلط انداز ہے بس

دنیا کو ہے اس مہدیٔ برحق کی ضرورت — ہو جس کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

ذہنِ انسانی کی تربیت اور نشوونما اور اس کے ذریعہ علومِ طبعی sciences کی تحصیل' اقبالؔ کے نزدیک تعلیم کا ایک اہم جزو ہے لیکن اقبالؔ، تعلیم جدید کے اس اصول کا ابطال کرتے ہیں کہ علوم کو شخصیت کے اعلیٰ جوہر کی گرفت سے آزاد کر دیا جائے۔ شخصیت کے اعلیٰ جوہر سے مراد انسانی اور اخلاقی قدریں ہیں۔ جنھیں مجموعی حیثیت سے روحانی قدروں سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب علم و حکمت، شخصیت کے اعلیٰ جوہر کی گرفت سے آزاد ہو جائیں اور شخصیت کا ادنیٰ جوہر' علم و حکمت کی رہنمائی کرنے لگے تو علم و حکمت اقبالؔ کے الفاظ میں "ابلیس کا حربہ" ثابت ہوتے ہیں۔ اور نوعِ انسانی کی رہزنی کا باعث ہوتے ہیں —
اسی خیال کو رومیؔ نے ان دو مصرعوں میں اس طرح واضح کیا تھا ؎

علم را بر تن زنی مارے بود — علم را بر دل زنی یارے بود

حاصل یہ کہ جدید تعلیم' اقبالؔ کے نقطۂ نظر سے ادھوری' نامکمل اور بے جان تعلیم ہے۔ جو شخصیت کے صرف ایک جزو یعنی ذہنِ انسانی کی تربیت اور نشوونما کو' اپنا مقصود قرار دیتی ہے۔ اقبالؔ کے نظریۂ تعلیم کی اساس یہ ہے کہ انسان کے بنیادی ولولۂ حیات vital force میں' ایک خروش اور حرکت و ہیجان پیدا کیا جائے۔ جذبۂ حیات' ولولۂ حیات یا اقبالؔ کی اصطلاح میں جذبۂ عشق کی یہ بیداری انسان کی کامل شخصیت کی بیداری ہے جو شخصیت کی ہر جہتی توسیع اور نشوونما کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔
اقبالؔ تعلیم کے اسی نصب العین کی صراحت کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

تب و تابے کہ باشد جاودانہ — سمندِ زندگی را تازیانہ

بہ فرزنداں بیاموز ایں تب و تاب — کتاب و مکتب افسون و فسانہ

جوہرِ انسانی کے دھماکے یا explosion کے human atom کے لئے ایک بڑا دماغ لازمی شرط نہیں ہے۔ ایک تڑپتا ہوا دل' اس کی بنیادی شرط ہے۔ انسانی عظمت کا انحصار دل کی خلش و اضطراب کے درجہ پر ہے اور یہی اقبالؔ کے نزدیک انسانی زندگی کا سب سے زیادہ بیش بہا سرمایہ ہے۔ اس خیال کا ادعا ان کے اشعار میں کثرت سے ملتا ہے ؎

در جہاں جز دردِ دل ساماں مخواہ

کسی اور مقام پر کہتے ہیں ؎

زندگی بر آرزو دارد اساس — خویش را از آرزوئے خود شناس

ایک مصرعہ ہے ؏ قسمتِ ہر دل بقدرِ ہائے و ہوست

انسان کے بنیادی جذبۂ حیات میں ایک زبردست حرکت و ہیجان کی پیدائش شخصیتوں کے ظہور کی شرط ہے۔ اور یہ انسانی عظمت ایک بڑے دماغ کے واسطے سے ظاہر ہو سکتی ہے یا اس کے بغیر بھی۔ تعلیم جدید کے اس رجحان پر تنقید کرتے ہوئے' جو دماغی تربیت اور نشوونما کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے' اقبالؔ اربابِ تعلیم کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ نوجوانوں کی سیرت سازی کے

(بقیہ صفحہ ۳۰ پر)

خوشحال زیدی

مقالہ کی تسوید

محقق کا آخری اور اہم کام تحقیقی مقالہ لکھنا ہے۔ تحقیقی مقالہ یا ریسرچ رپورٹ تیار کرنے میں بہت احتیاط، سلیقہ، مدلل اسلوب اور عالمانہ وقار و تمکنت کی ضرورت ہے۔ اس رپورٹ میں محقق اپنی تحقیق کے عنوان، اس موضوع پر کئے گئے کام، تحقیق میں آزمائے گئے وسائل اور طریقۂ کار اور حاصل شدہ مواد کے تجزیاتی نتائج قلمبند کرتا ہے، جس سے اس میدان کے متعلقین اور دیگر قارئین تک وہ تحقیق مقالہ کی شکل میں پہونچ سکے۔ مقالہ اگر خوش سلیقگی سے اصولوں کے تحت لکھا گیا ہے تو دیگر محققین اس تحقیقی موضوع کی تکرار سے بچ جاتے ہیں۔ یہ رپورٹ اس موضوع کے متعلق دیگر مسائل اور تحقیق کی حدود مقرر کر کے مستقبل کے لئے نئی راہیں کھولتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ محقق اپنی رپورٹ کے ذریعہ کسی مخصوص میدان سے متعلق علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اس رپورٹ کے نتائج اور امور سے دیگر محققین کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

محقق اپنی رپورٹ لکھتے وقت درج ذیل سوالات کے جوابات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

۱۔ تحقیقی رپورٹ کی شکل یا خاکہ کیا ہونا چاہیئے؟

۲۔ اس کے حاصل شدہ نتائج اور معروضات کو قلمبند کرنے کے لئے کیا شکل اختیار کرنا چاہیئے؟

۳۔ اس کو اپنی رپورٹ لکھنے کے لئے زبان و ادب کا کیا معیار رکھنا چاہیئے یعنی زبان اور موضوع میں باہمی ربط ہے یا نہیں؟

۴۔ آخر میں اس رپورٹ کو خوش خط لکھنے، لکھانے یا ٹائپ کرانے سے متعلق، مسائل سے کس طرح عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔

مذکورہ بالا سوالات کے پیش نظر محقق کو اپنی رپورٹ کو لکھنے کے اچھے ڈھنگ، اس کی خصوصیات اور اس کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا ضروری ہے کیونکہ اس سے اچھی ترتیب و تنظیم کے ساتھ مقالہ لکھنے میں مدد ملتی ہے۔ تحقیقی مقالہ کی تسوید کے چند اصول ہیں۔ جو کہ تھوڑی بہت تبدیلی یا فرق کے ساتھ عالمی پیمانہ پر سب جگہ بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ تحقیقی مقالہ یا تحقیقی مضامین رسائل ـــــ اسی حیثیت سے شائع کئے جاتے ہیں۔ نیز اس سے قاری کو بھی آسانی رہتی ہے۔

عموماً رپورٹ کے ڈھانچے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) ابتدائی رپورٹ : اس حصے میں درج ذیل باتیں آتی ہیں۔

۱۔ سرورق ۲۔ انتساب (اگر ضروری ہے) ۳۔ دیباچہ ۴۔ فہرست مضامین ۵۔ تصاویر، نقشے، ٹیبل اور چارٹ (اگر

(ب) **رپورٹ کا خاص حصّہ**: یہ رپورٹ کا وہ حصہ ہے جس میں محقق یہ مخصوص باتیں درج کرتا ہے۔
۱۔ تمہید (INTRODUCTOIN) جس میں عنوان کی اہمیت، اس عنوان کے تحت تحقیق کی ضرورت، اس موضوع پر کئے گئے کام، تحقیقی کام کا حوالہ، تنقید و تجزیہ کا عکس، خاص ٹکنیکل الفاظ کی وضاحت کرتے ہوئے، اس تحقیقی موضوع کی حدود متعین کی جاتی ہیں۔
۲۔ وسائل اور طریقۂ کار: محقق نے کن وسائل اور طریقۂ کار کو آزمایا ہے؟ کس لئے؟ کس طرح؟ کہاں کہاں سے اس نے نتائج اخذ کئے ہیں؟
۳۔ تلخیص: اس میں وہ اپنے وسائل اور طریقۂ کار کے تحت کن نتائج پر پہونچا؟ اس کے مطالعہ کی کیا حدود تھیں؟ نیز اس کے بعد تحقیق کے لئے مفید معروضات پیش کرتا ہے۔
(ج) **حوالہ جات مواد**: اس میں کتابیات، فٹ نوٹ (اشارات) وغیرہ کی تفصیل آتی ہے۔
اس خاکہ میں کچھ تبدیلی بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً بہت سے لوگ موضوع سے متعلق تحقیقات کے سلسلے میں الگ خاکہ بھی بناتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے امور میں بھی تھوڑا بہت ردّوبدل کیا جا سکتا ہے لیکن مذکورہ بالا باتیں ہی عموماً تحقیقی مقالے میں آتی ہیں۔ محقق کو اپنے ادارے کے صدر اور نگران سے اپنی تحقیقی رپورٹ تیار کرنے میں رجوع ہونا چاہئے۔
اب ہم تحقیقی مقالے کی رپورٹ کے ان مختلف حصوں کو یہاں تفصیل سے پیش کریں گے۔

۱ ابتدائی مواد
۱۔ سرورق (ٹائٹل صفحہ) سرورق کے تحت درج ذیل باتیں آتی ہیں:
۱۔ موضوع کا عنوان، ۲۔ محقق کا پورا نام، کس نصاب کے لئے یہ مقالہ لکھا گیا ہے۔ ۳۔ تاریخ، سنہ، مہینہ جب یہ مقالہ پیش کیا گیا۔ ۴۔ ادارے کا نام، ۵۔ اگر تحقیقی مقالہ شائع ہو رہا ہے تو ناشر کا نام، تاریخ اور مقام۔
موضوع کا عنوان موٹے حروف میں ہونا چاہئے۔ اگر عنوان کی دو سطریں ہیں تو پہلی سطر لمبی اور دوسری سطر چھوٹی ہونی چاہئے۔ عنوان ایسا ہونا چاہئے کہ قاری اس کو پڑھ کر مقالے کے بارے میں فوراً اندازہ لگا لے۔
۲۔ انتساب (ACKNOWLEDGMENT)
انتساب کی اپنی اہمیت ہے۔ اس میں محقق اپنے نگران، اپنے ساتھیوں اور دیگر لوگوں (جن سے اس تحقیق میں بہت مدد ملی ہے) کے نام اس مقالے کا انتساب کر سکتا ہے۔ انتساب نہایت سادہ مختصر ہونا چاہئے۔ یہ انتساب اس ادارے کے نام بھی ہو سکتا ہے۔
۳۔ دیباچہ یا پیش لفظ: اس میں عموماً محقق اپنی تحقیق، اس کی ہیئت، مقصد اور اس موضوع کی اہمیت کا حوالہ دیتا ہے۔ اس میں وہ ان لوگوں کا شکریہ بھی ادا کر سکتا ہے جن سے اس کو بہت مدد ملی ہے۔ اس کی فہرست بہت زیادہ لمبی نہ ہو۔ عموماً لوگ انتساب کے بجائے ایسے لوگوں کا شکریہ دیباچہ ہی میں کرتے ہیں لہٰذا انتساب صرف کسی ایسے آدمی کے نام کرتے ہیں جس سے محقق اپنے موضوع کے سلسلے میں بہت متاثر ہوا ہو۔ ایسے آدمیوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ ایک یا دو ہوتی ہے۔
فہرست مضامین: اس کے بعد فہرست مضامین ایک یا دو صفحات کی ہوتی ہے۔ اس سے رپورٹ کے پڑھنے والے کو ایک نظر میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کیا کہاں ہے؟ ہر باب کا عنوان موٹے الفاظ میں اور ذیلی عنوان چھوٹے الفاظ میں دیا جاتا ہے۔

۵ ۔ چارٹ نقشے وغیرہ : مقالہ میں جتنی تصاویر، چارٹ، نقشے آتے ہیں ان کی فہرست دی جاتی ہے ۔

رپورٹ کا خاص جزو

۱ ۔ ابتدائیہ : اس جزو میں محقق اپنے موضوع کی اہمیت، ہیئت اور شکل کا تعارف کراتا ہے ۔ اس موضوع سے متعلق جو کام ہوئے ہیں ان کا حوالہ دیتا ہے ۔ ان حدود کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ موجودہ موضوع سے ان تحقیقی کاموں یا مقالوں کا رابطہ قائم کرتے ہوئے اپنے موضوع کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے ۔ موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ اپنے موضوع کی حدود قائم کرتا ہے ۔

اگر یہ ابتدائی باب سلیقہ سے ترتیب دار اور واضح لکھا جاتا ہے تو قاری شروع ہی سے اس مقالے کی اہمیت اور محقق کے وسائل سے واقف ہو جاتا ہے ۔ موضوع کی وضاحت تفصیل سے کرنا چاہیئے ۔ نیز طریقۂ کار اور وسائل (جو اس تحقیق میں اپنائے گئے ہیں) کو ترتیب وار لکھنا چاہیئے ۔

۲ ۔ طریقۂ کار اور وسائل : اس باب میں محقق اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ یہ تحقیقی کام کس طرح کیا گیا ۔ طریقۂ کار اور وسائل کو وضاحت سے پیش کر کے محقق اپنی تحقیق میں اس کے استعمال اور حاصل شدہ نتائج کی وضاحت کرتا ہے ۔ عموماً ممتحن بھی اسی حصہ کو زیادہ غور سے دیکھتے ہیں کیونکہ یہ حصہ تحقیق کی روح اور محقق کی کارگزاریوں کا صحیح آئینہ دار اور کسوٹی ہوتا ہے ۔ ساری تحقیق کی کامیابی اور ناکامی اسی حصے پر منحصر ہے ۔ اس باب میں پیش کئے گئے تجزیاتی نتائج عموماً گہرے مطالعہ اور محنت کا نتیجہ ہوتے ہیں ۔ محقق اس باب میں مثالوں کی تعداد نوعیت، اعداد و شمار کی شکل، طریقۂ انتخاب، طبقات، فکری طور پر اثر انداز ہونے والے کوئی دیگر عناصر نیز کب اور کن حالات میں یہ نتائج اخذ کئے گئے ۔ ان سب کی تفصیل اس باب میں آتی ہے ۔ ساتھ ہی جن چیزوں نے تحقیق میں پوری طرح معاونت نہیں کی، اس کا سبب، تجربات کی شکل اور طریقۂ کار، جواب دہندہ کو دی گئی ہدایت، اگر اس سے قبل کوئی تحقیقی مقالہ اس موضوع پر لکھا گیا ہے تو اس کے نتائج اور موجودہ تحقیق کیلئے منتخب کئے گئے وسائل وغیرہ کا تعین اور ان کا مفصل و مکمل بیان ہوتا ہے ۔ اس کے تحت محقق اس وسیلے کا بیان (وسیلے کا تجزیہ اور تنقید جسکو تحقیق میں آزمایا گیا ہے) بھی اس باب میں ہوتا ہے ۔ نیا وسیلہ اپنایا ہے یا پچھلی تحقیق پر ہی آزمودہ طریقہ کار ہے یا اس میں تبدیلی کی گئی ہے ۔ تو اس کے طریقہ کار وغیرہ کی تفصیل دی جاتی ہے ۔

یہ تمام معلومات کبھی ایک ہی باب میں چند ذیلی عنوانات کے تحت ترتیب وار دی جاتی ہیں ۔ یا پھر متعدد ابواب بنائے جاتے ہیں جو کہ تحقیقی مواد کو حاصل کرنے ان کے تجزیے اور ان کے بیانات کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں ۔ حاصل شدہ مواد کا تجزیہ اور اس کی توضیح بہت احتیاط سے کرنی چاہیئے ۔ عام طور پر محقق درج ذیل باتوں کو اپنے اکتفا کی بنیاد قرار دیتا ہے ۔ کیا حاصل شدہ تحقیقی مواد کے تجزیہ میں کوئی سقم تو نہیں ہے ؟ یہ نتائج غیر متعلق لوگوں سے تو اخذ نہیں کئے گئے ہیں ۔ کیا محقق نے شعوری طور پر اپنے افکار سے متصادم نظریات کو نظر انداز تو نہیں کر دیا ہے ؟ کیا محقق کے تجزیات محض تسلسل کا نتیجہ تو نہیں ۔ کیا محقق نے چند جزوی نظریات کو کلیہ طور پر تو قبول نہیں کر لیا ہے ؟ محقق نے تجزیات کی بنیاد کسی اہم شخص کی رائے پر ہی تو مبنی نہیں ہے ؟

تلخیص: رپورٹ کے اس حصہ میں محقق نہایت اختصار کے ساتھ تحقیق کے وسائل، اس سے حاصل شدہ مواد اور مکمل رپورٹ کا خاکہ پیش کرتے ہوئے مقالے کے اہم حصوں کو یکجا کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اپنے اخذ کئے گئے نتائج کو تنقیدی پیرایہ میں پیش کرتا ہے کہ اس کے طریقہ کار کو اس تحقیق میں مانا گیا ہے یا نہیں۔ اگر یہ نتائج کسی پہلے مقالے کے نتائج کی تردید کرتے ہیں یا ان کا تضاد ہیں تو ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔ یہ تردید اور تضاد دونوں ہی اس حصے میں وضاحت سے دے کر اپنے نتائج پیش کرنا بھی اس حصہ میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ اس حصہ میں وہ اپنا مطالعہ اور تحقیق کے تحت حدود متعین کرتا ہے، مستقبل کے لئے اپنے مشورے دیتا ہے جو کہ اس میدان میں تحقیق کے لئے نئی راہیں کھولتے ہیں۔ رپورٹ کے پڑھنے والے اس حصے کو خصوصی طور پر پڑھتے ہیں کیونکہ یہاں سب ہی ضروری معلومات ایک جگہ مل جاتی ہیں۔

ج۔ حوالہ جات مواد۔

آخر میں محقق اپنے دیئے گئے اقتباسات، عبارات کے اشارات یعنی جن کتب سے وہ ماخوذ ہیں، ان کتب کی تفصیل دیتا ہے۔ اشارات کے ساتھ ساتھ کتابیات بھی اہم ہیں۔ محقق نے اپنی تحقیق میں جن کتب، رسائل، جرنل وغیرہ سے استفادہ کیا ہے اس میں یہ تمام تفصیل آتی ہے۔ اس باب کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس سے اس قسم کے موضوعات پر تحقیق کرنے والوں کے مطالعہ کے لئے نئی راہیں کھل جاتی ہیں۔ عموماً یہ کتابیات مصنفین کے علمی ناموں (جو کہ حروف ابجد کے تحت ترتیب دیئے جاتے ہیں) سے ترتیب دی جاتی ہیں۔ کتابیات کبھی کبھی مصنفین کے ناموں کے ساتھ نہ ہو کر عنوانات پر مشتمل ہوتی ہے۔

کتابیات کے بعد ضمیمہ جات اور مشمول لائے جاتے ہیں اگر اس تحقیق میں ان کی ضرورت ہو۔ کیونکہ اکثر مفید مواد کتاب کی طباعت کے دوران حاصل ہوتا ہے اور اس کو بیچ میں نہیں دیا جاسکتا۔ اس کو ضمیمہ کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔ نقشے ڈائگرام وغیرہ بھی ضمیمہ کے طور پر دیئے جاسکتے ہیں۔

تحقیق کی زبان اور اسلوب:

تحقیقی رپورٹ کو اگر پُراثر انداز میں دوسروں کے سامنے پیش نہ کیا گیا تو وہ کتنی بھی اہم تحقیق ہو، نیز محقق نے کتنی ہی محنت سے مقالہ لکھا اور صحیح نتائج دیئے ہوں، اس رپورٹ کی اہمیت "نہیں" کے برابر رہ جائے گی۔ تحقیقی مقالے کا لکھنا، عام مضامین کے لکھنے سے قطعی مختلف ہے۔ مقالہ کا لکھنا محض قارئین کو محظوظ کرنا نہیں اور نہ ہی محقق کسی خاص موضوع پر اپنے عام خیال کو بیان کرتا ہے۔ بلکہ جو کچھ اس نے اس موضوع پر معلومات حاصل کی ہے، اس کا تردید اور تفسیر دیتا ہے۔ اس کے تجربات اور تجزیات کی وضاحت کرتا ہے وہ سائنٹفک طریقے سے آگے بڑھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ تحقیقی مقالہ علمی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کے پیش کرنے کا انداز بھی علمی ہونا چاہیئے۔ یعنی تحریر میں عالمانہ وقار اور تمکنت ہو۔ لیکن یہ بھی خیال رہے کہ تحریر خشک نہ ہو جائے۔ تحقیقی مقالہ کو عام لوگ تو پڑھتے نہیں ہیں اس کو وہی شخص پڑھتا ہے جسے اس موضوع اور مضمون میں خاص دلچسپی اور معلومات ہو۔ وہ اس رپورٹ یا مقالے کو تنقیدی نکتۂ نظر سے پڑھتا ہے۔ اس کی خامیوں اور ٹکنیکل غلطیوں کو تلاش کرتا ہے۔ اور اس رپورٹ کے تجزیاتی نتائج پیش کرتا ہے۔ بہت زیادہ مواد کو بے ترتیبی سے پیش کرنا جس میں کوئی ربط نہ ہو اور منطقی تعلق نہ ہو، اس کو تحقیقی مقالہ یا رپورٹ نہیں کہا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ واضح فکر، مواد کی منطقی ترتیب، بہتر ترجمانی اور موثر طرز تحریر میں ایک قطعی رشتہ ہے۔ [۱]

[۱] C.V. Good اور D.E. Scates "Methods of Research" باب ۱، ص ۸۳۳

مقالے کے مباحث کو مختلف عنوانات اور ذیلی عنوان میں تقسیم کرکے اس طرح لکھنا چاہیئے کہ ایک لفظ بھی فالتو کا نہ ہو۔ ہر لفظ ہر جگہ خاص وجہ سے ہی استعمال کیا ہو۔ نیز اس کے بنیاد پینے سے رپورٹ اثر انداز ہوتی ہے۔ لفظوں کا غیر ضروری استعمال، انشاء پردازی پر اچھا اثر نہیں ڈالتا۔ لفظوں میں توانائی ہوتی ہے اور توانائی کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ اس توانائی کا صحیح استعمال عبارت میں حسن پیدا کرتا ہے۔ علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ "گلستان میں جو مضامین اور خیالات ہیں ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور تناسب نے سحر پیدا کر دیا ہے" [1]

مشہور فلسفی کنفیوشس کا کہنا ہے کہ اگر الفاظ صحیح نہ ہوں تو زبان واقعات کے تابع نہیں ہو سکتی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کے تمام معاملات درہم برہم ہو جائیں گے" [2]

تحقیقی مقالے کی زبان گمراہ اور صنائع بدائع سے بھری نہ ہو کر آسان، عام فہم اور صاف مقصد ظاہر کرنے والی اور پُر اثر ہو الفاظ کی مینا کاری تحقیقی مقالوں میں مناسب نہیں، الفاظ اور جملے ایسے ہوں کہ قاری کے ذہن میں مقصد بآسانی واضح ہوتا جائے۔ تحقیقی مقالہ چونکہ واقعات اور حقائق پر مبنی ہوتا ہے اس لئے اس میں لفاظی، افسانہ طرازی، خطابت یا شاعرانہ رنگین بیانی سے کام لینا نہیں چاہیئے۔ یہ باتیں مقالہ کی عظمت کو کم کرتی ہیں۔ اگر مواد (حقائق) کی کمی ہے تو رنگین بیانی، لفاظی یا خطابت اس کی تلافی نہیں کر سکتی [3]

وھٹنی کا کہنا ہے کہ "جذباتی طرز استدلال اور ناصحانہ انداز بیان کے لئے بھی تحقیقی مقالہ میں کوئی جگہ نہیں ہے" [4]

مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب "حیات سعدی" میں اسلوب بیان کے لئے لکھا ہے۔ "جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ایک ایک لفظ میں مصنف کے خون جگر کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر سمجھنا چاہیئے کہ اس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔

عبارت میں پیراگراف ضرور بنائے جائیں لیکن یہ خیال رہے کہ ہر پیراگراف ایک دوسرے سے کڑی کی طرح منسلک ہو۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ایک پیراگراف میں ایک ہی بات کہی جائے، پیراگراف نہ زیادہ طویل ہوں اور نہ ہی نہایت مختصر۔

رپورٹ ہمیشہ ضمیر غائب میں لکھی جاتی ہے۔ میں، مجھے، میرا، ہمارا، ہم، تم، تمہارا وغیرہ کا استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کے بدلے راقم السطور، مضمون نگار، مرتب یا اسی قسم کا کوئی دوسرا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تحقیقی مقالہ میں تصاویر، چارٹ، نقشے اور ڈائگرام لکھنے سے زیادہ پُر اثر ثابت ہو سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ نہایت احتیاط، ہوشمندی اور سلیقے سے بنا کر مرتب کئے گئے ہوں۔ تحقیق میں نظریات اور خیالات کو بھی خوبصورتی اور صفائی

۱۔ مولانا شبلی، شعر العجم، طبع سوم، جلد چہارم، باب اول، ص ۳۰،
۲۔ ڈاکٹر بشیر احمد "حکیم کون فیوشس اور چینی فلسفۂ اخلاق"۔ حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق، ص ۱۴،
۳۔ ——— C.V. Good and D.E. Scate کتاب مذکور باب ۱۰، ص ۸۸۲
۴۔ The Elements of Research". F.L. Whitney" باب ۱۴ ص ۳۱۷

سے تصاویر کے ذریعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔

کسی بھی مقالے میں اقتباسات اپنی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر تحقیقی مقالے میں سارے اقتباسات ہی بھرے ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ تحقیقی مقالہ نہ ہو کر محقق کے لئے محض نوٹ بن گیا ہے جس میں محقق نے محض بہت سے لوگوں کی ہی باتیں ماخوذ کر دی ہیں۔ اس لئے ضروری اقتباسات ہی دینے چاہیئے جنکا مختصر ہونا ضروری ہے۔ اشارات صاف اور واضح ہونا چاہیئے — اس کے تحت مصنف کے نام کا آخری حصہ پہلے اور اصل بعد میں، اس کے بعد کتاب کا نام، صفحہ نمبر، ایڈیشن (اگر کوئی ہے)، مقام اشاعت، سن اشاعت، اور پبلشر کا نام ہونا چاہیئے۔ اسی طرح اخبارات و رسائل کے اشارات لکھنا چاہیئے۔

تحقیقی رپورٹ یا مقالہ لکھنے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیئے۔ ہر باب کو اطمینان سے لکھنا چاہیئے۔ لکھنے کے بعد کئی بار پڑھ کر اس میں موجود بیکار اور فالتو کی باتوں اور اغلاط کو دور کر کے ہی آخری شکل دینا چاہیئے۔ مقالہ کو نہایت خوش خط انداز میں لکھنا چاہیئے سب سے بہتر شکل ٹائپ ہے۔ اب اردو ٹائپ میں بھی کافی سہولیات ہیں۔ ٹائپ میں غلطیوں کے زیادہ امکانات رہتے ہیں۔ ٹائپ صاف ستھرا اور غلطیوں سے عاری ہونا چاہیئے۔

■■

اُردو صحیح معنوں میں ایک ترقی پسند زبان ہے وہ کسی خاص حلقے اور دائرے میں مقیّد نہیں رہنا چاہتی۔ اس لئے اس کا مستقبل بھی اُن ہی لوگوں کے ہاتھوں بہتر بن سکتا ہے جو فرقہ وار اور صوبہ دار تعصّبات کو پس پشت ڈال کر کشادہ دلی اور وسعتِ نظر سے اس کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں۔

اب وقت نہیں رہا کہ اردو کی تائید میں قدیم انگریز حاکموں اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کی اُردو دوستی کے افعال و اقوال کی شہادتوں پر اکتفا کیا جائے۔ اب اس امر کی ضرورت ہے کہ ملک کے جدید رجحانات اور عوام کی روزمرہ کی زبان اور ذہنی میلان کو پیشِ نظر رکھ کر ایک عظیم تر اُردو کی داغ بیل ڈالی جائے۔

اب اُردوئے معلّٰی کا دَور گزر گیا، گزرا ہوا زمانہ محض یاد باقی رکھنے اور افسوس کرنے سے واپس نہیں آ سکتا، اب عمل کی ضرورت ہے۔ ایسے ترقی پسندانہ عمل کی جو رفتارِ زمانہ کے قدم بہ قدم ہو اور جس کے لئے ایسے کار پرداز مہیا ہوں جن میں خار دار گھاٹیوں اور دشوار گزار راستوں سے بغیر اُلجھے اور اُلجھائے آگے نکل جانے کی صلاحیت ہو۔

اگر آپ کے ہمسایہ باغ میں درخت اور کیاریاں سرسبز و شاداب ہوں اور آپ کے باغ میں پھلوں اور پھولوں اور شادابی کی کمی ہے تو یہ کمی اس طرح دُور نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے ہمسایہ کو گالیاں دیں اور اس کے درختوں اور روشوں پر پتھر پھینکیں بلکہ آپ کا باغ اسی وقت ہمسایہ کے چمن سے ہمسری کر سکے گا جبکہ آپ اس کے لئے ویسی ہی محنت و مشقت کریں۔ پس اُردو کے چمن کو ہرا بھرا سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے ہندی یا بنگالی یا تلنگی زبانوں کی مخالفت یا اُن کی آبیاری کرنے والوں سے جھگڑا مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم بھی انہیں ذریعوں اور طریقوں کو سمجھیں اور سیکھیں جن سے ان زبانوں کو بار آور کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر زورؔ (اقتباس خطبۂ صدارت ورنگل کالج ۱۹۵۸ء)

دستی کپڑے کی صنعت کے ساتھ نیا برتاؤ

دستی کپڑے کی صنعت آندھراپردیش میں تقریباً ۳۰ لاکھ عوام کو روزگار فراہم کرتی ہے زراعت کے بعد دستی کپڑے کے شعبہ میں عوام کی سب سے زیادہ تعداد روزی کماتی ہے۔

تحریک امداد باہمی اس شعبہ کے لئے ایک عظیم نعمت ثابت ہوئی ہے۔ ۱۹۵۳-۵۴ء میں بافندوں کی امداد باہمی انجمنوں کی تعداد ۹۴۲ تھی۔ لیکن فی الوقت ریاست میں ۹۷۷ انجمنیں قائم ہیں۔

آندھراپردیش اسٹیٹ ٹیکسٹائیل ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام عمل میں لے آیا گیا ہے اس کارپوریشن نے مختلف اضلاع میں ۹ پیداواری مراکز قائم کئے ہیں جو تقریباً ۳۰۰۰ بافندوں پر محیط ہیں۔

کنٹرولڈ اقسام کی ساڑیوں اور دھوتیوں کی تیاری دستی کپڑے کے شعبہ کو تفویض کی گئی ہے۔ اس وقت ۱۰۰۰ سوسائٹیوں میں ۳۰۰۰ کرگھے کنٹرولڈ اقسام کی ساڑیوں اور دھوتیوں کی تیاری میں مصروف ہیں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھراپردیش حیدرآباد

D.P.R. No. 1/7[illegible]
ADVT /C3/7?

صلاح الدین نیّر

تم بھی یہیں تھے اپنے مکانوں میں کیا نہ تھا
لٹنے سے پہلے قافلے والوں میں کیا نہ تھا
خنجر کی دھار پر تھی قبیلے کی آبرو
اس کے سوا بھی خانہ بدوشوں میں کیا نہ تھا
ذہنی تحفظات تھے، تم خود نہ پڑھ سکے
دیوانِ میر جیسی کتابوں میں کیا نہ تھا
کچھ مصلحت تھی ایسی کہ خاموش ہم رہے
سچ پوچھیے تو آپ کی آنکھوں میں کیا نہ تھا
جس موڑ پہ بھی جائیے مے خانے بند ہیں
پہلے ہمارے شہر کی راتوں میں کیا نہ تھا
تم خود ہی ابتدا سے توہّم پرست تھے
درنہ قلندروں کی دعاؤں میں کیا نہ تھا
محلوں کی روشنی میں گزاری تمام عمر
نیّر! ہمارے گھر کے اُجالوں میں کیا نہ تھا

تسنیم فاروقی

روشنی جس پہ محبت کی نظر آ جائے
سر ہمارے اسی دہلیز پہ خم رہتے ہیں
آج کا دن تو گزر جائے گا کل کیا ہوگا
کتنے دامن ہیں جو اس رنج میں نم رہتے ہیں
پچھلی تاریخ کے چہرے کی خراشیں نہ گنو!
اور لکھ لیں گے یہاں اہلِ قلم رہتے ہیں
ان کی نظروں میں جبراً نیم ہیں غربت والے
عرش کے لوگ ہیں یہ فرش پہ کم رہتے ہیں
میں کسی راہ کسی موڑ سے گذروں لیکن
میری آنکھوں میں ترے نقش قدم رہتے ہیں
آج تک کوئی سمجھ ہی نہ سکا اس کا مزاج
لاکھ سلجھاؤ مگر زلف میں خم رہتے ہیں
چلنے والے نہیں رکھتے کبھی منزل کا حساب
فاصلے سنگ کے سینے میں رقم رہتے ہیں
دھوپ کیسی بھی ہو [illegible] ہیں
سایۂ دیر میں بھی اہلِ حرم رہتے ہیں

صادق نقوی

کھلونوں کی دکان پہ درد کے شہ پارے لایا ہوں
یہ کچھ آنسو ہیں جن کو بیچنے بازار آیا ہوں
نگاہوں سے برستے سرد شعلوں کی کہانی کو
غزل کا روپ دے کر آپ کی محفل میں لایا ہوں
تصوّر کے اُفق پر جگمگاتے چاند تاروں کا
اندھیری بستیوں کے نام اک پیغام لایا ہوں
سناؤں تو یہ ڈر ہے آپ پہ بارِ گراں ہوگا
وہ اک سادہ سا افسانہ جسے آنسو بنا پایا ہوں
ذرا نظریں اٹھا کر مسکرا کر دیکھ تو لیجیے
بڑی اُمید لے کر آپ کی محفل میں آیا ہوں
جسے دنیا نے ٹھکرا کر زندگی کا نام دے ڈالا
[illegible]

مجید بیدار

ڈاکٹر زورؔ کا سماجی شعور

عالمی برادری سے رشتہ مربوط کرنے کے لئے موجودہ دور میں "سماج" اکائی کا درجہ رکھتا ہے اور وہی قومیں ترقی کی راہوں سے تیز رو گذر سکتی ہیں جس نے اپنے سماج کا تعلق عالمی برادری سے منسلک رکھا ورنہ ان کا ترقی سست رفتاری کا شکار ہوسکتی ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں دنیا کی تمام قومیں ایک سماج سے منسلک ہوجانا چاہتی ہیں تاکہ افرادِ عالم میں وہ بھی برابر کی شریک کار رہیں۔ اردو داں طبقہ کو ایک سماج سے مربوط کرنے کی اولین کوشش جنوبی ہند میں شروع ہوئی اور ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے اپنی تخلیقات' مضامین' افسانے اور لسانی دلائل سے مسلم معاشرت کو سماجی شعور سے ہم آہنگ کرنے کی مقدور بھر کوشش کی تاکہ اردو داں طبقہ اس خلیج کو پاٹ سکے جس سے وہ ترقی کے میدان میں میلوں دور نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ اپنے قلم کے ذریعہ ہندو مسلم معاشرت کے امتزاج سے بہترین سماج کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کی تدوین اور ترتیب کے بعد محمد قلی کی نظموں پر عنوانات تجویز کرنا' ڈاکٹر زورؔ کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کے سماجی شعور کو پوری طرح اجاگر کرتا ہے۔ کتاب "گولکنڈے کے ہیرے" کے دیباچے میں اپنے سماجی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں " اس امر کی بے حد ضرورت ہے کہ تاریخی مواد سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مختلف اقطاع کی ایسی تاریخیں مرتب کی جائیں جن میں بادشاہوں اور امیروں کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام اور غریبوں کی زندگی نمایاں ہو۔ درباروں اور حرم سراؤں کی پر تکلف آرائش و زیبائش کے علاوہ بازار اور پست مکانوں میں رہنے سہنے والوں کی معاشرت بھی ظاہر ہوسکے اور سب سے بڑھ کر وہ اسرار بے نقاب کئے جائیں جن پر اس زمانے کے لوگوں کے قلبی اطمینان اور راحت و آرام کا انحصار تھا۔"

ڈاکٹر زورؔ سماجی یکسانیت کے حامی تھے۔ بادشاہوں کے ہمراہ عوام کے حالاتِ زندگی قلم بند کرنے کا استدلال اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ بادشاہ اور عوام کو سماج کا نمائندہ تصور کرتے تھے ورنہ دیگر ادیب و شاعر یا مورخ کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کی ذات کو سماج میں ارفع و اعلیٰ ثابت کرنا چاہتا ہے جس سے عوام کا سماجی موقف کمزور ہوجاتا ہے لیکن ڈاکٹر زورؔ نے حالاتِ سلاطین کے ہمراہ عوام کی بازیافت کے ذریعے زندگی کی تدوین کا اظہار کرکے اپنے سماجی شعور کو نمایاں کیا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے خیال میں بادشاہ اور عوام ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان دونوں کا تعلق ایک ہی سماج سے ہوگا جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے سماجی بندھنوں میں بندھ جائیں گے۔ اپنے سماجی نظریہ "سماجی مساوات" کو تقویت پہنچانے کے لئے وہ "کلیاتِ محمد قلی" کی نظموں کے ایسے گوشوں کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں جن میں بادشاہ اور عوام میں مساوات کا عمل دکھایا گیا ہے۔ " محمد قلی قطب شاہ کی رعایا میں ہندوؤں کی کثرت تھی اور اس کے محل میں بھی ہندو عورتوں اور ملازموں کی کمی نہ تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان ہی کی خاطر بسنت نہیں مناتا تھا بلکہ خود اپنی

خاطر اس تقریب میں بے تکلفی سے حصہ لیتا تھا۔" (کلیاتِ محمد قلی صفحہ ۲)
نظم "بسنت" میں اس قسم کا کوئی اظہار نہیں اور بقول ڈاکٹر زور اس قسم کے واقعات کا ذکر تاریخوں میں بھی نہیں ملتا۔ اس کے باوجود بھی محمد قلی کی نظم کے مطالعہ کے بعد اس کا رعایا سے بے تکلفانہ برتاؤ پیش کرنا خودا ... ب ... کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر زور سلطان محمد قلی کو اپنے "سماجی شعور کی روشنی میں پیش کرنا چاہتے تھے اور محمد قلی قطب شاہ کو "سماجی مساوات" کا علمبردار بتا کر اپنے شعور کا پرچار چاہتے تھے محمد قلی قطب شاہ کی متعدد نظموں کی بے ساختگی اور اس کا عوام سے ربط بتا کر ڈاکٹر زور نے اسے "سماجی مساوات" کا حامی بتایا ہے۔ حالانکہ یہ عمل ان کے ذہن کی اختراع ہے لیکن ڈاکٹر زور نے اپنے سماجی شعور کے آئینہ میں محمد قلی کی تصویر دیکھ کر اسے بھی اپنے رنگ کا حامی بتا دیا۔ درحقیقت زور صاحب "سماجی مساوات" کے حامی تھے اور اسی فکر کے پیچھے انہوں نے سلطان قلی کو بھی اپنی فکر کا ہم مکتب بنا دیا۔ "سماجی مساوات" کے شعور کو تقویت پہنچانے کے لئے محمد قلی قطب شاہ کی نظموں کا سہارا لیتے ہیں۔ "محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد میں ایک بین قومی فضا کی ترویج میں بڑا حصہ لیا تھا اور ملک کے جملہ طبقوں کا دل موہ لینے کے سلسلہ میں .... خالص اسلامی عیدوں کے علاوہ اور بھی تقریبیں زور و شور سے رائج کیں جن میں نوروز، بسنت اور آمدِ برسات کی تقریبوں کو خاص اہمیت حاصل ہے" (کلیات محمد قلی ص ۱۹۹)
طبقات کی افراتفری کا اختتام ہی "سماجی مساوات" کا ضامن ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ کا اسلامی عیدوں کے علاوہ دیگر تہواروں کو رواج دینے کے عمل کو جملہ طبقات کا دل موہ لینے والا فعل ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر زور نے یہ حوالہ درج کیا ہے جو ان کے سماجی شعور کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر زور شخصی طور پر "سماجی مساوات" کے گرویدہ تھے اور جن تفکرات کو وہ بہتر سمجھتے تھے اسی کے عکس کو انہوں نے کلیات میں نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر زور فکری و شعوری طور پر "مساوات" کے حامی ہیں ورنہ بذاتِ خود محمد قلی قطب شاہ کی نظموں میں ایسا کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا جس کی وجہ سے بین قومی کیفیات کا ملا جلا عکس مل سکے۔ ڈاکٹر زور کے سماجی شعور کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ کی بین قومیت پسند شخصیت ظاہر ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کا سماجی شعور کافی بلند تھا چنانچہ مضمون "گولکنڈے کے ہیرے" میں لکھتے ہیں۔ "جب تک بادشاہوں اور غریبوں کی خوبیوں کے خاص نمونے اور ان کے اسباب و علل نہ پیش کئے جائیں ہماری تاریخیں، درسگاہیں اور ہماری جدید نسلیں ان کے ذریعہ سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے گر نہیں سیکھ سکتیں"
(دیباچہ گولکنڈے کے ہیرے)
ڈاکٹر زور کے سماجی شعور کا مسئلہ اس حوالہ سے پوری طرح حل ہو جاتا ہے وہ سماجی مساوات یا یکسانیت کا پرچار کر کے جدید نسلوں کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنا چاہتے ہیں اور امیر و غریب کے درمیان جو دیوار حائل ہے اس کے انہدام کے لئے وہ اپنے سماجی شعور کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماجی عدم مساوات کا ازالہ بادشاہوں اور غریبوں کی خوبیوں کو پیش کر کے کیا جا سکتا ہے۔
ڈاکٹر زور کا سماجی شعور بیرونی اثرات سے متاثر نہیں بلکہ وہ خود بیرونی اثرات کو متاثر کرتا ہے یعنی زور مرحوم نے "سماجی مساوات" کا جو ذہن بنایا ہے اس سے لوگ اثرات قبول کرتے ہیں وہ خود کسی بیرونی اثر کا تابع نہیں۔ ڈاکٹر زور

ڈاکٹر مجید بیدار

ڈاکٹر زور کا سماجی شعور

عالمی برادری سے رشتہ مربوط کرنے کے لئے موجودہ دور میں "سماج" اکائی کا درجہ رکھتا ہے اور وہی قومیں ترقی کی راہوں سے تیز رو گذر سکتی ہیں جس نے اپنے سماج کا تعلق عالمی برادری سے منسلک رکھا ورنہ ان کی ترقی سست رفتاری کا شکار ہو سکتی ہے۔ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں دنیا کی تمام قومیں ایک سماج سے منسلک ہو جانا چاہتی ہیں تاکہ فائدہ عامہ میں وہ بھی برابر کی شریک کار رہیں۔ اردو داں طبقہ کو ایک سماج سے مربوط کرنے کی اولین کوشش جنوبی ہند میں شروع ہوئی اور ڈاکٹر زور مرحوم نے اپنی تحقیقات، مضامین، افسانے اور لسانی دلائل سے مسلم معاشرت کو سماجی شعور سے ہم آہنگ کرنے کی مقدور بھر کوشش کی تاکہ اردو داں طبقہ اس خلیج کو پاٹ سکے جس سے وہ ترقی کے میدان میں میلوں دور نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر زور اپنے قلم کے ذریعہ ہندو مسلم معاشرت کے امتزاج سے بہترین سماج کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ "کلیات محمد قلی قطب شاہ" کی تدوین اور ترتیب کے بعد محمد قلی کی نظموں پر عنوانات تجویز کرنا، ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جو ان کے سماجی شعور کو پوری طرح اجاگر کرتا ہے۔ کتاب "گولکنڈے کے ہیرے" کے دیباچے میں اپنے سماجی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اس امر کی بے حد ضرورت ہے کہ ہر ممکن مواد سے فائدہ اٹھا کر ہندوستان کے مختلف اقطاع کی ایسی تاریخیں مرتب کی جائیں جن میں بادشاہوں اور امیروں کے حالات کے ساتھ ساتھ عوام اور غریبوں کی زندگی نمایاں ہو۔ درباروں اور حرم سراؤں کی پر تکلف اور آرائش و زیبائش کے علاوہ پست مکانوں میں رہنے سہنے والوں کی معاشرت بھی ظاہر ہو سکے اور سب سے بڑھ کر وہ اسرار بے نقاب کئے جائیں جن پر اس زمانے کے لوگوں کے قلبی اطمینان اور راحت و آرام کا انحصار تھا۔"

ڈاکٹر زور سماجی یکسانیت کے حامی تھے۔ بادشاہوں کے ہمراہ عوام کے حالات زندگی قلم بند کرنے کا استدلال اس بات کا ثبوت پیش کرتا ہے کہ ڈاکٹر زور بادشاہ اور عوام کو سماج کا نمائندہ تصور کرتے تھے ورنہ دیگر ادیب و شاعر یا مورخ کی کتابوں کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بادشاہ کی ذات کو سماج میں ارفع و اعلیٰ ثابت کرنا چاہتا ہے جس سے عوام کا سماجی موقف کمزور ہو جاتا ہے لیکن ڈاکٹر زور نے حالات سلاطین کے ہمراہ عوام کی بازیافت اور ان کی زندگی کی تدوین کا اظہار کر کے اپنے سماجی شعور کو نمایاں کیا ہے۔ ڈاکٹر زور کے خیال میں بادشاہ اور عوام ایک ہی طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان دونوں کا تعلق ایک ہی سماج سے ہوگا جس کی وجہ یہ ہے وہ ایک دوسرے سے سماجی بندھنوں میں بندھ جائیں گے۔ اپنے سماجی نظریئے "سماجی مساوات" کو تقویت پہنچانے کے لئے وہ "کلیات محمد قلی" کی نظموں کے ایسے گوشوں کو واضح طور پر پیش کرتے ہیں جن میں بادشاہ اور عوام میں مساوات کا عمل دکھایا گیا ہے۔ "محمد قلی قطب شاہ کی رعایا میں ہندوؤں کی کثرت تھی اور اس کے محل میں بھی ہندو عورتوں اور ملازموں کی کمی نہ تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان ہی کی خاطر بسنت نہیں مناتا تھا بلکہ خود اپنی

خاطر اس تقریب میں بے تکلفی سے حصہ لیتا تھا۔" (کلیات محمد قلی صفحہ ۲۰)

نظم "بسنت" میں اس قسم کا کوئی اظہار نہیں اور بقول ڈاکٹر زور اس قسم کے واقعات کا ذکر تاریخوں میں بھی نہیں ملتا۔ اس کے باوجود بھی محمد قلی کی نظموں کے مطالعہ کے بعد اس کا رعایا سے بے تکلفانہ برتاؤ پیش کرنا خود ( ) ۔ کی دلیل ہے کہ ڈاکٹر زور سلطان محمد قلی کو اپنے "سماجی شعور کی روشنی میں پیش کرنا چاہتے تھے اور محمد قلی قطب شاہ کو "سماجی مساوات" کا علمبردار بتا کر اپنے شعور کا پرچار چاہتے تھے محمد قلی قطب شاہ کی متعدد نظموں کی بے ساختگی اور اس کا عوام سے ربط بتا کر ڈاکٹر زور نے اسے "سماجی مساوات" کا حامی بتایا ہے۔ حالانکہ یہ عمل ان کے ذہن کی اختراع ہے لیکن ڈاکٹر زور نے اپنے سماجی شعور کے آئینہ میں محمد قلی کی تصویر دیکھ کر اسے بھی اپنے رنگ کا حامی بتا دیا۔ درحقیقت زور صاحب "سماجی مساوات" کے حامی تھے اور اسی فکر کے پیچھے انہوں نے سلطان قلی کو بھی اپنا فکر کا ہم مکتب بنا دیا۔ "سماجی مساوات" کے شعور کو تقویت پہنچانے کے لئے محمد قلی قطب شاہ کی نظموں کا سہارا لیتے ہیں۔ "محمد قلی قطب شاہ نے حیدرآباد میں ایک نئی قومی فضا کی ترویج میں بڑا حصہ لیا تھا اور ملک کے جملہ طبقوں کا دل موہ لینے کے سلسلہ میں......... خالص اسلامی عیدوں کے علاوہ اور بھی تقریبیں زور و شور سے منائی گئیں جن میں نوروز، بسنت اور آمدِ برسات کی تقریبوں کو خاص اہمیت حاصل ہے" طبقات کی افتراق کا اختتام ہی "سماجی مساوات" کا ضامن ہوتا ہے۔ قلی قطب شاہ کا اسلامی عیدوں کے (کلیات محمد قلی صفحہ ۱۹) علاوہ دیگر تہواروں کو رواج دینے کے عمل کو بلا طبقات، کا دل موہ لینے والا فعل ثابت کرنے کے لئے ڈاکٹر زور نے یہ حوالہ درج کیا ہے جو ان کے سماجی شعور کا عکاس ہے۔ ڈاکٹر زور شخصی طور پر "سماجی مساوات" کے گرویدہ تھے اور جن تفکرات کو وہ بہتر سمجھتے تھے اسی کے عکس کو انہوں نے کلیات میں نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ڈاکٹر زور فکری و شعوری طور پر "مساوات" کے حامی ہیں ورنہ بذات خود محمد قلی قطب شاہ کی نظموں میں ایسا کوئی عنصر دکھائی نہیں دیتا جس کی وجہ سے ہمیں قومی کیفیات کا ملا جلا عکس مل سکے۔ ڈاکٹر زور کے سماجی شعور کی وجہ سے محمد قلی قطب شاہ کی ہیئت قومیت پسند شخصیت ظاہر ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کا سماجی شعور کافی بلند تھا چنانچہ مضمون "گولکنڈے کے ہیرے" میں لکھتے ہیں۔ "جب تک بادشاہوں اور غریبوں کی خوبیوں کے خاص نمونے اور ان کے اسباب و علل نہ پیش کئے جائیں ہماری تاریکیں، درسگاہیں اور ہماری جدید نسلیں ان کے ذریعہ سے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کے گر نہیں سیکھ سکتیں"

(دیباچہ گولکنڈے کے ہیرے")

ڈاکٹر زور کے سماجی شعور کا مسئلہ اس حوالہ سے پوری طرح حل ہو جاتا ہے وہ سماجی مساوات یا یکسانیت کا پرچار کر کے جدید نسلوں کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھنا چاہتے ہیں اور امیر و غریب کے درمیان جو دیوار حائل ہے اس کے انہدام کے لئے وہ اپنے سماجی شعور کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک سماجی عدم مساوات کا ازالہ بادشاہوں اور غریبوں کی خوبیوں کو پیش کر کے کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر زور کا سماجی شعور بیرونی اثرات سے متاثر نہیں بلکہ وہ خود بیرونی اثرات کو متاثر کرتا ہے یعنی زور مرحوم نے "سماجی مساوات" کا جو ذہن بنایا ہے اس سے لوگ اثرات قبول کرتے ہیں وہ خود کسی بیرونی اثر کا تابع نہیں۔ ڈاکٹر زور

کی اسی خوبی کی وجہ سے انھیں بہترین سماج پسند کہا جاتا ہے۔

قطب شاہی سلاطین کی رعایا پروری اور "مشترکہ سماج" کی تشکیل کی کوشش کو وہ اپنے ہر مضمون میں ظاہر کرتے رہے بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ دکھنیات کے شعبہ کا قیام' خود ان کا ایک ایسا کارنامہ رہا جس سے وہ ایک مشترکہ دکنی سماج کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے جس میں خود، سلاطین گولکنڈہ کو خصوصیت کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس بیان کو تقویت پہنچانے کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ "ایک عرصہ میں قطب شاہی حکمرانوں نے تہذیب و تمدن تمول و مروّت' علم و فضل اور شعر و سخن کی ایک ایسی فضاء پیدا کر دی جس پر دکن کی تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ ان بادشاہوں نے شیعہ' سنی و ہندو غرض ہر مذہب و ملت کے باشندوں میں ایک مشترکہ کلچر پیدا کرنے میں یہاں تک کامیابی حاصل کی تھی کہ دوسروں کے لئے اس ملک کے بسنے والوں کا باہمی اتحاد اور یگانگت باعث رشک تھی" (دیباچہ سیر گولکنڈہ)

ڈاکٹر زور جس سماجی شعور کے علمبردار تھے۔ اسی کا عکس قطب شاہی تاریخ سے اخذ کرتے ہوئے وہ دکن میں اسی میل جول کی فضاء پیدا کرنا چاہتے تھے جس کی وجہ سے جنوبی ہند میں بسنے والوں کا ایک مشترکہ سماج بن جائے اور وہی کارنامے عود کر جائیں جن کی بدولت عہد قطب شاہی دکن کی تاریخ میں یادگار باب بن گیا ہے۔

ڈاکٹر زور کا سماجی شعور اگرچہ کہ ان کی فکری کاوشوں کا نتیجہ ہے لیکن یہ قطب شاہی رواداری کے پیچھے اتنا گم نظر آتا ہے کہ ادب کا ہر قاری اسے ڈاکٹر زور کا کارنامہ قیاس کرنے میں پس و پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ زور صاحب کی فکری صلاحیتوں میں پوشیدہ "سماجی شعور" نے کلیات محمد قلی کے مخطوطات کو اکھٹا کرنے کے لئے انھیں اکسایا اور ان کے سماجی نظریات کو تسکین دینے کے لئے تاریخ قطب شاہی کافی ثابت ہوئی' ڈاکٹر زور کو کلیات محمد قلی کے مخطوطات دستیاب نہ ہوتے تو ان کی سماجی فکر ضرور انھیں سماجی مصلح بنا دیتی۔ ڈاکٹر زور کی تحریریں خود گواہ ہیں کہ وہ سماجی مساوات کے علمبردار تھے اور دکھنیات کے ذریعہ ایک مشترکہ دکنی سماج کی بنا رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے سماجی شعور کی تاریک تخیلات کو قطب شاہی تاریخ سے روشنی ملی جس کی وجہ سے ان کے دماغ میں روشنی چراغ اس طرح منوّر ہوا کہ ان کا سماجی شعور ادب کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہو گیا ڈاکٹر زور سماج کے نمائندہ تھے اسی لیے ان کے سماجی شعور کے اثرات بکثرت ہندوستانی سماج میں دیکھے جا سکتے ہیں کتابوں کی ڈھیر میں ان کے اندر کا سماجی انسان چھپ کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر زور کے سماجی شعور کو ان کی بے پناہ ادبی مصروفیات نے فکر بننے کا موقع نہ دیا اگر وہ ادبیات پر توجہ دینے کی بجائے سماجیات پر غور و فکر کرتے تو ضرور سوشیالوجی میں ان کے شعور اور تصورات کو منفرد دکنی سماج کے ارتقاء کی صورت میں شامل کیا جاتا۔ آج کے اس سماج پسند دور میں ڈاکٹر زور کے سماجی شعور کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے ملک و قوم کی لازوال ترقی عین ممکن ہے ●●

موت سے بھی مریں گے نہیں زورؔ ہم
زندگی میں جو کچھ کام کر جائیں گے

اک انجمن تھا

(ڈاکٹر زورؔ کی یاد میں)

شہیدِ فکر شیدائے سخن تھا
وہ اپنا عہد تھا اپنی لگن تھا
وہ نقشِ اوّلِ اُردو کا حامی
بڑا تیکھا بہت شیریں دہن تھا
بجا ہے ناز اُردو ہے دکن کو
کہ دکھنیات کا استادِ فن تھا
ادب سے مسندِ سجادگی تک
وہ دیدہ ور چمن اندر چمن تھا
ادب کا گھر ہے یہ "ایوانِ اُردو"
یہیں اک روز وہ بھی نغمہ زن تھا
نہ آیا جنتِ ارضی سے واپس
خدا جانے کہاں اس کا وطن تھا
اسے لائیں تو اب لائیں کہاں سے
جو اپنی ذات سے اک انجمن تھا
بجا ہے اے حبابؔ اسکو جو کہئے
کہ ڈاکٹر زورؔ بابائے دکن تھا

حبابؔ آفرید

منزل بھی، راہ بھی

(ڈاکٹر زورؔ مرحوم کی نذر)

وہ ایک پرچھائیں
درحقیقت ہزارہا جگنوؤں کی آماجگاہ بھی تھی
وہ اک سرائے
جو بے جگہ رہروانِ راہِ سخن کی
جائے پناہ بھی تھی
جو حرف و معنی کی محتشم بارگاہ بھی تھی
وہ ایک ایسی سڑک
جو منزل بھی، راہ بھی تھی۔

سیاہیوں کے ہجوم اندر ہجوم مرغولوں
میں وہ پرچھائیں کھو گئی ہے
خموشیٔ مجرمانہ پہنچی ہے نقطۂ انجماد تک
اور اس سرائے کو برف پے جا سے ڈھک گئی ہے
مگر وہ ایسی سڑک جو اک راہ منحنی تھی
ہزارہا رہروؤں کی آن تھک مسافری سے
گزر گہِ استوار ٹھہری
جو ہم کو شرطِ سفر کی کوتاہیوں پہ تنبیہ
کر رہی ہے
ہماری جانب بہت ہی حسرت سے
تک رہی ہے ▼▼

رؤف خیر

یادِ زورؔ

(ڈاکٹر زورؔ کی ۸۵ ویں برسی کے موقع پر)

وہ آفتابِ دکن، آفتابِ اُردو تھا
تمازتوں سے منوّر تھی جس کی بزمِ ادب
جو ظلمتوں میں رہا بھی تو روشنی کی طرح
شعور و فکر کو بخشی تھی روشنی جس نے
دل و نگاہ کو بخشی تھی زندگی جس نے
وہ اپنی ذات سے تھا، ایک انجمن جیسے
دیئے لہو کے، ادب کے لئے جلاتا رہا
قدم قدم پہ نیا راستہ بناتا رہا
قدم بڑھاتا رہا سوئے منزلِ اُردو
عجیب شان تھی اس باوقار چہرے کی
ہر ایک بات میں اک خاص وضعداری تھی
لبوں پہ جس کے ادب آشنا تبسم تھا
نگار شات میں ڈوبا ہوا ترنّم تھا
خموشیوں میں سمویا ہوا تکلم تھا
سخن سخن تو ہے لیکن سخن میں رعنائیاں
دکن اُداس نہ ہو کیوں، دکن میں تعزیتیں

ڈاکٹر راہی

فیض احمد فیض

مرزا ظفر الحسن میری نظر میں

عزیزی ظفر ـــــ آپ کی نئی تصنیف "عمر گزشتہ کی کتاب" کے اختتامیہ اوراق "مخدوم میری نظر میں" اور "فیض میری نظر میں" پڑھ چکا ہوں ان میں مخدوم کا ذکر آپ کی زبانی سُنا تو بار بار دل بھر آیا اپنا احوال پڑھا تو بار بار ہنسی آئی۔ مخدوم تو اللہ کو پیارے ہو چکے اس لئے آپ کے لکھے کی تصدیق یا تردید تو کر نہیں سکتے۔ البتہ اگر زمین کی بات عالم ارواح تک پہونچتی ہے تو آپ کے خط سے محظوظ ہوئے ہوں گے۔ رہی میری بات تو مجھے گلہ ہے تو اتنا کہ آپ سے میری ملاقات حیدرآباد میں آپ کے ایام جاہلیت کے دوران میں کیوں نہ ہوئی تاکہ چھوٹے بڑے میں دوئی کا جو ایک پردہ پڑا رہتا ہے وہ بیچ میں نہ آتا اور آپ میرے بارے میں بھی اسی منہ پھٹ انداز میں لکھ سکتے تھے جیسا مخدوم کے لئے لکھا لیکن یہ شکایت تو آپ سے نہیں اپنے آپ سے ہے۔ اب جزاء احسان کا تقاضہ تو یہی ہے کہ میں بھی ایک مضمون لکھوں "مرزا ظفر الحسن میری نظر میں" ـــ لیکن انداز بیان کہاں سے لاؤں۔ خیر سُن لو۔

لاہور میں (اور لاہور سے پیشتر جن سے دیس پردیس میں کئی جگہ ساتھ رہا) ہمارے ایک دوست ہوا کرتے تھے۔ نواب زادہ امتیاز علی خاں مرحوم جو اپنے احباب میں "نواب توپ" کہلاتے تھے۔ یہ لقب انھیں اس لئے ملا تھا کہ جب وہ کسی کے معترف ہوتے تو کہتے فلاں بڑا توپ آدمی ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں مرحوم کے قریبی عزیزوں میں سے تھے لیکن ساری عمر نوابی کرنے اور انقلابی باتیں کرنے کے علاوہ تنکا دہرا کر کے نہیں دیا۔ ان نواب صاحب نے ہمارے ایک اور قریبی دوست کو "پھدکا" کا خطاب دے رکھا تھا وہ اس وجہ سے کہ یہ صاحب کسی زمانے میں انتہائی سرگرم سیاسی کارکن تھے اور کبھی نچلے نہیں بیٹھتے تھے۔

مرزا ظفر الحسن کا سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ لقب اصل میں انھیں ملنا چاہیئے تھا اس لئے کہ موصوف کے جسم، ذہن، زبان غرض جملہ قوتیں کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ اسکول اور کالج کی خرمستیوں سے فارغ ہوئے تو حیدرآباد سے پشاور تک یا بقول شخصے راس کماری سے فارغ بخاری تک مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کا دیا کھاتے رہے۔ "چلے گی کیا کوئی قینچی مری زباں کی طرح"

اس شغل سے ابھی جی نہ بھرا تھا کہ سرکار نے کراچی کے الیکشن کمیشن کے دفتر میں افسر بنا کر لا بٹھایا۔ صدر ایوب خاں مرحوم کا دور تھا الیکشن ولیکشن کا بازار سرد پڑا تھا اور کمیشن کے دفتر میں تو اُلّو بھی مرزا صاحب سے ہمکلام ہونے کا روادار نہ تھا۔ اس فضا میں مرزا صاحب جیسے ہنگامہ پرستوں کا گذارا ہونا تو کیوں کر۔ چنانچہ آپ نے ادبی مقدموں کا شاخسانہ کھڑا کیا اور مرزا رسوا کو اور آپ سے غالب کو اس کے حریفوں سے بھڑا دیا ـــــ ہمارے ہاں قیام پاکستان کے بعد دو چار معرکے کے مقدمے ہوئے ہیں جیسے مولوی تمیز الدین بنام اسکندر مرزا والا مقدمہ یا حسین شہید سہروردی مرحوم اور نواب گورمانی صاحب کے "ایبڈو" مقدمات تھے۔ لیکن اول تو ان عدالتوں میں ہما شما کا داخلہ کہاں اور پھر خالص قانونی موشگافیوں میں کتنے لوگوں کو دلچسپی ہے چنانچہ ان کا چرچا خواص تک محدود رہا لیکن مرزا صاحب کی سجائی ہوئی عدالت میں سارا شہر اُمنڈ آیا اور ان کی عدالتی کارروائیاں ایک زمانے تک اہل ذوق میں موضوع گفتگو بنی رہیں۔ ایسے ہی ایک مقدمے میں ہم بھی حاضر تھے وہیں آپ سے تعارف ہوا اور آپ کی مجلس آرائی کا معتقد ہونا پڑا۔

پھر ان کے بھلے کو یا شاید بُرے کو مرزا غالب کی صد سالہ برسی آن پہونچی۔ یہ اطلاعات تو بہت پہلے آ چکی تھیں کہ ہندوستان اور حتیٰ کہ سوویٹ روس میں بھی بڑے پیمانے پر تقریبات کا اہتمام ہو رہا ہے اور متعلقہ ریاستی ادارے اس جانب پوری توجہ دے رہے ہیں لیکن اپنے ہاں سرکاری

اور غیر سرکاری سب حلقوں میں ہُو کا عالم تھا۔ ہم لوگوں کو یہ تشویش ہوئی کہ پاکستان والوں نے جہاں اُردو قومی زبان قرار دے رکھی ہے اور اس اعتبار سے غالب دوستی سب سے زیادہ ہمیں پر فرض ہے اگر اس موقع پر بالکل سرد مہری کا مظاہرہ کیا تو بہت ہیٹی ہوگی۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ "این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند" کا قرعہ کس کے نام نکالا جائے۔ مجھے مرزا صاحب کے عوامی کارنامے یاد تھے اس لئے میں نے انھیں سے درخواست کی کہ آئیے غالب کی صد سالہ برسی کا کچھ کریں۔ مرزا صاحب تو سنتے ہی ایسے اُچھلے جیسے انھیں ہی دو آنکھیں درکار تھیں۔ آناً فاناً ادارۂ یادگارِ غالب کی تشکیل ہوئی اور کراچی کے بہت سے اہلِ دل اور صاحبِ نظر حضرات میں سے جو بھی میرے ہاتھ لگا دھر لیا گیا۔ پیر حسام الدین راشدی۔ سبط حسن، شان الحق حقی، ابن انشاء، مسلم ضیائی، بیگم مجید ملک، مختار زمن اور بعض دوسرے احباب۔ لیکن اصل کرتا دھرتا تو مرزا صاحب ہی تھے۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اس پر پورا شہر گواہ ہے۔ سرکاری خزانے سے صدائے برنخواست کے علاوہ کوئی جواب نہ ملا تو مرزا صاحب نے اہلِ کرم کی جیبیں ٹٹولنے کے لئے جتن شروع کئے۔ "غالب پنسل" بنی جو ایک سو سے لے کر تین ہزار روپے تک میں بکی۔ "غالب کیلنڈر" تیار ہوا جو پانچ روپے سے دو ہزار تک میں فروخت ہوا۔ "تماشائے اہلِ کرم" کے نام سے ایک بڑا ادبی اجتماع، دوسرے چھوٹے موٹے جلسے، اخباری اطلاعات، غرض صد سالہ برسی کی تقاریب کے دن آنے تک زبانِ خلق نقارۂ غالب بن چکی تھی۔

پھر تقریبات کا پروگرام، کتب اور مخطوطات کی نمائش کے لئے ہر جانب ہرکارے دوڑائے گئے۔ مقالات اور تقاریر کے لئے اہلِ علم و فضل کی دہلیز پر چوکی دی گئی موسیقی اور شعر و سخن کی محافل کے لئے ملک بھر کے ممتاز مغنی اور سخنور یکجا کئے گئے اور کلامِ غالب کو مصوری میں آراستہ کرنے کے لئے نقاشِ اوّل صادقین کو پابہ زنجیر کیا گیا۔ ایک پورا ہفتہ صبح و شام آرٹس کونسل کراچی کی عمارت مرجعِ خلائق بنی۔

یہ ہنگامہ فرو ہوا تو تجویز ہوئی کہ نشستند و گفتند و برخواستند کے بجائے غالب کی کوئی مستقل یادگار بھی قائم ہونی چاہئے چنانچہ بلدیہ کراچی اور حبیب بینک کے تعاون سے ایک عمارت تعمیر کر کے غالب لائبریری کی بنیاد رکھی گئی۔ مرزا صاحب نے اپنا ڈائنمو پھر چارج کیا اور اس کام کا ایسا پیچھا لیا کہ شاید ہی کسی گھر میں کوئی ذخیرۂ کتب ایسا ہوگا جو مرزا صاحب کی دسترس سے بچ رہا ہو۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ کوئی بھی محفل یا پبلک جلسہ یا شادی بیاہ کا مجمع ہو یا صفِ ماتم غالب لائبریری کی ایک ٹانگ مرزا بیچ میں ضرور گھسیٹ لائیں گے اس کا ایک ثمر تو غالب لائبریری کی صورت میں سب کے سامنے ہے لیکن ایک دوسرا خوشگوار نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مرزا جو اب تک صرف زبان چلاتے تھے قلم بھی چلانے لگے۔ حیدرآباد دکن کی یادوں سے معطر ایک بہت شگفتہ کتاب "ذکرِ یار چلے" مقبول ہو چکی ہے اب یہ نقشِ ثانی آپ کے سامنے ہے۔ کتاب کی توصیف میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ اس میں مدحِ خود کا پہلو نکلتا ہے لیکن مرزا کے ادبی ذوق و شوق، دوستانہ خلوص و ایثار، منتظمانہ ہنرمندی اور حُسنِ کار اور ان تھک مستعدی اور جہد و کاوش کی توصیف میں ان کے جاننے اور نہ جاننے والے یقیناً سب مجھ سے متفق ہوں گے۔

فیض احمد فیض

(زیر طبع کتاب "عمر گزشتہ کی کتاب" کا دیباچہ)

[مرزا ظفر الحسن کی تازہ تخلیق " عمر گذشتہ کی کتاب " میں مصنف نے مخدوم محی الدین اور فیض احمد فیض کے نام ایک ایک خط لکھا ہے ۔ یہاں مخدوم کو موسومہ مکتوب پیش کیا جارہا ہے ۔ کتاب پریس میں ہے اور عنقریب چھپ جائے گی — ادارہ]

مخدوم / پیار

ہم دونوں کی دوستی کی روایت کے خلاف بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پیار بھیجیں مگر آج روایت سے بغاوت کرنی چاہی تو پیار رکھ دیا۔

ارادہ تھا کہ ایک مضمون لکھ کر بتاؤں کہ تم میری نظر میں کیا اور کیسے ہو مگر پھر سوچا مضمون کی بجائے ایک خط کیوں نہ لکھ دوں کبھی کبھار یہ ہو چکا ہے کہ تم کچھ کہے سنے بغیر ہماری بھری بزم سے غائب ہو گئے اور دو دو دن مفقود الخبر رہے۔ یار اس بار تو تم ایسے گئے کہ سات سال بیت گئے۔ بیٹھے بٹھائے مرنے کی کیا سوجھی تھی اور مرنا ہی تھا تو جن کے ساتھ جیتے تھے ان کے ساتھ مرتے۔ چلو معاف کیا۔ اشفاق اور میر حسن تمہارے پاس خیریت سے پہنچ گئے اور تمہیں بتایا ہوگا کہ میں بھی کوئی دم میں آنے والا ہوں۔

تمہیں اپنے گاؤں سنگاریڈی کا زمانہ یاد ہوگا۔ میرا بچپن ختم نہیں ہوا تھا تمہارا لڑکپن شروع ہو گیا تھا۔ ایک دن تمہیں میری صورت یا کوئی ادا بھا گئی تو تم نے اپنے دوست محمد بن صالح سے سکوٹ کر کے مجھے تالاب کی سیر کے لیے لیجانا چاہا۔ ایک تو میں چھوٹا تھا والدین کی اجازت بغیر گھر سے دس بیس گز دور بھی جانے کی ہمت نہ تھی، دوسرے شام کا جھٹپٹا تھا اور جلدی باورچی خانے میں گھس کر جمال بی یا ماما کو تنگ کرتا تھا کہ بھوک لگی ہے جلدی کھانا دو، تیسرے تم بالکل اجنبی لڑکے تھے تمہارے ساتھ کس طرح جاتا۔ چنانچہ میں نہیں گیا۔ تم بد تماش نہیں تھے ورنہ میرے گھر کے بار بار پھیرے کرتے اور مجھے گھیر گھار کر تالاب تو دکھا ہی لاتے۔

سنگاریڈی کی اس پہلی ملاقات کے بعد دکنی بچوں کی کہاوت کے مطابق " بھوم بھاٹ " ہو گئی۔ ہم دونوں بچپن میں بچھڑے تو پھر جوانی ہی نے جوت جگائی۔ میں سٹی کالج میں پڑھتا تھا اور تم عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں۔ تمہارے کالج میں عزیز احمد کا ڈرامہ کالج کے دن " اسٹیج کیا جانے والا تھا۔ ان دنوں پیشہ ور تھیٹریکل کمپنیوں تک میں نسوانی کردار لڑکیاں اور عورتیں نہیں کرتی تھیں۔ مدنی نقاب کی کہنے ہیں ایک خوبرو نوجوان فقیر محمد ہیروئن کا پارٹ کرتا تھا ہے۔ ایک ہی مرتبہ دیکھ کر میں اس کا فریفتہ ہو گیا۔ دوسرے دن

دیانیک وردھنی تھیٹر کے کئی چکر کاٹے کہ اس ظالم کا دیدار نصیب ہو مگر وہ نہ ملا۔ تمھارے کالج سے کچھ لوگ سٹی کالج آئے اور ہیروئن مس آرورا کا پارٹ کرنے کے لئے میرا انتخاب کیا۔ حالانکہ اس وقت مجھ سے بہتر شکل و صورت کے بہت لڑکے تمھارے کالج میں پڑھتے تھے۔

پھر تمھارے اور میر حسن کے ڈرامے "ہوش کے ناخن" کے اسٹیج کرنے کا سال آیا تو میں دوبارہ پکڑا گیا۔ ہماری نام نہاد خوب صورتی سے زیادہ میر حسن کی مستی کا زور تھا۔ یاد ہے میر حسن کب کس کا عاشق ہوا۔ ہم تو تھے ہی خواجہ حسن نظامی کا گرویدہ ہوا۔ عباس علی خان پہ جان چھڑکی۔ میکش کا دیوانہ ہوا اور نہ جانے اپنے دل کے گوشوں میں کس کس کو قید کیے رہا۔ ایسے میر حسن اور شاید تمھاری رائے بھی شامل ہو "ہوش کے ناخن" کی ہیروئن مجھے بنایا گیا تھا

ریہرسل کرتے کرتے سب تھک جاتے تو تم شرارت سے لفظ بگاڑ کر کہتے اچھا بھئی "انٹرول" ۔ اسٹار ملنے کے سینما کے چونی والے ناظرین بھی انٹرویل ہی کہا کرتے تھے۔ انٹرول ہوتا تو میر حسن مجھے لیاقت منزل کے قریب والی بمبئی بیکری میں لے جاکر چائے پلاتا۔ پیسٹری کھلاتا اور ادھر ادھر کی مزیدار باتیں کرتا اور میرا دل لبھاتا تھا۔ ہماری واپسی میں کبھی دیر ہوجاتی تو تم میر حسن پہ غصہ کرتے کہ کام کے وقت کام اور چائے کے وقت۔ پھر رک کر کہتے اس وقت بھی کام ہے۔ مجھے دو ایک بار تیرا معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک پیالی چائے کا بھی روادار نہیں مگر تم نے بعد کی زندگی میں ثابت کر دکھایا کہ محنت اور محبت میں قریبی رشتے کے باوصف ایک سے دوسرے کو حسب ضرورت الگ رکھنا چاہئیے۔ مخدوم میں یہ نہیں کہوں گا کہ زندگی کے کچھ لمحات تم نے ضائع نہیں کئے۔ مگر اس زبان میں دوسری ہی نوعیت کی زندگی تھی۔ شاید وہ نہ ہوتی تو تم اتنے اچھے نہ ہوتے اور اتنے اچھے کام نہ کرپاتے۔

جس دن شو تھا ہم سب بہت مسرور بلکہ مغرور تھے کہ ہمارا ڈرامہ دیکھنے کے لیے سر اکبر حیدری اور رابندر ناتھ ٹیگور آرہے ہیں۔ لیاقت منزل کا میدان کرسیوں اور صوفوں سے پاٹ دیا گیا تھا، پورا علاقہ روشنی سے جگ مگ جگ کررہا تھا مہمان آنے لگے تھے اور گرین روم میں میک اپ ہو رہا تھا۔ یاد ہے ایک بابن لال ہوا کرتے تھے۔ پینتالیس پچاس کا سن، سر کے بال کھچڑی، نیلی آنکھیں، نہایت گورے اور وہ جو نور برسنا کہتے ہیں تو بڑے میاں کا کیا نورانی چہرہ تھا۔ اس پہ سہاگہ خوش مزاجی۔ ہر ایک سے ہنس ہنس کر بات کریں اور جس سلسلے سے کردار ڈرامے میں آنے والے ہوں اسی سلسلے سے ان کا میک اپ کریں۔ یاروں کو عجلت کہ فوراً میک اپ کراکے آئینے سے اپنی داد لیں اسلیے شور مچائیں "پہلے ہم، پہلے ہم" اور بابن لال کی بزرگی جوش میں آئے اور وہ انھیں ایک گھڑی میں سیدھا کردیں۔

یونیورسٹی میں آنے آنے تک میں نے طالب علم مقرر کی حیثیت میں چھوٹا موٹا مقام پیدا کرلیا اور سٹی کالج کا نائب صدر ہوچکا تھا۔ تقریر کے میدان میں خود کو بڑا تیس مار خان سمجھنے لگا تھا۔ انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کے صدارتی انتخاب کا زمانہ آیا۔ جی ایم خان اور تم صدارتی امیدوار تھے۔ میں تمھارا کارندہ اور ووٹر تھا۔ میر حسن، جمیل احمد فاروقی اور شنکر جی نے تمھارے حریف کو ہرانے کے لیے جان کی بازی لگادی تھی۔ اپنی تعلیم "پیلا دوشالہ" لکھ کر اس وقت تک تم مشہور ہوچکے تھے۔ میں تمھارے اور میر حسن کے بہت زیادہ قریب نہیں جاتا تھا مگر میر حسن کو میری دوری کھٹک رہی تھی اور وہ زیادہ سے زیادہ پیار پیدا کرنا اور تمھارے انتخابی جلسوں میں مجھ سے تقریریں کراکے اپنی راہ عشق ہموار کرنا چاہتا تھا۔

فرحت منزل ہاسٹل میں رہنے والے لڑکوں کو تمھارا ووٹر بنانے کے لیے وہاں ایک جلسہ کیا گیا اور میرحسن نے مجھ سے تقریر کی فرمائش کی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ میں تمھاری قوتِ گویائی کی بے حساب تعریف کروں اور اداکاری کو جتنا ہو سکتا ہے سراہوں۔ اسی دن میرحسن نے پہلی بار مجھے "بے بی" کا لقب دیا اور مرتے دم تک مجھے بے بی کہتا رہا۔ میں نہ تم کو بڑا اداکار مانتا تھا اور نہ مقرر۔ دل میں یہ گھمنڈ کہ ہم ہیرو ہی کا پارٹ کرتے ہیں۔ سٹی کالج کی بزمِ مباحثہ کے نائب صدر رہ چکے ہیں تمھیں جھنڈے پہ اس طرح چڑھائیں تو ہم کدھر جائیں گے۔ مگر جی کڑا کر کے برسرِ عام کہہ دیا کہ تقریر کے معاملے میں مخدوم محی الدین اپنی مثال آپ اور ہم جیسے ان کے آگے طفلِ مکتب ہیں۔ اس دن تم نے اتنی خوبصورت تقریر کی کہ میں نے اپنا جو بت دل ہی دل میں تراشا تھا وہ پاش پاش ہو گیا مگر میرے دعوے کا بھرم بھی رہ گیا۔ کہ تم بے مثال مقرر ہو۔ جو تم نہیں تھے۔ جلسے کے بعد میرحسن نے میری تقریر کی تعریف کی اور کرتے کیے نہیں عاشق جو تھے۔ تم نے ایک لفظ نہ کہا۔ مجھے بہت برا معلوم ہوا مگر گھر جا کر سوچا کہ اگر مخدوم تعریف کر بھی دیتا تو کیا ہوتا۔ ہم دونوں کی دوستی کی ایک اہم قدرِ مشترک یہ بھی رہی کہ تحسین باہمی محض بکواس ہے۔ تعریف و توصیف میں وقت ضائع کرنے کی بجائے ہم ایک دوسرے کو گالیاں کیوں نہ دیں اور دھول دھپے سے کیوں نہ جی بہلائیں۔ میرحسن البتہ ہم دونوں سے مختلف تھا۔ تعریف پر آیا تو پل باندھ دئیے۔ مذمت کی ٹھانی تو بڑے بڑوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے فحش اشعار نے کیسے کیسوں کا حلیہ بگاڑ دیا۔

گالی گلوچ میں تم ہیٹے نہ تھے۔ بڑی کراری اور بے ساختہ گالیاں اختراع کرتے تھے مگر آج یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ تم نے کبھی کوئی فحش شعر نہیں کہا۔

شہر کی کرائے کی عمارتوں سے نکل کر جامعہ جب اڈکمیٹ منتقل ہوئی تو کچھ طلباء مجبوراً ہاسٹل میں شریک ہو رہے تھے کیونکہ شہر میں بھی وہ ہاسٹل میں رہتے تھے مگر یاد ہے ہم لوگوں نے "تم" "میں" میرحسن وغیرہ نے آپس میں یہ گفتگو کی کہ جامعہ عثمانیہ کی تاریخ کا ایک نیا باب لکھا جا رہا ہے اس میں ہمارا نام بھی آنا چاہئیے اس لیے ہاسٹل میں رہیں گے۔

اب تو شاندار بہت سے ہاسٹلیں بن گئی ہیں۔ شروع میں ایک ہی بارک تھی اور لمبے عارضی اقامت خانہ یا ٹمپوریری ہاسٹل کہتے تھے۔ پختہ دیواریں، ایسبسٹاس کی اونچی چھت، شاہ آباد کا فرش، اور کوئی دو ڈھائی سو کمرے۔ شہر کی نظامت منزل، فرحت منزل اور مسرت منزل کی ہاسٹلوں کے لڑکوں کا حق پہلے تھا اس لیے انھیں کمرے دے دئیے گئے مگر ہم جیسوں نے بھی یلغار کر دی تھی اس لیے پروفیسر وحید الرحمن صاحب نے فوراً چند خیمے نصب کر کے ان میں ہمیں ٹھہرایا اور جب کمرے دئیے تو تمھیں میرحسن کے ساتھ رکھا اور مجھے شہریار کاوس جی کے ساتھ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہم پہ انگریزیت بہت چھائی ہوئی تھی اور ہم ایک پارسی لڑکی سے عشق کیا کرتے تھے۔ مگر کیا عشق؟ چپکے سے چاکلیٹ کا پیکٹ دے دیا۔ سالگرہ آئی تو کوئی تحفہ پہنچا دیا۔ کھیل کود میں ایک دوسرے کے پارٹنر رہے۔ اور عشق تمام شد۔ جاگیرداری کا نظام اپنے شباب پر تھا۔ حیدرآباد شہر میں جس مسلمان کو دیکھو سرکاری ملازم، جاگیردار، منصب دار، یا نواب ہوتا یا کم از کم خود کو ایسا ظاہر کرتا۔ اس نظام کی تمام برائیاں مسلمانوں نے بھی اپنائی تھیں اور ہندوؤں نے بھی۔ مگر بدنام مسلمان زیادہ تھے۔ کچھ واقعی بدمعاش تھے اور ان کی بدمعاشیاں یاد کرتا ہوں، تو کانپ جاتا ہوں۔ کچھ برائے نام بدمعاش تھے ان کی کہانیاں یاد کر

کرکے بنتا ہوں کہ بدمعاشی بھی نہ کر سکے۔ دیکھو اپنا عابد علی خاں بھی تو جاگیردار تھا، اس کی شرافت سے دم گھٹتا تھا، اس نے کون سی بدمعاشی کی؟ میکش مرحوم "صاحبزادہ" تھا۔ اشرف علی خان بھی صاحبزادہ تھا۔ اپنے ساتھیوں میں ڈھیر بھر امیر زادے صاحبزادے، نواب زادے اور جاگیردار تھے اور بیشتر شریف۔ مگر اس کے باوجود مسلمان بدنام تھے۔ پارسی، ہندو اور عیسائی لڑکیاں اور ان کے والدین تو مسلمان لڑکوں کے نام سے ہی بدکتے تھے اسی لیے ملنے جلنے میں احتیاط کرتے اور لڑکے لڑکیوں کے اختلاط باہمی کو ناپسند کرتے تھے۔ بتاؤ ایسے میں ہمارا عشق اور وہ بھی ایک غیر مسلم لڑکی سے کوئی معمولی کارنامہ تھا؟

ہمارا اڈہ حیدرآباد کی ایک عیسائی خاتون مسز مچایا کا مکان تھا۔ جنھیں میں ان کے بیٹے اور اپنے یار غار اسعد ہی کی طرح "ممی" پکارتا اور اپنی ماں کے برابر سمجھتا تھا۔ مسز مچایا اور ان کی بہن مسز چارلس کو ڈرامے کا بہت شوق تھا۔ ان کے گھر میں انگریزی ڈراموں کے شوقینوں کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور وہیں ہم نور جہاں شتل کاک بھی کھیلا کرتے تھے۔ ایک لحاظ سے وہ گھر ایک خانگی کلب تھا۔ اس پارسی لڑکی سے وہیں ملاقات ہوئی اور ہوتی ہی رہی۔

عابد روڈ پر میرے سٹی کالج کے ایک دوست میر اقبال علی خان نے چھوٹی سی ایک دوکان کھولی۔ اقبال اسٹور اور کچھ ملے نہ ملے۔ یہاں قیمتی پوڈر، سینٹ، لپ اسٹک، قسم کی ایسی بہت سی چیزیں ملتی تھیں جو لڑکیوں کے مطلب کی ہوں۔ اقبال کی خواہش تھی کہ شہر کی خوبصورت لڑکیاں، پارسی، ہندو اور عیسائی، کیونکہ مسلمان لڑکیاں تو بے چاری پردہ نشین تھیں۔ اس کی دوکان پہ خریداری ہو نہ ہو دلبرانِ دکن کو ایک نظر قریب سے دیکھنے کا موقع مل جائے اور کسی سے آنکھ لڑ جائے۔ اقبال نے سینٹ پوڈر وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے پیکٹ بناکر اور ان پر اقبال اسٹور کی مہر لگا کر مجھے دئیے اور مضمون دیتا کہ میں ان لڑکیوں کو تحفتاً دوں جو مسز مچایا کے گھر ڈرامے کی ریہرسل، شتل کاک کے کھیل وغیرہ کے سلسلے میں آتی ہیں۔ ڈاکٹر گورک شنکر کی نہایت حسین صاحبزادی کستوری، اس کی بہن ولاسنی، ایلین تھیافولس، نرگسی ڈانس، بوڈی والا روز میری، مہرو ہورانا اور دوسری کئی لڑکیاں آتی تھیں۔ کوئی خوبصورت ہے تو کسی کی جوانی پھوٹ پڑی ہے۔ کوئی چنچل تو کوئی چرب زبان۔

ابھی ابھی میں نے اپنے ہم سبق شہریار۔ کاؤس جی کا ذکر کیا ہے کہ ہاسٹل میں وہ اور میں ساتھ رہتے تھے۔ شہریار اس پارسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر مخدوم جیسا کہ تم اس لفظ کا ایسا ہی تلفظ کرتے تھے شہریار سے اپنے اظہارِ عشق میں کوئی "مسٹیک" اور وہ لڑکی شہریار سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو گئی۔ شہریار بڑا شریف آدمی تھا۔ دوست بھی بہت پیارا تھا غریب شرافت اور حیا میں مارا گیا۔ ہمت نہ ہوئی کہ مجھ سے کہتا میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔ اس کی بجائے ہر رات بارہ ایک بجے جب سو جاتے تو اندھیرے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے مصنوعی سسکیاں لیتے ہوئے بی اے کی انگریزی نظموں کی نصابی کتاب "گولڈن ٹریژری" کی نظمیں دھیمے سروں میں بڑبڑاتا، بار بار اس لڑکی کا نام لیتا اور میری نیند خراب کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا عشق مجھ پر ظاہر ہو جائے۔ مگر وہ چھپا ہوا کب تھا؟ لڑکی نے مجھے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ ویسے بھی معلوم تھا۔

میں نے راتوں کی اس متواتر بڑبڑاہٹ سے تنگ آکر ایک دن تمھیں سارا قصہ سنا دیا۔ تم نے لڑکی کا حلیہ وغیرہ پوچھا جو میں نے بتا دیا تو لڑکی تمھاری سمجھ میں آ گئی اور تم نے پہچان لیا کہ اسے عابد روڈ پر آتے جاتے دیکھ چکے تھے۔ تم نے مشورہ دیا ایسی شکل و صورت کی لڑکی سے شہریار کو شادی کر لینے دو تم کوئی خوبصورت لڑکی تلاش کر لو۔ میں نے جواب میں تم سے کہا یہ تم [illegible]

تم نے جواب اعراب دیا مجنوں تو الو کا پٹھا تھا (بی) تمھارے باپ لو کالطف نہیں دے سکتا۔ پھر تم نے کہا حقیقۃً دو جہاں سے پچاپا کو مسترد کر کے کسی اور سے عشق تو کوئی احمق ہی کرسکتا ہے۔ ہم نے تمھیں سمجھایا کہ وہ تو اپنے جیونت راؤ کا مال ہے اور کہا میں تم سے شہریار کا علاج پوچھ رہا ہوں اور تم میرے ہی عشق کے نئے نسخے تجویز کر رہے ہو۔ تم بولے یہ عشق پشتی سب جوانی کا جنون ہے۔ شہریار گولڈن ٹریژری نکلتے نکلتے تھک جائے گا تم اس لونڈیا کو بھول جاؤ گے اور سب کی اپنے اپنے حالات کے مطابق شادیاں ہو جائیں گی۔ چنانچہ یہی ہوا۔ یہ طویل داستان سنانے کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ تمھارے مزاج کا ایک عکس یہ بھی تھا۔ تم نے ایک مرتبہ بھی مجھ سے نہ کہا کہ یار مجھے پچاپا سے تو ملاؤ۔

تمھیں یاد ہوگا کہ بعد کے دنوں میں جب میرا ڈراما "طبیبِ حاذق" اسٹیج ہونے لگا تو ایک کردار تمھیں بھی دیا تھا۔ ریہرسل پچاپا کے گھر میں ہوتے تھے۔ اپنا مرحوم دوست حلیم بھی کوئی پارٹ لے رہا تھا۔ تم نے مجھے وارننگ دی تھی کہ حلیم سے پارٹ نہ کراؤ اور اس کا آنا جانا بند کردو۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے کہ پچاپا کو اس سے دلچسپی ہے۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ ہر لڑکی اور خصوصاً پر نازک اندام کی مسکراہٹ قیامت ہوتی ہے مگر اس قیامت کو حلیم کی طرح محبت سمجھ لینا حماقت ہے۔ ڈراما خیر خوبی سے اسٹیج ہوگیا کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی مگر مجھے آج بھی حیرت ہے کہ پچاپا کے حسنِ دوشیزگی نے تم میں کوئی آگ نہیں بھڑکائی۔ کچھ میرا خیال کچھ جیونت کا پاس اور بہت کچھ تھا تمھاری طبیعت کی اٹھان۔ مخدوم۔ تمھاری یاری اور پاسداری اب کہاں ملے گی۔

عارضی اقامت خانے' اڈیکمیٹ کی ایک چاندنی رات یاد آگئی۔ جامعہ کی مستقل نئی عمارتیں کافی اونچی جگہ پر تعمیر ہو رہی تھیں۔ دو تین میل دور کوئی ندی یا نالہ نہایت نیچی سطح پر تھا اور وہیں سے ریت لائی جاتی تھی۔ ان ریت لانے والی ٹرالیوں کے لئے ریل کے ننھے منے انجن منگوائے گئے تھے اور پتلی پتلی پٹریاں ڈالی گئی تھیں۔ دن بھر کام ہونے کے بعد تمام ٹرالیاں کسی ایک جگہ کھڑی کردی جاتیں اور پہیوں پر لوہے کا ایک تکون قفل لگا دیا جاتا تاکہ ٹرالیاں نہ چلیں۔ طے ہوا کہ ندی کی سیر کو چلیں۔ تم نے کہا کسی طرح دو ٹرالیاں چرائی جائیں ان کو ریل کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے سے جوڑا جائے دس بارہ لڑکے مل کر پہیوں کو اس تکون قفل کے اوپر سے ادھر طرف پہنچائیں اور پھر ان میں چلیں۔ انجن کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ دو تین میل ڈھلان کے تھے اور ٹرالی خود بخود بھاگتی تھی۔

یہ سارا ٹیکنیکل کام تم نے اور شہاب نے اپنی نگرانی میں کرایا اور جب ٹرالی کے پہیے [illegible] صاف ہوگیا تو ہم سب اپنے ساز و سامان کے ساتھ ان میں بیٹھے تم نے شہاب کو ٹرالی کا "ڈرائیور" مقرر کیا اور ہمارا قافلہ ہماری سیٹیوں کی گونج میں جانب ڈھلان روانہ ہوا اور تھوڑی دیر میں منزل مقصود قریب آگئی۔ ندی کا کنارا ٹرالی کی برق رفتاری سے دل دھک دھک کر رہا تھا کہ نہ جانے کب الٹ جائے۔ تم نے آواز لگائی "ارے ڈرائیور شہاب بریک! ورنہ ہم مرے" شہاب نے آہستہ آہستہ بریک لگایا۔ ٹرالی رکی۔ ہم سب ٹرالی سے اترے، سامان سجایا اور ریت پر لیٹ گئے۔

سامنے ہارمونیم سنبھالا، جمیل فاروقی وائلن کا سر ڈھونڈنے لگا۔ غلام علی نے طبلے پر تھاپ دی اور کسی نے تان اڑائی۔

ریتی میں لگی آگ پریشان ہے تیلی کچھ شعلہ بدن اترے ہیں ریتی میں نہانے

خوش گپیاں کرتے پانچ دس منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اس سنسان بیابان میں گھنگھرو یا پازیب کے قسم کی ایک جھنکار اس کے بعد بیس پچاس گز کے فاصلے پر ایک شیرنی قہقہہ اور ساتھ ہی پستول کا ایک فائر سنائی دیا۔ ہم دس بارہ کڑیل جوان اس وقت ایسے

جیوٹ تھے کہ ایک ہی فائر میں ڈھیر ہوگئے۔ سر پر پاؤں رکھ کر ایسے بھاگے کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ ہانپتے کانپتے پہلے ہاسٹل پہنچے اور جب دم میں دم آیا تو سوچنے لگے کہ کوئی خواب تھا یا سچا واقعہ۔ فائر کرنے والا کوئی عاشقِ صادق تھا یا بوالہوس، قہقہہ پر جانے لگا یا تھا یا کسی چڑیل نے، سرزمین جامعہ پر اس جوڑے کی آمد کو مداخلت بیجا قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ سب اپنی اپنی کہہ رہے تھے مگر تم نے کہا" ہماری عقل مندی دیکھو۔ محاذ عشق دوسرے کا اور گولی ہم کھائیں؟" "نو تھینک یو" مخدوم! جب تم سیاست کے میدان میں کودے تو تم نے اپنے پرائے محاذ کا فرق مٹا دیا۔ جو لوگ تمھیں گولی مار سکتے تھے وہ بھی تمھارے لئے سینہ سپر ہوگئے۔ کامیاب رد پوشی کوئی تمھارا کارنامہ نہیں بلکہ اس محبت کا کمال تھا جو تم سے کی گئی۔ تم نے بھی تو ہر ایک سے بے پناہ محبت کی ہے۔

آپا جان تم سب سے پردہ کرتی تھیں۔ ہاں یاد آیا انہوں نے ہم سب سے بھی پردہ کرلیا ہے اور اب تک تو ان سے تمھاری ملاقات ہو چکی ہوگی۔ جب کراچی آئیں تو مجھ بتایا تھا کہ جیل سے چھوٹتے ہی نہ جانے تمھاری کون سی قید تھی سب سے پہلے ان سے ملنے گئے، شہاب کو بھی ساتھ لے گئے، دیر تک گپ لڑائی پرانے قصے دہرائے جب وہ پردہ کرتی تھیں اور اسی نشست میں تم نے میرے بھانجے معید کو جسے تم اور میر حسن نے دنیا بھر کی گالیاں سکھا کر شوخ بنا رکھا تھا میری بابت پوچھا "کیوں بے کیسا ہے تیرا ماموں اور آج کل کیا کر رہا ہے؟" معید نے جواب دیا" مخدوم بھائی وہ آپ کی طرح بیکار لیڈر بھیڈر نہیں ہیں کمیشن کے افسر ہیں افسر۔" بھلا یہ سن کر تم خاموش ہو سکتے تھے۔ تم نے جواب دیا" چپ رہ بے" جس کمیشن کا افسر تیرا ماموں ہو، ہم جانتے ہیں وہ کیسا آئین بنائے گا۔

میں تمھاری اولین قید میں چنچل گوڑہ جیل میں تم سے ملا تھا جس کا تفصیلی ذکر اپنی کتاب "ذکر یار چلے" میں کرچکا ہوں۔ یار تم ایسے بے مروت نکلے کہ کتاب چھپنے کا انتظار بھی نہ کیا اور چل بسے۔ اسی سلسلے کا ایک اور قصہ سنو۔ یہ تو تمھیں یاد ہوگا کہ دو دوستوں میں صرف میں ہی تم سے ملنے آیا تھا۔ میرے چھوٹے چچا مرزا منظور الحسن کے ایک دوست تھے۔ ستم راؤ۔ چھوٹے موٹے راجا تھے۔ ہم سب انھیں راجا صاحب کہتے تھے۔ اپنی جاگیر سے جب بھی آتے، اور اچھے خاصے لاؤ لشکر کے ساتھ آتے تو چچا کے پاس ٹھہرا کرتے تھے۔ گھر والوں سے کوئی پردہ نہ ہوا تھا اور وہ گھر والوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک دن مجھ سے پوچھا۔ یہ تمھارے دوست مخدوم کی آمدنی کا کیا ذریعہ ہے۔ میں نے کہا کوئی نہیں۔ فرمایا خیر جب وہ جیل میں نہیں تھا تو سنتے ہیں کچھ تو کرتا رہا ہوگا اور اب تو اس کے گھر فاقے ہو رہے ہوں گے۔ میں نے جواب دیا اتنی پرانی اور گہری دوستی کے باوجود ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر کے حالات نہ تو معلوم کرتے ہیں اور نہ خود بیان کرتے ہیں۔ لڑکے اسی لیے تو میں آج کل کے نوجوانوں کو نالائق کہتا ہوں۔ میاں تم تو دوستوں کی بات کر رہے ہو میں اپنے پورے گاؤں والوں کے حالات جانتا ہوں۔ یہ لو، کچھ روپے مخدوم کے گھر پہنچا دو مگر میرا نام مت بتانا۔ میں نے روپے لے لیے اور پوچھا راجا صاحب آپ مخدوم سے کبھی نہیں ملے اور اس کی شاعری سے بھی واقف نہیں تو اس عنایت کی کیا وجہ ہے۔ راجا صاحب کچھ سوچنے لگے اور کچھ دیر بعد بولے مجھے کچھ نہیں معلوم کہ مخدوم کتنا قابل ہے، کیسا نوجوان ہے اس لئے تمھاری دوستی کیوں ہے مگر میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ آئندہ دس بیس برسوں میں مخدوم کوئی ایسا کام کر جائے گا کہ ہزاروں اس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔ کوئی تعجب نہیں جو وہ دکن کا دلارا بن جائے۔ میں نے کہا راجا صاحب وہ اشتراکی خیالات کا آدمی ہے۔ اولین موقع ملنے پر آپ کی جاگیر بھی ضبط کرلے گا۔ کہنے لگے ہم خود تنگ آگئے ہیں اس جاگیر سے۔ نوکر دو گھنٹے تک پاؤں نہ دبائے تو نیند نہیں آتی۔ ٹکٹکی لیتے ہیں تو صبح سے شام تک شہر کا چکر لگاتے پھرتے ہیں نہ کام نہ دھام۔ ہم تو اپنی آمدنی کو حرام کا مال سمجھتے ہیں مگر یہ حرام خوری دادا پردادا کے زمانے سے چلی آرہی ہے۔ مخدوم تم سے ملنے

والے ایسے بھی تھے۔

مگر ہم جیسے چاہنے والے کیسے تھے کہ کبھی تم سے پوچھا بھی نہیں کہ گھر کا کاروبار کیسے چلاتے ہو۔ روز کا ملنا جلنا؟ برسوں کی رفاقت گھریلو نشستیں، مشاعروں کی محفلیں، کھیل کا میدان، ڈرامے کا اسٹیج، دعوتوں میں یکجائی، ہوٹلوں میں صحبت، پوری رات آوارہ گردی میں گذر دی تو پورا دن بحث کی نذر ہو گیا مگر پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ آسادری بڑھتی ہے تو کس اسکول میں ؟ آج گولڈ فلیک سگریٹ پی رہے تو کہاں سے آیا ؟ قمیص کے بٹن کیوں غائب ہیں ؟ جوتے کی ڈوریاں ٹوٹ گئی ہیں نئی کیوں نہیں ڈالتے ؟

جامعہ میں اپنا ایک درزی تھا۔ ملیا۔ اپنا کیا پوری جامعہ کا خدمت گذار۔ ایسا پاگل کا مدد بار کا مجھے آج تک نہیں ملا۔ اسے ساری فکر یہ تھی کہ تمام لڑکے اسی کی سلی ہوئی نیلے رنگ کی شیروانیاں پہنیں۔ اور کسی دوسرے درزی کا جامعہ میں عمل دخل نہ ہو۔ نہ کسی سے اجرت طے کرے، نہ پیشگی مانگے اور نہ شیروانی ہاسٹل کے کمرے میں پہنچانے کے بعد یہ پوچھے کہ سلائی کب ملے گی۔ آپ نے شیروانی پہن لی اس کا جی باغ باغ ہو گیا۔ میں جب انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ کا صدر ہوا تو مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ الیکشن سے اس کا کیا واسطہ ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے ہر صدر برابر تھا مگر نہ معلوم کیوں اسے میری کامیابی کی اتنی خوشی ہوئی۔ میرا ناپ لے گیا۔ راتوں رات شیروانی سی کر لایا اور بڑی لجاجت سے بولا کرسی نشینی کے جلسے میں یہی شیروانی پہنیں، میری طرف سے تحفہ ہے۔ اسی ملیا نے تمہاری نیلی شیروانی بھی سی تھی جو تم برسوں پہنتے رہے۔ تمہارے پاس اتنی اچھی بس ایک ہی تو شیروانی تھی بلکے بلکے بالوں سے کالر میلا ہو جاتا۔ مہینوں برسوں میلا رہتا تو ہمیں یہ کہنے کی توفیق بھی نہ ہوتی کہ شیروانی دُھل والو۔ ان دنوں واشنگ کمپنیاں کہاں تھیں۔ دھوبی لے جاتا تو آٹھ پندرہ دن سے پہلے کیا لاتا اور اس مدت میں تم کونسی شیروانی پہنتے ؟

تم بچپن سے دُکھ سہنے کے عادی تھے۔ یہ تو کوئی خاص بات نہیں کیونکہ آج بھی کروڑوں کی زندگی ایسے ہی دُکھ میں بسر ہو رہی ہے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ تم اپنا دکھ بیان کر کے کسی دوست کو دکھی نہیں بنانا چاہتے تھے دوسرے کا درد تمہیں دُکھی بناتا رہا۔ اور تم سکھ کی تلاش میں آتشیں نمرودیں کو دپڑے۔ جیتے جی نہ خود سکھ پایا نہ دکھیوں کا سکھ دیکھا۔ اسی تلاش میں تمہیں سکون ملا اور اسی سے سرور حاصل ہوا۔ فلسفہ بگھارنے والے کہیں گے یہی تو اصل سُکھ اور سرور ہے مگر مجھے بنّے بھائی کے اس قول سے اتفاق ہے کہ "مخدوم نے اپنے جسم اور اپنی ذات کو ان کا وہ تھوڑا سا حق بھی دینے سے انکار کیا جو صحت کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری تھا۔"

چند سطروں یا چند صفحوں میں کیسے بیان کروں کہ تم میری نظر میں کیا ہو۔ یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم اپنے وقت کے افلاطون تھے۔ تم سے ایسی حماقتیں بھی سرزد ہوئی ہیں کہ ہفتوں ہماری گالیاں سُنتے رہے۔ میر و غالب بھی نہیں کہوں گا ہم عصروں میں تم جیسے اور شاعر بھی ہیں تم سے بڑے بھی ہیں اور زیادہ مشہور بھی۔ کوئی خاص مقرّر اور اداکار بھی نہیں تھے۔ بس ہماری طرح تھے۔ حسین و جمیل بھی نہیں تھے کہ کوئی ٹکٹکی باندھے تمہیں دیکھتا رہتا۔ یقیناً بہت گہرے اور پرانے دوست تھے مگر مخفل یاراں میں اور بھی تو تھے۔ میر حسن کہ جس محفل میں گیا صدر بنا۔ اشفاق حسین کہ اس کی ایک ایک گالی اور قہقہے کو آج بھی ترس رہا ہوں۔ نورالہدیٰ کہ جب بولنا شروع کرتا تھا تو معلومات کا دریا بہا دیتا۔ مگر پھر سوچتا ہوں مخدوم تو مخدوم ہے۔ وہ مخدوم ہے کیا ؟

تمہاری زندگی میری حد تک دو ادوار میں منقسم ہے۔ ایک وہ دَور جو میرے دکن چھوڑنے پر ختم ہوا۔ دوسرا وہ جو تمہاری زندگی کے ساتھ ختم ہوا۔ دوسرے دَور کی داستان کا کچھ حصہ مطبوعات کی صورت میں دیکھ چکا ہوں۔

پچھلے دور کی وہ ملاقات یاد کرو جب تم روپوش تھے اور ہند حیدرآباد تقسیم ہوا تھا۔ لیپنے کلامکس کے قریب تھا، اختر حسن کے گھر میں ہم ملے۔ تم نے دوسرے ہفتے دوبارہ آنے کی تاکید کی اور میں پہنچا واپسی کے وقت تم نے تیسرے ہفتے بھی آنے کو کہا مگر میں نہیں گیا۔ اس ملاقات کی تفصیلی ذکر یار چلے میں موجود ہے۔ اور میں نے وہ کتاب اس ملاقات کے ذکر پر ہی ختم کی ہے۔ میں اس لیے نہیں آیا نہیں تھا کہ اگر خدانخواستہ کسی اور شخص کی نشاندہی پر تم گرفتار کر لیے جاتے اور خود تمہیں یا روپوشی کے زمانے کے تمہارے مقربین کو اگر معمولی شبہ ہوتا کہ گرفتار کرانے میں میرا ذرا سا بھی حصہ ہے تو میری بقیہ زندگی اتنی بے چین گذرتی کہ تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ جس دن ایسا شبہ ہوتا اسی دن ہم ایک دوسرے کے لیے مر گئے ہوتے۔

تم دوست تھے، دوست رہو گے۔ ہمدم تھے، ہمدم رہو گے۔ محبوب تھے، محبوب رہو گے۔ اپنے دوسرے دور کی زندگی میں تم انسان دوست تھے انسان دوست کی حیثیت میں یاد کیے جاؤ گے۔ تم نے انسانوں سے محبت کی انسانیت کے لیے محنت کی۔ تمہاری اس محنت اور محبت کو زمانہ رائیگاں نہیں جانے دے گا۔

اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی یہ نہ بتا سکا کہ تم میری نظر میں کیا ہو۔ یہ نہ سمجھنا کہ نثر بیکار ہو گئی ہے بلکہ ؎

بے محبتِ رخسار اندھیرا ہی اندھیرا　　گو جام وہی مے وہی میخانہ وہی ہے

ہمیشہ تمہارا
ظفر الحسن

حیدرآباد ایک عجیب و غریب شہر ہے۔ اس کا چپہ چپہ اپنے اندر سینکڑوں دلکشیاں رکھتا ہے۔ اس کی تاریخ اس کا تمدن اس کی معاشرت اس کی روایات، غرض ہر چیز ذوق رکھنے اور مطالعہ کرنے والے کے لئے گوناگوں دلچسپیوں کا باعث ہوتی ہے۔ بہت کم شہر ہوں گے جہاں طرز معاشرت میں گلی کوچوں میں سمتوں اور محلوں میں اور خوش باشندوں میں ایسا شدید جلوہ اور ایسی بلند و پست بوقلمونی پائی جاتی ہو یا کوئی نسل ایسی نہیں جس کے نمائندے یہاں نہ رہتے ہوں۔ شاید ہی کوئی زبان ہو جو یہاں بولی نہ جاتی ہو۔ یہاں کے محل اور جھونپڑیاں، بنگلے اور باغات، سڑکیں اور گلیاں اپنی اپنی طرز تعمیر اور اپنی تاریخی خصوصیتوں کے لحاظ سے اس شہر کو ایک عجائب گاہ بنا رہے ہیں۔ جتنی اس "فرخندہ بنیاد" میں ماضی کی عظمتیں حال و مستقبل کی تابناکیوں اور جدت طرازیوں کے ہم پہلو ہیں۔ شاید ہی صفحۂ ہستی کی کسی اور آبادی میں پائی جاتی ہوں!

یہ شہر حیدرآباد سلطنتِ قطب شاہیہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے لحاظ سے دسویں صدی ہجری کے اواخر میں خود بخود آباد ہو نے لگا تھا کیونکہ اس سلطنت کے پایہ تخت گولکنڈہ میں مزید آبادی کی گنجائش نہ رہی تھی اور سب سے پہلے وہاں کے امراء نے اس قلعہ کے اطراف و جوانب میں اپنے لئے باغ اور شبستان تعمیر کرنے شروع کر دیے تھے۔ خاص کر قلعہ کی جانب مشرق موسیٰ ندی کے کنارے کنارے یہ آبادی بڑھنے لگی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ میں مستقل طور پر ایک عالیشان شہر کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ شہر جس جگہ آباد کیا گیا۔ اسکے محل وقوع کے بارے میں تاریخ قطب شاہی میں لکھا ہے کہ لطیف و دلکش آب و ہوا ہے : مبارک شہر لے فرخندہ جائے
(ڈاکٹر زور: فرخندہ بنیاد حیدرآباد سے)

حیدرآباد کے شاعر

(۹)

رئیس اختر

۱۹۶۲ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ

رئیس احمد خاں ولد غلام نبی خاں (مرحوم) ۲۶ جون ۱۹۳۶ء کو حیدرآباد کرناٹک کے ضلع بیدر میں پیدا ہوئے وہیں سے ثانوی درجوں کی تکمیل کی چادر گھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے انٹرمیڈیٹ کامیاب کیا اور پھر جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا۔ "جامعہ" کے شعری و ادبی ماحول نے ان کی ذہانت طبع کو روشنی کیا اور اسی ذوق کے سبب بااصول کے اپنے کلام سے زندگی کا ترقی پسند اور سلیم اقدار کو گویائی بخشی۔ رئیس اختر کی پہلی غزل "مجلۂ عثمانیہ" میں کیا چھپی کہ ان کی شعری صلاحیتیں حیدرآباد کے ادبی و علمی ماحول سے خراج تحسین وصول کرنے لگیں۔ دل نشیں ترنم اور بہتر کلام کے سبب کئی کل ہند مشاعروں میں رئیس اختر نے داد حاصل کی۔ ریڈیو سے بھی ان کا کلام نشر ہوتا رہتا ہے۔ ملک کے ادبی رسائل میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔ شعر کے ساتھ ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی رئیس اختر کا رجحان رہا ہے۔ بیدر سے نکلنے والے ادبی ہفت روزہ "وقت" کے اعزازی مدیر بھی رہے ہیں اور وہیں کی ایک انجمن "دیارِ ادب" کے بانی و مشیر کی حیثیت سے ادبی و تہذیبی تقاریب کے انعقاد میں مخلصانہ طور پر معاونت کرتے رہتے ہیں۔ گزشتہ بیس سال سے شعر کہتے ہیں۔ غزل ان کی محبوب ترین صنفِ سخن ہے۔ جدید غزل کے نامور سخنور خورشید احمد جامی کے ارشد تلامذہ میں رئیس اختر کا شمار ہوتا ہے۔ "آندھرا پردیش ہاؤزنگ بورڈ" میں کارگزار ہیں۔ مزاجاً مخلص، یار باش منکسر الطبع اور حیدرآبادی روایات کا عطر مجموعہ ہیں۔ پہلا شعری مجموعہ "آئینہ دار" ریاستی اردو اکیڈمی کی اعانت سے ترتیب و اشاعت کے مراحل طے کر رہا ہے۔

(د۔ خ)

آوازِ قلب و جاں ہیں تمنائے فن ہیں ہم — تاریکیوں میں جیسے چراغِ وطن ہیں ہم
اتنے نہیں ہیں سہل کہ ہر ایک پڑھ سکے — دل کا بیان وقت کا رنگِ سخن ہیں ہم
لرزاں ہے جس کے نام سے تاریکیوں کا دل — اس تابناک صبح کی پہلی کرن ہیں ہم
تعمیر کے شعور کو دیتے رہے لہو — دل کی نظر سے دیکھئے اہلِ کفن ہیں ہم
خاموشیوں پہ آپ ہماری نہ جائیے — پڑ جائے کوئی وقت تو شعلہ دہن ہیں ہم
اک مہ جبیں کے پیار کا اعجاز ہے رئیس — تنہائیوں میں رونقِ صد انجمن ہیں ہم

○

بزم سے ان کی جب سے اٹھا ہوں — لمحہ لمحہ ٹوٹ رہا ہوں
زہر ملے یا امرت ساقی — مے خانہ میں آتو گیا ہوں
رفتہ رفتہ ٹوٹنے والے — میں بھی کبھی آئینہ رہا ہوں
کون ہے قائل رسمِ وفا کا — سر کو جھکائے میں بھی کھڑا ہوں
بھول نہ جانا اے غمِ دوراں — برسوں تیرے ساتھ رہا ہوں
مے خانہ ہی چلئے رئیس اب — گھر تو کبھی کے چھوڑ چکا ہوں

○

دنیا سے آج پاسِ وفا مانگتا ہوں میں — یہ جرم ہے اگر تو سزا مانگتا ہوں میں
کس موڑ پر حیات کے چھوڑا ہے تم نے ساتھ — اک اک سے آج اپنا پتہ مانگتا ہوں میں
میں نے تو کی ہے دردِ مسلسل کی آرزو — تم نے سمجھ لیا کہ دوا مانگتا ہوں میں
برساؤ مجھ پہ سنگ بنام خلوصِ عشق — اپنے کئے کی آپ سزا مانگتا ہوں میں
کیا جانے اب سمیٹ کے ساری تباہیاں — اس دورِ اضطراب سے کیا مانگتا ہوں میں
قاتل کو غمگسار سمجھتا ہوں اب رئیس — مقتل میں زندگی کی دعا مانگتا ہوں میں

○

حادثہ اتنا سخت گیر نہیں — دل گرفتہ ہے دل پذیر نہیں
آنسوؤں کو زبان دے یارب — میرے دل کا کوئی سفیر نہیں
جس کی قسمت نہ فرصتِ غم ہو — میرے ہاتھوں میں وہ لکیر نہیں
تیشۂ کوہکن کا حصہ تھا — سب کی قسمت میں جوئے شیر نہیں
بابِ رحمت کو کھولنا ہوگا — تیرا بندہ ہوں میں فقیر نہیں
لوگ پھر بھی رئیس کہتے ہیں — جانتے ہیں کہ ہم امیر نہیں

○

جلال الدین

حیدرآباد کے بڑے لوگ : سلسلہ ۳

حیدرآباد کے آخری دَور میں یہاں چند ایسی ہستیاں گذری ہیں جو صحیح معنوں میں "بڑے لوگ" تھے۔ یہاں کی تعلیمی، سماجی معاشرتی اور گنگا جمنی تہذیب، اتحاد، رواداری ان ہی کی مرہون منت رہی۔ حیدرآباد کی جس کسی نے اس کو نقشہ سے مٹایا وہ سیاسی شعور کی کمی تھی۔

ان بڑی ہستیوں میں یم۔ نرسنگ راؤ صاحب مدیر "رعیت" بھی ایک تھے آپ یہاں کی ایک اور بڑی ہستی ملّا عبدالقیوم صاحب سے بہت متاثر تھے۔ یہ ایک المیہ ہے کہ یہاں کے مسلمان ملّا عبدالقیوم کے جانشین کو پا نہیں سکے۔ یم۔ نرسنگ راؤ صاحب جس ٹھوس رواداری کے علمبردار تھے اس کا اندازہ آپ کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے جس کو آپ نے اپنی گرفتاری کے وقت ۲۴ر نومبر ۱۹۴۷ء کو جاری کیا تھا

"ملک کے حالات بہت نازک ہیں۔ اہلِ ملک سے میری درخواست ہے کہ جراءت وہمّت اور شانتی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کریں۔ ہندوؤں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے تعلق سے کسی قسم کے خیالاتِ نفرت پرورش نہ کریں بلکہ محبت کے ساتھ پیش آئیں۔ تعصب کا جواب ہرگز تعصب نہیں ہوسکتا بلکہ تعصب کا جواب رواداری ہونا چاہیئے۔ مسلمانوں سے میری استدعا ہے کہ وہ وسیع الخیالی سے کام لے کر بین الاقوامی قومی اور ملک کے حالات کا جائزہ لیں۔ میں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے مفادات ہندوں کے مفادات سے ہرگز علحدہ نہیں ہیں۔ غربت اور افلاس کا ازالہ کرنا اور خوشحالی کے لئے عوام کے معیارِ زندگی کو بڑھانا سب کا مقصد ہونا چاہیئے"۔

نرسنگ راؤ صاحب اپنے اس ایقان پر چٹان کی طرح جمے رہے حق و صداقت کے اظہار میں بھی وہ بڑے بے باک اور جری تھے۔ پولیس ایکشن کے بعد بے گھر مسلمانوں کی باز آبادی کے سرکاری رکن کی حیثیت سے ضلع عثمان آباد کے دورے میں ایک اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میرے ہندو بھائیوں نے پندرہ روز کے عرصے میں کئی گنا زیادہ ایسے مظالم ڈھائے ہیں جن کے پندرہ مہینوں میں رضاکار مرتکب نہ ہوسکے، ہم بہت ہی المناک دَور سے گذر رہے ہیں ہماری مسرتیں بیواؤں، یتیموں اور کمزوروں کی آہ و بکا میں گم ہوگئی ہیں۔ میں نے اکثر مقامات ایسے دیکھے ہیں جہاں بجز عورتوں اور بچوں کے ایک بھی مسلمان نظر نہیں آیا۔ مسلمانوں کو مواضعات میں زراعت سے اور شہروں میں سرکاری ملازمت سے آپ محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ۳۵ لاکھ کی اقلیت کو ذرائع معاش سے محروم کردیا جائے تو کیا ملک ایک رات بھی امن کے ساتھ گزار سکتی ہے ؟"

آپ کی تقریر کے ان جملوں کی صدائے بازگشت سکیورٹی کونسل میں سنائی دی جب ظفر اللہ خاں نے اپنی تقریر میں ان کو دہرایا۔ "انتقام، پھر اکثریت کا انتقام اقلیت پر بے پناہ ہوتا ہے اس کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا"۔ اب اندازہ لگائیے کہ ایم نرسنگ راؤ اور ان کے اخبار "رعیت" نے ریاست میں جمہوریت اور ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی مانگ اور ترجمانی کا منصب ادا کیا تو اس میں عوامی خوشحالی اور رواداری کی کس قدر حقیقت پسندانہ تڑپ تھی۔ ایم نرسنگ راؤ نے ۱۹۳۸ء میں ریاست میں بنیادی انسانی حقوق کے احترام اور خوشحالی کی فضا کو ٹھوس بنیاد دینے کے لئے نواب بہادر یار جنگ صدر مجلس اتحاد المسلمین سے گفتگوئے مفاہمت کی جو "ذمہ دارانہ حکومت" کے مفروضہ خوف کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی۔ ایم نرسنگ راؤ ریاست میں جمہوری روایات کی ترویج اور رواداری کی فضاء کو قائم و مستحکم بنانے کے لئے ۱۹۳۴ء میں ایک مشترکہ پلیٹ فارم "ادارہ جمعیت نظام" کی بنیاد رکھنے میں پیش پیش رہے جس کے صدر سر نظامت جنگ نائب صدور ڈاکٹر لطیف سعید اور رام چندر نایک تھے جو پولیس ایکشن سے قبل رکن ہائیکورٹ رہے اور بعد میں چیف جسٹس ہوئے عابد حسین، بی رام کشن راؤ اور سری نواس شرما اس کے سکریٹریز تھے اور ارکان عاملہ میں کئی ہندو اصحاب کے علاوہ نواب بہادر یار جنگ، مولوی ابو الحسن سید علی، سید احمد محی الدین مدیر "رہبر دکن"، بیرسٹر اکبر علی خاں، خلیل الزماں بعد میں آپ ہائیکورٹ کے رکن اور چیف جسٹس مقرر ہوئے، میر حسن الدین صاحب مدیر اخبار "مملکت" وغیرہ شامل تھے۔ ابتداً جمعیت ملکی حقوق پر زور دیتی رہی جب "ذمہ دارانہ حکومت نظام دکن کے زیر سایۂ عاطفت کو اپنا نصب العین قرار دیں تو مسلم اصحاب جمعیت سے مستعفی ہوگئے یہ استعفے مسلم ارکین کے آزادانہ فیصلہ کا نتیجہ تھے یا اس کے پس پردہ کون کون قوتیں کام کر رہی تھیں جس کے اثر و دباؤ سے اس جمہوری ادارے کی بیخ کنی کی گئی یہ بحث اس وقت بے محل اور بے موقع ہے تاہم یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ریاست حیدرآباد ایک موڑ سے گذر گئی۔ ایم نرسنگ راؤ پست نہیں ہوئے اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ دیش بھر میں جاری تحریک آزادی اور جمہوری فضا کو حیدرآباد میں پیدا کرنے اور گاندھی جی کے اصول "عدم تشدد" اور حق و صداقت کے پرچار کے لئے یہاں کی سیاسی تحریکات میں حصہ لیتے رہے۔ ریاست میں آندھرا کانفرنس کی تنظیم ۱۲ نومبر ۱۹۲۱ء کو ہوئی تو اس کے سکریٹری ہوئے۔ بعد میں دو مرتبہ ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۴ء میں اس کے صدر منتخب ہوئے۔ حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین کے رکن کی حیثیت سے "کم سنی کی شادی پر امتناع" کا بل پیش کیا۔ ریاست حیدرآباد کی کئی کمیٹیوں مابعد جنگ تنظیم جدید و منصوبہ بندی، غذائی مشاورتی کونسل" وغیرہ کی رکنیت اس وقت تک قبول کرتے رہے تا آنکہ حکومت نے ۱۹۴۶ء میں مختلف وجوہ کی بناء پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مسترد کردہ اصلاحات کو عملی جامہ پہنانے کا تیقن نہیں دیا۔

پولیس ایکشن کے بعد آپ کئی سرکاری کمیٹیوں کے رکن رہے۔ "کور دالا کمیٹی" کے رکن ریاست میں زرعی اصلاحات کے نفاذ کی پیش رفت میں قائم ہونے والے "لینڈ کمیشن" کے صدر مقرر ہوئے۔ آپ دو مرتبہ ریاستی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ پہلی بار ۱۹۵۲ء میں حلقہ محلوا کورتی اور ۱۹۵۷ء میں حلقہ کولا پور سے رکن منتخب ہوئے۔ مرکز میں جب پانچسالہ پلان شروع ہوا تو "زرعی اصلاحات" کے پیانل کے رکن رہے۔ ریاست کی تقسیم اور آندھرا پردیش کی تشکیل کے بعد نومبر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۲ء تک ریاستی وزیر رہے اس کے بعد سرگرم سیاسیات سے کنارہ کش ہوئے مگر سماجی تحریکات سے وابستگی کو جاری رکھا۔ ریاستی "بھارت سیوک سماج" کے کنوینر اور صدر رہے۔ اردو کالج اور جواہر لال پالی ٹکنک کے رکن بھی رہے ۱۹۷۴ء میں سے تصنیف و تالیف

میں مشغول ہوگئے آپ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں اپنے مشاہدات کو "۵۰ سالہ حیدرآباد" کے نام سے قلمبند کیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب بہت جلد شائع ہو جائے گی۔

آپ مذہب کے روایتی پابند نہ ہوتے ہوئے بہت ہی خدا ترس تھے آپ عادتاً روزانہ "فلسفۂ راما نج" (اسی فرقے سے آپ کا تعلق تھا)، مثنوی مولانا روم اور رباعیات سرمدؔ کا پابندی سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ مطالعہ آپ کی فطرت ثانی بن چکا تھا سیاسیات، تاریخ ومعاشیات کی معیاری ونادر کتب کی ایک لائبریری چھوڑتے ہوئے ۱۲ رمئی ۱۹۷۶ء کو بیکنٹھ باشی ہوئے۔

آپ کے اجداد کا قطب شاہی دربار سے تعلق تھا اسی تعلق نے آپ کے خاندان صوبہ پٹنم سے گولکنڈہ کے نواحی موضع "منددمل" تعلقہ چیوڑلہ ضلع حیدرآباد کو کھینچ لایا۔ اسی نسبت سے آپ کا خاندان "منددملا" سے منسوب ہے۔ جب قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو آپ کے خاندان کو موضع تلکنڈہ پلی اور موضع آک تو ٹاپلی کی دیشمکھی اور مقطعہ داری ملی۔ یہ خاندان پھر منددمل سے موضع تلکنڈہ پلی تعلقہ کلواکورتی ضلع محبوب نگر منتقل ہوا۔ آپ کی ولادت ۷ ر مارچ ۱۸۹۷ء کو ان کے ننھیالی موضع چیوڑلہ میں ہوئی آپ کے والد منددملا وینکٹ نرسمہوان راؤ صاحب بہت ہی وضع دار اور مرنجان مرنج طبیعت کے بزرگ تھے۔ آپ نے اپنے بچوں کی تعلیم کا انتظام گھر پر ہی کیا۔ لکشما راجو اور محمد حسین صاحب کو تلگو کا معلم مقرر کیا تھا۔ یم نرسنگ راؤ صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی یم راجیندر راؤ کے ساتھ (۱۵) سال کی عمر تک تلگو تعلیم ۱۹۰۸ء اپنے ہی موضع میں پاتے رہے۔ اس کے بعد آپ کے والد نے اردو فارسی تعلیم کے لئے حیدرآباد سے مولوی شرف الدین صاحب کو لاکر اتالیق مقرر کیا۔ جب ان دونوں بھائیوں نے اردو اور فارسی میں کافی استعداد پیدا کرلی۔ تو مولوی شرف الدین صاحب نے اپنے دونوں شاگردوں کو ۱۹۱۲ء میں حیدرآباد لایا۔ مولوی حبیب اللہ صاحب حلقی نے امتحان منشی کے لئے تیار کیا۔ ۱۹۱۵ء میں وینکٹ نرسمہوان راؤ صاحب اپنے دونوں لڑکوں کو بغرض امتحان منشی لاہور لے گئے۔ جس کو ان بھائیوں نے پاس کرلیا۔ جب ۱۹۱۸ء میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو انٹرمیڈیٹ کے داخلے کے لئے ایک امتحان انٹرنس ہوا کرتا تھا اس کی تیاری کے لئے یہ دونوں بھائی ۱۹۱۹ء میں دارالعلوم میں شریک ہوئے مگر امتحان انٹرنس کامیاب نہ کرسکے اس طرح ان کا تعلیمی سلسلہ ختم ہوا۔

اس زمانے میں وکالت کا پیشہ معزز ومقبول تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے شہر حیدرآباد میں مشترکہ وکالت شروع کی۔ یم نرسنگ راؤ کو وکالت سے دلچسپی پیدا نہ ہوسکی البتہ چھوٹے بھائی یم رام چندر راؤ نے پیشہ وکالت کو جاری رکھا نہ صرف "بار" میں اپنا مقام و نام پیدا کیا بلکہ سیاسی اور جمہوری تحریکات میں بھی حصہ لیتے رہے آندھرا کانفرنس کے سکریٹری اور صدر ہوئے ۱۹۳۸ء میں کانگریس کی ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ پولیس ایکشن کے بعد کانگریس کی اقتداری سیاست سے مایوس ہوکر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ آپ اپنے بڑے بھائی سے عمر میں دو سال چھوٹے تھے مگر ان سے ۲ سال قبل ۱۹۷۴ء میں سورگباش ہوگئے۔ یم رام موہن راؤ ایڈوکیٹ جو آجکل سٹی سیول کورٹ میں گورنمنٹ پلیڈر ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔

یم نرسنگ راؤ صاحب نے ۱۹۲۷ء میں اخبار "رعیت" ہفتہ وار جاری رکھا۔ "رعیت" حیدرآباد کی صحافت میں ایک نئی ڈگر کا حامل تھا۔ عوامی مشکلات، دیہی مسائل و معیشت کی اصلاح پر بے لاگ تبصروں کے علاوہ عصری تحریکات کا ترجمان بن گیا۔ جب ریاستی حکومت نے اندرون ریاست لندن کی کمپنی کی جانب سے چلائی جانے والی "نظام گیارنٹیڈ ریلوے" کی مخالفت

شروع کی "رعیت" نے اس وقت کی کساد بازاری کے پیش نظر اس تعاملت کو خسارہ کی معاملت قرار دیتے ہوئے مخالفت شروع کی تو حکومت نے ماہ مئی ۱۹۲۹ء میں "رعیت" ہفتہ وار کو مسدود کیا۔ جولائی ۱۹۳۲ء سے مکرر "رعیت" کو اجازت ملی۔ ۱۹۳۵ء میں ایم نرسنگ راؤ صاحب "رعیت لمیٹڈ" نامی کمپنی قائم کرکے "رعیت" کو ہفتہ وار سے روزنامہ بنایا۔ حکومت وقت نے حکومتی پالیسیوں کی نکتہ چینی، انڈین یونین میں حیدرآباد کی شرکت اور ذمہ دارانہ حکومت کی تائید اور مجلس اتحاد المسلمین کی جارحانہ پالیسیوں کی مخالفت کو حکومت کے خلاف معاندانہ اور باغیانہ "خیالات" کا "رعیت" پر الزام لگاتے ہوئے ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دو ماہ کے لئے "رعیت" کو مسدود کیا مگر اس کے بعد روزنامہ "رعیت" مسدود ہی ہو گیا۔ ۱۷ نومبر ۱۹۴۷ء کو ایم نرسنگ راؤ صاحب قابل اعتراض مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں گرفتار کر لئے گئے اور ضمانت و مچلکہ پر رہا ہوئے مگر حدود بلدیہ سے باہر نہ جانے کی پابندی عائد کی گئی جس کی خلاف ورزی میں یہ ۲۴ نومبر ۱۹۴۷ء کو بھونگیر ریلوے اسٹیشن مع اپنے بھتیجے ایم رام موہن راؤ گرفتار کرکے مشیرآباد سنٹرل جیل لائے گئے۔

ایم نرسنگ راؤ صاحب کے (۳) لڑکے اور (۴) لڑکیاں ہیں۔ بڑی لڑکی جو بورگل رگھوناتھ راؤ سے بیاہی گئی تھیں انتقال کر گئیں مابقی بقید حیات ہیں۔ لڑکوں میں بڑے صاحبزادے ایم نرسمہا راؤ ہندوستان ایروناٹکس لمیٹڈ کے ڈپٹی پرسنل منیجر ہیں۔ دوسرے لڑکے ایم گوپال کرشن راؤ زراعتی کاروبار میں مصروف ہیں۔ تیسرے لڑکے دادھا کشن راؤ جسمانی طور پر معذور ہیں۔

یہ تھے ایم نرسنگ راؤ مدیر "رعیت" کی زندگی کے چند پہلو۔ ایم نرسنگ راؤ حیدرآباد کی تاریخ میں اپنی جمہوریت پرستی حق و صداقت کے اظہار کی بیباکی سچی رواداری کے لئے اپنا جو عمل و کام چھوڑا ہے اس پر یہاں کی گنگا جمنی تہذیب کو ہمیشہ فخر و ناز رہیگا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ساتھیو!

پونچھ بھی ڈالو اب چشم نم ساتھیو — کیوں کریں آج بھی کل کا غم ساتھیو
اپنی تقدیر بنتی ہے تدبیر سے — اب نہ دشمن کا ڈھونڈو کرم ساتھیو
منحصر ہے یہ دنیا جو اسباب پر — سب ہی اسباب ہوں گے بہم ساتھیو
ہمارا ابھی نہ چھوڑو یہ وقت ہے — یوں ہی بڑھتا رہے ہر قدم ساتھیو

ہمتیں پست ہونے نہ پائیں گی اب
ختم ہونا ہے دور ستم ساتھیو!

اقبال کا تصور تعلیم

صلا سے آگے

... عظیم الشان کام میں، صرف دماغ کو نہیں بلکہ جذبۂ حیات و ولولۂ حیات کو ٹٹولیں اور اُسی کو اپنی توجہ کا بنیادی OBJECT یا معروض قرار دیں۔

ترا نومیدی از طفلاں روا نیست
چہ پروا گر دماغ شاں رسا نیست
بگو اے شیخ مکتب گر بدانی
کہ دل در سینۂ شاں ہست یا نیست

عبداللطیف اعظمی

ماہنامہ جامعہ : سب رس کا معاصر

مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے ماہانہ ترجمان "سب رس" نے اپنی عمر کے ۴۹ سال پورے کر لئے ہیں اور اس سال وہ چالیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس مبارک اور مسرت کے موقع پر اپنی طرف سے جو حقیر تحفہ "سب رس" ادارۂ ادبیاتِ اُردو اس کے کارکنوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ ماہنامہ "جامعہ" کے بارے میں ایک تعارفی مضمون ہے۔

ماہنامہ "جامعہ" بھی "سب رس" کی طرح ایک ادارے کا ترجمان ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ ایک تحقیقی ادارے کا ترجمان ہے اور یہ ایک تعلیمی ادارے کا مگر اغراض و مقاصد کے لحاظ سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں۔ ماہنامہ "جامعہ" تاریخ پیدائش کے لحاظ سے "سب رس" سے کوئی پندرہ [۱۵] سال بڑا ہے ـــــ جامعہ کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۲۳ء میں نکلا اور ماہنامہ "سب رس" کا سنہ اجرا ۱۹۳۸ء ہے۔ مگر ۱۹۴۷ء کے اواخر میں دہلی کے فسادات کی وجہ سے "جامعہ" بند ہوگیا تھا اور کوئی تیرہ [۱۳] سال کے بعد نومبر ۱۹۶۰ء میں اس کو دوبارہ حیات ملی۔ اگر اس درمیانی وقفے کو "جامعہ" کی مجموعی عمر سے خارج کر دیا جائے تو "سب رس" کے مقابلے میں اس کی عمر صرف دو سال بڑی ہے۔ جو کچھ زیادہ نہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ خدمت کے لحاظ سے قریب قریب دونوں ہم عمر ہیں۔

ماہنامہ "جامعہ" کا قیام پیدائش علیگڈھ ہے۔ مگر ۱۹۲۵ء کے اوائل میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، علیگڈھ سے دہلی منتقل ہوئی تو قدرتی طور پر ماہنامہ "جامعہ" بھی دہلی آگیا اور انتظامی تبدیلیوں کی وجہ سے، مدیر کے شمارے کے بعد، جو علیگڈھ سے شائع ہوا تھا پانچ ماہ کے وقفے کے بعد، ستمبر میں دہلی سے پہلی مرتبہ شائع ہوا۔ "جامعہ" کے مدیروں میں اردو کے نامی گرامی ادیبوں اور دانشوروں کے نام شامل ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، مولانا اسلم جیراجپوری، جناب نورالرحمان، ڈاکٹر یوسف حسین خاں اور ڈاکٹر عبدالعلیم وغیرہ۔ "جامعہ" کے پہلے مدیر جناب نورالرحمان صاحب (۱۸۹۴ء۔ ۱۹۷۲ء) مقرر ہوئے۔ نورالرحمان صاحب سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے قوم پرور گریجویٹ میں سے تھے، طالب علمی کے زمانے میں علیگڈھ میگزین میں ان کے بہت سے مضامین شائع ہو چکے تھے، بعد میں میر (۱۷۲۲ء۔ ۱۸۱۰ء) اور اکبر (۱۸۴۶ء۔ ۱۹۲۱ء) کے کلام کے انتخابات الگ الگ کتابی صورت میں، سرسید (۱۸۱۷ء۔ ۱۸۹۸ء) کی مختصر سوانح حیات اور انوارالرحمان (مطبوعہ: مرزا نوراللہ مرحوم) کی تلخیص شائع ہوئیں۔ ڈیڑھ سال ـــ جنوری ۱۹۲۳ء تا جون ۱۹۲۴ء، ماہنامہ "جامعہ" ان ہی کی ادارت میں شائع ہوا۔ جولائی اور اگست ۱۹۲۴ء کا مشترک شمارہ مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری (۱۸۸۱ء۔ ۱۹۵۵ء) کی ادارت میں نکلا، ایک سال کے بعد، ماہ ستمبر ۱۹۲۵ء سے ایک جامعی گریجویٹ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا ادارت میں اضافہ ہوا۔ یوسف صاحب اس وقت جامعہ سے نئے نئے فارغ ہوئے تھے، مگر علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ تاریخ ان کا خصوصی مضمون تھا اور "جامعہ"

میں ان کے متعدد مضامین شائع ہو چکے تھے۔ فروری ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین (۱۸۹۷ء۔ ۱۹۶۹ء) یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جامعہ ملیہ واپس آئے تو ان کے ساتھ ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب بھی تھے۔ ادھر یوسف حسین خاں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ جانے کا فیصلہ کیا اس لئے مارچ ۱۹۲۶ء کے شمارے سے یوسف صاحب کی جگہ ڈاکٹر سید عابد حسین کا نام "جامعہ" کی ادارت میں شامل کیا گیا۔ یوسف صاحب کو الوداع کہتے ہوئے اور ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اس شمارے کے شذرات میں مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم نے لکھا کہ: "جامعہ ملیہ کے علیگڑھ سے دہلی منتقل ہونے کے سبب سے ہمارے رسالے کی اشاعت میں جو بے نظمی پیدا ہو گئی تھی، اسے دور کرنے میں یوسف حسین خاں نے نہایت قابلیت اور محنت سے کام کیا اور رسالے کو ایسی حالت میں چھوڑا ہے کہ اس کی بہتری اور ترقی پہلے کی نسبت زیادہ آسان ہو گئی ہے۔" (صفحہ ۲۲۰۔ دسمبر ۱۹۲۳ء (جلد ۲۱ نمبر ۶) تک رسالہ جامعہ مولانا اسلم جیراجپوری اور ڈاکٹر عابد حسین کی ادارت میں شائع ہوتا رہا۔ جنوری ۱۹۲۴ء سے رسالے میں ایک بنیادی تبدیلی کی گئی اور طے کیا گیا کہ باری باری ہر شمارہ اسلامیات یا عمرانیات یا ادب و فنون لطیفہ کے موضوعات پر ہوگا۔ چنانچہ اس سال کے بارہ شماروں میں سے جنوری، اپریل، جولائی اور اکتوبر کے شمارے اسلامیات پر، فروری، مئی، اگست و نومبر کے شمارے عمرانیات پر اور مارچ، جون، ستمبر اور دسمبر کے شمارے ادب اور فنون لطیفہ پر شائع ہوئے۔ اس نئی اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے حسب ذیل حضرات پر مشتمل ایک مجلس ادارت مقرر کی گئی: ۱) مولانا اسلم جیراجپوری ۲) ڈاکٹر سید عابد حسین ۳) ڈاکٹر ذاکر حسین ۴) پروفیسر محمد مجیب اور ۵) ڈاکٹر عبدالعلیم (۱۹۰۵ء۔ ۱۹۷۶ء)۔

یہ خاص نمبر اپنے مضامین اور مباحث کے لحاظ سے بہت کامیاب اور مفید ثابت ہوئے، مگر ہر ماہ کسی مخصوص موضوع پر مضامین حاصل کرنا شاید مشکل تھا اس لیے یہ کامیاب تجربہ ایک سال سے زیادہ نہ چل سکا اور جنوری ۱۹۳۵ء سے پھر وہی حسب سابق عام شمارے شائع ہونے لگے اور جنوری سے اپریل تک ڈاکٹر عابد صاحب کی ادارت میں یہ رسالہ شائع ہوا، مئی سے پروفیسر محمد عاقل صاحب کا ادارت میں اضافہ ہوا اور اگست ۱۹۳۶ء تک یہی سلسلہ قائم رہا۔ مگر ستمبر ۱۹۳۶ء سے پروفیسر عاقل کا تعلق منقطع ہو گیا اور اس ماہ سے اکتوبر ۱۹۳۸ء تک صرف عابد صاحب کی ادارت میں شائع ہوا۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۳۸ء میں عابد صاحب کی جگہ عاقل صاحب نے یہ ذمہ داری سنبھالی اور ستمبر ۱۹۳۹ء تک اڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، اکتوبر میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی صاحب اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے اور ایک عرصے تک انھوں نے اس فرض کو انجام دیا۔ ۱۹۴۱ء میں میں نے جامعہ ملیہ سے فراغت حاصل کی اور ستمبر میں مکتبہ جامعہ کے شعبۂ تصنیف و طباعت کے انچارج کی حیثیت سے میرا تقرر ہوا۔ چونکہ ہاشمی صاحب کا، ان کے بعض نجی مسائل کی وجہ سے بھوپال میں قیام تھا اور وہیں سے رسالے کو مرتب فرماتے تھے اس لیے رسالہ "جامعہ" کی ترتیب وغیرہ میں میں بھی ان کی مدد کرتا تھا۔ اتفاق سے اس وقت "جامعہ" میں مجھے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۵ء کا تین برسوں کی فائلیں نہیں ملیں۔ اس لیے میں یقین کے ساتھ فی الحال نہیں کہہ سکتا کہ ہاشمی صاحب کا رسالہ "جامعہ" سے تعلق کب تک قائم رہا اور کب پروفیسر عاقل صاحب پھر اڈیٹر مقرر ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء کی مکمل فائل ہمارے یہاں موجود ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اس کے اڈیٹر عاقل صاحب تھے اور مجھے معلوم ہے کہ جولائی ۱۹۴۷ء تک وہی مرتب کرتے رہے، ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی میں فسادات کی وبا پھوٹ پڑی اور مکتبہ جامعہ اس کی نذر ہو گیا۔ کئی سال کے بعد مکتبہ جامعہ دوبارہ قائم ہوا تو اب جامعہ ملیہ کے ایک شعبے کے

بجائے لمیٹیڈ کمپنی کی حیثیت سے جامعہ ملیہ سے الگ ایک مستقل بالذات ادارے کی شکل قرار پائی اور چونکہ رسالہ "جامعہ" خود کفیل نہیں تھا، اس لیے لمیٹیڈ کمپنی نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول نہیں کی۔

۱۹۶۰ء میں جامعہ ملیہ نے جشن چہل سالہ منانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت راقم الحروف شیخ الجامعہ کا پرسنل مددگار تھا میں نے پروفیسر محمد مجیب صاحب کے سامنے جو اس وقت شیخ الجامعہ تھے، "رسالہ جامعہ" کے دوبارہ اجرا کی تجویز پیش کی اور اس کے اخراجات کے انتظام کی ذمہ داری خود اپنے ذمے لی۔ شیخ الجامعہ صاحب نے اس تجویز کو بخوشی منظوری فرمایا اور میں نے اس کے نکالنے کے کارروائی شروع کر دی۔ اتفاق سے اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی عنایت سے، جو اس وقت صوبہ بہار کے گورنر تھے، کلکتہ کے ایک غیر مسلم تاجر سے دو ہزار کا عطیہ موصول ہوا، جسے موصوف نے ہماری درخواست پہ رسالہ جامعہ کے لیے مخصوص کر دیا۔ اس طرح رسالے کا مالی مسئلہ وقتی طور پہ حل ہو گیا اور نومبر ۱۹۶۰ء میں، جشن چہل سالہ کے موقع پر اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ اس وقت سے اپریل ۱۹۶۴ء تک ساڑھے تین سال تک میں یکہ و تنہا اس کو مرتب اور شائع کرتا رہا۔ کوئی ڈھائی تین سال کے بعد رسالے کے اخراجات جامعہ ملیہ کے مرکزی بجٹ میں شامل ہوئے اور اس طرح اس کا مالی مسئلہ بھی خوش اسلوبی کے ساتھ حل ہو گیا۔ جامعہ ملیہ کی بعض مصلحتوں کی وجہ سے ۱۹۶۴ء کے مالی سال سے رسالہ "جامعہ" کے اخراجات کی مد مرکزی بجٹ سے نکال کر جامعہ کالج کے بجٹ میں منتقل کر دی گئی اور کالج کے پرنسپل جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب عہدے سے اس کے اڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس وقت سے وہ اس کے مدیر ہیں اور راقم الحروف مدیر معاون اور رسالہ پوری پابندی کے ساتھ نومبر ۱۹۶۰ء سے ماہ بہ ماہ شائع ہو رہا ہے۔

رسالہ "جامعہ" کا شروع ہی سے اردو کے بہترین ماہناموں میں شمار ہوتا ہے، مگر ذاکر صاحب، عابد صاحب اور مجیب صاحب کے جامعہ ملیہ میں آنے کے بعد اس میں کچھ ایسی خوبیاں اور خصوصیات پیدا ہوئیں جو مجموعی طور پہ اردو کے کسی ماہنامے میں نہیں تھیں وہ بہ یک وقت علمی بھی تھا، ادبی بھی اور مذہبی بھی۔ اُس وقت جامعہ ملیہ میں مذکورہ تینوں اساتذہ کے علاوہ مولانا اسلم جیراجپوری، پروفیسر محمد عاقل اور پروفیسر محمد سرور جیسے عالم، ادیب اور دانشور موجود تھے جو پابندی کے ساتھ "جامعہ" کے لیے لکھا کرتے تھے۔ اسی کی وجہ سے اس کا معیار بہت بلند تھا اور اس کی سب سے بڑی اور منفرد خصوصیت حالاتِ حاضرہ کا کالم تھا جسے عام طور پہ ذاکر صاحب اور مجیب صاحب لکھا کرتے تھے، ان دونوں بزرگوں کی دنیا کے سیاسی اور اقتصادی حالات اور مسائل پہ بڑی اچھی نظر تھی، علاوہ ازیں یورپ اور مشرق وسطیٰ کے بہترین رسالے جامعہ کے کتب خانے میں آتے تھے، اس لیے اس کالم میں جو کچھ لکھا جاتا تھا اس کی مثال اردو میں بالکل ناپید تھی۔ دوسرے دَور کے "جامعہ" میں وہ تمام خصوصیات تو پیدا نہ ہو سکیں جو دورِ اول کے زمانۂ عروج میں تھیں، لیکن اگر اس کو خودستائش نہ سمجھا جائے تو عرض کر دوں گا کہ اب بھی یہ اردو کے ماہناموں میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے اور اپنی خصوصیات میں بڑی حد تک منفرد بھی۔

خوش قسمتی سے "جامعہ" کو ایسے ادیبوں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے، جن کی زبان و ادب اور علمی موضوعات پہ گہری نظر ہے، اس کے علاوہ خود جامعہ کے اساتذہ میں ایسے لوگوں کی بہت کافی تعداد ہے جو مختلف موضوعات پہ اچھے مضامین لکھ سکتے ہیں جو زمانے کے تقاضوں کو بدرجۂ اتم پورا کر سکیں، اس کے ساتھ جامعہ کو ہمیشہ ایسے شیخ الجامعہ کی سرپرستی حاصل

رہی جو علم و ادب میں ملک گیر شہرت کے مالک تھے، جیسے مولانا محمد علی جوہر (۱۸۷۸ء۔ ۱۹۳۱ء) ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر محمد مجیب آج کل پروفیسر مسعود حسین صاحب شیخ الجامعہ ہیں۔ جو ملک کے ممتاز ماہر لسانیات میں سے ہیں اور اردو کے بہترین ادیبوں اور مصنفوں میں سے ہیں۔ کالج کے ڈین اور پرنسپل پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، صدر شعبۂ اردو پروفیسر نارنگ اور صدر شعبۂ اسلامیات پروفیسر مشیر الحق اردو کے معروف اور مشہور ادیبوں میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک مرکزی جگہ سے نکلتا ہے جس کی وجہ سے، بہتوں کے مقابلے میں ہمیں کتابت و طباعت اور کاغذ کی خاصی سہولت حاصل ہے، اس لیے ماہنامہ "جامعہ" زبان و ادب کے معیار اور ظاہری حسن و خوبی کی قدیم روایات کو بڑی حد تک نبھائے جا رہا ہے اور اس کے کارکن اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر باغبانی صحرا میں دل و جان سے لگے ہوئے ہیں۔ ●●

ڈاکٹر زور اور کشمیر

عبدالاحد رفیق

ڈاکٹر زور کشمیر میں صرف دو سال رہے۔ اس قلیل عرصے میں انہوں نے کشمیری ادیبوں میں نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ کشمیر میں آتے ہی انہوں نے "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی ایک شاخ قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے یہاں کے ادباء، شعراء، نقادوں اور افسانہ نگاروں کو اپنی اپنی تخلیقات شائع کرانے کی ہمت دلائی۔ زور مرحوم کا یہ کارنامہ ناقابلِ فراموش ہے۔ وہ ہمیشہ ان کی ہمت اور حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ ان کے مردہ دلوں میں نئی زندگی عطا کرتے رہے۔ انہیں اپنے پُرخلوص مشوروں اور نت نئی جدتوں سے نوازتے رہے۔ ان کی مشکلات کو بھانپ کر اپنی مشکلات سمجھ کر انہیں قدم قدم پر رہبری کرتے رہتے۔ وہ ہمیشہ ہنستے اور ہنس مکھ چہرے کو پسند کرتے تھے۔ وہ مشکلات کا مقابلہ بہادری سے کرنے والے کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

آپ نے کشمیر کے ادباء اور شعراء کو ایک مرکز پر لایا۔ انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنے کلام، تحریروں اور رشحاتِ قلم کو چھاپ دیں۔ جہاں تک میرا ذاتی علم ہے وہ ان کی قدمے، درمے اور سخنے مدد کرتے رہے وہ خود اہلِ علم تھے۔ اس لئے ہر ادیب، شاعر اور عالم کی قدر دل سے کرتے تھے۔ "نیل کنول مسکائے" محمود حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو جناب ڈاکٹر زور کے اہتمام و انصرام سے اشاعت پذیر ہوا۔ اور اس پر ایک مفصل دیباچہ خود تحریر کیا جو دراصل کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کی ایک مختصر تاریخ ہے۔

کشمیر میں آپ کے کارناموں کی تفصیل بہت طویل ہے۔ گو آپ یہاں صرف دو سال رہے مگر پھر بھی آپ نے نوجوان دل و دماغ کیلئے بہت کچھ کیا۔ آپ نے کشمیر میں تحقیق اور تفتیش کے لئے پی، ایچ، ڈی۔۔۔ کا سلسلہ بھی شروع کیا تھا اور چند ہونہار طالب علموں میں اس کا ذوق و شوق بھی پیدا کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ مضامین جو ابھی تک جموں و کشمیر یونیورسٹی میں نہیں پڑھائے جاتے تھے ان کی درس و تدریس کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ چنانچہ آپ ہی کی ذاتی کوششوں کی وجہ سے فارسی اور سنسکرت (ایم اے) کے مضامین پڑھانے کا بندوبست ہوا۔

مرحوم کے دل میں کشمیر کو ایک اعلیٰ علمی، تحقیقی اور ادبی مرکز بنانے کے منصوبے موجزن رہتے تھے۔ آپ کہا کرتے تھے کہ جس طرح کشمیر گزشتہ دور میں علم و ادب کا گہوارہ تھا اور طالب علم بخارا، سمرقند اور تاشقند سے علمی پیاس بجھانے کے لئے آتے تھے اسی طرح یہاں ازسرِنو ہونا چاہیئے۔ ●● (اقتباس، شیرازہ، زور نمبر ۱۹۶۲ء سے)

سلیمان اطہر جاوید

زورؔ صاحب

میں چادر گھاٹ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال کا طالب علم تھا ـــــ ۱۳؍ اگست ۱۹۶۱ء کی بات ہے کالج کے شناختی کارڈ پر مجھ کو پرنسپل صاحب کے دستخط لینے تھے۔ زورؔ صاحب پرنسپل تھے میں ان کے اجلاس پر جا پہنچا۔ انھوں نے شناختی کارڈ پر دستخط کر دئیے اس وقت اتفاق سے آٹوگراف بک بھی میرے پاس تھی' میں نے زورؔ صاحب کے آگے بڑھادی۔ انھوں نے میری اس "حرکت" پر مجھے کچھ اس طرح دیکھا کہ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ زورؔ صاحب نے بغیر کچھ کہے آٹوگراف بک پر لکھ دیا "ہمیشہ مسکراتے رہو" زورؔ صاحب کی یہ دعا آج بھی میرے آٹوگراف بک پر ہی نہیں' میرے لبوں اور میرے چہرے پر موجود ہے۔ میری زندگی میں بھی ـــــ

۱۳؍ اگست ۱۹۶۱ء سے پہلے اور بعد میں نہ جانے کتنی بار زورؔ صاحب سے مل چکا ہوں لیکن زورؔ صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ' بغیر اوقات مجھے یاد آتا ہے آج بھی یاد آرہا ہے ـــــ کشادہ پیشانی' بڑی بڑی آنکھیں جن سے فراست ٹپک رہی ہو اور بقول جوشؔ ملیح آبادی "جن میں آبائی امارت کا خمار پوشیدہ ہو" ستواں ناک' چوڑی تھوڑی لانبے بال' منہ میں پان' ابھرے ہوئے رخسار' سرخ و سپید رنگ اور مجموعی طور پر وہی مسکراتا چہرہ!

۲۴؍ ستمبر ۱۹۶۲ء کی رات میں' میں "رہنمائے دکن" میں مقامی صفحہ کی ترتیب کا کام کر رہا تھا۔ روزنامہ "سیاست" کے جناب محبوب حسین جگرؔ نے فون پر دریافت کیا "کیا زورؔ صاحب کے بارے میں کوئی اطلاع آئی ہے؟" میں نے نفی میں جواب دیتے ہوئے دریافت کیا "کیسی اطلاع! کیا کوئی خاص بات ہے؟" جگرؔ صاحب نے کہا "ہاں! بہت بری خبر ہے" ـــــ میں نے مزید کچھ پوچھنا مناسب خیال نہیں کیا۔ "بری خبر" ٹیلیفون رکھتے ہوئے میں سوچنے لگا۔ "خدا نہ کرے کوئی ایسی ویسی بات ہو۔ ابھی میں نے ٹیلیفون رکھا ہی تھا کہ پھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ "ہلو! کیا منظور صاحب ہیں؟" جناب ام۔ ام۔ ہاشم بات کر رہے تھے' میں نے کہا "جی نہیں' منظور صاحب نہیں ہیں کہئے' آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں؟"

ہاشم صاحب کہنے لگے! "مجھے کچھ دیر قبل وزیر اعظم کشمیر بخشی غلام محمد نے ذریعہ ٹرنک کال اطلاع دی ہے کہ زورؔ صاحب چل بسے ـــــ" "زورؔ صاحب چل بسے ـــــ" میں ہاشم صاحب کے الفاظ دہرایا ـــــ ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا اور میرے ذہن کے پردے پر زورؔ صاحب کا وہی چادر گھاٹ کالج کا چہرہ متحرک تھا وہی مسکراتا چہرہ! جیسے وہ میرے استعجاب پر مسکرا رہے ہوں! ـــــ

کیسے یقین کروں کہ زورؔ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اور پھر کیسے انتقال ہوا کب انتقال ہوا یہ سب اخبار میں دینا ضروری تھا۔ تفصیلات جاننے کے لئے معتمد کشمیر سے ٹرنک کال پر ربط پیدا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن لاحاصل۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ موسم خراب ہے ـــــ ایک بجے رات میں پی۔ ٹی۔ آئی نے اطلاع دی کہ قلب پر حملہ کے سبب موت واقع ہوئی ہے۔ کیا ایسے لوگوں کا پیمانۂ زندگی بھی اس قدر جلد لبریز ہو سکتا ہے زورؔ صاحب چل بسے' نہیں' ایک تحریک چل بسی' ایک ادارہ چل بسا' بلکہ ایک عہد چل بسا۔ کسی نے اردو زبان کو لوٹ لیا۔ حیدرآباد کی ادبی تاریخ کا ایک باب

ختم ہوگیا۔ دکن کا ایک متوالا، ایک عاشقِ زار چلا گیا ــــ آہ! یہ کیا ہوگیا ــــ یہ کیوں ہوگیا ــــ کیوں ہوگیا؟؟ آہ!

رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ مغل سلطنت نے ہندوستان کو تین چیزیں دی ہیں "تاج محل، اردو اور غالب"۔ میرا خیال ہے آصف جاہی سلطنت نے حیدرآباد کو دو چیزیں دی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ اور ڈاکٹر زورؔ ــــ زورؔ صاحب بڑی بانکی شخصیت کے حامل تھے۔ اُن کا اندازِ گفتگو، اُن کا چلنے کا انداز، پان کھانے کا قرینہ، ان کے لباس کی سج ــــ وہ دکنی تہذیب کا زندہ مرقع تھے، ان صوری حیثیتوں کے علاوہ زورؔ صاحب کو دکن سے بس ایک لگاؤ تھا، جذباتی لگاؤ ــــ میں سمجھتا ہوں دکنی زبان و ادب کے تعلق سے ان کی تحقیقات اور تنقیدات میں یہی جذباتی وابستگی کارفرما تھی ــــ بعض لوگ اس نظریے کا شکار ہیں کہ اردو نہ صرف شمالی ہند میں پیدا ہوئی بلکہ وہیں پھلی پھولی بھی زورؔ صاحب کو بجا طور پر اس سے اختلاف تھا۔ اُن کا نظریہ یہ تھا کہ اردو بلاشبہ شمالی ہند میں پیدا ہوئی ہے لیکن اس کی نشوونما دکن میں ہوئی۔ اُردو کو دکن والوں نے سجایا اور سنوارا اور یہیں اس کے ابتدائی ادبی شاہکار منظرِ عام پر آئے اپنے اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے دکنی ادب کے ان گوشوں کو روشن کیا جن کا خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا انہوں نے دکنی ادب کی قدامت اور عظمت کا لوہا نہ صرف ہندوستان کی دیگر علاقائی زبان والوں سے منوایا بلکہ یورپ کے مستشرقین کو اعتراف کرنے پر مجبور کیا۔ زورؔ صاحب نے دکن کے قدیم ادبی کارناموں کو اپنی تحقیقات کے ذریعہ نہ صرف حیاتِ جاودانی بخشی بلکہ اس حقیقت کو بھی بے نقاب کیا کہ دکن میں اردو کی تاریخ سینکڑوں برس کی ہے۔ دکنی ادب کے تعلق سے اگر زورؔ صاحب میں یہ جذبہ اور لگن نہ ہوتی تو کون کہہ سکتا ہے کہ دلی اور نگ آبادی سے ایک ڈیڑھ صدی قبل کا جو ادبی سرمایہ آج ہماری دسترس میں ہے، وہ آج موجود ہوتا۔ انھوں نے نہ صرف مری ہوئی دکنی زبان کو حیات دی اور گمشدہ دکنی ادب کو دریافت کیا بلکہ دکن کی مٹتی ہوئی تہذیب کو بھی جلا بخشی۔

قطب شاہی سلاطین کے نام تاریخ میں بلاشبہ محفوظ رہتے لیکن اُن کے ادبی کارناموں کو علٰحدہ کردیا جائے تو کتنے ہیں جو محمد قلی قطب شاہ اور اور سلطان عبداللہ قطب شاہ سے واقف ہوتے۔ دکن سے زورؔ صاحب کو کتنی محبت تھی اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اُن کی شاید ہی کوئی کتاب اور بہت کم مضامین ایسے ہوں گے جن میں انھوں نے دکن یا دکن کے کسی ادیب و شاعر کا تذکرہ نہ کیا ہو۔ انھوں نے اپنی تحقیق و جستجو سے کئی شاعروں اور ادیبوں کو منظرِ عام پر لایا دکن کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر کتنے ہی شاعروں اور ادیبوں کے مقابر اور مزاروں کا تعین کیا اور اُن پر کتبے نصب کئے۔

ایک طرف تو زورؔ صاحب کو دکن اور دکن کی زبان سے اتنا غیر معمولی عشق تھا لیکن جب یہ اطلاع ملی کہ انھیں سری نگر میں مسجد حضرت بلؒ کے صحن میں سپردِ خاک کیا گیا تو بے اختیار ظفرؔ کا یہ شعر زبان پر آگیا ــــ

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لئے ، دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

زورؔ صاحب کو ادب اور خصوصاً دکنی ادب پر زبردست ملکہ حاصل تھا بلکہ یہ کہیے کہ دکنی ادب میں اُن کی خدمات حرفِ آخر کی حیثیت رکھتی ہیں تحقیق و جستجو کی اُن کی لگن اپنی مثال آپ تھی وہ ہمیشہ سرگرمِ جستجو رہے۔ اپنے قیامِ یورپ کے دوران انھوں نے جہاں جہاں اردو کی مخطوطات ملیں ان کا گہرا مطالعہ کیا اور کام میں لایا۔ انھوں نے اردو کی خدمت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہے بلکہ اس لیے کہ اردو کی خدمت ان کے مزاج اور ان کی فطرت میں داخل تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک پل اردو کے لئے وقف کردیا تھا۔ وہ زندگی بھر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ انھوں نے آنکھ کھولی بھی تو ایسے ماحول میں جو "اردو ماحول" تھا اور آنکھ بند بھی کی تو ایسی ریاست میں جس کی سرکاری زبان اردو ہے۔ اُن کا سب سے عظیم الشان کارنامہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا قیام ہے جس کو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں قائم کیا تھا۔

انھوں نے ادارہ کے لئے سب کچھ وقف کر رکھا تھا وہ ادارہ کے کام سے کبھی غافل نہ رہے۔ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ہوں یا عقیل صاحب، زور صاحب کبھی حیدر آباد سے باہر گئے ہوں۔ انھوں نے ان افراد اور دوسروں سے ادارہ کے سب ذمہ داریاں برابر ...ـ ... صاحب اور ادارے کے مابین کچھ ایسا رشتہ قائم ہو چکا تھا کہ دونوں لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا

آج ادارہ ادبیات اردو حیران و پریشان ہے کہ اس کا والی کہاں ہے؟ قلعۂ گولکنڈہ کے کھنڈر سر بگریباں ہیں کہ اُن کے شاہوں کو بعد از موت "زندگی" دینے والا آج خود موت سے ہمکنار ہو چکا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کی مخطوطات، اس کا قیمتی کتب خانہ، ایوان اردو اور اردو میوزیم ــ زور صاحب اگر ایک لفظ بھی تحریر نہ کرتے تب بھی یہ کارنامے زور صاحب کے نام کو حیاتِ دوام عطا کرنے کے لئے کافی تھے زور صاحب کو جنوبی ہند میں وہی مرتبہ حاصل تھا، ہے اور رہے گا جو سرسید کو شمالی ہند میں حاصل تھا، ہے اور رہے گا۔

زور صاحب بڑے باعمل انسان تھے۔ بیشتر فنکار عموماً لا اُبالی اور بے پروا انسان ہوتے ہیں۔ ان کا عمل نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے وہ صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ لیکن زور صاحب میں ایسی بات نہیں تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ وضع قطع کے اعتبار سے بڑے ہی شاعر قسم کے انسان نظر آتے تھے۔ وہ کبھی شاعر بھی تھے اور اب کشمیر پہنچنے کے بعد انھوں نے پھر غزل گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ وہ معروف تو اپنے تخلص سے رہے ہوں گا ــ لیکن اُن کی زندگی انتہائی متوازن، باسلیقہ اور شائستہ تھی، انھوں نے علم اور عمل کے درمیان واقع خلیج کو پاٹ دیا تھا وہ جس کام کا ارادہ کرتے اس کو انجام دے کے رہتے ــ لندن میں انھوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کا سہ سالہ نصاب، دو سال میں مکمل کر لیا تھا اور ایک سال ... کی بجائے انھوں نے جرمنی میں کافی تحقیقاتی کام انجام دیئے۔ حیدر آباد میں جو اصحاب زور صاحب سے قریب رہے ہیں وہ اُن کے فعال اور باعمل ہونے کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو، ایوان اردو اور ماہنامہ "سب رس" زور صاحب کے باعمل ہونے کے دستاویزی ثبوت ہیں ــ چادر گھاٹ کالج میں بھی وہ ہماری کلاس لیتے ہوئے بھی خاصے مصروف ہوتے ادھر طلبہ کو کوئی شعر یا کوئی عبارت سمجھائی جا رہی ہے۔ ادھر کالج کے کلرک، دیگر عہدیدار اور بعض غرض مند آ رہے ہیں اُن کی طرف بھی توجہ دی جا رہی ہے۔ حمید الدین صاحب شاہد یا ... صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اُن سے ادارۂ ادبیات یا کسی اور موضوع پر بات چیت بھی ہو رہی ہے۔ اُن کی زندگی تھی ہی ایسی مصروف! پان اُن کے لئے ایندھن کا کام کرتے تھے۔ گھر ہو یا کالج پاندان اُن کے ہمراہ ہوتا۔ وہ یکے بعد دیگرے پان کھاتے جاتے اور کھلاتے ... ـ

زور صاحب سحر انگیز شخصیت کے مالک تھے۔ اُن کی شخصیت میں بلا کی مقناطیسیت پائی جاتی تھی۔ کسی شخص کو اپنا بنانے میں اُن کو کمال حاصل تھا۔ اُن کے دوست ہوں یا دشمن اپنے ہوں یا بیگانے کوئی ایسا نہیں تھا جو اُن کی شخصیت سے مسحور نہ ہوا ہو۔ بظاہر وہ ... دکھائی دیتے۔ چند ایک کو شکایت ہے کہ اُن کا برتاؤ غیر شائستہ و غیر شاعرانہ ہوتا تھا لیکن جن اصحاب کو زور صاحب سے زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا ہے وہ گواہی دیں گے کہ اُن میں غرور و تمکنت کا شائبہ بھی نہیں تھا وہ انتہائی بامروت، خوش خلق، نرم دل، مرنجاں مرنج اور ... کے آدمی تھے۔ انھیں دنیا کی عیش و عشرت کے سامان میسر تھے۔ وہ خاندانی آدمی تھے۔ یورپ سے بڑی بڑی ڈگریاں لے آئے تھے۔ ... معیاری اور بلند پایہ کتب کے مصنف، مولف اور مرتب تھے۔ عصرِ حاضر کے صفِ اول کے لوگوں سے اُن کے دوستانہ مراسم تھے لیکن اُن سے بات کرتے ہوئے کبھی بھی اس کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ ہم کسی "بڑے آدمی" سے ہم گفتگو ہیں۔ وہ یہاں معنوی 'بڑے پن' سے لوگوں کو مرعوب کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُن کا رویہ لوگوں کو اُن کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتا تھا۔ زور صاحب کی یہ ایک اہم خصوصیت تھی۔ اس کا نتیجہ کہنا چاہئے کہ انھوں نے بعض بڑی بڑی شخصیات کو جن میں سے کئی کا اردو سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اردو سے ہمدردی اور خدمت پر مائل کیا ...

دکنی مخطوطات کے قیام کے لئے سالار جنگ کو زور صاحب ہی نے آمادہ کیا تھا۔ سابق مرکزی وزیر نشریات و اطلاعات حکومت ہند ڈاکٹر بی. گوپال ریڈی کو اُردو کا جو ذوق ہے وہ زور صاحب ہی کا پیدا کردہ ہے۔ نہ جانے اور ایسے کتنے افراد ہوں گے۔ یہی نہیں زور صاحب نے دکن کے نوجوانوں میں خود اعتمادی اور ذوقِ عمل پیدا کرنے میں غیر معمولی حصہ ادا کیا ہے۔ آج حیدرآباد میں اُردو کے جتنے بھی اساتذہ، طالب علم اور خدمت گزار ہیں تقریباً ان سب نے زور صاحب سے کسی نہ کسی طرح سے فیض اُٹھایا ہے گذشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصہ میں حیدرآباد کی اردو کی تہذیبی تاریخ میں زور صاحب نے ہیرو کا کردار ادا کیا ہے۔ اردو اور اردو والوں پر زور صاحب کے احسانات کی فہرست طویل ہے۔ اتنی طویل کہ نہ تیار کی گئی ہے اور نہ شاید تیار کی جا سکے۔ اقبال کا شعر ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

زور صاحب پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ انہوں نے اپنے احباب اور شاگردوں کے بلا تخصیص کام آنے کی کوشش کی وہ طلبہ سے صرف نصاب کی حد تک ہی نہیں نجی معاملات میں بھی ربط رکھتے تھے۔ انہیں مشورہ دیتے اور خود سے طلبہ کا جو بھی کام ہوتا فراخدلی سے کرتے۔ گزشتہ سال (غالباً) الٰہ آباد میں انہیں کسی میٹنگ میں شرکت کرنی تھی۔ کشمیر سے وہ الٰہ آباد گئے تھے اور ایسے ہی حیدرآباد بھی آئے۔ اس مختصر قیام حیدرآباد کے دوران اُن سے ملنے والوں میں میں بھی تھا۔ دورانِ گفتگو انہوں نے بتایا کہ یہاں آئے انہیں چند روز ہی ہوئے ہیں اور ابھی تک تقریباً دو سو تعارفی اور سفارشی خطوط وہ لکھ چکے ہیں ایک ایسے مرتبے اور مصروفیات کا انسان لوگوں کے لئے کام آئے، بہت کم افراد میں یہ بات پائی جاتی ہے۔

زور صاحب اُردو کے تعلق سے کبھی بھی مایوس نہیں رہے جبکہ آج اُردو کے کئی ممتاز ادیب و شاعر اور اونچے درجات کے افراد اُردو کے مستقبل سے ناامید ہیں۔ زور صاحب غالباً اس لئے مایوس نہ تھے کہ زندگی کے بارے میں بھی اُن کا نقطۂ نظر رجائیت کا حامل تھا۔ ایک مرتبہ جبکہ میں بی اے میں تھا انہوں نے کہا کہ اس کے بعد ایم۔ اے کرلو۔ میں نے جواب میں اُردو کے حالِ زار کی سمت اشارہ کیا۔ کہنے لگے حیدرآباد میں نہ سہی، کہیں اور سہی ــ اُردو کا مستقبل شاندار ہے

زور صاحب محقق، مورخ اور نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں لیکن اُن کی تحریریں بے رنگ، روکھی پھیکی، ناہموار اور سپاٹ نہیں۔ ان کی تحریریں شگفتگی، سلاست، روانی، زبان و بیان کا زور، الفاظ کی نشست و برخاست کی خوبصورتی اور معنوی حُسن پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "روحِ تنقید" جو اُردو میں اپنے موضوع کی پہلی کتاب ہے، ۱۹۲۵ء میں شائع کی تھی جبکہ وہ بی اے کے طالب علم تھے۔ اپنی تصانیف کے سلسلے میں اُن کو ہندوستان ہی میں نہیں ہندوستان کے باہر بھی بہت زیادہ سراہا گیا ہے۔ کئی جامعات کے نصاب خاص طور پر ایم۔ اے کے نصاب میں اُن کی کئی کتابیں شامل ہیں۔ اُن کی کتب کی قدر و منزلت کبھی کم نہ ہوگی۔ قیام یورپ کے دوران اپنے یورپی اساتذہ سے انہوں نے اپنی قابلیت کا خراج وصول کیا۔ اُن کا شمار ہندوستان کے مقدم ماہرین لسانیات میں ہوتا ہے۔ اُردو کے تو وہ ابتدائی ماہرین لسانیات میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ عالمی صوتیاتی انجمن (انٹرنیشنل فونیٹک اسوسی ایشن) کے رکن تھے اور ہندوستان کی نمائندگی کرتے تھے۔

زور صاحب کی تخلیقات کی فہرست طویل ہے۔ انہوں نے کم و بیش (۵۰) کتابیں تو لکھی ہیں جن میں ہر طرح کی کتابیں شامل ہیں۔ مختلف جرائد میں شائع ہونے والے مضامین ان کے علاوہ ہیں۔ اُن کی کتابوں میں انگریزی میں "ہندوستانی صوتیات" اور فرانسیسی میں "قصصِ خوب ترنگ" شامل ہیں۔

ڈاکٹر زور ۸ رمضان ۱۳۲۳ھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں بی. اے اور ۱۹۲۷ء میں ایم۔ اے کیا۔ اگست ۱۹۲۷ء میں حکومت کے وظیفہ پر لندن گئے جہاں آریائی زبانوں کا تقابلی مطالعہ کے موضوع پر انہوں نے لندن یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی ۱۹۳۱ء میں وہ یورپ سے واپس لوٹے اور جامعہ عثمانیہ میں اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور بعد میں صدر شعبہ۔ ۱۹۶۰ء تک وہ حیدرآباد میں رہے یہاں چادرگھاٹ کالج کے پرنسپل

کی حیثیت سے سبکدوش ہونے پر حکومت جموں و کشمیر نے انھیں صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی مقرر کیا۔ کشمیر سے راس کماری تک کا علاقہ اُردو کا وطن ہے۔ زور صاحب نے اپنی حیات و موت سے اس کو ثابت بھی کر دیا۔ وہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور کشمیر میں پیوندِ خاک! لیکن زور صاحب' زور صاحب جیسی شخصیات مرتی کہاں ہیں۔ زور صاحب تو دراصل اُن کارناموں کا نام ہے جو آج بھی زندہ ہیں اور جب تک یہ کارنامے زندہ و باقی رہیں گے زور صاحب مر نہیں سکتے۔ وہ جاوداں رہیں گے! ___ (کتاب "چہرہ چہرہ داستان" مطبوعہ ۷۷ء سے)

غزلیں

جمیل مظہری

("افکار" کراچی سے)

ہر نوا ہر نے شنیدہ ہر تبسم دیدہ ہے
اس تماشازار کا ہر شعبدہ فہمیدہ ہے

تلخیاں بھی پی چکے شیرینیاں بھی چکھ چکے
ہر پیالہ اس خمارستان کا نوشیدہ ہے

حسرت اک زخمِ جگر کی تھی سو وہ بھی کھا چکے
کون سا گل ہے جو اس گلزار میں ناچیدہ ہے

ہر لحاظ اک دردِ دل ہر دردِ دل پُرپیچ و تاب
ہر تبسم اک گرہ ہے ہر گرہ پیچیدہ ہے

عقل ہے پروردۂ احساس اس سے کیا امید
خود جنوں بھی اضطرابِ شوق کا زائیدہ ہے

خاصیت ظاہر ہے لیکن ماہیت ظاہر نہیں
شعلہ گو دیدہ ہے لیکن شعلگی نادیدہ ہے

جامۂ ہستی میں کیوں ٹانکے لگاتے ہو جمیل
پھینک بھی دو قالب اب یہ پیرہن بوسیدہ ہے

علی جواد زیدی

وہ بھی کیا دن تھے کہ تھی نزہتِ گلزار پسند
رُت وہ بدلی کہ ہوئی وادیٔ پُرخار پسند

ایک تو راہ خرد یوں ہی بہت سہل نہ تھی
پھر طبیعت بھی وہ پائی کہ ہے دشوار پسند

ہم کو تپتے ہوئے صحرا کی ہوا خوب لگی
خام طلبوں کو ہوا سایۂ دیوار پسند

نہ رہِ خاص کے سمٹے ہوئے آلام عزیز
نہ رہِ عام کے بکھرے ہوئے آزار پسند

آؤ ان کو بھی ذرا دیکھ تو لیں' بات سنیں
کچھ دوانوں نے کیے ہیں رسن و دار پسند

گل و گلزار کی باتیں بھی سنی ہیں لیکن
سچ کہو کس کو نہیں رنگ رہِ دار پسند

یہ نہ سمجھو کہ تمھیں اہلِ نظر ہو زیدی
اگلے وقتوں میں بھی کچھ لوگ تھے معیار پسند

نقد و نظر

(تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

ہملیٹ : شیکسپیر کے شہرۂ آفاق ڈرامے کا اردو ترجمہ ، مترجم : فراق گورکھپوری
صفحات ۱۹۶ ، ناشر و پبلشر ۔ ساہتیہ اکیڈمی نئی دہلی ، قیمت دس روپے

ہملیٹ شیکسپیر کے بہترین ڈراموں میں سے ایک ہے ۔ بعض ناقدین تو اس کو پہلے نمبر پر شمار کرتے ہیں کیونکہ اس ڈرامے میں شیکسپیر نے کردار نگاری اور جذبات نگاری کے اعلیٰ ترین نمونے پیش کئے ہیں ۔ اس ڈرامے کے اردو زبان میں کئی ترجمے موجود ہیں اس لئے ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے جدید ترجمہ کروانے کی ضرورت کیوں محسوس کی ۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ زیرِ تبصرہ ترجمہ اصل ڈرامے کے ساتھ انصاف نہ کر سکا ۔ اس ترجمہ کے پڑھنے کے بعد ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس ڈرامے کے اکثر جاندار مکالمے بے جان ہو کر رہ گئے ہیں ۔ اس ترجمہ میں شہزادہ ہملیٹ کے جذبات سے بھرپور اور زہر آلود طنز کے حامل الفاظ ایک مجنوں کی بے معنی بکواس میں تبدیل ہو گئے ہیں ۔ اسی طرح ہملیٹ کے عظیم المرتبت کردار کو معتوزانہ شکل دینے والی اپنے آپ سے مخاطب تقریریں پھس پھسی نثر کی شکل اختیار کر لی ہے ۔
جہاں تک کتابت اور طباعت کا سوال ہے ، یہ ترجمہ ساہتیہ اکیڈمی کی دوسری مطبوعات کی طرح بہترین کہلائے جانے کے قابل ہے ۔ کاش ترجمہ بھی اسی معیار کا ہوتا ۔

(غلام جیلانی)

تین پنجابی ڈرامے ترجمہ ، محمود جالندھری ، صفحات ۲۰۸ ،
ناشر ، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۔ تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ، نئی دہلی ۲۵ ، قیمت ۱۲ روپے

تین پنجابی ڈراموں کے ترجمے اردو والوں کو ہندوستان کے مردم خیز علاقے کے طرزِ فکر سے آشنا کراتے ہیں ۔ ان تینوں ڈراموں کا پس منظر ایسی تاریخی اور روایتی کہانیوں پر مبنی ہے جن سے سارا ہندوستان واقف ہے ۔ یہ کہانیاں ہر ہندوستانی زبان میں موجود ہیں ـــــ گو اسلوبِ بیان جدا جدا ہے ۔ ممکن ہے کہ فنِ ڈرامہ نویسی کے نکات اور ضروریات کا ان ڈراموں میں پوری طرح لحاظ نہیں رکھا گیا ہو ، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ڈرامے اس میدان کی ابتدائی کاوشیں سمجھی جا سکتی ہیں ۔ اس کے باوجود اس نوع کی کتابوں کی اشاعت کے ذریعہ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے قومی یکجہتی اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی اور اردو کو چند روایاتی محدود کوششوں سے نکالنے کی کامیاب سعی کی ہے

ہماری نظر میں یہ اقدام قابلِ مبارک باد ہے ۔ کتابت اور طباعت کی دیدہ زیبی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا کی مونا پلی (monopoly) بنتی جارہی ہے ۔

(غلام جیلانی)

ارضیات کے بنیادی تصورات : مصنف ، وی ۔ اوبروچیف ، مترجم ، ڈاکٹر ماجد حسین

سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۵۸۰ ۔ قیمت ۲۲ روپے ، ناشر ، ترقی اردو بورڈ ۔ آر کے پورم ، نئی دہلی

یہ کتاب طبعی ارضیات سے متعلق ہے ۔ جو ارضیات کی مختلف شاخوں کے بنیادی اصولوں اور تصورات پر مشتمل ہے ۔ ارضیات میں زمین کی اندرونی کیفیت اور سطح زمین پر ہونے والی تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے ۔ زمین کب اور کیسے بنی ، اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں ؟ بحر اعظم اور بر اعظم کیسے وجود میں آئے ؟ پہاڑوں کی تشکیل اور تخریب کیسے ہوتی ہے ؟ زمین کی اندرونی اور بیرونی قوتیں زمین کے داخلی اور خارجی حصوں پر کیا اور کیسے تبدیلیاں لاتی ہیں ؟ بہتا ہوا پانی اور آب دوز زمین گلیشر اور ہوا نیز سمندری لہریں کیسے زمین پر تراشی خراش (کٹاؤ) اور مٹی کے جماؤ کا کام کرتی ہیں ، زلزلوں کے اسباب کیا ہیں ؟ اور آتش فشاں کیسے پھٹتے ہیں ۔ ؟ حجریات (چٹانیں) اور معدنیات (دفینے) کے وجود پذیر ہونے کی حقیقت معلوم ہوتی ہے ۔ اس کے اصول اور تاریخ نیز تدریجی ارتقاء کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے ۔ کرۂ ارض پر زندگی کے آغاز اور ارتقاء کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ یہ کتاب ان موضوعات کا احاطہ کرتی ہے ۔

زیر نظر کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے ۔ ہر باب کے شروع میں موضوع سے متعلق تشریحات کا اندراج ہے ۔ اردو اصطلاحات کے ساتھ ساتھ انگریزی اصطلاحات دی گئی ہیں ۔ حسب موقع خاکے نقشے اور دلآویز تصاویر بھی دی گئی ہیں جو ارضیات جیسے بظاہر خشک اور خشک موضوع کو دلچسپ بناتی ہیں ۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زبان عام فہم ہے ۔ جس کی وجہ سے کتاب کی افادیت میں چار چاند لگ گئے ہیں ۔ ہر ایک باب افسانوی انداز میں تحریر کیا گیا ہے ۔ جس کی وجہ سے کتاب ایکبار اٹھا کر پڑھے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ۔

جہاں تک اصطلاحات اور ترجمہ کا تعلق ہے یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اردو اصطلاح سازی میں ، اصطلاح سازی کے بنیادی اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اور کامیاب اصطلاحیں وضع کی گئی ہیں ۔ ترجمہ کی زبان بھی عام فہم اور معیاری ہے ۔ عام طور پر تراجم میں جو الجھاؤ ، ابہام اور پیچیدگی نظر آتی ہے ، یہ کتاب اس قسم کے اسقام سے پاک ہے ۔ اور مصنف کے بنیادی خیال کو اس کے اجزا کی صحت و سالمیت کے ساتھ ، عام فہم اردو زبان میں ادا کیا گیا ہے ۔ چونکہ مترجم کا مطالعہ اس موضوع اور اس سے ملتے جلتے موضوعات پر بہت گہرا ہے اس لئے انہوں نے کتاب کا ترجمہ کرتے وقت موضوع سے پورا پورا انصاف کیا ہے ۔ جس کے لئے مترجم ترقی اردو بورڈ دونوں مبارک باد کے مستحق ہیں ۔

(عنوان چشتی)

گستاخی معاف (طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ) مصنف ، ایم اے خان

قیمت ۶ روپے ۔ ناشر ، زندہ دلان حیدرآباد ۔ ۲۰ ، بمر دکاوہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۔

اردو میں طنز و مزاح کا آغاز ہجو اور ہزل سے ہوا ۔ مگر رفتہ رفتہ اس میں نمایاں تبدیلی آئی ۔ پھکڑپن ، پھبتی ، استہزا ، تمسخر ، رکاکت ، فقرہ بازی اور دشنام طرازی کا نام مزاح نہیں ہے ۔ بقول حالی " مزاح کا کام پژمردہ دلوں کو خوش کرنا ہے نہ کسی کا دل دکھانا " ۔ مزاح کا صحیح اور صحت مند مفہوم ہمیں سب سے پہلے غالب کے ہاں ملتا ہے ۔ غالب مزاح میں بھی دقار

سنجیدگی کے قائل تھے۔ طنز و مزاح ادب کی مشکل ترین صنف ہے۔ اکثر ادیبوں کے قدم اس راہ میں ڈگمگا جاتے ہیں۔ لیکن جن ادیبوں نے اس صنف میں سرخروئی حاصل کی ہے ان میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، یوسف ناظم، مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین قابلِ ذکر ہیں۔

۲۴ سالہ نوجوان، ایم۔اے۔ حنان نے بڑے عزم و اعتماد کے ساتھ اس دشوار گذار گھاٹی میں قدم رکھا ہے۔ گستاخی معاف ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جس میں مختلف موضوعات پر ان کے ۱۴ مضامین شامل ہیں۔ رونمائی (مصنف کا پیش لفظ) سے آشکار ہے کہ نوعمر مزاح نگار نے انگریزی ادب کی شاہکار تخلیقات کے علاوہ رشید احمد صدیقی، ابراہیم جلیس، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن اور مشتاق احمد یوسفی کو چاہت سے پڑھا ہے۔ آخر الذکر دونوں مزاح نگاروں نے انھیں متاثر بھی کیا ہے۔ اس سے اس ڈگر کا پتہ چلتا ہے جس پر چل کر حنان اپنی منزل کو پانا چاہتے ہیں۔ منزل دور سہی لیکن انہوں نے راہِ راست کا انتخاب کیا ہے۔ اس لئے زیرِ نظر مجموعہ ہمیں مایوس نہیں کرتا۔ مصنف کا طنز تیکھا اور مزاح لطیف ہے۔ اگر موصوف زیبِ داستاں کی حاشیہ آرائی سے اپنے قلم کو بچا کر زندگی کے حقائق رقم کرتے رہیں تو بہت جلد طنز و مزاح کی وادی میں اپنی مستقل جگہ بنالیں گے۔ "جوتی مبوک" نہ بن سکے ادیب، نیا نوکر، اور حضرتِ کاتب" اس مجموعہ کے دلپذیر مضامین ہیں۔

شہر حیدرآباد کا طنز و مزاح سے گہرا علاقہ رہا ہے۔ فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، ابراہیم جلیس، یوسف ناظم، زینت ساجدہ، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، رشید قریشی، برق آشیانوی، خواجہ عبدالغفور، مجتبیٰ حسین، پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم، جیسے طنز و مزاح نگار اسی شہر سے ابھرے ہیں۔ اس باب میں ایم۔اے۔ حنان ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔

(وہاب عندلیب)

مبصر

(ایچ، ای، ایچ دی نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری کا سہ ماہی ترجمان) صفحات شمارہ اول (۱۱۴) دوم (۱۰۰) قیمت فی شمارہ -/۳ روپیہ (ڈیمائی سائز) پتہ:۔ نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری حمایت نگر روڈ حیدرآباد ۲۹۔

مجلسِ مشاورت: پروفیسر سید علی اکبر، محامد علی عباسی، ایم ایم بیگ۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر عبدالستار دلوی

مجلسِ مرتبین: محمد اکبر الدین صدیقی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست، محمد منظور احمد، غیاث صدیقی۔

خانوادۂ آصفجاہ کی اُردو خدمات تاریخ ادبِ اُردو کا روشن باب بن چکی ہیں۔ جناب آصفجاہ ثامن نے اُردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کی غرض سے ایک بڑا ٹرسٹ چھ لاکھ کے سرمایہ سے قائم کیا ہے۔ زیرِ تبصرہ تماہی اسی ٹرسٹ کے زیرِ اہتمام کتب خانہ اور ادبی محفل "حلقۂ اربابِ ذوق" کا ترجمان ہے۔ ماہانہ ادبی محفلوں میں نئی اور اہم مطبوعات پر قابل اصحاب سے مفصل تبصرے سنوائے جاتے ہیں جنھیں یکجا کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ جناب عبدالمحمود معتمد اردو ٹرسٹ ڈائرکٹر لائبریری کی مخلصانہ سعی و کاوش کے باعث "مبصر" کا اجرا عمل میں آیا اور حلقہ "اربابِ ذوق" کی ماہانہ محفلیں منعقد ہوا کیں۔ زیرِ نظر مبصر کے دو شماروں میں علی الترتیب ۸ اور ۵ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ تبصرہ کرنے والوں میں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر مغنی تبسم ڈاکٹر یوسف سرمست، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، ڈاکٹر رحیم الدین کمال، ڈاکٹر محمد یوسف الدین ایسے ملک گیر عثمانین کے دوش بدوش ڈاکٹر احتشام احمد ندوی، حکیم عبدالحمید دہلوی، جواد رضوی، سرمنیا سن لاہوتی اور نور الحسن قابلِ ذکر ہیں۔

ادارہ کو "مبصر" کی کتابت کے حسن کی طرف اولین توجہ دی جانی چاہیئے تاکہ تبصرہ کا حسنِ توازن متاثر نہ ہو۔ (و، خ)

ادبی سرگرمیاں:

اردو نامہ:- علمی، ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

۴؍ اگست: ممتاز ماہر تعلیم جناب سید نور الحسن کا پیرانہ سالی میں انتقال ہوگیا۔ پرنسپل حسن متعدد علمی اور تعلیمی نیز ادب اطفال کی کتابوں کے مصنف اور انیس سوسائٹی کے بانی صدر تھے۔ "انیسیات" پر مرحوم کی نظر تھی۔ خدا مغفرت فرمائے۔

۵؍ اگست: اردو اکیڈمی کے تازہ پریس نوٹ کے بموجب ریاست کے کتب خانوں کی امداد کے سلسلے میں ۳۰؍ ستمبر تک درخواستوں کی ترسیل کی خواہش کی گئی ہے۔

● معروف شاعر و سخنور جناب سعادت نظیر (استاد اردو پبلک اسکول) کی کتاب "آب و رنگ" (شعری مجموعہ) شائع ہوا۔ اس سے پہلے موصوف کی ۹ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں ایک مفید کتاب اردو غزل پر تنقید سے متعلق ہے جسے ریاستی اکیڈمی کا ایوارڈ بھی ملا۔

۶؍ اگست: محکمۂ ڈاک و تار آندھرا سرکل کی اردو اسوسی ایشن کے زیر اہتمام مرحوم افسانہ نگار ابراہیم شفیق کی یاد میں ادبی اور کلچرل پروگرام منعقد ہوا۔ شفیق مرحوم کا ڈرامہ "توڑ دو زنجیریں" اسٹیج کیا گیا۔ شفیق محکمۂ ڈاک و تار میں برسرِ روزگار تھے۔

۷؍ اگست: جواں فکر و جواں عمر سخنور جناب رؤف خیر کے پہلے شعری مجموعہ "اقرا" کی تقریب رسم اجرا ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ پروفیسر سید عالم خوندمیری، مصلح الدین سعدی اور جمیل شیدا نے خیر کی شعری ذہانت پر خیالات کا اظہار کیا۔ مسٹر بھارت چند کھنہ سکریٹری ریاستی اردو اکیڈمی نے کتاب کی رسم اجرا انجام دی۔ رؤف خیر نے کلام سنایا۔ اس جلسہ کے کنوینر رحمت یوسف زئی نے تعارفی و خیر مقدمی تقریر کی۔

● انیس اکیڈمی کی طرف سے پرنسپل نور الحسن کی وفات پر جلسۂ تعزیت منعقد ہوا، اور قرار داد تعزیت منظور کی گئی۔

● حکیم تیموری مرحوم کی یاد میں مولانا سید معز الدین ملتانی کی صدارت میں ادبی اجلاس و مشاعرہ ہوا۔ ڈاکٹر محمد علی احمد واثق، مولانا خالد کیفی، عاکف بیابانی اور ظہیر وارثی صاحبان نے نثر و نظم میں تیموری مرحوم کو خراجِ عقیدت ادا کیا۔ آخر میں غیر طرحی مشاعرہ بھی ہوا۔

● اقبال اکیڈمی کی طرف سے منعقدہ محفلِ اقبال کو ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور محمد ظہیر الدین احمد صاحب نے مخاطب کیا۔ جناب یس ملتانی نے صدارت کی۔ غیاث الدین گھانگرے نے شکریہ ادا کیا۔

۸؍ اگست: جناب غلام یزدانی (ایڈوکیٹ) رکن مجلس انتظامی انجمن ترقی اردو نے ایک بیان کے ذریعہ حیدرآباد سے ٹیلی ویژن پروگراموں میں اردو کو بھی شامل کئے جانے کے سلسلے میں مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات مسٹر کشن لال اڈوانی کو توجہ دلائی ہے۔

۹؍ اگست: پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر "ادارۂ ادبیاتِ اردو" نے ایک تعزیتی بیان جاری کرتے ہوئے مرحوم نور الحسن صاحب کی تعلیمی و ادبی خدمات کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا ہے۔

● اردو کے نئے لکھنے والوں نے ایک اجتماع میں اردو سوسائٹی کے قیام کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ سوسائٹی گولکنڈہ میں قائم کی گئی ہے جس کے صدر موہن لال شرما اور معتمد عثمان علی ضیاء منتخب ہوئے۔

● نواب میر احمد علی خاں رکن عاملہ جنتا پارٹی نے ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے ریاستی حکومت اور ریاستی اردو اکیڈمی کے صدر جناب آصف پاشا سے اس امر کا مطالبہ کیا کہ ریاست میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دلانے میں اپنے مثبت اثرات کو بروئے

کارلائیں۔

۱۲؍اگست : ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کو پروفیسر ہارون خان شیروانی نے اہم کتابیں عطیہ دیں۔ جناب میر سرمیلا کر علیخاں سابق گورنر اڑیسہ کی صدارت میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ ریاستی وزیر سیاحت ڈاکٹر سی' ایچ' دیوانند راؤ نے پروفیسر شروانی کی خدمات کو خراج تحسین ادا کرتے ہوئے ان کے اس اقدام پر مبارک باد دی اور کتابیں انسٹیٹیوٹ کے حوالہ کیں۔

● اُردو محاذ کا ادبی اجلاس و مشاعرہ مولانا ابویوسف (ایم' ایل' سی) کی صدارت میں منعقد ہوا آزادی کی تحریک میں اُردو شعر و ادب کے بارے میں صدر جلسہ نے روشنی ڈالی۔ مشاعرہ میں سیف حموی' صابر کوسگوی' صادق نقوی' علی سرور' عظیم حیدرآبادی' رؤف ارسلان اور امام الدین فدا کے علاوہ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

● ممتاز کالج کے زیر اہتمام جناب سید ہاشم علی اختر (آئی' اے' ایس) معتمد اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی صدارت میں مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کے شعراء نے کلام سنا کر محفل کو زعفران زار بنایا۔

۱۳؍اگست : اقبال اکیڈیمی کی طرف سے بصدارت جناب شاذ تمکنت شعری محفل منعقد ہوئی۔ پاکستانی سخنور مجیب خیرآبادی کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید' شاذ' اختر حسن ڈاکٹر یوسف ... میاں' محمد منظور احمد' مصلح الدین سعدی' سعید بن محمد نقش' مظفر ممتاز' علی سرور ...

معظم عبیدی وغیرہم نے کلام سنایا۔ طاہر رومانی نے نظامت کے فرائض انجام دئیے۔

● ادارۂ قدر ادب کی جانب سے غیر طرحی محفل شعر جناب عبدالکریم ... کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔ میر ازماں منیر نے مشاعرہ کی کارروائی انجام دی اور شکریہ ادا کیا۔

۱۴؍اگست : اُردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس جناب عابد علی خاں معتمد ادبی ٹرسٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام عمر خاں ریڈر شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صدر شعبۂ اُردو جامعہ ملیہ دہلی نے علی الترتیب "اقبال کا تصورِ تعلیم" اور "اقبال کے کلام کا صوتی آہنگ" کے زیر عنوان مقالے سنائے۔ جناب سری نواس لاہوٹی نے ڈاکٹر نارنگ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اُن کی ادبی خدمات کی ستائش کی۔ پروفیسر نارنگ نے حیدرآباد کے علمی و ادبی ماحول کو زبردست خراج تحسین ادا کیا۔ ڈاکٹر زورؔ' ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور انجمن ترقی اُردو کی خدمات کو مثالی قرار دیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے آندھرا پردیش میں اُردو کے موقف پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پاکستان کے مہمان شاعر جناب مجیب خیرآبادی نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیّر معتمد اُردو مجلس نے شکریہ ادا کیا۔

● بزم شب رنگ کا ادبی اجلاس و مشاعرہ بصدارت جناب ... واسع جوائنٹ سکریٹری منعقد ہوا جس کا ... خصوصی ...

رشید احمد اور پروین مشطاری نے انشائیہ اور افسانہ سنایا۔ عزیز صدیقی نے طنز و مزاح کے شاعر اسمٰعیل ظریف سے انٹرویو لیا۔ محفل شعر میں تاباں عابدی' ضیاء موسوی' عظیم حیدرآبادی عزیز ظریف اور کئی شعراء نے کلام سنایا۔

● مدینہ منشن میں جناب خلیل اللہ حسینی کی صدارت میں محفل اقبال کا انعقاد عمل میں آیا ڈاکٹر مغنی تبسم' ڈاکٹر صفدر علی بیگ اور محمد منظور احمد صاحبان نے مباحثہ میں حصہ لیا۔

● ادارۂ شاہکار کی جانب سے مشاعرہ جشن آزادی اوج یعقوبی صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر اور تہذیبی سفیر جناب تجمل حسین نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی شرکت کی اور مخاطب بھی کیا خواجہ ذاکر گوڈر شاہی' ڈاکٹر غیاث صدیقی' علی سرور' حفیظ فضا' چرن سنگھ حیرانؔ فکری بدایونی' شجاع فاروقی' اسحق ملک اور سعادت جہاں رضوی سحر نے کلام سنایا۔ انور ہاشمی مدیر ہفتہ وار "شاہکار" نے شکریہ ادا کیا۔

۱۵؍اگست : یوم آزادی کے موقع پر "ایوانِ اُردو" پر جناب میر سراج الدین علی خاں آفس سکریٹری نے قومی پرچم لہرایا۔

● حکومت آندھرا پردیش نے تلگو کے نامور شاعر مسٹر داسرتھی کو آندھرا پردیش کے ملک الشعراء کے اعزاز سے نوازا۔ مسٹر داسرتھی نے غالب صدی تقاریب کے موقع پر تلگو میں غالب کی غزلیہ شاعری کا انتخاب چھپوایا تھا

● اُردو فورم کے زیراہتمام مشاعرۂ جشن جمہوریت بصدارت جناب بھارت چند کھنہ سکریٹری اُردو اکیڈمی منعقد ہوا۔ امیر احمد خسرو اور مجیب خیرآبادی صاحبان مہمانانِ خصوصی تھے۔ جناب کے یم عارف الدین (ایڈوکیٹ) نے مخاطب کیا۔ کھنہ صاحب نے آزادی کی مبارک باد دیتے ہوئے اُردو کے تعلیمی اور علمی مسائل پر روشنی ڈالی۔ محفلِ شعر میں کنول پرشاد کنول، خسرو، مجیب، احسن رضوی، خیرات ندیم، غیاث صدیقی، صلاح الدین نیر، وقار خلیل، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، جوہر رامشی، علاء الدین نوید، غیاث متین، فکری بدایونی، جبر تی، امان ارشد، صادق نقوی، اسحٰق ملک کے علاوہ آمنہ ضیاء اور سعادت جہاں سحر نے کلام سنایا۔ جناب شریف اسلم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔

● سوگیان مندر ہندی ورگ کے زیر اہتمام اُردو، ہندی کا ملا جلا مشاعرہ راجہ لال راجہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ منوہر لال بہار مہمان خصوصی تھے۔ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔ کالی داس کاشیکر نے خیر مقدم کیا۔

● پیلپنر ویلفیر آرگنائزیشن کے زیر اہتمام بمقام فانی میدان محفلِ شعر آراستہ کی گئی۔ جناب اختر حسن مددگار معتمد اُردو اکیڈیمی نے صدارت کی۔ مسز ڈی انجیا ریاستی وزیر بیر اور جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر نے مخاطب کیا۔ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

● فیل خانہ رلیف کیمپ کی طرف سے جشنِ جمہوریہ کا مشاعرہ خواجہ فدا گرگوڑر شاہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ سابق ریاستی وزیر مسز روڈا مستری اور جناب ادیب یعقوبی مہمانانِ خصوصی تھے۔ ۲۲ شاعروں نے کلام سنایا جن میں عزیز بھارتی، علی سرور، حبیب گوندیادی، ساقی ایوبی، سرور ہاشمی قابلِ ذکر ہیں۔ معین نجیب معتمد مشاعرہ تھے۔

۱۶ر اگست؛ حلقۂ اربابِ ذوق (نظامس اُردو ٹرسٹ لائبریری) کا ماہانہ ادبی اجلاس ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن نے ڈاکٹر یوسف سرمست کی کتاب "بیسویں صدی میں اُردو ناول" پر مبسوط اور سیر حاصل تبصرہ سنایا۔ جناب عبدالحمود ڈائرکٹر لائبریری نے شکریہ ادا کیا۔

۱۹ر اگست؛ معروف ادیب اور دانشور جناب ضیاء الدین احمد شکیب کو پونا یونیورسٹی نے تاریخ میں ڈاکٹر آف فلاسفی (Ph.D) کی ڈگری کا مستحق قرار دیا۔ جناب شکیب نے "گولکنڈہ اور ایران کے مابین تعلقات (۱۵۱۸ء۔ ۱۶۸۷ء)" پر مقالہ پیش کیا تھا۔ موصوف دفتر ریاستی اسناد حیدرآباد سے وابستہ ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں "غالب اور حیدرآباد" کے علاوہ "ذکا اور غالب" قابلِ ذکر ہیں۔

۲۰ر اگست؛ حیدرآباد کے بزرگ اور معمر شاعر جناب احمد علی شباب (۲ر نومبر ۱۹۰۲ء) علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ شباب مرحوم فصاحت جنگ جلیل کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ مذہبیات اور علم عروض پر مہارت حاصل تھی۔ شعری اور نثری مجموعے مطبوعہ ہیں۔ خدا مغفرت فرمائے۔

۲۱ر اگست؛ عثمانیہ یونیورسٹی کے پریس نوٹ کے مطابق مرزا اکبر علی بیگ لکچرار اُردو سٹی کالج کو اُن کے مقالہ "مرزا علی لطف: حیات اور کارنامے" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی گئی۔ موصوف نے ڈاکٹر مغنی تبسم کی نگرانی میں یہ کام انجام دیا۔

● محترمہ محمدی بیگم مطلب کو ان کے مقالہ "احسن اللہ خاں بیان: حیات اور کلام" پر جامعہ عثمانیہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کی۔

۲۲ر اگست؛ نظام اُردو ٹرسٹ کی اعانت سے مشہور ادیب اور مصنف ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید کی نئی کتاب "چہرہ چہرہ داستان" نیشنل بکڈپو سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مولانا عبدالماجد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر زور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مبارز الدین رفعت، جامعہ عثمانیہ اور آخری آصفی حکمران میر عثمان علی خاں پر خاکے شامل ہیں۔

۲۵ر اگست؛ اُردو اکیڈیمی میں ایک محفلِ شعر کا انعقاد عمل میں آیا۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے ریفریشر کورس کے زیر تربیت اُردو داں عہدہ داروں کا اس موقع پر خیر مقدم کیا گیا۔ جن میں مسز کالیہ بیگم (ہریانہ) اور کمار رنجیت سنگھ (ہماچل پردیش) شعر و ادب سے ذوق رکھتے ہیں۔ جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی اُردو

اکیڈیمی نے اکیڈیمی کا تعارف کراتے ہوئے عہدہ داروں کی اُردو دانی اور اُردو دوستی کی ستائش کی اور خیر مقدم کیا۔ محفلِ شعر کو مہمان شاعر ... مخدوم، مجیب خیرآبادی کے علاوہ سعید شہیدی، ڈاکٹر مغنی تبسم، امیر احمد خسرو، کنول پرشاد کنول، شاذ تمکنت، خیرات ندیم، راشد آذر، وقار خلیل، مصحف اقبال توصیفی، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن خیالؔ، محمد منظور احمد منظور، صادق نقوی، محمود خاور نے کلام سُنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

۲۷ر اگست: نیشنل انسٹیٹوٹ آف کمیونٹی ڈولپمنٹ کے آئی۔ اے۔ ایس زیر تربیت عہدہ داروں کی جانب سے یادگار ادبی اجلاس اور مشاعرہ ڈاکٹر مدیا ڈین انسٹیٹوٹ، کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" مہمانِ خصوصی تھے۔ جناب بھارت چند کھنّہ اور جناب خواجہ عبد الغفور (بمبئی) نے مزاحیہ مضامین سُنائے۔ مسٹر ڈویں کے کالیہ ہمدم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ محفلِ شعر میں مسرز امیر احمد خسرو، مغنی تبسم، کنول پرشاد کنول، سعید شہیدی، مجیب خیرآبادی، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، فیض الحسن خیالؔ، وقار خلیل، ہمدم، محمد منظور احمد منظور صاحبان نے کلام سُنایا۔

۲۸ر اگست: نامور انقلابی سخنور اور محبوب قائد مخدوم محی الدین کی آٹھویں برسی کے موقع پر آندھرا پردیش سوشیل ایجوکیشن اینڈ لٹریری اسوسی ایشن (اپسیلا) کے زیر اہتمام جلسۂ "یادِ مخدوم" جناب عابد علی خاں ایڈیٹر "سیاست" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، احسن علی مرزا، پرتاپ کشور نے مخدوم کی شخصیت اور ان کی شعری و تہذیبی خدمات پر روشنی ڈالی اور زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا۔ مجیب خیرآبادی، بانو طاہرہ سعید اور علی سرور نے منظوم خراجِ عقیدت ادا کیا۔ جلسہ کا آغاز مخدوم کی نظم کے ٹیپ ریکارڈ سے ہوا۔ کمسن گلوکارہ حسنیٰ نے مخدوم کی غزل سُنائی۔ جناب خواجہ معین الدین صدر اپسیلا نے شکریہ ادا کیا۔

۳۰ر اگست: حلقۂ اربابِ ذوق (نظامس ٹرسٹ اُردو لائبریری) میں معروف صحافی اور افسانہ نگار جناب عابد سہیل سابق مدیر "کتاب" لکھنؤ کا خیر مقدم کیا گیا۔ جناب اختر حسن معتمد معتمد اُردو اکیڈیمی نے صدارت کی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم اور ڈاکٹر یوسف سرمست نے جناب سہیل کے افسانوی مجموعہ "سب سے چھوٹا غم" پر تبصرہ کیا۔ عابد سہیل صاحب نے نئی کہانی سُنائی اور حیدرآباد کے ادبی ماحول اور یہاں کی کلچرل روایات کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ جناب عبد المحمود ڈائرکٹر لائبریری نے شکریہ ادا کیا۔

● معروف سخنور جناب شاذ تمکنت کا تیسرا شعری مجموعہ "نیم خواب" ریاستی اُردو اکیڈیمی کی اعانت سے طباعتی مراحل سے گذر رہا ہے۔ مرکزی انجمن ترقی اُردو ہند دہلی بھی شاذ صاحب کا ایک انتخاب "دستِ فرہاد" شائع کر رہی ہے۔

۳۱ر اگست: حیدرآباد کے دو شعراء شمس الدین تاباں (دفتر سیول سپلائز کا ونسل) اور خیرات ندیم (مددگار دار العلوم ہائی اسکول) وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ اِن شعراء کے اولین شعری مجموعے ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے بہت جلد شائع ہونے والے ہیں۔ ———

مقدّس دریاؤں کی سرزمین

آندھراپردیش مقدّس دریاؤں کی سرزمین ہے۔ جن کے گُن ہمارے قدیم تمدنی رزمیہ گیتوں اور پُرانوں میں گائے گئے ہیں۔ ۱۹۵۶ء سے ہی ہماری ریاست نے آبپاشی کے فروغ اور ترقی کی جانب غیر منقسم توجہ دی ہے۔

منصوبوں کے دوران میں آبپاشی کے لئے پیدا کردہ جملہ گنجائش ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

پہلا منصوبہ۔	:	۲۲۰۹۸۰ ایکڑ
دوسرا منصوبہ۔	:	۴۴۲۹۹۸ ایکڑ
تیسرا منصوبہ۔	:	۲۷۹۵۲۴ ایکڑ
پانچویں منصوبے کے ناٹارگٹ آبپاشی کی اضافہ گنجائش کیلئے	:	۴۶۵۰۰۰ ایکڑ

ناگرجوناساگر ہندوستان کے سب سے بڑے کثیر مقصدی پراجکٹوں میں سے ایک ہے۔ پوچم پاڑ پراجکٹ پر کام پوری قوت کے ساتھ جاری ہے۔ ۱۸۲ کروڑ روپے لاگت والا دھامودھرم پراجکٹ کی تکمیل پر ضلع سریکاکلم میں ۱۴۸۲۰۸ ایکڑ زمین سیراب کرسکے گا۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھراپردیش حیدرآباد

DIPR: NO: 11/77,78,806
ADVT/CS/77

زندہ طلسمات ہر گھر میں ضروری ہے
ZINDA TILISMATH
MUST BE IN EVERY HOUSE
صاف، صحت مند دانتوں کے لیے
کھانسی
نزلہ زکام
ملیریا
انفلوئنزا
پیچش
دانت کا درد
سر درد
پیٹ کی تکلیف کے
FAROOKY
منجانب کارخانہ زندہ طلسمات حیدرآباد دکن

اپنی بات

دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد قارئین سب رس کی خدمت کرنے کا موقع مل رہا ہے مگر مسرت اس بات کی ہے کہ میرے غیاب میں سب رس مجھ سے بہتر ہاتھوں میں تھا۔ جناب عابد علی خاں اور جناب گوپی چند نارنگ نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود اس شمع کو نہ صرف روشن رکھا بلکہ اس کی لَو کو اور بھی تیز تر کر دیا۔

زیرِ نظر شمارہ کے قارئین شاید یہ محسوس کریں کہ ہماری ساری زندہ آزمائی ڈاکٹر زور سے ہی متعلق ہے لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ڈاکٹر زور بذاتِ خود ایک انجمن تھے اور ظاہر ہے اس انجمن نما فرد کی یاد دِلوں کو گرما دیتی ہے اور خراجِ عقیدت پیش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ عقیدت کے یہ پھول زیرِ نظر شمارے میں سجائے جا رہے ہیں ہمیں یقین ہے کہ قارئین سب کا پسند فرمائیں گے۔

اُردو صحافت میں پرچوں کا بہ تاخیر منظرِ عام پر آنا کوئی نئی بات نہیں۔ حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ باوجود کوششِ بسیار کے ہم پرچہ وقت پر نہیں نکال پا رہے ہیں لیکن قارئین سب رس مایوس نہ ہوں کہ ہماری کوششیں جاری ہیں۔ سب رس کے لئے چند مستقل عنوانات کا انتخاب کیا گیا تھا، اُن پر بھی پابندی نہیں ہو رہی ہے۔ توقع ہے اہلِ قلم حضرات کا تعاون رفتہ رفتہ ہمیں حاصل ہو جائے گا۔ ہم پُرامید ہیں کہ جلد ہی یہ کمی پوری ہو کر رہے گی۔ بقول علامہ اقبالؔ

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

غلام جیلانی

سیدہ عزت النساء

مہدی افادی کا اسلوب بیان

پھول تو دو دن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے   حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔

یہ شعر مہدی حسن پر صادق آتا ہے۔ ان کی قبل از وقت موت اُردو ادب میں ایک سانحہ بن گئی۔ ان کی ذہنی صلاحیتیں ابھی منظرِ عام پر آنے بھی نہ پائی تھیں کہ موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں آ دبوچا۔ اور یہ قابلِ فخر ادیب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔

مہدی حسن کی پیدائش کا فخر گورکھپور کو حاصل ہے جہاں وہ غالباً ۱۸۶۷ء یا ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے لیکن انھیں اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ بسلسلۂ ملازمت پردیس کی نذر کر دینا پڑا۔ جہاں ملازمت کی روح فرسا پابندیوں نے مرحوم کی شخصیت کا گلا گھونٹنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ افسوس ہے کہ انھیں اتنی مہلت اور آزادی نہ مل سکی کہ وہ اطمینان سے اپنی کوئی تصنیف یادگار چھوڑ جاتے۔ لیکن مرحوم اتنا وقت اور فرصت ضرور نکال لیتے تھے کہ وقتاً فوقتاً اخبار اور رسائل وغیرہ میں کسی عصری بحث پر قلم برداشتہ کچھ لکھ سکیں یا اپنے خیالات کو انشائے لطیف کی صورت میں پیش کر سکیں۔ ہم بیگم مہدی کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے ان جواہر پاروں کو یکجا کر کے شائع کر دیا جو "مکاتیبِ مہدی" اور "افاداتِ مہدی" کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

"مکاتیبِ مہدی" خطوط کا مجموعہ ہے جو انہوں نے دوست احباب اور بڑی بڑی ادبی شخصیتوں کے نام لکھے ہیں۔ ان میں کچھ نجی خطوط بھی شامل ہیں۔ "افاداتِ مہدی" مرحوم کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان خطوط اور مضامین کو اردو کے ادب العالیہ یعنی کلاسکس میں جگہ دی جاتی ہے۔

ادب، ادیب کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اس میں ادیب کی شخصیت جلوہ گر ہوتی ہے۔ مہدی حسن کے مزاج میں بلا کی شگفتگی اور شوخی تھی۔ یہی چیز ہم کو ان کے اسلوبِ بیان میں نظر آتی ہے۔ سید ناصر علی ایڈیٹر صلائے عام دہلی کو ایک کھلی چٹھی لکھتے ہیں جس سے ان کے مزاج کی شوخی اور شگفتگی کا پتہ چلتا ہے۔

"میں آپ میں یونانیوں کی سی لطافتِ خیال پاتا ہوں۔ آپ کی چشمِ سخن "جنسِ لطیف" اور اس کے متعلقات کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ وہ نزاکتِ خیال کی آخری حد ہے۔ یورپ میں جو آج بڑے پائے کے لکھنے والے ہیں ان میں مذاقِ حسن پرستی اس قدر بڑھ گیا ہے کہ یہ قریب قریب ان کی ہستی کا ایک جزو بن گیا ہے، عورت جسے خوابِ طفلی اور آرزوئے شباب کہیے، ~~سے~~ ہر بات تری فسانۂ حسن
ہیئتِ اجتماعی یعنی سوسائٹی کی روحِ رواں ہو رہی ہے جس سے کوئی شائستہ لٹریچر دست بردار نہیں ہو سکتا۔ آپ ان نزاکتوں سے خوب واقف ہیں، اور یہ وجہ ہے کہ ~~سے~~ عکسِ رخ موتیوں کے دانوں میں ..... صنفِ نازک آپ کے دائرۂ تحریر میں کسی نہ کسی حیثیت سے آ ہی جاتی ہے"۔

اس طرح کی لطیف اور رنگین بیانی کی مثالیں ہمیں افادات مہدی میں جگہ جگہ بکھری پڑی ملتی ہیں ۔ ان کے بعض مضامین مثلاً فلسفۂ حسن و عشق، جنتِ ارضی، حجابِ عقلی، دو آرزوئے شباب میں اس قسم کی مثالیں اس قدر شوخی سے واضح ہوئی ہیں کہ تصور کے لئے گنجائش کم رہ جاتی ہے ۔

مہدی حسن کے ادبی دوستوں کا دائرہ خاصہ وسیع تھا ۔ اس وقت کے مشہور لکھنے والے مثلاً حالیؔ، شبلیؔ، عبدالماجد دریا آبادی، نیاز فتح پوری، سلیمان ندوی وغیرہ، ان سب سے ان کی خط و کتابت رہتی تھی ۔ ان کے خطوط میں دلچسپی اتنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تھی کہ یہ سب حضرات مہدی حسن کے خط کے منتظر رہتے ۔ عام طور پر ان کے خطوط ادبی مسائل سے بھرے ہوتے تھے ۔ پروفیسر عبدالباری کو غالب کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں : " جو نکات غالبؔ سے منسوب کیا جاتا ہے ان میں سے اکثر نکات بعید الوقوع ہیں ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حکیمانہ صداقتیں ان کے کلام میں موجود نہیں ۔ سوال یہ ہے کہ جس فلسفیانہ سانچے میں ہم اس کو ڈھالنا چاہتے ہیں کیا شاعر بھی ہر جگہ اس نکتہ سے واقف تھا ؟ اس میں ذرا مجھ کو کلام ہے "

مہدی حسن کا دل مشرقی اور دماغ مغربی تھا ۔ انہیں انگریزی اصطلاحوں کے اردو مترادف وضع کرنے کا بڑا شوق تھا ۔ جس سے ان کے تخلیقی دماغ کی اُپج کا پتہ چلتا ہے ۔ وہ خود ترجمہ کرتے اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے ۔ انہیں ان ترجموں پر بڑا ناز بھی تھا ۔ انہوں نے Etiquette کے لئے مراسمِ رسمیہ کی اصطلاح کی ۔ Higher Criticism کے لئے تنقیدِ عالیہ، کلاسکس کے لئے ادبِ عالیہ، ماسٹر پیس کے لئے اختراعِ خالقہ، لپ سروس کے لئے وظیفۂ لب کی اصطلاحیں انہیں کی نکالی ہوئی ہیں ۔ اسی طرح بعض ترکیبیں بھی وضع کیں جنہیں وہ اپنی عبارت میں استعمال کرکے اپنے بیان کو رنگین اور پُرمعنی بناتے تھے جس سے ان کی تحریر چمک اٹھتی تھی ۔ مثلاً زہرہ شباب، محبت کا ثراولین، کمیانۂ شباب، مقیاس الشباب، مے پرستانِ کُشی، جنبشِ لب وغیرہ ۔

مہدی حسن کے خطوط ان کی زندگی کی مکمل تصویر ہیں ۔ جس کے مطالعہ سے ان کی پوری شخصیت ہمارے سامنے جلوہ گر ہو جاتی ہے ۔ وہ موضوعوں کے سامنے پند اور ہمنواؤں کے سامنے مُتقطع بن جاتے ہیں ۔ وہ اپنے الفاظ کو خوبصورت الفاظ کا جامہ پہنا کر حسین بنا لیتے ہیں ——— "مکاتیبِ مہدی" میں کچھ نجی خطوط بھی شامل ہیں ۔ لیکن ان نجی اور ذاتی باتوں کو بھی وہ سب کے لئے حد درجہ دلچسپ بنا دیتے تھے ——— مندرجہ ذیل خط وہ اپنی دونوں بیٹیوں کو لکھتے ہیں اور اس میں انہوں نے اپنے خورد سال بچوں کی حرکات و سکنات کا یوں نقشہ کھینچا ہے :

" ایک لڑکا آگے آگے بھاگا چلا آتا ہے، ایک بچہ اس کے پیچھے لگا ہوا ہے ۔ کچھ اختلاف ہو گیا ہے ۔ اس لئے دانت کاٹنے کی فکر میں ہے ۔ دری کے فرش تک تو یہ گھٹنیوں چلا (جسے تم بکیاں کہتی ہو) اس کے بعد ٹاٹ کی رگڑ سے بچنے کے لئے یہ چھوٹا سا دو ٹانگ کا حیوان چوپایہ بن گیا ہے ۔ اصحاب شاہد کی پنڈلی پر دانت جمایا جا چکا ہے ۔ لیکن مدد پہنچ گئی ۔ تاخت کا وار خالی گیا "

اپنی بڑی لڑکی کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں :

" خدا پر بھروسہ کرو، ذرا بھی دلگیر نہ ہو ۔ یہ فطرت کے معمولی حوادث ہیں جو ہوتے رہتے ہیں ۔ خدا میرا اس قدر حق کو ضائع نہیں کرے گا ۔ ثبوت یہ ہے کہ تم نے ایک غیر علاج پذیر مرض سے معجزانہ شفا پائی ۔ اگر تم مجھے راحتی چاہتی ہو تو دل چھوٹا نہ کرو " مہدی حسن کے ان مختصر اور معمولی باتوں میں ہم کو سچی روحانیت اور سچی تہذیب ملتی ہے ۔ جو کہیں اور دکھائی نہیں دیتی ۔

"افاداتِ مہدی" کے بیشتر مضامین وقتی اور موسمی کہے جا سکتے ہیں ۔ لیکن ان کا قلم ایک آرٹسٹ کا قلم تھا جو بے جان سے بے جان چیز میں جان پیدا کر دیتا ہے ۔ اسی وجہ سے ان کے مضامین میں آج بھی وہی لذت ہے جو ۵۰، ۶۰ سال پہلے تھی ۔ چنانچہ ان [illegible]

کے پیش نظر مجنوں گورکھپوری رقم طراز ہیں :

"اردو نثر کی تاریخ میں میرامّن کے بعد شبلی تک مجھے سوا آزاد کے کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جس کے طرز اسلوب میں اتنی زندگی ہو جتنی مہدی الافادی کے اسلوب میں ہے ۔ اور جو محض اپنے اسلوب کی بنیاد پر تاریخ ادب میں ایسی مستقل حیثیت کا مالک اور ایسی پائدار زندگی کا مستحق ہو۔ شبلی کے اسلوب کو موضوع کی اہمیت اور وقت سے الگ کر لیجئے تو اس میں کچھ زیادہ نہیں رہ جاتا ۔ ان کا اسلوب اپنے تمام تناسب اور آہنگ کے باوجود فاضلانہ تحریر سے سر مو آگے نہیں بڑھتا۔ حالی کا انداز تحریر سلیس ، بے تکلف ، پختہ اور نرم ہے ۔ مگر اس کے اندر کوئی خاص جمالیاتی کیفیت بہت کم ہے ۔ نذیر احمد کے اسلوب میں ایک البیلا پن ہوتا ہے ۔ جو صرف کسی فسانہ نگار کو زیب دے سکتا ہے ۔ افادی الاقتصادی کے اسلوب کی اہمیت موضوع کی اہمیت سے بالکل الگ چیز ہے اور بڑے مرتبہ کی چیز ہے ۔"

ان کے اسلوب کی سب سے نمایاں خصوصیت جمالیت ہے ۔ ان کا ذوق جمال خدائی عطیہ تھا ۔ جو ان کی تحریروں میں ہر جگہ آشکارا ہے ۔ اس لئے خود شبلی جو بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور کسی کی بھی تعریف میں بہت محتاط رہا کرتے تھے ، ان کے بڑے معترف تھے ۔ چنانچہ انہوں نے مہدی حسن کی دل کھول کر تعریف کی ہے ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ، " کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب ہوتے ـــــ واللہ اور بیڑ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کی بات نہیں ۔" ـــــ ایک دوسرے خط میں یوں رقم طراز ہیں : " البشیر میں ایک مضمون دیکھا نیچے تمہارے نام کی دستخط تھی ۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے ۔ کئی دن دیکھتا اور احباب کو دکھاتا رہا ۔"

مہدی حسن والٹر پیٹر ، رسکن اور آسکر وائلڈ کے روحوں کا گویا مجموعہ تھے ۔ جو ایک انشا پرداز کے مجسمہ میں پنہاں تھے ۔ جس کا ثانی اردو نثر نگاروں میں کوئی نہیں ۔ ان کے اسلوب کا موازنہ کسی کے اسلوب سے نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ ادب میں جدت خیال ، طرز بیان میں ندرت ، شوخی اور نکتہ سنجی کو ضروری خیال کرتے تھے ۔ نذیر احمد کے بارے میں وہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں : " بے مثل قدرت بیان ، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور وہ تصرفات جو جدت خیال اور ظریفانہ نکتہ سنجیوں کے لحاظ سے صرف اس شخص کا حصہ ہے ، لٹریچر کی جان ہے ۔" لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ قیاس کر لینا کہ وہ خیال کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ، بے معنی معلوم ہوتا ہے ۔ انہوں نے کئی جگہ اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ طرز ادا کے ساتھ ساتھ معنوی پہلو بھی اہمیت کے حامل ہیں ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ، " ہم سے الفاظ کتنے ہی خوش گوار ہیں ہوں ، نفس مضمون کی شستگی اور ہم طرحی کی کہاں تک تلافی کریں گے ۔"

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ادب میں صوری اور معنوی دونوں پہلوؤں کے حامی ہیں ۔ ان کا اسلوب تخیلی نہیں بلکہ اس میں معنویت موجود ہے ۔ ان کا طرز بیان دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ بلیغ بھی ہے جس میں گہری باتیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں ۔ اور یہ یقیناً مغرب کی دین تھی ۔ وہ نہ صرف مغرب کی طرز معاشرت کے قائل تھے بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی طرز ادا سے بھی متاثر تھے ۔ اردو میں یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی اسالیب اور صور کو جذب کر کے اردو نثر کو نظری عناصر بنائے ۔ اردو ادب میں پچھلے کئی سالوں سے جو مغربی طرز ادا کا ہے ایسے کے موجد نہ تو حالی تھے اور نہ ہی شبلی بلکہ یہی خوش اسلوب مہدی حسن تھے ۔ تحقیق و تنقید میں حالی اور شبلی کا مرتبہ یقیناً بلند ہے ۔ لیکن اردو کے جدید اسلوبی رجحانات کو متشکل کرنے میں انہوں نے وہ حصہ نہیں ادا کیا جو مہدی حسن نے کیا ہے ۔ یقیناً اردو کے جدید اسلوب کا سنگ بنیاد انھیں کے ہاتھوں رکھا گیا ۔

مہدی حسن نے بڑی غیرت دار طبیعت پائی تھی ۔ وہ کسی کے ممنون و مشکور رہنا گوارا نہیں کرتے تھے ۔ یہی خصوصیت ان کی تحریروں میں بھی جلوہ گر ہے ۔ وہ حتی المقدور انگریزی الفاظ سے پرہیز کرتے تھے ۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تحریر و تقریر دونوں میں انگریزی الفاظ سے پرہیز کرتے تھے ۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تحریر اور تقریر دونوں دونوں میں انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا ۔ چنانچہ حالیؔ اور شبلیؔ بھی اس علت سے بچ نہ سکے ۔ لیکن مہدی حسن نے اس سے ہمیشہ پرہیز ہی کیا ۔ اگر انہوں نے کہیں انگریزی الفاظ استعمال بھی کئے ہیں تو مجبور ہو کر ورنہ وہ عموماً ترجمہ پر ہی قناعت کرتے جن کا ذکر ابتدا میں آچکا ہے ۔ ان کے یہ ترجمے اردو کے ذخیرے میں بیش بہا اضافہ ہیں ۔ ان کی تحریروں کی امتیازی شان و شوکت وہ نزاکت اور نفاست ہے جو ان کی فطرت ثانی تھی ۔ اور جو ہمیں صرف مغرب میں نظر آتی ہے ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اپنی تصنیف " اسالیب بیان " میں تحریر فرماتے ہیں '

" مہدی رسکنؔ کی طرح الفاظ کے خوشنما بیل بوٹے بنا کر پیش کرتے تھے " وہ آگے مزید تحریر فرماتے ہیں '

" ان کی عبارتیں انگریزی کمانوں کی طرح خوشنما ہونے کے علاوہ سہل الفہم بھی ہوتی ہیں "

افاداتِ مہدی میں جتنے بھی مضامین ہیں ان میں سے اکثر کی نوعیت تنقیدی ہے ۔ بحیثیت تنقید نگار وہ ہمیں پیٹر کی یاد دلاتے ہیں ۔ مہدی افادی کا اندازِ تنقید پیٹر کی طرح محاکاتی ہے ۔ ادب میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے تنقید کو ادب لطیف بنایا ۔

بہر حال مہدی حسن کا قلم چاہے وہ مضمون ہو یا مکتوب اپنے کمال کا وہ جوہر دکھاتا ہے جس کا کوئی ثانی نہیں ۔ مجنوں گورکھپوری کہتے ہیں '

" یوں تو اکثر مشاہیر ادب اردو میں ایسے نکلیں گے جن کے مکاتیب کو ہم آنکھوں سے لگاتے ہیں ' لیکن خطوطِ مہدی کی بات ہی کچھ اور ہے ۔ ان کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ دراصل خط لکھنے کا سلیقہ کیا ہے ۔ اور ہندوستانی ابھی اس سلیقہ سے کس قدر بے گانہ ہیں ۔ مجھے تو " عودِ ہندی " اور " اردوئے معلیٰ " میں بھی وہ بات نہیں ملی جو خطوطِ مہدی میں ہے "

غرض مہدی حسن کے مکاتیب اور مضامین اردو ادب میں بیش بہا اضافہ ہیں ۔ افسوس ہے کہ انھیں زمانے نے اتنی فرصت ہی نہ دی کہ وہ کوئی ایک مستقل تصنیف چھوڑ جاتے ۔ لیکن ان کے طرزِ بیان کی شوخی انھیں زندہ رکھنے میں بڑی معاون ہے ۔ اگر ان کی عمر بھی ساتھ دیتی تو اردو ادب پر ان کا مزید احسان ہوتا ۔ ایسے ہی باکمال ادیبوں کے لئے مرزا غالبؔ کہہ گئے ہیں '

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں ۔

انیس قیوم فیاض

چند عثمانین افسانہ نگار

حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کا خیال مختار الملک کے عہد میں پیدا ہو چکا تھا۔ اور ۱۲۹۲ھ میں رفعت یار جنگ کی جانب سے ایک تحریری یادداشت بھی مختار الملک کو پیش کی گئی تھی۔ لیکن نو سال تک کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا تو یہ تحریک دوبارہ اٹھائی گئی اور ۱۳۰۱ھ میں نظام یونیورسٹی کی خیالی بنیاد رکھی گئی۔ سلطان العلوم میر عثمان علی خاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد ۱۳۲۶ھ میں یونیورسٹی کے قیام کی منظوری دے دی اور ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۱۹ء سے جماعتوں کا آغاز ہوا۔

بیگم صغرا ہمایوں مرزا، عظمت اللہ خاں اور رگھناتھ راؤ درد وغیرہ سرزمین حیدرآباد سے اس زمانے میں بھی لکھ رہے تھے —

ڈاکٹر زورؔ اور پروفیسر عبدالقادر سروری بلند پایہ محقق اور نقاد کی حیثیت سے علمی دنیا میں روشناس ہوئے۔ لیکن بہت کم لوگ واقف ہیں کہ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں جو اپنے زمانے میں بہت مقبول ہوئے۔

"طلسمِ تقدیر" ڈاکٹر زورؔ کے خالص ادبی افسانوں کا مجموعہ ہے۔ "گولکنڈے کی ہیرے" اور "سیرِ گولکنڈہ" میں زورؔ صاحب نے افسانہ نگاری کے بڑے ہی اچھے نمونے پیش کیے ہیں۔ افسانہ بالعموم تخیل اور حقیقت کے دل کش امتزاج کا نام ہے۔ ساتھ ہی وہ کرداروں کی نفسیات، ان کے جذبات و احساسات کا بھی تجزیہ کرتا ہے۔ یہ تمام چیزیں زورؔ صاحب کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

"سیرِ گولکنڈہ" بارہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں حیدرآباد کے ماضی کی دل کش خیالی تصویریں ملتی ہیں۔ جنھیں پڑھ کر اسکاٹ اور شرر کے جانبازوں کی طرح ان حیدرآبادی جانثاروں ابوالحسن تاناشاہ اور عبدالرزاق لاری وغیرہ سے محبت ہو جاتی ہے اور ان کی تصویریں نظروں کے سامنے گھوم جاتی ہیں۔

ڈاکٹر زورؔ نے عہدِ ماضی کی معاشرت کو کچھ ایسے دلکش پیرایے میں پیش کیا ہے کہ زمانۂ گذشتہ کا ہو بہو نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

تاریخی مختصر افسانوں کی اصل غرض وقائعِ ماضی کی تدوین ہوتی ہے۔ تاریخ میں گذرے ہوئے واقعات کو ان کے اسباب اور محرکات سے علیحدہ کر کے بیان کیا جاتا ہے۔ مورخ صرف خارجی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اور جہاں سے انسانی احساسات و جذبات شروع ہوتے ہیں وہاں سے تاریخی مختصر افسانہ نگاری کی سرحد آجاتی ہے۔ تاریخی افسانے [illegible]

کر کے اللہ وطن احساسات اور جذبات کی ترجمانی کو بھی نہایت موثر طریقے سے اجاگر کیا ہے۔ اور موقع و محل کی مناسبت کا لحاظ رکھتے ہوئے تمثیل کا ایسا مناسب رنگ بھرا ہے کہ وہ صد درجہ موثر بن جاتی ہے۔ ایک اچھے افسانہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ غیر مستند واقعہ کو بھی اس طرح بیان کرے کہ اس کی صحت پر کسی کو شبہ نہ ہو۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں "میر گولکنڈہ میں زورؔ صاحب نے تاریخ اور افسانے واقعات اور تخیل کو ایسی خوبی سے ملایا ہے کہ قطب شاہی دور کی تصویر نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے"

جس عہد کا نقشہ وہ اپنے مختصر افسانوں میں پیش کرتے ہیں وہ بالکل جیتا جاگتا قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔ اور افراد چلتے پھرتے اور گفتگو کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ دراصل یہ جادو نگار مصنف کا اعجاز ہی تو ہے کہ وہ تاریخ کے خشک اور فرسودہ واقعات کو از سر نو زندہ کر دیتا ہے۔

جس طرح پریم چند اجودھیا کے عہد کو از سر نو زندہ کرنے میں کامیاب رہے ہیں اسی طرح ڈاکٹر زورؔ نے بھی عہد قطب شاہیہ کو دوبارہ زندگی دی ہے۔ "خشک محل، کھویا ہوا چاند، شہزادی کا عقد، انار کے چودہ دانے، غیبی امداد، اور کا غذی برج منہ بولتی تصویریں ہیں۔ "کاغذی برج" میں جنگ کا مکمل سراپا کھینچا ہے ۔۔۔ "دوپہر کا وقت ہے، مغل فوجیں ایک قطب شاہی سپہ سالار کی غداری سے قلعہ گولکنڈہ میں داخل ہوچکی ہیں اور ایک ایک فصیل پر اپنا قبضہ جما رہی ہیں۔ کل دن بھر معروف پیکار رہ کر برج کو منہدم کرنے اور آج صبح اس کو صحیح سالم دیکھنے والے مغل سپاہیوں نے قلعہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اس عجوبہ روزگار برج کی طرف لپکے۔ جب وہاں پہنچے تو حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ سارا برج تو راتوں رات کاغذ لکڑی اور ٹاٹ سے مصنوعی بنایا گیا ہے" اس منظر کو پڑھنے کے بعد قاری اپنے خود یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ سامنے ایک کاغذی برج کھڑا ہوا ہے۔ اور مغل سپاہیوں کو محو حیرت کئے ہوئے ہے۔

"انار کے چودہ دانے" میں لکھتے ہیں " داد محل کا دیوان خانہ خوش وضع امیروں اور سلیقہ مند خدمت گاروں سے معمور تھا، بادشاہ کی پوشاک تخت گاہ کی آرائش، قالینوں کی رنگا رنگی، پردوں کے نقش و نگار، امیروں کے حفظ مراتب، درباری آداب، خادموں کی مستعدی، غرض ہر چیز اور ہر بات میں شائستگی اور سنجیدگی نمایاں تھی۔ "کیا رسیلی آواز آرہی ہے؟" ۔ گولکنڈہ کے محبوب بادشاہ نے آخری کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ میر منشی سر جھکائے نگاہیں نیچی کئے آگے بڑھا اور مودبانہ لہجے میں عرض کیا "بندہ پرور! چاند محل کے حوض کے اطراف دھان کی جارہا ہے، مزدوریاں کے گانے کی آواز آرہی ہے" اس کے ساتھ ہی اس دور میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اپنے تصور کی آنکھ سے گولکنڈہ کے محبوب بادشاہ کے کروفر کو دیکھنے لگتا ہے۔ جیسے مزدور عورتوں کے گیت کی رسیلی آواز گونج رہی ہے۔ یہ زورؔ صاحب کے قلم کا جادو نہیں تو اور کیا ہے کہ چاہے جس کا قاری پلک جھپکتے میں طے کر کے قاری قطب شاہی عہد میں پہونچ جاتا ہے۔

زورؔ صاحب نے ایک محدود دائرے میں رہ کر تاریخ ادب میں توسیع کی اور دکنی ادب کا ذوق عام کر گئے۔ وہ میلے سے ہرن نکال لینے کو بڑا کام نہیں سمجھتے تھے بلکہ چٹان کا سینہ چیر کر جوئے شیر لانے کے قائل تھے۔ چنانچہ دکنی ادب، لسانیات، صوتیات، اسالیب بیان اور تنقید پر ان کی تالیفات اسی کاوش کے ثمر ہیں۔

دکنی ادبیات کی بازیافت، ایک دور کی تہذیب کی بازیافت تھی، ایک سنگلاخ زمین کی بازیافت تھی جس میں اردو کی معنوی پہنائیاں ہیں۔ یہ ان [illegible] کی بازیافت تھی جس کی خوشبو اب اردو نثر کی کلیوں اور غزلوں کے پھولوں میں بسی ہوئی ہے۔

[illegible] ادارہ ادبیات اردو قائم کیا۔ قیام جامعہ کے بعد اردو کا ماحول بنانے میں زورؔ صاحب کی [illegible]

بہت نمایاں [illegible]

"طلسم تقدیر" کے دیباچہ میں عبدالقادر سروری لکھتے ہیں " قصہ کے تمام واقعات میں نسبتاً اصلیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کو قدیم روایتی قصوں کے گروہ میں شمار کرنا چاہئیے جن میں ایک شخص کی اپنی زندگی کے واقعات کا بیان ہی قصہ کا سارا سرمایہ ہوتا ہے۔ تدبیر و تقدیر کی بحث کے خارستان سے قصہ نگار کا دامن بچا کر نکلنا قابل تعریف ہے" اور آخر میں جس عظیم الشان نتیجے پر وہ پہونچتے ہیں وہ پورے قصہ کو بلند پایہ بنا رہا ہے۔ بظاہر قصہ سادہ اور معمولی ہے۔ لیکن اس کے توسط سے جو اہم بالشان پیغام نوجوانوں کو پہونچایا گیا ہے وہ سروالٹر اسکاٹ کی تمام شاعری کے بہترین پیغام سے کسی طرح کم نہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ مختلف سازوں کی آوازسے ہم آہنگ ہو کر تمام عیش پرست دنیا میں منادی کر دو کہ صحت مند زندگی کی ایک مصروف ساعت گمنامی کی ایک عمر نوح سے بہتر ہے"

جامعہ کی ابتدائی دور کی افسانہ نگاری میں پروفیسر عبدالقادر سروری کا نام بھی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "رات کا بھولا" میں گیارہ دلچسپ افسانے ملتے ہیں۔ خواب زندگی، اکیلی قبر کا راز، ندامت، بیاہی بیوہ، اور رات کا بھولا اچھے افسانے کہے جاسکتے ہیں۔ یہ افسانے کچھ تو ۱۹۳۲ء کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ ۳۴ء کے۔ ان افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے کردار حقیقی بھی ہیں اور تخیلی بھی۔ ای۔ ایم۔ فارسٹر کی طرح دبیلے انسان ہیں جن پر انسانوں کا دھوکہ ہوتا ہے۔ سروری صاحب نے اکثر افسانوں کے موضوع زندگی سے لئے ہیں۔

میر کہتے تھے "کیا جانتا ریختہ پردہ سخن کا" یہ کمال کا بڑا درجہ ہے۔ ظاہر جس طرح افسانہ گو اور شاعر کا کمال ہے اسی طرح یہ اس کی قوت اور اس کا عیب بھی ہے جس سے تعمیر و تخریب یا ذہنی تربیت وابستہ ہوسکتی ہے۔ لیکن اس وقت اور اس کے حربے کے موثر استعمال کے لئے استاد دماغ اور مشاق ہاتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سروری صاحب ایک استاد دماغ اور مشاق ہاتھ رکھتے تھے۔ جن کی بدولت وہ آج کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ "جدید اردو شاعری" "اردو مثنوی کا ارتقاء" "زبان اور علم زبان" اور "دنیائے افسانہ اور کردار و افسانہ" وغیرہ۔ موخرالذکر کتابیں لکھ کر انہوں نے پہلی بار مغربی افسانہ نگاری سے روشناس کروایا۔ دنیائے افسانہ میں افسانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں۔ "آج ہندوستان کی جو ناگفتہ بہ حالت ہے اس کو دور کرنے کے لئے ایک ٹالسٹائی ایک روسو، ایک ڈکنز کی ضرورت ہے"

ان کے خیال میں کسی بھی زبان کی تاریخ ادب اس وقت تک مکمل نہیں کہلائی جاسکتی جب تک اس زبان کے افسانے اس میں شامل نہ کئے جائیں۔ ادبیات میں افسانوں کا درجہ بہترین افسانوں کی ہر دلعزیزی سے ہوسکتا ہے یہاں انہوں نے دالٹرمس کا حوالہ بھی دیا ہے کہ "افسانہ اسی قالب میں ڈھل جاتا ہے جس میں خود مصنف اس کو ڈھالنا چاہتا ہے۔" اگرچہ کہ وہ افسانہ نگار بھی تھے لیکن محقق اور نقاد زیادہ تھے۔ انہوں نے تحقیق کی دنیا کو بہت کچھ دیا جو ہمیشہ انہیں زندہ رکھے گا:

ان بزرگوں کے بعد جامعہ عثمانیہ سے جتنے بھی افسانہ نگار ابھرے وہ سب ہی ایک مخصوص اسکول کی پیداوار تھے جو نفسیاتی خواہشات اور لذت پرستی کے گرد نہیں گھومتا بلکہ صحت مند اور صالح جذبات پیدا کرتا ہے۔ ان میں نمایاں نام رشید قریشی، بھارت چند کھنہ، بدر شکیب، محشر عابدی، جہاں بانو نقوی اور عزیز النساء حبیبی وغیرہ ہیں۔

رشید قریشی ادب کے ان خدمت گزاروں میں سے ہیں جن میں جذبۂ عمل کے ساتھ ساتھ ذوق ادب بھی ودیعت کیا گیا ہے۔ ان کے افسانوں میں زیادہ تر ایک نوجوان کی تخیل کی بستی آباد ہے۔ جس میں شباب کی تصویریں ہیں، سوز ہے، مستی ہے، جذب ہے، شوق ہے جو من کی دنیا میں آباد ہوگئے ہیں۔ "من کی دنیا" ۲۲ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ عبدالقادر سروری لکھتے ہیں ــــ "رشید قریشی کے قصوں کے متعلق یہ بات خاص طور پر

قابلِ ذکر ہے کہ تقریباً سب کے سب طبعزاد ہیں۔ اور اسی لئے ہماری زندگی کے نقشے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دلچسپی کے نئے نئے موضوع تلاش کرتے رہتے ہیں، اور جب موقع ملتا ہے ان کو وہ قصے کے پیرائے میں لکھتے چلتے ہیں"۔

رشید قریشی کے افسانے محسوسات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ "من کی دنیا" کے تمام افسانے 'فراق' وصال' کشمکش' اسیری' فریب' شوق' شرارت' دھوکہ فریب اور حماقت سے عبارت ہیں۔ ڈاکٹر زینت ساجدہ کا خیال ہے کہ "رشید قریشی افسانہ نگاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے یہاں فکر و شعور کے مقابلے میں تصوریت اور ماورائیت کا رنگ گہرا ہوتا ہے۔ اور جو خود فراموشی' جذباتی سپردگی اور تخیل کی طلسم کاری پر جان دیتے ہیں"۔

"دُکھی دل" میں ایک طوائف کے جذبات کی یوں عکاسی کرتے ہیں ـــ "میں نہیں جانتی محبت کیا ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے قریب رہو۔ اور میرے رہو"۔ طوائف کے دل میں انگڑائی لیتی ہوئی ناآسودہ خواہشوں کو جیسے انہوں نے زبان دے دی۔ تب ہی تو وہ چاہتی ہے کہ اس کا محبوب اس کے سامنے رہے۔ اور صرف اس کا رہے۔ کسی اور کا نہیں۔ الغرض ان کے افسانے پلاٹ' کردار نگاری کے اعتبار سے اپنے وقت کے شاہکار خیال کئے جاتے ہیں۔ اسلوب کی جدّت' پلاٹ کی ندرت کے لحاظ سے "خوابِ ناتمام" ان کا کامیاب ترین افسانہ ہے۔

بھارت چند کھنہ بنیادی طور پر ایک مزاح نگار ہیں لیکن انہوں نے کئی کامیاب افسانے بھی لکھے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "مسکراتے آنسو" ۱۹۴۴ء میں چھپا تھا۔ جس میں "حسرت' شیرنی کا بچہ" تکنک اور مواد کے لحاظ سے اچھے افسانے ہیں۔ کھنہ صاحب میں ایک بہترین خاکہ نگار اور افسانہ نویس دونوں صلاحیتیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر زور کھنہ صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں "ان کی طبیعت کے جوہر اور نمایاں ہوتے اگر وہ اتنے بڑے عہدہ دار نہ ہوتے۔ ان کی تحریروں میں کرشن چندر کے سے تیور نظر آتے ہیں۔ زندگی کے سیاہ سفید اور رنگارنگ پہلوؤں اور انسانی فطرت کی اتھاہ گہرائیوں تک وہ اس طرح پہونچتے نظر آتے ہیں جس طرح کرشن چندر پہنچ جاتے ہیں"۔

جامعہ کے اولین افسانہ نگاروں میں محشر عابدی کی شخصیت بھی تعارف کی محتاج نہیں' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "محشرستان" کے نام سے شائع ہوا اور دوسرا مجموعہ "رس" ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔ ان کے خیالات میں ندرت و جدّت' تخیل میں بلندی و عظمت' زبان میں سلاست و شگفتگی' طرزِ بیان میں رومانیت اور پختگی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ "رس" کے ہر افسانے میں تخیل کی رومانیت اور طرزِ نگارش کی موسیقیت نمایاں ہے۔ کہیں شباب کی بے چینیاں ہیں تو کہیں جوانی کی بیقراریاں' کسی مقام پر عشق کروٹ بدل رہا ہے تو کسی جگہ حسن خود بے تاب تماشہ دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ کہ ان کا تعلق سائنس سے ہے لیکن اس کے باوجود ان میں اچھی اعلیٰ صلاحیت موجود ہے

ڈاکٹر زینت ساجدہ لکھتی ہیں "سائنس اور ادب میں خدا واسطے کا بیر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن محشر عابدی سائنس دانوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو دیکھ کر اس خیال کی صداقت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ان کے افسانہ "پرستارِ محبت" کے بارے میں نیاز فتح پوری نے لکھا ہے' "فنی اعتبار سے یہ محشر عابدی کا کامیاب ترین افسانہ ہے' موضوع کا انتخاب' عمدہ تکنک اور اچھی روانی محشر عابدی کے افسانوں کی جان ہے"۔ محشر عابدی کی دو اور کتابیں "روپ متی" اور "حیات گیا ہے" ملتی ہیں۔

بدر شکیب جامعہ عثمانیہ کے ابتدائی دور کے افسانہ نگاروں میں سے ہیں۔ جنھوں نے اس صنفِ ادب پر خاطر خواہ توجہ کی ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "نزلے دھوکے" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بدر شکیب واقعات کو سیدھے سادے الفاظ میں بیان کرتے ہیں اور آنکھوں کے سامنے ایک سماں کھینچ دیتے ہیں۔ ان کے قلم میں روانی ہے جس کے باعث افسانوں میں بڑی زندگی اور تازگی پائی جاتی ہے۔

جامعہ حیدرآباد کی جن خواتین نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان گیر شہرت حاصل کی ان میں جہاں بانو نقوی امتیازی مقام رکھتی ہیں۔ حیدرآباد کے پرانے لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی چھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں رفتارِ خیال، بربطِ ناہید، فن اور فنکار، محمد حسین آزاد قابلِ ذکر ہیں۔ "رفتارِ خیال" ان کے دل نشین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کا اسلوب بے حد مترنم و نازک ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نثر میں شاعری کی گئی ہو۔

ڈاکٹر زینت ساجدہ کے بیان کے بموجب وہ ادب ہی نہیں ادیب گر بھی تھیں۔ نئی نسل کی لکھنے والیوں کی ذہنی تربیت میں ان کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ وہ بجائے خود ایک ادارہ تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح انھیں اشعار کو اپنی عبارت میں کھپانے کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ ——

"رفتارِ خیال" کے افسانے گھریلو واقعات پر مبنی ہیں۔ عورت اور اس کے مسائل پر انھوں نے کافی روشنی ڈالی ہے۔ اندازِ بیان میں ایک قسم کی شگفتگی پائی جاتی ہے جس سے پڑھنے والا انجانے طور پر محظوظ ہوتا ہے۔ "شہیدِ غافل" ان کا ایک کامیاب افسانہ ہے جو "رفتارِ خیال" میں شامل ہے —— "ایک عام عورت کی طرح رتنا کی خواہش تھی کہ اپنے قیمتی زمرد و الماس کی مالا پہن کر تصویر لے۔ لیکن اس کے شوہر کو ہرگز یہ پسند نہیں تھا کہ رتنا کوئی ایسی تصویر لے اور اس کی یہ تصویر کوئی دیکھ لے۔ وہ اسے بے انتہا چاہتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی بہت زیادہ بدگمان، دقیانوسی کھوٹے خیالات کا آدمی تھا۔ یہی ذرا سی بات تھی جس نے رتنا کو گھلا کر رکھ دیا تھا اور آخر ایک دن وہ اپنی تصویر کی حسرت لئے دنیا سے چلی گئی۔

شکنتلا اس کی دوسری بیوی تھی۔ وہ اس کی بیوی کی سہیلی بھی تھی۔ اسے احساس تھا کہ محض ایک معمولی خواہش کے پورے نہ ہونے سے رتنا کی جان گئی —— ایک دن جب اس کے شوہر نے تصویر کھنچوانے کی فرمائش کی تو اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ شکنتلا نے وہی مالا پہن کر تصویر کھنچوالی —— لیکن وہ اس صدمہ کو سہہ نہ سکی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں!! عورت کے جذبات و احساسات کی عکاسی کرنے میں جہاں بانو کو ملکہ و دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے ہمیشہ عورت کو باوفا ثابت کیا۔ جو شوہر کی مرضی پر مٹ جانے ہی کو ایمان سمجھتی ہے۔

خورشید النساء حبیبی بھی جامعہ عثمانیہ کی افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "تم بڑی سنگدل ہو" چند رومانی اور معاشرتی افسانوں پر مشتمل ہے۔ وہ معاشرہ کی گفتگو، تہذیب اور اخلاق کی صحیح صحیح مرقع کشی کرنے میں کامیاب ہیں۔ انہوں نے اپنے رومانی افسانوں کو عشق و محبت کی چاشنی دے کر سرسبز کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابتداً اردو ادیبوں کے سب سے زیادہ دل کش ادبی مرقعے محبت ہی کے کیف آور نغموں میں ڈوب کر نکلے ہیں۔

نقش عالی کے افسانوں کا مجموعہ "محبت کی ٹھوکریں" ہے جس میں جنسی عنصر بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ محبت ہی کے تحت جنسی جذبے کی تسکین بھی آجاتی ہے۔

مارشل پراوسٹ، لارنس، جوائس، موپساں اور فرائڈ سے متاثر ہو کر جن افسانہ نگاروں نے اس طرح کی کہانیاں لکھی ہیں، ان میں نقش عالی بھی شامل ہیں۔ اس طرح کی کہانیوں میں جنسی بھوک کی پکار صاف سنائی دیتی ہے۔

اسی طرح جامعہ عثمانیہ کے افسانہ نگاروں کی فہرست میں اضافے ہی ہوتے رہے اور یہ اضافے آج بھی جاری و ساری ہیں۔ کیونکہ جامعہ عثمانیہ کے طالب علموں میں افسانہ نگار، شاعر وغیرہ برابر ابھرے ہیں۔ یہ افسانہ نگار ہر دور میں مختلف تحریکوں سے متاثر رہے ہیں۔

جمیل شیدائی

اپروچ

کردار: اعجاز، زبیر، ثمینہ ————

(یہ ایک مکان کا وسطی حصہ ہے۔ جہاں بے شمار چھوٹے چھوٹے کمرے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سارا ڈراما ایسے ہی کمرے میں ہوتا ہے۔ یہ کمرہ اندرونی طور پر مختصر مگر سلیقے سے سجا ہوا ہے۔ داخلے کے دروازے کے دونوں جانب دو پلنگ ہیں جن پر آرام دہ بستر ہے اور ان کے مقابل قدِ آدم آئینہ ہے۔ آئینے کے داہنے والا دروازہ باورچی خانے کی طرف جاتا ہے۔ اس کمرے میں دو نوجوان زبیر اور اعجاز رہتے ہیں۔ دونوں ہم عمر ہیں ایک ہی جگہ ملازمت کرتے ہیں زبیر پلنگ پر لیٹا ہوا ہے اور اعجاز اس کے سرہانے کرسی پر بیٹھا ہے۔)

———— • ————

اعجاز۔ اب اٹھو بھی دیکھو ساڑھے آٹھ ہو رہے ہیں۔

زبیر: طبیعت بوجھل سی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے مجھے نیند کی ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج مجھے رخصت لینی چاہیئے۔

اعجاز: رات تو تم مزے سے سوتے رہے ہے۔

زبیر: پچھلے پہر سے نیند اچاٹ گئی تو صبح تک جاگتا رہا۔

اعجاز: میں نے محسوس کیا ہے کہ تم ان دنوں جذباتی ہوتے جا رہے ہو — میاں عاشقی صحت مند دماغ نہ ہونے کا پتہ دیتی ہے۔

زبیر: کچھ سہی، تم یہ کیوں سمجھ لیتے ہو کہ طبیعت کی موجودہ افتاد عاشقی کا نتیجہ ہے۔

اعجاز: اس کے علاوہ اور کیا سمجھوں چوبیس گھنٹے تم پر یہی بھوت تو سوار رہتا ہے

زبیر: تم سے تذکرہ کر کے میں نے غلطی کی۔ میری ہر حرکت کو تم مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہو اور میری کسی بھی بات پر عاشقی کا لیبل لگا دیتے ہو۔

اعجاز: اگر تمہیں برا لگتا ہے تو میں تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ (وہ دریچے سے باہر دیکھتا ہے)

زبیر: بھئی تم عجیب آدمی ہو (وہ اٹھ جاتا ہے) اعجاز میں تمہارے مشورے کا طالب ہوں۔ تم نفسیات کا مطالعہ کرتے ہو۔ میں ایک عجیب الجھن کا شکار ہوں۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟

اعجاز: ضرور۔ میں خوش قسمت ہوں کہ تم مجھے اس قابل سمجھتے ہو۔ ویسے کسی چیز کو [illegible] جڑی کا مدرک کم ہو جاتا ہے۔

زبیر: ثمینہ کو میں بری طرح چاہنے لگا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میری شخصیت اس کے بغیر ادھوری سی ہے۔ یہ احساس کیوں پیدا ہوا، اس کے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا ثمینہ کا اقرار مجھے اسی ذہنی کرب و اضطراب سے نجات دلا سکتا ہے۔

اعجاز: کسی کو چاہنے یا محبت کرنے کا عمل عمر کے تقاضے کا نتیجہ ہے۔ یہاں تک تمہارا جذبہ درست ہے مگر یہ کیا کہ تم محبت کا اقرار ثمینہ سے چاہتے ہو۔

زبیر: اعجاز، جسے ہم ٹوٹ کر چاہتے ہوں اس کا ردِ عمل معلوم کرنے کی خواہش کیا فطری نہیں ہوتی؟

اعجاز: تم اپنا کام کیے جاؤ اور وہ اپنا کرے۔

زبیر: واہ، یعنی میں اپنی ساری توانائی یوں ہی ضائع ہونے دوں، یہی نا؟ اس کے اقرار کے بعد مجھے معلوم ہو جائے گا کہ میری پرستش رائگاں نہیں۔

اعجاز: فرض کرو کہ اس نے انکار کیا۔

زبیر: تو میں راستے سے ہٹ جاؤں گا۔

اعجاز: راستے سے ہٹنے کے بعد تمہارے دل پر کچھ نہیں گزرے گی؟

زبیر: کچھ بھی گزرے۔ کم سے کم میں وہ سہانے خواب تو نہیں دیکھوں گا جو اب دیکھ رہا ہوں۔

اعجاز: خواب دیکھنا یا نہ دیکھنا ایک الگ چیز ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے تمہیں جنسی لگاؤ اور محبت کے درمیان حدِ فاصل کے تعین میں دھوکہ ہوا ہے۔

زبیر: یعنی میں جنسی لگاؤ کو محبت سمجھ رہا ہوں۔

اعجاز: ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں یہ کہتے ہوئے میرے پاس استدلال بھی ہیں۔

زبیر: میں سمجھا نہیں۔

اعجاز: محبت کسی اقرار کی بھوکی نہیں ہوتی، اقرار — (ہنستا ہے) کار ابرائی کا وسیلہ بنتا ہے اور تم ... (وہ رک جاتا ہے)

زبیر: تم نے مجھے غلط سمجھا ہے

اعجاز: پھر مجھے سمجھاؤ تم اقرار کیوں چاہتے ہو۔

زبیر: تم جانتے ہو وہ خوبصورت ہے اور .....

اعجاز: اور کیا؟

زبیر: میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ .....

اعجاز: یعنی اس کا اقرار تمہارے احساسِ کمتری کو چھین لے گا۔

زبیر: ہاں

اعجاز: کیوں نہ تم اپنے معیار کو اونچا کرو تاکہ کمتری کا احساس خود بخود تم سے نکل جائے۔

زبیر: باتیں کرنا، مشورے دینا آسان ہے مگر عملی طور پر کوئی چیز کر گزرنا سہل نہیں۔ اس طرح تو تم بات کو اور الجھا رہے ہو۔

اعجاز: ٹھیک ہے۔ ثمینہ کے نقطۂ نظر سے سوچ رہا ہوں۔ اس نے اقرار کیوں نہیں کیا اس ایک سوال کے کئی جواب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ کسی اور میں دلچسپی لیتی ہوگی۔

زبیر: ایسی بات نہیں ہے

اعجاز: تم کیسے کہہ سکتے ہو؟

زبیر: میرا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزرتا ہے۔ اس کے ملنے جلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں۔

اعجاز: ہو سکتا ہے وہ عاشقی کو لغو سمجھتی ہو

زبیر: تو ایسی صورت میں اس نے مجھے اپنے اظہار پر ٹوک دیا ہوتا۔ اس کے برخلاف جب کبھی میں نے اظہار کیا وہ انجان سی رہی۔

اعجاز: یہ ایک عجیب بات ہے۔ اس کا اس طرح خاموش رہنا جستجو کو ہوا تو ضرور دیتا ہوگا۔

زبیر: ہاں یہ ایک کیس ہے اس کا تجزیہ تمہارے ذمے۔

اعجاز: اگر میں اس سے تمہاری سفارش کروں تو کیسی رہے؟

زبیر: اعجاز یہ کسی دفتر کی کلرکی تو ہے نہیں کہ سفارش سے مل جائے۔ دل کے معاملے میں سفارش کا کیا دخل؟

اعجاز: جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے افراد بھی دنیا میں ملتے ہیں جن کی پہلو دار شخصیت ہمارے لئے نافہم ہو کے رہ جاتی ہے۔ اب ثمینہ ہی کو لو۔۔۔ تمہارے اظہار کے بعد بھی اس کا چپ سادھ لینا کیا معنی خیز نہیں؟ نہ تو وہ تمہارے اظہار پر اپنے دل کی بات بتاتی ہے اور نہ تردید کرتی ہے۔ تحت الشعور میں کوئی بات ہو تو اُسے شعور میں لایا جاسکتا ہے چنانچہ اظہار اس عمل کا ذریعہ بنتا ہے۔

زبیر: شعور میں کوئی بات ہونے کے باوجود بھی ہم اس کا اظہار نہیں کرتے۔

اعجاز: تمہاری یہ بات بھی درست ہے اب کئی باتیں ہمارے شعور میں موجود ہوتی ہیں ہم شعور کی ساری باتوں کا اظہار کہاں کرتے ہیں؟

زبیر: پھر کیا کیا جائے؟

اعجاز: میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بعض تحت الشعور کی باتیں شعور میں کسی حادثہ کی بنا پر بھی آجاتی ہیں۔ حادثہ سے یہاں میرا مطلب دماغی جھٹکے سے ہے۔

زبیر: تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں اسے علاج کے لئے کسی نیورولوجسٹ کے یہاں لیجاؤں

اعجاز: میرا مطلب یہ نہیں

زبیر: پھر کس طرح دماغی جھٹکا دیا جاسکتا ہے؟

اعجاز: تمہاری محبت اس کا حصول تو فرور چاہتی ہوگی، ہے نا؟

زبیر: ہاں

اعجاز: تو پھر دل کی یہ آرزو بھی نکال لو اس کے لئے تمہیں دست درازی سے کام لینا پڑے گا۔

زبیر: اور نتیجہ الٹا نکلا تو۔۔۔؟

اعجاز: ابھی تم نے کہا تھا نا کہ تم ایسی صورت میں راستے سے ہٹ جاؤ گے۔

زبیر: مگر یہ سچویشن میری پیدا کردہ ہوگی۔

اعجاز: اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم عمل کرکے تو دیکھو۔

— دوسرا سین —

(تین دن بعد۔۔۔ وہی کمرہ ہے۔ زبیر کمرے میں تنہا ہے۔ کچھ دیر بعد اعجاز آتا ہے)

زبیر: یار بڑی راہ دکھائی

اعجاز: ہاں، آج معمول سے کچھ زیادہ ہی کام تھا۔

زبیر: تمہیں میرا انتظار رہا ہوگا۔

اعجاز: ہاں۔ میں تمام رات تمہارا انتظار کرتا رہا۔ یہ چہرے پہ خراشیں کیسی ہیں؟

زبیر: یہ خراشیں ثمینہ کے ناخنوں کی ہیں۔

اعجاز: اچھا۔ کیا رہا۔

زبیر: میں نے تمہارے مشورے پر عمل کیا۔ کچھ دیر تک وہ ہاتھا پائی کرتی رہی۔ اس نے چیخیں ماریں، کاٹ کھایا۔ مگر میرا تشدد کچھ اتنا زیادہ رہا کہ اُسے سوائے پذیرائی کے کوئی چارہ نہ تھا۔ میری حالت بالکل ایک وحشی کی سی تھی۔ بعد کو مجھے اپنے رویہ کا سخت افسوس رہا۔ اور ابتک میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔

اعجاز: آخر اس نے کہا کیا؟

زبیر: اس نے کہا کہ وہ تمام عمر میری صورت نہیں دیکھے گی اور یہ بھی کہا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور میرا مقام اس کے نزدیک ایک جاہل وحشی سے زیادہ نہیں ہے۔

اعجاز: اب تو تم نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ تمہارے تعلق سے اس کے کیا خیالات ہیں۔

زبیر: ہاں مجھے اس کے خیالات کا علم ہوگیا۔ وہ مجھ سے سخت نفرت کرتی ہے۔

اعجاز: وہ تمہیں چاہتی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔

زبیر: کچھ بھی ہو۔ میں یہاں نہیں رہوں گا پتہ نہیں کیوں مجھے اپنے آپ سے زیادہ تم پر غصہ آرہا ہے۔ نہ تم نے غلط مشورہ دیا ہوتا اور نہ یہ ساری باتیں ہوتیں۔ آج شام میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔

اعجاز: تمہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے میں خود چلا جاؤں گا بلکہ مجھے اسی وقت چلا جانا چاہیئے۔

(وہ اٹھتا ہے اور اپنا بستر باندھتا ہے۔ زبیر اس سے بے نیاز پلنگ پر نیم دراز ہے۔)

ایک تاثر

چاندنی رات میں مدھم سے ستاروں کا جمود
وقت کی پلکوں پہ مچلا ہوا آنسو ہے وجود
سنسناتی ہوئی منحوس خلاء کون و مکاں
سر تو بے جان فضا فرش سے تا کاہکشاں
ایک زنداں ہے کہ دروازہ نہ روزن جس میں

اور تنہائی، کہ ماحول کی گردن پہ سوار
ابھی کچھ اور بکھر، اور سنور جائے گی
وقت سے کھسکی ہوئی بوڑھی طوائف کی طرح
دل کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں کر لے گی سنگھار
پھر مری سمت اُٹھے گی نگہہِ داد طلب
جینے میں اس سے گریزاں تھا نہ جب اور نہ اب

نازش پرتابگڈھی

○

کے وی پٹیا

حمید الماس

ایک کنٹرا نظم

دندناتی ہوئی ریل غائب ہوئی
شور بھی مر چکا
پھر زمیں دوپہر کی سلگتی ہوئی دھوپ میں
تپ کے بے ہوش سی ہو گئی
یوں اچانک یہ منظر ابھر کر
نگاہوں سے اوجھل ہوا
نیند میں
جیسے دھرتی بُرے خواب کی سرگرانی سے
سہمی ہوئی ہے

راشد آذر

راز کی بات

یوں ملنا بھی کچھ ملنا ہے کوری صراحی کا پانی
جیسے پیاسے کو مل جائے خوشبو سونگھ نہ پائے
ملو تو ایسے گھل کر ملنا جیسے شام سے رات ملے
بات کرو تو ایسے کرنا جیسے جھالوں کا پندار
[illegible] ٹوٹ گیا ہو، راز بھی کوئی راز نہ ہو

○

اچھا اب یہ سب رہنے دو، آؤ سنائیں مطلب کی بات
[illegible] کتنے جسم چھوڑے ہیں، تم نے کتنے پیدا کئے

ہر اک مدت میں شکستہ آرزو کا گھر ٹپکتا تھا
ہمارے آسماں پر درد کا سورج چمکتا تھا

بند مٹھی میں کچھ یادوں کے جگنو جگمگاتے تھے
رگِ جاں میں کسی کے جسم کا شعلہ لپکتا تھا

وہاں بھی ہم تمہاری یاد سے غافل نہیں گزرے
جہاں رہ کر فرشتہ بھی خدا کو بھول سکتا تھا

خود اپنی ذات پہ ہم سو طرح کے ظلم ڈھاتے تھے
ہمارے صبر کا پیمانہ اندر ہی چھلکتا تھا

مظفرؔ سر بہ زانو، دم بخود بیٹھے رہے ہم تو
اِدھر یلغار لفظوں کی، اُدھر جذبہ ہمکتا تھا

ڈاکٹر مظفر حنفی

اس شان سے جیتا ہوں کوئی جی نہیں سکتا
لیکن یہ مری تشنہ لبی ساتھ رہے گی

دن آئے گا پگھلا کے چلا جائے گا چہرے
پھر رات میں اک برف کی دیوار اٹھے گی

کٹ جائیں گے احساس کے سوکھے ہوئے دھاگے
جھنکار سی اک سازِ تکلف سے اٹھے گی

ہاں اتنا بتا سکتے مجھے سوختہ ساماں
ہستی کو کبھی خاک ترے در کی ملے گی

جب شام کے منظر میں ہمر آئے گی نئی رات
اک ماتم کے منظر کو وہ ملبوس کرے گی

اسلم عمادی

رحمٰن جامی

(نذرِ سراج)

پڑ گئی ان کی نظر بے ساختہ
ہو گیا گھائل جگر بے ساختہ

آپ کیا آئے ادھر بے ساختہ
کھل گیا اس دل کا در بے ساختہ

حال میرا دیکھ کر بے ساختہ
جھک گئی اُن کی نظر بے ساختہ

اُن سے مل کر یہ مری آوارگی
آ گئی خود راہ پر بے ساختہ

حال اُن سے کہتے کہتے رو پڑا
بھر گیا غم کس قدر بے ساختہ

ظلم ڈھا کر آپ جس جانب چلے
چل پڑی دنیا اُدھر بے ساختہ

اُن کو میں رحمٰن جیسے بارہا
یاد آیا بھول کر بے ساختہ

بھارت چند کھنہ

ڈاکٹر زورؔ : دو واقعات

ڈاکٹر زورؔ کے بارے میں، ان کے فن بلکہ فنون، اُردو سے والہانہ محبت، کام کرنے اور کام لینے کی صلاحیت، تحقیق و تنقید کے کارنامے اور تادمِ آخر اُردو کے فروغ کے لئے ہمہ تن کوششیں، اُن کی صفات اور کارہائے نمایاں کا ذکر مجھ سے پہلے حیدرآباد کے دانشور انتہائی خوبی سے کرچکے ہیں ان کے بعد اسی موضوع پر میرے لئے مزید کچھ اور کہنا بالکل غیر ضروری ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے کام، مقام اور اُن کی عظمت کے تعلق سے جو کچھ بھی اب تک سُنا ہے مجھے اُس سے پورا پورا اتفاق ہے۔

البتہ ڈاکٹر صاحب کے بارے میں دو واقعات جن کا تعلق راست مجھ سے ہے آپکی اطلاع کے لئے عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔ گو اُردو ادب کے میدان میں موصوف کی زندگی میں حیدرآباد میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو انکے کارناموں سے واقف نہ ہو، مگر میرے جیسے چند لوگ ایسے بھی تھے جنکی رسائی اُن تک نہیں ہوسکی تھی۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب موصوف چادر گھاٹ کالج کے پرنسپل تھے اور میں حکومت کے محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن میں ڈپٹی سکریٹری تھا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ چونکہ اُٹھایا تو اُدھر سے آواز آئی "کیا کھنہ صاحب بات کر رہے ہیں۔ جب میں نے "جی ہاں" کہا تو آواز آئی "میں ڈاکٹر زورؔ ہوں" میں نے کہا "زہے نصیب کہ مجھے آپ سے گفتگو کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے" کہنے لگے "تم نے جو ڈرامہ "آئیٹ بانس بریلی" لکھا ہے مجھے اُس کا مسودہ درکار ہے ہمارے کالج کے لڑکے اسٹیج کرنا چاہتے ہیں" میں نے عرض کیا کہ میرے پاس اُس کی صرف ایک کاپی رہ گئی ہے جو جناب کی خدمت میں بھیج رہا ہوں مگر اس اُمید کے ساتھ کہ بعد استعمال مجھے واپس کر دیا جائے گا"۔ موصوف نے فرمایا کہ "میں اس بارے میں کوئی شک دل میں نہ رکھوں"

اس گفتگو کے کچھ دن بعد موصوف بنفس نفیس "جی۔ اے۔ ڈی" کے دفتر میں تشریف لے آئے۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا جسے انھوں نے یہ کہکر مجھے دیدیا کہ وہ بارہ کاپیاں "آئیٹ بانس بریلی" کے مسودہ کی لے آئے ہیں تاکہ آئندہ کسی کے مانگنے پر مسودہ دینے میں دشواری پیش نہ آئے۔ بارہ عدد صاف ستھری سائیکلو سٹائیل کی ہوئی مسودے کی کاپیاں جن کے ٹائپ میں ایک بھی غلطی نہ تھی!

میں بوکھلا سا گیا۔ میرا تجربہ اس بارے میں یہ تھا کہ جو کوئی بھی مسودہ واپس کرنے کا وعدہ کرکے لے جاتا مسودہ حاصل کرتے ہی اپنا وعدہ بھول جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس عنایت کا جس طرح بن پڑا میں نے شکریہ ادا کیا۔

موصوف جانے کے لئے کرسی سے اُٹھے مگر کچھ سوچ کر پھر بیٹھ گئے اور فرمایا "ایک بات اور ہے کیا

تمہارے پاس اپنے مضامین کے مسودے ہیں؟
جب میں نے جواباً "جی ہاں" کہا تو کہنے لگے کہ ان کو کتاب کی شکل میں چھپواتے کیوں نہیں۔" میں نے عرض کیا کہ کسی ناشر نے اس بارے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ یہ سن کر ڈاکٹر زورؔ نے فرمایا کہ وہ یہ کام خود کر دیں گے۔ جیسے ہی میں ان کو مسودے فراہم کر دوں گا وہ ان کی کتابت شروع کروا دیں گے۔ اور بہت جلد میری نئی کتاب شائع ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں نے اپنے غیر مطبوعہ مضامین بھیج دیئے۔
موصوف نے اپنی نگرانی میں ان کی کتابت کروائی اور ذرہ نوازی کرتے ہوئے نہایت عمدہ پیش لفظ بھی لکھا یہ نہایت عمدہ اس لئے بھی تھا کہ موصوف نے خاکسار کی تحریرات کو سراہا تھا۔ مجھے "کھلنڈرے ادیب" کے لقب سے سرفراز کیا تھا۔ الغرض میری تیسری کتاب "ٹھنڈی بجلیاں" کے نام سے چھپی اور اس کتاب کی رسم اجراء ڈاکٹر صاحب نے مرحوم سنجیوّیا صاحب جو اس وقت چیف منسٹر آندھرا پردیش تھے کے ہاتھوں گولکنڈہ کے مقبروں میں منعقدہ "یوم قلی قطب شاہ" کے افتتاحی جلسے میں کرائی۔
اردو کے فروغ کی لگن ڈاکٹر زورؔ کے دل میں ہر وقت رہی۔ مذکورہ بالا دو واقعات سے عیاں ہے اور اسی چیز کو ثابت کرنے کے لئے خاکسار نے ان واقعات کی تفصیل آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کی میں دعا کے ساتھ متوقع ہوں کہ خالق نے مرحوم کو جنت میں اردو زبان کی تحقیق و ترویج کا کام عطا کیا ہوگا۔
(صدارتی تقریر یوم زورؔ ۱۹۷۷ء)

قرار دادِ تعزیت

(جناب سید ہاشم علی اختر (معتمد اعزازی ادارہ) نے یوم زورؔ کے اجلاس میں مندرجہ ذیل قرار دادِ تعزیت پیش کی۔ جسے حاضرین نے دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ منظور کیا)

یوم زورؔ کا اجلاس نامور عثمانین ڈاکٹر مصلح الدین صدیقی، جناب جی ایم خاں اور جناب محمد عمر مہاجر کی وفیات حسرت آیات پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔
ڈاکٹر مصلح الدین صدیقی کا تعلق مختلف علمی و ادبی انجمنوں سے رہا ہے، وہ عرصہ تک ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ افضال کے معتمد رہے سرسید اور اقبالیات پر ڈاکٹر صدیقی کے مقالے ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی ایسے موضوعات پر راست نظر تھی۔
جناب جی ایم خاں فرزندانِ جامعہ عثمانیہ میں نمایاں شخصیت کے حامل تھے، اردو املا کو آسان اور صوتیاتی طریق اظہار عطا کرنے میں اپنے ادبی ماہنامہ "ہندوستانی ادب" کے ذریعہ نصف صدی تک بے لوث خدمات انجام دیں۔ خان صاحب مرحوم مخصوص حیدرآبادی ترجمے کے فن سے واقف اور قوم پرست ہندوستانی صحافی تھے وہ اپنے اصول اور نظریات کے پکے اور دھن کے پکے تھے آخر تک اسی وضع پر قائم رہے۔
جناب محمد عمر مہاجر عثمانین اور حال کے شعرا میں معتبر ادیب اور سنجیدہ شاعر تھے عرصہ ہوا پاکستان منتقل ہو چکے اور وہاں ان کے شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔ اجلاس ان کی وفیات پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتے ہوئے مغفرت کی دعا کرتا ہے اور پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ہاشم امیر علی

زورؔ صاحب کی یاد

(یومِ زورؔ کا اختتامی تقریر)

خواتین و حضرات!

پورے دو گھنٹے ہم سب زورؔ صاحب مرحوم کے ادبی خدمات کی یاد تازہ کرتے رہے۔ اور دکن کی ثقافتی تاریخ پر جو ضیاء انھوں نے ڈالی ہے اس سے اپنے احساسات کو گرماتے رہے۔ تقریباً ہر قابل مقرر اور شاعر نے ان کی خدمات کو سراہا اور واقعہ بھی ہے کہ مرحوم نے اُس دَور میں دکھنی تہذیب و ثقافت کی وکالت کا بیڑا اُٹھایا تھا جب پورے ب کی دو صد سالہ سیاسی پیشوائی نے ہم دکھنیوں کے ادبی حوصلہ کو پست کر دیا تھا۔ مرحوم کی کاوشوں اور ساتھیوں کو جگانے کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ادیبوں کے کندھے دوبارہ سیدھے ہوئے اور اُردو زبان کی تاریخ اور ارتقاء میں دکن کا حصہ بھی اُجاگر ہوا۔

کافی دیر ہو چکی ہے۔ ان قابل مقررین کے روشنی انداز مقالوں کے بارے میں مجھے زیادہ کہنا بھی نہیں ہے۔ جس انہماک، خاموشی اور دلبستگی سے آپ نے ان تقاریر اور نظموں کو سُنا ہے اس سے بہتر خراجِ تحسین پیش کرنا مشکل ہے۔ واقعہ ہے کہ اِن کا دَور ایسا تھا جس میں سے

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تاہم "سب رس" کا وجود اور خود اس "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کی شاندار بقاء ہمیں یاد دلانے کے لئے کافی ہیں کہ چالیس سال گذر جانے کے بعد بھی زورؔ صاحب مرحوم کی ادبی سلسلہ جنبانی جاری ہے اور آج بھی ہم لوگ دو گھنٹے تک زورؔ صاحب کے ادبی کارناموں کی یاد تازہ کر کے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

زورؔ صاحب کی یاد تازہ کرنے میں میرا آپ کو مخاطب کرنا محض اتفاقی اعزاز ہے لیکن میں نے اس کو اپنا فرض جانا اس لئے کہ چالیس سال قبل انھوں نے اس ادارہ کے کتب خانہ کی خدمت میں مجھے بھی کسی حد تک مربوط کیا تھا اور قرآن مجید کے اُردو ترجموں کو جمع کرنے کی مہم کے علاوہ اس موضوع پر ایک مضمون بھی مرتب کرنے کی ترغیب دی تھی۔ خدا مرحوم کو غریقِ رحمت رکھے اور اس ادارۂ ادبیاتِ اُردو کو تا دیر اُردو اور دکن کی ثقافت کی خدمت کرنے کا موقع دے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر

ڈاکٹر زورؔ کی تحقیقی کاوشیں

ڈاکٹر زورؔ ایک ممتاز ماہرِ لسانیات، ایک اچھے نقاد اور خوش گو شاعر ہی نہیں ایک بلند پایہ محقق بھی تھے ڈاکٹر زورؔ کی تحقیقی کاوشیں ان کے رچے ہوئے تاریخی اور ادبی شعور کی ترجمان ہیں۔ سرزمین دکن سے زورؔ صاحب کی والہانہ وابستگی نے انھیں اُردو کے اس قدیم اور اہم مرکز کے ادب پاروں کی بازیافت کی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم ڈاکٹر زورؔ کی تحقیقی مساعی کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یوں تو بہمنی اور عادل شاہی دور کی ادبی شخصیتوں کو بھی گوشۂ گمنامی سے باہر نکالا اور نئی نسل سے ان کے فن کو متعارف کروایا ہے لیکن ڈاکٹر زورؔ کی بہترین تحقیقی صلاحیتوں، ان کی ذہانت و بصیرت اور جگر کاوی و ریاضت کا بھرپور اظہار ان ادبی تحقیقات میں نظر آتا ہے جو قطب شاہی دور سے متعلق ہیں اس کا ایک نفسیاتی اور تاریخی سبب بھی تھا جس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اٹھارویں صدی کی پہلی دہائی میں مغلیہ سلطنت کی سالمیت کا شیرازہ بکھرنے لگا تھا اور چھوٹی چھوٹی خود مختار سلطنتیں جو معاشی اور اقتصادی اعتبار سے خود مکتفی تھیں، آزاد سیاسی اکائیاں بن چکی تھیں۔ انھیں بعض مورخوں نے قومی مرکزیت کے تصور کے پیشِ نظر محض سیاسی مفروضات سے بھی تعبیر کیا ہے۔

ہندوستان کے دوسرے تہذیبی مراکز کی طرح حیدرآباد میں بھی ثقافتی اور معاشرتی روایات کا ایک تاریخی سلسلہ موجود تھا۔ یہ تہذیبی وحدت ماضی میں اپنی روایات کا تسلسل قطب شاہیوں کے گولکنڈہ میں تلاش کرتی تھی۔ تاریخی اعتبار سے اس کی وجہ یہ تھی کہ تسخیرِ گولکنڈہ کے بعد دکن میں مغل اپنا تہذیبی اثر و رسوخ پیدا بھی نہ کرسکے تھے کہ شمال میں ان کی شہنشاہیت کا چراغ انقلاب کی آندھیوں سے بجھنے لگا۔ مغلوں کے جانشین آصف جاہی حکمران خود دکن میں مقبولیت حاصل کرنے قطب شاہی روایات کی پذیرائی کے قائل تھے۔ دکنیوں کو قطب شاہی تہذیب سے اس لئے مفاہمت اور محبت و عقیدت تھی کہ یہ تہذیب ان کی سماجی زندگی کا ایک جزو بن چکی تھی اور اس کا نفسیاتی اور اخلاقی اثر سالہا سال سے یہاں برابر قائم تھا جس ثقافتی وحدت کو دکنی تہذیب کہا گیا ہے وہ دراصل مغل تہذیب سے دوری اور انحراف و تردید اور قطب شاہی تہذیب کی روایات کی پاسداری کے رجحانات کی ترجمانی تھی۔ ڈاکٹر زورؔ کے ادبی شعور کی نشو نما اسی دکنی تہذیب کے گہوارے میں ہوئی اس کا نفسیاتی اثر اس طرح بھی ظاہر ہوا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ نے اُس تہذیب کو جو قطب شاہی سرچشموں سے سیراب ہوئی تھا اور جس کا ایک اہم عنصر دکنی زبان بھی تھی، اپنی توجہ کا مرکز بنالیا ہے اُردوئے قدیم کی بازیافت کی مہم میں ڈاکٹر زورؔ تمام عمر بڑے خلوص، درد مندی اور لگن کے ساتھ مصروف رہے اس کا ایک مقصد یہ ثابت کرنا بھی تھا کہ شمال میں جس زبان کو

"ایک بات لچر سی بزبان دکنی" کہا گیا تھا وہ علم و ادب کے انمول خزانوں سے مالا مال تھی جس نے ایسے شاعر اور ادیب پیدا کئے تھے جن کی تخلیقات نے اردو ادب کو سربلند و سرافراز کر دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی تحقیقات نے اردو ادب کی تاریخ کو تین چار صدی آگے بڑھا دیا۔ دکنی ادبیات کی بازآفرینی محض چند شعری مجموعوں یا نثری کارناموں کا احیاء نہیں بلکہ ان کے ذریعہ سے ایک پوری تہذیب کو زندگیٔ جدید اور ایک مکمل ثقافتی دور کو حیاتِ نو عطا کی گئی ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے حیدرآباد میں علوم و فنون کا نشاۃ ثانیہ عمل میں آیا تھا اس درسگاہ کے جن سپوتوں نے علم و ادب اور تحقیق و تدقیق کے میدان میں زندۂ جاوید کارنامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں ان میں ڈاکٹر زورؔ کا نام سرفہرست نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی خدمات کے ذریعہ سے اہلِ دکن کی لسانی خود اعتمادی کو بحال کرنے کی کوشش کی اور ان میں یہ احساس بھی پیدا کیا کہ اُن کی زبان کا سلسلہ ایک وقیع اور قابلِ فخر ادبی سرمائے اور لسانی سرچشمے سے جا ملتا ہے۔ انھوں نے نہ صرف قطب شاہی عہد کی گنگا جمنی تہذیب اور اس سرزمین کی عظمتِ رفتہ کو بے نقاب کیا بلکہ یہاں کے عظیم شہ پاروں کو منظر عام پر لا کر دکنی زبان و ادب کی کھوئی ہوئی ساکھ دوبارہ قائم کی۔ ڈاکٹر زورؔ نے ایسے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو دوبارہ زندگی بخشی جن کے کارنامے "نقش و نگارِ طاقِ نسیاں" بن چکے تھے اور ڈاکٹر زورؔ دکنی ادب کی بازیافت کو ایک تحریک اور ایک مہم نہ بنا لیتے تو ادب کے ان گوشوں کے درخشندہ کارنامے سے مرورِ زمانہ کی گرد و غبار میں ہمیشہ کے لئے نظروں سے اوجھل ہوجاتے ڈاکٹر زورؔ کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس نے ان کے نام کو اُردو زبان کی تاریخ میں لافانی بنا دیا ہے۔ انھوں نے نئی نسل میں اپنے تہذیبی اور ادبی کارناموں پر ناز کرنے کا جذبہ پیدا کیا اور اسی جذبے سے سرشار ہوکر آج حیدرآباد میں نئی نسل کے محققین بھی دکنی ادب کے قدیم کارناموں سے دلچسپی لے رہے ہیں۔

تحقیق ایک صبر آزما اور مشکل فن ہے اس میں جذبے کی لطافت و رنگینی اور تخیل کی حنابندی یا طرزِ ادا کی پرکاری پر قناعت نہیں کی جاسکتی۔ یہ بڑی دیدہ ریزی زہرہ گذاری اور ریاضت و مشقّت کا کام ہے اس کے آداب کو ملحوظ رکھنا اور اس سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ زورؔ صاحب ایک ایسے کوہ کن تھے جنھوں نے تاریخ کی چٹانوں کا سینہ چاک کر کے جوئے شیر لائی اور اردو کے چمن کی آبیاری کی۔

ڈاکٹر زورؔ نے "حیات میر مومن" "کلیات محمد قلی قطب شاہ" "اردو شہ پارے" "دکنی ادب کی تاریخ" اور "طالب و موہنی" جیسی محققانہ تصانیف لکھ کر ایک بھولے ہوئے تمدّن کی یاد تازہ کی اور "فردوسِ گم گشتہ" کا پتہ چلایا ہے۔ کلیات محمد قلی قطب شاہ کا مقدمہ یہ بتاتا ہے کہ قاری کو سینکڑوں سال قبل کے ماحول میں ایک سچے فنکار کا جادو ہی پہنچا سکتا ہے۔ کلیات کے مقدمے میں مرتب نے گولکنڈے کے پانچویں فرماں روا اور بانیٔ شہر حیدرآباد کے عہد کی زندہ اور متحرک تصویریں پیش کر دی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر زورؔ محمد قلی قطب شاہ کا ذکر کرنے والے پہلے مصنف نہیں تھے لیکن انھوں نے اس عظیم شاعر کے واقعاتِ زندگی اور اس کے کلام پر پہلی مرتبہ محققانہ شان کے ساتھ نظر ڈالی ہے۔

تحقیق اپنے موضوع سے انصاف چاہتی ہے وہ مواد کو سلیقے سے اکٹھا کرنے اس کی صحیح جانچ پڑتال، اسناد کی صداقت اور چھان بین، تقابل، ردّ و قدح اور تنقیدی شعور کی محتاج ہے۔ ڈاکٹر زورؔ ایک مسلمہ محقق ہی نہیں ایک

باذوق نقاد بھی تھے ۔ اسلئے اُن کی تحقیقی کاوشیں ادبی اعتبار سے بلند مرتبہ اور وقیع ہیں ۔ انھوں نے تحقیق اور تدوین کے اُن اُصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے مختلف مخطوطات کی ایڈیٹنگ کی تھی جو اس زمانے میں رائج و مقبول تھے ۔ آج تحقیق کا معیار اور انداز دونوں بدل گئے ہیں ۔ متن کی ترتیب کے جدید اصولوں کی روشنی میں ڈاکٹر زورؔ کی تصانیف میں کہیں کہیں کوتاہیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ آنے والی نسل کے قاری اور محقق کے لئے اُنھوں نے بڑی جانفشانی اور ادبی ذکاوت کے ساتھ ضروری مواد اکٹھا کر دیا ہے ۔

ڈاکٹر زورؔ نے محمد قلی قطب شاہ کے حالاتِ زندگی اور دوسرے ثقافتی اور تاریخی اُمور پر روشنی ڈالتے ہوئے اکثر جگہ ابوالقاسم فرشتہ کے بیانات کو بنیاد بنایا ہے ۔ فرشتہ کی تاریخ دانی پر شُبہ نہیں کیا جاسکتا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک ایسا مورخ ہے جو تاریخ نویسی میں ہر ماخذ سے حاصل ہونے والی معلومات سے جن میں روایات اور افواہوں کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے، کام لینا چاہتا ہے ۔ فرشتے کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ اس نے تاریخ نویسی میں واقعات کی صلابت اور مستند ماخذوں پر اپنے تخیل کی بلند پروازی کو ترجیح دی ہے ۔ ہم فرشتے کی وسیع و ہمہ گیر معلومات اور اس کی قوتِ آخذہ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے لیکن تاریخ نویسی میں "بڑھا دیا ہے فقط زیب داستاں کے لئے" کا رجحان زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ تاریخ حق گوئی اور صداقت پسندی کی خواہاں ہوتی ہے ۔ دراصل فرشتے نے گولکنڈہ یا نئے بسائے ہوئے شہر حیدرآباد کی سرزمین پر کبھی قدم بھی نہیں رکھا تھا ۔ اس کی معلومات سماعی اور قیاسی تھیں ۔ حد یہ ہے کہ فرشتے محمد قلی قطب شاہ کے صحیح نام سے بھی ناواقف ہے ۔ ایسے مورخ کے بیانات کو در خورِ اعتنا سمجھنا زیادہ درست نہیں معلوم ہوتا ۔ "طالب و موہنی" تذکرہ مخطوطات کی مختلف جلدیں "گلزار ابراہیم" "عہد عثمانی میں اُردو کی ترقی" اور "اُردو شہ پارے" تحقیق میں ڈاکٹر زورؔ کی نکتہ رسی، سخن شناسی اور سلیقہ مندی کے شاہد ہیں، ایک محقق کی حیثیت سے ڈاکٹر زورؔ کا نام تاریخ ادب اُردو کے صفحات سے محو نہیں ہو سکے گا ۔

یادِ زورؔ

بانو طاہرہ سعید

وہ جو محفل میں نہیں ہیں تو ہے محفل ویراں ۔۔۔ لگ رہا ہے کہ خود "ایوان" کا ہے دل ویراں
اے صبا، پردۂ محمل نہ اُٹھا ظلم نہ کر ۔۔۔ یادِ ایام دلاتی ہے یہ محمل ویراں
اب بہاروں میں دھرا کیا ہے بجز ماتمِ گل ۔۔۔ رنگ بے رنگ ہوئے جب سے ہوا دل ویراں
ان کے ہمراہ گیا قافلۂ شعر و ادب ۔۔۔ ہو گئی نغمہ و آہنگ کی منزل ویراں

طاہرہ ان کی صدا، ان کی ادا، اُن کی نوا
ہو نہ محفل میں تو کیسے نہ ہو محفل ویراں

ڈاکٹر زور — چند تاثرات

پروفیسر محمود حسینی

وقت ہر درد کا درماں ہے۔ وقت ہر زخم کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جب زخم ہرے ہو جاتے ہیں اور دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب کی موت کا رنج بھی وقت کے گذرنے کے ساتھ کم ہو تا گیا لیکن جب کبھی کسی محفل میں ان کا ذکر آتا ہے یا کسی جلسہ میں ان سے متعلق کہا جاتا ہے تو یقیناً ان کے مداحوں اور پرستاروں کے دل سے ہوک سی اٹھتی ہو گی اور آنکھیں نم ہو جاتی ہوں گی۔ جن لوگوں نے ڈاکٹر زور صاحب کو چلتے پھرتے ہنستے بولتے نہیں دیکھا ان کے سامنے جب وہ ان کا تصور کرتے ہوں گے زیادہ سے زیادہ وہی تصویر ابھرتی ہو گی جسے انہوں نے کسی اخبار میں، کسی رسالے میں چھپی یا کسی دیوار پر ٹنگے دیکھا ہو گا لیکن جن لوگوں نے برسوں انہیں دیکھا اور ان کے ساتھ کام کیا ہے ان کی نظروں کے سامنے یقیناً ڈاکٹر صاحب کی پُر وقار شخصیت زندگی سے بھرپور قہقہہ لگاتے یا بڑی سنجیدگی سے پیشانی سہلاتے آنکھیں بند کیے آہستہ آہستہ مخصوص علمی گفتگو کرتے ابھرتی ہو گی۔

میں نے ڈاکٹر زور صاحب سے جامعہ عثمانیہ میں چار سال تک اردو پڑھی ہے۔ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۷ء تک شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ میں اردو کے بڑے نامور اساتذہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر سید سجاد صاحب، پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور۔ مجھے ان سب سے تلمذ کا فخر حاصل ہے اساتذہ میں فرق کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے اور نہ یہ میرا مقصد ہے لیکن واقعہ کا اظہار بھی ضروری ہے۔ مجھے اس امر کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ مجھے سب سے زیادہ ڈاکٹر زور نے متاثر کیا۔

یہ صحیح ہے کہ اپنی پسند کے لئے کسی معقول وجہ کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ اکثر پسند کرنے والے کے زاویۂ نظر ہی کو ایسی صورت میں زیادہ دخل ہوتا ہے پھر بھی اپنی پسند کی ایک نمایاں وجہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ مجھے ان دنوں ڈاکٹر زور کی جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ تھی ان کی اردو سے محبت۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اردو کی محبت کا ایک اتھاہ سمندر تھا جو ان کے دل میں ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا کبھی یہ سمندر نہایت پُرسکون رہتا تھا اور کبھی اس میں ایسے طوفان اٹھتے تھے کہ اس کے سامنے پہاڑوں کے قدم اکھڑتے نظر آتے۔

اردو کی محبت ہی نے ڈاکٹر زور صاحب کو اس کے قدیم روپ دکنی سے محبت کرنا سکھایا۔ اس میدان میں تحقیق و تشریح کا کام کم ہوا تھا بہت کم لوگوں کو دکنی ادب سے دلچسپی تھی۔ نہ صرف یہ کہ دکن میں اردو کی جو خدمت قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہوں کے زمانے میں ہوئی تھی اس سے لوگ واقف نہیں تھے بلکہ خود آصف جاہی دور میں جامعہ عثمانیہ

کے توسط سے جو کام یہاں ہو رہا تھا اس کو بعض لوگ شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور بعض تو زیر لب مسکرا اس طرح منہ موڑ لیتے تھے جیسے کہ کھلا طنز! انہیں مناسب نہیں معلوم ہوتا یہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ہی نہیں بلکہ عام اردو بولنے والوں سے اس طرح کا برتاؤ کیا جاتا تھا جیسے کسی غیر مہربان حکومت میں دوسرے درجہ کے شہریوں سے کیا جاتا ہے۔ محبت میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب رقابت کی آگ شدت سے بھڑک اٹھتی ہے اور نرم دل سے نرم دل عاشق بھی فدویت کو برخواست کر کے فدائیت پر اتر آتا ہے۔ ایسی ہی جرأت، ایسی ہی ہمت ایسے ہی نڈر پن اور بے باکی کا مظاہرہ ڈاکٹر زورؔ نے اس وقت کیا جب انہوں نے ادارۂ ادبیات اردو کی بنا ڈالی اور بڑی پامردی اور استقلال سے انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے جن میں پروفیسر سروری، پروفیسر سید محمد، نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر عبدالمجید صدیقی نمایاں تھے۔ اس ادارے کو پروان چڑھایا اور اپنی زندگی ہی میں اسے اس درجہ کو پہنچا دیا کہ وہ ہندوستان کے چوٹی کے لسانی و ادبی اداروں میں سمجھا جانے لگا۔

یہ اردو کی محبت کا ہی ایک پہلو تھا کہ ڈاکٹر زورؔ صاحب نے دکنی کو چاہا تو جہاں یہ زبان پھولی پھلی اس دیس کو بھی چاہا اور اس کے بسنے والوں سے بھی محبت کی۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان بادشاہ شاعر محمد قلی قطب شاہ کو بھی چاہا اور اس کی چہیتی بھاگ متی کے نام پر بسائے جانے والے شہر کو بھی دل و جان سے پسند کیا۔ ڈاکٹر جانسن نے بھی انگلستان اور خصوصیت سے لندن سے کچھ ایسی ہی محبت کی تھی جتنی کہ ڈاکٹر زورؔ کو دکن سے اور خصوصیت سے شہر حیدرآباد سے تھی۔

جامعہ عثمانیہ سے ڈاکٹر زورؔ کو جو محبت تھی وہ صرف اس لئے نہیں تھی کہ وہ ان کی مادر علمی تھی اور وہ اس کے شعبۂ اردو سے ابتدا ہی سے متعلق رہے تھے بلکہ اس لئے بھی کہ جامعہ عثمانیہ اردو کی خدمت کا بہت بڑا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ قطب شاہوں کے زمانہ میں انہوں نے اگر اردو کو شعر و شاعری کی زبان بنا دیا تھا تو جامعۂ عثمانیہ نے اس کو علم اور سائنس کی زبان بنا دیا۔ ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک ملکی زبان کو جامعہ کی اعلیٰ ترین ڈگریوں کی تعلیم کا ذریعہ بنانے کی کامیاب کوشش کی گئی تھی۔ اور اس میں سائنس، طب، قانون، انجینئرنگ، معاشیات، عمرانیات اور دوسرے تمام مضامین اور فنون کی تعلیم دی جانے لگی۔ آصف جاہی حکومت نے اردو کو انتظام مملکت اور عدالت کی زبان بنا دیا غرض وہ سب کچھ کیا گیا جو اس سے پہلے اس زبان کے لئے نہ کہیں کیا گیا تھا اور نہ کبھی ہوا تھا۔ مرحوم قاضی محمد حسین صاحب پرو وائس چانسلر کے الفاظ میں "علم غیر زبانوں میں مقید تھا یہاں آزاد کیا گیا"۔

ڈاکٹر زورؔ کو جامعہ عثمانیہ کے سپوتوں سے بھی بڑی محبت تھی وہ ان کے علمی کارناموں پر ہمیشہ خوش ہوتے تھے اور ان کی عزت و ناموری کو ملک و مادر علمی کے لئے ناموری کا باعث سمجھتے تھے وہ اردو کے طلباء میں اردو کی خدمت کا جذبہ پیدا کرتے تھے۔ ان کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھار کر تے اور ان کا دل کچھ اس طرح بڑھاتے کہ ان میں شوق پیدا ہو جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے شاگردوں نے بڑا نام کیا اور مقام بھی۔ مخدومؔ و میر حسن، میکش و صمد رضوی ساز، ڈاکٹر زورؔ کے شاگرد تھے۔ اس دور کے اردو کے مشہور اساتذہ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ ہوں کہ ڈاکٹر زینت ساجدہ، ڈاکٹر حفیظ قتیل ہوں کہ پروفیسر اکبرالدین صدیقی۔ ان سبھوں نے ڈاکٹر زورؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کی ہے۔ محبت کی اس شمع نے اور کتنے شمعوں کو

روشن کر رکھا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کے ایک چہیتے شاگرد خواجہ حمید الدین شاہد نے پاکستان میں یہ شمع جلا رکھی ہے
جو حال حال تک وہ اردو ترقی بورڈ سے منسلک تھے۔ ان کا اپنا مکان "ایوانِ اردو" کہلاتا ہے ڈاکٹر زورؔ کی اپنے ان شاگردوں سے محبت
شخصی وجوہ سے زیادہ اس بناء پر تھی کہ ان سب کے دل میں اُردو کی لگن تھی اور جس نے اُردو کو چاہا اس کو ڈاکٹر زورؔ کیسے نہ چاہتے۔
ادارۂ ادبیات اُردو کے لئے جب "ایوانِ اردو" بنانے کا وقت اور موقع آیا تو انہوں نے اپنی بیگم صاحبہ سے کہہ کر اس کے لئے زمین بطور
نذرانہ دلوادی۔ جس محنت اور دلچسپی سے اس کے لئے انہوں نے روپیہ جمع کیا اور جس لگن سے اپنی شخصی نگرانی میں اس عمارت کو بنوایا
اس سے وہ لوگ بخوبی واقف ہیں جنھوں نے انہیں دھوپ میں چھتری اور لگا کر کھڑے کام کی نگرانی کرتے دیکھا ہے۔ ایوانِ اردو
کے سجانے، اس کی دیواروں پر تصویریں لگانے، اس کے کتب خانے میں کتابیں جمانے میں جس ذاتی دلچسپی کا اظہار انہوں نے کیا اس سے
ان کی اس عمارت سے، اس کتب خانے سے نہیں بلکہ اُردو سے محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی نیا اور اہم مہمان آجاتا تو اس کو جس
دلچسپی سے وہ ادارہ کی کتابوں، مخطوطات اور دیگر نادرات کو بتلاتے تھے اتنی ہی دلچسپی سے وہ ہر اس شخص کو بھی ان چیزوں کو
بتلاتے تھے جو ذرا سی بھی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ان کے چہرے پر حقیقی مسرت کی لہریں دوڑ جاتیں جب کوئی ان سے یہ کہتا کہ ادارے
کے کتب خانہ سے ہزاروں طالبانِ علم اور ادبی محقق و متجسس کے جو یا اب تک فائدہ اُٹھا چکے ہیں اور ان گنت لوگ آئندہ بھی اُٹھائیں
گے۔ انہیں اس تصور سے دلی خوشی ہوتی تھی کہ ان کے بنائے ہوئے ادارے کی خدمت سے اُردو بولنے پڑھنے اور لکھنے والوں کو واقعتاً
فائدہ پہنچ رہا تھا۔

تعلیم بالغان کے مدارس اور اُردو دانی، اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات ڈاکٹر زورؔ کی ان کوششوں کا نتیجہ ہیں کہ جہاں
تک ہو سکے عوام اُردو سیکھیں، بولیں، پڑھیں اور لکھیں۔ وہ اس نظریہ کے حامی تھے کہ زبان کو جغرافی حدود میں بند نہیں کیا جا سکتا
صرف کسی خاص خطے کے بسنے والوں کو اہلِ زبان نہیں کہا جا سکتا۔ اہلِ زبان وہ ہے جو اس زبان کو بولتا ہو سمجھتا ہو، لکھتا ہو اور
پڑھتا ہو۔ اسی خیال کا انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے اُردو کے پروفیسر کی حیثیت سے اپنے طلباء میں پرچار کیا تھا۔ اس سے ان کی اس
خواہش کا اظہار ہوتا تھا کہ اُردو زبان ہندستان کی عام زبان بنے اور وہ ہمالہ سے نیلگری کی پہاڑیوں تک، آسام کے گھنے جنگلوں سے
کچھ کے دلدلوں تک بولی اور سمجھی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی خاص خطے یا شہر کی زبان پر اجارہ داری کے خلاف تھے۔ ممکن ہے اسی بناء
پر انہیں اس زمانہ کے بعض اساتذہ سے اختلاف رائے رہا ہو اور لوگوں نے اُس کو شعبۂ اُردو کے لامتناہی جھگڑوں کا رنگ دے دیا ہو۔

اُردو کی حمایت میں ڈاکٹر صاحب اکثر و بیشتر بہت بے لوث بولتے تھے وہ دوسرے معاملات میں مصلحت کو شعار بناتے
ہوں تو ہوں لیکن جہاں اُردو زبان کی بہبودی یا اس کے بقاء کا سوال پیدا ہو جاتا تھا تو وہ اصول کے خلاف کبھی سمجھوتے کو گوارا
نہیں کرتے تھے۔ شاید ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کا ذکر ہے کہ ٹرپونڈرم میں ہندستان کی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کی کانفرنس
ہوئی تھی۔ پہلا اجلاس پنڈت نہرو کی صدارت میں ہوا تھا اس میں ڈاکٹر زورؔ صاحب نے بھی اپنی ایک انگریزی میں لکھی ہوئی
تقریر پڑھی تھی۔ حسب بے باکی اور نڈر پن سے انہوں نے حکومت کی پالیسی پر تنقید کی تھی اور دوسری زبانوں کی رقمی امداد کے مقابلے
میں اُردو کے حصہ میں آنے والے صرف میٹھے میٹھے بولوں کا کچھ اس تلخ انداز میں تذکرہ کیا تھا کہ لہجہ کی تندی اور الفاظ کی ترشی کے
باوجود پنڈت نہرو نے اس تقریر کو بہت سراہا تھا۔ ایک پارسی خاتون نے جو اس کانفرنس کی سکریٹری تھیں بعد میں ڈاکٹر زور صاحب

کو خط لکھا تھا جس میں پنڈت جی کے ان کی اس تقریر سے متعلق خیالات کا اظہار تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے سکریٹری نے خواہش کی تھی کہ وہ اپنی تقریر کی روئداد کا بیان ٹائپ کروا کر بھجوائیں تاکہ ایک اشاعت کے لئے رکھ لی جائے اور دوسری پنڈت جی کے پاس بھجوادی جائے۔ میں نے ڈاکٹر زور صاحب کو انگریزی میں تقریر کرتے اور پڑھتے بھی سنا ہے۔ وہ آہنگ دار آواز، صاف ستھرے لب و لہجہ اور اتنے ہی پُر اثر انداز میں انگریزی بولتے تھے جیسی کہ وہ اُردو بولتے تھے۔ خصوصی بات یہ ہے کہ بڑے اور صاحب اقتدار آدمیوں کے سامنے ان کا رنگ اور نکھر جاتا تھا۔ سر اکبر حیدری، سر سالار جنگ، نواب علی یاور جنگ، بخشی غلام محمد، شیخ عبداللہ جیسے لوگوں کے سامنے اردو اور ادارۂ ادبیات اردو سے متعلق تقریر کرتے جن لوگوں نے انہیں سنا ہے وہ گواہی دیں گے کہ ڈاکٹر زور صاحب ایسے مواقع پر جیسے کھل کھیلتے۔ اُردو کے حقوق کی نمائندگی اور اس کی بہبودی کے لئے مطالبات وہ کچھ اس مدلل طریقہ پر پیش کرتے تھے کہ سننے والوں کو ان کے بیان کی تصدیق کے سوا چارہ نہیں ہوتا تھا اور بہی خواہانِ اُردو کے لئے ان کے مطالبات کو مان لینے کے سوا کوئی اور متبادل راستہ باقی نہیں رہتا تھا۔ اس طرح انہوں نے حکومت حیدرآباد سے بھی اور حکومت ہند سے بھی ادارۂ ادبیاتِ اُردو اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے لئے جو ادارہ کے ایک ملحقہ ادارہ کی حیثیت سے شروع کیا گیا تھا معتدبہ رقمی امداد منظور کروائی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی خواہش یہی تھی کہ وہ حیدرآباد میں مریں اور یہیں دفن ہوں۔ چنانچہ انہوں نے خانقاہ عنایت اللّہی میں اپنے والد صاحب کی قبر کے بازو اپنے لئے بھی قبر بنوائی تھی لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اُردو ہی کی خدمت کے سلسلہ میں وہ کشمیر گئے تھے اور وہاں کی یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر کام کر رہے تھے کہ اچانک ان کا انتقال ہوگیا۔ اور حالات کچھ ایسے بنے کہ لاکھ چاہنے کے باوجود ان کی لاش حیدرآباد نہیں لائی جا سکی۔ موسم اتنا خراب تھا کہ بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعلیٰ کشمیر کی پوری کوشش کے باوجود فوجی ہوائی جہاز بھی نہ اُڑ سکے۔ مجبوراً ڈاکٹر زور صاحب کو وہیں سپرد خاک کر دینا پڑا۔ کون جانے اس میں بھی یہ مصلحت ہے کہ دکن کی سطح مرتفع سے طلوع ہونے والا یہ سورج شمالی کوہستانوں میں غروب ہو اور جنوب سے شمال تک اور شمال سے جنوب تک اُردو کی محبت کا یہ دریا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رواں دواں رہے۔

ڈاکٹر زورؔ چند یادیں

رمن راج سکسینہ

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم کے نام کے ساتھ ہی ذہن میں تین ذیلی سرخیاں اُبھر آتی ہیں۔ یعنی
۱۔ کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ   ۲۔ ہندوستانی لسانیات   ۳۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو
ڈاکٹر زورؔ کی شخصیت بڑی پہلو دار تھی۔ "سیرِ گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" میں وہ ایک ممتاز افسانہ نگار "روحِ تنقید" "تنقیدی مضامین" اور "اُردو شہ پارے" میں ایک عظیم تنقید نگار "حیاتِ میر مومن" "حیاتِ سلطان محمد قلی قطب شاہ" اور "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" میں وہ ایک بلند مقام مورخ نظر آتے ہیں۔
ڈاکٹر زورؔ کی تحقیق سے پہلے ولیؔ، اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر سمجھے جاتے تھے۔ خود ڈاکٹر زورؔ بھی ابتداءً میں اسی خیال کے حامی تھے۔ لیکن کتب خانہ سالار جنگ میں محمد قلی قطب شاہ کے کلیات کو ایک عرصہ تک مرتب کرنے کے بعد، وہ بڑے اعتماد کے ساتھ، اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کی حیثیت سے محمد قلی قطب شاہ کو متعارف کراسکے محمد قلی کے حالاتِ زندگی، معاشرتی اور سیاسی حالات اور غزلوں پر مشتمل ایک ہزار سے زائد صفحات کی ایک ضخیم کتاب مرتب کی، جو ۲۲۰ نظموں، ۳۱۲ غزلیات اور کئی قصاید، رباعیات، سلام اور مرثیوں پر مشتمل ہے
"ہندوستانی لسانیات کی تصنیف" ڈاکٹر زورؔ کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ اس کتاب کو بجا طور پر اُردو زبان میں لسانیات کے موضوع پر تحریر کردہ پہلی کتاب قرار دیا گیا ہے اور غالباً یہ اپنے موضوع پر اُردو زبان میں پہلی اور آخری کتاب ہے۔
ڈاکٹر زورؔ مرحوم نے "ادارۂ ادبیاتِ اُردو" کی صورت میں سب سے قیمتی تحفہ اہلِ ملک کو پیش کیا ہے۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہوں گے کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے کام اور ترقی کے متعلق ڈاکٹر زورؔ کس قدر فکر مند رہا کرتے تھے۔ ادارہ سے اپنی لگن کی وجہ سے وہ نہ صرف خود اپنے لئے کوئی قابلِ لحاظ سرمایہ جمع کر سکے اور نہ اپنی اولاد کی تعلیم کے لئے خاطر خواہ توجہ دے سکے۔
یہ سوال یقیناً اہم ہے کہ اس ادارہ کے قیام کی کیا ضرورت تھی؟؟ جبکہ انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد میں کل ہند اساس پر سرگرم عمل تھی۔ میں عرض کروں گا کہ اس زمانہ میں حیدرآباد کے معاشرتی حالات، اس بات کے سخت متقاضی تھے کہ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس زمانہ میں "دکنی" کا انتہائی حقارت کے ساتھ تذکرہ کیا جاتا تھا۔ کچھ لوگ ایسے تھے جو اہلِ زبان اور ماہرِ علم و ادب ہونے کا دعویٰ کررہے تھے اور "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" ان

کی زبان پر تھا۔

دکن کے لوگ تو محض "اجڈ" گنوار اور کھٹّے کے شائق سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے خیال میں دکنی نہ تو علم و ادب میں دخل رکھتے تھے اور نہ زبان و تہذیب سے ان کا کوئی سروکار تھا۔ اِن حالات میں جامعہ عثمانیہ میں جو "درآمد" شروع ہو گئی ہو دکنیوں میں احساسِ کمتری کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اِن حالات میں چند دکنی اصحاب نے ڈاکٹر زور کے ساتھ اس ادارہ کے قیام کا اعلان کیا۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد اردو زبان و ادب کا اچھا ذوق پیدا کرنا، نوجوانوں کو لکھنے پڑھنے کی جانب متوجہ کرنا، تاریخ، تمدن اور دکنی کلچر و آثار کی حفاظت کرنا اور ایک اچھے کتب خانہ کا قیام تھا جو حیدرآباد میں دکنی ادبیات کا تحقیقاتی مرکز بن سکے۔ ڈاکٹر زور کی محنت اور لگن سے اُن کی زندگی میں یہ تمام مقاصد بڑی حد تک پورے ہوئے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنے مشن کو کامیاب ہوتے ہوئے دیکھا ہو اس لحاظ سے، ڈاکٹر زور یقیناً خوش قسمت انسان تھے۔ ادارہ کی ترقی کے لیے انہوں نے خود کو سیاست سے ہمیشہ دور رکھا اور ہر دور میں اس ادارہ کی ترقی کے لیے مقتدر اصحاب سے بھرپور تعاون حاصل کیا۔ ایک تحقیقاتی اور ادبی ادارہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ سیاسی کشمکش سے اپنے کو بچائے رکھے۔

ادارہ نے دکنی تہذیب اور معاشرت کو روشناس کرانے کے لیے جو تحریکات شروع کیں۔ اُن میں "یومِ محمد قلی قطب شاہ" کا انعقاد ایک اہم کام تھا۔ یہ تقاریب کوئی میلہ یا دکھاوا نہیں ہیں بلکہ اِن تقاریب میں حیدرآباد کی قدیم معاشرت، یکجہتی، علم و ادب اور فنونِ لطیفہ سے عوام کو متعارف کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یہ تحریک اپنی اِفادیت کی بنا پر ریاست میں ایک تہذیبی جشن کی حیثیت اختیار کر رہی ہے۔ اِن تقاریب کی پسندیدگی کا اندازہ عوام کی اس کثیر تعداد سے ہو سکتا ہے جو ناکافی ذرائع آمد و رفت کے باوجود ہر سال گولکنڈہ کے مقام پر ہزارہا کی تعداد میں بڑی پابندی سے جمع ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کا نام میں نے پہلی بار اس وقت سُنا، جب کہ میری عمر بمشکل نو یا دس سال کی ہوگی۔ یہ غالباً ۱۹۳۱ء کا زمانہ تھا جب کہ ڈاکٹر زور یورپ سے واپس تشریف لائے تھے۔ گھر میں اکثر ڈاکٹر زور کا تذکرہ رہا کرتا تھا میں سوچتا تھا کہ ڈاکٹر زور کوئی جرمن یا انگریز ہوں گے اُس زمانہ میں ڈاکٹر زور کا نام کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا کیونکہ اکثر نام مولوی یا پنڈت کے القاب سے شروع ہوا کرتے تھے۔ حسابی اندازے سے یہ کوئی چالیس سال پُرانی بات ہے۔ لیکن یہ بات میرے ذہن میں کچھ اس طرح تازہ ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔

ڈاکٹر زور کو پہلی بار دُور سے دیکھنے کا موقع غالباً ۱۹۳۳ء میں ملا۔ حیدرآباد سے کوئی چھ میل دُور، اَتر پلی میں ہمارا اسکاؤٹ کیمپ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر زور، پروفیسر سروری کے ساتھ وہاں تشریف لائے۔ شہر سے دُور اُس پُر فضا ماحول میں کوئی مشکل ہی سے کہہ سکتا تھا کہ وہ یورپ سے آئے ہوئے عثمانیہ یونیورسٹی کے ننھے پروفیسر ہیں۔ وہی حیدرآبادی اندازِ گفتگو، وہی خوبی اور وہی سادگی۔

محترم ڈاکٹر چچا صاحب قبلہ (ڈاکٹر رگھو نندن راج سکسینہ آہام) کی ایک رباعی سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور صاحب کا ساتھ کوئی پچپن سال رہا۔ "رباعیاتِ آہام" کے مقدمہ میں ڈاکٹر زور خود تحریر فرماتے ہیں کہ تحتانی تعلیم کے لئے دو مدرسہ کایستھ پاٹھ

شالہ میں شریک ہوئے جو راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت کا قائم کردہ تحتانی مدرسہ تھا۔ اور آج بھی راجہ صاحب کی دیکا وعریض دیوڑھی کے ایک گوشہ میں قائم ہے۔ اس مدرسہ میں رائے منوہر راج خلف راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی راشے پر تعلقہ دار سابق ناظم زراعت اور ڈاکٹر آر۔ آر سکسینہ صاحب اُن کے ہم جماعت تھے۔ اس زمانہ میں ڈاکٹر زور کا دولت خانہ محلہ شاہ گنج میں واقع تھا۔ وہ شاہ گنج جہاں حیدرآباد کے صدر المہام اور اُمرائے عظام کی عالیشان اور پُرشکوہ دیوڑھیاں، جلوخانے اور نوبت خانے ہر ہر قدم پر دکھائی دیتے تھے۔ آج نواب سر خورشید جاہ کی بارہ دری، سر آسماں جاہ کا خانہ باغ، اور مسرو وقار الامرا کی کوٹھی زبانِ حال سے اپنی زبوں حالی کا گلہ کر رہے ہیں۔ حیدرآباد کے ان ہی قدیم محلوں سے حیدرآباد کے وہ لوگ اُٹھے جنہوں نے باہر والوں کے شانہ بہ شانہ حیدرآباد کو سنوارنے اور نکھارنے میں نمایاں حصہ لیا۔

ڈاکٹر زور صاحب اور ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ صاحب نے اُس زمانہ میں ایک ادبی انجمن قائم کی تھی جس کی نشستیں میرے جدِ اعلیٰ کشن لعل صاحب قبلہ کے بنگلے پر ہوا کرتی تھیں۔ تحتانی جماعتوں کے یہ طلباء مضامین لکھتے اور پھر مضامین پر سوالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔ کایستھ پاٹھ شالہ کی تعلیم کے بعد ڈاکٹر زور ثانوی تعلیم کے لئے مدرسۂ مفید الانام اور مدرسہ دار العلوم میں شریک ہوئے اور میرے دونوں چچا صاحبان شمالی ہند کے طویل سفر پر روانہ ہوئے۔ کئی سال بعد ان کی ملاقات اس زمانہ میں ہوئی جبکہ ڈاکٹر زور بی اے کے طالبِ علم تھے اور میرے دونوں چچا صاحبان دار العلوم میں شریک تھے

جب ڈاکٹر زور انگلستان سے واپس تشریف لائے تو قدیم تعلقات کی پھر تجدید ہوئی۔ جو ڈاکٹر زور صاحب کے انتقال تک بلکہ آج بھی اُن کے افرادِ خاندان سے اُسی طرح قائم ہیں۔

ہمارے خاندان کی ہر تقریب میں ڈاکٹر زور مرحوم کے اراکینِ خاندان کچھ اس خلوص سے شرکت فرماتے ہیں جیسے کہ یہ اُن کی اپنی تقاریب ہوں۔ یہ تعلقات حیدرآباد کے سرد و گرم حالات سے نہ کبھی متاثر ہوئے اور نہ کبھی آئندہ ہوں گے۔

جب ادارۂ ادبیاتِ اُردو کا قیام عمل میں آیا تو ڈاکٹر زور صاحب سے قریبی تعلق کی بناء پر میرے دونوں چچا صاحبان (یعنی ڈاکٹر آر۔ آر سکسینہ صاحب اور پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب) اس ادارے کے قیام کی کوشش میں ڈاکٹر زور کے دستِ راست بن گئے۔ ۱۹۳۶ء میں نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصفِ سابع کی سلور جوبلی کے موقعہ پر جب "مرقعِ سخن" کی ترتیب و اشاعت کا کام شروع ہوا تو ڈاکٹر زور صاحب کے اصرار اور خواہش پر میرے چچا پروفیسر مہندر راج سکسینہ صاحب نے کئی ہندو اور دکنی شعراء پر مضامین لکھے اور ادارہ کے مالیہ کی خاطر "جیوتی" پر ایک نصابی کتاب مرتب کی جس سے ایک زمانہ تک ادارہ کو مالی فائدہ ہوا۔

ایک عرصہ تک وہ اُردو انسائیکلو پیڈیا کی ترتیب کے کام میں مصروف رہے۔ ڈاکٹر زور صاحب کے قیامِ کشمیر کے زمانہ میں اپنی گوناگوں مصروفیت کے باوجود، ڈاکٹر زور کی خواہش پر وہ ایک عرصہ تک اس ادارہ کے معتمدِ عمومی رہے۔

جب ایوانِ اُردو کی شاندار عمارت تعمیر ہو رہی تھی تو ڈاکٹر زور نے یہ ضروری کہا کہ اس عمارت کے ایک کمرہ کو ڈاکٹر آر۔ آر۔ سکسینہ صاحب کے نام سے موسوم کیا جائے۔

۱۹۴۵ء میں جب سٹی کالج کے ماہنامے "الموسی" کی ادارت پر میرا انتخاب ہوا تو ڈاکٹر زور صاحب کافی خوش اور مطمئن

ہوئے پھر ۱۹۴۹ء میں جب میں "مجلۂ عثمانیہ" کا ایڈیٹر مقرر ہوا تو وہ بظاہر مجھ سے ناراض رہنے لگے اور شکایتی انداز میں اکثر فرماتے۔ "تم کسی کام کے آدمی نہیں ہو۔ تم کبھی ادارے نہیں آتے۔ ہم لوگ آخر کب تک کام کریں گے"۔ ۱۹۵۲ء میں مجھے مجبور کرنے کے لئے بلکہ پکڑ لانے کے لئے انہوں نے "سب رس" کی مجلس ادارت کی معتمدی پر میرا انتخاب کیا۔ اتفاقاً یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں بطور وکیل اس نئے پیشے میں داخل ہوا تھا۔

لیکن ڈاکٹر زورؔ کو اصرار تھا کہ ہر چار پانچ دن کے بعد ادارہ کا چکر لگاتا رہوں۔ جب اس حکم کی تعمیل نہ ہوتی تو وہ خفگی کے ساتھ زیر لب فرماتے "جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا"

ڈاکٹر زورؔ کو خوش رکھنے کے لئے میں نے یہی مناسب خیال کیا کہ یوم محمد قلی قطب شاہ کی تقاریب میں پیش پیش رہا کروں اور اس طرح ان کا زیادہ سے زیادہ ہاتھ بٹاتا رہوں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ میری ہر تحریک کو قبول فرماتے اور اس کے انجام دینے کی ذمہ داری بھی مجھ پر عاید کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر زورؔ کا خلوص میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے وہ اکثر اپنی مصروفیات کی بنا پر گھر پر رہتے ہوئے گھر پر نہیں رہا کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر ملازم کو قبل از قبل ہدایت دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ میں کسی کام سے "تہنیت منزل" آیا۔ ڈاکٹر زور صاحب نے دریچہ ہی سے میری موٹر دیکھ لی۔ اور ملازم کو ہدایت کی کہ "ان کے لئے میں گھر پر ہوں۔ انہیں لے آؤ"۔ جب میں کمرہ میں داخل ہوا تو ڈاکٹر صاحب ایک تخت پر تشریف فرما تھے اطراف کچھ قدیم کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک فل اسکیپ کاغذ پر کچھ ابتدائی سطریں لکھی گئی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے "دروازہ بند کر دو۔ میں آج گھر پر نہیں ہوں"۔ ان کی مصروفیات میں یوں مخل ہونے پر مجھے بڑی شرمندگی ہوئی۔ لیکن زورؔ صاحب نے اطمینان کے ساتھ اس نامکمل مضمون کو ایک طرف رکھ دیا اور اس اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے رہے جیسے انہیں اس دن کوئی اور مصروفیت نہ ہو۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈاکٹر زورؔ صاحب کے لیے ادارہ ہی سب کچھ تھا۔ انہوں نے اپنی قیمتی اور نایاب اشیاء ادارہ کے میوزیم اور کتب خانہ میں رکھ دیں۔ عید کی ایک ملاقات کے موقعہ پر میں نے اکبری نورتن ملّا ابو الفضل کی تحریر کردہ "بھگوت گیتا" انہیں نذر کی۔ ڈاکٹر زورؔ نے اس قلمی نسخہ کو ادارہ کے نوادرات میں رکھ دیا۔ اسی طرح عالیجناب پروفیسر مہندر راج سکسینہ کا تحفہ "ارشاد نامہ" کا کوئی اور نسخہ حیدرآباد کے کسی اور کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔

لسانیات کے ماہر، اردو میں تنقید نگاری کے اوّلین مصنف، اور جامعہ عثمانیہ کے قابل احترام پروفیسر، جب سیر و تفریح کے لئے حیدرآباد سے چند میل دور نکل جاتے تو وہ اپنی شخصیت اور مصروفیات کو یکسر بھول جاتے۔ جناب رفیع الدین صاحب اور جناب محی الدین صاحب کو قریب کے پہاڑیوں پر دوڑنے کی ہدایت کرتے اور خود زیر لب کوئی غزل گنگنایا کرتے۔ وہ اپنی بزرگ شخصیت کا رعب جمانے کے قائل نہیں تھے۔ بلکہ لوگوں کی نظریں ان کے احترام میں خود بخود جھک جاتی تھیں اور آج وہ نظریں اُن کی یاد میں اشکبار ہیں۔

یہ ہمارے لئے باعث فخر ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو زمانہ کے انقلابات کے باوجود اپنی محدود آمدنی اور ذرائع کے ساتھ بڑی خاموشی سے، مسلسل دکنی تہذیب کو روشناس کرانے، دکنیات کی ترویج و اشاعت اور حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کو متعارف کرانے کی کوشش میں مصروف ہے۔ اس ادارہ کو ماہرین تعلیم اور ایڈمنسٹریٹرس کا بھرپور تعاون حاصل رہا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ کی یاد کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس TOWER HOUSE کو ہمیشہ روشن رکھا جائے۔ ■■

نازصدیقی

ڈاکٹر زورؔ کی علمی و اَدبی خدمات

آج ہم ایک ایسی شخصیت کا یاد منانے کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں جس نے ہمارے علم و اَدب اور تہذیب و تمدّن کی تشکیلِ جدید میں اہم اور نمایاں حصّہ لیا۔ ہم اُردو بولنے والے جس تہذیبی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور جس کلچر کے حوالے سے اپنے آپ کو پہچان رہے ہیں اس کی نوعیت کچھ اور ہوتی اگر سرزمینِ دکن اور دنیائے ادب میں ڈاکٹر زورؔ جیسی شخصیت کا ظہور نہ ہوتا اور وہ کارنامے سر انجام نہ دیئے جاتے جو اُن کی ذات سے مخصوص ہوگئے ہیں۔ اپنے تخیل کی مدد سے تھوڑی دیر کے لئے آپ ان کارناموں کو نابود کر دیجیے، تو یہ محسوس کریں گے کہ ہماری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ہم کوئی نصف صدی پیچھے چلے گئے ہیں۔ ایک ایسے دَور میں جسے "قبل زورؔ عہد" کہا جاسکتا ہے۔ خواجہ بندہ نوازؒ سے لے کر محمد قلی قطب شاہ، وجہیؔ، غواصیؔ، نصرتیؔ، ہاشمیؔ اور پھر ان سے چار صدی آگے آصفی دَور اور زمانۂ حاضر کے بے شمار ادیب اور شاعر ہمارے اَدبی اُفق سے یکسر غائب ہوجائیں گے اور بعض کی صرف دُھندلی سی پرچھائیاں صفحۂ ذہن پر باقی رہ جائیں گی۔ گولکنڈے اور بیجاپور کے تمدن کی وہ تاریخ دفن ہوجائے گی جو دکن کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات میں سانس لیتی ہے۔ وہاں نہ "ایوانِ اردو" ہوگا نہ اس کے بیش قیمت تحقیقی اور تمدنی نوادر، "یومِ محمد قلی قطب شاہ" بظاہر معمولی تقریب ہے لیکن ہماری ذہنی اور جذباتی زندگی کی ایک اہم علامتی قدر بن گئی ہے۔ ہماری دنیا اس علامت سے بھی عاری ہوجائے گی۔ یوں محسوس ہوگا جیسے تصویرِ حیات سے کچھ رنگ اور خطوط محو ہوگئے ہیں۔ اگر ہم اس کمی اور نقصان کا تصوّر کریں تو زورؔ صاحب کے علمی اور ثقافتی کاموں کی اہمیت ہم پہ واضح ہوگی اور ہم اُن کی صحیح قدر شناسی کر سکیں گے۔

ڈاکٹر زورؔ کے کارنامے مختلف نوعیت کے ہیں اور علم و ادب اور زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ شاعر تھے، افسانہ نگار تھے، نقاد تھے، مورخ تھے، ماہرِ لسانیات تھے پھر انھوں نے اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے کاموں میں عملی حصّہ لیا "ایوانِ اُردو" اور "ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" جیسے اداروں کا قیام اور استحکام انہیں کی شخصی دلچسپی اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ان سارے اشغال اور مصروفیات میں بظاہر کوئی ربط نظر نہیں آتا لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کام ڈاکٹر زورؔ کے لئے مقصود بالذات نہیں تھا بلکہ یہ سارے کام ایک عظیم اور واحد مقصد کے حصول کا ذریعہ تھے اور مقصد یہ تھا کہ اردو کلچر کا رشتہ اس کی قدیم روایات سے جوڑا جائے، جن کے آثار و مظاہر زمانے کی دستبرد سے مفقود اور ناپید ہوتے جا رہے تھے۔ یہ روایات بیک وقت لسانی، ادبی اور تہذیبی نوعیت کی تھیں، یہ روایات

اگر ناپید ہو جاتیں تو اردو کلچر کی مثال ایک ایسی تعمیر کی ہو جاتی جو فضا میں معلق ہے۔ ڈاکٹر زور نے ان روایات کی بازیابی کے ذریعہ نہ صرف اردو کلچر کی بنیاد کو استوار کیا بلکہ اس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا کر اسے زیادہ توانا اور فعّال بنایا۔

ڈاکٹر زور کی ادبی سرگرمیوں کی ابتدا شاعری سے ہوئی۔ کالج میں آنے کے بعد انہیں تنقید اور افسانہ نگاری سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ زور صاحب کو تصنیف و تالیف کی طرف راغب کرنے میں جامعۂ عثمانیہ کی عام علمی فضا کا بڑا دخل تھا۔ یونیورسٹی میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا گیا تھا اس وقت اردو میں عصری علوم پر کتابیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس لئے "دارالترجمہ" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس ماحول میں طالب علموں کو بھی لکھنے لکھانے کی ترغیب ہوئی۔ اساتذہ ان کی ہمت افزائی کرتے۔

چنانچہ زور صاحب کی صلاحیتوں کو ایک راہ پر لگانے میں ان کے استاد وحید الدین سلیم کے مشورں کا بھی دخل رہا ہے انھوں نے یہ احساس دلایا کہ زبان کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو جذبہ و احساس کے حصار سے نکال کر قوم کی تمام ذہنی اور فکری سرگرمیوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔ زور صاحب ابھی بی اے ہی میں تھے کہ "روحِ تنقید" کے نام سے مغربی تنقید کی تاریخ اور اصول پر ایک کتاب تالیف کر دی۔ اردو میں اس موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی اس کے علاوہ انھوں نے کئی تنقیدی مضامین لکھ کر مختلف رسالوں میں شائع کرائے، اسی زمانے میں انھوں نے دکن کی تاریخ کا مطالعہ کیا اور ان کے دل میں یہ لگن پیدا ہوئی کہ حیدرآباد کے قدیم تمدنی آثار کی چھان بین کریں۔ گولکنڈہ کے آثار نے پہلے ہی ایک رومان کی شکل اختیار کی اور ان کھنڈروں سے انھوں نے جو ہیرے برآمد کئے وہ افسانوں کی شکل اختیار کر گئے۔ جامعۂ عثمانیہ سے ایم اے کی ڈگری بدرجہ امتیاز حاصل کرنے کے بعد اس رومان پرور تخیل کو بلند ہواؤں میں بسائے، انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ کا سفر کیا۔ ڈاکٹر زور نے دو سال لندن میں رہ کر قدیم ادب پر تحقیقی کام کیا۔ اور لندن یونیورسٹی سے "پی ایچ ۔ ڈی" کی ڈگری حاصل کی۔ اسی عرصے میں انھوں نے لسانیات اور صوتیات کے علوم کی تحصیل بھی کی۔ اپنے تحقیقی کام کے دوران انھیں دکنی کے قدیم اور نایاب مخطوطات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ ان مخطوطات سے انھوں نے جو اقتباسات جمع کئے انھیں "اردو شہ پارے" (جلد اول) میں ایک طویل مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اسی طرح دکنی ادب کے بہت سے نادر نمونے پہلی بار منظرِ عام پر آئے۔ لندن سے پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد وہ پیرس گئے اور ہندستانی صوتیات" پر کام کیا۔ ان کا یہ مقالہ "ہندستانی فونیٹیکس" کے نام سے انگریزی میں شائع ہوا۔

اس کے علاوہ انھوں نے ہند آریائی زبانوں کے ارتقاء پر ایک تحقیقی مقالہ سپردِ قلم کیا جس میں اردو کے آغاز کے بارے میں اہم نظریہ پیش کیا۔ جس سے اردو زبان کے آغاز پر تحقیقی کام کا ایک نیا باب کھل گیا۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد ڈاکٹر زور نے اپنی پوری توجہ ادبیاتِ دکن کی تحقیق اور دکنی کلچر کی بازیافت پر مرکوز کر دی اور جب یہ کام تشفی بخش حد تک آگے بڑھ گیا تو اپنے دائرہ کار کو وسعت دے کر دورِ شاہی تک آصفی عہد کے تمام شاعروں اور ادیبوں کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے کی مہم شروع کی تھی۔ ان کے شعر و ادب کا شوق اور تخلیق کام کا تجربہ مغربی تنقید کا مطالعہ اور تحقیق ان کے علاوہ مختلف ہندستانی اور بیرونی زبانوں کی مہارت، ان سارے صلاحیتوں کو اپنی شخصیت میں سمو کر ہی وہ اس عظیم مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے جو ان کی زندگی کا واحد نصب العین تھا۔ زور صاحب ان لوگوں میں سے تھے جو زمانے کو اپنے ساتھ لے کر

چلتے ہیں۔ چنانچہ اپنی زندگی کے اس نصب العین کو انھوں نے تحریک کی شکل دے دی اور کچھ ہی مدت میں زبان و ادب کے ایسے بے لوث خدمت گذار ان کے اطراف جمع ہوگئے تھے جنھیں اپنے کلچر اور ادب کی روایت سے عشق تھا اور زور صاحب کی تحریک ایک عظیم ادارہ کی شکل اختیار کر گئی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جامعہ عثمانیہ کا قیام جن امنگوں اور تمناؤں کا مظہر تھا اور اس کے بانیوں نے جو خواب دکھایا تھا اس کی تعبیر "ادارۂ ادبیاتِ اردو" کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ اس ادارہ نے جہاں ایک طرف اردو زبان کی ترویج و اشاعت کا کام ریاست گیر پیمانے پر شروع کیا وہیں دکن کے نوجوانوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں میں علم و ادب کا ذوق عام کیا۔ قدیم ادبیات کے ساتھ لکھنے والوں کی تحقیقی علمی اور ادبی کاوشوں کی اشاعت کا انتظام کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر زور کی تصانیف، تالیفات اور متفرق مضامین کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان کا سرسری جائزہ لینے کے لئے بھی ایک دفتر درکار ہوگا۔ ان کی تصانیف کی قدر و قیمت کے بارے میں مختصر طور پر یہ کہنا کافی ہے کہ جن موضوعات کو زور صاحب کے قلم نے چھوا ممکن نہیں کہ انھیں موضوعات پر کوئی قلم اٹھائے اور زور صاحب کی تحریروں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ سکے۔

زور صاحب کا نام جہاں ایک محقق عالم ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ وہیں یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا کہ انھوں نے تاریخِ ادب میں "دبستانِ دکن" کا اضافہ کرنے کے ساتھ حیدرآباد کو علم و ادب کا ایک اہم مرکز بنا دیا۔

اُردو ادب کا کوہِ نور

● یس موہن لال جوہر حیدرآبادی

(حضرت سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم کی پندرھویں برسی پر)

○

السّلام اے پاسبانِ عظمت و شانِ وطن   تو کہ تھا نورِ دکن، روحِ ادب، جانِ سخن
اِک نئے انداز سے کی تو نے تنظیمِ چمن   بھر گیا نظروں میں شاہانِ قطب کا بانکپن

ناز فرماتی ہے تجھ پر آج تہذیبِ دکن

یوں تو اک دینی گھرانے میں ہوا تیرا ظہور   مِلّت و مذہب کے جھگڑوں سے رہا تو دور دور
مغربی ماحول میں کھویا نہ مشرق کا شعور   گولکنڈہ کی زمیں پر تھا مثالِ کوہِ نور

ناز فرماتی ہے تجھ پر آج تہذیبِ دکن

تو نے ساری عمر کر دی وقف اردو کے لئے   طالبانِ علم کے چاکِ گریباں بھی سیئے
حق تو یہ ہے تو نے اردو پر بڑے احسان کئے   آج بھی روشن ہیں تیری فکر و کاوش کے دیئے

ناز فرماتی ہے تجھ پر آج تہذیبِ دکن

تو وہ سورج تھا کہ بخشی ذرّے ذرّے کو چمک   تھیں تیری خدمات اردو کے لئے بالائے شک
پھول تھا ایسا کہ ہر گلشن میں ہے تیری مہک   قدر ہے تیری دکن سے وادیٔ کشمیر تک

ناز فرماتی ہے تجھ پر آج تہذیبِ دکن

ڈاکٹر محمد چراغ علی حقیر

ڈاکٹر زور ـــــ جیسا کہ میں نے پایا

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی شخصیت، اُن کا علمی تبحر، اُن کی محققانہ لگن اور مستقل طور پر اُن کا والہانہ جذبۂ خدمتِ اُردو اُردو دنیا میں، اور اُردو والوں کے لئے محتاجِ تعارف نہیں ہے، لیکن نوعیتِ خدمت کے اعتبار سے زبان کی خدمت کرنے والوں میں کچھ فرق و امتیاز ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اُردو ادب کے معماروں میں آج الحمدللہ سینکڑوں کے نام گنوائے جاسکتے ہیں جنھوں نے اُردو زبان کی ترقی اور اس کی ترویج میں مختلف حیثیتوں سے نمایاں حصہ لیا ہے۔ بلاخوفِ تردید میں یہ کہوں گا کہ اُردو کے خدمت گزاروں میں بعض ایسے ہیں جنھوں نے اپنے نام و نمود اور فائدے کی خاطر کام کیا ہے، اور چند ہی ایسے ہیں جن کا جذبۂ خدمتِ اُردو، مخلصانہ، بے لوث، دیرپا اور حقیقی خدمت گزاری سے بہت ہی قریب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور، اُردو کے ان خدمت گزاروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں جنھوں نے اُردو زبان کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کردی تھی، اور بالخصوص دکنی ادب تو اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہ کوئی معمولی خدمت نہ تھی، تادمِ زیست وہ دکنی ادب کی دامے، درمے، قدمے اور سخنے بڑی مستعدی کے ساتھ خدمت انجام دیتے رہے۔ دکنی ادب پر اُن کا تحقیقاتی کام، اُردو کے قدیم بیش بہا خزانوں سے اُردو والوں کو متعارف کرانے، اور اُردو زبان کی بنیادوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے میں، بیحد اہم اور نمایاں حصہ ہے۔ ڈاکٹر زور نے دیکھا کہ اُردو والوں کے سامنے اُردو زبان کا کوئی ٹھوس مستند تاریخی و ادبی مواد موجود نہیں، جس سے وہ صحیح طور پر ایک سرسری اندازہ کرسکیں کہ واقعی دکنی ادب میں ایسے شہ پارے بھی موجود ہیں جن کی بنیادوں پر زبانِ اُردو کی ایک عالی شان عمارت تیار کی جاسکتی ہے۔ سچ پوچھو تو اُردو والوں کے سامنے چند رسالے تھے، جن کو صوفی بزرگوں نے مرتب کیا تھا، لیکن دکنی ادب کے شاعروں اور نثر نگاروں نے، اس زبان کی کیا خدمت انجام دی تھی، اس کا کوئی دھندلا سا خاکہ بھی اُن کے سامنے موجود نہ تھا۔ ڈاکٹر زور نے اُردو زبان کی اس اہم بنیادی خدمت کا بیڑا اُٹھایا اور اپنی عمر کا بیشتر حصہ اُن بیش بہا خزانوں کو ڈھونڈ نکالنے میں صرف کردیا، اور اس پوشیدہ خزانوں سے وہ جواہر پارے سمیٹے جو اس زبان کے محققین کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے سکتے ہیں۔ اور بجا طور پر سرزمینِ دکن، اُردو زبان کو سنوارنے اور اس کو پروان چڑھانے پر فخر کرسکتی ہے۔

ڈاکٹر زور نے اسی جذبۂ خدمتِ اُردو کے تحت اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لاکر اپنی محنت اور کاوشوں سے اُردو مخطوطات کا وہ ذخیرہ جمع کیا، جو بیشتر مختلف خانگی کتب خانوں میں بیکار پڑا ہوا تھا۔ ان مخطوطات کے ایک ایک نمونے کو انھوں نے بڑی احتیاط سے محفوظ کردیا، اور ان کی تہذیب و ترتیب میں بڑی مستعدی اور ذہانت سے کام لیا ہے اور ان سے مخطوطات کی ایک مستقل شکل "ایوانِ اُردو" کے روپ میں تبدیل کردی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا، اس خصوص میں اہلِ دکن اُردو والوں پر ...

کچھ کہا ہے، اب کچھ ہندی والوں سے بھی سن لیجئے۔ ڈاکٹر زور کے ایک دوست، ڈاکٹر دنشی دھر ودیالنکار، جو پہلے صدر شعبۂ ہندی جامعہ عثمانیہ تھے اور بعد کو پرنسپل نائک رام بھگوان داس سائنس کالج ہوئے، انھوں نے بزم ادب اردو کے ایک سالانہ جلسہ میں اپنی تقریر میں اور باتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم نے بھی "ایوانِ اردو" کی سیر کی ہے، ڈاکٹر زور نے ہمیں بھی ازراہ مہربانی یاد کیا تھا اور قدم قدم پر ہماری بڑی آؤ بھگت کی ہم نے وہاں دیکھا کہ بڑے ہی چاؤ اور جوپکھوں سے ڈاکٹر زور نے دکنی مخطوطات کے ایک ایک ٹکڑے کو بہت ہی نمایاں طور پہ جان جتن کر رکھا ہے۔ اُن کا سلیقہ ہم مان گئے بے شک وہ بڑے آدمی ہیں، اُن کی ہمت بڑی ہے، اُن کے کام بڑے ہیں، اُن کا ذہن بہت اونچا ہے۔ وہ اردو کی خدمت میں اس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کر رہے ہیں۔ ایوانِ اردو جیسی کئی عمارتیں بن سکتی ہے۔ لیکن جو کام اردو کا انھوں نے جمع کیا ہے، وہ بہت بڑا ہے۔ سچ پوچھو تو ہم ہندی والوں میں ایسا سلیقہ نہیں۔ ہر کام کے لئے ایک خاص آدمی پیدا ہوتا ہے، ڈاکٹر زور اردو کی سیوا کے لئے جنم لیا ہے۔ اُن کے کام ہمیں بہت پسند آئے ہیں، وہ اردو زبان کے ایک عاشق ہیں۔ اور اردو کے علاوہ سبھی زبانوں سے انھیں محبت ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈاکٹر زور اگر زور نہ دیتے تو جامعہ عثمانیہ میں آج ہر زبان میں انٹرنس، ڈپ اوال، بی اوال اور ایم۔ او ال کے امتحانات منعقد ہی نہ ہوتے۔ انھوں نے نہ صرف اردو والوں کی حمایت کی بلکہ تمام علاقائی زبان کے بولنے والوں کے ساتھ بڑے ہی کھلے ذہن اور دماغ سے کام لے کر ان کو بھی اپنی زبان کے جاننے اور اس سے روزگار پیدا کرنے کا موقع دیا، یہ اُن کا بڑا احسان ہے جسے ہر شخص نہیں جانتا۔"

ڈاکٹر زور نے دکنی ادب کے مخطوطات اور اس کے منتشر جواہر ریزوں کو یکجا کر کے ان کی تہذیب و ترتیب پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ اُن کی از سرِ نو فہرستیں تیار کیں، اور اپنی تالیفات اور تصنیفات میں اُن کا ذکر کر کے انھیں کارآمد بنا دیا "اردو شہ پارے" اور "دکنی ادب کی تاریخ" مرتب کر کے دکنی ادب کے شاعروں اور نثر نگاروں کو روشناس کرایا، اور اردو زبان کے محققین کے لئے راہیں متعین کر دیں۔ رہنما نے راستہ بتلا دیا، اب راستوں کی کیا صعوبتیں ہیں اور منزلوں تک پہونچنے میں کیا کیا دشواریاں ہیں، اُن سے راہ رو ہی اپنے ذاتی تجربوں کے ذریعہ خوب واقف ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا نادانی سے یہ کہنا کہ ڈاکٹر زور نے اپنی تالیفات اور تصنیفات میں صرف اشاروں سے کام لیا ہے، تشفی بخش مواد نہیں ملتا، میرے خیال میں ان معترضین کو جاننا چاہیئے کہ کسی چیز کے سرسری جائزے اور تفصیلی جائزے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور اپنی تالیفات اور تصنیفات میں اگر ہر چیز کا تفصیلی جائزہ لیتے تو اس قدر وافر طریقے سے ہماری رہنمائی نہ ہوتی۔ اب رہی کہیں کہیں سہو نظری اور بھول چوک، یہ کوئی نئی بات نہیں، بڑے بڑوں سے ہوتی آئی ہے۔ ڈاکٹر زور کے بے شمار علمی، تحقیقاتی کارنامے ہیں، جن میں محمد قلی قطب شاہ کے کلیات اور مختلف قدیم تاریخی قصوں کی اشاعت سے اردو کے ذخیرہ میں نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے انھوں نے ایک کتاب "فنِ انشاء پردازی" پر بھی مرتب کی ہے۔ اور اردو والوں کو انشاء پردازی کے رموز سے واقف کرایا ہے اس لحاظ سے ہم ڈاکٹر زور کے انتہائی ممنونِ احسان ہیں۔ ڈاکٹر زور کے تمام علمی وادبی تحقیقاتی کارنامے ایسے ہیں جن کو ایک معمولی پڑھا لکھا شخص بھی پڑھ سکتا ہے اور سمجھ سکتا ہے، وہ اس لئے کہ ان کی تحریروں میں چھوٹے چھوٹے الفاظ چھوٹے چھوٹے جملے

اور سلیس عبارت، جس کے مطالب بآسانی ذہن نشین ہوسکتے ہیں۔ ان کی تالیفات اور تصنیفات کے مطالعے سے پتہ نہیں چلتا کہ اسے اُردو کی ایک بڑی شخصیت نے قلمبند کیا ہوگا۔ کیوں کہ ہر جگہ اُن کا اسلوب بیان نہایت سیدھا سادہ اور عام فہم ہے۔

اس قدر مختصراً ڈاکٹر زور کے علمی کارناموں کے ذکر کے بعد اب میں چند خاص باتوں کا تذکرہ کروں گا جو اس بڑی شخصیت سے متعلق ہیں۔ آپ ہم سبھی جانتے ہیں کہ ایک ملازم سرکار چاہے وہ کسی نوعیت کی خدمت انجام دیتا ہو، مقررہ اوقات کارِ سرکاری کے آخری چند لمحوں میں وہ بڑی بے چینی سی محسوس کرنے لگتا ہے کہ کب وقت ختم ہو اور گھر بھاگے۔ ڈاکٹر زور نے اپنی فراخدلی سے اپنے ساتھی کام کرنے والوں کے لئے، بلا لحاظ مذہب و ملت چادر گھاٹ کالج میں اوقاتِ کارِ سرکاری کے بعد وہ دلچسپیاں پیدا کر دی تھیں کہ اکثر لکچرار صاحبان اوقاتِ کار کے بعد کالج ہی میں دیر تک ٹھہرتے اور مختلف نوعیت کی تفریحات میں مشغول ہو جاتے تھے، ڈاکٹر زور خود بھی کبھی کبھار ان تفریحات میں اُن کا ساتھ دیتے، گویا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوقاتِ کار کے بعد چادر گھاٹ کالج ایک کلب ہے، جہاں سب جمع ہوتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے ہر ایک ماحول میں دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ ان کی ملنساری، دوستی اور ماتحت نوازی کے سبھی قائل ہیں کہ انھوں نے برادرانہ سلوک روا رکھا ہے۔

ڈاکٹر زور اپنے ماتحتوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کے عادی تھے۔ وہ اس لئے کہ اُن کے ہاں کام کے انجام دہی کی بڑی اہمیت ہوا کرتی تھی اور وہ ایسے فرماں بردار ماتحین پر عموماً بڑے مہربان رہا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک بار جس پر ان کا اعتبار قائم ہو جاتا تو اس کو ہر وقت بڑا ہی قابل بھروسہ آدمی سمجھتے تھے اور کبھی اس پر شک نہ کرتے تھے۔ اُن کے گھر کا دیوان خانہ ہو یا کالج کا اجلاس، ہر جگہ ان کے چند مخصوص احباب ایک جانب موجود رہتے تھے۔ ڈاکٹر زور کو علم نجوم پر بڑا عقیدہ تھا، چنانچہ جب کبھی انھیں کوئی نیا کام شروع کرنا ہوتا یا کسی سفر پر روانہ ہونا ہوتا تو قبل از وقت وہ نیک گھڑی تلاش کرتے اور اس کی پابندی بھی کیا کرتے تھے۔ اس خصوص میں سید شاہ مراد علی طالع کا نام لیا جانا نامناسب نہ ہوگا۔ اپنے ہاں آنے جانے والوں کی بڑی قدر و منزلت کیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ اکثر اوقات کوئی نہ کوئی شاعر یا ادیب ہر وقت دکھائی دیتا تھا۔ ضرورت پر شاعروں اور ادیبوں کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ چھوٹوں کا دل بڑھانا اور اُن کو صحیح راستہ پر لگانا، اُن کی طبیعت کا ایک خاصا تھا۔

ڈاکٹر زور اپنی وضع قطع کے بڑے پابند آدمی تھے۔ سفید پاجامہ، کھدر کے چرخلنے کی رنگین شیروانی اور اُسی کپڑے کی کشتی نما ٹوپی زیب تن کیا کرتے تھے، اور یہ سیدھا سادہ لباس گھر ہو یا کالج یا بڑی سے بڑی دعوت میں ہوا کرتا تھا۔ ڈاکٹر زور زبان کے منہ پھٹ اور دل کے صاف واقع ہوئے تھے جب کبھی کچھ غصہ آتا تو اس وقت سب کچھ بُرا بھلا سنا دیتے، لیکن خوبی یہ تھی کہ بعد کو اس پر اس قدر مہربان ہو جاتے کہ ہر وقت اس کے کام کو سراہتے اور ہر طرح سے اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتے۔ ماتحت نوازی میں ڈاکٹر زور، نواب آعظم جنگ اور نواب علی یاور جنگ سے کم نہ تھے۔ خود کام کرنے کے عادی تھے، کام اُن کا محبوب مشغلہ تھا، ہزاروں کو انھوں نے کام کرنے کا ڈھنگ سکھایا۔ افسوس کہ ایسی ہستی اب ہم میں موجود نہیں ہے۔ ؏

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

لئیق صلاح

ڈاکٹر زور، خطوط کے آئینے میں

ڈاکٹر زور کی شخصیت کا عموماً مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ جیسے محقق، نقاد، شاعر اور ان تمام سے اہم ایک اور حیثیت ہے۔ جس میں اُن کی ادبی حیثیت، اور ان کی اپنی انفرادیت پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ ہے ڈاکٹر زور کی مکتوب نگاری۔ کہتے ہیں کہ اچھی گفتگو شائستگی کی علامت ہے لیکن اس سے بھی بڑی علامت شائستگی اور تہذیب کی یہ ہے کہ کسی کو خط نگاری کا سلیقہ کہاں تک ہے؟ خط نگاری کے فن کی یہ عجیب خصوصیت ہے، یہ آسان بھی ہے اور نازک ترین بھی، یوں تو یہ ادب کی کوئی خاص صنف نہیں لیکن جب خاص ماحول اور مزاج میسر آجائے تو یہ ادب بن جاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبد اللہ "خط لکھنے کے لئے فرصت کی بہرحال! ضرورت ہے" اور غالب کی سی خط نگاری کم فرصت آدمی کر ہی نہیں سکتا۔ غالب نے غزل کی طرح خط کو بھی ایک ادبی مشغلہ بنا لیا تھا۔ ان کے خط، ان ہی تخیلات سے پیدا ہوئے جن سے ان کی غزل پیدا ہوئی۔ انھوں نے نئے انداز میں خط لکھ کر نہ صرف مکتوب نگاری ہی میں طرزِ نو کی بنا ڈالی۔ بلکہ اُردو نثر کو بھی ایک جدت سے آشنا کیا۔ ورنہ مکتوب نگاری "رقعات عالمگیری" سے آگے نہ بڑھ سکتی۔

سر سید نے غالب کے ظرف کو عام کیا۔ ان کے خطوط میں سادگی اور بے تکلفی ہے۔ لیکن اس بے ساختگی میں زبان اور محاورہ کی غلطیاں بھی ملیں گی۔ مولانا آزاد کے خطوط کو نقادوں نے سر سید کے افادیت پسند اور منطقی ذہن کے خلاف ایک ردِ عمل قرار دیا ہے۔ ان کے خطوط میں افادیت پسندی کے بجائے، جذبے اور تخیل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

ہر شخص خواہ وہ ادیب ہو کہ شاعر، اپنی تخلیقات میں کہیں کہیں سے اپنی جھلک دکھلاتا ہے۔ اور یہ جھلک اتنی مختصر ہوتی ہے کہ پڑھنے والا بڑی مشکل سے مصنف کے بارے میں کچھ رائے قائم کر سکتا ہے۔

لیکن خطوط میں اُس کی ہر ہر ادا پر نگاہ پڑتی ہے۔ چاہے وہ جلوت میں ہو یا خلوت میں، جہاں اُس کی خوبیاں اور اچھائیاں منظرِ عام پر آتی ہیں۔ وہیں اس کی برائیاں اور کمزوریاں چھپ نہیں سکتیں۔ اس لیئے کہ کمزوریوں پر پردہ ڈالنا مکتوب نگاری کے فن میں بہت بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔

خطوط کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، جو رسمی اور غیر رسمی قرار دی گئی ہیں۔ جن میں کاروباری، داخلی اور نجی زندگی کا پردہ چاک کرنے والے سب ہی شامل ہیں۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس فرض کو کیسے نبا ہا ہے۔

ڈاکٹر زور کے جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں انھیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے لاتعداد خطوط لکھے ہیں، لیکن لاطائل نویسی کا شکار نہیں ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ غالب کی طرح انھوں نے بھی قلم برداشتہ یہ خطوط لکھے اس کے باوجود قلم کو کہیں لغزش نہیں ہوئی۔ "سادگی و پُرکاری" کی سچی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ خطوط ڈاکٹر نارنگ، حمید الدین شاہد، مبارز الدین رفعت، خلیق انجم، سید محمد، محمد رفیع بیدری اور اسلم پرویز کے نام ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ نے اپنی یادیں

کا اعتراف کیا ہے کہ، انھیں ڈاکٹر زورؔ نے تقریباً دو سو خطوط لکھے تھے جن میں سے چند "سب رس" زور نمبر" میں شائع ہوئے ہیں۔ خطوط خواہ ڈاکٹر نارنگ کے نام ہوں یا خلیق انجم کے یا حمید الدین شاہدؔ کے سب میں ایک ہی اثر کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ ہے ڈاکٹر زورؔ کا خلوص اور اُن کی سادگی، مخاطب چاہے ساتھی ہو یا طالب علم، اُن کے اندازِ تخاطب میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ جتنا وہ ساتھیوں کے ذوقِ جستجو کی داد دیں گے۔ اسی مناسبت سے چھوٹوں کی سعی و جستجو کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ڈاکٹر زورؔ نے جو القاب استعمال کیے ہیں وہ سب کے لیے تقریباً ایک ہی ہیں۔ مثلاً محب مکرم، عزیز مکرم، محب محترم زاد لطفہ، محب عزیز سلمہٗ عزیز من اور بھی وغیرہ

ڈاکٹر زورؔ کے زیادہ تر خطوط ادارے اور "سب رس" کے متعلق ہیں کسی میں گرانٹ کی منظوری کا ذکر ہے۔ کسی میں گرانٹ منظور کروانے کی تگ و دو، تو بعض مکاتیب میں اس کے ناکافی ہونے کا شکوہ۔ اور چند "سب رس" کی اشاعت کے بارے میں۔ مثلاً گرانٹ کے ناکافی ہونے کا شکوہ۔ گوپی چند نارنگ کے خط میں اس طرح کیا ہے۔

"آج آزادؔ صاحب کا بھی خط آیا ہے اور خوش خبری بھی ملی ہے۔ مگر سمندر سے شبنم والی بات ہے گذشتہ سال ہی کی رقم منظور ہوئی۔ حالانکہ اس کے موازنے میں بھی خسارہ ہے۔ بہرحال آزاد صاحب کا شکریہ ادا کر دیجئے"

ایک اور خط میں ڈاکٹر گوپال ریڈی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"ان سے ملیں تو کہیئے کہ آندھرا گورنمنٹ ادارے کی عمارت کے لیے مدد دے رہی ہے۔ انھوں نے شرط لگائی تھی کہ آندھرا دے تو حکومت ہند دوسری قسط دے گی۔ مثل ان ہی کے پاس رکھی ہوئی ہے۔ آپ مل کر کہیے کہ اُردو دنیا کی نظریں ادارے کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اس کا جلد مکمل ہونا ضروری ہے وغیرہ۔ آپ ان سے جلد ملیئے۔ آپ کی گفتگو کا اثر ہوگا"۔

ڈاکٹر زورؔ حیدرآباد میں ہوں کہ دلّی میں، یا کشمیر میں وہ ادارے کے کاموں اور "سب رس" کی اشاعت سے کبھی غافل نہیں رہے۔ بے انتہا مصروف ہونے کے باوجود وہ اپنے ہمنواؤں سے بھی التجا اور اصرار کرتے ہیں کہ "سب رس" کی اشاعتوں کو خوب سے خوب تر بنائیں۔ خصوصاً وقت کی پابندی کا خاص طور پر خیال رکھیں۔ اقتباس پیشِ خدمت ہے "آپ سب رس کے لئے جو دلچسپی لے رہے ہیں اس کے لئے مشکور گذار ہوں اس کی توقع تھی یہ ترقی کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ماہ کا پرچہ اسی مہینے کی دس تاریخ تک نکل جائے"۔

غالبؔ کی طرح انھوں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا۔ ڈاکٹر نارنگ کو لکھتے ہیں "ایک خط پہلے لکھ چکا ہوں، ملا ہوگا۔ مجھ سے کے لئے ایک اور مضمون بھیج رہا ہوں۔ اس کو بھی شامل کر لیجئے۔ اور اطلاع بخشئے کہ اس کا کام کس منزل تک پہنچا۔ کتابت کتنی ہوئی آپ کا مقدمہ تیار ہو گیا کہ نہیں۔ مجھے بھی تو دکھایئے۔ رومیؔ اور اقبالؔ والا مضمون بھی شامل کیجئے وہ مضمون آخر کہاں بھیجا ہے، مگر اس کی نقل رکھ لینی چاہیئے تھی"۔

ڈاکٹر زورؔ کی مصروفیتوں کا علم، اُن ہی کے علمی و ادبی کارناموں سے تو ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن ان مکاتیب میں خود ڈاکٹر زورؔ کی زبانی سارا حال سنیئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"حیدرآباد آنے کے بعد بے انتہا مصروف ہو گیا ہوں۔۔۔ میں ۲۴ر فروری کو دہلی آرہا ہوں اور ۵ مارچ کو [illegible]

جمعوں کے لیے روانہ ہوں گا۔

آگے لکھتے ہیں:۔ "میں بے حد مصروف ہوں' آپ اندازہ نہیں کرسکتے'

ڈاکٹر زور بیک وقت کئی کاموں میں مشغول رہا کرتے تھے۔ اِدھر آزاد انسٹیٹوٹ کا افتتاح ہو رہا ہے۔ اُدھر یوم قلی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ایک کام سے نمٹنے نہ پائے کہ دوسری ذمہ داری سر ہو جاتی۔ جس کا انکشاف بھی ان خطوط میں کیا گیا ہے لکھا ہے

"آزاد ریسرچ انسٹیٹوٹ کے لئے ۱۲ ہزار رقم آگئی ہے۔ اس کا کام اور کمیٹیاں بھی شروع ہیں بہت زیادہ مصروفیت ہے۔ افتتاح عمارت اور یوم قلی وغیرہ کے انتظامات بھی ہیں۔ غرض ایک سر ہزار سودا کا حال ہے۔ جب تک اللہ چاہے کام لیتا رہے گا اور جب تک اس کو منظور ہو میں محنت کروں گا۔ اس لئے زیادہ بار برداشت کر رہا ہوں کہ جب تک برداشت کی قوت ہے نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے"

اور آگے انھوں نے اپنی مصروفیت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"میں انتہا سے زیادہ مصروف ہوں۔ پہلے میں کام ڈھونڈتا تھا۔ لیکن اب کام مجھے ڈھونڈ کر آرہے ہیں"۔

ڈاکٹر زور کی عدیم الفرصتی نے انھیں بالآخر ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں سے وہ لوٹ نہیں سکتے تھے۔ تھکن اتارنے کے لیئے وہ تھوڑی سی علالت کے طلب گار تھے۔ لیکن زمانے انھیں اتنی مہلت بھی دینی گوارہ نہ کی۔ اس لیئے وہ عاجز آکر اپنے ہمدم دیرینہ حمیدالدین شاہد کو لکھتے ہیں:۔

"اب میں کام کرتے کرتے بہت تھک گیا ہوں۔ چھوڑنا چاہتا ہوں مگر کام پیچھا نہیں چھوڑتے یکے بعد دیگرے سلسلہ بندھا ہوا ہے۔ اب یوم قلی قطب شاہ کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ گھریلو معاملات پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ادارے کے کام بڑھے جا رہے ہیں"

ان الفاظ کا لکھنے والا وہی شخص ہے جس نے کبھی لکھا تھا۔

"اتوار کے دن فرصت ہے۔ کوئی ادبی یا سیاحتی منصوبہ بنا رکھیئے"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک دن بھی وہ اپنی زندگی کا ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اس متاعِ عزیز کا ایک ایک لمحہ کاروبارِ شوق کی نذر کرنا گویا اُن کا ایمان تھا لیکن جب اُس مردِ آہن کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہوں کہ میں تھک گیا ہوں تو ہمیں اُس کی بات پر یقین کرنا چاہیئے کہ وہ واقعی اس قدر کمزور ہوگیا ہوگا اور اس کی ناتوانی و کمزوری نے اُسے شاید اس قابل نہ رکھا ہو کہ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنائے۔ ایک اور خط میں شاہد صاحب کو لکھتے ہیں۔

"میری طبیعت بہت پست ہوگئی ہے۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا ہے".... اسی خط میں آگے لکھتے ہیں۔

"مگر اب دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش کی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ علمی و ادبی کاموں سے بھی اگلی سی لگن باقی نہیں رہی"

یہ خطوط انتقال سے تین چار سال قبل لکھے گئے۔ جن کے پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے موت کے قدموں کی آہٹ محسوس کر لی ہوگی۔ اور قانونِ فطرت کے آگے انھوں نے مجبوراً سپر ڈال دی۔ اس خط میں لکھتے ہیں۔

"بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ اب اچھی ہے۔ مگر میری طرح وہ بھی زوال آمادہ ہوگئی ہیں۔ قانونِ فطرت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

ڈاکٹر زورؔ نے اپنے بعض مکاتیب میں کشمیر کے موسم اور وہاں کی ادبی سرگرمیوں پر بھی روشنی ڈالی ہے کشمیر کے موسم کی شدت ان کے لیے ناقابلِ برداشت تھی دوسرا یہ کہ انھیں سرزمینِ دکن سے بے حد لگاؤ تھا لیکن اس خطہ کو چھوڑنے پر جس چیز نے مجبور کیا وہ تھی، اردو ادب کی خدمت، جس کو وہ اپنی آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔

موسم کی شدت اور غریب الوطنی کا شکوہ بھی بعض اوقات زبانِ قلم پر آہی جاتا ہے۔ اپنے ایک خط میں ڈاکٹر زورؔ رقم طراز ہیں:

"مجھے اس وقت یاد نہیں کہ یہ تین رسالے کہاں موجود ہیں اور کہیں ہیں بھی یا نہیں۔ یہاں تو بالکل بے دست و پا اور بے پر و بال ہوں۔ اور محض اس خطے میں اردو کی خدمت کے لیے لبطورِ غریب الوطنی مقیم ہوں۔ اور اپنی بساط کے مطابق اردو کا کام کر رہا ہوں جس کے نتائج کچھ عرصے کے بعد ظاہر ہوں گے۔ خدا کرے! میری یہ خدمت مقبول ہو۔ اور خود اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائیں"۔

دوسرے خط میں اس طرح خامہ فرسا ہیں:-

"دلّی میں گرمی تھی اور یہاں پہنچا تو پھر برف خانہ میں بند ہوگیا۔ بلا کی سردی ہے۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے صحت و عافیت سے رکھے۔ آسمان پر بادل ہیں۔ دن کے وقت ایسی تاریکی ہے جیسے وہاں ۵، ۶ بجے صبح ہوتی ہے۔ ایسے موسم اور ایسی سردی میں کیا کام ہوگا۔ اور میں کام کا بندہ ہوں۔ اور خدا نے مزدور پیدا کیا ہے اور قسمت میں کام لکھا ہے"۔

اس جان لیوا سردی نے ڈاکٹر زورؔ کے عزائم کو متزلزل نہ ہونے دیا۔ انھوں نے اپنی جراًتِ رندانہ سے سب کو آخر متحیر کر دیا۔ اور اس دور دراز خطے میں بھی اردو کی شمع کو فروزاں کیا۔ اس سلسلے میں جو خطوط ہمیں ملے ہیں اُن میں ایک خط سے ان کے آئندہ پروگراموں کا حال معلوم ہوتا ہے اور دوسرے خط میں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اُن کی کوشش کامیاب رہی۔ جناب ممتاز حسن صدر ترقی اردو بورڈ کراچی کو لکھتے ہیں:-

"میں مئی میں یہاں آگیا اور اردو کی خدمت میں منہمک ہوں۔ ایک کشمیر اردو اکیڈیمی بھی بنا رہا ہوں اور کوشش کر رہا ہوں کہ اردو ادب و زبان کا اعلیٰ ذوق پیدا ہو سکے"۔

دوسرا خط عارف الدین حسن کے نام ہے جس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے: "اردو کی خدمت کے ذوق نے اس دور دراز علاقے میں غریب الدیار بنا کر پہنچایا ہے۔ دعا فرمائیے کہ اردو والوں کی کچھ خاطر خواہ خدمت کر سکوں۔ یہاں اب تک پی۔ ایچ۔ ڈی کا کچھ انتظام نہ تھا۔ میری آمد کے بعد آٹھ خواتین و حضرات نے درخواستیں دی ہیں۔ کشمیر اردو اکیڈیمی کے لیے کوشاں ہوں۔ انشاء اللہ جلد اس کا افتتاح عمل میں آئے گا"۔

چند خطوط ایسے ہیں جن میں ڈاکٹر زورؔ نے مولانا آزاد کی طرح اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے برجستہ اشعار کا سہارا لیا ہے۔ ممتاز حسن کی جدوجہد کو سراہتے ہوئے لکھا ہے:- "آپ جیسے اصحاب وہاں اردو کے لئے جو کچھ توجہ فرما رہے ہیں غنیمت ہے مگر ضرورت ہے کہ مزید توجہ منعطف ہو سے

"حدی را تیز تر می خواں چوں محمل را گراں بینی"

ڈاکٹر زورؔ نے مبارز الدین رفعت سے یہ خواہش کی تھی کہ وہ حضرت بندہ نواز گیسو دراز پر ایک بسیط مقالہ لکھیں تاکہ اردو کے مخلصوں کی یاد پھر سے تازہ ہو جائے۔ اقتباس سماعت فرمائیے:-

"خواجہ بندہ نواز پر ایک مبسوط مقالہ کئی سو صفحات کا لکھئے۔ ان کے مرشد نصیر الدین چراغ دہلوی کی بھی ایک ہندی کتاب اردو رسم الخط میں مجھے مل گئی ہے۔ جس سے اب یقین ہو چلا ہے کہ اگر ان پر لکھیں تو بجائے خود دکن کے چند بڑے علمی خدمت گزاروں کی یاد تازہ ہو جائے گی "

تازہ خواہی داشتن این داغ ہائے سینہ را

تحقیق سے ڈاکٹر زور کو اس قدر لگاؤ تھا کہ انہوں نے اس دشت کی سیاحی تنہا نہیں کی۔ وہ تو ایک کارواں کے متمنی تھے۔ اس لیے جو بھی آگے بڑھتا، اس کی حوصلہ افزائی کرتے، اسے بار بار للکارتے، آوازیں دیتے، اس کی رہنمائی کرتے اس طرح اسے منزل تک پہنچانے کے لیئے ممکنہ بھر کوشش کرتے۔ رفعت صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ کے علمی اور تحقیقاتی کاوشوں سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اور باوجود ناسازئ مزاج کے آپ جو کام کرتے رہتے ہیں اس کا دلی قدرداں ہوں:۔

یا کبھی اپنے پُر خلوص مشوروں سے مستفید فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ستائش وصلہ کی پرواہ کیئے بغیر علمی وادبی کام کرتے جائیں۔

"ایک بات یہ بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھیئے کہ علمی وادبی کام کو ذریعہ آمدنی نہ بنائیے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ملازمت اور باعزت ملازمت سے سرفراز فرمایا ہے۔ کچھ کام محض علم وفن کی خاطر کیجئے۔ دولت وعزت خود بخود ملتی جائے گی اور یہ عارضی چیزیں ہیں دائمی چیز کام ہے اور کام خود انعام ہے:۔

ان کی تحقیقی صلاحیتیں واقعی قابلِ تعریف ہیں حضرت خواجہ بندہ نواز سے منسوب تصنیف "معراج العاشقین" کو اتنا زمانہ گزرنے کے بعد محققین نے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ خواجہ صاحب کی نہیں ہے۔ اور آج سے پندرہ سال پہلے ڈاکٹر زور نے اس شبہ کا اظہار، رفعت صاحب کے موسومہ خط میں کیا ہے۔ "لکھا ہے کہ چونکہ مولوی عبدالحق نے اسے خواجہ صاحب سے منسوب کیا تھا اس لیئے ڈاکٹر زور نے خاموشی اختیار کی تھی۔

ڈاکٹر زور کا شمار دکن کے نامور محققین میں کیا جاتا ہے لیکن ان کے کسی قول اور فعل سے اس امر کا اظہار نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کارناموں پر نازاں تھے۔ بجائے اس کے انھوں نے کسرِ نفسی سے کام لیا ہے۔ اور اپنی مدح سرائی کی تردید ان الفاظ میں کی ہے۔ لکھا ہے :۔

میرے بارے میں آپ جو کچھ سُنتے ہیں۔ وہ حقیقت سے زیادہ ہے۔ "من آنم کہ من دانم"

اِن خطوط میں جہاں اتنی ساری باتیں ہیں۔ وہیں اپنے دوستوں، رشتہ داروں سے خلوص و محبت کا بھی اظہار کیا ہے وہ دبی زبان میں شکوۂ تقدیر بھی کرتے ہیں کہ زمانے اُن کے چاہنے والوں کو اُن سے ہمیشہ دُور رکھا۔ لکھتے ہیں۔

"آپ کا شکر گزار ہوں کہ بڑی محبت سے خطوط لکھے۔ اس عمر میں محسوس ہو رہا ہے کہ مخلصوں کی قربت کتنی مفید ہوتی ہے:

ڈاکٹر زور کے انتہائی قریبی دوست حمید الدین شاہد تھے (خانگی زندگی کے حالات کا علم ان ہی کے خطوط سے ہوتا ہے) ایک خط میں حمید الدین شاہد کو لکھتے ہیں:۔

"آپ کی یاد ہر موقع پر آتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ جن کو قریب رکھنے کی کوشش کی وہی دور ہو گئے آپ کا بھی وہی حال

وہیں تھا اور تہذیب کا بھی وہی۔ حالانکہ اس کے لئے باہر کے کتنے عمدہ عمدہ پیام آئے تھے۔ اس خیال سے نہیں دیا کہ قریب رہے مگر فطرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ شادی کے بعد خود مجھے وہاں سے نکل جانا پڑا۔ اس سے پتہ چلا کہ قسمت میں عزیزوں سے فراق اور دوری لکھی ہے اور اس کی وجہ سے ایک خاص سوز و کرب دل میں پیدا ہوتا رہتا ہے۔"

کشمیر جسے جنتِ ارضی کہا جاتا ہے اس کے حسن نے ڈاکٹر زورؔ کو متاثر تو کیا تھا، لیکن ان کے دل سے دکن کی یاد محو نہ ہو سکی وہ جتنی تعریف و توصیف حیدرآباد کی کرتے ہیں۔ اتنی کسی اور سرزمین کی نہیں۔ یہاں کی آب و ہوا یہاں کے موسم اور یہاں کے لوگوں نے ڈاکٹر زورؔ کے دل کو موہ لیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اپنی آبائی سرزمین کو مقدم جانتے ہیں جس کا اظہار انھوں نے اپنے دو خطوط میں کیا ہے۔ ان خطوط میں ادبیت، دلکشی اور شاعرانہ خوبیاں بھی موجود ہیں لکھتے ہیں:۔

"یہاں بارش شروع ہو گئی۔ مطلع ابر آلود ہے۔ جھوار جاری ہے۔ اس کو کہتے ہیں عالم آرائی، ہر طرف سبزہ ہے اور موسم خوشگوار ہے۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:۔

"یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ اردو والے اور خاص کر مسلمان ہر جگہ سست گام اور آہستہ خرام واقع ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے حیدرآبادی کچھ تیز گام نظر آتا ہے۔ جہاں آپ جیسے مستعد اور مخلص اصحاب اس گئے گزرے زمانے میں بھی موجود ہیں۔"

"ڈاکٹر زورؔ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے اور یہ مسکراہٹ ان کی شائستگی اور زندہ دلی سے عبارت تھی۔ لیکن وہ زوردار قہقہہ لگانے کے قائل نہ تھے۔ اس زیرِ لب مسکراہٹ کی جھلک ہمیں ان کے خطوط میں بھی ملتی ہے مثلاً وہ اپنے پاکستانی رفیق سے اس طرح مخاطب ہیں:۔

"مگر یہ سب باتیں آپ کو لکھنے سے کیا فائدہ! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا سے جنت گویا عالمِ بالا کو خط لکھ رہا ہوں۔ نہ آپ کچھ کر سکتے ہیں اور نہ لطف اٹھا سکتے ہیں۔ جنت والوں کو دنیا کے قضیوں اور جھگڑوں سے دلچسپی تو ہو سکتی ہے۔ مگر وہ ان میں کمی یا ان کے سلسلے میں مدد نہیں کر سکتے۔ ہاں دعا کر سکتے ہیں اور اس سے تو آپ بھی دریغ نہیں کریں گے۔"

"عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کو گھریلو کام کرنے کی فرصت بہت کم میسر آتی ہے۔ جس کا شکوہ ان کے افرادِ خاندان کرتے رہتے ہیں۔ جنھیں یہ احساس ہو جاتا ہے کہ دیگر دلچسپیوں نے شعراء و ادیبوں کو اس قابل نہ رکھا کہ وہ افرادِ خاندان سے دلچسپی کا اظہار کر سکیں۔ حمید الدین شاہدؔ کے نام ڈاکٹر زورؔ کے جو خطوط ہیں ان سے نجی زندگی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زورؔ ایک ایسے انسان تھے جنھوں نے اپنے رشتہ داروں کو یہ احساس قطعاً نہ ہونے دیا کہ وہ ان سے غافل ہیں۔ انھوں نے اپنے اکثر خطوط میں بیگم صاحبہ کی علالت کا ذکر، اور فکر و تردد کا اظہار بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"میں بے حد مصروف ہوں۔ اور بیگم صاحبہ کی صحت کی وجہ سے پریشان ہوں۔ بیگم صاحبہ کو ضمِ معدہ میں درد رہتا تھا۔ اور سینے میں بھی۔ کارڈیوگرام لیا گیا تو قلب کے عارضہ کا بھی شبہ ہے۔ اس لئے کئی روز سے لٹا دیا گیا ہے۔ مجھے ہر وقت ان کے قریب نہ رہنے سے بے چینی رہتی ہے..... اب تکلیف کم ہے مگر جب تک حسبِ معمول چلنے پھرنے نہ دیں پریشان رہوں گا۔"

تو کبھی اپنی لڑکی کی شادی کے تعلق سے لکھتے ہیں:۔

"تہذیب کا ابھی کچھ نہیں ہوا۔ خدا کرے کہ جلد کسی اچھے گھرانے میں طے پا جائے۔ بیکراری کا بھی کچھ نہ ہوا۔"

ایک خط میں انھوں نے اپنے مرگ، مفاجات کے متعلق پیش قیاسی کی ہے۔ شکوۂ دوراں کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"میری قسمت بھی عجیب ہے۔ اس اہتمام سے درگاہ کی عمارتیں بنوائیں اور کچھ عرصے بعد اس سے بے تعلق ہو گیا ایوانِ اردو بنایا۔ اپنی زندگی ہی میں چھوڑ آیا۔ اب یہاں کشمیر اردو اکیڈیمی کی بنیاد ڈال رہا ہوں شاید عمارت بن جانے کے بعد اس کو بھی چھوڑ دوں گا۔ موتوقبل ان تموتوا کی مثل صادق آتی ہے۔"

جس طرح مشاہیر کے خطوط سے، اُن کی سوانح ترتیب دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہم ڈاکٹر زورؔ کے خطوط سے اُن کی زندگی کا ایک نقش تیار کر سکتے ہیں۔ جس میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلو، ہمارے دل کو یوں دعوتِ نظارہ دیتے ہیں کہ ہم کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دیتے۔ بقول حافظ ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشید کہ جا اینجا است

●■

"اردو نامہ" صفحہ ۵۴ سے آگے۔

نے نظامت کے فرائض انجام دیئے کئی شاعروں نے نعتیہ کلام پیش کیا۔

● مرکز ادب کا ادبی و شعری اجلاس جناب ابوالمحامد عرشی کی صدارت میں ہوا۔ ناصر شطاری نے کہانی سنائی۔ محفلِ شعر میں کئی شاعروں نے غزلیں سنائیں۔

● ریاستی اردو اکیڈمی کے دفتر پر اراکین اکیڈمی اور محبانِ اُردو سے مشہور نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صدر شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اُردو تعلیم اور زبان و ادب کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ "اُردو زبان کو ملک میں آئینی موقف دیا جانا چاہیئے۔ اُردو کے قانونی تحفظ سے اُسکے سماجی مرتبے میں اضافہ ہوگا۔ اس خیر مقدمی تقریب کی صدارت جناب آصف پاشا ریاستی وزیر و صدر اکیڈمی نے کی۔ پروفیسر نارنگ نے مزید کہا کہ گزشتہ تیس برسوں میں اُردو سے حق تلفی روا رکھی گئی اس کے باوجود یہ زبان آب و تاب کے ساتھ زندہ ہے اس کی یہی وجہ ہے کہ اس زبان میں صوتی، صرفی، نحوی، تہذیبی، شعری، جمالیاتی اور معنوی صلاحیتیں موجود ہیں جو ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں پائی جاتیں۔

ابتداء میں صدر مجلس انتظامی اکیڈمی جناب عابد علی خاں نے پروفیسر نارنگ کا خیر مقدم کیا اور ان کی علمی و لسانی بصیرت کو خراجِ تحسین ادا کیا۔ عابد علی خاں صاحب نے اکیڈمی کی سرگرمیوں سے متعارف کرایا۔ محفلِ شعر میں مسز کنول پرشاد کنول، ڈاکٹر مغنی تبسم، اختر حسن، سعید بن محمد نقش، صلاح الدین نیر، گیان سنگھ شاطر، ناصر کرنولی، ڈاکٹر اشرف رفیع اور وقار خلیل نے کلام سنایا۔ صلاح الدین نیر نے محفلِ مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔ اور جناب بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر اکیڈمی نے شکریہ ادا کیا۔

● ایچ ای ایچ دی نظام اُردو ٹرسٹ لائبریری کی طرف سے منعقدہ ادبی محفل میں پروفیسر نارنگ کا خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی سابق صدر شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی نے اس تقریب کی صدارت کی۔ ڈاکٹر یوسف سرمست نے خواجہ صاحب اور نارنگ صاحب کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان حضرات کی ادبی خدمات کی ستائش کی، پروفیسر گوپی چند نارنگ نے "احتشام حسین کے لسانی شعور" پر عالمانہ مقالہ سنایا۔ جناب عبدالمحمود ڈائرکٹر نظام ٹرسٹ لائبریری نے شکریہ ادا کیا۔

۲۵ ستمبر: اقبال اکیڈمی کی مجلس عاملہ میں جسکی صدارت جناب حامد علی عباسی نے کی جناب غلام یزدانی کی تجویز پر طے کیا گیا کہ حیدرآباد پر اقبال کی شایانِ شان یادگار کے طور پر "اقبال ہال" کی تعمیر عمل میں لائی جائے اس سلسلے میں ایک کمیٹی کی تشکیل دی گئی اس اجلاس پر اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں سہ روزہ اجلاسوں کے انعقاد کے بارے میں فیصلے لئے گئے نومبر کے پہلے ہفتہ میں یہ تقاریب منعقد ہونگی۔

۳۰۔ ستمبر: ریاستی انجمن ترقی اُردو کے پریس نوٹ کے مطابق ایسے لڑکے اور لڑکیوں کے لئے جن کی مادری زبان اُردو ہے لیکن وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے یا بہت کم جانتے ہیں ان کے لئے ہر روز شام میں ۵ تا ۶ بجے اُردو ہال حمایت نگر میں مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

رؤف خلش

وہ مسیحِ سخن...

سانولی سرزمینِ دکن
علم و تاریخ و تہذیب کی انجمن
جس کی مٹی سے اٹھا اک ایسا مسیحِ سخن
جس نے شمعِ ادب کی لوؤں کو دیا
اپنی فکر و نظر کا ہر اک بانکپن
جس نے دکنی تمدن کے اوراق پر
محمد قلی کو ابھارا
جس نے اردو کے پھولوں کو مہکار بخشی
چمن در چمن :

دُور صحرا میں وہ کھو گیا ہے مگر
اس کی ہر کھوج، اس کا وہ دیوانہ پن
جب بھی "ایوانِ اردو" میں چمکیں گے بن کے کرن در کرن
شہد گھولیں گے کانوں میں دکنی کے میٹھے بچن
دکنی بولی کو اقطاعِ ہندوستان میں بنایا اسی نے جسے معتبر
یاد آتا رہے گا وہ بانکا سلونا سجن
وہ مسیحِ سخن
وہ مسیحِ سخن

صادق نقوی

نذرِ زورؔ

یہ انسانوں کی بستی ہے، یہاں ہر چیز فانی ہے
یہاں انسان قسطوں میں فنا ہوتے ہیں ہر لمحہ
کبھی آنکھوں کو موت آتی ہے حق دیکھا نہیں جاتا
کبھی ہاتھوں کو موت آتی ہے حق چھینا نہیں جاتا
کبھی پیروں کو موت آتی ہے حق تک جا نہیں سکتے
کبھی ہونٹوں کو موت آتی ہے حق بولا نہیں جاتا

مگر اے دوست! اس دارِ فنا کی سرد وادی سے
کچھ ایسے لوگ بھی اٹھتے ہیں جو مر ہی نہیں سکتے
یہ وہ ہیں جن کی آنکھوں سے ضیا تقسیم ہوتی ہے
یہ وہ ہیں جن کے ہاتھوں سے بقا تقسیم ہوتی ہے
یہ وہ ہیں جن کے پیروں سے وفا تقسیم ہوتی ہے
یہ وہ ہیں جن کے چہرے سے حیا تقسیم ہوتی ہے
بدن ان کے بھی مر جاتے ہیں لیکن وہ نہیں مرتے
کہ موت آ ہی نہیں سکتی کبھی جذبوں کے خالق کو
اگر یہ مانتے ہو پھر یہ مانو زورؔ زندہ ہیں
خدا رکھے خیالوں میں، وفا میں، ذہنِ انساں میں
اگر آنکھوں میں بینائی ہے دیکھو کس نے بخشا ہے
زباں کی شاہزادی کو حسینِ ایوان کا تحفہ
یہ کس نے "شاہ پاروں" کو اٹھا کر دیا پھر سے
مرتب کر دیا کس نے قطب شاہوں کے نغمے کو
یہ کس کی جستجو ہے جس نے ماضی کی کتابوں کو
سلیقہ سے، مہارت سے، محبت سے سجایا ہے
یہ کس کے نام سے علم و عمل کے دیپ جلتے ہیں
کمال و فن کے جادے پر زباں والوں کی منزل ہیں
یہ کس نے جستجو کی روح پھونکی نوجوانوں میں
مروت سے، محبت سے، خلوصِ دل کی منزل سے
چلو پھر اُس کے در پر آج تجدیدِ وفا کر لیں
سلامِ شوق کر لیں زندگی کا آسرا کر لیں

فاطمہ پروین

ڈاکٹر زور کی ادبی خدمات

آج ہم ایک وسیع النظر نقاد، محقق، ماہر لسانیات اور ادارۂ ادبیات اردو کے معمار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم کی یاد تازہ کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں تاکہ ان کی حیات جاوید اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں اور کارناموں کو خراجِ تحسین پیش کریں

ڈاکٹر زور ان شخصیتوں میں تھے جو ایک بیدار دل اور متلاطم ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ آپ نے طالب علمانہ زندگی سے لیکر موت تک جس علمی سطح کا کام کیا ہے اس کی نظیر ڈھونڈنے سے نہیں ملے گی۔ زور صاحب نے اردو کی اعلیٰ اور معیاری تدریس، اردو کے متعلق تحقیقی کام، ادارۂ ادبیاتِ اردو کا قیام، ادارہ کے کتب خانہ کی تاسیس پر جس انداز سے توجہ دی اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی شخصیت پہلودار اور ہمہ رنگ تھی یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت افسانہ نگار بھی تھے اور شاعر بھی مورخ بھی تھے اور نقاد بھی، ماہر لسانیات بھی تھے اور ماہرِ تعلیم بھی۔ کوئی چالیس سال تک وہ زبان و ادب کی خدمت کرتے رہے اور چالیس سے زیادہ ان کی مستقل تصنیفات ہیں، چیدہ چیدہ مضامین کا تو کوئی حساب ہی نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کا سب سے گراں بہا کارنامہ دکنی ادب اور تاریخ کو علمی رکھ رکھاؤ کے ساتھ ہر دل عزیز بنانا ہے گو اس سلسلے میں ان کے پیش رو اور اصحاب بھی تھے لیکن حیدرآباد اور دکن کی زبان و ادب اور تہذیب و معاشرت کو اُجاگر کرنے کے منصب کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا انھیں دکن اور دکنی تہذیب سے والہانہ محبت تھی۔ "اردو شہ پارے" "کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" "حیاتِ محمد قلی قطب شاہ" "حیاتِ میر مومن" "داستانِ ادب حیدرآباد" "حیدرآباد فرخندہ بنیاد" اور دکنی اُردو ادب کے مطالعہ سے اس امر کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں حیدرآباد، اس کے بانی سلطان محمد قلی قطب شاہ اور اس کے اثر سے وجود میں آنے والی تہذیب سے کس درجہ عشق تھا۔

دکن میں اُردو زبان، دکنی مصنفین، مولفین، شعرا اور صوفیائے کرام کی سیکڑوں سال پرانی، بوسیدہ، کرم خوردہ تصنیفات و تالیفات اور بلند پایہ بزرگوں کے خیالات اور ان کی زندگی کے رازہائے سربستہ کھولنے کی مرحوم نے جو انتہائی کوشش کیں ان کو اپنی تقریروں، تحریروں، تصانیف اور تذکروں غرض کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

"کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ" کی تدوین ہی ڈاکٹر زور کا ایسا زبردست کارنامہ ہے جو ہمیشہ اہل ذوق حضرات سے دادِ وصول کرتا رہے گا اور سخت سے سخت نقاد بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرسکتا کیونکہ اس کی وجہ سے اُردو ادب کی عمر میں قابل قدر مدت کا اضافہ ہوگیا ورنہ اس سے قبل ولی کو ہی اُردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کلیات کو مرتب کرتے ہوئے اس کے ساتھ ایک طویل اور پُر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔ اس کلیات کے بارے میں رشید الدین صاحب کا خیال ہے کہ مستقبل میں جب ہماری یہ نسل نہ ہوگی اور شخصی طور پر ڈاکٹر زور سے کوئی واقف نہ ہوگا اس وقت بھی یہ کتاب اتنی ہی اہمیت کی حامل ہوگی جتنی آج ہے بلکہ جب قدامت کی اہمیت اور بڑھ جائے گی اور وہ اُردو کی کلاسیکی کتابوں میں شمار ہوگی"

تنقید کے میدان میں بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنی عظمت اور برتری کا لوہا منوایا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "روح تنقید" اس وقت شائع کی جب ان کی عمر بیس اکیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس وقت تک اردو تنقید پر مغربی تنقید کا اثر غالب تھا انہوں نے مغربی ادیبوں کے بہت سے اقوال اور خیالات یکجا کر دیئے جن کی مدد سے تنقیدی مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی جا سکتی تھی اب ان میں سے اکثر خیالات عام ہو کر تنقیدی ادب کا جزو بن چکے ہیں لیکن اس وقت یہ کام اہم تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت وہ طالب علم تھے اور یہ کوشش طالب علمانہ تھی لیکن اس وقت بھی ان کی سوجھ بوجھ نے ایک ضروری کام انجام دیا
"تنقیدی مقالات" اور "تین شاعر" کے مضامین جو جلد جلد اور تھوڑی تھوڑی مدت میں لکھے گئے۔ ان میں سے بعض مضامین پہلی مرتبہ ایک نئے تنقیدی اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ "اردو کے اسالیب بیان" ایک منفرد تنقیدی تصنیف ہے جس کے مطالعہ سے زور صاحب کے ادبی شعور کا اندازہ ہوتا ہے اس کتاب میں انہوں نے قدیم و جدید اساتذۂ فن کے طرز و اسلوب پر رائے زنی کی ہے اور ان کی انفرادی خصوصیات بیان کی ہیں۔ ان کی تنقید نگاری کی نمایاں خصوصیت تفصیل ہے جامعیت کے ساتھ زیر قلم موضوع کے تمام گوشوں کو اجاگر کرتے ہوئے متفرق اور متضاد پہلوؤں کا ذکر کرتے ہیں آخر میں قطعی اور واضح نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے اپنے ادبی اور شعری نظریات کی صحت اور صداقت کے لئے ممتاز مشاہیر کی ادبی و فنی تخلیقات میں سے موزوں اور برمحل حوالے پیش کرتے ہیں۔

"ہندوستانی لسانیات" میں ڈاکٹر زور نے ان موضوعات پر لکھا جو نہ صرف اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک بھی اردو میں نئے تھے ان کی لسانیاتی تخلیقات کو عرصہ گزر چکا ہے اس دوران میں لسانیات کا علم بہت کچھ ترقی کر چکا ہے آج بھی ان کی تحریروں میں استقام نظر آتے ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں یہی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔

افسانوی ادب میں انہوں نے کوئی خاص مقام حاصل نہیں کیا لیکن دکن کی تہذیب کے بعض گوشے ان سے ضرور متعلق ہوئے ہیں غالباً ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ افسانوں کے پیرایہ میں ان کی طرف متوجہ کریں "سیر گولکنڈہ" اور "گولکنڈے کے ہیرے" اس حیثیت سے اہم ہیں کہ ان میں دکن کا تہذیبی حسن نمایاں کیا گیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے لوگوں میں دکن کی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"ادارۂ ادبیات اردو" کا قیام اسی مقصد کے تحت ہوا تھا کہ حیدرآباد اور جنوبی ہند میں اردو کا فروغ عام کیا جائے اور اس خطہ کے موجودہ اور گذرے ہوئے شاعر اور ادیب اردو دنیا میں اس طرح روشناس ہوں کہ ان کا جائز حق ان کو مل سکے اور ساتھ ہی اردو امتحانات کی جو طرح انہوں نے ڈالی تھی کہ اس کے ذریعہ سے اردو کی اشاعت و توسیع کی جائے۔ آج بھی زور صاحب کی علمی خدمات کی نمائندگی کر رہے ہیں

ایک مختصر مقالہ میں ڈاکٹر صاحب کے علمی، ادبی اور عملی خدمات کا جائزہ لینا ممکن نہیں۔ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ ایک وقت پڑھنا، پڑھانا، لکھنا لکھانا۔ کئی اداروں کا انتظام سنبھالنا، علم و ادب کے مختلف شعبہ جات میں تحقیق، شعر و شاعری، جرائد اور مجلات جاری کرنا، ایوان اردو بنوانا، پرنسپل، صدر شعبہ اور معتمد اعزازی کے فرائض بجا لانا، تحقیق و تنقید لکھتے رہنا، تحقیق و تنقید میں لگائے رکھنا، خود شب و روز کام کرنا اور دوسروں کو کام کرنا سکھانا، اردو زبان و ادب کی بے شمار شخصیتوں کو تعلیم اور پیدا کرنا کسی ایسے ہی انسان کا حصہ ہو سکتا ہے جس کی زندگی قوت اور حرکت کا ابلتا چشمہ ہو۔

عظیم منزلوں اور نئی سرحدوں کی جانب پیش رفت

آج آندھراپردیش عظیم منزلوں اور نئی سرحدوں کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔ ریاست میں ترقیاتی سرگرمیاں زور وشور سے جاری ہیں۔ ۱۹۷۶ء - ۷۷ کے سالانہ منصوبے کے اخراجات ۲۹۰٫۳۸ کروڑ روپلے کے مقابلے میں سال ۱۹۷۷ء - ۷۸ کے لئے منصوبہ جاتی اخراجات کو بڑھا کر ۲۶۵٫۷۵ کروڑ روپیے کر دیئے گئے تھے۔ اب ان اخراجات میں مزید اضافہ ہوا ہے اور یہ ۲۸۰٫۳۸ کروڑ روپلے تک پہونچ گئے ہیں۔

زرعی شعبہ حسب دستور مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ کثیر پیداواری اقسام کے پروگرام کے تحت کاشتکاری کے بڑھ چڑھ کر نشانے مقرر کئے گئے ہیں۔ کیمیائی کھاد کی اب قلت نہیں رہی ہے — شعبۂ آبپاشی کو ترقی دینے کے نتیجے میں توقع ہے کہ ۱۹۷۷ء - ۷۸ کے دوران میں مزید ۵۵۲۷۰ ہیکٹر رقبے کو سیراب کرنے کی گنجائش پیدا ہو جائے گی۔ کارپوریشن برائے فروغ آبپاشی نے لفٹ اریگیشن کی متعدد اسکیمات کی عمل آوری کا کام شروع کر دیا ہے۔

شعبۂ صنعت کے لئے ۱۹۷۶ء - ۷۷ میں مقررہ گنجائش اخراجات ۷٫۵۷ کروڑ روپلے کو بڑھا کر ۱۹۷۷ء - ۷۸ میں ۸٫۰۳ کروڑ روپلے کر دیا گیا ہے۔

آندھراپردیش نئی سمتوں کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔ آئیے ہم سب مل کر اس پیش رفت میں سرعت پیدا کریں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھراپردیش حیدرآباد

No: 14 - 77-78/2/1032
ADVT/C3/77

نقد و نظر

(۔ تبصرہ کیلئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہے)

نئی اردو شاعری' ایک تجزیاتی مطالعہ' از زینت اللہ جاوید'
صفحات ۱۴۴۔ ڈیمائی سائز۔ قیمت دس روپے' اشاعت جون ۱۹۷۷ء۔
ناشر: ایجوکیشنل پبلیکیشنز' منظور پورہ' اورنگ آباد۔ (مہاراشٹرا)

یہ زینت اللہ جاوید کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو ناگپور یونیورسٹی سے اردو اور فارسی میں ام اے کرنے کے بعد شعبۂ اردو فارسی گورنمنٹ کالج اورنگ آباد میں فارسی کے استاد کی حیثیت سے مامور رہ چکے ہیں اور اب ناردرن ریجنل لنگویج سنٹر پٹیالہ میں " لکچرشپ " کر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں نئی شاعری اور جدیدیت کے مسائل کو زیر بحث دیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مضامین کسی خاص مقصد کے پیش نظر سرسری طور پر بہت روا روی میں لکھے گئے ہیں۔ ان پر کاتا اور لے دوڑی کی مثل پوری طرح صادق آتی ہے۔ ان مضامین کی تیاری میں مصنف نے انھیں موضوعات پر لکھے گئے چند مضامین اور کتابوں سے فراخ دلی کے ساتھ استفادہ کیا ہے۔ اور چونکہ اصل مسائل کے بارے میں ان کی اپنی معلومات محدود اور ناقص ہیں اس لئے جہاں کہیں بھی انہوں نے " ذاتی خیالات " پیش کرنے کی جسارت کی ہے وہ ان کے فہم و علم کی بے بضاعتی کا اشتہار بن گئے ہیں۔ بات صرف استفادہ تک محدود ہوتی تو گوارا کیا جاتا تھا۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ مصنف / مولف نے مختلف مصنفوں اور مضمون نگاروں کی عبارتوں سے اینٹ اور روڑے کا کام لے کر بھانامتی کا کنبہ جوڑ دیا ہے۔ ان عبارتوں کو مضامین سے الگ کر دیا جائے تو رطب و یابس کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا ۔ یہاں صرف ایک مضمون سے اس کرشمہ سازی کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔ جو عبرت دلانے کے لئے کافی ہے۔ مضمون کا عنوان " نظریۂ وجودیت " ہے۔ اس مضمون سے صرف دو وجودی فلسفیوں سارتر اور مارسل کے خیالات کا " نچوڑ " پیش کیا گیا ہے جو تمام تر ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب " فرانسیسی ادب " سے سرقہ ہے۔ لیکن سرقہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا گیا۔ عبارتوں کے ردوبدل میں کہیں کہیں مفہوم کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے سارتر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا کہ " ژاں پال سارتر اس وقت فرانس میں وجودیت کی تحریک کا قائد مانا جاتا ہے " (ص ۱۱۵) زینت اللہ جاوید نے اس بیان میں یوں تحریف کر دی " وجودیت کی تحریک دراصل فرانس سے چلی' جس کا قائد سارتر مانا جاتا ہے " (ص ۲۲)۔ اگر موصوف ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب کے اس حصے کو غور سے پڑھتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ یہ تحریک فرانس سے نہیں چلی۔ سارتر کے بارے میں آگے چل کر ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے صاف صاف لفظوں میں اس کی صراحت کر دی ہے کہ " سارتر کے خیالات پر جرمنی کے

وجودی فلسفی ہائیڈگر سے متاثر ہیں" (ص ۵۴۴) ذیل میں کسی مزید تبصرہ کے بغیر زینت اللہ جاوید کے مضمون "نظریۂ وجودیت" اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی کتاب "فرانسیسی ادب" سے چند عبارتیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں۔ تاکہ صاحب کتاب مضمون نگار کی "دیدہ دلیری" داد سے محروم نہ ہو جائے۔

نظریۂ وجودیت

وہ (سارتر) کہتا ہے انسان تنہا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کے باعث وہ بے کس ولاچار ہے لیکن اس کی یہ ذمہ داری خود اپنے وجود کے دو بدو ہے۔ سارتر انسان کو اپنے اعمال کا مجبور بتاتا ہے۔ سارتر نے اپنے ناولوں کے کردار سے جدید تہذیب کی بحرانی کیفیت کا عکس اجاگر کیا اور وجودیت کے اصولوں کو بھی کردار کے ذریعہ پیش کیا ہے پھر انہیں اصولوں کو وجود اور عدم وجود (L'ETRE ET NEANT) میں فلسفیانہ طور پر بیان کیا ہے (ص ۳۳)

● اس نے (مارسل نے) اپنے مشہور ڈرامہ "اللہ والا" (UN HOME DIE) میں جامعی زندگی کی برکت کو اجاگر کیا ہے۔ وہ انسان کی ذات کی تکمیل کے لئے انسان کا اس کے اندر سے اپنے اندرونی خول سے باہر نکلنا انتہائی ضروری سمجھتا ہے۔ سارتر تعقل، روح خود اور خدا کے دائروں سے نکل کر اس محدودِ تنگ میں آزادی کے مینار پر نظر رکھتا ہے۔ جب کہ مارسل انسان کی حقیقی آزادی ذاتِ باری کو لو لگانے میں محسوس کرتا ہے۔ خدا کا اپنے لئے انتخاب کرنا اس کی نظر میں قابلِ فخر ہے جس کی عقیدت کے بغیر عمل کی دنیا افراتفری میں مبتلا رہتی ہے۔ مارسل کی وجودیت میں مذہبی باطنیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ مذہبی باطنیت چاہے وہ مسیحیت کی ہو یا اسلام کی اس میں روح کی ایسی کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو وجودیت کے فلسفے سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً سالک کو اپنے وجود میں ذہنی کرب، ذمہ داری اور تحیر کا شعور اور محبوب سے قرب و اتصال کی تمنا کا احساس ہو جاتا ہے۔ مسیحیت اور اسلام کا خدا حی و قیوم ہے اور پکارنے والے کی آواز سنتا ہے۔ اور انسانی وجود کی داخلی تنہائی

فرانسیسی ادب

وجودیت کے ماننے والے کہتے ہیں کہ انسان تنہا ہے اور اپنی بے شمار ذمہ داریوں کے باعث وہ بے کس اور لاچار ہے (ص ۵۴۴) لیکن یہ ذمہ داری خود اپنے وجود کے دوبدو ہے (ص ۵۴۴)۔ انسان اپنے اعمال کا مجبور ہے (ص ۵۴۴)۔ غرض کہ جدید تہذیب کی بحرانی کیفیت کا عکس بھی خاص طور پر اس کے کرداروں میں نظر آتا ہے۔ (ص ۵۴۲)۔ سارتر نے وجودیت کے جن اصولوں کو اپنے ڈراموں اور ناولوں کے کرداروں کے ذریعہ پیش کیا ہے اور پھر انہیں کو "وجود اور عدم" (L'ETRE ET NEANT) میں فلسفیانہ طور پر بیان کیا ہے۔ (ص ۵۴۳)

● اس ڈرامے "اللہ والا" (UN HOME DE DIEU) میں مارسل نے جامعی زندگی کی برکت کو اجاگر کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب تک فرد اپنے اندرونی خول میں سے باہر نہیں نکلتا خود اس کی ذات کی تکمیل نہیں ہوتی۔ (ص ۵۴۵) — اس پابند عالم کے بیچوں بیچ اسے (سارتر کو) آزادی کا مینارہ جگمگ کرتا نظر آتا ہے۔ (ص ۵۴۳) — حقیقی آزادی انسان کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب وہ اپنے ذریعہ بلند ہستی یعنی ذاتِ باری سے لو لگاتا ہے۔ یہی اس کا استدلال ہے کہ وہ خدا کا اپنے لئے انتخاب کرتا ہے (ص ۵۴۵)۔ اس لئے مارسل کی (وجودیت) وجودیت میں مذہبی باطنیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ مذہبی باطنیت چاہے وہ مسیحیت کی ہو یا اسلام کی اس میں روح کی ایسی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں جو وجودیت کے فلسفے سے بہت مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً سالک کو اپنے وجود میں ذہنی کرب، ذمہ داری اور تحیر کا شعور اور محبوب سے قرب و اتصال کی تمنا کا احساس ہو جاتا ہے (ص ۵۴۸) مسیحیت اور اسلام کا خدا حی و قیوم ہے اور پکارنے (ص [illegible]) والے کی آواز سنتا ہے۔ اور انسانی وجود کی داخلی تنہائی

دور کرنے والا اور کوئی نہیں، نہ اہل وعیال نہ ریاست نہ سوسائٹی۔ ذات باری کی بدولت انسان اپنے وجود سے ماورا ہو جاتا ہے، جس سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعین ہوتا ہے ——— (ص ۴۷)

اس کے ذریعے دور ہوتی ہے۔ ورنہ اس تنہائی کو دور کرنے والا اور کوئی نہیں نہ اہل وعیال نہ ریاست اور نہ سوسائٹی۔ ذات باری کی بدولت انسان اپنے وجود سے ماورا ہو جاتا ہے جس سے اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا تعین ہوتا ہے۔ (ص ۵۴۹)

(ڈاکٹر مغنی تبسم)

لمحات کا بہتا دریا

(شعری مجموعہ) ست نام سنگھ خمار، ڈیمائی سائز صفحات (۱۱۲) مجلد معہ گرد پوش قیمت -/۱۰ روپے

ملنے کا پتہ : کرمانی پبلی کیشنز ۱۷۶۸، حوض سوئی والان نئی دہلی ۲۱۔

"لمحات کا بہتا دریا" پنجاب کے خوش فکر شاعر ست نام سنگھ خمار کی اولین شعری پیش کش ہے۔ پروفیسر جاوید وششٹ نے خمار کو نکہت و رنگ و نور کا شاعر بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "لمحات کے دریا کی موجوں میں خمار ماضی، حال اور مستقبل کے مسلسل اور اٹوٹ رشتوں کو پالینے کے ہنر سے واقف نظر آتے ہیں" مرحوم مخمور شمیم کرمانی نے مقدمہ لکھا ہے اور خمار کی فعال شعری صلاحیتوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ ست نام سنگھ خمار، نظم اور غزل کے البیلے پنجابی نژاد شاعر ہیں کلام میں شوخی، رنگینی اور وطن سے بے پناہ محبت کی لہریں ملتی ہیں" ان کے جذبات میں دروں بینی اور ٹھہراؤ آتے آتے آئے گا مگر یہ جو کچھ چھپا ہے بہتر اور غنیمت سرمایۂ سخن ہے، چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

پھولوں کی آگ اب تو کبھی نظر نہ آئے ؛ اُترے کوئی سمندر صحرائے تشنگی میں
حسن الفاظ کی خوشبو سے معطر لوگو ؛ معنویت کی گپھاؤں میں اُتر کر دیکھو

اُبھر رہی تھی صدا درد کے نشیمن سے ؛ سسک رہے تھے مرے پاس یاد کے بادل
اتنی فرصت ہی کہاں روٹھیں لڑیں ؛ زندگی دو چار دن کی بات ہے

قصہ مختصر: ست نام سنگھ خمار کو نئی شعری روایات کے بہاؤ کو نظر میں رکھ کر احتیاط سے قدم بڑھانا چاہئے۔ ویسے ان کی شاعری ابھی لمحات کے بہاؤ میں رواں ہے۔ (وقار خلیل)

جلوے

(مدحت اہل بیت) ساجد رضوی صفحات (۱۷۶) قیمت -/۵۔

ملنے کا پتہ : ساجد رضوی ۹۱۳-۱-۲۲ سلطان پورہ حیدرآباد ۲۴۔

ساجد رضوی حیدرآباد کے معروف شاعر، موصوف کو مدحت اہلبیت و غم حسینؑ سے والہانہ شغف رہا ہے جس کا ثبوت ان کی منقبتیں، سلام اور نوحے ہیں "جلوے" اسی سلسلے کی ایک معتبر کوشش ہے۔ اس سے پہلے "تجلیاں" اور "شمع حرم" کے نام سے دو شعری تخلیقات شائع ہو چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے ساجد رضوی کی ذہانت فکر اور اصحاب اہل بیت سے ان کی عقیدت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ اُردو میں نوحوں اور مرثیوں کی روایت روشن رہی ہے۔ دکن کے نامور شعرائے اہل بیت نے جن میں حضرت نجم آفندی سر فہرست ہیں، اپنے افکار کی طہارت سے نام پیدا کیا۔ ساجد رضوی نے نجم صاحب ایسے بزرگوں سے فکری و فنی استفادہ کیا ہے تبھی تو ان کے سلام، نوحے اور منقبتیں جی لگا کر پڑھی جاتی رہی ہیں۔ 'جلوے' میں (۵) ابواب پر طویل نظمیں شامل ہیں جن کے عنوانات سرور کائنات، مولائے کائنات، قصائد عید غدیر، جناب سیدہؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور حضرت عباسؑ ہیں، ان نظموں میں فکر کا احترام، لہجے کی شائستگی اندازِ بیان کا احسن طریق، مضامین کی رنگا رنگی اور مواد کی تقدیس روشن نظر آتی ہے ——— (و، خ)

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ : علمی ادبی اور تہذیبی خبرنامہ

۴۔ ستمبر : ڈاکٹر غوث الدین کی ادارت میں پندرہ روزہ "یونانی طب" کا پہلا شمارہ شائع ہوا۔ ایک خوشگوار تقریب میں جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" نے رسم اجرا انجام دی، حکیم ظہور الحسن پرنسپل نظامیہ طبیہ کالج نے صدارت کی۔ اطباء نے اردو صحافت میں طبیبوں کے رول اور طب یونانی کی افادیت پر روشنی ڈالی۔

۶ ستمبر : اقبال اکیڈمی کے زیر اہتمام نومبر کے پہلے ہفتے میں منائی جانے والی اقبال صدی تقاریب کے ایک جز نمائش اقبالیات کے سلسلہ میں مشاورتی اجلاس منعقد ہوا۔ مشہور مصور سعید بن محمد نقش نے فنی مشوروں سے کمیٹی کو واقف کروایا۔

۸ ستمبر : جواں فکر اور باشعور ادیب ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (ریڈر شعبہ اردو وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی) کی چھٹی ادبی تخلیق "تنقیدی افکار" کے نام سے شائع ہو کر مارکٹ میں آئی۔ ڈاکٹر جاوید کے ۱۵ مقالات کا یہ مجموعہ ریاستی اردو اکیڈیمی کے بکڈپو اور نیشنل بکڈپو حیدرآباد ۲ سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

● معروف افسانہ نویس جناب عوض سعید کی تیسری کتاب "رات والا اجنبی" ریاستی اردو اکیڈیمی کی اعانت سے شائع ہو گئی ہے۔ اس سے پہلے عوض سعید کی کہانیوں کے دو مجموعے "سائے کا سفر" اور "تیسرا مجسمہ" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ مؤخر الذکر افسانوی مجموعہ ریاستی اردو اکیڈمی کے بکڈپو سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۱۰ ستمبر : دانشور نقاد اور مورخ ادیب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کا معلوماتی اور مفید مقالہ "مطالعہ کیوں اور کیسے" کے نام سے چھپ گیا ہے ۴۸ صفحات پر مشتمل اس کتابچہ میں معلومات کا وافر ذخیرہ یکجا کیا گیا ہے اور چھوٹے چھوٹے (۴۵) عنوانات کے تحت مطالعہ کی افادیت اور اس کے مضمرات پر عام فہم اور دل نشین انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اردو داں حلقوں اور کتب خانوں میں اس کتاب سے استفادہ عام کیا جانا چاہیے، یہ کتاب اردو اکیڈمی بکڈپو حیدرآباد ۲ سے تین روپے میں خریدی یا طلب کی جا سکتی ہے۔

۱۲ ستمبر : معروف دانشور نقاد ڈاکٹر ملک راج آنند نے سالار جنگ میوزیم میں "آرٹ ایک لغو یا تخلیقی صلاحیت کا اظہار" کے موضوع پر لکچر دیتے ہوئے بتایا کہ فنون لطیفہ کے معاملے میں ہندوستانی دانشور جمالیاتی پہلوؤں سے کہیں زیادہ تاریخی واقعات سے محظوظ ہوتے رہے ہیں

۱۵ ستمبر : "گاندھی درشن منڈپ" میں مختلف زبانوں کے ادیبوں کی ایک کانفرنس "حیدرآباد سماچار" کی طرف سے منعقد ہوئی جس کی صدارت تلگو ادیب مسٹر بھوئی بھیملنے کی۔ مسٹر نہپال سنگھ ورما کنوینر نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس کانفرنس کو اردو کے دانشور ادیب ڈاکٹر الندمنظم الد جناب یوسف اعظمی لکچرر انوار العلوم کالج نے بھی مخاطب کیا۔ ہر دو مقررین نے مختلف زبانوں سے باہمی ترجموں کی افادیت پر زور دیا اور ایسی کانفرنسوں کو لسانی اتحاد کے لئے بہتر قرار دیا۔ اس موقع پر ادیبوں کی بڑی تعداد نے طے کیا کہ "سرد ا بھاشا لیکھک پنچ (سبھی زبانوں کا فورم)" کے نام سے ایک اڈھاک کمیٹی نامزد کی جائے۔ اس نوتشکیل شدہ فورم میں اردو کی نامور ادیبہ محترمہ جیلانی بانو اور یوسف اعظمی کے ساتھ ہندی کے نہپال سنگھ ورما ڈاکٹر وشنو سروپ، تلگو کے بھوئی بھیما جی بن اشوک اور مراٹھی، کنڑی، تامل کے ایک ایک ادیب کو شامل کیا گیا ہے۔

۱۷ ستمبر : زندہ دلان حیدرآباد اور طنز و مزاح کے ماہنامہ شگوفہ کی طرف سے "ادبی محفل عید" کا اہتمام کیا گیا۔ جناب محمد چند کھنہ ڈائرکٹر ریاستی اردو اکیڈیمی نے صدارت کی۔ مشہور طنز و مزاح نگار رشید قریشی مسیح انجم اور پرویز یداللہ مہدی کے مضامین عید کے موضوع پر فکاہات سنائے۔ محفل شعر میں رشید عباس جمیل نظام ...

۱۱ پٹھو بجو نگیری، اشرف مہدی، طالب خوندمیری، اسمٰعیل ظریف، سریٹ، گرٹیڑ، اور مصطفیٰ علی بیگ نے رنگ جمایا۔ مسیح انجم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ جناب مصطفیٰ کمال مدیر "شگوفہ" نے شکریہ ادا کیا۔

۱۸ ستمبر: اقلیم ادب کا ماہانہ شعری و ادبی اجلاس پروفیسر سید سراج الدین ریڈر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب اختر حسن جوائنٹ سکریٹری ریاستی اردو اکیڈیمی مہمان اور ڈاکٹر سید عبدالمنان مہمانِ خصوصی تھے۔ مہمان افسانہ نگار ادیبہ محترمہ رفیعہ منظور الامین نے کہانی سنائی، جناب مصلح الدین سعدی نے نوجوان ادیب مدیر "حریف" ڈرامہ نویس ادیب جناب جمیل شیدائی سے انٹرویو لیا اور ان کے فن پر تبصرہ کیا۔ معروف سخنور جناب مصحف اقبال توصیفی کی ایک نظم پر اختر حسن، جمیل شیدائی اور حامد مغل نے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ محفلِ شعر میں پروفیسر سراج، اختر حسن، مصحف اقبال، مصلح الدین سعدی، رحمٰن جامی، برق یوسفی، مضطر مجاز، غیاث متین، علی الدین نوید، یوسف خیر، رشید عبدالسمیع جلیل، اثر غوری، احمد قمر اور محمد معین صلاح نے کلام سنایا۔ جناب مفتی نعیم معتمد اقلیم ادب نے اجلاس کی کارروائی انجام دی۔

۱۹ ستمبر: ریاستی انجمن ترقی اردو کے پریس نوٹ میں بتایا گیا ہے کہ اردو کو فروغ دینے کی غرض سے ایسے طلبہ و طالبات کو تعلیمی وظائف دیئے جائیں گے جنھوں نے سال رواں میں ایس ایس سی تک اردو میڈیم میں امتیازی کامیابی حاصل کی ہو اور آئندہ بھی اردو ذریعہ تعلیم سے پڑھنا چاہتے ہوں۔ ایسے طلباء و طالبات متعلقہ صداقتنامے کے ساتھ دفتر انجمن "اردو ہال" حمایت نگر سے رجوع ہوں۔

● گنیش اتسو کے سلسلہ میں ہندی اردو کا ملا جلا مشاعرہ جناب منوہر لال بہار کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کئی قدیم مکتب فکر کے شعراء نے کلام سنایا۔

۲۰ ستمبر: انسٹی ٹیوٹ آف ریلوے سگنل انجینئرنگ اسٹاف سکندرآباد کے زیر اہتمام مشاعرۂ عید جناب شفیع اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ عزیز بھارتی، محسن جلگانوی، عبرت سکندرآبادی، شمیم نصرتی، ناگپال عظیم نے کلام سنایا۔ ریلوے کے کئی باذوق اصحاب و عہدہ داروں نے اس مشاعرہ کو دلچسپی سے سنا۔

● "بزم رفیقانِ طالب رزاقی" کی ایک ادبی محفل میں تشکیل عمل میں آئی۔ جناب خالد کشمیری سرپرست، بشیر وارثی صدر، جلیل افسر رزاقی نائب صدر، تشکیل الور معتمد اور عارف بیابانی معتمد ادب منتخب ہوئے۔

۲۲ ستمبر: ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے امام الہند مولانا آزاد کے یوم پیدائش کے موقع پر ایک ادبی محفل جناب میر اکبر علی خاں سابق گورنر اڑیسہ کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید اور مسٹر رضی الرحمٰن نے "غبار خاطر" پر لکچر دیئے۔ جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر نے شکریہ ادا کیا۔

● ابوالکلام آزاد میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام "یوم آزاد" منایا گیا۔ جناب عزیز سیٹھ مدیر سیاحت حکومت کرناٹک مہمانِ خصوصی تھے۔ جناب سید رحمت علی ڈپٹی اسپیکر ریاستی اسمبلی نے صدارت کی۔ مولانا حافظ ابو یوسف، جناب احسن علی مرزا، جناب غوث خاموشی اور مسٹر سرینواس لاہوٹی نے آزاد کی قومی، ادبی اور مذہبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

● ہندی اور اردو کا ملا جلا مشاعرہ گنیش اتسو کے سلسلہ میں نہایت اہتمام سے مسٹر نرملا داس پیرواسی ایڈیٹر ہندی "طالب" کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ مہمان خصوصی تھے۔ اردو محفل کی نظامت جناب رئیس اختر نے اور ہندی کی مسٹر نہپال سنگھ ورما نے کی۔ کلام سنانے والوں میں امیر احمد خسرو، سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، نہپال سنگھ ورما، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر احسن رضوی، ڈاکٹر تبسم، خیر آنکیم، منوہر لال بہار، رئیس اختر، فیض الحسن خیال، محمد منظور احمد، صادق نقوی، پرواسی، علی چند شششی، ویداکرپانڈے، ویدپرکاش لاہوٹی، ساون اور منیر الزماں منیر قابل ذکر ہیں۔

۲۴ ستمبر: بزرگ شاعر مولانا خواجہ طیباں صدیقی کے نعتیہ مجموعہ کلام "خلدان" کی رسم اجراء کے سلسلہ میں محفل نعت "مولانا معز ملتانی کی نگرانی میں منعقد ہوئی۔ محفل میں شعرا
(بقیہ صفحہ ۶۱ پر ملاحظہ فرمائیں)

آئیے ہم ان کی مدد کریں

ہندوستان کے خوددار سپوتوں یعنی قبائلیوں کی پرورش ہمارے پہاڑیاں اور وادیاں بڑے چاؤ سے کرتی ہیں۔ حصولِ آزادی کے بعد ان کی فلاح و بہبود کے لئے بہت سی اسکیمات شروع کی گئی ہیں۔ فلاحی کاموں میں سب سے زیادہ اہمیت ان کے تعلیمی فروغ کو دی جارہی ہے۔

اس وقت ۲۷۵ کی تعداد میں آشرم اسکول قائم ہیں جن میں متعلمین کی تعداد ۲۲۱۲۰ ہے۔ درج فہرست اور غیر معلنہ قبائلیوں کے لئے ۷۵ - ۱۹۷۴ء میں ۲۹۹ اقامت خانے تھے جو بڑھ کر ۷۷ - ۱۹۷۶ء میں ۳۲۳ ہوگئے۔

ریاست کے قبائلی علاقوں میں صنعتوں کو فروغ دینے کے پیش نظر بہت سی قابلِ قدر ترغیبات رکھی گئی ہیں جیسے محصولِ فروخت، اسٹامپ ڈیوٹی، محصولِ آب اور غیر زرعی محصول وغیرہ سے استثناء۔

آندھرا پردیش شیڈولڈ ٹرائبس کواپریٹیو فینانس کارپوریشن قبائلیوں کی بہبودی اور آسودگی کی جانب غیر منقسم توجہ دیتا ہے۔ اس کارپوریشن نے مئی ۱۹۷۷ء کے ختم تک جملہ ۷۷ء ۵۶ لاکھ روپے مالیت کی اسکیمات منظور کیں جن سے تقریباً ۲۵۶۰ قبائلی مستفید ہوئے۔

آج ہمارے قبائل عظیم منزلوں اور نئی سرحدوں کی جانب پیش رفت کررہے ہیں۔ آئیے ہم ان کی مدد کریں۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

NO:16-77-78/2/1032
ADVT/C3/77

ڈیری کی صنعت ترقی پر ہے

آندھرا پردیش میں ڈیری کی صنعت ترقی پر ہے۔ ۱۹۷۴ء میں آندھرا پردیش ڈیری ڈیولپمنٹ کارپوریشن کا قیام ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران میں اس کارپوریشن نے ۹۸۴ لیٹر دودھ حاصل کیا اور اس کے علاوہ ۲۵۴ ٹن مسکہ۔ ۲۲۱۸ ٹن گھی۔ ۱۱۶۷ ٹن دودھ پاؤڈر تیار کیا۔ کارپوریشن کی اس لائق ستائش کارکردگی کی بدولت ڈیری کی صنعت کو زبردست بڑھاوا ملا ہے۔

کارپوریشن کی زیر نگرانی اس وقت ریاست میں چارہ تیار کرنے والے چار کارخانے کام کر رہے ہیں۔ جن سے دودھ سربراہ کرنے والوں کو مویشیوں کے لئے روزانہ ۸۵ ٹن متوازن چارہ فراہم کیا جاتا ہے۔ ان چار کارخانوں کے علاوہ دو اور کارخانوں کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔

توقع ہے کہ ڈیری کی صنعت آنے والے برسوں میں بھی بدستور اہم کردار ادا کرتی رہے گی۔

ناظم محکمۂ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش، حیدرآباد

No. 15-77-78/2/1032
ADVT/C3/77

سن اجراء : ۱۹۳۸ء ۔ فون نمبر : ۳۸۴۶۹
بانی نگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

نگراں : سید علی اکبر ایم اے کینٹب
معتمد مجلس مشاورت : غلام جیلانی
مرتب : وقار خلیل

اقبال نمبر

نومبر ۱۹۷۷

جلد : ۴۰ ★ شمارہ : ۱۱

زر سالانہ : ۱۲ روپے
ششماہی : ۷ روپے
فی شمارہ : ایک روپیہ پچیس پیسے

پرنٹر پبلشر : سید علی اکبر ۔ مطبوعہ : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۔ مقام اشاعت : ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

سڑک کے رستے سفر کرنے والوں کو ریلوے
لیول کراسنگ سے گذرتے وقت انتہائی
احتیاط ملحوظ رکھنی چاہیئے ؛
اتنی سی احتیاط سے آپ حادثات سے محفوظ
رہ سکتے ہیں اور معصوم جانوں کو ضائع جانے
سے بچا سکتے ہیں۔

ایسے لیول کراسنگ پر جہاں کوئی متعین
نہ ہو' وارننگ بورڈ کے قریب رُک جایئے ؛
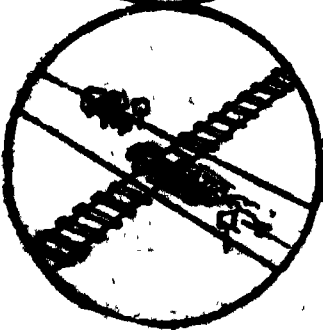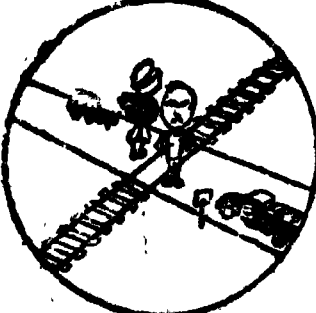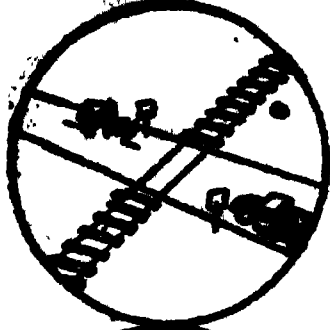
دونوں طرف دیکھ لیجئے

اور اسی وقت ریلوے لائن کو عبور
کیجئے جبکہ کوئی ٹرین نہیں آرہی ہو ؛

چیف سیفٹی سپرنٹنڈنٹ
ساؤتھ سنٹرل ریلوے

PUB 4/1/4/77-320 D/21-1977

اداریہ

چند یادوں کی نوازش ہے فسانہ کیا ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی تو کہیں جا کر آج سے سو سال پہلے ایک دیدہ ور پیدا ہوا۔ اور اس دیدہ ور نے شاعری کو پیغمبری کی سرحدوں تک پہنچا دیا۔ آج سارے ملک میں صد سالہ جشن منایا جا رہا ہے۔ اس موقع پر سب رس بھی بقدر بساط عقیدت کے پھول پیش کر رہا ہے۔ راقم الحروف کا سرمایہ علامہ اقبال سے متعلق چند یادیں ہیں۔ پہلی بات جو یاد ہے وہ دورِ غلامی کی ہے جبکہ مدارس میں ہر صبح حمدِ باری تعالیٰ کے بعد اقبال کا ترانہ گایا جاتا تھا۔ اور اسکول کے در و دیوار "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" کی صداؤں سے گونج اٹھتے تھے۔ پھر اقبال کو سمجھنے یا پہچاننے کے شعور سے پہلے کی بات ہے مہاراجہ سر کشن پرشاد کے ہاں اقبال کا قیام تھا اور ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا۔ مقامی شاعر اپنا کلام سناتے رہے۔ لیکن معیار کی پستی نے علامہ کے چہرے پر بیزارگی اور اکتاہٹ کے آثار پیدا کر دیئے۔ مہاراجہ نے یہ بات محسوس کی اور مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کروا دیا۔ حاضرین کی جانب سے خود اقبال سے خواہش کی گئی کہ وہ اپنا کلام ارشاد فرمائیں۔ فضا کچھ ایسی پیدا ہو گئی تھی کہ علامہ کلام سنانے پر آمادہ نہ ہوئے ساتھ کچھ نہ لانے اور خرابیٔ حافظہ کا عذر کیا۔ ایسے میں چلمن کے پیچھے بیٹھنے والی خواتین میں سے ایک نے علامہ کے کلام کے مطبوعات کا بنڈل چلمن کے نیچے سے آگے کر دیا اور کہا "مطبوعہ کلام ہی سے کچھ سنا دیجئے۔" اس عجیب حرکت سے علامہ کا موڈ بدل گیا۔ بنڈل کو پاس رکھ کر اس پر ہاتھ مارتے گئے اور سناتے گئے اسی واقعہ کے سلسلہ کی بات ہے کہ علامہ چیمبر آف پرنسس کی جانب سے حیدرآباد ایک پیام لائے تھے اور چاہتے تھے کہ حیدرآباد کے نمائندے سر اکبر حیدری متفقہ محاذ کا ساتھ دیں کہا جاتا ہے کہ سر اکبر حیدری نے امید دلائی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔ مگر دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں سر اکبر حیدری نے توقعات پر پانی پھیر دیا۔ ظاہر ہے علامہ اقبال کے جذبات کو ٹھیس لگی ہوگی۔ ایسے میں ستم ظریفی دیکھئے کہ دورانِ وقفہ لابی میں ایک جانب اقبال بیٹھے ہوئے کچھ اصحاب سے باتیں کر رہے تھے اور دوسرے کنارے پر سر اکبر حیدری مصلیٰ بچھا کر نماز ادا کر رہے تھے نماز ختم کر کے وہ بھی علامہ کے قریب آ گئے اور ان سے کچھ سنانے کی خواہش کی۔ علامہ پر یہ خواہش بہت ہی ناگوار گذری اور انہوں نے فی البدیہہ سنانا شروع کیا ؎

تو ابھی رہگزر میں ہے قیدِ مقام سے گذر ؏ مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

اور اسی میں وہ شعر بھی ہے جس میں سر اکبر حیدری پر راست حملہ کیا گیا تھا ؎

تیری نماز بے سرور تیرا امام بے حضور ؏ ایسی نماز سے گذر ایسے امام سے گذر

غرضیکہ یہی بنیاد تھی اقبال اور اس کے کلام سے آگاہی اور تمنا کی۔

پھر ۱۹۳۵ء کی بات ہے کہ ایک ساتھی کی شادی کے موقعہ پر کالج کے دوستوں کی ایک ٹولی ایک لاری کرایہ پر لیکر اس شادی میں شرکت کیلئے روانہ ہوئی۔ اسی ٹولی میں ایک دوست خورشید احمد محمدی تھے جنکی آواز بہت اچھی تھی اور جنھیں شکوہ اور جواب شکوہ دونوں نظمیں یاد تھیں۔ دوستوں کی فرمائش پر انہوں نے کورس کے انداز میں گانے پر آمادگی ظاہر کی اور راستہ بھر یہ کورس چلتا رہا۔ ان دو نظموں کو اس سفر سے پہلے بھی اور بعد بھی بارہا پڑھنے کے مواقع ملے لیکن جو لطف اس سفر میں آیا اس کا جواب نہیں۔

علامہ اقبال کے انتقال پُر ملال کی خبر مجھے بمبئی میں ملی جہاں میں گرما کی تعطیلات گذار رہا تھا۔ اس اطلاع نے کچھ دیر تک تو ہوش وحواس گم کر دیئے۔ پھر میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور ایک مضمون "آہ اقبال! وہ بلبل بھی اب خاموش ہے" قلمبند کیا۔ دیکھنے کی بات ہے اپنی پہلی قلمی کاوش کچھ اچھی ہی نظر آئی۔ بلا سوچے سمجھے بمبئی کے ایک ہفتہ وار اخبار کے پتہ پر بھیجدیا۔ اس ہفتہ وار کا نہ اب نام یاد ہے اور نہ اس مضمون کا مسودہ موجود ہے۔ چند دن بعد ڈاک سے ہفتہ وار ملا تھا اور اس میں اپنا مضمون دیکھ کر کسقدر خوشی ہوئی تھی بیان سے باہر ہے آخری یاد جو ذہن میں محفوظ ہے۔ وہ "یادِ اقبال" کا جلسہ ہے جو اکسلیسیر تھیٹر (آجکل اسکا نام سگر ٹاکیز ہے) میں ہوا تھا۔ سر شیخ عبدالقادر صدر اور خلیفہ عبدالحکیم معتمد تھے ان دونوں نے اپنی تقریروں میں اقبال کی زندگی کے ایسے ایسے واقعات بیان کیے کہ سامعین تصوراتی دنیا میں محو اقبال کو چلتے پھرتے، مذاق کرتے اور شعر کہتے ہوئے محسوس کر سکے۔ یہ جلسہ کوئی ایک بجے شب تک چلتا رہا۔ کوئی واقعہ خلیفہ بیان کرتے تو سر شیخ بیچ بیچ میں لقمے دیتے جاتے۔ یہی حال سر شیخ عبدالقادر کی تقریر کا تھا۔ خلیفہ تھا بار بار ٹوکتے اور یادداشت درست کرتے۔

جون ۱۹۳۸ء میں "سب رس" نے شاعرِ مشرق کو اپنے دستاویزی "اقبال نمبر" کے ذریعہ دکن کی طرف سے بھرپور خراجِ عقیدت ادا کیا تھا۔ ہماری "جامعہ عثمانیہ" نے بھی آخری دنوں میں جبکہ اقبال بقید حیات تھے ۱۹۳۸ء میں ان کی عظیم خدمات کے پیشِ نظر ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری عطا کی تھی۔

"اقبال صدی تقاریب" کے موقع پر "سب رس" کے اس شمارے میں جہاں اُن کی فکر و فن کے نئے گوشوں پر خصوصی مقالات شامل کئے جا رہے ہیں، وہیں ۱۹۳۸ء کے "اقبال نمبر" سے چند اہم تحریریں ڈائجسٹ کی گئی ہیں۔

▬ افسوس کہ ۲۶ر اکتوبر کو کراچی میں اُردو کے ظریفیہ ادب کا ایک روشن ترستارہ غروب ہوگیا۔ ابراہیم جلیس برصغیر ہند و پاک کے نامور طنز نگار ادیب، مصنف، کالم نویس اور صحافی تھے۔ حیدرآباد (دکن) تعلیمی اور علمی شعور حاصل کیا۔ عوامی مسائل اور ترقی پسند اقدار سے جلیس کا فن عبارت تھا اور انہوں نے زندگی بھر صحافت اور ادب کے میدانوں میں اپنے اسی آدرش کو روشن رکھا۔ بقول اصغر سلیم ؎

لو آج اُس کو موت نے افسانہ کر دیا　　کرتا تھا زندگی کے جو قصے رقم بہت

زندہ دلی میں طنز نگاری میں فرد تھا　　یاروں کو ہے جلیس کے جانے کا غم بہت

▬ اربابِ دکن جلیس کی وفات پر نم دیدہ تھے کہ ۲۹ر اکتوبر کو ہمارے دکن جناب فیاض الدین نظامی بھی رحلت کر گئے۔ مرحوم ملک کے نامور آرکیٹکٹ تھے کتنی ہی عمارتوں کے ڈیزائن انکی یادگار ہیں۔ "ایوانِ اردو" کے در و بام کی تزئین و حسنِ تعمیر میں انکا فنی شعور کار فرما رہا ہے۔ انکی کتنی ہی تحریریں عہدِ قطب شاہی، عہدِ آصفی اور مشرق وسطی کے اسلامی طرزِ تعمیر کے رموز و نکات سے روشن تھیں ضرورت ہے کہ ایسے مضامین کا انتخاب شائع کیا جائے۔ اس شمارہ میں مرحوم کی تحریر "اقبال اور حسنِ تعمیر" شائع کی جارہی ہے خدا سے دعا ہے کہ وہ جلیس مرحوم اور فیاض مرحوم کو جوارِ رحمت سے سرفراز فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔　　(غلام جیلانی)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

اقبال کا اثر اردو شاعری پر

اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دیئے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرادیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جارہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دعوائے کار نمایاں جذبوں کی جگہ حقائق کی تلخیوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کردیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع بدل گئے اور شاعری واقعی ساحری بن گئی۔ اقبال نے صاف صاف اعلان کردیا ؎

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق ؎ نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش ؎ میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہی ہے لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا کیوں کہ انھوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا ——— وہ کہتے ہیں ؎

حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو ؎ نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ کہتے ہے ؎ عزیز تر ہے متاعِ امیر و سلطان سے ؎ وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی ؎ شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے لوازم غزل کی پابندی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ زبان دانی کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے: ———

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں ؎ کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی ؎ کہ بانگِ صورِ سرافیل دلنواز نہیں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ ؎ کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ مے خانہ

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا ؎ کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری ؎ وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی حقیقت نگاری شاعری کے لوازم ہوتے جارہے ہیں۔ معاملہ بندی کا دسترخوان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، ملا یا محتسب کے مذاق یا لطف مرتبہ

کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ مولانا حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلفاتِ لایعنی اور خیالی لوازمِ شعری کی مدافعت اس مہذب پیرایہ میں کی تھی کہ ؎

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی ٭ بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال مقتضیات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کر کے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کر دیا اور اُردو شاعری یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہو گئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود کر دی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا اور بغیر مشاطگی یا پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں گے ؎

ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎ مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو ٭ کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنابندی

میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر ٭ میرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ اہلِ محفل کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مئے لالہ فام نکالیں۔ اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوقِ خودی نہیں رکھتے ان سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے۔

؎ نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ ٭ کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندوستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس کا حق محفوظ ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں ؎

؎ کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا ٭ مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہلِ مدرسہ و اہلِ خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ اب تک ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

اقبال کا شعر ہے ؎ کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے ٭ فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق ٭ خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ ٭ مری تمام جستجو کھوئے ہوؤں کی آرزو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خونِ جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات ٭ ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر ٭ نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہارِ بوالہوسی اور زلف کا کل، خد و خال اور چاہِ ذقن کے مضامین باندھنے کی اچھی تردید کی ہے کہ ؎ عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا ٭ ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند ٭ کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس / آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ "آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار" جتنا اُردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا ــــــ عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں۔ جب تک ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہوگا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ حیات اور باعث وقار ثابت نہیں ہو سکتی۔

ہر دو شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر ؎ گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات ؎ نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی ؎ خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بیکار ہے۔ وہ باد سحر کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں ــــــ اقبال کہتے ہیں ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن ؎ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا ؎ اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو ؎ جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز ؎ اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستان ؎ بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز
اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ ؎ از ہر چہ بآئینہ نمایند بپرہیز

آخر میں ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سنائے دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحہ عمل کا کام دے سکتے ہیں اور جن میں اقبال نے شاعر ہی سے مخاطب ہیں ؎

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے ؎ شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم ؎ اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو ؎ شمشیر کے مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی ؎ اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعت نظر اور مرحلۂ شوق کی گوناگونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہا ہے۔ اقبال کی تخیل نوازیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ سیماب اور جوش و ساغر جیسے مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے ایک [illegible] اور اقبال کے اثر سے بہت فرسودہ خیالات [illegible] متروک ہوتے جا رہے ہیں اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبال کے کلام سے متاثر رہے گی اور [illegible] قائم رکھنے کا باعث ہوگی۔

(۲۱۱۳۸)

پروفیسر عبدالقادر سروری

اقبال کی شاعری کا آخری دور

دنیا کے اس شاعر اعظم کی زندگی ہی میں، اس کی شاعری پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور اس کی فکر اور صناعی کے کئی پہلو ایک سے زیادہ مرتبہ معرض بحث میں آچکے ہیں۔ ان سب کے باوجود، اس وقت اس کے انتقال کے بعد، جب ہم غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی عظیم الشان شاعری کے متعلق اب بھی سب کچھ نہیں کہا جا سکا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کبھی نہیں کہا جا سکے گا۔ اس کی شاعری کی طرح، اس کی شاعری کی تنقید کی تشنگی بھی ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور یہ اقبال کی عظمت کی دلیل ہے۔ دنیا کے غیر فانی شاعروں اور خاص کر مفکر شاعروں کے متعلق جس قدر لکھا اور کہا جا سکتا ہے، اس سب کے باوجود ان کے خیال، صناعی اور حسن کلام کے متعلق بہت کچھ ناگفتہ رہ جاتا ہے

اس طرح یہ کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ عین مطابق فطرت ہے کہ اقبال کے کلام کی دلچسپی کی مناسبت سے ان کے کلام کی تنقید کی دلچسپی بھی لازوال ہو۔ اس شاعر نے غور و فکر کے لئے اتنا سرمایہ چھوڑا ہے کہ نئے نئے نقاط نظر سے اس کی شاعری کا مطالعہ کیا جاتا رہے گا۔ بہت سے گوشے ابھی ٹٹولنے ہیں اور بہت کچھ سعی اس کے قلب کی گہرائیوں تک تو نہیں تو ان کے قریب پہنچنے کے لئے جاتی ہے اور سچ پوچھو تو ان تمام مساعی کا حقیقی مقصد اس کی برگزیدہ ہستی کی یاد اپنے دلوں میں تازہ رکھنے کی آرزو ہے۔ ہم و بساط مختلف مدارج اسی طرح اس ہمدرد بنی نوع انسان کی جناب میں اپنا اپنا ہدیہ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔

یہ بات اب ہر وقت سے زیادہ واضح ہو گئی ہے کہ فارسی زبان کی حد تک جو انتہائی تعریف، مثنوی معنوی کی گئی ہے وہ اردو میں اس پیر رومی کے اس پرستار کے کلام پر پوری پوری صادق آتی ہے۔ "ہست قرآن در زبان ہندوی" اس فکر شعری کے آخری مدارج ارتقا کو سامنے رکھتے ہوئے، جب ہم اس کے ابتدائی مراحل پر نظر ڈالتے ہیں تو وہ اس عروج کے دور زینے دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس ہی روشنی میں جاری اگلی کوشش جو ان ادوار کے کلام کی چھان بین سے متعلق کی گئی ہیں۔ ادھوری، نامکمل اور ناقص معلوم ہونے لگی ہیں۔

اقبال کے آخری عمر کا کلام "ایک عظیم الشان چیز" ایک سرمایۂ حیات اور ایک سرچشمۂ زندگی ہے۔ اس میں ایک حقیقی مفکر کی پختگی فکر اور ایک حساس صناع کے موقلم کی سحر کاری موجود ہے۔ قوت گویائی کے رعب داب میں طنطنہ اور پیغمبرانہ شان پیدا ہو گئی ہے۔ رفعت فکر اور بلندئ خیال میں صوفی صافی کی روحانی سیر کے انداز نظر آتے ہیں۔ یہی درحقیقت شاعر کی معراج ہے۔ یہاں پہنچ کر کائنات اپنے تمام رموز کے ساتھ شاعر کی ہتھیلی میں ایک رائی کا دانہ معلوم ہوتی ہے۔ یہ بلندی پرواز قوت فکر ہی سے نصیب ہو گئی ہے۔

اقبال نے اردو اساتذہ کی اصلاحی شاعری میں پہلا قدم رکھا تھا اسی میدان میں جب ان کی فکر انفرادیت کی طرف رجوع ہوئی تو وہ اصلاحی شاعری سے ہٹ کر اپنے اطراف کی اشیاء اور مسائل پر عمومی خیالات کا اظہار کرتے رہے کبھی کسی کی ترجمانی کبھی کسی کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنایا اور کسی وقت وطن اور قوم کے مسائل میں ان کی توجہ الجھ کر انداز بیان ان کا اپنا تھا لیکن خیالات عموماً وہی تھے جو ان کے

اطراف عالم پر دائج تھے۔

یورپ کی سرزمین کے قیام نے دراصل شاعر کی آنکھیں کھول دیں۔ بہت سے مسائل میں اس کی فریب خوردگیاں بے نقاب ہوگئیں اسے نظر آگیا کہ جن چیزوں کو اس کی قوم پائیدار سمجھ کر ان کے پیچھے عمر گنوا رہی تھی وہ دراصل دھوکا اور حاکم قوموں کی شعبدہ بازی تھی جس نے شمار مسائل نے شاعر کو متاثر کیا اس کا خاکہ اس زمانے کے کلام میں موجود ہے۔ اسی دور میں اقبال کی پہلی عظیم الشان نظم "شکوہ" لکھی گئی۔ یہ اقبال کی شاعری کا دوسرا دور تھا۔

جب شاعر کی فریب خوردگی اس پر عیاں ہوگئی تو فطرتاً اسے ایک پائیدار چیز کی تلاش ہوئی جس کے لئے حیاتِ انسانی وقف کی جاسکتی ہے۔ اس تلاش میں اس کی طبیعت اسلامی فلسفۂ حیات معاشرت کی طرف رجوع ہوئی۔ اور یہاں اس کو وہ چیز مل گئی جو اس کے لئے حیاتِ کائنات کا ماحصل تھا۔ خیالات کے اس طوفان کو لے کر وہ زور و شور سے اٹھا اور ایک پیغمبر کی طرح دنیا کو اپنا پیغام سنانے لگا۔

اب اقبال ایک انقلاب پسند شاعر اور حقیقی صوفی ہوگئے تھے۔ ان کا مذہب عشق اور ان کا فلسفہ "خودی" متعین ہوگیا تھا۔ اور ہر عقدہ کا حل ان کو انہیں چیزوں میں مل گیا۔ جیساکہ وہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں۔

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ ۔۔۔ خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے ۔۔۔ صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ
کیا ہے تو نے متاعِ غرور کا سودا ۔۔۔ فریب سود و زیاں لا الٰہ الا اللہ
خرد ہوئی ہے زماں و مکاں کی زناری ۔۔۔ نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ

عشق ان کے لئے مذہب اور عشق ہی ایمان تھا ــــ "علم و عشق" کے عنوان کی نظم میں وہ کہتے ہیں ــــــــ

عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن ۔۔۔ علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن ۔۔۔ عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات ۔۔۔ علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات ۔۔۔ علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں ۔۔۔ عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں، عشق زمان و زمیں ۔۔۔ عشق سراپا یقیں اور یقیں فتحِ باب
شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام ۔۔۔ شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام ۔۔۔ علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب

خودی اقبال کی نظر میں رازِ حیات ہے۔ اور اس کی تفہیم اور تشریحات میں اقبال نے جس نکتہ رسی سے کام لیا ہے شاید ہی کسی اور نے کبھی اس کا عشرِ عشیر سمجھا یا سمجھایا ہو ــــ "خودی کی زندگی" میں وہ فرماتے ہیں ــــــــ

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی ۔۔۔ نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب ۔۔۔ خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد ۔۔۔ نہنگ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

افراد کو منظم کرنے والا، ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی جذبہ رہا ہے۔ کسی زمانے میں یہ جذبہ مذہب تھا اور موجودہ زمانے میں وطنیت اور قومیت نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ لیکن امنِ عالم کے لئے یہ جذبہ مذہب زیادہ تباہ کن ثابت ہو چکا ہے۔ قومیت کے شدید جذبے کی جڑیں اب پوشیدہ نہیں رہ گئیں۔ ہر قومی جذبہ میں دوسری قوموں سے منافرت، بغض اور دشمنی کا موجود ہونا لازمی سا ہو گیا ہے۔ اس کو دنیا کے بعض اولوالعزم اصحاب نے محسوس کیا اور اس کو کسی قدر قابو رکھنے کے لئے تجربے کے طور پر ایک بین قومی احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مجلس بین الاقوام اسی کا نتیجہ تھا۔ لیکن یہ ترکیب جس قدر کارگر ہوئی، پچھلے چند سال کے واقعات سے ظاہر ہے۔ اقبال نے مجلس بین الاقوام کی ناکامیوں کا جو خاکہ اڑایا ہے وہ زبان زد ہو گیا ہے۔ "ضربِ کلیم" میں اس عنوان کی نظم میں بھی یوں اظہارِ خیال کیا ہے۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے — ڈر ہے خبرِ بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن — پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ — ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

اقبال کے وسیع ترانسانی جذبات نے انھیں بین قومیت کے مقابلے میں ایک بین الانسانیت کا احساس پیدا کرنے پر ابھارا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ احساس انھوں نے کہاں سے اخذ کیا۔ "مکہ اور جنیوا" کے عنوان کی نظم میں اس احساس کو انھوں نے صاف صاف ظاہر کر دیا ــــــ

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام — پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود — اسلام کا مقصود فقط ملتِ آدم
مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم

اقبال کے خیال میں، دنیا کی موجودہ ابتری اور پریشانی کا علاج اگر کوئی ہو سکتا ہے تو یہی کہ بجائے قومیت کی تفرقہ پردازی کے "انسانیت" کے اتحاد کا احساس دنیا کی ساری قوموں کے افراد میں پیدا کیا جائے ــــــ

ظاہر ہے کہ یہ اقبال کی فکر کا ایک نہایت قابلِ قدر پہلو ہے۔ اور دنیا کی موجودہ حالت کو نظر میں رکھتے ہوئے اس اتحاد اور ملتِ انسانی کا دنیا میں قائم ہونا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اقبال اس کو حاصل کرنے کے لئے اس کی تمام مزاحم قوتوں سے جنگ کی تلقین کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ کہا جاتا ہے، جنگ کو ختم کرنے پر بھی ابھارتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اقبال کا پیغام دنیا کے لئے ایک عالمگیر قسم کا پیغام ہے، کیونکہ یہ احساس امن نہ بزدلی کا پیدا کردہ ہے اور نہ اس کا نتیجہ بزدلی ہے۔ اس دور کے کلام میں، جو جوش اور صدق طلب ہے اس کی مثال شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی۔ یہ طلب اور بہتری کی خواہش ذات کی حد تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس میں وہ تمام عظیم الشان انسانی گروہ شامل ہیں۔ جن کی زندگیاں کبھی دنیا کے لئے مشعلِ ہدایت ثابت ہو چکی تھیں۔ مثلاً بالِ جبریل" میں ایک جگہ وہ فرماتے ہیں

حرم کے دل میں سوزِ آرزو پیدا نہیں ہوتا — کہ پیدائی تری اب تک حجاب آمیز ہے ساقی
نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے — وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اسی مجموعے میں ایک نظم کا آخری شعر ہے۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ — ترے پیمانے میں ہے ماہِ تمام اے ساقی

یہاں شاعر کائنات کے اصلی منشاء تخلیق اور اس کے رموز پر پوری طرح حاوی ہو گیا ہے۔ اور وہ چیز وہ دیکھتا ہے اس میں ...

ہے۔ اور اسی وجہ سے اس کی شاعری کے اثر میں بے حد اضافہ ہو گیا ہے۔ اس دور کی شاعری میں ایک شدید احساسِ استغنا اور ایک احساسِ تعلّی بھی پیدا نظر آتا ہے۔ استغنا ہر اس چیز کے ساتھ جو اس کے اصلی منشائے حیات کے حصول میں سدِ راہ ہو اور تعلّی کی خواہش ان تمام امور کے متعلق جو اس کے دسترس سے باہر ہوں۔ لیکن ان کے مواخذہ میں وہ گرفتار ہو۔ وہ چیز خواہ اس عالمِ آب و گل سے تعلق رکھتی ہو یا عالمِ روحانی سے ـــ ذیل کے اشعار میں شاعر کا انداز کس قدر غیر معمولی ہو گیا ہے۔

ــــہ اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد — نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد
یہ مشتِ خاک، یہ صرصر، یہ وسعتِ افلاک — کرم ہے یا کہ ستم تیری لذتِ ایجاد
قصوروار غریب الدیار ہوں، لیکن — ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

ایک اور نظم میں فرماتے ہیں ـــــ

ــــہ ترے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے — دونوں کے صنم خاکی، دونوں کے صنم فانی

یہ احساس، اقبال کی آخری نظموں میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ گویائی کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں تھی۔ قوموں کے عروج و زوال کے پوشیدہ رازوں کو بھی اقبال نے صاف یا استعارے کے پیرایہ میں جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ ذیل میں چند شعر نقل کئے جاتے ہیں ـــــ

ــــہ خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد
گزر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں — کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کارِ آشیاں بندی
حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز — زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز
وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں — اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں — زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیِ شوق — نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے — کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے؟ — شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر
نہ صبوری ہے زندگی دل کی — آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں
سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے — زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

غرض موجودہ زندگی کے بہت کم مسائل ہوں گے۔ جن پر اقبال نے اس زمانے میں روشنی نہ ڈالی ہو یا تنقید نہ کی ہو۔ اگر کوئی قوم بد حالتِ پستی میں ہو۔ اقبال کے صرف آخری زمانے کے کلام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائے تو یقین ہے کہ اس میں حیات کی ایک تازہ لہر پیدا ہو جائے گی ـــــ

(۱۹۳۸)

X

"کوئی تشبیہ، کوئی استعارہ، کوئی اشارہ، کوئی کنایہ باقی نہیں جس کے اندر اقبال نے اپنا پیام نہ رکھ دیا ہو۔ پھول کی پنکھڑیوں میں، [illegible] میں، پہاڑ کی بلندیوں میں، میخانے کے خم میں، ساقی کے ساغر میں، عشق کے ساز میں، ساز کے تار میں، ہواؤں میں، آسمانوں میں، وہ پیغام مخفی ہے، وہی ایک شاعر ہے، وہی اس کا پیام ہے۔"

(قاضی عبدالغفار)

شاعر حکمت شناس

یہ صحیح ہے کہ ایک سائنسداں کے لئے تحمل اور آلے ضروری ہیں لیکن لازمی نہیں۔ اس لئے کہ دنیا کے بعض بلند نظر سائنسداں یقیناً معملوں کی پیداوار نہیں ہوتے نہ ان کے پاس ان پیچیدہ اور حساس آلوں کا ذخیرہ تھا جن سے موجودہ سائنس متمتع ہے پھر بھی کیا یہ حقیقت نہیں کہ آج ہمارا بیشتر علم ان ہی بے سروساماں محققین کی کاوشوں کا حاصل ہے۔ اور ہمارا سرمایۂ معلومات ان ہی مجاہدینِ بلند ہمت کے تجسس و تلاش کا رہینِ منت ہے جنھوں نے جہل کے خلاف نہتے ایک دوامی جنگ چھیڑ دی۔

حضرت عیسیٰ سے تقریباً (۵۰۰) سال قبل دیمو قریطس نے اپنا وہ مشہور "نظریۂ جواہر" پیش کیا جس پر ہماری سائنس کی بنیادیں کھڑی ہیں اس کے یہاں اور تو اور معمولی خورد بین کا سادہ تصور بھی نہ تھا اور نہ سر جے جے ٹامسن کے طویل آلے اس کی امداد کو آتے تھے۔ اسی طرح مائیکل تسن اور فیثا غورث کے "نظام سیارگان" کی دریافت کے لئے نہ تو ولسن کی عظیم دوربین موجود تھی نہ ایکس کی رصدگاہیں۔

حیرت انسان کا فطری جذبہ ہے اور تجسس اس کا بدیہی نتیجہ اس کے لئے نہ معملوں کی ضرورت ہے نہ آلوں کی۔ بچہ ابھی ماں کو نہیں پہچانتا لیکن دیئے کی چمکتی ہوئی لو کو گھورتا ہے، شادی، برات کے باجوں کی جھنک ننھے ننھے دلوں کو دریچوں میں اور چھوٹے چھوٹے پیروں کو دروازوں سے باہر کھینچ لاتی ہے۔ چاند ماما اپنے ایک شیر خوار بھانجے کے لئے اتنے ہی مسحور کن ہیں جتنے سر جیمس جینس یا سر آرتھر ایڈنگٹن کے لئے۔ چونکہ حیرت اور تجسس اس عالم رنگا رنگ میں بچے کی آنکھ کھلتے ہی ساتھ ہو جاتے ہیں اور جیسے جیسے اس کے حواس اور قوئ ذہنی کی ترقی ہوتی ہے وہ بھی بڑھتے گیا۔

سائنس اسی جذبۂ تلاش و جستجو کی نمو یافتہ شکل ہے لہذا یہی وہ اولین علم ہے جس کو انسان نے حاصل کیا اور چونکہ انسانی زندگی اور سائنس میں چولی دامن کا ساتھ رہا اسی لئے اس کی تہذیب کی ترقی اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ وہ بھی فروغ پاتی رہی۔ اسی کی مدد سے ابتدائی انسان نے تھکا دینے والے تجربات کے بعد آلات تراشے اپنے کمزور بازوؤں سے خونخوار درندوں پر فتح پائی۔ تاریک غاروں میں خوفناک ریچھوں کا مقابلہ کیا اور اسی کی کوشش سے سینۂ سنگ سے اس چنگاری کو روشن کیا جس نے انسان کی معاشرت کی کایا پلٹ دی۔

اس لئے فطری تجسس جس کو آپ سائنس کہتے ہیں نہ تو مغرب کی ایجاد ہے نہ مشرق کی، بابل والوں نے اس کو پروان چڑھایا نہ ہندیوں نے اس کو سینچا۔ بلکہ اس کی بنیاد اس وقت ہوی جب خطِ استواء کے گرم میدانوں کی گھاس سے انسان نے اول اول اپنا سر بلند کیا اور حیوانیت سے دائرۂ انسانیت میں داخل ہونے لگا اس نے یار و مددگار زمانے میں بھی وہ اس کا سہارا تھی اور آج بھی جب وہ فاتح عالم کے تخت پہ جلوہ افروز ہے وہ اس کی ہم رکاب ہے۔

اسی جذبۂ تلاش نے انسان میں کائنات اور اس کے مافیہ کی اصل و ماہیت دریافت کرنے کا شوق پیدا کیا۔

اور اسی ذوقِ جستجو نے "میں" کے تجزیہ و تشریح کی لگن لگا دی۔ دنیا کے بلند نظر مفکر، مدبر، محقق اور نکتہ شناس سائنسداں اسی "علم ہیئت" کے اطراف چکر لگاتے ہیں۔ عقل کی گہرائیاں کھودتے ہیں اور فکر کے آسمان چھانتے ہیں۔
چنانچہ ان معنوں میں متجسس انسان فطرتاً سائنسداں ہے، فلسفی ہے، شاعر ہے اور جو ظاہر بینوں نے سائنس، فلسفہ اور شاعری میں اختلاف دیکھا ہے وہ غلطی کرتے ہیں۔ اور سخت غلطی کرتے ہیں۔ صرف ریڈیو، ٹیلی وژن اور بے تار برقی کی میکانیتوں سے واقف آدمی سائنس سے اسی قدر دور ہے جتنا محض زمان و مکاں۔ نفسی اور خارجی کے مباحث میں الجھا ہوا فلسفی فلسفہ سے، یا فقط ردیف و قافیہ، صنایع و بدایع میں جکڑا ہوا شاعر شاعری سے۔
سائنسداں کائنات کی اصل ماہیت کا جویا ہے، فلسفی عالم کے اصل محرک کا متلاشی، اور شاعر معشوقِ حقیقی کی تلاش میں سرگرداں۔ یہ غلط ہے کہ سائنسداں گیس و بخارات ڈھونڈتا ہے۔ فلسفی خیر و شر کی ٹوہ میں ہے اور شاعر چشمِ نرگسیں کو گھورتا ہے، عارضِ گلگوں کو پیار کرتا۔ اور زلفِ سیاہ میں پھنسا ہوا ہے بلکہ تینوں ایک "حقیقت" کی تاک میں ہیں اور تینوں ایک ہی "شاہدِ حقیقی" کے جلوۂ بے باکانہ کے منتظر ہیں۔ دراصل یہیں سائنس، فلسفہ اور شاعری کی حدیں ملتی ہیں وہ گویا ایک مثلث کے اضلاع سے مشابہ ہیں جو ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں اور شاید اسی مثلثِ مساوی الاضلاع کا نام مذہب ہے
چنانچہ اگر میں اقبال کو ایک بڑا سائنسداں کہوں تو وہ غلط نہیں ایک روشن حقیقت ہے بنا برایں کہ وہ ایک بڑے شاعر اور بڑے فلسفی تھے ان کی شاعری جنسی رجحانات سے پاک تھی اور ان کا فلسفہ منطقی پیچیدگیوں سے بلند تھا۔
میں مبالغہ نہیں کرتا لیکن یہ مانتا ہوں کہ اگر کسی اور شاعر کے لئے ایسے جرأت طلب دعوے کیے جاتے تو شاید ان کا ثابت کرنا مضمون نگار کیلئے دو بھر ہو جاتا۔ لیکن جب کوئی اقبال پر لکھنے بیٹھتا ہے تو دلائل کا ایک دریا ہوتا ہے جو نوکِ قلم سے امڈا آتا ہے اور یہی کسی کے بڑے ہونے کی دلیل ہے۔ ایک سائنسداں کی بڑی خصوصیت اس کا ذوقِ مشاہدہ ہے جو اس کو عوام سے ممتاز کرتا ہے۔ کھوج ہر انسان میں ہے لیکن وہ تلاش جس میں غور و فکر کو زیادہ دخل ہے۔ اور جستجو جو زندگی کے لئے غذا پانی کی طرح ضروری ہو جاتی ہے، سائنسداں کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ موجودات پر سرسری نظر نہیں ڈالتا بلکہ اس کی غائر نگاہیں ہر شئے کی تہ تک پہونچنا چاہتی ہیں۔ اسے ظاہر سے تشفی نہیں ہوتی وہ حقیقت دیکھنا چاہتا ہے اقبال کا کلام اسی تلاشِ مسلسل سے بھرا ہوا ہے۔

گلزارِ ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ　　ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

نہ صرف یہ بلکہ وہ تلاشِ پیہم کو کارخانۂ عالم کا محرک بھی سمجھتے ہیں۔

یہ تلاشِ متصل شمعِ جہاں افروز ہے　　توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

قدرت کی خوبصورت صنعتیں شاعر کے حواس جمالیاتی ذوق پہ سحر کا اثر کرتی ہیں۔ لیکن ایک حقیقی شاعر انہیں دیکھ کر صرف متاثر نہیں ہوتا اس کی آنکھیں ان نقوشِ ظاہری میں حقیقتِ پردہ نشیں کو ڈھونڈتی ہیں غالب کے یہاں یہی شوقِ دید کام کر رہا ہے، جب وہ پوچھتے ہیں۔

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ٭ نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ٭ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

مگر اقبال کائنات کی دیگر اشیاء کے ساتھ اپنی ذات کے متعلق بھی اسی قدر بے چین تھا۔ وہ ایک ماہرِ حیاتیات کی طرح اس "صندوقِ سربستہ" کو کھولنا چاہتے ہیں۔

پریشاں ہوں میں مشتِ خاک لیکن یہ نہیں کھلتا ٭ سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں

تاریخِ تمدنِ آدم شاہد ہے کہ انسان ایک عرصۂ دراز سے "اپنی ذات" کی کھوج میں لگا ہوا ہے۔ آج سے کئی سو سال پیشتر تبریز کے ایک بڑے بزرگ نے دنیا سے سوال کیا تھا۔

چہ تدبیر اے مسلماناں کہ من خود را نمی دانم ٭ نہ ترسا و یہودی ام نہ گبرم نے مسلمانم

ایک سائنسداں جانتا ہے کہ کائنات اور ذاتِ انسان کے اصل کی جستجو سے یقیناً انسان ہزارہا ایجادات اور سیکڑوں اسائشوں سے بہرہ یاب ہوا ہے۔ لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اضطراب "ایک چبھتا ہوا کانٹا دلِ انسان میں ہے" اور احساسِ جہالت جو روز افزوں دریافت کے باوجود گہرا ہی ہوتا جاتا ہے حقیقت تلاشِ فطرت کے سینے میں ایک مسلسل کھٹک ہے۔ یہی شعور اور آگہی ہے جس سے ہم پریشان ہیں اور یہی خیال ان ساری بے اطمینانیوں کی وجہ ہے جو آدمی کے دل کو ایک آن چین نہیں لینے دیتی۔

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار ٭ خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار
یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے ٭ گل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے
بستان و بلبل و گل و بو ہے یہ آگہی ٭ اصلِ کشاکشِ من و تو ہے یہ آگہی
بے تاب ہے ذوقِ آگہی کا ٭ کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے ٭ آئینہ کے گھر میں اور کیا ہے

اس دردِ استفہام سے اقبال بھی ایک سائنسداں کی طرح رنجیدہ ہیں اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ حکمت کی ہزارہا کد و کاوش کے باوجود یہ بھید نہیں کھلتا اور سائنس کی مسلسل تگ و دو کے بعد بھی یہ راز اور پیچیدہ ہوتا جاتا ہے۔ تو وہ عقلِ انسانی کی محدودیت اور حواس کی غیر معتبر شہادتوں پر اس کا سارا قصور رکھتے ہیں:-

چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے ٭ عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے

اسی نکتہ کو فانی نے بھی بیان کیا ہے ؎

ہر مژدۂ نگاہ غلط، جلوہ خود فریب ٭ عالم دلیلِ گمرہیِ چشم و گوش تھا

سر جیمس جینس کے الفاظ میں "کائنات کو ہم مادی تصور میں یقیناً پیش نہیں کر سکتے۔ بنا براں میرے خیال میں وہ محض ایک تخیلی احساس ہے"

آپ نے دیکھا کہ جو لوگ سائنس پر تلقینِ مادیت کی تہمت دھرتے ہیں حقیقت سے ناآشنا ہیں اس لئے کہ پھر پھر کر سائنس بھی ان ہی نتائج پر پہونچتی ہے جو ایک فلسفی یا شاعر کے ماخوذ ہیں۔ اور یہی خیالات ہیں جن سے متاثر ہو کر

اور ان سیاروں کا درمیانی فاصلہ ـــ ممکن ہے کوئی یقین نہ کرے۔ اتنا ہے کہ اگر آپ ان میں سے قریب ترین والا کی سیر کرنا چاہیں تو ...۰...۰...۰...۰...۰...۰ ۱۵ سال کی ضرورت ہوگی، اور جب آپ اس سفر سے بہ سلامت لوٹیں گے تو اس کا بہت امکان ہے کہ ہماری ننھی سی دنیا کسی دُمدار ستارے کے عقب میں سیاہ و برباد پھرتی ہوگی یا کسی عجیب سیارے کے وسیع شکم میں جذب ہوچکی ہوگی یا اس کے لاتعداد ٹکڑے روشن شہاب ستاروں کی صورت میں فضا بسیط میں ٹوٹتے ہوں گے۔

ان کی عمریں۔ اس حقیقت سے اندازہ لگائیے کہ آپ کی دنیا جو اور ستاروں کی نسبت کل کی ہے ۱۰-۲۰ ارب سال قدیم ہے اقبال کے الفاظ ہیں۔

عقل جس سے سر بہ زانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سرگذشتِ نوعِ انساں ایک ساعت ان کی ہے

لیکن آدمی اس وقت اور بھی مبہوت ہو جاتا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس ناقابلِ قیاس تعداد میں دو ایک مشتبہ سیاروں کو چھوڑ کر صرف ہماری دنیا کو زندگی ودیعت کی گئی ہے یعنی دنیا کے تمام سمندروں کے ساحلوں کی ریت یکجا ہو تو اس میں سے ایک ذرۂ بے مقدار کو یہ شرف ملا ہے۔

سر آرتھر ایڈنگٹن کے لحاظ سے ان حالات میں اگر کائنات میں زندگی یا اس کی انتہائی مخلوق انسان کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح جنگل میں ہزارہا اوک کے بکھرے ہوئے بیج سے صرف ایک دو درخت اُگ آتے ہیں، ممکن ہے قدرت نے انسان کی تخلیق کے لئے ثوابت کا یہ زبردست جال بچھایا ہو۔

اس مشہور سائنسدان کی تائید میں اقبال کا یہ شعر آفتاب یا تابع آفتاب سیاروں سے متعلق کس قدر چسپاں ہوگیا ہے

شعلۂ خورشید شائد حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرر

مگر ہم جانتے ہیں کہ اقبال کے یہاں نہ کوئی معمل تھی نہ ۱۰۰ انچ دہانے کی انعکاسی دوربین پھر ان کے الفاظ تک تقریباً وہی ہیں جو ان سے کئی ہزار میل دور رہنے والے اس جید مہندس اور ہیئت دان نے استعمال کئے تھے شائد ایسے ہی مقامات پر انسان یہ ماننے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری

اقبال حیات بعد موت پر یقین رکھتے ہیں چنانچہ اس مسئلہ میں ان کے دلائل دلچسپ بھی ہیں اور سائنٹفک بھی۔ جب کبھی وہ اس بحث پر کچھ کہنے لگتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک رنگین بیان شاعر کی صورت میں ایک خشک سائنٹسٹ حقائق پیش کر رہا ہے۔

سائنس کا ایک معتقد یہ بھی جانتا ہے کہ اشیاء کی تبدیلیٔ اشکال یا باہمی ترکیب و تحلیل سے مختلف صورتوں کا ظہور ہوتا ہے کسے نہیں معلوم کہ برف سے پانی اور پانی سے بھاپ ایک ہی مرکب کی کئی حالتیں ہیں ان کی تحلیل سے آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسیں اور ان گیسوں کے اتصال سے وہی پانی حاصل ہوگا۔

مانا کہ آکسیجن نہیں لیکن اس گیس کی تبدیل شدہ شکل تو اس مرکب میں موجود ہے۔ اقبال بھی مظاہر حیات و موت کو ان ہی مسلسل بدلنے والی کیفیتوں کا نام دیتے ہیں۔ انھوں نے اس حقیقت کو ایک لطیف تشبیہ میں پیش کیا ہے

جس طرح ایک کشتی ساحل پر کھڑے ہوئے انسان کی نظروں سے دور ہوتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے لیکن فنا نہیں ہوتی۔ انسان بھی نظروں سے چھپ جاتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا۔

سبک روی میں ہے مثل نگاہ یہ کشتی　　نکل کے حلقۂ حد نظر سے دور گئی
جہاز زندگی آدمی رواں ہے یونہیں　　ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں
شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا　　نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

اس دوسرے میں ایک اور دلیل بھی پیش کی ہے اور دیکھئے وہ کس قدر وزنی ہے۔

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے　　ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات　　عام یوں اس کو نہ کر دیتا نظام کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں　　جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

ہمیں یہ معلوم ہے کہ دنیا میں زندگی کے کس قدر لاتعداد اور مختلف الاشکال مظاہر ہیں۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ان زندہ صورتوں کی حفاظت کی کیا کیا تدبیریں قدرت کرتی ہے۔ پھر اگر یہ یوں ہی ختم ہو جانے والی ہوتیں تو نظام کائنات انھیں اس قدر عام نہ کرتا۔

کسی ماہرِ حیاتیات کو کیا جاہل کسان سے کہئے کہ بیج بے جان ہیں اس لئے کہ ان میں کیفیات زیست کا فقدان ہے تو وہ ہنسنے لگے گا۔ وہ جانتا ہے کہ تخم دراصل دو عالی مدارج کے درمیان ایک سستانے والا وقفہ ہے اور یقیناً شاخ سے اس کی علیحدگی موت نہیں بلکہ ابتداء ہے کسی آنے والی زندگی کی ؂

تخم گل کی آنکھ زیرِ خاک بھی بے خواب ہے　　کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ　　موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ

موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی　　ہے یہ شام زندگی صبح دوام زندگی

اور اپنے اس نظریہ سے وہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دیتے ہیں۔

تو خاک کی مٹھی ہے اجزا کی حرارت ہے　　برہم ہو پریشاں ہو وسعت میں بیاباں ہو

لیکن اقبال یقیناً ایک محرم شاعر نہ ہوتے اگر وہ اس اعتراف مجبوری کا اظہار نہ کرتے جس کو ایک سائنٹسٹ محسوس تو کرتا ہے لیکن اقرار سے ڈرتا ہے۔ یہی اقبال نادانی ان کی عالی ہمتی کی غمازی کرتی ہے۔

یونان کی اس عدیم النظیر شخصیت نے جس پر فلسفہ کو اب تک ناز ہے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "تمام زندگی کے تفکر کے بعد اس نے یہ معلوم کیا کہ وہ کچھ نہیں جانتا" پوچھا گیا کہ "پھر آپ اور جاہل میں کیا فرق ہوا" کہا کہ "میں یہ جانتا ہوں کہ میں کچھ نہیں جانتا اور ایک عام انسان یہ نہیں جانتا کہ وہ کچھ نہیں جانتا"

جب عقل کی گرہیں مضبوط پڑ جاتی ہیں اور تدبیر کی کلیں بے سود ہو جاتی ہیں تو وہیں احساس ہوتا ہے کہ اس

کارخانے میں جس کے سپید و سیاہ میں ہم کو کوئی دخل نہیں ہے انسان مجبور و لاچار ہے۔ نہ صرف وہ بلکہ موجودات کا ہر ذرہ ذرہ ایک غیر یقینی حالت میں گھومتا ہے۔

پروفیسر ہیزن برگ Professor Heison Berg کے اصول عدم استقلال کا خواہ ریاضی داں جو بھی نتیجہ اخذ کریں ایک بات تو یقینی ہے کہ کارخانۂ عالم کی قسمت غیر یقینی ہے اور ہم مجبور ہیں ہماری عقل لاچار ہے، اور ہماری تدابیر اپاہج ہیں۔

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیِ تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں

ہے شکست انجام غنچہ کا سبو گلزار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گلزار میں

وہ کائنات کی طرح فکر کی کائنات سے واقف اور عقل کی رسائی سے آگاہ ہیں وہ حواس کی قیاس آرائیوں سے مجبور انسان کے سرمایۂ علم کا اندازہ لگاتے ہیں۔

فروغ دانش ما از قیاسی است
قیاس ما ز تقدیر حواس است

مشرق کا وہ حکیم جو فلسفی بھی تھا اور شاعر بھی آج ہم میں نہیں ہے اس کا پیغام ایک سرچشمہ ہے جس سے ہر شخص بقدر ہمت خویش فیضیاب ہوتا ہے جس کے کلام میں نوجوانوں کے لئے درس عمل اور ضعیفوں کو مژدۂ امن و سکون ہے اس دریائے سخن سے ایک سائنسداں حقائق کے گوہر ہائے بے بہا نکالتا ہے فلسفی اخلاقیات کے لاقیمت جواہر اور شاعر مضامین کے [illegible] نایاب پاتا ہے۔

یہ شاعر جسے مشرق نے بے وقت کھو دیا، ایک سائنسداں تھا معلوں سے بے نیاز، ایک فلسفی تھا منطقی پیچیدگیوں سے متنفر اور ایک شاعر تھا تصنع سے برگشتہ۔

ہم نے اسے کھو دیا ہے جس کا بدل ممکن ہے ہندوستان صدیوں میں نہ پا سکے، اور ہم سے وہ کلیم جادو بیان چھین لیا گیا ہے جو شاید ہی پھر کبھی مادر وطن پیدا کر سکے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(۱۹۳۸ء)

اقبال کا نام الہامی نام تھا۔ ان کے والد صوفی اور پاکیزہ نفس تھے۔ ایک مرتبہ ان سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی شستہ اور لطیف گفتگو کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ اقبال جب پیدا ہونے کو تھے تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک عجیب و غریب رنگ کا خوبصورت پرندہ آسمان سے زمین کی طرف آ رہا ہے۔ جب وہ قریب آگیا تو بہت سے لوگوں نے اس کو پکڑنے کی کوشش کی اور میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ پرندہ میری گود میں آگیا اور میں نے اس کو پکڑ لیا۔ — [illegible]

ماہرالقادری

اقبال

دلوں کی وادیوں میں پھول برساتا ہوا آیا
حجازی "لے" میں نغمہ ہند کا گاتا ہوا آیا

کہا لبیک اس کے شعر پہ کلیوں نے ہنس ہنس کے
نسیم صبح کی مانند اٹھلاتا ہوا آیا

بہارِ لالہ و گل اس کی فطرت کا تھا آئینہ
وہ بوٹے گل سے ہر وادی کو مہکاتا ہوا آیا

وہ شاعر جس کے نطقِ شعر کا احساں ہے اردو پہ
ادب کی زلفِ ژولیدہ کو سلجھاتا ہوا آیا

جو باتیں رہ گئی تھیں فکرِ عطارؔ و سنائیؔ سے
اُن ہی باتوں کی وہ تکمیل فرماتا ہوا آیا

شرابِ ساقیٔ رومیؔ سے بدمستِ خودی ہوکر
فضائے ہند پہ اک کیف برساتا ہوا آیا

نظر آزاد، دل بے باک، فکر و ذہن بے پایاں
خودی کا پرچمِ رنگیں لہراتا ہوا آیا

ہوا نازل زمینِ ہند پر "بانگِ درا" بن کر
وہ آیا اور ہر سوتے کو چونکاتا ہوا آیا

قلندر کی زباں میں اس نے دی تعلیم آزادی
مجاہد کی طرح تلوار چمکاتا ہوا آیا

کہا اس نے کہ ہے عجزِ غلامی موت انساں کی
وہ سینوں میں خودی کی آگ بھڑکاتا ہوا آیا

کہا اس نے امیری بے فقیری ہو نہیں سکتی
وہ جبر و ظلم کی طاقت کو ٹھکراتا ہوا آیا

کلیمی ضرب کی تاثیر تھی اس کے تکلم میں
وہ ہر فرعون کی قوت سے ٹکراتا ہوا آیا

کہا اس نے مسلماں موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
فسانہ حضرتِ ٹیپوؒ کا دہراتا ہوا آیا

"خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"
وہ ان اسرار کو شعروں میں سمجھاتا ہوا آیا

وہ شاعر مردِ خود آگاہ، تہذیبِ فرنگی کو
حجازی تیغ کا آئینہ دکھلاتا ہوا آیا

وہ دل جو برف کے ٹکڑوں سے بھی بڑھ کر فسردہ تھے
وہ ان کو بادۂ الفت سے گرماتا ہوا آیا

جبیں میں اس کی رخشاں تھا جلالِ شانِ فاروقیؓ
غلامی کی فضا میں گرچہ شرماتا ہوا آیا

دیا پیغام اسلامی اخوت کا زمانے میں
جہاں میں زندگی کی روح دوڑاتا ہوا آیا

وہ آتش جس کے سینے میں ہے گویا سوزِ طارقؒ کی
اسی سے دل کے خاکستر کو گرماتا ہوا آیا

دیا تھا جو پیام زندگی نطقِ محمدؐ نے
اسی پیغام کو اقبالؔ دہراتا ہوا آیا

عالم خوندمیری

اقبال بحیثیت مفکّر

یہ بحث کہ اقبال مفکر ہیں یا شاعر۔ اس اعتبار سے بے معنی ہے کہ ان کی شاعری مفکرانہ ہے اور اُن کی فکر شاعرانہ ہے۔ فکر و شاعری صرف ادنیٰ سطح پر متضاد نظر آتے ہیں۔ شاعری بھی ایک ذریعۂ علم ہے جہاں وجدانِ حقیقت کی اُن منطقوں کو چھو نے نکلتا ہے۔ جہاں استدلالی فکر کبھی کبھی عاجز نظر آتی ہے۔ فکر اور شعر کا امتزاج مشرق اور مغرب دونوں کی ایک مشترک روایت ہے۔ مشرق میں اعلیٰ فکر نے ہمیشہ شاعری کے ذریعے اپنا اظہار کیا ہے۔ اقبال کئی جہتوں سے مشرق اور مغرب کا نقطۂ اتصال ہیں۔ فکر اور شعر کے امتزاج میں بھی اُنھوں نے اِن دو عظیم تہذیبی اور روحانی روایتوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ اُن کا یہ نظریۂ شعر ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن ۔۔۔ جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

جہاں ایک طرف مشرق کی عظیم شعری روایات کی نمایندگی کرتا ہے وہیں مغرب کی فنّی روایت کا ترجمان ہے۔ فکر کی معراج اگر عقلِ بینا ہے تو شعر کی معراج دیدۂ بینا اور بینائی یا عرفان فکرِ اقبال اور شعرِ اقبال کا نقطۂ اتحاد ہے۔

وجود کی ماہیت اور وجود کا عرفان مشرقی فکر کا منتہا رہا ہے لیکن مشرقی فکر وجود کے اس بحرِ ناپیدکنار میں انسانی شخصیت یا انسانی وجود کے آزاد نقطے کو دریافت کرنے میں ناکام رہی۔ وہ لامحدود دشتِ وجود میں گم ہو گئی اور ایک ایسے موجود کا سراغ نہ پاسکی جو اضافی حیثیت ہی سے سہی لیکن بار بار اس دشتِ وجود میں اپنی زیست کا اعلان کرتا رہتا ہے۔ دشتِ وجود میں اس طرح گم ہو جانے کا ایک المناک نتیجہ یہ نکلا کہ مشرقی فکر انسان کی کلّی تقدیر سے بے نیاز ہو گئی۔ انسان کی عارضی زندگی اور اس کے وجود کے وہ مطالبات اور تقاضے جو اس عارضی زندگی سے وابستہ ہیں مشرقی فکر کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ زمانہ اور تاریخ انسانی فکر کے لئے غیر اہم اور غیر نتیجہ خیز اُمور بن گئے۔ اس کے برخلاف انسانی وجود کا یہ DEONENSION مغربی فکر، مغربی حکمت اور مغربی فن اور ادب کو ہمیشہ اُکساتا رہا اور اپنی جانب متوجہ کرتا رہا۔ مشرق روح میں اس طرح مگن ہو گیا کہ مادہ اور مادی دنیا اس کے لئے بے معنی اور لغو ہو گئے۔ مغرب نے اداروں اور سماجی زندگی کی تنظیم کو ایک ادنیٰ درجے کی مصروفیت قرار دیا۔ جس میں اُلجھ کر انسان اپنی ماہیت سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ اگر مشرق انسانی وجود سے غافل ہو گیا تو مغرب نے انسانی وجود کے آگے اور اس سے ماوراء حقیقت کو پس پشت ڈال دیا۔ کائنات کی تسخیر مغرب کا مطمحِ نظر بن گیا اور اس تسخیر کی اس مہم میں خود انسانی وجود ایک ذریعہ کا وسیلہ بن گیا۔ مشرق نے تسخیرِ کائنات کے بغیر تسخیرِ نفس کو کافی تصوّر کیا۔ اور نتیجتاً مادی دنیا سے انسانی نفس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ سیاسی غلامی، معاشی استحصال اور کائناتی جبر اس کی نظروں میں حقیر بن گئے۔

اقبال کی فکری زندگی کا روشن پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مشرق اور مغرب کی ان یکطرفہ بصیرتوں کو یکجا کرنے اور ایک مجموعی کلی نقطۂ نظر فراہم کرنے کی کوشش کی۔ جہاں انسان اپنے وجود کے دونوں ابعاد کا نقطۂ اتصال بنا سکے۔ جہاں وہ مغرب کے انسان کو یہ یاد دلاتے ہیں ؎

فضا تیری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اُٹھاؤ مقام آسماں سے دور نہیں

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

تو وہیں مشرقی انسان پر اس حقیقت کو منکشف کرتے ہیں ؎

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

اقبال کی عظمت کا راز یہی ہے کہ انھوں نے انسانی وجود کے ان دو ابعاد کے تضاد کو دور کرنے کی کوشش کی اور انسانی وجود کو من حیث الکل اپنی فکر اور اپنے فن کا نصب العین بنایا۔ اس معنی میں ان کی فکر مشرق اور مغرب، روحانیت اور مادیت، انفس و آفاق، الوہیت و انسانیت مگر دنیویت اور ابدیت اور تاریخ کا نقطۂ اتصال بن جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں کہ پہلی بار اقبال کے فکر اور شعور میں انسان اپنی طاقت اور اپنی بے مائیگی، اپنی جسارت اور اپنی منکسری، اپنے عرفان اور اپنی بے بصری، اپنے لامحدود امکانات اور اپنی حقیقت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ اور مشرقی فکر اور فن کی ایک نئی روایت بن جاتا ہے۔ ان کی فکر نے انسانی وجود اور اس کی شخصیت کو دریافت بھی کیا اور اس پر تنقید بھی کی وہ نہ بیری انسانیت پرستی کے شکار ہوئے اور نہ روایتی مشرقی الوہیت پسندی میں گم ہو گئے۔ ان کی شاعرانہ فکر کا یہی ایک کارنامہ انہیں مشرق میں ممتاز کرنے کے لئے کافی ہے۔ لیکن اقبال کی فکر نے وجود کے مزید ایسے گوشوں کو منکشف کیا۔ جن پر مشرقی فکر نے پردے ڈال رکھے تھے۔

کائنات کی ناتمامی اور سلسلۂ موجودات کے ناکافی ہونے کا عرفان مشرق کی فکر میں ہمیشہ نمایاں رہا۔ لیکن اس طرح کہ یہ انسان کے لئے چیلنج نہ بن سکا۔ کائنات کی اس ناکافی کا عرفان اداس اور برہم کے جذبات کا سبب بنا رہا۔ اقبال مشرق کی اس عارفانہ روایت کے حصہ دار ہیں لیکن یہ روایت ان کی فکر اور ان کے شعر میں امکانات، توقعات اور امیدوں کے نئے در کھول دیتی ہے۔ یہ ناتمامی حرفِ آخر نہیں رہتی بلکہ ایک مسلسل تخلیقی عمل کی جانب نشاندہی کرتی ہے۔ مستقبل کا ایک نیا عرفان عطا کرتی ہے۔ جہاں انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ارتقا پذیر کائنات کا جز ہے اور اسی لئے خود ارتقائی عمل کا ایک شعوری حصہ دار۔ اب کائنات کی ناتمامی کا احساس کوئی الم انگیز کیفیت پیدا نہیں کرتا۔ بلکہ ایک ماورائی مسرتِ امید کا سامان فراہم کرتا ہے ؎

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

اس منزل پر انسان مجبور محض وجود کی طرح یہ نہیں سوچتا کہ "ہوتا ہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا"۔ اس تخلیقی اور ارتقائی عمل میں خود بھی حصہ لینے کا حوصلہ اور امنگ محسوس کرتا ہے وہ ایک فعال اور وجودی حیثیت سے ایک آزاد اور خود مختار موجود بن جاتا ہے۔ حرکت اور زمانے کا یہ عرفان اقبال کی اپنی روایت ہے اس روایت کے بانی [illegible]

ہی [illegible] کی فکر سے یہ چراغ روشن ہوا۔ شعور کی اس طرح پر انسان کو اس بات کا عرفان حاصل ہوتا ہے آزادی کا عمل ایک منزل پر اس مادی کائنات کے مظاہر سے سروکار رکھنے کا بھی تقاضا کرتا ہے اور اگر ماورائی شعوری رہنمائی حاصل ہو تو عالم مادی سے ربط انسانی وجود کے اخلاقی انحطاط اور اس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت نہیں ہوتا بلکہ کائنات اور دشت وجود اس کے لئے قید بن جاتے ہیں۔ اس منزل پر کائنات کا جنون فریب میں اُلجھاتا نہیں بلکہ ایک اخلاقی چیلنج بن جاتا ہے۔

انسان حلقۂ دامِ خیال نہیں بلکہ خود کائنات اس کی اسیر بن جاتی ہے اور اس کی خلاقی ایک نئے میدان کی متلاشی ہو جاتی ہے ؎

در دشتِ جنون من جبریل زبوں صیدے　　یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اقبال کا یہ مردِ عارف صرف اپنی خلوتوں میں گم نہیں رہتا بلکہ اس کا عرفان اس کو تاریخ ساز عمل پر اور انسانی ماحول کو بدلنے پر اُکساتا ہے۔ اس تخلیقی اور تاریخی عمل میں انسان اپنے آپ کو دریافت کرتا ہے۔ اور زندگی کو معانی عطا کرتا ہے۔ وہ اپنی تعمیری قوتوں کو اکٹھا کرتا ہے اور تاریخ ساز عمل میں تخلیقی حصہ لیتا ہے۔ وہ آفاق میں گم نہیں رہتا بلکہ آفاق کو اپنے وجود میں سمو لیتا ہے۔ یہاں انسان اور کائنات کا ربط ایک مجبور وجود اور وسیع اور عریض بے رحم کائنات کا ربط باقی نہیں رہا بلکہ خود حیات ذوقِ سفر کا نام بن جاتی ہے اور انسان اس کائنات میں ایک خلاق اور مشتاق موجود کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ زوالِ آدم عروجِ آدم بن جاتا ہے اور اسی لمحہ یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

اقبال کی آرزو یہی ہے کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ اپنی تقدیر کا عرفان حاصل کر لے۔ اسی آرزو کو انہوں نے اپنی فکر کا نقطۂ آغاز بنایا اور اسی لئے ان کی فکر مشرقی روایت میں ایک انوکھا انداز رکھتی ہے ▪▪

●

اقبال بہت بڑے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک زبردست فلسفی بھی ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان کی کون سی حیثیت پر زیادہ زور دے سکتا ہوں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اقبال کی شاعری کی علت غائی کو سمجھنے، ان کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں اور ان کے تصور کی بلند پروازی تک پہنچنے کی کوشش کرتا تھا لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ان کی شاعری اولیں دور میں تھی۔ زمانہ گزرتا گیا اور اس کی دلچسپی کو جو زندگی کے شاعرانہ اعتبار سے متعلق ہے صرف حسن و رعنائی کے اطمینان بخش اندازِ بیان سے کچھ اور زیادہ طلب کرنے کی ضرورت ہوئی۔ بعض اوقات میں نے ان کے فلسفہ کے منتہائے مقصود تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور اس دنیا پر اس کی تاریخ پر اس کے مسائل پر اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کے مستقبل قریب پر ایک وجدانی تصور کے ذریعہ نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے اور یہ تصور اقبال کے فلسفہ کا مہیا کردہ [illegible]

(ڈاکٹر سید عبداللطیف [illegible])

ڈاکٹر غلام عمر خاں

اقبال کی شاعری

اقبال کی شاعری کا تعلق پُر عظمت شاعری کے اس درجہ کمال سے ہے، جس کے بارے میں عظیم المرتبت شاعر اور صوفی جلال الدین رومی نے کہا تھا۔

شاعری جزویست از پیغمبری

شاعری کے اسی مقام و مرتبہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خود اقبال کہتے ہیں۔

شعر را مقصود گر آدم گری است
شاعری ہم وارث پیغمبری است

پُر عظمت شاعری (GREAT POETRY) کیا ہے۔ اس کی وضاحت دو چار جملوں میں کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے۔ پُر عظمت شاعری وہ شاعری ہے جو انسانیت کے ازلی مسائل کے تعلق سے حکیمانہ بصیرت کی حامل ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے بدیع ذہن کی پیداوار ہوتی ہے۔ جو انسانیت کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتا ہے۔ انسان اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے کی پُر خلوص کوشش کرتا ہے۔ اور ایک ایسے حل کا متلاشی ہوتا ہے جو انسان کو اپنے اطراف و اکناف کی دنیا سے مطابقت پیدا کرنے کی ضمانت دے۔ یا یوں کہیے کہ ایک عظیم شاعر وہ شاعر ہے جو فلسفہ کی مقبول اصطلاحوں میں صداقت، خیر، اور حسن کی ازلی قدروں کا متلاشی ہوتا ہے۔ پھر صداقت کی تلاش میں کبھی اس کی روح کی یہ تڑپ، نغموں کی صورت میں پھوٹ نکلتی ہے۔ اور کبھی حقائق حیات، اس کے قلب پر اس طرح منکشف ہوتے ہیں کہ اس کا سینہ تجلی زار حسن بن جاتا ہے۔ اور اس کے باطن حسن کا چھلکاؤ، شعر کا قالب اختیار کر لیتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عظیم شاعری اصطلاح، عالمی ادب کے جن مشاہیر کے لئے بالعموم مستعمل ہے۔ ان کی صف میں بھی ایسے جلیل المرتبت شاعروں کی تعداد صرف خال خال ہے۔ جنھیں رومی کے الفاظ میں منصب نبوت سے کوئی نسبت ہے۔

اقبال کی شاعری کے محرکات، ان کی شاعری کے موضوع یا متن، اور ان کے طریقہ تخلیق، یا غزل و شعر کے تجربہ کو سمجھنے کے لئے، ہمیں خود اقبال کے تصور شاعری کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ کیونکہ ان کا نظریۂ شاعری خود ان کے شاعرانہ تجربہ کی اساس اور عکس ہے۔ اور اعلیٰ شاعری کی جو تعبیر و تشریح اقبال نے کی ہے وہ خود ان کی شاعری پر پوری طرح صادق آتی ہے۔

اعلیٰ شاعری کے تعلق سے شاعر مشرق اقبال اور جرمنی کے عظیم فلسفی شاعر نیٹشے کے تصورات میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ متن اور موضوع کے اعتبار سے نیٹشے اور اقبال کی شاعری بالکل مختلف ہے۔ لیکن شاعری کے

منصب [illegible] کے طریقۂ عمل اور اس کی تخلیقی قدر و قیمت کے بارے میں دونوں ہم خیال ہیں۔ نیٹشے کے نزدیک صحت مند شاعری اور آرٹ ایک مخصوص جمالیاتی کیفیت کی پیداوار ہوتا ہے اس کیفیت کو نیٹشے (DIONYSAIN - AESTHETIC STATE) سے موسوم کرتا ہے۔ یہ شدتِ ایقان سے پیدا ہونے والی سرخوشی اور سرمستی کی کیفیت ہے۔ باطنی توانائی اور شدت و فور سے چھلک اٹھتی ہے۔ سرمستی اور سرشاری کی یہ جمالیاتی کیفیت اشیاء کو دیکھنے کے ایک فاعلانہ اور قاہرانہ اندازِ نظر (ATTITUDE) کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ فاعلانہ اندازِ نظر ہر وقت اشیاء کی ہیئت کذائی اشیاء کی ہیئت کذائی کو بدل دینے ان کو زیب و زینت بخشنے اشیاء کے حسن میں اضافہ کرنے، غرض موجود (BEING) کی قلب ماہیت کرنے، اسے ایک مولود (BECOMING) میں تبدیل کر دینے کی تمنا، اور عزم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

اقبال کے نزدیک بھی اعلیٰ اور صحت مند شاعری، خودی کی قاہرانہ جمالیاتی کیفیت کا ایک مظہر ہے وہ تجربہ جو خودی میں کیف و سرور اور جذب و مستی کی پیدائش کا باعث ہوتا ہے۔ نظارۂ حق، یا ذات کا ادراک و عرفان ہے۔ اقبال کے نزدیک یہ عرفان و ادراک تجربۂ قلب یا (MYSTIC EXPERIENCE) کے ذریعہ ممکن ہے، جو حیات کی اعلیٰ تر سطحوں کا تجربہ ہے۔ دیدارِ ذات کے تجربہ کی بدولت، عظیم فنکار اپنی شخصیت کے باطنی حسن و تمول تک رسائی حاصل کرتا ہے جو زبردست تخلیقی قوت کا سرچشمہ ہے۔ عظیم شاعر عرفانِ ذات یا نظارۂ حق کے تجربہ سے فیض یاب ہوتا ہے۔ اس کی روح کیف و سرور کی فراوانی سے بے خود و سرشار ہو جاتی ہے، اور ایک جنون انگیز ایقان سے معمور۔ اس طرح خودی پر عشق و جنون کی وہ قاہرانہ جمالیاتی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اشیاء کو دیکھنے کے ایک فاعلانہ بلکہ جارحانہ اور قاہرانہ اندازِ نظر کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور اشیاء کی موجودہ قدر و قیمت کو رد کر کے، انھیں نئی قدر و قیمت عطا کرتی ہے۔ خارجی دنیا کے تعلق سے یہی مخصوص قاہرانہ جمالیاتی کیفیت، پُر عظمت شاعری کا سرچشمہ ہے، وہ شاعری جو قوموں کی تقدیر بدل دینے کا باعث ہوتی ہے۔ اقبال نے نگاہِ شوق کے عنوان سے اس کیفیت کی تشریح کی ہے۔

یہ کائنات بدلتا ہے کاروبارِ جہاں	نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی
اسی نگاہ میں ہے قاہری و جباری	اسی نگاہ میں ہے دلبری و رعنائی
اسی نگاہ سے محکوم قوم کے فرزند	ہوئے جہاں میں سزاوارِ کارفرمائی
اسی نگاہ سے ہر ذرہ کو جنوں میرا	سکھا رہا ہے رہ و رسمِ دشت پیمائی

اقبال کے نزدیک ایک عظیم المرتبت شاعر موجود یا (BEING) کا تابع نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی طاقتور خودی موجود کو درہم برہم کر کے، ایک ایسے نقش کو نمود دینے کی کوشش کرتی ہے جس کا جلوہ شاعر کو اپنی شخصیت کی گہرائیوں میں نظر آتا ہے۔ وہ شاعر جو موجود یا فطرت سے اکتسابِ حسن کرتا ہے، ایک ایسا فنکار ہے جسے اپنی ذات کے باطنی حسن تک رسائی میسر نہیں ہو سکی۔ وہ ایک مریض ہے، جس کی بھوکی روح، خارج سے حسن و فراوانی کی تلاش کرتی ہے۔ ایک صحت مند شاعر کا مقابلہ، مریض طبع فنکار کے طرزِ تخلیق سے کرتے ہوئے، اقبال اسی خیال کی اس طرح توضیح کرتے ہیں۔

"وہ فنکار جو زندگی کا مقابلہ کرتا ہے وہ انسانیت کے لئے باعثِ برکت ہوتا ہے۔ وہ تخلیق میں خدا کا ہمسر ہے اور اس کی روح میں زمانہ اور ابدیت کا پَرتو منعکس ہوتا ہے۔ عہدِ جدید کا فنکار فطرت سے اکتساب فیض کرتا ہے حالانکہ فطرت تو لیس ہے۔ اور اس کا کام یہ ہے کہ ہماری اس جستجو میں روڑے اٹکائے۔ جو ہم اس کے لئے کرتے ہیں جو "ہونا چاہئے" اور جسے فنکار اپنے وجود کی گہرائیوں میں پا سکتا ہے۔"

پُرعظمت شاعری قوتِ اعجاز کی حامل ہوتی ہے، جو نطشے کے الفاظ میں، اپنے عزم و ارادہ کو مسلط کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ یہ وہ آرٹ ہے جس کو فنکار فطرت کے حسنِ مستعار سے حسین نہیں بناتا۔ بلکہ اپنی شخصیت کی انتہائی گہرائیوں سے، بالفاظ دیگر اپنے قلب و جگر سے خون دے کر، اس میں اپنی مخصوص و منفرد روح پھونک دیتا ہے۔ تمام فنونِ لطیفہ خواہ وہ فنِ تعمیر ہو، کہ سنگ تراشی، نقاشی یا موسیقی ہوں کہ شاعری، ناقص و نامکمل اور قوتِ اعجاز سے عاری رہ جاتے ہیں۔ جب تک کہ فنکار کے خونِ جگر سے ان کی آبیاری نہ ہو، اور اک خودی اور نظارۂ حق کے حسنِ سرمدی کا عکس ان پر نہ پڑا ہو۔ ذیل کے اشعار میں اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارے کئے ہیں۔

رنگ ہو یا سنگ و خشت، چنگ ہو یا حرف و صوت   معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر   نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر   میخانۂ حافظ ہو کہ بتخانۂ بہزاد

اقبال کی طرح نطشے کو بھی صرف وہی نقش عزیز ہے جو خون سے ثبت کیا گیا ہو۔ اور خون نطشے کے نزدیک بھی شخصیت کا نچوڑ یا شخصیت کا جوہر، یعنے روح ہے۔

نطشے کہتا ہے۔ "تمام تحریروں میں مجھے صرف وہ تحریر عزیز ہے جسے کسی نے اپنے خون سے لکھا ہو۔ خون سے تحریر کرو۔ اور تمھیں معلوم ہوگا کہ خون روح ہے۔"

پُرعظمت شاعری میں، جو عزم تسخیر کا نقش ہوتی ہے، قوت کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ وہ شعر و ادب، یا وہ آرٹ، جو قوت کے عنصر یا نارِ حیات سے عاری ہوں، اقبال کی نظر میں سحر و فسوں یا طلسم و جادوگری کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دلبری بے قاہری جادوگری   دلبری با قاہری پیغمبری

اقبال کے نزدیک وہ حسن جو صحت و فراوانی اور تموّل کی پیداوار ہوتا ہے۔ قوت کے عنصر کا حامل ہوتا ہے نطشے کی نظر میں تو حسن صرف قوت ہی کے چھلکاؤ سے عبارت ہے۔ قوت سے عاری حسن اقبال اور نطشے، دونوں کے نزدیک مرض اور انحطاط کی پیداوار ہے۔ اور طبع انسانی میں فساد و زوال پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اقبال حسنِ جمیل (BEAUTIFUL) کے نہیں بلکہ حسنِ جلیل (THE SUBLIME) کے پرستار ہیں۔ پُرعظمت عرفانیات کا سوز جلال اور ارادۂ خودی کی گرمی اور تابندگی پائی جاتی ہے۔ حسنِ محض جو قوت سے عاری ہو صرف ایک سراب ہے، جو انسانی توانائی کی تضییع پر منتج ہوتا ہے۔ اقبال "جلال و جمال" کے عنوان سے اپنے تصورِ حسن کی اس طرح صراحت کرتے ہیں۔

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی   ترے نصیب فلاطوں کی تیزیِ ادراک

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی — کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر — ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

قوت کے عنصر سے عاری شعر و ادب کا طلسم، مسموم اور خواب آور اثرات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ قوموں کے شعلۂ حیات کو مدہم کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ اقبال کی نظر میں شاعروں اور فنکاروں کا پُر فساد اور مائل بہ انحطاط ضمیر ایک قوم کے حق میں چنگیز اور اٹیلا کے لشکروں سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

اقبال نے جاوید نامہ میں رومی کی زبانی پر ایک نصب العین شاعر کی حیثیت اور اس کے منصب و مرتبہ پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک مثالی شاعر کی یہ تصویر واقعہ یہ ہے کہ خود اقبال پر بہ حیثیت شاعر کے پوری طرح صادق آتی ہے۔

ایک عظیم المرتبت شاعر عرفان خودی یا مشاہدۂ حق کے تجربہ کے ذریعہ اپنے وجود کی گہرائیوں میں حسن سرمدی کا سرچشمہ دریافت کرتا ہے۔ بصیرت الٰہی سے فیض یاب ہو کر وہ حق و صداقت کا نقش خارجی دنیا پر ثبت کرنے کی جدوجہد کرتا ہے، جس کا پر تو اس کو اپنی شخصیت کی گہرائیوں میں نظر آتا ہے۔ ایک صاحب دل شاعر قوم کے جسد میں قلب کی حیثیت رکھتا ہے اس کا آرٹ، راست قلوب انسانی پر اثر انداز ہوتا، اور اپنی قوت اعجاز سے ان کی قلب ماہیت کر دیتا ہے۔ وہ انسان کی خوابیدہ روح کو بیدار کر کے، اپنی روح کے حسن و جمال سے، اس کو متحرک، مضطرب اور رقصاں کر دیتا ہے۔ اور ساری قوم کے رگ و ریشہ میں نئی زندگی اور نیا خون رواں کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کی شاعری قوموں کی تقدیر بنانے کی قوت کی حامل ہوتی ہے۔ اور اس حیثیت میں ایک اعلیٰ مرتبت شاعر، منصب پیغمبری کا جانشین ثابت ہوتا ہے...

اقبال کہتے ہیں۔ ؎

رومی آن عشق و محبت را دلیل — تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل
گفت ان شعرے کہ آتش اندر وست — اصل او از گرمیٔ اللہ ہو ست
آن نوا گلشن کند خاشاک را — آن نوا برہم زند افلاک را
آن نوا بر حق گواہی می دہد — با فقیران پادشاہی می دہد
خون ازو اندر بدن سیار تر — قلب ازو بے روح الامین بیدار تر
فطرت شاعر سراپا جستجوست — خالق و پروردگار آرزوست
شاعر اندر سینۂ ملت چو دل — [illegible]
سوز و مستی نقشبند عالمے است — [illegible]
شعر را مقصود گر آدم گری است — [illegible]

[illegible] شعر یا نزول شعر کے تعلق سے اقبال [illegible]
[illegible] ڈاکٹر اقبال کیا آپ بھی [illegible]
[illegible] اقبال نے کہا [illegible]
[illegible] قرآن کا آیات [illegible]

اقبال

اس اندھیرے میں یہ کون آتش نوا گانے لگا
جانبِ مشرق اجالا سا نظر آنے لگا
موت کی پرچھائیاں چھلنے لگیں چھٹنے لگیں
ظلمتوں کی چادریں پھٹنے لگیں ہٹنے لگیں
اک شرارہ اڑتے اڑتے آسمانوں تک گیا
آسماں کے نور پیکر نوجوانوں تک گیا
عالمِ بالا پہ باہم مشورے ہونے لگے
آسمانوں پر زمیں کے تذکرے ہونے لگے
پھر اندھیرے میں وہی آتش نوا پایا گیا
زندگی کے موڑ پر گاتا ہوا پایا گیا
وہ نقیبِ زندگی شام و سحر گاتا گیا
کو بہ کو، کوچہ بہ کوچہ، در بہ در گاتا گیا
گیت سننے کے لئے خلقِ خدا آنے لگی
گردنوں کو جنبشیں دے کر یہ فرمانے لگی
نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صورِ اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں
عرش کا قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے مرے پاک عشق کی اک آگ ہے

مخدوم محی الدین

نوائے اقبال

سونے والوں کو پیامِ صبحِ نو دیتی ہوئی
خواب کی دنیا اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
مطلعِ مشرق پہ چمکا، آفتابِ شاعری
ہر کرن، جس کی بنی تارِ ربابِ شاعری
دل پہ تھا جو داغِ غفلت اشکِ آتشیں ہوگئیں
خرمنِ مشرق میں ہزاروں بجلیاں حل ہوگئیں
ضبط کے زخمِ نہاں، فریاد سے بھرنے لگے
یعنی بندے بھی خدا سے گفتگو کرنے لگے
عارضِ پُر نور جھلکا، گیسوئے شب رنگ سے
جوئے بار سازِ دل نکلی سکوتِ سنگ سے
اشکِ خونیں میں نظر آئی تبسم کی جھلک
نغمۂ بلبل بنی، خاموش پھولوں کی مہک
کارواں بڑھنے لگا، تیزی سے منزل کی طرف
کائناتِ درد خود کھنچنے لگی دل کی طرف
دہر کے دھارے پہ طغیانی ہوا سے بہنے لگی
ناؤ مشرق کی کنارے کی طرف بہنے لگی
جاگ اٹھا مشرق جلی اقبال کی [illegible]
واہ کا محشر لیے آئی [illegible]
قلب یہ شاعر ہے [illegible]
[illegible]

[illegible]

نذر اقبال

کچھ تذکرے ہیں مرتبہ حمیدہ تری

قابل انشا پردازوں نے اقبال کی بے وقت موت پر اخباری دنیا کے لئے کافی مسالہ فراہم کردیا ہے۔ سالم کے سالم اخبار اس کے ماتم میں سیاہ ہوچکے ہیں۔ آج گھر گھر اس کا تذکرہ ہے۔ ہر شخص کی زبان پر اس سانحہ کے افسوس کا اظہار ہے کتنے دل ایسے ہیں جن میں اس کا دکھ پنہاں ہے۔ وہ کتنا خوش نصیب ہے جس کے اتنے رونے والے ہیں۔ یہ عزیزوں کا مجازی ہمگران کس قدر جلد اپنے خدائے حقیقی سے جاملا۔

۲۱ر اپریل تاریخ عالم کا وہ حسرت ناک دن ہے جس نے مشرق کے ادبی افق سے رنگینی چھین لی۔ فضائے شاعری سے کشش مفقود ہوگئی جس نے ان گنت اور بے حساب دلوں کو اپنا بنالیا تھا۔ تسخیر قلوب جس کی شاعری کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس کی موت نے سب کی آنکھیں کھول دیں۔ خبر مرگ نے ایک بیکس کی آہ کی طرح جگر کو چھلنی کردیا۔ شاعری کی دیوی اندھا ہوگئی حقیقت افسانہ بن گئی۔ واقعی اس مقولہ میں کتنی قوت ہے، کتنا جادو ہے، — "ایک ہونہار ادیب یا شاعر کی موت دنیائے ادب کی موت ہے !!"

وہ شوریدہ سری، وہ طوفان و ہیجان، وہ تلاطم خیزیاں، وہ جوش و خروش جو اقبال کے قلم اور دماغ کا نتیجہ تھیں ——— قائم تو رہیں گی جب تک دنیا قائم ہے۔ لیکن اس کا تسلسل ختم ہوگیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم، عرفان و فلسفہ پر اداسی چھاگئی، اب مردہ قوموں میں زندگی کی لہر دوڑانے والا شاید کوئی نہیں رہا۔ اقبال کی شاعری قومی شاعری تھی۔ اس کا دائرۂ عمل اپنے ہی تک محدود نہیں تھا۔ وہ دوسروں کے لئے زندہ تھا شاید یہی ٹھیک ہی ہے۔ ——— "مرنا بھلا ہے اس کا جو اپنے لئے جئے ، جیتا ہے وہ جو مرچکا انسان کے لئے"

اقبال کی موت ایک فلسفہ ہے جس کو سوچنے اور اس پر سر دھننے سے دماغ تھکا ہو جاتا ہے۔ اقبال کو موت سے وابستہ کرنے میں دل پس و پیش کرتا ہے۔ یقین کی حس ساکت و صامت ہو جاتی ہے۔ شاید زندگی کا لطف اسی میں ہے کہ انسان آئے اور چلے جائے ——— ابدی زندگی کس کام کی ——— سوا سو برس جینے کی لوگ دعا دیتے ہیں ——— اُف کتنی بد دعا دیتے ہیں ——— خیال کرنے سے وحشت ہوتی ہے اور فوراً زبان سے "خدا نہ کرے" نکل جاتا ہے۔ ۶۰، ۷۰ برس ہی کتنے بہت ہیں۔ خضر کیا کر رہے ہیں نہیں معلوم زندہ وہ کو اتنے زمانے سے ——— "ابدی زندگی" انھیں نصیب ہے !!

تخیل ——— زندگی کے متعلق ایک خیالی دنیا ——— جس میں علو ہمتی ہو اولوالعزمی ہو، ہمت و حوصلہ، وجدان و کیف ہو۔ اسی کا نام شاید تخیل ہے اور اقبال ان محسوسات شاعری کا ناخدا تھا۔ بجھی ہوئی خاموش طبیعت کو اکسا دینے والی قوتیں اس کے قلم میں چھپی ہوئی تھیں جس کو ایسے ایسے جادو جگانے یاد تھے کہ بس دنیا جانتی ہے۔

اس کا "شکوہ" ایک بچے کا اظہار ہے ——— وہ زبان جو شکوہ پر کھلی تو اللہ کو بھی اس نے نہ چھوڑا اور پھر خدا کی شان اللہ ہی کو

زبان سے ہی ادا اس شکوہ کا وہ ذہنی عکس غالب ہے کہ جیسے خدا خود بول رہا ہے۔ شکوہ میں اس نے کچھ بات اٹھائیں کہ خوب ہی مزا ہے نکلا اللہ کی پناہ بخدا "ہرجائی" تڑپایا ——— اس پردہ عذر کر بھی ناز ہو گیا۔ اس کے بعد بے باک نے آسمانوں کو چیر دیا افلاک کے جگر چاک ہو گئے ؎

پیر گردوں نے کہا سن کے کہیں ہے کوئی | بولے سیارے سرِ عرشِ بریں ہے کوئی
چاند کہتا تھا نہیں اہلِ زمیں ہے کوئی | کہکشاں کہتی تھی پوشیدہ یہیں ہے کوئی
کچھ جو سمجھا مرے شکوے کو تو رضواں سمجھا | مجھے جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

اللہ کی زبان میں کتنی مٹھاس بھری ہے وہ کہتا ہے ؎

ناز ہے طاقتِ گفتار پہ انسانوں کو | بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

"جوابِ شکوہ" میں انسانی زندگی کے لئے عمل کا سبق ملتا ہے۔ جو کہہ دیا ہے ناکس نے "کوشش کرنے سے خدا ملتا ہے" اقبال اس عقیدے کی رگ رگ پر حاوی ہے۔ وہ قوموں کو حرکت میں لانے کے لئے بے چین اور تڑپتی دیکھنے والوں کو بے چین و مضطرب دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو جمود و سکوت ناپسند ہیں۔ اس کے الفاظ میں بجلیاں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے اشعار کے بے پایاں دریا سے ان موتیوں کا اقتباس ستاروں کو گننے کے مشغلے سے کم نہیں۔

اقبال کی شاعری نے ایک عالمگیر ہر دل عزیزی کا حاصل کی۔ بلاشبہ اقبال پر بعض اوقات غالب کا دھوکا ہوتا تھا۔ وہ اس نوع سے زندہ غالب تھے۔ آج یہ محسوس ہوتا ہے کہ صرف اقبال ہی نہیں بلکہ غالب بھی دنیا سے چل بسے۔

اقبال کی شاعری جھوٹے ڈھکوسلوں اور نفسانی ناچاریوں سے قطعاً بے نیاز ہے۔ اقبال، میر کی طرح سرہانے آہستہ بولنے کی استدعا نہیں کرتا۔ روتے روتے ابھی آنکھ لگی کا اس کو کچھ نہیں بلکہ اس کے یہاں کی دھوم دھام یوں ہے ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو | کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

فرانس کا سب سے بڑا مفکر و ادیب روسو کہتا ہے:—

"ہر اعلیٰ کارنامہ انسان کا ذہنی شاہکار ہے"

خیال تو کیجئے اقبال نے ایسے کتنے شہکار چھوڑے ہیں جن کا ٹھکانا نہیں ——— جو بجائے خود ایک گلدستۂ ادب ہے۔ "بانگِ درا" میں اقبال ایک ڈھونڈنے والے کی طرح بے چین ہے۔ اور "بالِ جبریل" میں ایک پانے والے کی طرح مطمئن۔ "بانگِ درا" زیادہ تر رنگ ہے اور بالِ جبریل تمام درس ہے۔ وہ الفاظ ہیں جو وحید اقبال کے لئے لکھتے ہیں اور شاید اس سے بہتر تشریح نہیں ہو سکتی ——— احساسِ خودی اور [illegible] یہ اقبال کے پیام کے دو اہم اجزاء ہیں۔ وہ اپنے نظریوں کی بالکل آزادانہ تبلیغ کرتا تھا [illegible] کہ زندگی ختم ہو گئی۔ فلسفہ نہ ہی نکتہ رہ گیا۔

اقبال ایک سچے آدمی کی طرح اپنے طرزِ کلام میں صاف اور بے باک ہے۔ جو فن اور خروش ہو تو اس کے یہاں اہمیت رکھتے ہیں اور انہیں کا پلہ یہاں بھاری ہے۔ اقبال کا نظریہ تھا کہ حرکت زندگی ہے اور سکون موت۔

؎ ناصبوری ہے زندگی دل کی | آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

کسی کا خیال ہے کہ زندگی ایک معمہ ہے "سمجھنے کا نہ سمجھانے کا" لیکن جن کے بازو میں قوت ہے اور جوشِ ہمت ان کے نزدیک ایک معمولی کھیل ہے۔

کچھ بالِ جبریل سے تغزل کی مثالیں ——

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

آدمی کے ریشے ریشے میں سما جاتا ہے عشق شاخِ گل میں جس طرح بادِ سحرگاہی کا نم

یہ اشعار حقائق پر کس انداز سے روشنی ڈالتے ہیں کہ دماغ کو سوچنے اور غور کرنے کا ایک پرکیف مشغلہ مل جاتا ہے ——

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن
من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

غرض بعض کوتاہ بینوں کا یہ نظریہ ہے کہ اقبال کے یہاں تغزل نہیں — ایسی ذہنیتیں شاید موسیقی کے فن اور سُر سے ناواقف ہیں —— بہرکیف —

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا (۱۹۳۸ء)

بشیر النساء بیگم بشیر

بہارِ آخریں

(ارمغانِ حجاز کو دیکھ کر)

نظر آنے لگے جلوے خداوندِ سخنداں کے! سنبھل اے دیدۂ گریاں! کہ ہیں آثار طوفاں کے!

سنائی دے رہی ہیں پھر وہی مانوس آوازیں کوئی سازِ غزل پر چھیڑتا ہے راگ عرفاں کے

مجھے محسوس ہوتا ہے وہ کب کا جا چکا یاں سے یہ نغمے ہیں فقط اک گونج رحلت کے حدی خواں کے

نہ آئے گا کوئی پیغامِ تازہ اب نہ آئے گا بشیر اب بند کیا ہوں گے یہ آنسو چشمِ گریاں کے

جگر کا خون دے دے کر جو بوٹے اس نے پالے تھے
یہ اوراقِ پریشاں ارمغاں ہیں اس گلستاں کے!

(۱۹۳۹ء)

تضمین بر غزلِ اقبال

شاذ تمکنت

دلِ ازل میں جو تھا ذوقِ جستجو میں ہوں
تمام سازِ تمنا تمام سوزِ دروں
چھپائے پھرتا ہوں سینہ میں قلزم و جیحوں
"وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں"

تمام پردہ ہیں وہ ذوقِ روشنی دے کر
ازل سے تابہ ابد لطفِ تشنگی دے کر
جنوں کے ہاتھ میں قندیلِ آگہی دے کر
"عجب مزہ ہے مجھے لذتِ خودی دے کر
وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آپ میں نہ رہوں"

ہنر فریفتۂ قیمتِ ہنر دے گا
سکوتِ سنگ کہاں دادِ شیشہ گر دے گا
تہی پیالہ، تہی دست کیسے بھر دے گا
"ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیٔ افلاک میں ہے خوار و زبوں"

فرازِ طورِ جنوں و درازِ دستیٔ شوق
متاعِ درد و سرشتِ وفا و ہستیٔ شوق
گداز قلب و مئے ذات و خود پرستیٔ شوق
"ضمیرِ پاک و نگاہِ بلند و مستیٔ شوق
نہ مال و دولتِ قاروں نہ فکرِ افلاطوں"

نگاہ کیا ہے نظاروں کی جانِ محبوبی
جنوں کیا ہے شکیب و قرار بے ایوبی
وجود کیا ہے عناصر کی عرشِ منسوبی
"حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں"

ہے اپنے شوق کا احساس ابتداء سے مجھے
ملی ہے تابِ سخن بامِ کبریا سے مجھے
ہزار ناز سے کہنا ہے یہ خدا سے مجھے
"سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں"

طلوعِ جلوہ پسِ اوجِ بام ہے شاید
مئے کشیدۂ لمحاتِ خام ہے شاید
مسافتِ بشری چند گام ہے شاید
"یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں"

داؤد اشرف

اقبال ایک وطن پرست

اقبال ہندوستان کے اُن چند شعرا میں سے ایک ہیں جنہیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اقبال کا مقام محدود شاعروں کا ہی عظیم نہیں ہے بلکہ اپنے ہم عصر دنیا کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت ان کی شاعری کی عظیم خصوصیات کی وجہ سے ہے۔ ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کو ایک عظیم نصب العین فلسفۂ حیات اور پیام کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔ ان کا مقصد نوع انسان کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام تک پہنچانا تھا وہ چاہتے تھے کہ ان کی شاعری پڑھ کر نئی نسلیں اپنی اہمیت کو سمجھیں اور ان میں یہ خواہش پیدا ہو کہ وہ معمولی انسان بنے رہنے کی بجائے عظیم انسان بنیں پھر وہ یہ چاہتے تھے کہ ایسے عظیم انسان دنیا میں ایک ایسا انقلاب لائیں جس سے ہر شخص میں عظمت اور بلندی تک پہنچنے کا شوق پیدا ہو۔

حرکت و عمل اقبال کے فلسفہ اور پیام کی بنیاد ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں فرد، جماعت اور زندگی کے اہم اور بنیادی مسائل پر حکیمانہ اظہارِ خیال کیا ہے۔ اقبال اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے انسان کو بہت اونچا اور بلند مقام عطا کیا۔ وہ احترامِ آدمی کو انسانیت کا شیوہ سمجھتے ہیں اور مقامِ آدمی سے سب کو باخبر اور آگاہ کرتے ہیں۔

آدمیت احترامِ آدمی ... باخبر شو از مقامِ آدمی

اقبال نے مشرقی اور مغربی علوم کا وسیع اور گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کا فکر گہرا اور فلسفیانہ تھا۔ ان کا تخیل بلند اور جذبہ طاقت ور تھا۔ اقبال نے اپنے پیام کی اشاعت کے لئے تقریباً چالیس سال تک شاعری کی۔ اردو اور فارسی میں ان کی شاعری کے دس مجموعے شائع ہوئے۔ اپنی تمام شاعری میں اقبال کہیں بھی اپنے مقصد سے غافل نہیں تھے۔

اقبال نے جب شاعری کا آغاز کیا تھا اس وقت بھی اردو شاعری کا مقام میرؔ اور غالبؔ کی عظمت اور دوسرے اساتذہ کے شعری سرمایہ اور حالیؔ اور اکبرؔ کے نئے تجربوں کی بدولت کافی اونچا اور بلند تھا لیکن اقبال نے اپنی شاعری سے اردو شاعری کو ہمہ گیری، وسعت اور نئی بلندیاں عطا کیں۔

اقبال نے حب الوطنی کے ایسے ترانے گائے ہیں جو میٹھے، دلکش اور حسین ہونے کے ساتھ ہی ساتھ تاثیر میں آپ اپنی مثال ہیں۔ اقبال نے ان نغموں سے اپنے ہم وطنوں کے دلوں میں حب الوطنی کے جذبہ کو طاقتور بنانے کی کوشش کی ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ... ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا

اقبال کا یہ "ترانہ" ہندوستان کے قومی ترانوں میں منفرد مقام رکھتا ہے اور آج بھی ملک کی فضاؤں میں گونجتا رہتا ہے۔ اقبال کی نظمیں "ہمالہ" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" "نیا شوالہ" "تصویر درد" "رام" اور "نانک" جذبۂ حب الوطنی

سے لبریز ہیں اور درد مندی کی آواز ہیں۔ ان نظموں میں وطن سے سچی اور گہری محبت کے اظہار کے ساتھ ہی ساتھ وطن کی زبوں حالی پر نوحہ خوانی بھی ہے وہ اپنے اہلِ وطن کو ایک دوسرے سے محبت کرنے اور غلامی کا جوا اُتار پھینکنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ اقبال کی اردو شاعری کا پہلا مجموعہ " بانگِ درا " وطن سے محبت کی شاعری کا ایک خوب صورت مرقع ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اقبال نے ابتدائی چند سال تک ہی حب الوطنی کے نغمے گائے اور وطن سے محبت کا جذبہ صرف " بانگِ درا " کی شاعری ہی میں نظر آتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے ہاں یہ جذبہ آخر تک ملتا ہے۔ " ضربِ کلیم " اور " جاوید نامہ " کی شاعری اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہے۔

اقبال " ضربِ کلیم " کی ایک نظم " شعاعِ اُمید " میں ایک شعاع کرن کے ذریعہ نہ صرف مشرق بلکہ ارضِ ہند سے اپنی دلی وابستگی محبت اور درد مندی کا اظہار ان اشعار میں کرتے ہیں۔ شعاع کہتی ہے ؎

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو — جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز — اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اسی خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی — جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
بتخانے کے دروازے پہ سوتا ہے برہمن — تقدیر کو روتا ہے مسلمان تہِ محراب

مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

" جاوید نامہ " میں جو اقبال کی شاعری کے آخری دور کی نمائندگی کرتا ہے اقبال سیرِ افلاک کے دوران میں بھی اپنے وطن کو نہیں بھولتے۔ وطن کی محبت کے ساتھ ہی وطن کو آزاد دیکھنے کی تڑپ بھی ملتی ہے۔ وطن کی زبوں حالی پر ان کا قلم روتا ہے۔ یہ سیرِ اقبال، مولانا روم کے ہمراہی میں کرتے ہیں جہاں وہ ہندوستان کی عظیم شخصیتوں وشوامتر اور بھرتری ہری سے ملتے ہیں۔ ہندوستان کی یہ عظیم شخصیتیں دنیا اور زندگی کے بارے میں اہم نکتے اقبال کے گوش گزار کرتی ہیں اور جب اقبال بھرتری ہری سے اپنے ہم وطنوں کی حالت اور بے چینی کے بارے میں استفسار کرتے ہیں تو بھرتری ہری اس کے اسباب و علل پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اسی سیر کے دوران میں فلکِ زحل پر اقبال کا روحِ ہندوستانی سے سامنا ہوتا ہے۔ اس ملاقات کے پہلے منظر میں اقبال نے ہندوستان کی جو تصویر پیش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں اپنے وطن سے انھیں بھرپور محبت اور وابستگی ہے۔ وطن کی غلامی کے خیال سے یہ دُکھی اور رنجیدہ بھی ہیں۔ روحِ ہندوستان اقبال سے نالہ و فریاد کرتی ہے کہ وہ آزادی کی روشنی سے محروم ہے اور غلامی کی تاریکی اس کا مقدر رہی ہے۔ میر جعفر جیسے غدارانِ وطن ابھی ملک میں موجود ہیں۔ ایسی ملعون روحوں سے روحِ ہندوستانی پناہ مانگتی ہے۔

وطن سے غداری کرنے پر جو ذلت اور رسوائی ہوتی ہے اور غدار کا جو عبرت ناک اور شرم ناک انجام ہوتا ہے اس کا نقشہ اقبال بڑے موثر انداز میں کھینچتے ہیں۔ یہ غدارانِ وطن میر جعفر اور میر صادق کی روحیں کو کہیں ٹھکانہ نہیں ملتا انھیں کوئی قبول کرنے تیار نہیں حتیٰ کہ جہنم کی آگ نے بھی یہ کہہ کر ان روحوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اس

خس و خاشاک بہتر ہے اور جہنم کی آگ ان ملعون روحوں سے زیادہ پاک ہے۔" جاوید نامہ" میں بیان کی ہوئی یہ باتیں کیا یہ ثابت نہیں کرتیں کہ اقبال وطن پرست نہیں تھے۔ بلکہ وطن کے غداروں کو کبھی معاف نہیں کر سکتے تھے۔

اقبال کی شاعری میں آزادی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے لئے احساس اور جذبہ کی شدت، تڑپ اور بے قراری ان کے اشعار میں جگہ جگہ ملتی ہے وہ غلامی کی زندگی کو تیرہ بختوں کی جبر سمجھتے ہیں اور اسے ہر طرح سے ہدفِ ملامت بناتے ہیں۔ انھیں اپنے ہم وطنوں سے غلام بنے رہنے پر شکایت ہے۔ "ضربِ کلیم" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند — لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے — یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو

اس بحث کے بعد جو بات وضاحت طلب رہ جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وطن سے محبت اور آزادیٔ وطن کے لئے شدید خواہش، امنگ اور سچی تڑپ کے باوجود وطنیت اور قومیت کے جذبے میں ان کے تصورات میں جو تبدیلیاں آئیں وہ کیا تھیں، کس نوعیت کی تھیں، ان تبدیلیوں کو ذہنی ارتقاء کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ یہ تبدیلی جذبہ کی تبدیلی نہیں تھی بلکہ معنی و مفہوم کی وسعت تھی۔ انھوں نے وطن کی محبت کو ترک نہیں کیا۔ وطن پرستی سے ایک دنیا اور انسانیت کی طرف ان کی فکر نے جست لگائی۔ اس تبدیلی کو سمجھنے کے لئے ہمارے ذہن میں یہ بات رہنی چاہئے کہ اقبال کی معاصر دنیا میں قومیت اور وطنیت کے تصورات میں نہیں۔ معنی و مفہوم میں نئی وسعتیں ابھر رہی تھیں۔ وہ دن گزر چکے تھے۔ جب قومی وحدت اور انسانوں میں اتحاد کے لئے وطن کو ایک بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اقبال کے عہد میں اس تصور اور خیال میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ عالمگیر انسانیت کا تصور عام ہو رہا تھا۔ نئے مفکرین نے خیالات کی یکجہتی اور مخصوص نظامِ حیات پر ایقان کو سماجی اتحاد کی بنیاد بتایا۔ مارکس نے پرولتاری آمریت کے بعد غیر طبقاتی اور بغیر مملکت کے سماج کا تصور پیش کیا اور اسی تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے لینن نے بین الاقوامی اشتراکیت کا نظریہ پیش کیا۔ گاندھی جی بھی مملکت کو غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ٹیگور قومیت کے تنگ دائرہ کے خلاف تھے اور بین الاقوامی قومیت میں یقین رکھتے تھے ٹیگور نے ۱۹۲[illegible]ء میں جبکہ وہ امریکہ گئے ہوئے تھے اپنے ایک لیکچر میں کہا تھا۔ "مجھے ہندوستان سے محبت ہے۔ میری مراد ہندوستان سے اس کے در و دیوار نہیں بلکہ اس کا نصب العین ہے اس خیال کے تحت اگر لوگ مجھے محبِ وطن نہ گردانیں تو نہ سہی لیکن میں دنیا کے ہر گوشہ میں ایسے ہم وطنوں کی تلاش میں رہوں گا۔"

اقبال کے ہاں قومیت کا جو تصور ہے وہ ایک (Universal Integrity) ہے اپنے اس تصور میں اقبال قرآن سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور خدا، انسان اور حیات و کائنات کی وحدت کو اپنے تصورِ زمان و مکان کے آئینہ میں پیش کرتے ہیں تو اس عظیم تر تصور میں کسی قسم کی نسلی، جغرافیائی اور قومی تقسیم کا امکان باقی نہیں رہتا۔

ضیاءالدین نظامی

اقبال اور خواجہ حسن نظامی

حضرت خواجہ حسن نظامی اور علامہ اقبال میں نہایت خلوص و پیار تھا دونوں ایک دوسرے کے نام کی مالا جپتے تھے۔ خواجہ صاحب نے نثر میں کمال پیدا کیا۔ ان کے البیلے اسلوبِ نگارش نے اردو دنیا سے لوہا منوالیا۔ بقول اکبر الہ آبادی "اللہ میاں کی عربی اور حسن نظامی کی اردو کیا کہنا" ادھر علامہ اقبال نے نظم کے ذریعہ اپنے افکار اور دل کی تڑپ کو پیش کر کے عوام کی توجہ کے مرکز بن رہے تھے۔ شاعری سے علامہ اقبال کا مقصد صرف اتنا تھا کہ پڑھنے والوں میں وہی خیالات موجزن ہو جائیں جو ان کے قلب و روح میں طوفان برپا کر رہے تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے "اگر میں خواجہ صاحب جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہارِ خیال کا ذریعہ نہ بناتا"۔

اس کے برعکس خواجہ صاحب فرماتے ہیں "ڈاکٹر اقبال سلیس اردو پر قادر نہیں مگر جذبات کو متحرک کرنے میں ان کو بڑی قدرت حاصل ہے۔ حیاتِ انسانی کے مختلف شاخوں پر جس حسن و خوبی سے وہ لکھتے ہیں اور جس سوز کی تاثیر وہ پیدا کر سکتے ہیں اور کسی میں یہ بات کم پائی جاتی ہے"۔ اور ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "ڈاکٹر اقبال سے میرا ملنا جلنا ۱۹۰۳ء سے تھا۔ ایک دفعہ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور میں انہوں نے اپنی نظم خاص لحن سے پڑھی اور مجھ پہ ایسا اثر ہوا کہ میں نے اپنا عمامہ سر سے اتار کر ان کو دے دیا اور کہا "تمہارے جام مئے کی نذر میری پار سائی ہے"۔ اراکینِ انجمن نے عمامہ نیلام کیا اور حکیم محمد شریف صاحب (آنکھوں کے ڈاکٹر) نے اسے خرید لیا۔ اس جلسہ میں مولانا ابو الکلام آزاد بھی تھے۔ بہرحال دونوں میں ایک ایسی مستحکم اور پائیدار دوستی کی بنیاد قائم ہو گئی جسے زمانے کی کوئی گردش گزند نہ پہنچا سکی اور جس کی نسبت خواجہ صاحب کا خیال تھا کہ "ملنساری کا برتاؤ اور چیز ہے اور دوستی کسی اور شئے کو کہتے ہیں۔ دوستی ایک ناقابلِ ختم ملنساری ہے۔ اور جیسی زندگی کی اس کو ضرورت ہے ویسی ہی مشکل سے وہ میسر آتی ہے"۔ علامہ اقبال کو انگلستان اور جرمنی میں جو عالمی فتوحات حاصل ہو رہی تھیں خواجہ صاحب انھیں خوب سراہتے تھے اور بعض دوست احباب کو خواجہ صاحب کو قابلِ مبارکباد سمجھتے تھے۔ علامہ اقبال نے ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء کو لندن سے خواجہ صاحب کو لکھا "میری کامیابیوں پر جو لوگ آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔ راستی پر ہیں۔ مجھ میں اور آپ میں فرق ہی کیا ہے۔ دیکھنے کو دو حقیقت میں ایک"۔ ولایت سے پی۔ ایچ۔ ڈی اور بیرسٹری کی ڈگریاں لے کر واپس آنے کے بعد خواجہ صاحب نے اقبال کی شان میں بہت کچھ لکھا۔ فرماتے ہیں۔ "حضرت اقبال کے کمالِ شاعری، سوز و گداز اور اس کے اثر سے انکار کرنا جس نے مسلمانوں کی موجودہ نسل کو بیدار کیا۔ آفتاب کے وجود سے انکار کرنا ہے وہ میرے اس زمانے سے دوست ہیں۔ جب ان کی کارگزاری نے نیا نیا نشان بلند کیا۔ اور ہم ہمیشہ ان کے قلم کے پیچھے رہے۔ میں نے زبان سے، قلم سے، اور ہر اس طریقہ سے جس پر مجھے قابو تھا اقبال کے خیالات کی تبلیغ کی [illegible]

علامہ اقبال کا پایہ اس توصیف سے بھی کہیں بلند ہے۔" اس احسان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو سیالکوٹ سے اقبال نے نہایت انکساری سے تحریر فرمایا۔

"آپ لوگوں کو میرا مشتاق بناتے ہیں مجھے کچھ اعتراض نہیں مگر اندیشہ ہے کہ وہ مجھ سے مل کر مایوس نہ ہوں۔ آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پوچھے مجھے شریک تصور کیجئے۔ مگر جس درد نے بعد کا جنون سے مجھ بیتاب کر رکھا ہے جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا اور مجھے تنہائی میں رُلاتا ہے اس کی وجہ پہلے مجھ سے سن لیجئے۔ پھر جو چاہے کیجئے میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور آپ میرے ساتھ۔" ۱۹۱۵ء کے آغاز میں خواجہ صاحب نے اقبال کی اسلامی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں "سرّ الوصال" کا خطاب عطا فرمایا۔ اقبال نے ۱۸ر فروری ۱۹۱۵ء کے خط میں جواباً لکھا۔ "آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت اور استحکام پر بحث کی ہے اب قریباً تیار ہے۔ اور پریس میں جانے کو ہے اس کے لئے کوئی عمدہ نام تجویز فرمائیے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اس کا نام "اسرار حیات" "پیام سروش" اور "پیام نو" تجویز فرمایا ہے۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمائیے کہ میں انتخاب کرسکوں یہ تو معلوم نہیں ہوسکا کہ خواجہ صاحب نے کون کون سے نام تجویز کئے۔ لیکن "اسرارِ خودی" کا نام جو خواجہ صاحب نے تجویز کیا۔ ڈاکٹر اقبال نے پسند فرمایا۔ لیکن اسرارِ خودی کی اشاعت کے بعد خواجہ صاحب اور علامہ اقبال میں کچھ اختلاف ہوگیا۔ اس کی نسبت خواجہ صاحب نے یہ وضاحت کردی کہ "مثنوی اسرارِ خودی" کے بنیادی اصول میں مجھے ان سے اختلاف نہ تھا۔ بلکہ حضرت حافظ وغیرہ شعرا اور مشائخ صوفیہ کے بعض خیالات کی نسبت جو کچھ انھوں نے لکھا میں نے اور حضرت اکبر الہ آبادی نے ان سے اختلاف کیا تھا جس کو مخالفین نے بڑھا چڑھا کر مشہور کیا تھا۔ اس سلسلے میں خواجہ صاحب فرماتے ہیں۔" میں اقبال کی نیت پر حملہ نہیں کروں گا اس لئے نہیں کہ وہ میرے دوست ہیں ؟ اس لئے نہیں کہ وہ بڑے آدمی ہیں بلکہ اس لئے کہ میں سالہا سال سے ان کے خیال اور ارادے کو جانتا ہوں۔ انھوں نے تو مثنوی اپنی دانست میں مسلمانوں کے فائدے کے لئے لکھی ہوگی مگر اس سے سخت خطرے پیدا ہوں گے اور مسلمانوں کے اصول و عقائد میں تزلزل پڑ جائے گا۔ درحقیقت یہ مثنوی اقبال کی نہیں بلکہ اقتضائے وقت کی لسانِ حال ہے۔ وقت کی خواہش ہے کہ مشرق، مغربی بن جائیں۔ مگر کیا وہ ایسا کر سکے گا ؟

"اسرارِ خودی میں کن کن یورپین فلاسفروں کی روح ہے۔ اس کو ذرا سمجھ لینے دو۔ کون بے علم ہیں، بے سہارا ہیں۔ مگر دین کی حمایت میں ہم سے جو کچھ بن پڑے گا کریں گے۔ اقبال سے خدانخواستہ دشمنی نہیں۔ لیکن دوستی کو عقائد میں حائل ہونے کا کوئی حق نہیں۔ مسلمان اپنی مذہبی رائے میں کسی دنیاوی تعلق کا پابند نہیں ہو سکتا۔ لہذا میں بھی نہیں ہوں۔"

جب علامہ اقبال کے عقائد کی نسبت لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلنی شروع ہوئیں اور مسائل کو غلط رنگ میں پیش کیا گیا تو انھوں نے اس وقت کے اخباروں میں بالخصوص "وکیل" امرتسر۔ اور "نیو ایرا" لکھنؤ میں اعتراضات کے جوابات دیئے اور خواجہ حسن نظامی کو خاص کو مخاطب کرکے فرمایا۔ "مجھے خوب معلوم ہے کہ آپ کو اسلام اور [illegible] [illegible] ہے مجھ کو ممکن ہے کہ آپ کو ایک حقیقت اسلامی معلوم ہو جائے اور آپ اس کا انکار کریں [illegible]

ابھی سے یقین ہے کہ آپ بالآخر میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔ میری نسبت بھی آپ کو معلوم ہے کہ میرا فطری اور آبائی میلان تصوف کی طرف ہے اور یورپ کا فلسفہ پڑھنے سے یہ میلان اور بھی قوی ہو گیا۔ کیونکہ فلسفۂ یورپ بحیثیت مجموعی وحدت الوجود کی طرف رخ کرتا ہے۔ مگر قرآن پر تدبر کرنے اور تاریخ اسلام کا بغور مطالعہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اپنی غلطی معلوم ہوئی اور میں نے محض قرآن کی خاطر اپنے قدیم خیال کو ترک کر دیا اور اس مقصد کے لئے مجھے اپنے فطری اور آبائی رجحانات کے ساتھ ایک خوفناک دماغی اور قلبی جہاد کرنا پڑا۔

اس کے بعد علامہ اقبال نے ایک ایک کر کے ہر اعتراض کا جواب نہایت وضاحت اور جامعیت سے دیا ان کو اپنے آپ پر پورا اعتماد تھا وہ فلسفی اور مفکر ہونے کے علاوہ بہت اچھے قانون دان بھی تھے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا اس میں ایک اچھے، قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط بھی تھا۔ چنانچہ اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے حضرت علامہ نے فرمایا۔

"مندرجہ بالا سطور سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ فلسفیانہ اور مورخانہ اعتبار سے مجھے ایسے مسائل سے اختلاف ہے جو حقیقت میں فلسفے کے مسائل ہیں جن کو عام طور پر تصوف کے مسائل سمجھا جاتا ہے۔ تصوف کے مقاصد سے مجھے کیونکر اختلاف ہو سکتا ہے۔ کون مسلمان ہے جو ان لوگوں کو برا سمجھے جن کا نصب العین حضرت رسول اللہ صلعم ہے اور جو اس ذریعہ سے ذاتِ باری سے تعلق پیدا کر کے اپنے اور دوسروں کے ایمان کی پختگی کا باعث ہوتے ہیں۔ اگر میں تمام صوفیا کا مخالف ہوتا تو مثنوی میں اُن کی حکایات و مقولات سے استدلال نہ کرتا۔"

اس موقع پر حضرت اکبر الہ آبادی نے ثالث بالخیر کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے پہلے تو اس مخالفت کو کوئی اہمیت ہی نہ دی بلکہ سرسری طور پر اپنے مخصوص رنگ میں کہدیا ؎

حضرتِ اقبال اور خواجہ حسن
پہلوانی ان میں، اُن میں بانکپن

جب نہیں ہے زورِ شاہی کے لئے
اور کُشتہ جائیں خدا ہی کے لئے

ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی
ہاتھا پائی کو تصوّف ہی سہی

ہست اندر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

لیکن جب معاملہ حد سے تجاوز کرنے لگا اور بحث میں اُلجھنیں پیدا ہو گئیں تو ایک طرف علامہ اقبال کو روکا اور دوسری طرف خواجہ صاحب کو پُر خلوص مشورہ دیا۔ فرماتے ہیں ؎

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رَد
قومی رگنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی

تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر
ہیں دشمنِ فتنۂ رقیبان وہ بھی

پریوں کیلئے جنون ہے تم کو اگر
دیوؤں کے لئے بنے سلیمان وہ بھی

بہرحال دونوں بزرگ و رہنمائے قوم حضرت اکبر کو اپنا مرشد اور استاد مانتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں کو ان کے مشورے نے دوبارہ قریب تر کر دیا۔ اقبال نے مثنوی کے دوسرے ایڈیشن میں بعض جگہ لفظی ترمیمیں کر کے میدان مار لیا۔ ان کا فلسفۂ خودی مقبولِ خاص و عام ہوا۔ اور خواجہ صاحب بھی پہلے کی طرح ہمنوا و شکر گزار ہو کر

اقبال کی دوستی کو ہمیشہ قائم رکھا۔

۱۹۳۶ء میں خواجہ صاحب نے بہت سے مشاہیر کے قلمی چہرے اپنے مخصوص انداز میں لکھے اور اپنے دوست اقبال کے قلمی چہرے میں نہایت پیار سے یوں رنگ بھرا۔ "سر مقصد، گندمی رنگ، پُر تمکنت چہرہ، داڑھی صاف، شاعر بھی ہیں، نثر نویس بھی ہیں، بیرسٹر بھی ہیں۔ سر بھی ہیں، لیڈر بھی ہیں اور صاحبِ اقبال بھی ہیں۔ آنکھیں ایسی نشیلی کہ ایک آنکھ میں حافظ کا میکدہ اور دوسری میں عمر خیام کا خم خانہ، جسم پنجابی، خیال صوفی، لیکن دل مسلمان۔ پہلے شاعر تھے پھر بیرسٹر ہوئے اور اب لیڈر ہیں۔ انگریزی زبان پر پورا قابو رکھتے ہیں۔ لیکن انگریزیت کے قابو میں نہیں آئے۔ انگریز ان کو سمجھتا ہے اور انگریز کو یہ سمجھتے ہیں۔ اگر انگریز کو سمجھنا نہ جانتے تو نہ سر بنتے اور نہ گول میز کانفرنس میں نظر آتے۔ عربی بھی جانتے ہیں اور فارسی بھی جانتے ہیں۔ فارسی اتنی اچھی جانتے ہیں کہ اگر خاقانی اور انوری کے زمانے میں ہوتے تو دوسرے خاقانی اور انوری مانے جاتے۔ مسلک حق پسندی، ہمیشہ علمی خدمت، مذہب مسلمانوں کی بہبودی، مزاج میں سنجیدگی، متانت اور استقلال۔ یعنی شاعر ہونے کے باوجود شاعرانہ تلوّن مزاجی نہیں ہے۔ دوسرے شاعروں کی طرح ان کی شاعری بھی عشق باز ہے۔ لیکن ان کی شاعری کو گل و بلبل سے عشق نہیں ہے ان کی شاعری کو قوم اور وطن سے عشق کرنے میں لطف آتا ہے۔ انگریز کی نظر میں پسندیدہ ہیں۔ مسلمان کی نظر میں محبوب ہیں۔ ہندو کی نظر میں اپنی صاف گوئی کی وجہ مرغوب ہیں۔ ان کی شاعرانہ قابلیت، سوئی ہوئی قوم کو جگانا خوب آتا ہے اگر یہ پیدا نہ ہوتے تو حالی کی شاعری کے گلشن میں بہار نہ آتی۔"

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرت اقبال اپنے رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔ چنانچہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۸ء کے منادی میں انتقال کی خبر دیتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے جو کچھ لکھا اس کے حرف حرف سے رنج و غم کا اظہار ہوتا ہے۔ "آج اپریل کی ۲۱ تاریخ صبح کو دلی ریڈیو نے یہ الم ناک خبر سنائی کہ تمام اسلامی دنیا کے مسلّم قومی شاعر نے جنھوں نے سارے دنیا میں ترقی و زندگی کی لہر پیدا کر دی اس دنیا سے انتقال فرمایا۔ یہ خبر نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کو غمگین کرنے والی ہے بلکہ تمام ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہوگا کیونکہ مرحوم اقبال ایشیا کی پرانی تہذیب کے عاشق اور مددگار تھے۔ اس لئے ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔"

مرحوم کا دلدادہ حسن نظامی

خواجہ صاحب نے علامہ اقبال کے قلمی چہرے میں لندن کی گول میز کانفرنس کا ذکر فرمایا ہے۔ اتفاقاً میں اپنی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں لندن گیا ہوا تھا۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے حیدرآباد سے سر اکبر حیدری [illegible] اور تمام دوسری ریاستوں کے نمائندے اور ہندوستان کے مختلف لیڈر آئے ہوئے تھے جن کو سر اکبر نے ایک دن عشائیہ پر مدعو کیا تھا۔ اور مجھ سے فرمایا کہ [illegible] سے خارج ہونے تک اگر کوئی صاحب آئیں تو استقبال کرنا۔ میری خوش قسمتی کہ سب سے پہلے جو صاحب تشریف لائے وہ ڈاکٹر اقبال تھے [illegible] سے فارغ ہو کر ابھی تشریف لائیں گے۔ جس پر ڈاکٹر اقبال نے شکریہ ادا کیا۔ [illegible] ڈاکٹر اقبال کے اس فقرہ کو نہیں سمجھ سکا۔ جو بعد میں ظاہر ہوا۔ [illegible] آنے لگے۔ جن کا استقبال خود سر اکبر نے کیا اور اس وقت [illegible] حیدری نے ڈاکٹر اقبال سے خواہش کی کہ وہ آج [illegible]

سب رنگ — اس عنوان کے تحت ہند و پاکستان کے معیاری ادبی کتب و رسائل سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوتا ہے

احمد ندیم قاسمی

اقبال کا نظریۂ شعر

صرف "بانگِ درا" میں اردو فارسی اور انگریزی کے چھ شعرا پر علامہ اقبال کی پانچ نظمیں شامل ہیں۔ (ایک نظم "شبلی و حالی" میں دونوں پر بیک وقت اظہارِ خیال کیا ہے)۔ ان نظموں کی مدد سے اقبال کا نظریۂ شعر بڑی آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے۔ اور اگرچہ یہ سب ان کے ابتدائی دورِ شاعری کی تخلیقات ہیں، مگر جو نظریہ ان سے مرتب ہوتا ہے، اس کا اطلاق، بعض معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ان کے آخری دورِ شاعری پر بھی ہو سکتا ہے۔ "بانگِ درا" میں دو نظمیں ایسی بھی شامل ہیں جن میں شاعر کے منصب کی وضاحت کی گئی ہے۔ ان دونوں کا عنوان "شاعر" ہے۔ پھر "سید کی لوحِ تربت" اور "عبدالقادر کے نام" میں بھی ان کے نظریۂ شعر کی چند جھلکیاں موجود ہیں۔ اس نظم میں، جس کا عنوان "عبدالقادر کے نام" ہے اقبال نے جیسے اپنی شاعری کا منشور مرتب کر دیا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے "بالِ جبریل" "ضربِ کلیم" "ارمغانِ حجاز" اور اپنی فارسی تصانیف میں اس منشور کے مطابق شاعری کی ہے۔

عبدالقادر کے نام

جس طرح غالب نے کہا تھا کہ:

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگرد انیم

اسی طرح اقبال نے شیخ عبدالقادر سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

اور

شمع کی طرح جئیں بزمِ گہِ عالم میں   خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اقبال اس نظم میں کہتے ہیں کہ اپنی بساط فریاد ہی تو ہے مگر یہ ایسی فریاد ہے جو محفل کو تہ و بالا کر سکتی ہے۔ آؤ کہ ہم عشق کی قوت ـــــ لگن کی قوت سے سنگِ امروز کو اتنا صیقل کریں کہ وہ آئینۂ فردا بن جائے۔ قوم کو اس کی گمراہی چھوڑی [illegible] قوت و حشمت کا احساس دلائیں۔ چمن کو آئینہ نمو سکھائیں تاکہ شبنم کا ایک ایک قطرہ ایک ایک دریا کی روانی اور بیکرانی اختیار کرے۔ اقدار بدل رہی ہیں۔ دو عظیم جنگ میں ہوا تا [illegible] ، اس لیے اپنے ہم عصروں کو نئی اقدار سے متعارف کرانے [illegible] کو آرزوئے [illegible] سے آشنا کر دیں۔ ہم نے بچپن کے تنگ ماحول میں بیٹھ کر جو کچھ سوچا تھا۔ اور اپنے ذہنوں کو ان سوچوں سے گرمایا تھا، انھیں یہاں مشرق میں عام کریں اور اس اعتماد کے ساتھ [illegible] ہمارے جلنے سے روشنی عام ہوگی اور [illegible]

آنکھوں میں بینائی لوٹ آئے گی۔ اقبال کا کلام گواہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ اپنے انتقال سے تیس پینتیس برس پہلے کہا تھا وہ محض جوانی کے جوش میں یا جذباتیت کی رو میں آکر نہیں کہا تھا۔ بلکہ پورے غور و فکر کے بعد انھوں نے شاعر کا منصب متعین کیا تھا۔ پھر انھوں نے اس منصب کو اپنے دور کے سیاسی حالات اور تاریخ کے حوالے سے پرکھا تھا۔ اور اندھیرے میں تیر نہیں چلایا تھا۔ بلکہ انھیں اپنے ہدف کا شعور کامل حاصل تھا۔ اور وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ایک ایسے راستے پر گامزن ہوئے تھے جس پر بعد میں پوری قوم چلی۔ "عبدالقادر کے نام" میں تو اقبال نے بہت کھل کر اپنے فن کارانہ عزائم کا اظہار کیا ہے مگر دیگر (متذکرہ) نظموں میں بھی (بالواسطہ طور پر ہی سہی) وہ اپنے نظریۂ شعر کو غیر مبہم انداز میں بیان کرتے چلے گئے ہیں اور کسی ایک مقام پر بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ انھوں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جس پر بعد میں وہ عمل نہ کر سکے ہوں۔ ممکن ہے اس وضاحت سے بعض لوگوں کو یہ گمان گزرے کہ اقبال نے اپنی بے ساختگی پر پہرے بٹھا لیے تھے اور اپنے آپ کو پابند کر لیا تھا ——— مگر گزارش یہ ہے کہ بڑے شاعر خود کو بعض نظریات کا پابند کر لینے کے باوجود اپنی ساختگی کو مجروح نہیں کرتے اور جو شاعر کسی فنی یا تہذیبی نقطۂ نظر کا پابند نہیں ہوتا وہ اپنی بے ساختگی کو صرف اس حد تک کام میں لاتا ہے کہ آخری دم تک خود اسے پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا کہتا رہا ہے

"شاعر" کے عنوان سے دو نظمیں "بانگِ درا" میں شامل ہیں۔ پہلی نظم حصہ اول میں ہے اور ۱۹۰۵ء سے قبل کی تخلیق ہے۔ دوسری حصہ سوم میں ہے اور ۱۹۰۸ء کے بعد کی تخلیق ہے مگر خوشگوار حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں جگہ شاعر کے مناصب موجود ہیں۔ پہلی نظم میں اقبال نے قوم کو جسم قرار دیا ہے۔ افراد کو اس جسم کے اعضا کہا ہے۔ (یہ اعضا "منزلِ صنعت" کے رہ پیما ہیں) "محفلِ نظمِ حکومت" قوم کا "چہرۂ زیبا" ہے اور شاعر قوم کا "دیدۂ بینا" ہے شاعر کو پیکرِ قوم کی آنکھ قرار دینے کے بعد اقبال نے بڑے فن کارانہ حسن کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ شاعر قوم کے کسی دکھ، کسی مصیبت، کسی آزمائش سے بے توجہ نہیں رہ سکتا۔ وہ ایسا کرے گا تو اپنے پاکیزہ منصب کی نفی کا مرتکب ہوگا، کیونکہ:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

"شاعر" کے عنوان کی دوسری نظم میں اس نقطۂ نظر کو مزید وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور قوم سے ہمدردی اور اس کے مصائب میں شرکت کے علاوہ شاعر پر فرض کر دیا ہے کہ وہ (ان مصائب کے خاتمے کے لیے) فکر کی بات کہے۔ وہ فکر کی بات کہے گا تو حیمنِ ویرانۂ حیات میں بہار آئے گی۔ جب قوم بت سازی اور بت گری پر اتر آئے تو شاعر کے کلام کو شانِ خلیل دکھانی چاہیے اور کارِ خلیل کرنا چاہیے۔ اقبال نے اس نظم میں یہ بھی کہا ہے کہ جو شاعری خونِ جگر سے پرورش پاتی ہے، وہ عام انسانیت کے لیے زندگیٔ دوام کا نسخہ ثابت ہوتی ہے۔ الغرض اگر پہلی نظم میں شاعر کا منصب متعین کیا گیا ہے تو دوسری نظم میں اس منصب کا حق ادا کرنے کے لیے شاعر کے لیے لائحۂ عمل مقرر کی ہے۔ اور ایسی شاعری کو (جس میں شاعر اپنی نوع اور اپنی قوم اور اپنے معاشرے کی بعض ذمہ داریاں قبول کرتا ہے) زندگی کی نجیل پہلی، اس کی شادابی اور بالیدگی کی بنیاد قرار دیا ہے

گلشنِ دہر میں اگر جوئے مے سخن نہ ہو پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

"سید کی لوحِ تربت" میں اقبال شاعر کو اپنے وقار اور "آبرو" کا تحفظ کرنے کی تلقین کرتا ہے:

ہو نہ جائے، دیکھنا، تیری صدا بے آبرو

یہ صدا کی بے آبروئی بہت ہی بڑا سانحہ ہے جو کسی شاعر پر گزر سکتا ہے۔ شاعر کی صدا کی آبرو صرف اس طرح محفوظ رہ سکتی ہے کہ بقول شاعر:

جو کچھ کہوں، یقین سے کہوں، برملا کہوں

وہ جو کچھ کہے، اپنے اعلیٰ منصب کو پیش نظر رکھ کر کہے۔ پھر وہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اسے علم ہو کہ اس کی صدا صرف اس تک محدود نہیں ہے بلکہ اُسے دنیا میں پھیلنا ہے اور دنیا کو رنگ و بو کی، فراوانی و نمو کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اس نظم میں شعرا کو یہ احساس بھی دلایا ہے کہ جو اقدار مر گئیں وہ مر چکیں اور نئی قدروں، نئے معیاروں سے بدکنا بیکار ہے۔ اس خیال کو اقبال نے ایک اور جگہ بھی بڑی خوبصورتی کے ساتھ نظم کیا ہے:

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا　　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

"سید کی لوحِ تربت" میں انھوں نے واشگاف اور بلاواسطہ انداز میں کہہ دیا ہے کہ:

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ　　　رنگ پر جو اب نہ آئیں، ان فسانوں کو نہ چھیڑ

انھوں نے شاعر سے کہا ہے کہ پرانی لکیروں کو پیٹنے کی بجائے:

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے　　　خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

یہ شعر و شاعری کی باتیں تھیں مگر جب اقبال شاعروں کا ذکر کرتے ہیں تو جب بھی اپنے نقطۂ نظر پر قائم رہتے ہیں۔ ساتھ ہی ان نظموں میں ان کا نظریۂ فنِ شاعری بھی پوری جزئیات کے ساتھ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہ نظمیں داغ، شبلی و حالی، غالب، عرفی اور شیکسپیئر کے متعلق ہیں۔ داغ کے مرثیے میں انھوں نے داغ کے بانکپن اور شوخیٔ بیان کا ذکر کیا ہے یہ بتایا ہے کہ پیری میں بھی ان کے رنگ ڈھنگ جوانوں کے سے تھے۔ عشق کی ہو بہو تصویر کھینچتے تھے۔ ہر شخص کے دل کی بات کہتے تھے۔ اور تخیل کی پرواز کے دوران سے اپنا رشتہ ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔ اس سے زیادہ اقبال نے داغ کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ اور انھیں کہنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ کیونکہ ان کا نظریۂ فن، داغ کے نظریۂ فن سے یکسر مختلف تھا۔ بہر صورت داغ کے اس مرثیے سے یہ مزید ثابت ہوتا ہے کہ بیان کی شوخی، اظہار کا بانکپن اور معاملاتِ عشق کی شاعری اقبال کے نزدیک کوئی گناہ نہیں تھی۔ بصورت دیگر ہم اقبال کے بعد کے کلام میں اس قسم کے سراپا جمال اشعار کہاں پاتے کہ:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال　　　اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

شبلی و حالی کا مرثیہ دراصل اس شعر کی تضمین ہے:

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں　　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اس مرثیے میں اقبال ایک مسلمان سے کہتے ہیں کہ تو منزوی ہے۔ نئے نئے علوم دراصل تیرا سرمایۂ رفتہ ہیں۔ تیرے پرانے قافلوں کی گرد کا نام تہذیب قرار پایا ہے۔ تو نے ہر دانش و قار و آبرو کے معیار قائم کیے ہیں۔ پھر آج گلچیں گلشن پر خزاں کی یلغار ہے تو اس کا راز گلشن کے پرانے رازداروں سے پوچھ کہ مردانِ کار مصائب پر محض روتے نہیں ہیں

بلکہ حادثات کے اسباب ڈھونڈ کر مصائب کا علاج کرسکتے ہیں۔ علامہ پر مسلم جواب دیتا ہے کہ کس سے پوچھوں جب کہ گلشن کے وہ گل پرانے رازدار خاموش ہوگئے ہیں۔ جن کی قرأت وہ ملتِ اسلامیہ کے لیے سرمایۂ گداز تھی۔

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستاں　　حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

یہ مرثیہ اقبال کے اس مشہور شاعری (عبدالقادر کے نام) کے عین مطابق ہے جس میں وہ کہتے ہیں۔

جلوۂ یوسفِ گم گشتہ دکھا کر ان کو　　تپش آمادہ تر از خونِ زلیخا کر دیں

اقبال کا نظریۂ شعر ان نظموں میں بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے جن کے عنوان عرفی، شیکسپیر اور مرزا غالب ہیں۔ عرفی کے بیان میں وہ کہتے ہیں۔ کہ اس نے تخیل کا ایک ایسا ایوان تعمیر کیا جس کی عظمت و حشمت پر سینا و فارابی کے "حیرت خانے" قربان کیے جا سکتے ہیں، پھر

فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی

کہ جس سے آج بھی درد کے سوتے اُبل رہے ہیں۔ اس کے بعد وہ روحِ عرفی سے پوچھتے ہیں کہ اب لوگوں میں وہ اضطراب، وہ بے تابی، وہ بے قراری ڈھونڈے سے نہیں ملتی، اس سیمابی کیفیت کا کہیں نام نہیں ہے جو ارتقائے حیات کے لیے ضروری ہے اور تو جس کا ایک بلیغ نمائندہ تھا۔

کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر　　گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

اس پر روحِ عرفی، شاعر سے کہتی ہے کہ گلے شکوے نہ کر بلکہ :

نوا را تلخ تر می زن، چو ذوقِ نغمہ کم یابی　　حدی را تیز تر می خواں، چو محمل را گراں بینی

اور کون انکار کر سکتا ہے کہ روحِ عرفی کا یہ مشورہ اقبال کے نظریۂ فن کا عنوان ہے۔

شیکسپیر کو مخاطب کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ جس طرح دریا، شفقِ صبح کا آئینہ ہے۔ اور حسن حق کا آئینہ ہے اور دل، حسن کا آئینہ ہے۔ اسی طرح تیرا حسنِ کلام دلِ انسان کا آئینہ ہے تیری فکر فلک رس تھی۔ تیری آنکھ نے عالم کو عریاں دیکھا (حالانکہ چشمِ عالم تجھے نہ دیکھ سکی کیونکہ تو تو خود شید میں تابِ خورشید کی طرح پوشیدہ تھا) اور :

حفظِ اسرار کا فطرت کو ہے سودا ایسا　　راز داں پھر نہ کرے گی کوئی پیدا ایسا

یوں اقبال نے اس نظم میں اعلیٰ شاعری کو محسوسات و تصوراتِ انسانی کا آئینہ، فکر کی بلندی کو اعلیٰ شاعری کا لازمہ اور اسرارِ فطرت کی راز دانی کو اعلیٰ شاعری کی پہچان قرار دیا ہے اور یہی عناصر اقبال کے نظریۂ شعر کے لازمی جز ہیں

مرزا غالب کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے اقبال نے تخیل کی بلند پروازی، روح بدن کے رشتوں کے ادراک، اور حسن کی اس جستجو کی اہمیت واضح کی ہے جو زندگی کو جامد نہیں رہنے دیتی۔ بلکہ اسے ہمہ وقت بیدار و بے قرار رکھتی ہے اور انسان کو نئی دنیاؤں سے متعارف کراتی ہے :

تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار

پھر اس نظم میں اقبال نے اس نکتے (اپنے منشورِ شاعری کی اس شق) پر بھی زور دیا ہے کہ غالب کی

طرح سچا شاعر وہ ہے جس کی نوا زندگی سے کچھ چھینتی نہیں بلکہ اس کے سرمائے میں اضافہ کرے۔ اس کا شعر زندگی کا عکس ہو۔ شاعر کا حسن گویائی ایسا سحر کن ہو کہ تصویریں بول اٹھیں اور بُت چیخ کر اُبلنے لگے۔ پھر اقبال نے متذکرہ نظم میں یہ نازک نکتہ بھی بیان کیا ہے کہ محض تخیل کی بلند پروازی عظیم شاعری کی تخلیق پر قادر نہیں ہو سکتی۔ غالب کی سی عظیم شاعری تخلیق کرنے یا غالب کی پیروی کرنے کے لیے تخیل کی بلندی میں فکر کی بلندی کو بھی شامل کرنا ہو گا۔

اور کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اقبال نے ان نظموں میں شعر و شاعری کے بارے میں جو بھی نظریات پیش کیے ان پر عمر بھر عمل کیا۔ اور یوں وہ دنیا کی عظیم شاعری کے علاوہ زندگی کے سرمائے میں بھی بے پناہ اضافہ کر گئے۔

(المعارف لاہور، ستمبر اکتوبر [illegible])

اوما شنکر جوشی

اقبال ہندوستان کے نشاۃ الثانیہ کی آواز

عظیم شاعری وقت اور زمانہ کے امتداد کے ساتھ ساتھ نکھرتی جاتی ہے۔ چنانچہ شاعر اقبال جن کی صدی منائی جا رہی ہے۔ ہمارے لئے شاعرانہ کمال کی ایک علامت بن گئے ہیں اور آج ہم اس بات میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ کہ ان محرکات کو بڑی حد تک سمجھ سکیں جو ان کے نوائے شاعرانہ میں اس درجہ کشش اور اتنا سوز پیدا کر سکے۔

میری نسل کے ایسے لوگوں کے لیے جنہوں نے ۱۹۳۰ء سے لکھنا شروع کیا برصغیر ہند کے گلستان ادب کی دو بلند قامت شخصیتوں ٹیگور اور اقبال نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ تحریک عدم تعاون کے ہنگامہ خیز دور میں جب کہ جیل میں تھا مجھے بنگالی اور اردو سیکھنے کا موقع ملا۔ یہ درست ہے کہ میں اردو میں کچھ زیادہ مہارت حاصل نہ کر سکا۔ لیکن ایک ایسے شہر (احمد آباد) کے ناگرک کی حیثیت سے جس کی فضاؤں میں اردو کے پہلے شاعر ولی کے نغمے گونجتے رہے ہیں۔ اردو زبان اور اس کی قواعد سے واقف ہونے میں مجھے کوئی خاص دشواری پیش نہ آئی۔ اس اعتبار سے بھی میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ مسلمان علماء اور شاعروں سے میرا گہرا ربط رہا ہے۔ جنہوں نے مجھے اردو شاعروں کے جواہر پاروں سے روشناس کرایا۔ میں نے پارلیمنٹ میں کی جانے والی تقاریر اور سنٹرل ہال میں گپ شپ کے دوران بھی اردو کے کتنے ہی اشعار سنے اور ان سے لطف اٹھایا ہے۔ ہندی کے کٹر حامیوں کو بھی میں اس وقت تک میری نشست پار کر کے اپنی سیٹ تک پہونچنے نہیں دیا کرتا تھا جب تک کہ وہ مجھے ایک آدھ شعر سنا نہ دیتے۔ میں یہ جان کر دنگ رہ جاتا تھا کہ ہندی کے ان پرچارکوں کو بھی اردو کے بے شمار اشعار ازبر ہیں۔ ہندوستان کے چند ادیبوں اور مصنفوں کو جن میں خود میں بھی شامل تھا کچھ عرصہ پہلے سوویت یونین کے دورہ اور سیاحت کا موقع ملا۔ اس سفر میں ہندی کے مشہور شاعر ڈاکٹر [illegible] ازبکستان میں ہمارے مختصر سے قیام کے دوران اردو کے اتنے اشعار اور اتنے قطعات سنایا کرتے تھے کہ ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ ہندی کے نہیں اردو کے شاعر ہیں۔ یہ ان واقعات کا [illegible] تفصیل سے اس لیے ذکر کر رہا ہوں کہ آپ کو بھی اندازہ ہو سکے کہ اردو کی شاعری میں کتنی جان اور کتنی کشش

ہے ۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو زبان ہی شاعری کے لیے بنی ہے۔

داغ نے بالکل صحیح کہا تھا "آتی ہے اردو زبان آتے آتے"، بلاشبہ اردو پر عبور حاصل کرنا آسان نہیں لیکن جب کوئی اردو کو سمجھنے لگتا ہے تو سب سے پہلے اردو شاعری ہی اس کا دامنِ دل پکڑ لیتی ہے اور ہر بڑے شاعر کا کلام پڑھنے والے کی فہم و فراست کی سطح کے مطابق لطف و انبساط کی ایک نئی کیفیت پیدا کرتا ہے اور میر کے ۷۲ نشتر جو ان کے ہم عصروں نے منتخب کئے تھے میرے دل میں پیوست ہو جاتے ہیں۔

میرے علم کی حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اردو کے سوا شاید ہی کوئی ایسی زبان ہوگی جس نے غالب جیسے شاعر کو جنم دیا جسے کسی بھی بین الاقوامی معیار پر جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے اور بقول کسی کے تیر بھی کچھ کم نہیں تھے۔ غالب کی شاعری کو عزن کے اعجاز نے جادو داں بنا دیا۔ اور ایک ایسے دور میں جب کہ مغربی ادب کے زیر اثر متعدد ہندستانی زبانیں اپنے آپ کو کمتر محسوس کرنے لگی تھیں۔ اردو نے شاعرانہ اندازِ بیان کی روایات کا لوہا منوالیا۔

یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے کہ اردو نے جو انیسویں صدی کے وسط تک اعلیٰ مقام پر پہونچ گئی تھی مغرب کے ادب عالیہ سے اکتساب میں بڑی بخالت سے کام لیا۔ غالباً اس کی وجہ اس عہد کا سیاسی اور ثقافتی ماحول تھا۔ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کی ناکامی کے زخم کی کسک بھی اس مغرب بیزاری کا ایک سبب تھی۔ لیکن ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو والوں کی اکثر بہت ساحلِ سمندر سے دور تھی۔ جب کہ مغرب کی تہذیبی یلغار کا اثر کلکتہ۔ بمبئی۔ اور مدراس کی بندرگاہوں پر پڑ رہا تھا۔ یہی تین شہر ہمارے ملک کی ابتدائی تین جامعات کے مراکز بنے اور وادی گنگ و جمن کا شمالی علاقہ جو بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر بے حرص نہیں تو منھ کھولے حیرت و استعجاب سے ان تبدیلیوں کا نظارہ کر رہا تھا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی شعوری زندگی کا ابتدائی مرحلہ نشاۃ الثانیہ، اصلاح اور احیائے ماضی کے ایک عجیب و غریب امتزاج پر ان کے جب سر سید احمد خاں طاقت و قوت کے ایک مینار کی طرح ابھرے اور حالی و آزاد نے نئے طرز کی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ لیکن اسی مرحلہ پر بھی اقبال نے ہمنوائی بھی، اپنے لب و لہجہ اور اپنے اسلوب بیان کی انفرادیت کو باقی و برقرار رکھا۔ ان کی آواز ایک منفرد آواز بن گئی۔ ترکی اور ایران میں جو کچھ ہو رہا تھا۔ اقبال نے اس کے تعلق سے خاموش تماشائی کا رویہ اختیار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ انگلستان اور جرمنی کی تعلیم نے ان کی نظر کو وسعت اور فکر کو ایک خاص جہت عطا کی اور اپنے وقت کے اہم موضوعات و مسائل پر وہ مخصوص انداز میں تبصرہ کرنے لگے۔ طبعی طور پر طاقتور لیکن بے جان جیت سے حامل مغرب کے مقابلہ میں انہوں نے پوری قوت و طاقت سے خودی کا نعرہ بلند کیا۔ یہ نعرہ صرف ان کے "انا" کی تسکین کا ذریعہ نہیں۔ بلکہ ان کی شخصیت کے رصانی پر تو کا آئینہ دار تھا۔ انہوں نے بڑی بلندی پر پہونچ کر کہا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ان کی آواز ہندستانی نشاۃ الثانیہ کے قدموں کی چاپ بن گئی۔

"اسرارِ خودی" سے انہوں نے فارسی کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ وہ اس تجربہ میں زیادہ کامیاب [illegible]

غالب کی طرح ان کے ہم عصر فارسی نقادوں اور ادیبوں نے بھی ان کے مقام اور ان کی عظمت کو تسلیم نہیں کیا۔ اہلِ فارسی کے احساسِ برتری کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ پڑھا ، یہ ترجمہ نکلسن نے کیا ہے ، سورت کے جناب منادی نے زبورِ عجم اور پیامِ مشرق کا گجراتی میں ترجمہ کیا ہے اور کراچی کی اقبال اکیڈمی کے یہ علاوہ ان کے ترجمے میرے پاس ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اپنی مادری زبان کے بجائے کسی اکتسابی زبان میں شعر کہنے کی کوشش بالعموم مایوس کن ثابت ہوتی ہے اور بیک وقت دو زبانوں میں تخلیق ممکن بھی نہیں ہوتی۔ لیکن اس سے بھی تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو فارسی سے بالکل مختلف زبان نہیں۔ اس حقیقت کو بھی کون فراموش کر سکتا ہے۔ کہ انگریزوں کے قدم جانے سے پہلے ہمارے ملک کے برسرِ اقتدار گروہ کی زبان فارسی ہی تھی۔ عظیم ترین گجراتی شاعر نہن لال نے جن کا جشنِ صد سالہ ہم اگلے برس منانے والے ہیں۔ کالج میں فارسی پڑھی تھی۔ آپ باور کریں یا نہ کریں ، سورت شہر کے بعض نگر برہمن انیسویں صدی کے اوائل تک پوجا (سندھیا) میں فارسی زبان استعمال کرتے تھے۔ اور احمد آباد کے برہمن اس صدی کے وسط تک بھی اپنے بچوں کو خط فارسی ہی میں لکھا کرتے تھے۔ تو پھر اقبال کے مرتبہ کے کسی شاعر کا جس نے پنجاب میں جنم لیا تھا۔ فارسی کو ایک کلاسکی زبان کے بجائے ایک عصری زبان سمجھ کر اس میں طبع آزمائی کرنا کیوں قابلِ اعتراض قرار دیا جائے۔ فارسی میں اگر اقبال کے کلام کو وہ مقام و مرتبہ نہ مل سکا جس کا وہ مستحق تھا۔ تو یہ بھی کوئی عجیب بات ہے۔ ٹیگور کی بنگالی نظموں کے انگریزی ترجموں کو برطانیہ اور امریکہ میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے! شری اروبندو گھوش کی جنم شتابدی کے موقع پر ان کے مضامین اور ان کی طویل ترین انگریزی نظم ساوتری (۳۰) جلدوں کی شکل میں شائع کی گئی۔ مجھے یقین ہے کہ برطانیہ اور امریکہ کے انگریزی زبان کے شعراء شری اروبندو کی ان نگارشات کو ادبی حیثیت سے وہ مقام نہیں دیں گے جس کی وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔ جمالیاتی حیثیت سے بھی وہ اس کلام سے لطف اندوز نہیں ہو سکیں گے۔ تاہم مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ چلی کی ایک شاعرہ گبریلا مسٹرال نے شری اروبندو اور ٹیگور کا کافی اثر قبول کیا ہے میں اقبال کے فارسی کی جانب توجہ مبذول کرنے کے ایک اور امکانی سبب کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہوں گا۔ صدیوں سے وسطی ایشیا اور ایران سے ہزاروں لوگ کارواں در کارواں خیبر کو عبور کر کے ہمارے ملک میں داخل ہوتے رہے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کے ایک عظیم شاعر کی آواز وسطی ایشیا اور ایران کے ان ملکوں تک نہیں پہونچ پاتی تو انہیں ہندوستان کے نشاۃ ثانیہ کا علم کیسے ہوتا۔

اقبال کے فلسفہ کے بارے میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے ان کے سیاسی تصورات اور نظریات بھی موضوعِ بحث بنتے رہے ہیں۔ ان کے ہاں اسلامی زاویۂ نگاہ پر کچھ لوگوں کو اعتراض بھی ہے لیکن وہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جب اقبال نے محسوس کیا کہ خود برصغیرِ ہند میں ایک آزاد و خود مختار مسلم اسٹیٹ کا قیام ممکن ہے تو انہوں نے "وطن ہے سارا جہاں ہمارا" والی بات سے دستبرداری اختیار کر لی۔ بلاشبہ وہ تصورِ پاکستان کے خالق تھے لیکن ایڈورڈ تھامسن نے ان کے ایک مکتوب کے حوالے سے ان کے مجوزہ پاکستان کا جو نقشہ پیش کیا ہے کیا اس پر بھی اعتراض کیا جانا چاہیئے؟ اس قسم کے مباحث میں الجھ جانے والے اقبال کو بحیثیت شاعر دیکھنے کے بجائے [illegible] کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں جس سے کوئی غلطی سرزد ہی نہیں ہو سکتی۔ [illegible] زبان میں شاعر کو رشی کہا جاتا ہے اور رشی کے [illegible] ہیں۔ بالفاظِ دیگر شاعر کو پیغمبر بننے کی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں [illegible]

[illegible]

[illegible]

سماجی و معاشی ترقی کا ذریعہ
امداد باہمی کی تحریک جو لازمی طور پر ایک عوامی تحریک ہے سماجی و معاشی ترقی کا ایک کامیاب ذریعہ ہے
چنانچہ ہمارے منصوبوں میں امداد باہمی شعبہ کو زبردست اہمیت دی گئی ہے۔
آندھرا پردیش نے عام آدمی کی ضروریات پوری کرنے کی خاطر اس تحریک میں ۱۹۷۴ء۔۷۵ سے
مزید سرعت اور طاقت پیدا کر دی ہے۔ آندھرا پردیش کوآپریٹیو سنٹرل اگریکلچرل ڈیولپمنٹ بینک
(اے پی سی اے ڈی) ریاست میں پھیلے ہوئے اپنے ۲۰۴ پرائمری کوآپریٹیو اگریکلچرل ڈیولپمنٹ
بینکوں کے جال کے ذریعہ کاشتکاروں کو طویل مدتی قرضے فراہم کرتا ہے۔
ریاست میں آندھرا پردیش اسٹیٹ کوآپریٹیو بینک سے ملحق مواضعات کی سطح پر ۱۵۰۰۰ نفع بخش
قرض کی ابتدائی سوسائٹیاں بھی قائم ہیں۔ اے پی سی اے ڈی نے ۱۹۷۵۔۷۶ کے دوران
میں ۲۴ر۲۷ کروڑ روپئے کے طویل المدتی قرضے فراہم کئے۔ ۱۹۷۶ء۔۷۷ میں اس کی جانب
سے دیئے جانے والے قرضوں کی رقم ۳۳ کروڑ روپے تک پہنچ گئی ہے۔
آندھرا پردیش نے شعبہ امداد باہمی میں جو کارنامے انجام دیئے ہیں ان پر وہ بجا طور پر فخر
محسوس کر سکتا ہے۔
ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد
No. 20/77-78/2.

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب: **زرد زرخیز** مجموعۂ کلام: زیب غوری . صفحات (۱۶۶) قیمت ۱۵/= روپئے
ناشر: شب خون کتاب گھر، ۳۱۳ رانی منڈی، الہ آباد ۔ ۳

نئی شاعری کے لب و لہجہ کا انوکھا پن کئی جہتوں میں اُبھرا ہے۔ زیب غوری کی شاعری اصل اُردو کی شاعری ہے۔ اس میں اُردو کی لفظیات ہیں اس شُستہ اُردو کی جو ہمارا ادبی ورثہ ہے۔ لیکن الفاظ کو اس طرح برتا گیا ہے کہ متعینہ معانی اور مقصودِ معانی میں کافی فرق ہے، زیب کی شاعری جذبہ کے ترسیل کی شاعری ہے۔ اس کے ہر شعر میں ایک وقوعہ ہے جس کو احساسات کے تشخص سے ایک خاص کرب کے اظہار کے لئے تشکیل دیا گیا ہے۔ زیب کی شاعری میں متکلم نگاہِ بصیرت سے منظر کو دیکھتا ہے اور اس کی عکاسی اپنی ذات پر اس طرح کرتا ہے کہ ہر منظر کے کلائمکس میں شاعر شریک ہے اور اپنے تاثرات کو دھیمے دھیمے لہجے میں بیان کرتا جاتا ہے۔ اسی لئے اشعار میں خود کلامی کی سی کیفیت ہے۔ 'سی' کا استعمال میں نے یہاں اس لئے کیا ہے کہ اس خود کلامی کا انداز واضح گفتگو جیسا ہے۔

شاعر کرب سے تسکین کی لذت اخذ کرتا ہے، ایسا مظلوم ہے جو ستمِ زمانہ کو لطف لے لے کر بیان کرتا ہے، جو بے حسی کو مقدر سمجھتا ہے، جو بے اعتنائی کو ایک واقعہ جانتا ہے، جو بے راہ مسافرت پر مُصر ہے اور جو کسی طلسم کا منتظر ہے۔

زیب کی زبان پر عجیب کا اثر بہت ہلکا سا ہے، اسی لئے فارسیت اور مبہم تراکیب کا ان کی شاعری میں بہت کم حصہ ہے ہاں غالب کے لب و لہجہ کا ہلکا سا لطف کہیں کہیں آجاتا ہے۔ اکثر استعاراتی پیکر شعریت نہیں رکھتے بلکہ معاشرتی اور اتفاقی تمثیلات پر مبنی ہیں۔ جو سماجی سوختہ سامانی اور انسانی ستم زدگی کی شدید صورت کی آئینہ دار ہیں۔

ان کی شاعری میں جذبات کی آنچ تیز نہیں ہے اور مصرعے رواں اصوات کی بجائے استعاراتی الفاظ سے پُر ہیں زیب کی شاعری اظہارِ ذات کی شاعری ہے اور نامکمل ترسیل کو [illegible] الفاظ کے ذریعہ مکمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"زرد زرخیز" نئی شاعری کا ایک نمائندہ مجموعہ ہے اور نئی غزل کا اچھی مثالوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کی ترتیب [illegible] کتابت، خوش خط اور طباعت عمدہ ہے۔ اس مجموعہ کے [illegible] اشعار قاریوں کے لئے پیش ہیں:

[illegible] تیرا دیکھتا کیا ہوں
مانگنے کے ہاتھ میں تھا گوہرِ یک دانہ کوئی

ابھی گھر آیا ہوں میں [illegible]
چاند نا یک سمندر میں گرا آہستہ

[illegible] بکھرے گا ہے زیب — بیٹھا ہے کیوں خموش کسی کو پکار بھی
مری اعتماد کے آگے کوئی دیوار کب ٹھہری — اسیرِ لفظ جو پا یا نہ فن میرا قفس بولا
بہ دام ساتھ چلنے کو تیار تھی اجل — سونا پڑا تھا شہر خریدار میں بنا تھا
میں اس سے پوچھتا گیا کہ جب تک پوچھوں — مرے سوال نے پیدا نیا سوال کیا
میں عکس آرزو تھا ہوا لے گئی مجھے — زنداں جسم و جاں سے چھڑا لے گئی مجھے

اور ایسے کئی خوبصورت اشعار اس مجموعے میں نقش ہیں، زیب کی شاعری میں جو الفاظ زیادہ استعمال ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔ "در، قفس، دام، اسیر، نیزہ، عکس، مکان، آسمان، فسوں، طلسم، دیوار، دشمن، سخن، شرر، سفر، اعتبار"۔ کتاب اچھی ہے اور اچھے ادب کے طالبعلموں کے لئے تحفہ ہے —— (اسلم عمادی)

کتاب: **سازِ مغرب** (جلد اول، و جلد دوم) مرتب: حسن الدین احمد
ناشر: ولا اکیڈیمی، عزیز باغ، سلطان پورہ، حیدرآباد
جلد اول: ضخامت: ۳۱۷ صفحات — قیمت: بیس روپے جلد دوم: ضخامت: ۲۸۰ صفحات۔ قیمت بیس روپے

اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے تخلیقی ادب کے ساتھ ساتھ تعمیری ادب بہت اہم ہے، اب کچھ ماحول ایسا ہوگیا کہ "بہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" نتیجتاً اچھے قلم کار بچوں کا ادب، معلوماتی ادب، انشائیے، تاریخی ناول نگاری، تعبیرات کا ادب، سائنسی ادب وغیرہ سے بدکتے ہیں اور شعر و افسانہ کا دَور دورہ ہے۔ اس ماحول میں جو کام بھی انتخابات اور معلوماتی ادب کی راہ میں کیا جائے اُردو کی بڑی خدمت ہے۔ "سازِ مغرب" اس سلسلے کا ایک اہم کام ہے۔ اس کے دائرۂ انتخاب میں انگریزی زبان کی نظموں کے ترجمے شامل ہیں۔ گرچہ 'سازِ مغرب' کے نام سے یہ خیال آتا ہے کہ اس کتاب میں فرانسیسی، روسی، ترکی وغیرہ زبانوں کے تراجم ہوں گے لیکن حیطۂ انتخاب کو صرف انگریزی تک رکھا گیا ہے۔

تراجم کے معیار کے لئے اسمٰعیل میرٹھی، اقبال، عظمت اللہ خاں، نظم طباطبائی اور ایسے ہی اکابر کے نام ضامن ہیں۔ تراجم بچوں کی نظموں، اخلاقی اور نیچرل منظومات کے ہیں۔ جلد اول میں انگریزی کی اصل اور اُردو ترجمہ دونوں کو تقابلی طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جلد دوم میں صرف تراجم ہی ہیں۔ غالباً یہ ضخامت کی تحدید کے سبب ہے۔

ان نظموں میں چند ایسی خوبصورت نظمیں سامنے آئی ہیں جو عام طور پر مشہور نہیں ہیں مثلاً ندی کا راگ (ظفر علی خاں) رموزِ حیات (جعفر عباس) نرگس سے خطاب (وحید زیدی) آنسو (نادر کاکوروی) لو ریلزل (دھرم سروپ) عظمت اللہ خاں کے تراجم خصوصاً ننھا غاصب، چپیل چھبیلی، طرمت (شان الحق حقی)

اور کئی نظمیں ہیں کہ اگر فہرست بنائی جائے تو کتاب کی فہرست سے قریب ہو جائے۔

گرچہ ترتیب کے لئے کوئی اصول اختیار نہیں کیا گیا ہے نہ تو ابجدی ترتیب ہے نہ تو مصنفین کے [illegible] کسی اصول پر ہے لیکن یہ بے ترتیبی بھی بری نہیں لگتی۔

حسن الدین احمد صاحب اور محمد ابراہیم صاحب ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس اہم کام کی ابتدا کی ہے۔ اور امید ہے کہ اگلا اڈیشن اس سے بھی بہتر ہوں گے۔ طباعت وکتابت عمدہ، گٹ اپ سنجیدہ اور شستہ ہے (اسلم عمادی)

کتاب:- **میڈیا** مصنف: یوری پیڈیز ترجمہ:- خواجہ احمد فاروقی، عبدالشکور
(۹۲) صفحات، قیمت ۵/- روپئے ناشر:- ساہتیہ اکیڈمی، نئی دہلی

ڈرامہ کی زبان اپنے اندر کئی پہلو رکھتی ہے۔ اس میں جذبات کا اظہار ہوتا ہے، کردار کا عکس ملتا ہے، سماجی پس منظر ہوتا ہے، فلسفیانہ آہنگ بھی ہوتا ہے۔ ایک ڈرامہ نگار کا سب سے بڑا فن کردار سازی ہے۔ وہ کردار کی شکل و صورت اور شباہت بناتا ہے، اس شباہت سے اس کا رویہ اور مزاج مقرر کرتا ہے، اس کے لب و لہجہ کا ایک خاص زاویہ بناتا اور اس کی زبان میں تضاد و توازن کے ذریعے مخصوص شخصیت بناتا ہے اور کردار کو اہمیت بھی دیتا ہے۔

یوری پیڈیز بلاشبہ ایک قابل ڈرامہ نگار تھا۔ اس کے ڈرامہ میں ایک خاص ماحول ہے۔ اور اس کے کردار اس ماحول کے دائرے میں جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ ڈرامہ اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ چار سو ساٹھ برس قبل مسیح کے اطراف لکھا گیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جبکہ یونانی اور ایرانی تہذیبوں کا پہلا عہد تھا۔ فلسفہ کی بنیادیں پڑ رہی تھیں۔ سقراط اور کئی ہم عصر منطقی و فلسفی اپنے مباحث سے انسانی ذہنوں کو انگیز کر رہے تھے۔ یوری پیڈیز کے اس ڈرامے میں بھی زندگی، موت، خوف، دوستی، وہم اور ایسے ہی کئی بنیادی مسائل پر مکالموں کے ذریعے بیان کو پُر زور بنایا گیا ہے۔ اس ڈرامے کے اہم کردار میڈیا اور جیسن ہیں۔ میڈیا جیسن کی عاشق ہے وہ جیسن کو دیوانگی کی حد تک چاہتی ہے۔ جبکہ جیسن طاقت اور تخت و تاج کے حصول کے لئے میڈیا کی محبت سے مکارانہ فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اور دوسری شادی کی کوشش کرتا ہے۔ میڈیا کا دل اس بے وفائی سے حسد کی آگ میں جل اُٹھتا ہے اور یہ ڈرامہ اور متکلم ہو جاتا ہے۔ ترجمے کے کچھ گوشے مطالعہ کے لئے پیش ہیں

'اہا—! بچے اپنے کھیل سے واپس آ رہے ہیں۔ وہ خوش و خرم ہیں۔ وہ اپنی ماں کا رنج و غم بھول گئے ہیں۔ کم عمر کے لوگ المناک فضاء سے جلد اکتا جاتے ہیں۔"

۲۔ 'اب جلدی کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس گریاں بادل کے نہاں خانے میں کڑکنے والی آگ موجود ہے۔ آہستہ اکٹھا ہونے والی، جو جلد ہی چمکنے والی ہے۔

گو میں یہ نہیں جانتا کہ کیسے، اچھائی کے لئے یا بُرائی کے لئے
[illegible] روح کو حرکت میں لاتی ہے، جو بدلے کی وجہ سے اندھی ہو رہی ہے"

[illegible] بس! [illegible] تمہیں اس قدر فولادی ہیں کہ میری کوئی حقارت تم تک نہیں پہنچ سکتی [illegible] میرے راستے سے [illegible] ہو جا [illegible] کی نشو و نما [illegible] والی۔ بچوں کے خون سے اندھی"

[illegible] آہنگ نثر کا انتخاب کیا جاتا تو ڈرامے [illegible] بہتر ہو سکتی تھی۔ کتاب کی طباعت اچھی ہے (اسلم عمادی)

ریاست میں روشنی پھیلتی رہے

ایک پسماندہ علاقہ یا ایک ترقی پذیر ریاست کی تیز رفتار ترقی کے لئے برقی قوت کا فروغ ایک لازمی اور اولین ضرورت ہے۔ کتہ گوڑم مرحلہ نمبر ۲ کی ۱۱۰ میگاواٹ والی پہلی یونٹ کے حال ہی میں چالو ہو جانے سے ریاست میں برقی کی تنصیبی صلاحیت ۱۲۲۸ میگاواٹ ہو گئی ہے۔

ناگرجونا ساگر اور سری سیلم ہائیڈرو الکٹرک اسکیمات کی عاجلانہ تکمیل کے لئے سعودی عرب فنڈ سے بیرونی امداد کے حصول کی جو انتھک مساعی جاری تھیں وہ بارآور ہو گئی ہیں اور ۲ رجنوری ۷۷ء کو اس سلسلہ میں معاہدات پر دستخطیں کی جا چکی ہیں۔

تھرمل پاور کی پیداوار پر بھی ایک خاص توجہ مرکوز کی جا رہی ہے۔ کتہ گوڑم تھرمل پاور اسٹیشن اسٹیج ۔ ۴ "بی" توسیعی اسٹیشن کے پیش نظر ۱۱۰ میگاواٹ والی دو یونٹوں کی تنصیب ہے۔ پہلی یونٹ نے کام کرنا شروع کر دیا ہے اور دوسری یونٹ ستمبر ۱۹۷۷ء سے کام شروع کر دیگی۔

ہماری ریاست میں ۲۷۲۲۱ مواضعات ہیں جن میں سے نصف کو مارچ ۱۹۷۷ء کے ختم تک برقالیا گیا ہے جو واقعی ایک سنگ میل کی حیثیت والا کارنامہ ہے۔

آندھرا پردیش برقی قوت کی پیداوار کے سلسلہ میں خود مکتفی بن جانے کی بھرپور مساعی کر رہا ہے تاکہ ریاست کے گوشہ گوشہ میں اجالا ہو جائے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 19/77-78/2

ادبی سرگرمیاں

اردو نامہ: علمی ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم اکتوبر: بزم نارائن داس کا ماہانہ طرحی مشاعرہ جناب شیخ محمود کرسپانڈنگ آفیسر آل انڈیا ریڈیو سری نگر کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قدیم مکتب سخن کے کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۳ اکتوبر: بزم جوہر کی غیر طرحی محفل شعر جناب اوج یعقوبی کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر راہی نے معتمد مسلم کے فرائض انجام دیئے۔ مسرز معظم عبیدی، ذاکر گو ڈر شاہی، محمد علی زیرک، عارف سیابانی اور کئی شعراء نے کلام سنایا۔

۴ اکتوبر: روزنامہ "سیاست" میں مطبوعہ اطلاع کے بموجب جامعہ عثمانیہ کے ممتاز فرزند، ڈرامہ نویس ادیب جناب محمد عمر مہاجر کا ۲۰ ستمبر کو کوئٹہ (پاکستان) میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ مہاجر مرحوم "مجلہ عثمانیہ" کے ایڈیٹر بھی تھے۔

۵ اکتوبر: ڈاکٹر محمد مصلح الدین صدیقی، پروفیسر (ریٹائرڈ) سماجیات ریاستی زرعی یونیورسٹی کا حرکت قلب بند ہونے کے باعث انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر صدیقی اسلامیات اور اقبالیات کے ادیب تھے۔ [illegible] ادارہ ادبیات اردو کے شعبۂ اطفال کے رکن اور معاون بھی رہے۔

• حیدرآباد کے ایک قدیم کتب خانہ "حیدری گشتی کتب خانہ" کا ریاستی اردو اکیڈیمی سے ایک خوشگوار تقریب میں الحاق عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کی صدارت جناب آصف پاشا ریاستی وزیر قانون و اوقاف (صدر اکیڈیمی) نے کی۔ موصوف نے کہا کہ "اردو اکیڈیمی کی جانب سے پرانا شہر میں ایک اردو کامپلکس کی تعمیر عمل میں آئے گی۔ اردو مطالعہ گھروں کا ایک جال بچھایا جائے گا جہاں ابتدائی اردو تدریس کے انتظامات بھی کیے جائیں گے۔" جناب عابد علی خاں صدر نشین مجلس انتظامی اردو اکیڈیمی نے اس موقع پر اردو والوں کی بڑی تعداد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "حیدری گشتی کتب خانہ کا اکیڈیمی سے الحاق اس کی موثر اور بہتر سرگرمیوں کی توسیع ہے۔ موصوف نے کتب خانہ کی طرف سے اردو تعلیم کا انتظام کئے جانے پر اکیڈیمی کی طرف سے معاونت کا اعلان کیا۔ محترمہ شاکرہ بیگم سکریٹری کتب خانہ نے کتب خانہ کی سرگرمیوں اور [illegible] تفصیلی اظہار خیال کیا۔ مسٹر بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر اکیڈیمی نے شکریہ ادا کیا۔ اور مسٹر اختر حسن اسسٹنٹ سکریٹری نے جلسہ کی کارروائی انجام دی۔

۶ اکتوبر: جناب جی۔ ایم خان ایڈیٹر "ہندوستانی ادب" کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ خان مرحوم راست باز اور بے باک صحیفہ نگار تھے۔ ۲۵ سال تک انہوں نے "ہندوستانی ادب" کو مخصوص انداز میں زندہ رکھا۔ وہ اردو کو صوتی انداز میں تحریر کے ذریعہ آسان اور سہل بنانے کے زبردست حامی تھے۔

۸ اکتوبر: بزم شب رنگ کا ادبی اجلاس و مشاعرہ مسٹر ایس۔ پی کوشک ایڈمنسٹریٹر آفیسر ریجنل ریسرچ لیباریٹری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر مارکٹنگ مسٹر پی ہندر ناتھ اور ڈپٹی چیرمن بجسلیٹو کونسل مسٹر سید مختار شاہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شریک محفل تھے۔ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۹ اکتوبر: ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی ۵۰ ویں برسی کے موقع پر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے "ایوان اردو" میں "یوم زور" منایا گیا۔ اجلاس اول کی صدارت جناب بھارت چند کھنہ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی اور اجلاس دوم کی صدارت جناب ڈاکٹر ہاشم امیر علی صاحب نے کی۔ جناب محمد مسعود احمد [illegible] ادارۂ ادبیات اردو نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر زور کی شخصیت [illegible] تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں، لسانی شعور اور دکنیات پر ان کی گہری بصیرت پر مسز ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر سیدہ جعفر پروفیسر محمود حسین، رمن راج سکسینہ، ڈاکٹر جراغ علی تحقیر کے علاوہ، محترمہ لیق صلاح، محترمہ ناز صدیقی اور فاطمہ پروین نے مضامین سنائے۔ روفی غلش اور صادق نقوی صاحبان نے منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ ابتدا میں معتمد اعزازی ادارہ جناب سید ہاشم علی اختر (آئی اے ایس) نے ایک قرار داد تعزیت پیش کی جس میں جامعہ عثمانیہ کے تین معروف اہل قلم اصحاب ڈاکٹر مصلح الدین صدیقی جناب مجاہد خاں اور محمد عمر مہاجر کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے مرحومین کی اردو زبان و ادب سے وابستگی پر خراج عقیدت ادا کیا گیا اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔

۱۰ اکتوبر: بزم سعدی کا ادبی اجلاس و مشاعرہ "نظامس ٹرسٹ اردو لائبریری" میں بصدارت ڈاکٹر سید عبد المنان منعقد ہوا۔ ڈاکٹر عالی خانی قونصل جنرل ایران مہمان خصوصی تھے۔ ڈاکٹر شریف النساء نے "ایران کے جشن در درد" کے زیر عنوان اپنے [illegible] شعرائے ایران اور ریسرچ کے موضوع پر مقالہ [illegible]۔ محفل شعر میں فارسی کلام سنانے والوں میں ڈاکٹر قاسم علی خاں مسلم، ڈاکٹر بہمن سوری، شمس الدین تاباں، حامد بن شبیر، شفیق سجز، رشید نقوی، مسرز ا سرفراز علی اور ارمان قریشی قابل ذکر ہیں۔ معتمد کے فرائض شفیق سجز نے انجام دیئے۔ جلسہ کا آغاز کلام سعدی سے ہوا جسے آقائی حسن طبسی تبریز نے پیش کیا۔

۱۳ اکتوبر: "لوہیا وگیان سمیتی" کے زیر اہتمام ایک لسانی سمینار کو مخاطب کرتے ہوئے مرکزی وزیر مسٹر راج نارائن نے کہا کہ "وہ اردو کی ہندی کی طرح اتنی ہی عزت کرتے ہیں کیونکہ اردو ملک کی دیگر زبانوں میں سے ایک ہندوستانی زبان ہے۔" اس سمینار کی صدارت مسٹر کے پرتاب ریڈی (ایڈوکیٹ) نے کی۔

۱۶ اکتوبر: اقلیم ادب کا ادبی و شعری اجلاس ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے اقبالیات کے بارے میں جناب مصلح الدین سعدی نے اسٹرولیو لیدیک نظم تین تاثر کے موضوع پر مباحثہ کے لئے ڈاکٹر یوسف کمال نے اپنی نظم پیش کی۔ جمیل شیدائی، یوسف اعظمی اور حامد مجاز نے اس نظم پر تجزیاتی تاثرات سنائے "افسانہ اور اس کے فن" پر مجید قادری نے مضمون پڑھا۔ محفل شعر میں ڈاکٹر شکیب، شمس الدین تاباں، [illegible]، [illegible] مجاز، ڈاکٹر یوسف کمال، رحمن جامی، برق یوسفی، حامد مجاز، صادق نقوی، ماہر حیدرآبادی اور حسام الدین سلیم نے کلام سنایا۔ جناب غنی نعیم نے نظامت کے فرائض انجام دیئے اور شکریہ ادا کیا۔

- مرکز ادب کی محفل شعر میں جناب منوہر لال بہار کے مجموعۂ کلام "بہارستان" کی اشاعت پر ان کا خیر مقدم کیا گیا جناب محمد عبد الکریم ماہر نے اس تقریب کی صدارت کی۔ محفل شعر میں بہار، ماہر، عظیم حیدرآبادی، بے محس الہ آبادی، اسمٰعیل ظریف، محوی سر دھنی، علی سرور، صائب رزاقی، راجہ لال راجہ، آنند راؤ آنند اور محسن نظامی نے کلام سنایا۔

۱۸ اکتوبر: علی گڑھ اولڈ بوائز اسوسی ایشن کی طرف سے یاد سر سید اور جشن صد سالہ مسلم یونیورسٹی کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر منظور عالم صدر شعبہ جغرافیہ جامعہ عثمانیہ نے "علی گڑھ تحریک کے ارتقاء میں سر سید کے حصہ" پر مبسوط روشنی ڈالی۔ پروفیسر حبیب الرحمن معتمد ریاستی انجمن ترقی اردو نے سر سید کو مصلح قوم قرار دیتے ہوئے ان کی قومی، ملی اور تعلیمی خدمات کو زبردست خراج عقیدت ادا کیا۔ [illegible] میں ایک محفل شعر جسٹس شرف الدین احمد صاحب کی صدارت میں [illegible] سعید شہیدی، کنول پرشاد کنول، [illegible]

احمد خسرو، غیاث متین، ڈاکٹر مغنی تبسم، صلاح الدین نیر، ڈاکٹر احسن رضوی، امداد راشد، فیض الحسن خیال اور رئیس اختر صاحبان نے کلام سنایا۔

۲۴ر اکتوبر: اردو سبھا کے زیرِ اہتمام ایک خوشگوار ادبی و شعری محفل میں جس کی صدارت جناب عابد علی خاں معتمد ادبی ٹرسٹ نے کی۔ اردو، ہندی اور تلگو کے مصنفین کا خیر مقدم کیا گیا۔ مسز اقبال متین، اختر حسن، منوہر لال بہار اور تلگو شاعرہ شیتندر رشرما کی گلپوشی کی گئی۔ ڈاکٹر مغنی تبسم، ڈاکٹر یوسف سرمست اور جناب اختر حسن نے مخاطب کیا۔ محفلِ شعر میں ہندی اور اردو شعراء کے علاوہ انگریزی کی شاعرہ شریمتی اندرا دھن راج گیر نے کلام سنایا۔

● مسز شاردا مکرجی گورنر آندھرا پردیش نے "عظمت جاہ لائبریری" کا معائنہ کیا۔ مسٹر ظہیر احمد چیرمن نظامس ٹرسٹ کمیٹی نے خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ پرنس مکرم جاہ کے صاحبزادہ کے نام سے موسوم اس کتب خانہ میں پانچ ہزار مختلف زبانوں کی نایاب و کمیاب کتابوں کا ذخیرہ موجود ہیں۔

۲۴ر اکتوبر: آندھرا پردیش اردو [illegible] تعلیم و [illegible] [illegible] [illegible] صدر نشین [illegible] [illegible] خاں

نے اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ مرکزی ترقی اردو کے تین پراجکٹ مرکز خوشنویسی، اردو انسائکلو پیڈیا اور نصابی کتابوں کی ترتیب و اشاعت کا کام حیدرآباد میں اطمینان بخش طریقے پر انجام پا رہا ہے۔ شریمتی برکتکی نے اکیڈیمی کی سرگرمیوں اور حیدرآباد میں ترقی اردو بورڈ کے پراجکٹوں کی کارکردگی پر اظہارِ ستائش کرتے ہوئے کہا کہ وہ حیدرآباد میں اردو زبان اور تعلیم و ادب کی سعی و کاوش سے متاثر اور مطمئن ہیں۔ گزشتہ تیس سال میں اردو کی ترقی کے لئے کئے گئے اقدامات کو ناکافی قرار دیتی ہیں۔

● صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر نیلم سنجیوا ریڈی نے حیدرآباد میں ٹیلی ویژن اسٹیشن کے افتتاح کی رسم انجام دی۔ مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات مسٹر ایل کے ایڈوانی نے بھی مخاطب کیا۔ اس موقع پر تلگو کے نامور شاعر ڈاکٹر داشرتھی نے ٹیلی ویژن کے بارے میں اردو کا ایک شعر سنا کر بےحد داد حاصل کی۔ اس تقریب میں اقبال کا ترانہ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" مشہور موسیقار [illegible] وارثی نے سنایا۔

● اقبال اکیڈیمی کی محفلِ اقبال [illegible] [illegible] اقبال [illegible] رسم

اجرا جناب محامد [illegible] انجام دی۔ ڈاکٹر غلام دستگیر نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ ڈاکٹر رحیم الدین کمال، جناب محمد [illegible] احمد (مدیر اقبال ریویو) جناب محمد ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی، جناب سلطان محوی اور جناب راحت عزمی اقبالیات کے موضوع پر مقالے پیش کیے۔

۲۶ر اکتوبر: اردو کے نامور طنز نگار ادیب، کالم نویس اور صحافی جناب ابراہیم جلیس کا کراچی میں دماغ کی شریانیں پھٹ جانے کے سبب انتقال ہوا۔ جلیس مرحوم پاکستان پیپلز پارٹی ٹرسٹ کے روزنامہ "مساوات" کے ایڈیٹر تھے۔ جلیس مرحوم کا تعلق حیدرآباد سے تھا۔ گلبرگہ سے انھوں نے انٹرمیڈیٹ کیا تھا، علی گڈھ کے گریجویٹ تھے اور دکن کے نامور اور محبوب طنز نگار ادیب تھا۔ ابتدائی تخلیقات سب رس میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی تھیں۔ جناب محبوب حسین جگر جوائنٹ ایڈیٹر سیاست اور جناب مجتبیٰ حسین جلیس مرحوم کے بھائیوں میں ہیں۔

۲۷ر اکتوبر: ابراہیم جلیس کی وفات پر صحافتی بیانات کے ذریعہ مسز خلیل اللہ حسینی (صدر اقبال اکیڈیمی) [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] اور [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible] پر دیکھئے

شیریں و درخشاں مستقبل

یقیناً تعلیم تیز رفتار معاشی ترقی اور عاجلانہ تکنیکی فروغ کے لئے اہم ترین منفرد عنصر ہے۔

سال ۷۷-۱۹۷۶ء میں تقریباً ۰۹ر۰ لاکھ اضافہ بچوں کو اوّل تا پنجم جماعتوں میں داخلہ دیا گیا جس کے نتیجہ میں ۶ تا ۱۱ سال عمر والے بچوں میں لڑکوں کے داخلے کا فیصد ۸۴ر۲۴ اور لڑکیوں کے داخلے کا فیصد ۶۰ر۹ ہو گیا۔ کسی لحاظ سے بھلا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

ہماری ریاست میں فی الوقت ۳۵۰۰ ہائی اسکول ہیں۔ سال ۷۸-۱۹۷۷ء کے منصوبے میں ثانوی تعلیم کے فروغ کے لئے ۶ر۴۳ کروڑ روپیوں کی کثیر رقمی گنجائش فراہم کی گئی ہے۔ ریاست کے تینوں رہائشی اسکولوں کا بڑا شاندار ریکارڈ رہا ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء میں ان تینوں اسکولوں کے پورے طلباء درجہ اوّل سے کامیاب ہوئے۔

آندھرا پردیش ان پڑھوں کے ساتھ نئے ڈھنگ سے پیش آرہا ہے چنانچہ فی الوقت ان کے فائدے کے لئے اضلاع کرشنا۔ کھمم اور کڑپہ میں غیر رسمی تعلیم کی ایک اسکیم چل رہی ہے۔ اس سال ضلع عادل آباد کے علاوہ دو اور اضلاع میں بھی اس اسکیم کو لاگو کر دیا جائیگا۔

ہماری پروان چڑھتی ہوئی نسل ایک شیریں و درخشاں مستقبل کی سمت بڑھ رہی ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

No. 18/77-78/2

سن اجراء ۱۹۳۸ء | بیادگار ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ | فون نمبر ۳۸۲۶۹

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد ۴۰ | دسمبر ۱۹۷۷ء | شمارہ ۱۲

نگران:
سید علی اکبر ایم اے کنٹیب

معتمد مجلس مشاورت:
غلام جیلانی

مرتب:
وقار خلیل

مجلس مشاورت
ڈاکٹر گوپی چند نارنگ
ڈاکٹر غلام عمر خاں
رین راج سکسینہ
عابد علی خاں
محمد منظور احمد

زر سالانہ: ۱۲ روپے
ششماہی: ۷ روپے
فی شمارہ: ایک روپیہ پچیس پیسے

پرنٹر، پبلشر: سید علی اکبر — مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد — ادارہ ادبیات اردو پنجہ گٹہ حیدرآباد

ریاست کے جیالے کسانوں کو آفرین

آندھرا پردیش کی خوشحالی کا دار و مدار کسان کے بل پر ہے۔ ہمارے پانچسالہ منصوبے برسوں سے غذائی اجناس کی پیداوار میں اضافے کو زبردست اہمیت دیتے آئے ہیں۔ آندھرا پردیش میں غذائی پیداوار میں اضافے کی مساعی کو ۱۹۷۵-۷۶ میں نمایاں کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے ۹۴٫۳۲ لاکھ ٹن اجناس اُگائے جو ایک ہمہ وقتی ریکارڈ ہے۔

قدیم زمانے سے خشک سالی کے شکار علاقوں میں قلت کے حالات کے ازالہ کے لئے "خشک سالی سے متاثرہ ہونے والے علاقوں کے پروگرام" کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے جو فی الوقت اضلاع اننت پور، کرنول، کڑپہ، چتور، محبوب نگر، نلگنڈہ اور پرکاشم میں جاری ہے۔

چھوٹے کسان کو بھی فراموش نہیں کیا گیا ہے۔ چھوٹے کسانوں کی ترقیاتی ایجنسی اور مارجینل کسانوں و زرعی مزدوروں کی ترقیاتی ایجنسی کی جانب سے اب تک ۸۷۸٫۸۶ لاکھ روپیوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور ۲۳٫۹۲ کروڑ روپیوں کے مساوی ادارہ جاتی مالیہ فراہم کیا گیا ہے۔ تقریباً ۶٫۹۷ لاکھ چھوٹے کسانوں، مارجینل کسانوں اور زرعی مزدوروں کی "شناخت" عمل میں لائی جا چکی ہے۔

ناظم
محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
حکومت آندھرا پردیش حیدرآباد

12.56/ADVT/CS/77-23

اپنی بات

▭ ۱۹۷۷ء رخصت ہو رہا ہے، جاتے جاتے اس نے ۱۹/ نومبر کو ہماری ریاست آندھرا پردیش میں قیامتِ صغریٰ کا لرزہ خیز منظر پیش کیا۔ ریاست کے ساحلی علاقوں میں طوفانِ باد و باراں اور غضب ناک دیوہیکل سمندری موجوں نے زبردست تباہی مچائی ہزاروں قیمتی انسانی جانیں ضائع ہوئیں، ہرے بھرے کھیت جھیل بن گئے، کتنے ہی لوگ بے گھر اور بے سہارا ہو گئے۔ اس عظیم سانحہ پر ہر درد مند دل نے آنسو بہائے۔ طوفان میں جاں بحق ہونے والوں کے پسماندوں سے ساری دنیا نے اظہارِ ہمدردی کیا ہے بچنے والوں کی دستگیری کے لئے کئی ہاتھوں نے سہارا دیا۔

اس المناک سانحہ پر ادیبوں اور شاعروں نے بھی آنسو بہائے ہیں، ہم دعا گو ہیں کہ خدا اس طوفان سے بچنے والوں پر اپنی رحمتیں افزوں فرمائے اور ریاست کے ساحلی اضلاع میں پھر سے زندگی، حرکت اور مسرت کے آثار روشن ہوں۔

▭ ۱۱۔ ڈسمبر کو ریاستی انجمن ترقی اُردو کا ۱۴واں سالانہ اجتماع منعقد ہوا۔ ریاست میں اُردو تعلیم اور نظم و نسق میں اُردو کے مسائل کا بھرپور جائزہ لیا گیا۔ مرکزی انجمن ترقی اُردو کے صدر پنڈت آنند نرائن مُلّا نے اپنے افتتاحی خطبہ میں اُردو والوں کو توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ "اُردو والوں کو چاہیئے کہ وہ ماضی کے احیاء کے رجحان سے چوکس رہیں اور اُردو کی ترقی کا جائزہ لینے کے لئے تین اُمور پر دھیان دیں، پہلی بات یہ ہے کہ موجودہ حالات کا رُخ کیا ہے اور بدلتے ہوئے حالات میں ہم کو کس جانب توجہ دینی ہے۔ دوسری بات ہمارے آئینی حقوق کیا ہیں اور تیسری چیز ہمیں ان حالات میں راہ کے تعین کی طرف اشارہ کرتی نظر آتی ہے" ہم سمجھتے ہیں کہ چاہیئے کہ ان نکات پر غور کریں تاکہ اُردو کا مسئلہ اور زیادہ پیچیدہ نہ بنے اور ریاست میں اس کو صحیح مقام مل جائے۔

اس کانفرنس میں جناب حبیب الرحمٰن، جناب عابد علی خاں، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور دیگر قائدین نے جن خیالات کا اظہار کیا ان پر ہر اردو دوست کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے تاکہ ریاست میں اُردو کا موقف متحدہ سعی و کاوش کے سبب آنے والے کئی سالوں کے لئے مستحکم بن سکے۔

"سب رس" کے اس شمارے میں برصغیر ہند و پاک کے نامور طنز نگار ادیب ابراہیم جلیس مرحوم کی یاد میں چند تحریریں شائع کی جا رہی ہیں ان کے علاوہ پروفیسر سید محمد مرحوم، کرشن چندر مرحوم کے فکر و فن اور شخصیت کے روشن گوشوں پر مفید تحریریں شامل ہیں۔ دیگر مندرجات میں ادبی اور لسانی نیز تاریخی و تہذیبی ابواب پر مضامین شامل ہیں۔

(غ - ج)

امیر خسرو کا صوفیانہ کلام

ڈاکٹر مصفدر علی بیگ

حضرت امیر خسرو صوفیائے کرام کے سلسلۂ چشتیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور شیخ کبیر حضرت نظام الدین اولیاء کے مریدانِ خاص میں بھی بلندترین درجہ رکھتے تھے۔ عہد وسطیٰ میں تعلیم یافتہ طبقے کے لئے ایک اہم دلچسپ اور قابلِ غور مسئلہ بنا ہوا تھا۔ صوفیانہ اخلاق و اطوار اور طرزِ زندگی مرکزِ توجہ رہے۔ صوفیا کی تعلیمات، تصورات اور خیالات پر تنقید و تبصرہ، تاریخی ولسانی تحقیق اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے ان کا تجزیہ کیا جاتا رہا۔

تاریخی اعتبار سے چوتھی صدی ہجری کے اختتام تک صوفیت ایک اٹل اور واضح طرزِ زندگی اور اندازِ فکر بن گئی تھی اور تصوف ادب، شاعری فلسفہ اور مذہب کا مرکزِ توجہ بن گیا تھا۔ بقول پروفیسر اے۔ جے۔ آربری کے جب تصوف نے ایران کی روح اور دماغ کو اپنی گرفت میں لیا اور ایرانیوں کی غیر معمولی قوتِ فکر کو ایک نیا میدان جولانیاں دکھانے کے لئے مل گیا تو تصوف کو جمالیاتی حیثیت سے نشوونما پانے کا موقع ملا۔ فارسی کی کلاسیکی شاعری بڑی حد تک صوفیانہ خیالات اور جذبات سے مملو ہے۔" فارسی کی صوفیانہ شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی کہتے ہیں کہ" فارسی شاعری اس وقت تک قالبِ بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا۔"

فی الجملہ تصوف کو اسلامی دنیا میں بہت جلد چاروں طرف فروغ ہونے لگا۔ عرب، عراق، شام اور مصر سے تصوف کا ابر بہاری ہر چمن کی آبیاری کرتا ہوا ایران اور خاص کر خراسان پہنچا۔ جس کی سرزمین اس کے لئے بہت زرخیز ثابت ہوئی اور وہاں بے شمار صوفیا اور صوفی شعراء پیدا ہوئے۔ تصوف نے ایران کی راہ سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ چوتھی، پانچویں صدی ہجری ہی سے صوفیا ہندوستان میں داخل ہونے لگے تھے۔ چنانچہ شیخ ابوالحسن علی ہجویری مصنف "کشف المحجوب" جو پانچویں صدی ہجری کے بڑے صوفی گزرے ہیں۔ لاہور آئے، وہیں سکونت اختیار کرلی اور وہیں مدفون ہیں۔ دہلی میں مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے قبل ہی ہندوستان کے کئی شہروں میں صوفی بزرگ داخل ہوئے اور مستقل طور پر بود و باش اختیار کرلی تھی۔ تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی تک ہندوستان میں کئی صوفی سلسلے رائج ہوچکے ہیں۔ بتدریج بے شمار صوفیا اور صوفی شعراء پیدا ہوگئے۔ جن میں بعضوں نے غیر معمولی شہرت اور عزت حاصل کرلی۔ ان صوفیا میں خواجہ معین الدین چشتی، شیخ فرید شکر گنج اور نظام الدین اولیا اور صوفی شعراء میں یمین الدین محمود امیر خسرو دہلوی اور حسن سجزی نے کافی شہرت و مقبولیت حاصل کی۔

صوفیانہ افکار اور تصورات کو امیر خسرو نے اپنے کلام کے ذریعہ وسیع تر اور عمیق تر بنایا۔ صوفیا تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب کی تعلیم دیتے اور اپنے نفسوں اور دلوں کی صفائی کرنے کے لئے صبر و قناعت، فقر و مسکینی، سنجیدگی اور خاموشی اختیار کرتے تھے۔ نفسِ امارہ کی مخالفت اور خواہشاتِ نفسانی کے فرو کرنے کی تعلیم تمام انبیاء، اولیاء اور حکماء نے دی ہے۔ رسولِ خدا صلعم ارشاد فرماتے ہیں کہ "نفس کے خلاف جہاد جہادِ اکبر ہے۔" حضرت علی ابنِ ابی طالب فرماتے ہیں کہ "سب سے طاقتور وہ انسان ہے جو اپنے نفس پر قابو رکھے۔"

الغزالی کے نزدیک انسان سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے۔ وہ بدی کا امر کرتا اور خیر سے بھاگتا ہے۔ علی ہجویری کا خیال ہے کہ انسان کے لئے حقیقی شیطان اس کا نفسِ امارہ ہے۔ اس سے آزاد ہونے والوں کو سراہتے ہوئے امیر خسرو کہتے ہیں۔

اے من غلام ہمتِ آن پاک بندۂ　　کز بندگیٔ نفس بد آزاد می رود

(میں تو اس پاک بندے کی ہمت کا غلام ہوں اور اس کے آگے سر جھکاتا ہوں جو نفس امارہ کی غلامی سے آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے)

اور دعا فرماتے ہیں　زنفسِ تیرہ کنیم کش بہ یکبار　　پس آنگہ سوئے خویشم کش بہ یکبار

(اے خدا مجھے تیرگی پیدا کرنے والے نفس سے دور کردے اور پھر اپنی طرف ایک بار کھینچ لے) نفس حرص و ہوا کا خالق ہوتا ہے۔ حرص و ہوا انسان کو عقل و دانش سے دور کردیتی ہے۔ اس لئے عقلا نے بالعموم اور صوفیا نے بالخصوص حرص و طمع سے منع کیا ہے۔ امیر خسرو کہتے ہیں۔

اے شدہ بازیچۂ دستِ ہوا　　کردہ روائی بہ رہِ نا روا

(اے تو کہ ہوا و ہوس کے ہاتھوں کا کھلونا بن گیا ہے اپنے لئے ناروا طریقے کو روا رکھا ہے)

اگر انسان کی آرزوئیں اور خواہشات قلیل ہوں، اور وہ صبر و قناعت کرے تو نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی باعث سکون بن جائے۔ اسی لئے اکثر حکما اور صوفیا نے صبر و قناعت کو ایسی دولت بے پایاں بتایا ہے جو انسان کو بے فکری اور سکون و اطمینان کا گنج لازوال عطا کرتی ہے قانع انسان بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ حرص کا تاج پہننے اور "ہوا" کے تخت پر اڑنے کا قائل نہیں ہوتا امیر خسرو کے الفاظ میں

اے شدہ بازیچۂ دستِ ہوا　　کردہ روائی بہ رہِ نا روا

(بادشاہ کا ڈھول اندر سے خالی (پول) ہے لیکن شور اتنا مچاتا ہے کہ آدمی کے سر میں درد ہوجائے وہ شخص جو پانی کے گھونٹ اور جو کی پر قناعت کرجائے وہی زمین اور سمندر دونوں کا (یعنی خشک و تر کا) بادشاہ ہوتا ہے۔) ایک اور جگہ امیر خسرو کہتے ہیں۔

مردِ پنہاں در گلیمی بادشاہِ عالم است　　تیغِ خفتہ در نیامی پاسبانِ کشور است

(کمل میں چھپا ہوا ایک شخص تمام عالم کا بادشاہ ہوتا ہے وہ تلوار جو نیام میں سوتی ہے ملک کی پاسبان ہوتی ہے)

تمام صوفیا شان و شوکت، جاہ و جلال اور مال و منال کو ہیچ سمجھتے رہے اور لذایذِ جسمانی پر کیفِ روحانی کو ترجیح دیتے رہے۔ خدا کی محبت میں اور اس کی راہ پر چلنے کے لئے فقر و مسکینی اور درویشی اختیار کرتے رہے۔ عشقِ حقیقی کی لذت کے لئے دنیوی عیش کو ٹھکراتے رہے۔ علی ہجویری کہتے ہیں کہ "اللہ عز و جل نے فقر کا درجہ بلند کیا ہے اور فقرا ہی کو اپنے ساتھ مخصوص گردانا ہے۔ کیونکہ فقرا نے ظاہری و باطنی اسباب کو چھوڑ کر بالکل مسبب یعنی خدا کی ذات کی طرف رجوع کیا۔ یہاں تک کہ ان کا فقر ان کے لئے باعثِ فخر ہوا۔ انبیاء اور اولیاء فقیرانہ اور درویشانہ زندگی گزارتے تھے۔ رسول خدا خود اپنے فقر پر فخر کیا کرتے تھے۔ فقیری کو امیری پر ترجیح دیتے ہوئے اور حرص و ہوا سے منع کرتے ہوئے امیر خسرو کہتے ہیں۔

ناکس و کس ہر کہ حرصِ مال داشت دوزخی است　　عود و سرگین ہر چہ در آتش فتد خاکستر است

(اچھا ہو یا برا انسان جو بھی مال و دولت کی حرص رکھے دوزخی بن جاتا ہے کیونکہ (حرص کی) آگ وہ ہے جس میں خواہ عود ہو یا گوبر جل کر خاکستر ہوجاتا ہے) قرآن حکیم کی ایک آیت کے مطابق "جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے جاتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے رسول) اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو جس دن وہ (سونا چاندی) جہنم کی آگ میں گرم اور لال کیا جائیگا۔

پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور (ان سے کہا جائیگا) یہ وہ ہے جسے تم نے اپنے لئے (دنیا میں) جمع کر کے رکھا تھا۔ تو اب اپنے جمع کئے کا مزہ چکھو۔" (۹:۳۴، ۳۵) ان ہی نصیحتوں کو پیشِ نظر رکھ کر امیر خسرو نصیحت کرتے ہیں۔

اگر خواہی نہ بینی رنج بسیار — بہ اندک مایہ راحت باش و خرسند

خوش آن کسان کہ گزشتند پاک چون خورشید — کہ سایہ نیز بہ سوئے جہان نیفگندند

عاشق زر عاشق درگاہ نیست — زان کہ دوئی درخورِ این راہ نیست

(اگر تو زیادہ رنج اٹھانا نہیں چاہتا تو قلیل سرمائے میں راحت اور خوشی سے بسر کردے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو سورج کی طرح پاک زندگی گذار کر گذر گئے اور جنھوں نے دنیاداری پر اپنا سایہ بھی نہ پڑنے دیا۔ جو مال و دولت پر مرتا ہے وہ درگاہِ عالی کا عاشق نہیں ہوتا کیونکہ یہاں اس راہ میں دوئی نہیں چلتی)

اہل اللہ نے ہمیشہ معرفتِ حق کو دولت و ثروت پر ترجیح دی۔ خود اللہ تعالی نے معرفت و حکمت کو خیرِ کثیر سے تعبیر کیا ہے (۲: ۲۶۹)

امیر خسرو کہتے ہیں — ہر کہ از علم توانگر بود — کئے نظرش بر گہر و زر بود

(وہ انسان جو علم کی دولت سے مالا مال ہو، اس کی نظر زر و گوہر پر کب پڑتی ہے) —— برخلاف اس کے اگر دولت مند آدمی علم و حکمت سے عاری ہو تو خسرو کی نظر میں بہت ہی بدبخت ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

آنکہ بزندانِ جہالت گم است — ہست گدا اگرچہ زرش صد خم است

(وہ شخص جو جہالت کے زندان میں کھویا ہوا ہے اگرچہ سو مٹکے سونے سے بھر کر کیوں نہ رکھتا ہو پھر بھی وہ بے نوا اور فقیر ہے۔)

اکثر اہل اللہ اور صوفیا نے گردشِ روزگار اور انقلاباتِ زمانہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور دنیا اور دولتِ دنیا کی ناپائیداری اور زوال پذیری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جہانِ فانی سے روگردانی اور حیاتِ لافانی کی طرف توجہ کا درس دیا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں "یہ دنیا ایک ابر کے سیاہ سے زیادہ کچھ نہیں .... یہ دنیا تمہارا گھر نہیں ہے۔ نہ وہ تمہاری منزل ہے جس کے واسطے تم پیدا کئے گئے ہو۔ اگرچہ یہ تم کو فریب دے رہی ہے .... لیکن تم اس کے فریب میں نہ آجاؤ۔ اس کی طمع کو چھوڑ دو —" شیخ محی الدین ابن العربی کہتے ہیں۔ "یہ بالکل حق ہے کہ دنیا خواب و خیال ہے۔ جو اس مسئلے کو سمجھ جائے وہ رازہائے طریقت حاصل کریگا...... زندگی خواب ہے۔ موت بیداری ہے اور آدمی ان دونوں کے درمیان چلتا پھرتا خیال ہے۔" اہلِ دانش سے امیر خسرو یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ ہستیٔ ناپائیدار کے دام میں الجھ جائیں اور نہ یہ کہ وہ عمل قوت سے بیزار ہو جائیں۔

زاہلِ عقل نہ پسند خردمند — کہ دارد رفتنی را پائے دربند

سب ہی جانتے ہیں کہ زمانے کی گردشوں نے جن سروں پر تاج رکھا ان پر خاک ڈال دی۔ کیسے کیسے شاہانِ باوقار اور صاحبانِ اقتدار صرف گرد و غبار بن گئے۔ حیاتِ انسانی کے اس تاریک پہلو پر امیر خسرو اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

آن سروران کہ تاجِ سرِ خلق بودہ اند — اکنون نظارہ کن کہ ہمہ خاکِ پا شدند

جن لوگوں کے سرِ غرورِ جہاں بانی کے سبب آسمان پر رہا کرتے تھے اب زمین کی تہوں میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ ان کے کر و فر اور بلند مرتبہ کا کیا ذکر ان کے نام و نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہے۔ خسرو کہتے ہیں ——

؎ سری کہ زیر زمین شد نہفتہ شاہان را ٭ ہمان سر است کہ بر آسمان فراختہ اند

جہانِ فانی کی بجائے خدائے لافانی کی طرف متوجہ ہونا، اور اس سے محبت اور قربت حاصل کرنے کے لئے کرشان رہنا حقیقت شناس کا مطمح نظر ہونا چاہئے۔ جس طرح کہ فارسی زبان کا ایک صوفی شاعر کہتا ہے۔

؎ تو دل بہ کسی دہ کہ در اطوار وجود ٭ بود است ہمیشہ با تو و تو اہد بود

(جا دل اس کو دے، جو وجودِ ہستی میں ہمیشہ سے تیرے ساتھ رہا ہے اور جو ہمیشہ تیرے ساتھ رہیگا۔)

الغزالی کے نزدیک مستحقِ محبت صرف خدائے پاک کی ذات ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہلِ بصیرت کے نزدیک سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کوئی محبوب نہیں۔ امیر خسرو عشقِ حقیقی کی مستی سے دور رہنے والوں سے پوچھتے ہیں۔

؎ بگو کہ چند فسوئی بے خبر ز مستیٔ عشق ٭ کسی کہ مستیش از عشق نیست بے خبر است

عشقِ حقیقی کی مستی عقلا، عارفین اور باخبر اشخاص کو عطا کی جاتی ہے۔ خسرو کی نظر میں اہلِ دل اور اہلِ ہوش کے لئے عشق کی مستی ناگزیر ہے۔ اور جنھیں یہ مستی نہ ملی وہ عمر بھر بے خبر رہے۔

؎ مرا بہ مستی معذور داری ای ہشیار ٭ کہ این زمام نہ در دستِ اختیارِ من است

ضائع آن وقتی کہ برندہ دلان بے عشق رفت ٭ ناخوش آن روزی کہ بر مستان بہ ہشیاری گذشت

عشق کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بے خودی کی کیفیت اور خود فراموشی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ شیخ فرید گنج شکر کہتے ہیں کہ جب کسی شخص کو حق تعالیٰ سے محبت ہو جاتی ہے تو اس کے پاس فرشتے اور ہژدہ ہزار عوالم بھی آئیں تو ان کی طرف نہ دیکھے گا۔ اس خیال کی تائید کرتے ہوئے امیر خسرو کہتے ہیں ؎ نہ بس زیباست لافِ عشق بازی خود پرستان را ٭ چو با عشق آشنا گشتم ز خود بیگانہ خواہم شد

جب عاشقِ حقیقی خدا کے لئے خود سے گزر جاتا ہے تو نہ صرف اسے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے بلکہ اس میں صفاتِ الٰہیہ پیدا ہونے لگتی ہیں اور اس میں رفتہ رفتہ ایسی صفات جمع ہو جاتی ہیں کہ وہ جامع کمالات ہو جاتا ہے۔ اس نوبت پر پہنچنے کے بعد نظام الدین اولیاء کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ اس کو چشمِ بینا و عنایت فرما دیتے ہیں اور وہ تمام عجائب و غرائب، ازمین و آسمان اور مافیہا کو دیکھتا ہے۔ صوفیا کا یہ بھی خیال ہے کہ اس پر نہ صرف اسرارِ الٰہی منکشف ہو جاتے ہیں بلکہ غیر معمولی خدائی قوتیں خدائے تعالیٰ کی جانب سے اس کو ودیعت ہوتی ہیں۔ اور وہ ان قوتوں سے کام لے کر کائناتِ فطرت پر حکم چلا سکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پیغمبروں اور اماموں کے معجزات اور اولیاء اللہ کے کشف و کرامات ظاہر نہ ہوتے۔ لیکن یہ عشق کے وہ راز ہیں جو عقل، دنیوی علوم اور فلسفے کے ذریعہ سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ انسانی ذہن زمان و مکان، ازلی و ابدی اور لامحدود و محصور ہے۔ اور عشق جن حقایقِ تعالیٰ تک پہنچاتا ہے وہ ماورائے زمان و مکان، ازلی و ابدی اور لامحدود و لازوال ہوتے ہیں۔ عہدِ حاضر کے ماہرین نفسیات، اکابر حکما و سائنسدان بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ ماورائے عقل و نظر بھی ایسے حقائق ہیں جن کا احصا عقل و فہم اور علومِ ظاہری کے ذریعے ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اللہ نے عقل کے مقابلے میں عشق کو ترجیح دی ہے، بقول الہید

؎ عقل در رد سر است از این معنی ٭ عارفان عاشقِ جنون باشند

عشقِ حقیقی انسان کو اس مقام پر پہنچاتا ہے، جہاں پہنچ کر وہ دنیا و مافیہا، راحت و آرام، ساز و سامان بلکہ حیات و ممات سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ جب وہ اس طرح خود سے گزر جاتا ہے۔ تو جمالِ الٰہی کے روبرو ہوتا اور اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ خود سے گزرنے اور خدا تک پہنچے

کی اہمیت خسرو کے چند شعروں سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

یک قدم بر جانِ خود نہ یک قدم در کوئے دوست ٭ زیں نکوتر رہروانِ عشق را رفتار نیست

(یعنی بہ یک وقت دو سمتوں میں قدم اٹھاؤ، ایک قدم اپنی جان پر، دوسرا محبوب کے کوچے میں عشق کی راہ میں چلنے والوں کے لئے اس سے بہتر کوئی رفتار نہیں ہوتی۔) ایک اور جگہ وہ کہتے ہیں ؎

عاشقی را کہ غمِ دوست بہ از جان نہ بود   عاشقِ خود بود و عاشقِ جانان نہ بود
اثری نہ ماند باقی زِ من اندر آرزو یت   بچہ کنم چو دیدن نتوان رُخ نکویت

مشاہدۂ حق کے لئے بالکل گزر جانا بھی ضروری ہے۔ نیز اور نفسانی خواہشات جن کا محرک نفس امارہ ہے اس کا بھی خاتمہ کرنا لازمی ہے۔ اوصاف ذمیمہ کی جگہ اوصاف حمیدہ پیدا کرنا چاہیئے۔ حرص و ہوا، غیض و غضب، جہل و نادانی، غفلت و گمراہی اور شر کی بجائے علم و معرفت، اعلیٰ و اخلاق، اعمالِ صالح اور عبادت و محبت سے نفس امارہ فنا ہو جاتا ہے۔ اس فنا کے بعد ابوالقاسم قشیری نیشاپوری کہتے ہیں کہ سلطانِ حقیقت انسان پر تجلی فرماتا ہے۔ عاشقِ حقیقی نہ صرف اپنے نفس امارہ کو فنا کر دیتا ہے بلکہ راہِ خدا میں طرح طرح کی اذیتیں اور جسمانی و روحانی کرب برداشت کرتا ہے کیونکہ وہ لوگ جو عشقِ حقیقی کے رموز اور معرفتِ حق کے اسرار سے ناواقف ہوتے ہیں عاشقانِ حقیقی کو آزار پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے حیاتِ انسانی کی تاریخ گواہ ہے کہ عاشقانِ حقیقی کو ہمیشہ "دار" اور "نار" سے سابقہ رہا۔ انبیاء، ائمہ، اولیاء اور صوفیا کے لئے اہلِ جہاں اکثر تیغ بکف رہے۔ لیکن اہلِ دل کو امیر خسرو نصیحت کرتے اور کہتے ہیں کہ جب تک سر کندھوں پر ہوتا ہے۔ دیدارِ یار نصیب نہیں ہوتا۔

؎ اے اہلِ دل نخست زجان ترکِ جان کنید   وانگہ نظارہ در رخ آن دلستان کنید۔

اپنے آپ کو نصیحت کرتے ہیں کہ ؎

خسرو اگر عاشقی سر بہ میان آر از آنکہ   ہر کہ دراین راہ رفت سر بہ سلامت نہ بُرد

ایک اور جگہ کہتے ہیں "غلام عشقِ خودخسرو بزیر تیغ گردن نہ" وہ کبھی اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دیتے ہیں "عاشقاں را زخم بے مرہم فوغ است" عاشقانِ حقیقی کا مضحکہ اُڑانے والوں کو جتاتے ہیں؛

؎ ہر کہ بر حالِ عاشقاں خندید   گریہ ای واجب است بر حالش

(وہ جو عاشقوں کے حال پر ہنستا ہے۔ اس کے حال پر رونا چاہیئے)

اگر لوگ عاشقِ حقیقی کو کافر ٹھرائیں تو وہ کہتے ہیں کہ ان کی طرف توجہ نہ دینا چاہیئے ؎

بجرمِ عشق اگر کافر کنندم خلق گو می کُن ٭ مرا باری زبان ہرگز بہ استغفار نکشاید

الغزالی کہتے ہیں کہ "آخرت میں اس شخص کا حال سعید تر ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی محبت قوی تر رکھتا ہوگا" امیر خسرو کہتے ہیں۔

؎ خلق اگر چہ نشان بخت بداست ٭ نزد عاشق سعادت ابد است

(بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ عشق میں مبتلا ہونا بدنصیبی ہے لیکن عاشق کے نزدیک وہ ابدی سعادت ہے)

مختصر یہ کہ امیر خسرو نے صوفیانہ تصورات اور تعلیمات کے ہر پہلو پر اپنے کلام میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا اندازِ بیان شاعرانہ، پُر لطف اور پُر اثر ہے۔

• طیب انصاری

کرشن چندر کا فن

کرشن چندر اُردو کے ممتاز ادیب تھے اس حقیقت سے کسی نے بھی انکار نہیں کیا ہے اس بات کا اعتراف ان کی حیات میں کیا گیا اور اب بھی کیا جارہا ہے جب کہ وہ اپنی ذات کو منوانے کے لئے اس دنیا میں نہیں رہے۔ دوسرے ترقی پسندوں کے مقابلے میں کرشن چندر یوں بھی زیادہ خوش قسمت ادیب تھے کہ ان کو ہر مکتب خیال کے ادیبوں نے اپنانے اور اپنا کہنے کی کوشش کی۔ کرشن چندر کے انتقال پر "بی بی سی لندن" سے جو مباحثہ نشر ہوا۔ اس میں ڈیوڈ میتھوز نے تو یہاں تک کہا کہ وہ رومانیت پسند ادیب تھے حالانکہ یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ کرشن چندر نے زندگی بھر رومانیت پسندی کے خلاف جنگ جاری رکھی۔ جو بات ڈیوڈ میتھوز نے کہی ہے وہ بھی غلط نہیں ہے ڈاکٹر عالم خوندمیری نے اپنے انداز میں یہی بات بہت پہلے کہی ہے۔ "کرشن چندر کی طبعی رومانیت کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے انھیں کٹھن سے کٹھن منزل پر تلخی اور جھلاہٹ سے بچا لیا۔ انتہائی بھیانک حقیقت کے اظہار میں بھی ان کا لہجہ سخت نہیں ہوتا" اصل میں یہ جو مغالطہ قاری کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ کرشن چندر کے اسلوب اور انداز بیان کا نتیجہ ہے۔ ورنہ وہ بنیادی طور پر حقیقت پسند اور ترقی پسند ادیب ہی تھے اور بقول ڈسگار نے حقیقت کی تلاش مکمل طور پر انفرادی کوشش ہوتی ہے جب کہ ترقی پسندی اجتماعی کوشش کا نام ہے۔ پریم چند ترقی پسند تھے لیکن ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں کرشن چندر تھے پریم چند کا دَور تشکیک کا دَور تھا کعبہ و کلیسا کی کشمکش کا دَور تھا تاہم پریم چند کی ترقی پسندی نے انھیں ترقی پسندوں کی کانفرنس کی صدارت کی کرسی تک رہنمائی کی لیکن وہ بنیادی طور پر سماج وادی تھے۔ ہندوستانیت کی روح ان میں حلول کرگئی تھی وہ ماضی سے چمٹے ہوئے تھے۔ کرشن چندر نے شعوری طور پر ترقی پسندانہ نقطۂ نظر کو قبول کر لیا تھا اور انھوں نے پریم چند ہی کی طرح انسان اور سماج کے رشتہ کو استوار کرنے اور ترقی پسندانہ خیالات کے زیر اثر انسان اور سماج کے کرب اور دکھ کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ کرشن چندر کا مشاہدہ اور مطالعہ بھی پریم چند ہی کی طرح وسیع تھا، پھیلا ہوا اور گہرا۔ لیکن کرشن چندر نے ماضی سے غدر کیا اور ان کا پورا پورا جھکاؤ کمیونزم کی طرف تھا وہ دیگر مارکس وادیوں کی طرح کمیونزم کو ہر مرض کی دَوا سمجھتے تھے لیکن کمیونزم دیگر ترقی پسندوں کی طرح ان کی کمزوری نہ بن سکا۔ اسی لئے وہ فن کی سنگلاخ وادی سے بچ کر نکل گئے۔ اور وہ اب ہم میں نہیں ہیں تو ان کے فن کو پیش نظر رکھ کر یہ بحث کی جارہی ہے کہ کرشن چندر ترقی پسند تھے یا رومانیت پسند۔ اصل میں یہ کوئی متنازعہ فیہ ادبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اعتراف ہے اس بات کا کہ کرشن چندر کا فن ترقی پسندی اور رومانیت کا امتزاج ہے۔ حسین اور رنگین!۔۔

کرشن چندر پر ہی کیا منحصر ہے ہر بڑے ادیب کے تعلق سے اس قسم کی متضاد باتیں کہی جاسکتی ہیں اور واقعتاً یہ متضاد کیفیات ان میں موجود بھی ہوتی ہیں اور یہ تضاد اصل میں تضاد نہیں ادب اور انسانیت کا فطری تقاضہ ہے۔ ادب چونکہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اور انسانی زندگی کے دو تقاضے ہوتے ہیں جن کو ترقی پسندوں نے مادّہ اور رُوح کے نام سے پیش کیا ہے۔ ہم جس طرح زندگی میں مادّہ اور روح کی اہمیت

اہمیت اور ان کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے اس طرح ادب سے بھی مادّہ یا روح کو خارج نہیں کر سکتے ـــــ سجاد ظہیر اور سردار کے یہاں نظریہ [illegible] کی بڑی اہمیت ہے ۔ جب کہ کیفی ' جاں نثار اختر ' مخدوم اور کرشن چندر نے نظریہ کے ساتھ ساتھ رومانیت کو بھی برتا ہے۔ اس لئے ان کی تخلیقات محض نعرہ بازی کی ذیل میں نہیں آتیں۔ احتشام حسین نے ٹھیک ہی کہا کہ کرشن چندر نے ترقی پسندی کا نام لے کر رومانیت کی اشاعت کی۔ اصل میں یہ ہر بڑے ادیب کی کمزوری اور مجبوری رہی ہے۔ وہ نہ تو مادّہ کی اہمیت سے انکار کرسکتا ہے اور نہ روح کی تازگی سے منہ موڑ سکتا ہے۔ ادب کی دنیا ان دونوں کے درمیان آباد ہے اور شاد ہے۔ اس طرح کرشن چندر نے زندگی کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ ہم کرشن چندر کو محض نظریاتی عینک لگا کر دیکھ نہیں سکتے۔ اور حقیقت بھی تو یہ ہے کہ اقدارِ حیات اور اقدارِ ادب کا جمالیاتی تناسب جو ہر اچھے ادیب کی پہچان ہوتی ہے کرشن چندر کے فن کا بھی معیار ہے۔ احتشام حسین ہی کے الفاظ میں کرشن چندر کے افسانوں میں مواد ' موضوع اور اسلوب کی الگ الگ تحلیل آسان نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ سب ایک دوسرے سے بڑی ہم آہنگی کے ساتھ وابستہ ہیں ـــــ"

احتشام حسین کی اس بات کی تصدیق کے لئے آپ کو کرشن چندر کے افسانوں مثلاً تالاب کی حسینہ ' افسردوں والی ' گل فروش ' خونیں ناچ ' دل کا چراغ ' ٹوٹتے ہوئے تارے اور بالکونی کا مطالعہ کرنا پڑے گا ۔ یہ کہانیاں زندگی کی موڑ پر رومانی انداز کا ہوا اچھا مرقع ہے اسی نمائندگی کے افسانوں میں گرہن کی ایک شام ' جھیل سے پہلے جھیل کے بعد اور بالکونی جیسے افسانوں میں " وہ آدمی مر چکا اور " ان داتا " غیر معمولی اہم افسانے ہیں ان داتا میں کرشن چندر ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو قحط زدہ ' مفلوک الحال اور بھوک کی ماری ہوئی جنتا کو دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے ۔" وہ آدمی مرچکا " میں کرشن چندر نے اونچے طبقہ کی موت پر مسرت کا اظہار کیا ہے ان افسانوں میں ان کی انسان دوستی پوری قوت کے ساتھ ابھر آئی ہے اس لئے بعض بعض جگہوں پر ان کا انداز انقلابی ہوگیا ہے۔ لیکن یہ انداز ان کا مستقل انداز نہیں ہے۔ وہ پھر اپنے اسلوب اور انداز بیان کے سہارے سبک لہجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان افسانوں کی دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کے کردار حقیقی ہیں اور وہ جس طبقے کی روح ان میں بسی ہوئی ہے ۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں اپنے طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ افسانہ کی یہی خوبی ان کی ناولوں میں بھی موجود ہے کرشن چندر کی افسانہ نگاری کی بات کرتے کرتے جملۂ معترضہ کے طور پر یہ کہا جائے کہ ناول نگاری ان کی افسانہ نگاری سے کچھ الگ نہیں ہے تو بیجا بھی نہ ہوگا۔ کیونکہ شخصیت کے اظہار کے یہ دو انداز اور اسالیب نہیں۔ اس لئے افسانہ نگاری کے بارے میں میری جو رائے ہے وہی رائے ان کی ناول نگاری کے بارے میں بھی ہے۔ کرشن چندر کی تخلیقات میں سب سے زیادہ جس تخلیق نے مجھے متاثر کیا وہ ہے ' ان کا رپورتاژ ' پودے ' " ترقی پسندوں کی کانفرنس (حیدرآباد) کی رپورٹ کی حیثیت رکھتی ہے لیکن معنویت اور انداز بیان کی وجہ سے ایک ادب پارہ ہے ' اچھوتا اور خوب صورت ' محبوب حسین جگر کی شخصیت کو جس انداز میں کرشن چندر نے پیش کیا ہے اس سے کردار نگاری کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

کرشن چندر ایک آدمی کا نام ہے جو اپنے اندر وہ ساری خوبیاں اور کمزوریاں رکھتا ہے جس سے وہ عبارت ہے۔ اس طرح ان کی افسانہ نگاری ان کی ذات کی آئینہ دار بھی ہے۔ ہم نے کبھی بھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ فن کے ذریعہ فنکار تک پہنچیں ' اس کو پہچانیں اور اس کی تلاش کریں۔ فنکار کی زندگی کا تجزیہ کر کے اس کے فن پر حکم لگانے کا طریقہ میں سمجھتا ہوں فرسودہ ہو چکا ہے۔ ویسے بھی آدمی کو سر سے دیکھنے کی بجائے پیر سے سر تک دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ہرج ہی کیا ہے؟

کرشن چندر کا دور ہماری سماجی ' معاشی اور سیاسی بے چینی اور تبدیلی کا دور ہے ۔ کرشن چندر نے یقیناً اپنے بچپن میں نذیر احمد کی

(بقیہ صفحہ ۲۴ پر)

مجید بیدار

اُردو میں یادداشت نگاری اور رشید احمد صدیقی

یادیں انسان کی دیرینہ ساتھی ہوتی ہیں جو تاحیات اس کی دماغ کی گرہوں میں محفوظ رہتی ہیں یعنی یادیں انسان کی ایسی رفیق ہیں جو تادمِ زیست انسان سے وفائی کرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ زندگی کے نشیب و فراز کے وقت بھی وہ انسان کے تخیلات سے چمٹی رہتی ہیں۔ دنیا کی تمام چیزیں انسان کو دھوکا دے سکتی ہیں لیکن یادیں انسان کا ایک ایسا بہترین سرمایہ ہیں جو ہر شعبۂ حیات میں اس کی ہمراہی کا حق ادا کرتی ہیں اسی لئے انسانی زندگی میں یادوں کو کافی اہمیت حاصل ہے۔

انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ قیمتی یادوں کو دماغ میں محفوظ رکھتا ہے اور مختلف انداز سے مختلف موقعوں پر اس کا اظہار کرتا ہے تاکہ اس کی یادیں دوسروں کے لئے لمحۂ فکر بنیں اور انسانوں کو درسِ انسانیت حاصل ہو۔ یادوں کے اظہار کے کئی مقاصد ہوتے ہیں جن میں سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعہ عہدِ گزشتہ کی تصاویر و واقعات انسانوں کے دماغوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اردو ادب میں عہدِ گذشتہ کی یادوں کو کتابی حیثیت دینے کا فخر رشید احمد صدیقی کو حاصل ہے انھوں نے علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ اپنی یادوں کو "آشفتہ بیانی میری" میں سپردِ قلم کیا۔ جس کے ساتھ ہی اردو ادب کی صنف "سوانح نگاری" میں ایک نئی صنف "یادداشت نگاری" کا آغاز ہوا۔

رشید احمد صدیقی کو اردو ادب میں "مرقع نگار" کی حیثیت سے بلند مرتبہ حاصل ہے ان کے طنزیات و مضحکات بھی اُردو میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ وہ صاحبِ طرز ادیب اور منفرد اسلوب کی وجہ سے اردو ادب میں جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن "آشفتہ بیانی میری" کے اسلوبِ نگارش سے رشید احمد صدیقی کی ایک نئی شخصیت ظاہر ہوتی ہے اور وہ اردو ادب میں اولین یادداشت نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

یادداشت نگاری ایک ایسی صنفِ ادب ہے جس میں ماضی کے جھروکوں سے گذرے ہوئے لمحات کو اکھٹا کیا جاتا ہے اور یادوں کے گوشوں سے کُرید کر انھیں الفاظ کی شکل دی جاتی ہے یعنی یادداشت نگاری ادب کا ایک ایسا اسلوبِ تحریر ہے جس کے ذریعہ قاری کو ماضی کی سیر کرائی جاتی ہے اور قاری یادداشت نگار کی شخصیت کو ماضی میں سرگرداں عمل دیکھتا ہے اور ساتھ ہی ماضی کے بارے میں تخلیق کار کے خیالات سے واقفیت بھی حاصل کرتا ہے۔

رشید احمد صدیقی نے جہاں اچھوتا طرزِ اسلوب ایجاد کیا وہیں یادداشت نگاری کی بہترین مثال بھی پیش کی۔ وہ اردو کے پہلے صاحبِ طرز ادیب ہیں جن کی تحریروں سے اردو اصنافِ نثر میں "مرقع نگاری" اور "یادداشت نگاری"

کی ابتداء ہوئی۔ ان سے قبل اُردو ادب میں کسی ادیب نے اُن اصناف کو برتاؤ میں نہیں لایا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے بالکلیہ پہلی بار ادب اُردو میں "یادداشت نگاری" کی ابتداء کر کے اپنی یادوں کو کسی ایک فکر سے وابستہ کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ جو اُن کی ادب دوستی و سخن سنجی کی دلیل ہے۔

رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں مبدائے اصلی "علی گڈھ یونیورسٹی" کو بنایا ہے اور اپنی تمام یادوں کو اسی جامعہ سے منسلک کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ رشید احمد صدیقی نے اپنی یادوں کو علی گڈھ کے لئے مختص کر کے انھیں محدود کر دیا۔ لیکن یہ محدودیت قابلِ نظر انداز ہے چونکہ یہ عمل ایک مقصد کے حصول کے لئے کیا گیا ہے

علیگڈھ کی ایک بگڑتی تہذیب اور دوسری اُبھرتی تہذیب کا رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں جس انداز سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے انداز بیان اور طریقۂ استدلال کی گرد کو اُردو کا کوئی دوسرا ادیب نہیں پہنچ سکتا۔ علیگڈھ کے بارے میں اپنی حق پسندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔ "علی گڈھ سے متعلق بعض دوستوں اور عزیزوں کے خیالات یقیناً ویسے نہ ہوں گے جیسے کہ میرے ہیں۔ وہ علی گڈھ کو اس رنگ میں اور اس طرح پر دیکھنا چاہتے ہوں گے جو اُن کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ لاریب۔ یہ بھی علی گڈھ کی خیر اندیشی میں ہوگا۔" "آشفتہ بیانی میری" ص۱۲

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنہوں نے علیگڈھ یونیورسٹی کا مختلف پہلوؤں سے حقائق پسندانہ جائزہ لیا ہے اور یادداشت نگاری کے دوران جامعہ کی ان کوتاہیوں کی جانب بھی نشاندہی کر دی جس کے مطالعہ سے رائے عامہ میں کھلبلی مچنا یقینی امر تھا۔ صدیقی صاحب اس بات پر مُصر نظر آتے ہیں کہ رائے عامہ پر ان کی حق پسندی کو برتری حاصل ہے اسی لئے انھوں نے حق پسندی سے فرار اختیار نہیں کی اور زمانۂ طالب علمی میں جو بھی حالات اور واقعات سے انھیں علی گڈھ میں سابقہ پڑا ان کو رقم کر دیا۔ صدیقی صاحب کی یہ حق پسندی "یادداشت نگاری" کی جانب کامیاب قدم ہے کیونکہ یادداشت نگاری کے لئے حق پسندی اور بے باکی اوّلین شرط کا درجہ رکھتی ہے۔ جسے صدیقی صاحب نے پوری طرح نبھایا اور ماضی کے جھروکوں سے واقعات اور حالات کو مجتمع کر کے بیباک اور حق پسند طریقے سے ان کا اظہار کیا جو یادداشت نگاری کی مکمل تصویر کشی کا نمایاں ثبوت ہے۔

رشید احمد صدیقی نے "آشفتہ بیانی میری" میں خود کی شخصیت کو واقعات اور حالات کے جھرمٹ میں ایک آلۂ کار کی حیثیت دی ہے اور جا بجا اپنے تجاویز کو بھی قلمبند کر دیا ہے چنانچہ ۱۹۱۶ء میں اپنے دوست کے نام تحریر کردہ خط کے حوالے سے کہتے ہیں۔ "مذہب کا دخل سیاسی اغراض کی بناء پر بھی ہو سکتا ہے جس کا دھندا کہیں اور نہیں تو ایشیائی ممالک میں کافی ہے۔" (آشفتہ بیانی میری ص۸۷)

اپنی تجویز کو حالات اور واقعات سے تجزیہ کے ساتھ پیش کرنا صدیقی صاحب کی کامیاب یادداشت نگاری کی دلیل ہے کیونکہ یادداشت نگاری کی خصوصیت ہی یہی ہوتی ہے کہ اس میں واقعات اور حالاتِ زمانہ کو تحریر کرتے ہوئے درمیان میں ایسے چُست فقرے استعمال کئے جاتے ہیں کہ جس کے مطالعہ سے قاری کی فکر میں ایک جھٹکا پیدا ہوتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سوچ و جستجو میں غرق ہو جاتا ہے صدیقی صاحب کا یہ جملہ دانستہ طور پر قاری کے ذہن پر ہتھوڑے لگاتا ہے اور ماحول میں وقوع پذیر ہونے والے حالات کو سمجھنے اور سنجیدگی اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس طرح صدیقی صاحب اپنی

رائے کا اظہار بھی کرتے ہیں جو یادداشت نگاری کی تعریف کو تقویت پہنچاتی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔ "سرسید نے مدرسۃ العلوم (مذہبی ادارہ بننے نہیں دیا اسلامی اور علمی ادارہ بنانے اور رکھنے کی برابر کوشش کرتے رہے" (آشفتہ بیانی میری ص ۵۴)
یادداشت نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہوتی ہے کہ اس صنف کو استعمال کرنے والا مصنف حالات و واقعات زمانہ قلمبند کرتے ہوئے درمیان میں واقعہ کے بارے میں اپنا ذاتی خیال کردے۔ اگر ایسا عمل اختیار نہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ یادداشت نگاری، روزنامچہ کی حیثیت کے مماثل ہو جائے "آشفتہ بیانی میری" میں صدیقی صاحب نے ہر بیان کے دوران تجاویز و مشورے بھی شامل کر دیئے ہیں جن سے صدیقی صاحب کے ایک بہترین یادداشت نگار ہونے کے ثبوت کو تقویت ملتی ہے۔

صدیقی صاحب ملک و ملت کے حالات اور زمانہ کے نشیب و فراز کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی کتاب میں روزنامچہ کی خصوصیات کو اس طرح شامل کرتے ہیں" علی گڈھ سے باہر فرقہ وارانہ جھگڑے اور صوبہ جاتی عصبیت کے جہاں تہاں، مظاہرے ہوتے رہے لیکن کالج کی فضا اس طرح کی نحوست و نجاست سے ہمیشہ پاک رہی" (آشفتہ بیانی میری ص ۵۵)

اپنی رائے کا اظہار اور واقعات و حالات کی دیدہ دلیری سے تصویر کشی یہ ایسے ثبوت ہیں جو صدیقی صاحب کی اس "یادداشت نگاری" کا بہترین نمونہ قرار دینے میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور علی گڈھ کی خصوصیت کو ظاہر کرتے ہوئے حالات علیگڈھ بیان کرنے کا یہی انداز صدیقی صاحب کی جامع ترین یادداشت نگاری کے حق میں دلائل پیش کرتا ہے کیونکہ یادداشت نگاری میں تاریخ کے جھرو کے بھی شریک رہتے ہیں اور روزنامچہ کا عنصر بھی شامل رہتا ہے اسی لیئے رشید صاحب نے اپنی کتاب میں جو انداز تحریر اختیار کیا ہے وہ سوائے یادداشت نگاری کے اور کسی کی نمائندگی نہیں کرسکتا صدیقی صاحب نے علیگڈھ کے عہد گذشتہ کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے روزنامچہ کی شان کو اپنی کتاب میں اضافہ کیا جس کی وجہ سے "آشفتہ بیانی میری" "تاریخ" سوانح اور روزنامچہ سے ہٹ کر یادداشت بن کر رہ گئی۔ اگر صدیقی صاحب صرف واقعات علیگڈھ قلمبند کرتے تو یہ کتاب، تاریخ کا ایک باب بن جاتی یا پھر روزنامچہ کا ایک ورق۔ یا ان کی حیات کے ایک حصہ کی سوانح، لیکن رشید احمد صدیقی کے انداز نے اس کتاب کو تمام قدیم اصناف بننے سے روکا اور ایک جدید صنف" یادداشت نگاری" کی تولید کی۔ صدیقی صاحب کا بیانیہ انداز ان کی کامیاب یادداشت نگاری کی دلیل پیش کرتا ہے۔

علیگڈھ کے اساتذہ، اولڈ بوائز اسوسی ایشن، لیباریٹری، ریسرچ روم اور ان کے استعمالات غرض ہر چیز کا رشید صاحب نے معروضی طور پر" آشفتہ بیانی میری" میں جائزہ لیا ہے۔ وہ علی گڈھ کی خامیاں اور کامرانیاں۔ دونوں کا جائزہ لیتے ہیں اور اس جگہ جہاں کوتاہیوں کا ذکر آتا ہے، اپنا مطمح نظر ضرور بیان کر دیتے ہیں تاکہ ان کی کتاب روزنامچہ کی خصوصیات سے علیحدہ رہے اور اس کی تاریخیت کا عنصر اس کتاب کو تاریخ کا باب نہ بنائے۔ اس لحاظ سے رشید صاحب نے" آشفتہ بیانی میری" کو روزنامچہ اور تاریخ کے وسط کا اسلوب دیا جو سوائے یادداشت نگاری کے اور کچھ نہیں کہلایا جا سکتا۔

علی گڈھ کالج کی ہما ہمی، نوجوانوں کی سرگذشت، بے ہنگم خطابات کی نوازش طلباء کی سرگرمیاں، ہاسٹلس کی گہما گہمی، اساتذہ کا طریقہ تعلیم، شعر و ادب کی محفلیں، سمینار دسترخوں کی ہوٹنگ، غرض علیگڈھ کی ہر قسم کی ہنگامہ آرائی کو صدیقی صاحب نے" آشفتہ بیانی میری" میں پیش کر دیا ہے لیکن انداز بیان، سادہ اور دل کو لبھانے والا چٹکیاں لینے و

سوچ بچار پر مجبور کرتا ہے کہیں کہیں طنز و ظرافت سے بھی کام لیا گیا ہے تاکہ تحریر اور بیان کی خوبیاں پوری طرح اجاگر ہو جائیں صدیقی صاحب کی اپنی کوشش نے انھیں اردو کا ایک کامیاب ادیب ثابت کیا لیکن ہماری نظر میں آشفتہ بیانی میری، کا جدّت پسند انداز اور تاریخ علیگڈھ کے روزنامچہ سے امتزاج پیدا کرنے کی کوشش، رشید صاحب کی ایسی خصوصی پیش کش ہے کہ جس کو ہم ایک نئی صنف "یادداشت نگاری" کے طور پر پیش کر سکتے ہیں ۔

اُردو کے ناقدین نے "آشفتہ بیانی میری" کو علی گڈھ کی کہانی "کی حیثیت دی۔ لیکن اس کے اسلوب اور طرزِ بیان پر توجہ نہ دی ۔ درحقیقت آشفتہ بیانی میری علی گڈھ کے عہد گذشتہ کی یادگار ہے اور اس میں جو نکات اور جو حالات و واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا انداز نہ کہانی جیسا ہے اور نہ ہی داستاں کی تحریر سا۔ اس کتاب میں تاریخ علیگڈھ کی جھلکیاں ہونے کے باوجود اس کا تعلق تاریخ سے نہیں ہو سکتا۔ روزنامچہ کی خصوصیات کا عکس بھی اس کتاب میں ملتا ہے لیکن یہ روزنامچہ نہیں کہلائی جا سکتی۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسا طرز اسلوب جس میں بیک وقت تاریخ، روزنامچہ اور جرانڈ کی خصوصیات پائی جائیں وہ صنف " یادداشت نگاری" ہی ہو سکتی ہے اور رشید احمد صدیقی نے اس طرز کو اُردو ادب میں سب سے پہلے استعمال کیا اسی لئے انھیں اُردو کے اولین یادداشت نگار کا حیثیت حاصل ہے اور ایسے موقع پر جبکہ یہ عظیم ہستی اُردو دوستوں کی حجھرمٹ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو چکی ہے اردو داں طبقہ کا فریضہ ہے کہ وہ اس جدّت پسند ادیب کے اسلوب کو اپنائیں اور ان کے کام کو سراہنے کا حق انجام دیں۔ رشید احمد صدیقی آج اُردو دوستوں سے دور ہیں ۔ لیکن ان کا اسلوب، اصناف میں جدّت پسندی اور اختراعِ طبع، اُردو طبقہ کو بار بار ان کی یاد دلاتا اور ان کے نام کو روشن کرتا رہے گا ــــــــــ ●●

رشید احمد صدّیقی ایک ادبی قامت بھی ہیں، ایک تاثر بھی اور ایک ادیب بانفوذ بھی۔ ان کے طنز و مزاح نے اُردو ظرافت کو ایک شستہ ذہن اور شائستہ لہجہ عطا کیا ہے۔ ان کے مزاح کو خالص ادبی مزاح کہا جا سکتا ہے۔ جس میں شعر و ادب کی صدیوں کی صدائے بازگشت ملتی ہے۔ اپنے طرزِ نگارش سے انھوں نے اردو ادیبوں کی ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ اس میں نہ صرف علی گڈھ بلکہ بہار و دکن تک کے ادیب شامل ہیں ان کی شخصیت ایک ادیب کی پر پیچ شخصیت ہے۔ بیک وقت شگفتہ و بیزار، خموشی و گفتار، جانِ مجلس اور مجلس سے گریزاں۔ غرض کہ متضاد صفات کی جامع ہے :

رشید صاحب آدمی بھی ہیں اور انسان بھی۔ مرنجا مرنج، حساس اور زود حس، نظر کے کانٹے پر اشخاص کو ٹھیک ٹھیک تولنے والے۔ کسی نامعقول کو اپنی صحبت میں بار نہ دینے والے۔ ان کے مزاج کی بنیادی خصوصیت خواص پسندی ہے۔ اشخاص ہوں یا اشیا، ان کے انتخاب کا ایک خاص معیار ہمیشہ برقرار رہتا ہے۔

ــــــــ (مسعود حسین خاں)

غزلیں

شاذ تمکنت

میں کہ ہوں تیری رفاقت کے بغیر
جیسے ایک سایہ ہو قامت کے بغیر
اتنے برسوں میں یہ پہلی شب ہے
چاند دیکھا تری صورت کے بغیر
تجھ پہ گذری تھی انکار نہ کر
چار دن میری محبت کے بغیر
روز ملنے کی نہ عادت پڑ جائے
وصل کچھ بھی نہیں فرقت کے بغیر
کون سمجھے گا گناہوں کا ثواب
حسن کی آنکھ کی نیت کے بغیر
یوں لگا بزم جہاں میں یا رب
میں چلا آیا اجازت کے بغیر
ہم کہ مجنوں بھی تھے فرہاد بھی شاذ
شہر میں پھرتے تھے وحشت کے بغیر

عزیز قیسی

اپنوں کے کرم سے یا قضا سے
مر جائیں تو آپ کی بلا سے
باقی دن چین سے بسر ہوں
بچ جائیں اگر تری وفا سے
اے رہ زدگان کہیں تو پہونچے
منہ موڑ گئے جو رہنما سے
(ق)
پھر نیند اُڑا کے جا رہے ہیں
تاروں کے یہ قافلے ندا سے
مڑ مڑ کے وہ دیکھنا کسی کا
نظروں کے وہ دور کے دلاسے
چپ چاپ فسانہ در فسانہ
امڈتے ہوئے نین پیاسے
پلکوں کی ذرا ذرا سی لرزش
پیغام ترے ذرا ذرا سے
داتا ہیں سبھی نظر کے آگے
کیا مانگیں چھپے ہوئے خدا سے
گرتی رہی روز روز شبنم
مرتے رہے روز روز پیاسے
کیا ہاتھ اُٹھایئے دُعا کو
ہم ہاتھ اُٹھا چکے دُعا سے

علی احمد جلیلی

چاند سورج کی نگاہوں سے چھپاؤ مجھ کو
تیرگی ہوں میں اُجالے میں نہ لاؤ مجھ کو
ٹوٹنے میں ہے جو لذت وہ بکھرنے میں کہاں
فرشِ گل پہ نہیں پتھر پہ گراؤ مجھ کو
قتل گاہوں کی مجھے راہ دکھانے والو
پہلے الزام ہے کیا یہ تو بتاؤ مجھ کو
تم سمجھتے ہیں کہ رسوا نہ سرِ محفل ہوں
درد مچلا ہے کہ پلکوں پہ سجاؤ مجھ کو
آج ہر سر پہ لٹکتی ہوئی تلواریں ہیں
زندگی چیخ رہی ہے کہ بچاؤ مجھ کو
جو دکھاتے ہیں علی سب کو نشانِ منزل
میں وہی نقشِ قدم ہوں نہ مٹاؤ مجھ کو

وہاب عندلیب

فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں دکنی ادب

اُردو زبان کی ابتدا ملک کے کس خطے میں اور کب ہوئی تاحال محققین میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریات کارفرما ہیں۔ کسی کی نظر میں وہ مغلیہ دَور کی پیداوار ہے تو کوئی اس کا رشتہ محمود غزنوی کی فتوحاتِ ہند سے جوڑتا ہے تو کوئی اور پیچھے ہٹ کر اسے محمد ابن قاسم کی فتح سندھ سے منسوب کرتا ہے۔ اسی طرح کسی نے دلّی کو اس کا مولد ٹھہرایا تو کسی نے پنجاب سے اس کا خمیر اُٹھایا تو ایک اور گروہ کے خیال میں اُردو کو دکن اور گجرات سے نسبت ہے۔
جہاں یہ صحیح ہے کہ اُردو زبان کی ابتدا شمالی ہند میں ہوئی وہاں یہ بھی صحیح ہے کہ اُردو ادب کا آغاز دکن میں ہوا کیونکہ شمالی ہندوستان کے اہلِ قلم ایک عرصہ تک فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے رہے جبکہ دکن میں اُردو تصنیف و تالیف کا کام شمالی ہندوستان کے مقابلے میں کئی سو برس پہلے شروع ہوا اس طرح دکنی یا اُردو کا آغاز شاہ جہاں کے دَور کی یادگار نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اُردو نثر و نظم کی ابتدا کا سہرا دکن ہی کے سر ہے چنانچہ شمال کا شاعر قائم چاندپوری کہتا ہے ؎

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ — اک بات لچر سی بہ زبان دکنی تھی

میر صاحب بھی فرماتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے — معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو ادب کی ابتدا و فروغ میں شمال کے مقابلے میں دکن کو اوّلیت حاصل رہی —
علاء الدین خلجی نے تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں دکن پر حملہ کیا۔ ملک کافور کی قیادت میں اس کی افواج نے راس کماری تک سلطنت کو وسیع کر دیا۔ اس طرح دکن میں اُردو کی ابتدائی صورت کو رواج دینے کا کام علاء الدین خلجی کی افواج نے انجام دیا۔
جب محمد بن تغلق برسرِ اقتدار آیا تو اس نے ۱۳۲۶ء میں دہلی کے بجائے دولت آباد کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ اس کے ہمراہ صرف فوج ہی نہیں بلکہ اہلِ علم و کمال، صنّاع، تاجر اور دہلی کی کثیر آبادی دکن آ گئی۔ پائیہ تخت کی دوبارہ منتقلی کے بعد بہتوں کو دہلی واپس ہونا پڑا لیکن اکثر خاندان یہیں کے ہو رہے ان کی زبان اُردو تھی جس نے دکن میں دکنی اور ہندوی کا نام پایا۔ اس واقعہ کے ۲۱ برس بعد محمد تغلق کے ایک افسر ظفر خان نے اس کے دائرہ اطاعت سے آزادی کا اعلان کیا اور سکندر ثانی علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کر کے ۱۳۴۷ء میں گلبرگہ میں بہمنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور شہر کا نام حسن آباد رکھا ؎

ہمیں شہر گلبرگہ شد تخت گاہ — عمارت بہ آورد برآوج ماہ
بنام حسن شہر شد چوں تمام — نہادند زاں حسن آباد نام

دکن کا یہ نیا بادشاہ اور اس کی رعایا دہلی کے اثر سے آزاد رہنا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنی خاص طرزِ زندگی اور

اندازِ فکر کے مطابق زندگی گزاریں۔ چنانچہ انھوں نے فارسی کی بجائے اُردو میں دلچسپی لی۔ اس اردو پر گجراتی اور مرہٹی کا اثر نمایاں تھا اس لیے وہ دکنی اور گجراتی کہلانے لگی۔ اسی بادشاہ نے سب سے پہلے اس زبان کو سلطنت کے دفتری کاروبار کے لیے منتخب کیا۔ اس سلطنت کی سرحدیں شمال میں تاپتی، جنوب میں تنگبھدرا اور کرشنا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سلطنتِ بہمنیہ ۱۸۰ سال تک برقرار رہی۔ شاہانِ بہمنیہ کی بے تعصبی، رواداری، وسیع القلبی اور فراخ دلی کے واقعات سے تاریخِ دکن کے صفحات بھرے ہیں۔ ان کا طریقہ کار صلح کل تھا۔ انصاف کے مقابلہ میں انھوں نے کسی کے ساتھ جانبداری نہیں برتی۔ سلطان علاء الدین نے اپنے گرو گنگو کو وزیرِ مال مقرر کیا۔ گنگو پہلا برہمن ہے جس نے ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت اختیار کی۔ گنگو کے زمانے سے یہ رسم چل پڑی کہ وزارتِ مال، تمام فرمانروایانِ دکن کی مملکت میں برہمنوں کو تفویض ہوتی رہی۔ اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ارتباط بڑھتا گیا اور اس باہمی میل جول سے زبانِ اُردو کو بھی فیض پہنچا۔ علم دوستی اور علم پروری کے لحاظ سے بھی یہ دَور یادگار سمجھا جاتا ہے۔ اس دَور کے نامور علماء، فضلا اور شعراء میں میر فضل اللہ انجو، شیخ آذری، نظیری، محمود گاواں، اشتاق، لطیفی، نظامی، محمود، فیروز اور اشرف ہیں۔ خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی نے بھی گلبرگہ آنے کی دعوت قبول کی تھی مگر کسی وجہ سے نہ آسکے۔

سلطان تاج الدین فیروز شاہ اسی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا جو نومبر ۱۳۹۷ء میں بادشاہ بنا۔ اس نے ۲۵ سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں بہمنی سلطنت کو بہت فروغ حاصل ہوا اور شہر گلبرگہ کے علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ بن گیا۔ اس نے گلبرگہ کو تعلیم و تدریس کا مرکز بنانے کے لیے نامور علماء، صوفیا اور شعرا کو دکن آنے کی دعوت دی جن میں مولانا لطف شیرازی، حاکم حسن گیلانی، اور سید محمد گزدانی قابل ذکر ہیں۔ فیروز خود بھی بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں علماء، شعرا، ادباء، فضلاء، صوفیا، مشائخین اور مورخین جمع تھے۔ حاجی محمد قندھاری لکھتے ہیں کہ "فیروز شاہ اپنا وقت اہل کمال اور خوش طبع لوگوں کے ساتھ گزارتا تھا اس کا قول تھا کہ "ہر ملک کا بہترین تحفہ اس ملک کے صاحب کمال ہیں۔" یہی وجہ ہے کہ اس کا دربار باکمالوں سے بھرا ہوا تھا۔ میر فضل اللہ انجو جیسا عالم اس کے عہد میں گلبرگہ کا صوبہ دار تھا۔ اس نے مولانا لطف اللہ شیرازی کو نائب وکیل سلطنت مقرر کیا تھا۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ علم و دانش میں فیروز شاہ کا پایہ محمد تغلق سے زیادہ بلند تھا اسے قرآن، فقہ، تفسیر، کلام اور تصوف میں مہارت تھی۔ وہ ماہر لسانیات اور خوش نویس بھی تھا۔ بہت ساری زبانیں جانتا تھا۔ فارسی، عربی، ترکی، کنڑی، مرہٹی، تلنگی، گجراتی اور بنگالی زبانوں پر عبور تھا۔ اس لئے وہ ہر ایک سے ان کی اپنی زبان میں گفتگو کرتا۔ فیروز شاہ نے انتہائی رواداری کے ساتھ حکومت کی۔ وہ دوسرے مذاہب کو بھی قدر کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس نے غیر مسلموں کو اپنی حکومت میں ذمہ دارانہ عہدے دیئے۔ اس کی بیگمات بھی مختلف اقوام سے تعلق رکھتی تھیں جن کی زبانیں بھی الگ الگ تھیں جن سے بادشاہ بخوبی واقف تھا۔ وجیا نگر کی شہزادی سے بھی اس نے بیاہ رچایا تھا۔ مدگل کے سنار کی لڑکی پرتھال جو ایک خوش جمال رقاصہ تھی فیروز کے بیٹے حسن خاں سے بیاہی گئی تھی۔ شاہی خاندان کے مختلف اقوام سے قریبی تعلقات سے بھی اس نئی زبان دکنی کو فروغ حاصل ہوا۔ وہ نہ صرف عام بول چال کی زبان بن گئی بلکہ دھیرے دھیرے اس زبان میں رسالے لکھے جانے لگے۔ اکثر صوفی بزرگوں نے اس زبان میں تبلیغ و تلقین کا کام کیا اور اپنے ارادت مندوں کے لئے کئی رسائل اور کتب تصنیف کیں۔ دکن کے یہ بندگانِ دین ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبان میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ یہی زبان جو دکنی کے نام سے مشہور تھی ترقی کرکے ادبی زبان بننے کے قابل ہوگئی۔

صوفیائے کرام کا یہ شعار رہا ہے کہ عوام سے ربط پیدا کرنے کے لئے عوامی بولیوں اور ان کی زبانوں کو منتخب فرماتے حضرت بابا فرید شکر گنجؒ نے رعیت کی زبان پنجابی کو اپنایا تو حضرت محبوب الٰہیؒ نے ہندوی کی بنیاد رکھی۔ اسی طرح دکنی اُردو حضرت بندہ نوازؒ کی دکنی [illegible] حضرت سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سلطان فیروز شاہ بہمنی کی دعوت پر ۸۰۱ھ میں گلبرگہ تشریف لائے۔ ابھی آپ شہر گلبرگہ سے چند میل پر تھے کہ فیروز شاہ نے اپنی ساری فوج، علماء و امرا کے ساتھ آپ کا استقبال کیا۔ صوفیائے چشت میں آپ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے شخصی طور پر رشد و ہدایت کے سوا قلم کے ذریعہ حق جوئی اور حق کا شعی کا راستہ دکھایا۔ آپ کے عہد میں دکنی زبان کی حیثیت ایک بولی سے بڑھ کر نہ تھی۔ حضرت بندہ نوازؒ نے اپنے ایمان سے اس بولی کو علمی و ادبی زبان بنا دیا گویا بندگیٔ مخدوم نے ترسیل و ابلاغ کے لئے فارسی پر دکنی اُردو کو ترجیح دی۔ ان کی پیروی میں اس خانوادہ و سلسلہ کے صوفیاء حضرت سید محمد اکبر حسینیؒ، حضرت سید عبداللہ حسینیؒ، حضرت میراں جی شمس العشاقؒ، حضرت برہان الدین جانمؒ، حضرت امین الدین اعلیٰؒ، حضرت میراں جی خدا نماؒ، حضرت ہاشم حسینی خدا بندہ بادیؒ وغیرہ نے دکنی ادب میں تصنیف و تالیف کے سلسلے کو جاری رکھا۔ چنانچہ اس سلسلہ کی آخری کڑی حضرت ٹیپو سلطان شہیدؒ کے مرشد حضرت شاہ صدرالدین اور ان کے خلیفہ حضرت عارف شاہ قادریؒ ہیں۔ دکنی کے ذریعہ تصوف اور عرفان کے موضوع پر قلم اٹھانے والے یہی دو آخری صوفی ہیں۔

حضرت بندہ نوازؒ نے اصلاح معاشرہ کے لئے رسالوں کے علاوہ لوریوں اور چکی ناموں کی صورت میں بھی تصوف کے مسائل پیش کئے۔ یہ لوریاں اور چکی نامے آج بھی ہمارا قیمتی تہذیبی اثاثہ ہیں جو نہ صرف سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے رہے ہیں بلکہ چکی کے یہ گیت آج بھی دکنی خواتین کو ازبر ہیں۔ دکنی کلام کے علاوہ بندگیٔ مخدوم نے کئی مختصر نثری رسالے بھی لکھے۔ پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم نے حضرت بندہ نوازؒ سے منسوب دکنی رسائل کی تعداد ۲۱ بتائی ہے جن میں معراج العاشقین، شکار نامہ، تلاوت الوجود، دُرّ الاسرار، ہشت مسائل، تمثیل نامہ، رسالہ سہ بارہ، ہدایت نامہ، خلاصۃ التوحید اور معراج نامہ قابل ذکر ہیں۔ محققین نے آپ کی تصنیف "معراج العاشقین" کو اُردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے حال میں ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی تصنیف "معراج العاشقین کا مصنف" کے ذریعہ یہ سوال اٹھایا ہے کہ "معراج العاشقین" کا مصنف کون ہے؟ ڈاکٹر صاحب "معراج العاشقین" کو بارھویں صدی کے عہد کے ایک بزرگ مخدوم شاہ حسینی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ فی الحال اس تحقیق کو قطعیت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ تلاش و فکر اور تحقیق و تجسس کے دروازے ہنوز وا ہیں۔ اگر بندگی مخدوم کی کسی ایک کتاب کو اولین اردو رسائل کی فہرست سے خارج بھی کر دیا جائے تو ان کے پہلے نثر نگار ہونے میں کوئی کلام نہیں کیونکہ اس کے بعد بھی ۲۰ اُردو رسائل اُن سے منسوب رہیں گے۔ معراج العاشقین کو سب سے پہلے آج سے کم و بیش ۴۰ سال قبل بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مرتب کر کے اپنے مقدمے اور فرہنگ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ جب یہ کتاب نایاب ہو گئی تو دہلی کے محقق اور ادیب پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اور ان کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے دوبارہ شائع کرایا۔

"شکار نامہ" کو پہلی بار مرتب کر کے شائع کرنے کا اعزاز پروفیسر سید مبارز الدین رفعت مرحوم کو حاصل ہے۔ "تلاوت الوجود" کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ اور سالار جنگ لائبریری میں محفوظ ہے۔ "دُرّ الاسرار" کا ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو اور کتب خانہ آصفیہ میں ملتا ہے۔ رسالہ تلاوت الوجود "بڑی حد تک طالب و مرشد کے مکالمے پر مشتمل ہے جس میں

مرشد نے طالب کی تشنگی کو سیراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ "تحفۃ الاسرار" میں صوفیانہ مسائل معرض بحث میں آگئے ہیں جبکہ "شکار نامہ" میں عرفان اور وحدانیت کے اسرار اور رموز ملتے ہیں۔ حضرت بندہ نوازؒ کے فرزند اکبر سید محمد اکبر حسینیؒ بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ آپ سے بھی ایک دکنی رسالہ منسوب ہے۔ حضرت عبداللہ حسینیؒ نے (جو حضرت بندہ نوازؒ کے پوتے ہیں) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے عربی رسالے "نشاط العشق" کا ترجمہ کر کے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ حضرت بندہ نوازؒ کے ایک مرید اور شاگرد نے اپنے مرشد کے ملفوظات کی ایک شرح مشرح "ہفت اسرار" کے نام سے قلمبند کی ہے اسی زمانہ میں اشرف نے ایک طویل مثنوی "نوسرہار" تحریر کی جس میں شہدائے کربلا کا تذکرہ ہے۔ حضرت بندگی مخدوم کے خلفا اور مریدوں میں بیجاپور کے صوفیائے کرام حضرت میراں جی شمس العشاق، حضرت برہان الدین جانمؒ، حضرت امین الدین اعلیٰ نے بھی اردو نثر و نظم میں تصوف اور عرفان کے موضوع پر کئی رسالے تصنیف فرمائے۔ اس طرح اردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جو فیروز شاہ بہمنی کے عہد میں شروع ہوا تھا آخر تک جاری رہا۔ اس لئے فیروز شاہ بہمنی کے دور کو ہم تاریخ کا سنہرا دور کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ دور انتظام سلطنت کے علاوہ علمی و تمدنی ترقی کے اعتبار سے بھی تاریخ میں امتیاز رکھتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دکنی اردو کی ابتدا، ترقی و ترویج کے لئے اس عہد کی خدمات ناقابل فراموش ہیں ——

فیروز شاہ اپنی علمی و عملی قابلیت میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اس کی علمی قابلیت تو سب سے بڑھی ہوئی تھی۔ میر فضل اللہ کی شاگردی میں اس نے اس زمانے کے تمام متداول علوم سیکھے تھے۔ کوئی ایسا علم نہیں تھا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ علوم کے علاوہ وہ دنیا کی اکثر زبانیں عربی۔ فارسی۔ ترکی اور ہندوستان اور دکن کی اکثر زبانیں بولتا تھا۔ یہاں تک کہ لاطینی سے بھی واقف تھا۔ اگر تاریخ کا بیان صحیح سمجھا جائے تو انجیل۔ توریت اور ویدوں پر اس نے حاشئے چڑھائے تھے اور ان کتابوں کے علماء سے بحث کرتا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں صرف دو ہی بادشاہ ایسے گذرے ہیں جو تخت و تاج کے ساتھ عالم متبحر کہے جا سکتے ہیں، ایک سلطان محمد تغلق اور دوسرے فیروز شاہ بہمنی۔ لیکن بقول "فرشتہ" فیروز شاہ کی علمیت تو محمد تغلق سے کہیں زیادہ تھی۔

"از قیاس صاف مفہوم میگردد کہ دانش وے زیادہ از دانش بادشاہ محمد تغلق بود"

یوں تو فیروز شاہ کی علمیت کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، لیکن فرشتے کی وضاحت سے فائدہ اٹھایا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تفسیر کا عالم تھا، فقہ پر پوری دستگاہ رکھتا تھا، طبعی و اخلاقی فنون جانتا تھا، ہندسہ و ریاضی میں متبحر تھا۔ ریاضی سے تو اس کو بے حد دلچسپی تھی، گویا اس کا دماغ اس کے الفاظ میں "آسمانِ فرہنگ" تھا۔

دماغِ طبع مروجی چہ دلکشا چمن است　　چمن مگوئے کہ ایں آسمانِ فرہنگ است

(پروفیسر مجید صدیقی)

سیدہ عزت النساء

محمد قلی بحیثیت مرثیہ نگار

اُردو مرثیہ کی ابتدار دکن سے ہوئی ہے۔ چونکہ دکن پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں شمالی ہند کے حملوں سے محفوظ رہا اس لئے اسے سیاسی یکسوئی حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ثقافتی کاموں کی طرف توجہ دینے کا موقع مل سکا ہم دیکھتے ہیں کہ دکنی کو جو اُردو کی ابتدائی شکل ہے قبول عام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اسے دربار میں جگہ ملی اور درباری شاعری نے دکنی طرز کی خلعت سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ اس طرح دکنی زبان بادشاہوں اور امیروں کا دل موہ لی۔ لیکن اس کے باوجود اس نے عوام سے اپنا منہ موڑا۔ بلکہ ان کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتی رہی اور ان کے دکھ سکھ میں ہمیشہ شریک رہا۔ عوامی زندگی میں جذبۂ عقیدت کی تسکین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان کے ابتدائی عہد میں اس سرمایہ کی خاص فراوانی ہے۔ دکنی زبان بھی مختلف اصناف کے علاوہ مرثیہ سے بھی مالا مال ہے۔

اب تک جو قدیم مرثیہ دستیاب ہوسکا ہے وہ محمد قلی قطب شاہ کا ہے جو سولھویں صدی عیسوی میں لکھا گیا۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ محمد قلی قطب شاہ سے قبل کسی شاعر نے مرثیہ نہیں کہا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ اس سے قبل بھی ضرور مرثیے کہے گئے ہونگے اور اس قیاس کو تقویت اس حقیقت سے ملتی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے اشرف نے ایک طویل نظم "دہ مجلس" کے انداز میں لکھی تھی۔ جس کا نام "نوسرہار" ہے۔ اس کا موضوع واقعہ کربلا ہے اور اس میں امام حسینؑ علیہ السلام کے مصائب کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں ایک بنیادی اختلاف یہ ہے کہ واقعہ کربلا جو حق و باطل کی آویزش ہے اس نظم میں بالکل دوسرے انداز میں پیش ہوا ہے اور مرثیہ کے موضوع کو بھی پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ اگر محمد قلی قطب شاہ بھی پہلا مرثیہ گو شاعر ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کے سامنے آذری اور روضۃ الشہدا کے فارسی مرثیے ہونگے، جو نمونے کا کام دیتے ہوں ڈاکٹر محمد چراغ علی رقمطراز ہیں۔۔۔۔

> "محمد قلی قطب شاہ کے مرثیوں کے فنی خط وخال کو دیکھتے ہوئے قیاس ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اُردو کا پہلا مرثیہ گو شاعر نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے ضرور مرثیے کہے ہوں گے، اور یہ نمونے اس کے سامنے ہوں گے، ممکن ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے اس صنف کو فنی اعتبار سے کمال کو پہنچایا ہو۔ اگر محمد قلی قطب ہی پہلا مرثیہ گو شاعر ہے تو اس کو اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعجاز سمجھنا چاہئے کہ اُس نے اس صنف کو اردو میں روشناس بھی کیا اور اس بلندی پر پہنچایا کہ اس کے بعد صدی ڈیڑھ صدی میں بہت کم شاعر ایسے پیدا ہوئے جو اس صنف خاص میں اس پہ سبقت لے گئے ہوں۔"

"محمد قلی قطب شاہ نے مرثیوں کے علاوہ غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی اور ترجیع بند وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ لیکن اس سے بحث نہیں صرف اس بات کو پیش نظر رکھنا ہے کہ جہاں اس کی اصناف اسے ایک عیاش بادشاہ ظاہر کرتی ہیں وہیں اس کے مرثیے امام حسینؑ علیہ السلام سے حسن عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ گویا اس کی طبیعت کے دو پہلو ہے۔ جو بظاہر ہر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں مختلف مورخین کے مطابق اس کے دربار میں سینکڑوں حسینائیں تھیں۔ وہ سال کے دس مہینے ہنستی زلفوں اور دلکش باہوں میں گزارتا اور خوب عیش کرتا لیکن یہی شاعر رمضان اور محرم میں ان چیزوں سے یکسر کنارہ کشی اختیار کرلیتا۔ محرم میں ہر روز عاشورخانہ جاتا اور مجلس عزاداری میں شریک ہو جاتا جس سے اس کے حسن عقیدت اور نیک طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔

"چونکہ محمد قلی قطب شاہ کو حضرت امام حسین علیہ السلام سے بڑی عقیدت تھی اس لئے وہ ہر سال محرم میں متعدد مرثیے لکھا کرتا تھا۔ جو مختلف موقعوں پر پڑھے جاتے افسوس بلکہ صد افسوس کہ اس کے صرف پانچ مرثیے کلیات میں شامل ہوسکے۔ جن میں دو مکمل اور تین نامکمل حالت میں ہیں۔ ڈاکٹر زور کے خیال میں محمد قلی قطب شاہ کا شعری سرمایہ اس کے کلیات میں شامل سرمایہ سے کئی گنی زیادہ ہوگا۔ چونکہ اس کا کلام کافی مقبول ہوگیا تھا اس کی حفاظت کی ضرورت محسوس نہ کی گئی ہو اور جو کلام ضبط تحریر میں آگیا تھا وہی محفوظ کرلیا گیا ہو۔

محمد قلی قطب شاہ کے مراثی کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے مراثی بھی اس کی دیگر اصناف کی طرح اس کے حقیقی جذبات کے آئینہ دار ہیں اور اس نے اس وقت اردو جیسی کم عمر زبان میں اپنے خیالات اور تاثرات کو نہایت حسین پیرایہ میں نظم کیا ہے۔ مسیح الزماں کا خیال ہے کہ اگر ان مراثی کا آذری اور روضۃ الشہدا کے مراثی سے مقابلہ کیا جائے تو محمد قلی قطب شاہ کی مراثی کسی طرح کمتر درجہ کے کہلانے کے مستحق نہیں۔ عہد قطب شاہ میں مرثیہ گوئی کا مقصد رنج و ملال کا اظہار تھا۔ سانحہ کربلا سے آنحضرت صلعم، حضرت بی بی فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کو متاثر دکھانا، اس واقعہ کی طرف اشارہ کردینا اور اس سانحۂ عظیم کو سوچ کر قلب پر مرتسم ہونے والے احساسات کو پیش کردینا مرثیے کے موضوع تھے۔ چنانچہ محمد قلی قطب نے اُن ہی جذبات کے اظہار میں اپنا زور طبیعت دکھایا ہے، جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے۔

درجگ اماماں دکھ تھے سب جیو کرتے زاری وائے وائے
تن روں کی کڑیاں جال کر کرتے ہیں خواری وائے وائے
شاتو گگن آٹھو جنت ساتو دریا ساتو دھرت
ایکس تے ایک آپس میں اب دکھ کرتے کاری وائے وائے
کالا کیا کسوت مکا دیکھو اماماں دو دکھ لگے!!
ظلمات بی کالا ہوا اس دکھ تے بھاری وائے وائے

کربلا کے اس قیامت خیز حادثہ سے ساری کائنات سوگوار ہے۔ زمین، آسمان، سورج، سمندر، پرندے سب مصروف نوحہ ہیں اس کا نقشہ محمد قلی نے کچھ اس طرح کھینچا ہے۔

آہ بھارے درد تے دریا کوں سب جوش آوتا ۔۔۔ ماہیاں لکے لہر بنداں تے الگ سب بچ جاوتا
فاطمہ دکھ تے عرش کرسی تھے فرآ بجھو مٹے ۔۔۔ ساتوں آسماں ہوا زمیں میں آگ کی بھڑکیاں تے
پھولوں سکے سب دکھ سستی کہ ہوئے بلبل جگہ سستی ۔۔۔ کوئل جمناں دکھ بن تن پکاری وائے وائے "

مندرجہ ذیل شعر سے اس فن کی خدمت کا اندازہ ہوتا ہے

سب دکھاں کوں انت ہے اس دکھ کے تائیں انت نیئں ٭ ظالماں کے پوت بن اس جگ نیئں نیئں لوڑ کیئں

محمد قلی قطب شاہ کے مراثی میں امام حسین علیہ السلام سے حسن عقیدت کے علاوہ مضمون آفرینی، نزاکت بیان، ندرت خیال، حسن کلام اور محاکات بھی ملتے ہیں اس نے فارسی ترکیبوں کو دکنی میں ڈھالا ہے۔ یہ تمام خصوصیتیں اسے اپنے عہد کے دوسرے مرثیہ گو شعراء میں اعلیٰ مقام عطا کرتی ہیں۔ اس کے کلام میں روانی بھی خوب ہے۔ محمد قلی کے عہد کے بعد کے شعراء نے بھی اس صنف میں اپنے تخیل کی جولانیاں دکھانے کی کوششیں کیں ہیں۔ لیکن محمد قلی قطب شاہ ان سے کسی طرح کمتر نہیں۔ اس نے بھی اس صنف میں اپنا زور تخیل دکھایا ہے۔ اس کے کمال فن سے صرف نصرتی اور غواصی جیسے چند شعراء بچ نکل سکتے ہیں۔ چونکہ محمد قلی قطب شاہ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ مرثیہ گوئی اس کے مذہب و مشرب کا تقاضہ ہے۔ چنانچہ رقمطراز ہے ؎

خدایا قطب شاہ کوں بخش توں حرمت اماماں کا کہ ان کی مدح کا حلقہ مرے کن میں سمایا ہے

دکن کے مرثیہ گو شعراء کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مراثی میں حسن تعلیل کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ بعض شعراء نے تو اسی صنعت سے اپنے مرثیوں کو مرصع کیا ہے۔ اس کا پہلا نمونہ ہمیں محمد قلی قطب شاہ کے یہاں ملتا ہے۔ دو شعر پیش خدمت ہیں ؎

لوح ہور قلم، کرسی، عرش، قدسیاں، فلک، غلماں سب

جھلیاں بیدل اذ جلتے ہیں رات ساری وائے وائے

آسماں نچ جالا ہوا سورج اگن والا ہوا

چندر سورج کا لا جلا ہے دکھ اپاری وائے وائے

مندرجہ ذیل اشعار میں محمد قلی قطب شاہ نے امام حسین علیہ السلام کی مظلومیت اور شہادت، امام حسن علیہ السلام کو زہر دینے کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان روایات کو منظوم کرنے کی بھی پہلی مثال ہمیں محمد قلی کے یہاں ہی ملتی ہے۔

دو نور دیدے بی بی کے آ کر دیکھو کیوں دکھ دکھے! ٭ لہو میں لوٹے پیاسے بھکے دیکھو یہ خواری وائے وائے

یک پوت کو دیتے زہر یک پوت پر کھینچے خنجر! ٭ کافر کئے کیسے قہر یو زخم کاری وائے وائے

محمد قلی قطب شاہ نے دیگر اصناف کے برخلاف مرثیہ میں سادگی اور بے ساختگی اختیار کی ہے۔ دوسری اصناف میں اس کی زبان ثقیل ہے، غواصی اور وجہی کی زبان سے بھی نسبتاً مشکل نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ غزل جیسی نرم و نازک صنف میں بھی اس نے سنسکرت اور پراکرت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مرثیہ میں اس نے اس صنف کے مزاج اور مقصد کے پیش نظر ایسی سادہ اور سلیس زبان استعمال کی ہے کہ ڈاکٹر محمد چراغ علی کے کہنے کے مطابق یہ مراثی گیارھویں صدی ہجری کے اواخر کے کسی شاعر کے مراثی معلوم ہوتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیے ؎ دو جگ خراباں ہو رہے بھوکاں کہاں ہو رہے ٭ تخت در مراباں ہو رہے نا ہوے جاری وائے وائے

آ دل کو تجیا ں سب اس غم تے لہو روویں ٭ وا اماماں ! یا اماماں ! یاد کر کر دل کھوویں

خدایا داد لے ہور داد دے اس ظالماں کن تے

کہ جن نیں سو تیاں پر جفا ہور ظلم ڈھایا ہے۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زور محمد قلی کے اسلوب بیان کی سادگی کے تعلق سے تحریر فرماتے ہیں۔

"محمد قلی کی شاعری کا اسلوب بیان نہایت سادہ ہے، زبان کی ارتقائی حالت کو دیکھ کر
یقین نہیں آتا یہ دکنی شاعروں کی اولین پیداوار سے ہوگی۔ اس کی قادر الکلامی کا ثبوت
اس امر سے ملتا ہے کہ اس نے ان خیالات کو نہایت روانی اور خوبی کے ساتھ دکنی
میں ادا کیا ہے جو فارسی میں اس وقت پیش کئے گئے تھے، جب کہ اس کا خاصہ
لسانی ارتقاء ہو چکا تھا۔"

محمد قلی قطب شاہ کے مراثی کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے یہاں دوسرے مرثیہ گو شعراء سے ہٹ کر یزیدوں کے علاوہ خلفائے شیخین کی بھی مذمت ملتی ہے۔ بعد کے مرثیہ گو شعراء کے یہاں خلفاء کی مذمت نہیں ——

یزیداں کا سو قصہ ظلم کا کوئی نا سکے کہتے شعر کہ جانو ہیں تھے شیطان ان کنے تعلیم پایا ہے۔
یزید و شمر کے کاملاں ذکر سیں کوئی شیطان بھی شعر ہزاروں لعن ہے اس پر جن ایسا پوت جایا ہے

غرض محمد قلی قطب شاہ نے مرثیہ گوئی کو جو ابھی پالنے ہی کی منزل میں تھی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں اور فن کی طاقت سے گھٹنوں چلا دیا۔ اس کے مرثیے فن اور فکر کے اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو نقوش محمد قلی نے اپنے مراثی میں چھوڑے تھے اس پر فنی اور موضوع کے اعتبار سے سنہ [illegible] تک بہت کم اضافہ ہوا ہے۔ محمد قلی کی مرثیہ گوئی کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد چراغ علی کہتے ہیں۔

"جوش عقیدت، تلخئ احساس، خلوص اظہار، سادگی بے ساختگی اور والہانہ پن
مراثی کی وہ خصوصیات ہیں جو اس کو تاریخ ادب میں مرثیہ نگار کی حیثیت
سے بھی اونچا مقام دیتی ہیں ——"

بادۂ کہن

ملک الشعراء غواصی

دستا نہیں کروں کیا وہ بیہان کربلا کا
پھرتا ہوں زار ہوں میں حیران کربلا کا
اسمان تے خدایا جبرئیل اتر کو آیا
روتا اوپر تے لایا فرمان کربلا کا
دکھ سر ملک نئے ہیں ماتم زدے ہوئے ہیں
رو رو دریا کتے ہیں آسمان کالا کا
چندا نہ سکھ سوں سوتا، اس دکھ سوں عمر کھوتا
تاریاں سوں روز روتا فرمان کربلا کا

منج سکھ نہیں ہے دکھ میں ہوں میں نڈھال چھن چھن — لا گیا ہے رات ہور دن منجہ دھیان کربلا کا
غواصیا معطر عالم کوں سب کیا ہے — گویا یو مرثیہ ہے ریحان کربلا کا

خیرات ندیم

فسونِ دیر و حرم کی ہر ایک زد سے نکل
جنوں سے ہاتھ ملا، سازشِ خرد سے نکل
وہ دیکھ دامنِ آفاق کس قدر ہے حسیں
تلاشِ ذات بہت ہو چکی جسد سے نکل
کشاکشِ غمِ دوراں کا توڑ کر حلقہ
خود اپنے عزم و عمل کی جوان مد سے نکل
یہ سچ ہے تیز ہے سنگِ جفا کی بارش بھی
اداسیاں تجھے کھا جائیں گی تو کد سے نکل
حیات ایک مسلسل سفر ہے غور نہ کر
قیودِ ذات سے باہر سواد حد سے نکل
کمالِ علم و ادب ہے غرورِ جہل کے ساتھ
جو ہو سکے تو کبھی آتشِ حسد سے نکل
نگاہ و فکر کو تخلیق کی حرارت دے
روایتوں کی اب اس بارگاہِ بد سے نکل
لکیر کھینچ کے کچھ لوگ مطمئن ہیں ندیم
فریبِ قد میں نہ جا تو فریبِ قد سے نکل

تاج مہجور

آنچلوں کی چھاؤں ہی کافی نہیں
زندگی ہو تم مگر تم ہی نہیں
بات کر سکتے ہو ہر موضوع پر
لاجونتی چھوئی ہے لڑکی نہیں
چومی ہے نظروں سے اس کی دلکشی
انگلیوں کی آنکھ سے دیکھی نہیں
بوتل اتنے ہی میں خالی ہو گئی
خالی پن کی بات ابھی کی بھی نہیں
پھر رہے ہیں شہر کے جنگل میں دیو
بو کے آدم زاد بھی آتی نہیں

نصیر احمد گلبرگوی

سلگتی دھوپ کا چہرہ نڈھال ہے کتنا
مرے وجود کا اس کو خیال ہے کتنا
میں ریت بن کے بکھرنے لگا ہوں ہر لمحہ
مرے نصیب میں آخر زوال ہے کتنا
زمین جیسے اترنے لگی ہے خاک دان میں
یہ دیکھنا ہے فلک پائمال ہے کتنا
درخت چیخ رہا ہے مجھے بھی دکھلاؤ
نئی رتوں کا بدن بے مثال ہے کتنا
ذرا تھمے جو یہ طوفاں تو دیکھ لیں گے نصیر
سمندروں میں ابھی اشتعال ہے کتنا

سے ہے میرا مطلب آپ نہیں سمجھے تو جانے دیجئے کہانی سنئے' اس کہانی کے ہیرو بھی اندر سبھا کے سیکڑوں گمناموں میں سے ایک تھے۔ اس زمانے میں حکومت وغیرہ کا رواج کم تھا۔ اس کے بجائے یہ ہوتا تھا کہ جاڑا یا فصل میں جس رئیس نے چاہا تماشہ کروالیا اور دیکھنے والے بے روک ٹوک کے جمع ہوگئے، جب کہیں سے بلاوا نہ آئی تو مشق کرنے کے لئے یا دل کے تقاضے سے یہ لوگ خود ہی تماشہ کرتے رہتے اور ارد گرد کے عورت مرد مفت تماشہ دیکھا کرتے میک اپ کرنے کے آج والے طریقے کہاں تھے کہ ایکٹر دانت تڑوا ڈالیں اور مختلف ساخت کے چہرے بنوالیں جس سے صورت بدل جایا کرے اس زمانے میں روپ تو ضرور بھرتے تھے مگر قدرتی صورت کی محتاجی آج سے زیادہ تھی۔ اس وجہ سے گمنام ایسا آدمی تجویز کیا جاتا تھا جو اسٹیج کے باہر بھی گمنام ہی نظر پڑے۔ ہماری کہانی کے ہیرو مدے خاں چھوٹی حیثیت کے صرف اتنا پڑھے تھے کہ اندر سبھا پڑھ کر یاد کرلیں۔ جاہل ہوں، کم حیثیت ہوں مگر حکومت کرنے کا کمال خدا کے یہاں سے لائے تھے۔ گاؤں میں اگر کہیں چوری ہوجاتی ہے اور پولیس تحقیقات کرنے آتی ہے یا کوئی حاکم دورے پر آتا ہے تو بعد کو لڑکے ان واقعات کی نقل کیا کرتے ہیں۔ ایک لڑکا ہوتا ہے جو بلا اختلاف رائے تھانیدار تجویز کیا جاتا ہے اور اسی طرح ایک ہوتا ہے۔ جو چودھری یا حاکم کا پارٹ لیتا ہے۔ مدے خاں بھی اسی طرح کے تھے کہ اپنے ہم چشموں میں صرف ممتاز ہی نہیں تھے بلکہ ہر کام میں سب کی نظر انہی پر پڑتی تھی۔ اور لوگ بے ارادہ ان کا حکم مان لیتے تھے۔ اندر سبھا کا خیال بھی سب سے پہلے انہی کو آیا تھا اور انہی نے دوسرے ایکٹروں کو بھی بھرتی کیا تھا۔ ہفتے میں ایک رات کو تماشہ ضروری ہوتا تھا اور جب سہالگ یعنی بیاہ شادی کا زمانہ ہوتا تھا یا جب کوئی نیا ایکٹر بھرتی کیا جاتا تھا۔ تو ہفتے میں دو تین راتیں تماشہ کے لئے الگ کردی جاتی تھیں۔

گاؤں بھر کی عورتیں، بچے اور نوجوان لوگ جمع ہوجاتے تھے جوان عورتوں میں تو دن کو بھی اسی کا چرچا اکثر رہتا تھا۔ اس کے گانے گائے جاتے تھے اور باتیں کرتے میں اندر سبھا کا تلازمہ آجاتا تھا۔ ایک روز اندر سبھا والے جمع تھے شاید کہیں باہر سے بلاوا آیا تھا یا مشق کرنے کا ارادہ تھا کہ گاؤں میں ایک طرف آگ لگ گئی تھی دھواں اٹھا ہی تھا کہ گاؤں بھر جمع ہوگیا۔ رسی ڈول گھڑے، سیڑھیاں لمبی لمبی لاٹھیاں جیسے یکبارگی زمین سے نکل پڑیں، شور کرنے والوں نے آسمان سر پر اٹھالیا لوگ ایک طرف بجھاتے تھے کہ آگ دوسری طرف زبان درازیاں کرنے لگتی تھی۔

اتنے میں ایک کچی ہوئی چھت پر ایک عورت کی چیخ کی آواز آئی گھر کے اندر تو آگ لگی ہی ہوئی تھی وہ غریب اترتی کدھر سے کوٹھے میں دوسری طرف چھپر تھا۔ وہاں آگ اس وقت تک نہیں پہونچی تھی۔ مگر وہ چھپر گرایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ لوگ چھپر کو تو صبر کرسکتے ہیں لیکن آدمی کی جان بڑی چیز ہے۔ لئے لیجئے ادھر بھی آگ نے لے لیا۔ سیڑھی لگائی گئی اور ایک آدمی چھت پر چڑھ ہی گیا۔ مگر اترے کدھر سے' جدھر سے وہ چڑھا تھا وہ دیواروں پر چاروں طرف پرچھتیاں تھیں۔ اُدھر بھی آگ پہنچ گئی تھی۔ مگر وہ شخص جان پر کھیل گیا اور اس عورت کو گود میں لے کر مکان کے پچھواڑے کود گیا۔ کسی کا گھٹنا ٹوٹا کسی کا ٹھڈی سے خون بہہ نکلا مگر جانیں دونوں کی بچ گئیں۔ دیکھا گیا تو میاں گمنام تھے اور وہ جو ان کی اصلی زندگی میں آئندہ چل کر سبز پری ہوئی۔

جہاں جان کی جوکھم آن پڑتی ہے وہاں تصنع بناوٹ کا لفافہ دور جا پڑتا ہے اور آدمی کی اچھائی برائی سامنے آجاتی ہے۔ پھر سمجھنے پرکھنے کی فرصت نہیں رہتی کہ کون بھروسے والا آدمی ہے کون نہیں، عورت کی روح ایسا ہی آدمی پسند کرتی ہے یا کسی دوسری طرح کا۔ یہ کسی سمجھ بوجھ والے آدمی سے پوچھئے یا اس قصے کی ہیروئن دلہن سے پوچھئے کہانی لکھنے والے کو علم النفس نہیں آتا کچی ہوئی سانولی رنگت بھرا بدن، آنکھوں میں وہ موہنی کہ آدمی کا کون ذکر پری کا دل موہ لیا۔ تماشہ دیکھنے والوں میں کون عورت ہوگی جو ایک خیالی پہلو سے اپنے آپ کو سبز پری کی جگہ

نہ بجھتی ہوگی۔ آخر آپ نے بھی ناول پڑھے ہیں۔ نہ معلوم کتنے بار اپنے آپ میں ہیرو۔ ہیروئن کی جھلک پائی ہوگی۔ اس سے زیادہ اثر گلفام کا پڑا۔ ایک تو گلفام اور پھر تلوار باندھے بسنت رت جب آتی ہے تو چڑا چوں چوں کرکے چڑیا کو اپنے بس میں کرلیتا ہے۔ غریب دہنا تو پھر آدمی کا بچہ تھی گو شودر تھی۔ محبت نے خیال میں جو نفاست پیدا کردی ہو وہ دہکتا رہا آگ میں پھاند پڑنے والا معاملہ اس عورت کے نفسیات سمجھنے والے جانیں ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ آگ کے واقعہ کے پہلے نہ معلوم دل میں کیا رہا ہو۔ لیکن اس کے بعد جو بن پیا بارسے تج دیں" جیا نہ تنک رہ گیا تھا نہ کلام۔ عورت کی ذات بودی کہلاتی ہے۔ مگر جہاں دل کا معاملہ آن پڑتا ہے وہاں اس کی بہادری کی قسم کھائی جاتی ہے۔ یہی حال دہنا کا تھا کہ نہ برادری کا ڈر رہ گیا تھا نہ ماں دھاڑ کا۔ دہنا خیال کرتی تھی کہ زندگی کا مزا میٹھا۔ سلونا، سیٹھا، کڑوا سب سے مکر بنتا ہے اور وہی چوکھا ہوتا ہے۔ دنیا اس کو بے حیا کہے مگر عورت کی روح پکار پکار کر کہتی ہے۔

شعر — دل و دیں را بہ رہ دوست نثارے کردم ؎ حاصل عشق ہمی بود کہ کارے کردم

دہنا کی شادی ہوچکی تھی۔ رخصتی نہیں ہوئی تھی۔ دہنا کے ماں باپ بھی چاہتے تھے کہ جلد رخصت کردیں مگر پنڈتوں کا حساب اور سن کا پھیر ایسا تھا کہ چلنا عت نہیں بن رہی تھی۔ اسی انتظار میں سال بھر گزر گیا ماں باپ نے کوئی جتن اٹھا نہیں رکھا نہ معلوم کتنا مارا پیٹا مگر سوپ بجائے جا ہے اونٹ بھاگ جائے لیکن سختی سے دل کی لگی، لگی ہی رہتی ہے۔

شعر — اینہم اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر

خدا خدا کرکے رخصتی کا وقت آیا۔ دہنا رو دھو کر سسرال چلیں۔ دہنا کی سسرال دور تھی۔ درمیان میں بڑا گھنا جنگل پڑتا تھا۔ جس وقت وہاں یہ لوگ پہنچے میاں مدے خاں نے دھاوا بول دیا اور دہنا کو چھین لائے۔ نوابی جا چکی تھی مگر عادتیں بگڑی ہوئی تھیں۔ اس طرح کے واقعات اکثر ہو جاتے تھے۔ واردات کی کچھ پوچھ گچھ ہوئی۔ لوٹ کا مقدمہ تو چلا نہیں۔ لیکن بیاہی عورت کو بھگا لے جانے میں میاں مدے خاں کئی سال پچھ مہینے کے لئے جیل بھیج دیئے گئے۔

اس دوران میں دہنا کا پوچھنے والا کوئی نہیں رہ گیا تھا۔ غریب نہ میکے کی رہی نہ سسرے کی۔ سسرال والوں کا کیا ذکر خود ماں باپ تک غریب کی طرف پھر کے نہ دیکھ سکے۔ مدے خاں کی ماں نے البتہ چھاتی پیٹ سے لگایا اور بہو بنا کر رکھا۔ ان کا نام دہنا سے بدل کر نوجلادن ہوگیا۔ چھ مہینے پھر وہی گلفام اور وہی سبز پری، پہلے یہ مشغلہ شروع ہوا تھا دل بہلاؤ کو اور اب روٹیوں کا سہارا ٹھہرا۔ مدے خاں جب تک جیئے ان کی اندر سبھا دوسروں کے مقابلہ میں ایسی رہی جیسے دیوتاؤں کی محفل میں اندر۔ گلفام کا پارٹ تو کچھ دنوں بعد چھوٹ گیا مگر کالا دیو بہت دنوں تک بنتے رہے پھر یہ بھی گیا اور خالی تجربے کی بناء پر کمپنی کے مالک منیجر کی طرح کام کرتے رہے اور استاد کہلانے لگے۔ بی نوجلادن کی عزت مدے خاں کے ساتھ بڑھتی گئی اور جتنے ایکٹر تھے ان کو استادنی کہتے تھے۔

اتنے میں مدے خاں کا انتقال ہوگیا۔ نوجلادن نے مدے خاں کے شاگردوں کے ذریعے سے اندر سبھا جاری رکھنی چاہی مگر نہ رکھ سکیں ناچار ماماگیری کرنے لگیں، بڑھاپے سے زیادہ بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ کوئی اولاد نہ تھی۔ اندر سبھا کا وقت گیا تھیٹروں کا زمانہ آیا تھیٹروں کا شوقین کم ہوا۔ سینما کا دور دورہ ہوا۔ بی نوجلادن بہت بوڑھی ہوگئیں۔ مگر دو باتیں نہ چھوڑیں، ایک تو جمعرات کے دن مدے خاں کی قبر پر جانا دوسرے اندر سبھا کا ذکر اس طرح کرنا جیسے ابھی کی بات ہے۔ غریب آدمی نہ کوئی آگے نہ کوئی پیچھے۔ اس لئے کچھ کمائی تھیں وہ میں سے کچھ جوڑ کر کفن دفن کے اپنے گور کفن کے لئے مزدور رکھی جاتی تھیں کہ محتاجی میں نہ اٹھائی جائیں ساتھ والیاں ان کی جوڑ رسی پر آواز سے

تو ازسے کستی تھیں کہ نہ معلوم کس لیے جمع کر رہی ہیں۔ مگر یہ سنی ان سنی کر جاتی تھیں اور جواب نہیں دیتی تھیں ان کے اثاثے میں ایک بانس کی پٹاری بھی تھی۔ جس پر چمڑا منڈھا ہوا تھا۔

اس کو جدارن جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھیں۔ ان کے جیتے جی کسی کو نہ معلوم ہوا کہ اس کے اندر کیا ہے اگر لوگ اندازہ کرتے تھے کہ عمر بھر کی کمائی اسی کے اندر ہوگی۔ جب ان کا آخر وقت ہوا اور زبان بدل گئی، آنکھوں پر پردے پڑ گئے تب یہ کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سنکرات میں جدارن کو گھنٹوں لگ گئے اور یہ اسی طرح پانی پانی کہتی تھیں۔ پہلے لوگ سمجھے پانی مانگتی ہیں۔ کسی نے کہا ارے پٹاری تو نہیں کہتی ہیں۔ لوگوں نے پٹاری کھول کر دیکھا تو ایک پوٹلی میں بندھی ہوئی چھ اشرفیاں نکلیں اور ٹوٹا پھوٹا کلاسوں سیاہ، ستارے ماند، گلفام کا تاج ایک عورت نے لا کر ان چیزوں کو ان کے سینے پر رکھ دیا۔ ادھر رکھنا تھا کہ ۔۔۔۔۔ ۔۔۔ ادھر معلوم ہوا کہ کلی چٹکی اور بو نکل گئی ——— ”کشکول محمد علی شاہ فقیر“ سے

اردو کے فن کار ادیبوں میں جو مادرِ فطرت کے آغوش میں پلے اور بڑھے اور جن کی سحر بیانی اسی کے سہانے بولوں کی مرہونِ منت اور جن کی فکر و دانش اسی کی بتائی پہیلیوں کی ممنون ہے۔ محمد علی ایک یکتا اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے یکتا کا لفظ پورے ارادے اور ذمہ داری سے استعمال کیا ہے۔ وہ اس لحاظ سے یکتا ہیں کہ وہ اپنے ذاتی مطالعے کی حدود سے کبھی باہر نہیں جاتے۔ وہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ وہ بنیادی طور پر ایک قصہ گو ہیں۔ اور ان کا کوئی قصہ کسی اڑتے ہوئے جذبے یا کسی ابلتی ہوئی تحریک سے جنم نہیں لیتا۔ بلکہ ہمیشہ ان کے کسی خیال افروز مشاہدہ یا اضطراب انگیز مطالعے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اردو وہ اس حیثیت سے بھی ایک امتیاز خاص کے مالک ہیں کہ وہ ”من و تو“ کی حدود کو ایک بے مثال شان بے تکلفی سے عبور کر کے اپنے ناظر سے اس طرح سے گھل مل جاتے ہیں۔ گویا وہ خود قصہ نہیں لکھ رہے بلکہ وہ اور ان کا پڑھنے والا دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے اس قصہ میں روحانی طور پر گزر رہے ہیں۔ یہ کیفیت ہمارے ہاں انھیں سے خاص ہے۔ میری اس گزارش سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ زندگی کے محض ایک چابکدست عکاس ہیں۔ ہر گز نہیں۔ زندگی کی تصویر کھینچنے کے ساتھ ساتھ وہ اس تصویر میں بڑے لطیف اور نادر رنگ بھرتے جاتے ہیں۔ محمد علی کو بصارت کے ساتھ بصیرت بھی ارزانی ہوئی ہے۔ وہ ایک نادرہ کار مصور محسوسات ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک ماہر نفسیات بھی ہیں۔ اور ان کے بیشتر افسانے علم النفس، خصوصاً اس کے جنسی پہلو کے بیش بہا مطالعات اور دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی تصویر کشی وہ نہایت اخلاص سے کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا پس منظر نمایاں کرتے ہیں۔ اور اس کی پہیلیوں کا حل بھی بتاتے ہیں۔ (صلاح الدین احمد)

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

سیّد مرحوم: چند یادیں

۱۹۵۴ء کی بات ہے جب میں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تھا اور ابھی گلبرگہ ہی میں مقیم تھی ایک دن اچانک پروفیسر سیّد محمد کا مکتوب گرامی میرے نام آیا۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا خط اور وہ بھی ایک بی۔ اے کی طالبہ کے نام میں تو بس حیران رہ گئی۔ حیرانی بھی تھی اور مسرت بھی۔ بی۔ اے میں میرے نشانات تمام اُمیدواروں میں سب سے زیادہ تھے اور میرے لئے میرٹ اسکالر شپ (Merit Scholar - ship) منظور ہوا تھا۔ اس کی اطلاع دفتر کے کسی کلرک نے نہیں شعبہ اُردو آرٹس کالج کے پروفیسر نے دی تھی۔ سیّد صاحب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا ایک معتبر، معزز، ہمدرد اور بے لوث انسان کا دوسرے معمولی انسان سے پہلا رابطہ ــــ!

۴ اگست ۱۹۵۴ء کا وہ دن بھی مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار آرٹس کالج گئی۔ شعبے میں سیّد صاحب اکیلے موجود تھے، قتیل صاحب اور سروری صاحب اُسی وقت نکل چکے تھے میرے چھوٹے بھائی ظہیر پروفیز جواب کیلفورنیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں میرے ساتھ تھے۔ ہمارے خاندان میں پردے کی سخت پابندی تھی اور یہ پہلا موقع تھا جو میں پردے سے باہر آئی تھی۔ سیّد صاحب نے میری وحشت اور گھبراہٹ کو محسوس کر لیا۔ اپنے ہی خاندان کے کسی مشفق مہربان بزرگ کی طرح مجھ سے بات کی، میری ہمت بندھائی۔ عرب کی اُن بہادر عورتوں کی یاد دلائی جو جنگوں میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں یہ اور اسی قسم کی باتیں ایسی مخلصانہ اور بزرگانہ فضاء میں ہوئیں کہ میں نے محسوس کیا عزم و عمل کے لئے یہ بھی ایک میدان ہے اور جیسے میرے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا مل گیا ــــ

۱۵ اگست آزادیٔ ہند کی عام تعطیل تھی۔ ۱۶ کو مجھے اکیلے ہی کالج جانا تھا۔ سیّد صاحب کی حوصلہ افزا گفتگو کا اثر تھا یا اعلیٰ تعلیم کے حصول کی لگن جو چراغِ آرزو بن کر دل میں پہلے سے روشن تھی اور فروزاں ہو گئی۔ میری ہم جماعت ایک اور لڑکی بتول صفدر مرزا بھی تھیں۔ میں مغلوبِ گماں خود نگہداری کی قائل، بتول بدگماں ــــ دونوں نہ کالج کے کسی فنکشن میں شریک ہوتے نہ توسیعی لکچرس (EXTENSION LECTURES) ہی سنتے۔ کمرہ ۵۴ میں ہم جیسی تقریبیں روز ہی ہوتیں لیکن ہم کو ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کبھی جب اُردو کا کوئی بڑا شاعر یا ادیب آتا سیّد صاحب ہمیں چلنے کے کہتے۔ خود بھی ساتھ چلتے۔ سیّد صاحب کی یہ سعی غالباً یا تو ہماری بے جا جھجک دُور کرنے کے لئے ہوتی یا دستورِ زندگی سکھانے، گلستاں و بیاباں کی شریعت بتانے۔ گلستاں وہ کہ جہاں گھات میں صیّاد بھی تھے اور بیاباں جہاں کانٹوں سے دامن بچانا تھا ــــ

ہم کو لائبریری سے کتابیں لینا ہوتیں تو شعبے کے چپراسی مجید کو حکم ہوتا کہ ہمارے ساتھ جائے۔ مجید صاحب ہمارے

ساتھ چلتے پھر ادھر ادھر گھومتے پھرتے۔ شعبے میں دیر تک کوئی چپراسی موجود نہ ہوتا۔ پروفیسر سروری مرحوم کو بھی اس کا پتہ تھا کہ مجید صاحب ہمارے کاموں کے بہانے گھومتے پھرتے ہیں لیکن مجید صاحب کی تنبیہ در کنار، تعرض بھی نہ کرتے سید صاحب نے ایک روز گھر کا پتہ پوچھا۔ ہمارے گھر آئے۔ میرے بڑے بھائی معین الدین صاحب سے جو اب ڈپٹی چیف انجینئر تعمیرات ہیں ملاقات کی اور ہم کو دوسرے دن اپنے گھر چائے پر آنے کی دعوت دی۔ شام پانچ بجے کے قریب بھابھی اور میں "زینب منزل" پہنچے۔ "زینب منزل" کا ڈرائنگ روم جو بہرحال یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کا ڈرائنگ روم تھا کسی نوع بھی سجا سجایا نہیں کہلایا جا سکتا تھا۔ یہ ڈرائنگ روم تھا اُردو کے ایک عاشق کا جہاں محمد حسین آزاد جیسے مجنون ز خود رفتہ، مصلح قوم سرسید، فرشتہ سیرت حالی، مذہب پرست شبلی، قلندر مزاج مولانا سلیم اور علامہ اقبال کی بڑی بڑی تصویریں اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں آویزاں تھیں۔ میں ابھی تصویروں کی اس دنیا میں گم تھی کہ اندر سے ہمیں بلاوا آیا۔ ایک بڑے دالان میں چاندنی کے ستھرے فرش پر گاؤ تکیہ سے ٹیک لگائے، پاندان قریب میں رکھے بیگم سید محمد بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں نے سلام کیا انتہائی خلوص کے ساتھ سلام لے کر ہم کو اپنے قریب ہی بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر ادھر اُدھر کی باتیں کیں پھر بڑی لڑکی قیصر بیگم کو بلا کر ہمیں چائے کے لئے چلنے کو کہا۔

مکان کے بائیں باغ میں چائے کی میز لگائی گئی تھی۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ہم دو ہستیوں کے لئے اچھا خاصہ عصرانہ دیا گیا تھا۔ دنیا بھر کی چیزیں۔ اس پر بیگم سید محمد اور بچیوں کا اصرار کہ یہ لیجئے، وہ لیجئے، اور لیجئے۔ میں نے سوچا میزبانی بھی ایک خاص سلیقہ ہے اور یہ شائد اس گھرانے کے لئے مختص ہے۔

سید صاحب کی خارجی اور داخلی زندگی میں مجھے کوئی بُعد نظر نہیں آیا۔ وہ جیسے خوش اخلاق یونیورسٹی میں طالب علموں کے ساتھ تھے، اپنے گھر آنگن میں اپنے بچوں کے ساتھ بھی اسی طرح دوستانہ برتاؤ کرتے اور اُن کی چھوٹی بڑی دلچسپیوں میں حصہ لیتے دیکھا۔ بچوں نے کھلے صحن کے ایک حصہ میں خرگوش پال رکھے تھے۔ ایک ڈربے میں مرغیاں بند تھیں۔ ایک طرف طوطے کا پنجرہ لٹک رہا تھا۔ کچھ بچے کھیل رہے تھے چھوٹا بچہ مچل کر یکبارگی سید صاحب کی گود میں جا بیٹھا۔ میں جو سید صاحب کو کالج کے علمی ماحول میں دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی خالص گھریلو فضاء میں دیکھ رہی تھی۔ سید صاحب کا سادہ، بے تکلف، بے محابا اور بے ریا اندازِ شائستگی دیکھ کر دل نے بے ساختہ داد دی "انسان ایسے ہی ہوتے ہیں"

سید صاحب کے لکچرس، عموماً اُن کی پرانی یادداشتوں پر مبنی، روائتی اور مروجہ نوعیت کے ہوتے لیکن اُن کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی کہ اُن میں ایک اعتماد ہوتا اور کوئی بات بھی ایسی نہ ہوتی جو موضوع بحث بن سکے۔ اپنی ذات یا بات سے معرکے کھڑے کرنا دراصل سید صاحب کا شیوہ نہیں تھی۔ تحیر و تعجب پیدا کرنا اُن کا مزاج نہیں تھا اور اُن کا مزاج ہی اُن کا طرزِ منصبی (پیشۂ تدریس) تھا۔ سید صاحب کے لکچرس عموماً مختصر ہوتے جو ذوقِ صحیح رکھنے والوں کی رہنمائی کا سبب ہوتے تھے۔ طالب علموں پر اپنا اثر جمانا یا رعب جتانا انھیں نہ آتا تھا ظلم و زبردستی اور مطلق العنانی تو وہ جانتے نہ تھے یہی وجہ تھی کہ طالب علم پورے اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اُن سے گفتگو کرتے۔

ذہین اور باذوق طالب علموں کا پی ایچ ڈی کے لئے انتخاب جیسے سید صاحب کی ذمہ داری تھی۔ وہ خود سپروائزر تھے نہ گائیڈ۔ ڈاکٹر زور اور پروفیسر سروری ہی دو اصحاب ریسرچ گائیڈ مقرر تھے۔ سید صاحب کی عالی حوصلگی، نہ ستائش کی

تمنائی تھی نہ صلے کی آرزومند۔ وہ طالب علموں کا انتخاب کرتے انھیں ترغیب اور تحریص دلاتے اور رسالوں میں مقالے چھپواتے۔ پھر ان کو مقالہ لکھوا دیتے۔ یہ سب کچھ ایسے خاموش طریقے پر ہوتا کہ گویا یہ کوئی کرم ہی نہ تھا طالب علم ریسرچ کے کاروبار میں لگ جانے کے بعد ان کے کارنامۂ اہمیت کو بھول جاتے اور کبھی یاد آتا تو یہی کہ حاصل ہے کہ نیاز ظاہر کرنے والے بھی اس جہاں میں موجود ہیں۔

میں بھی ریسرچ کی مصروفیتوں میں سید صاحب کے اس کرم کو بھول گئی۔ مہینوں میں کبھی ملاقات ہوتی تو اسی خندہ پیشانی سے ملتے جو میں سمجھتی ہوں کہ ان کی فطرت کا جز و تھی۔ برہمی اور اپنے طالب علموں کے ساتھ برہمی وہ نہیں جانتے تھے۔ کالج لائبریری یا سمینار لائبریری سے جو کتاب ہم کو دستیاب نہ ہوتی سید صاحب کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہوتی تو وہ ضرور ہمیں فراہم کر دیتے اب یہ طالب علم پر منحصر ہوتا کہ کتاب ایمانداری سے لوٹا دے۔ تقاضہ کرنا یا سختی کرنا سید صاحب کی فطرت نہ تھی۔ میرے خیال میں "با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا" سید صاحب کا وطیرہ تھا۔ شعبۂ اردو اور ایوانِ اردو اس زمانے میں دو بڑی رقابت گاہیں تھیں۔ لیکن وہ سروری صاحب کے یہاں کی کوئی ادبی اور شعری محفل ہو یا ایوانِ اردو کی مجلس دونوں جگہ سید صاحب کی پذیرائی ہوتی۔ کبھی سروری صاحب کے دستِ راست ہیں تو کبھی ڈاکٹر زورؔ کے ہمدم و ہمراز ۔۔۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے مہربان استاد سمجھا تو ڈاکٹر زینت ساجدہ نے مخلص اور مشیر جانا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کسی ادبی محفل میں سید صاحب کے کسی شاگرد کی تقریر ہوتی۔ سید صاحب ایسے موقعوں پر عموماً آخر میں تقریر کرتے۔ یہ تقریب محض اپنے شاگردوں کی تقریروں پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے کے لئے ہوتی ذوقِ تقریر نہ ہوتا۔ کسی استاد کا اپنے شاگردوں کے لئے ایسا رویہ میں سمجھتی ہوں کہ ایک گراں قدر عطیہ سے کم نہیں ہوتا۔

سید صاحب ایک نارمل انسان تھے ان کی ذات اور شخصیت میں کوئی غیر معمولی بات تھی تو یہ تھی کہ وہ خود کو غیر معمولی انسان نہیں سمجھتے تھے۔ کوئی ہو اور وہ کہیں ہوں ان سے مل لیتا انھیں کبھی اس پر تعرض نہیں ہوتا تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ خود شناس نہیں تھے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب سید صاحب نے سروری صاحب سے گریز شروع کیا۔ اس کا سبب میرے خیال میں کوئی مخالفت یا مخاصمت نہیں تھی۔ سروری صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ جس پر التفات کرتے اسے عموماً ساتھ لئے پھرتے۔ شعبے کے معاملات میں وقتاً فوقتاً مشورہ کرتے۔ سید صاحب وظیفہ سے پہلے اعجاز پریس کی تشکیل میں مصروف تھے۔ سید صاحب کو بجا یا بے جا بالقول بیگم سید محمد ایسا احساس ہوگیا کہ "اردلی میں رکھتے ہیں" ظاہر ہے کہ ایسا احساس کسی عنوان بھی دوستی کی مزید ترقی کا ضامن نہیں ہوسکتا تھا تاہم دونوں کے مراسم خوشگوار بھی رہے اور برقرار بھی۔ اور یہ دونوں کے کردار کی شرافت تھی

سید صاحب ۱۹۶۱ء میں اپنے عہدے سے سبکدوش ہوئے اور اورینٹل اردو کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ سماجی اور فلاحی اداروں سے بھی وابستہ ہوئے۔ سماجی خدمات بھی انجام دیں۔ خود ان کا گھر بھی ان کے غریب اور بیکس عزیز و اقارب کا مسکن بنا ہوا تھا نظیرؔ نے کہا تھا

ع سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

سید صاحب کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد بیگم سید محمد بھی انتقال کر گئیں۔ ابھی بن بیاہی لڑکیاں ہیں۔ ماں باپ کی [illegible] "ادارہ ادبیات اردو" "اردو اکیڈیمی" اور "انجمن ترقی اردو" کیلئے کیا یہ غور کی بات نہیں ہے؟ ایک خادم اردو کی خدمات کا شایانِ شان اور مستحق اعتراف کیا ان کے خاندان کے لئے نہیں کیا جانا چاہئے ۔۔۔؟

حیدرآباد کے شاعر

(۱۱) فیض الحسن خیالؔ

۱۹۷۷ء میں ریاستی ساہتیہ اکیڈیمی کے مطبوعہ تذکروں کا سلسلہ۔

فیض الحسن خیالؔ، حیدرآباد کے معروف شاعر ہیں۔ غزل اور نظم خوب کہتے اور بہتر ترنم میں پڑھتے ہیں۔ کل ہند اور بین الریاستی مشاعروں میں پسند کئے جاتے ہیں۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۲ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد حسین قادری (مرحوم) ہے۔ گھریلو ماحول شرفائے حیدرآباد کا رہا۔ مذہبیات سے رشتہ استوار رکھتے ہیں۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک کرنے کے بعد خیالؔ نے جامعہ اردو علی گڑھ سے "ادیب کامل" پاس کیا اور پھر عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ او۔ ایل کی سند لی۔

زمانۂ طالب علمی سے شعر کہتے ہیں، ابتداء موضوعاتی نظموں سے ہوئی پھر غزلیہ شاعری کی طرف رجحان افزوں ہوا۔ ۱۹۵۵ء ابتدائے سخن کا سال ہے۔ ۱۹۶۵ء میں پہلا شعری مجموعہ "موجِ صبا" چھپا۔ خواجہ احمد عباس اور زینت ساجدہ نے خیالؔ کے فکر و فن پر رائیں لکھیں۔ ۱۹۷۲ء میں دوسرا مجموعہ "صبح کا سورج" ریاستی حکومت کی اعانت سے شائع ہوا جس کا پیش لفظ پروفیسر مسعود حسین خاں (وائس چانسلر جامعہ ملیہ) نے تحریر کیا ہے۔ تیسرا مجموعہ "طلوعِ صبح" کے نام سے زیرِ ترتیب ہے۔ خیالؔ کی شاعری کا وصف یہ ہے کہ وہ مسائلِ حیات پر عصری حسیت کے ساتھ نظر رکھتے ہیں اور لہجے کی تازگی کے سبب دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ ۔۔۔ آندھرا پردیش میں ملازم ہیں، دفتر کی مصروفیات کے بعد بچا وقت علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ مذہبی علوم کی تحصیل میں گزارتے ہیں، طبعاً مخلص، دردمند اور صوم و صلوٰۃ کے پابند جوانِ فکر سخنور ہیں۔

(و۔ خ)

●

قافلہ والوں کو لٹتے ہوئے اکثر دیکھا
ہم نے میلوں میں بھی تنہائی کا منظر دیکھا

رت جگے کتنے ہوئے میکدہ سجنے کے لئے
صبح دم ہم نے تو ہر جام میں خنجر دیکھا

زندگی تجھ سے ملاقات کہاں ہوتی ہے
ہم نے لیکن تجھے تنہائی میں اکثر دیکھا

کون جانے کے زمانے کے ارادے کیا ہیں
ہم نے لمحوں کو بھی صدیوں میں اترتے دیکھا

حادثوں کے سوا کیا تھا مری راہوں میں خیالؔ
اس نے کچھ دیر مرے ساتھ بھی چل کر دیکھا

●

مرے خلوص کا ہر لمحہ امتحاں ہے یہاں
سوائے آپ کے ہر شخص بدگماں ہے یہاں

دلوں میں شعلے اگانے کا فن تو آساں ہے
مگر گلاب اگانے کا فن کہاں ہے یہاں

بتاؤ کون سے منصور کی تلاش میں ہو
ہر ایک شخص صلیبوں کے درمیاں ہے یہاں

مجھے تو کیسے تجھے تشنگی نہیں معلوم
سمندروں کا دلاسا بھی رائیگاں ہے یہاں

نویدِ صبح کی تاریخ کیسے لکھیں ہم
ابھی تو آنکھوں میں بارود کا دھواں ہے یہاں

اُگے تو کیسے اُگے روشنی کی فصل خیالؔ
ابھی اندھیرا اُجالوں کے درمیاں ہے یہاں

●

زندگی جب درد کا پیغام لے کر آئے گی
وقت کے چہرے پہ بھی سنجیدگی آجائے گی

گفتگو جب بھی کرے گی مجھ سے تنہائی مری
جائزہ لے کر مری انجمن سے وہ شرمائے گی

یوں ہی میرا خون دنیا میں اگر بکتا رہا
کجکلاہی شب کی، سورج کا مکاں بن جائے گی

فرشِ گل پر بھی مجھے آرام مل سکتا نہیں
جانے کب یہ زندگی کانٹوں پہ چل کے تھک جائے گی

دشتِ خوں میں پھر اگیں گے پیار کے پودے خیالؔ
جب خوشی کو بے بسی غم کا کفن پہنائے گی

●

خوشی کا درد کا سنگم رہا ہے آنکھوں میں
ترا خیال مجسم رہا ہے آنکھوں میں

غمِ حبیب جو کم کم رہا ہے آنکھوں میں
اک انتظار کا عالم رہا ہے آنکھوں میں

دھندلکے کرنوں کا ۔۔۔ کے آئے ہیں
طلوعِ صبح کا ماتم رہا ہے آنکھوں میں

اسی لئے تو میں تنہا پسند ہوں شاید
غمِ ۔۔۔ وہ ہمدم رہا ہے آنکھوں میں

تماشہ شب کا ابھی ختم ہونے والا ہے
مگر سحر کا ۔۔۔ رہا ہے آنکھوں میں

رہیں خیالؔ کے دامن میں ۔۔۔
اسی لئے تو وہ ۔۔۔ رہا ہے آنکھوں میں

●

عبدالمتین نیاز

صرف لفظوں کو تخیل کا بیاں سمجھا تھا میں
اب سے پہلے کب معانی کی زباں سمجھا تھا میں

شام ہوتے ہی پرندے گھونسلوں میں جا بسے
سارے جگ کو اپنا جیسا اپنے مکاں سمجھا تھا میں

آنکھ کھولی تو ملے ٹکڑوں میں دھرتی اور اُفق
زندگی کے سلسلوں کو بیکراں سمجھا تھا میں

ہو چکا خوں میں سرایت تب یقین آیا مجھے
خوف کو ورنہ توہم کا دھواں سمجھا تھا میں

پڑ گئے کیوں جسم کی دیوار میں اتنے شگاف
وقت جب تجھ کو مسیح و مہرباں سمجھا تھا میں

میں نے ان احباب کو پایا خلاؤں کی طرح
دور سے ہستی کو جن کی آسماں سمجھا تھا میں

شفیق احمد

یہ حال ہے مرے دل کا تری نظر کے قریب
ہو جس طرح سے نشیمن کوئی شرر کے قریب

ہر اک مقام سے گذرے ہیں ہم اس زمانے میں
"تری وفا کے سہارے تری نظر کے قریب"

ہے دھوپ گردشِ دوراں کی تیز کچھ ایسی
کہ اپنا سایہ بھی آتا نہیں ہے ڈر کے قریب

وہ ہم نہیں کہ جو بھاگیں بہار کے پیچھے
بہار آتی ہے چل کر ہمارے گھر کے قریب

نہ جانے کب کوئی اس رہگذر پہ آ نکلے
جلائے بیٹھے ہیں اک شمع رہگذر کے قریب

اُسے کہیں لب و رخسارِ گل کے لوٹ نہ لیں!
حیات آئی ہے کیوں شبنم و شرر کے قریب

مومن خاں شوق

زندگی میری گلستاں کی طرح کھل اُٹھی
موسمِ گل کی طرح تیری جوانی مہکی

داستاں آج مرے عشق کی یوں عام ہوئی
جیسے بلبل کی صدا بن کے کہانی مہکی

بے سبب دل کی طرف آپ نے ہنس کر دیکھا
بے ارادہ مرے جذبات کی رانی مہکی

آمدِ موسمِ گل کر گئی ظاہر خوشبو
نام لے کر ترا کلیوں کی زبانی مہکی

زخم پہ زخم لگا شوق رہِ اُلفت میں
دل ہوا خون تو اشکوں کی روانی مہکی

ڈاکٹر صفی الدین صدیقی

ابراہیم جلیس — چند یادیں

۲۳ر اکتوبر کو میں اس سڑک سے گذر رہا تھا جو ملک پیٹ اسٹیشن سے ریس کورس کی طرف جاتی ہے اس دن سڑک پر موٹر گاڑیوں اور دوسری قسم کی سواریوں کی اس قدر بھیڑ تھی کہ آسانی کے ساتھ آگے بڑھنا دشوار ہوگیا تھا۔ زندگی کی بے معنویت سے بے خبر لوگ ریس کورس کا تماشہ دیکھنے کے لئے بے محابہ بڑھے جارہے تھے۔ میں نے سڑک کی داہنی طرف واقع ایک مکان "زینت فضا" کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ہم نشین سے کہا "کبھی ابراہیم جلیس اس مکان میں رہتا تھا اور یہیں پر پہلی بار میں اس سے ملا تھا" اس کے دو روز بعد جب میں اورنگ آباد پہونچا تو ابراہیم جلیس کی موت کی خبر میرا انتظار کر رہی تھی۔ مدت العمر بچھڑے ہوئے دوست کی اچانک یاد اور پھر اس کی موت کا سانحہ' کیا ان دونوں میں کوئی منطقی ربط پایا جاتا ہے؟ اس سوال کا شافی جواب دینا کوئی فلسفی نہیں دے سکتا۔

آج جب کہ میں پیچھے مڑکر ماضی کے دھندلکوں میں جھانکتا ہوں تو میرے ذہن کے پردے پر ایک خاص تہذیب کے خدو خال ابھرنے لگتے ہیں۔ مجھے کچھ مانوس چہرے دکھائی دیتے ہیں اور ان میں سے ایک مانوس چہرہ ابراہیم جلیس کا بھی ہے۔ میں نے ابراہیم جلیس کو آخری بار حیدرآباد کے سقوط سے کچھ پہلے یعنی اگست ۱۹۴۸ء میں اورنگ آباد کو اپنی روانگی سے قبل الوداع کہا تھا اس وقت تک ابراہیم جلیس دنیائے ادب میں اپنا مقام پیدا کرچکا تھا اور تین چار کتابوں کا مصنف بن چکا تھا۔ تب سے لے کر آج تک ۲۹ سال کی اس طویل مدت میں قومی اور بین قومی سطحوں پر کیا کچھ تبدیلیاں نہیں آئیں۔ میری اپنی پیڑھی کے لوگ اب پچاس سے کچھ اوپر کے ہوچکے ہیں۔ زمانے کے کافی سرد و گرم دیکھے ہیں۔ وہ دوسری جنگ عالمی کے بھیانک دور سے گزرے۔ انھوں نے برصغیر کو تقسیم ہوتے دیکھا اور پرانے حیدرآباد کی کایا پلٹ ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔ ہمارے حیدرآباد کی تاریخ' نہ صرف آئینۂ ماضی ہے بلکہ درس عبرت بھی ہے۔

ابراہیم جلیس سے میرا تعلق اگر جان پہچان کی حد تک ہوتا تو شاید یہ وفات نامہ محض ایک ادیب کی موت کا نوحہ بن کر رہ جاتا۔ مگر یہ ایک ادیب کا ہی نہیں بلکہ ایک ہمدم دیرینہ کی موت کا نوحہ ہے جس سے میں کافی قریب رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اپنے وطن اور اپنے اعزہ و احباب کی کشش ابراہیم جلیس کو حیدرآباد کھینچ کر لائی تھی مگر بدقسمتی سے میری اور اس کی ملاقات نہ ہوسکی۔

مجرد گاہ (بیچلرز بلڈنگ) کی سہ منزلہ عمارت جو آج بھی روزنامہ "سیاست" کے دفتر کے مقابل کھڑی ہے اس کے سنگین سینہ میں نہ جانے حیدرآباد مرحوم کے کتنے ہی راز دفن ہیں۔ اسی مجرد گاہ میں ایک کرانک بیچلر مسلم ضیائی رہتے تھے

وحقیقۃ ارباب سلم سے مسلم ضیائی کیوں کر بنے یہ ایک الگ داستان ہے جو اپنے اندر خاصی رومانیت لئے ہوئے ہے۔ مسلم ضیائی کافی پڑھے لکھے اور دولت تواناانسان تھے چنانچہ مسلم ضیائی ہی کی وساطت سے میں پہلی بار ابراہیم جلیس سے متعارف ہوا اتفاق سے ابراہیم جلیس میرے ہم محلہ بھی تھے لیکن اس سے قبل دہلی کے ایک ادبی ماہنامے "ساقی" میں ابراہیم جلیس کی چند کہانیاں میری نظر سے گذری تھیں۔ "ساقی" کے ایڈیٹر شاہد احمد دہلوی خود ایک باکمال صاحب طرز ادیب تھے اور ان کے رسالے میں چھپنا کوئی معمولی بات نہ تھی ــــ ابراہیم جلیس علیگڑھ یونیورسٹی سے بی اے کرنے کے بعد نئے نئے حیدرآباد وارد ہوئے تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں قانون کے شعبہ میں داخلہ لیا تھا۔ وہ ایک چھریرے سے بدن والا دراز قد نوجوان تھا اور اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی اس کے بعد شاید ہی کوئی دن گذرا ہوگا کہ ہم ایک دوسرے سے نہ ملے ہوں۔ مجرد گاہ، عابد روڈ پر واقع جے موسی بلڈنگ میں نظامیہ ہوٹل تھی یا پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کی ادبی مجالس، ہر جگہ ہم موجود ہوتے تھے۔

ہمارے دیس میں محض ایک پیشہ ور ادیب (اور وہ بھی اردو زبان کا) بن کر زندہ رہنا مشکل ہے۔ لہٰذا بہت سارے ادیبوں کی طرح ابراہیم جلیس کو بھی ملازمت کا سہارا لینا پڑا تاکہ وہ اپنے اہل وعیال کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکے۔ اس کی شادی گلبرگہ کے ایک خوشحال تجارت پیشہ خاندان میں ہوئی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ابراہیم جلیس کا دفتر مالگذاری روڈ پر واقع تھا ان دنوں ابراہیم جلیس نے کئی اچھی کہانیاں تخلیق کیں۔ میرڈتھ نے طنز وظرافت کو دو دھاری تلوار کہا ہے چنانچہ ابراہیم جلیس اس دو دھاری تلوار کا استعمال ادب میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس زمانے میں کتابوں کی اشاعت پر بہت زیادہ خرچ نہیں بیٹھتا تھا اس کے باوجود حیدرآباد میں اچھے اشاعتی اداروں کا فقدان تھا بالخصوص فکشن کی اشاعت پر بہت کم توجہ کی جاتی تھی۔ مسلم ضیائی جو اس وقت بچوں کے لئے ایک رسالہ مرتب کرتے تھے اور بچوں کے لئے لٹریچر بھی شائع کرتے تھے انھوں نے باقاعدہ کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا چنانچہ ان کے ادارے سے شائع ہونے والی پہلی کتاب ابراہیم جلیس کے افسانوں کا مجموعہ "زرد چہرے" تھا۔ اس کتاب نے ابراہیم جلیس کو افسانہ نگاروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ مسلم ضیائی کے ادارے کے لئے ابراہیم جلیس نے ایک ناول بھی لکھا جو "چور بازار" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ناول کا مسودہ جلیس نے مجرد گاہ میں بیٹھ کر ہفت عشرہ کے اندر اندر تیار کیا تھا۔

انھیں دنوں حیدرآباد میں ایک پنجابی پبلشر نے قدم جمائے تھے وہ بزنس کے آرٹ سے خوب واقف تھا اور اس کی وجہ سے اچھے بھلے دوستوں کے درمیان بسا اوقات غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی ہو جاتی تھی چنانچہ اس کے ادارے "نفیس اکیڈیمی" سے ابراہیم جلیس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ "چالیس کروڑ بھکاری" شائع ہوا تھا اس کے لئے ایک اور کتاب "بھوکا ہے بنگال" ابراہیم جلیس نے ایڈٹ کی تھی جس میں کئی جانے بوجھے اور نئے لکھنے والوں کے افسانے شامل تھے ــــ جلیس کی ایک اور کتاب "تکونا دیس" یہیں سے شائع ہوئی۔

سنہ ۱۹۴۵ء میں جب حیدرآباد میں ترقی پسند ادیبوں کی کانفرنس ہوئی ہماری ملاقات کئی ادیبوں اور شاعروں سے ہوئی ــــ ساحر لدھیانوی سے اسی زمانے میں ربط وضبط بڑھا۔ ساحر جب دوسری بار حیدرآباد آئے (شہر نگاراں میں کوئی خاص کشش تھی جو انھیں لاہور سے دوبارہ کھینچ لائی تھی) تو وہ ابراہیم جلیس ہی کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ اس وقت

تک جلیس بشیر باغ کے قریب حیدرگوڑہ کے ایک مکان میں اٹھ آئے تھے ـــــ اسی زمانے میں مسلم ضیائی، ابراہیم جلیس، ساحر لدھیانوی اور راقم الحروف، اختر حسن صاحب (جو ورنگل کالج میں ادبیات اسعد ومغاری کے لکچرر تھے) سے ملنے ورنگل گئے تھے اور ہم نے حیدرآباد سے ورنگل تک کا فاصلہ تیز رفتار ڈزل کار میں طے کیا تھا ـــــ اس وقت کی ایک یادگار تصویر آج بھی میرے البم میں موجود ہے ۔

۱۹۴۲ء میں ابراہیم جلیس نے ایک ہفت روزہ اخبار ("رباب") کی ادارت سنبھالی ۔ "رباب" کے لئے میں نے کئی مضامین لکھے جن میں ابراہیم جلیس اور ترقی پسند افسانہ اور میرے سفر مدراس (اپریل ۱۹۴۶ء) کا ایک رپورتاژ بعنوان "مدوجزر" قابل ذکر ہے ـــــ مگر یہ ہفت روزہ اخبار سال بھر کے اندر اندر بند کر دیا گیا ۔

یہ وہ زمانہ ہے جب حیدرآباد کی سیاسی زندگی میں ایک خطرناک موڑ آیا تھا ۔ برصغیر بدیسی سامراج کی غلامی سے آزاد ہونے والا تھا اور انگریز کے زیر سایہ حیدرآباد اپنا علٰحدہ سیاسی وجود منوانے کے لئے کوشاں تھا ۔ انہیں دنوں حیدرآباد سے ایک نیا ہفت روزہ اخبار "پرچم" فصیح الدین احمد کی ادارت میں شائع ہونے لگا ۔ "پرچم" کا سرکولیشن اچھا خاصا تھا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ نکلتا تھا اس پرچہ کے لئے ابراہیم جلیس کے علاوہ میں نے اور ہمارے بستر یہ ایک دوست شاہین فاروقی نے کئی مضامین لکھے ۔

کہانیوں کے علاوہ طنزیات و مضحکات کی مشق کے تحت ابراہیم جلیس نے اعلیٰ درجہ کی چیزیں تخلیق کیں وہ بلا کا زود نویس تھا ۔ کبھی کبھی تو یوں بھی پیش آیا ہے کہ پرچم کے دفتر میں اس نے ایک ہی نشست میں اپنا مضمون ختم کیا اور نظر ثانی کے بغیر اسے پریس بھیج دیا گیا ۔ حیدرآباد میں مخدوم محی الدین مرحوم کی قیادت میں انجمن ترقی مصنفین، سب سے پہلے سرگرم رہی ہے ۔ کئی ابھرتے ہوئے نوجوان فنکار اس سے وابستہ تھے ۔ جب ابراہیم جلیس علی گڑھ سے حیدرآباد آیا تو وہ بھی ترقی پسندوں کے کاروان میں شامل ہو گیا ۔ اسی زمانے میں جلیس نے مارکسزم اور مارکسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ۔ مارکس اور لینن کی تعلیمات کے علاوہ چیخوف، گورکی، الکسی ٹالسٹائی وغیرہ ہماری ادبی گفتگو کا محور بن گئے ۔ ان دنوں مارکسزم سے غیر معمولی شغف کی بناء پر ہم نے ابراہیم جلیس کو ابراہیم جلیسوف کے نام سے مخاطب کرنا شروع کیا تھا ۔ اور شاید اس نے اپنے نئے نام کو کچھ کہانیوں میں بھی داخل کیا تھا ۔

حیدرآباد سے اس کی ہجرت کے اسباب وعوامل کی دلگداز داستان وہ طویل مضمون ہے جو ابراہیم جلیس نے "دو ملک ایک کہانی" کے نام سے تحریر کیا تھا ۔ اس نے اپنی عمر کا آدھے سے زائد حصہ ایک پڑوسی ملک کا شہری بن کر گذارا ہے ۔ اس کی کتاب حیات کے تقریباً آدھے اوراق میرے لئے کورے ہی ہیں ۔ البتہ وقتاً فوقتاً مجھ تک یہ اطلاعات پہنچتی رہی ہیں کہ اس نے وہاں جرنلزم میں بڑا نام کمایا ہے ۔ اس بجٹ سے اس نے دنیا کے کئی ملکوں کی یاترا کی ہے ۔ وہ کراچی کے موقر روزنامہ "جنگ" کا ایک اہم کالم نگار تھا ۔ بعد کو اس نے ایک اہم سیاسی اخبار "مساوات" کی ادارت بھی سنبھالی ۔ آخری وقت تک بھی اس کے ہاتھ میں قلم تھا ۔ وہ قلم جو ۳۵ سال تک بے تکان لکھتا رہا لیکن ۲۵ر اکتوبر ۱۹۷۷ء کو اپنے وفات نامہ پر دستخط ثبت کرنے کے بعد وہ قلم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا ؎

نہ کہہ کہ صبر میں پنہاں ہے چارۂ غم دوست　　　نہ کہہ کہ صبر معمائے موت کی ہے کشود

عوض سعید

ابراھیم جلیس سے دو ملاقاتیں

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے پیچھے ایک تاریخ ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس ان ہی میں سے ایک تھے۔ اس تاریخ ساز شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنھیں ان کے قرب کی دولت میسّر ہوئی ہو۔ میرے لئے تو ابراہیم جلیس کی صرف دو ملاقاتیں ہی سرمایہ ہیں۔ مجھے سنہ اور تاریخ ٹھیک طرح یاد نہیں۔ غالباً ۱۹۴۸ اور ۱۹۵۰ کے درمیان شاذ کے ساتھ پہلی بار جلیس سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ہم ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ فصیح الدین ہفتہ وار پرچم نکالا کرتے تھے۔ پرچم کا آفس درگاہ یوسفین سے لگا ہوا تھا۔ فصیح الدین اکثر ان کے سر پر سوار رہتے اور کسی نہ کسی طرح پرچم کے لئے جلیس سے مضمون لکھوا لیتے۔ دوسری طرف نقوش، ساقی، ہمایوں، ادبی دنیا، نیا دور اور ادب لطیف میں ابراہیم جلیس چھائے ہوئے رہتے۔ دراصل جلیس زرد چہرے کی اشاعت ہی سے شہرت پا چکے تھے اور مقبولیت میں کسی طرح کرشن چندر سے کم نہ تھے۔ پھر چور بازار، تکونہ دیس، دو ملک ایک کہانی نے انھیں لازوال شہرت بخشی۔ جلیس کے ہزاروں مداحوں میں ہم بھی تھے۔ اس لئے ہماری یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس قدآور ادیب سے ملا جائے۔ اس زمانے میں ہمارے ایک ساتھی فضل اشر ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی جلیس کے بڑے مداحوں میں سے تھے۔ ہم نے جب ان سے رجوع کیا تو انھوں نے ہم سے وہ کاپیاں طلب کیں جن میں ہمارے چند مزاحیہ مضامین بکھرے پڑے تھے تاکہ وہ جلیس کو دکھا سکیں کہ ہم لوگوں کو آگے لکھنا بھی چاہیئے یا ......

شاذ اس وقت اپنے احباب کے لئے مزاح نگار مصلح الدین تھے۔ شاعر نہیں تھے۔ میرا کل اثاثہ ایک کہانی دو مزاحیہ مضامین تھے۔ جس کے بل بوتے پر میں پکی روشنائی سے اپنا نام لکھوانا چاہتا تھا۔ فضل صاحب نے ایک دن یہ کہہ کر ہم سے کاپیاں لے لیں کہ ملاقات تو بعد بھی ہو سکتی ہے لیکن جلیس کی رائے ہم نو واردانِ بساطِ ادب کے لئے ضروری ہے۔ کاپیاں ان کے حوالے کر دی گئیں لیکن عرصہ دراز تک ہمارے کانوں میں ذرا سے رد و بدل کے ساتھ یہی بات سنائی دیتی رہی کہ امروز فردا میں کاپیاں رائے کے ساتھ واپس کر دی جائیں گی اور آخر ایک دن کاپیاں واپس آ گئیں۔ اس میں جلیس کی رائے درج نہ تھی۔ جو چیزیں انھیں پسند آئی تھیں اس پر انھوں نے رائٹ کا نشان لگا دیا تھا۔ زیادہ نشانات شاذ کے حصے میں آئے تھے۔ میرے حصے میں ایک نشان آیا تھا جو میری کہانی کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ہمیں یہ بھی شبہ تھا کہ کہیں فضل صاحب نے یہ حرکت نہ کی ہو۔ اس لئے ہم جلیس سے ملنے کی ٹھان لی۔ ایک دن نظامیہ ریسٹوران پہنچے تو جلیس اپنے مداحوں میں گھرے ہوئے چہک رہے تھے۔ مجھے یاد ہے شاذ نے بیرے کے ہاتھ میں ایک چٹھی تھما دی تھی اور اشارہ سے بیرے کو سمجھا دیا تھا کہ جلیس تک یہ چٹھی پہنچا دے۔

تاجدارِ قلم　　ابراہیم جلیس
ہم لوگ آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ پانچ منٹ کے لئے زحمت کیجئے۔

شاذ نے غالباً کچھ اس طرح کی عبارت لکھی تھی۔ چِٹھی دیکھتے ہی وہ فوری ہماری طرف آئے اور مسکراتے ہوئے کہا
"بھئی آپ لوگوں نے یہ تاجدار قلم کیا لکھ دیا۔"
جب ہم لوگوں نے کاپیوں پر لگائے ہوئے نشانات کی تشریح چاہی تو انھوں نے قدرے رکتے ہوئے مجھ سے کہا کہ "آپ افسانے لکھئے اور شاذ سے کہا کہ وہ مزاح میں اپنا زور آزمائیں"
شاذ مزاح نگار بنتے بنتے رہ گئے اور آگے چل کر شاعر بن گئے۔ لہذا میں نے افسانہ نگاری شروع کردی جو اب تک جاری ہے جلیس کی نظامیہ والی وہ ملاقات آج تک میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

غالباً ۱۹۶۲ء میں وہ پاک سے حیدرآباد آئے تھے۔ معین فاروقی نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی تھی۔
فاروقی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ یہ میرے دوست عوض سعید ہیں۔
"افسانہ نگار عوض سعید ــــ جلیس نے اس طرح کہا جیسے میرا نام اب ان کے لئے نیا نہیں رہا۔ میں خوش ہوگیا کہ جلیس کو کم ازکم میرا نام تو یاد ہے۔
آج ابراہیم جلیس ہم میں نہیں رہے۔ لیکن مجھے احساس ہورہا ہے کہ میرے ہاتھ میں ایک کاپی آج بھی ہے جس پر خلوص سے نشان لگانے والا کوئی نہیں ــــ

سال یاد نہیں رہا۔ نظر حیدرآبادی مرحوم نے اپنے کشن منڈی والے مکان میں ایک ادبی اجتماع کیا۔ اور مجھے میر حسن اور مخدوم کو بھی مدعو کیا تھا۔ علی گڑھ سے فراغتِ علم کے بعد ایک نوجوان حیدرآباد آیا۔ اور یہ جلسہ اسی کے اعزاز میں اور اسی کے تعارف کے لئے کیا گیا تھا۔ اس میں ہماری شرکت کا ایک سبب یہ تھا کہ نظر نے بڑے خلوص سے بلایا تھا اور دوسرا یہ کہ وہ نوجوان ہمارے کرم فرما محبوب حسین جگر کا چھوٹا بھائی تھا ــــ ابراہیم جلیس۔
ہم لوگ جلیس سے ملے، جلیس کو سنا اور خوش ہوئے۔ اس کے بعد پھر اکثر و بیشتر ملنا ہوا اگر ہر بار ہم نے محسوس کیا کہ جلیس ہم سے چھوٹوں کی طرح ملتا ہے۔ بزرگی اور خوردی کے اس فرق کو اس نے مرتے دم تک برقرار رکھا۔ بلکہ اسوقت بھی جب وہ ادب اور صحافت کی دنیا میں نہایت قدآور ہوگیا۔ ہمارے ہم عمروں کے چھوٹے بھائیوں میں جلیس جیسے کم سعادت مند تھے۔ جلیس کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جنھوں نے آن کی آن میں ہندوستان گیر شہرت حاصل کی جس کا ثبوت یہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کے تمام اہم مدیران و جرائد اس کی تخلیقات کا انتظار کرتے تھے اور دوسرا یہ ہے کہ قاضی عبدالغفار مرحوم مدیر روزنامہ پیام نے اس کی پہلی کتاب کا دیباچہ لکھا۔ پاکستان آتے ہی اس کی جسطرح پذیرائی کی گئی کسی ادیب و شاعر کی نہیں ہوئی۔ بلاشبہ جلیس ایک شخصیت تھا۔ بہت بڑی شخصیت ۔ دلکش، مقبول، معروف اور محبوب جلیس نے دنیائے ادب کو کا ملاً خیرباد تو نہ کہا تھا مگر جب وہ دنیائے صحافت میں داخل ہوا تو اس کی زندگی کا یہ موڑ پیچیدہ بھی تھا اور کٹھن بھی ■

(مرزا ظفر الحسن ۔ کراچی)

مجیب خیرآبادی
(پاکستان)

مرا جلیس مرا ہم وطن مرا ہمدم

(محبی محبوب حسین جگر ۔ اپنے اور پاکستان کے آنسو آپ کی اور اہل دکن کی نذر ہیں)

سسکیاں بھرتے ہوئے آج صبا نے یہ کہا
کسمپری میں وہ پیمانۂ جان ٹوٹا ہے
کیا خبر کون سی ٹوٹی تھی قیامت دل پر
ناگہاں، سلسلۂ نطق و بیان ٹوٹا ہے

اس نے چاہا تھا مساوات کے در بند نہ ہوں
فکر انجام رفیقان کا گنہگار ہوا
جب نظر آ نہ سکیں دھند میں لپٹی راہیں
ایک دو گام بھی چلنا اسے دشوار ہوا

ایسے عالم میں، فضائیں ہوں جہاں زہر آلود
ایک معصوم سا انسان بھلا کیسا جیتا!
کتنی بے رحم ہواؤں نے ڈسا تھا اس کو
یوں بھی حالات کا زہر اب کہاں تک پیتا!

کتنی ہی آنکھوں نے رو لے ہیں گہر اس کے لئے
کتنے دیوار و در و بام صدا دیتے ہیں
چہرۂ وقت پہ ہے رنگِ خجالت کیا کیا
کل کے دشمن بھی اسے آج دعا دیتے ہیں

جب بھی آزادیٔ اظہار پہ آنچ آئے گی
دوستو! اس کا چلن راہ نما ٹھہرے گا
تیرہ و تار نظر آئے گا جب دشتِ سفر
مشعلِ نور، وہ نقشِ کفِ پا ٹھہرے گا

کل جو نذرانۂ جاں دے کے گیا ہے لوگو!
دل یہ کہتا ہے کہ مرحوم نہیں ہے وہ شخص
شوخیٔ طرزِ نگارش سے رہے گا زندہ
اب یہ بات اور، کہ پیوندِ زمیں ہے وہ شخص

اب بھی ہر لمحہ یہ احساس فروزاں ہے مجیب
چھیڑنے آئے گا ابھی آ کے جنانے گا جلیس
نسل در نسل جنوں عام کرے گا اپنا
ابھی دنیا زمانے کو سکھائے گا جلیس

بہ یاد ابراہیم جلیس

وہ گلِ برگ دکن کی خاکِ دانش کا سجن تھا
جسے عثمانیہ نے رنگ و بو بخشا
وہ ایسی سرزمیں کا سانولا اہلِ قلم تھا
جس کی خوشبو سے گلستانِ دکن باغِ ارم تھا
بہاروں میں چمن اُجڑا کچھ ایسا
فسانہ بن گیا حرفِ جنوں بھی

قلم لکھتا رہا ایسی کہانی
جس کا لہجہ زہر میں ڈوبا ہوا تھا
اُسے جس نے پڑھا، جب بھی پڑھا ہے
خرد مندوں کے حق میں تازیانہ ہی لگا اسلوبِ فن اس کا
قلم کیا چھینتے طوق و سلاسل، وہ جیتا اور مسیحا بن کے

وہ افسانہ کہ ملکوں کی کہانی بن گیا ہے
نہ مٹنے والی اک ایسی نشانی بن گیا ہے ●●

وقار خلیل

سب رنگ — اس عنوان کے تحت ہند و پاک کے معیاری ادبی رسائل و کتب سے مضامین نظم و نثر کا انتخاب شائع ہوا کرے گا (ادارہ)

ابراہیم جلیس

آٹوگراف

دُنیا کے بڑے لوگ دو چیزوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ ایک تو غیر طبعی موت اور دوسری آٹوگراف بک۔ چنانچہ میں اکثر یہ دیکھتا ہوں کہ وہ جب کبھی کسی پبلک مقام پر آتے ہیں تو خاص طور پر اس بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ انھیں مشتبہ لوگوں اور آٹوگراف شکاریوں سے محفوظ رکھا جائے لیکن یہ بھی میرا مشاہدہ ہے کہ بڑے اور مشہور آدمی مشتبہ لوگوں کی بندوق اور پستول کی گولی سے اکثر بچ جاتے ہیں لیکن آٹوگراف شکاریوں سے کبھی نہیں بچ سکے۔ آٹوگراف شکاری بالعموم اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکیاں اور لڑکے ہوتے ہیں جن کے بارے میں ساری دنیا میں یہ مشہور ہے کہ شیطان بھی ان سے پناہ مانگتا ہے جبھی تو کسی کی شہرت کے بارے میں اندازہ لگاتے وقت یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ

"ارے وہ تو شیطان سے بھی زیادہ مشہور ہے"

یہاں شیطان کا ذکر صرف برسبیل تذکرہ آگیا ہے ورنہ "شیطان را بہ آٹوگراف چہ کار"

مگر ایک بات ہے آٹوگراف شکاری اس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں جب کہ ساری دنیا کے بچے علم کی روشنی سے مستفید ہو رہے ہیں اور وہ دنیا کے ابتدائی ادوار کے بچوں کی طرح جاہل نہیں ہیں، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اب اگر انہیں کہیں شیطان نظر آجائے تو وہ اس کے کان دان نہیں کاٹیں گے بلکہ اپنی اپنی آٹوگراف بک اس کے سامنے پیش کر دیں گے لیکن اس حسنِ سلوک کے باوجود بھی شیطان اپنے کانوں کو لگائے گا یا اپنے کان کھجائے گا، کیونکہ یہ راز تو دنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ شیطان کو پڑھنا لکھنا نہیں آتا۔ اگر شیطان کو پڑھنا لکھنا آتا تو پھر وہ شیطان کاہے کو ہوتا کم ازکم کوئی رجعت پسند ادیب تو ضرور ہوتا۔

موجودہ دنیا میں جہاں علم کا نور ماسکو جیسے ترقی یافتہ شہر سے لے کر کھٹمنڈو جیسی پسماندہ آبادی تک پھیل گیا ہے۔ کتاب زندگی کا لازمہ بن گئی ہے۔ اب شاید دنیا کا کوئی ایسا گھر ہو جہاں کوئی کتاب نہ ہو۔ اسی طرح بہت کم طالب علم ایسے ہوں گے جن کے پاس آٹوگراف بک نہ ہو۔ پھر کم ازکم جس گھر کے والدین کے پاس ایک چیک بک ہو تو پھر یقیناً اس گھر کے بچے کے پاس آٹوگراف بک بھی ضرور ہوگی۔

دنیا کے بڑے اور مشہور آدمیوں کے آٹوگراف حاصل کرنا موجودہ دنیا کے خوشحال والدین کے بچوں کا ایک محبوب مشغلہ ہے۔ یوں تو ڈاک کے ٹکٹ کھیلوں کی تصویریں، ماچس اور سگریٹ کی ڈبیوں کے لیبل اور ملک ملک کے نئے اور پرانے سکے وغیرہ جمع کرنا بھی موجودہ دنیا کے طالب علموں کے محبوب مشغلے ہیں۔ لیکن بڑے آدمیوں کے آٹوگراف جمع کرنے کے مشغلے نے عالمگیر مقبولیت حاصل کرلی ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے اس کے لئے بڑی جد و جہد کرتے ہیں۔ جب بھی کوئی بڑا آدمی کسی منظر عام پر آتا ہے تو اس کا آٹوگراف حاصل کرنے کے لئے اکثر اوقات انھیں بزرگوں کی گھڑکیاں بھی سننی پڑتی ہیں اور کبھی کبھی پولیس کی لاٹھیاں بھی کھانی پڑتی ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ اس کے باوجود وہ بڑا آدمی ان ننھے شکاریوں کی آٹوگراف کا پیوں کے جال سے بچ کر نکل جائے۔ میں کراچی کے ایک رئیس زادے طالب علم مسٹر حسن علیانی کو جانتا ہوں جو صرف مسٹر آر۔ کو سیلا کا آٹوگراف لینے کے لئے کراچی سے جاپان کے دارالحکومت ٹوکیو تشریف لے گئے تھے۔ ممکن ہے کہ مرحلہ جات بیان [illegible]

سے ہم آغوش نظر آتی ہو، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آٹوگراف شکاری آٹوگراف کی خاطر کبھی کبھی اپنی پیاری جان کو بھی خطرے میں ڈالنے سے باز نہیں رہ سکتا، چنانچہ میری زندگی کا ایک ایسا ہی واقعہ ہے۔ ہوا یہ تھا کہ مرحوم ریاست حیدرآباد دکن کے ایک وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد بستر مرگ پر لیٹے ہوئے تھے اور سارے حیدرآباد میں یہ شہرہ تھا کہ بس اب انکا چل چلاؤ ہے۔ اب گئے اور تب گئے۔ میں نے سوچا کہ کم از کم اب ان کا آٹوگراف لے لینا چاہیئے ورنہ پھر ہمیشہ کے لئے کف افسوس ملنا پڑے گا۔ چنانچہ میں کسی نہ کسی طرح ان کے بستر مرگ تک پہنچ گیا اور ان کے آگے فاونٹین پن اور آٹوگراف بک بڑھادی۔ ان کے رشتہ داروں، مصاحبوں اور نوکروں کو جب معلوم ہوا تو انھیں بڑا غصہ آیا۔ انھوں نے یہ سمجھا کہ جیسے میں کوئی مذاق کرنے آیا ہوں اس پر ان لوگوں نے مجھے اتنا مارا کہ میں بے ہوش ہوگیا۔ جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ مہاراجہ کشن پرشاد آٹوگراف دیئے بغیر ہوش وحواس کی دنیا سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ اس واقعہ کو بھی سخن سازی پر محمول کروگے لیکن ایمان سے یہ سخن سازی نہیں ہے۔

بڑے آدمیوں کی آٹوگراف حاصل کرنے کا شغل ایک حد تک ایک عالمگیر وبا کی حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ اس وبا میں دنیا کی ہر خوشحال لڑکی اور لڑکا مبتلا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ آخر بڑے آدمیوں کے دستخط میں ایسی کیا خوبی ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لئے اسکول کا طالب علم اتنا بے چین رہتا ہے؟ اس سوال کا جواب بلکہ کئی جواب ہوسکتے ہیں لیکن معقول جواب آج تک نہیں مل سکا۔ کسی حد تک معقول جواب ہوسکتا ہے کہ دنیا کے ہر بڑے آدمی کی ہر چیز بڑی قیمتی اور ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے جانے کے لائق ہوتی ہے چاہے وہ اس کے ٹیڑھے میڑھے دستخط ہی کیوں نہ ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آٹوگراف بک "پندنامہ" قسم کی کتابوں کی طرح ایسا "نصیحت نامہ" ہوتی ہیں جو اسکول کے نوعمر طالب علموں کے خام ذہنوں پر ایسا اچھا اثر ڈالتی ہیں جو ان کی مستقبل کی زندگی کو سنوارنے میں مدد دیتی ہیں۔ چنانچہ میں ایک اور بات بتاؤں کہ جب میں اسکول کا طالب علم تھا ان دنوں مجھے ہندوستان کے مشہور شاعر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا آٹوگراف لینے کا موقع ملا۔ ڈاکٹر ٹیگور نے آٹوگراف دینے سے پہلے لکھا

"کردار انسان کی تقدیر ہے۔ ٹیگور"

یہ جملہ میرے موم جیسے خام ذہن پر پتھر کی لکیر کی طرح ثبت ہوگیا۔ چنانچہ اب پندرہ برس گذر چکے ہیں۔ پتہ نہیں وہ آٹوگراف بک کہاں ہے؟ لیکن ڈاکٹر ٹیگور کی وہ نصیحت مجھے ابھی تک یاد ہے اور اس نے جیسے بچپن ہی سے میری زندگی بدل دی۔ اور اب کم از کم میں ایک صاحب کردار نہ سہی بدکردار بھی نہیں ہوں اور کردار میری قسمت کو دن بدن بناتا چلا آرہا ہے۔ اسی ایک آٹوگراف کے حوالے سے میں یہ دعوی کرسکتا ہوں کہ کبھی کبھی ایک آٹوگراف ایک انسان کی زندگی کو یکسر بدل دیتا اور بہتر بنا دیتا ہے۔ بحیثیت مجموعی میری نظر میں آٹوگراف بک ایک ایسی شفیق ماں ہوتی ہے جو ہر دم اپنے بچوں کو نصیحت کرتی رہتی ہے تاکہ وہ ان نصیحتوں کی روشنی میں اپنی زندگی کو صحیح ڈگر پر ڈال سکیں۔ (اگر ایک طرف آٹوگراف بک لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ناصح اور مشعل راہ حیات کا کام دیتی ہے تو دوسری طرف وہ بڑے آدمی کی حاضر دماغی کا بھی ایک امتحان گاہ ہے آٹوگراف بک ایک نہایت مختصر ترین عرصے کے لئے بڑے آدمی کے پاس جاتی اور اسی مختصر ترین لمحے میں حاضر دماغ آدمی کوئی معرکۃ آلارا جملہ یا شعر لکھ کر اس طرح دستخط کرتا ہے جیسے اپنی حاضر جوابی کا سکہ بٹھا رہا ہو۔ اس کے برعکس غیر حاضر دماغ بڑا آدمی صرف دستخط ثبت کرکے گویا مکھی مارتا ہے۔ اس بات کا پتہ لگانے کے لئے کون بڑا آدمی ہر وقت حاضر دماغ اور کون ہر وقت غائب دماغ رہتا ہے آٹوگراف بک بڑی مفید ثابت ہوتی ہے۔ اور تو اور بعض ماہر نفسیات آٹوگراف کے ساتھ لکھے ہوئے جملوں اور اشعار سے بڑے آدمیوں کی موجودہ الوقت ذہنی کیفیت اور حالت بلکہ کردار کا بھی اندازہ لگاتے ہیں۔ مثلاً ہندوستان کی مشہور شاعرہ اور خطیبۂ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے ایک آٹوگراف بک پر یہ جملہ لکھا تھا۔

[illegible] لکھوں؟ اور کیا لکھوں؟ اور پھر لکھنے سے فائدہ! جب پڑھنے والی نگاہوں کی تو افراط ہے اور محسوس کرنے والوں کا فقدان۔
— سیدہ اختر خلیبۂ ہند ۲/ اگست ۴۳ء

اس آٹوگراف سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خطیبۂ ہند لکھنے لکھانے سے عاجز آ گئی ہیں اور انہیں اپنے قارئین کرام سے شدید مایوسی ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ اس کے باوجود وہ مایوسی کو کفر سمجھتی ہیں اور برابر اور بے تحاشا لکھے جا رہی ہیں۔

ایک نوجوان لڑکی کے ایک آٹوگراف بک پر ایک شاعر صاحب نے جن کا نام مصلحتاً حذف کیا جا رہا ہے۔ جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ ایک اجنبی لڑکی کی آٹوگراف بک ہے یہ شعر لکھا ؂

اجازت ہے تمہارا نام لکھ دوں　　　میرے دل کا ورق سادہ ہے اب تک

وہ لڑکی سمجھدار تھی۔ اس قسم کا آٹوگراف دیکھنے کے بعد اس نے ان شاعر صاحب کے کردار کا اندازہ کر لیا۔ اور ان کے آٹوگراف والے صفحے کو پھاڑتے ہوئے یہ کہا کہ "اس سے بہتر ہے کہ میری آٹوگراف بک کے سارے ورق سادہ ہی رہیں"۔

پچھلے دنوں مجھے ایک بڑی دلچسپ آٹوگراف بک دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں ایک خاص مقصد کے تحت بڑے آدمیوں کے آٹوگراف جمع کئے گئے تھے۔

وہ خاص مقصد یہ تھا کہ　بڑے آدمیوں کی ایک دوسرے سے پوشیدہ چشمک کو کسی منظرِ عام پر پیش کیا جائے۔ تاکہ اس کے بعد بڑے آدمیوں میں ایک دوسرے کے خلاف رنج، شکوہ اور نفرت کے جذبات پیدا ہوں تاکہ بقول آٹوگراف بک کے مالک کے "ذرا تفریح رہے"۔ مجھے اس دلچسپ شرارت اور خطرناک تفریح کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کے چند صفحات کا مطالعہ یقیناً ایک دلچسپ مطالعہ ہے۔

اس آٹوگراف بک کے تیسرے صفحے پر ابوالاثر حفیظ جالندھری کا ایک آٹوگراف ہے

مصرع سنا ہے میں نے اک نیک آدمی سے　　عزت کی موت بہتر ذلت کی زندگی سے
حفیظ　۱۳-۴-۴۹ء

اس کے محاذی صفحے پر مجید لاہوری کا ایک جملہ درج ہے۔

"جو مصرع یا نصیحت سنو اس پر خود بھی عمل کرو"　مجید لاہوری　۱۲-۸-۴۹ء

پانچویں صفحے پر اردو کے مشہور افسانہ نگار مہندر ناتھ کا آٹوگراف ہے

زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں　　　مہندر ناتھ　۱۲-۷-۴۶ء

چھٹے صفحے پر ماہر القادری نے لکھا تھا۔

آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار　　　ماہر القادری　۲۴-۵-۴۹ء

۳۲ ویں صفحے پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"اردو زندہ باد"　　　عبدالحق

۳۳ ویں صفحے پر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے جواب دیا۔

"ہندی ہندوستان کی قومی زبان ہے"　　　پرشوتم داس ٹنڈن

(واضح رہے کہ بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے مدھ جمد اردو رسم الخط میں لکھا ہے)

۴۸ ویں صفحے پر مشہور ترقی پسند شاعر اسرار الحق مجاز نے لکھا ہے۔

میرا ایں رندی مجاز ایک شاعر مزدور و دہقاں ہے اگر شہروں میں وہ بدنام ہے بدنام رہنے دے مجاز

۴۹ ویں صفحے پر کسی فاضل جبلپوری نے طنز کیا ہے۔

"رندی اور مزدور دہقان کی شاعری ترقی پسند ادب ہے"

۵۰ ویں صفحے پر سجاد ظہیر کا آٹو گراف ہے۔

"کھل رہا ہے عہد نو کا سرخ پھول" سجاد ظہیر

۵۱ ویں صفحے پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے دستخط ہیں۔

"اسلام اشتراکیت سے ہزار درجہ بہتر نظامِ حیات ہے" ابوالاعلیٰ مودودی

۵۹ ویں صفحے پر مشہور اشتراکی ادیب سبط حسن نے لکھا ہے۔

زندگی کے جسم پر کوئی سفید بال نہیں۔ سبط حسن

۶۰ صفحے پر کسی سکندر فہیم نے مایوسی کا اظہار کیا ہے

زندگانی کا کیا بھروسہ ہے زندگی اک حباب ہے بھائی

۶۱ ویں صفحے پر آٹو گراف بک کے مالک نے اردو کے مشہور طنز و مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ایک قلمی تصویر یعنی پنسل اسکیچ اتارا ہے۔ اس پر پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے۔

"اس سے تو یہ بہتر ہوتا کہ آپ یہاں اپنی تصویر بناتے اور نیچے میرا نام لکھ دیتے" رشید صدیقی

۶۲ ویں صفحے پر مشہور افسانہ نگار ہاجرہ مسرور نے لکھا ہے۔

"جس گھر میں نوجوان لڑکی ہوتی ہے اس گھر کے والدین کو ہوا کے جھونکے سے بھی ڈر لگتا ہے" ہاجرہ مسرور

۶۴ ویں صفحے پر شوکت تھانوی نے ایک بات پیدا کی ہے۔

"مسلمان لڑکیاں شادی کے غم میں بتاشوں کی طرح گھلتی رہتی ہیں" شوکت تھانوی

۶۵ ویں صفحے پر کرشن چندر کی اک تمنا ہے۔

"ہائے وہ لمحہ جو کٹ کر کائنات بن جائے"۔ کرشن چندر

۶۶ ویں صفحے پر عادل رشید کی بھی ایک تمنا ہے۔

"کاش زندگی کرشن چندر کے افسانے کی طرح خوبصورت ہوتی" عادل رشید

۶۷ ویں صفحے پر سوویت روس کے مشہور ادیب ایلیا اہرن برگ نے لکھا ہے۔

"اگر کسی گیدڑ کے سامنے ٹائپ رائٹر رکھ دیا جائے تو وہ بورژوا ادیب کی تحریر لکھ سکتا ہے" ایلیا اہرن برگ

۶۸ ویں صفحے پر [illegible] کے سامنے [illegible] جلتے ہوئے کراچی کے ہوائی اڈے پر یہ آٹو گراف دیا ہے۔

ایلیا اہرن سوویٹ ادب کا ڈاکٹر گریبلن ہے" سامرسٹ ماہم کراچی ایڈیٹ

اور پھران سب آٹوگراف کا شاید بغور مطالعہ کرنے کے بعد آٹوگراف بک کے آخری صفحے پر شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے یہ تبصرہ فرمایا ہے۔

"یہ بیاض ایک ایسا اصطبل ہے جس میں عربی گھوڑے اور خچر ساتھ ساتھ بند ہیں۔" جوش مرحوم

اور اسی تبصرہ کے بالکل نیچے اُردو کے ایک شاعر ساغر نظامی نے جوش صاحب پر ہاتھ مارا ہے۔

"الٰہذے بورژوائیت! زندہ باد شاعر انقلاب" ساغر نظامی

اس پر فراق صاحب نے ایک بڑی زہریلی دستخط ماری

"چور کی داڑھی میں تنکا" فراق

ان چند صفحات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آٹوگراف بک کا مالک کیسی شرارت پسند فطرت کا مالک ہے۔ میں نے اس آٹوگراف بک سے صرف ان صفحات کو پیش کیا ہے جن میں بڑے اور مشہور آدمیوں بلکہ ادیبوں کی شوخ لیکن بے ضرر قسم کی نوک جھونک ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کبھی یہ آٹوگراف بک مکمل حالت میں طبع ہو کر شائع ہوجائے تو پھر بلا شبہ عہد حاضر کے بہت سے بڑے آدمی ایک دوسرے کے جانی دشمن اور خون کے پیاسے ہوجائیں۔ اسی آٹوگراف بک کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ابھی ابھی ایک طالب علم کے آٹوگراف بک پر لکھا ہے:۔

"ساری دنیا کے بڑے آدمیو! متحد ہوجاؤ اور ڈرو اس ننھی سی کتاب سے جو تم پر ہمیشہ نازل ہونے والی ہے۔"

بقیہ کرشن چندر کا فن صفحہ ۱ سے آگے

"منتخب الحکایات" جان گلکرائسٹ کے جمع کردہ "قصص مشرق" عبدالحلیم شرر کی نیم تاریخی و نیم رومانی کہانیاں، یلدرم کے رومانی قصے اور نیاز اور مجنوں کی جذباتی اور داخلی زندگی سے متعلق افسانے ضرور پڑھے ہوں گے۔ یہ بات تو وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے پریم چند کو دیکھا ہے، پڑھا ہے اور تاثر قبول کیا ہے۔ میری بات کے ثبوت میں ان کے سارے ہی افسانے پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اور کرشن چندر نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا ہوگا اس وقت بھی ان کا مطالعہ جاری رہا ہے، چنانچہ انھوں نے احمد ندیم قاسمی، ممتاز شیریں، حیات اللہ انصاری، عزیز احمد، احمد علی، منٹو، عصمت، اختر انصاری، خواجہ احمد عباس، اختر حسین، اوپندر ناتھ اشک اور قرۃ العین حیدر سے لے کر واجدہ تبسم، جیلانی بانو، بیدی، شوکت تھانوی، رام لعل، اقبال مجید، اقبال متین، عابد سہیل اور جوگندر پال کو پڑھا ہوگا۔ چونکہ کرشن چندر مطالعہ اور مشاہدہ کے قائل تھے اور اسے ہمیشہ تازہ بہ تازہ رکھنا ہی چاہتے تھے اس لئے یہ بات بھی [illegible] سریندر پرکاش، بلراج مینرا، رشید امجد، انور سجاد، احمد رشید، کمار پاشی، غیاث احمد گدی، اکرام باگ اور احمد جیش کو بھی [illegible] ضرور پڑھا ہی ہوگا ــــ اردو افسانہ بہت مختصر ہے اور اس کی تاریخ بھی مختصر ــــ لیکن اس مختصر فن کو جس نے [illegible] میں پریم چند ہیں اور دوسرے دور میں کرشن چندر۔ پریم چند سے افسانہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے [illegible] پر افسانہ ختم ہوگیا۔"

مواقعات کی دیوی چشم براہ ہے

ہندوستانی اُفق پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی کہانی بڑی دلکش و دلفریب ہے۔ ہندوستان میں گذشتہ دو دہے ایک عظیم صنعتی انقلاب کے آغاز کے شاہد ہیں۔

ہماری ریاست میں صرف دیوقامت اور دقار افروز صنعتوں پر ہی زور نہیں دیا جاتا ہے بلکہ چھوٹی صنعتیں بھی بھرپور توجہ کی مستحق سمجھی گئی ہیں۔ ریاست گیر اور پُرزور مہموں کے ذریعہ چھوٹی صنعتوں کی ترقی کو زبردست بڑھاوا دیا گیا ہے۔

مارچ ۱۹۷۷ء کے ختم تک ان مہموں نے ریاست کے پورے ۲۱ اضلاع کا احاطہ کر لیا جس کے نتیجے میں ۲۳ء۲۸ کروڑ روپے معروف شدنی سرمائے سے تقریباً ۳۵۲۰ یونٹوں کا تعین عمل میں لایا گیا

خود روزگار اسکیمات کی کامیاب عمل آوری کے معاملے میں آندھرا پردیش ہندوستان کی صف اوّل کی ریاستوں میں شمار ہوتا ہے۔ سال ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران میں ۴۲۰ء۰۷ لاکھ روپیوں کے سرمائے سے تقریباً ۱۸۵۸ صنعتی یونٹیں قائم کی گئیں۔

سال ۱۹۵۶ء میں موجودہ ریاست کی تشکیل کے وقت صرف ۴۵ اوسط اور چھوٹی صنعتیں موجود تھیں جن میں معروف سرمائے کی مقدار ۴۸ کروڑ روپے تھی۔ آج ہمارے یہاں ۲۴۸ بڑی اور اوسط صنعتیں قائم ہیں جن میں ۲۲۵ کروڑ روپے کا سرمایہ لگا ہوا ہے۔

آندھرا پردیش میں مواقعات کی دیوی اپنی پوری دلربائی اور رعنائی کے ساتھ نئے میدانوں کے متلاشی صنعت کاروں کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ ہے۔

ناظم محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ

آندھرا پردیش - حیدرآباد

1266/ANT/69/77-22

نقد و نظر

(تبصرے کیلئے ہر کتاب کی دو جلدوں کا آنا ضروری ہے)

کتاب :۔ "غواصی شخصیت اور فن" از محمد علی آثر صفحات (۲۳۲) مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲/ روپے، اشاعت ۱۹۷۷ء ۔ ملنے کا پتہ ، اردو اکیڈیمی بکڈپو ۔ سیف آباد ۔ حیدرآباد ۔ ۵۰۰۰۰۴

دکنی شعر و ادب کے بارے میں ایک عرصہ تک تحقیق بہت زیادہ کی گئی تھی، تنقید کم۔ لیکن اب جب کہ تحقیق کے نتیجے میں دکنی ادب کے کئی گنجہائے گراں مایہ اردو ادب میں موقر اور معتبر اضافوں کا باعث ہوئے ہیں، تنقید کی سمت بھی کماحقہٗ توجہ دی جارہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ گذشتہ دو ایک دہوں سے تاریخی طور پر ہی نہیں ادبی حیثیت سے بھی تاریخ ادب میں دکنی شہ پاروں کا اپنا ایک مقام بنتا جارہا ہے۔ دکنی ادب کے سلسلہ میں تحقیق کے آغاز کا سہرا جامعہ عثمانیہ اور اس کے مایہ ناز سپوتوں کے سر رہا اور آج بھی اسی خاک پاک سے اٹھنے والے کسی ستائش کی تمنا اور صلہ کی پرواہ کئے بغیر دکنی ادب کی تحقیق اور تنقید کے میدان میں پیش پیش ہیں اور مجموعی طور پر اردو ادب کے سرمایہ کو اور وسیع اور وسیع کرتے جارہے ہیں۔ محمد علی آثر جیسا کہ ڈاکٹر غلام عمر خاں نے اپنے تعارف "میں تحریر کیا ہے، دکنی شاعری سے غیر معمولی دلچسپی رکھتے ہیں۔ آثر کی یہ کتاب "غواصی شخصیت اور فن" دکن کے ایک عظیم شاعر غواصی کی شخصیت اور فن پر ان کا وہ مقالہ ہے جسے موصوف نے ام۔اے (آخری) کے چوتھے پرچے کی بجائے تحریر کیا تھا۔ یہ کتاب دکنی ادب پر تحقیق سے زیادہ تنقیدی نقطۂ نظر کی غمازی کرتی ہے۔ غواصی اپنے عہد کا نامور اور عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اپنے ہمعصر اور بیشتر دکنی شاعروں کی طرح اس کی شاعری حسن و جمال کی شاعری ہے لیکن پُر شکوہ زبان، الفاظ کی نشست و برخاست میں بانکپن، مصرعوں کے در و بست میں ندرت، تشبیہات و استعارات کے فنکارانہ استعمال اور مجموعی طور پر پُر وقار شعری دلکشی کے باعث اس کا کلام دکنی ادب کا ایک قابل فخر حصہ بن چکا ہے۔ آثر نے غواصی کے عہد کے سماجی حالات اور ادبی پس منظر کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے حالات زندگی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ غواصی کی مثنویوں، قصیدوں، غزلوں اور رباعیوں کا بھی سیر حاصل تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ مزید برآں اس کے ہم عصر شاعروں کے کلام سے تقابلی مطالعہ کے باعث غواصی اور اس کے عہد کو سمجھنے میں مزید مدد ملتی ہے۔ آخر میں دکنی شاعری میں غواصی کے مقام کو متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غواصی کے کلام کا بڑا حصہ غیر مطبوعہ ہے۔ اس رعایت سے اس کے کلام کے انتخاب کی شمولیت نے کتاب کی وقعت میں کچھ اور اضافہ کر دیا ہے۔ دکنی شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب یقیناً مفید ثابت ہوگی۔ کتاب سلیقے سے شائع کی گئی ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔ (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

کتاب :۔ مطالعہ کیوں اور کیسے ؟ از :۔ ضیاء الدین احمد شکیب [illegible] صفحات [illegible]
قیمت ۱۲/ ناشر : ادارۂ ساز ادب ۔ حیدرآباد

ضیاء الدین احمد شکیب کی کتاب کا یہ عنوان قدرے اجنبی لگتا ہے اور ممکن ہے بیشتر اصحاب یہ سوچ کر اس کتاب کا مطالعہ کریں کہ آخر ہم نے تو اب تک اس "کیوں اور کیسے" کے بغیر مطالعہ کیا ہے۔ اب ایسا کیا ضروری ہے کہ [illegible]

کیسے" کے چکر میں پڑیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے، کم از کم اپنے مطالعہ کو دلچسپ، مفید اور بامقصد بنانے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے شکیب صاحب نے اس موضوع پر بڑے دلآویز انداز میں قلم اٹھایا ہے اور خاصے سائنٹفک طریقے سے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن کے باعث کوئی قاری اپنے مطالعہ کو بہتر مطالعہ میں تبدیل کر سکتا۔ اور اس سے محظوظ ہو سکتا ہے۔ غیر ضروری مطالعہ سے پہلو تہی کی جا سکتی ہے۔ مطالعہ برائے مطالعہ سے دور رہ کر اپنے مطالعہ میں معنویت اور گہرائی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کم سے کم مطالعہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جا سکتا ہے اور مطالعہ کو زندگی دوست قدروں سے ہم روش کیا جا سکتا ہے۔ شکیب صاحب نے انداز بیان سلیس اختیار کیا ہے اور چھوٹی چھوٹی سرخیوں کے تحت عام فہم پیرایہ میں ایسی باتیں تحریر کی ہیں کہ دلنشین ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً طالب علموں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ انگریزی میں تو ایسی کتابیں کئی مل جائیں گی لیکن ظاہر ہے اردو میں ایسی تصانیف انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ کتابت، طباعت اور کاغذ عمدہ ہیں۔ قیمت کچھ کم ہوتی تو اچھا تھا۔ (ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید)

مجلہ: **اقبال ریویو (سہ ماہی)** } مجلس مشاورت: ڈاکٹر عالم خوندمیری، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، ڈاکٹر مرزا صفدر علی بیگ، سید عباس رضوی   مجلس ادارت: محمد ظہیر الدین احمد، میر محمد خان، یوسف اعظمی   مدیر: محمد منظور احمد   زر سالانہ ۱۶ روپئے۔

پتہ: اقبال اکیڈمی ۔ مدینہ منشن نارائن گوڑہ ۔ حیدرآباد۔

حیدرآباد کبھی اقبال کے خوابوں کا مرکز تھا لیکن سیاسی تبدیلیوں کے نتیجہ میں نئی نسل رفتہ رفتہ اقبال سے دور ہوتی گئی۔ موجودہ زمانہ میں کلام اقبال کا تہذیبی اور مذہبی پس منظر میں مطالعہ جاری ہے اور یہ بات غنیمت ہے۔ خصوصاً پچھلے چند برسوں میں اقبال اکیڈمی نے "درس اقبال" کا جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے وہ اقبال کے شیدائیوں اور اس کے چاہنے والوں کے لئے غیر معمولی بات ہے۔ "اقبال ریویو" (سہ ماہی) کی اشاعت بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اور مستحسن ہے۔ اس کی وجہ سے علمی و ادبی سطح پر اقبال کی نئی دریافت اور تشکیل میں مدد ملے گی اور فکر و خیال کی قندیلیں بھی روشن ہوں گی۔ "اقبال ریویو" کے اس پہلے شمارہ کی مشمولات باوجود اس کے کہ بہت مختصر ہیں لیکن موضوع اور مواد کے اعتبار سے وقیع بھی ہیں اور اہم بھی خصوصاً ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر حفیظ قتیل، اور جگن ناتھ آزاد کے مضامین اقبالیات کے نئے گوشوں کو روشن کرتے ہیں جبکہ محمد ذکی الدین احمد کا مضمون معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ اور اقبال کی شخصیت کا صحیح تعارف بھی کراتا ہے۔ دیگر مضمون نگاروں میں ڈاکٹر ضیاء الدین احمد شکیب، ڈاکٹر صفدر علی بیگ، مصلح الدین سعدی اور رفیع روف شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اقبال اور عصری تقاضے کے زیر عنوان سمپوزیم بھی شامل ہے جس کے شرکاء ہیں پروفیسر محمد صلاح الدین اور سراج الدین یہ ایک مفید اور اہم موضوع ہے اور اس سلسلہ کو آئندہ بھی جاری رکھا جائے تو مناسب رہے گا۔

جناب منظور احمد کی ادارت میں جو ادبی صحافت کا تجربہ بھی رکھتے ہیں اقبال ریویو شائع ہوا ہے۔ ۹۶ صفحات پر مشتمل پہلے شمارے اکتوبر کی قیمت پانچ روپیہ ہے جو ظاہر ہے بہت زیادہ ہے ایک ادارہ سے شائع ہونے والے اس مفید رسالہ کو عام بنانا ضروری ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ قیمت کی کمی کی طرف توجہ دیں۔ یقین ہے "اقبال ریویو" کا علمی و ادبی دنیا کی طرف سے بہتر خیر مقدم کیا جائے گا یہاں اس امر کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ "اقبال ریویو" کے ہر شمارہ میں اقبالیات کے موضوع پر تحریروں اور تصانیف پر مبنی "اقبال نما" بھی مختلف رسائل و کتب کے حوالوں سے قسط وار شامل کیا جائے۔ (طیب انصاری)

کتاب :۔ نارائن راؤ مصنف اڑدی باپی راجو مترجم : من موہن تلخ
ناشر : ساہتیہ اکاڈمی ۔ رویندرا بھون' نئی دہلی ۱؎ قیمت ۲۰ روپیہ

چار حصوں پر مشتمل یہ تلگو ناول آندھرائی تاریخ و تہذیب اور رسم و رواج کی آئینہ دار ہے۔ اس طویل ناول کا با محاورہ ترجمہ جناب من موہن تلخ نے بڑی کاوش اور دلجمعی سے کیا ہے۔ دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب سے اردو دان افراد کو روشناس کرنے کا جو اقدام ساہتیہ اکاڈمی نے کیا ہے وہ قابل مبارکباد ہے کہ اب تک ترجموں کے لئے صرف مغربی ادب کو ہی پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اس اقدام سے نہ صرف اردو ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہو رہا ہے بلکہ اردو دان افراد ہندوستان میں بولی جانے والی صوبائی زبانوں کے ادبی رجحانات سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ زیر تبصرہ ترجمے کی کتابت اچھی طباعت نفیس اور کاغذ بہترین ہے۔ اور یہ خصوصیات ساہتیہ اکاڈمی کا اجارہ بنتی جا رہی ہیں (غلام جیلانی)

کتاب :۔ یارانِ شہر طیب انصاری کے ادبی خاکوں کا دوسرا مجموعہ ' سلسلہ مطبوعات ادارہ ادبیات اردو نمبر ۲۱۹
ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت دس روپیہ
ملنے کا پتہ :۔ سب رس کتاب گھر ۔ ایوان اردو ۔ خیریت آباد ۔ حیدرآباد ۴-۰۰۰۵

طیب انصاری کے لکھے ہوئے زیرِ تبصرہ ۳۴ خاکوں کو پڑھنے کے بعد قاری سوچتا ہے کہ ناموں کے انتخاب نے انھیں رسوا تو نہیں کیا۔ حضرت مصحفی کا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

ایک ہم ہیں کہ دیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

اگر طیب انصاری مصوّر ہوتے تو صرف ایسے اصحاب کا انتخاب کرتے جنھیں تصویر بنا آتی ہے۔ یا اگر طیب انصاری کارٹونسٹ ہوتے تو صرف ایسے اصحاب کو منتخب کرتے جن میں کارٹون بننے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ چونکہ طیب انصاری ادبی خاکہ نویسی کے ماہر ہیں اس لئے انتخاب میں چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ استاد رسوا کے متعلق کہا جاتا ہے کہ کسی سے خوش ہوتے بھی تو آواز دیتے "غنچے لانا تو قلمدان ہمارا" اور قصیدہ لکھ دیتے۔ اور کسی سے ناراض ہوتے بھی تو وہی صدا دیتے اور پھر ایک "ہجو" تخلیق پا جاتی۔ کچھ اس طرح کا حال طیب انصاری کا ہے۔ اسی لئے ان کی فہرست میں نامور افراد بھی شامل ہیں اور گمنام بھی۔ کسی خاکے میں اعتقاد کی جھلک ہے تو کسی میں اشتعال و بیزارگی کی۔ کسی خاکہ پہ دلوں محنت کی ہے تو کسی پر چلتے چلتے قلم چلا گئے ہیں۔
طیب انصاری کے خاکوں کے دوسرے مجموعے کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا فن پختہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور ہماری دعا ہے کہ " اللہ کرے زور قلم اور زیادہ " سب سے خاص بات یہ ہے کہ سب ہی حیدرآباد والوں کو لوٹ کر جانے کی ادا ان کے خاکوں کا اُفق ہے ۔۔۔۔
(غلام جیلانی)

کریم رضا

حیدرآباد میں اقبال صدی تقاریب

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد ۱۹۵۹ء سے افکار اقبال کی اشاعت میں مصروف ہے۔ نئی نسل کو اقبال سے متعارف کروانے میں اس اکیڈیمی نے جناب سید خلیل اللہ حسینی صدر اقبال اکیڈیمی کی سرگرمگی میں گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اقبال اکیڈیمی حیدرآباد کے زیر اہتمام انجمن ترقی اُردو، ادارہ ادبیات اُردو، اُردو مجلس اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ کے تعاون سے ۹ر تا ۱۲ر نومبر ۷۷ء اقبال صدی تقاریب شاندار پیمانے پر منائی گئیں اس سلسلہ میں نواب کاظم نواز جنگ بہادر صدر مجلس استقبالیہ، جناب حامد علی عباسی، جناب عابد علی خاں اور جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ نائب صدور اور جناب ساطر ملک معتمد استقبالیہ کے علاوہ حیدرآباد کے مختلف سماجی، علمی اور ادبی اداروں سے تعلق رکھنے والے ممتاز اصحاب اور دانشوروں پر مشتمل مجلس استقبالیہ نے ماہ جون ہی سے تیاریوں کا آغاز کیا۔

ان چار روزہ تقاریب کا افتتاح شریمتی شاردا مکرجی گورنر آندھرا پردیش نے کیا۔ یہ پُر اثر اور رنگا رنگ افتتاحی اجلاس ۹ر نومبر کی شام ۶ بجے نمائش کلب کے وسیع ہال میں منعقد ہوا۔ قاری محمد علی صاحب کی قراءت کلام پاک سے کارروائی کا آغاز ہوا۔ وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی پروفیسر جی رام ریڈی نے اس عظیم اجتماع کی صدارت کی۔ پروفیسر رمیش موہن، ڈائرکٹر سنٹرل انسٹیٹوٹ آف انگلش، وزیر قانون و صدر اُردو اکیڈیمی جناب آصف پاشاہ، جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ اور جناب ظہیر الدین احمد نے مخاطب کیا۔

نواب کاظم نواز جنگ نے اپنے خطبۂ صدارت میں پیام اقبال کی تفہیم اور اشاعت کے سلسلہ میں ارض دکن کے کارناموں اور خاص طور پر اقبال اکیڈیمی کی مخلصانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس توقع کا اظہار کیا کہ یہ تقاریب ایک طویل سفر کا مرحلہ ہیں۔

شریمتی شاردا مکرجی گورنر آندھرا پردیش نے ان تقاریب کا افتتاح کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ اقبال پوری نوع انسانی کے شاعر ہیں۔ ان کی فکر مشرق و مغرب کا ایک حسین امتزاج ہے، گورنر نے کہا کہ اقبال کا تصور خودی ایک انقلابی اور حرکی تصور ہے جو زندگی کی تمام جہتوں میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے، شریمتی شاردا مکرجی نے کہا کہ اقبال نے اس وقت برطانوی سامراج کے خلاف آواز اُٹھائی جب کہ سارے ماحول پر ایک طرح کا خوف اور مرعوبیت طاری تھی اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفۂ حیات کو آج کے حالات میں بھی مشعل راہ کی حیثیت حاصل ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ نوجوان نسل میں جس انقلابی جذبے کو بیدار کیا اُس کے احیاء کی آج بھی ضرورت ہے۔

جناب آصف پاشاہ وزیر قانون حکومت آندھرا پردیش نے کہا کہ ہندوستان میں اقبال فہمی اور اقبال شناسی کے ایک تابناک دور کا آغاز ہو چکا ہے اور ماضی میں جو غلط فہمیاں اور تنگ نظریاں حائل تھیں اب دور ہو رہی ہیں۔ پروفیسر رمیش موہن نے اپنے فکر انگیز مقالہ میں کہا کہ اقبال کی شخصیت ایک عظیم فلسفی، بلند پایہ شاعر، ایک مدبر اور باعمل انسان کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ظہیر الدین احمد نائب صدر اقبال اکیڈیمی نے اکیڈیمی کی کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ جناب غلام یزدانی ایڈوکیٹ نے حیدرآباد میں اقبال کی شایان شان یادگار قائم

کرنے کے لئے اقبال ہال کی تعمیر کے منصوبہ کا تذکرہ کیا۔ پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنی دلچسپ صدارتی تقریر میں اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "اقبال چیر" کا قیام ایک اہم یادگار ہوگا۔ مسرز امیر احمد خسرو اور سلمان فاروقی نے اثر انگیز ترنم میں کلام اقبال پیش کیا۔ اس افتتاحی اجلاس کے کنوینر جناب سید مظہر الحق قادری تھے۔ جن کی خصوصی دلچسپی اور جدوجہد کی وجہ سے یہ افتتاحی اجلاس نظم و ضبط اور اعلیٰ معیار کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہا۔

اس افتتاحی اجلاس میں ایک دیدہ زیب اور معیاری سوونیر کی اجرائی بھی عمل میں آئی۔ اس سوونیر کی اجرائی جناب کریم رضا ایڈیٹر اور جناب ام اے سبحان منیجنگ ایڈیٹر کی کوششوں کی رہین منت ہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد نواب شاہ عالم خاں نے نمائش اقبالیات کا افتتاح کیا۔ یہ نمائش انڈور گیمس کے وسیع ہال میں سائنٹفک طریقہ پر ترتیب دی گئی تھی۔ اس نمائش میں اقبال کی پیدائش سے لے کر ان کی تعلیم و تربیت، ذہنی نشو و نما، ان کی تعلیمی، سیاسی اور سماجی زندگی کے پہلوؤں کو واضح کیا گیا۔ ان امور کی وضاحت کے لئے نہایت نادر و نایاب تصاویر، قلمی تحریروں اور چارٹس سے کام لیا گیا۔ اقبالیات کی یہ اعلیٰ نمائش دو حصوں پر منقسم تھی پہلے حصہ میں اقبال کی زندگی، ذہنی نشو و نما اور ان کے کارناموں کو ۱۲ تفصیلی یونٹوں میں مختلف موضوعات کے تحت عہد بہ عہد پیش کیا گیا۔ نمائش کا دوسرا حصہ نایاب و نادر اقبالیاتی لٹریچر پر مشتمل تھا۔ اس نمائش کے کنوینر جناب ظہیر الدین احمد تھے۔

اقبال صدی تقاریب کے دوسرے دن یعنی ۱۰ر نومبر کی صبح ۱۰ بجے پروفیسر وحید الدین کی زیر صدارت "اقبال اور عصریت" کے موضوع پر ایک فکر انگیز سمپوزیم رکھا گیا اس سمپوزیم میں ڈاکٹر انور معظم، جناب سراج الدین، جناب تقی علی مرزا، ڈاکٹر عالم خوندمیری، جناب محمد انور، ڈاکٹر رحیم الدین کمال کے علاوہ مہمان خصوصی جناب علی سردار جعفری نے حصہ لیا۔ ان دانشوروں نے اپنی عالمانہ تقاریر میں اس بات کو پیش کیا کہ اقبال نے ایسی قدریں دی ہیں جو نہ صرف ان کے دور کے لئے اہمیت رکھتی تھیں بلکہ آج بھی بامعنی ہیں۔ اس سمپوزیم میں انسان کی شخصیت کی شکست و ریخت اور جدید مسائل کے روبرو اپنی شناخت کو بچا لینے کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ فلسفہ کے استاد ڈاکٹر عالم خوندمیری نے کہا کہ اقبال کے تصور خودی کا ایک عصری پہلو یہ ہے کہ انسان کو شخصیت کو نہ صرف اپنی تشکیل و تعمیر کرنی چاہئیے بلکہ اس کی حفاظت بھی کرنی چاہئیے۔

اسی دن دوپہر میں ۲ بجے دن سے اقبال کے شعر و آہنگ پر ایک دلچسپ سمینار کا آغاز جناب اختر حسن کی زیر صدارت ہوا۔ اس سمینار میں ڈاکٹر سیّدہ جعفر، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، جناب سراج الدین، ڈاکٹر رضیہ اکبر، جناب مضطر مجاز، ڈاکٹر یوسف سرمست اور جناب علی سردار جعفری علی الترتیب، اقبال کا تصور فن، اقبال کا اسلوب، مسجد قرطبہ کا تجزیاتی مطالعہ، روح فکر اقبال، کلام اقبال کے ترجمہ کے مسائل اقبال کا اثر ادبی تحریکوں پر اور اقبال کی غزل جیسے موضوعات پر مقالے پیش کئے۔ مقالوں میں پیش کئے گئے بعض نکات پر بحث بھی اتنی دلچسپ اور معیاری تھی کہ سمینار ۸ بجے شام تک جاری رہا۔ اس سمینار کی کارروائی جناب یوسف اعظمی نے چلائی۔

تقاریب کے تیسرے دن یعنی ۱۱ر نومبر ۷۷ء ۶ بجے شام جناب سید خلیل اللہ حسینی صدر اقبال اکیڈیمی کی صدارت میں ایک اجلاس عام کا انعقاد عمل میں آیا جس میں پرستاران اقبال کی کثیر تعداد شریک رہی۔ جلسہ کی کارروائی کا آغاز جناب قاری خورشید سلیم کی قرأت کلام پاک سے ہوا۔ بیرسٹر سرور اور علیخاں، ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، جناب سلیمان سکندر اور مولانا سید عباس رضوی نے مخاطب کیا۔ جناب سلمان فاروقی، جناب سہیل حسن کاظمی اور جناب امیر احمد خسرو نے کلام اقبال پیش کیا۔ اس جلسہ عام میں جناب مصطفیٰ کمال معتمد تحریری مقابلہ نے رپورٹ پیش کی اور نواب کاظم نواز جنگ صدر استقبالیہ نے اول و دوم آنے والے طلباء و طالبات میں انعامات دیئے۔ جناب محمد منظور احمد

نے اس اجلاس عام کے کنوینر کے فرائض انجام دیئے۔

اقبال صدی تقاریب کے چوتھے اور آخری دن یعنی ۱۲ر نومبر کے تمام اجلاس [illegible] ہال رام کوٹ حیدرآباد میں منعقد ہوئے۔ [illegible] بجے ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں اقبال کی مذہبی اور [illegible] پر سیمینار کا آغاز ہوا۔ اس اجلاس میں جناب یوسف اعظمی، ڈاکٹر صفدر علی بیگ اور ڈاکٹر رحیم الدین کمال نے مقالے پڑھے۔

دوپہر میں ۲/۱ ۲ بجے سے سیمینار کا آخری اجلاس مہمانِ خصوصی جناب علی سردار جعفری کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں "اقبال اور عصر حاضر" کے موضوع پر جناب مصلح الدین سعدی کا لکھا ہوا مقالہ جناب مضطر مجاز نے پڑھا۔ "اقبال کا سماجی شعور کیا اقبال احیاء پسند تھے۔" "اقبال کی شاعری میں عرفانِ وقت" کے موضوعات پر جناب احسن علی مرزا، ڈاکٹر ضیاء الدین شکیب اور ڈاکٹر عالم خوندمیری نے فکر انگیز مقالے پڑھے۔ جناب علی سردار جعفری نے اپنی تقریر میں کہا کہ اقبال کی فکر و تعلیمات کو عام کرنے کا مشن اب ایک عالمی تحریک بن چکا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اقبال کی شاعری ہندوستان اور پاکستان کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں قدر مشترک بن سکتی ہے۔ اس سیمینار کی کارروائی جناب منیر احمد خاں نے چلائی۔

صدی تقاریب کی آخری اور دلچسپ کڑی مشاعرہ تھا جو سر رحمتی دلوی ہال میں ۸ بجے شب منعقد ہوا جس کی صدارت جناب راجہ کنج بہاری لال چیرمین سروس رولس کمیشن حکومت آندھرا پردیش نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب کے وی کیشولو وزیر بلدیہ [illegible] آندھرا پردیش نے شرکت کی۔ وزیر موصوف نے فصیح اردو میں تقریر کرتے ہوئے اکیڈیمی کی سرگرمیوں کو سراہا۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کے مطالعہ سے سلیقہ سے جینے کا حوصلہ ملتا ہے۔ اس مشاعرہ میں جناب علی سردار جعفری کے علاوہ منتخب میزبان شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ جناب صلاح الدین نیر نے کنوینر مشاعرہ کے فرائض انجام دیئے۔

اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام منائی جانے والی یہ تقاریب ہر اعتبار سے بڑی معیاری اور شاندار رہیں۔ اس موقع پر "سب رس" کا مختصر مگر مفید نمبر بھی شائع ہوا ●●

●

اردو کتاب کا مسئلہ اردو قاری کا مسئلہ بھی ہے۔ اور جب ہم اردو کتاب کے آئندہ دہے کے منصوبہ کی بات کرتے ہیں تو اس بنیادی حقیقت نظرانداز نہیں کر سکتے کہ اردو پڑھنے والوں کی موجودہ رفتار کہیں اردو کتاب کے اس قلیل تعداد میں شائع ہونے والے ایڈیشن کو مزید متاثر نہ کرے۔ گذشتہ دہے میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ ملک بھر میں روزآنہ اردو کی اوسطاً دو کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اس کے بعد کوئی نئے اعداد و شمار سامنے نہیں آئے ہیں لیکن قیاس ہے کہ اس تعداد میں مزید کوئی کمی نہیں ہوئی ہوگی چونکہ اردو اکیڈیمیوں کے علاوہ مصنفین اور ناشرین کی ایک نئی صف اس عرصہ میں ابھر آئی ہے۔ اب اکثر شعراء و مصنفین خود ہی اپنی کتابیں شائع کرانے لگے ہیں۔ بعض تو صرف اکیڈیمیوں سے انعام پانے کی غرض سے اپنی کتاب خود شائع کرنے لگے ہیں اور بعض جو اردو میں ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں وہ ایم اے کا مقالہ یا اپنے مضامین کا مجموعہ شائع کراتے ہیں تاکہ ڈاکٹریٹ میں داخلہ میں سہولت ہو [illegible] ایسی کتابیں کثرت سے شائع ہو رہی ہیں۔ ان [illegible] لیکن اکثر و بیشتر غیر معیاری ہیں۔ [illegible]

ادبی سرگرمیاں

اُردو نامہ : علمی ادبی اور تہذیبی خبر نامہ

یکم نومبر: یوم تاسیس آندھرا پردیش تقاریب کے سلسلے میں ریاستی حکومت کی طرف سے بصدارت ملک الشعراء داسرتھی تلگو شعراء کا مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس کوی سمیلن میں اُردو کی نمائندگی جناب صلاح الدین نیّر نے کی۔ مسٹر داسرتھی نے مشاعرہ کی کارروائی چلاتے ہوئے اقبال کے متعدد اشعار سنائے اور داد حاصل کی۔

۳ر نومبر جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اُردو میں تین اساتذہ کے تقررات عمل میں آئے۔ مسٹر سید مصلح الدین (شاذ تمکنت) اور ڈاکٹر محمد ہاشم علی (میسور یونیورسٹی) کا تقرر ریڈر کی جائیداد پر ہوا اور ڈاکٹر اشرف رفیع بکرار شعبۂ اُردو منتخب ہوئے۔

۴ر نومبر حیدرآباد کے ایک بزرگ شاعر جناب عبدالحبیب عیّاں کا بمقام نارائن کھیڑ (محبوب نگر) انتقال ہوا۔ جناب عیاں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے تھے اور ریاست کے محکمۂ تعلیمات میں ملازم تھے۔ مئی ۱۹۷۶ء میں ان کی شعری و تدریسی خدمات کے اعتراف میں جشن بھی ہوا تھا۔ مرحوم نے زندگی کا بڑا حصہ شعر و ادب اور اُردو درس و تدریس میں گزارا۔

۵ر نومبر بزم نارائن داس کا طرحی مشاعرہ جناب احمد معین الدین مجنی (ایڈوکیٹ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ (۵۱) شعراء نے کلام سنایا۔

● ہند و پاک کے معروف سخنور جناب شاذ تمکنت ریڈر شعبۂ اُردو، عثمانیہ یونیورسٹی کا تیسرا مجموعۂ کلام "نیم خواب" ریاستی اُردو اکیڈیمی کی اعانت سے اشاعتی مراحل میں ہے۔ اس سے پہلے دو مجموعے "تراشیدہ" اور "بیاضِ شام" چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

● ہند و پاک کے صفِ اول کے طنز نگار ادیب اور صحافی ابراہیم جلیس کی وفات پر بزم اُردو اے جی آفس، بزم ضامن کنتوری، بزم نارائن داس اور عثمانیہ لٹریری سرکل کی طرف سے تعزیتی اجلاس منعقد ہوئے۔ جن میں جلیس مرحوم کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔

● مسرز اوج یعقوبی، برق موسوی اور طیّب انصاری بکرار گورنمنٹ کالج ہاسن نے صحافتی بیان کے ذریعہ ابراہیم جلیس کی وفات کو اُردو ادب اور صحافت کے لئے ناقابلِ تلافی سانحہ قرار دیا۔

● اقلیم ادب کی طرف سے جلیس مرحوم کو زبردست خراجِ عقیدت ادا کیا گیا۔ مسرز مصلح الدین سعدی، رحمن جامی، ڈاکٹر خورشید خضر، مفتی نعیم اور رحمت یوسف زئی نے مضامین اور تقریروں کے ذریعہ جلیس کی انشائیہ نگاری اور صحافتی خدمات پر روشنی ڈالی اور آخر میں قرار دادِ تعزیت منظور کی گئی۔

۸ر نومبر پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ جامعہ عثمانیہ جو کسی زمانے میں اُردو ذریعہ تعلیم کا واحد ذریعہ رہا، آج بھی اُردو سے اُس کی وابستگی ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔

● اُردو ادبیات اور تاریخ دکن کے نامور اسکالر ادیب ڈاکٹر ضیاءالدین احمد شکیب کی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسۂ تہنیت جناب خواجہ محمد احمد ڈائرکٹر ابوالکلام آزاد اورنیٹل ریسرچ انسٹیٹوٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مسرز ڈاکٹر یوسف کمال، مصلح الدین سعدی، مضطر مجاز، زیب النساء اور طیبہ شاہین نے مقالے پڑھے اور بتایا کہ ڈاکٹر شکیب کی کی حیثیت علم و فن کے بحرِ رواں کی سی ہے خاص طور پر طالبانِ علم کے حق میں وہ اپنی ذات سے ایک مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر شکیب کی تصانیف، تصاویر اور مقالات کی نمائش کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

● بزم رفیقانِ طالب رزاقی کے نثری و شعری اجلاس میں علی سرمد اور عارف بیابانی نے جناب عظیم مہندسا با[illegible]

کی شعری عظمت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ زور آغائی کی صدارت میں محفلِ شعر بھی منعقد ہوئی۔ (۱۹) شاعروں نے کلام سنایا۔

۷ نومبر ریاستی وزیر اطلاعات و تعلقات عامہ مسٹر ایم مانک راؤ نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ حیدرآباد میں ٹی وی اسٹوڈیو کی تعمیر کے بعد اردو پروگرام کا آغاز ممکن ہوگا۔

۹ نومبر علامہ اقبال کی ولادت صدی تقاریب کا ریاستی گورنر محترمہ شاردا مکرجی نے افتتاح کیا۔ یہ چار روزہ تقاریب اقبال اکیڈیمی کے زیر اہتمام انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو، اردو مجلس اور ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے نہایت اہتمام کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ سمینار کو حیدرآباد کے ماہرینِ اقبالیات کے علاوہ جناب علی سردار جعفری نے بھی مخاطب کیا۔ ان تقاریب کی تفصیلات علیحدہ صفحات میں آگے شائع ہو رہی ہیں۔

● مشہور طنز نگار ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کی خود نوشت "میری داستان" کے نام سے ان کے فرزند مرزا شرافت اللہ بیگ نے شائع کی ہے جو ان کے گھر کے پتے ۵-۳-۳۰۳ برکت پورہ، حیدرآباد سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

۱۱ نومبر اقلیم ادب کی طرف سے نامور ترقی پسند شاعر اور دانشور جناب علی سردار

جعفری کا ڈاکٹر عالم خوندمیری، راشد آذر اور ڈاکٹر انور معظم نے تقریباً دو گھنٹے تک ادبی انٹرویو لیا۔ اس انٹرویو کو حیدرآباد کے علمی و ادبی حلقوں میں بیحد پسند کیا جا رہا ہے۔ جعفری نے ادب و شعر

کی قدیم و جدید اقدار، اپنی ادبی و شعری تخلیقات، اقبالیات اور ترقی پسند تحریک کے بارے میں کئی سوالات کے شافی جواب دیئے۔ مغنی تبسم، رحمت یوسف زئی اور رحمن جامی نے اس انٹرویو کو ٹیپ ریکارڈ کی مدد سے سپرد قلم

بھی کر لیا ہے۔

● ہندی لیکھک سنگھ کے ادبی اجلاس میں مسٹر تیج نارائن جیسوال نے عظیم شاعر اقبال کے موضوع پر مقالہ سنایا۔

● اقبال صدی تقاریب کی موزوں یادگار کے طور پر اقبال اکیڈیمی کی طرف سے "اقبال ہال" کی تعمیر کے سلسلے میں ایک مقتدر کمیٹی کا قیام عمل میں آیا۔ کاظم نواز جنگ (صدر) مسٹر ٹی انجیا، جناب ابراہیم علی انصاری اور جناب آصف پاشا (ریاستی وزرا) پروفیسر جی رام ریڈی وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ، جناب عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست، جناب حامد علی عباسی (نائب صدر ادارہ ادبیات اردو) اراکین اور جناب غلام یزدانی (ایڈوکیٹ) کنوینر مقرر ہوئے۔

۱۲ ار نومبر انجمن ترقی اردو، ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین اور اردو مجلس کی طرف سے "ایوان اردو ہال" میں ابراہیم جلیس کی یاد میں تعزیتی اجلاس بصدارت جناب سید ہاشم علی اختر معتمد اعزازی ادارۂ ادبیات اردو منعقد ہوا۔ ابتدا میں قرار داد تعزیت منظور کی گئی جسے صلاح الدین نیر صاحب نے پیش کیا اور دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔ جناب علی سردار جعفری نے جلیس کی بے وقت جدائی کو ادب اور صحافت کا بڑا نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں سلطانی جمہور کے لئے قلمی جہاد میں مصروف جلیس کو ہندسے بھی بے حد انس اور جذباتی لگاؤ رہا ہے اس لئے اُن کی صحافتی تحریروں کا انتخاب حیدرآباد سے چھپنا چاہئیے۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے کہا کہ جلیس حیدرآباد کی تہذیبی قدروں کے آخر دم تک پاسبان رہے اور کراچی میں بھی انہوں نے انسانی حقوق کے لئے اپنے قلم اور شخصیت سے جد وجہد جاری رکھی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، محترمہ آمنہ ابو الحسن، مولانا عباس رضوی، مسٹر پی، یں سوامی (تلگو جرنلسٹ) نے بھی جلیس کی خدمات پر اظہار خیال کیا جلیس کے بھائی جناب مجتبیٰ حسین نے متاثر کن مضمون سنایا۔

● اقبال صدی تقاریب کے سلسلے میں مسٹر کے پی لال کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا۔ ریاستی وزیر گھر یلو مصنوعات مسٹر کے وی کیشولو نے بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی اور اقبال کو نذرانۂ عقیدت ادا کرتے ہوئے کہا کہ "اقبال ایک آفاقی شاعر تھے ان کا پیام ساری انسانیت کے لئے یکساں فیض رساں ہے۔ اقبال کے کلام کے مطالعہ سے قوموں کو سلیقے سے جینے کا قرینہ ملتا ہے۔ موصوف نے مزید کہا کہ گو تلگو میری مادری زبان ہے لیکن میں اس ماں (جامعہ عثمانیہ) کو کیسے بھول سکتا ہوں جس نے مجھے دودھ پلایا ہے اس لئے مجھے اردو زبان سے گہری وابستگی ہے۔ اس مشاعرہ میں سردار جعفری، سعید شہیدی، امیر احمد خسرو، علی احمد جلیلی، کنول پرشاد کنول، شاذ تمکنت، اوج یعقوبی خیرات ندیم، عنایت صدیقہ، راشد آذر، وقار خلیل احسن رضوی، صلاح الدین نیر (معتمد مشاعرہ) ناصر کرنولی، امان ارشد، نقی علیخاں ثاقب، فیض الحسن خیال، رئیس اختر، محمد منظور احمد، صادق نقوی، یوسف اعظمی، محی الدین نوید، خواجہ شوق، احمد بن سلطان مہدی اور سہیل احمد سہیل نے کلام سنایا۔

۱۳ ار نومبر مرکزی اردو محاذ کا ادبی اجلاس و مشاعرہ مولانا حافظ ابو یوسف (یم ایل سی) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ابتداً ابراہیم جلیس کی وفات پر قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔ ایک اور قرار داد کے ذریعہ مرکزی اور ریاستی حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ ٹی۔ وی سے اردو پروگرام کی نشریات کا جلد انتظام کیا جائے۔ محفل شعر میں سیف حموی، خورشید جنیدی، ڈاکٹر اسد انصاری، امام الدین فدا، اولاد جہاندار جاہی، طاہر عابدی اور نصیر بیابانی کے علاوہ کئی شاعروں نے کلام سنایا۔

۱۶ ار نومبر مخدوم محی الدین مرحوم کے ۰۷ ویں یوم پیدائش (۴ ار فروری ۷۸ء) کے موقع پر ادبی اور تہذیبی تقاریب کے شایان شان انعقاد کے سلسلے میں ایک مشاورتی کمیٹی کا اجلاس جسٹس گوپال راؤ ایکبوٹے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس موقع پر مخدوم سوسائٹی کی تشکیل دی گئی اور طے کیا گیا کہ ادبی اجلاس، کلچرل نائٹ اور مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ [illegible] گوپال [illegible]

کمیٹی میں شرکت کی۔ کمیٹی کے اراکین مسز پی۔ نرسا ریڈی ریاستی وزیر، عابد علی خاں ایڈیٹر سیاست ڈاکٹر سی۔ نارائن [illegible] ڈاکٹر زینت ساجدہ ڈاکٹر عالم خوندمیری، ڈاکٹر حسینی شاہد، سجادت چنگھٹہ اور سری نواس لاہوٹی بہ حیثیت اراکین مشاورتی اجلاس میں شریک رہے۔

۱۸ نومبر صدر ریاستی اردو اکیڈیمی جناب آصف پاشا وزیر اوقاف و مجالس نے اردو کے بارے میں مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چرن سنگھ کی جانب سے ظاہر کردہ خیالات کو جنتا پارٹی کے ذہن کا ترجمان قرار دیتے ہوئے کہاکہ اردو والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی زبان، تہذیب اور ثقافت کے ورثہ کی حفاظت کے لئے اپنے آپ کو متحرک اور سرگرم عمل رکھیں۔

۱۹ نومبر عثمانین قلمکاروں کی طرف سے بصدارت میر احمد علی خاں صدر ریاستی انجمن ترقی اردو اقبال صدی کے موقع پر پرانے شہر میں ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ ڈاکٹر غلام دستگیر رشید، پروفیسر سراج الدین، مسٹر ظہیرالدین احمد اور مجید بیدار نے اقبالیات پر مخاطب کیا۔

● جناب الطاف حسین جنیدی رکن عاملہ ریاستی اقلیتی سیل اردو کمیٹی پردیش کانگریس نے مرکزی وزیر داخلہ کے دورۂ حیدرآباد پر اردو کے [illegible] دیے گئے ان کے ایک بیان پر [illegible] کا اظہار کرتے ہوئے ایک میمورنڈم پیش [illegible] جس میں [illegible] تصدیق کی گئی [illegible] اردو [illegible]

● حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین کی طرف سے ڈاکٹر زینت ساجدہ صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں یوم اقبال منایا گیا۔ ڈاکٹر حمینہ شوکت، ڈاکٹر سیدہ جعفر، ڈاکٹر اشرف رفیع، نجمہ عبدالخالق اور رفیع روف نے اقبال کے فکر و فن کے مختلف گوشوں پر مقالے سنائے۔ بانو طاہرہ سعید نے منظوم خراج سخن پیش کیا اور محترمہ بلقیس علاء الدین نے اقبال کی ایک نظم کا انگریزی ترجمہ سنایا۔

● مرکز ادب کا ماہانہ ادبی اجلاس و مشاعرہ قائم جعفری صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا ارمان قریشی نے جناب محوی سروشی سے ادبی انٹرویو لیا اور پھر مشاعرہ میں کئی شاعروں نے غزلیہ شاعری سنائی۔

۲۰ نومبر مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چرن سنگھ نے پریس کانفرنس میں بتایا کہ وہ اردو کے مخالف نہیں ہیں، جب اخبار والوں نے ان کی توجہ بلٹز کے ایک انٹرویو کی طرف دلائی تو انہوں نے کہاکہ میرے خیالات کو غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے، مسٹر چرن سنگھ نے بتایا کہ اردو کو مذہب یا فرقہ سے جوڑنا غلط ہے کیونکہ اردو کے کئی ممتاز ادیبوں اور مصنفوں میں ہندو بھی شامل ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ اردو [illegible] عدالتی زبان تھی [illegible] مجھے اردو [illegible] بھی نہیں آتی [illegible] تاہم میں [illegible] سے مجبور

۲۳ نومبر آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے پریس نوٹ کے مطابق ریاست کے (۲۲) کتب خانوں کو ۱۳۱۰۰۰ (ایک لاکھ [illegible] ۵) روپئے کی گرانٹ دی گئی [illegible] ان میں کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو بھی شامل ہے۔

● اکیڈیمی نے ریاست میں اردو کی ۱۶ کتابوں کے مصنفوں کو جز کی اشاعت ۱۹۷۶ء میں عمل میں آئی انعامات دیئے ہیں۔ ایک ہزار روپئے انعام پانے والوں میں ۵ کتابیں شامل ہیں۔
۱۔ میری دھرتی میرے لوگ (تلگو شاعری) شیشدر شرما مترجم اختر حسن ۲۔ قفسِ رنگ (شاعری) ڈاکٹر غیاث صدیقی ۳۔ شیشے کی دیوار (ناول) اکرام جاوید ۴۔ لہولہان سورج (افسانے) ابراہیم شفیق مرحوم ۵۔ دشتِ تمنا (شاعری) زبیدہ تحسین۔ ۷ سو روپے کے انعامات چھ کتابوں پر دیئے گئے جن میں تصویریں (شاعری) سعادت نظیر، پریم چند کی ناول نگاری (مقالہ) ڈاکٹر یوسف سرمست، رات کا سفر (افسانے) قدیر الزماں، دلّی کی بیگماتی زبان (مقالہ) محی الدین حسن، در پردہ (طنز و مزاح) مسیح انجم اور یادوں کی برات (ایک مطالعہ) صابر کمال۔ ۴ سو روپئے کا انعام ان پانچ کتابوں کو ملا۔
۱۔ نگارِ حیات (شاعری) تاج کریم نگر ۲۔ سہ ماہی [illegible] کھنڈر (شاعری) حنیف کیفر ۳۔ عورت کا دل [illegible] [illegible] صالحہ نسرین قادری [illegible] پیدا [illegible] (خواتین و معاشرہ) [illegible] شفیق

(سلسلہ جاری)

ضلع کرشنا کے طوفان سے متاثرہ افراد کی امداد

ایک اپیل

ایسے افراد، رضاکارانہ تنظیمیں اور دوسرے ادارے جو ضلع کرشنا کے طوفان سے متاثرہ افراد کی امداد کپڑوں، بلانکٹس، بیڈشیٹس، ادویات، کھانے پینے کی چیزوں، گھریلو استعمال کے برتن اور تعمیری اشیاء بشمول ٹرپالینس وغیرہ کی شکل میں کرنے کے خواہشمند ہوں ان سے درخواست ہے کہ اشیاء کی صحیح تقسیم اور رہنمائی کے لئے اسپیشل آفیسر سائیکلون ریلیف سپلائز سے دفتر سب کلکٹر وجے واڑہ پر ربط پیدا کریں۔

ایسی تنظیمیں اور افراد جو متاثرین کی بذات خود مدد کرنا اور اشیاء کی تقسیم کا کام سنبھالنا پسند کرتے ہوں، ان سے گذارش ہے کہ وہ دستخط کنندہ ذیل سے مشورہ کریں تاکہ اشیاء کی دوہری تقسیم یا کسی ایک مخصوص علاقہ پر پوری کی پوری توجہ مرکوز نہ ہونے پائے اور اشیاء کی صحیح تقسیم اور متاثرین کی مناسب خدمت ہوسکے۔

رضاکارانہ تنظیموں سے خصوصی استدعا ہے کہ وہ دستخط کنندہ ذیل کے مشورہ سے ایک یا ایک سے زائد گاؤں کا انتخاب کریں اور وہاں طوفان سے متاثر افراد کی عارضی سکونت کے لئے فوری طور پر کمیونٹی پنڈالس قائم کریں۔

ربط پیدا کیجے

فون نمبرز

۸ بجے صبح تا ۸ بجے شام ۶۲۲۹۰ وجے واڑہ

دوسرے اوقات ۶۱۱۵۲ وجے واڑہ

بی دانم آئی اے ایس
اسپیشل آفیسر
سائیکلون ریلیف سپلائز وجے واڑہ

28/77478